جلد نمبر ۲ | F | یکم جنوری ۱۹۸۳ء | شمارہ نمبر ۱

ہمارے اور ہماری قوم کے حال پر حافظ کا یہ شعر صادق آتا ہے

بدم گفتی و خرسندم عفاک الله نکو گفتی　　　جواب تلخ می‌زیبد لب لعل شکرخا را

پرانے دل بعضے تو ہم کو بُرا کہتے کہتے ٹھنڈے ہو گئے ہیں اور بعضے نئے دل جوش پر ہیں اور ہم کو بُرا کہنے پر نہایت تیز زبان۔ مگر ہمارا دل اپنے کام سے ٹھنڈا نہیں ہے۔ ہم کو وہی جوش محبت و ہمدردی اپنی قوم کے ساتھ ہے۔ ان کی بھلائی اور تہذیب و شائستگی کی دن رات فکر ہے۔ ان کے غصے سے ہم کو رنج نہیں ان کی سخت کلامی کا ہم کو غم نہیں کیونکہ ہم جانتے ہیں کہ وہ نہیں جانتے اور ہم سمجھتے ہیں کہ وہ نہیں سمجھتے...... ہم کو پچھلوں کے اور خود اپنے پیارے رسول صلعم کے حالات سے کامل تسلی ہے ہم دیکھتے ہیں کہ جن لوگوں نے عام بھلائی پر کمر باندھی ہے اور اپنی قوم کی بہتری و بہبودی کی کوشش کی ہے ان کو دنیا کے ہاتھ سے اور خاص انھیں اپنی قوم کے ہاتھ سے کیا کیا کچھ صدمہ اٹھانا پڑا کوئی آرہ سے چیرا گیا کوئی [illegible] کیا گیا پس ہم کو جاننا چاہئے کہ قوم کے ہاتھ سے ہم کو جو ہونا چاہئے تھا اس کا کروڑواں حصہ بھی نہیں ہوا۔

سید احمد

[ایک مضمون بعنوان "حالِ قوم یا سامانِ قوم" سے]

فی پرچہ ایک روپیہ ششماہی ۱۱ روپے سالانہ ۲۰ روپے

بیرون ہند سے

فی پرچہ ایک ڈالر سالانہ ۱۵ ڈالر۔

ترسیل زر و خط و کتابت کا پتا

قاضی معز الدین احمد

صفدر منزل۔ تار بنگلہ۔ اے ایم یو علی گڑھ یوپی۔

جب تک نہ زندگی کے حقائق پہ ہو نظر
تیرا زجاج ہو نہ سکے گا حریفِ سنگ

یہ زورِ دست و ضربتِ کاری کا ہے مقام
میدانِ جنگ میں نہ طلب کر نوائے چنگ!

خونِ دل و جگر سے ہے سرمایۂ حیات
فطرت لہو ترنگ، ہے غافل! نہ جل ترنگ،

نہیں مقام کی خوگر طبیعتِ آزاد
ہوائے سیر مثالِ نسیم پیدا کر
ہزار چشمہ ترے سنگِ راہ سے پھوٹے
خودی میں ڈوب کے ضربِ کلیم پیدا کر

پندرہ روزہ

تہذیب الاخلاق

علی گڑھ

مدیر:۔ سیّد حامد
وائس چانسلر۔ اے ایم یو

مدیر مسئول:۔ قاضی معزالدین احمد

سرگذشت

الحمد للہ رسالہ تہذیب الاخلاق کا یکم جنوری ۱۹۸۳ء سے اشاعت کا دوسرا سال شروع ہو رہا ہے۔ رسالہ یکم فروری ۸۲ء کو جاری ہوا تھا۔ جب رسالہ جاری ہوا تھا بعض حضرات کو یہ خوف تھا کہ رسالہ کے چند شمارے تو ضرور شائع ہو جائیں گے لیکن پھر بادِ مخالف کا مقابلہ نہ کر سکے گا اور بند ہو جائے گا۔

جرائد شائع ہونے اور بند ہونے کا سلسلہ اردو حلقہ میں ایسا جاری ہے کہ جب بھی ڈاک کی خرابی سے رسالہ کسی خریدار کو نہیں ملا، یا پھر کسی دشواری سے اشاعت میں دو چار روز کی تاخیر ہو گئی تو رسالہ کے ناظرین کو خیال یہی ہوا کہ رسالہ بند ہو گیا ہے۔ لیکن خدا کا شکر ہے کہ احباب اور ہمدردوں کی اعانت سے ہمیں رسالہ کی اشاعت کے لیے برابر مضامین ملتے رہے اور رسالہ برابر پورے گیارہ ماہ نکلتا رہا۔ اور اب یکم جنوری ۸۳ء سے ہم اس کی اشاعت کا نیا سال شروع کر رہے ہیں۔

اس رسالہ کا مقصد نہ تجارت ہے نہ محفل آرائی۔ ہمارا مقصد مسلمانوں کا، جو پسماندہ ہیں، مایوسی کا شکار رہے ہیں، احساس کمتری میں مبتلا ہیں اور بادِ مخالف کے تھپڑے کھاتے ہیں، اللہ پر اور اپنے دستِ بازو پر بھروسہ کر کے زندگی کی جدوجہد جاری رکھتے ہیں اور ترقی بھی کر رہے ہیں، ضمیر بیدار کرنا، ان کی ہمت بڑھانا اور جدید دنیا سے ہم آہنگ کرنے کے لیے تیار کرنے کی کوشش کرنا ہے۔ لیکن یہ خواہش اس وقت پوری ہو سکتی ہے جبکہ ہمیں اپنے ہم خیالوں، رفیقوں اور ہمدردوں کا تعاون برابر حاصل رہے اور ایسے مضامین ہم حاصل کرتے رہیں جن کی تہذیب الاخلاق کو اشاعت کے لیے ضرورت ہے۔

ازما بجز حکایتِ مہر و وفا مپرس

اردو کے رسالے تو بہت نکلتے ہیں لیکن زیادہ تو وہی اردو داں حلقہ میں مقبول ہیں جو دلچسپی کا باعث ہوں۔ ایسے رسالے جو پڑھنے والے کو کچھ معلومات فراہم کریں اور ان کی ترقی کی راہوں پر چلنے کے لیے کچھ مشورے دیں مشکل ہی سے پسند کیے جاتے ہیں اور ان کو یہ مشورہ برابر دیا جاتا ہے کہ رسالے کو دلچسپ بنانا چاہیے۔ گویا وہ جس لیے نکالے گئے ہیں وہ ترک کر دیا جائے۔ ایسے ناظرین سے ہم

درخواست کریں گے کہ وہ دلچسپی کے لیے دوسرے رسالوں کا مطالعہ کریں اور اصلاح و ترقی کی طرف توجہ کرنا چاہیں تو تہذیب الاخلاق کا مطالعہ کریں۔ تہذیب الاخلاق سے یہ توقع رکھنا کہ وہ دلچسپ کیوں نہیں ہے ایسا ہے جیسا کہ کوئی میر انیس سے یہ کہتا کہ آپ غزل کیوں نہیں کہتے۔ یا اکبر اور اقبال کی شاعری میں جرکین کے کلام کا لطف حاصل کرنے کی خواہش کرنا۔

ہمارے ایک مضمون نگار نے مشورہ دیا کہ تہذیب الاخلاق ہندی میں نکلنا چاہیے۔ یہ اس لیے کہ اب نوجوان ہندی جانتے ہیں، اردو نہیں جانتے۔ اس تجویز میں خاصی جان ہے یوپی، بہار، دہلی، ہریانہ، ہماچل پردیش وغیرہ کے نوجوان جن کی مادری زبان اردو ہے وہ اردو بولتے تو ہیں لیکن ان میں کم ہی ہیں جو اردو بلا تکلف لکھ سکیں۔ اور اچھی اردو سمجھ سکیں۔ اردو جاننے والے اب عام طور پر ادھیڑ عمر کے لوگ رہ گئے ہیں۔ تہذیب الاخلاق سے جن کو فائدہ اٹھانا چاہیے وہ سب ہندی داں ہیں اردو دانی اس قدر کم تو نہیں ہوئی جیسا کہ خیال کیا گیا۔ لیکن تیزی سے کم ہو رہی ہے اور اردو کی صحیح املا لکھنا آسان نہیں رہا۔ بہت کم اردو والے صحیح اردو لکھ سکتے ہیں۔

اردو کے اس انحطاط کی طرف اردو والوں کی توجہ بہت کم ہے۔ جو لوگ اردو کی ترویج کا مل کر کام کر رہے ہیں ان کی کوششیں اتنی کامیاب نہیں ہیں جتنی کہ ہونی چاہیے تھیں۔ ہمارے اہل وطن میں اب شاید ہی کوئی ہو جو اپنے بچوں کو اردو پڑھواتا ہو۔ مسلمانوں کو یہ خیال ہے کہ پہلے ہم نے انگریزی نہ سیکھی تھی اور سو سال پیچھے رہ گئے۔ اب سرکاری زبان ہندی ہے۔ اب اگر ہندی نہ پڑھیں گے تو پھر اور پیچھے رہ جائیں گے۔ مسلمانوں کا یہ خطرہ غلط نہیں۔ ان کو ہندی پوری توجہ سے پڑھنی چاہیے اور اس میں کوتاہی نہ ہونی چاہیے لیکن اس کے یہ معنی نہیں کہ اردو نہ سیکھی جائے اور نہ پڑھی جائے لیکن اس کے لیے ارادہ اور عزم کی ضرورت ہے۔ افسوس یہ ہے کہ مسلمانوں میں یہ دونوں نہیں ہیں۔ وہ پیٹ بھرنے کے لیے ہاتھ پیر مارتے ہیں تہذیب و شائستگی کے لیے کچھ نہیں کرتے۔

اردو ایک زبان ہی نہیں ایک تہذیب بھی ہے اس کا شعر و ادب ایسا حسن و لطافت پیدا کرتا ہے جو قلب و روح کو گرما دے۔ ہندی والے جب بھی اپنی گفتگو، اپنی تحریر، اپنی تقریر میں جان پیدا کرنا چاہتے ہیں اردو کا سہارا لیتے ہیں۔ ہندی کی ترقی کے لیے ضروری ہے کہ وہ اردو کا دامن پکڑے۔ اگر اردو والے اردو لکھنا پڑھنا سیکھیں اور آزاد اور نذیر احمد کو نہ بھولیں تو وہ وقت آئے گا جب اردو کی قدر بڑھے گی اور اردو کو زندہ رہنے کا پورا موقع ملے گا۔

بدقسمتی یہ ہے کہ اردو مسلمانوں سے وابستہ ہو گئی ہے اور ملک میں جس قدر فرقہ وارانہ منافرت بڑھائی جاتی ہے، اتنا ہی زیادہ اردو زبان کو نقصان ہوتا ہے اس منافرت کے پھیلانے کی ذمہ دار اکثریت کی بعض پارٹیوں پر زیادہ اور مسلمانوں پر کم ہے۔ لیکن حالات کچھ ایسے ہیں کہ فرقہ وارانہ منافرت کو پھیلنے سے روکنا آسان نہیں۔

عقل و شعور کی اس قدر کمی اور روایت پرستی کا اس قدر زور ہے کہ روایات کی حفاظت کے لیے عقل نظر انداز کی جاتی ہے۔ یہ روایات کا تحفظ اردو کی ترقی ہی میں رکاوٹ نہیں، ملک کی ترقی میں بھی رکاوٹ ہے۔ اس کا احساس روایات نہیں عقل ہی کر سکتی ہے

ق۔م۔ا

ایس ایچ۔ ہاشمی
نیشنل انسٹی ٹیوٹ آف اوشنوگرافی
گوا۔

ہندوستان میں بحری کان کنی

سمندر بہت سے معدنیات کا خزانہ ہے

یہ وہ خزانہ ہے جو کہ سالہا سال تک انسانی ضروریات کو پورا کر سکتا ہے۔ اتنا بڑا خزانہ ہوتے ہوئے بھی صرف محدود مقدار میں ہی معدنیات کی کان کنی ہوتی ہے جو کہ ساحل کوہ تک محدود ہے۔ قبل ازیں اس کا جائزہ لیں کہ کون کون سے معدنیات سمندر میں ملتے ہیں، یہ بہتر ہوگا کہ اس کا ذکر کرتے چلیں کہ سمندر کے مختلف حصّوں کے کیا نام ہیں۔

ہم بخوبی جانتے ہیں کہ سمندر کا پانی جہاں تک آتا ہے اس کو ساحل کہتے ہیں اس سے خشکی کی طرف والے حصّہ کو ساحلی میدان کہتے ہیں۔ جس میں (بیچز) ساحل بھی آجاتے ہیں۔ مدوجزر کی وجہ سے سطح میں جو فرق آتا ہے اس فرق میں آنے والے حصّہ کو مدوجزر کا منطقہ (ٹائڈل زون) کہتے ہیں۔ ساحل سے پانی کے نیچے ایک بہت ہی یکساں ڈھلان والا حصہ ہوتا ہے جس کو ساحل کوہ کہتے ہیں۔ اِس ساحل کوہ پر جہاں سے فوری طور پر ڈھلان بڑھ جاتی ہے اس کو ساحل کوہ کا کنارہ کہتے ہیں اور یہ ڈھلان برّاعظم کی جڑ پر ختم ہوتی ہے اور وہاں سے جو معمولی ڈھلان شروع ہوتی ہے اس کو برّاعظم کی شروعات کہتے ہیں اس کے بعد کے حصہ کو قعرِ بحر (اتھاہ سمندر) کہا جاتا ہے۔ ساحل کوہ پر اکثر کٹاؤ بھی ملتے ہیں جن کو کہ سمندر کے اتار چڑھاؤ کے سبب سے بنے ہوئے مانے جاتے ہیں۔ انھیں کی مدد سے پرانے ساحل کی نشاندہی کی جا سکتی ہے۔

سمندر سے ملنے والے معدنیات میں تیل اور گیس کے علاوہ مینگنیز کے گولے بھی کافی اہمیت کے حامل ہیں۔ یہ چار یا پانچ ہزار میٹر کی گہرائی میں پائے جاتے ہیں۔ ان میں مینگنیز کے علاوہ نکل، کوبالٹ، تانبہ بھی ملتا ہے۔ صنعتی طور پر ان کو نکالنے میں ابھی بہت کچھ دشواریاں ہیں جس میں سے ایک ملکیت کا مسئلہ بھی ہے جو کہ ملکوں کے درمیان طے نہیں ہو پا رہا ہے۔ دنیا کے مختلف خطوں میں سمندر (صرف پچاس میٹر سے کم کی گہرائی) سے نکالے جانے والے کچھ معدنیات کا ذکر حسبِ ذیل ہے۔

۱۔ ایشیا، انڈونیشیا اور تھائی لینڈ کے ٹین کا معدنی ریت پلیسر۔
۲۔ الاسکا کا سونے اور پلاٹینیم کا ذخیرہ
۳۔ جنوبی افریقہ کی اورنج ندی کے دہانے پر ہیروں کا ذخیرہ۔
۴۔ پیرو، چلی، میکسیکو، امریکہ، شمالی افریقہ کے فاسفورائٹ کا ذخیرہ اس کے ساتھ ساتھ بحرِ ہند کے سکوترا جزیرے کے اِرد گرد بھی فاسفورائٹ ملتا ہے۔

امریکہ میں کلیفورنیا کے علاوہ کسی اور جگہ سے باقاعدہ طور پر معدنیات کے نکالنے کا کام نہیں ہو رہا ہے۔ ساحل کوہ پر ملنے والے ذخیروں میں قدرتی گیس اور تیل کے ذخیرے اپنی ایک الگ ہی اہمیت رکھتے ہیں۔ آج کل ان پر بھی بہت اہم تحقیقی کام ہو رہا ہے۔ اس ضمن میں کلیفورنیا، فارس کی کھاڑی مارکیپو جبیل، مغربی افریقہ، جنوبی مشرقی برازیل، شمالی جاوا، جنوب مغربی آسٹریلیا، مغربی نیوزی لینڈ، شمالی الاسکا، جنوب مشرقی تھائی لینڈ، شمالی تیوان، ہندوستان کا مغربی ساحل وغیرہ خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔

مندرجہ بالا سبھی معدنیات مالیت کے لحاظ سے کافی اہمیت کے حامل ہیں۔ اور اسی وجہ سے ان کی دریافت اور کان کنی بھی سودمند ہے۔ مختلف ممالک نے ان معدنیات کی طرف زیادہ توجہ نہیں دی جو مالیت کے لحاظ سے زیادہ بیش بہا نہیں ہیں۔ مثلاً کوارٹز سینڈ اور کلکیریس سینڈ گو کہ کچھ جگہوں پر جیسے کلیفورنیا فلوریڈا رودبار برطانیہ سے کوارٹز سینڈ نکالی جا رہی ہے جو کہ عمارتی انجینئرنگ کے کام آتی ہے کلکیریس سینڈ دنیا کے بہت سے ساحل کوہ پر عام طور سے ملتی ہے۔ جو کہ سیمنٹ کے لیے بھی استعمال میں آتی ہے (مثلاً کیرالا کے ومباناد جھیل، کچھ کی کھاڑی اور لکش دیپ کی کلکیریس سینڈ) یا پھر کیمیائی صنعت میں بھی استعمال کی جاتی ہے جیسے کہ بجاما کے اولائٹس۔

سمندر کے یہ معدنی خزانے ساحل کوہ کی ارضیاتی ارتقاء رسوب اور رسوبیت کے ڈھنگ پر بہت منحصر کرتے ہیں اس لیے یہ ضروری ہو جاتا ہے کہ اس پر بھی ایک نظر ڈالتے چلیں۔ اس مضمون میں صرف ہندوستان کے مغربی ساحل کوہ کا ہی جائزہ لیا جا رہا ہے۔ کیوں کہ اس پر بہت کچھ تحقیقی کام ہو چکا ہے۔

مغربی ساحل کوہ کا رقبہ تقریباً تین لاکھ مکعب کلومیٹر ہے۔ بمبئی کے مقابل ۲۰۰ کلومیٹر ہے جبکہ جنوب میں کیرالا کے مقابل صرف ۶۰ کلومیٹر ہے۔ سمندر کی تہہ کی معلومات کرنے والا آلہ جو آواز کی گونج کے اصول پر کام کرتا ہے اور اکو ساونڈر کہلاتا ہے، کے اعداد و شمار سے پتہ چلتا ہے کہ ساحل سے ۶۰ میٹر کی گہرائی تک تہہ عام طور سے برابر ہے جبکہ ۶۰ میٹر کی گہرائی سے ساحل کوہ کے کنارے جو کہ تقریباً ۹۰ سے ۱۲۰ میٹر گہرائی کے بیچ ہے، نکیلے نشیب و فراز ملتے ہیں جو کہ ۱۰ میٹر تک اونچے ہیں۔ ساحل کوہ کے اوپر کے رسوب تین طرح کے ہیں۔

۱۔ ساحلی بالو جو کہ بلند حد سے سمندر کی ۱۰ میٹر کی گہرائی تک ملتی ہے۔ ریت کی یہ پٹی کچھ ہی کلومیٹر کی چوڑائی کی ہے۔ اور بھاری وزنی معدنیات کا مجموعہ ہے

۲۔ دوسرا خطہ (گاد) سلٹ اور مٹی کا ہے جو ۱۰ سے ۶۰ میٹر کی گہرائی تک پھیلا ہوا ہے۔

۳۔ تیسرا خطہ ساحل کوہ کا وہ حصہ ہے جو کہ ۶۰ میٹر سے ساحل کوہ کے کنارے تک کا ہے اور کیلشیم والی ریت سے ڈھکا ہوا ہے

یہ تینوں رسوب تخلیق کے لحاظ سے بالکل مختلف ہیں۔ پہلے دو دورِ حال کی گرم و نم موسم میں ارضیاتی طریقوں سے ساحلی چٹانوں پر کٹاؤ اور ٹوٹ پھوٹ کا نتیجہ ہے۔ اس وجہ سے یہ رسوب ساحلی چٹانوں کی ماہیت اور ساخت کی نمائندگی کرتے ہیں۔ برخلاف ان دونوں کے بیرونی ساحل کوہ پر کلکیریس رسوب و کلکیریس چٹانیں ہیں جو کہ پلائسٹوسین کے آخری دور کی ہیں جب کہ تہہ سمندر دور موجودہ کی سطح سے ۶۰ سے ۹۰ میٹر کی گہرائی پر تھی۔

ان رسوب اور چٹانوں کی مدت ... ۹ سے ... ۱۱ سال کے
بیچ کی ہے جس کو کاربن کی ترکیب سے دریافت کیا گیا ہے
اتنی مدت کی وجہ سے ان کو رسوب قدیم کہا جاتا ہے۔ یہ وہ
رسوب ہوتے ہیں جو کہ مدّت اور رسوخ کے اعتبار سے دورِ
حال کے رسوب سے ہم آہنگ نہیں ہو پاتے ہیں۔ سمندر کے
اس اتار چڑھاؤ کے ساتھ ساتھ بہت سے قدیم ساحلی
کنارے منسلک پائے جاتے ہیں۔ ان میں سے کچھ ۱۳۰ سے
۲۰۰ میٹر کی بیچ گہرائی میں ساحل کوہ پر پشتہ کی شکل میں
آج بھی ملتے ہیں۔ وزنی معدنیات ان ساحلی کناروں پر ہی
ملتے ہیں۔ حالاں کہ بہت سے قدیم ساحلی کناروں کی شناخت
کرنا اس لیے مشکل ہو جاتا ہے کیونکہ وہ دورِ حال کے
رسوب کے نیچے دب چکے ہوتے ہیں۔

مختلف معدنیات کے ملنے کا امید افزا سمندری خطّہ

وزنی معدنیات:

یہ وزنی معدنیات جیسے ہیماٹائٹ، مینگنیٹائٹ،
مونازائٹ، زرکان، گارنٹ وغیرہ جو کہ بلیسر ذخیروں کی
شکل میں مغربی و مشرقی ساحلوں پر ملتے ہیں۔ ان میں رتناگری
کا المینائٹ اور کیرالا کے مونازائٹ و المینائٹ کے ذخیرے
قابل ذکر ہیں۔ ان معدنیات کے ساحل پر جماؤ ساحلی چٹانوں
کے قدرتی طور پر ہونے والے کٹاؤ کا نتیجہ ہے۔ جس میں
لہروں کے اثر کی وجہ سے ہلکے معدنیات کوارٹز و فلسپار
نکل جاتے ہیں اور وزنی معدنیات کا جماؤ بڑھ جاتا ہے۔
ان معدنیات کا پھیلاؤ سمندر کی تہہ میں ہونا قیاس کی
حد سے باہر نہیں ہے۔ اس وجہ سے مغربی ساحل پر یہ
ایک امید افزا خطّہ ہو سکتا ہے۔ حال ہی میں گوا سے
کیپ کمورن کے درمیان ساحل کوہ کی اضافی تحقیق
سے ان معدنی ریت کے ذخیروں کا پھیلاؤ گہرے پانی میں
ہونے کا پتہ چلا ہے۔ اس کے علاوہ باہری ساحلی کوہ پر کوارٹز
دیکھ وزنی معدنیات کی موجودگی بھی رسوب کی جانچ سے ثابت
ہوئی ہے۔ برخلاف اس کے سوراشٹرا سے گوا کے درمیان
کے بیرونی ساحل کوہ پر کلکیریس سینڈ ملتی ہے جس میں کوارٹز
بہت کم مقدار میں ہوتا ہے حال ہی میں نیشنل انسٹی ٹیوٹ
آف اوشنوگرافی گوا کے سائنس دانوں نے رتناگری کے پاس
سمندر میں المینائٹ کا پتہ لگایا ہے۔

فاسفورائٹ

فاسفورائٹ کے کسی بڑے خزانے کا مغربی ساحلی
کوہ پر ابھی تک پتہ تو نہیں چلا ہے۔ لیکن اس کے ملنے کے لیے کافی
امید افزا نشانات ملتے ہیں جو کہ حسبِ ذیل ہیں۔

۱۔ ایسے خطوں کی موجودگی جہاں پر کہ نسبتاً ٹھنڈا
اور فاسفیٹ و نائیٹریٹ سے مالا مال گہری
سطح کا پانی اوپری سطح کی طرف آتا ہے۔

۲۔ باہری ساحل کوہ پر کلکیریس سینڈ کی موجودگی
جس کے ذرّات کے اوپر فاسفیٹ جمع ہو سکتا
ہے۔ فاسفیٹائزڈ اولائٹ اور ایلگی کے ٹکڑوں
کا ملنا ان حالات کی تصدیق کرتے ہیں۔ اس
کی تحقیق کے لیے سوراشٹرا اور گوا کے درمیان
ساحل کوہ کو فوقیت دی جا سکتی ہے۔

کوارٹز و کلکیریس سینڈ

گوا سے کیپ کورن تک ساحل کوہ کے ایک بہت بڑے
حصّہ میں کوارٹز سینڈ پھیلی ہوئی ہے جس میں کاربونیٹ کی
مقدار بہت کم ہے۔ یہ دورِ حال کا جمع شدہ ہے۔ مستقبل قریب
میں ہی ہم کو ان ذخیروں کو کام میں لانے کی ضرورت پڑ سکتی ہے
کیونکہ ساحلی علاقوں کی ترقی کے ساتھ انھیں ذخیروں سے
پورا کیا جا رہا ہے۔ ساحل سے ریت کو ہٹانا بہت پہلے سے

ہی ایک مشکل کام بن چکا ہے۔ اس وجہ سے اگر کسی جگہ سے ایک قسم کی ریت ہٹائی جاتی ہے تو اس کی کمی کو دوسری طرح کی ریت سے ضرور پوری کرنی پڑتی ہے۔ اس کام کے لیے گہرائی کی ریت استعمال میں لائی جا سکتی ہے۔

کلکریس اشیار او لائٹ اور مختلف اقسام کی صدف کی شکل میں ساحل کوہ کے جنوبی حصہ کے رسوب میں ۶۰ سے ۷۰ فی صد تک ملتے ہیں۔ کچھ مقامات پر جیسے کہ پچاس فیدم کے فلیٹ پر یہ بڑھ کر ۹۰ فیصد تک ہو گئے ہیں۔ تجزیہ کرنے پر پتہ چلا ہے کہ ان میں نا قابلِ تحلیل اجزا صرف ایک سے دو فیصد تک ہی ہیں۔ جس کی وجہ سے ان کو کیمیائی صنعت میں بآسانی کام میں لایا جا سکتا ہے۔

آج کل بحری کان کنی میں پٹرولیم و گیس سب سے زیادہ اہمیت رکھتی ہے۔ مغربی ساحل پر بمبئی ہائی میں اس کے بہت بڑے ذخیرے ملے ہیں۔ گزشتہ سال (۱۹۷۹ء) یہاں سے ایک کروڑ اٹھارہ لاکھ ٹن تیل نکالا بھی گیا ہے۔ اس کے علاوہ کچھ اور جگہوں پر بھی تحقیقی کام چل رہے ہیں جس سے نئے نئے ذخیروں کے دستیاب ہونے کی امیدیں بڑھتی جا رہی ہیں۔ مینگنیز کے گولوں کی تحقیق کے سلسلہ میں نیشنل انسٹی ٹیوٹ آف اوشیانوگرافی کے سائنس دانوں کی ایک جماعت بہت جلد جائزے کے لیے جانے والی ہے۔ اس جائزے میں انسٹی ٹیوٹ کا جہاز گویشنی بھی استعمال کیا جائے گا۔

ہندوستان کے مغربی ساحل پر دستیاب ارضیاتی اطلاعات سے یہ صاف ظاہر ہوتا ہے کہ پٹرولیم و گیس کے ساتھ ساتھ اور دوسرے معدنیات کی کان کنی کے لیے بہت روشن مستقبل ہے۔

(بصد شکریہ "سائنس کی دنیا")

بقیہ "مسلمانوں کا کل ہند معاشی سروے"

متعلقہ صفحہ نمبر ۲۹

تخلیقی یا تعلیمی سروے کا کام کیا ہو۔

۴۔ اس پروگرام پر تعمیری تنقید، قابلِ عمل تجاویز اور کارآمد مشورے بھیجیے جس سے اسے زیادہ بہتر انداز میں چلانے میں مدد ملے۔

آپ کے تعاون کے بغیر یہ کام ممکن نہ ہوگا، لہذا گزارش ہے کہ اپنے قیمتی اوقات سے تھوڑا وقت اس اہم کام کے لیے بھی نکالیے۔ ہمدرد ایجوکیشن سوسائٹی نے اللہ کا نام لے کر کل ہند معاشی سروے کا بیڑہ اٹھایا ہے جو بہرحال ایک سخت کام ہے، لیکن اگر توقع کے مطابق ملت کے دردمند حضرات کا تعاون ہمیں مل گیا تو ہم ضرور اپنے مقصد میں کامیاب ہو جائیں گے۔

براہِ کرم اس پتہ پر خط و کتابت کیجیے۔

سید شمیم شاہ
ایڈمنسٹریٹو سکریٹری
ہمدرد ایجوکیشن سوسائٹی
ہمدرد نگر۔
نئی دہلی ۶۲

نجمہ شہریار
ویمنس کالج
اے ایم یو۔

گھر کے ماحول میں بچّے کی حیثیت

انگریزی کے مشہور شاعر ورڈز ورتھ نے کہا ہے "Child is Father of The Man" یعنی "بچہ انسان کا باپ ہے"۔ اس کے مطابق بچے میں زیادہ معصومیت ہوتی ہے جو تجربہ آنے پر دھیرے دھیرے ختم ہوتی جاتی ہے۔ چنانچہ بچہ بڑوں سے برتر اور عظیم تر ہے کہ وہ مکر و فریب، ریاکاری اور مصلحت پسندی سے پرے ہے۔ اس میں سادگی کے علاوہ انصاف کی زبردست حس ہوتی ہے...... بچہ بڑوں سے زیادہ حساس ہوتا ہے۔ وہ ایک مکمل فرد ہے اس کی اپنی الگ دنیا ہوتی ہے۔ اس کا تخیل زیادہ جاندار، زیادہ تیز ہوتا ہے، اس میں سیکھنے کی زیادہ صلاحیت ہوتی ہے..... اب ہمیں یہ دیکھنا ہے کہ اس عظیم تر مخلوق کی ہمارے گھر میں کیا حیثیت رہی ہے اور کیا ہونا چاہیے۔

عموماً گھروں میں بچوں کی حیثیت کوئی بہت قابلِ اطمینان نہیں رہی ہے۔ ان کو دبایا جاتا رہا ہے۔ یہ سوچا جاتا رہا ہے کہ بچے میں انفرادیت نہیں ہوتی وہ نہ محسوس کرتا ہے، نہ سوچتا ہے، نہ سمجھتا ہے۔ گویا وہ ذی روح نہیں ہے۔ پہلے والدین بچوں پر اپنی مرضی لادتے تھے۔ بڑوں کی محفل میں بچوں کی مداخلت ممنوع تھی۔ بڑوں اور بچوں میں دوستی کا کوئی تصور نہ تھا۔ بے جا ادب خوردی تقاضوں سے بچے اپنے ساتھ کی گئی ناانصافی پر کچھ کہہ نہ سکتے تھے اور بڑے ہونے پر بھی کہیں نہ نکال سکتے تھے۔ تب بے ادب کہلاتے تھے۔ جنس کا کس توقع کیا جائے والدین کو قطعی معلوم نہ تھا۔ بچے پر سب سے زیادہ باپ کا خوف طاری رہتا تھا۔ اس کی تربیت میں عموماً ماں کی مداخلت پسند نہ کی جاتی تھی۔ گو کہ اس کی دیکھ بھال کی ذمہ داری ماں کے ہی سر تھی۔ ماں فقط ذریعہ پیدائش سمجھی جاتی تھی بچوں کی خدمت اس کا فرض تھا۔ اس لیے بچے دل سے ماں کی عزت نہ کرتے تھے۔ اب بھی صورتِ حال کم و بیش یہی ہے۔

سوال یہ ہے کہ گھر میں بچے کی حیثیت کیا ہو تو کہنا یہ ہے کہ بچے کو بچہ سمجھ کر اس سے یہ نہ کہا جائے جاؤ باہر جا کر کھیلو۔ گویا اس کا کوئی مصرف ہی نہیں ہے۔ اس میں خود اعتمادی پیدا کرنے کے لیے گھر کے چھوٹے موٹے کام اس کے سپرد کیے جائیں۔ بچوں سے کام لینے کو عیب نہ سمجھا جائے اس سے وہ بالکل نااہل ہو جاتے ہیں اور ہم کو ان کی فطری صلاحیتوں کا علم نہیں ہو پاتا۔ بچہ خود کو بے مصرف سمجھ کر گھر سے نکل لیتا ہے اور پھر محلے بھر کے بچے جمع ہو کر اودھم بازی کرتے ہیں۔ ان کا دل پڑھائی سے بھی اچاٹ ہو جاتا ہے اور پھر یہی بچے ذرا بڑے ہو کر ہنگامے کرتے ہیں۔ غنڈہ گردی کرتے ہیں، اسٹرائیکوں میں حصہ لیتے ہیں اور دنگے فساد میں سب سے پیش پیش رہتے ہیں...... آخر لڑکیاں اور

عورتیں فسادوں میں حصہ کیوں نہیں لیتیں، یہ ایک اہم سوال ہے
عموماً دیکھا گیا ہے کہ گھر کے کاموں میں لڑکیاں
ماں کا ہاتھ بٹاتی ہیں لیکن لڑکے ہر کام سے بری الذمہ رہتے
ہیں۔ اگر ان کا بھی مصرف سمجھا جائے تو اس سے دو فائدے ہوں
گے ایک تو وہ خود کو ماں اور بہنوں سے برتر نہ سمجھیں گے، دوسرے
ماں پر کام کا بوجھ ہلکا ہو جائے گا..... گھروں میں غیر منصفانہ
تقسیم کار دونوں جنسوں کے مابین ایک دیوار کھڑی کر دیتی
ہے اور گھر میں طبقاتی جنگ شروع ہو جاتی ہے۔ آج کل تو زمانہ
مساوات کا ہے لڑکیاں بھی علم بغاوت بلند کر دیتی ہیں کہ جب
بھائی نہیں کرتا تو ہم کیوں کریں۔ بچے کی صلاحیت کو سمجھ کر
اسے ذمہ داری سونپنا بہت ضروری ہے۔ بچے بڑوں ہی کی طرح
کام کرنے کے اہل ہیں۔ (مثلاً میرے بچے گھر خوب صاف کر سکتے
ہیں، اسے سجا سکتے ہیں۔ بڑے بیٹے کو کھانے کی میز سجانے اور
گلدانوں میں پھول لگانے کا بڑا شوق ہے.... وہ کھچڑی پکا سکتا
ہے آملیٹ اور پراٹھا بنا لیتا ہے۔ آج کل قمیص میں بٹن ٹانکنے کی
مشق کر رہا ہے۔ ساتھ ہی پڑھائی میں بھی بہت اچھا ہے۔
کہانیاں پڑھنے کا بڑا شوقین ہے۔ بہت سے رسالے جاری
کرا رکھے ہیں۔ چھوٹا بیٹا بہت سے چھوٹے موٹے کام کر لیتا ہے
سر میں درد ہو تو بہت محبت سے سر دباتا ہے۔ میری دس سالہ
بیٹی بڑی محبت سے اپنے چھوٹے بھائی کے اسکول کے یونیفارم
کی فکر خود رکھتی ہے۔ کبھی بڑی اچھی طرح صاف کرتی ہے۔ بیماری
پر میری تیمار داری کرتی ہے)۔ عموماً گھروں میں ہم دیکھتے ہیں
کہ خدمت کی اہمیت نہیں سمجھی جاتی جو خدمت کرے اسے
کمتر سمجھا جاتا ہے۔ بچوں کو یہ احساس نہیں دلایا جاتا کہ
مدر ٹریسا اور فلورنس نائٹنگل کی عظمت کا راز کیا ہے۔

اکثر گھروں میں اہم مسائل کے حل کرنے
میں بچوں کو نظر انداز کر دیا جاتا ہے۔ ہم یہ دیکھتے ہیں کہ بچوں
کی عقل سے اکثر بڑے بڑے کام ہو جاتے ہیں۔ اس وقت
مجھے وہ کہانی یاد آ رہی ہے جس میں ایک ماں کے دس سالہ
بیٹے نے اپنی ماں کو ایک بہت بڑی مصیبت سے نجات دلائی
تھی۔ (اس نے ماں سے کہا تھا کہ جا کر ان تینوں سوداگروں
سے کہہ دو کہ ابھی تو تم صرف تین ہی آئے ہو اور تم نے کہا تھا
کہ جب ہم چاروں مل کر آئیں تب ہی روپیوں کی تھیلی ہمیں دینا
چنانچہ جب تم چاروں مل کر آؤ گے تھیلی تب ہی ملے گی)۔

(اکثر یہ بھی دیکھنے میں آیا ہے کہ چھوٹے چھوٹے بچے
گھر کے بڑوں کی حفاظت کر لیتے ہیں۔ ایک نو سالہ بچی نے ڈاکوؤں
سے یہ کہہ کر اپنی ماں کو بچا لیا کہ مجھے مار ڈالو مگر میری ماں
کو چھوڑ دو۔ ان کا دل بچی کی اس قربانی سے پسیج گیا اور
انھوں نے اس کی ماں کو چھوڑ دیا۔ بچہ بھی بڑوں کا محافظ ہوتا
ہے۔ وہ بھی ایثار کر سکتا ہے۔ چنانچہ مکمل فرد ہے اور اس
کا نظر انداز کیا جانا قطعاً نامناسب ہے۔

بچوں پر (خصوصاً چھوٹے بچوں پر) نہ تو اتنی
زیادہ توجہ دی جائے کہ وہ بالکل کھلونا لگنے لگیں۔ اس لیے کہ
ذرا بڑا ہونے پر بھی بچہ اسی قسم کی توجہ چاہے گا اور نہ پانے
پر دوسروں کا دھیان اپنی طرف کرنے کے لیے الٹی سیدھی
حرکتیں کرنا شروع کر دے گا..... نہ ہی بے توجہی برتی جائے
...... وہ کوئی قابل تعریف کام کرے تو اس کی مناسب تعریف
کی جائے..... اس کے کھانے پینے کا، پڑھنے لکھنے کا، تفریح
کا، جسم اور کپڑوں کی صفائی کا خیال رکھا جائے۔ اس
میں خود پر اعتماد ہوگا اور اس کی صحیح نشو و نما ہوگی۔

والدین کو چاہیے کہ بچوں پر اپنی مرضی نہ لادیں
ان کی دلچسپی اور رجحان کو دیکھتے ہوئے ان کو اپنے کیریر
کا انتخاب کرنے دیں۔ ان کو اپنی مرضی کے مطابق مضامین
اختیار کرنے دیں ورنہ اکثر ان کی پوری شخصیت ہی ختم ہو جاتی

ہے۔ مثلاً بچّے کا رجحان تو آرٹس کی طرف ہے اور پڑھائی جا رہی
ہے سائنس۔ سائنس کی کیونکہ آج کل قدر زیادہ ہے۔ اس کا
سکوپ بہت ہے خواہ بچّے کو اس میں قطعاً دلچسپی نہ ہو۔

آج کل یہ بھی ایک رجحان ہے کہ بچوں
کو خود رو درخت کی طرح بڑھنے دو۔ یہ بھی غلط ہے ایک توازن
ضروری ہے۔ ان کے ذہن میں یہ بٹھانا ضروری ہے کہ ایک خاص
حد ہے جسے ان کو پار نہیں کرنا ہے...... بڑوں کی ناانصافی پر
مناسب طریقے سے وہ احتجاج کر سکتے ہیں۔ لیکن بدتمیزی اور
بداخلاقی قطعی قابل قبول نہ ہوگی۔ بچوں میں یہ احساس ان کو
سمجھا بجھا کر پیدا کیا جائے۔ مارنے یا ڈانٹنے کا طریقہ خصوصاً
کسی کے سامنے اس لیے مناسب نہیں کہ بچّے کی بھی اپنی ایک
مخصوص انا ہوتی ہے جو یوں مجروح ہوتی ہے اور وہ عدم
خود اعتمادی کا شکار ہو جاتا ہے۔ والدین اور استادوں کو
بچوں کے سامنے خود نمونہ بن کر پیش ہونا چاہیے۔ بچوں کو زیادہ
سے زیادہ تخلیقی کاموں میں لگائیں.... وہ چھوٹے چھوٹے ڈرامے
اسٹیج کریں، کہانی لکھیں، تصویریں بنائیں۔ گھر کو سجانے کے
لیے چھوٹی موٹی چیزیں خود بنائیں.... اس سے ان میں خود اعتمادی
پیدا ہوگی اور وہ خالی الذہن بھی نہ رہیں گے۔

چند باتیں میں اس اہم مسئلہ کی طرف اور
کہنا چاہوں گی جس کا ذکر میں نے شروع میں کیا تھا اور جس
کا تعلق لفظ "حیثیت" سے بہت گہرا ہے۔ عرف عام میں لفظ
"حیثیت" کے جو معنی لیے جاتے ہیں، ان کے لحاظ سے ہمارے
گھروں میں دو طبقے پیدا ہوئے ہیں یعنی "برتر حیثیت" کے مالک گھر
کے مرد اور بچے سمجھے جاتے ہیں اور کمتر حیثیت کی مالک گھر
کی عورتیں اور نوکر۔ ضروری نہیں کہ ہر گھر میں یہی صورت
حال ہے۔ باپ بچوں کو اپنا سمجھتا ہے۔ ماں کی حیثیت تقریباً
آیا کی ہوتی ہے اگر بچّے کے خود اس کی ہی شرارت سے چوٹ
لگ جائے تو قصور وار ماں ٹھہرائی جائے گی ـــ" برتر حیثیت
والے طبقے پر گھر کی ذمہ داریاں اور کام صفر کے برابر ہوتا ہے۔
(اس لیے کہ کاہلی آرام طلبی برتری کی ضامن ہیں!) ساری ذمہ
داریاں "کمتر" طبقے پر ہوتی ہیں۔ اس لحاظ سے ہم دیکھیں تو
بچوں کی حیثیت گھروں میں بہت اعلیٰ ہے... لیکن میرے نزدیک
معاملہ برعکس ہے.... یہ کہ گھر کے مرد اور بچّے فرد کی حیثیت
سے صفر ہو جاتے ہیں۔ ان کی ہستی گھر کے لیے ناگزیر نہیں
رہتی... بچے خود کو ماں سے برتر خیال کرنے لگتے ہیں۔ ان
کے اندر چھپی ہوئی عملی صلاحیتیں بیکار ہوتی رہتی ہیں۔ وہ محنت
کی عظمت کو سمجھنے سے قاصر رہتے ہیں۔ عموماً یہ دیکھنے میں آیا
ہے کہ نوکر جہاں گھر میں داخل ہوا اور سب نے کام سے ہاتھ
سمیٹا۔ گھر کی عورتیں خصوصاً بیوی پھر بھی انسانی ہمدردی
کے رشتے سے نوکر کے ساتھ لگی رہتی ہے تو اس کی اس ہمدردی
کی کوئی قدر نہیں ہوتی.... میرے نقطۂ نظر سے فرد اور ذی روح
کی حیثیت دراصل برتر درجہ بیوی اور نوکر کا ہی ہوتا ہے۔
اس لیے کہ وہی زیادہ مشکل اور محنت طلب کاموں کے اہل ہوتے
ہیں۔ اور گھر کا مالک اور بچّے بالکل لاچار معلوم ہوتے ہیں کہ ہل
کر پانی بھی نہیں پی سکتے۔ بات ذرا سی پیچیدہ ضرور ہے لیکن
ذرا دماغ پر زور دینے سے سمجھ میں آ سکتی ہے: زیادہ ہمدردی
زیادہ قناعت، زیادہ محنت اور ایثار بھی اسی دوسرے
طبقے کی خصوصیات ہیں جو کہ اسے برتر اور ناگزیر حیثیت
بخشتی ہیں۔

اس گھریلو طبقاتی کشمکش کو دور کرنے کے لیے ضروری
ہے کہ سب ہی گھر والوں پر برابر کی ذمہ داریاں ہوں اور
اس سے کسی میں بے جا احساس برتری پیدا نہ ہوگا اور
سب محنت کی عظمت کو سمجھیں گے اور کسی عزیت کو کولھو کے بیل
کی طرح لگنا بھی نہ پڑے گا۔ یہ خیال کہ ہمارے بچے پڑھتے

ہیں، کام کیوں کریں نامناسب ہے۔ پڑھنے لکھنے کا مطلب یہ ہرگز نہیں ہے کہ آدمی کی عملی زندگی ختم ہو جائے.... اگر ہو سکے تو اس نوکر کی تعلیم کا بھی کچھ انتظام کر دیں۔ دراصل میں تو نوکر رکھنے کے ہی خلاف ہوں۔ یا تو رکھیے مت اور اگر رکھیے تو انسان کی طرح، مشین کی طرح نہیں۔ بچوں کو ان پر حکومت نہ جھاڑنے دی جائے۔ ان کو اپنے چھوٹے موٹے کام خود کرنے کی تاکید کی جائے دراصل ہم میں باوجود ساری تبدیلیوں کے اب بھی جاگیردارانہ خوبو باقی ہے۔ رسی جل گئی ہے پر بل ابھی باقی ہے۔ زبانی جمع خرچ کرنا اور بات ہے اور اپنے آدرشوں کو عملی صورت دینا اور بات اور بے حد مشکل بھی۔ ہم مشکل کام کر نہیں سکتے اور ہمیشہ احساسِ برتری کا شکار رہتے ہیں۔ اس لیے گھاٹے میں رہتے ہیں اور ہمارے بچوں میں خود اعتمادی کی کمی ہو جاتی ہے۔ ان کی صلاحیتیں بروئے کار نہیں آپاتیں ... میاں صاحب اور بچے فرصت ہی فرصت ہونے کی وجہ سے اپنی اپنی دوستیوں اور تفریحوں میں پڑے رہتے ہیں۔ کسی کو اس بات کی پروا نہیں ہوتی کہ بیوی یا ماں کو بھی دوستی کرنے، تعلقات کو نبھانے کا وقت مل پاتا ہے کہ نہیں۔ عموماً گھروں میں بچوں اور مردوں کی دوستیوں کو تو اہم سمجھا جاتا ہے۔ میاں کے دوست آئے ہیں تو ان کے پاس وقت ہوگا کہ وہ گھنٹوں خوش گپیاں کریں۔ یوں ہی بچوں کی دوستیوں کی بڑی اہمیت سمجھی جاتی ہے (کہیں سالگرہ ہو، بچوں کی پارٹی ہو، اپنے بچے بڑے اہتمام سے بھیجے جاتے ہیں۔ کوئی بچہ کھیلنے آیا تو ہمارے بچے کے پاس اس کے ساتھ کھیلنے اور دوستی برقرار رکھنے کو وقت ہی وقت ہوتا ہے) لیکن بیویوں اور ماؤں کی دوستی بے وقعت، بے معنی اور تضیع اوقات سمجھی جاتی ہے اور یوں کہہ دیا جاتا ہے کہ شادی کے بعد عورتوں کی دوستی کیسی..... گویا شادی کے بعد انفرادیت ختم... جینے کا حق سلب.... اگر گھر میں تقسیم کاری مساوی ہو تو اُن کو بھی اپنی دوستوں اور ملنے والیوں کے ساتھ تھوڑا وقت گزارنے کا، اور خوش گپیوں کا وقت مل جائے..... اس میں خود خواتین کی بھی کمزوری ہے وہ خود پر اتنی زیادہ ذمہ داریاں لاد لیتی ہیں اور مصروفیت پر اتنا فخر کرتی ہیں کہ ان کو ملنے ملانے کا وقت نکالنا مشکل ہو جاتا ہے۔ نہ ہی وہ اپنی ذات کو اہمیت دیتی ہیں نہ اپنی دوستی کو.... ان کو یہ احساس ہی نہیں ہوتا کہ انسان کے لیے سب سے پہلے اپنی ذات پر توجہ دینی ضروری ہے۔

چنانچہ کہنے کا مقصد یہ ہے کہ گھر میں سب کی حیثیت مساوی ہو یہ نہیں کہ بچوں کو جنم دینے والی ہستی کی حیثیت کمتر اور کمتر رہ جائے اور بچے خود کو اس سے برتر تصور کریں..... یہ ایک بنیادی نکتہ ہے، جس پر غور کرنا انتہائی ضروری ہے...... جن گھروں میں ماؤں کی عزتِ نفس برقرار رہتی ہے ان میں بچے ذہنی طور سے زیادہ صحت مند ہوتے ہیں۔

بہ شکریہ آل انڈیا ریڈیو

پروفیسر ایم وائی انصاری
صدر شعبۂ سول انجینئرنگ
اے ایم یو۔

مسلمانوں کے علمی کارہائے نمایاں

مسلمانوں کے علمی کارہائے نمایاں اس قدر وسیع اور جامع ہیں کہ وہ نہ صرف علوم ہی ہیں بلکہ وہ تعلیم۔ تربیت تہذیب اور عام معلومات سب کو اپنے دائرے میں لے آتے ہیں۔ انھیں علوم کی پروردہ عظیم الشان ثقافت و تہذیب کو مسلمانوں کا " زریں دور" تصور کیا جاتا ہے۔

اسی تعلیم اور تربیت نے سائنس، فنون لطیفہ، تہذیب و تمدن، فن تعمیر اور دیگر علوم عقلیہ کو جنم دیا اور ان کی پرورش کی۔ یہی تعلیم و تربیت دنیا کے لیے سرمایۂ ناز بنی۔ تعلیم کی بدولت عرب کی ایک بدّو اور ناخواندہ قوم نے جو مفکرین، فلسفی، مورخ، کیمیاداں، اطبائے حاذق، علماء طبیعیات اور مہندسین پیدا کیے ان میں البیرونی، ابن خلدون ابن سینا، خوارزمی، جابر بن حیان، ثابت قرا، امام غزالی، شیخ سعدی وغیرہ چند نام ہیں۔ ان میں ابن رشد و دیگر حضرات کی حوادثات زمانہ سے بچی کچی چند تصانیف حال کی صدی تک یورپ کی مشہور علمی درس گاہوں کے نصاب میں داخل تھیں۔

ایک فن تعمیر ہی کے میدان میں عربوں نے نہ صرف ایک اچھوتے طرز تعمیر کی بنیاد ڈالی اور نئی اشیائے تعمیر دریافت اور استعمال کیں بلکہ نئے اصول تعمیر بھی وضع کیے۔ گوکہ عظیم اسلامی عمارات کے بارے میں فنون لطیفہ کے نقطۂ نظر سے وافر اور معقول تحریری مواد ذخیرہ کی حد تک موجود ہے۔ لیکن افسوس ہے کہ بدقسمتی سے ابھی تک فن تعمیر و ساخت کو ذہن میں رکھتے ہوئے مسلمانوں کے ان تعمیری شاہکاروں کے طرز تعمیر، اصول تعمیر اور اسلوب تعمیر کی طرف خاطر خواہ توجہ نہیں دی گئی ہے۔ ضرورت ہے کہ محققین، اسلامی فن ساخت اور اصول تعلیم کے اہم لیکن نظر انداز شدہ پہلوؤں کی طرف اپنی گراں قدر توجہ مبذول کریں

بلاشبہ ان کے کارہائے نمایاں کا راز اسلام اور مسلمانوں کا علمی ذوق، تجسس اور غیر متزلزل قوت عمل ہی میں مضمر ہے۔ قرآن حکیم نے صریح و واضح الفاظ میں مسلمانوں کو مکمل ضابطۂ حیات عطا فرمایا۔ بلا تفریق مذہب، رنگ و ملت اور فاصلوں و دشواریوں سے بے نیاز ہوکر حصول علم کی ہدایت کی ہے۔ چنانچہ قرآن پاک اور متعدد احادیث نبوی علم، حصول علم، اور فضیلت علم کے سلسلہ میں قلم بند کی جاسکتی ہیں۔ امام غزالی نے قرآن و احادیث کی روشنی میں ایک مفصل باب علم کی تعریف و مفہوم، حصول علم، اساتذہ وطلاب کے فرائض پر مرتب کیا جو آج بھی ہماری رہنمائی اچھے طریقے پر کرسکتا ہے۔

علم کا مفہوم

علم برائے علم نہ کہ برائے حصول دولت

ثروت اور شان و شوکت مسلمانوں کا مطمح نظر رہا۔ مسلمانوں نے
علم کو کبھی تحصیلِ دولت کے لیے نہیں حاصل کیا۔ نہ علماء ہی کسی دور
میں بہت دولت مند یا صاحب جاہ و منصب تھے۔

ابتدائے اسلام ہی سے قرآن اور پیشوائے
اسلام کے احکام کے مطابق علم دوستی اور علم پروری مسلمانوں
کا شیوہ اور تفریحی مشغلہ رہا ہے۔ چنانچہ علماء کا ایک اہم فرض
علمی اور مذہبی حوصلہ مندی ہے۔ اس حوصلہ مندی کے زیر
اثر محدثین نے ایک ایک حدیث کے لیے ہزاروں میلوں کا سفر
کیا اور ہر قسم کی تکالیف سے دوچار ہوئے۔ اس حوصلہ مندی
کا اثر تھا کہ اندلس کے طلباء ہندوستان میں حصولِ علم کے لیے
آتے تھے۔ ابن بیطار نے نباتات کی تحقیق کے لیے اندلس سے
چل کر یونان اور بحر روم کے جزائر کی خاک چھانی جغرافیہ کی
تحقیق کے لیے علامہ بشاری نے اٹھائیس برس دنیا کے سفر
میں صرف کیے۔ علم کی خاطر ابو الفرج اصفہانی نے پچاس سال
صرف کر کے اپنی کتاب "الاغانی" تصنیف کی اور علم ادب
میں گراں قدر اضافہ کیا۔

نویں صدی عیسوی میں ابن حائک ہمدانی
نے عرب کا ایک ایسا جغرافیہ تیار کیا جو زمانۂ حال کی تحقیقات
کے مطابق ہے۔ اس میں عرب کے ایک ایک گاؤں اس کی
پیداوار، عمارات، معدنیات، نباتات، حیوانات تجارت
وغیرہ کے حالات تفصیل سے درج ہیں۔ یہ نسخہ ۱۸۸۴ء
میں لیڈن سے شائع ہوا ہے۔ اس کے علاوہ بھی علوم
اسلامی پر بڑی بڑی ضخیم کتابیں لکھیں۔ یورپ میں جو اسلامی
سائنس اور دیگر علوم کی کتابیں شائع ہوئیں اور ان کے
کتب خانوں کا مایہ ناز سرمایہ ہیں، دیکھ کر مسلمانوں کے علمی
ذوق کا اندازہ ہوتا ہے۔ چنانچہ مثال کے طور پر حال کی
تصانیف میں جو کسی تعارف کی محتاج نہیں۔ سر سید کی
"آثار الصنادید" ہے۔ ضرورت اس بات کی ہے کہ اس
کتاب کو سامنے رکھ کر ان عمارات، جن کا اس میں ذکر ہے
نقشے (PLANS) تیار کیے جائیں اور اس کتاب میں شامل
ہوں۔ تاکہ یہ کتاب تاریخ کے علاوہ انجینئرنگ کے نقطۂ نظر
سے مکمل ہو جائے۔ یہ کام محققین تاریخ اور سول انجینئرنگ
مل کر انجام دے سکتے ہیں۔

قرآن و حدیث کے پیش نظر علماء اور مفکرین نے
حصولِ علم کے لیے مندرجہ ذیل پہلوؤں پر زور دیا ہے:۔

۱۔ اعمالِ خیر
۲۔ تہذیب الاخلاق اور
۳۔ نشر العلوم

چنانچہ اس نظریہ کے تحت بلا کسی قید و مذہب و ملت مسلمان
طلباء کے علاوہ یہودی اور نصرانی یورپ اور ایشیا سے
ذوق در ذوق حصولِ علم کے لیے جامعہ قرطبہ کی طرف
رجوع ہوئے۔

مسلمانوں کے زریں دور میں تین اقسام کے
علمی ادارے قائم ہوئے:

۱۔ مکاتب برائے ابتدائی تعلیم
۲۔ مدارس برائے تعلیم ثانوی۔ ان کی نوعیت
موجودہ دور کے اسکول اور کالجوں کی
طرح تھی
۳۔ دار العلوم برائے اعلیٰ تعلیم و تحقیق۔ ان کی
نوعیت موجودہ دور کی یونیورسٹیوں اور اعلیٰ
تعلیمی و تحقیقی مرکزوں کی طرح تھی۔

نصاب عام طور پر دینیات، صرف و نحو، منطق،
زبان، علم لسانیات، فلکیات، علم ہیئت اور علم الهندسہ
وغیرہ پر مشتمل تھا۔

عربوں کا علمی ذوق۔

ریگستان اور صحرا کے رہنے والے بدوؤں کو ملک سے باہر نکل کر پانی سے زیادہ علوم کی تشنگی ہوئی۔ مسٹر ودھنگٹن اپنی کتاب " تاریخ طب " میں عربوں کی ابتدائی فتوحات کا تذکرہ کرتے ہوئے اُن کی علمی طلب و علمی ذوق کو ان الفاظ میں بیان کرتے ہیں۔

"............ ایک بزنطینی بادشاہ کو حیرت ہوئی کہ عرب کے بدو اور فاتح قوم نے علاوہ اور شرائطِ صلح کے ایک شرط یہ بھی رکھی کہ ان کو یونانی کتابوں کی خرید اور جمع کرنے کا مجاز ہو..... بادشاہ کو حیرت تھی کہ DIOSCORIDES کی کتاب مع تشریح تصاویر عرب کے سردار کے لیے سب سے اعلیٰ بیش بہا اور قابل قبول تحفہ ہوسکتی ہے۔ قسطنطنیہ کے فلسفی، مسلمان مصنفین کو دیکھ کر متحیر رہ گئے۔ یہ وہی عرب تھے جن کو انھوں نے نہایت بددلی سے تعریف کرتے ہوئے ان کو عالم و فاضل مگر غیر متمدن کا لقب دیا تھا....."

یہی وہ بدّو تھے جنہوں نے یونانی طب و علوم کی بجھتی ہوئی شمع کو گل ہونے سے بچایا..... پانچ سو سال کے بعد انھیں عربوں نے اس شمع کو پہلے سے بھی زیادہ روشن و درخشاں کرکے یورپ کے حوالے کیا۔

مسلمانوں کی علوم پروری اور علماء نوازی کی بنا پر عرب بیشتر یونانی علوم و فنون سے مستفید ہوئے۔ ان کی تحقیقی جستجو اس درجہ بڑھ گئی کہ جب ان کو یونانی کتابوں کے عربی تراجم سے تشفی نہ ہوئی تو انھوں نے اصل یونانی کتب سے رجوع کیا۔

دوسری قوموں کے علوم حاصل کرنے کے لیے عربوں نے مختلف زبانیں سیکھیں اور ان زبانوں کے لغات و شرح مرتب کیں، چنانچہ آج بھی مختلف زبانوں کے لغات دنیا کے عجائب خانوں کا سرمایہ ہیں۔

علمی ذوق جب اور بڑھا تو عربوں نے قاموس (انسائیکلوپیڈیا) تالیف کیے۔ عربی کا پہلا قاموس وہ کتاب "عیون الاخبار" ابن قطیبہ (۸۲۸ء تا ۸۸۹ء) نے تیار کیا۔ اس کے عنوان طاقت، جنگ، شرافت، سیرت علم، فصاحت، زہد، دوستی، عبادت، خدا، غذا اور صنفِ نازک تھے۔ قرطبہ کے ابن عبدالربیع نے "عقدہ" شائع کی۔ یہ کتاب عیون الاخبار سے زیادہ جامع اور عنوان بھی زیادہ تھے۔ ۹۷۵ء اور ۹۹۰ء کے درمیان خوارزمی نے "مفتاح العلوم" شائع کی۔ یہ قاموس علم قانون فلسفہ، تصوف، صرف و نحو، دفتری کام، شاعری، موسیقی تاریخ، طب، ریاضی، علم هندسہ، علم ہیئت وغیرہ پر مشتمل ہے۔ دسویں صدی عیسوی میں پانچ مصنفوں نے مل کر رسالہ "اخوان الصفا" تالیف کیا۔ یہ باون رسالوں پر مشتمل تھا۔ اس میں ریاضی، جغرافیہ، موسیقی، منطق اخلاقیات، علوم سائنس وغیرہ پر بحث کی۔ ان تمام رسائل کا ایک مکمل ایڈیشن ۸۹-۱۸۸۶ء میں شائع ہوا ہے۔ مصری مورخ النویری نے ۱۲۷۲ء اور ۱۳۳۲ء میں "غایتہ العرب فی فنون الدنیا" شائع کیا۔ یہ ۹۰۰۰ نو ہزار صفحات پر مشتمل تھی۔ اس کے عنوان جغرافیہ ہیئت، موسمیات، علم تاریخ، ارضیات، حیوانیات اور نباتات تھے۔ اس کا مکمل ایڈیشن ۱۹۳۳ء میں شائع ہوا ان کے علاوہ بھی مختلف قاموس سرہندی میں تالیف ہوتے رہے

اسی علمی ذوق اور تجسس علوم کی چند مثالیں ذیل میں درج ہیں۔ مثالوں کی نشان دہی کا مقصد صرف یہ بتانا ہے کہ اقوام مذاہب اور ملکوں کے عروج و زوال میں علم کو کس درجہ دخل ہے۔

۱ علم کے متعلق ڈاکٹر اسپرنگر نے لکھا ہے۔

"مسلمانوں کے اسماء الرجال میں پانچ لاکھ مشہور عالموں کا حال مل سکتا ہے۔ اب اگر یہ قیاس کیا جائے کہ تعلیم یافتہ گروہ کس نسبت سے ایک صاحب کمال پیدا کرتا ہے تو عام تعلیم کا ایک معقول اندازہ ہو سکتا ہے۔"

۲۔ نظام الملک طوسی نے ۱۰۶۷ء میں نظامیہ بغداد کی تعمیر کی۔ مشہور مغربی مورخ گبن نظامیہ بغداد کے متعلق لکھتا ہے۔

"ایک سلطان کے وزیر نے بغداد میں مدرسہ قائم کرنے کے لیے دو لاکھ دینار وقف کیے اور پندرہ ہزار دینار سالانہ اس کے صرف کے لیے مقرر کیے۔ اس ادارہ سے چھ ہزار ہر درجہ کے طلبہ مختلف فنون میں بہرہ اندوز ہوئے......" (دینار قریب پانچ روپیہ کا تھا)

اس مدرسے کے تعلیمی معیار، عظمت اور وسعت کا اندازہ اس بات سے ہوتا ہے کہ شیخ سعدیؒ اور امام غزالیؒ مدرسہ نظامیہ بغداد کے آخری زمانہ کے طالب علم تھے۔

۳۔ صاحب بن عباد کو جب نوح بن منصور نے وزارت کے لیے طلب کیا تو اس نے عذر لکھ بھیجا۔

"مجھ کو ضروری ساز و سامان کو ساتھ لانے میں بڑی زحمت ہوگی اور صرف کتابوں کو لادنے کے لیے چار سو اونٹ درکار ہوں گے۔"

صاحب بن عباد نے علم کو وزارت پر ترجیح دی۔

۴۔ ابو جعفر بن عباس نے جو کتب خانہ قائم کیا اس میں چار لاکھ مجلد کتابیں تھیں۔ اس سے کتب خانہ کی وسعت اور علم دوستی کا اندازہ ہوتا ہے

۵۔ امام ابن جوزی نے اپنے ہاتھ سے دو ہزار جلدیں لکھیں۔ احادیث لکھتے وقت قلموں کا تراشہ جمع کرتے رہتے تھے۔ مرتے وقت وصیت کی کہ غسل میت کا پانی اسی تراشے سے گرم کیا جائے۔ کہتے ہیں کہ پانی گرم کرنے کے بعد کافی تراشہ بچ رہا۔ اندازاً تراشہ کا کل وزن ساٹھ ستر کلو گرام رہا ہوگا۔ اس وزن سے بھی ان کی تصانیف اور تحریروں کا اندازہ لگانا زیادہ قرین قیاس ہے۔

۶۔ زمانہ حال میں مولانا حضرت تھانوی رحمۃ اللہ علیہ کی یومیہ تصانیف کا اوسط چالیس صفحات بتایا جاتا ہے۔ یقین بمشکل ہوتا ہے۔ حالاں کہ یہ حقیقت ثابت ہو چکی ہے۔

۷۔ خود بانی درس گاہ سر سید مرحوم کی تصانیف اس قدر کثیر ہیں کہ یقین نہیں ہوتا، مگر حقیقت پر مبنی ہے

مدارس، دار العلوم و کتب خانے

مدارس۔

دار ارقم۔ مسلمانوں کا سب سے اوّل مدرسہ دار ارقم ہے۔ اس مدرسہ کی نمایاں خصوصیات حسب ذیل ہیں۔

معلم حضور سرور کائنات

تعداد متعلم — چالیس افراد

حیثیت — مدرسہ اور دارالاقامہ

یہ مدرسہ صرف ایک ماہ رہا۔ مدرسہ کے علاوہ یہ اوّل دور کے مسلمانوں کے لیے پناہ گاہ بھی تھی۔ اس کے بعد ہی مسلمان کھلم کھلا اسلام کی نشر و اشاعت کرنے لگے۔

جامعہ صفہ

ہجرت کے بعد مسجد نبوی کی تعمیر کے ساتھ مدینہ منورہ میں مسجد سے ملحق ایک چبوترہ قائم ہوا۔ اس میں حضور سرور کائنات بہ نفس نفیس خود قرآن کا درس دیتے تھے۔ یہ بھی ایک طرح کا مدرسہ اور دارالاقامہ تھا۔ جامعہ صفہ کے فارغ التحصیل حضرات نے اسلام کی نشر و اشاعت میں بہت اہم فرائض انجام دیے۔ ان میں سے چند جلیل القدر اشخاص کے نام حسب ذیل ہیں۔

حضرت اسماء بن حارثہؓ۔ حضرت ابوذر غفاریؓ

حضرت سعد بن ابی وقاصؓ، حضرت بلال بن رباحؓ، حضرت طلحہ بن عمرؓ، حضرت سلمان فارسیؓ، حضرت ابوہریرہؓ

حضرت عبداللہ بن مسعودؓ وغیرہ وغیرہ۔

حضرت ابوہریرہؓ کے ذمہ متعلمین کے طعام کا انتظام تھا۔

دارالحکمہ

خلیفہ ہارون رشید نے ۸۳۰ء میں بغداد میں یہ ادارہ قائم کیا۔ یہ ایک کتب خانہ اور دارالترجمہ تھا۔ کتب خانہ میں، عربی، سنسکرت، فارسی اور یونانی وغیرہ زبانوں کی کتابیں تھیں۔ ایک حصہ میں رصدخانہ تھا۔ ۸۵۰ء میں خلیفہ المامون نے مشہور حساب داں خوارزمی کو دارالحکمہ کا ناظم مقرر کر دیا۔

۱۲۵۸ء میں بغداد کے ساتھ دارالحکمہ بھی برباد ہوا۔ کتابیں نذر آتش اور غرق آب کر دی گئیں۔ مسلمانوں کا علمی سرمایہ نیست و نابود کیا۔ کچھ بچی کچھی مگر کثیر تعداد میں کتابیں آج بھی یورپ میں پائی جاتی ہیں۔ ان نایاب نسخوں میں چمڑے پر حضورؐ کے دادا عبدالمطلب کے ہاتھ کا لکھا ہوا ایک گراں قدر نسخہ بھی تھا جو ضائع ہوا۔

جامعہ نظامیہ بغداد

۱۰۶۷ء میں نظام الملک طوسی نے بغداد میں قائم کیا۔ یہ ایک یونیورسٹی تھی۔ نیشاپور، ہرات، موصل اور اصفہان وغیرہ میں جامعہ نظامیہ کے الحاقی مدارس تھے۔ خود نیشاپور میں قریب ۲۵ حنفی اور شافعی مدارس اور قریب بارہ کتب خانے تھے۔ سلیمان صفوی کے دور میں صرف اصفہان ہی میں اڑتالیس مدارس تھے۔ شیخ سعدیؒ اور امام غزالیؒ اسی جامعہ نظامیہ کے فارغ التحصیل تھے۔

مستنصریہ بغداد

۱۲۳۴ء میں خلیفہ مستنصر نے بغداد میں قائم کیا۔

چھ سال کے عرصہ میں مدرسہ مکمل ہوا۔ مدرسہ کی عمارت نہایت شاندار اور اس زمانہ کے فن تعمیر کا بہترین نمونہ تھی۔ طلباء کا قیام، طعام، کتب وغیرہ سب مفت تھا۔ طلباء کو طعام کے ساتھ شیرینی و فواکہ بھی دی جاتی تھی۔ اس کے علاوہ ایک گنی ماہانہ جیب خرچ دیا جاتا تھا۔ پینے کے پانی کو ٹھنڈا کرنے کا خاص اہتمام تھا۔ مستنصریہ کے قیام کے فوراً ہی بعد قریب دو سو اڑتالیس [۲۴۸] طلباء اقامہ گاہ میں رہتے تھے۔ خلیفہ نے اپنے کتب خانہ سے ایک سو ساٹھ [۱۶۰] اونٹوں پر لاد کر کتابیں مستنصریہ کو عطا کیں۔ اگر ایک اونٹ پر دو سو کتابیں فرض کریں تو کل کتابوں کی تعداد بتیس [۳۲] ہزار ہوتی ہے۔ ان مدارس کے علاوہ نورالدین زنگی اور

سلطان صلاح الدین ایوبی نے بیشمار مکاتب اور مدارس قائم کیے۔ ترکوں کے عہد میں بھی مکاتب و مدارس قایم ہوئے اسپین۔

خلفاء اسپین نے بھی دل کھول کر علوم کو نوازا اور علماء کی بڑی قدر و منزلت کی۔ بڑے بڑے جامعہ مدارس اور کتب خانے قایم کیے۔ ان کی علم دوستی سے یورپ کے لوگ مستفید ہوئے۔ اندلس کی اسلامی درس گاہوں سے یورپ کو علوم کی روشنی ملی۔ یورپ کے طلباء اندلس کی اسلامی درس گاہوں میں فارغ التحصیل ہوئے۔ اپنے ملک واپس جا کر علم و حکمت کو فروغ دیا۔ اگر اہل یورپ کو اندلس کی درس گاہوں سے علم کی روشنی نہ ملی ہوتی تو قیاس یہ ہے کہ وہ آج بھی دنیا کی جاہل ترین قوموں میں شمار کیے جاتے۔

بارھویں صدی عیسوی سے تیرھویں صدی عیسوی تک عرب کی قریب تین سو کتابوں کا ترجمہ لاطینی زبان میں ہوا۔ ان میں زکریا رازی، ابوالقاسم زہراوی، ابن رشد، بوعلی سینا وغیرہ کی تصانیف کا ترجمہ شامل ہے۔ ارسطو، بقراط، جالینوس اور اقلیدس کی کتابوں کا عربی سے لاطینی میں ترجمہ ہوا۔ آج ان عالموں کی تصانیف عربی ہی کی بدولت محفوظ ہیں۔ انیسویں صدی کے شروع میں پیرس، برلن، لنڈن، آکسفورڈ، اٹلی اور اسکوریال (اسپین) وغیرہ کتب خانوں میں عربی زبان کی ڈھائی لاکھ سے زائد مطبوعہ اور مخطوطہ کتابیں موجود تھیں۔

طر نے اپنی تصنیف "تاریخ فلسفہ" میں اسپین کی اسلامی درس گاہوں کے تذکرہ میں لکھا ہے

"مغربی علوم کے اصلی ماخذ عربوں کے وہ مدارس ہیں جو ہسپانیہ میں قایم ہوئے اور یورپ کے ہر ملک کے طلباء ان مدرسوں کی طرف دوڑے تھے اور ان میں جا کر علوم طبیعہ، علوم ریاضیہ اور علوم ماورا الطبعیہ حاصل کرتے تھے۔ اسی طرح جب عربوں نے اٹلی پر قبضہ کیا تو وہ بھی یورپ میں اسلامی علوم کے داخلہ کا سبب بنا۔"

کتب خانے

مکاتیب، مدارس اور دارالعلوم کے کتب خانوں کے علاوہ بہت سے اور کتب خانے دنیائے اسلام میں تھے، ان میں سے صرف چند کی نشان دہی مقصود ہے

۱۔ خالد بن یزید بن معاویہ کا کتب خانہ۔ اسلامی دنیا میں سب سے پہلے کتب خانے کی بنیاد ڈالی
۲۔ دارالحکمہ کا کتب خانہ
۳۔ علامہ وقادی کا کتب خانہ
۴۔ اسپین میں حاکم ثانی کا کتب خانہ
۵۔ سلطان بخارا نوح بن منصور کا کتب خانہ
۶۔ شیراز میں عضدالدولہ کا کتب خانہ
۷۔ سیف الدولہ کا کتب خانہ
۸۔ دور فاطمی میں مصر کا کتب خانہ
۹۔ عراق، شام اور فارس کے کتب خانے وغیرہ وغیرہ۔

استنباط:

۱۔ مسلمانوں کے علم کا مفہوم اور حصول علم کا نظریہ عین قران اور احادیث کے مطابق رہا۔ اس مفہوم کو عملی جامہ پہنانے کی غرض سے علم برائے علم نہ کر برائے حصول دولت، ثروت اور شان و شوکت مسلمانوں کا

معلم نظر رہا۔

۲۔ ضرورت ہے کہ محققین اسلامی فن ساخت اور اصول تعمیر کے اہم لیکن نظر انداز شدہ پہلوؤں کی طرف اپنی گراں قدر توجہ مبذول کریں۔

۳۔ جو کتابیں مغرب میں شایع ہو چکی ہیں اُن کا ترجمہ انگریزی، اردو، فارسی اور دنیا کی دیگر زبانوں میں شایع کرنے کا بندوبست ہو۔ ان قلمی نسخوں اور کتابوں کو کتب خانہ سے نکال کر تعلیم یافتہ طبقہ کے لیے عام ہو۔

۴۔ نایاب قلمی نسخوں کے Micro films بنوا کر دنیا میں مختلف جگہہ محفوظ کریں۔ تاکہ حوادث زمانہ atomic warfare سے کہیں تو محفوظ رہ سکیں اور انسانیت کا یہ سرمایہ بچ سکے۔ یہ کام زیادہ زر طلب بھی نہیں ہے۔

۵۔ چند کتابوں کا اقتباس کتابچوں کی شکل میں عام انسانوں خاص کر طلباء تک پہنچ جائے مثلاً لی بان کی کتاب "تمدن عرب" کا کتابچہ تیار ہو اور اس کو ہمارے نصاب میں شامل کرنے پر غور کریں۔ اس سے یہ فائدہ ہوگا کہ ہمارے نوجوان اپنے ماضی سے واقف ہوں گے۔ مگر اس کا مقصد یہ ہرگز نہیں ہے کہ "پدرم سلطان بود"۔

۶۔ سرسید کی کتاب "آثار الصنادید" میں نقشے شامل کرکے اس کو پایہ تکمیل کو پہنچانے میں کوئی اسکیم بنانا چاہیے۔

بقیہ مضمون "طبی نصاب تعلیم"

متعلقہ صفحہ نمبر ۲۳ کا

گریجویٹ لیول کے نظام تعلیم کی درستی کے ساتھ طبی کالجوں میں طب کے بنیادی مضامین۔ کلیات، معالجات، ادویات اور جراحیات کے پوسٹ گریجویٹ لیول کے شعبے بھی قائم کیے جائیں۔ تاکہ علم طب کی تعلیم کا معیار طبی کالجوں میں بلند ہو اور طب کو فروغ حاصل ہو۔ طبی کالجوں میں نظام تعلیم درست ہوگا اور طب کا معیار بلند ہوگا تو یقین مانیے کہ یہ شکایت باقی نہ رہے گی کہ طبی کالجوں میں پڑھانے کے لیے اچھے اساتذہ اور طبی ریسرچ پروجیکٹس میں کام کرنے کے لیے اچھے طبیب نہیں ملتے ہیں۔

حکیم سید محمد کمال الدین حسین
اجمل خاں طبیہ کالج
اے ایم یو۔

طبّی نصابِ تعلیم

طبّی نصابِ تعلیم کی ترتیب و تدوین کا مسئلہ مدّت سے الجھا ہوا ہے۔ ابتداءً ہر طبّی کالج کے پرنسپل نے اپنے نظریات کے مطابق طبّی تعلیم کے لیے نصاب مرتب فرماکے اس کو اپنے کالج میں جاری فرمایا۔ پھر بدلتے ہوئے دور کے تقاضوں کے مطابق ہر طبّی کالج کے نصابِ تعلیم میں ترمیم و تنسیخ اور تبدیلی کا سلسلہ جاری رہا۔ مختلف طبی کالجوں کے نصاباتِ تعلیم کا مطالعہ کیا جائے تو یہ حقیقت واضح ہو جاتی ہے کہ زمانہ قدیم میں جو نصابات جاری تھے، ان میں طبّی مضامین کا غلبہ تھا اور ڈاکٹری مضامین حسبِ ضرورت شامل کیے گئے تھے۔ اساتذۂ فن نے طبی تعلیم کے لیے حسبِ ذیل مضامین کا ضروری قرار دیا تھا:

(۱) کلیاتِ امورِ طبیعیہ (۲) تشریح (۳) منافع الاعضاء (۴) حفظانِ صحت (۵) کلیاتِ امراض و اسباب و اعراض (۶) ماہیت الامراض (۷) کلیاتِ نبض و بول و براز (۸) کلیاتِ علاج (اصولِ علاج) (۹) کلیاتِ ادویہ (۱۰) مفردات (۱۱) دواشناسی و دواسازی (صیدلہ) (۱۲) مرکبات (۱۳) معالجات (امراضِ انسانی کی ماہیت) (۱۴) نوزائیدہ (۱۵) امراضِ اطفال (۱۶) [illegible] و مطب (۱۸) طبِ قانونی و علم السموم (۱۹) علم الجراحت (۲۰) تشخیص عملی (۲۱) تاریخِ طب۔

لیکن جوں جوں ہندوستان میں ڈاکٹری کو فروغ حاصل ہوا۔ طبی نصابِ تعلیم میں ڈاکٹری مضامین کا اضافہ ہوا اور ڈاکٹری اصول کے مطابق طبی مضامین کے عناوین میں بھی تبدیلی کی گئی۔ طبّی نصاب تعلیم میں طبّی اور ڈاکٹری مضامین کے الحاق کا نتیجہ یہ برآمد ہوا کہ طبی کالجوں میں ڈاکٹری مضامین کی مانگ بڑھی جس کے نتیجے میں ڈاکٹری مضامین طبی نصاب تعلیم میں بڑھتے رہے حتیٰ کہ طبی کالجوں کے نصاب تعلیم میں جملہ ڈاکٹری مضامین کم و بیش شامل کر دیے گئے اور طبّی نصاب تعلیم میں ڈاکٹری مضامین کا غلبہ ہوا۔ پھر یہ مانگ ہوئی کہ ڈاکٹری مضامین کی تعلیم کے لیے طبی کالجوں میں وہ جملہ سہولتیں مہیّا کی جائیں جو میڈیکل کالجوں کو مہیّا کی جاتی ہیں۔ چنانچہ بعض طبی کالجوں میں ڈاکٹروں کی تعداد حکیموں سے زیادہ ہو گئی۔ اور پھر طبی کالجوں کے اس جدید ماحول میں طبّی کالجوں کے سند یافتہ حکیم بھی حکیم کے بجائے اپنے کو ڈاکٹر کہنے اور لکھنے لگے۔ اس طرح طبّی کالجوں میں طب دب کر اور گھٹ کر رہ گئی اور طبی کالجوں کے طلبا بھی طب سے دل برداشتہ ہو کر ڈاکٹری کی جانب توجہ زیادہ دینے لگے اور حکیم بننے کے بجائے ڈاکٹر بننے لگے اور تعلیم سے فارغ ہو کر طبّی پریکٹس کے بجائے ڈاکٹری پریکٹس اختیار کرنے لگے۔

طبی کالجوں میں طب کا یہ زوال دیکھ کر طالبانِ طب
سے نہ رہا گیا اور انھوں نے آل انڈیا یونانی طبی کانفرنس کے
ذریعہ صدائے احتجاج بلند کی۔ جس کے نتیجہ میں گورنمنٹ آف
انڈیا نے طب کے تحفظ کے لیے سینٹرل کونسل آف میڈیسن قائم
کی۔ اسی کونسل نے طبی کالجوں کے نصاب تعلیم کا بھی جائزہ لیا
اور یہ طے کیا کہ جملہ طبیہ کالجوں کے لیے نصابِ تعلیم ایک اور یکساں ہونا
چاہیے۔ نیز یہ نصابِ تعلیم ایسا ہونا چاہیے کہ جس کو پڑھنے
کے بعد طلباء ڈاکٹر نہ بنیں اور ڈاکٹری پریکٹس نہ کریں۔
اس فیصلہ کے مطابق کونسل نے ایک جدید نصابِ تعلیم مرتب
کیا اور اس کو جملہ طبیہ کالجوں میں نافذ کیا۔ اس نصابِ تعلیم
پر جب غور کیا گیا تو واضح ہوا کہ اس نصاب میں بھی ڈاکٹری
مضامین موجود ہیں۔ صرف ان کو اردو زبان اور فارسی و
عربی اصطلاحات کے جامے ملبوس کر کے شامل نصاب کیا گیا
ہے۔ پھر نصابی کتب کی فہرست میں جملہ ڈاکٹری نصابی کتابیں
شامل کی گئی ہیں۔ علاوہ ازیں طبی مضامین کے ساتھ ڈاکٹری
مضامین مکمل طور پر شامل کر دیے گئے ہیں مثلاً کلیاتِ
امراض و اسباب و اعراض کے ساتھ پیتھالوجی کا مکمل نصاب
شامل کیا گیا ہے۔ جب کہ ان دونوں مضامین کا طریق تعلیم علمی
و عملی دونوں اعتبارات سے مختلف ہے۔ پس ان دونوں
مضامین کو یکجا تعلیم دینا خصوصاً ایسی صورت میں جب کہ
ان دونوں مضامین کے لیے اساتذہ مختلف ہوں دشوار
بلکہ محال ہوگا اور طلبہ کو بھی بیک وقت ان دونوں مضامین
کا سمجھنا دشوار ہوگا۔ بلکہ عین ممکن ہے کہ یہ دونوں مضامین
مرکب ہو کر خلط مبحث کا شکار ہو جائیں۔ لہذا ان دونوں مضامین
کی آمیزش نصابِ تعلیم میں کی گئی ہے مناسب نہیں ہے۔ کلیات
امراض و اسباب و اعراض اور پیتھالوجی کو ایک دوسرے
سے جدا ہی رکھنا مناسب ہے۔ تاکہ کلیات، کلیات کے طرز پر
پڑھائی جاسکے اور پیتھالوجی، پیتھالوجی کے طریقہ پر پڑھائی
جائے اور طلباء بھی ان دونوں مضامین کو صحیح طور پر
سمجھ سکیں۔ پھر ایک دشواری یہ بھی ہے کہ کلیات اور
پیتھالوجی سے مرکب کوئی کتاب ہنوز تصنیف نہیں کی گئی
ہے۔ اس بنا پر بھی ان دونوں مضامین کو الگ الگ کتابوں
سے پڑھنا اور پڑھانا ضروری ہے اور اگر آئندہ کوئی کتاب
کلیات و پیتھالوجی سے مرکب تصنیف کر بھی دی جائے تو
وہ نہ صرف یہ کہ کافی نہ ہوگی بلکہ بعید از فہم بھی ہوگی۔
اس لیے کہ یہ دو جداگانہ مضامین ہیں کہ جن پر جداگانہ
طور سے سیکڑوں کتابیں تصنیف کی جاچکی ہیں۔

موجودہ نصابِ تعلیم میں ڈاکٹری اصول
کے مطابق طبی موضوعات میں بھی ترمیم کی گئی ہے۔ بعض طبی
مضامین کے نام ہی تبدیل کر دیے گئے ہیں۔ مثلاً کلیات
امور طبیعیہ کو صرف امور طبیعیہ لکھا گیا ہے۔ اس تبدیل
شدہ عنوان سے مغالطہ پیدا ہونا ضروری ہے کہ اس عنوان
کے تحت امور طبیعیہ سے متعلق کلیات کی تعلیم دینا مقصود
ہے یا کلیات و جزئیات دونوں کی تعلیم دینا مقصود ہے
اگر کلیات کی تعلیم ہی دینا مقصود ہے تو اس مضمون کا
نام حکمائے قدیم نے کلیات امور طبیعیہ رکھا تھا اور اگر کلیات
و جزئیات دونوں کی تعلیم دینا مقصود ہے تو امور طبیعیہ پر
کوئی اس قسم کی کتاب تصنیف نہیں کی گئی جو کلیات و
جزئیات دونوں پر حاوی ہو۔ لہذا مناسب یہی ہے کہ
نصابِ تعلیم میں اس مضمون کا صحیح نام کلیات امور طبیعیہ
قائم و برقرار رکھا جائے۔ تاکہ امور طبیعیہ سے متعلق کلیات
کی تعلیم میں کوئی خلل پیدا نہ ہو۔

علاوہ ازیں کونسل کے جاری کردہ نصاب
تعلیم میں طب کے بعض مضامین کو یکجا کر کے ایک عنوان

سے مضمون کیا گیا ہے۔ مثلاً قدیم طبی نصاب تعلیم میں کلیات امراض و اسباب و اعراض تھا جسے تبدیل کر کے علم الامراض کے نام سے موسوم کیا گیا ہے جو طبی اعتبار سے صحیح نہیں ہے۔ اس لیے کہ اس مضمون کے تحت امراض و اسباب و اعراض سے متعلق کلیات مقصود تھے اور امراض کی تعلیم سے متعلق مضمون معالجات شامل نصاب تھا کہ جس کے تحت جملہ امراض انسانی کی تعلیم مقصود تھی۔ اس مضمون کے نام کی تبدیلی سے بھی یہ مغالطہ پیدا ہوگا کہ اس کے تحت کلیات کی تعلیم مقصود ہے یا کلیات و جزئیات دونوں کی تعلیم مقصود ہے تو اس موضوع پر بھی کوئی کتاب ایسی تصنیف نہیں کی گئی جو کلیات و جزئیات دونوں پر حاوی ہو۔

اسی طرح کلیات طب سے متعلق دو دیگر مضامین "کلیات نبض و بول و براز" اور "کلیات علاج" کو ایک جدید موضوع "سریریات" کے تحت شامل کیا گیا ہے اور یہ وہ موضوع ہے جو نہ کسی قدیم طبی نصاب تعلیم میں موجود ہے اور نہ کسی مستند طبی کتاب میں شامل ہے۔ پس ایسا موضوع جو کلیات طب کی صحیح ترجمانی نہ کر سکے، کلیات سے متعلق مضامین کے لیے قطعی نامناسب ہے۔ پس بہتر اور مناسب یہی ہے کہ طبی مضامین کے جو نام حکمائے قدیم نے اپنی مستند کتابوں میں درج کیے ہیں ان کو قائم رکھا جائے اس لیے کہ وہ بڑی حکمتوں پر مبنی ہیں۔

کلیات، طب کا ایک بنیادی شعبہ ہے جو کلیات امور طبیعیہ، کلیات اسباب و امراض و اعراض، کلیات نبض و بول و براز، کلیات علاج اور کلیات ادویہ اور کلیات حفظ صحت پر مشتمل ہے اور ان مضامین پر حکماء نے سیکڑوں کتابیں تصنیف و تالیف کی ہیں۔ لہذا اس شعبہ پر طبع آزمائی کر کے اس شعبہ کی اصلی اور حقیقی شکل و صورت کو مسخ نہ کیا جائے تو بہتر ہے۔ اس کے موضوعات کو تبدیل کر دینے سے اس میں بڑا خلل پیدا ہوگا اور جب شعبہ کلیات ہی میں خلل پیدا ہو تو طب کی پوری عمارت خلل کا شکار ہوگی۔

طبی نصاب تعلیم ہی وہ بنیاد ہے کہ جس پر علم طب کی صحیح تعمیر ممکن ہے۔ طبی نصاب تعلیم ایسا ہونا چاہیے جو نہایت جامع ہو اور طبی موضوعات کی ترجمانی صحیح طور سے کرتا ہو اور طب کے حقیقی خد و خال کا محافظ ہو اور اس کی جامعیت کا یہ انداز ہو کہ جدید حقائق کو اپنے باطن میں جذب کیے ہوئے ہو مگر طبی زبان اور طبی مصطلحات کے جامہ میں جسے دیکھ کر ہر اہل فن سمجھ لے کہ یہ ایک علم طب کا جامع نصاب تعلیم ہے۔ وہ کونسی طبی حقیقت ہے جو ہماری قدیم طبی تصانیف میں بیان نہیں کی گئی ہے اور جب ایسا ہے تو پھر طب کی تعلیم کے لیے ہم ڈاکٹری مضامین کو طبی مضامین میں کیوں شامل کریں۔ اگر طبی کالجوں میں ڈاکٹری مضامین کی مکمل تعلیم ضروری ہے تو ایسی صورت میں ان کو طبی مضامین سے الگ ہی پڑھایا جائے۔ طبی اور ڈاکٹری مضامین کی آمیزش دونوں مضامین کے لیے مضر ثابت ہوگی۔ اس طرح بیک وقت کسی ایک مضمون کو مکمل طور پر نہ سمجھایا جا سکے گا جس سے تعلیم میں خلل پیدا ہوگا۔

دور حاضر میں جس طرح ڈاکٹری مضامین کی تعلیم و تدریس کے لیے انگریزی زبان لاطینی اور یونانی اصطلاحات کے ساتھ استعمال کی جاتی ہے۔ اس طرح علم طب کی تعلیم و تدریس کے لیے ہندوستان میں اردو زبان فارسی و عربی اصطلاحات کے ساتھ استعمال کی جا سکتی ہے۔ صدیوں کی جانفشانی سے طب یونانی کا سرمایہ اردو زبان میں فارسی و عربی اصطلاحات کے ساتھ منتقل ہوا ہے۔ لہذا زبان اردو ہی بجا طور سے اس علم کی تعلیم کی سزاوار صحیح طور سے

ہوسکتی ہے۔ انگریزی یا کسی دیگر زبان میں طب کی تعلیم و
تدریس اس وقت تک محال ہے جب تک کہ طب کا تمام تر
سرمایہ اس زبان میں منتقل نہ کر دیا جائے۔

جدید انداز پر طبی کتب کی تصنیف و
تالیف بھی زبان اردو میں فارسی و عربی اصطلاحات کے
ساتھ طبی نصاب تعلیم کے مطابق نہایت ضروری ہے اس لیے
کہ کوئی نصاب تعلیم اس وقت تک کامیاب نہیں ہو سکتا
جب تک کہ اس کے مقصد کو پورا کرنے والی جامع اور مفید
کتب ہر موضوع سے متعلق موجود نہ ہوں۔ ترقی اردو
بورڈ منسٹری آف ایجوکیشن اینڈ کلچر نے چند طبی کتابیں
بھی اردو میں شائع کی ہیں۔ اور اردو اکیڈمی نے بھی
مصنفین کو طبی کتابوں کی اشاعت کے لیے جزوی امداد سے نوازا
ہے لیکن منسٹری آف ہیلتھ کی جانب سے طبیب مصنفین کی امداد
کے لیے کوئی مناسب منصوبہ عمل میں نہیں آیا ہے جس سے طبی مصنفین
کی دل شکنی ہوتی ہے۔ علم طب سے متعلق لٹریری ریسرچ پروجیکٹس
کے علاوہ طبی موضوعات پر معیاری کتابیں تالیف و تصنیف کرنے
والے اساتذہ کی معاونت کے لیے بھی کوئی منصوبہ ہونا چاہیے
تاکہ وہ نصاب تعلیم کے مطابق بہتر سے بہتر کتابیں تصنیف کر کے
شائع کر سکیں اور ان کے دل کی آرزوئیں اور تمنائیں دل ہی
دل میں نہ رہ جائیں۔

موجودہ نصاب تعلیم میں طبی مضامین کی تعداد
کم کرنے کی کوشش بھی کی گئی ہے۔ مثلاً کلیات نبض و بول
و براز اور کلیات علاج جو طب کے دو مستقل جداگانہ مضامین
تھے ان کو باہم ملا کر ایک مضمون یعنی سریریات بنا دیا گیا ہے
جبکہ قدیم نصاب تعلیم میں تشخیص علی کا مضمون کلیات کے
ان دونوں مضامین سے الگ مقرر کیا گیا تھا۔ پھر ان
دونوں مضامین کے الگ الگ تحریری، عملی اور تقریری
امتحانات کے بجائے سریریات کا صرف ایک عملی اور ایک علمی
امتحان مقرر کیا گیا ہے اور اسی طرح معالجات کے امتحانات
میں کمی کر دی گئی ہے۔ یہ اسکیم بھی طب کے حق میں سراسر مضر
ہے۔ اس لیے کہ طلبا کی توجہ کسی مضمون کی جانب اسی وقت
بڑھتی ہے جبکہ نصاب تعلیم میں اس مضمون کی شاخیں وسیع
ہوں اور ہر شاخ کا امتحان علمی، عملی اور تقریری مقرر ہو۔
نیز بعض طبی مضامین کا علمی امتحان مقرر کیا گیا ہے اور اس
مضمون کے عملی اور تقریری امتحانات کو حذف کر دیا گیا ہے
مثلاً علم طب کا ایک اہم ترین بنیادی مضمون "کلیات امور
طبیعیہ" کہ نصاب تعلیم میں اس کا صرف علمی امتحان مقرر کیا گیا
اور اس کے عملی و تقریری امتحانات حذف کر دیے گئے
جب کہ اس مضمون کے علمی امتحان کے ساتھ ہر طبی کالج میں عملی
اور تقریری امتحانات ماضی میں جاری رہے ہیں۔ سمجھ میں نہیں آتا کہ
موجودہ سائنٹفک دور میں جب کہ ہر قسم کی سہولتیں حاصل
ہیں، کلیات امور طبیعیہ کا عملی و تقریری امتحان مقرر کرنے
میں کیا دشواری ہے۔ درحقیقت موجودہ نصاب تعلیم میں
طبی مضامین کے موضوعات و امتحانات میں تخفیف کا جذبہ
کارفرما ہے۔ طبی کالجوں سے طبیب پیدا کرنا ہے تو نصاب
تعلیم میں طبی مضامین کو پھیلانا اور علمی و عملی اعتبارات سے
مختلف شاخوں میں تقسیم کرنا اور ہر شاخ سے متعلق علمی،
عملی اور تقریری امتحانات کا مقرر کرنا ضروری ہے۔

پھر طبی کالجوں میں جو تعلیمی خامیاں ہیں، وہ حقیقت
یہ ہے کہ اسی وقت دور ہو سکتی ہیں جب کہ سینٹرل کونسل
آف انڈین میڈیسن کی سفارشات کے مطابق طبی کالجوں میں
ہر طبی مضمون کے معیاری ڈپارٹمنٹ قائم کیے جائیں جب تک
کہ ایسا نہ ہوگا طبی کالجوں میں طب کی تعلیم کا نظام درست
نہ ہو پائے گا اور طب کی تعلیم ناقص و ناتمام ہی رہے گی۔

باقی صفحہ نمبر ۱۹ پر

فرخ جلالی
شعبۂ تاریخ، اے ایم یو

آزادی رائے، سرسید اور انگریز

افکار اور عمل میں مطابقت قائم رکھنا بڑے اشخاص کا طرز رہا ہے۔ عظیم مقاصد کو حاصل کرنے کے لیے یہ ضروری بھی ہوتا ہے۔ سرسید نے اس راہ میں قدم رکھا اور نبھانے کی غیر معمولی کوشش کی۔ اسی میں ان کی عظمت کا راز پنہاں ہے۔

یہ محض اتفاق نہیں کہ سرسید نے آزادیٔ رائے کی خوبی اور خوشامد کی مذمت کے سلسلہ میں مضامین لکھے۔

سرسید کے متعلق عام خیال یہ ہے کہ انھوں نے انگریزوں کو خوش رکھنے کے لیے بہت جتن کیے۔ سرسید نے تعلیم سیاست اور معاشرت کے مختلف معاملات اور نظریات میں انگریزوں سے اختلاف کیا[1]۔ اس سلسلہ میں ان پر سختیاں بھی کی گئیں۔

۱۸۵۷ء سے قبل یورپی انگریز پادریوں اور مسلم علماء و دانشوروں کے درمیان مناظرے شروع ہو گئے مولوی رحمت اللہ کیرانوی اور مولوی آل حسن موہانی اور دوسرے علماء نے اس موضوع پر بہت کچھ لکھا۔ انیسویں صدی کی ابتداء سے لے کر وسط صدی تک یورپ میں ایک تحریک چلی کہ ایشیا اور یورپ میں تبدیلیٔ مذہب سے مسائل حل ہو سکتے ہیں۔ یورپ میں یہودیوں کو راضی کرنے کی کوشش کی گئی۔ ایشیا میں بھی یہ کوشش کی گئی کہ مسلم اور غیر مسلم اس تحریک سے متاثر ہو جائیں

صوبہ ممالک مغربی وشمالی (اترپردیش) کے لفٹنٹ گورنر جیمس تھامسن اور ولیم میور اس تحریک کے خاص حامیوں میں سے تھے۔

۱۸۴۰ء سے ۱۸۶۲ء تک سرسید زیادہ تر ہندوستانی تاریخ پر کتابیں لکھنے اور مرتب کرنے میں مصروف رہے۔ ۱۸۵۷ء کے ہنگامہ اور خاک وطن نے چالیس برس کی عمر میں ان کو سفید ریش کر دیا۔ اب مذہب تعلیم اور معاشرت ان کے فکری اور علمی نشانے تھے۔ یہ راہ کٹھن اور منزل دور تھی۔ سرسید تمام عمر مایوسی سے متنفر اور امید کے پرستار رہے۔ سرسید ایک طرف تو مغرب کی سائنس اور صنعت سے متاثر تھے۔ دوسری طرف یورپ کی غیر واضح مذہبیت پر متحیر تھے۔

اس بحث بحران کی ایک معرکۃ الآرا کتاب تبیین الکلام فی تفسیر التوراۃ والانجیل علی ملۃ

---

[1] ملاحظہ ہو راقم کا مضمون "سرسید کی انگریز دشمنی"۔ روزنامہ "دعوت"۔ علی گڑھ مسلم یونیورسٹی نمبر ۱۹۷۲ء

ملّتِ الاسلام ہے جس کا پہلا حصہ ۱۸۶۲ء میں اور دوسرا حصہ ۱۸۶۵ء میں شایع ہوا اور آخری حصہ بائیس برس کے بعد شایع ہوا۔ یہ کتاب اردو اور انگریزی دونوں زبانوں میں شایع ہوئی۔ اس کتاب میں سرسید نے کھل کر قدیم کتب سماوی (توریت، زبور اور انجیل) اور صحف سماوی کے بارے میں اسلامی عقاید کا نقطۂ نظر پیش کیا۔ وحی کی ضرورت اور دین کی اہمیت کو واضح کیا۔ اس کتاب کا قابل ذکر وہ حصہ ہے جہاں انھوں نے انجیل کے مختلف نسخوں کا ذکر کیا ہے اور عیسائی علماء کے درمیان جو مباحث تھے، ان کو پیش کیا۔

یورپ نے حسب معمول اس کتاب سے بے اعتنائی برتی اور ہندوستان کے پادریوں نے ناراضی ظاہر کی۔ حالانکہ یہ کتاب انگریزی میں بھی طبع ہوئی تھی۔ مگر حکومت کے زیر اثر افراد نے اس کی عام اشاعت نہ ہونے دی۔ علماء نے سرسید کی اس کتاب کے جواب نہیں لکھے۔ اس کتاب کی تصنیف کے بعد سرسید نے ایک کتاب 'احکام طعام اہل کتاب' ۱۸۶۸ء میں تحریر کی۔ اس کتاب کے جواب چند غیر معروف علماء نے دیے۔ جن کو طبقۂ علما میں کوئی خاص امتیاز حاصل تھا

اسی زمانہ میں انگریزی داں طبقہ میں یوپی کے گورنر ولیم میور کی کتاب 'لائف آف محمد' کا چرچا تھا۔ یہ مغرب کی پرانی تحریک کا نیا حربہ تھا۔ اس دوران (۱۸۶۹ء) میں سید محمود کو انگلستان میں پڑھنے کا ایک وظیفہ ملا اور سرسید بھی طویل رخصت پر سید محمود کے ساتھ انگلستان گئے۔ اور وہاں انھوں نے ولیم میور کی غیر تحقیقی اور دل آزار کتاب 'لائف آف محمد' کا نہایت محققانہ جواب لکھا جس کا نام انھوں نے الخطبات الاحمدیہ فی العرب والسیرۃ المحمدیہ رکھا۔ اس کتاب کا انگریزی میں بھی ترجمہ کیا اور لندن سے ۱۸۷۰ء میں شایع کر دیا۔ اس کتاب کی اشاعت کی غرض سے سرسید نے اپنی جائیداد اور املاک کا معقول حصہ فروخت کر دیا۔ ایک عجیب بات یہ ہے کہ ہندوستان کے علماء کی طرف سے خطبات احمدیہ کا کوئی جواب شایع نہیں ہوا۔ حالاں کہ سرسید کی ہر تحریر پر گرفت جاری تھی۔ شاید اس کی وجہ یہ تھی کہ علماء مدت سے سیر و تاریخ کے کوچہ کو چھوڑ چکے تھے۔

لندن کے دوران قیام میں سرسید نے ہندوستان کے سرکاری نظام تعلیم پر ایک نوٹ بھی بطور پمفلٹ شایع کیا[1] ولیم میور اپنی کتاب کا جواب دیکھ کر بہت خفا ہوا۔ سرسید جب لندن سے لوٹ کر واپس آئے تو اس پمفلٹ کی وجہ سے ولیم میور نے سرسید سے باز پرس کی۔ سرسید سرکاری ملازم تھے اس ناراضگی کا انھوں نے مقابلہ کیا (انگلستان کا نیا تعلیم یافتہ طبقہ جو آزاد ذہن رکھتا تھا اور سول سروس میں تھا سرسید کا ہم نوا تھا)۔

۱۸۷۲ء میں ولیم ہنٹر نے "ہمارے ہندوستانی مسلمان" نامی کتاب شایع کی۔ سرسید نے اس کا سخت جواب دیا۔

ادھر سرسید نے اپنے رسالہ "تہذیب الاخلاق" (دور اول ۱۸۷۰ء تا ۱۸۷۶ء) میں قدیم کتب سماوی پر محققانہ مضامین اپنے قلم سے اور دوسرے دانشمندوں کے شایع کیے۔ یہ سلسلہ تہذیب الاخلاق کے دوسرے اور آخری دور تک چلتا رہا۔ ایک موقع پر انھوں نے حضرت ابراہیمؑ سے متعلق ایک مضمون شایع کیا۔ جس میں عہد عباسیہ

باقی صفحہ نمبر ۲۷ پر

[1] ملاحظہ ہو۔ Syed Ahmad Khan - Strictures upon the Present Educational System in India. London Henry S King 1869

سید احمدؒ

مولانا محمد قاسم نانوتویؒ

[علی گڑھ انسٹی ٹیوٹ گزٹ مورخہ ۲۰ اپریل ۱۸۸۰ء]

افسوس ہے کہ جناب ممدوح حضرت مولانا محمد قاسم نانوتویؒ نے ۱۵ اپریل ۱۸۸۰ء کو ضیق النفس کی بیماری میں بمقام دیوبند انتقال فرمایا۔ زمانہ بہتوں کو رو رہا ہے اور آئندہ بھی بہتوں کو روئے گا۔ لیکن ایسے شخص کے لیے رونا جس کے بعد اس کا کوئی جانشین نظر نہ آوے نہایت رنج و غم اور افسوس کا باعث ہوتا ہے۔ ایک زمانہ تھا کہ دلی کے علماء میں سے بعض لوگ جیسے کہ اپنے علم و فضل اور تقویٰ اور ورع میں معروف و مشہور تھے، ایسے ہی نیک مزاجی اور سادہ وضعی اور مسکینی میں بے مثل تھے۔ لوگوں کا خیال تھا کہ بعد جناب مولوی اسحاقؒ کے کوئی شخص ان کی مثل ان تمام صفات میں پیدا ہونے والا نہیں ہے۔ مگر مولوی محمد قاسم مرحوم نے اپنی کمال نیکی اور دین داری اور تقویٰ اور ورع اور مسکینی سے ثابت کر دیا کہ اس دلی کی تعلیم و تربیت کی بدولت مولوی محمد اسحاق صاحب کی مثل ایک اور شخص کو بھی خدا نے پیدا کیا ہے۔ بلکہ چند باتوں میں ان سے زیادہ ہے۔

ابھی بہت سے لوگ زندہ ہیں جنھوں نے مولوی محمد قاسم صاحب کو نہایت کم عمری میں دلی میں تعلیم پاتے دیکھا ہے۔ انھوں نے جناب مولوی مملوک علی صاحب سے تمام کتابیں پڑھی تھیں۔ ابتدا ہی سے آثار تقویٰ اور ورع اور نیک بختی اور خدا پرستی کے ان کے اوضاع و اطوار سے نمایاں تھے اور یہ شعر ان کے حق میں بالکل صادق تھا۔

بالائے سرش زہوش مندی
می تافت ستارۂ بلندی

زمانہ تحصیل علم میں جیسے کہ وہ ذہانت اور عالی دماغی اور فہم و فراست میں معروف و مشہور تھے، ویسے ہی نیکی اور خدا پرستی میں بھی زبان زد اہل فضل و کمال تھے۔ ان کو جناب مولوی مظفر حسین صاحب کاندھلوی کی صحبت نے اتباع سنت پر بہت زیادہ راغب کر دیا تھا۔ اور حاجی امداد اللہ رحمۃ اللہ علیہ کے فیض صحبت نے ان کے دل کو ایک نہایت عالی رتبہ کا دل بنا دیا تھا۔ خود بھی پابند شریعت تھے اور دوسرے لوگوں کو بھی پابند سنت و شریعت کرنے میں زائد از حد کوشش کرتے تھے۔ باایں ہمہ عام مسلمانوں کی بھلائی کا ان کو خیال تھا ان ہی کی کوشش سے علوم دینیہ کی تعلیم کے لیے نہایت مفید مدرسہ دیوبند میں قائم ہوا۔ اور ایک نہایت عمدہ مسجد بنائی گئی۔ علاوہ اس کے اور چند مقامات میں بھی ان کی سعی اور کوشش سے مسلمانی مدرسے قایم ہوئے۔ وہ کچھ خواہش پیر و مرشد بننے کی نہیں کرتے تھے۔ لیکن ہندوستان میں اور خصوصاً اضلاع شمال و مغرب میں ہزارہا آدمی ان کے معتقد تھے اور ان کو اپنا پیشوا و مقتدا

جانتے تھے۔

مسائلِ خلافیہ میں بعض لوگ اُن سے ناراض تھے اور بعضوں سے وہ ناراض تھے۔ مگر جہاں تک ہماری سمجھ ہے ہم مولوی محمد قاسم مرحوم کے کسی فعل کو خواہ کسی سے ناراضی کا ہو خواہ کسی سے خوشی کا ہو۔ کسی طرح ہوائے نفس یا ضد یا عداوت پر محمول نہیں کر سکتے۔ ان کے تمام کام اور افعال جس قدر کرتے تھے بلاشبہ للّٰہیت اور ثوابِ آخرت کی نظر سے تھے اور جس بات کو وہ حق اور سچ سمجھتے تھے، اس کی پیروی کرتے تھے۔ ان کا کسی سے ناراض ہونا صرف خدا کے لیے تھا اور کسی سے خوش ہونا بھی صرف خدا کے واسطے تھا۔ کسی شخص کو مولوی محمد قاسم صاحب اپنے ذاتی تعلقات کے سبب اچھا یا بُرا نہیں جانتے تھے۔ مسئلہ حب للّٰہ اور بغض للّٰہ خاص ان کے برتاؤ میں تھا۔ ان کی تمام خصلتیں فرشتوں کی سی خصلتیں تھیں۔ ہم اپنے دل سے ان کے ساتھ محبت رکھتے تھے۔ اور ایسا شخص جس نے ایسی نیکی سے اپنی زندگی بسر کی ہو، بلاشبہ نہایت محبت کے لائق ہے۔

اس زمانہ میں سب لوگ تسلیم کرتے ہوں گے کہ مولوی محمد قاسمؒ اس دنیا میں بے مثل تھے۔ ان کا پایہ اس زمانہ میں شاید معلوماتی علم میں شاہ عبدالعزیزؒ سے کچھ کم ہو، الّا اور تمام باتوں میں اُن سے بڑھ کر تھا۔ مسکینی نیکی اور سادہ مزاجی میں اگر ان کا پایہ مولوی اسحاق سے بڑھ کر نہ تھا تو کم بھی نہ تھا۔ وہ درحقیقت فرشتہ سیرت اور ملکوتی خصلت کے شخص تھے اور ایسے آدمی کے وجود سے زمانہ کا خالی ہو جانا ان لوگوں کے لیے جو ان کے بعد زندہ ہیں نہایت رنج اور افسوس کا باعث ہے۔

افسوس ہے کہ ہماری قوم بہ نسبت اس کے کہ عملی طور پر کوئی کام کرے زبانی عقیدت اور ارادت بہت زیادہ ظاہر کرتی ہے۔ ہماری قوم کے لوگوں کا یہ کام نہیں ہے کہ ایسے شخص کے دنیا سے اُٹھ جانے کے بعد صرف چند کلمے حسرت اور افسوس کے کہہ کر خاموش ہو جائیں۔ یا چند آنسو آنکھ سے بہا کر اور رومال سے پونچھ کر چہرہ صاف کر لیں۔ بلکہ ان کا فرض ہے کہ ایسے شخص کی یادگار کو قائم رکھیں۔

دیوبند کا مدرسہ اُن کی ایک نہایت عمدہ یادگار ہے اور سب لوگوں کا فرض ہے کہ ایسی کوشش کریں کہ وہ مدرسہ ہمیشہ قائم اور مستقل رہے اور اس کے ذریعے سے تمام قوم کے دل پر اُن کی یادگاری کا نقش جما رہے۔

بقیہ مضمون "آزادیٔ رائے اور سرسیّد"

متعلقہ صفحہ نمبر ۲۷ کا

کے مشہور عالم ابن اسحٰق کندی کے نظریات کی رد پر قرآن کریم کا نقطۂ نظر پیش کیا۔

سرسیّد کی آخری عمر میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی ازواجِ مطہرات کے بارے میں ایک مصنف نے بہت دل آزار کتاب شائع کی۔ سرسیّد نے ۱۸۹۸ء میں اس کا جواب لکھا۔ جو ان کی وفات کا سال ہے۔

یہ سب باتیں انگریزوں اور حکومت کو ناراض کرنے والی تھیں۔ لیکن سرسیّد نے اس کی پرواہ نہ کی اور سچائی پر مبنی اپنا نقطۂ نظر پیش کیا ــــ یہ سرسیّد کی حق گوئی اور بے خوفی کی زندہ مثالیں ہیں ــــ

سید شمیم شاہ

مسلمانوں کا کل ہند معاشی سروے

جیساکہ آپ کے علم میں ہے، ہمدرد ایجوکیشن سوسائٹی کا قیام جناب حکیم عبدالحمید صاحب کی سرپرستی میں اپریل ۱۹۸۱ء میں عمل میں آیا تھا۔ اور ڈیڑھ سال کے اس مختصر عرصے میں سوسائٹی ملک گیر سطح پر مسلم زیرانتظام اسکولوں اور کالجوں کا سروے مکمل کرچکی ہے۔ اس سروے میں تقریباً ... مسلم اسکولوں و انٹر کالجوں اور .. ڈگری کالجوں کا احاطہ کیا گیا تھا۔ اس سروے کی عبوری رپورٹ تیار ہوچکی ہے اور تفصیلی رپورٹ، اب کمپیوٹر کے مراحل سے گزر کر بہت جلد تیار ہونے والی ہے۔

سوسائٹی نے دوسرا اہم کام عربی و دینی مدارس اور درس گاہوں کے سروے کا شروع کر رکھا ہے اس سلسلہ میں ہمیں اب تک دینی مدارس کے قریب تین ہزار خطوط موصول ہوچکے ہیں اور ۳۵۰ سوالنامے بھی بھر کر آگئے ہیں۔ لیکن سوالنامے بھیجنے اور وصول ہونے کا یہ معقول تناسب نہیں ہے۔ اس لیے سوالناموں کی وصولیابی کی آخری تاریخ ۱۲ر اکتوبر سے بڑھاکر ۳۱ر دسمبر ۸۲ء کر دی گئی ہے اور اخبارات کے ذریعہ یہ اعلان کرایا جاچکا ہے کہ جن عربی مدارس نے یہ سوالنامے ابھی تک نہ منگائے ہوں، وہ ایک خط بھیج کر ایڈمنسٹریٹو سکریٹری، ہمدرد ایجوکیشن سوسائٹی، ہمدرد نگر، نئی دہلی ۱۱۰۰۶۲ سے منگالیں۔

یہاں یہ بتانا بھی مناسب رہے گا کہ جس طرح اسکولس/کالجوں کے سروے کے وقت ہم نے بہترین جوابات اور مکمل سوالناموں کے لیے ۳۵ ہزار روپے کے انعامات تقسیم کیے تھے، اسی طرح عربی مدارس کے اس سروے کو کامیاب بنانے کے لیے اور اس میں دلچسپی پیدا کرانے کے لیے ہم ۳۰ ہزار روپے کی کثیر رقم مختلف انعامات کی صورت میں پھر پیش کر رہے ہیں۔

ان دونوں پروگراموں کو شروع کرنے سے پہلے جناب حکیم عبدالحمید صاحب نے مختلف مراحل پر ملک کے مقتدر اور نامور ماہرین تعلیم، صحافیوں، ممبران پارلیمنٹ سیاست دانوں اور دانشوروں سے مختلف میٹنگوں، سیمناروں، خط وکتابت، ومشاورت کے ذریعے سیر حاصل صلاح مشورہ کیا اور سب کو اس بات پر متفق پایا کہ چوں کہ تعلیم اور معاشیات کا چولی دامن کا ساتھ ہے اور دونوں لازم و ملزوم ہیں، اس لیے تعلیمی سروے کے ساتھ ساتھ مسلمانوں کا معاشی سروے ہونا بھی ضروری ہے۔ لیکن بدقسمتی سے آج تک ملک گیر سطح پر مسلمانوں کا ایک ایسا معاشی جائزہ نہیں لیا گیا جس سے پتہ چلتا کہ معاشیات سے متعلق اعداد وشمار کیا ہیں، صنعت وحرفت، زراعت، تجارت اور ملازمت میں ان کی پوزیشن کیا ہے اور کون سے ایسے منفی عوامل کارفرما ہیں جو ان کو تعلیمی اور معاشی بدحالی وپستی کے ذمہ دار

ہیں اور انھیں کیوں کر بہتر بنایا جاسکتا ہے ۔

معاشی سروے پہلے بھی ہوئے ہیں

لیکن وہ محض گنی چنی صنعتوں کے سلسلے میں ہوئے اور وہ بھی علاقائی سطح پر، یا کہیں کہیں ایسی تحقیقات جن سے کسی ضلع صوبے یا کسی ملازمت کی ایک آدھ شاخ کے بارے میں تو کچھ اندازہ ہو سکتا ہے، لیکن ملک گیر سطح پر مسلمانوں کی معاشی صورت حال کیا ہے، ایسا کوئی سروے اب تک نہیں ہوا ہے ۔ ہمدرد نگر اور کوٹلیہ مارگ (حکیم عبدالحمید صاحب کی رہائش گاہ) پر ہونے والی ان اعلیٰ سطحی میٹنگوں میں، جن میں عبدالسلام صاحب نوبل انعام یافتہ تک شریک رہے ہیں، مسلمانوں کی تعلیمی پستی اور معاشی بدحالی کا گہرائی سے جائزہ لیا گیا۔ حکیم صاحب قبلہ اب اس نتیجے پر پہونچے ہیں کہ جب تک مسلمانوں کی معاشیات کا جائزہ نہیں لیا جاتا نہ تو ہم کسی ٹھوس سائنٹفک نتیجے پر پہنچ سکتے ہیں اور نہ ہی اس معاشی پس ماندگی کا علاج تجویز کیا جاسکتا ہے۔ صحیح اعداد و شمار کی غیر موجودگی میں نہ تو ہم اپنا کیس ملت کے سامنے پیش کر سکتے ہیں اور نہ اپنے مطالبات منوانے کے لیے پارلیمنٹ جیسے اعلیٰ اختیار اداروں کو متاثر کرسکتے ہیں ۔

مسلمانوں کے معاشی سروے کا کام

ہم نے اپنی سطح پر شروع کر دیا ہے اور پہلے مرحلے میں مختلف لائبریریوں، سرکاری اور غیر سرکاری اداروں، اخبارات کے دفتروں اور دیگر ایجنسیوں سے رابطہ قائم کرکے تقریباً ایک ہزار ایسی کتابوں، تحقیقی رپورٹوں، مقالوں، میگزین اور جرنل وغیرہ جمع کرکے ببلیوگرافی تیار کی ہے ۔ ایسا کرنے سے مقصد یہ ہے کہ پہلے ہمیں یہ معلوم ہو جائے کہ اس میدان میں اب تک کیا ہو چکا ہے۔ یہ ببلیوگرافی ابھی ادھوری ہے اور اسے پورے طور سے مکمل کرنے کی ضرورت ہے ۔

لہٰذا ہم اس سرکلر کے ذریعہ ملت کا درد رکھنے والے تمام حضرات سے اپیل کرتے ہیں کہ وہ ہمیں ایسی کتابوں، رپورٹوں تحقیقی مقالوں اور پروجیکٹ رپورٹوں کے بارے میں اطلاع دیں جن میں مسلمانوں کی معاشیات، خصوصاً زراعت، تجارت صنعت وحرفت اور ملازمتوں کے بارے میں اعداد و شمار اور تفصیلات موجود ہوں ۔ دیہی، قصباتی، ضلعی یا صوبائی اور ملکی سطح پر کسی بھی لیول پر، جو کچھ بھی معلومات ہوں، وہ ہمیں ملنا چاہیے تاکہ اسے یکجا کیا جاسکے ۔

مسلمانان ہند کے معاشی سروے کے پروگرام کے اس پہلے دور میں آپ مندرجہ ذیل انداز میں ہماری مدد کر سکتے ہیں:

۱۔ ہمیں ببلیوگرافی کے لیے حوالے اور تفصیلات بھیجیے۔ یعنی متعلقہ کتابوں، رپورٹوں کے نام مصنف یا ریسرچ ورکر کے نام مع سنہ تحریر واشاعت اور مقام۔ اس جگہ کا نام جہاں وہ میٹیریل موجود ہے، یا دستیاب ہوسکتا ہے، اور جس سے مسلمانوں کی صنعت وحرفت، تجارت، زراعت اور ملازمتوں کی پوزیشن کا پتہ چل سکے ۔

۲۔ ضلع کی سطح پر ایسے والینٹیروں کے نام یا فہرست بھیجیے، جس میں ایسے افراد واداروں کے پتے ہوں جن کو آپ اس معاشی سروے کے سلسلے میں کارآمد خیال فرماتے ہوں ۔

۳۔ ہمیں ان حضرات کے نام و پتوں سے آگاہ فرمایے جنھوں نے ہندوستانی مسلمانوں کے معاشی معاملات میں کسی بھی طرح کا

[باقی صفحہ نمبر ۸ پر]

مسلم یونیورسٹی کے شب و روز

ڈاکٹر اکمل الدین احسان اوغلی کی یونیورسٹی میں آمد

۱۵ دسمبر ۱۹۸۲ء کو ڈاکٹر اکمل الدین احسان اوغلی، ڈائرکٹر جنرل مرکز الابحاث للتاریخ والفنون والثقافۃ الاسلامیہ، استنبول Research Centre for Islamic History Art & Culture, Istanbul. مع اپنی اہلیہ محترمہ یونیورسٹی میں تشریف لائے۔ ڈاکٹر عبدالرزاق صاحب ڈائرکٹر وزارت صحت، حکومت سندھ آپ کے ہمراہ تھے معزز مہمان کا استقبال مرکز دراسات ایشیائے غربی کے ڈائرکٹر عبدالسلیم خاں صاحب نے کیا۔ اُس کے بعد موصوف وی سی لاج تشریف لائے جہاں آپ نے وائس چانسلر صاحب اور سینئر اساتذہ سے مختلف موضوعات پر کچھ دیر تبادلہ خیال کیا اور اپنے مرکز تحقیق کے کاموں اور آئندہ پروگرام کے بارے میں مختصراً بتایا۔ آپ نے وائس چانسلر صاحب کو یونیورسٹی لائبریری کے لیے اپنے ادارے کی کچھ مطبوعات بھی عنایت فرمائیں۔ بعدازاں آپ نے مرکز دراسات ایشیائے غربی میں لکچر دیا۔ صدر جلسہ ڈاکٹر عبدالسلیم خاں صاحب نے معزز مہمان کا پرجوش خیر مقدم کیا اور حاضرین سے تعارف کرایا۔ حاضرین میں اساتذہ اور ریسرچ اسکالرس کی خاصی تعداد تھی۔ معزز مہمان نے اپنی تقریر میں منظمۃ المؤتمر الاسلامی (Organisation of Islamic Conference) کے قیام کے اسباب مقاصد اور اس کے تحت قائم کردہ مختلف اداروں اور مجالس کا تفصیل سے جائزہ لیا۔ آپ نے بتایا کہ آپ کا ریسرچ سینٹر بھی اسی تنظیم کا قائم کردہ ایک ادارہ ہے۔ اپنے مرکز تحقیق کی موجودہ سرگرمیوں اور آئندہ پروگراموں کا آپ نے خصوصیت سے تعارف کرایا۔

اسلامک کانفرنس کے قیام کے متعلق آپ نے بتایا کہ مسجد اقصیٰ میں آتش زنی کے واقعہ کے بعد ستمبر ۱۹۶۹ء میں مسلم ممالک کے سربراہوں کی ایک میٹنگ رباط (مراکش) میں ہوئی۔ اسی میٹنگ میں اس کانفرنس کے قیام کا فیصلہ کیا گیا۔ کانفرنس کے ممبر ممالک کی موجودہ تعداد بشمول تنظیم آزادیٔ فلسطین (پی۔ایل۔او) بیالیس ہے۔ اس کا سکریٹریٹ جدّہ میں ہے۔ موجودہ سکریٹری جنرل دنیائے اسلام کی معروف شخصیت حبیب شطی ہیں۔ ممبر ممالک کے سربراہوں کی کانفرنس ہر تین سال کے بعد ہوتی ہے۔ لیکن وزرائے خارجہ کی میٹنگ سالانہ ہوتی ہے۔ کانفرنس مندرجہ ذیل مقاصد کے لیے وجود میں لائی گئی ہے۔

۱۔ ممبر ممالک میں اسلامی اخوت واتحاد کو فروغ دینا۔

۲۔ ممبر ممالک کے درمیان معاشی، سماجی، ثقافتی،

سائنسی و دیگر بنیادی اہمیت کے دائرہ ہائے عمل
میں تعاون استوار کرنا اور ایسے ممالک جو دوسرے
عالمی اداروں اور بین الاقوامی تنظیمات سے بھی تعلق
رکھتے ہیں انھیں باہم صلاح و مشورہ کی ترغیب دینا
اور اس کا انتظام کرنا۔

۳۔ نسلی علیحدگی اور امتیاز کو ختم کرنا اور ہر نوع کے
نوآبادیاتی نظام کی بیخ کنی کرنا۔

۴۔ انصاف پر مبنی عالمی امن کے لیے ضروری اقدامات
کرنا۔

۵۔ مقاماتِ مقدسہ کے تحفظ کے لیے جملہ مساعی کو مربوط
بنانا، فلسطینی عوام کی جدوجہد کی حمایت کرنا اور
اُن کے حقوق کی بازیافت اور ان کی سرزمین کو
صہیونی طاقت کے تسلط سے آزاد کرانے کے لیے
ہر طرح کی مدد دینا۔

۶۔ جبروتی طاقتوں کے خلاف تمام مسلم اقوام کی جدوجہد
کو تقویت پہنچانا، تاکہ ان کی آزادی، قومی حقوق اور
عزّت و آبرو کا تحفظ ہو سکے۔

۷۔ ممبر ممالک کے درمیان تعاون اور باہمی صلاح و مشورہ
کے لیے سازگار فضا پیدا کرنا۔

فاضل مقرر نے فرمایا کہ ان مقاصد کے حصول
کے لیے کانفرنس کے تحت کئی تنظیمات اور ادارے کام کر رہے
ہیں۔ آپ نے خصوصیت سے مندرجہ ذیل کا ذکر کیا۔

۱۔ اسلامی کمیشن برائے معاشی، ثقافتی و سماجی امور
۲۔ اسلامی یکجہتی فنڈ (۱۹۷۴ء)
۳۔ القدس کمیٹی (۱۹۷۵ء) برائے آزادیٔ فلسطین
۴۔ مرکز برائے معاشی و سماجی تحقیق و اعداد و شمار
انقرہ (۱۹۷۸ء)
۵۔ مرکز برائے تکنیکی و پیشہ جاتی تربیت و تحقیق
ڈھاکہ (۱۹۷۹ء)
۶۔ انجمن بنک ہائے اسلامی۔ مکہ مکرمہ
۷۔ اسلامی چیمبر برائے کامرس، صنعت و حرفت
اور مبادلۂ اشیاء۔ کراچی (۱۹۸۰ء)
۸۔ اسلامی ترقیاتی بنک۔ جدہ (۱۹۷۵ء)
۹۔ اسلامی خبر رساں ایجنسی۔ جدّہ
۱۰۔ نشریاتی تنظیم ممالک اسلامیہ۔ جدہ
۱۱۔ عالمی مرکز برائے اسلامی تعلیم شاہ عبدالعزیز
یونیورسٹی۔ مکہ مکرمہ
۱۲۔ مرکز الابحاث للتاریخ والفنون والثقافۃ الاسلامیہ
استنبول

اپنے مرکز تحقیق کی سرگرمیوں کا ذکر کرتے ہوئے فاضل مقرر
نے فرمایا کہ اس کے قیام کا مقصد اسلامی تاریخ، آرٹ
اور ثقافت کے شعبوں میں مسلم دانشوروں، مفکروں، علماء
و فضلاء کے مابین تبادلۂ خیالات اور بحث و مباحثہ کے لیے
مواقع فراہم کرنا ہے۔ تاکہ ان شعبوں میں تحقیق کو فروغ ہو
اس مقصد کے حصول کے لیے اس ادارے نے اپنا کام سہ
نکاتی پروگرام سے شروع کیا ہے۔

۱۔ مسلم ممالک میں اسلامی تاریخ، آرٹ اور ثقافت
ثقافت پر مواد اور تحقیقی مآخذ کے حامل
اداروں (کتب خانے، میوزیم وغیرہ) اور
ان علوم میں تعلیمی و تحقیقی اداروں سے
متعلق معلومات حاصل کرنا اور اُن کی جامع
ڈائرکٹری تیار کرنا

۲۔ ان ممالک میں [illegible] اسلامی تہذیب پھیلی
اور پروان چڑھی [illegible] نوعیت کے اداروں

کی دوسری فہرست مرتب کرنا۔

۳۔ تیسری فہرست ایسے تمام اداروں کی تیار کرنا جو دنیا کے دوسرے ممالک میں اسلامی تاریخ آرٹ اور ثقافت کے مطالعہ و تحقیق کے لیے مختص ہیں۔

ادارہ پہلی فہرست شائع کر چکا ہے۔ دوسری فہرستوں کے لیے سوالنامے بھیج کر مواد اکٹھا کیا جا رہا ہے۔ توقع ہے کہ باقی دو فہرستیں بھی جلد تیار ہو جائیں گی اور مذکورہ بالا دوائر و شعبہ جات میں تحقیقی و تدریسی کام کرنے والوں کے لیے بڑی مفید ثابت ہوں گی۔

ادارہ کے آئندہ منصوبوں کا ذکر کرتے ہوئے فاضل مقرر نے فرمایا کہ دو اہم پروگرام اس کے پیش نظر ہیں۔ اولاً دنیائے اسلام میں اسلامی علوم پر تصنیف و تحقیق اور درس و تدریس میں منہمک محققین، مفکرین، مصنفین علماء فضلاء کی ایک سوانح جاتی ڈکشنری تیار کرنا۔ دوئم پورے عالم اسلام کی تاریخ تدوین کرنا۔ اس عظیم کام کے لیے ادارے نے یہ خاکہ مرتب کیا ہے کہ اسلامی ممالک اور ان ممالک کو جہاں مسلمان بڑی تعداد میں بستے ہیں چند علاقوں میں جغرافیائی اور زبان و ثقافت کی بنیادوں پر تقسیم کیا جائے۔ مثلاً عرب علاقہ، ایرانی علاقہ، ترکی علاقہ، برصغیر ہند کا علاقہ، وسط ایشیا، جنوب مشرقی ایشیا، افریقہ وغیرہ۔ اور ہر علاقے کی تاریخ علیحدہ لکھی جائے۔ بعد میں سب کو یکجا شائع کیا جائے۔

لکچر کے اختتام پر فاضل مقرر نے حاضرین کے سوالات کے جوابات دیے۔ بعد ازاں صدر جلسہ ڈاکٹر عبدالسلیم خاں صاحب نے معزز مہمان کا مرکز دراسات ایشیائے غربی کی طرف سے شکریہ ادا کیا۔ لکچر سے فارغ ہو کر آپ کیمپس دیکھنے تشریف لے گئے۔

لنچ کے بعد آپ مولانا آزاد لائبریری تشریف لائے۔ قائم مقام لائبریرین عشرت علی قریشی صاحب نے آپ کو لائبریری کے مختلف ذخائر، شعبہ جات اور[illegible] دکھائے۔ لائبریری کے ذخائر، تعداد ممبران، [illegible]، اوقات، بجٹ اور دیگر امور کے بارے میں آپ نے متعدد استفسارات کیے۔

مخطوطات اور علوم اسلامیہ پر عربی و فارسی میں نادر مطبوعات کو دیکھنے میں آپ نے اپنے گہری علمی شغف کا اظہار کیا۔ ترکی زبان میں کتابیں دیکھ کر آپ بہت مسرور ہوئے اور بعض کے متعلق فرمایا کہ اب یہ نادر و نایاب ہیں۔

آپ کو یہ معلوم ہو کر بھی بڑی خوشی ہوئی اور تعجب بھی کہ لائبریری صبح ۸ بجے سے رات کے ۱۰ بجے تک کھلی رہتی ہے۔ تقریباً ایک گھنٹہ آپ لائبریری کے ذخائر کو بڑے انہماک سے ملاحظہ کرتے رہے۔ لائبریری کی طرف سے عشرت علی قریشی صاحب نے مخطوطات اور نادر مطبوعات کے کچھ ذخیروں کے کیٹلاگس آپ کو پیش کیے۔

لائبریری کے بعد معزز مہمان ویمنس کالج اور طبیہ کالج دیکھنے گئے۔ شام سالکا میل سے آپ دہلی واپس تشریف لے گئے۔

پرنٹر پبلشر قاضی معز الدین احمد مطبع لیتھو کلر پرنٹرس علی گڑھ مقام اشاعت: صفدر منزل، ستار بنگلہ، اے ایم یو علی گڑھ

جلد ۲ ۱۴۰۳ھ ۱۶ فروری ۱۹۸۳ء شمارہ ۲

"جو شخص سچے دل سے اور نیک نیتی سے کسی کام کو کرتا ہے اس کو بُرا کہنے والوں سے کوئی غرض نہیں ہوتی۔ اس کو خدا سے غرض ہوتی ہے اور جب کہ خدا سے غرض ہے تو لوگوں کے بُرا کہنے سے اس کے دل پر کچھ اثر نہیں ہوتا بلکہ ان لوگوں کے ساتھ اس کی محبت بڑھتی جاتی ہے اور وہ زیادہ کوشش کرنے لگتا ہے۔ وہ سمجھتا ہے کہ ان لوگوں کو فائدہ پہنچانے اور سمجھانے کے لیے زیادہ کوشش درکار ہے اور جوں جوں مخالفت بڑھتی جاتی ہے، اس کی کوشش بھلائی کے واسطے ترقی کرتی جاتی ہے۔"

سیّد احمد

یہ تنازعات آخر کب تک — قاضی معز الدین احمد
سر سید احمد خاں: ایک مستقل تشخیص — سید حامد

پبلک اسکولوں کا کام — ایچ ایس سنگھ
کامیابی کا راز کہاں ہے — وحید الدین خاں
شیخ الاسلام ابن تیمیہ — اقبال انصاری
اردو زبان اور اس کا بیان — سید احمد خاں
اردو زبان اور اس کی عہد بہ عہد ترقی — " "
کا بلی — " "

فی پرچہ ایک روپیہ — ششماہی ۱۱ روپے — سالانہ ۲۰ روپے

بیرون ہند سے

فی پرچہ ایک ڈالر — سالانہ ۵ ڈالر

ترسیل زر و خط و کتابت کا پتا

قاضی معز الدین احمد
صفدر منزل - تار بنگلہ - اے ایم یو
علی گڑھ - یوپی 202001

پندرہ روزہ

تہذیب الاخلاق

علی گڑھ

مدیر: سید حامد وائس چانسلر
علی گڑھ مسلم یونیورسٹی

مدیر مسئول: قاضی معز الدین احمد

یہ فسادات آخر کب تک؟

فرقہ وارانہ فسادات نے ایک بھیانک شکل اختیار کر لی ہے۔ جواہر لال نہرو جی کا خیال تھا کہ ایک آزاد ملک میں فسادات کیسے برداشت کیے جا سکتے ہیں؟ آزاد ہندوستان کی حکومت میں فسادات نہ ہوں گے، حکومت ان کا تدارک کرے گی۔ لیکن آزاد ہندوستان میں فسادات اور بڑھ گئے۔ اور اب تو فسادات نے بہت ہی خطرناک شکل اختیار کر لی ہے۔ تصور کیجیے کہ ایک شخص کسی ضرورت کے تحت کہیں جا رہا ہے، وہاں فرقہ وارانہ فسادات کا ہنگامہ ہے۔ مفسد اس مسافر پر ناگاہ حملہ آور ہوتے ہیں اور وہ مارا جاتا ہے۔ کسی کو کیا معلوم کہ اس کے کیا حالات تھے۔ ہو سکتا ہے کہ وہ ایک ماں کا اکلوتا بیٹا ہو اور بھرے گھر کا واحد سہارا ہو۔ اس کے بچے کم عمر ہوں، جوان بیوی ہو۔ ایک دو روز کے لیے وہ گھر سے نکلا ہو اور وہ واپس نہ پہونچے۔ اس کا گویا انتظار ہو۔ اس کے گھر والوں پر کیا گزرے گی جب وہ گھر واپس نہ پہونچے گا۔ اس کا انتظار دو چار روز ہوگا۔ پھر گھر والے پریشان ہوں گے۔ چند روز میں پریشانی مایوسی تک پہنچ جائے گی۔ بیوی، بچے اور بیوہ ماں روتے روتے بے حال ہو جاتے ہوں گے۔

یہ ایک خیالی بات نہیں ہے۔ ایسا ہوتا رہتا ہے اور ہر فساد کا شکار اجنبی بھی ہوتے ہیں اور ان کے گھر برباد ہوتے ہیں۔

ہم تو بڑے انسان دوست ہیں۔ ظلم و ستم کا تصور بھی نہیں کر سکتے۔ پھر آخر یہ فسادات کیا ہوتے ہیں۔ انسان کے خون کی پیاس ہم کو کیوں بے قابو رکھتی ہے؟ ہم تو بڑی عظیم تہذیبوں کے وارث ہیں۔ ہم کو تو یہ دعوا ہے کہ ہمارے سائے میں شیر اور بکری ایک گھاٹ پانی پیتے رہتے ہیں۔ پھر یہ کیا ہے کہ مختلف خیالات اور عقائد کے لوگ ایک ساتھ ہمارے سائے تلے نہیں رہ سکتے اور مخالف کو نیست و نابود کرنے کا جذبہ ہماری رگ و پے میں سرایت کیے ہوئے ہے۔ یہ زمانہ جمہوریت کا ہے۔ دنیا انصاف اور امن کی طالب ہے۔ دنیا میں کہیں لڑائی ہوتی ہے تو ہم طرفین کو مشورے دیتے ہیں۔ پھر آخر کیا بات کہ اپنے ملک میں اپنے ہمسایہ کو برداشت نہیں کر سکتے۔

حکومت کا فرض ہے کہ وہ ہر شہری کی جان و مال کی حفاظت کرے۔ [illegible] فسادات کب تک جاری رہیں گے

یہ سلسلہ اب اس منزل میں ہے کہ اگر بند نہ ہوا تو دنیا یہ
بھول جائے گی کہ اس ملک میں گاندھی اور بڑے بڑے صوفیا
اور رشی پیدا ہوئے تھے۔

فرقہ وارانہ فسادات نے شدت اختیار کی تو
ہونا تو یہ چاہیے تھا کہ پارلیمنٹ کے تمام ممبران سر جوڑ کر بیٹھتے
اور فسادات کے ہر پہلو پر غور کرتے اور ملک میں خوش گوار
فضا پیدا کرنے کی ہر ممکن کوشش کرتے۔ لیکن ہوا یہ کہ صرف
مسلمان ممبران پارلیمنٹ نے احتجاج کیا اور سب خاموش
رہے۔ پارلیمنٹ کے ممبران تو مصلحت بین ہوتے ہیں۔ تعجب
صحافیوں پر ہے جو آزاد خیال اور آزاد منش ہوتے ہیں۔
وہ بھی غیر جانب دار نہ رہے۔

اب تو ضرورت اس کی ہے کہ ہر انصاف پسند
ہندوستانی صحافی، ادیب و شاعر اور سب ان فسادات کے
خلاف آواز اٹھائیں اور ہر فرقہ کے لیڈر بالکل صفائی کے ساتھ
اپنے اپنے تاثرات بیان کریں۔ اگر ہندوؤں کو مسلمانوں سے
شکایات ہوں تو وہ صاف طور پر بیان کی جائیں اور مسلم اکابر
سے سنیں۔ وہ رہنما تبادلہ خیال کریں اور اسی طرح مسلمان بھی
ہندوؤں کے خلاف اپنی شکایات پیش کریں اور دونوں فرقوں
کے لیڈر ایک دوسرے کا بیان سن کر آپس کے اختلافات
ختم کریں۔ تاکہ اس برصغیر میں امن و سکون قائم ہو اور لوگ
چین کی زندگی گزار سکیں

یہ تو معلوم ہی ہے کہ ہندو مسلم اختلافات
کی بنیاد ہندوستان کی ماضی کی تاریخ ہے جس کے واقعات کو
انگریزوں نے مسخ کر کے لکھا ہے اور تاریخ کی کتابیں اسکول کے
نصاب میں داخل کر کے ہندو مسلمان بچوں کے دلوں میں
نفرت کا بیج بو رہا ہے لیکن آخر یہ احساس کیوں نہیں ہے کہ
دنیا کی تاریخ میں شاید ہی کوئی ایسا ملک ہو جہاں وہی لوگ آج
بھی آباد ہوں جو روز اول سے وہاں بستے تھے یا ہزاروں سال
بعد وہاں آ کر آباد ہو گئے تھے۔ ہر آبادی کے حکمراں ہوس کا
شکار رہے ہیں۔ یہ پڑوس کی آبادی پر اگر وہ کمزور ہوتی تو
حملہ کر کے قابض ہو جاتے تھے۔ بادشاہوں، راجاؤں، حاکموں کا یہ
دستور ہزاروں برس رہا ہے اور آج بھی ہے۔ اب بھی دنیا میں
ایسی قومیں ہیں جن کے منہ کو انسانی خون لگا ہوا ہے۔ وہ اپنے
کمزور پڑوسی کو ہی نہیں ہزاروں میل دور بسنے والی مخلوق کو بھی
غلام بنا لیتی ہیں۔ ان کی دولت پر ان قوموں کی نظر ہوتی ہے۔
عہد وسطیٰ میں تو جمہوری حکومت نہیں شخصی حکومت ہوتی تھی
حاکم وقت سیاہ و سفید کا مالک ہوتا تھا، جو چاہتا تھا کرتا
تھا۔ مجرموں کو ہی نہیں اپنے مخالفوں کو سخت سے سخت سزا
دیتا تھا۔ کس حاکم وقت نے مخالفوں پر ظلم نہیں کیا؟ ان کی
سرکوبی نہیں کی؟ مسلم حاکم وقت نے اپنے مسلمان مخالف کو کب
بخشا تھا جو کسی اور کو بخش دیتا۔ پھر حاکم وقت جہاں مخالف
کی سرکوبی کرتا تھا وہاں خوش ہونے پر انعام و اکرام کی بارش
بھی کرتا تھا۔ مسلمان حکمرانوں نے ہندو مسلم مخالفوں کی سرکوبی
بھی کی ہے اور انعام و اکرام کی بارش بھی ان پر کی ہے۔ اب
گزرے زمانے کے زخموں کو کریدنے سے کیا فائدہ؟ وہ
زمانہ پھر واپس نہ آئے گا۔ لیکن اگر زخموں کو کریدنے میں
ہی مزا آتا ہے تو پھر عطر محبت کی ان شمیم انگیزیوں کو بھی تو
یاد رکھیے جن کے سبب آٹھ سو سال ایسے بادشاہوں نے
حکومت کی ہے جن کا دین اسلام تھا

ظلم و ستم قومیں زیادہ عرصہ برداشت نہیں
کرتیں۔ انگریز جیسی ترقی یافتہ قوم کو ہندوستان نے دو ڈھائی سو
سال برداشت نہیں کیا پھر آٹھ سو سال مسلمان یہاں

سے حکومت کرتے رہے؟ اور یہ دونوں فرقے کیوں تیرونگر
ہے؟ کیا ظلم کا یہی نتیجہ ہوتا ہے؟
زمانہ جمہوریت کا ہے' عدل وانصاف [illegible] مساوات
ہے اِس دور کی خصوصیات کی عادت ڈالیے اور جمہوری'
نئی دور کی عینک سے دنیا کو دیکھیے۔ پھر دل کی سب کدورت
مل جائے گی اور پھر ہم سب ایک خوشگوار دور میں داخل
ہو جائیں گے۔

کسی قوم و ملک کی ترقی کے لیے تعمیری فکر' بلند
خلاق اور اعلیٰ کردار کی ضرورت ہوتی ہے۔ تخریب پسند
ر کسی قوم اور ملک کی ترقی کا ذریعہ نہیں ہو سکتی؟۔ قتل و
ادت گری ترقی و تحفظ کا سبب نہیں ہو سکتی۔ گزشتہ ۳۵
ال کی تاریخ سامنے رکھیے' دیکھ لیجیے ہمارے ملک کی کیا حالت
ہے؟ دوسری قوموں کی ترقی کے اسباب کا مطالعہ کیجیے تو
حقیقت اور واضح ہو جائے گی۔

آیئے ہم سب مل کر نیا ہندوستان بنائیں
بن میں سب کی توجہ تعمیر کی طرف ہو' تخریب کی طرف نہیں' اتحاد
کی طرف ہو انتشار کی طرف نہیں ؎

شکتی بھی شانتی بھی بھگتوں کے گیت میں ہے
دھرتی کے باسیوں کی مکتی پریت میں ہے

(ق-م-ا-)

بقیہ "پبلک اسکولوں کا کام"

ہیں کم مایہ و کمزور طبقہ کے زیادہ سے زیادہ تعداد کے طالب علموں
کا داخلہ کیا جاتا ہے تاکہ وظیفوں کی شکل میں طلبا اچھی قسم کی تعلیم
حاصل کر سکیں۔ اس طرح یہ اعتراض کہ پبلک اسکولوں نے
ممنونی' غیر ملکی امداد کو اچھا سمجھنے والے طبقہ کو جنم دیا ہے'
بھی غلط ثابت ہوتا ہے۔ درحقیقت طبقۂ اوسط کے بچوں کو

[illegible] تعلیمی وسائل مہیا ہوئے جو پہلے ممکن نہ تھے
انگریزی ذریعۂ تعلیم پر اعتراض بھی حقیقت
سے ہٹ کر ہے۔ یہ صحیح ہے کہ اچھی اور کامیاب تعلیم و تربیت
مادری زبان میں ہی ہوتی ہے۔ مگر انگریزی سے پہلو تہی
ہمیں آج کل کے لسانی تعصب میں ذہنی طور پر مفلوج کر دے
گی اور اس سے استفادہ نہ صرف نئے تجربوں' تازہ علم
بلکہ صحیح قومی نقطۂ نظر سے روشناس کرے گی اور اچھے
انسان بنیں گے۔

نوٹ

یکم جنوری ۱۹۸۳ء کے تہذیب الاخلاق میں حکیم
سید کمال الدین حسین کے مضمون "طبی نصاب تعلیم" میں
سہواً غلطی رہ گئی ہے براہِ کرم صفحہ نمبر ۲۰ پر مضمون اس
طرح پڑھا جائے

"(۱۳) معالجات (جملہ امراض انسانی کی ماہیت' اسباب'
علامات اور علاج) (۱۴) حیات - (۱۵) علم القابلہ و امراضِ
نوزائیدہ ...."

مزید تہذیب الاخلاق میں شائع شدہ محمد یونس
قاضی صاحب کا مضمون "مارکسزم پر ایک منصفانہ نظر" میں
بھی دو مقامات پر الفاظ رہ گئے ہیں ان کو اس طرح
پڑھا جائے

"... ان ممالک میں جہاں ذرائع پیداوار انفرادی ملکیت میں نہیں
ہیں ..."

"....دوسری جنگ عظیم کے دوران فاتح سرخ افواج
کو برلن میں داخل......"

(مدیر مسئول)

سید طٰہٰ

سرسید احمد خاں

ایک مستقل سرچشمۂ فیض[1]

انسانی دنیا میں اکثر ایسے رہنما ہوتے ہیں جن کی معنویت ان کی زندگی ہی میں ان سے جدا ہو جاتی ہے۔ زمانہ کی سازگار ہوا کے جھونکے انھیں امتیازی درجہ عطا کر دیتے ہیں مگر یہ امتیازی درجہ بہت جلد ان سے منہ موڑ لیتا ہے جب ان کی شہرت درجۂ کمال پر پہنچ جاتی ہے اس وقت کوئی شخص تصور بھی نہیں کر سکتا کہ یہ شہرت اتنی جلد زوال پذیر ہوگی کچھ ایسے رہنما بھی ہوتے ہیں جن کی شہرت نسبتاً پائدار ہوتی ہے۔ ان کی شہرت اور معنویت کی حیثیت عارضی نقش کی طرح نہیں ہوتی۔ ان کی موت کے بعد ایک نسل یا دو نسلوں تک ان کا ذکر خیر باقی رہتا ہے۔ بعد ازاں رفتہ رفتہ ان کی شہرت معدوم ہونے لگتی ہے۔ کچھ رہنما ایسے بھی ہوتے ہیں جو زندۂ جاوید قرار پاتے ہیں۔ ایک احسان مند طبقہ کے ذہن میں ان کی یادیں محفوظ رہتی ہیں خواہ صدیاں گزر جائیں مگر ان کی معنویت اور لچک ختم نہیں ہوتی ان پر فرسودگی کا کوئی اثر نہیں ہوتا۔ ایسے لوگوں میں ایک بنیادی خصوصیت ہوتی ہے، وہ لوگ اپنی ذہنی ساخت کے اعتبار سے ٹھوس قدروں کے حامل ہوتے ہیں اور ان میں بہت سی ذمہ داریوں سے عہدہ برآ ہونے کی بڑی سکت ہوتی ہے۔ بنابریں وہ لافانی ہو جاتے ہیں وہ لوگ چوں کہ غیر فانی اور محکم اصولوں کی نمائندگی کرتے ہیں اس لیے ان کی عظمت مرورِ ایام سے متاثر نہیں ہوتی وہ عہد ساز ہوتے ہیں اور ان کی معنویت اپنے عہد سے آگے متجاوز ہوتی ہے۔ ایسے ہی ایک انسان سرسید احمد خاں تھے۔ وہ لافانی ہیں کیوں کہ انھوں نے ایک قوم کی فکر کو بدل کر رکھ دیا۔ اسے قعرِ مذلت سے نکالا۔ اسے زمانۂ حال میں جینا سکھایا اور مستقبل کو سنوارنے کا حوصلہ بخشا۔ عصرِ جدید میں ہندوستان نے ان جیسے چند ہی بلند قامت لوگ پیدا کیے ہیں، وہ درحقیقت عہدِ حاضر کے سب سے زیادہ قد آور ہندوستانی مسلمان ہیں وہ اپنے زمانے کے انسانوں میں ایک بعض جمیل تھے جو لوگ ان کے بعد آئے وہ قد و قامت میں ان سے بہت معمولی ہیں۔ ان کی خوبیوں میں سے ایک خوبی ان کی عقل کا عملی رجحان ہے۔ ان کی بصیرت کا اندازہ اس وقت ہوتا تھا جب حالات اور حقائق سے مقابلہ کرنے کی صلاحیت کے اظہار کا موقع ہو۔ ایسے موقع پر ان کی بصیرت تخلیقی عمل کی صورت اختیار کر لیتی تھی۔ اور اس سے حالات میں تبدیلی رونما ہوتی

---

[1] یہ مضمون گذشتہ یوم سرسید پر انگریزی [illegible]

تھی۔ آیئے ہم غور کریں کہ ہندوستانی مسلمانوں کے موجودہ حالات میں سر سید احمد خاں کا کیا ردِ عمل ہوتا۔ ہمیں موجودہ حالات کا جائزہ لینا چاہیے۔

اول یہ کہ ہندوستانی مسلمان ایک ایسے گھر کی مانند ہے جس کے رہنے والوں میں شدید اختلاف ہو۔ یہ ایک ایسی جماعت ہے جو تعلیمی لحاظ سے عمودی شکل میں تفرقہ سے دوچار ہے

(الف) کچھ لوگ جدید تعلیم سے آراستہ ہیں۔

(ب) کچھ لوگ روایتی طریقہ سے تعلیم حاصل کیے ہوئے ہیں

موخر الذکر لوگوں کو غیر تعلیم یافتہ عوام کا کلی طور پر اعتماد و تعاون حاصل ہے۔ ثانیاً یہ کہ ایسا لگتا ہے کہ سر سید احمد خاں کی تحریک ختم ہو چکی ہے اور مسلمان اپنے آپ کو تعلیم کی انتہا پر پہنچا ہوا سمجھ رہے ہیں۔

ثالثاً یہ کہ مسلمان معاشی اعتبار سے پسماندہ ہیں۔ تجارت میں ان کا حصہ، ملک کی آبادی میں ان کے تناسب کے لحاظ سے کم ہے۔ ملک کے صنعتی نقشہ پر بھی ان کا نام نمایاں نہیں ہے۔ مختلف پیشوں میں ان کی نمائندگی تقریباً برائے نام ہے حکومت کے دفتروں میں خواہ پالیسی سازی کے شعبے میں ہوں یا احکام کے نفاذ سے متعلق ادارے میں ہوں، ان کا کوئی شمار نہیں۔ منظم پرائیویٹ سیکٹر اور پبلک سیکٹر میں ان کو ملازمتوں کے مواقع حاصل نہیں ہیں۔

رابعاً یہ کہ جہاں تک ان کے طرزِ عمل کا تعلق ہے وہ زیادہ حسیاتی اور جذباتی ہے عقل پسندانہ اور دانشمندانہ کم۔ اگر اس رفتار سے مقابلہ کیا جائے جو باقی معاشرہ کی ہے تو معلوم ہوگا کہ ہندوستانی مسلمان رینگ رہے ہیں۔ وہ ان تمام ترقی یافتہ ذرائع و وسائل سے جو ملک کی ترقی میں استعمال [illegible]

تقسیم سے ان کا اعتماد مجروح ہو گیا۔ ایک نئی نسل تقسیم ملک کے ایک عرصہ کے بعد پوری خود اعتمادی اور خود داری کے ساتھ ابھر کر سامنے آئی ہے۔ بدقسمتی سے نئی خود اعتمادی بھی بسا اوقات فرقہ وارانہ فسادات کی وجہ سے مجروح ہو جاتی ہے۔ یہ فرقہ وارانہ فسادات ہی ملک کی پیش رفت میں حصہ لینے اور ملک کی کامیابی پر فخر و ناز کرنے سے مسلمانوں کو روکتے ہیں۔ مسلم جماعت کے پاس منظم اور معتبر رائے عامہ کا اثاثہ نہیں اور نہ اسے پختہ کار قیادت مل رہی ہے۔ قیادت کو ملت کے ذہن کا صحیح اندازہ نہیں۔ یہ قیادت جو ملت کو حاصل ہے عارضی فوائد کو مستقل مفادات پر ترجیح دیتی ہے۔ محرومیوں اور ناکامیوں کی صورت میں یہ اپنے خول میں چھپ جاتی ہے۔ ورنہ تنگ نظر ہو کر یہ دیکھنے لگتی ہے کہ حالات اس کے سخت ناموافق ہیں اور یہ کہ آپ اس کا حق کبھی نہیں مل پائے گا۔ سید احمد خاں ایسی صورت میں کیا کرتے؟ وہ ہندوستانی مسلمانوں کو یہی مشورہ دیتے کہ وہ باعزت طریقہ پر حکومت اور بدلے ہوئے حالات سے سمجھوتا کریں۔ وہ ان کو غم و غصہ اور جذبات کے جوش و خروش کی صلاح نہیں دیتے۔ بلکہ وہ خود اعتمادی اور امید کے ساتھ حالات کا مقابلہ کرنے کی تلقین کرتے۔ وہ اس نکتہ کو سمجھاتے کہ شکایات کا یہ در پیچ سلسلہ خواہ کتنی ہی مستحکم بنیادوں پر مبنی ہو، مریضانہ ذہنیت اور منفی رویہ کی نشان دہی کرتا ہے۔ وہ انھیں تنبیہ کرتے کہ "یہ بڑبڑانا کیسا، یہ کراہنے کی آواز کیسی؟ کیوں حالات کا بار دیگر اندازہ نہیں لگاتے کیوں دونوں ہاتھوں میں قوت پیدا نہیں کرتے؟ کیوں اعلان نہیں کرتے ان حقوق کا جو تمہارے ہیں، کیوں اعلان نہیں کرتے اپنے حقوق کا مناسب اجتماعات میں، بغیر کسی عناد و عداوت کے اپنے حقوق مانگو۔ عظیم قوم کے حصہ دار کی حیثیت سے اپنے حقوق طلب کرو۔ اپنے حقوق کا مطالبہ

جاری رکھو۔ ہر وقت اور ہر حالت میں سخت مقابلہ کی دنیا میں
سبقت لے جانے کے لیے تیاریاں کرتے رہو۔" وہ موجودہ
حکومت اور اکثریتی فرقہ کے سامنے اتنی ہی صاف گوئی کا مظاہرہ
کرتے جتنا کہ انھوں نے حکومت برطانیہ کے روبرو کیا۔ وہ
ان سے کہہ دیتے کہ ہندوستانی مسلمان ہندوستان کی آبادی
کا ایک خاصا بڑا حصہ ہیں۔ اگر وہ پس ماندہ اور جمود کا شکار
رہے تو ملک کی ترقی کے لیے رکاوٹ ثابت ہوں گے۔ اگر
انھوں نے ملک کی تعمیر و ترقی میں حصہ لینے کا احساس کھو دیا تو
سیکولرازم کے تمام دعوے اور دستور کی جملہ ضمانتیں بے معنی
ہو کر رہ جائیں گی۔ اس لیے قوم کے وسیع تر مفاد کے پیش نظر
انھیں ملک میں وہ تمام سہولتیں اور امدادیں دینی ہوں گی
جو ترقی پذیر ممالک طلب کرتے رہے ہیں اور کسی نہ کسی حد
تک ترقی یافتہ ممالک سے پاتے بھی رہے ہیں۔ وہ اس حقیقت
پر زور دیتے کہ ترقی کی رفتار اپنے آپ میں نہایت بے رحم
ہوتی ہے۔ جو اس دوڑ میں آگے رہتے ہیں ان کے قدم آگے
ہی بڑھتے چلے جاتے ہیں۔ جو اس دوڑ میں پیچھے رہ جاتے ہیں وہ
اور زیادہ پیچھے ہو جاتے ہیں یہاں تک کہ وہ دوڑ میں آگے بڑھنے
والوں کے برابر پہنچ جانے سے ناامید ہو جاتے ہیں اور پھر
کوشش بھی چھوڑ بیٹھتے ہیں۔ وہ اپنے ترغیب آمیز دلائل کے
ساتھ بحث کر کے واضح کر دیتے کہ انھیں مشترکہ کامیابیوں
کی سطح تک لانے کے لیے مخصوص کوششیں کی جائیں۔ وہ پھر
اپنے ہم مذہبوں کی طرف متوجہ ہوتے اور ان سے جذبات
و تعصبات کو ترک کر دینے کا مطالبہ کرتے کیوں کہ یہ بصیرت
کی روشنی کو دھندلا کر دیتے ہیں۔ وہ ضرورت ظاہر کرتے
ٹھنڈے دل اور کھلی ہوئی آنکھوں سے جائزہ لینے کی۔
جوشیلے نعرے اور گروہی تعصبات سے مملو کلمات جذبات
کو ہیجان انگیز ضرور کر سکتے ہیں اور خون کے دوران کو تیز تر کر سکتے
ہیں لیکن یہ کسی جماعت کے معیاروں کو بلند کر سکتے ہیں نہ
اس کی حرکت میں اضافہ۔ وہ ان سے برابر یہ کہتے رہتے
کہ یہ زمانہ عقل و دانش کا ہے، ابلاغ و ترسیل کا ہے اور
سائنس و ٹکنالوجی کا ہے۔ جو لوگ زمانہ کے ان تقاضوں کو
نظر انداز کر رہے ہیں وہ دنیا سے نیست و نابود ہونے
کا مختصر ترین راستہ اختیار کر رہے ہیں۔ زبان کے اشتعال
انگیز مسئلہ کے متعلق وہ کثیر الاوصاف نابغۂ عصر، وہ جدید
اردو نثر کا معمارِ اولین، وہ صاحبِ طرز انشاپرداز جس
کی انشاپردازی سے آج بھی اردو مالا مال ہے، ہندی
میں کمال قابلیت حاصل کرنے پر اتنا ہی زور دیتا جتنا کہ اس
نے اپنے وقت میں انگریزی پر دیا تھا۔ وہ مسلمانوں کو مسلسل
یہی مشورہ دیتے کہ اکثریتی فرقہ سے اپنے تعلقات بہتر سے
بہتر بناؤ، اپنے برادرانِ وطن کے ساتھ صلح و آشتی کے ماحول
میں زندگی گزارو اور باہمی عزت و احترام کی فضا پیدا کرو
تاکہ مشترکہ مقاصد حاصل ہو سکیں۔

وہ اپنے یہی مشورے دوسرے فرقہ کو بھی دیتے
جنھیں ادب و احترام کے ساتھ سماعت کیا جاتا۔ کیوں کہ
بڑے انسانوں پر کسی ایک جماعت کا اجارہ نہیں ہوتا۔
یہاں تک کہ کوئی ایک ملک بھی ان کا اجارہ دار نہیں بن
سکتا۔ کیوں کہ عقل و حکمت کی ترغیب انگیز صدا اور اخلاق
کی بے خطا مضراب سے ایک عالم کے دلوں کے تار جھنجھنانے
لگتے ہیں۔

یہ یقینی بات ہے کہ سید احمد خاں تعلیمی اور سماجی
ترقی کی عظیم تحریک کا احیاء کرتے جو کہ افسوس ہے ان کی
موت کے کچھ عرصہ کے بعد ہی اپنا اثر کھو بیٹھی۔ وہ اس تحریک
کو نقطۂ عروج تک پہونچانے کے لیے اپنی جیسی توانائی کے ساتھ
سرگرم عمل ہو جاتے اور پورے ملک کو اس کی لپیٹ میں

۔ یتے۔ چوں کہ اس راہ کی رکاوٹیں ان کی زندگی ہی میں دور ہو چکی
تھیں اس لیے تعلیمی و سماجی اصلاح کی یہ تحریک اب تک بہت زیادہ
رقی کر چکی ہوتی۔ اہلِ نظر کی تنقید کا ارادہ یہ ہے کہ جو عظیم کام
سید احمد خاں نے تقریباً تنہا رہ کر اس قدر کامیابی کے ساتھ
پورا کر دکھایا، اس کے مقابلے میں آسان تر کام بھی ملک کے سب
مسلمان رہنما مل کر انجام نہ دے سکے۔ انھوں نے سید مرحوم
کی تحریک کے چشمۂ رواں کو جاری رکھنا تو کجا نہایت بے اعتنائی سے
سے خشک ہو جانے دیا۔ سید احمد خاں مسلمانوں کو تنبیہ کرتے کہ
وہ روٹی کے ٹکڑوں کے لیے بھیک نہ مانگیں بلکہ وہ خود اعتمادی،
بے نیازی اور بے باک آزادی کا ثبوت دیں۔ وہ انھیں سستی
کاہلی، اوہام پرستی، تنگ نظری، آدم بیزاری، نا اتفاقی، ہلاکت آفریں
خود غرضی، کوتاہ اندیشانہ تعصب پسندی اور کنبہ پروری سے
پیچھا چھڑانے کی ہدایت کرتے۔

اس میں ذرا شک و شبہ نہیں کہ وہ اُن دو
طبقوں کے درمیان حائل خلیج کو کم سے کم کرنے کی کوشش کرتے
ن میں مسلم جماعت بٹی ہوئی ہے۔ یہ کام وہ اس طرح انجام دیتے
کہ اولاً نصاب تعلیم کی تجدید و اصلاح کرتے اور ثانیاً وہ ایک
جز وقتی تدریس کی تحریک شروع کرتے۔ یہ جز وقتی تدریس کی
تحریک عبارت ہوتی تکملے یا ضمیمے کے طور پر پڑھائی سے جس سے پڑھنے
والوں کی معلومات میں نئے اضافے ہوتے۔ جہاں تک ملازمتوں
کا تعلق ہے وہ قومی وسائل و دولت کے نظم و نسق سے متعلق مختلف
سیکٹروں کے ملازمت دینے والوں سے رابطہ قائم کرتے اور
بحث و استدلال سے انھیں وسیع تر قومی مفاد کے پیشِ نظر
مسلمانوں کو ملازمتیں دینے کی افادیت سمجھاتے۔ وہ اپنے وسیع
تر ذہنی ذخیرہ میں محفوظ سارے دلائل و براہین اربابِ حکومت
کو یہ جتانے اور منوانے میں صرف کر دیتے کہ مسلمانوں کو ایک
قابلِ لحاظ تناسب کے ساتھ پولس اور فوج میں بھرتی کیا جائے

یہ ایک فرقہ وارانہ فسادات کے بدنما داغ کو مٹانے کے لیے ایک مؤثر
ترین قدم ہوگا۔ دوسری طرف یہ عمل مسلمانوں کو ملک کے دفاع
اور اس کے باشندوں کی سلامتی کی کوششوں میں فخر و مباہات
کے ساتھ شرکت کا احساس بخشے گا۔

مسلمانوں کی طرف دوبارہ نظر ڈال کر انھیں
ان کے بعد ہونے والی ترقی کی روشنی میں ٹیکنیکل ایجوکیشن پر
زور دینا پڑتا اور لڑکیوں کی تعلیم پر بھی اپنی توجہ مرکوز کرنا ہوتی
جسے وہ فی الواقع نظر انداز کر گئے تھے۔ انھیں ان کی اس بھول
کی وجہ سے ہدفِ تنقید بنایا جاتا رہا ہے۔ یہ درحقیقت ان
کی عملیت پسند تیل اور ان کے کبھی نہ خطا کرنے والے عصری شعور
کا مظہر ہے۔ اسی طرح وہ بہت جلد اپنے بنائے ہوئے ادارہ کے
مصنوعی تکلفات سے آراستہ کردار کو بھی خیرباد کہہ دیتے۔ کیوں کہ
اس طرح کے کردار سے شخصیت میں توانائی نہیں آتی۔ وہ یونیورسٹی
سے یہ امید کرتے کہ اس کی خدمات اور اثرات کی روشنی قرب و
جوار کے علاقے میں بھی پھیلے وہ تعلیمی معیار کے گر جانے پر
غضبناک ہوتے اور وہ نئے داخلوں کی کثرت کو ملحوظِ نظر بنا لے
اور اس وجہ سے استعداد میں تخفیف کرنے پر سخت برہم
ہوتے۔ وہ تعقل سے گریز اور تفکر سے فرار کی وجہ سے
بیحد رنجیدہ ہوتے اس گریز و فرار کی وکالت جن شواہد و
دلائل سے کی جاتی ہے، انھیں نظر تسلیم نہیں کرتی۔

ہر شخص غیر محدود طور پر تصور کر سکتا ہے کہ
سید احمد خاں کا ردِ عمل موجودہ حالت میں کیا ہوتا۔ یہ ان کی
عظمت کا پیمانہ ہے کہ ان کے کارناموں کی عمر زیادہ ہو جانے
کے باوجود آج بھی ہر شخص انھیں کی طرف دیکھتا ہے اور یقین
کے ساتھ جان سکتا ہے کہ اگر وہ ہوتے تو کس طرح آگے بڑھتے
اور یہ کہ ان کا طریقِ فکر و عمل آج کے زمانے سے کتنی مربوط ہے۔
یہ عمل پسند عقل کا جوہر اصلی ہے۔ یہ نظریہ جو نظریہ عملیت

ایچ۔ ایس سنگھ
ترجمہ
چودھری رحم علی الہاشمی۔

پبلک اسکولوں کا کام

موجودہ زمانہ کا ایک قابل لحاظ واقعہ پبلک اسکولوں کی غیر معمولی رفتارِ ترقی ہے۔ پبلک اسکول سے مراد کوئی اصلاحی اسکول نہیں بلکہ وہ ادارہ جو انڈین پبلک اسکول کی کانفرنس کا ممبر ہو جسے سرکاری امداد نہ ملی ہو بلکہ فیس سے کام چلاتا ہو اور انگریزی زبان کو ذریعہ تعلیم کے طور پر اختیار کیے ہو۔ اس طرح کے تقریباً ایک ہزار اسکول ہیں اور ہر سال ان میں کوئی ساٹھ نئے اسکولوں کا اضافہ ہو رہا ہے۔ ان میں کچھ ابتدائی اسکول تسلیم شدہ ہیں۔ گو بیشتر غیر تسلیم شدہ ہیں اور اپنی بقا و ترقی کو اپنے معیارِ تعلیم پر ہی قائم رکھے ہیں۔

مانے ہوئے اسکولوں میں بیشتر طلبا کی ہمہ گیر شخصیت کے ارتقا، قیادت کی صفات اور کردار کی نشو و نما پر زور دیتے ہیں۔ ان کے اساتذہ مالی فراغت اور ترقی یافتہ طریقۂ تعلیم سے بہرہ ور ہیں اور ان کی انتظامیہ مالی فراغ البالی و فیصلوں کی آزادی پر چلتی ہے۔ ان خصوصیات کے سبب تعلیم دو معیاروں میں بٹ گئی ہے۔ مالی طور پر خوش حال اور ذہنی طور پر اچھے بچے پبلک اسکول میں اور باقی سرکاری اور نیم سرکاری اداروں میں۔ یہ تقسیم بظاہر بڑی عجیب ہے اور کچھ ماہران تعلیم کہتے ہیں کہ سماجی مساوات کے لیے حالات سازگار نہیں اور شاید یہ سیاسی ڈھانچہ منجمد اور مستقل ہو جائے۔ مگر کیا یہ اندیشہ صحیح ہے؟

۱۹۶۴-۶۶ء کے تعلیمی کمیشن کی رپورٹ نے اس پر زور دیا کہ ہندوستان کی صورتِ حال میں یہ ذمہ داری نظامِ تعلیم کی ہے کہ مختلف سماجی طبقوں اور جماعتوں کو باہم ملائے اور اس طرح سماجی مساوات کو آگے بڑھائے اور سماج کا تحفظ کرے مگر بدنصیبی یہ ہے کہ اس وقت خود طرزِ تعلیم ہی سماجی مساوات میں حائل ہے اور طبقاتی نابرابری اور امتیاز کو بڑھاوا دیتی ہے۔

ابتدائی درجوں کے لیے بلا فیس والے اسکول جن میں بیشتر طلبا پڑھتے ہیں عموماً ادنیٰ اور ناقص قسم کے ہیں۔ بعض پرائیویٹ اسکول بہ حیثیت مجموعی بہتر ہیں مگر چونکہ وہ بھاری فیس وصول کرتے ہیں اس لیے صرف اہلِ زر ہی اپنے بچوں کو بھیج سکتے ہیں۔ ثانوی درجہ میں اچھے اسکول بیشتر پرائیویٹ ہیں اور ان میں زیادہ تر کافی فیس لیتے ہیں جس سے اوپر کے دس فیصد طبقہ کے لوگ ہی مستفید ہوتے ہیں۔ اوسط درجے کے لوگ اپنے بچوں کو اسی جگہ پڑھوانے کے لیے خاص قربانی کرتے ہیں۔ باقی کی استطاعت سے یہ تعلیم باہر ہے۔ اس طرح تعلیم میں مساوات ممکن نہیں ہو پاتی اور بدنصیبی یہ ہے کہ یہ فرق بڑھتا جاتا ہے اور مستقل سا ہو چکا ہے۔ شہروں کی طرف رُخ کرنا اور عوام الناس کی

اور اونچے طبقہ کی خلیج بڑھتی جا رہی ہے۔ علاوہ فیس کی رکاوٹ
کے دونوں قسم کے اسکولوں میں رابطہ بھی نہیں۔ اس صورتِ حال
کا شدید ترین ردِ عمل اس فکر سے ہوا کہ سارے پبلک اسکول
جنھیں سرکاری امداد نہیں ملتی ہے، بند کر دیے جائیں اور
کوئی پبلک اسکول گورنمنٹ سے منظور نہ ہوگا۔ سبب یہ ہے
کہ تمام پبلک اسکول جمہوریت میں جگہ نہیں پا سکتے۔ ہندوستان
کا غالب طبقہ غریب ہے اور اسے اپنے بچوں کو ان اسکولوں
میں پڑھانا ممکن نہیں جب کہ ذی حیثیت لوگ قابلیت نہیں بلکہ خاندانی
شرافت کی نسبت سے اپنے بچوں کے اخراجات برداشت کر سکتے
ہیں۔ چنانچہ جو انقلاب اور آزادی مساوات لانے کے لیے آئے
وہ اس نظامِ تعلیم سے مطابقت نہیں رکھتے۔ اس اندازِ فکر سے
تراش خراش کر برابری کی کوشش سے نہ برابری حاصل ہوگی اور
نہ بہتری جس کی آج اور بھی زیادہ ضرورت ہے۔ اچھے اسکولوں
کا معیار پست کرنے سے مقصد پورا نہ ہو جائے گا۔ اچھا تو یہ ہوگا
کہ امدادی اسکولوں کا معیارِ تعلیم بلند کیا جائے، ان کی امداد
میں اضافہ کیا جائے، اساتذہ کو معقول تنخواہیں ملیں، وظائف
کی تعداد میں اضافہ کیا جائے، داخلہ کی بھیڑ بھاڑ کم کی جائے وغیرہ
پرائیویٹ اسکولوں پر شدید تنقید کے باوجود
جو چیز قائم رکھتی ہے وہ والدین کی بچوں کے مستقبل کے بارے
میں دلچسپی ہے وہ چاہتے ہیں کہ اتنا خرچ کرنے پر بچے پوری
طرح سے علم حاصل کریں اور کامیابی کی طرف بڑھیں۔ آزادی
سے قبل والدین کو اتنی فکر نہ تھی۔ غالباً اس کا سبب سماجی کشمکش
اور طبقاتی اختلاط میں کمی کے ساتھ گھر و خاندان کی ضروریات اور
ترقی کے وسیع مواقع ہیں۔ یہ بھی ہے کہ اب شہر کی طرف آنے
کا رجحان بڑھ چکا ہے۔ پھر شہری طور طریقہ اختیار کرنے بھی
ضروری ہو چکے ہیں۔ یہ سب بہتر اسکولوں کے قیام کو ضروری
بناتے ہیں اور والدین بھی اپنے بچوں کی طرف سے متفکر
رہتے ہیں۔

ان پبلک اسکولوں میں جس طرح سے استاد
منتخب ہوتے ہیں اور جس طرح انھیں معاشی و تعلیمی آزادی
ہوتی ہے اس سے ان اچھے اور خوشحال گھرانے کے طلباء
کی تربیت قابلِ قدر ہوتی ہے اور ان کا علمی ذوق نشو و
نما پاتا ہے۔ ذہن کی تربیت ان کی امتحان میں کامیابی اور
زندگی میں آگے بڑھنے کی ضمانت دیتی ہے۔ نہ اسکول اس
طرح وقت کی اہم اور شدید ضرورت کو پورا کرتے ہیں۔ ہمیں
ایسے اسکول مہیا کرنے چاہییں جہاں کے طبقۂ اوسط کے
بچے بھی پوری دلچسپی سے پڑھ سکیں۔ اس ضرورت کو سرکار
نے تسلیم بھی کر لیا ہے اور کئی انگریزی پر توجہ دینے والے
اسکول اخلاق کی تعمیر میں لگے ہوئے ہیں۔ ان میں فوجی اسکول
خاص طور پر نمایاں ہیں۔ یہ وزارتِ دفاع نے قائم کیے ہیں۔
پھر مرکزی اسکول خود وزارتِ تعلیم نے چلا رکھے ہیں۔
پھر پنجاب اسکول ایجوکیشن بورڈ ماڈل اسکول چلا رہی ہے
ان سب کی ملی امداد سرکاری خزانے سے ہوتی ہے۔ جس کا نتیجہ
یہ ہے کہ تعلیم کلی یا جزوی طور پر امداد پر چلنے والی ہو جاتی
ہے۔ اگر حکومت خود معیاری اسکولوں کو مدد دے تو پھر
پبلک اسکول کے خلاف شور و پکار کیوں؟

پبلک اسکولوں کی بابت یہ خیال کہ ان میں خرچ
بہت ہوتا ہے جو عام حیثیت کے انسان کی طاقت سے باہر
ہے، یہ بات صحیح نہیں ہے۔ چونکہ تجربہ سے واضح ہے کہ ان
اسکولوں کا خرچ سرکاری امداد سے چلنے والے اداروں
سے بہت زیادہ نہیں ہے مگر چوں کہ ان کا خرچ والدین
پر پڑتا ہے جو ضرور دشوار ہے مگر یہ اسکول نادار طلبہ کی
مدد بھی کرتے ہیں۔ اسی طرح ان کے اوقات دسماجی ادارے
بھی بار اٹھاتے ہیں۔ اُن کی فروری ۸۱ء کی کانفرنس کے نتیجہ

[illegible] صفحہ [illegible] پر

کامیابی کا راز یہاں ہے

یہ مدراس کا واقعہ ہے۔ سمندر کے ساحل پر دو نوجوان نہا رہے تھے۔ دونوں دوست تھے اور تیراکی اچھا جانتے تھے۔ وہ پانی میں بھی تیرتے تھے اور ڈبکی لگا کر پانی کے اندر اندر بھی دور تک نکل جاتے تھے۔ دونوں تیرتے ہوئے دور تک پہنچ گئے۔ اس کے بعد سمندر میں موجوں کا ایک تھپیڑا آیا۔ دونوں اس کی زد میں آگئے۔ ایک نوجوان زیادہ ماہر تھا۔ "میں موجوں سے لڑ کر پار ہو جاؤں گا" اس نے کہا اور موجوں کے مقابلہ میں اپنی تیراکی کا کمال دکھانے لگا۔ مگر موجوں کا زور زیادہ تھا۔ وہ اپنے طاقتور بازوؤں کے باوجود اس سے نکلنے میں کامیاب نہ ہو سکا اور ڈوب کر مر گیا۔

دوسرا نوجوان بھی طوفان کی زد میں آیا۔ تھوڑی دیر اس نے اپنے ساتھی کی پیروی کی۔ اس کے بعد اس نے محسوس کیا کہ موجوں کی شدت اس سے زیادہ ہے کہ میرے بازو اس کا مقابلہ کر کے نکلنے میں کامیاب ہو سکیں۔ اچانک اس کو ایک بات یاد آئی۔ اس نے سنا تھا کہ موجیں خواہ کتنی ہی شدید ہوں ان کا زور اوپر اوپر رہتا ہے۔ پانی کی نیچے کی سطح پھر بھی ساکن رہتی ہے۔ اس کے بعد اس نے اپنا طریق عمل بدل دیا۔ اوپر کی موجوں سے لڑنے کے بجائے اس نے نیچے کی طرف ڈبکی لگائی اور پانی کی نچلی سطح پر پہنچ گیا۔ یہاں پانی نسبتاً ٹھہرا ہوا تھا اور اس کے لئے ممکن تھا کہ وہ اپنے تیرنے کے فن کو کامیابی کے ساتھ استعمال کر سکے۔ اس نے ساحل کی طرف تیرنا شروع کر دیا۔ اگرچہ وہ کافی تھک چکا تھا تاہم ہاتھ پاؤں مارتے ہوئے بالآخر وہ سمندر کے کنارے پہنچ گیا۔ کنارے پہنچتے پہنچتے وہ بے ہوش ہو چکا تھا۔ سمندر کے کنارے چند ملاح اپنی کشتیاں لئے ہوئے موجود تھے۔ انھوں نے فوراً اسے دیکھ کر اٹھایا اور خشکی پر لے گئے۔ اس کے بعد اس کو اسپتال پہنچایا گیا۔ وہاں چند دن زیر علاج رہ کر وہ اچھا ہو گیا ——— جس نے موجوں سے لڑنے کو تیراکی سمجھا تھا وہ ہلاک ہو گیا اور جس نے موجوں سے کترا کر نکلنے کا طریقہ اختیار کیا وہ کامیاب رہا۔

یہی معاملہ پوری زندگی کا ہے۔ زندگی میں طرح طرح کے طوفان آتے ہیں۔ مگر عقلمندی یہ نہیں ہے کہ جو تھپیڑا سامنے آئے بس آدمی اس سے لڑنا شروع کر دے۔ عقلمندی یہی ہے کہ آدمی جائزہ لے کر دیکھے کہ کامیابی کے ساتھ ساحل تک پہنچنے کا زیادہ قابل عمل راستہ کون سا ہے۔ اور جو راستہ قابل عمل ہو اسی کو اختیار کرے۔ خواہ وہ موجوں کی سطح سے اتر کر نیچے نیچے اپنا راستہ بنانا کیوں نہ ہو۔ یہ قدرت کا انتظام ہے کہ دریاؤں اور سمندروں میں جو تیز و تند موجیں آتی ہیں وہ پانی کے اوپر اوپر رہتی ہیں۔ پانی کے نیچے کی سطح ساکن رہتی ہے۔ چنانچہ طوفان کے وقت مچھلیاں نچلی سطح پر چلی جاتی ہیں۔ یہ قدرت کا سبق ہے۔ اس طرح قدرت ہم کو بتاتی ہے کہ طوفانی موجوں کے وقت ہم کو کیا طریق عمل اختیار کرنا چاہئے۔ زندگی میں کبھی طوفان سے لڑنا بھی پڑتا ہے۔ مگر اکثر اوقات کامیابی کا راز یہ ہوتا ہے کہ آدمی طوفانی سیلاب سے کترا کر نکل جائے۔ وہ طوفان کی زد سے بچتا ہوا اپنا راستہ بنا لے۔

از: الرسالہ، مولوی وحید الدین خاں۔ دہلی

پروفیسر محمد اقبال انصاری
صدر شعبۂ اسلامیات
اے ایم یو

شیخ الاسلام ابن تیمیہ

ساتویں صدی ہجری کا زمانہ مسلمانوں کے لیے بہت ہی ابتلاء و آزمائش کا تھا۔ ایک طرف علم کلام میں جو درحقیقت عقل و دماغ کو ایمان و یقین کی روشنی سے منور کرنے اور یونانی فلسفے کے مقابلہ کے لیے وجود میں آیا تھا، آہستہ آہستہ فلسفہ کی روح سرایت کر گئی تھی۔ یہاں تک کہ علم کلام میں بھی عقل کو پیمانہ تسلیم کیا جانے لگا تھا اور اس میں بھی اللہ تعالیٰ کی ذات و صفات کو عقل کی کسوٹی پر پرکھا جانے لگا تھا۔ دوسری طرف عیسائیوں میں اپنے مذہب کی حقانیت ثابت کرنے اور اسلام پر طرح طرح کے اعتراضات کرنے کی تحریک پیدا ہو رہی تھی جس نے بعد میں مستشرقیت کی شکل اختیار کرلی مگر اس سے زیادہ تشویشناک و خطرناک فرقہ باطنیہ تھا جو مسلم عوام میں دن بہ دن مقبول ہوتا جا رہا تھا اور اس کی شاخیں بلاد اسلامیہ کے مختلف حصوں میں مختلف ناموں سے مسلمانوں میں تشکیک والحاد اور ذہنی انتشار و دین سے بے اعتمادی پیدا کرنے اور مسلمانوں کے خلاف ریشہ دوانیوں میں اپنی پوری قوت صرف کر رہی تھیں۔ تاریخ شاہد ہے کہ جب کبھی کبھی صلیبیوں یا تاتاریوں نے اسلامی ممالک پر حملہ کیا تو اس فرقہ نے دشمنوں کا ساتھ دیا۔ چنانچہ شام پر جب عیسائیوں کا قبضہ ہوا تو انھوں نے باطنیوں ہی کو اپنا معتمد اور مقرب خاص بنایا اور ان کو ان کی "غداری" کا صلہ دیا۔

خود مسلم عوام میں بھی غیر مسلموں کے ساتھ اختلاط اور علماء کی غفلت کی وجہ سے بہت سے مشرکانہ عقیدے پھیل گئے تھے اور توحید و دین خالص کا چراغ ٹمٹمانے لگا تھا۔ یہودیوں اور عیسائیوں کی طرح وہ بھی اولیاء اللہ اور صالحین کے متعلق مختلف غلط قسم کے اعتقادات رکھنے لگے تھے اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے نبیوں کی قبروں کے بارے میں جن اندیشوں کا اظہار کیا تھا وہ حقیقت بن کر نظر آنے لگے تھے۔ تصوف کی خانقاہوں میں بھی یونانی اور ہندوستانی فلسفہ کا عمل دخل ہو گیا تھا اور وہ اسلامی عقائد کے ساتھ اس طرح خلط ملط ہو گیا تھا کہ صحیح اسلامی عقیدے کا پتہ لگانا دشوار ہو گیا تھا۔ جوگ، حلول و اتحاد اور وحدۃ الوجود کے عقیدے تصوف پر بری طرح اثر انداز ہو رہے تھے۔

علمی لحاظ سے بھی امت مسلمہ زوال پذیر تھی علماء کے حلقوں میں جمود طاری تھا اور وہ اپنے اپنے فقہی دائرہ سے ایک قدم بھی باہر نکالنا جرم سمجھتے تھے اور جب کبھی بھی کوئی فقہی اختلاف پیدا ہوتا تھا تو قرآن و سنت کو ثالث بنانے اور ان کے بنیادی اصولوں کی روشنی میں مسئلہ کا حل نکالنے کی بجائے خود قرآن و حدیث کو ان کے مطابق کرنے کی کوشش کی جاتی تھی۔ اسلامی

واجتماعی حیثیت سے بھی بلادِ اسلامیہ کی حالت نا گفتہ بہ حد ابتر تھی
تاتاریوں اور صلیبیوں کے حملوں سے انہیں ناقابلِ تلافی نقصانات
پہنچے تھے۔ اگرچہ صلیبیوں کے قدم تو اکھڑ چکے تھے مگر تاتاریوں
کی "ترک تازیاں" ہنوز جاری تھیں اور سرحدی شہروں کے
باشندوں کو بالخصوص ہر وقت یہ خطرہ لاحق رہتا تھا کہ کہیں
تاتاری حملہ کر کے ان کو تہ تیغ نہ کر دیں۔ بغداد پر ہلاکو خاں کے
حملہ کا منظر ان کی آنکھوں کے سامنے رہتا تھا۔

اس پُر آشوب زمانہ میں شہر حران (دمشق
کے قریب) میں ۱۰ یا ۱۲ ربیع الاول ۶۶۱ھ مطابق ۲۲ یا ۲۴
جنوری ۱۲۶۳ء کو شیخ الاسلام احمد بن تیمیہ پیدا ہوئے۔
تاریخی روایتوں کے مطابق حران وہ پہلا شہر ہے جو طوفانِ نوح کے
بعد روئے زمین پر آباد ہوا اور اسے حضرت ابراہیمؑ کے چچا
ہاران نے آباد کیا تھا اور انہی کے نام سے مشہور ہوا جو معرب
ہو کر حران بن گیا۔ اسے الجزیرۃ الفراتیہ بھی کہا جاتا ہے اور
عربوں نے ۶۳۹ء میں اسے فتح کیا تھا۔ مشہور طبیب، فلسفی و
ریاضی داں، ثابت بن قرۃ (۸۳۶ - ۹۰۱) اور مشہور فلکیات
ابوعبداللہ البتانی [ALBATANIUS] [۸۵۸ - ۹۲۹]
کا مولد بھی یہی ہے۔ آپ کا خاندان قدیم زمانہ ہی سے علم
و فضل کا مرکز و مرجع رہا ہے۔ خود آپ کے والد عبدالحلیم بن
تیمیہ الحرانی اپنے وقت کے نامور عالم دین اور بڑے پایہ کے
محدث و فقیہ تھے اور آپ کے بارے میں علامہ شمس الدین
الذہبی (۱۲۷۴ - ۱۳۴۸) کا قول ہے، کہ آپ علوم و فنون
کے امام اور آسمانِ ہدایت کے ستارہ تھے۔

شیخ الاسلام کا نام احمد، لقب تقی الدین
اور کنیت ابوالعباس تھی مگر آپ نے شیخ الاسلام ابن تیمیہ کے
نام سے شہرت پائی۔ تیمیہ درحقیقت آٹھویں (یا پانچویں؟) پشت
میں آپ کی دادی کا نام تھا جو بڑی ہی صاحبِ علم و فضل اور
مشہور واعظہ تھیں اور ان کے تبحرِ علمی کا دور دور تک شہرہ
تھا۔ چنانچہ اُن کی اولاد نے اپنی نسبت باپ کی بجائے ماں سے
کی اور پھر یہ خاندانی لقب بن گیا اور یہ کوئی عجیب بات نہیں ہے
موجودہ زمانہ میں بھی بعض بیگمات اپنے شوہروں سے زیادہ مشہور
ہیں اور تعارف کے وقت ان کی اولاد اور ان کے رشتہ دار
انھیں کا نام لیتے ہیں (۱)۔

امام ابن تیمیہ کی عمر بمشکل تین سال کی ہوئی ہوگی
کہ ان کے والد نے خود ہی پڑھانا شروع کر دیا چونکہ قوتِ حافظہ
بہت قوی تھی اس لیے جو سبق بھی وہ پڑھاتے دم بھر میں ازبر
ہو جاتا اور مزید پڑھانے کی درخواست کرتے۔ آپ کی عمر چھ سال
کی ہوگی کہ آپ کے والد تاتاریوں کے آئے دن کے مظالم سے
تنگ آ کر دمشق ہجرت کر گئے۔ وہاں آپ کی باقاعدہ تعلیم
کا آغاز ہوا۔ اس وقت دمشق میں مدرسوں کی کوئی کمی نہ تھی۔
مختلف علماء و محدثین اپنے اپنے طور پر مدرسے چلاتے تھے۔ البتہ
حنبلی مسلک (جو امامؒ کا تھا) کے دو مدرسے اس وقت بہت
مشہور تھے۔ دارالحدیث السکریۃ اور المدرسۃ الحنبلیہ
اوّل الذکر کے صدر مدرس خود آپ کے والد تھے اس لیے
آپ نے دونوں مدرسوں میں تعلیم حاصل کی اور ان کے اساتذہ
کے علاوہ اس وقت کے دوسرے علماء و محدثین سے بھی استفادہ
کیا جن کی تعداد دو سو تک پہنچتی ہے۔ جن میں چند خواتین بھی
ہیں البتہ اُن میں

۱۔ شیخ زین الدین ابوالعباس احمد بن عبدالدائم
المقدسی (۱۱۹۱ - ۱۲۷۰)

۲۔ قاضی القضاۃ شمس الدین ابو محمد عبداللہ بن
شرف الدین الاذرعی (۱۱۹۱ - ۱۲۷۴)

۳۔ قاضی القضاۃ شمس الدین ابو محمد عبدالرحمٰن
المقدسی (۱۲۰۰ - ۱۲۸۳)

۴۔ جمال الدین ابو الفرج عبد الرحمٰن بن سلیمان البغدادی [۱۱۸۹ – ۱۲۶۱]

۵۔ زین الدین ابو بکر محمد بن ابی طاہر الاشاطی [۱۲۱۲ – ۱۲۸۵]

۶۔ قاضی القضاۃ نفیس الدین ابو القاسم ہبۃ اللہ الحارثی (۱۲۱۰ – ۱۲۸۱)

۷۔ ام الخیر ست العرب بنت یحییٰ التاجیہ (۱۲۰۲ – ۱۲۸۵ء)

۸۔ ام العرب فاطمہ بنت ابی القاسم (۱۲۰۱ – ۱۲۸۵)

خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔

ابن تیمیہ بچپن ہی سے انتہائی ذہین و زیرک تھے اور ان کا حافظہ بہت ہی قوی تھا۔ اساتذہ کا پڑھایا ہوا سبق سنتے ہی یاد ہو جاتا تھا اور آپ کی قوتِ حافظہ کا دور دور شہرہ تھا اس سلسلہ میں ان کے شاگرد شمس الدین الذہبی نے (۱۲۷۳ – ۱۳۴۸) دو دلچسپ واقعے بیان کیے ہیں:

۱۔ ایک دن ابن تیمیہ کے والد اپنے بچوں کو لے کر سیر و تفریح کرنے جانا چاہتے تھے اس لیے ان سے بھی ساتھ چلنے کو کہا۔ مگر اصرار کے باوجود آمادہ نہ ہوئے۔ جب شام کو ان کے والد گھر لوٹے تو ابن تیمیہ سے کہا کہ آج بڑی اچھی تفریح رہی تم بھی چلتے تو خوب مزا آتا۔ اس وقت ابن تیمیہ کے ہاتھ میں ایک کتاب تھی اس کی طرف اشارہ کرتے ہوئے انھوں نے کہا کہ اگر میں آپ کے ساتھ جاتا تو یہ کتاب کیسے یاد کرتا۔ اس پر ان کے والد بہت حیرت زدہ ہوئے۔ اور پوچھا کہ کیا تم نے واقعتہً یہ پوری کتاب حفظ کرلی؟ ابن تیمیہ نے جواب دیا: 'جی ہاں' اس پر انھوں نے وہ کتاب اپنے ہاتھ میں لے لی اور ابن تیمیہ سے سنانے کے لیے کہا۔ انھوں نے پوری کتاب فرفر سنادی۔ اس پر انھوں نے بیٹے کو سینے سے لگا کر کہا "بیٹا! یہ واقعہ کسی اور کو نہ بتانا۔ ورنہ تمہیں نظر لگ جائے گی۔"

۲۔ حلب کے ایک شخص نے ابن تیمیہ کے حافظے کی شہرت سنی تو اس کی تصدیق کرنے دمشق آیا اور ایک درزی سے ان کا پتہ پوچھا، اس نے کہا کہ آپ یہیں ٹھہریے وہ روزانہ ادھر سے گزرتے ہیں جب گزریں گے تو میں بتلا دوں گا۔ تھوڑی دیر میں ابن تیمیہ ہاتھ میں تختی لیے اور بغل میں بستہ دبائے مدرسہ سے واپس ہوتے نظر آئے۔ درزی نے ان کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا کہ یہی لڑکا ابن تیمیہ ہے۔ اس شخص نے انھیں بلایا اور ان کی تعلیم کے متعلق کچھ دریافت کرنے کے بعد کہا کہ میں کچھ حدیثیں لکھواتا ہوں انھیں تختی پر لکھو۔ اس شخص نے گیارہ یا تیرہ حدیثیں املا کیں۔ جب ابن تیمیہ لکھ چکے تو اس شخص نے کہا کہ ان حدیثوں کو پڑھو۔ ابن تیمیہ نے ایک نظر ان احادیث پر ڈالی اور پھر تختی اس شخص کے حوالہ کرکے کہا کہ سن لیجیے اور روانی کے ساتھ ساری احادیث من وعن سنا دیں۔ اس شخص کو بڑا تعجب ہوا اور اس نے دوبارہ چند اسناد احادیث لکھوائیں اور پہلے کی طرح ان کو پڑھ کر سنانے کے لیے کہا، آپ نے ایک مرتبہ غور سے دیکھنے کے بعد تختی شیخ کے حوالہ کردی اور تمام اسناد بغیر کسی تغیر و تبدل کے سنا دیں۔ اس پر وہ شخص بہت ہی حیرت زدہ ہوا اور کہا کہ اگر یہ لڑکا زندہ رہا تو یقیناً بڑے مرتبہ والا ہوگا۔ اس لیے کہ اس بلا کا حافظہ میں نے آج تک کسی کا بھی نہیں دیکھا۔

امام ابن تیمیہ ابھی سن بلوغ کو بھی نہیں پہونچے تھے کہ تمام علوم اسلامیہ بالخصوص قرآن، حدیث، فقہ اور مناظرہ میں مہارت تامہ حاصل کرلی اور ان کا شمار اس وقت کے بڑے علماء میں ہونے لگا۔ علامہ ابن قدامہ لکھتے ہیں کہ آپ نے یہ تمام علوم بیس سال سے کم عمر میں

حاصل کیے تھے۔ ابن تیمیہ کی علمی لیاقت کا اس واقعہ سے اندازہ لگایا جاسکتا ہے کہ بچپن میں جب آپ مدرسہ جایا کرتے تھے تو راستہ میں ایک یہودی عالم آپ سے علمی و دینی سوالات کیا کرتا تھا اور آپ اس کے سوالات کا تشفی بخش جواب دیا کرتے تھے۔ یہ سلسلہ ایک عرصہ تک جاری رہا اور بالآخر آپ کی ذہانت و علمیت سے متاثر ہوکر وہ یہودی عالم حلقہ بگوش اسلام ہوگیا۔

۱۲۸۲ء — مطابق — ۶۸۲ھ میں اگرچہ ابن تیمیہ اپنے والد عبدالحلیم بن تیمیہ کے انتقال کے وقت سن عیسوی کے لحاظ سے صرف انیس۱۹ سال کے تھے مگر حکومت نے انھیں ان کے والد کی جگہ دار الحدیث السکریہ کا شیخ الحدیث مقرر کردیا۔ اس زمانہ کا دستور تھا کہ نئے استاد کے پہلے درس میں قضاۃ، علماء اور عمائدین شریک ہوا کرتے تھے۔ چنانچہ حسب روایت ابن تیمیہ کے پہلے درس میں بھی بڑے بڑے اہل علم و دانش اور عمائدین شہر شریک ہوئے۔ جن میں قاضی القضاۃ بہاء الدین بن الزکی الشافعی، شیخ الشافعیہ تاج الدین الفزاری اور شیخ الحنابلہ زین الدین بن المنجی الحنبلی خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔ اس درس میں ابن تیمیہ نے صرف بسم اللہ الرحمن الرحیم کی تشریح کی اور اتنے نکتے بیان کیے کہ تمام سامعین دم بخود رہ گئے۔ اُن کا یہ بیش بہا اور پُر از معلومات درس آج بھی بجنسہٖ محفوظ ہے۔

امام ابن تیمیہ کا دستور تھا کہ جب درس شروع کرتے تو سب سے پہلے قرآن مجید سے استدلال کرتے اور تمام متعلقہ آیات کو پیش کر کے اُن کے معانی و مطالب پر سیر حاصل بحث کرتے، ان کے الفاظ و معانی کی تعیین آیتوں ہی سے کرتے، ان کی باریکیوں کو سمجھاتے اور ان میں جو نکات پوشیدہ ہوتے ان کی وضاحت کرتے۔ پھر احادیث سے دلیل لاتے اور ائمہ اربعہ کی رایوں کو سامنے رکھ کر ان پر بے لاگ تبصرہ کرتے اور آخر میں جو رائے یا قول خود ان کے نزدیک قوی ترین و راجح ہوتا اسے ہی ترجیح دیتے۔ درس و تدریس کا یہ طریقہ صرف مدرسہ ہی تک محدود نہ تھا، افادۂ عوام کی خاطر آپ پابندی کے ساتھ ہر جمعہ میں بعد نماز قرآن مجید کی تفسیر بیان کیا کرتے تھے جس میں کثرت سے لوگ شریک ہوتے تھے۔ تفسیر قرآن کا یہ سلسلہ کئی سال تک جاری رہا۔ آپ کے علم و فضل اور قبول عام کی بنا پر آپ کو قاضی القضاۃ (چیف جسٹس) کا عہدہ پیش کیا گیا جس کے حصول کے لیے بڑے بڑے علماء و فضلاء عمائدین حکومت کے دروں پر حاضری دیا کرتے تھے اور ایڑی چوٹی کا زور لگاتے تھے مگر آپ کی غیور طبیعت نے ان شرائط کی پابندی گوارہ نہ کی جو یہ عہدہ سنبھالنے سے قبل حکومت سے کرنا ہوتی ہیں اور آپ نے اس عہدہ کے قبول کرنے سے صاف انکار کر دیا۔ البتہ شیخ الحنابلہ زین الدین بن المنجی (م ۱۲۹۵) کی وفات پر اُن کی قائم مقامی اور مدرسہ حنبلیہ کی صدر مدرسی قبول فرمائی۔

امام ابن تیمیہ کی یہ روز افزوں ترقی ان کے معاصرین و مخالفین کے دل میں کانٹا بن کر چبھ رہی تھی اور وہ کسی نہ کسی بہانے انھیں زک دینے کی فکر میں تھے۔ چنانچہ ۱۲۹۸ء میں انھیں شہر حماۃ (شام) سے ایک استفتا موصول ہوا جس میں "الرحمٰن علی العرش استوی" (طٰہٰ: ۵) جیسی آیات اور ان کے ہم معنیٰ احادیث و صفات باری تعالیٰ کے بارے میں علماء اہل سنت کا مسلک دریافت کیا گیا تھا۔ شیخ الاسلام نے اس کا جو مدلل و مفصل جواب دیا وہ العقیدۃ الحمویۃ الکبریٰ کے نام سے مجموعۃ الرسائل الکبریٰ (قاہرہ: ۱۹۰۵ء) میں شائع ہوچکا ہے۔ اس میں آپ نے متکلمین پر تنقید کی ہے اور سلف صالحین کے مسلک

...سرا ہاہے۔ اس فتویٰ کی وجہ سے علماء کا ایک طبقہ آپ سے ناخوش اور آپ کا مخالف ہوگیا۔ آپ کے عقیدہ کی سخت مخالفت کی اور حکومتِ وقت کو آپ کے خلاف ورغلایا۔ چنانچہ امیر سیف الدین جاغان کے حکم سے دربار میں علماء و قضاۃ پر مشتمل ایک مجلس منعقد کی گئی جس میں امام ابن تیمیہ کے فتویٰ کا ہر پہلو سے جائزہ لیا گیا اور بڑی بحث و تمحیص کے بعد یہ فیصلہ ہوا کہ اُن کے معتقدات بالکل صحیح ہیں۔ اس کے باوجود کچھ علماء و متکلمین اُن کی مخالفت سے باز نہ آسکے۔

شام کے خلاف تاتاریوں کی شورشیں متواتر بڑھتی جا رہی تھیں وہ شہروں میں گھس کر انھیں تاراج کر دیتے خون کی ندیاں بہاتے اور ظلم و ستم کا بازار گرم کر دیتے۔ آخرکار امام ابن تیمیہ نے ان کے خلاف جہاد کا فتویٰ دیا اور اپریل ۱۳۰۳ء (رمضان ۷۰۲ھ) کی جنگ میں یہ فتویٰ بھی صادر کر دیا کہ جنگ کی حالت میں مجاہدین کو روزہ کھول دینا چاہیے اور خود بھی گھوڑوں پر مجاہدین کے ساتھ رہے اور بڑھ بڑھ کر سپہ سالاروں اور سپاہیوں کے حوصلے بڑھاتے۔ اس جانفروشی کے نتیجہ میں تاتاریوں کے قدم اُکھڑ گئے اور انھیں شکست فاش اُٹھانی پڑی۔ تاتاریوں سے فارغ ہونے کے بعد امام ابن تیمیہ نے کسروان کے باغیوں کی سرکوبی کا فتویٰ صادر کر دیا۔ چنانچہ فوج نے ان باغیوں کا سر کچل کر رکھ دیا ساتھ ہی امام ابن تیمیہ کی اپنی کوششوں سے کسروانیوں کی ایک اچھی خاصی تعداد تائب ہوگئی۔

اللہ تعالیٰ کی یہ سنت ہے کہ جو اس کی راہ پر چلتا ہے وہ اسے آزماتا بھی ہے اور جتنا زیادہ حق پرست و حق گو ہوتا ہے اس کو اتنی ہی زیادہ آزمائش سے دوچار ہونا پڑتا ہے۔ امام ابن تیمیہ حق پرست بھی تھے اور حق گو بھی، اس لیے اللہ تعالیٰ نے ان کی بھی سخت آزمائش کی اور تاریخ کے اوراق شاہد ہیں کہ وہ ہر آزمائش سے سرخرو و کامران ہو کر نکلے۔ تاتاریوں اور کسروانیوں کی سرکوبی سے فراغت حاصل کرنے کے بعد امام تیمیہ دوبارہ درس و تدریس اور وعظ و ارشاد میں لگ گئے اور ساتھ ہی ساتھ بدعات و منکرات کے خلاف بھی جہاد کا آغاز کر دیا۔ اُس زمانہ میں یہودیوں و عیسائیوں کے ساتھ میل جول کی وجہ سے مسلمانوں میں بہت سی مشرکانہ رسمیں راہ پاگئی تھیں۔ جن میں نہر قلوط (نواحِ دمشق میں) کی چٹان سے منتیں و مرادیں ماننا بھی تھا اس چٹان کے متعلق طرح طرح کی روایتیں مشہور تھیں اور ہر سال مسلمانوں کا ایک مجمع وہاں جاتا اور اپنی من مانی مرادیں پانے کے لیے نذر و نیاز کرتا۔ امام ابن تیمیہ کو جب اس کا علم ہوا تو چند مزدوروں اور سنگ تراشوں کو لے کر وہاں جا پہونچے اور اس چٹان کے ٹکڑے ٹکڑے کر کے شرک و بدعت کے اس دروازہ کو ہمیشہ ہمیشہ کے لیے بند کر دیا۔

شرعی و اخلاقی احتساب کے لیے امام ابن تیمیہ نے خود اپنے تلامذہ و رفقاء پر مشتمل ایک محکمہ قائم کر رکھا تھا اگر حکومت عوام میں پھیلی بعض بدعات و منکرات پر توجہ نہ دیتی تو یہ محکمہ ان کو بزور ختم کرا دیتا۔ ۱۳۰۴ء کا واقعہ ہے کہ ایک پیر مرد جو اپنے کو المجاہد ابراہیم بن القطان کہتا، امام ابن تیمیہ کے پاس اس حال میں لایا گیا کہ وہ بہت لمبی چوڑی گدڑی میں ملبوس تھا، اس کے بال اور ناخن بڑھے ہوئے تھے، لبیں منھ کو آرہی تھیں، ہر وقت فحش گالیاں بکتا تھا اور نشہ آور چیزوں کا استعمال کرتا تھا۔ آپ نے اس کی گدڑی کے پارہ پارہ کرنے کا حکم دیا۔ سب لوگ ٹوٹ پڑے اور چشم زدن میں اس کی گدڑی تار تار ہوگئی اس کے بال و ناخن ترشوائے گئے اور فحش کلامی اور نشہ آور اشیاء...

کے استعمال سے توبہ کرائی گئی اور پھر وہ راہ راست پر آگیا۔ اسی طرح کے اور بھی کئی واقعات ہوئے جن سے عوام واصحاب اقتدار کا ایک طبقہ ان کا مخالف ہوگیا لیکن ان کی اکثریت امام ابن تیمیہ کی ممد ومعاون رہی۔

اسی اثنا میں ابن تیمیہ کو پتہ چلا کہ مصر میں ایک شخص ابوالفتح نصر الدین المنبجی حکومت وقت پر بُری طرح اثر انداز ہو رہا ہے اور وہ "وحدت الوجود" کا قائل اور شیخ محی الدین ابن العربی (۱۱۶۵ — ۱۲۴۰ء) کا معتقد ہے۔ چنانچہ آپ نے سلطان مصر ملک الناصر محمد بن قلاوون (۱۲۸۵ — ۱۳۴۱ء) کو ایک طویل مراسلہ بھیجا جس میں منبجی اور ابن عربی کے عقیدہ پر سخت تنقید کی جسے پڑھ کر منبجی آگ بگولہ ہوگیا اور سلطان مصر کو امام ابن تیمیہ کے خلاف بھڑکایا۔ اس پر سلطان مصر نے امیر سیف الدین جاغان کو خط لکھا کہ ابن تیمیہ کے عقیدہ کا دوبارہ امتحان لیا جائے۔ چنانچہ دوبارہ علماء وقضاۃ پر مشتمل ایک مجلس نے ان کے عقیدہ کا امتحان لیا اور انہیں صحیح العقیدہ قرار دیا لیکن مصر کا وزیر اعظم، رکن الدین بیبرس المنصوری (م ۱۳۲۴ء)، جو سلطنت کے سیاہ وسپید کا مالک تھا، ابن عربی اور منبجی کا بڑا معتقد تھا۔ اس لیے اس نے امام ابن تیمیہ کو زک پہونچانے کی غرض سے سلطان مصر کی طرف سے انھیں فوراً طلبی کا فرمان بھجوایا۔ احباب وتلامذہ اور خود امیر سیف الدین جاغان نے جو آپ کا بڑا ہی معتقد تھا، آپ کو روکنے کی امکانی کوشش کی مگر آپ اس پر کسی طرح بھی رضامند نہ ہوئے اور مصر پہونچے اور آپ کے محاکمے کے لیے قضاۃ واعیان سلطنت پر مشتمل ایک مجلس بلائی گئی جس میں امام ابن تیمیہ نے کچھ کہنا چاہا مگر انھیں اس سے روک دیا۔ اس پر انھوں نے دریافت کیا کہ میرے معاملے میں حکم کون ہے؟ جواب ملا کہ قاضی ابن مخلوف المالکی۔ اس پر انھوں نے فوراً کہا کہ وہ تو میرے حریف ہیں پھر حکم کیسے بن سکتے ہیں؟ اس پر ابن مخلوف کو غصہ آگیا اور انھوں نے ابن تیمیہ کے خلاف حکم صادر کردیا۔ جس کے مطابق انھیں بُرج میں قید کردیا گیا اور پھر عید کی رات انھیں مصر کی مشہور جیل جُبّ (کنواں) میں منتقل کردیا گیا۔ وہاں بعض قضاۃ، امراء نیز گورنر مصر کی جانب سے چھ بار یہ کہلایا گیا کہ اگر ابن تیمیہ اپنے بعض عقائد سے رجوع کرلیں تو انھیں رہا کردیا جائے گا۔ مگر آپ نے کسی قسم کی شرط پر رہائی نامنظور کردی اور سنت یوسفی میں یہی جواب دیا کہ "رب السجن احب الی مما یدعوننی الیہ" (ق ۱۲: ۳۳) [اے میرے پروردگار مجھے اس سے تو قید خانہ ہی بہتر ہے جس کی دعوت دیتے ہیں] بالآخر ڈیڑھ سال بعد رہا کردیا اور آپ وہاں سے اپنے معاندین ومخالفین کو زبان حال سے سنت یوسفی میں "لا تثریب علیکم الیوم (ق ۱۲ : ۹۲) [آج تم پر کوئی الزام نہیں ہے] کا مژدہ سناتے ہوئے نکلے۔

رہائی کے بعد آپ نے مصر ہی میں درس وتدریس، تصنیف وتالیف اور وعظ وارشاد کا سلسلہ شروع کردیا۔ مصر کی ایک جامع مسجد میں نماز جمعہ پڑھاتے اور اس کے بعد وعظ کہا کرتے تھے۔ اگرچہ ان دنوں مصر عقیدہ وحدت الوجود کا ایک مرکز تھا۔ پھر بھی آپ بلا جھجک اپنے وعظ وخطبہ میں اس کی تردید کرتے تھے۔ اس سے صوفیوں کا ایک طبقہ آپ سے سخت ناراض ہوگیا اور سلطان مصر سے اس کی شکایت کی۔ اس نے دار العدل میں ایک مجلس منعقد کی مگر ابن تیمیہ کے خلاف کارروائی کا کوئی جواز نہ نکلا۔ بالآخر روز روز کی شکایت وشورش سے تنگ آکر یہ تجویز رکھی گئی کہ یا تو وہ اپنے وطن "دمشق" واپس چلے جائیں یا اسکندریہ میں رہیں مگر اپنے مخصوص عقائد کی تبلیغ نہ کریں، یا پھر جیل میں رہیں۔ آپ نے اس بار بھی سنت یوسفی

یں آخری شکل منظور کی مگر تلامذہ واحباب کے شدید اصرار پر دمشق
واپس جانا منظور کر لیا لیکن راستہ ہی سے واپس بلا کر آپ
کو قاضی القضاۃ بدر الدین بن جماعۃ (م ۱۳۳۲ء) کی عدالت میں
پیش کیا گیا جہاں سے پھر حکم قید صادر ہوا اور آپ حارۃ الدیلم
کے قید خانہ میں محبوس کر دیے گئے۔ یہاں آپ نے قیدیوں کی
اصلاح حال کی طرف توجہ کی اور چند ہی روز میں یہ قید خانہ علم و
مذہب کا گہوارہ بن گیا اور بالآخر صدر مدرسہ صالحیہ میں تین قضاۃ
کا اجتماع ہوا اور ان سب کی متفقہ تجویز پر آپ کی قید ختم کر دی
گئی اور آپ لوگوں میں پہلے سے زیادہ مقبول ہو گئے۔

اسی اثناء مصر کے سیاسی حالات میں کچھ
ایسا تغیر ہوا کہ ابن تیمیہ کے لیے مشکلات بڑھ گئیں۔ سلطان
بن قلاوون نے سلطنت سے کنارہ کشی اختیار کر لی اور رکن
الدین بیبرس جاشنگیر نے اپنی خود مختار سلطنت کا اعلان کر دیا
یہاں کے شیخ نصر الدین المنبجی اس کے مشیر خاص اور ابن تیمیہ
کے شدید مخالف تھے۔ نیز سلطان بن قلاوون بھی ابن تیمیہ کے
ہمدرد و حامی سمجھے جاتے تھے اس لیے ابن تیمیہ کو اس خیال
سے اسکندریہ جلاوطن کر دیا گیا کہ وہ ان دنوں تصوف و
صوفیاء کا مرکز تھا ممکن ہے کہ کوئی دل جلا ان کا کام تمام
کر دے۔ لیکن اس کے برخلاف وہاں ابن تیمیہ کی طرف رجوع
عام ہو گیا اور وہ کتاب و سنت کی ترویج اور شرک و بدعت
کی تردید میں لگ گئے اور تھوڑے ہی دنوں میں وہاں تلامذہ
و معتقدین کا ایک اچھا خاصا حلقہ بن گیا۔ نیز ابن تیمیہ کی پیشین
گوئی کے مطابق رکن الدین کا خود ستارہ گردش میں آ گیا اور
وہ اپریل ۱۳۱۰ء میں قتل کر دیا گیا اور ابن قلاوون نے پھر
زمام سلطنت اپنے ہاتھ میں لے لی اور اولین فرصت میں ابن تیمیہ
کی جلاوطنی ختم کر کے نہایت تزک و احتشام کے ساتھ انھیں
اسکندریہ سے قاہرہ بلا لیا۔

ایک مدت تک قاہرہ میں قیام کرنے کے بعد امام
ابن تیمیہ دمشق آ کر درس و تدریس، تصنیف و تالیف اور
افتاء میں لگ گئے۔ آپ کا اجتہاد تھا کہ حلف بالطلاق یمین
ہے۔ اس پر حکومت اور قاضیوں کی طرف سے آپ کو طلاق
کے بارے میں فتویٰ دینے سے روک دیا گیا۔ آپ نے ان
فرمانوں کو نظر انداز کر دیا اور فتویٰ دیتے رہے۔ اس پر
پھر آپ کو قید و بند کی سزا دی گئی جس سے تقریباً ساڑھے
پانچ ماہ بعد رہائی ملی اور آپ پھر اپنے مشاغل میں لگ گئے
ان دنوں وہاں زیارت قبور کا بڑا رواج تھا مگر ابن تیمیہ
اسے جائز نہیں سمجھتے تھے اور علی الاعلان اس کی مخالفت
کرتے تھے۔ چنانچہ اس سلسلہ میں آپ کے خلاف اتنا بڑا ہنگامہ
ہوا کہ آپ کے بڑے بڑے حامی دم بخود ساتھ چھوڑ گئے اور
مخالفین نے بہت کوشش کی کہ یا تو آپ کی زبان کاٹ لی
جائے یا جلاوطن کر دیا جائے یا پھر کوڑوں اور دائمی حبس
کی سزا دی جائے۔ مگر آپ اعلاء کلمۃ الحق سے باز نہ آ سکے
بالآخر مخالفین کی ایک جماعت سلطان مصر کے پاس پہونچی اور
آپ کے قتل کر دیے جانے پر اصرار کیا لیکن سلطان نے صرف
قید کرنے ہی پر اکتفا کی جس سے چند ماہ بعد رہائی مل گئی۔

اس کے کچھ ہی دنوں بعد پھر ایک استفتاء
زیارت قبور کے لیے سفر کے بارے میں آیا تو آپ نے اس کے
ناجائز ہونے کا فتویٰ دیا۔ اس پر علماء اور صوفیاء کا ایک
گروہ آپ کا دشمن ہو گیا اور آپ کے خلاف ہنگامہ برپا کر دیا
چنانچہ آپ کے محبوس کیے جانے کا فرمان صادر ہو گیا اور
اس بار قلعہ دمشق کے ایک ایوان میں آپ قید کر دیے گئے
آپ نے خلوت و تنہائی کے اس موقع کو غنیمت جانا اور پورے
انہماک کے ساتھ عبادت و تلاوت اور تصنیف و تالیف میں
لگ گئے۔ آپ جو کچھ بھی لکھتے اسے آپ کے معتقدین ہاتھوں

ہاتھ لیتا اور ملک کے ایک سرے سے دوسرے سرے تک پہنچا دیتے۔ انھیں تصانیف میں "الرسالۃ الاخنائیۃ" بھی تھا جس میں آپ نے مالکی قاضی عبداللہ بن الاخنائی کے خیالات کی تردید کی تھی۔ قاضی صاحب نے اس کی شکایت سلطان مصر سے کی اور ان کے ارادہ پر سلطان نے فرمان جاری کر دیا کہ آپ کے پاس لکھنے پڑھنے کا کوئی سامان نہ چھوڑا جائے اور جتنی کتابیں اور کاغذ، قلم دوات ہو اسے ضبط کر لیا جائے۔ چنانچہ یہ سارا سامان آپ کے پاس سے کتب خانہ عادلیہ (موجودہ مکتبہ ظاہریہ) کے سامنے منتقل کر دیا گیا۔ چنانچہ پھر آپ نے منتشر اوراق پر کوئلے سے لکھنا شروع کر دیا اور زیادہ وقت عبادت و تلاوت میں صرف کیا کرتے۔ چنانچہ آپ کے بھائی عبدالرحمٰن بن تیمیہ کا بیان ہے کہ آپ نے قرآن مجید کے اسی دورے کیے آخری دورے کے درمیان طبیعت ایسی بگڑی کہ پھر نہ سنبھلی اور ۲۰ یا ۲۲ ذوالقعدہ ۷۲۸ھ (۲۰ یا ۲۹ ستمبر ۱۳۲۸ء) کی شب میں آپ اپنے مالک حقیقی سے جا ملے۔ انا للہ و انا الیہ راجعون۔

قلعہ کے موذن نے مینار پر چڑھ کر شیخ الاسلام کی وفات کی اطلاع دی اور آناً فاناً یہ خبر پورے شہر میں پھیل گئی۔ قلعہ کا دروازہ کھول دیا گیا اور لوگ جوق در جوق آخری زیارت کے لیے آنے لگے۔ اور آپ کو بڑے تزک و احتشام کے ساتھ عصر کی اذان کے وقت دمشق کے مشہور قبرستان مقبرۃ الصوفیہ میں سپرد خاک کر دیا گیا۔ جنازہ میں شرکت کرنے والوں کی تعداد کا اندازہ ساٹھ ہزار سے لے کر ایک لاکھ تک کیا گیا ہے۔ میں نے ۱۹۵۶ء میں اس قبرستان کو دیکھا ہے جسے جامعہ سوریہ (شام) کی تعمیر کے وقت مع اقوات ذات مسمار کر دیا گیا تھا اور زبان حال سے یہ

زمیں کھا گئی آسماں کیسے کیسے

کا نوحہ پڑھ رہا تھا۔ اس بے کراں میں حافظ ابن عساکر (۵۷۱-۱۱۰۵) اور علامہ ابن کثیر (۷۷۴ - ۱۳۷۰) جیسے نہ معلوم کتنے علماء و فضلا کی قبریں تھیں جن کا اب نام و نشان بھی باقی نہیں رہا ہے۔ صرف شیخ الاسلام کی قبر یونیورسٹی کے اسپتال کے سامنے باقی رہ گئی تھی۔

شیخ الاسلام نے اپنی پوری زندگی بدعتوں اور بدعقیدگیوں کے خلاف جہاد میں صرف کر دی اور درس و تدریس اور تقریر و تحریر کی پوری صلاحیتوں کو اس کے لیے وقف کر دیا لیکن اس کی خاطر قید و بند کی مصیبتیں بھی اٹھائیں مگر اعلائے کلمۃ الحق سے بال برابر انحراف نہ کیا اور اپنے پیچھے تصانیف کی بے شمار تعداد چھوڑی۔

شیخ الاسلام کی تصانیف کی صحیح تعداد بتلانا بہت دشوار ہے۔ آپ کے شاگرد شمس الدین الذہبی نے ان کی تعداد ایک ہزار بتلائی ہے۔ حاجی خلیفہ (۱۰۶۷-۱۶۵۷) نے کشف الظنون میں ان کی تعداد ۴۳۳ بتلائی۔ غلام جیلانی برق نے سوانح ابن تیمیہ (لاہور، ب، ت) میں حروف تہجی کے اعتبار سے انھیں مرتب کر کے ۴۷۰ تعداد بتلائی ہے۔ مگر یہ بھی لکھا ہے کہ ہر جلد کو اگر انفرادی طور پر ایک تصنیف فرض کر لی جائے تو ان کی تعداد ۵۰۰ تک پہنچ جاتی ہے۔ شیخ ابو زہرہ نے ابن تیمیہ، حیاتہ و عصرہ، آراء و فقہہ (قاہرہ ۱۹۵۲ء) میں فنی تقسیم کے بعد ان کی تعداد ۱۹۵ بتلائی ہے۔ محمد یوسف کوکن صاحب نے اپنی کتاب "ابن تیمیہ" (مدراس ۱۹۵۹ء) میں اکتیس مطبوعہ کتابوں کی نشاندہی کی ہے۔ بہرحال آپ کی بیشتر تصانیف دستبرد زمانہ سے محفوظ نہ رہ سکیں جو باقی بچی ہیں ان میں سے حسب ذیل خصوصیت کے ساتھ قابل ذکر ہیں۔ مگر اختصار کی وجہ سے میں ان کے ناموں ہی پر اکتفا کروں گا۔

۱۔ الامامۃ والسیاسۃ
۲۔ تفسیر ابن تیمیہ
۳۔ الجواب الصحیح لمن بدل دین المسیح (۲ جلدیں)
۴۔ الرد علی المنطقیین
۵۔ فتاوی ابن تیمیہ (۳۰ جلدیں)
۶۔ المستصفی
۷۔ منہاج السنۃ النبویہ

تصانیف ہی کی طرح آپ کے تلامذہ بھی بے شمار ہیں اور ان کی صحیح تعداد بتلانا دشوار ہے۔ میں ذیل میں چند صاحب تصانیف اور مشہور تلامذہ کے نام پر اکتفا کروں گا۔ پھر ان شاء اللہ آئندہ ان کا مختصر تعارف پیش کروں گا جنہوں نے عالم اسلام کی دنیا میں ایک انقلاب برپا کیا اور آج بھی اہل علم ان سے فیضیاب ہو رہے ہیں، ان کی تصانیف جدید انداز سے شائع ہو رہی ہیں۔ اور ان کے مختلف زبانوں بالخصوص اردو میں ترجمے چھپ کر مقبول عام ہو رہے ہیں۔

۱۔ شمس الدین ابو عبداللہ محمد بن (ابی بکر الزرعی المعروف بابن قیم الجوزیہ (۱۲۹۲-۱۳۵۰) صاحب زاد المعاد فی ہدی خیر العباد وغیرہ

۲۔ ابو الفداء عماد الدین اسماعیل بن عمر المعروف بابن کثیر (۷۲ — ۱۳۰۰) صاحب البدایہ والنہایہ وتفسیر ابن کثیر وغیرہ۔

۳۔ شمس الدین ابو عبداللہ محمد بن ابی بکر المعروف بالذہبی (۱۲۷۴-۱۳۴۷) صاحب تاریخ الاسلام الکبیر وتذکرۃ الحفاظ وغیرہ۔

۴۔ شمس الدین ابو عبداللہ محمد بن احمد بن عبدالہادی المقدسی المعروف بابن عبدالہادی ۴۳-۱۳۰۴ء) صاحب الاحکام الکبری والاعلام فی ذکر مشائخ الائمۃ الاعلام۔

۵۔ زین الدین ابو الفرج عبدالرحمن بن رجب الحنبلی (۹۳-۱۳۰۹) صاحب التخویف من النار والتعریف دار البوار

علامہ شبلی نعمانی (۱۸۵۷-۱۹۱۴ء) نے لکھا ہے

"اسلام میں سیکڑوں ہزاروں بلکہ لاکھوں علماء، فضلاء، مجتہدین، ائمہ فن اور مدبرین ملک گزرے لیکن مجدد یا ریفارمر بہت کم پیدا ہوئے۔

مجدد یا ریفارمر کے لیے تین شرطیں ضروری ہیں

۱۔ مذہب، علم یا سیاست (پالیٹکس) میں کوئی مفید انقلاب پیدا کرے۔

۲۔ جو خیال اس کے دل میں آیا ہو کسی کی تقلید سے نہ آیا ہو، بلکہ اجتہادی ہو۔

۳۔ جسمانی مصیبتیں اٹھائی ہوں، جان پر کھیلا ہو سرفروشی کی ہو۔

یہ شرائط قدماء میں بہت کم پائے جاتے ہیں اور ہمارے زمانے میں تو ریفارمر ہونے کے لیے صرف یورپ کی تقلید کافی ہے

تیسری شرط اگر ضروری قرار نہ دی جائے تو امام ابو حنیفہؒ، امام غزالیؒ، امام رازیؒ شاہ ولی اللہ صاحبؒ اس دائرہ میں آسکتے ہیں۔ لیکن جو شخص ریفارمر کا اصلی مصداق ہو سکتا ہے وہ علامہ ابن تیمیہؒ ہے۔ مجدد ہونے کی اصلی خصوصیتیں جس قدر علامہ کی ذات میں پائی جاتی ہیں اس کی نظیر بہت کم مل سکتی ہے"

(مقالات شبلی، ج ۵، ص ۳۳۳
اعظم گڑھ: ۱۹۵۵ء)

میاں محمد یوسف

اردو زبان اور اس کا بیان

[آثار الصنادید مطبوعہ ۱۸۵۴ء و ۱۹۰۴ء]

اردو زبان کے متعلق یہ مضمون سرسید مرحوم نے آثار الصنادید کے دوسرے ایڈیشن مطبوعہ ۱۸۵۴ء کے آخر میں لکھ کر شامل کیا تھا۔ ۱۹۰۴ء کے کانپور والے ایڈیشن میں بھی یہ مضمون موجود ہے۔ صرف پہلے ایڈیشن میں نہیں ہے۔ اردو زبان کی مختصر تاریخ اور اس کی بتدریج اشاعت کے سلسلہ میں غالباً یہ پہلا مضمون ہے جو سرسید کے قلم سے نکلا۔ لسانیات ... کی بہت سی نئی باتیں آپ کو اس مضمون کے پڑھنے سے معلوم ہوں گی۔

— محمد اسماعیل پانی پتی

(۱) ہندوؤں کے راج میں تو یہاں ہندی بھاشا بولنے چالنے لکھنے پڑھنے میں آتی تھی۔ ۵۸۰ ہجری مطابق ۱۲۰۸ عیسوی موافق سمت ۱۲۱۱ بکرماجیت کے جب مسلمانوں کی سلطنت نے یہاں قیام پایا تو بادشاہی دفتر فارسی ہو گیا۔ مگر زبان رعایا کی وہی بھاشا رہی۔ ۸۹۰ ہجری مطابق ۱۴۸۸ء تک بجز بادشاہی دفتر کے رعایا میں فارسی کا رواج نہیں ہوا اس کے چند روز بعد سلطان سکندر لودھی کے عہد میں سب سے پہلے ہندوؤں میں سے کائستھوں نے جو ہمیشہ سے امورات ملکی اور ترتیب دفتر میں مداخلت رکھتے تھے، فارسی لکھنا پڑھنا شروع کیا۔ پھر رفتہ رفتہ اور قوموں نے بھی شروع کر لیا اور فارسی لکھنے پڑھنے کا ہندوؤں میں بھی رواج ہو گیا

(۲) اگرچہ اکبر اور جہانگیر کے عہد تک ہندی بھاشا میں تغیر و تبدل نہیں ہوئی تھی۔ مسلمان اپنی گفتگو فارسی زبان میں اور ہندو اپنی گفتگو بھاشا میں کیا کرتے تھے۔ پر جب بھی امیر خسرو نے خلجی بادشاہوں کے ہی زمانے سے یعنی حضرت مسیح سے تیرھویں صدی میں فارسی زبان میں بھاشا کے لفظ ملانے شروع کیے تھے اور کچھ پہیلیاں اور مکرنیاں اور نسبتیں ایسی زبان میں کہی تھیں جن میں اکثر الفاظ بھاشا کے تھے۔ غالب ہے کہ رفتہ رفتہ بھاشا میں جب ہی سے ملاپ شروع ہوا مگر ایسا نہ تھا جس کو جدا زبان کہا جائے۔ جبکہ شاہجہاں بادشاہ نے ۱۰۵۸ ہجری مطابق ۱۶۴۸ء کے شہر شاہجہان آباد آباد کیا اور ہر ملک کے لوگوں کا مجمع ہوا۔ اسی زمانے میں فارسی زبان اور ہندی بھاشا بہت مل گئی اور بعضے فارسی لفظوں اور اکثر بھاشا کے لفظوں میں بسبب کثرت استعمال کے تغیر و تبدیل ہو گئی۔ غرض کہ بادشاہی اردو معلیٰ میں ان دونوں زبانوں کی ترکیب سے نئی زبان پیدا

ہو گئی اور اسی سبب سے زبان کا اردو نام ہوا۔ پھر کثرت
استعمال سے لفظ زبان کا محذوف ہو کر اس زبان کو اردو
کہنے لگے۔ رفتہ رفتہ اس زبان کی تہذیب اور آراستگی ہوتی
گئی۔ یہاں تک کہ تخمیناً ۱۱۰۰ ہجری مطابق ۱۶۸۸ء یعنی اورنگ
زیب عالمگیر کے عہد میں شعر کہنا شروع ہوا۔ اگرچہ مشہور ہے
کہ سب سے پہلے اس زبان میں ولی نے شعر کہا۔ مگر خود ولی
کے اشعار سے معلوم ہوتا ہے کہ اس سے پہلے بھی کسی نے اس
زبان میں شعر کہا ہے۔ کیونکہ اس کے شعروں میں اور
شاعروں کی زبان پر طنز نکلتی ہے۔ مگر اس زمانے کے شعر
بہت پھیکے اور نہایت سست بندش کے تھے۔ پھر دن بدن
اس کو ترقی ہوتی گئی۔ یہاں تک کہ میر اور سودا نے اس کو
کمال پر پہنچا دیا۔

۳۔ میر کی زبان ایسی صاف اور شستہ ہے اور
اس کے شعروں میں ایسے اچھے محاورات بے تکلف بندھے ہیں
کہ آج تک سب اس کی تعریف کرتے ہیں۔ سودا کی زبان بھی اگرچہ
بہت خوب ہے اور مضامین کی تیزی میر پر غالب ہے۔ مگر
میر کی زبان کو اس کی زبان نہیں پہونچتی۔

۴۔ اردو نثر لکھنے والوں میں میر امن جس نے باغ و بہار
لکھا سب پر فوق لے گیا۔ حقیقت میں نظم لکھنے میں جیسا کمال
میر کو ہے، نثر لکھنے میں ویسا ہی کمال میر امن کو ہے

۵۔ عربی زبان کا اردو میں ترجمہ سب سے پہلے مولوی
عبدالقادر صاحب اور مولوی رفیع الدین صاحب نے کیا۔ مولوی
عبدالقادر صاحب کا اردو ترجمہ کلام اللہ کا اردو لغات کے لیے
ایک بڑی سند ہے۔ اور مولوی رفیع الدین صاحب کا ترجمہ ترکیب
نحو کے لیے ایک بہت دستاویز ہے۔

۶۔ اردو زبان کے شعروں کا بھی طریقہ فارسی شعروں کے
قاعدے پر یوں ہی آن پڑا کہ گویا جوان مرد خوبصورت
لڑکے کی تعریف میں شعر کہتا ہے

۷۔ سیندی بھاشا میں دستور تھا کہ عورت کی زبان سے
مرد کی نسبت عشقیہ شعر ہوتے تھے۔ بعضی بعضی دفعہ اردو زبان
میں اسی طرح پر بھی شعر کہا جاتا ہے اور اس کو ریختی بولتے ہیں
غالب ہے کہ تخمیناً ۱۲۲۰ ہجری مطابق ۱۸۰۵ء کے انشاء اللہ
خان نے اس کو رواج دیا۔

۸۔ فارسی شعروں کی جو بحریں اور اقسام ہیں وہ سب
اردو شعروں میں مروج ہیں۔ الا مکری اور پہیلی کہنے کا وزن
بھی اور ہے زبان بھی ایسی ہے، جس میں اکثر بھاشا ملی
ہوئی ہو۔

۹۔ نسبتیں جو مشہور ہیں، فقرے ہوتے ہیں کہ
ان میں دو یا تین یا زائد چیزیں جن میں کچھ باعتبار ظاہر کے
مناسبت نہیں معلوم ہوتی ہے، بیان کی جاتی ہیں اور مخاطب
سے پوچھا جاتا ہے کہ ایسی ایک بات جو جامع بیان کرے، جو
سب میں پائی جائے

۱۰۔ پہیلی میں کسی چیز کے اوصاف اور خصائص اور
پتے بیان کیے جاتے ہیں اور مخاطب سے پوچھا جاتا ہے کہ وہ
چیز کیا ہے۔ بڑی خوبی پہیلی کی یہ ہے کہ اس میں اس چیز کا
نام بھی آ جائے جس کے اوصاف اور خصائص بیان کیے گئے
ہیں۔ پھر اس پر بھی مخاطب نہ سمجھے۔

۱۱۔ مکری میں عورت کی زبان سے ذو معنی بات
بیان کی جاتی ہے جن میں ایک سے معشوق مراد ہوتا ہے
اور دوسری سے اور کچھ، قائل اس کا جب چاہے معشوق
کی بات سے مکر جائے۔

پہیلیاں

بالا تھا تو سب کو بھایا   بڑا ہوا کچھ کام نہ آیا
میں نے کہہ دیا اس کا ناؤں   بوجھے تو بوجھ نہیں چھوڑ دے گاؤں
دیا یعنی چراغ

فارسی بولی آئی نہ ترکی بولی پائی نہ
ہندی کہتے عارسی آوے منہ دیکھوں جو اسے بتادے
(آئینہ)

مکری

آپ ہلے اور موکو ہلا دے
واکا ہلنا موکو بھاوے
ہل ہلا کے بھیا نسکھا
اے سکھی ساجن نا سکھی پنکھا
(پنکھا)

نسبتیں

گوشت کیوں نہ کھایا ڈوم کیوں نہ گایا گلا نہ تھا
انار کھایا کیوں نہیں وزیر رکھا کیوں نہیں دانا نہ تھا
سموسہ کیوں نہ کھایا جوتا کیوں نہ پہنا تلا نہ تھا

ریختے

اچھا جو خفا ہم سے ہو تم اے صنم اچھا
لو ہم بھی نہ بولیں گے خدا کی قسم اچھا

شعر اردو

عشق کرتے ہیں اس پری رو سے
میر صاحب بھی کیا دیوانے ہیں

میر اس نیم باز آنکھوں میں
ساری مستی شراب کی سی ہے

ہم ہوئے تم ہوئے کہ میر ہوئے
اس کی زلفوں کے سب اسیر ہوئے

از "مقالات سرسید" مرتبہ محمد اسماعیل پانی پتی۔ مجلس ترقی ادب لاہور

بقیہ مضمون "کاہلی"

اور یہ ایک وضع دار وحشی ہوتا ہے۔ شراب پی کر پلنگ پر پڑے رہنا اور پیچوان کے دھوئیں اڑانا اس کو پسند ہوتا ہے اور جنگل کی ریت پر پڑے رہنا اور ناریل میں تمباکو کے دھوئیں اڑانا اس کو پسند ہوتا ہے پس پیچوان اور ناریل اور بچھونے اور ریت کے فرق سے کچھ مشابہت میں جو ان دونوں میں ہے کمی نہیں ہوتی۔

ہم قبول کرتے ہیں کہ ہندوستان میں ہندوستانیوں کے لیے ایسے کام بہت کم ہیں جن میں ان کو قوائے دلی اور قوائے عقلی کو کام میں لانے کا موقع ملے اور برخلاف اس کے اور ولایتوں میں اور خصوصاً انگلستان میں وہاں کے لوگوں کے لیے ایسے موقع بہت ہیں اور اس میں بھی کچھ شک نہیں کہ اگر انگریزوں کو بھی کوشش اور محنت کی ضرورت اور اس کا شوق نہ رہے جیسا کہ اب ہے تو وہ بھی بہت جلد وحشت پنے کی حالت کو پہنچ جاویں گے۔ مگر ہم اپنے ہم وطنوں سے یہ کہتے ہیں کہ ہمارے ملک میں جو ہم کو اپنے قوائے دلی اور قوت عقلی کو کام میں لانے کا موقع نہیں رہا ہے اس کا بھی سبب یہی ہے کہ ہم نے کاہلی اختیار کی ہے یعنی اپنے دلی قویٰ کو بیکار چھوڑ دیا ہے۔ اگر ہم کو قوائے قلبی اور قوت عقلی کے کام میں لانے کا موقع نہیں ہے تو ہم کو اس کی فکر اور کوشش چاہیے کہ وہ موقع کیوں کر حاصل ہو۔ اگر اس کے حاصل کرنے میں ہمارا کچھ قصور ہے تو اس کی فکر اور کوشش چاہیے کہ وہ قصور کیونکر رفع ہو۔ غرض کہ کسی شخص کے دل کو بے کار پڑا رہنا نہ چاہیے کسی نہ کسی بات کی فکر و کوشش میں مصروف رہنا لازم ہے تاکہ ہم کو اپنی تمام ضروریات کے انجام کرنے کی فکر اور مستعدی رہے اور جب تک کہ ہماری قوم سے کاہلی یعنی دل کو بے کار پڑا رکھنا نہ چھوٹے گا اس وقت تک ہم کو اپنی قوم کی بہتری کی توقع کچھ نہیں ہے۔ نہایت حکیمانہ قول ہے کہ:

بے کار مباش کچھ کیا کر
گر کر نہ سکے تو کچھ کہا کر

سید احمد خاں

اردو زبان اور اس کی عہد بعہد کی ترقی

[یہ مضمون سرسید نے ۱۸۴۷ء میں اس وقت لکھا تھا جب انھوں نے نہایت محنت اور جانفشانی کے بعد دہلی کی عمارات اور اس کے محلات و مزارات کی جامع تاریخ "آثار الصنادید" کے نام سے مرتب کی۔ اس مضمون میں سرسید نے بتایا ہے کہ اردو زبان کیا ہے؟ اور کیوں وہ اردو کے نام سے موسوم ہوئی؟ کس طرح رفتہ رفتہ وہ صاف و شستہ ہو گئی اور کن کن لوگوں نے اس کی ترقی و ترویج میں حصہ لیا؟ اب منجھ کر وہ کیسی ہو گئی ہے؟ اور عام طور پر کس شہر کی بولی سب سے زیادہ صحیح اور مستند سمجھی جاتی ہے؟

اس مضمون میں سرسید نے اردو کے ادیبوں اور انشاء پردازوں کو نہایت قابل قدر نصیحت یہ کی ہے کہ اگر تم اردو زبان میں فارسی کی تراکیب اور الفاظ زیادہ لاؤگے تو یہ کوئی خوبی نہیں ہوگی بلکہ عیب ہوگا اور ایسا کرنے کا نقصان یہ ہوگا کہ زبان میں "اردو پن" نہیں رہے گا۔ سرسید کی یہ نصیحت آج بھی ایسی ہی ضروری اور اسی قدر لائق عمل ہے جیسی آج سے ایک سو تیرہ برس پہلے تھی۔ یہ مفید اور معلوماتی مضمون سرسید نے اپنی کتاب "آثار الصنادید" کا چوتھا باب شروع کرتے ہوئے اس میں شامل کیا تھا۔]

[محمد اسماعیل پانی پتی]

اس ملک میں اب جو زبان مروج ہے اور جس میں سب لوگ بولتے چالتے ہیں اس کا نام اردو ہے۔ اور تحقیق اس کی یوں ہے کہ "اردو" فارسی لفظ ہے اور اس کے معنی بازار کے ہیں اور اردو سے مراد اردوئے شاہجہاں ہے۔

اگرچہ دلی بہت قدیم شہر ہے اور ہندوؤں کے تمام راجہ اور مہاراجوں کا ہمیشہ دارالسلطنت رہا ہے لیکن سب اپنی اپنی بھاکا بولتے تھے۔ ایک کی دوسرے سے زبان نہیں ملتی تھی جب کہ ہندوستان میں مسلمانوں کی عملداری ہوئی اور مسلمان لوگ ان شہروں میں آکے رہے تو اور بھی مشکل پڑی اور نئی زبان کے لوگوں کے آنے سے سودا سلف لینے دینے، بیچنے بہاننے میں دقت پڑنے لگی۔ اول اول تو مسلمانوں کی عملداری میں اختلاف رہا۔ کبھی کسی کی بادشاہت رہی اور کبھی کسی کی۔ کبھی غوری آئے اور کبھی لودی اور کبھی پٹھان اور کبھی مغل، اس سبب سے زبان کا بدستور اختلاف چلا گیا اور کوئی شخص اس کی اصلاح کے

پیچھے دیکھا۔ جب اکبر بادشاہ ہوا ایک گونہ سلطنت کو قیام ہوا
اور سب لوگ اپنے اپنے ٹھکانے بیٹھے اور علم کا بھی چرچا ہوا۔
لیکن اس زمانے میں فارسی زبان کی کچھ ایسی قدر تھی کہ لوگ اور
کسی طرف متوجہ بھی نہیں ہوتے تھے۔ جب کہ شہاب الدین
شاہجہاں بادشاہ ہوا اور اس نے انتظام سلطنت کا کیا۔
اور سب ملکوں کے وکیلوں کے حاضر رہنے کا حکم دیا اور دلی
شہر کو نئے سرے سے آباد کیا اور قلعہ بنایا اور شاہجہاں آباد
اس کا نام رکھا اس وقت اس شہر میں تمام لوگوں کا مجمع ہوا
ہر ایک کی گفتار رفتار جدا جدا تھی۔ ہر ایک کا رنگ ڈھنگ نرالا
تھا جب آپس میں معاملہ کرتے ناچار ایک لفظ اپنی زبان کا دو
لفظ اس کی زبان کے، تین لفظ تیسرے کی زبان کے ملا کر بولتے
اور سودا سلف لیتے۔ رفتہ رفتہ اس زبان نے ایسی ترکیب پائی
کہ یہ خود ایک نئی زبان ہوگئی۔ اور چونکہ یہ زبان خاص بادشاہی
بازاروں میں مروج تھی اس واسطے اس کو زبان اردو کہا کرتے
تھے اور بادشاہی امیر امراء اسی کو بولا کرتے تھے۔ گویا کہ
ہندوستان کے مسلمانوں کی یہی زبان تھی۔ ہوتے ہوتے خود
اس زبان ہی کا "اردو" نام ہوگیا۔

اس وقت سے اس زبان نے رونق حاصل کی اور
دن بدن تراش خراش اس میں ہوتی گئی۔ یہاں تک کہ جس
زمانہ میں میر اور سودا نے آوازہ اپنی خوش زبانی کا
بلند کیا تھا اور یہ آویزہ ہر ایک کے کان میں پہنایا تھا۔ اس
وقت یہ زبان بہت درست ہوگئی تھی۔ اور عجب رنگ ڈھنگ
نکال لائی تھی۔ اس کے بعد کچھ کچھ اس زبان میں اور تغیر و تبدیل
ہوئی اور اب ایسی منجھ گئی ہے کہ قیامت تک اس سے بہتر
ہونی ممکن نہیں اور اس زبان کو شاہجہاں آباد سے ایسی نسبت
ہے جیسے فارسی کو شیراز سے، یعنی یہاں کے لوگوں کی زبان
تمام اطراف کے رہنے والوں کو سند ہے۔ نہیں تو بقول میراثی کے
اپنی دستار، رفتار، گفتار کو کوئی برا نہیں جانتا۔ اگر ایک گنوار
سے پوچھیے تو شہر والوں کو نام رکھتا ہے اور اپنے تئیں سب
سے بہتر سمجھتا ہے۔ خیر عاقلاں خود میدانند۔

اگرچہ اس زبان میں اکثر فارسی اور عربی اور سنسکرت
کے الفاظ مستعمل ہیں اور بعضے بعضوں میں کچھ تغیر و تبدیل کرلی
ہے لیکن اس زمانہ میں اور شہر کے لوگوں نے یہ طریقہ اختیار
کیا ہے کہ اردو زبان میں یا تو فارسی کی لغت بہت ملا دیتے ہیں
اور یا فارسی کی ترکیب پر بکنے لگتے ہیں سو یہ دونوں باتیں اچھی
نہیں۔ ان سے اردو پن نہیں رہتا اور ظاہر ہے کہ اس بات
کے لیے کہ کس قدر فارسی کی ترکیب دی جاوے؟ اور کون
کون سی لغت اور زبانوں کی نہ بولی جاویں۔ کوئی قاعدہ نہیں
مقرر ہوسکتا۔ یہ بات صرف اہل زبانوں کی صحت پر
منحصر ہے۔

(از مقالات سرسید، مرتبہ محمد اسماعیل پانی پتی، مجلس ترقی ادب لاہور)

بقیہ مضمون "سرسید احمد خاں، ایک [illegible]"

کی حامل ہے، یہ فکر و تعقل ہے جس میں ہمدردی اور محبت کا
امتزاج ہے۔ یہ کوشش ہے دوسرے انسان کے نقطۂ نظر
کو سمجھنے کی اور اپنے نقطۂ نظر کو سمجھانے کی، یہ کاوش ہے مفاہمت
اور ہم آہنگی کو بڑھاوا دینے کی اور علم و آگہی کو پھیلانے کی۔
سید احمد خاں فرشتہ نہ تھے۔ انھوں
نے غلطیاں بھی کی ہیں۔ یہ غلطیاں رائے زنی سے متعلق ہیں یا
قدرِ احساس و عمل سے تاہم یہ ان کے کمال بصیرت کو متاثر
نہیں کرتیں، یہ انھیں اس راستے سے منحرف نہیں کرتیں جو
انھوں نے ذہن کی صفائی اور صحت فکر کے ساتھ اختیار
کیا تھا۔ یہ راستہ امن و آشتی، ترقی و بہبود، خود اعتمادی
و خودداری اور علم پروری و بیداری کی منزل تک پہنچاتا تھا

سید احمد خاںؒ

کاہلی

تہذیب الاخلاق جلد ۳۔ بابت ۱۰۔ محرم ۱۲۸۹ھ

یہ ایک ایسا لفظ ہے جس کے معنی سمجھنے میں لوگ غلطی کرتے ہیں۔ لوگ یہ سمجھتے ہیں کہ ہاتھ پاؤں سے محنت نہ کرنا، کام کاج محنت مزدوری میں چستی نہ کرنا، اٹھنے بیٹھنے چلنے پھرنے میں سستی کرنا کاہلی ہے، مگر یہ خیال نہیں کرتے کہ دلی قویٰ کو بیکار چھوڑ دینا سب سے بڑی کاہلی ہے۔

ہاتھ پاؤں کی محنت اوقات بسر کرنے اور روٹی کما کر کھانے کے لیے نہایت ضروری ہے اور روٹی پیدا کرنا اور پیٹ بھرنا ایک ایسی چیز ہے کہ مجبوری اس کے لیے محنت کی جاتی ہے اور ہاتھ پاؤں کی کاہلی چھوڑی جاتی ہے اور اسی لیے ہم دیکھتے ہیں کہ محنت مزدوری کرنے والے لوگ اور وہ جو کہ اپنی روزانہ محنت سے اپنی بسر اوقات کا سامان مہیا کرتے ہیں بہت کم کاہل ہوتے ہیں۔ محنت کرنا اور سخت سخت کاموں میں ہر روز لگے رہنا گویا ان کی طبیعت ثانی ہو جاتی ہے۔ مگر جن لوگوں کو ان باتوں کی حاجت نہیں ہے اور اپنے دلی قویٰ کو بیکار چھوڑ کر بڑے کاہل اور بالکل حیوان صفت ہو جاتے ہیں۔

یہ سچ ہے کہ لوگ پڑھتے ہیں اور پڑھنے میں فکر بھی کرتے ہیں اور ہزار پڑھے لکھوں میں سے شاید ایک کو ایسا موقع ملتا ہوگا کہ اپنی تعلیم کو اور اپنی عقل کو ضرورۃً کام میں لاوے۔ لیکن اگر انسان ان عارضی ضرورتوں کا منتظر رہے اور اپنے دلی قویٰ کو بیکار ڈال دے تو وہ نہایت صفت کاہل اور وحشی ہو جاتا ہے۔ انسان بھی مثل اور حیوانوں کے ایک حیوان ہے اور جب کہ اس کے دلی قویٰ کی تحریک سست ہو جاتی ہے اور کام میں نہیں لائی جاتی تو وہ اپنی حیوانی خصلت میں پڑ جاتا ہے اور جسمانی باتوں میں مشغول ہو جاتا ہے اور انسانی صفت کو کھو کر پورا حیوان بن جاتا ہے۔ پس ہر ایک انسان پر لازم ہے کہ اپنے اندرونی قویٰ کو زندہ رکھنے کی کوشش میں رہے اور ان کو بیکار نہ چھوڑے۔

ایک ایسے شخص کی حالت کو خیال کرو جس کی آمدنی اس کے اخراجات کے مناسب ہو اور اس کے حاصل کرنے میں اس کو چنداں محنت و مشقت کرنی نہ پڑے جیسا کہ ہمارے ہندوستان میں ملکیوں اور لاخراج داروں کا حال تھا اور وہ اپنے دلی قویٰ کو بھی بیکار ڈال دے تو اس کا حال کیا ہوگا۔ یہی ہوگا کہ اس کے عالی شوق وحشیانہ باتوں کی طرف مائل ہوتے جاویں گے۔ شراب پینا اور مزیدار کھانا اس کو پسند ہوگا، قمار بازی اور تماش بینی کا عادی ہوگا اور یہی سب باتیں اس کے وحشی بھائیوں میں پائی جاتی ہیں۔ البتہ اتنا فرق ہوتا ہے کہ [illegible] بدسلیقہ وحشی ہوتے ہیں۔

باقی صفحہ نمبر ۲۲ پر

علی گڑھ مسلم یونیورسٹی علی گڑھ

نوٹس

علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کے ہائی اسکول امتحان میں پرائیویٹ طور پر شریک ہونے والی خواتین امیدواروں کو یونیورسٹی اسکولس کے ریگولر طلبا کے لیے ترتیب دیے گئے نصاب کو سمجھنے میں کچھ دشواریاں پیش آتی ہیں۔ اس لیے انھیں پرائیویٹ خواتین امیدواروں کے لیے ایک نیا نصاب ترتیب دیا گیا ہے۔

خواتین پرائیویٹ امیدواروں کا ۱۹۶۳ء کا ہائی اسکول امتحان بورڈ آف ہائی اسکول ایجوکیشن سے منظور شدہ نئے نصاب ہی کے مطابق ہوگا۔ سلیبس کی مطبوعہ کاپی علی گڑھ مسلم یونیورسٹی علی گڑھ کے پبلیکیشن ڈویژن سرفراز ہاؤس سے 5.25 روپیہ بھیج کر ۵ دسمبر ۱۹۶۲ء کے بعد حاصل کیا جاسکتا ہے۔

پرائیویٹ طالبات کی معلومات کے لیے نئے نصاب کی روشنی میں امتحان کے مضامین کا ایک مختصر خاکہ درج ذیل ہے۔

خواتین امیدواروں (پرائیویٹ) کے ہائی اسکول ۱۹۶۳ء کا امتحان مندرجہ ذیل مضامین پر مشتمل ہوگا۔

	مضمون	پرچے	نمبر
الف:	دینیات (سنی / شیعہ) / تمدن وتہذیب کی تاریخ	ایک پرچہ	۵۰ نمبر
ب	اردو مع لازمی ہندی / ہندی مع لازمی اردو	تین پرچے	ہر ایک [illegible] نمبر
	ابتدائی اردو / ابتدائی ہندی	ایک پرچہ	۱۰۰ نمبر
ج	انگریزی	۲ پرچے	ہر ایک ۷۵ نمبر
د	جنرل سائنس اور حفظانِ صحت	۲ پرچے	" "
س	ہوم سائنس اور نفسیاتِ اطفال	۲ پرچے	ہر ایک ۷۵ نمبر
ص	سوشل اسٹڈیز		
	تھیوری ۹۰ نمبر / سوشکس ۳۰ نمبر	ایک پرچہ	۹۰ نمبر

جغرافیہ	ایک پرچہ	۶۰ نمبر

ک مندرجہ ذیل مضامین میں سے کوئی ایک مضمون

مضمون	پرچے	نمبر
عربی	۲ پرچے	ہر ایک ۵۰ نمبر
فارسی	"	" "
سنسکرت	"	" "
کامرس	"	" "
ٹیلرنگ	"	" "
اکانومکس	"	" "
آرٹس	"	" "

ایم محی الدین
کنٹرولر آف اگزامنیشن اینڈ ایڈمیشن

پرنٹر پبلشر قاضی جمال الدین احمد۔ مطبع لیتھو کلر پرنٹرس علی گڑھ۔ مقام اشاعت۔ صفدر منزل تار بنگلہ۔ اے ایم یو علی گڑھ یو پی

روزگار سماچار

۱۔ سول سروسز کا ابتدائی امتحان اور اس کے بعد خاص امتحان کا مخصوص ضمیمہ امپلائمنٹ نیوز نئی دہلی مورخہ ۱۸ دسمبر ۸۲ء میں شایع ہو چکا ہے جس کے لئے ۲۱ سے ۲۸ سال کے درمیان کی عمر والے صاحب ڈگری یا اس سے زیادہ لیاقت رکھنے والے لوگ امتحان کے شرکاء ہو سکتے ہیں۔ دفتر۔ یو۔ پی۔ اس۔ سی میں درخواست جمع ہونے کی آخری تاریخ ۲۱ جنوری ۸۳ء ہے۔

۲۔ ہندوستان ایرونامکس لمیٹیڈ کو اپنی مختلف شاخوں کے لئے ایسے انجینیرنگ پاس حضرات درکار ہیں جو اول درجہ میں ایرونائکل / مکینیکل / الکٹریکل / الکٹرانکس / ٹیلر جیکل شاخوں کی لیاقت رکھتے ہوں اور ۲۵ سال سے زائد عمر نہ ہو۔ تفصیلات کے لئے امپلائمنٹ نیوز ۸ جنوری ۸۳ء کو ضرور ملاحظہ فرمائیے درخواست جمع ہونے کی آخری تاریخ ۲۶ جنوری ۸۳ء ہے

۳۔ جو لوگ صاحب ڈگری اور ۲۱ سے ۲۶ سال کی عمر کے ہوں "پائنیر" لکھنؤ مورخہ ۲ جنوری ۸۳ء ضرور دیکھیں اس میں بینکنگ سروس ریکروٹمنٹ بورڈ۔ مرکزی گروپ۔ لکھنؤ کا اشتہار شایع ہوا ہے جس میں کل ۲۸۰۰ (اٹھائیس سو) مختلف جگہوں کے لئے درخواستیں برائے امتحان مقابلہ مطلوب ہیں دفتر میں مکمل درخواست پہنچنے کی آخری تاریخ ۲ فروری ۸۳ء ہے

۴۔ ناردرن انڈیا پتریکا" لکھنؤ مورخہ ۵ جنوری ملاحظہ کیجئے جس میں آپ ریزرو بینک آف انڈیا کے لئے ریسرچ آفیسر کی جگہ کے لئے مقابلہ کے امتحان کا اشتہار پائیں گے۔ یہ امتحان برائے سال ۸۳ء ہوگا امیدوار کو کم سے کم۔ اقتصادیات / کامرس / اکونامیٹرکس میں ماسٹر ڈگری حاصل ہو اور مجموعی طور پر ۵۵ فی صد نمبر ہوں عمر کی میعاد ۲۱ سے ۲۸ سال ہے درخواست کی آخری تاریخ ۲۹ جنوری ۸۳ء ہے۔

۵۔ اسٹاف سلکشن کمیشن کے زیر انتظام سب انسپکٹر امتحان برائے سال ۸۳ء منعقد ہونے والا ہے ۲۰ سے ۲۵ سال کی عمر کے صاحب ڈگری حضرات اپنی درخواست یکم فروری ۸۳ء تک دفتر کو ضرور روانہ کر دیں یہ مقابلہ کا امتحان مارچ یا اپریل میں مختلف مراکز پر ہوگا تفصیل امپلائمنٹ نیوز مورخہ ۸ جنوری ۸۳ء میں ملے گی۔

ترتیب

انور حبیب علوی
کاکوری۔ لکھنؤ

پرنٹر پبلشر قاضی معز الدین احمد۔ مطبع: بیتھو کلر پریس علی گڑھ مقام اشاعت: سفید منزل۔ مارس روڈ علی گڑھ

Ramu topped in exam

I didn't

Poor performance in the class damages his self-confidence
He can surely regain self confidence if parents care to
give him two slices of bread everyday with

DIMAGHEEN

A nourished mental tonic

Dawakhana Tibbiya College

ALIGARH MUSLIM UNIVERSITY. ALIGARH-202001
Phone : 3629 Gram : "DAWAKHANA

جلد نمبر ۲ یکم فروری ۱۹۸۳ء شمارہ نمبر ۳

کاہلی یہ ایک ایسا لفظ ہے جس کے معنیٰ سمجھنے میں لوگ غلطی کرتے ہیں۔ لوگ یہ سمجھتے ہیں کہ ہاتھ پاؤں سے محنت نہ کرنا، کام کاج، محنت مزدوری میں چستی نہ کرنا، اٹھنے بیٹھنے، چلنے پھرنے میں سستی کرنا کاہلی ہے۔ مگر یہ خیال نہیں کرتے کہ دلی قویٰ کو بے کار چھوڑ دینا سب سے بڑی کاہلی ہے۔

سید احمد

میلاد النبی کی تقریب — قاضی معز الدین احمد

تعلیمی ادارے۔ جرائم کی تربیت گاہ — ڈاکٹر عبدالرحیم قدوائی صدر شعبہ انگریزی اے۔ایم۔یو

ذکر ایک مشغل بہ کف اور قندیل بہ چشم کا — نجمہ شہریار ویمنس کالج اے۔ایم۔یو۔

سیرت نبویؐ کی معنویت دور حاضر میں — ڈاکٹر انجم آرا انجم۔ علی گڑھ

پر آشوب دور حاضر میں مسلمانوں کا ایک لائحہ عمل — معظم علی صدیقی۔ بی۔ اے چھترپور، ہزاری باغ

صاحب خلق عظیم " " " " "

ہمدردی — سید احمد خاں

چن پتے " " " "

فی پرچہ ایک روپیہ ششماہی ۱۱ روپے سالانہ ۲۰ روپے۔

بیرون ہند سے

فی پرچہ ایک ڈالر سالانہ ۱۵ ڈالر

ترسیل زر و خط کتابت کا پتہ

قاضی معز الدین احمد
صفدر منزل، تار بنگلہ۔ اے ایم یو۔
علی گڑھ یو پی 202001

سے سامنا ہو گیا اور ان کی تباہ و غارت گری کی روایات کے تحت دوکانیں اور مکانات کو آگ لگا دی گئی۔ رحمت عالم کے [illegible] نے اپنی ظلمت پسندی کے پوری سرگرمی کے ساتھ [illegible] اظہار کیا۔

عقائد کے اختلاف پر اس قسم کی مسلمانوں میں لڑائیاں نئی نہیں ہیں۔ ایک دور میں آمین زور سے یا آہستہ سے کہنے پر جھگڑا ہوا کرتی تھی۔ مساجد دھوئی جاتی تھیں۔ عدالتی کارروائی ہوتی تھی اور انگریز جج فریقین میں فیصلہ کرتا تھا اور جائز و ناجائز مسئلہ حل کرتا تھا۔ کوّے کے گوشت کے حلال و حرام ہونے پر آج سے ستر اسی سال پہلے خوب رسہ کشی رہی۔ خیریت رہی کہ کوّے کی جان بچ گئی اور فریقین تھک کر خاموش ہو بیٹھے۔

اس قسم کے اختلافات مسلمانوں میں کیوں ہوتے ہیں اور ہوتے بھی ہیں تو ان پر اختلاف رائے شدید کیوں ہوتا ہے؟ اس کا سبب ہمارے خیال میں یہ ہے کہ مسلمانوں میں تعلیم و تربیت عام نہ ہوئی اور ان کو اسلامی تعلیمات سے آگاہ نہ کرایا گیا۔ اسلام کے مقاصد اور مطالبات سے وہ بالکل

ناآشنا ہیں۔ یہ عوام کا حال ہے خواص کی واقفیت بھی اسلامی تعلیمات کے بارے میں بہت کچھ ہے [illegible] نماز اور کچھ [illegible] آداب سے [illegible] نہیں ہوتے۔ تعلیم و تربیت عام نہ ہونے کا ایک اہم سبب تو یہ ہے کہ اس مقصد کو حاصل کرنے کے لئے درسگاہوں کے قیام کی ضرورت ہوتی ہے اور ان درسگاہوں کے لئے اساتذہ کی۔ اور درسگاہوں کے قیام اور استادوں کی فراہمی کے لئے کثیر [illegible] کی ضرورت [illegible] حکومتیں تو عوام کی تعلیم و تربیت کی [illegible] سے [illegible] حکومتیں [illegible] قومی [illegible] حقیقی نہیں ان حالات میں عوام [illegible] رہیں تو [illegible] و شکایت کس کی کی جائے لیکن مسئلہ کا ایک پہلو

اور بھی ہے یہ دین کے مبلغوں کا فرض ہے۔ کہ وہ عوام کی تعلیم و تربیت کی طرف توجہ کریں اور ان کی رہنمائی کریں۔ لیکن بڑے پیمانے پر یہ خدمت بلا تنظیم اور منصوبہ بندی کے ہو نہیں سکتی یہ خدمت بدقسمتی سے انفرادی طور پر بھی دین کے محافظوں نے بہت کم ادا کی ہے انہوں نے نہ ان کو انفرادی اور اجتماعی ذمہ داریوں کا احساس پیدا کرایا نہ حقوق و فرائض کے بارے میں کچھ بتایا جب مسلمانوں کی دینی تعلیم سے ناواقفیت کا یہ عالم ہو تو وہ آپس میں اگر چھوٹی چھوٹی باتوں پر لڑیں تو تعجب کیوں ہو

مسلمانوں کی زندگی میں ایک حادثہ اور ہوا ہے با اقتدار طبقہ نے ان کو آپس میں لڑا کر اپنا مفاد حاصل کیا ہے۔ انیسویں صدی میں انگریزوں نے یہی کیا مسلمانوں میں عقائد اور مسلک کے اختلافات پیدا کئے اور ان کی طاقت منتشر کی کوئی تعجب نہیں کہ یہ سلسلہ آج بھی جاری ہے اور مسلمانوں کی جمعیت منتشر کرنے کے لئے بعض گروہ یہ حربہ استعمال کر رہے ہوں۔ بس دعا کیجئے کہ اللہ مسلمانوں کو شعور دے اور وہ [illegible] ناشناس ہو جائیں

بقیہ صفحہ ۸

سے فائدہ نہیں اٹھاتے اور اپنے مسائل کے حل کے لئے [illegible] کی طرف دیکھتے ہیں اور ان [illegible] تمام ہی مسلمان تھا [illegible] کہ وہ آقا حضرت محمد مصطفےٰ صلی اللہ علیہ وسلم کی حیات طیبہ کا بھرپور مطالعہ کریں اور اس پر حسب توفیق عمل کرنے کی کوشش کریں۔ اسی وقت ہم اپنی اپنی موجودہ اور آئندہ نسل کی زندگی کو کامیاب خوشگوار اور قابل قدر بنا سکتے ہیں اس کے ساتھ ہی دوسری اقوام کو بھی سیرت النبی کے مطالعہ کے لئے متوجہ کر سکتے ہیں اور ان کے مسائل کو حل کرنے میں مدد یہ معاون ثابت ہو سکتے ہیں۔

ڈاکٹر عبدالرحیم قدوائی (مترجم)
شعبہ انگریزی
اے ایم یو۔ علی گڑھ

تعلیمی ادارے — جرائم کی تربیت گاہ

تعلیم کا بنیادی مقصد طلبا کی ذہنی اور اخلاقی تربیت کرنا اور ان کو تہذیب سے آراستہ کرنا ہے ہمارے ارد گرد کا اخلاقی زوال، معاشرتی انتشار اور بے مقصدیت ہمارے تعلیمی اداروں کی ناکامی کا جیتا جاگتا ثبوت ہیں۔ ان تعلیمی اداروں نے اپنی ناکامی کے اسباب کا تجزیہ کرنے کی شاذ و نادر ہی کوشش کی ہے۔

مرکزی وزارت تعلیم کے مہیا کردہ حالیہ اعداد و شمار سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ ۴۲ فی صد طلبا پانچویں جماعت تک پہنچنے سے قبل اپنی تعلیم کو خیر باد کہہ دیتے ہیں طلبا کی ۷۷ فیصد تعداد آٹھویں جماعت تک اپنی تعلیم ترک کر دیتی ہے۔

۶ - ۱۴ سال کی عمر کے تقریباً ۵ کروڑ بچے ابتک تعلیم سے محروم رہا۔ ان بچوں میں لڑکیوں کا تناسب ۷۱ فیصد ہے۔ ۵ کروڑ کی اس تعداد میں تعلیم ترک کر دینے والے اور تعلیم سے محروم دونوں ہی قسم کے بچے شامل ہیں کم سنی میں جرائم کرنے کے رجحان کا سد باب کرنے میں تعلیم اب تک کوئی موثر کردار ادا کرنے سے قاصر رہی ہے۔ اجتماعی شوریدہ سری، بے ہودگی اور سرکاری املاک کو تباہ و برباد کرنا روزمرہ کا معمول ہو گیا ہے۔ یونیورسٹیوں کے تقریباً ۴ فی صد طلبا نشہ آور اشیاء کے عادی ہیں۔

۱۸۳۵ء میں میکالے نے برٹش پارلیمنٹ میں یہ بیان پیش [illegible] کے تحفظ کا سب سے کارگر طریقہ [illegible]

کے بعد ہم اب تک تعلیم کے مقاصد کو متعین کر پائے ہیں؟ انگریزوں سے ورثے میں ملنے والے نظام تعلیم کو ہم [illegible] الزام قرار نہیں دے سکتے۔

سب سے اہم معاملہ استاد اور شاگرد کے مابین بڑھتی ہوئی خلیج کو پاٹنا اور تعلیمی معاملات میں افراد کا زیادہ سے زیادہ اشتراک حاصل کرنا ہے۔ دور قدیم کی استاد اور شاگرد کے مابین گہری موانست کو بحال کرنا ہمارے لیے ممکن نہیں۔ لیکن نوعمر طلبا میں ہم زندگی کے بارے میں مزید اشتیاق پیدا کر سکتے ہیں اور اساتذہ [illegible] سے طلبا کو آسودہ کر سکتے ہیں۔ تعلیم میں طلبا کی [illegible] کا محرک جذبہ تجربہ ہوتا ہے۔ تعلیم کا محض [illegible] اہم نہیں ہے۔ بہترین تعلیمی ماحول کا اصول [illegible] سریم اور تربیت کے انداز میں [illegible] ہے۔ اس سے طلبا کا ذہنی ارتقاء [illegible] کے ایک [illegible] پہلو کے خلاف [illegible] مرکزی [illegible] یہ ہدایت یقیناً معاون ثابت ہوگی کہ [illegible] کے پورے تعلیمی سال [illegible] امتحان لیا جائے۔

اسکولوں [illegible] بتانے کے لیے [illegible] نے ایک [illegible]

کی رو سے نصابِ تعلیم میں روزگار کی زیادہ سے زیادہ
گنجائش پیدا کرتا ہے۔ اکثر و بیشتر غلط ترجیحات، لال فیتہ شاہی
اور اخراجات ان مقاصد کے حصول میں آڑے آتے ہیں۔
۱۹۸۰ء کا پنج نکاتی پروگرام صحت، تغذیہ بخش غذا
حفظانِ صحت، حالات کی مناسبت سے موزوں نصابِ تعلیم
اور افراد کے بیش از بیش اشتراک و تعاون پر مشتمل ہے۔ مالیات
کی کمی کے باعث یہ پروگرام ابھی تک محض زیبِ قرطاس ہی ہے
کم سنی میں جرم کرنے اور نشہ آور
اشیاء کے عادی ہونے کے بڑھتے ہوئے رجحان کے پیشِ نظر
مذکورہ بالا پروگرام پر عمل درآمد کہیں زیادہ فوری توجہ
کا محتاج ہے۔ وزارتِ داخلہ کے ایک جائزے کے مطابق
۱۹۷۷ء میں ہونے والے ۸۴۵،۱۶۷ جرائم کی بہ نسبت
۱۹۸۷ء میں ۱۰۳۰۰۰۰ قابلِ تعزیر جرائم کا ارتکاب
ہوا۔

گویا دس سال کے قلیل عرصے میں جرائم میں
۲۲ فیصد اضافہ ہوا۔ بے روزگاری، غربت، آبادی میں
اضافے اور ہمارے سماج میں دیگر خرابیوں کے باوجود جرائم
کے ارتکاب میں یہ زبردست اضافہ ہر اعتبار سے خطرناک
ہے۔ ڈکیتی کی حالیہ وارداتوں میں زیادہ تر نوجوان ہی
ملوث پائے گئے۔ اسی طرح گاڑیوں کی چوری کے مجرمین
میں بھی نوجوانوں کی نمایاں اکثریت ہے۔

طرزِ عمل کا مطالعہ

کم سنی میں جرائم کرنے کے رجحان اور تعلیمی
اداروں کی ناکامی کے مابین گہرے تعلق کو عام طور پر تسلیم کیا جاتا ہے
نوجوانوں میں سرکشی کا جذبہ درحقیقت تعلیمی اداروں میں پائے
جانے والے گھٹے ماحول کے خلاف ایک ردِ عمل کی شکل ہے۔ اس
جذبہ کا محرک گھر یا مدرسہ کا ماحول نہیں ہے جن [illegible] گے

وجود میں آنے کے نتیجے میں پیدا ہونے والے انحرافات کا تدارک
اسکولوں میں کیا جا سکتا ہے۔ لیکن درحقیقت ایسا شاذ و نادر
ہی ہوتا ہے۔ گھریلو پس منظر کے تحت پیدا ہونے والے غلط
طرزِ عمل کی اصلاح بھی اس طور پر ممکن ہے کہ طلباء کے مزاج
اور ردِ عمل کا مناسب انداز میں مطالعہ کیا جائے۔

NCERT نے نصاب کی یکسانیت کو ختم کرنے
اور اسے مقامی حالات کی مناسبت سے ترتیب دینے پر بجا طور
پر زور دیا ہے۔ اسی ادارے نے پرائمری اسکولوں اور
ٹیچرس ٹریننگ کے لیے بطور نمونہ ایک لائحہ عمل تیار کیا ہے
ملک کے ۵ لاکھ پرائمری اور ۶ لاکھ ابتدائی اسکولوں کے
اساتذہ، عمارت اور دیگر ضروریات پر توجہ کرنا لازمی ہے
جرائم کے رجحان کی بیخ کنی کے لیے معاشرتی علاج پر مبنی اصلاحی
اداروں، آبادکاری اور دماغی علاج کے مراکز کے قیام کی
بھی ضرورت ہے۔ اسکولوں سے نفرت کے ردِ عمل کی بھی
اصلاح خصوصی توجہ سے ممکن ہے۔ دماغی طور پر ناکارہ
اور معذور طلباء کا رویہ عموماً تخریبی ہوتا ہے جس کا اظہار
ان کی طرف سے راہ چلتے افراد پر فقرے کسنے اور سواریوں
پر خشت باری کرنے سے ہوتا ہے۔ سماج دشمن عناصر ان
طلباء کو اپنا آلۂ کار بناتے ہیں۔ دماغی ناکارہ پن اور غیر
متوازن طرزِ عمل امراضِ خبیثہ اور مرض کا شاخسانہ ہوتا ہے

تعلیم کی افادیت

ہمارا مقصد اس رجحان کا انسداد کرنا نہیں
بلکہ اس پر قابو پانا ہونا چاہیے۔ کیوں کہ اوّل الذکر طریقہ
کار اختیار کرنے سے منفی نتیجہ بھی برآمد ہو سکتا ہے۔ مغربی
ممالک میں ایسے مجرمین کو بہترین مراکز میں رکھا جاتا ہے اور
رضاکارانہ سماجی اداروں کے تعاون کی بدولت ان مجرمین
کا مطالعہ کیا جاتا ہے۔ البتہ سنگین جرائم کے مرتکب مجرمین

کو سخت سزا دی جاتی ہے۔ اگر ان حوالاتی مراکز میں بھی جیل کا سا ماحول ہوا تو اصلاح اور آبادکاری کا مقصد ہی فوت ہو جائے گا۔ اس رجحان کے عوامل کا سدِ باب کرنے میں تعلیم بہت موثر کردار ادا کر سکتی ہے، گو مکمل انسداد ممکن نہیں ہے۔ والدین کی بے توجہی اور طلبا۔ کی جذباتی ناآسودگی پر اس طرح قابو پایا جا سکتا ہے کہ ناخواندہ اور غور و فکر سے عاری والدین کو مناسب ہدایات دی جائیں۔ اگر ماں باپ دونوں ہی برسرِ روزگار ہیں تو اس امر کا قوی امکان پایا جاتا ہے کہ بچے جذباتی ناآسودگی کا شکار ہو جائیں۔ مناسب تعلیم اور سودمند تربیت کے حق میں ہم قاتل مندرجہ ذیل امور ہیں۔

اِرد گرد کا ماحول، سینما کا پیش کردہ تشدد
فحش ادب کی بہتات اور پست معیار کے
حامل مزاحیہ رسائل۔

Video اور TV کے ذریعہ فروغ پانے والی تہذیب
[illegible]ن قابلِ مذمت سلسلہ کو مزید تقویت بخش رہی ہے۔
[illegible]لاقی تعلیم سے قطع نظر، ضرورت اس امر کی ہے کہ مجرم
[illegible]م کے ارتکاب سے قبل از خود اپنے فعل کے بارے میں
[illegible]چے۔ سماجی تحفظ کا حصول اس طرح ممکن نہیں کہ جرم کے
[illegible]تکاب کے بعد مجرم کو گرفتار کیا جا سکے زیادہ ضرورت
[illegible]ماتقدم کے طریقۂ کار میں اصلاح کرنے کی ہے۔
جیسا کہ ویبنر سی۔ کیوادسیس نے کہا ہے کہ
[illegible]ن مجرمین سے نپٹنے کے لیے نہ غصے اور نہ ہی جذباتیت کی
[illegible]ت ہے۔ کم سن مجرم کی یہ خواہش ہوتی ہے کہ وہ ایک
تجربہ کرے جس سے اس کے بڑے تک ناواقف ہیں۔
[illegible]پنا تشخص چاہتا ہے۔ جرائم پر قابو پانے کے لیے
[illegible] [illegible] کی ابتدا ہی دقت ہو سکتی

ہے جب معلمین ان مجرمین کے طرزِ عمل کا مطالعہ
بھی کریں

(ترجمہ)

Educational Institution —
— Classrooms for Crime.
by
Kailash C. Kohli
The Hindustan Times — Nov 26, 1982

(بقیہ: صاحبِ خلقِ عظیم)

ام المومنین حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا کے الفاظ تھے
ہیں آپ کے خادمِ خاص حضرت انس رضی اللہ عنہ کا بیان بھی شامل
کر لیجیے کہ میں نے دس برس حضور علیہ السلام کی خدمت کی
اس پوری مدت میں آپ میرے متعلق ناپسندیدگی کی
کوئی بات زبان پر نہ لائے اور نہ کبھی یہ فرمایا کہ فلاں کام
کیوں کیا اور فلاں کام کیوں نہیں کیا۔

بقیہ مضمون "ہمدردی"

صفحہ نمبر ۱۸ کا بقیہ

جو عمدہ ترتیب ہمدردی کی اس میں بتائی ہے وہ بالکل قانونی قدرت کے مطابق ہے۔ جس سے یقین ہوتا ہے کہ جس نے قدرت کے قانون کو بنایا ہے، اسی نے یہ کلی قانون ہم کو دیا ہے جبکہ دونوں کا بانی ایک ہی ہے جس سے فعل اور قول دونوں [illegible] کی ہی مقصد ہے۔

از: مقالاتِ سرسید مرتبہ محمد اسماعیل پانی پتی
ناشر: مجلس ترقی ادب۔ لاہور پاکستان

نجمہ شہریار
ویمنس کالج اے ایم یو

ذکر ایک مشعل بہ کف اور قندیل بہ چشم کا

ہر طرف اندھیاروں کا سمندر تھا
نہ کہیں زمین کا پتہ تھا نہ آسمان کا .... طویل
و عریض میدان کی سخت محسوس کی جانے والی شے یعنی زمین پہ
انسانی نفوس کا ہجوم تھا۔ ہر متنفس اوروں کی تو بات ہی کیا خود
کو بھی پہچاننے سے قاصر اور انکاری تھا۔ ہوا تیزی سے فضاؤں
میں بہہ رہی تھی۔ اس میں بادِ سموم کی تپش سمو گئی ہوئی تھی
اندھیرے کی وجہ سے ان تاریک انسانوں کا دم گھٹتا جاتا تھا!
اسی وقت کہیں دور آسمان پر ــ
ایک ستارہ چمکا اور عین اسی وقت زمین پر ایک پُر اسرار
روشنی ہویدا ہو گئی جس نے ان انسانی نفوس کو چونکا دیا۔
اندھیروں کے عادی تھے چنانچہ روشنی سے متحیر ہوئے،
گھبرائے، سراسیمہ ہوئے ـــــ وہ روشنی ان کو پسند نہیں
آئی۔ خنک، نم، شبنمی ٹھنڈک والی وہ شفاف، آبی روشنی
آہستہ آہستہ قریب آتی گئی۔

روشنی جب کافی قریب آگئی تب
لوگوں نے دیکھا جمال و جلال سے آراستہ ایک شخص کو کہ
جس کے داہنے ہاتھ میں ایک مشعل تھی جو کہ مہتابی روشنی
دیتی تھی! اس شخص کے لب متبسم تھے اور نگاہیں
مہربان۔

لوگوں کی الجھن بڑھ رہی تھی۔ اندھیروں
کی طرح آنکھیں بند ہوئی جاتی ہیں۔ اس مشعل بہ کف نے
نے نرمی سے کہا۔
"تم راستہ بھول گئے ہو ... میرے ساتھ آجاؤ میں
تمہیں روشنی دکھاؤں گا"
گھٹی گھٹی سی کئی چیخیں ایک ساتھ ابھریں۔ کسی نے
بہ آوازِ بلند کہا۔
"ہماری آنکھیں اس روشنی سے پھوٹی جاتی ہیں
ہم جس حالت میں بھی ہیں، اسی میں ٹھیک ہیں۔ ہمیں راستہ
دکھانے کی کوشش نہ کرو۔ اس لیے کہ ہمارے پاس ہماری اپنی
کوئی چیز نہیں ہے جس کی ہمیں تلاش ہو۔!" ـــ
وہ مشعل بہ کف اُداس لہجے میں گویا ہوا ـــ
"کبھی اندھیاروں کی گھٹن کا احساس ہو جائے تو مجھ کو
یاد کر لینا"۔

پھر وہ آہستگی سے روانہ ہوا جس سمت سے آیا تھا
اُسی سمت کو ...... ہوا بہتی رہی لیکن مشعل کچھ فاصلے پر
پھر بھی جلتی رہی اور اس کا عکس تاریک انسانوں پر پڑتا رہا۔
نہ جانے اُس منور چہرے والے شخص کو، کہ جو
بڑا تند آور تھا، ان تاریک انسانوں سے کس قسم کا لگاؤ تھا،
کتنا گہرا عشق تھا کہ وہ بار بار اُدھر آجاتا، راستہ دکھانے
کی کوشش کرتا اور لوگوں کے بے نور چہرے دیکھ کر واپس
ہو جاتا لیکن نگاہوں سے اوجھل وہ کبھی بھی نہیں ہوا ـــ!
اور پھر یوں ہوا کہ آخری بار جب وہ مشعل

بے کف دار ہوا تو اس نے خاموشی کی زبان میں کچھ کہا — چہرے پر
عزم اور یقین کی روشنی کچھ اور زیادہ تھی جیسے اپنے ارادے
کی تکمیل کا تہیہ کر کے آیا ہو۔

تب اُس مشعل بہ کف نے زمین پر دور
تک بہت سے ننھے ننھے مٹی کے دیئے بکھرے ہوئے دیکھے
جو ہوا نے نہ جانے کب بجھا دیے ہوں گے

پھر یہ ہوا کہ نہ جانے کیوں اور کیسے
چکر کاٹتی ہوا نے شبنمی روشنی والی اس مشعل کو بجھا دیا اور
اب چاروں طرف گھپ اندھیرا — !

اور اُسی لمحہ ایک بڑی ہی عجیب
اور حیرت خیز بات ہوئی۔ اُس مشعل بہ کف کی نگاہوں میں
آبی اور شبنمی روشنی کی قندیلیں جل اٹھیں...... لوگوں کی
آنکھوں میں ٹھنڈک سی پڑی۔ آنکھوں کی پراسرار روشنی سے
بے تیل کے دیے جل اٹھے۔ جانے کیسی کشش تھی لوگ مسحور
ہوتے چلے گئے — !

اور پھر اس قندیل بہ چشم کے پیچھے پیچھے
قافلہ روانہ ہوا اور اپنی کھوئی ہوئی چیزوں کی بازیافت
کے لیے — !

جس راہ پر قافلہ چل رہا تھا اس کے دونوں
طرف لالے کے پھولوں کی آگ روشن تھی جس پر اوس گر رہی تھی
تھی ! اور جو اتنی کا طوفان ایسا کہ دریاؤں کے دل
لرز جائیں — !

وہ قندیل بہ چشم کسی بادشاہ کی سی شان
سے رواں دواں کہ جس کی نگاہوں کی آبی روشنی اور
لبوں کی مسکراہٹ سے فضائیں پر نور تھیں — قافلہ چلا جا رہا تھا
اس قندیل بہ چشم کے پیچھے — اپنی کھوئی ہوئی چیزوں کی
تلاش میں !

بقیہ مضمون " چنّے چنے " صفحہ نمبر ۱۲

دو ایک روز لگاتار گرم پانی سے انیما کر لینا چاہیے۔ پانی
میں کمی نہ کرنی چاہیے اور سنترہ میٹھا لیموں، ناشپاتی سیب
انگور اور آلوچہ وغیرہ کھلانا چاہیے۔ روزانہ غذا میں پورا
کرنے کے بعد آہستہ آہستہ ٹھوس چیزیں شروع کرائی
لیکن غذا اتنی دی جائے کہ ہضم ہو جائے

مقامی علاج کے سلسلہ میں سب سے
نمک کے پانی کی پچکاری کی جائے اس سے آنت کی صفا
ہو جائے گی۔ اس کے بعد دو گھنٹے گزر جانے پر چونے
پانی میں ذرا سا سہاگہ گھول کر اس کی پچکاری کی جائے
سے یہ امید ہے کہ چنے چنے کم ہو جائیں گے اور بچہ سکو
محسوس کرے گا۔ اس صورت میں چھ چھ گھنٹے بعد اس د
کی پچکاری کی جاتی رہے۔ اگر اس پچکاری سے سکون
نہ ہو تو پاؤ بھر پانی میں ایک چٹکی تمباکو جوش دے کر ا
نیم گرم پانی سے انیما کیا جائے اس سے کافی سکون
گا۔ چونے کے پانی والی پچکاری اس کے بعد بھی جاری رکھ
نیم کا تیل لگانے سے بھی آرام مل جاتا ہے۔ شفتالو کے
کی پچکاری سے کیڑے جلد مر جاتے ہیں۔ بچے کے ناف
مقام پر سونٹھ ترکی ۲ گرام ایلوا ۲ گرام شفتالو کے
کے پانی میں پیس کر لگا دینا چاہیے۔ اندرونی طور پر
استعمال کریں۔ رسونت ۲ گرام، چاکسو ۱ گرام
۲ گرام ایلوا ۱ گرام، سیاہ مرچ ۲ گرام پیس کر نیم کے
کے رس میں مونگ کے دانہ کے برابر گولیاں بنا لیں
چھوٹے بچوں کو صبح شام ایک ایک گولی کھلائیں
بچوں کو دو دو گولیاں دی جائیں۔

ڈاکٹر انجمن آرا انجم
علی گڑھ

سیرت نبویؐ کی معنویت دورِ حاضر میں

ہر دور اور ہر زمانے میں سماج میں کچھ نہ کچھ خرابیاں رہی ہیں، مگر کبھی کبھی برائیاں نیکیوں اور خوبیوں پر اس طرح غالب آتی ہیں کہ پورا معاشرہ ان کی لپیٹ میں آجاتا ہے اور تخریبی عناصر کی زیادتی کی وجہ سے انسان تباہی اور بربادی کی طرف بڑھتا ہی چلا جاتا ہے۔ ایسے میں ضرورت ہوتی ہے کہ خدا تعالیٰ کا کوئی پیغمبر آئے جو انسانی قافلے کو جہالت اندھیرے سے روشنی میں لائے اور قعر مذلت سے نکال کر صراط مستقیم پر چلنے کی ہدایت دیتے ہوئے ان کو اعلیٰ پاکیزہ اقدار کا وہ سبق دے جو دنیا و آخرت میں ان کی کامیابی و سرفرازی کا باعث بنے۔

آج سے چودہ سو سال پیشتر ایک ایسا ہی دور تھا جب جہالت، بت پرستی، قبائلی عصبیت، شراب خوری و قمار بازی، قتل و غارت گری، انتقامی جذبے اور لڑکیوں کو زندہ درگور کر دینے کا بازار گرم تھا بلکہ یہ کہنا بجا ہوگا کہ اس زمانہ کے تمام تر سماجی برائیاں اپنی تمام تر کار کردگی کے ساتھ پورے عروج پر تھی۔ ایسے میں اللہ پاک نے نبی آخر الزماں حضرت محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم کو رحمۃ للعالمین بنا کر مبعوث فرمایا اور اپنے دین کو مکمل کر دیا جیسا کہ قرآن مقدس میں فرمان خداوندی ہے "الیوم اکملت لکم دینکم واتممت علیکم نعمتی ورضیت لکم الاسلام دینا۔ یعنی میں نے تمہارے لیے تمہارا دین مکمل کر دیا اور اپنی نعمت تم پر تمام کر دی اور تمہارے لیے دین اسلام کو پسند کیا۔ اللہ کے دین اور قرآن پاک کے پیغام کو عام کرنے میں سرور کائناتؐ نے جو مصائب اور تکالیف برداشت کیں، دشمنوں اور مخالفین کی بڑی سے بڑی بدسلوکی کے بدلے میں اپنے اخلاق حسنہ اور بلند کرداری کا جو ثبوت دیا جس طرح ہر قول کو عمل میں ڈھال کر پیش کیا وہ کوئی آسان کام نہ تھا۔ یہی وجہ تھی کہ آپؐ کا بڑے سے بڑا دشمن بھی آپؐ کے آگے سرنگوں ہو گیا۔ آقائے نامدار کی سیرت مبارکہ کی سب سے بڑی خوبی یہی تھی کہ جو زبان سے کہا اس پر عمل کیا۔ کہیں کسی قول و فعل میں سر مو فرق نہیں ملے گا۔ عرب جیسے ریگستانی علاقے اور عرب جیسے بدوؤں کو وہ تہذیب سکھائی کہ ابد تک سارے عالم کے لیے ایک لافانی مثال بن گئی۔ نبی کریمؐ کی بدولت ایک ایسا سماج وجود میں آیا جہاں انسان کو جانچنے کی کسوٹی ان اکرمکم عند اللہ اتقاکم قرار دی گئی۔ یعنی اللہ کے نزدیک وہ شخص قابل عزت و تکریم ہے جو متقی اور پرہیزگار ہے۔ یہ انسانی زندگی کی بلندی اور ترقی کا وہ معیار تھا جس سے آگے کوئی انتہا ہو ہی نہیں سکتی۔ اس سماج میں انسانی برابری اور مساوات کا وہ عملی نمونہ وجود میں آیا جس کی مثال آج تک کوئی ملک، کوئی مذہب اور کوئی معاشرہ پیش نہ کر سکا۔ خاتم النبیینؐ نے وہ جامع، مکمل اور واضح شریعت پیش کی جس پر عمل کر کے انسان ہر زمانے میں راہ نجات حاصل کر سکتا ہے اور ہر ملک

زندگی گزارنے کا طریقہ اور سلیقہ سیکھ سکتا ہے۔ یہی وجہ تھی کہ اسلام کی دعوت عام ہوئی اور ملکوں ملکوں پہنچی

مگر جیسے جیسے زمانہ آگے بڑھتا گیا برائیوں نے پھر سر اٹھایا اور آج پھر معاشرہ تیزی سے تباہی کی طرف گامزن نظر آتا ہے۔ یورپ کے صنعتی انقلاب اور سائنس کی روز افزوں ترقی اور مغربی فلسفہ نے دنیا میں ہل چل مچادی اور اعلیٰ انسانی اقدار کا گلا گھونٹ دیا۔ نئے نئے خیالات اور نظریات نے زندگی کا رخ موڑا۔ پرانی ڈگر سے ہٹ کر نئے راستے اختیار کیے گئے۔ مذہب بیزاری، لادینیت، مفاد پرستی، خودغرضی اور مادہ پرستی کے رجحانات پروان چڑھے۔ نتیجے میں پوری دنیا اس سحر کی لپیٹ میں آگئی۔ یہی تمام چیزیں ہیں جو معاشرے کی جڑوں کو کمزور اور کھوکھلا کر رہی ہیں اور یہی سبب ہے کہ تمام مادی ترقی اور وسائل کی فراہمی کے باوجود چاند میں اتر جانے والا، نئی نئی دریافت کرنے والا، مختلف علوم و فنون میں درک رکھنے والا آج کا مہذب اور ترقی یافتہ انسان بے اعتمادی، مایوسی اور ذہنی انتشار کا شکار ہے۔ وہ بظاہر خوش اور کامیاب نظر آتا ہے مگر اندر سے ٹوٹ چکا ہے۔ وہ ایسے نظام حیات کا منتظر ہے جو اس کو بھیانک تباہی اور گمراہی سے بچا کر ایسے راستے کا پتہ دے جو اسے جسمانی، ذہنی اور روحانی سکون مہیا کر سکے۔ اس کی دنیا اور آخرت بنا سکے، اسے انسانیت کے احترام کا سبق پڑھا سکے، جو اس نام نہاد اشرف المخلوقات کو صحیح معنیٰ میں اشرف المخلوقات بنا سکے۔

یورپ اور امریکہ جیسے مہذب اور ترقی یافتہ ممالک کا جائزہ لینے سے معلوم ہوتا ہے کہ وہاں افراط [illegible] اور مادی ضروریات زندگی کے وسائل کی کوئی کمی نہیں ہے بلکہ روز افزوں ان میں ترقی ہو رہی ہے۔ مگر ان سب آسائشوں کے باوجود وہاں کا انسان جس ذہنی کرب کے طوفان میں گھرا ہوا ہے وہ ڈھکی چھپی بات نہیں ہے اور وہ اب اپنی مادی اور روحانی زندگی کو کامیاب اور پرسکون بنانے کے لیے اسلام کی طرف بڑھ رہا ہے۔ اس کو یہ یقین ہو چلا ہے کہ اس کے مسائل کا حل صرف کلام اللہ اور نبی کریمؐ کے احکام کی بجا آوری میں ہے۔ اب مستشرقین بھی جو کبھی صرف اسلام کے خلاف آواز اور قلم اٹھاتے تھے، یہ ماننے پر مجبور ہیں کہ اسلام ہی زمانہ کا ساتھ دے سکتا ہے۔ وہی ایک ایسا ہمہ گیر مذہب ہے جو انسانی فلاح و بہبود کا بہترین مظہر ہے۔ اسلام کی بڑھتی ہوئی مقبولیت کا اندازہ اس سے لگایا جا سکتا ہے کہ یورپ، امریکہ اور دوسرے مغربی ممالک میں جگہ جگہ اسلامی مراکز کھولے جا رہے ہیں جن کے دروازے نہ صرف مسلمانوں بلکہ غیر اقوام کے لیے بھی کھلے ہوئے ہیں۔ ان کے مشن کے صحت مند اور امید افزا اثرات سے یہ اندازہ ہوتا ہے کہ وہاں کے باشندے انشاء اللہ تعالیٰ اسلام کی تعلیمات پر ایک نہ ایک دن ضرور لبیک کہیں گے اور اپنی صحیح منزل دریافت کر ہی لیں گے

مگر افسوس یہ ہے کہ جن کے پاس قرآن پاک اور رسول مقبول صلی اللہ علیہ وسلم کی تعلیمات کا بیش بہا خزانہ پہلے سے موجود ہے جو ان کو بغیر کد و کاوش کے مل گیا ہے۔ وہ اس سے قطعی لاپرواہ ہیں بلکہ یہ کہنا چاہیے کہ خود کو اس سے محروم کر رکھا ہے۔ وقت آگیا ہے کہ ہم کو اس بارے میں کوتاہی کا ثبوت نہیں دینا چاہیے کیوں کہ اس دور پر آشوب میں اور عصر جدید کے گوناگوں مسائل کو حل کرنے میں سرکار دو عالمؐ کی تعلیمات ہی ہماری رہنمائی کر سکتی ہیں۔ اس لیے اس زمانے میں سیرت نبوی کی معنویت اور بھی زیادہ ہو جاتی ہے۔ زندگی کے بڑے سے بڑے اور چھوٹے سے چھوٹے مسئلے میں محبوب خدا محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم کی حیات طیبہ کے نمونے موجود ہیں۔ یہ ہماری بدنصیبی ہے کہ اس لازوال دولت

باقی صفحہ نمبر [illegible] پر

معظم علی صدیقی بی۔اے
چترپور، ہزاری باغ

پُر آشوب دورِ حاضرہ میں
مسلمانوں کا ایک لائحۂ عمل

عام طور سے دانشورِ غیر مسلمین کو اعتراف ہے کہ بلاشبہ اسلام فی نفسہٖ بہترین مذہب ہے لہٰذا ہمیں اس کا نمونۂ کامل پیش کرنے کی ذمہ داری ہے غیر مسلموں کے اصول جداگانہ ہوتے ہوئے بھی یہاں جس قوم کا نام مسلمان ہے وہ ہر قسم کے رطب و یابس لوگوں سے بھری ہوئی ہے۔ کیرکٹر کے اعتبار سے جتنے ٹائپ غیر مسلموں میں پائے جاتے ہیں، اتنے ہی اس قوم میں بھی موجود ہیں۔ عدالتوں میں جھوٹی گواہیاں دینے والے جس قدر غیر مسلم قومیں فراہم کرتی ہیں، غالباً اسی تناسب سے یہ بھی فراہم کرتی ہے۔ رشوت، چوری، زنا، جھوٹ اور دوسرے ذمائم اخلاق میں یہ بھی غیر مسلموں سے کچھ کم نہیں ہے۔ پیٹ بھرنے اور دولت کمانے کے لیے جو تدبیر غیر مسلم کرتے ہیں وہی اس قوم کے لوگ بھی کرتے ہیں۔ ایک مسلمان وکیل جان بوجھ کر حق کے خلاف اپنے موکل کی پیروی کرتے وقت اتنا ہی خدا کے خوف سے خالی ہوتا ہے جتنا ایک غیر مسلم وکیل ہوتا ہے۔ ایک مسلمان رئیس دولت پاکر یا ایک مسلمان عہدیدار حکومت پاکر وہی سب کچھ کرتا ہے جو غیر مسلم کرتا ہے۔ یہ اخلاقی حالت جس قوم کی ہو اس کی تمام کالی اور سفید بھیڑوں کو جمع کرکے ایک منظم گلہ بنا لینا اور سپاہی

تربیت سے ان کو لومڑی کی سی ہوشیاری سکھانا یا فوجی تربیت سے ان میں بھیڑیے کی درندگی پیدا کرنا جنگل کی فرمانروائی حاصل کرنے کے لیے تو مفید ہو سکتی ہے مگر میں نہیں سمجھتا کہ اس سے اعلائے کلمۃ اللہ کس طرح ہو سکتا ہے؟ کون ان کی اخلاقی برتری تسلیم کرے گا؟ کس کی نگاہیں ان کے سامنے عزت سے جھکیں گی؟ کس کے دل میں انہیں دیکھ کر اسلام کے لیے ہمدردی کا جذبہ پیدا ہوگا؟ کہاں ان کے "انفاسِ قدسیہ" سے "یدخلون فی دین اللہ افواجا" کا منظر دکھائی دے سکے گا؟ کس طرح ان کی روحانی امانت کا سکہ جمے گا اور زمین پر رہنے والے کہاں ان کا خیر مقدم اپنے نجات دہندوں کی حیثیت سے کریں گے؟ اعلائے کلمۃ اللہ جس چیز کا نام ہے اس کے لیے تو صرف ان کارکنوں کی ضرورت ہے جو خدا سے ڈرنے والے اور خدا کے قانون پر فائدہ اور نقصان کی پرواہ کیے بغیر چلنے والے ہوں خواہ وہ اس نسلی قوم ہی سے ملیں یا کسی دوسری سے بھرتی ہوں تو ایسے دس آدمی اس مقصد کے لیے زیادہ قیمتی ہیں بہ نسبت اس کے کہ وہ انبوہ جس کا میں اوپر ذکر کر آیا ہوں ۲۵ لاکھ یا ۵۰ لاکھ کی تعداد بھرتی ہو جائے یا اس کو ہنکانے

کے سکوں کا خزانہ مطلوب نہیں ہے جس پر اشرفی کا ٹھپہ
لگایا گیا ہو۔ وہ سکے کے نقوش دیکھنے سے پہلے دریافت
کرتا ہے کہ ان نقوش کے نیچے خالص سونے کا جوہر ہے بھی یا
نہیں۔ ایسا ایک سکہ جعلی اشرفیوں کے ڈھیر سے اس کے
نزدیک زیادہ قیمتی ہے۔ پھر جس لیڈر شپ کی اعلائے کلمۃ اللہ
کے لیے ضرورت ہے وہ ایسی لیڈر شپ ہے کہ ان اصولوں
سے ایک انچ بھی ہلنے کے لیے تیار نہیں، جن کا بول بالا کرنے
کے لیے اسلام اٹھا ہے خواہ وہ اس ہیئت کی بدولت تمام
مسلمان بھوکے ہی کیوں نہ مر جائیں بلکہ تہہ تیغ ہی کیوں نہ
کر دیے جائیں۔ یہ معاملہ اپنی قوم کا فائدہ تلاش کرنے والی
اور اصول سے بے نیاز ہو کر اس تدبیر کو جس میں قوم کی دنیوی
فلاح نظر آئے' اختیار کرنے والی لیڈر شپ؛ جس میں تقویٰ
اور خدا ترسی کا رنگ مفقود ہو' اس مقصد کے لیے قطعی
ناکارہ ہے جس پر اسلام نے اپنی نظر جما رکھی ہے۔ وقت
کا تقاضہ ہے کہ مسلمان خود اپنی انفرادی اور اجتماعی زندگی پر
فوراً احتساب کریں۔ مجھے ایسا لگتا ہے کہ ہمارے معاشرے
کی جملہ خرابیوں کی اصل وجہ صرف عام ابتدائی تعلیم کا فقدان ہے
ایک مسلمان کا ایمان صرف کلمہ گوئی اور
انفرادی عبادت میں نہیں ہے بلکہ وہ جملہ قرآنی اور احادیث کی
ہدایتوں کا نمونہ ہے۔ وہ بیک وقت موحد عابد، متقی، انسانیت
ہمدرد، امر و نہی کا پابند، اجتماعی منتظم کار، فدائی، سیاست
دان اور مرد مجاہد ہے۔ وہ اندرون مسجد یا گھر میں عبادت گذار
کے ساتھ ساتھ میدان کارزار میں مجاہد کی شکل میں حاضر رہتا ہے
ایک عالم ہو کا مدار مسجد میں امام بھی رہ سکتا ہے۔ یہ ہے وہ
مسلمان جس کی تربیت اسلام کرتا ہے۔ اس کا مقصد زندگی
صرف "کھاؤ پیو اور عیش کرو" نہیں ہے۔ اتحاد اور نظم
ہی فوت ہے۔

ضرورت ہے کہ ہر قصبہ میں جہاں مسلمانوں کی کافی
آبادی ہو، ایک مخلوط مدرسہ ہونا چاہیے جس کا الحاق صوبائی
مدارس بورڈ سے ہو۔ دیکھا یہ گیا ہے کہ شہر کے ایک ہی
مسلم محلہ میں کئی کئی مدرسے قائم ہیں جن کا نہ نظم و نسق درست
ہے اور نہ درس و تدریس درست ہے اور نہ وہ صوبائی
مدارس بورڈ سے الحاق شدہ ہیں۔ وہی مثل مشہور ہے
"ڈیڑھ اینٹ کی الگ مسجد" جہاں دیکھو وہیں خود نمائی اور
خود ستائی ہے۔ پہلے یہ مدرسہ ابتدائی درجہ اور اس کے
بعد اعلیٰ درجات تک ہو سکتا ہے۔ یہ امید کی جاتی ہے
کہ ہر قصبہ میں ثانوی مدرسہ موجود ہے۔ لہذا ابتداً مدرسہ میں
اعلیٰ درجات (ہفتم تا دہم) کوچنگ کے ذریعہ شروع کیے جا سکتے
ہیں۔ اس تعلیمی پروگرام کو ضرورت کے مدنظر ترمیم بھی کیا
جا سکتا ہے۔ اس سے یہ فائدہ ہوگا کہ نسلی مسلم طلباء اور
طالبات دین اسلام کی پوری واقفیت رکھیں گے اور اپنی زندگی
بہترین بنانے کے کوشاں رہیں گے۔ قرآن اور حدیث جان
کر سمجھ کر عمل کرنے کا نام ہے۔ صوبائی مدارس بورڈ سے
الحاق کرانے پر یہ فائدہ ہوگا کہ طلباء اور طالبات مدرسہ عالیہ
کے علاوہ کالج میں بھی اپنا داخلہ کرا سکتے ہیں۔ یا سرکاری
پرائمری اسکول اور تربیت کے بعد دوسرے شعبہ جات میں
ملازمت حاصل کر سکتے ہیں۔ دینی مدرسہ سے ثانیہ یا اعلیٰ
درجات پاس کرنے کے بعد یہ معنیٰ ہرگز نہیں ہیں کہ وہ طالب علم
ایک موٹر مستری، ایک بجلی مستری، ایک سائیکل مستری، ایک
فارمسٹ، ایک درزی، ایک دکاندار، ایک تاجر، ایک کاشتکار
ایک ادیب، ایک شاعر، ایک صحافی، ایک وکیل، ایک ڈاکٹر، ایک
انجینیر وغیرہ نہیں بن سکتے ہیں۔ اس طریقہ کار سے ہماری
آئندہ نسل ایک نمونہ بن کر ابھرے اور پھیلے گی۔ اسلامیات
سے نابلد طلباء و طالبات بھی عموماً گمراہ ہوتے تھے اور [illegible]

پر غلط اعتراضات تراشتے ہیں اور سماج میں باعث فساد ہوتے ہیں۔ جس طرح شہد جسمانی امراض کی شفا ہے اسی طرح اسلامی تعلیمات کی علم و عمل نفسیاتی، اخلاقی اور سماجی امراض کی شفا ہے لہذا اسلامی تعلیمات بچے اور بچیوں میں عام کرنا ہوگی۔ افسوس کی بات ہے کہ غیر دینی مدرسہ سے تعلیم یافتہ نوجوان طبقہ اپنے مذہب کے عام اصول مثلاً نماز، روزہ، وراثت اور نکاح و خلع تک کے مسائل سے ناواقف ہے۔

اس کے علاوہ ایک انجمن فلاح المسلمین قائم کرنی ہوگی جس کے مندرجہ ذیل شعبہ جات ہوں گے۔

۱۔ انتظامیہ کمیٹی ۲۔ بیت المال کمیٹی (۳) تعلیمی کمیٹی (۴) مسجد کمیٹی (۵) عیدگاہ کمیٹی (۶) قبرستان کمیٹی (۷) رفاہِ عام کمیٹی (۸) لائبریری کمیٹی (۹) تنازعہ کمیٹی (۱۰) نکاح کمیٹی آڈٹ کمیٹی۔

اس انجمن کے تحت درج ذیل کارکردگی کے پروگرام نمونے کے طور پر پیش کیے جائیں گے

(۱) اعلیٰ تعلیم کے لیے مدارس تعمیر کرنا (۲) ہر محلہ میں ایک شعبہ تعلیم بالغان مرکز قائم کرنا۔ (۳) خواتین کے لیے ایک شعبہ عزازی درس قرآن و حدیث اردو میں ایک گھنٹہ کے لیے محلہ کی زیر نگرانی قائم کرنا۔ (۴) لائبریری قائم کرنا۔ (۵) انجمن ہال تعمیر کرنا (۶) غرباء اور تجارت پیشہ افراد کو ضمانت پر بغیر سود قرض دینا۔ (۷) محتاجوں کی حاجت روائی اور غریب مہلک امراض میں مبتلا افراد کے لیے علاج کے لیے بندوبست کرنا۔ (۸) ناگہانی آفت و مصیبت کے وقت عام امدادی کام کرنا (۹) ذہین و فہیم اور غریب بچوں کو اعلیٰ درجات کی تعلیم دلانا۔

علاوہ ازیں بے روزگاری دور کرنے اور اس مسئلہ پر صلاح و مشورہ کرنے کے لیے بھی ایک ایسا ادارہ قائم کرنا ہوگا جو اس سلسلہ میں مفید مشورے دے سکے۔

اس کے علاوہ شائقین کھیل کود کے لیے ایک اتھلیٹک ایسوسی ایشن بھی بنا لیں تو بہتر ہے۔ اس میں بھی بہت سے فوائد مضمر ہیں۔ اس کا نام شہیدان ملک، رہنمائے ملک اور ملک کے بہترین کھلاڑیوں کے نام پر رکھا جاسکتا ہے جیسے شہید اشفاق اللہ خاں، شہید بھگت سنگھ وغیرہ۔

مندرجہ بالا تنظیموں کی تشکیل اور قواعد و ضوابط موقع و مصلحت اور ضرورت کے مطابق خود مرتب کرنا ہے۔ پرانے زمانے کے ہمارے مسائل اور ضروریات اور آج کل کے مسائل اور ضروریات میں آسمان و زمین کا فرق ہوگیا ہے، لہذا ہمیں دور حاضرہ کی ضرورتوں کے مطابق اپنا لائحہ عمل مرتب کرکے عمل پیرا ہونے کی کوشش کریں۔ اور اپنے کردار و اخلاق کو بھی جلد از جلد درست کرنے کی سعی کریں

آخر میں یہ دعا ہے کہ خداوند تعالیٰ ہم سب ہی لوگوں کو غور و فکر کرنے کی صلاحیت عطا فرمائے اور ہم کو صراط مستقیم پر چلنے کی ہدایت و توفیق عطا کرے۔ آمین

بقیہ مضمون: "محبت"

بھی برائی نہ چاہے۔ وہ بلاشبہ تعریف کے قابل ہے۔ دل انسان کا ایک ہے۔ اس میں دو چیزیں یعنی عداوت، کسی کے ساتھ کیوں نہ ہو، اور محبت سما نہیں سکتیں۔ وہ ایسی کوٹھیا نہیں ہے جس میں دو خانے ہوں۔ ایک محبت کا ایک عداوت کا اور اس لیے یہ دو چیزیں گو اشخاص متعدد اور حیثیات مختلف کے ساتھ کیوں نہ ہو، سما نہیں سکتیں، اس لیے انسان کو لازم ہے کہ محبت کے سوا کسی دوسری چیز کے دل میں لانے کا خیال بھی نہ کرے اور ایسی ہی زندگی انسان کے لیے عمدہ زندگی ہے۔

از مقالات سرسید: مرتبہ محمد اسماعیل پانی پتی - مجلس ترقی ادب لاہور

صاحبِ خلقِ عظیمؐ

حقیقت یہ ہے کہ دنیا میں آج محاسنِ
اخلاق کا جو بھی سرمایہ ہے وہ صرف انھیں پاکیزہ ہستیوں کے
دم سے جنہوں نے خود اپنے آپ کو حسنِ اخلاق اور کمالاتِ
اِنسانی کا اعلیٰ پیکر بن کر لوگوں کے سامنے پیش کیا۔

تمام پیغمبر منصبِ نبوت تفویض ہونے سے
پہلے بھی افرادِ انسانی کے منتخب اور برگزیدہ اشخاص تھے۔ ہر قسم
کی معصیت اور نافرمانی سے پاک تھے۔ اس بنا پر انبیا کی جماعت
تمام افرادِ انسانی پر سب سے فائق و برتر ہے۔ اور پھر انبیاء
کی جماعت میں بھی سب کے قافلۂ سالار سب سے اعلیٰ و افضل
حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات گرامی ہے

حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کیوں کہ تمام
رسولوں اور پیغمبروں میں اعلیٰ و افضل ہیں، نبوت اور رسالت
کے کمالات کی انتہا آپؐ پر ہی ہوئی۔ لہٰذا اللہ تعالیٰ نے آپؐ
کو سلامتِ فطرت، لطافتِ طبیعت، عقل و دیانت، انصاف
و دیانت اور اخلاق و کردار کی وہ خوبیاں اور محاسن عطا
کیے جن کی پوری نسلِ انسانی میں نہ کوئی مثال گزری ہے اور
نہ آئندہ گزرے گی۔ قرآن انہیں ان ہی صفتوں کے ساتھ
متصف کرتا ہے۔

یعنی "اے لوگو، تمہارے پاس تم ہی میں سے ایک
رسول آئے ہیں۔ انھیں تمہاری تکلیف گراں گزرتی
ہے۔ ان کو ہر لحظہ تمہاری فلاح و بہبود کا خیال ہے۔
اور وہ مسلمانوں پر بہت ہی شفیق اور مہربان ہیں"

(توبہ ۱۲۸)

اس آیتِ پاک میں اللہ پاک نے رسول اللہ صلی اللہ
علیہ وسلم کے ان ترحمانہ جذبات کا ذکر کیا ہے جو آپ ک
پوری نسلِ انسانی کے ساتھ تھے۔ اس آیتِ پاک میں ا
امر کی شہادت ہے کہ حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم تمام
نوعِ انسان کے خیر خواہ اور خیر طلب تھے اور مسلمانوں
خصوصیت کے ساتھ ان کی مہربانی اور محبت و شفقت سا
فگن رہتی تھی۔ امت پر آپ کی شفقت، مہربانی اور نرم
کی گواہی قرآن ایک مقام پر یوں دیتا ہے

"پس خدا کی عنایت سے تم ان لوگوں کے
لیے نرم ہو۔ اے محمدؐ! اگر تم کہیں کم خلق اور
سخت دل ہوتے تو البتہ یہ لوگ (جو تمہارے
پاس جمع ہوتے ہیں) تمہارے گرد و پیش
سے ہٹ جاتے۔

(آلِ عمران ۱۵۹)

اخلاق کی بنیادی حیثیت

یہ حقیقت تسلیم شدہ ہے کہ دنیا کے تمام
کی بنیاد اخلاق پر ہے۔ لوگوں کی ہدایات اور رہنمائی کے لیے
جتنے پیغمبر اور مصلح آئے ان سب نے یہی تعلیم دی کہ سچ بو
اچھا اور جھوٹ بولنا برا ہے۔ انصاف بھلائی کی راہ دکھا

، اور ظلم انسان کو تباہی کی طرف لے جاتا ہے۔ صدقہ و خیرات
ا ہے اور بخل برائی ہے۔ لیکن مذہب کے دوسرے ابواب
طرح اس باب میں بھی جناب محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت
لیم تکمیلی حیثیت رکھتی ہے۔ حضور سرورِ کائنات کے ظہور سے
ے ایک نبی کے بعد دوسرے نبی کی ضرورت باقی رہی۔ کیونکہ
ی ایک فرستادہ حق نے دینِ فطرت کو کامل نہیں کیا تھا۔ اللہ
الیٰ ہر نبی کو ایک خاص صفت اور امتیاز کے ساتھ مخصوص
رتا رہا۔ لوگوں نے بھی ان کی ان ہی سنتوں کو یاد رکھا جن
ے وہ مظہر کامل تھے۔ حضور علیہ السلام کی ذاتِ گرامی میں اس
سم کی تخصیص و تحدید ممکن نہیں۔ آپؐ کی ذات میں توحیدِ
براہیمی بھی ہے اور حیاتِ یوسفؑ بھی، موسوی ذوقِ جہاد
بھی ہے اور حلمِ مسیح بھی۔ یہی وجہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے جب
دنیا کو یہ مشاہدہ کرا دیا کہ ہم نے (اللہ نے) ایک ہی ذات
میں بدرجہ اتم متفرق، نوع بہ نوع بلکہ بظاہر ایک دوسرے سے
مختلف صفات اور فضائل اخلاق جمع کر دیے ہیں اس لیے اب
نبوت و رسالت کا دروازہ بند کرتے ہیں اور اعلان کرتے ہیں
کہ جامع کمالات و محاسن اور دائمی نمونہ رشد و ہدایت مبعوث
ہو گیا اب کسی بندے کی رہبری کی ضرورت نہیں۔

آپؐ کی اخلاقی تعلیم کا بھی تکمیلی رخ تھا جس
کی بنا پر بارگاہِ خداوندی سے یہ عالمگیر اور دائمی اعلان ہوا۔
یقیناً تمہارے لیے اللہ کے رسول کی زندگی میں پیروی کا
بہترین نمونہ ہے۔ خود اپنے بارے میں رسالت مآبؐ کا
ارشاد ہے — "میں حسنِ اخلاق کی تکمیل کے لیے بھیجا گیا
ہوں" یہ موطا امام مالک کی روایت ہے۔ مسند احمد بن
حنبل میں زیادہ واضح الفاظ میں فرمایا
"میں تو اسی لیے بھیجا گیا ہوں کہ اخلاقِ حسنہ
کی تکمیل کروں"

یا ایک مرتبہ فرمایا
میزانِ اعمال میں حسنِ اخلاق سے زیادہ بھاری
کوئی چیز نہ ہوگی اور اچھے اخلاق والا آدمی
اپنے حسنِ اخلاق سے ہمیشہ روزہ رکھنے
والے اور نماز پڑھنے والے کا درجہ حاصل
کر لیتا ہے۔"

تعلیماتِ نبویؐ کا تیسرا باب

حقیقت یہ ہے کہ عقائد اور عبادات کے بعد تعلیماتِ نبوی
کا تیسرا باب "اخلاق" ہے۔ اخلاق سے مراد باہم لوگوں
کے حقوق و فرائض ہیں جن کا ادا کرنا ہر شخص کے لیے ضروری
ہے۔ انسان جب اس دنیا میں آتا ہے تو ہر چیز سے اس کا
تھوڑا بہت تعلق ضرور ہو جاتا ہے اس تعلق کی بنا پر جو
ذمہ داریاں عاید ہوتی ہیں ان کو حسن و خوبی کے ساتھ انجام
دینے کا نام "اخلاق" ہے۔

قرآن کریم کے سوا کسی مذہب کے صحیفے نے
اپنے حامل اور شارع کی نسبت اس بات کی کھلی شہادت
نہیں دی کہ وہ اپنے عمل اور کردار کے لحاظ سے بھی ایک
بلند ترین انسان تھا۔ لیکن قرآن کریم نے صاف صاف کہا
اور دشمن و دوست سب کے مجمع میں کہا
"یعنی (اے محمد صلی اللہ علیہ وسلم!
بے شک آپ کا اجر کبھی ختم نہ ہونے والا ہے
اور بلاشبہ آپ اخلاق کے بلند ترین مرتبہ
پر فائز ہیں۔
(القلم ۴۳)

نبی علیہ الصلوٰۃ والسلام نے اپنی بعثت کے ساتھ ہی اس
فرض کو انجام دینا شروع کر دیا تھا۔ ابھی آپؐ مکہ ہی میں
تھے کہ حضرت ابوذر غفاریؓ نے اپنے بھائی کو آپؐ کے حالات

اور تعلیمات کی تحقیق کے لیے بھیجا تو انھوں نے واپس آکر اپنے
بھائی کو جن الفاظ میں اطلاع دی وہ یہ تھے۔

"میں نے اس کو دیکھا۔ وہ لوگوں کو اچھے اخلاق
کی تعلیم دیتا ہے۔"

ہجرت حبشہ کے موقع پر جب وہاں کے بادشاہ نے مسلمانوں
سے حضور اکرمؐ کے بارے میں پوچھا تو حضرت جعفر طیار
رضی اللہ عنہ نے فرمایا

"اے بادشاہ! ہم لوگ جاہل تھے۔ بتوں کو
پوجتے تھے، مردار کھاتے تھے۔ ہمسایوں کو ستاتے
تھے، بھائی بھائی پر ظلم کرتا تھا۔ زبردست زیردست
کو کھا جاتا تھا۔ ہم میں ایک شخص پیدا ہوا۔ اس
نے ہمیں بتایا کہ بتوں کو پوجنا چھوڑ دیں۔ سچ بولیں
خونریزی سے باز آجائیں۔ یتیموں اور بے کسوں
کا مال نہ کھائیں۔ ہمسایوں کی راحت وعزت کا
خیال رکھیں اور پاک دامن عورتوں پر بدنامی
کے داغ نہ لگائیں۔"

گویا ایمان کی روح کے بعد دعوتِ محمدیؐ کے دو
پہلو ہیں ایک عبادت اور دوسرا اخلاق۔ ایک خالق کا حق دوسرا
مخلوق کا۔ اور ان ہی کے مجموعے کا نام اسلام ہے۔

جب ہم تمام انبیاء کی زندگیوں کا مطالعہ کرتے ہیں
تو معلوم ہوتا ہے کہ ان میں سے کسی کی زندگی بھی سرورِ کونین
آقائے نامدار حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی حیاتِ پاک کے
برابر نہیں۔ دنیا کا کوئی پیغمبر اور بانیِ مذہب ایسا نہیں جس کی
زندگی کا ہر پہلو ہمارے سامنے موجود ہو۔ حضرت نوح علیہ السلام
سے لے کر حضرت موسیٰ علیہ السلام تک تمام پیغمبروں پر ایک نگاہ
ڈالی جائے۔ ان کی معلوم زندگی کی چند سطریں اور چند واقعات
ہمارے سامنے ہیں اور ان کا بھی زیادہ تر قابلِ اعتماد حصہ
قرآن کریم کی زبانی ہم تک پہونچا ہے۔

حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی ۳۳ سالہ زندگی میں
صرف تین برس کا حال ہم کو معلوم ہے۔ اسلام کے معلمِ اخلاق
ہی کی زندگی ایسی ہے جس کا ایک ایک حرف دنیا میں محفوظ اور
سب کو معلوم ہے۔ خود کائنات کے اس عظیم معلمؐ اخلاق کا یہ حکم
تھا کہ میرے ہر قول وعمل کو ایک سے دوسرے تک پہنچا دو۔
محرمانِ راز کو اجازت تھی کہ "مجھے خلوت میں جو کرتے دیکھو اسے
جلوت میں برملا بیان کر دو۔ حجروں اور کوٹھریوں میں جو کہتے
سنو اسے چھتوں پر چڑھ کر لوگوں کو سنا دو۔" ہر خطبہ میں
آپؐ کا یہ اعلان ہوتا تھا آگاہ ہو جاؤ جو بھی یہاں حاضر ہے
اور میری بات سن رہا ہے وہ غائب کو میری بات پہنچا دے
ایک حرف چھپانے کی ضرورت نہیں ہے۔

چند شہادتیں

انسان کے اخلاق وعادات اور اعمال وافعال کا
بیوی سے بڑھ کر رازداں اور کون ہو سکتا ہے۔ جس وقت
حضور اقدسؐ کو نبوت ورسالت سے نوازا گیا۔ اس وقت
حضرت خدیجہؓ سے آپؐ کے نکاح کو پندرہ برس ہو چکے تھے
۔ یہ اتنی بڑی مدت ہے کہ اس میں ایک انسان
دوسرے کے عادات وخصائل کو خوب اچھی طرح جان لیتا ہے۔
اس جان لینے کا اثر حضرت خدیجہؓ پر یہ پڑا کہ جب آنحضرتؐ
نے اپنی نبوت ورسالت اور وحی آنے کا حال بیان کیا تو حضرت
خدیجہؓ نے بلا تردد اس کی تصدیق کی اور جب آپؐ کو نبوت
کے بارِ گراں سے گھبرایا ہوا دیکھا تو یوں تسلی دی

"یا رسول اللہ! خدا آپؐ کو تنہا نہیں چھوڑے گا
کیوں کہ آپؐ قرابت داروں کا حق ادا کرتے ہیں،
قرضداروں کا قرض اتارتے ہیں۔ غریبوں کی مدد
کرتے ہیں مہمان کی تواضع کرتے ہیں، حق کی حمایت

کہتے ہیں اور مصیبتوں میں درد مندوں کے کام آتے ہیں

(رسول رحمت ابوالکلام مرتبہ غلام رسول مہر مقتبس)

حضرت عائشہ صدیقہؓ کی شہادت

حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ تعالی عنہا نے مدینہ آنے سے قبل رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی مکی زندگی کے بعض اہم واقعات بھی دیکھے تھے اور مدنی زندگی میں تو وہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی رفیقہ حیات بن گئی تھیں۔ یہاں تک کہ حضور علیہ السلام کی حیات پاک کا آخری ہفتہ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کے حجرے میں گزرا جب روح پاکؐ اس دنیا کو چھوڑ کر عالم قدس کو پہنچی تو وہی آپؐ کو سہارا دیے ہوئے تھیں۔ اور اللہ تعالی نے آپؓ کے حجرے کو حضورؐ کے جسم اطہر کی آرام گاہ بنایا۔

مشاہدے اور تجربے کے جیسے مواقع حضرت عائشہؓ کو میسر آئے وہ اور کسی کو نصیب نہیں ہوئے۔ آپؓ کے ارشادات ملاحظہ ہوں

- جب کبھی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو دو باتوں میں اختیار دیا جاتا تو آپؐ ان میں سے وہ لیتے جو آسان ہوتی۔ بشرطیکہ اس میں برائی کا کوئی پہلو نہ ہوتا۔ اگر اس میں برائی یا گناہ کا شائبہ بھی ہوتا تو آپؐ سب سے بڑھ کر اس سے پرہیز کرنے والے ہوتے۔
- رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے کبھی اپنی ذات کے لیے کسی کو سزا نہیں دی نہ کبھی بدلہ لیا۔ ہاں اللہ تعالی کے حکموں کی حرمت زائل کرنے والوں کو آپؐ سزا دیتے تھے۔
- آپؐ کی عادت مبارکہ یہ تھی کہ اگر کوئی برائی کرتا تو اس کا بدلہ برائی سے نہیں دیتے تھے بلکہ اس کو معاف فرما دیتے تھے۔
- آپ کبھی قہقہہ مار کر نہیں ہنستے۔ اس طرح ہنسنے کرتا لونگ نظر نہیں آتا۔ صرف مسکرایا کرتے تھے
- ہر لحظہ دل پر خوف و خشیت الہی کا غلبہ رہتا۔ بادل دیکھتے یا آندھی آتی تو چہرہ مبارک پر تکلیف کے آثار نمایاں ہو جاتے۔ میں نے (حضرت عائشہؓ نے) ایک بار عرض کیا۔

یا رسول اللہ! لوگ بادل دیکھتے ہیں تو اس امید پر خوش ہوتے ہیں کہ بارش ہوگی۔ آپؐ کے چہرے سے تکلیف اور پریشانی کے آثار نمایاں ہوتے ہیں۔ فرمایا عائشہ! کون سی بات مجھے بے خوف کر سکتی ہے کہ اس میں عذاب نہیں ہوگا۔ ایک قوم کو آندھی سے عذاب دیا گیا۔ ایک قوم نے عذاب دیکھا تو کہا یہ بادل ہے۔

- آپؐ نے نام لے کر کبھی کسی پر لعنت نہیں فرمائی نہ کبھی کسی خادم، غلام، کنیز، عورت اور جانور کو اپنے ہاتھ سے مارا
- آپؐ نے کبھی کسی کی درخواست رد نہیں کی۔ الا یہ کہ وہ ناحق اور غلط ہوتی۔
- گھر میں تشریف لاتے تو مسکراتے ہوئے آتے۔ باتیں اس طرح ٹھہر ٹھہر کر کرتے کہ کوئی یاد رکھنا چاہتا تو یاد کر لیتا۔
- اگر کسی کی کوئی بات ناپسند ہوتی تو اس کا نام لے کر منع نہ فرماتے بغیر کسی کی نشاندہی کے اس بات کی برائی بیان فرماتے
- ایک بار ایک دیہاتی آیا اور بولا یا رسول اللہؐ! آپ بچوں کو بوسہ دیتے ہیں۔ ہم تو نہیں دیتے۔ فرمایا اللہ نے تیرے دل سے رحم نکال دیا ہے۔ اس میں میرا کیا اختیار ہے

باقی صفحہ نمبر ۶۵ پر

سید احمد خاںؒ

ہمدردی

کیا دھوکے کی چیز ہے! کیا بھلاوے میں پڑے ہیں جو سمجھتے ہیں کہ دوسروں کی مصیبت میں مدد کرنا ہمدردی ہے۔ کیا قدرت کا کوئی کام بے فائدہ ہے؟ نہیں، گو ہم بہتوں کے سمجھنے سے عاجز ہیں۔ کیا ہم اس فائدہ میں شریک نہیں؟ نہیں، بیشک واسطہ یا بلا واسطہ یا واسطہ در واسطہ شریک ہیں۔ پھر دوسرے کی مدد کرنا کہاں رہا؟ بلکہ اپنی آسائش کے کسی وسیلے سے اپنی مدد آپ کرنا ہوا، اس لیے جو لوگ ہمدردی کرتے ہیں وہ حقیقت میں اپنی آپ مدد کرتے ہیں اور جو نہیں کرتے وہ خود اپنی آسائش کے وسیلے کو نقصان پہنچاتے ہیں۔

ہمدردی کا لفظ ہمارے خیال کو ایسی امداد کی طرف لے جاتا ہے جو رنج اور مصیبت کی حالت میں ہو لیکن اگر ہم مصیبت کے لفظ کی اصلی مراد پر غور نہ کریں تو ضرور غلطی میں پڑیں۔

عام مفہوم مصیبت کا جو اس لفظ سے ہماری سمجھ میں آتا ہے کوئی مستقل مفہوم نہیں ہے بلکہ نسبتی مفہوم معلوم ہوتا ہے جو چیز کہ ایک کے لیے مصیبت ہو ممکن ہے کہ دوسرے کے لیے نہ ہو۔ وہ عادت اور استعمال سے ایسی مختلف ہو جاتی ہے کہ مصیبت معلوم نہیں ہوتی۔ وہ کسی وقت کے سبب سے ایسی بدل جاتی ہے کہ بالکل راحت سمجھی جاتی ہے۔ بیشک یہ تمام مفہوم نسبتی ہیں اور جو اصلی مفہوم ہے وہ ایسی حالت کا ہونا یا واقع ہونا ہے جو قدرتی فرحت اور راحت کے برخلاف ہو۔

اس حالت کا ہونا غیر اختیاری حالتوں کا ہونا ہے اور واقع ہونا اختیاری حالتوں کا، مگر پچھلی حالت اگر نتیجے کی لاعلمی یا نقصانات غیر متعدی کے سبب سے ہے تو مجازاً وہ پہلی ہی سی ہے ورنہ حقیقت میں وہ مصیبت نہیں بلکہ سزا ہے اور اس لیے اس میں ہمدردی نہیں۔ پس اصلی یا اصلی سی مصیبت میں کسی کی مدد کرنا البتہ سچی ہمدردی ہے۔

رحم اور مؤانست اور ہمدردی شاید نتیجے میں متحد ہوں مگر ہر ایک کا منشا مختلف ہے۔ رحم ایک فطری نیکی ہے جو ہم جنس اور غیر ہم جنس دونوں کے ساتھ برتی جاتی ہے۔ مؤانست کا اثر صرف ہم جنسوں ہی میں پایا جاتا ہے۔ ہمدردی جو عقل کے نتیجوں میں سے ہے ذی عقل ہی میں ہو سکتی ہے اور اس لیے صرف انسان ہی میں منحصر ہے۔ پس جس میں ہمدردی نہیں اس کی انسانیت میں نقصان ہے۔

قدرتی قاعدے کے مطابق ہمدردی کے اعتبار متفاوت، اپنی آسائش کے وسیلوں کے متفاوت درجے ہیں، جس طرح کہ باپ، بھائی، جورو، بچے، پھر اور درجہ بدرجہ کے رشتہ مند، پھر اپنے ملک کے، پھر اپنے ہمسایہ ملک کے، پھر اس سے دور کے ملک کے باشندے درجہ بدرجہ ہماری آسائش کے وسیلے ہیں، اسی طرح اس قادر مطلق کی کامل قدرت نے ہمدردی کے رشتہ کی مقبولی اور

استواری کو بھی درجہ بدرجہ بنایا ہے۔ باپ کو بیٹے سے جو جوش
اور ہمدردی ہے وہ پوتے سے نہیں اور جو پوتے سے ہے وہ
پڑپوتے سے نہیں۔ اسی طرح یہ رشتہ جتنا کہ بڑھتا جاتا ہے
اتنا ہی گھٹتا جاتا ہے اور جب وہ اپنے ملک یا ہمسایہ ملک یا
اس سے دور کے ملک تک پہنچتا ہے تو اور بھی بتلا ہو جاتا ہے
بعض کہتے ہیں کہ "یہ ایک دھوکہ ہے اور
اگر یہ دھوکہ نہیں ہے اور یہ متفاوت درجے قدرتی ہیں۔
تو انجان بیٹے اور ان پہچان باپ میں کیوں وہ ہمدردی نہیں
حقیقت میں یہ صرف ایک خیال ہے جس سے موانست پیدا
ہوتی ہے اور وہی باعث ہمدردی ہے۔ نفرت جو اس کی
ضد ہے اس کا بخوبی ثبوت کرتی ہے کہ جب وہ پیدا ہوتی ہے
تو باوجود موجود ہونے قدرتی رشتے کے کچھ بھی ہمدردی نہیں
رہتی۔

بیشک ایسا یا ایسا سا ہوتا ہے، مگر اس میں کچھ غلطی
بھی ہے۔ قریب رشتہ والا بہ نسبت دور کے رشتے والے
کے بلاشبہ ہم سے زیادہ تر جزئیت رکھتا ہے اور اسی طرح
بعید بہ نسبت ابعد کے، پھر اگر وہ جزئیت قدرتی ہے تو وہ
ہمدردی بھی قدرتی ہے ہاں موانست اس کو نہایت تیز کر دیتی
ہے اور کبھی ایسی جو قدرتی سی معلوم ہوتی ہے۔ نفرت اس کی
تیزی کو دباتی ہے اور کبھی ایسا کر دیتی ہے جو کبھی ہوئی سی
معلوم ہوتی ہے۔ انجان بیٹے اور ان پہچان باپ میں جو وہ جھکتی
نہیں نہ اس لیے کہ وہ نہیں ہے بلکہ اس لیے کہ ان میں انسانیت
کا ایک بڑا جزو جو علم یعنی دانستن ہے وہ نہیں ہے۔ مگر تعجب یہ
ہے کہ جو ہمدردی اعلیٰ ہے وہ مذمت میں اعلیٰ اور صفت میں
ادنیٰ ہے اور جو ادنیٰ ہے وہ مذمت میں ادنیٰ اور صفت
میں اعلیٰ ہے۔ اس لیے کہ ایک میں کم نا قدرتی صفت کا اور
دوسری میں متعصب کم نا قدرتی صفت میں ہے

قریبوں سے ہمدردی نہ کرنی نہایت بدخصلت
اور قابل سزا کے ہے۔ اس لیے کہ قدرت کے نہایت مستحکم قاعدے
کو توڑنا ہے اور کرنی کچھ بڑی صفت نہیں، کیونکہ قدرت
نے اس کے کرنے پہ مجبور کر رکھا ہے۔ بعیدوں سے ویسی نہ
کرنی کچھ سخت مذمت نہیں۔ اس لیے کہ قدرت کے کسی مستحکم قاعدے
کی برخلافی نہیں اور کرنی نہایت عمدہ صفت ہے۔ کیونکہ قدرت
کے منشا کو بدرجہ اتم کامل کرنا ہے۔

افسوس ہے کہ یہ عمدہ صفت کبھی دھوکہ کھا کر
معیوب بھی کر دی جاتی ہے۔ جبکہ پہلی کو ادنیٰ صفت سمجھ کر
چھوڑتے ہیں اور دوسری کو اعلیٰ صفت سمجھ کر چھوڑتے ہیں۔ مگر
پہلی کے چھوڑنے کی برائی دوسری کی بھلائی کو بھی لے ڈوبتی ہے
پس سچی ہمدردی وہی ہے جو قدرت کے قانون کے مطابق اور
قدرت کی منشا کی تکمیل کے لیے ہو۔

کیا عمدہ اور سہل طور پر عام عمل درآمد کے
لائق کر دیا ہے۔ اس مضمون کو بڑی قدرت والے اور معاشرت
و تمدن کے زبردست قانون جاننے والے نے جب کہ ہم سے
یوں کہا۔

لیس البر ان تولوا وجوھکم قبل المشرق
والمغرب ولکن البر من آمن باللہ والیوم الآخر
والملائکۃ والکتاب والنبیین وآتی المال علی حبہ
ذوی القربی والیتامی والمساکین وابن السبیل
والسائلین وفی الرقاب (ترجمہ) نیکی یہی نہیں کہ
منہ کرو اپنے مشرق کی طرف، لیکن نیکی وہ ہے جو کوئی ایمان
لاوے اللہ پر اور پچھلے دن پر اور فرشتوں پر اور کتاب
پر اور نبیوں پر اور دیوے مال اس کی محبت پر قرابت
والوں کو اور یتیموں کو اور محتاجوں کو اور راہ کے مسافر
کو اور مانگنے والوں کو اور گردنیں چھڑانے میں۔

باقی صفحہ نمبر ۵ پر

چُن چُنے

یہ بہت باریک دھاگے کی طرح سفید کیڑے
ہیں جو بڑی آنت کے آخری حصہ میں پیدا ہو جاتے ہیں۔ یہ چوں کہ
سرکے کے کیڑوں سے مشابہ ہوتے ہیں۔ اس لیے عربی میں انھیں
دود الخل" کہتے ہیں۔ انگریزی میں تھریڈ ورم سے موسوم ہیں
یہ بیماری عام طور پر بچوں کو زیادہ ہوا کرتی ہے۔ ان کیڑوں
کی لمبائی $\frac{1}{12}$ سے $\frac{1}{2}$ انچ تک ہوتی ہے۔ سر میں تین لبوں والا
منہ ہوتا ہے اور کیڑے دونوں سروں پر گاؤدم ہوتے ہیں
ان کی جگہ اندھی آنت ہے۔ بعض اوقات دوسری آنتوں
اور مقعد میں بھی آجاتے ہیں۔ کبھی معدے میں بھی پہنچ جاتے ہیں
تعداد ہزاروں تک پہنچ جاتی ہے۔ یہ اجابت کے ساتھ خارج ہو کر
انڈے دیتے ہیں۔ یہی انڈے پانی ساگ پات یا میووں کے
ساتھ آدمی کے پیٹ میں چلے جاتے ہیں اور پھوٹ کر کیڑوں کی
شکل اختیار کر لیتے ہیں۔ بڑھتے بڑھتے ہزاروں لاکھوں تک
ہو جاتے ہیں۔

جو بچے اس بیماری کا شکار ہوتے ہیں، ان کے
پاخانے کے مقام پر سخت کھجلی ہوتی ہے۔ کھجلی رات کو زیادہ ہوتی
ہے اور کھجاتے کھجاتے جگہ سرخ ہو جاتی ہے بے چینی اتنی ہوتی
ہے کہ اکثر رات کو نیند بھی نہیں آتی۔ اگر یہ بیماری عرصے تک
رفع نہیں ہوتی ہے تو بچہ ضدی اور چڑچڑا ہو جاتا ہے۔ اس
کی آنتوں کے افعال خراب ہو جاتے ہیں۔ اس لیے پاخانہ
پھٹا پھٹا آیا کرتا ہے۔

کیڑوں کے جو انڈے باہر سے پیٹ میں جاتے ہیں
وہ اپنی پرورش کا موزوں ماحول پا کر وہاں بڑھنے لگتے ہیں
اگر بچوں کو قابض غذائیں کھلائی جاتی ہیں تو ان کا فضلہ آنتوں
میں دیر تک ٹھہرنے کی وجہ سے انڈوں میں سے نکلے ہوئے
بچوں کی پناہ گاہ بن جاتا ہے
کیڑے مارنے کی غرض سے تیز زہریلی دوائیں
بچوں کو نہ دی جائیں۔ اس قسم کی دواؤں سے عارضی فائدہ
ضرور ہوتا ہے مگر مستقلاً آرام نہیں ہوتا۔ کیڑے پھر پیدا
ہو جاتے ہیں۔ بہتر علاج یہ ہے کہ اس پناہ گاہ کو باقی نہ رہنے
دیا جائے جس کے زیر سایہ پیٹ کی اندرونی فضا میں کیڑوں
کی یہ فوج روز بروز بڑھتی ہی جا رہی ہے۔ دودھ پیتے بچوں
کی ماں کو اپنی غذا میں بہت زیادہ احتیاط کرنی چاہیے۔ گوشت
چھوڑ دینا چاہیے اور پھل زیادہ کھانے چاہییں۔ کنو، سنترہ، موسمی
میٹھا لیموں، سیب، ناشپاتی، چکوترہ، انگور، آلو،
آلوچہ اس حالت میں بہت عمدہ پھل ہیں انھیں خوب کھانا
چاہیے۔ اس کے ساتھ دودھ استعمال کرنے میں کوئی حرج
نہیں۔ دو چار دن غذائیں کھا کر آہستہ آہستہ ٹھوس
غذائیں شروع کی جا سکتی ہیں۔ مگر ابتدا میں دودھ، دلیا،
مونگ کی پتلی کھچڑی اور ساگو دانہ کھانا چاہیے۔ پھر پکی ہوئی سبزیاں
بغیر چھنے آٹے کی روٹی کھائی جا سکتی ہے۔ ہفتہ بھر بعد سبزی
ڈلا ہوا گوشت بھی کھایا جا سکتا ہے۔ قبض کی صورت میں پھلو

باقی صفحہ نمبر ... پر

عزت

تہذیب الاخلاق جلد دوم نمبر

بہت کم لوگ ہیں جو اس کی حقیقت جانتے ہوں اور بہت کم ہیں جو اس کے مشتقات کے معزز (آنریبل) کے مستحق ہوں جس کی لوگ بہت زیادہ آؤ بھگت کرتے ہیں اس کو لوگ معزز سمجھتے ہیں اور وہ اپنے آپ کو بھی معزز جانتا ہے۔ دولت، حکومت، ظاہری ملازمت، تنخواہ لوگوں کو معزز بنا دیتی ہے۔ وہ خود بھی آپ کو معزز جانتے ہیں۔ اوصافِ ظاہری بھی ایک ذریعہ معزز ہونے اور معزز بننے کا ہے جو دولت اور حکومت اور حشمت سے بھی زیادہ ان کو معزز بنا دیتا ہے، مگر یہ اعزاز اس سے زیادہ کچھ رتبہ نہیں رکھتا جیسے کہ ایک تانبے کی مورت پر سونے کا ملمع کر دیا گیا ہو۔ جب تک وہ مورت ٹھوس سونے کی نہ ہو اس وقت تک درحقیقت وہ کچھ قدر و قیمت کے لائق نہیں ہے۔ یہی حال انسان کا ہے۔ جب تک اس کی اندرونی حالت بھی عزت کے قابل نہ ہو وہ معزز نہیں ہو سکتا۔ لوگوں کو کسی انسان کی اندرونی حالت کا جاننا نہایت مشکل اور قریب ناممکن کے ہے پس ان کا کسی کو معزز سمجھنا درحقیقت اس کے معزز ہونے کی کافی دلیل نہیں ہے۔ ہاں وہ شخص بلاشبہ معزز ہے جس کا دل اس کو معزز جانتا اور معزز سمجھتا ہو۔ جس کو انگریزی میں سیلف ریسپکٹ کہتے ہیں۔ کوئی شخص کسی سے جھوٹی بات کو سچی بنا کر کہتا ہے تو خود اس کا دل اس کو ٹوکتا ہے کہ یہ سچ نہیں ہے، گو سننے والا اس کو سچ سمجھتا ہو مگر کہنے والے کا دل گواہی دیتا ہے کہ وہ جھوٹوں میں کا ایک جھوٹا اور بے عزتوں میں کا ایک بے عزت ہے۔

اسی طرح تمام افعال انسان کے جو صرف ظاہری نمائش کے طور پر کیے جاتے ہیں، گو لوگ ان کی عزت کرتے ہوں مگر درحقیقت وہ عزت کے مستحق نہیں ہیں۔ عزت کے لائق وہی کام ہیں جن کو دل بھی قابل عزت سمجھے۔ اس لیے انسان کو انسان بننے کے لیے ضروری ہے کہ تمام اس کے کام سچائی اور دلی شہادت پر مبنی ہوں۔ ہم کوئی بات ایسی نہ کہیں جس کو ہمارا دل جھٹلاتا ہو۔ ہم کوئی ایسا کام نہ کریں، جس کی ہمارا دل عزت کرتا ہو۔ کسی سے ہم اظہار دوستی اور محبت کا نہ کریں اگر درحقیقت ہمارے دل میں اس سے ویسی ہی محبت اور دوستی نہ ہو جیسی کہ اظہار کرتے ہیں۔ ہم کوئی کام ایسا نہ کریں جس کو ہمارا دل اچھا نہ سمجھتا ہو۔ صلح کل ہونا اگر اس کے معنی یہ ہوں کہ سب سے اس طرح ملیں کہ ہر شخص جانے کہ ہمارے بڑے دوست ہیں تو یہ نفاق اکبر ہے اور ایسا شخص نہ کسی کا دوست ہوتا ہے اور نہ کوئی اس کا دوست ہوتا ہے۔ اور اگر اس کے یہ معنی ہوں کہ کسی سے بغض، عداوت اور دشمنی اپنے دل میں نہ رکھے، کسی کا برا نہ چاہے۔ دشمن کی

باقی صفحہ نمبر ۱۲ پر دیکھیے

مولوی وحید الدین خاں

کوئی چیز مشکل نہیں

ہیرا ہماری تمام دھاتوں میں سب سے زیادہ سخت ہے۔ دنیا کی کوئی چیز ہیرے سے زیادہ سخت نہیں ہوتی۔ شیشہ کا فریم بنانے والے کو آپ نے دیکھا ہوگا کہ وہ "قلم" کی صورت میں ایک چیز شیشہ کے تختے پر گزارتا ہے اور شیشہ کٹ کر دو ٹکڑے ہو جاتا ہے۔ اس قلم میں ہیرے کا ٹکڑا لگا ہوتا ہے۔ ایسا اس لیے ممکن ہوتا ہے کہ ہیرا انتہائی سخت چیز ہے خواہ وہ قدرتی ہو یا مصنوعی۔

تمام دوسری معدنیات کے برعکس ہیرے پر کسی قسم کا ایسڈ (تیزاب) اثر نہیں کرتا۔ آپ ہیرے کو خواہ کسی بھی تیزاب میں ڈالیں وہ ویسا کا ویسا باقی رہے گا۔ مگر اس سخت ترین ہیرے کو اگر ہوا کی موجودگی میں خوب گرم کیا جائے تو وہ ایک بے رنگ گیس بن کر اڑ جائے گا اور یہ گیس کاربن ڈائی آکسائڈ ہوگی۔

اسی طرح ہر چیز کا ایک "توڑ" ہوتا ہے۔ اگر آپ کسی چیز کا مقابلہ وہاں کریں، جہاں وہ اپنی سخت ترین حیثیت رکھتی ہے تو ممکن ہے کہ آپ کی کوشش کامیاب نہ ہو۔ مگر کسی دوسرے مقام سے آپ کی یہی کوشش انتہائی حد تک نتیجہ خیز ہو سکتی ہے۔ جب بھی آپ کا مقابلہ کسی مشکل سے پیش آئے تو سب سے پہلے یہ معلوم کیجیے کہ اس کا کمزور مقام کون سا ہے اور جہاں اس کا کمزور مقام ہو وہیں سے اپنی جدوجہد شروع کر دیجیے۔ ایک چیز کسی اعتبار سے ناقابل شکست ہو سکتی ہے مگر وہی چیز دوسرے اعتبار سے آپ کے لیے موم ثابت ہوگی۔

ایک شخص جس کو آپ کڑوے بول سے اپنا موافق نہ بنا سکے، اس کو آپ میٹھے بول سے اپنا موافق بنا سکتے ہیں۔ اپنے جس حریف کو آپ لڑائی کے ذریعہ دبانے میں کامیاب نہ ہو سکے اس کو آپ اخلاق اور شرافت کے ذریعہ دبانے میں کامیاب ہو سکتے ہیں۔ ایک ماحول جہاں آپ مطالبہ اور احتجاج کے ذریعہ اپنا مقام حاصل نہ کر سکے وہاں آپ محنت اور لیاقت کے ذریعہ اپنا مقام حاصل کر سکتے ہیں۔

ہیرا تیزاب کے لیے سخت ہے مگر وہ آنچ کے لیے نرم ہو جاتا ہے۔ یہی معاملہ انسان کا بھی ہے۔ ایک آدمی اگر ایک اعتبار سے سخت نظر آئے تو اس کو ہمیشہ کے لیے سخت نہ سمجھ لیجیے۔ اگر وہ ایک اعتبار سے سخت ہے تو دوسرے اعتبار سے نرم بھی ہو سکتا ہے۔ ہر چیز کا یہ حال ہے کہ وہ کسی اعتبار سے سخت ہے اور کسی اعتبار سے نرم۔ ایک شخص ایک انداز سے معاملہ کرنے میں بے لچک نظر آتا ہے مگر وہی دوسرے انداز سے معاملہ کرنے میں ہر طرح راضی ہو جاتا ہے۔ یہی وہ حقیقت ہے جس کو جاننے میں زندگی کی تمام کامیابیوں کا راز چھپا ہوا ہے۔

ماخوذ از الرسالہ دہلی۔ مئی ۱۹۸۲ شمارہ نمبر ۶۶

علی گڑھ مسلم یونیورسٹی علی گڑھ

اشتہار نمبر ۱۳/۸۷-۱۹۸۲

مندرجہ ذیل آسامیوں کے لیے مجوزہ فارموں پر درخواستیں مطلوب ہیں:

یہ آسامیاں فیکلٹی آف آرٹس، فیکلٹی آف سائنس، فیکلٹی آف کامرس، فیکلٹی آف سوشل سائنسیز اور فیکلٹی آف انجینئرنگ اور ویمنس کالج سے متعلق ہیں۔

پروفیسرس:

شرح تنخواہ:- ۱۵۰۰ - ۶۰ - ۱۹۰۰ - ۱۰۰ - ۲۰۰۰ - ۱۲۵/۲ - ۲۵۰۰ روپیہ

۱- پروفیسر شعبۂ سنسکرت (مستقل)

۲- پروفیسر شعبۂ اسٹیٹسٹکس (" ")

استعداد:

۱- (لازمی):- متعلقہ مضمون میں ماسٹرس ڈگری، فرسٹ کلاس یا سیکنڈ کلاس۔ یہ ڈگری کسی بھی ہندوستانی یونیورسٹی کی ہو یا اس کے مساوی بیرونی ممالک کی ڈگری ہو۔

۲- ریسرچ ڈگری ڈاکٹریٹ کے معیار کی یا اعلیٰ معیار کی مطبوعہ تحقیقی کام اور

۳- پوسٹ گریجویٹ کلاسیز کی تدریس کا دس سالہ تجربہ معہ ریسرچ کی رہنمائی کے۔

پسندیدہ:

۴- اسامی نمبر ۱- پروفیسر شعبۂ سنسکرت کے لیے۔

پراکرت اور پالی کی بقدر ضرورت معلومات

ریڈرس

شرح تنخواہ: ۱۲۰۰ - ۵۰ - ۱۳۰۰ - ۶۰ - ۱۹۰۰ روپیہ مع دیگر الاؤنسیز

۳۔ ریڈران اسٹیٹسٹکس، شعبۂ اسٹیٹسٹکس (مستقل)

۴۔ ریڈران بزنس مینیج مینٹ (دو آسامیاں) ڈیپارٹمنٹ آف بزنس ایڈمنسٹریشن (مستقل)

۵۔ ریڈرانِ ایجوکیشن، ڈیپارٹمنٹ آف ایجوکیشن (مستقل)

۶۔ ریڈرانِ پولٹیکل سائنس، ڈیپارٹمنٹ آف پولٹیکل سائنس (مستقل)

۷۔ ریڈرانِ ویسٹ ایشین اسٹڈیز (پولیٹیکل سائنس) سینٹر آف ویسٹ ایشین اسٹڈیز (عارضی مگر مستقل ہونے کا امکان)

استعداد

(۱) لازمی:

۱۔ ہندوستان کی کسی یونیورسٹی سے فرسٹ یا سکنڈ کلاس ماسٹرس ڈگری یا اس کے مساوی بیرونی ممالک سے ڈگری۔

۲۔ ڈاکٹریٹ معیار کی ریسرچ ڈگری یا اعلیٰ معیار کا مطبوعہ تحقیقی کام اور

۳۔ کم سے پانچ سال کا پوسٹ گریجویٹ کلاسیز کی تدریس کا تجربہ اور کچھ ریسرچ کی رہنمائی کا تجربہ۔

(۲)۔ پسندیدہ

۱۔ آسامی نمبر ۵ ریڈرانِ ایجوکیشن کے لیے ایم۔ایڈ اور پی ایچ ڈی کی سطح پر ریسرچ کی رہنمائی کا تجربہ ضروری ہے نیز اسکول کے کسی ایک مضمون میں ماسٹرس ڈگری ضروری ہے۔

۲۔ اسامی نمبر ۷ ریڈرانِ ویسٹ ایشین اسٹڈیز (پولیٹیکل سائنس) ایشیائے غربی کے سیاسی رجحانات و میلانات کی جدید ترین معلومات نیز ایشیائے غربی کی کسی دو عصری زبان کی بقدر ضرورت معلومات یا جدید یورپی زبان کی معلومات۔

لکچررس:

شرح تنخواہ: ۷۰۰ - ۴۰ - [illegible] - ۵۰ - ۱۴۰۰ روپیہ مع دیگر علاوہ نسیز

۸۔ لکچرران اسٹیٹسٹکس، شعبۂ اسٹیٹسٹکس (تین اسامیاں) دو مستقل ایک عارضی

۹۔ لکچرران اکنامکس (دو آسامیاں) شعبۂ معاشیات (مستقل)

۱۰۔ لکچرران اکنامکس (ایک اسامی) ویمنس کالج (عارضی)

۱۱۔ لکچرران بزنس مینیج مینٹ، ڈیپارٹمنٹ آف بزنس ایڈمنسٹریشن (دو اسامیاں مستقل)

۱۳۔ لیکچرران میتھیمیٹکس (دو آسامیاں۔ ایک مستقل اور ایک عارضی) شعبۂ ریاضیات

استعداد:

(۱)۔ لازمی:۔

۱۔ ڈاکٹرس ڈگری یا اس کے مساوی اعلیٰ معیار کا تحقیقی کام اور

۲۔ فرسٹ یا اعلیٰ سکنڈ کلاس کے ساتھ مسلسل تعلیمی ریکارڈ (بی ان دی سیون پائنٹ اسکیل) متعلقہ مضمون میں ماسٹرس ڈگری یا اس کے مساوی بیرونی ملک کی ڈگری۔

انٹر ڈسپلینری پروگرامس کی پیش رفت کی ضرورت کا لحاظ رکھتے ہوئے نمبر (۱) اور نمبر (۲) میں متذکرہ بالا ڈگریاں مضمون میں ہوں اگر سلکشن کمیٹی امیدوار کے تھیسیس یا مطبوعہ کام کو نہایت اعلیٰ درجہ کا تحقیقی کام خیال کرے تو متذکرہ بالا نمبر (۲) میں طلب کی گئی استعداد کی شرط کو کالعدم قرار دے سکتی ہے۔

اس کے علاوہ یہ بھی شرط ہے کہ اگر ڈاکٹرس ڈگری یا اس کے مساوی تحقیقی کام کا حامل کوئی امیدوار دستیاب نہ ہوسکے یا مناسب نہ سمجھا جائے تو ایسے شخص کا تقرر کیا جا سکتا ہے جو مسلسل بہتر تعلیمی ریکارڈ رکھتا ہو۔ (ایسی صورت میں ترجیح اس امیدوار کو دی جائے گی جو ایم فل کرچکا ہو یا اس کے مساوی ڈگری رکھتا ہو یا اس نے تحقیق کا معیاری کام کیا ہو۔ ایسے امیدوار کے لیے یہ بات مشروط ہے کہ اس نے کم سے کم دو سال تک تحقیقی کام کیا ہو۔ یا ریسرچ لیبارٹری / آرگنائزیشن میں کام کرنے کا عملی تجربہ رکھتا ہو اس شرط کے ساتھ کہ وہ اپنے تقرر کے وقت سے پانچ سال کی مدت کے اندر اندر ریسرچ ڈگری حاصل کرے گا یا اس کے مساوی اعلیٰ معیار کے تحقیقی کام کی شہادت پیش کرے گا۔ اگر وہ ایسا نہ کرسکا تو اس کے آئندہ کے انکریمنٹس روک جائیں گے جب تک کہ وہ ان مطلوبہ شرائط کو پورا نہ کر دے۔

فیکلٹی آف انجینئرنگ اینڈ ٹیکنولوجی اینڈ یونیورسٹی پالی ٹیکنیک:

لیکچررس:

شرح تنخواہ: ۷۰۰ ۔۔ ۴۰ ۔۔ ۱۱۰۰ ۔۔ ۵۰ ۔۔ ۱۶۰۰ روپے مع دیگر الاؤنسیز:

۱۳۔ لیکچررس ان میکینیکل انجینئرنگ، ڈپارٹمنٹ آف میکینیکل انجینئرنگ۔ ذاکر حسین کالج آف انجینئرنگ اینڈ ٹیکنولوجی (چار آسامیاں، عارضی ان جنسٹ پر گئے ہوئے لیکچررس کی خالی جگہیں)

۱۴۔ لیکچرران سول انجینئرنگ سیکشن یونیورسٹی پالی ٹیکنیک (عارضی)

۱۵- لکچرار سول انجینئرنگ (ڈرافٹنگ اینڈ ڈیزائنگ) یونیورسٹی پالی ٹیکنیک۔ پلان پوسٹ۔

۱۶- لکچرار میتھیمیٹکس سیکشن (تین اسامیاں) (ایک مستقل، ایک کے مستقل ہونے کا امکان اور ایک عارضی)۔
ذاکر حسین کالج آف انجینئرنگ اینڈ ٹیکنالوجی۔

۱۷- لکچرار میکنیکل انجینئرنگ (ڈرافٹنگ اینڈ ڈیزائننگ (ایک اسامی) میکنیکل انجینئرنگ سیکشن، یونیورسٹی پالی ٹیکنیک (پلان پوسٹ)

۱۸- لکچرار الیکٹرانکس (دو اسامیاں) ایک مستقل ایک عارضی۔ الیکٹرانکس انجینئرنگ سیکشن، ویمنس پالی ٹیکنیک (خواتین امیدواروں کو ترجیح دی جائے گی۔)

استعداد:

(۱) لازمی:۔

۱- انجینئرنگ/ٹیکنولوجی کے مناسب اور متعلقہ مضمون میں ماسٹرس ڈگری۔

۲- انجینئرنگ/ٹیکنولوجی میں بیچلرس ڈگری متواتر بہتر تعلیمی ریکارڈ کے ساتھ۔ فرسٹ کلاس بیچلرس ڈگری میں اور/یا ماسٹر کی ڈگری کی سطح پر۔

۳- اکیڈمک/ریسرچ انسٹی ٹیوشن کے باہر ایک سال کا متعلقہ پیشہ ورانہ تجربہ۔

انجینئرنگ اور ٹیکنولوجی کے انٹر ڈسپلنری پروگراموں کی پیش رفت کے ابھرتے ہوئے امکانات اور ان کے تقاضوں کا لحاظ کرتے ہوئے انجینئرنگ/ٹیکنولوجی کی ڈگریوں کی مطلوبہ شرائط کو کالعدم کیا جا سکتا ہے بشرطیکہ اعلیٰ تحصیلات کے حامل امیدوار میسر آجائیں۔

اس کے علاوہ یہ بھی تجویز کیا گیا ہے کہ گو ایک امیدوار پیشہ ورانہ تجربہ نہیں رکھتا یا ایک ایسا شخص جو یہ تجربہ تو رکھتا ہے لیکن موزوں نہیں پایا گیا ایسی صورت میں تقرر پانے والے امیدوار کے لیے ضروری ہوگا کہ وہ اپنی تاریخ تقرر سے پانچ سال کی مدت کے اندر اندر مطلوبہ پیشہ ورانہ تجربہ حاصل کرے۔ اگر وہ ایسا نہ کر سکا تو مستقبل کے انکریمنٹس سے وہ اس وقت تک محروم رہے گا جب کہ وہ ان تقاضوں کو پورا نہ کر دے۔

(۲) پسندیدہ:۔

برائے اسامی نمبر ۱۶ لکچرار میتھیمیٹکس سیکشن

۱- بی ایس سی انجینئرنگ کلاسیز کی تدریس کا تجربہ

۲- ایک اسامی کے لیے کمپیوٹر میتھڈ کی معلومات۔

۳۔ ایک اسامی کے لیے ان امیدواروں کو ترجیح دی جائے گی جن کے پاس ایم ایس سی ان اسٹیٹسٹکس کی ڈگری بھی ہو۔

غیر معمولی استعداد اور تجربہ رکھنے والے امیدواروں کو ابتدا ہی سے اعلےٰ تنخواہ دی جا سکتی ہے۔ جن امیدواروں کو انٹرویو کے لیے طلب کیا جائے گا انھیں بطور ٹی اے سکنڈ کلاس کا یکطرفہ کرایہ قریب ترین راستہ کا لحاظ کرتے ہوئے دیا جائیگا۔

درخواست دینے کے لیے مجوزہ فارم اور دیگر ہدایتیں اسسٹنٹ رجسٹرار (سلکشن کیٹی) سے ذاتی طور پر پتہ لکھ کر (۱۰×۲۳ سینٹی میٹر) کا لفافہ اور نقد دو روپیہ کی رسید جو مسلم یونیورسٹی کے فائننس آفس میں جمع شدہ ہو یا انڈین پوسٹل آرڈر (جو فائننس آفیسر مسلم یونیورسٹی کے نام واجب الادا ہو) کے ہمراہ حاصل کی جاسکتی ہیں۔

درخواستیں موصول ہونے کی آخری تاریخ ۲۰ رفروری ۱۹۸۳ء ہے۔ تاخیر سے موصول ہونے والی یا نامکمل درخواستیں مسترد کی جاسکتی ہیں۔

نوٹ :۔ یونیورسٹی کی ایگزیکٹو کونسل کی ہدایت مورخہ ۲۵ راگست ۱۹۸۲ء کے بموجب آئندہ تقرریوں کے لیے مناسب اور موزوں اشخاص پینیل پر رکھے جاسکتے ہیں۔

ضمیر احمد خاں
رجسٹرار

علی گڑھ مسلم یونی ورسٹی علی گڑھ

اشتہار نمبر ۱۴/۸۲-۱۹۸۳ء

درج ذیل اسامیوں کے لیے مجوزہ فارموں پر درخواستیں مطلوب ہیں۔

۱ - یونیورسٹی رجسٹرار:-

شرح تنخواہ:- ۱۵۰۰ - ۶۰ - ۱۸۰۰ - ۱۰۰ - ۲۰۰۰ روپیہ مع دیگر الاؤنسیز

استعداد:

امیدواروں کا بہتر تعلیمی پس منظر ہونا چاہیے اور کم از کم ایڈمنسٹریشن کا دس سالہ تجربہ، قابلِ ترجیح وہ ہوں گے جنھیں یونیورسٹی ایڈمنسٹریشن کا تجربہ حاصل ہو۔

۲ - پرنسپل، اے ایم یو گرلس ہائی اسکول:

شرح تنخواہ:- ۱۱۰۰ - ۵۰ - ۱۶۰۰ روپیہ مع دیگر الاؤنسیز

(الف)

۱- بیرونی ملک کی یونیورسٹی کی ماسٹرس ڈگری یا آنرس ڈگری جسے یو پی ایس سی نے ہندوستانی یونیورسٹی کی ڈگری کے مساوی تسلیم کیا ہو۔ یا ہندوستانی یونیورسٹیوں کی ایسی آنرس ڈگری جسے یو پی ایس سی نے ماسٹرس ڈگری کے مساوی تسلیم کیا ہو۔

۲- ٹیچنگ ڈگری یا ایجوکیشن میں ڈپلوما یا اس کے مساوی سند، اور

۳- مندرجہ ذیل دفعات میں سے کسی ایک کا تجربہ مطلوب ہے۔

۱ الف:- کسی بھی تسلیم شدہ کالج جس میں انٹرمیڈیٹ کا یا اعلیٰ کلاسیز ہوں، کے انتظامی عہدہ کا تین سالہ تجربہ۔

ب :- کسی بھی تسلیم شدہ ہائی اسکول کے انتظامی عہدہ کا پانچ سالہ تجربہ۔

ج :- کسی بھی تسلیم شدہ کالج یا ہائر سکنڈری اسکول میں تدریس کا پانچ سالہ تجربہ یا اس کے مساوی تدریس کا تجربہ کسی ٹیچرس ٹریننگ انسٹی ٹیوشن میں۔

د :- کسی تسلیم شدہ ہائر سکنڈری اسکول میں تدریس کا آٹھ سالہ تجربہ۔

ہ :- کم از کم پانچ سالہ تجربہ جس میں تین سالہ تجربہ تعلیمی امور کے انتظامیہ سے متعلق ہو اور کسی تعلیم شدہ ہائی / ہائر سکنڈری اسکول یا ٹیچرس ٹریننگ انسٹی ٹیوٹ میں تدریس کا دو سالہ تجربہ شامل ہو۔

(ب) تسلیم شدہ ہائی اسکولوں کے ٹرینڈ گریجویٹ ہیڈ صاحبان جن کی عمر ۴۵ سال ہو اور جنھیں ہائی / ہائر سکنڈری اسکول میں سکنڈری کلاسیز کی تدریس کا ۱۵ سالہ تجربہ ہو۔ (جس میں کم از کم ۵ سال کا انتظامی امور کا تجربہ کسی تعلیم شدہ ہائی اسکول میں بہ حیثیت ہیڈ کے ہو۔

یا

(ج) وہ امیدوار جن کے پاس ماسٹرس ڈگری ہو اور اس کے ساتھ کسی تعلیم شدہ ہائر سکنڈری اسکول اور/یا کسی تسلیم شدہ کالج میں تدریس کا کم از کم ۱۵ سالہ تجربہ ہو اور جن کی عمر ۴۵ سال ہو۔

یا

(د) تسلیم شدہ مڈل اسکولوں کے ہیڈ صاحبان جو ٹرینڈ پوسٹ گریجویٹ ہوں اور جنھیں تسلیم شدہ مڈل اسکولوں کے بحیثیت ہیڈ کے انتظامی امور کا کم از کم ۸ سالہ تجربہ ہو۔

یا

(ہ) وہ اشخاص جن کے پاس ماسٹرس ڈگری ایجوکیشن میں ہو اور جو ان شرائط میں سے کسی ایک کو پورا کر سکتے ہوں جس کا ذکر اس سے پہلے الف تا د کی دفعات میں آچکا ہے۔

نوٹ :- تجربہ کی دو یا زیادہ قسموں کو از راہ تناسب ملایا جا سکتا ہے اور تجربہ کی قسموں کی یہ ملاوٹ استعداد کی شرط (الف) کی قسم ۲ (ہ) اور (د) پر مشتمل ہوگی۔ ان کو ۸:۵ یا ۵:۸ کی نسبت سے ملایا جا سکتا ہے جیسی صورت حال ہو۔

۳۔ اسسٹنٹ انجینئر، بلڈنگ ڈپارٹمنٹ (مستقل)

شرح تنخواہ :- ۶۵۰ — ۳۰ — ۷۴۰ — ۳۵ — ۸۱۰ — ای بی — ۸۸۰ — ۴۰ — ۱۰۰۰ — ای بی — ۴۰ — ۱۲۰۰ روپیہ معہ دیگر الاونسیز

استعداد:

سول / میکینکل انجینرنگ میں قانوناً تسلیم شدہ ہندوستانی یونیورسٹیوں کی بیچلر ڈگریاں اور اس کے ساتھ واٹر سپلائی / سیوج اور کسی آرگنائزیشن میں سیوریج ڈسپوزل سسٹم کا کم از کم پانچ سالہ تجربہ یا واٹر سپلائی / سیوریج اور سیوج ڈسپوزل کے طریق کار اور اس کے تحفظ کا تجربہ (جو کم از کم ۵ سال پر مشتمل ہو)

یا

سول میکینکل انجینرنگ میں ڈپلوما اور اس کے ساتھ واٹر سپلائی سیوج اور سیوریج ڈسپوزل سسٹم (کسی آرگنائزیشن میں) یا واٹر سپلائی سیوریج اور سیوریج ڈسپوزل کے تحفظ اور طریق کار کا دس سالہ تجربہ

غیر معمولی استعداد اور تجربہ کے حامل امیدواروں کو ابتداء ہی سے اعلیٰ تنخواہ دی جا سکتی ہے۔ جن امیدواروں کا انٹرویو لیا جائے گا انھیں بطور ٹی اے سکنڈ کلاس کا ریل کا یک طرفہ کرایہ ادا کیا جائے گا۔

درخواست دینے کے لیے مجوزہ فارم اور دیگر ہدایات اسسٹنٹ رجسٹرار (سلکشن کمیٹی) سے ذاتی طور پر یا ذاتی پتہ لکھ کر ۱۰ × ۲۳ سینٹی میٹر لفافہ اور نقد دو روپیہ کی رسید (جو مسلم یونیورسٹی کے فائننس آفس میں جمع شدہ ہو) یا انڈین پوسٹل آرڈر (جو فائننس آفیسر مسلم یونی ورسٹی کے نام واجب الادا ہو) کے ہمراہ حاصل کی جا سکتی ہیں

درخواستیں موصول ہونے کی آخری تاریخ ۱۲ر فروری ۱۹۸۲ء ہے۔

تاخیر سے وصول ہونے والی یا نامکمل درخواستیں مسترد کر دی جائیں گی۔

ضمیر احمد خاں
رجسٹرار

علی گڑھ مسلم یونیورسٹی علی گڑھ

اشتہار نمبر ۱۵/۸۲-۱۹۸۳ء

مندرجہ ذیل اسامیوں کے لیے مجوزہ فارموں پر درخواستیں مطلوب ہیں ....

۱- سینئر ٹیکنیکل اسسٹنٹ، ڈیپارٹمنٹ آف پریوینٹیو اینڈ سوشل میڈیسن (مستقل)

شرح تنخواہ :- ۵۵۰ - ۲۵ - ۷۵۰ - ای بی - ۳۰ - ۹۰۰ روپیہ مع الاؤنسیز

استعداد :-

۱- لازمی :-

بی ایس سی اور اس کے ساتھ ٹریننگ کا تجربہ کسی میڈیکل کالج کے شعبۂ پریوینٹیو اینڈ سوشل میڈیسن/پیتھولوجی/بیکٹریولوجی میں۔

۲- پسندیدہ :

ترجیح انھیں دی جائے گی جنھیں پبلک ہیلتھ لیبارٹری ورک کا تجربہ حاصل ہو۔

۲- سینئر ٹیکنیکل اسسٹنٹ، ڈیپارٹمنٹ آف اناٹومی (مستقل)

شرح تنخواہ :- ۵۵۰ - ۲۵ - ۷۵۰ - ای بی - ۳۰ - ۹۰۰ روپیہ مع دیگر الاؤنسیز

استعداد :-

بی ایس سی اور اس کے ساتھ ٹریننگ کا تجربہ ہو جو مضمون کی لیبارٹری تیکنیک سے متعلق ہو۔

۳- سینئر ٹیکنیکل اسسٹنٹ، ڈیپارٹمنٹ آف اناٹومی (مستقل)

شرح تنخواہ :- ۵۵۰ - ۲۵ - ۷۵۰ - ای بی - ۳۰ - ۹۰۰ روپیہ مع دیگر الاؤنسیز

استعداد :-

(۱) لازمی :-

۱- بی ایس سی / بی اے

۲- ڈپلوما ان میوزیولوجی / ڈپلوما ان اسکول آف آرٹس۔

پسندیدہ :-

میوزیم کے تحقیقی نمونوں کی کلرنگ اور ماؤنٹنگ کا تجربہ اور کیمیاوی اشیاء کے ذریعہ تحقیق کے ان نمونوں کی حفاظت کرنے
تجربہ، مٹی سے نمونے بنانے اور ان کی کاسٹنگ کرنے کا تجربہ، سماعت اور بصارت کے آلات کے ذریعہ تدریس کا
تجربہ سب سے زیادہ قابلِ ترجیح ہوگا۔

۴:- سینیر ٹیکنیکل اسسٹنٹ، ڈپارٹمنٹ آف سرجری - پلاسٹک برن، ہینڈ اینڈ فیسیو میکزلری یونٹ (مستقل)
شرح تنخواہ :- ۵۵۰ - ۲۵ - ۷۵۰ - ای بی - ۳۰ - ۹۰۰ روپیہ مع دیگر الاؤنسیز

استعداد

۱- لازمی :-

بی ایس سی اور اس کے ساتھ مضمون سے متعلق لیبارٹری کے تکنیکی طریق کار کا تجربہ۔

۲- پسندیدہ :-

کسی تسلیم شدہ میڈیکل کالج کے پلاسٹک سرجری آپریشن تھیٹر اینڈ لیب ورک کا تجربہ

۵- سینیر ٹیکنیکل اسسٹنٹ (فوٹو) مولانا آزاد لائبریری (مستقل)
شرح تنخواہ :- ۵۵۰ - ۲۵ - ۷۵۰ - ای بی - ۳۰ - ۹۰۰ روپیہ مع دیگر الاؤنسیز

استعداد :-

۱- لازمی :-

بی ایس سی اور اس کے ساتھ مضمون سے متعلق لیبارٹری تکنیک کا تربیتی تجربہ۔

۲- پسندیدہ :-

۱- کسی یونیورسٹی لائبریری یا اعلیٰ تعلیمات کے ادارہ میں مخطوطات کی مائیکرو فلمنگ کا اور فوٹوگرافی کا کم از کم پانچ سال
تجربہ

۲- الیکٹرو کاپیر یا زیروکس مشین کے استعمال کرنے کا کم از کم تین سال تجربہ۔

۶۔ سینیر ٹیکنیکل اسسٹنٹ: شعبۂ جغرافیہ (مستقل)

شرح تنخواہ: ۔ ۵۵۰ ۔ ۲۵ ۔ ۷۵۰ ۔ ای بی ۔ ۳۰ ۔ ۹۰۰ روپیہ معہ دیگر الاؤنسیز

استعداد:

۱۔ لازمی: ۔ بی ایس سی / بی اے ۔ ترجیح انھیں دی جائے گی جن کے پاس کسی تسلیم شدہ یونیورسٹی / ادارہ سے کارٹو گرافی کا ڈپلوما ہوگا۔

۲۔ پسندیدہ: ۔ نقشے بنانے جغرافیائی چارٹس تیار کرنے اور ڈائی گرامس بنانے کا وسیع تجربہ اور کسی بھی پوسٹ گریجویٹ لیبارٹری میں کام کرنے کا تجربہ

۷۔ سینیر ٹیکنیکل اسسٹنٹ (ریفریکشن) ڈیپارٹمنٹ آف آپتھلموجی (مستقل)

شرح تنخواہ: ۔ ۵۵۰ ۔ ۲۵ ۔ ۷۵۰ ۔ ای بی ۔ ۳۰ ۔ ۹۰۰ روپیہ معہ دیگر الاؤنسیز

استعداد: ۔

بی ایس سی اور اس کے ساتھ ریفریکشن اور آپٹومیٹری میں تجربہ ۔ آپتھلمولوجی کے شعبہ میں یا کسی شہرت یافتہ ادارہ میں ریفریکشنسٹ کی حیثیت سے تجربہ۔

۸۔ سینیر ٹیکنیکل اسسٹنٹ، ڈیپارٹمنٹ آف کیمسٹری (مستقل)

شرح تنخواہ: ۔ ۵۵۰ ۔ ۲۵ ۔ ۷۵۰ ۔ ای بی ۔ ۹۰۰ روپیہ معہ دیگر الاؤنسیز

استعداد: ۔ بی ایس سی اور اس کے ساتھ مضمون سے متعلق لیبارٹری تکنیکوں میں تجربہ ترجیحی ۔

۹: ۔ پروگرام اسسٹنٹ، سینٹر آف کانٹینیوئنگ اینڈ ایڈلٹ ایجوکیشن (مستقل)

شرح تنخواہ: ۔ ۴۲۵ ۔ ۱۵ ۔ ۵۰۰ ۔ ای بی ۔ ۱۵ ۔ ۵۶۰ ۔ ۲۰ ۔ ۷۰۰ روپیہ معہ دیگر الاؤنسیز

استعداد: ۔

(الف) لازمی: ۔

۱۔ کسی مضمون میں بیچلرس ڈگری

۲۔ دفتر کے کاموں سے عہدہ برآ ہونے کی صلاحیت یعنی ٹائپنگ، اکاؤنٹنگ، فائل کیپنگ اور ڈرافٹنگ۔

۳۔ کانٹینیوئنگ اینڈ ایڈلٹ ایجوکیشن کے پروگراموں میں فیلڈ ورک کے اندر مدد کرنے کی صلاحیت۔

(ب) ۔ پسندیدہ: ۔

۱۔ کم از کم آفس ورک کا پانچ سالہ تجربہ۔

۹۔ یونیورسٹی کے اندر مختلف سیکشنوں سے اور پبلک سے رابطہ رکھنے کی صلاحیت۔

۱۰۔ اسٹاف نرسیز (دو اسامیاں) یونیورسٹی ہیلتھ سروس (مستقل)

شرح تنخواہ :۔ ۴۲۵ ۔ ۱۰۔۵ ۔ ای بی ۔ ۲۰ ۔ ۶۴۴ روپیہ معہ دیگر الاؤنسیز۔

استعداد :۔

۱۔ لازمی :۔ ہائی اسکول۔ تسلیم شدہ ادارہ کا جنرل نرسنگ میں اے گریڈ ڈپلوما اور اس کے ساتھ کسی ہسپتال میں تین سالہ تجربہ، کسی ایک ریاست (اسٹیٹ) میں رجسٹریشن۔

پسندیدہ :۔

مردانہ اسٹاف نرس کو ترجیح دی جائے گی۔

نوٹ :۔ بغیر آرائشی اسباب کے رہائش گاہ مفت دی جائے گی۔ اور رہائش گاہ کے ساتھ پانی اور ۲۰ یونٹ بجلی مفت دی جائے گی۔ رہائش گاہ کے بجائے ہاؤس الاؤنس ضوابط کے مطابق دیا جائے گا۔ جس میں واشنگ اور بورڈنگ الاؤنسیز شامل ہوں گے۔

۱۱۔ سیمی پروفیشنل، یونیورسٹی پالی ٹیکنیک لائبریری (مستقل)

شرح تنخواہ :۔ ۳۸۰ ۔ ۱۲ ۔ ۵۰۰ ۔ ای بی ۔ ۱۵ ۔ ۵۶۰ ۔ ای بی ۔ ۲۰ ۔ ۶۴۰ روپیہ معہ دیگر الاؤنسیز۔

استعداد :۔

(۱) لازمی :۔ بی اے / بی ایس سی / بی کام / بی ایس ایس کا ۔ یالائبریری سائنس میں ایک سال کا پوسٹ گریجویٹ ڈپلوما (متواتر فرسٹ یا سیکنڈ کلاس تمام امتحانات میں۔)

(۲) پسندیدہ :۔

۱۔ انگریزی / اردو ٹائپ رائٹنگ کے ذریعہ کیٹلاگ تیار کرنے کی صلاحیت۔

۲۔ کسی انجینئرنگ کالج لائبریری میں کام کرنے کا کچھ تجربہ۔

۱۲۔ جونیئر گلاس بلوور، ڈیپارٹمنٹ آف کیمسٹری (مستقل)

شرح تنخواہ : ۴۲۵ ۔ ۱۵ ۔ ۵۶۰ ۔ ای بی ۔ ۲۰ ۔ ۶۴۰ روپیہ معہ دیگر الاؤنسیز

استعداد :۔

۱۔ لازمی :۔ امیدوار کو گلاس بلوئنگ ٹیکنیکس (شیشہ گری کے طریق کار) سے کما حقہ واقف ہونا چاہیئے۔

۲- پسندیدہ :- گلاس بلوانگ (شیشہ گری) کا چار سالہ تجربہ

۱۳- سینیئر لیبارٹری اسسٹنٹ، ڈیپارٹمنٹ آف مائیکرو بائیلوجی (عارضی)

شرح تنخواہ :- ۳۵۰ - ۱۲ - ۵۰۰ - ای بی - ۱۵ - ۵۶۰ - روپیہ معہ دیگر الاؤنسیز

استعداد :- ہائر سکنڈری یا اس کے مساوی سائنس کے مضمون میں تحصیل لیاقت کی سند اور سابقہ تجربہ۔

۱۴- سینیئر لیبارٹری اسسٹنٹ، ڈیپارٹمنٹ آف فارمکولوجی (عارضی لیکن مستقل ہونے کا امکان)

شرح تنخواہ :- ۲۸۰ - ۱۲ - ۵۰۰ - ای بی - ۱۵ - ۵۶۰ روپیہ معہ دیگر الاؤنسیز

استعداد :- ہائر سکنڈری یا اس کے مساوی سائنس کے مضمون میں سند سابقہ تجربہ کے ساتھ۔

۱۵- سینیئر لیبارٹری اسسٹنٹ (ڈریسرس) (دو اسامیاں) ڈیپارٹمنٹ آف آپتھلمولوجی (عارضی لیکن مستقل ہونے کا امکان)

شرح تنخواہ :- ۲۸۰ - ۱۲ - ۵۰۰ - ای بی - ۱۵ - ۵۶۰ روپیہ معہ دیگر الاؤنسیز

استعداد :-

(۱) لازمی :- سائنس مضامین کے ساتھ ہائر سکنڈری۔ ہسپتال کے وارڈس / آپریشن تھیٹر میں کام کرنے کا تجربہ۔ مانع عمل آلات کی معلومات اور مریض کی دیکھ بھال کا تجربہ۔

(۲) پسندیدہ :- کسی بھی تسلیم شدہ ہسپتال میں نرسنگ اسسٹنٹ (مردانہ) کی حیثیت سے تجربہ

ملازمت کے لیے شرطیں اور کیفیات : وارڈ / آپریشن تھیٹر میں اپنے فرائض کو انجام دینا ہوگا۔ آنکھوں کے ریلیف کیمپس میں گاؤں میں رہ کر کام کرنا ہوگا۔ اور ہر وہ خدمت انجام دینا ہوگی جس کے لیے آپریشن تھیٹر انچارج ور ڈائرکٹر انسٹی ٹیوٹ آف آپتھلمولوجی حکم دے۔

۱۶- لائف سیونگ گارڈ، سوئمنگ پول، یونی ورسٹی گیمس کمیٹی (مستقل)

شرح تنخواہ :- ۲۳۰ - ۱۰ - ۲۸۰ - ای بی - ۱۲ - ۵۰۰ - ای بی - ۱۵ - ۵۶۰ روپیہ معہ دیگر الاؤنسیز

استعداد :-

(الف) لازمی :-

ا- پری یونیورسٹی کلاس پاس کے مساوی سند

ب- کسی تسلیم شدہ باڈی یا لائف سیونگ سوسائٹی سے لائف سیونگ کا سرٹیفکٹ۔

III - دفتر و سٹی مراسٹیٹ سطح کا پیراک -

۲ - پسندیدہ :- لائف سیونگ گارڈ کی حیثیت سے ایک سال تجربہ

۱۷ - جونیئر لیبارٹری اسسٹنٹ (تین اسامیاں) ڈیپارٹمنٹ آف کیمسٹری (مستقل)

شرح تنخواہ :- ۲۶۰ - ۵ - ۳۰۰ - ای بی - ۸ - ۳۴۰ - ۱۰ - ۳۸۰ - ای بی - ۱۰ - ۴۴۰ روپیہ معہ دیگر الاؤنسیز

استعداد :-

سائنسی مضامین کے ساتھ میٹرکولیشن

۱۸ :- کلرک گریڈ II ، ڈینٹس کالج (مستقل)

شرح تنخواہ :- ۲۶۰ - ۶ - ۲۹۰ - ای بی - ۶ - ۳۲۶ - ۸ - ۳۶۶ - ۸ - ۳۹۰ - ۱۰ - ۴۰۰ روپیہ معہ دیگر الاؤنسیز

استعداد :- ہائر سکنڈری یا پری یونیورسٹی کلاس -

نوٹ :- خاتون امیدوار کو ترجیح دی جائے گی -

۱۹ :- کلرک گریڈ II / ٹائپسٹ ، سینٹر آف کانٹی نیوئنگ ایڈلٹ ایجوکیشن (عارضی)

شرح تنخواہ : ۲۶۰ - ۶ - ۲۹۰ - ای بی - ۶ - ۳۲۶ - ۸ - ۳۶۶ - ای بی - ۸ - ۳۹۰ - ۱۰ - ۴۰۰ روپیہ معہ دیگر الاؤنسیز

استعداد :-

۱ - ہائر سکنڈری یا پری یونیورسٹی

۲ - ٹائپنگ کی بہتر رفتار اور دفتر کے طریق کار کی معلومات -

۲۰ - بوائلر اٹینڈنٹ سجے این میڈیکل کالج ہسپتال (مستقل)

شرح تنخواہ :- ۲۶۰ - ۶ - ۲۹۰ - ای بی - ۶ - ۳۲۶ - ۸ - ۳۶۶ - ای بی - ۸ - ۳۹۰ - ۱۰ - ۴۰۰ روپیہ معہ دیگر الاؤنسیز

استعداد : جنرل میکینک کا آئی ٹی آئی سرٹیفکیٹ یا بوائلر یونٹ میں کام کرنے کا پانچ سالہ تجربہ -
غیر معمولی استعداد اور تجربے کے حامل امیدواروں کو ابتدا ہی سے اعلیٰ تنخواہ دی جا سکتی ہے - جن امیدواروں کو انٹرویو کے لیے بلایا جائے گا انھیں بطور ٹی اے ریل کے سکنڈ کلاس کا ایک طرفہ

کرایہ اداکیا جائے گا۔

درخواست دینے کے لیے مجوزہ فارم اور دیگر ہدایات اسسٹنٹ رجسٹرار (سلکشن کمیٹی) سے ذاتی طور پر یا ذاتی پتہ لکھ کر ۱۰×۲۳ سینٹی میٹر کا لفافہ اور نقد ۲ روپیہ کی رسید (جو مسلم یونیورسٹی کے فائنانس آفس میں جمع شدہ ہو) یا انڈین پوسٹل آرڈر (جو فائنانس آفیسر مسلم یونیورسٹی علی گڑھ کے نام واجب الادا ہو) کے ہمراہ حاصل کی جاسکتی ہیں۔

درخواستیں موصول ہونے کی آخری تاریخ ۲۱ر فروری ۱۹۸۲ء ہے۔
تاخیر سے وصول ہونے والی یا نامکمل درخواستیں مسترد کردی جائیں گی۔

ضمیر احمد خاں
رجسٹرار

جلد نمبر ۲ ۱۶ر فروری ۱۹۸۳ء شمارہ نمبر ۴

"جس قوم میں باپ دادا کے افتخار نسیاً منسیاً ہوجاتے
ہیں یا بطور دیو پری کی کہانیوں کے باقی رہ جاتے ہیں اس
قوم سے ترقی کی امید باقی نہیں رہتی۔ الحمدللہ ہماری
قوم کی حالت ابھی ایسی نہیں ہوئی۔ سسکتی ہے، پر
کچھ جان باقی ہے۔ اگر خدا مدد کرے تو شاید صحت پاجاوے"

(سر) سیّد احمد

فی پرچہ ایک روپیہ   ششماہی ۱۱ روپے   سالانہ ۲۰ روپے

بیرون ہند سے

فی پرچہ ایک ڈالر   سالانہ ۱۵ ڈالر

ترسیل زر و خط و کتابت کا پتا

قاضی معز الدین احمد

معز منزل۔ تار بنگلہ۔ اے ایم یو۔ علی گڑھ یوپی

پندرہ روزہ تہذیب الاخلاق علی گڑھ

مدیر: سید حامد وائس چانسلر علی گڑھ مسلم یونیورسٹی

مدیر مسئول: قاضی معز الدین احمد

جلد نمبر ۲ ۱۶ فروری ۱۹۸۳ء شمارہ نمبر ۴

خودسوزی

اخباروں میں آئے دن خبریں آتی رہتی ہیں
کہ فلاں عورت باورچی خانہ میں جل کر مرگئی۔ ان میں سے بعض
موتیں دراصل لاپرواہی کی وجہ سے ہوتی ہیں۔ آگ قریب
ہو تو اتنی ہی احتیاط برتنی چاہیے جتنی اس وقت جب انسان
بُرے لوگوں کی سنگت میں ہو۔ آگ لگنے اور بُرائی پکڑنے
میں دیر نہیں لگتی۔ اسی وجہ سے ہمیشہ اصرار کیا جاتا ہے کہ
عورتوں کو رسوئی میں نائلون کی ساری پہن کر نہ جانا چاہیے
اور انسانوں کو بُرے لوگوں کی صحبت سے پرہیز کرنا چاہیے

ایسی موتوں کے متعلق لوگ قیاس آرائی
کرتے ہیں۔ کبھی کہا جاتا ہے کہ شوہر اور ساس یا نند نے اس
غریب کو اس لیے جلا دیا کہ اس کے ماں باپ جہیز کی مانگ کو
پورا نہ کر سکے تھے۔ بسا اوقات یہ بات صحیح ثابت ہوتی ہے
سوچیے اس سے زیادہ شرمناک، اس سے زیادہ بے غیرتی
کی بات کیا ہو سکتی ہے کہ انسان زندگی کی ساتھی کو اس بنیاد
پر پھونک دے کہ وہ کتنی دولت لے کر آئی ہے۔ دولت کے یہ پجاری
اگر پہلی فرصت میں بیوی سے پیشہ کرانے لگیں تو حیرت نہ ہونی
چاہیے بلکہ پیشہ کرانا جہیز مانگنے سے کم بُرا ہے۔ یہ دونوں
کام لالچ کی بنا پر کیے جاتے ہیں، لیکن جہیز مانگنے والے ایک
پاکیزہ رشتہ کو شروع ہی سے ناپاک کر دیتے ہیں اور نہ
صرف بیوی بلکہ اس کے خاندان پر بھی بے غیرتی اور بے رحمی
سے وار کرتے ہیں۔ پیشہ کرانے والا شادی کے بعد بھٹکتا
ہے۔ اس کے علاوہ جہیز مانگنے والے کو اکثر احساس بھی
نہیں ہوتا کہ وہ ایک بہت بڑا گناہ، ایک سنگین جرم کر رہا
ہے اور پیشہ کرانے والا باوجود بے غیرتی کے سر چھپاتا پھرتا
ہے۔ وہ اپنے جرم کو محسوس کرتا ہے۔ جس گناہ کا احساس
ہو اُس سے توبہ کی جا سکتی ہے، اس کا کفارہ ادا کر سکتے
ہیں، جہاں گناہ کا احساس ہی نہ ہو وہاں توبہ، کفارہ،
پشیمانی اور اصلاح کا ذکر بے سود ہے۔

یہ لالچی شوہر کیا کبھی یہ نہیں سوچتے کہ ان
کی اولاد اپنے ماں باپ کو کتنی حقارت سے دیکھے گی جب اسے
معلوم ہوگا کہ ان کی ماں اس لائق نہیں تھی کہ مال و دولت
کے بغیر کوئی اسے قبول کرتا اور ان کا باپ کتنا بے غیرت اور
لالچی تھا کہ اس نے شادی کو دولت حاصل کرنے کا ذریعہ

بنایا تھا اس پاکیزہ رشتہ کو جو سود و زیاں کے تصور سے
بالاتر ہے اس نے پیسہ بٹورنے کے لیے استعمال کیا تھا۔
ایسی ماں اور ایسے باپ کی کیا عزت اولاد کے دلوں میں
رہ جائے گی۔ اس گھناؤنی رسم کے حق میں آپ یہ نہیں کہہ
سکتے کہ یہ عام ہے اور کسی کا دھیان اس کی بنیادی بدطینتی
اور کراہت کی طرف نہیں جاتا۔ کسی بُری رسم کے عام ہونے
کی بات کرنے والے کیا یہ نہیں سوچیں گے کہ گمراہ عورتوں
کے لیے جسے پیشہ کہا جاتا ہے اس کی روایت اور زیادہ عام
ہے، ساری دنیا میں پھیلی ہوئی ہے۔ اسے تو انسانوں کے
سب سے برے پیشہ کا نام دیا جاتا ہے۔ پیشہ کی برائی اس
بنا پر کم نہیں ہو جاتی کہ وہ عام ہے یا قدیم ہے۔ میں کہہ
رہا تھا کہ جہیز مانگنا اس سے بھی زیادہ بُرا ہے کہ اس
کا پھیلاؤ زیادہ ہے، زیادہ لوگ اس کی زد میں آتے ہیں
لڑکی کے گھر والوں پر اس کا تباہ کن اثر تو پڑتا ہی ہے بے غیرتی
اور لالچ کے اس کاروبار میں لڑکے کے گھر والے بھی شریک
ہوتے ہیں بلکہ اکثر یہ شرمناک حرکت ان ہی کے اصرار پر
سرزد ہوتی ہے۔

آپ اعتراض کریں گے تو لڑکے کے
بے غیرت والد کہیں گے کہ ہمیں جو اپنی لڑکی کو جہیز دینا پڑا
تھا اس نقصان کو پورا کیسے کریں۔ وہ نہیں جانتے کہ وہ
نقصان کو پورا نہیں کر رہے ہیں بلکہ اس کے سلسلہ کو
طول دے رہے ہیں۔ بُری بات کو جتنے زیادہ لوگ دہرائیں
وہ اتنی ہی زیادہ بُری ہو جاتی ہے۔ مرض کو وبا کی شکل
دینے والے یہ نہیں کہہ سکتے کہ مرض عام ہو گیا اس لیے اسے
مرض کہنا ہی نہ چاہیے۔ یہ روگ سماج کو کھوکھلا کر دیتا ہے
جس معاشرہ میں گھر کی بنیاد لالچ پر رکھی جائے اور جہاں
نسل کی افزائش کا ناتہ سیم و زر کے ساتھ جوڑا جائے اس کی
اٹھان صحت مند کیوں کر ہو سکتی ہے۔

لیکن یہ مان لینا صحیح نہ ہوگا کہ گھروں میں جلنے سے جو موتیں
ہوتی ہیں وہ یا تو لاپرواہی کی بنا پر یا سسرال والوں کے ہاتھوں
سرزد ہوتی ہیں۔ ان سے بھی زیادہ دردناک وہ موتیں ہیں جب
دُلہن اس فکر میں کہ اس کے ماں باپ اس کی سسرال کے مطالبات
کو ماننے کی حیثیت میں نہیں ہیں، خود کو جلا کر خاکستر کر دیتی ہے
چاہے سسرال والے اس کو جلائیں یا وہ خود کو جلا ڈالے، قاتل
ایک ہی ہیں۔

خود سوزی کی یہ ایک مثال تھی۔ عبرت کا مقام ہے کہ
والدین نے جس لڑکی کی شادی اتنی آرزوؤں اور امنگوں کے
ساتھ کی، خود لڑکی کتنی تمناؤں اور ولولوں کے ساتھ دُلہن
بن کر اپنے رفیقِ حیات، اپنے سوامی کے گھر گئی اسے چاندنی کی
چار راتیں بھی نہیں ملیں، لالچ اور ظلم کے گھور اندھیرے نے اس کو
ہر طرف سے گھیر لیا۔ اسے روشنی کی صرف ایک راہ نظر آئی۔ پتنگے
کی طرح خود کو جلا ڈالے۔ پروانہ خود کو شمع کی محبت میں جلاتا
ہے۔ اس غریب نے خود کو محبت میں نہیں محبت کی چتا میں جلا ڈالا۔

راقم نے اپنے مضامین اب تک ان بیماریوں کا ذکر کیا تھا جو
ہندوستانی مسلمانوں سے تعلق رکھتی ہیں۔ اس بار قلم بھٹک کر ایک
ایسے زخم کو کریدنے لگا جو ہمارے ہندو بھائیوں کے لیے ناسور
بن گیا ہے۔ مضمون شروع کرتے وقت ارادہ یہ نہ تھا
جیسا کہ اس مضمون کی دوسری قسط سے ظاہر ہوگا لیکن ہندوستانی
ہونے کی حیثیت سے اسے حق ہے کہ کبھی کبھی وہ ان مسائل
کی طرف بھی دھیان دے جو مسلمانوں تک محدود نہیں ہیں۔ شرط
صرف ایک ہے ہمدردی اور اصلاح کی خواہش۔ جہیز مانگنے کی رسم سے
ہندوستانی مسلمان ابھی تک بچے ہوئے ہیں۔

(باقی آئندہ)

سید حامد

متین الزماں زبیری
جواہرلال نہرو یونیورسٹی
نئی دہلی۔

تلخیص و ترجمہ
شہناز ہاشمی
گرلز کالج۔ اے ایم یو۔ علی گڑھ

ترک اسلحہ اور ترقی

آج کی دنیا ایسی گہری اور دور رس تبدیلیوں سے گزر رہی ہے جس کی مثال قرونِ وسطیٰ کے نظام کی تباہی اور بربادی کے بعد سے کسی دور میں نہیں ملتی۔ تقریباً تین صدیوں سے دنیا ترقی سے فائدہ اٹھانے والوں اور اس کا شکار ہونے والوں میں تقسیم ہوتی جارہی ہے۔ شکار ہونے والے ممالک اب ترقی کے فوائد میں اپنا حصّہ پانے کی جدوجہد کر رہے ہیں۔ برّاعظموں، قوموں اور طبقوں کے مابین اس بدلتے ہوئے توازن میں اور اتنے وسیع پیمانے پر تبدیلیوں کے باعث اضطراب وابتری کے عناصر ناگزیر ہیں۔ یہ دنیا دن بدن بڑھتی ہوئی شکایتوں کی دنیا ہے۔

ہمیں احساس ہوتا جارہا ہے کہ کون سی طاقتیں ہمیں گرفت میں لینے کی دھمکی دے رہی ہیں۔ ماحول، بڑھتی ہوئی آبادی، غذا کی فراہمی، سمندر کا مصرف، انسانی بستیاں، تجارت و ترقی، سائنس اور صنعت کے فرائض اور تباہ کن ہتھیاروں کی بڑھتی ہوئی لعنت جیسے آفاقی مسائل کا حل سوچنے کے لیے بیس سے زیادہ کانفرنسیں اور اقوام متحدہ کے خصوصی اجلاس ہو چکے ہیں۔ ان ساری کاوشوں کا مقصد یہ ہے کہ انسانی بقا و بہتری کے امکانات کی تلاش جاری ہے کوئی صورت ایسی نظر نہیں آتی جو انسان کی مشترکہ قسمت کے لیے مفید ثابت ہو۔ سوائے اس کے کہ بڑے پیمانہ پر ترک اسلحہ کی کوشش کی جائے۔ تخریبی صلاحیتوں میں اضافہ نے انسانی وجود کو خطرے میں ڈال دیا ہے۔ انسانی اور مادّی ذرائع پر بوجھ بن گیا ہے۔ اس طرح خطرات کا ایک سوچا سمجھا نظام نہ صرف انسانی وجود کے لیے باعثِ مرگ ہے بلکہ تاریخ کے طریق کار کو بھی منجمد کر دیتا ہے۔ وہ عناصر جو خود تاریخ کے موضوعات رہ چکے ہیں اپنی قسمت بنانے کے راستے میں رکاوٹیں دیکھ رہے ہیں۔ اس سیّارے کے تمام انسان مہلک اور تباہ کن ہتھیاروں کے سائے میں زندگی گزار رہے ہیں۔ لاکھوں ہیروشیماؤں کی لرزہ خیز طاقت فوری استعمال کے لیے جمع کر لی گئی ہے۔ صرف ایک فوجی آب دوز جہاز تیس لاکھ انسانوں کی جان لے سکتا ہے۔ اس دیوانی دنیا کی بھیانک حقیقتوں کا خلاصہ صدر کارٹر نے ان الفاظ میں کیا ہے:

"ایٹمی جنگ کی ایک طویل دوپہر کے صرف ایک لمحے میں اتنی زبردست تباہی آسکتی ہے کہ دوسری جنگِ عظیم کے دوران نہ آئی ہوگی یعنی ہر لمحہ ایک جنگِ عظیم ہے۔ چند گھنٹوں میں اتنے لوگ مارے جائیں گے جتنے تاریخ کی ساری لڑائیوں میں ملاکر۔ باقی ماندہ۔ اگر کوئی باقی بچ گیا۔ ایک خودکش تہذیب کے کھنڈر پہ

ویرانوں میں دکھ جھیلتے رہیں گے۔"

آج دنیا جنگی مقاصد کے لیے سالانہ ذرائع کا اتنا حصہ استعمال کرتی ہے جو اوائل صدی کی مجموعی پیداوار سے بھی زیادہ ہے۔ جنگی معاشیات پر پانچ سو ارب ڈالر کا صرف ہے جو تمام ترقی پذیر ممالک کے مجموعی اخراجات کے برابر ہے۔ دنیا کے تقریباً ایک تہائی انسانی اور مادی وسائل جنگی مقاصد کی نذر ہو جاتے ہیں۔ فوجی تحقیقی کام نے کئی ملکوں میں شہری مسائل پر تحقیقات کی جگہ چھین لی ہے۔ تقریباً پانچ لاکھ سائنس داں جنگ سے متعلق تحقیقی کاموں میں لگے ہوئے ہیں جس سے شہری معاشیات بُری طرح متاثر ہوئی ہے عام فوجی پیداوار کے کام پر عام شہری پیداوار کے کام سے بیس گنا زیادہ طاقت اور مہارت خرچ ہوتی ہے۔ جنگی معاشیات نہایت قیمتی مادی ذرائع ہڑپ کر جاتی ہے امریکہ اور سوویت یونین چند اور ممالک جیسے برطانیہ، چین، فرانس اور مغربی جرمنی کے ساتھ مل کر پوری دنیا کے فوجی مصارف کا دو تہائی خرچ کرتے ہیں۔ آٹھ ممالک۔ امریکہ برطانیہ، فرانس، سوویت یونین، مغربی جرمنی، چیکوسلواکیہ اٹلی اور پولینڈ۔ اسلحہ کی تجارت کا نوے فیصدی سے زیادہ حصہ فراہم کرتے ہیں۔

ترقی پذیر ممالک میں اسلحہ کی درآمد بڑھنے لگی ہے۔ یہ فوجی طاقت کی ترقی کی نشانی ہے۔ ترقی پذیر ممالک ایک عرصے سے بنتے رہے ہیں اس لیے قدرتی طور پر وہ باہر سے وہ اپنے دفاع کو مضبوط بناتے ہیں تاوقتیکہ وہ خود کفیل نہ ہو جائیں۔ مثلاً ایران، سعودی عرب، شام اور عراق نے ترقی پذیر ممالک کے درآمدی ہتھیاروں کا ایک تہائی سے زیادہ حصہ حاصل کیا۔

یہ جغرافیائی ارتکاز پیٹرو ڈالروں کے دائرہ پر بھی روشنی ڈالتا ہے۔ ایک زمانہ میں شاہ ایران اس وسیع پیمانے پر اسلحہ کی خریداری کر رہے تھے کہ امریکہ کے فوجی سربراہ پریشان ہو گئے کہ کہیں امریکہ کی فوجی ضروریات مجروح نہ ہو جائیں۔

ترقی پذیر ممالک میں اسلحہ کی تجارت کا تعلق اسلحہ کی مرکزی دوڑ سے ہے جیسے بہتر سے بہتر اسلحہ ترقی یافتہ ملکوں کے اسلحہ خانوں میں داخل ہوتے جاتے ہیں وہ پرانے اسلحہ کے خریدار تلاش کرتے ہیں۔ ان کی فوجی صنعت کا توازن اور ادائیگی کا تناسب قائم رکھنے کے لیے یہ فروخت ضروری ہے۔ بعض ممالک انتہائی تامل کے ساتھ مگر اپنے اسلحہ بند پڑوسیوں کے خوف سے اسلحہ خریدتے ہیں جس سے ان پر بھاری بوجھ پڑتا ہے اور ان کی ترقی کی راہ میں رکاوٹیں حائل ہوتی ہیں۔

امیر ترین اور مضبوط ترین ملک کی حیثیت سے امریکہ نے اسلحہ کی دوڑ کی ایک خاص رفتار مقرر کر دی ہے امریکہ میں فوجی صنعت نے سماجی ڈھانچے کو بُری طرح مجروح کر رکھا ہے۔ انسانی اور مادی وسائل کے ایسے بے پناہ ذخیرے جنگی تیاریوں میں لگے ہوئے ہیں کہ ملک کا نقشہ ہی بدل گیا ہے۔

خانگی طور پر فوجی بجٹ میں تخفیف کی مخالفت وہ لوگ یقیناً کرتے ہیں جن کی اپنی غرض جنگ پر قائم ہے۔ صدر کارٹر کے دورانِ حکومت امریکی کانگریس نے امریکی اسلحہ خانہ میں new bomber B1 کا اضافہ نہ کرنے کا فیصلہ کیا تو کتنے ہی ایسے لوگ ٹیلی ویژن پر بات چیت کرتے دکھائے گئے جن کی ملازمتیں خطرے میں پڑ گئی تھیں۔ عام مزدور جو کبھی فوجی پالیسی کے مشوروں میں شامل نہیں کیا گیا تھا، سنجیدگی سے اس بات پر اصرار کر رہا تھا کہ

یہ فیصلہ امریکہ کو سوویت یونین کے مقابلہ میں کمزور
کردے گا۔

امریکہ کا فوجی بجٹ دنیا کے بیشتر ممالک کی مجموعی
قومی ترقی سے زیادہ ہے۔ صدر آئزن ہاور نے امریکن
شہریوں کو دس صنعتی پہلو کے خطرات سے آگاہ کیا تھا اور
ان مضر اثرات کی طرف توجہ دلائی تھی جو امریکن شہری کی معاشی
سیاسی، روحانی زندگی پر پڑ سکتے تھے اور اس خطرے سے
بھی آگاہ کیا تھا کہ ایک وقت ایسا آسکتا ہے جب امریکن
سیاست، صنعت و حرفت کے ایک منتخب طبقے کی قیدی بن
جائے گی۔ جنرل خوب جانتے تھے کہ وہ کیا کہہ رہے ہیں۔ اس
پہلو میں حکومت، مزدور جماعتوں ذرائع ابلاغ اور دانشوروں
کے طبقے شامل تھے۔ اس صورتِ حال نے اسلحہ کی تہذیب
کو جنم دیا ہے اور ۱۹۶۱ء سے جب جنرل آئزن ہاور نے یہ
آگاہی دی تھی اس کے پنجے بہت پھیل چکے ہیں۔

تباہی کے ان وسائل نے سیاسی مسائل کو جو
گفت وشنید سے طے ہو سکتے ہیں فوجی طاقت کے حساب
کتاب اور دھمکیوں میں تبدیل کر دیا ہے۔ ترقی پذیر ممالک
کے انقلابات کا ذمہ دار خانگی مسائل کو نہیں بلکہ بیرونی
سازشوں کو ٹھہرایا جاتا ہے۔ ترقی پذیر ممالک کو ایک
"عالمی شہر کی بیہودی بستیاں" کہا جا سکتا ہے۔ غریب
ممالک کی مٹی میں پوشیدہ کچھ قیمتی دھاتوں کی موجودگی نے
امیر ممالک کی نظروں میں ان کو اہم بنا دیا ہے۔ پٹرو ڈالروں
کی گردش اس مسئلہ کو حل کر سکتی ہے۔

ایک گمراہ کن خیال اپنے مفاد کے لیے
لوگوں نے پھیلایا ہے کہ ایٹمی اسلحہ گراں اور روایتی اسلحہ
مقابلۃً ارزاں ہوتے ہیں۔ نام نہاد روایتی اسلحہ پر بجٹ
کا خاصہ بڑا حصہ خرچ ہوتا ہے۔ آج بھی امریکہ کے فوجی
اخراجات کا دو تہائی سے زیادہ حصہ روایتی اسلحہ پر
خرچ ہوتا ہے۔

فوجی لحاظ سے کمزور ممالک کی ترقی بڑا مشکل کام
ہے۔ ان کے تیزی سے آگے بڑھتے ہوئے سماجوں کو ہر
وقت فوجی اور غیر فوجی خطرات رہتے ہیں۔ ان کی ترقی کا
انحصار دوسروں پر ہے۔ اندرونی افراتفری کا رشتہ
بیرونی عدم تحفظ سے جڑا ہوا ہے۔ ان حالات سے بے چینی
پیدا ہوتی ہے جس کو بیرونی امداد ملتی ہے اور ملک میں
اضطراب پھیل جاتا ہے جو خود اپنی جگہ ایک پیچیدہ مسئلہ
ہے۔

غریب ممالک مسلسل صنعتی ترقی یافتہ ممالک کی
سرزنش کا شکار رہتے ہیں۔ دولت مندوں کی طاقت
ان کو عقلِ کل بننے کا حق دیتی ہے۔ یہ وہی تھے جو ترقی کے
راستے پر پہلے روانہ ہوئے اور باقی دنیا کو اپنے پیچھے
چلنے والا ہی سمجھتے ہیں۔ کے ایم پانیکر کی اس بات میں
کچھ سچائی ضرور تھی۔

"یورپین ملکوں نے ایک عجیب منطق کے ذریعے
جو انھوں نے ایشیائی ممالک سے اپنے رشتے میں برقرار رکھی
اپنے آپ کو یہ سمجھا لیا ہے کہ بہیمانہ اور غیر انسانی حرکات
سے ایشیائی ملکوں کی نظروں میں ان کی عزت میں اضافہ
ہوگا۔"

ترقی یافتہ ممالک ہر طرح کے الزام سے بری ہو کر
ترقی پذیر ممالک میں فوجی دخل اندازی جاری رکھ سکتے ہیں
لیکن وہ اب فوجی مداخلت کے مقابلوں کے دور میں ہیں
افغانستان میں روس کی مداخلت طاقت ور اور کمزور
قوموں کے رشتوں کے اس نئے دور کی طرف اشارہ
ہے۔ یہیں بتایا جاتا ہے کہ بین الاقوامی نظم و ضبط کے لیے

اسلحے سے لیس جہازات سے ہی ضروری ہیں جتنی شہری نظم و ضبط
کے لیے پولیس کی گاڑیاں۔ اور چھوٹی قومیں دوسروں کی
خاص کر بڑی طاقتوں کی عزت کرنا نہیں سیکھ سکتیں جب
تک ان کو اس کی بڑی قیمت نہ ادا کرنا پڑے۔

دنیاوی کشاکش کو دیکھتے ہوئے اسلحہ
کی دوڑ پر پابندی کی امید رکھنا ایک خواب سا معلوم ہوتا
ہے۔ اگر یہ خواب شرمندۂ تعبیر ہونا ہے تو ترک اسلحہ کا رشتہ
ترقی سے جوڑنے کے لیے خاص حکمتِ عملی اختیار کرنا پڑے
گی۔ دنیا کے فوجی اخراجات کا بیشتر حصہ ترقی یافتہ ممالک
میں صرف ہوتا ہے۔ اس لیے یہ تجویز بے جا نہ ہوگی کہ ترکِ
اسلحہ وہیں سے شروع ہونا چاہیے۔ چونکہ ترقی یافتہ ممالک
میں گرانی بڑھتے ہوئے فوجی اخراجات کے باعث ہے اور
یہ گرانی تجارت کے ذریعہ باقی دنیا میں درآمد کی جاتی ہے
اس لیے ترک اسلحہ کا فائدہ ترقی یافتہ اور ترقی پذیر دونوں
طرح کے ممالک کو ہوگا۔

مزید یہ کہ اسلحہ کی دوڑ میں سہل رفتاری
سے تناؤ کی کیفیت کم ہو کر ایک ایسا ماحول بن جائے گا
جس میں ترقی پذیر ممالک اپنے کو نسبتاً محفوظ سمجھیں گے اور
اس طرح دولت کا استعمال پرامن مقاصد کے لیے ہوسکے گا

طاقت ور قوموں سے ترک اسلحہ کی
اپیل اخلاقی اور احتیاطی بنیادوں پر بھی کی جاسکتی ہے
اخلاقی اپیل کا اثر افراد پر ہوسکتا ہے مگر طاقت ور ممالک
شاید اخلاقی بلیک میل سمجھیں۔ کہا جاتا ہے کہ دریا دلی
سے غریبوں کو خیرات دینا کارِ خیر ہے مگر جب غریب اپنے
محسنوں کو درس دینے لگیں تب امیروں کو غریبوں سے
نفرت ہو جانے کا پورا حق ہے۔

مصلحت یا احتیاط کی بنا پر اپیل کے
دو طریقے ہوسکتے ہیں۔ ایک یہ دلیل دی جاسکتی ہے کہ
غریب ترقی کریں تب ہی امیر پھل پھول سکتے ہیں اور یہ
دلیل اخلاقی دلیل کی بہ نسبت زیادہ پراثر ہوسکتی ہے۔ مگر
اس کی کوتاہیاں بھی ہیں مثلاً یہ بھی کہا جاتا ہے کہ مغرب
کی بقاء ترقی اور بنی نوعِ انسان کی فلاح کے لیے ضروری ہے
کہ غریب ممالک غریب ہی رہیں۔ جتنی سہل رفتاری سے
وہ ترقی کریں گے اتنی ہی تیزی سے دولت مندوں کو ترقی
کے وسائل حاصل ہوں گے۔

اس کا بھی امکان ہوسکتا ہے کہ غریب
ممالک اپنے مصائب سے تنگ آکر جنگ پر آمادہ ہو جائیں
مصلحت کا تقاضہ ہے کہ اس امکان سے گریز کیا جائے
مگر حال ہی میں ہنری کسنجر نے کہا ہے:۔

"سچ تو یہ ہے کہ دولت مند ممالک جنگ
شروع کرتے ہیں۔ ایک بھی ایسی جنگ
دکھا دیجیے جو کسی غریب ملک نے اس لیے
شروع کی ہو کہ وہ غریب ہے"

ایک برطانوی عالم نے اس سے زیادہ واضح
الفاظ میں کہا ہے "

"تہذیب کی تباہی کے لیے مسز گاندھی
جنگ نہیں کرسکتیں خواہ جنرل ضیاء جیسے
فوجی ان کے دائیں بائیں کیوں نہ کھڑے ہوں"

لہٰذا محض اخلاقی خطرے کے لیے اس طرف دیکھنا اپنے
آپ کو دھوکہ دینا ہے۔

دولت مند ممالک اپنی معاشی اور سیاسی برتری
برقرار رکھنے کے لیے فوجی طاقت کو لازمی سمجھتے ہیں۔ ان کا
نظریہ یہ ہے کہ طاقت ور جو چاہیں طلب کریں اور کمزور
وہ سب پیش کریں جو انھیں کرنا چاہیے۔ طاقت اور

ق لازم و ملزوم ہیں۔ دوسری طرف غریب ممالک کی زبوں
، کچھ اپنی کم ایکی اور کمزوری کی وجہ سے ہے۔ جب کبھی غربت
، بے انصافی سے مجبور ہو کر بے چینی کا اظہار ہوتا ہے، امیر
ا چھوٹی چھوٹی رعایتیں دے کر اسے قابو میں کر لیتے ہیں۔

حال ہی میں اقوام متحدہ کے چند ماہرین نے ترک اسلحہ اور ترقی
مان ایک رپورٹ تیار کی ہے۔ رپورٹ نے اسلحہ کی دوڑ کے
نتائج کا تجزیہ کر کے بتایا ہے کہ امیر و غریب دونوں طرح کے
ک کے لیے ترک اسلحہ ضروری ہے۔ ۱۹۶۰ء کے آس پاس
س، ناروے اور پولینڈ میں عوام سے پوچھا گیا کہ ترک
لحہ سے بچایا ہوا پیسہ کس مصرف میں لایا جائے۔ جواب
ب ممالک کے لیے بے سود تھا۔ تینوں ممالک نے خود اپنی
، پر زور دیا تھا۔ زندگی کا معیار بڑھانے اور ٹیکس کم
نے کی تجاویز پیش کی گئی تھیں۔ غریب ممالک کو صنعتی امداد
نے کے حق میں فرانس میں ۷۰ فیصد، ناروے میں ۱۴ فیصد
پولینڈ میں ۱۲ فیصد لوگ تھے۔ اگر اس بارے میں اب
رائے عامہ دریافت کی جائے تو ترک اسلحہ سے بچائے ہوئے
، میں غریب ممالک کو حصہ دار بنانے پر راضی ہونے
ے اور بھی کم لوگ ہوں گے۔

صنعتی ممالک میں بڑے پیمانہ پر
لحہ کی دوڑ کے خلاف عوامی تحریکیں شروع ہو گئی
۔ گرانی اور بے روزگاری نے اسلحہ پر پیسہ صرف
نے کے مضر اثرات کا احساس دلایا ہے۔ امریکہ میں
جی بہبود کے اخراجات میں تخفیف اور قومی اخراجات
اضافہ کے باعث انتشار کی کیفیت نمایاں ہو چلی ہے
بی یورپ کے ممالک بھی معاشی بحران کا شکار ہیں۔
اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ اگر فوجی اخراجات میں کمی
جائے تب بھی اس بچت کا کچھ فائدہ غریب ممالک
کو نہ پہونچے گا۔ خیرات بہر حال اپنے ہی گھر سے شروع
ہونی چاہیے۔ ترقی پذیر ممالک کو اپنی ترقی کا ایسا نقشہ
بنانا ہوگا جو ان کے مفاد کی حفاظت کر سکے اور بنیادی
تبدیلیوں کے ذریعہ سماجی انصاف کی فضا قائم
کر سکے۔

World Focus

(اپریل ۱۹۸۲ء)

بقیہ "قومی اتفاق"
متعلقہ صفحہ نمبر ۲۰ کا

ہیں۔ اب بھی ہر شہر اور ہر قصبہ میں دیکھو گے کہ لوگ
کس قدر خیرات کرتے ہیں، بھوکوں کو کھلاتے ہیں، گاؤ
زیارت میں روپیہ خرچ کرتے ہیں، مسجدیں بنواتے ہیں،
کوئی ایسا کام جس میں ان کی دانست میں مذہبی نیکی ہو،
دل و جان سے اس میں مصروف ہوتے ہیں۔ سب لوگ
قبول کریں گے کہ اس نیت سے یہ کام کیے جاتے ہیں کہ
قیامت میں ان کو اس کا بدلہ ملے گا اور روز محشر میں ان
کو ثواب حاصل ہوگا۔ اگر میرا یہ خیال صحیح ہے تو درحقیقت
یہ سب کام خود غرضی اور ذاتی منفعت کے ہیں نہ ابنائے جنس
کی بھلائی اور قومی ہمدردی کے۔ جب تک کہ ہمارے دل میں
یہ جوش نہ پیدا ہو کہ جو کام ہم کریں وہ قوم کے لیے کریں،
نہ ثواب آخرت کے لیے، اس وقت تک قومی ہمدردی کا
جوش پیدا نہیں ہو سکتا۔

میرا یہ مطلب نہیں ہے کہ میں ان
ثواب کے کاموں کو برا جانتا ہوں یا ان کی کچھ حقارت
کرتا ہوں، بلکہ میرا مقصد یہ ہے کہ میں اصلی قومی ہمدردی
کو ذہن نشین کرنے میں کوشش کروں اور دوسرے
کاموں سے جو امتیاز ہے اس کو بتلاؤں۔

حکیم احسان اللہ
شعبۂ یونانی طب و جراحت
اجمل خاں طبیہ کالج - اے ایم یو

ادرک کی تاریخی و طبیّ اہمیت

کائنات کون و فساد کے جمیع موجودات کو ان کی چند اہم اور بنیادی خصوصیات کے پیش نظر تین بڑے گروہوں (انواع) میں تقسیم کیا گیا ہے۔ انھیں اقسام کو اصطلاحاً موالید ثلاثہ کہا جاتا ہے۔ کائنات کی تمام اشیاء ان ہی اقسام کے تحت آجاتی ہیں۔ حسب ذیل سطور میں ان کا مختصراً ذکر کیا جاتا ہے

۱۔ جمادات: کون و مکان کی وجہ سے جان اشیاء اس نوع کے فرد کی حیثیت رکھتی ہیں۔ زمین اور اس کے سینے میں قدرت کے محفوظ خزانے، دریا، سمندر ریگزار اور کوہسار وغیرہ اور فلک پر چاند سورج ستارے سیارے اور کہکشاں وغیرہ تمام موجودات جن میں خصوصیات حیات کا فقدان ہے، جمادات میں شمار کی جاتی ہیں۔

باقی دو اقسام میں ایک خصوصیت یعنی مادۂ حیات کی موجودگی، مشترک ہے اور دونوں کے جوہر اساسی میں بڑی حد تک یکسانیت پائی جاتی ہے۔ اس بنیادی اشتراک، مماثلت اور قرب کے باوجود دونوں کے مظاہر میں اس قدر نمایاں فرق اور تفاوت ہے کہ انھیں کرۂ ارض کے قطبین (دو پول) سے تعبیر کیا جا سکتا ہے

۲۔ حیوانات: دنیا کی ہر وہ شے جس کی اصل میں علامتِ زندگی موجود ہو، اس نوع میں شامل ہے یک خلوی (UNICELLULAR) اجسام سے لے کر جراثیم حشرات الارض چرند و پرند، درندے اور مچھلیاں و دیگر عظیم الہیکل حیوانات کو یہ نوع محیط ہے۔ حیوان ناطق یعنی حضرت انسان جو اشرف المخلوقات کے ممتاز لقب سے سرفراز فرمایا گیا ہے، اسی گروہ میں داخل ہے۔

۳۔ نباتات: صفحہ گیتی کے دو تہائی حصہ میں پانی ہی پانی ہے یعنی سمندروں سے گھرا ہوا ہے۔ تقریباً ایک تہائی خشک حصہ پر انسانی آبادیاں ضرور ہیں لیکن آباد زمینوں کا تناسب ان وسیع و عریض خطوں سے کم ہے جن کو قدرت نے حسین اور دلکش مناظر فطرت کے حفاظت کی غیر معمولی ذمہ داری سونپی ہے۔ نباتات نہ صرف روئے زمین کے خشک حصوں کے اوپر بلکہ زیر زمین اور زیر آب دریا اور سمندر کے سینے میں بھی نشو و نما پاتے ہیں۔ اس نوع کے افراد میں خود رو ننھے پودے اور تناور درخت سبھی شامل ہیں۔

اگرچہ نباتات کی موجودگی روئے زمین کے تمام حصوں پر عام ہے لیکن خصوصیت کے ساتھ دنیا کے وہ خطے ان کی بہتر افزائش و بالیدگی کے لیے سازگار آب و ہوا فراہم کرتے ہیں جو کرۂ ارض کے عرضی خطوط (خط سرطان

وخط جدی جو خط استوار کے شمال وجنوب میں ہوتی ہیں)
کے درمیان اور ان خطوط کے دونوں طرف قطبین کی جانب
واقع ہیں۔ ان خطوں کو علی الترتیب منطقہ حارہ و منطقہ تحت
حارہ یا معتدلہ کے نام سے جانا جاتا ہے۔ قطب شمالی و قطب
جنوبی کے قریب واقع ممالک کی آب وہوا مادۂ حیات کی
حامل دونوں انواع کی بہتر وصحت مند افزائش کے لیے موافق
نہیں ہیں بالفاظ دیگر ان ممالک کی آب وہوا مخالف حیات
ہے۔ یہی سبب ہے کہ ان ممالک میں حیوانات ونباتات
کی تعداد قلیل ہے۔

انسان کی زندگی سے نباتات کا تعلق قدیم ہونے
کے ساتھ ساتھ اتنا مضبوط اور مستحکم ہے جس کو الگ نہیں
کیا جا سکتا۔ حیات انسانی سے نباتات کی وابستگی اور ان
کی ہشت پہلو اہمیت سے کس کو انکار ممکن ہے۔ آرام و
آسائش کے سامان، نمائش وزیبائش کی چیزیں، درس گاہوں
ورہائش گاہوں کی زینت، فنون نقاشی وتجلدی کی حفاظت
غرض کہ مہد سے لے کر لحد تک زندگی کے جملہ شعبہ جات میں
آئے دن پیش آنے والی ضروریات کی تکمیل اسی نوع کی
مرہون منت نظر آتی ہیں۔

مذکورہ بالا مختلف النوع فوائد سے قطع نظر
نباتات کی دو حیثیتیں خصوصی ذکر کے قابل ہیں۔ غذائی۔
دوائی۔

غذا مدار زندگی ہے نہ صرف انسانوں کے لیے
بلکہ حیوانوں اور خود نباتات کے لیے بھی۔ البتہ نوعیت غذا
ہر کسی میں مختلف ہوا کرتی ہے۔ انسان اپنی غذا بعض
حیوانات سے حاصل کرتا ہے لیکن اس کی غذا کا بیشتر
حصہ (تقریباً ۹۰ فیصد) نباتات پر مشتمل ہوتا ہے۔ اور
وہ لوگ جو صرف اور صرف نباتاتی اشیاء پر گذارا کرتے
ہیں یعنی نباتات خور (Vegetarians) ان
کی زندگی کا تو مکمل انحصار نباتات ہی پر ہے۔

دوا: اس اصطلاح کا اطلاق ہر اس شے پر
ہوتا ہے جو داخلی یا خارجی طور پر کسی مرضی کیفیت کے ازالہ
کی غرض سے استعمال کی جائے۔ دواؤں کی اہمیت غذا سے
سے کسی طرح بھی کم نہیں۔ بسا اوقات انسان کی قیمتی جانوں
کے تحفظ کے لیے دوا ناگزیر ہوتی ہے۔ مشاہدہ اس دعویٰ
کی دلیل کے لیے کافی ہے کہ عمدہ اور بہتر غذاؤں کی وافر
مقدار ایک بیمار کے لیے بیکار ثابت ہوتی اگر مرض کی مخصوص
دوا جسم میں نہ پہونچائی جائے۔

اس حیثیت سے بھی آخر الذکر نوع کو دیگر
انواع پر فوقیت وفضیلت حاصل ہے۔ قدیم وجدید دونوں
طریقہائے علاج منت کش فیضان نباتات ہیں، تسکین درد
کی معمولی ادویہ سے لے کر بہت سی خطرناک اور ماضی میں
ناقابل علاج بیماریوں کی جراثیم کش اور مخصوص دوائیں پیڑ،
پودوں اور ان کے اجزاء سے اخذ کی جاتی ہیں۔

ایک بہت ہی عام بات جس کو لوگ برابر استعمال
کرتے ہیں لیکن اس کی طبی اہمیت سے ناآشنا ہیں۔ طبی
نقطہ نظر سے یہ بہت ہی اہم اور کثیر المنفعت ہے۔ نباتیات
(Botany) سے ناواقفیت کی بنا پر عوام وخواص اس
کو جڑ سمجھتے ہیں۔ طب کی بعض قدیم کتابوں میں بھی اس کو
جڑ ہی لکھا گیا ہے۔ لیکن ماہرین نباتیات کی تحقیقات اس
بات کے اثبات میں موجود ہیں کہ یہ جڑ نہیں بلکہ زیر زمین
پھیلنے والا ایک قسم کا تنا ہے۔ زمین کے نیچے نشوونما
پانے والے تنوں کی یہ قسم رائی زوم (Rhizome)
کہلاتی ہے۔ زیر نظر نباتات اس کے ایک فرد کی حیثیت
رکھتی ہے جس کی طبی اہمیت وافادیت کا تذکرہ مقصود

ہے۔ اس کی تازہ قسم کو عرف عام میں "ادرک" کہتے ہیں اور خشک ہو جانے پر یہی "سونٹھ" یا "زنجبیل" کہلاتی ہے۔ طب کی کتابوں میں انھیں دونوں ناموں (ادرک اور زنجبیل) کے تحت اس کی تفصیلات ملتی ہیں۔

"دیگر زبانوں میں ادرک کے نام"

ہندوستان میں بولی جانے والی چند زبانوں اور کچھ غیر ملکی زبانوں میں اس کے نام حسب ذیل ہیں

نام		زبان
ادرک (تازہ)		(ہندی)
سونٹھ (خشک)		(")
ادھرک		(پنجابی)
ادا		(بنگالی)
سرنگادیرا	(Sringavera)	(سنسکرت)
آردرکا	(Ardraka)	(")
سونٹھی	(Sunthi)	(")
انجی	(Inji)	(تامل)
زنجبیل اور زنجفیل		(عربی)
زنگبیل		(فارسی)
زنجبیل		(")
جنجر	(GINGER)	(انگریزی)
انگور	(INGWER)	(جرمن)
زنجبیری	(ZINGIBERI)	(یونانی)

• نباتاتی نام ZINGIBER OFFICINALE

مختلف زبان میں ادرک کے لیے استعمال کیے جانے والے ناموں کے سلسلے میں ڈاکٹر رائل (Royle) کا خیال ہے کہ بیشتر زبانوں کے نام سنسکرت سے مشتق ہیں۔ اس کے خیال میں (Sringavera سرنگادیرا) اصل ہے اور دیگر زبانوں کے نام اس کے مشتقات

باقی آئندہ شمارہ میں ملاحظہ فرمایئے۔

معلومات متعلقہ فارم نمبر ۴

نام رسالہ: تہذیب الاخلاق علی گڑھ
مقام اشاعت: علی گڑھ
وقفہ اشاعت: پندرہ روزہ

نام پرنٹر، پبلشر: قاضی معزالدین احمد
قومیت: ہندوستانی
پتہ: صفدر منزل - تار بنگلہ
اے ایم یو - علی گڑھ

نام مالک و ایڈیٹر: سید حامد
قومیت: ہندوستانی
پتہ: وائس چانسلر لاج
اے ایم یو علی گڑھ یو پی

میں قاضی معزالدین احمد تصدیق کرتا ہوں کہ جو تفصیلات اوپر دی گئی ہیں وہ میرے علم و یقین کے مطابق صحیح ہیں

دستخط:
قاضی معزالدین احمد

سید جلال الدین عمری
مدیر تحقیقات اسلامی
علی گڑھ

قسط اوّل

اسلام میں مظلوم کے حقوق

کسی شخص پر ظلم و زیادتی ہو تو اسے یہ حق ملنا چاہیے کہ وہ اس کے خلاف آواز اٹھائے اور اس نقصان کی تلافی کا مطالبہ کرے جو اسے پہونچا ہے۔ ورنہ معاشرے میں کمزوروں کے حقوق محفوظ نہیں رہ سکتے۔ جس کسی کے ہاتھ میں طاقت ہوگی وہ جب چاہے گا ان کے حقوق پر دست درازی کرے گا اور اسے کسی جوابی اقدام کا خطرہ نہ ہوگا۔ اسلام نے مظلوم کو وہ سارے حقوق دیے ہیں، جن کے ذریعہ وہ ظلم کا مقابلہ کر سکتا، ظالم کو بے نقاب کر سکتا اور اس کے خلاف چارہ جوئی کر سکتا ہے۔ یہاں اس سلسلہ کے بعض حقوق کا ذکر کیا جا رہا ہے۔

مظلوم ظلم کے خلاف آواز اٹھا سکتا ہے

اگر کسی پر ظلم ہو تو اسے ظالم کے خلاف آواز اٹھانے کا فطری حق ہے لیکن معاشرہ کے کمزور افراد اور طبقات بالعموم اس حق سے محروم ہی رہے ہیں۔ انھیں اس قدر دبایا اور کچلا گیا کہ وہ بڑے سے بڑے ظلم اور بربریت کے خلاف بھی دم مارنے کی ہمت نہیں پاتے تھے۔ وہ اپنے حقوق کے مالک نہ تھے بلکہ ان کے حقوق ان جابروں اور ظالموں کے ہاتھوں میں تھے جو لطف و محبت اور ہمدردی سے ناآشنا تھے۔ وہ جب چاہتے ان بے نواؤں کے حقوق روندتے اور پامال کرتے اور انھیں صرف شکایت تک زبان پر لانے کی اجازت نہ تھی۔ اسلام نے مظلوم کو ظلم کے خلاف آواز اٹھانے کا حق دیا اور اعلان کیا

"اللہ کو پسند نہیں کہ کسی کی بُری بات کا ذکر کیا جائے لیکن جس شخص پر ظلم ہو (وہ اس کا اظہار کر سکتا ہے) اور اللہ سننے والا اور جاننے والا ہے۔"

کسی غلط اور گندی بات کا زبان سے نکالنا اور اس کا چرچا کرنا سخت ناپسندیدہ ہے اس لیے کہ اس سے اسے فروغ ملتا ہے جو گندگی ایک جگہ ہوتی ہے وہ دس جگہ پھیلتی ہے البتہ کسی پر ظلم ہو تو اسے اس کے اعلان و اظہار کا حق ہے۔ اس سے ایک طرف ظالم بے نقاب ہوگا اور سوسائٹی اس کے شر سے محفوظ رہے گی تو دوسری طرف مظلوم کے ساتھ ہمدردی پیدا ہوگی اور اس پر ہونے والے ظلم و ناانصافی کا مداوا ہوگا

ظلم و زیادتی اور بدسلوکی کی بہت سی شکلیں ہو سکتی ہیں۔ آدمی کے ساتھ جس قسم کی زیادتی ہو کیا وہ اس کا اظہار کر سکتا ہے۔ یا بعض مخصوص زیادتیوں ہی کے اظہار کی اسے اجازت ہے؟ مشہور تابعی حضرت مجاہدؒ کہتے ہیں کہ اگر ایک مسلمان دوسرے مسلمان کا مہمان بنے اور وہ اس کی ٹھیک سے مہمانی کرے تو وہ اس کی شکایت کر سکتا ہے۔ یہاں یہ بات ذہن میں رہے کہ اسلام کے نزدیک ایک مسلمان کے دوسرے مسلمان پر جو حقوق عاید ہوتے ہیں

ان میں سے ایک حقِ ضیف بھی ہے۔ اس کا منشاء یہ ہے کہ ایک مسلمان کسی بھی اجنبی جگہ پر پہونچ جائے تو بھوکا رہنے پر مجبور نہ ہو۔ وہاں وہ اپنے کسی بھی مسلمان بھائی کا مہمان ہوسکتا ہے۔ حقِ ضیف کے سلسلہ میں بعض روایات بھی آتی ہیں جن کی بنیاد پر امام احمد وغیرہ نے اسے واجب کہا ہے

حضرت عبداللہ بن عباسؓ فرماتے ہیں۔ آیت کا مطلب یہ ہے کہ آدمی پر زیادتی ہو تو وہ بددعا کرسکتا ہے۔ یہ درحقیقت مثالیں ہیں جن کے ذریعہ آیت کے مفہوم کو سمجھا گیا ہے ورنہ آیت میں مظلوم کو بغیر کسی تخصیص کے اپنے اوپر ہونے والے ہر ظلم کے اظہار کی بلکہ انتقام کی اجازت دی گئی ہے۔ چنانچہ سدی کہتے ہیں۔

(ترجمہ) "بے شک اللہ تعالیٰ اس بات کو ناپسند کرتا ہے کہ (بندوں) لوگوں میں سے کوئی بھی برائی کا اظہار کرے لیکن اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ جس پر ظلم ہوا ہے وہ اگر اپنے ظلم کے جواب میں انتقام لے تو اس پر کوئی گناہ نہیں ہے۔"

علامہ ابن جریر طبریؒ نے ان سب اقوال کو نقل کرنے کے بعد آیت کا مطلب اس طرح بیان کیا ہے "اللہ تعالیٰ اس بات کو پسند نہیں کرتا کہ علانیہ کسی کی برائی کی جائے۔ البتہ جس شخص پر ظلم ہوا ہے وہ اگر اس کا ذکر کرے تو کوئی حرج نہیں ہے۔ اس میں یہ بات بھی داخل ہے کہ کسی نے مہمان کا حق بالکل ادا نہیں کیا یا ٹھیک سے ادا نہیں کیا یا کسی کی جان و مال پر اس نے زیادتی کی۔ اس میں یہ بھی داخل ہے کہ مظلوم اللہ تعالیٰ سے دعا کرے کہ وہ اس کی مدد کرے۔ اگر وہ آواز کے ساتھ دعا کرے تو بھی یہ ایک طرح کا اظہار ہی ہے[2]

مفسر خازن لکھتے ہیں "علماء نے کہا ہے کہ لوگوں کے خفیہ حالات کو دوسروں پر ظاہر کرنا جائز نہیں ہے کیوں کہ اس کی وجہ سے لوگ غیبت میں مبتلا ہوتے ہیں اور خود وہ شخص شک وشبہ میں گرفتار ہوتا ہے۔ البتہ جس پر ظلم ہوا ہے وہ اس کا اظہار کرسکتا ہے اس طرح کہ فلاں نے اس کا مال چرایا یا غصب کیا ہے۔ اگر کوئی اسے برا بھلا کہے تو اسے اس کا جواب دینے کا بھی حق ہے[3]"

جس شخص پر ظلم و زیادتی ہو تو اس پر یہ مزید ظلم ہوگا کہ اسے اس کے اظہار کی بھی اجازت نہ دی جائے۔ مظلوم کی زبان بند کرنے سے ظالم بے قید ہو جاتا ہے اور اسے پھیلنے پھولنے سے دنیا کی کوئی طاقت نہیں روک سکتی۔ اسلام مظلوم کو یہ حق دے کر کہ وہ ظلم کا برملا اظہار کرسکتا ہے اسے معاشرے سے ختم کرنا چاہتا ہے۔

حق دار حق کا مطالبہ کرسکتا ہے۔

احادیث میں یہ بات بڑی وضاحت کے ساتھ کہی گئی ہے کہ حق دار اپنے حق کا مطالبہ کرسکتا ہے۔ اسے اس حق سے نہ تو روکا جاسکتا ہے اور نہ اس کی کمزوری سے فائدہ اٹھایا جاسکتا ہے۔ بلکہ اگر اپنے حق کے مطالبہ میں اس کی طرف سے شدت اور سختی کا مظاہرہ بھی ہو تو اسے برداشت کیا جانا چاہیے۔ حضرت ابوہریرہؓ کا بیان ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک شخص سے (جو غالباً کافر تھا) اونٹ قرض لیا۔ اس نے شدت سے واپسی قرض کا مطالبہ کیا تو صحابہ کرامؓ نے اسے سخت جواب دینا چاہا۔ آپؐ نے فرمایا

[1] تفصیل کے لیے ملاحظہ ہو۔ تفسیر ابن کثیر ۱/۵۷۰ [2] تفسیر ابن جریر جزء ۶/۲-۴ [3] تفسیر خازن ۱/۵۱۲ امام رازیؒ نے اس تشریح کو اصم کی طرف منسوب کیا ہے ملاحظہ ہو تفسیر کبیر ۳/۳۴۶

ترجمہ " اسے چھوڑ دو اس لیے کہ جو حق دار ہے اسے بولنے کی گنجائش ہے۔"

اس کے بعد حکم دیا کہ ایک اونٹ خرید کر اسے دے دیا جائے۔ صحابہ کرام نے عرض کیا کہ جو اونٹ اس سے لیا گیا تھا اس سن و سال کا اونٹ تو اس وقت دستیاب نہیں ہے البتہ اس سے بہتر اونٹ موجود ہے۔ آپ نے فرمایا وہی اونٹ خرید کر اسے دے دو۔ تم میں بہتر انسان وہ ہے جو بہتر طریقہ سے قرض کی ادائیگی کرے

اس حدیث کی شرح میں حافظ ابن حجرؒ فرماتے ہیں

ترجمہ "وہ زور سے طلب کر سکتا اور قوت سے بول سکتا ہے لیکن شریعت نے جو ادب بتایا ہے اس کی رعایت کرتے ہوئے "!

مطلب یہ کہ شریعت کے قائم کردہ حدود کے اندر رہتے ہوئے حق دار پورے زور اور قوت سے اپنے حق کا مطالبہ کر سکتا ہے۔ اسی حدیث کے ذیل میں علامہ ابن الملک کہتے ہیں کہ حق دار کو اپنا حق نہ ملے تو صرف یہی نہیں کہ شکایت اور ڈانٹ ڈپٹ کی اسے اجازت ہوگی، بلکہ وہ قانونی چارہ جوئی بھی کر سکتا ہے۔ ان کے الفاظ ہیں

ترجمہ " یہاں حق سے مراد قرض ہے یعنی جس کا لینے قرض دار پر حق ہو اور وہ اس کے ساتھ ٹال مٹول کرے تو وہ اس کی شکایت کر سکتا ہے۔ حاکم تک اسے لے جا سکتا ہے اور اس کی ڈانٹ ڈپٹ بھی کر سکتا ہے۔ حدیث میں جو "مقال" کا لفظ آیا ہے اس کا یہی مطلب ہے۔"

باقی آئندہ شمارے میں

بقیہ مضمون " مسلمانوں کا افلاس"

اس کے ساتھ مقابلہ کرنے میں ان کے فخر کو سخت ضرر پہنچتا ہو۔ مگر ان کو چاہیے کہ اپنی حالت کو قبول کرنے کے لیے کافی ہمت اور اس مقابلے میں سخت کوشش کرنے کے لیے کافی جرأت اور اپنی ذات کی عزت کا خیال رکھنے کے لیے پوری ہمت کریں۔ اگر تجربہ کی نصیحتوں کو صحیح صحیح نہیں پڑھ سکتے، یا نہ پڑھیں گے تو ضرور تکلیف میں رہیں گے۔ منجملہ ان بڑے بڑے اسباب کے جن سے مسلمانوں کی خرابی ہوئی ہے، روزینہ داری اور لاخراج داری بھی، جس کے وہ بہت گرویدہ ہیں، ایک بڑا سبب ہے۔ یہ طریقہ کاہلی پیدا کرتا ہے، اور کاہلی سے افلاس ہوتا ہے، اور افلاس موجب ہے ناخوشی کا۔"

بلاشبہ ملکی ہونا اور روزینہ دار ہونا انسان کے لیے بہت بڑی آفت ہے۔ اس زمانہ میں ملکی معافیدار اور روزینہ دار سب سے زیادہ خراب اور بُری حالت میں ہیں۔ مگر میری دانست میں ایک اور فرقہ بھی ایسا ہی ہے، یعنی وہ لوگ جو پیرزادے بن کر شہر بہ شہر اپنے مریدوں سے ٹیکس وصول کرتے پھرتے ہیں یا منبر پر بیٹھ کر جھوٹے سچے قصے سنا کر اور واعظ بن کر لوگوں سے روپیہ وصول کرتے پھرتے ہیں، اور بہت سے وہ لوگ ہیں جو اپنے تئیں کسی پیر فقیر کے خاندان کا بیان کر کر، کسی درگاہ کا خادم کہہ کر، یا مکہ معظمہ کا مطوف اور مدینہ منورہ کی زیارت کرنے والا بتا کر روپیہ مانگتے پھرتے ہیں۔ جو مسلمان کہ ان لوگوں کے ساتھ سلوک کرتے ہیں، درحقیقت اپنی قوم کے یعنی مسلمانوں کے دشمن ہیں۔ نامہذب خیرات نہایت بُری چیز ہے اس سے قوم میں مفلسی اور ناشائستگی، بے حیائی اور بے غیرتی پھیلتی ہے۔

از مقالات سرسید حصہ پنجم مولانا اسماعیل پانی پتی

پروفیسر محمد اقبال انصاری
صدر شعبۂ اسلامیات۔
اے ایم یو

حافظ ابن قیمؒ

شیخ الاسلام امام ابن تیمیہؒ (۱۲۶۸ - ۱۳۲۸ء)
کے تلامذہ میں جو شہرت و اہمیت اور فضیلت و خصوصیت اُن کے
ایہ ناز شاگرد حافظ ابن قیمؒ کو حاصل ہوئی وہ کسی اور دوسرے
کے حصّہ میں نہیں آئی۔ وہ علم و عمل، زہد و تقویٰ اور عبادت و
ریاضت، غرض ہر لحاظ سے اپنے جلیل القدر استاد کے
صحیح جانشین تھے۔ زندگی بھر ان کے ساتھ رہے اور اُن
کے انتقال کے بعد بھی انھیں کے مسلک پر قائم اور ان کی گرانقدر
تصنیفات اور علمی تحقیقات کی توسیع و اشاعت کرتے رہے
لیکن کس قدر افسوس کا مقام ہے کہ خود ان کی زندگی کے
حالات بہت ہی کم ملتے ہیں اور خود ان کے ہی ایک لائق شاگرد
عبدالرحمٰن بن رجب الحنبلی (۱۳۰۹ - ۱۳۹۳ء) نے ذیل طبقات
الحنابلہ میں جو حالات قلمبند کر دیے ہیں وہی بیشتر تذکرہ نگاروں
کا مرجع و ماخذ ہے۔

وہ ۶ / صفر ۶۹۱ھ (۲۰ / جنوری ۱۲۹۲ء) کو
دمشق کے ایک علمی خانوادہ میں پیدا ہوئے۔ ان کا اصل نام محمدؒ
کنیت ابو عبداللہ اور لقب شمس الدین تھا۔ ان کے والد
ابوبکر بن ایوب الزرعی (م ۱۳۲۳ء) دمشق کے ایک مدرسہ
کے (جو عبدالرحمٰن بن الجوزی (۱۱۲۶ - ۱۲۰۰ء) کا بنا کردہ
ہونے کی وجہ سے مدرسہ جوزیہ کہلاتا تھا) قیم (مہتمم) تھے۔ اور
قیم الجوزیہ کہلاتے تھے۔ چنانچہ ان کے صاحبزادے بھی شروع
میں ابن قیم الجوزیہ کہلائے جو بعد میں صرف ابن قیم رہ گیا
اور اس قدر مشہور ہوا کہ لوگ ان کا اصل نام ہی بھول گئے

بچپن ہی میں قرآن مجید حفظ کر لینے کے بعد
ابتدائی تعلیم خود اپنے والد، ابوبکر بن ایوب الزرعی، سے
حاصل کی جنھیں علم الفرائض میں ید طولیٰ حاصل تھا۔ پھر دمشق
کے مشہور اساتذہ سے علوم مروجہ کی تعلیم حاصل کی۔ البتہ عربی
زبان و ادب کی تعلیم ابن ابی الفتح اور مجد التونسی سے حاصل
کی اور فقہ مجد الحرانی اور امام ابن تیمیہؒ سے پڑھی اور موخر
الذکر ہی کا اثر سب سے زیادہ قبول کیا اور انھیں کے علم و
فضل سے سب سے زیادہ فیض یاب ہوئے۔ اگرچہ ان کے
ایک مشہور استاد صفی الدین ہندی بھی تھے۔ جن کی امام ابن
تیمیہ سے معاصرانہ چشمک رہا کرتی تھی۔ اور دونوں کے درمیان
مناظرہ بھی ہوا تھا۔ مگر ابن قیم بیک وقت دونوں سے استفادہ
کرتے رہے اور دونوں ہی کے دامنِ تلمذ سے وابستہ
رہے۔ البتہ جب ۱۳۱۵ء میں صفی الدین ہندی کا انتقال
ہوگیا تو وہ امام ابن تیمیہؒ ہی کی صحبت میں رہنے لگے۔
شریعت اور طریقت میں انھیں کا منہاج اختیار کیا اور
انھیں کے ہو رہے۔ چنانچہ اُن کے ہم درس و شاگرد
علامہ ابن کثیر نے لکھا ہے کہ:

جب شیخ تقی الدین (ابن تیمیہؒ) مصر سے

واپس آئے تو ابن قیم ان سے وابستہ ہو گئے اور ان کی وفات تک انھیں کے دامن سے وابستہ رہے۔ علمی ذوق اور شغل تو پہلے ہی سے رکھتے تھے۔ اب امام ابن تیمیہ سے علم بے نہایت حاصل کیا۔ دن رات طلب علم کی دھن تھی۔ لہٰذا متعدد علوم و فنون میں یگانہ روزگار بن گئے۔ ساتھ ہی کثرت عبادت کی صفت سے بھی متصف تھے۔"

۱۳۲۳ء میں اپنے والد کے انتقال کے بعد مدرسہ ...زیہ کی مسجد کی امامت قبول کی، اس لیے کہ دمشق کے دوسرے ...م مدرسہ صدریہ میں وہ پہلے ہی سے درس دے رہے تھے ...مت اور درس و تدریس سے جو بھی وقت بچ جاتا اسے تصنیف تالیف اور عبادت و ریاضت میں لگاتے۔ طلاق، زیارتِ ...ر اور صفات باری جیسے اس وقت کے اہم و نازک مسئلوں ... وہ اپنے استاد ہی کے ہمنوا تھے۔ چنانچہ جب امام ابن ...یہ نے مسجد حرام، مسجدِ نبوی اور مسجد اقصیٰ کے علاوہ کسی جگہ زیارت کی غرض سے اہتمام سفر کرنے کے عدمِ جواز کا فتویٰ دیا ...ں لیے کہ یہ حدیث شریف کی صریح مخالفت ہے تو حافظ ابن ...نے بلا خوف و خطر اس فتوی کی علی الاعلان تائید کی۔ اس ...کہ ان کی نظر میں اس اہتمام سفر سے شرک اور مشرکانہ عقائد ...طل کا دروازہ کھلتا تھا۔ لوگ اس زیارت کو عبادت اور ...ت کا ذریعہ سمجھنے لگے تھے اور حدود شریعت سے تجاوز کر کے ...ید کا دامن ہاتھ سے چھوڑ دیتے تھے۔ چنانچہ جب اس فتویٰ ...بنا پر شیخ الاسلام قلعہ دمشق میں قید کیے گئے تو ان کی ...ید و حمایت کی پاداش میں انھیں اونٹ پر بٹھا کر سارے ...ں گھمایا گیا، بر سر عام درے لگائے گئے اور پھر قلعہ دمشق ...انھیں اپنے محبوب استاد سے علیحدہ قید کر دیا گیا اور

اُن کے وہاں انتقال کے تین ہفتے بعد یعنی ۲۰ر ذی الحجہ ۷۲۸ھ (۵ار اکتوبر ۱۳۲۸ء) کو انھیں رہا کر دیا گیا۔ مگر وہ قید و بند کی کسی قسم کی پرواہ کیے بغیر مسلک امام ابن تیمیہؒ کی تائید و حمایت میں ہمہ تن مشغول رہے اور بالآخر انھیں ۱۳ر رجب ۷۵۱ھ (۱۶ر اگست ۱۳۵۰ء) کو قید حیات سے رہائی ملی اور باب صغیر کے قبرستان اپنی والدہ کے پہلو میں دفن ہوئے۔

حافظ ابن قیم کی اولاد میں صرف ایک صاحبزادہ شرف الدین عبد اللہ کا نام ملتا ہے جو اپنے والد کے انتقال کے بعد مدرسہ صدریہ میں مدرس ہو گئے تھے اور انھیں اپنے والد سے شرفِ تلمذ بھی حاصل تھا، دیگر تلامذہ میں ابو الفرج عبد الرحمٰن بن رجب الحنبلی (۱۳۰۹ - ۱۳۹۳ء)، صاحب ذیل طبقات الحنابلۃ الفراء، شمس الدین محمد بن عبد القادر النابلسی (م ۱۳۹۵ء) جنھوں نے ابن ابی یعلی الفراء (م ۱۱۳۲ء) کی "طبقات فقہاء اصحاب الامام احمد" کا جو طبقات الحنابلہ کے نام سے مشہور ہے، اختصار مختصر طبقات الحنابلہ کے نام سے کیا ہے البدایہ والنہایہ کے مصنف عماد الدین اسمٰعیل بن عمر القرشی المعروف بابن کثیر (۱۳۰۱ - ۱۳۷۳ء) اور شمس الدین محمد بن احمد بن عبد الہادی المقدسی المعروف بابن عبد الہادی (۱۳۰۷-۱۳۴۳) صاحب الاحکام الکبری و منتقی من تہذیب الکمال للمزی خاص طور پر قابلِ ذکر ہیں، اُن میں موخر الذکر دو اصحاب اصل میں امام ابن تیمیہؒ کے شاگرد تھے مگر انھیں ابن قیم سے بھی شرف تلمذ حاصل ہے۔

حافظ ابن قیم گوناگوں اوصاف حمیدہ کے حامل تھے۔ نرم مزاج، رحمدل، خوش اخلاق و خوش گفتار اور اپنی مذہبی شدت کے باوجود نہایت خلیق، بحد متواضع، صد درجہ منکسر المزاج اور صابر و قانع تھے۔ ان کا قول تھا کہ صبر و قناعت ہی سے امامت دین حاصل ہوتی ہے۔ نیز ایک سالک کے لیے

صبر و قناعت کے علاوہ علم و ہمت کی بھی ضرورت ہے اس لیے کہ
معرفت کی کٹھن منزلوں میں علم مشعل راہ کا کام دے گا اور ہمت
سخت سے سخت مراحل میں اس کے پائے استقلال میں لغزش
نہ آنے دے گی۔ اُن میں اپنے استاد کی سی حدت و شدت
نہیں تھی۔ اسی لیے ان کے مخالفین بھی انھیں قدر و منزلت
کی نگاہ سے دیکھتے تھے۔ فقہی مسلک کے اعتبار سے حنبلی
ہونے کے باوجود وہ تقلید شخصی کے بعید مخالف تھے اور جس
رائے کو کتاب و سنت سے قریب ترین پاتے تھے اُسی کو
اختیار کرتے تھے خواہ وہ حنبلی مسلک کے خلاف ہو یا ان کے
محبوب استاد کی رائے کے مخالف ہو۔ چنانچہ انھوں نے
متعدد مسائل میں اُن سے اختلاف کیا ہے۔ مثال کے طور پر
رضاعت اور لونڈی کی عدت کے مسئلہ میں انھوں نے امام ابن
تیمیہؒ سے اختلاف کیا ہے اور اس کے معقول وجود دلائل
دیے ہیں۔ اسی طرح زکوٰۃ اور خمس کی تقسیم میں حنابلہ کے
مسلک کے خلاف امام مالکؒ اور اہلِ مدینہ کی رائے تسلیم کی
ہے اور لکھا ہے کہ جو شخص بھی نصوص اور رسول اللہ علیہ
وسلم اور ان کے خلفائے کرام کے عمل کو پیشِ نظر رکھے گا
وہ اہلِ مدینہ کے مسلک ہی کی تائید کرے گا۔

عام طور پر یہ خیال کیا جاتا ہے کہ
جو مصنف کثیر التصانیف ہوتا ہے، اس کی تصنیفات میں
تحقیق و تدقیق کی کمی پائی جاتی ہے مگر ابن قیم کی ذات اس
کلیہ سے مستثنیٰ ہے اگرچہ انھوں نے قرآن و حدیث،
فقہ و اصولِ فقہ، تاریخ و سیرت اور علم کلام و تصوف غرض
تمام مروجہ علوم میں اپنی گرانقدر تصانیف چھوڑی ہیں جن کی
صحیح تعداد بتلانا دشوار ہے۔ اس لیے کہ نجانے کتنی دستبرد
زمانہ سے محفوظ نہ رہ سکیں مگر جو بھی ہم تک پہونچی ہیں وہ
ان کے علم کی گہرائی و گیرائی کا بین ثبوت ہیں۔ میں اختصار
کی بنا پر صرف چند کے ذکر پر اکتفا کروں گا۔

تفسیر میں تفسیر المعوذتین جو سورہ فلق اور
سورۃ الناس کی لاجواب تفسیر ہے اس کا اردو ترجمہ بھی
چھپ چکا ہے نیز مولانا محمد اویس نگرامی نے تفسیر القیم کے
نام سے ان کی تصانیف سے تمام تفسیری اقوال و خیالات یکجا
شائع کر دی ہیں۔

حدیث میں الطب النبوی اور تہذیب سنن
ابی داؤد خاص طور پر قابلِ ذکر ہیں۔

فقہ اور اصول فقہ میں اعلام الموقعین عن رب
العالمین اور الطرق الحکمیہ فی السیاسۃ الشرعیہ، ان میں اول
الذکر چار جلدوں پر مشتمل ہے اور فقہاء و محدثین کے لیے
ایک نعمت غیر مترقبہ ہے اور اس کا شمار ان کی اہم و بہترین
تصانیف میں ہوتا ہے۔ دلائل المحققین باحادیث سید المرسلین
المعروف بہ دین محمدی کے نام سے اس کا اردو ترجمہ بھی شائع
ہو چکا ہے۔

علم کلام میں شفاء العلیل فی مسائل القضاء والقدر
والحکمۃ والتعلیل اور الصواعق المرسلۃ (المنزلۃ) علی الجہمیۃ
والمعطلۃ غیر معمولی اہمیت کی حامل ہیں۔ اوّل الذکر میں قضا
و قدر جیسے اہم مسئلہ کی عقدہ کشائی کی گئی ہے اور موخرالذکر
میں جہمیہ و معطلہ فرقوں کی رد کی گئی ہے جو جبر کے قائل تھے
اور انسان کے مجبورِ محض ہونے کا اعتقاد رکھتے تھے۔ ان
میں اول الذکر جہم بن صفوان کی طرف منسوب ہے۔

تصوف میں مفتاح دار السعادۃ، عدۃ الصابرین
و ذخیرۃ الشاکرین اور مدارج السالکین بین منازل ایاک
نعبد و ایاک نستعین کافی اہم ہیں جن میں موخرالذکر اگرچہ
شیخ الاسلام عبداللہ الانصاری الہروی کی منازل السائرین
کی شرح ہے اور تین جلدوں میں ہے۔ لیکن اپنی جگہ پر خود

ایک گرانقدر تصنیف ہے اور اس کا شمار تصوف و سلوک کی
بہترین کتابوں میں کیا جاتا ہے۔
لیکن مصنف کی سب سے شاہکار و گرانقدر
تصنیف جو اسم بامسمیٰ ہے وہ زاد المعاد فی ہدی خیر العباد ہے
جو نہ صرف مصنف کے لیے توشۂ آخرت (زاد المعاد) ہے
بلکہ اس سے استفادہ کرنے والوں کے لیے بھی۔ یہ کتاب
چار جلدوں پر مشتمل ہے اور اگرچہ اس کا موضوع سیرت
ہے مگر وہ علوم اسلامیہ کا ایک دائرۃ المعارف ہے اور اس
میں سیرت کے ساتھ ساتھ حدیث، فقہ، علم کلام اور تصوف
پر بھی سیر حاصل بحث ہے اور بعض لحاظ سے اسے امام غزالی
(۱۰۵۹ - ۱۱۱۱ء) کی احیاء علوم الدین پر بھی فوقیت حاصل ہے
سیرت پر اس سے قبل بھی کتابیں لکھی گئیں اور بعد میں بھی
اور آئندہ بھی لکھی جاتی رہیں گی مگر زاد المعاد کا جو مقام ہے
یک سرِ مو فرق نہ آئے گا۔ اس کتاب کی غیر معمولی اہمیت کے
پیش نظر شیخ محمد بن عبد الوہاب (۱۷۰۳ - ۱۷۹۲ء) نے
مختصر زاد المعاد کے نام سے اس کا اختصار کیا جس کا اردو
ترجمہ بھی شائع ہو چکا ہے۔ ایک دوسرا خلاصہ ہدی الرسول
کے نام سے شیخ محمد ابو زید مصری نے کیا تھا جس کا اردو
ترجمہ اسوۂ حسنہ کے نام سے رئیس احمد جعفری نے کیا ہے
مولانا ملیح آبادی نے اسوۂ حسنہ کے دیباچہ میں بالکل
صحیح لکھا ہے کہ:

"ابن قیم سے پہلے اور بعد بکثرت سیرت نگار
گزرے مگر کسی کو وہ مسلک نہ سوجھا جو انھوں
نے زاد المعاد میں اختیار کیا۔ لوگوں نے آنحضرت
صلی اللہ علیہ وسلم کی سوانح عمریاں لکھیں مگر اس
طرح کہ گویا کسی سپہ سالار کی سوانح عمری لکھ
رہے ہیں۔ حالاں کہ ہونا یہ چاہیے تھا کہ آپ
کی سیرت طیبہ کی ہر ہر بات دکھلائی جاتی
جنگوں سے زیادہ اخلاقی، معاشرتی و خانگی
حالات بتائے جاتے اور امت کے سامنے
اسوۂ حسنہ نبوی اس طرح کھول کے رکھ
دیا جاتا کہ وہ اپنی زندگی کے مختلف شعبوں
اور مختلف حالات میں اس سے شمع ہدایت
کا کام لے سکے۔ ابن قیم نے یہی ضرورت
پوری کی اور زاد المعاد تصنیف کر کے
ہمیں اس قابل بنایا کہ آیہ کریمہ
" لقد کان لکم فی رسول اللہ اسوۃ حسنۃ
کے بموجب باساخی عمل کر سکیں۔"

مولانا سید ابو الحسن علی ندوی نے تاریخ دعوت و عزیمت
کے حصہ دوم میں زاد المعاد کا تعارف کراتے ہوئے بالکل
صحیح لکھا ہے کہ

"وہ اسلام کی ان اہم تصانیف میں سے
ہے جو ایک پورے کتب خانہ کی قائم مقام
اور اس کا وجود ایک متبحر و محقق کثیر الفنون
عالم کی موجودگی کے مرادف ہے اور
اس سے ہزاروں طالبین راہ خدا و متبعین
سنت نے دینی رہنمائی، روحانی غذا اور
ایمانی حلاوت پائی ہے۔"

سید احمد خاں مرحوم

قومی اتفاق

("مقالات سر سید" صفحہ ۱۳۶ تا ۱۴۱)

قوم کا لفظ ایک ایسا لفظ ہے جس کے معنوں پر کسی قدر غور کرنی لازم ہے۔ زمانہ دراز سے جس کی ابتداء تاریخی زمانہ سے بھی بالاتر ہے قوموں کا شمار کسی بزرگ کی نسل میں ہونے یا کسی ملک کا باشندہ ہونے سے ہوتا تھا

محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم بابی انت و اُمّی نے اس تفرقہ قومی کو جو صرف دنیاوی اعتبار سے تھا، مٹا دیا اور ایک روحانی رشتہ قومی قائم کیا جو ایک حبل المتین

لا الہ الا اللہ محمد رسول اللہ

سے مضبوط تھا، تمام قومی سلسلے، تمام قومی رشتے، سب کے سب اس روحانی رشتے کے سامنے نیست و نابود ہوگئے اور ایک نیا روحانی، بلکہ خدائی قومی رشتہ قائم ہوگیا۔

اِسلام کسی سے نہیں پوچھتا کہ وہ ترک ہے یا تاجیک، وہ افریقہ کا رہنے والا ہے یا عرب کا، وہ چین کا باشندہ ہے یا ماچین کا، وہ پنجاب میں پیدا ہوا ہے یا ہندوستان میں، وہ کالے رنگ کا ہے یا گورے رنگ کا، البتہ جس کسی نے عروۃ الوثقیٰ کلمہ توحید کو مستحکم کیا وہ ایک قوم ہوگیا بلکہ ایک روحانی باپ کا بیٹا! کیونکہ خدا نے خود فرمایا ہے۔

انما المومنون اخوۃ فاصلحوا بین اخویکم واتقوا اللہ لعلکم ترحمون۔

کون شخص ہے جو دو بھائیوں کو ایک باپ کا بیٹا نہیں جانتا؟ پھر جب کہ خود خدا نے تمام مسلمانوں کو ایک دوسرے کا بھائی فرمایا ہے تو ہم سب کا ایک روحانی باپ کی اولاد ہونے میں کیا شک رہا؟

مجھے اس بات کے دیکھنے سے نہایت افسوس ہے کہ ہم سب آپس میں بھائی تو ہیں مگر مثل برادران یوسف کے ہیں۔ آپس میں دوستی اور محبت، یک دلی، یک جہتی بہت کم ہے۔ حسد، بغض و عداوت کا ہر جگہ اثر پایا جاتا ہے جس کا نتیجہ آپس کی نا اتفاقی ہے۔ شیطان جس نے خدا سے وعدہ کیا کہ لاقعدن لھم صراطک المستقیم ایک مقدس اور بظاہر نہایت نورانی حیلے سے آپس میں بھائیوں کے، جن کو کہ خدا نے بھائی بنایا ہے، نفاق ڈالنے میں کامیاب ہو جاتا ہے اور جس طرح کہ ہمارے باپ آدم اس کے دھوکے کو خالص دوستی سمجھ کر دھوکے میں آگئے، اسی طرح ہم بھی دھوکے میں آجاتے ہیں اور اس نفاق کو جو ہر حالت میں مردود ہے ایک مقدس لباس پہناتے ہیں یعنی "مذہبی مقدس لباس کا خلعت

اسے عنایت کرتے ہیں۔

کون شخص ہے کہ جو اس بات کو نہیں جانتا
کہ،

من قال لا الٰہ الا اللہ فھو مسلم - من
استقبل قبلتنا فھو مسلم ومن ھو مسلم
فھو آخ۔

امام اعظم کا مذہب مشہور ہے۔

لا نکفر اہل القبلۃ

بایں ہمہ فروعِ مسائل میں اختلاف ہونے کے سبب
کس طرح ہماری قوم نے اس حبل متین کی بندش کو توڑا
ہے اور اس رشتۂ اخوت کو جسے خود خدا نے قائم کیا تھا
چھوڑا ہے۔ جس قصبے اور جس شہر میں جاؤ، جس مسجد اور
امام باڑے میں گزرو، باہم مسلمانوں کے شیعہ و سنی، وہابی
و بدعتی، لامذہب اور مقلد ہونے کی بنا پر آپس میں نفاق
وعداوت پاؤگے۔

ان نا اتفاقیوں نے ہماری قوم کو نہایت
ضعیف اور ٹکڑے ٹکڑے کر دیا ہے۔ جمعیت کی برکت ہماری
قوم سے جاتی رہی ہے۔ قومی ہمدردی اور قومی ترقی اور
قومی امور کے سرانجام دینے میں اس نالائق نا اتفاقی نے
بہت کچھ اثر بد پہنچایا ہے۔ پس ہماری قومی ترقی کا سب
سے اوّل مرحلہ یہ ہے کہ ہم سب آپس کی محبت سے اس
عداوت و نفاق کو یکتائی و یک جہتی سے مبدل کریں

یکتائی و یک جہتی سے میرا مقصد یہ نہیں
ہے کہ سب لوگ اپنے اپنے عقائد کو چھوڑ کر ایک عقیدے پر
قائم ہو جائیں۔ یہ امر تو قانونِ قدرت کے برخلاف ہے
جو ہو نہیں سکتا۔ نہ تو پہلے کبھی ہوا اور نہ آئندہ کبھی
ہوگا،

اتفاق کے قائم رکھنے کی جس کی ہم کو ضرورت ہے
ایک اور عقلی و نقلی راہ ہے جس کی پیروی قومی اتحاد کا ذریعہ
ہو سکتی ہے۔ انسان جب اپنی ہستی پر نظر ڈالے گا تو اپنے
میں دو حصے پائے گا۔ ایک حصہ خدا کا اور ایک حصہ اپنے
ابنائے جنس کا۔ انسان کا دل یا اس کا اعتقاد یا مختصر سے
الفاظ میں یوں کہو کہ اس کا مذہب خدا کا حصہ ہے جس میں
دوسرا کوئی شریک نہیں۔ اس کے عقائد کی جو کچھ بھلائی
یا برائی ہو اس کا معاملہ اس کے خدا کے ساتھ ہے۔ نہ
بھائی اس میں شریک ہے، نہ بیٹا، نہ دوست نہ آشنا اور
نہ قوم۔ پس ہم کو اس بات سے جس کا اثر ہر ایک کی صرف
ذات تک محدود ہے اور ہم سے کچھ تعلق نہیں ہے، کچھ
بھی تعلق رکھنا نہیں چاہیے۔ ہم کو کسی شخص سے اس خیال
پر کہ وہ شیعہ ہے یا سنی۔ وہابی ہے یا بدعتی، لامذہب
ہے یا مقلد یا نیچری یا اس سے کسی بدتر لقب کے ساتھ
ملقب ہے جب کہ وہ خدا اور خدا کے رسولؐ کو برحق
جانتا ہے کسی قسم کی عداوت و مخالفت رکھنی نہیں چاہیے
بلکہ اس کو بھی بھائی اور کلمے کا شریک سمجھنا اور اس اخوت
کو جس کو خدا نے قائم کیا ہے قائم رکھنا چاہیے۔

نہایت افسوس اور نادانی کی بات ہے
کہ ہم کسی سے ایسے امر میں عداوت رکھیں جس کا اثر خود
اسی تک محدود ہے اور ہم کو اس سے کچھ بھی ضرر و
نقصان نہیں۔ جو حصہ کہ انسان میں اس کے ابنائے جنس
کا ہے اس سے ہم کو غرض رکھنی چاہیے اور وہ حصہ آپس
کی محبت، باہمی دوستی، ایک دوسرے کی اعانت ایک دوسرے
کی ہمدردی ہے جس کے مجموعے کا نام قومی ہمدردی ہے۔
یہی ایک طریقہ ہے جس سے خدا کے حکم کی بھی اطاعت اور
آپس میں برادرانہ برتاؤ، قومی اتفاق، قومی ہمدردی

ماخذ: صفحہ نمبر ۱۲۳

قائم ہو سکتی ہے جو قومی ترقی کے لیے پہلی منزل ہے

یہ بات ہم کو بھولنی نہیں چاہیے کہ ان روحانی بھائیوں کے سوا اور بھی ہمارے وطنی بھائی ہیں گو وہ ہمارے ساتھ اس کلمے میں، جس نے ہم مختلف قوموں اور مختلف فرقوں کو ایک قوم اور آپس میں روحانی بھائی بنا دیا ہے، شریک نہیں ہیں۔ مگر بہت سے تمدنی امور ہیں جن میں ہم اور وہ مثل بھائیوں کے شریک ہیں۔ ہمسائے کا ادب ہمارے مذہب کا ایک جزو ہے اور یہی ہمسائیگی وسعت پاتے پاتے ہم ملکی اور ہم وطنی کی وسعت تک پہنچ گئی ہے۔

ان ہم وطن بھائیوں میں بھی دو حصے ہیں ایک خدا کا اور ایک ابنائے جنس کا۔ خدا کا حصہ خدا کے لیے چھوڑو اور جو حصہ ان میں ابنائے جنس کا ہے اس سے غرض رکھو۔ تمام امورِ انسانیت میں جو تمدن و معاشرت سے تعلق رکھتے ہیں ایک دوسرے کے مددگار رہو۔ آپس میں سچی محبت، سچی دوستی اور دوستانہ بردباری رکھو۔

اتفاق کی خوبیاں لوگوں نے بہت کچھ بیان کی ہیں اور وہ ایسی ظاہر ہیں کہ کوئی شخص اتفاق سے بھی ان کو بھول نہیں سکتا۔ بہت بڑے بڑے واقعات دنیا میں گزرے ہیں جن کو پرانی تاریخیں یاد دلاتی ہیں اور جن کی یاد سے ایک عجیب اثر ہمارے دلوں میں ہوتا ہے وہ سب باہمی اتفاق کا نتیجہ ہے۔ ایک ناچیز ریشۂ گیاہ جو تنہا نہایت کمزور ہوتا ہے باہمی اتفاق سے ایسا قوی اور زبردست ہو جاتا ہے کہ بڑی سے بڑی قوت کا مقابلہ کرتا ہے۔ اس وقت تعلیم یافتہ دنیا میں جو کچھ ترقی ہے یا مہذب ملکوں میں جو کچھ طاقت ہے، وہ اتفاق کی بدولت ہے

بعض قابلِ ادب بزرگوں کا قول ہے کہ جس طرح اصلی دوستی دنیا میں ناپید ہے اسی طرح آپس کا اتفاق بھی ناممکن ہے۔ ان کی دلیل یہ ہے کہ تمام انسانوں کی طبائع اور ان کے اغراض مختلف ہیں تو ضرور ہے کہ وہ ایک دوسرے کے مخالف ہوں۔ کوئی قوم مہذب یا نامہذب ایسی نہیں پائی جائے گی جس میں باہم حسد و نفاق، عداوت اور باہمی حقارت نہ پائی جاتی ہو۔ ہاں! یہ بات سچ ہے مگر جس اتفاق پر ہم بحث کرتے ہیں وہ شخصی اتفاق نہیں بلکہ قومی اتفاق ہے! ہمارے آپس میں بمقتضائے بشریت گو کیسا ہی نفاق ہو، جو خدا کے نزدیک ایک سخت گناہ ہے مگر وہ قومی اتحاد اور قومی اتفاق کا مانع نہیں ہے۔ قومی بھلائی یا قومی برائی کا اثر تمام قوموں کے لوگوں پر پہنچتا ہے، اس لیے جلب منفعت یا دفع مضرت میں سب لوگ متفق ہو جاتے ہیں اور شخصی تنازعات کا اس وقت کچھ اثر باقی نہیں رہتا ہے۔

اس زمانے میں جو سب سے بڑا سبب ہماری قوم کے تنزل کا ہے وہ یہی ہے کہ ہم میں قومی اتفاق کا خیال نسیاً منسیاً ہو گیا ہے۔ کسی کو بجز ذاتی منفعت کے قومی بھلائی یا قومی منفعت کا خیال بھی نہیں آتا ہے۔ اگر کوئی کچھ کرتا بھی ہے تو پہلے اس کو اپنی ذاتی غرض مدنظر ہوتی ہے اور قومی بھلائی کے پردے سے اس کی پردہ پوشی کرنا چاہتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ہمارے کاموں میں برکت نہیں ہوتی۔

میں یہ نہیں کہتا کہ ہماری قوم میں نیکی کا خیال نہیں ہے۔ نہیں! ان میں بہت کچھ نیکی ہے اور بہت سے نیک کام ان سے ہوتے ہیں۔ کیسی کیسی عالیشان مسجدیں، کیسے کیسے عالیشان امام باڑے، کیسی کیسی نفیس خانقاہیں ان کی نیکی کی یادگاریں موجود

باقی صفحہ نمبر ۷ پر

سید احمد خاں مرحوم

مسلمانوں کا افلاس

"الشیطان یعدکم الفقر و یامرکم بالفحشاء واللہ یعدکم مغفرۃ منہ و فضلا"

(تہذیب الاخلاق بابت ۱۵ شوال ۱۲۹۱ھ)

خدا تعالیٰ فرماتا ہے کہ تم کو محتاج اور فقیر کردینے کا تو شیطان وعدہ کرتا ہے اور بے پنے کے کام کرنے کا حکم دیتا ہے، اور خدا اپنی بخشش کا اور نعمت دینے کا وعدہ کرتا ہے: اس زمانے میں یہ ٹھیک مثل ان لوگوں کی ہے جن کا پیشہ یقولون ما لا یفعلون ہے۔ یعنی خود تو دنیا کے بندے ہیں اور کسی مرید و معتقد کی نذر تک نہیں چھوڑتے مگر زبان سے دنیا کی بے ثباتی اور دنیا کا ہیچ ہونا کہتے ہیں، اپنی جیب میں دنیا بھرتے ہیں اور لوگوں کو اس کے چھوڑنے کی نصیحت کرتے ہیں۔ جو کام مسلمانوں کی بھلائی و بہتری اور ترقی کو سوچا جاتا یا کیا جاتا ہے، یہ عقل کے دشمن خدا کے دشمن، رسول کے دشمن، مسلمانوں کے دشمن' ایک نہایت مسکینی سے ٹھنڈے سانس بھر کر کہتے ہیں۔ ہاں دنیا چند روزہ ہے، دولت مند ہوئے تو کیا، غریب ہوئے تو کیا۔ محل میں بھی گزر جاتی ہے، درخت کے سائے میں بھی گزر جاتی ہے، موٹے کپڑے سے بھی بدن ڈھک جاتا ہے پھٹے میں بھی سمٹ جاتا ہے۔ اچھا کھانے سے بھی پیٹ بھرتا ہے جو کی روٹی سے بھی بھرتا ہے، ایسی بات کرو جو وہاں کام آئے۔ دنیا تو گزر ہی جاتی ہے۔ ہاں جتنی دنیا ہوگی اتنا ہی حساب دینا پڑے گا۔ تقدیر پر شاکر رہو۔ انسان کو خدا بھوکا اُٹھاتا ہے پر بھوکا سلاتا نہیں۔ یہ لوگ حقیقت میں اس آیت کے مصداق ہیں اور وہ ٹھیک وہی وعدہ کرتے ہیں جس کا اس آیت میں ذکر ہے

مگر ہم تمام مسلمانوں کی دین دنیا کی بھلائی چاہتے ہیں، یہ خواہش کرتے ہیں کہ احکام شریعت حقہ کے بجا لادیں ممنوعات اور محرمات سے بچیں، مباح کے مزے اڑادیں نیک طریقے اور اچھے پیشے اور مباح وسیلوں سے دنیا کمادیں اور پھر جس طرح خدا کی مرضی ہے نیک کاموں میں اس کو صرف کریں کہ یہی مرضی خدا کی اور یہی حکم شریعت مصطفیٰ کا ہے۔

مگر نہایت افسوس ہے کہ مسلمانوں کا حال روز بروز بدتر ہوتا جاتا ہے۔ مفلسی ان کو گھیرے جاتی ہے۔ جرائم میں وہ مبتلا ہوتے ہیں یا جیل خانے ان سے بھرے جاتے ہیں۔ بید میں ان کے چوتڑوں پر لگتی ہیں، ڈگریوں میں وہ پکڑے جاتے ہیں، جائیدادیں ان کی فروخت ہوتی جاتی ہیں، مگر وہ بے رحم ان کے حال پر رحم نہیں کرتے اور ان کو بہکانے سے باز نہیں آتے۔ وہ اپنے اس قول پر قبر تک لاغوینھم الی یوم الدین جمے ہوئے ہیں اور ثابت قدم ہیں۔ حال کے ایک انگریزی اخبار (انڈین پبلک اوپینین لاہور) میں مسلمانوں کا حال

چھپا ہے ۔ اس کا ماحصل اس مقام پر لکھتے ہیں۔ شاید مسلمان متنبہ ہوں۔

اخبار مذکور نے مسلمانوں کے حالات پر غور کر کر یہ اصول قائم کیا ہے کہ "اس زمانہ میں مسلمانوں کو ضرور مفلس ہونا چاہیے، مسلمان کسانوں کا بتدریج مفلس ہونا جس کو ہم اس ضلع میں زیادتی مقدمات کا ایک سبب قرار دے چکے ہیں قابل لحاظ اور غور کے ہے جو رپورٹیں اور حالات کہ اخبار میں چھپے ہیں ان سب سے پایا جاتا ہے کہ عام ہندوستان میں یہ افلاس ترقی پر ہے ۔ اس ضلع میں ۱۸۷۳ء میں جتنی نالشیں نقدی کی مہاجنان و دوکانداران نے کیں ان میں سے نصف نالشیں مسلمان کسانوں پر ہوئیں اور بمقابلہ کل مقدمات قسم مذکور کے بحساب اوسط فی صدی چونتیس مقدمے ہوتے ہیں۔ جب ہم یہ بات دیکھتے ہیں کہ منجملہ آٹھ شخصوں کے ایک شخص بحساب اوسط عدالت کی لڑائی میں مشغول رہتا ہے تو تعداد ان کسانوں کی خیال کرنی چاہیے کہ کتنے لوگ روپے پیسے کے معاملات میں مبتلا ہو کر عدالت کی لڑائی میں حیران و پریشان رہتے ہیں۔ رجسٹرار جنرل پنجاب کی اخیر رپورٹ سے معلوم ہوتا ہے کہ تیرہ لاکھ اسی ہزار پونڈ یعنی ایک کروڑ اڑتیس لاکھ روپے کی جائداد غیر منقولہ مسلمانوں کی ۱۸۷۳ء میں بیع در رہن ہوئی۔ مسلمانوں کا مذہب صرف لڑائی اور لوٹ مار کے مناسب ہے ۔ تقدیر پر اندھا دھندی سے اعتبار و تکیہ کرنا جیسا کہ یہ مذہب سکھاتا ہے اور اس کے معتقدوں کو خوش خوش ایسے موقع کی طرف لے جاتا ہے جس میں یقینی بربادی کا سامان ہوتا ہے اور کوئی مذہب نہیں سکھاتا۔ مگر یہی خیال کہ تقدیر کبھی نہیں ٹلتی تمام جرأت اور ہمت کو کھو دیتا ہے اور ترقی و بہبود کو پژمردہ کر ڈالتا ہے۔"

تقدیر کے مسئلے کی نسبت جو کچھ صاحب اخبار نے لکھا ہے اس میں شک نہیں کہ موجودہ مسلمانوں کی حالت ایسی ہی ہے اور خود غرض لالچی مولویوں نے درحقیقت ایسا ہی ان کو سکھلایا ہے۔ الا مذہب اسلام کا یہ مسئلہ نہیں ہے خود قرآن مجید میں خدا فرماتا ہے

"لیس للانسان الا ماسعی"

ایک دوسرے اخبار مدراس ٹائمز نے مسلمانوں کی موجودہ حالت کی نسبت نہایت عمدہ مضمون لکھا ہے، اس کو بھی ہم لکھتے ہیں۔ وہ لکھتا ہے کہ مسلمان یورپوں کے بادشاہوں کے مشابہ ہیں جو نہ گذشتہ بات کو بھولتے ہیں اور نہ کسی بات کو جو آئندہ اُن کے لیے مفید ہو سیکھتے ہیں۔ یہ لوگ ہر بات میں ساکن رہتے ہیں۔ حرکت کرنے کی کبھی اُن کو خواہش نہیں ہوتی۔ یہ لوگ دوڑ میں پیچھے پڑ گئے اور گو ممکن ہے کہ بڑی کوشش سے اوروں کے برابر جاویں، مگر وہ کوشش کرنے کی خواہش ان کو معلوم نہیں ہوتی اور نتیجہ اس کا یہ ہوگا کہ بلحاظ قومیت اور مرتبہ و اختیار کے مسلمان بالکل گم ہو جائیں گے۔ اب یہ لوگ گویا اپنے امتحان پر ہیں اور اگر چوکے تو ممکن نہیں کہ دوسرا موقع ان کو مل سکے ۔ یہ تسلیم کرنا چاہیے کہ ان لوگوں کی حالت عجیب ہے۔ یہ لوگ سابق میں اس ملک کے فتح کرنے والے تھے اور اب ان کو مفتوحوں میں اپنا شمار ہونے کا بالطبع رنج ہوتا ہے۔ مذہبی تعصب اور غرور اور تعلیم کا جھوٹا خیال مسلمانوں کو اپنی ترقی کے اس میدان میں پیر رکھنے سے باز رکھتا ہے جس میدان کو انھیں طے کرنا ضرور ہے، بلیشتر اس کے کہ بمقابلہ اپنے ہوشیار ہمسایہ ہندوؤں کے نوکری یا اپنی روٹی پیدا کرنے کی امید کریں۔ جو قوم کہ تھوڑا عرصہ گزرا اُن کے تابع تھی،

علی گڑھ مسلم یونیورسٹی علی گڑھ

اشتہار نمبر ۸۳-۸۲ / ۱۶

مندرجہ ذیل اسامیوں کے لیے مقررہ فارموں پر درخواستیں مطلوب ہیں جو امیدوار ایک سے زائد اسامیوں کے لیے امیدوار ہوں ان کو چاہیے کہ وہ ہر پوسٹ کے لیے الگ الگ درخواست دیں۔

ا ۱۔ پوسٹ گریجویٹ ٹیچر (جیوگرفی) مستقل۔

شرح تنخواہ ۵۵۰-۲۵-۶۵۰-۳۰/ای بی-۳۰-۹۰۰ روپیہ اور دیگر الاؤنس

استعداد

۱۔ لازمی جغرافیہ میں ماسٹر ڈگری اور

(ا) تعلیمات میں منظور شدہ ڈگری یا ڈپلومہ

یا

ب انٹرمیڈیٹ یا اعلیٰ کلاسس میں تدریس کا تین سالہ تجربہ

یا

ج انگریزی اور غیر ملکی زبانوں کے مرکزی انسٹی ٹیوٹ (حیدرآباد) سے انگریزی کی تدریس کا ڈپلومہ

۲۔ پسندیدہ کسی ہائی / ہائر سکنڈری اسکول یا کالج میں انگریزی، اردو و ہندی کے ذریعہ اس مضمون کو پڑھانے کی اہلیت اور مناسب تجربہ

۲ پوسٹ گریجویٹ ٹیچر (انگریزی) سٹی ہائی اسکول (عارضی)

شرح تنخواہ:- ۵۵۰-۲۵-۶۵۰-ای بی-۳۰-۹۰۰ روپیہ معہ دیگر الاؤنس

استعداد:-

لازمی: اس مضمون میں ماسٹر ڈگری اور

(ا) تعلیمات میں منظور شدہ ڈگری یا ڈپلومہ یا

ب ۔ انٹرمیڈیٹ یا اعلیٰ کلاسیز میں تدریس کا تین سالہ تجربہ

یا

ج ۔ حیدرآباد کے انگریزی اور غیر ملکی زبانوں کے مرکزی انسٹی ٹیوٹ سے انگریزی تدریس کا ڈپلومہ

پسندیدہ :۔ ہائی / ہائر سکنڈری کلاسوں میں اس مضمون کو پڑھانے کا تجربہ اور اہلیت

۳۔ پوسٹ گریجویٹ ٹیچر (میتھمیٹکس) گرلس ہائی اسکول (عارضی)

۴۔ پوسٹ گریجویٹ ٹیچر (میتھمیٹکس) سٹی ہائی اسکول (عارضی)

شرح تنخواہ :۔ ۵۵۰ ۔ ۲۵ ۔ ۷۵۰ ۔ EB ۳۰ ۔ ۹۰۰ روپیہ اور دیگر الاؤنس

استعداد :۔

لازمی ۔ میتھمیٹکس میں ایم ایس سی اور

ا ۔ تعلیمات میں منظور شدہ ڈگری یا ڈپلومہ

یا

ب ۔ انٹرمیڈیٹ یا ہائی اسکول کلاسیز کو پڑھانے کا تین سالہ تجربہ

پسندیدہ :۔ کسی کالج یا ہائر سکنڈری یا ہائی اسکول میں اعلیٰ کلاسیز کو انگریزی، اردو یا ہندی کے ذریعہ پڑھانے کی اہلیت اور مناسب تجربہ

۵ ۔ پوسٹ گریجویٹ ٹیچر (بائیولوجی) سٹی ہائی اسکول (مستقل)

شرح تنخواہ ۔ ۵۵۰ ۔ ۲۵ ۔ ۷۵۰ ۔ EB ۳۰ ۔ ۹۰۰ روپیہ اور دیگر الاؤنس

استعداد :

لازمی :۔ مندرجہ ذیل میں سے کوئی ایک

۱ ۔ میڈیسن میں گریجویٹ

۲ ۔ باٹنی یا زولوجی میں ایم ایس سی ۔ اور بی ایس سی باٹنی یا زولوجی بحیثیت ایک مضمون کے ساتھ

۳ ۔ دہلی یونیورسٹی سے باٹنی یا زولوجی میں ڈپلومہ

پسندیدہ :۔ تعلیمات میں منظور شدہ ڈگری یا ڈپلومہ

۶ ۔ پوسٹ گریجویٹ ٹیچر (کیمسٹری) گرلس ہائی اسکول (عارضی لیکن مستقل ہونے کی امید)

شرح تنخواہ :۔ ۵۵۰ ۔ ۲۵ ۔ ۷۵۰ EB ۳۰ ۔ ۹۰۰ روپیہ اور دیگر الاؤنس

استعداد :

لازمی ۔ اس مضمون میں ماسٹرس ڈگری یا متعلقہ مضمون میں دہلی یونیورسٹی سے پوسٹ گریجویٹ ڈپلومہ

یا

میٹریکولیشن کرنے کے بعد اور کم از کم چھ سال تک استاذی کرنے کے بعد کسی منظور شدہ یونیورسٹی سے بائیو کیمسٹری میں ایم ایس سی ڈگری (صرف کیمسٹری کے اساتذہ کے لیے)

پسندیدہ:۔ کسی کالج یا ہائی / ہائر سکنڈری اسکول میں انگریزی، اردو اور ہندی کے ذریعہ پڑھانے کی اہلیت اور مناسب تجربہ

۔ پوسٹ گریجویٹ ٹیچر (اردو) گرلس ہائی اسکول (عارضی لیکن مستقل ہونے کی توقع)

شرح تنخواہ۔ ۵۵۰۔ ۲۵۔ ۶۵۰۔ ای بی ۳۰۔ ۹۰۰ روپیہ اور دیگر الاؤنس۔

اہلیت:

لازمی:۔ اس مضمون یا اس سے متعلق کسی مشرقی زبان میں ایم اے

یا

اردو آنرز اور انگریزی میں انٹرمیڈیٹ

یا

ادیب کامل (جامعہ اردو علی گڑھ) اور صرف انگریزی میں بی اے

پسندیدہ:۔ کسی کالج یا ہائی / ہائر سکنڈری کلاسیز میں اس مضمون کو پڑھانے کی اہلیت اور مناسب تجربہ

۔ ٹرینڈ گریجویٹ ٹیچر گرلس ہائی اسکول (عارضی لیکن مستقل ہونے کی توقع)

شرح تنخواہ:۔ ۴۴۰۔ ۲۰۔ ۵۰۰۔ ای بی ۲۵۔ ۷۰۰۔ ای بی ۲۵۔ ۷۵۰ روپیہ اور دیگر الاؤنس۔

استعداد:۔

۱۔ لازمی:۔ یونیورسٹی ڈگری (ہندی یا مضمون کی مناسبت سے کوئی جدید ہندوستانی زبان) یا ڈگری کے متبادل متعلقہ جدید ہندوستانی زبان میں السنہ مشرقیہ کی کوئی تسلیم شدہ ڈگری۔

۲۔ متعلقہ جدید ہندوستانی زبان میں آنرز اور انگریزی میں میٹرکولیشن۔

۳۔ جامعہ اردو علی گڑھ سے ادیب ماہر اور صرف انگریزی میں انٹرمیڈیٹ

پسندیدہ:۔ کسی کالج یا ہائی / ہائر سکنڈری اسکول کی کلاسیز میں اس مضمون کو پڑھانے کا تجربہ اور اہلیت۔

۹۔ ٹرینڈ گریجویٹ ٹیچر (انگریزی) گرلس ہائی اسکول (عارضی)

شرح تنخواہ:- ۴۴۰-۲۰-۵۰۰-EB-۲۵-۷۰۰-EB-۲۵-۷۵۰ روپیہ اور دیگر الاؤنس

استعداد:

i۔ لازمی:- اس مضمون/زبان میں بیچلر ڈگری اور تعلیمات میں تسلیم شدہ ڈگری/ڈپلومہ

ii۔ پسندیدہ:- کسی کالج یا ہائی/ہائر سکنڈری اسکول کی کلاسیز میں اس مضمون کو پڑھانے کا تجربہ اور مناسب قابلیت

۱۰۔ ٹرینڈ گریجویٹ ٹیچر (سائنس) سٹی ہائی اسکول (عارضی)

شرح تنخواہ:- ۴۴۰-۲۰-۵۰۰-EB-۲۵-۷۰۰-EB-۲۵-۷۵۰ روپیہ اور دیگر الاؤنس

استعداد:-

(i) لازمی:- میتھمیٹکس، فزکس اور کیمسٹری کے مضامین لے کر بیچلرس ڈگری اور تدریس میں ڈگری/ڈپلومہ

یا

فزکس، کیمسٹری، میتھمیٹکس میں بی ایس سی اور ریجنل کالج آف ایجوکیشن، این سی ای آر ٹی سے بی ایڈ۔

ii پسندیدہ:-

کسی کالج یا ہائی/ہائر سکنڈری اسکول کی کلاسیز میں اس مضمون کو پڑھانے کا تجربہ اور مناسب اہلیت۔

۱۱۔ ٹرینڈ گریجویٹ ٹیچر۔ گرلس ہائی اسکول (عارضی)

شرح تنخواہ:- ۴۴۰-۲۰-۵۰۰-EB-۲۵-۷۰۰-EB-۲۵-۷۵۰ روپیہ اور دیگر الاؤنس

استعداد:

۱۔ لازمی:- انگریزی ادبیات کے ساتھ جغرافیہ میں بی اے (آنرز)

۲۔ تعلیمات میں ڈگری/ڈپلومہ

پسندیدہ:- کسی کالج یا ہائی/ہائر سکنڈری اسکول کی کلاسیز میں اس مضمون کو پڑھانے کا تجربہ اور مناسب اہلیت

۱۲- ٹرینڈ گریجویٹ ٹیچر (ایگریکلچر) سٹی ہائی اسکول (عارضی)
شرح تنخواہ:- ۴۴۰- ۲۰- ۵۰۰- EB- ۲۵- ۷۰۰- EB- ۲۵- ۷۵۰ روپیہ
اور دیگر الاؤنس

استعداد:-

I- لازمی- بی-ایس سی (ایگریکلچر) ٹرینڈ ہو تو قابل ترجیح۔
II اردو اور انگریزی کے ذریعہ پڑھانے کی اہلیت

۱۳- کرافٹ ٹیچر- احمدی اسکول برائے نابینا (مستقل)
شرح تنخواہ:- ۴۴۰- ۲۰- ۵۰۰- EB- ۲۵- ۷۰۰- EB- ۲۵- ۷۵۰ روپیہ
اور دیگر الاؤنس

استعداد:-

بنائی میں تسلیم شدہ ڈگری/ڈپلومہ اور کسی سکنڈری اسکول یا تسلیم شدہ ٹیکنکل انسٹی ٹیوٹ میں تدریس کا تجربہ۔ اگر کوئی امیدوار بنائی کی مکمل معلومات کے ساتھ بینائی سے معذور بچوں کو یہ فن سکھانے اور بتانے کی اہلیت رکھتا ہو تو اس کے سلسلہ میں متعلقہ استعداد میں نرمی کی جا سکتی ہے۔

۱۴- پرائمری ٹیچر- گرلس ہائی اسکول (ایک مستقل اور ایک عارضی اسامی لیکن مستقل ہونے کی توقع)
شرح تنخواہ:- ۳۳۰- ۱۰- ۳۵۰- EB- ۱۰- ۳۸۰- ۱۲- ۵۰۰- EB- ۱۵- ۵۶۰- روپیہ اور دیگر الاؤنس۔

استعداد:-

لازمی:- میٹرک ٹرینڈ۔
پسندیدہ چھوٹے بچوں کو پڑھانے کی اہلیت
غیر معمولی تجربہ اور قابلیت کے حامل امیدواروں کو ابتدا ہی سے اعلیٰ تنخواہ سے شروعات کی جا سکتی ہے۔

جن امیدواروں کو انٹرویو کے لیے طلب کیا جائے گا انھیں ریلوے کا یکطرفہ سکنڈ کلاس کا کرایہ بطور T.A. ادا کیا جائے گا۔
متعلقہ فارم اور ہدایات اسسٹنٹ رجسٹرار (سلیکشن کمیٹی) کے دفتر سے دو روپیہ

نقد ادائیگی (جو مسلم یونیورسٹی کے کیش سیکشن، فائننس آفس میں جمع ہوگی)

یا

اسی قیمت کے پوسٹل آرڈر (جو مسلم یونیورسٹی کے فائننس آفیسر کے نام واجب الادا ہوں) دینے پر ذاتی طور پر یا بذریعہ ڈاک حاصل کیا جاسکتا ہے

ڈاک سے فارم منگوانے کی صورت میں 23 x 10 cm سائز کا خود کا پتہ لکھا ہوا لفافہ بھیجنا ضرور ہوگا۔

درخواست فارم وصول ہونے کی آخری تاریخ ۲۸ فروری ۱۹۸۳ء ہے

نامکمل اور تاخیر سے موصول ہونے والی درخواستوں پر غور نہ کیا جائے گا۔

ضمیر احمد خاں

رجسٹرار

پرنٹر، پبلشر قاضی معزالدین احمد نے لیتھو کلر پرنٹرس علی گڑھ میں چھپوا کر مصدر منزل تار بنگلہ اے ایم یو علی گڑھ سے شائع کیا

Ramu topped in exam
I didn't
Poor performance in the class damages his self-confidence
He can surely regain self confidence if parents care to
give him two slices of bread everyday with
DIMAGHEEN
A nourished mental tonic
Dawakhana Tibbiya College
ALIGARH MUSLIM UNIVERSITY, ALIGARH-202001
Phone : 3629 Gram : "DAWAKHANA

کیا
آپ کی روزانہ کی خوراک سے
آپ کے بدن کو پوری قوت اور
پورا فائدہ ملتا ہے؟

سنکارا ہی ایک ایسا ٹانک ہے جس میں
طاقت دینے والے ضروری وٹامنوں اور معدنی
اجزا کے ساتھ چھوٹی الائچی، لونگ، دھنیا،
دارچینی، تیزپات، تلسی وغیرہ جیسی جڑی بوٹیاں
شامل ہیں۔ اس مرکب سے آپ کے
نظامِ ہضم کو طاقت ملتی ہے اور آپ کا بدن
اس کی مدد سے آپ کی روزمرہ خوراک سے
صحیح تغذیہ اور بھرپور قوت حاصل کرتا ہے۔

جلد نمبر ۲   یکم مارچ ۱۹۸۳ء   شمارہ نمبر ۵

"میں مسلمانوں کا اس قدر مشکور نہیں ہوں جس
قدر ہندوؤں کا ہوں جنھوں نے بطور خیرات کے اپنے
بھائیوں کی مدد کی۔ مدرسہ کی عمارات کی دیواروں اور
محرابوں پر بہت سے ہندوؤں کے نام کندہ ہیں جس سے
ہمیشہ کو یہ یادگار قائم رہے گی کہ ہندوؤں نے اپنے
درماندہ مسلمان بھائیوں کی کس فیاضی سے مدد کی تھی"

(سر) سید احمد

خودسوزی [دوسری قسط]	سیّد حامد
اسلام میں مظلوم کے حقوق	سیّد جلال الدین عمری
ادرک کی تاریخی و طبی اہمیت	حکیم احسان اللہ
علی گڑھ چند یادیں	ضیاء احمد بدایونی
عبد الرحمٰن حیرت ۔ سرسیّد کے ایک قریبی ساتھی ۔	فرخ جلالی

فی پرچہ ایک روپیہ ششماہی ۱۱ روپے
سالانہ ۲۰ روپے

بیرون ہند سے
فی پرچہ ایک ڈالر سالانہ ۱۵ ڈالر

ترسیل و خط و کتابت کا پتا

قاضی معز الدین احمد
صفدر منزل ۔ تارنگر ۔ اے ایم یو ۔
علی گڑھ ۔ یوپی (202001)

پندرہ روزہ

تہذیب الاخلاق

علی گڑھ

مُدیر: سید حامد وائس چانسلر
علی گڑھ مُسلم یونیورسٹی

مُدیر مسئول: قاضی معز الدین احمد

جلد نمبر ۲ یکم مارچ ۱۹۸۳ء شمارہ نمبر ۵

خودسوزی

(گذشتہ سے پیوستہ)

پہلی قسط میں ہم نے اس مکروہ رسم کا ذکر کیا تھا، جس نے لاکھوں گھروں میں اندھیرا کر رکھا ہے لڑکی کیا پیدا ہوئی، ماں باپ کے لیے فکروں کا ختم نہ ہونے والا سلسلہ شروع ہو گیا۔ صرف پالنے پوسنے کی بات ہوتی تو غریبی کے باوجود کام چل جاتا۔ لیکن پال پوس کر، پڑھا لکھا کر بڑا کر دینے کے بعد کیا کریں گے۔ لالچی لڑکے اور ان سے زیادہ لالچی ان کے ماں باپ منھ پھاڑے ہوئے نظر آئیں گے۔ جہیز مانگیں گے۔ جہیز کے معنیٰ وہ ضروری سامان نہیں جو والدین شادی کے وقت بیٹی کے ساتھ خوشی خوشی کر دیتے ہیں کہ اسے گھر جمانے میں مدد ملے اور میکہ کی نشانیاں اس کے پاس رہیں۔ اپنی وسعت بھر بلکہ اس سے زیادہ امنگوں اور ارمانوں کے ساتھ بیٹی کو جہیز دیتے ہیں۔ اب جہیز کے معنیٰ دوسرے ہو گئے ہیں۔ لڑکے بلکہ اس کے والدین کو ان کے مانگنے پر بدرجہ مجبوری ایک بڑی رقم اس بات کے لیے دینا کہ ہم نے تمہاری بیٹی کو بادلِ ناخواستہ اپنی کنیز بنانا منظور کر لیا ہے۔ اس سے بڑی اہانت عورت ذات کی ہو نہیں سکتی۔ وہ ایسا کھوٹا سامانِ تجارت بن گئی ہے جسے پیسہ دے کر نہیں پیسہ لے کر خریدا جاتا ہے جب تک اس کا رشتہ طے نہیں ہوتا، اس کے ماں باپ اور بھائیوں کی جان سولی پر رہتی ہے۔ اس غریب کی حیثیت گویا ملبہ کی سی ہے کہ جو لوگ اسے اٹھا کر لے جاتے ہیں انھیں ملبہ کے ساتھ پیسہ دیا جاتا ہے۔ ورنہ ملبہ اٹھانے کی تکلیف کون گوارا کرے۔ جہاں سیانی ہوئی اسے خود اس کا احساس ہونے لگتا ہے کہ اس کے منحوس وجود نے ماں باپ کی نیندیں حرام کر دی ہیں۔ بھائی اور بھاوج الگ پریشان ہیں۔ ایسی صورت میں اس کی اٹھان اور نشو و نما کیا ہو گی۔ اپنی عزت نفس، طمانیت اور خوشی کو وہ کیونکر محفوظ رکھ سکے گی۔ اس کے ماں باپ اسے سامانِ تجارت کی طرح لے کر گھر گھر دکھائیں گے۔ گھمنڈی لڑکے جن کی نہ صورت نہ شکل، نہ شخصیت نہ اہلیت اور لالچی ماں باپ جو لڑکے

کو استحصال کا ذریعہ سمجھتے ہیں، اس بے چاری لڑکی کو چاندی کے گز سے ناپیں گے اور بے دردی سے رد کردیں گے۔ حساس لڑکیاں یہ رسوائی اور ماں باپ کی یہ تکلیف کیسے برداشت کرتی ہوں گی۔ ان کی جان پر بنی رہتی ہوگی۔ چنانچہ ایسی مثالیں بھی ہیں کہ بعض لڑکیوں کے ہاتھ پیلے کبھی نہ ہو پائے انھوں نے اس کرب اور فشار سے تنگ آکر خودکشی کرلی۔ زمین پر بوجھ بن کر وہ رہنا نہیں چاہتی تھیں زندگی بھر سلگتی رہیں اور چتا میں جل کر راکھ ہوگئیں۔ جیسے ندی اور بالآخر سمندر نے اپنے فراخ بازوؤں میں لے لیا۔

یہ دور اہلکاروں کا دور ہے جنھیں انگریزی میں بیوروکریسی کہا جاتا ہے اور جسے ہندی والوں نے نوکر شاہی کا نام دیا ہے۔ کون سی نوکری کون سا منصب عوام کی نگاہ میں کتنا اہم ہے، اس کا اندازہ شادی کے بازار میں لگتا ہے۔ اگر لڑکا کلرک ہے تو اس کی یہ قیمت ہے، انسپکٹر یا اوورسیر ہے تو یہ اجرت، انجنیر ہے تو یہ بھاؤ، ڈاکٹر ہے تو یہ نرخ، اسٹیٹ سول سروس میں ہے تو یہ شرح، اور انڈین ایڈمنسٹریٹو سروس کا رکن ہے تو یہ دَر۔ یہ تو مقررہ ریٹ ہیں۔ لڑکی والوں سے اس کے علاوہ اور جو کچھ حاصل کیا جاسکے اسے "بھاؤ جانیے"، بونس سمجھیے یا محنتانہ شمار کیجیے۔

بُرائی کو بُرائی سمجھا جائے تو وہ تیزی کے ساتھ نہیں پھیل پاتی۔ لوگ اسے چوری چھپے کرتے ہیں۔ وہ بُرائی جسے رواج کی سند مل جائے وہ آگ کی طرح پھیل جاتی ہے۔ چنانچہ ہمارے سماج میں یہ گھناؤنی رسم ہر طرف جڑ پکڑ گئی ہے۔ وہ نیک بخت جس کا اس طرح سودا ہوا ہے جب لڑکے کی ماں بنتی ہے تو سماج سے اس ظلم اس تحقیر کا بدلہ لے کر رہتی ہے۔ بدلہ یہی کہ "میرے ماں باپ نے مجھے بیاہنے کے لیے جو جہیز دیا تھا، میں اپنے بیٹے کے لیے اس سے کئی گنا لوں گی، دیکھوں گی کیسے نہیں دیتے ہیں" ـــــ برائی کا یہ سلسلہ جو ہر نئے سودے کے ساتھ اور زور پکڑتا ہے، الٰہی کس طرح ختم ہوگا

اِنسان مظلوم ہے لیکن قضا و قدر سے زیادہ خود اپنا۔ وہ ظالم ہے اور جاہل ہے۔ ظلم کرتا ہے اور بے خبر رہتا ہے۔ اس کیفیت کو چاہے بے خبری کہیے چاہے جہالت اسے نہیں معلوم کہ جہیز مانگ کر وہ کتنا بڑا ظلم کرتا ہے۔ وہ اپنی ماں کو خوار اور رسوا کرتا ہے۔ اس ماں کو جس کی کوکھ سے اس نے جنم لیا ہے۔ وہ عورت کو یہ جتاتا ہے کہ وہ ماں نہیں کنیز ہے اور ایسی کنیز جس کو اس لیے گوارا کیا جاتا ہے کہ وہ اپنے ساتھ روپیہ لے کر آتی ہے۔ وہ روپیہ لے کر نہ آتی تو کون اسے گھر میں گھسنے دیتا۔ شرمناک برتاؤ صرف اس لیے کہ عورت کمزور ہے اور مرد مضبوط۔ اور جو کمزوری سے فائدہ نہ اُٹھائے وہ بے وقوف ہے اور جو کمزور کو نہ ٹھکرائے اسے شہ زور نہیں کہتے۔ جو بے بسوں پر ظلم نہ کرے وہ بزدل۔

ہم نے کہا تھا کہ یہ رسم ہمارے ہندو بھائیوں تک محدود ہے ـــــ تو اب تک جا ہے تو یہ بات صحیح نہیں۔ پہلے تو یہ کہ سب ہندوؤں میں اس کا چلن نہیں۔ کچھ ذاتیں اس بُری رسم سے بچی ہوئی ہیں۔ دوسرے یہ کہ آج کل مسلمان بھی اس کی لپٹ سے جھلسے ہوئے نظر آتے ہیں۔ لیکن ان کے یہاں یہ رسم ہنوز عام نہیں۔ کچھ غیرت دریدہ اور اخلاق باختہ اور ہوس پیشہ لوگوں کو چھوڑ کر جنھیں مانگنے میں عار نہیں، باقی مسلمان اس وبا سے ایک حد تک محفوظ ہیں کب تک محفوظ رہیں گے یہ ایک تشویش ناک سوالیہ نشان ہے جس کا تذکرہ اس مضمون کی آخری قسط میں ہوگا۔

باقی آئندہ

سید حامد

سید جلال الدین عمری
مدیر "تحقیقاتِ اسلامی" علی گڑھ

آخری قسط

اسلام میں مظلوم کے حقوق

ق کے ادا کرنے میں ٹال مٹول کرنا ظلم ہے۔

ایک انسان دوسرے کا حق ادا کرنے میں
ملت اور کوتاہی کرے یا اپنے جائز حق سے زیادہ کا اس
مطالبہ کرے تو اس پر ظلم کرتا ہے۔ اس پر اگر بندش نہ
ئی جائے تو ظلم کا دائرہ وسیع سے وسیع تر ہو سکتا ہے
سلام اس رویہ کو غلط اور ناجائز ٹھہراتا ہے اور اسے
ختی سے روکتا ہے۔ حضرت ابو ہریرہؓ کی روایت ہے کہ
ول اللہ صلی اللہ علیہ نے فرمایا:

یہ "مال دار کا ٹال مٹول کرنا ظلم ہے (اس کی ایک
مسلمان سے توقع نہیں کی جا سکتی اس لیے)
جب تم میں سے کسی کو کسی مالدار کے پیچھے بھیجا
جائے (قرض کے سلسلہ میں اس کا حوالہ دیا
جائے) تو وہ اس کے پیچھے جائے (حوالہ
قبول کرے)"[1]

حدیث میں 'مطل' کا جو لفظ آیا ہے اس کے
کسی حق کی ادائیگی میں ٹال مٹول اور تاخیر کے ہیں۔ امام
قاضی عیاض وغیرہ کے حوالے سے کہتے ہیں۔

یہ "جس حق کا ادا کرنا ضروری ہو جائے اس
کے ادا کرنے سے انکار کرنا ہے"[2]

حدیث کا مطلب یہ ہے کہ جو شخص صاحبِ
حیثیت ہے اس کے لیے حقوق کی ادائیگی میں تاخیر ناروا
ہے۔ اس لیے کہ اس کی طرف سے تاخیر کی کوئی معقول وجہ
نہیں ہو سکتی۔ حق کا ادا نہ کرنا ہی ظلم نہیں ہے بلکہ بلا وجہ
اس میں ٹال مٹول بھی ظلم ہے۔ امام نووی فرماتے ہیں

اس حدیث کی رو سے کسی غنی اور تونگر
شخص کا حق دار کو حق ادا نہ کرنا ظلم اور
حرام ہے[3]

حق کے ادا کرنے میں ٹال مٹول کرنے والا فاسق ہے۔

جو شخص بغیر کسی عذر کے قرض یا کسی بھی حق کے ادا
کرنے میں دانستہ تاخیر کرے علماء نے اسے فاسق کہا ہے
امام نووی فرماتے ہیں

امام مالکؒ کے تلامذہ کے درمیان اس مسئلہ میں
اختلاف رہا ہے اور دوسرے لوگوں کے درمیان بھی کہ اگر
کوئی شخص ایک مرتبہ بھی قرض کی ادائیگی میں ٹال مٹول کرے
تو کیا اسے فاسق سمجھا جائے گا جب کہ بار بار اس سے
یہ حرکت سرزد نہ ہو۔ شوافع کے مسلک کا تقاضا تو یہ ہے

ی کتاب الاجارہ، باب الحوالہ، مسلم کتاب المساقاۃ والمزارعۃ باب تحریم مطل الغنی [2] فتح الباری ۴/۳۶۲ [3] شرح مسلم ۱۰/۱۸۱

کہ دوسری صورت میں اسے فاسق قرار دیا جائے۔[1]

لیکن علامہ سبکی کہتے ہیں شوافع کے مسلک کا تقاضہ بالکل دوسرا ہے۔ اس کا تقاضہ تو یہ ہے کہ ایسے شخص کو فاسق قرار دیا جائے اور اس کی شہادت قبول نہ کی جائے۔ اس کی دلیل انھوں نے یہ دی ہے کہ مطالبہ کے باوجود کسی کا حق ادا نہ کرنا غصب ہے اور غصب گناہِ کبیرہ ہے پھر یہ کہ اسے حدیث میں ظلم کہا گیا ہے یہ خود بھی اس کے گناہِ کبیرہ ہونے کی دلیل ہے۔ گناہ کبیرہ کے بارے میں یہ شرط نہیں ہے کہ وہ کسی سے بار بار سرزد ہو تب ہی اسے فاسق قرار دیا جائے۔ ہاں یہ ضروری ہے کہ اس کے فاسق ہونے کا فیصلہ اس وقت کیا جائے گا جب کہ یہ صاف اور صریح طور پر معلوم ہو کہ وہ بغیر کسی عذر کے ٹال مٹول کر رہا ہے[2]

ایک سوال یہ بھی ہے کہ حق کے محض واجب ہو جانے کے بعد اس کا ادا نہ کرنا فسق ہے۔ یا اس کے لیے مطالبہ ضروری ہے؟ حافظ ابن حجر فرماتے ہیں۔ علماء کے درمیان اس مسئلہ میں اختلاف ہے لیکن حدیث میں 'مطل' کا لفظ آیا ہے جو اس بات کی دلیل ہے کہ حق کا نہ ادا کرنا فسق نہیں ہے بلکہ مطالبہ کے بعد بھی اس کا ادا نہ کرنا فسق ہے[3]

حق کے ادا نہ کرنے پر سزا دی جا سکتی ہے۔

کسی کا حقِ واجب قصداً ادا نہ کرنا اور اس میں ٹال مٹول کرنا صریح ظلم ہے۔ اس کے خلاف قانونی کارروائی بھی کی جا سکتی ہے۔ چنانچہ حافظ ابن حجر اس حدیث کے ذیل میں لکھتے ہیں۔

" اس سے ٹال مٹول کرنے والے کو پکڑنے، قرض کی ادائیگی کو اس کے لیے ضروری قرار دینے، ہر ممکن تدبیر سے اس مقصد تک پہونچنے اور زبردستی اس سے قرض واپس لینے پر استدلال کیا گیا ہے۔[4]

ایک حدیث میں یہی بات صراحت کے ساتھ کہی گئی ہے۔ چنانچہ عمرو بن شریدؒ اپنے باپ سے روایت کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا

" جس کے پاس پیسہ موجود ہے وہ حق کی ادائیگی سے مونھ موڑتا ہے تو اس بات کو جائز قرار دیتا ہے کہ اس کی عزت کا خیال نہ کیا جائے اور اسے سزا دی جائے[5]

اس کا مطلب یہ ہے جو شخص استطاعت کے باوجود حق دار کا حق ادا نہ کرے اور اسے مار کھانے کی کوشش کرے تو اس کے ظلم و زیادتی کو دنیا کے سامنے کھولنا جائز ہوگا۔ اس سے اگر سوسائٹی میں اس کا وقار مجروح ہو رہا ہے اور اس کی جھوٹی عزت پر حرف آ رہا ہے تو اس میں کسی دوسرے کا قصور نہیں، خود اس نے اپنی عزت کو نقصان پہونچایا ہے۔ یہی نہیں ریاست کو اس کے خلاف تعزیری کارروائی کا بھی حق ہے اور اسے مناسب سزا دے سکتی ہے۔ چنانچہ حضرت عبد اللہ بن مبارک اس حدیث کی شرح میں فرماتے ہیں

وہ اپنی عزت کو حلال کرتا ہے۔ مطلب یہ کہ اسے ڈانٹ ڈپٹ کی جائے گی اور اس کی سزا سے مراد یہ ہے کہ اسے قید کیا جائے گا۔[6]

---

[1] شرح مسلم ۱۰/۲۲۷ [2] فتح الباری ۴/۲۱۳ [3] ایضاً [4] ایضاً

[5] ابو داؤد، کتاب القضاء، باب فی الدین ہل یحبس لہ نسائی، کتاب البیوع باب مطل الغنی [6] ابو داؤد حوالہ سابق۔

علامہ شوکانی کہتے ہیں، اس حدیث سے یہ استدلال
کیا گیا ہے کہ جو شخص قرض ادا کر سکتا ہو اسے تادیب کے
طور پر اور اس پر سختی کرنے کے لیے قید کیا جا سکتا ہے
یہاں تک کہ وہ قرض ادا کر دے[1]

نادار کا حکم۔

ان احادیث کی بنا پر کہا گیا ہے کہ کسی
دار شخص کی طرف سے حق کے ادا کرنے میں تاخیر ہو تو اسے
لم نہیں کہا جا سکتا۔

چنانچہ حضرت ابوہریرہؓ کی روایت جس میں مالدار
، ٹال مٹول کو ظلم کہا گیا ہے، اس کے ذیل میں امام نووی
تے ہیں

اس سے از خود یہ بات نکلتی ہے کہ اگر کوئی غریب
ر نادار کسی کا حق ادا نہیں کر پا رہا ہے تو اسے ظلم اور
م نہیں کہا جائے گا۔ اس لیے کہ وہ معذور ہے۔ اسی طرح
ب صاحب حیثیت اس لیے تاخیر کر رہا ہے کہ بر وقت
ن کے پاس رقم نہیں ہے یا اور کوئی (معقول) وجہ
، تو اس کی یہ تاخیر بھی جائز ہوگی[2]

یہ بات حدیث سے مفہوم مخالف کے طور
اخذ کی گئی ہے بعض لوگ اس کے قایل نہیں ہیں۔ حافظ
ن حجر فرماتے ہیں "انھوں نے اس کا یہ جواب دیا
، کہ جو شخص قرض ادا نہ کر سکے اسے ٹال مٹول کرنے والا
ہی نہ جائے گا۔ اگر کوئی مالدار شخص بر وقت مال نہ
نے کی وجہ سے کوئی حق ادا نہیں کر پا رہا ہے تو وہ
ظلم کا ارتکاب نہیں کر رہا ہے۔ اس کی دلیل یہ
ہے کہ ایسے شخص کو زکوٰۃ میں فقرا کا جو حصہ ہے اس
میں سے دیا جا سکتا ہے۔ اگر وہ غنی کے حکم میں ہو تو اسے
زکوٰۃ نہیں دی جا سکتی تھی[3]

اس کا مطلب یہ ہے کہ حدیث کا مفہوم
مخالف، نکالنے کی کوئی ضرورت نہیں ہے۔ حدیث میں جو
وعید آئی ہے وہ غنی کے لیے ہے۔ جو غنی نہیں ہے اس کے
لیے یہ وعید نہیں ہے۔ غالباً اسی وجہ سے امام نووی فرماتے
ہیں۔ 'غنی وہ شخص ہے جو حق واجب بر وقت ادا کر سکتا
ہو۔ جو اس حیثیت میں نہیں ہے اسے غنی نہیں کہا جائے
گا'۔[4]

ان احادیث سے یہ نتیجہ بھی اخذ کیا گیا ہے کہ
جو شخص نادار اور مفلس ہے، اسے حق کے ادا نہ کرنے پر
گرفتار نہیں کیا جا سکتا۔ امام نووی فرماتے ہیں

بعض حضرات کا خیال ہے کہ اس حدیث سے
امام مالک، امام شافعی اور جمہور کے اس مسلک کی تائید
ہوتی ہے کہ جو شخص مفلس اور نادار ہے اسے قرض کے
سلسلہ میں پکڑنا، قید کرنا اور اس سے مطالبہ کرنا اس
وقت تک جائز نہیں ہے جب تک کہ وہ ادا کرنے کی
حیثیت میں نہ ہو جائے۔[5]

حافظ ابن حجرؒ فرماتے ہیں، امام شافعی کی دلیل
یہ ہے کہ کسی نادار سے مواخذہ کرنے کا مطلب یہ ہے کہ
وہ ظالم ہے۔ حالاں کہ بظاہر حدیث بتاتی ہے کہ وہ ظالم
نہیں ہے اس لیے کہ وہ مجبور ہے۔ لیکن بعض علما کے
نزدیک قرض دار کو قید کیا جا سکتا ہے۔ اور بعض نے

---

[1] نیل الاوطار ۵/۲۹۱۔ [2] شرح مسلم ۲/۱۸۔ [3] فتح الباری ۴/۳۱۳ [5] شرح مسلم ۲/۱۸
[4] شرح مسلم ۲/۱۸

کہا ہے کہ قرض خواہ اسے پکڑنے بھی نہ سکتا ہے۔[۱]

فقہاء احناف نے مالی حقوق کی دو قسمیں قرار دی ہیں۔ وہ کہتے ہیں کہ بعض حقوق تو وہ ہیں کہ اگر حاکم کے پاس ثابت ہو جائیں اور مدعی اس بات کا مطالبہ کرے کہ مدعیٰ علیہ کو قید کر دیا جائے تو حاکم پہلے مدعیٰ علیہ سے کہے گا کہ وہ حق ادا کر دے اگر وہ ادا نہ کرے تو اسے قید کر دے گا۔ جیسے کوئی شخص کسی سے کوئی چیز خریدے اور قیمت نہ ادا کرے یا عورت کا مہر (معجل) نہ دے یا کسی کی مالی ضمانت دے اور اسے پورا نہ کرے۔ لیکن بعض حقوق وہ ہیں کہ اگر مدعیٰ علیہ یہ کہے کہ وہ نادار ہے اور حق ادا نہیں کرسکتا تو اسے اسی وقت قید کیا جائے گا جب کہ مدعی یہ ثابت کر دے کہ وہ حق ادا کرنے کی پوزیشن میں ہے۔ اس فرق کی وجہ یہ ہے کہ جو صورتیں پہلے بیان ہوئی ہیں ان میں آدمی کا صاحب حیثیت ہونا از خود ظاہر ہے اس لیے کہ خریدی ہوئی چیز اس کے پاس موجود ہے۔ اسی سے اس کا غنی ہونا ثابت ہے۔ مہر اور کفالت کا معاملہ یہ ہے کہ اس نے خود سے اسے اپنے اوپر لازم کرلیا ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ وہ اسے ادا بھی کرسکتا ہے۔ اسی میں قرض اور اجرت بھی داخل ہے[۲]

کسی بھی حق کے ادا کرنے میں ٹال مٹول صحیح نہیں ہے جس طرح قرض کے ادا کرنے میں ٹال مٹول ظلم ہے، اسی طرح وہ سارے حقوق جو ایک آدمی کے دوسرے آدمی پر واجب ہوں ان کے ادا کرنے میں لیت ولعل اور تاخیر کرنا بھی ظلم ہے۔ حافظ ابن حجر فرماتے ہیں۔

'مطل' (جس سے منع کیا گیا ہے اس کے حکم) میں ہر وہ شخص داخل ہے جس پر کوئی حق لازم آئے، جیسے شوہر پر بیوی کا، آقا پر غلام کا اور حاکم پر رعیت کا حق ہے۔ اس کے برعکس بھی حق واجب ہوگا۔[۳]

قرض دار حوالہ قبول کرے۔

جو شخص مالدار ہے اور قرض ادا کرسکتا ہے۔ حدیث میں جہاں اسے قرض کی ادائیگی میں تاخیر نہ کرنے کا حکم دیا گیا ہے وہیں قرض خواہ کو ہدایت کی گئی ہے کہ قرض کے سلسلہ میں کسی صاحب حیثیت کا حوالہ دیا جائے تو اسے قبول کرلے

اگر قرض دار حوالہ دے کہ فلاں شخص سے قرض وصول کرلیا جائے تو امام نووی فرماتے ہیں جمہور کے نزدیک اس کا قبول کرلینا مستحب اور پسندیدہ ہے۔ بعض لوگوں نے اسے صرف مباح قرار دیا ہے۔ داؤد ظاہری وغیرہ نے اسے واجب کہا ہے۔[۴]

حافظ ابن حجرؒ فرماتے ہیں جمہور نے اسے مستحب قرار دیا ہے۔ ایک شاذ رائے یہ ہے کہ وہ مباح ہے۔ حنابلہ میں سے اکثر نے ابو ثورؒ ابن جریر اور اہل ظاہر نے اسے واجب کہا ہے[۵]

فقہ حنفی کی رو سے حوالہ اسی وقت صحیح ہوگا جب کہ قرض دار، قرض خواہ اور جس کا حوالہ دیا جارہا ہے تینوں کی رضامندی اس میں شامل ہو[۶]

امام مالکؒ اور امام شافعیؒ کے نزدیک قرض خواہ

---

[۱] فتح الباری ۴/۳۱۳۔ [۲] تفصیل کے لیے دیکھیے ہدایہ ۳/۱۳۶-۱۳۷۔ رد المحتار مع در المختار ۴/۳۲۸-۳۲۹۔
[۳] فتح الباری ۴/۳۱۳۔ [۴] شرح مسلم ۱۰/۱۲ [۵] فتح الباری ۴/۳۱۲ [۶] ہدایہ ۳/۱۲۹

کی رضامندی تو ضروری ہے لیکن جس کا حوالہ دیا جا رہا ہے، امام مالکؒ فرماتے ہیں اس کی رضامندی ضروری نہیں ہے الا یہ کہ قرض خواہ کی اس سے کوئی عداوت اور دشمنی ہو۔ ایک روایت یہ ہے کہ امام شافعیؒ کی بھی یہی رائے ہے۔ ایک دوسری روایت یہ ہے کہ جس کا حوالہ دیا جا رہا ہے، اس کی رضامندی ضروری ہے۔ فقہ حنبلی میں ہے کہ جس کا حوالہ دیا گیا ہے اگر وہ مالی لحاظ سے اس حیثیت میں ہے کہ رقم ادا کر سکتا ہے اور انکار اور ٹال مٹول کرنے والا نہیں ہے تو قرض خواہ کو لازماً حوالہ قبول کرنا ہوگا۔ اس صورت میں قرض خواہ کی اور جس کا حوالہ دیا جا رہا ہے رضامندی ضروری نہیں ہے[1]

اگر قرض خواہ نے حوالہ قبول کر لیا اور یہ شرط نہیں رکھی کہ جس کا حوالہ دیا گیا ہے اسے صاحبِ حیثیت ہونا چاہیے تو اب وہ امام لیث، امام شافعیؒ، ابوعبید اور ابن المنذر وغیرہ کی رائے میں حوالہ دینے والے کی طرف قرض کے سلسلہ میں رجوع نہیں کر سکتا۔ چاہے جس کا حوالہ دیا گیا ہے وہ ٹال مٹول کرے یا اس کے افلاس، موت یا اور کسی وجہ سے وہ اس سے قرض وصول نہ کر سکے۔

امام احمد سے جو روایات پہونچی ہیں ان سے معلوم ہوتا ہے کہ جس شخص کا حوالہ دیا گیا وہ مفلس تھا اور قرض خواہ اس سے واقف نہیں تھا تو اسے حوالہ دینے والے کی طرف رجوع کا حق ہوگا۔ وہ چاہے اس کے افلاس کے باوجود اس حوالہ کو بھی قبول کر سکتا ہے۔ یہی رائے حنابلہ میں سے ایک جماعت کی ہے۔ امام مالکؒ سے بھی اسی طرح کا ایک قول منقول ہے۔ اس کی دلیل یہ ہے کہ جس شخص کا حوالہ دیا گیا ہے، اس کا مفلس ہونا ایک عیب ہے۔ اس وجہ سے قرض دار کو اس کا حق ہے کہ اس حوالہ کو رد کر دے۔ قاضی شریح اور امام نخعی فرماتے ہیں کہ جس شخص کا حوالہ دیا گیا وہ اگر مفلس ہو جائے یا انتقال کر جائے تو جس نے حوالہ دیا ہے اس کی طرف رجوع کا حق ہے۔ امام ابوحنیفہ فرماتے ہیں۔ قرض خواہ دو حالتوں میں حوالہ دینے والے کی طرف رجوع کر سکتا ہے۔ ایک یہ کہ جس کا حوالہ دیا گیا ہے اس کا افلاس کی حالت میں انتقال ہو جائے۔ دوسری صورت یہ ہے کہ وہ حاکم کے سامنے قسم کھا کر اس حوالہ ہی سے انکار کر دے اور حوالہ دینے اور قبول کرنے والے کے پاس کوئی شہادت نہ ہو۔ امام ابویوسفؒ اور امام محمدؒ فرماتے ہیں کہ ان دونوں صورتوں کے علاوہ وہ اس وقت بھی رجوع کر سکتا ہے جب کہ حاکم اس کے افلاس کا فیصلہ کر دے جس کا حوالہ دیا گیا ہے۔

حوالہ کے موضوع پر ہمارے فقہاء نے تفصیل سے بحث کی ہے۔ یہاں بعض موٹی موٹی اور ضروری باتوں کا ذکر کیا گیا ہے حدیث کا اصل منشا یہ ہے کہ قرض دار کی طرف سے قرض خواہ کو اپنا قرض وصول کرنے کی کوئی معقول صورت تجویز کی جائے تو اسے قبول کر لینا چاہیے۔ کسی صاحبِ حیثیت آدمی کا حوالہ بھی اسی طرح کی ایک صورت ہے۔ خواہ مخواہ کسی ایسی صورت پر اصرار نہ کرنا چاہیے جس سے قرض دار زحمت اور دشواری محسوس کرے حقیقت یہ ہے کہ قرض دار کے اندر اگر قرض کے ادا کرنے کا اور قرض خواہ کے اندر اسے پریشان نہ کرنے کا جذبہ موجود ہو تو قرض کی وجہ سے بعض اوقات معاملات میں جو الجھنیں پیدا ہو جاتی ہیں وہ ازخود ختم ہوتی چلی جائیں گی اور قرض تعلقات کی خرابی کا سبب نہیں بنے گا۔

[بہ شکریہ رسالہ تحقیقاتِ اسلامی علی گڑھ]

---

[1] المغنی ۴/۵۸۳۔ [2] المغنی ۴/۵۸۱ [3] ہدایہ ۳/۱۲۹-۱۳۰

دوسری اور آخری قسط

حکیم احسان اللہ
شعبۂ یونانی طب و جراحت
اجمل خاں طبیہ کالج اے ایم یو

"ادرک کی تاریخی وطبّی اہمیت"

تاریخی پس منظر۔

ادرک سے متعلق معلومات انسان کو زمانۂ دراز سے حاصل ہیں۔ اکثر کتابوں میں اس کی قدامت حضرت عیسیٰ علیہ الصلوٰۃ والسلام کی ولادت باسعادت سے صدیوں قبل لکھی ہوئی ملتی ہے اور یہ زمانہ کم وبیش چار سو سال قبل مسیح کا ہے۔ اسی زمانہ سے ہندوستان، چین روم اور یونان کے لوگ اس سے واقف ہیں۔ مذکورہ ممالک کے باشندے اس کا استعمال اپنے کھانے پینے کی چیزوں میں کیا کرتے تھے۔ اس کی شمولیت کا مقصد اشیاء خورد ونوش کے ذائقہ اور خوشبو میں اضافہ ہوتا تھا۔ بتدریج اس نبات سے دوسرے ممالک متعارف ہوئے اور مختلف ملکوں میں اس کی بڑے پیمانہ پر زراعت وتجارت کا سلسلہ شروع ہوا جو روز افزوں ترقی پذیر ہے اور اب تک قائم ہے۔

پہلی صدی عیسوی کا یگانۂ روزگار یونانی طبیب جو علم نباتات میں یدطولیٰ رکھتا تھا جس کو طبی دنیا میں حکیم دیسقوریدس (Dioscorides) کے نام سے شہرت حاصل ہے اس نے 78ء میں The Materia Medica کے نام سے ایک کتاب لکھی جس میں چھ سو (۶۰۰) سے زائد طبی پودوں سے متعلق معلومات تحریر کی ہیں۔

الو المفردات حکیم دیسقوریدس نے زنجبیل کا تذکرہ کیا ہے۔ اس کے بعد پھر بہت سے حکماء نے اپنی تصانیف میں اس کے مختلف النوع فوائد وخصوصیات پر روشنی ڈالی ہے، ان میں حکیم جالینو[س]، رازی، ابن ماسویہ اور شیخ الرئیس وغیرہ کی شخصیات قابل ذکر ہیں۔

قرآن کریم واحادیث نبی کریم (صلی اللہ علیہ وسلم) میں بھی ادرک کا ذکر موجود ہے۔

ویسقون فیہا کاسًا کان مزاجہا زنجبیلاً۔ عینًا فیہا تسمّٰی سلسبیلاً ۔ ۲۹ پ سورہ دہر

ترجمہ "اور اس میں وہ جام پلائے جائیں گے جس کی ملونی (آمیزش) ادرک ہوگی۔ وہ ادرک

لہ چرک سنگھتا۔ یہ دراصل اچاریہ چرک کی تالیف ہے۔ اس میں اچاریہ چرک نے اپنے استاد اگنی ویش سے جو تعلیمات حاصل کی تھیں ان کو قلم بند کیا ہے۔ اس سے پہلے یہ تعلیمات کتاب کی شکل میں نہ تھیں بلکہ سینہ بہ سینہ منتقل ہوتی چلی آرہی تھیں۔ اس کتاب اور اسکے مولف کا سن معلوم نہیں۔ پھر بھی اتنا اندازہ ضرور بتایا جاتا ہے کہ زمانہ قبل تاریخ (Pre Historic period) کی تالیف ہے۔ اس کتاب میں ادرک کا ذکر اس نبات سے متعلق معلومات کی تصانیف کا عکاس ہے۔

کہا ہے جنت میں ایک چشمہ ہے جسے سلسبیل
کہتے ہیں)۔

یعنی بعض شربتوں میں اس کی ملاوٹ ہوگی جو
عام جنتی پئیں گے اور چشمہ سلسبیل سے مقربین خاص نوش
فرمائیں گے اور سیراب ہوتے رہیں گے۔

ابو سعید خدری رضی اللہ عنہ سے روایت ہے
کہ ایک مرتبہ بادشاہ روم نے حضور اقدس صلی اللہ تعالیٰ
علیہ وسلم کو ادرک کا ایک برتن (یعنی مربیٰ ادرک) بطور
تحفہ بھیجا۔ اور سرکارؐ نے اس میں سے تھوڑا تھوڑا حاضرین
کو کھلایا۔

مراکز کاشت و تجارت

ادرک کی کاشت براعظم ایشیا، افریقہ اور
امریکہ کے ان ممالک میں وسیع پیمانہ پر کی جاتی ہے جو منطقہ
حارہ میں واقع ہیں۔ جیسا کہ ہندوستان، چین، سیرالیون
اور نائجیریا وغیرہ برآمد (EXPORT) کرنے والے ممالک
میں سر فہرست ہیں۔ جیکا میں ادرک کا تعارف اسپینیوں
کے ذریعہ حاصل ہوا اور پھر چند سال بعد جیکا نہ صرف
خود کفیل ہو گیا بلکہ A.D. 1547 سے اسپین کو برآمد
کرنے لگا۔

تجارتی ادرک کی دو قسمیں ہوتی ہیں۔

۱۔ غیر مقشر یا بغیر چھلی ہوئی یا سیاہ ادرک
۲۔ مقشر یا چھلی ہوئی یا سفید ادرک

جیکا کو خشک ادرک اور چین کو ادرک کا مربیٰ (Preserved Ginger) برآمد کرنے میں فوقیت حاصل ہے

ہندوستان میں کلکتہ، کوچین اور دہرہ دون
وغیرہ مشہور علاقے ہیں جہاں اس کی بہتر اقسام کی کثرت
سے کاشت کی جاتی ہے۔

طبعی خصوصیات

ادرک کی شکل غیر متعین ہوتی ہے۔ اس
میں انگلی کے مانند چھوٹے بڑے زوائد ہوتے ہیں۔ جگہ جگہ
گرہیں (Nodes) اور شگوفے یا کلیاں (Buds) ہوتی
ہیں۔ کچھ کلیاں تو آخری سرے پر ہوتی ہیں جو (Terminal-Buds)
کہلاتی ہیں اور کچھ گانٹھوں کے پاس سے نکلتی ہیں
جن کو Axillary Buds کہتے ہیں۔ ادرک کی زیریں
سطح سے دھاگے کی شکل کی چھوٹی چھوٹی اتفاقی جڑیں
(Adventitious Root) نکلتی ہیں۔ موسم سازگار
ہونے پر ہر دو طرح کی کلیوں سے ہوائی تنے (Aerial-Shoots)
نکل کر زمین سے اوپر آجاتے ہیں۔ جن سے
بڑی بڑی پتیاں نکلتی ہیں۔ چند ماہ بعد یہ مرجھا کر ختم
ہو جاتے ہیں۔ ادرک کے حاصل کرنے کا بہترین وقت
یہی ہوتا ہے جب ہوائی تنے اور پتیاں مرجھا کر گر جاتے ہیں۔

ادرک کے اوپر کا چھلکا باریک اور رنگت
میں بھورا سفیدی مائل ہوتا ہے۔ اس کی مہک تیز اور خوشگوار
ہوتی ہے۔ ذائقہ تلخی مائل (حریف) ہوتا ہے اور زبان
میں نفوذ کرتا ہے۔ ادرک کا مغز (گودہ) ریشہ دار اور
زردی مائل ہوتا ہے۔ خشک ہونے پر اس کے وزن
میں تقریباً ۷۰ فیصدی کی کمی واقع ہو جاتی ہے

افریقی ادرک اپنی رنگت کے اعتبار سے
اپنے کاشتکاروں کی طرح ہوتی ہے۔ یعنی اس کا چھلکا اور
گودہ دونوں سیاہی مائل ہوتے ہیں۔ ذائقہ قدرے زیادہ
تیز اور بو کسی قدر ہلکی ہوتی ہے۔

اسی طرح جاپان، جیکا اور اسپین وغیرہ میں
پیدا ہونے والی ادرک کی طبعی خصوصیات میں معمولی اختلاف
پایا جاتا ہے۔

"کیمیاوی اجزاء"

یہ امر اطبائے متقدمین کے مسلمات سے ہے کہ مہکنے والی ہر شئے کے اندر خاص قسم کے لطیف بخاری اجزاء موجود ہوتے ہیں جو فضا میں منتشر ہوکر اس کی مہک کا پتہ دیتے ہیں۔ ان اجزاء کی موجودگی کے فیصد پر اس چیز کے مہک کی تیزی و ہلکے پن کا انحصار ہوتا ہے۔ دوش ہوا کے سہارے جب یہ اجزاء عضو شامہ (organ of smell) تک رسائی حاصل کرتے ہیں، اس وقت اس کی مخصوص مہک کا احساس ہوتا ہے۔ تجزیہ کے بعد ادرک میں اس طرح کے لطیف اور فراری اجزاء مناسب مقدار میں پائے گئے ہیں جن کو روغن فراری (VOLATILE OIL) کہا جاتا ہے۔ یہی روغن فراری ادرک کی مخصوص مہک کا سبب ہوتا ہے۔ ادرک کے اندر اس کی مقدار ۱٪ - 3٪ تک ہوتی ہے۔ اس روغن میں متعدد قسم کے اجزاء ہوتے ہیں جن کو مزید تجزیہ کے بعد علیحدہ کیا گیا۔ ان میں سے چند حسب ذیل ہیں

کیمفین (CAMPHENE)، فلینڈرین (PHELLANDRENE)، سائنیول (CINEOL) اور جنجبرین (GINGIBERENE) وغیرہ

اس کے اندر پائے جانے والی رال دار (OLEORESINS) جن کا تعلق ادرک کے ذائقہ سے ہوتا ہے۔ یعنی ادرک کے مخصوص ذائقہ کا انحصار انھیں رال دار اجزاء پر ہے۔ شوگاؤل (SHOGAOL) اور جنجرول (GINGEROL) وغیرہ اس کے مشتملات ہیں۔

علاوہ بریں ادرک کے اندر گندھک (کبریت) (SULPHUR) اور معدنی نمکیات پائے جاتے ہیں (MINERAL SALTS)

اس کے اندر نشاستہ (STARCH) کی خاصی مقدار ملتی ہے جس کا تناسب پچاس فیصد (50٪) سے زائد ہوتا ہے۔

طبی افادیت

ادرک سے حاصل ہونے والے بہت سے فائدے علم انسانی میں آچکے ہیں لیکن اسی کو حرف آخر نہیں تسلیم کیا جاسکتا بہت ممکن ہے کہ آئندہ دور کی تحقیقات مزید اضافہ کریں۔ اب تک جن فوائد کا علم حاصل ہوچکا ہے ان کی روشنی میں اس کی اہمیت کا اندازہ لگایا جاسکتا ہے۔ اس کے اندر پوشیدہ مختلف النوع فوائد کے سبب ادرک کا استعمال مفرداً اور سیکڑوں مرکبات میں جزو اہم کی حیثیت سے ہوتا ہے۔

الکحلی مرکبات (TINCTURES) جس کی ایجاد بقول چارلس ایل ڈنا، عربوں نے کی ہے اس قسم کی دوائیں مختلف چیزوں سے تیار کی جاتی ہیں۔ ادرک کا روح شراب میں حاصل کیا جانے والا مرکب (TINCTURE-GINGER) کسی تعارف کا محتاج نہیں طب جدید میں اس کو اہم مقام حاصل ہے اور اس الکحلی مرکب کو طرح طرح کے (MIXTURES) میں شامل کیا جاتا ہے۔

دور حاضر میں ادرک کا سب سے زیادہ استعمال شراب کی تیاری میں ہوتا ہے۔ اور اس سے تیار کی جانے والی شراب کو اسی کے نام سے منسوب کرتے ہیں اور اس طرح یہ ادرک کی شراب (GINGER-ALE) کہلاتی ہے۔

ابوالطب بقراط نے بدن انسان کے اندر پائی جانے والی رطوبات (FLUIDS OF THE BODY) کو ان کی رنگت کے اعتبار سے چار گروہوں میں تقسیم کیا ہے

سرخ، سفید، زرد اور سیاہ - ان تمام رطوبتوں کو مجموعی طور پر اس نے اخلاط (HUMOURS) کی اصطلاح سے یاد کیا۔ اس نے یہ بھی وضاحت کی کہ یہ رطوبات خون میں مخصوص تناسب میں پائی جاتی ہیں - ان رطوبات کی طبعی کیفیت و کمیت (QUALITATIVE AND QUANTITATIVE NORMALCY) صحت قائم رکھتی ہے اور ان میں سے کسی ایک کا کیفی اور کمی تغیر بیماری کا باعث ہوتا ہے۔ اس نظریہ کی روشنی میں بہر صورت مرکز بیماری (مستوقد مرض) یہی رطوبات ہوا کرتی ہیں — چاروں قسم کی رطوبات کا مزاج باہم ایک دوسرے سے الگ ہوتا ہے اور ان سے پیدا ہونے والی بیماریوں کا مزاج بھی۔

ادرک کا استعمال ان بیماریوں میں خاص اہمیت کا حامل ہے جو سرد و تر رطوبت (بلغم PHLEGM) سے اور سردی کے اثر سے پیدا ہوتی ہیں جن کو بلغمی امراض کہا جاتا ہے چوں کہ ادرک وارد بدن ہو کر کیفیاتِ حارہ پیدا کرتی ہے اس لیے اس کو گرم دواؤں کی فہرست میں شامل کیا جاتا ہے اور اپنی اس گرمی کے سبب یہ نبات سردی کے اثر سے پیدا ہونے والی بیماریوں کو زائل کرنے میں بکثرت مستعمل ہے۔

ادرک بہت سی خوبیوں کا مجموعہ ہے

ان ہی خوبیوں کی بنا پر داخلی و خارجی دونوں طریقوں سے اس کو استعمال میں لایا جاتا ہے۔ جسم کے مختلف نظام پر اس کا اچھا اثر ہوتا ہے۔ علی الخصوص نظامِ ہضم و نظامِ تنفس (DIGESTIVE and RESPIRATORY SYSTEM) کی متعدد عام اور پریشان کن تکلیفوں میں ادرک کے استعمال کی بڑی اہمیت ہے۔

نظامِ ہضم کے افعال کا بحسن و خوبی انجام پذیر ہونا صحت کے لیے ازبس ضروری ہے کہ دیگر نظامِ جسمانی اسی سے اپنی غذا حاصل کرتے ہیں - اس نظام کی بیماریاں

ہر کس و ناکس میں بلا لحاظِ عمر و جنس پائی جاتی ہیں - بھوک کی کمی، ہضم کی خرابی، پیٹ میں ریاح (FLATULENCE) کی کثرت اور ان کا آسانی سے خارج نہ ہونا، کبھی کبھی ریاحی درد کا شدت پذیر ہو کر قولنجی (FLATULENT-COLIC) شکل اختیار کر لینا، پیٹ میں کیڑوں کی موجودگی وغیرہ وغیرہ عام شکایات ہیں جن میں سے کسی نہ کسی کا شکار ہر خاص و عام نظر آتا ہے۔ ادرک کا استعمال ان تمام تکلیفوں میں زمانہ دراز سے کامیابی کے ساتھ رائج ہے۔

جگر (LIVER) جو فعل ہضم میں کلیدی رول ادا کرتا ہے، اس کے فعل کا معمولی نقص نظامِ ہضم کو براہِ راست اور پورے جسم کو بالواسطہ ضعیف و کمزور بنانے کے لیے کافی ثابت ہوتا ہے۔ ادرک جگر کے فعل میں قوت و طاقت پیدا کرتی ہے اور اس کے اندر کسی قسم کے ضعف کے ازالہ میں نفع بخش ثابت ہوتی ہے۔

نظامِ تنفس (RESPIRATORY SYSTEM) کی مختلف بیماریاں مثلاً کھانسی، زکام، نزلہ، استحاب تجاویف انف (SINUSITIS) اور دیگر بلغمی حالتوں میں سود مند ہے۔ اس کے استعمال سے سرد و تر قسم کی رطوبات یعنی بلغم کی تولید میں کمی ہونے کے ساتھ ہی ساتھ پیدا شدہ بلغم کا بآسانی اخراج ممکن ہو جاتا ہے۔

نظامِ اعصاب (NERVOUS-SYSTEM) جس کا طبعی حالت میں ہونا ضروری ہوتا ہے۔ تمام حرکات و احساسات جسمانی کے اعتدال و صحت کا قیام اسی نظام پر منحصر ہوتا ہے۔ دماغی کمزوری، نسیان، عمومی عصبی کمزوری، وجع عرق النسا (SCIATICA)، لقوہ (BELL'S PALSY) اور فالج (PARALYSIS) وغیرہ بیماریوں میں اس کی افادیت مسلم ہے

خارجی طور پر بھی طرح طرح کی بیماریوں اور عوارضات میں اس کا استعمال کیا جاتا ہے۔ سردی کے اثر سے پیدا ہونے والے اورام (CHILLBLAINS) اور دردوں میں اس کا مقامی لیپ فائدہ مند ہوتا ہے۔ اسی طرح جلد کی ایک مخصوص بیماری جس میں بال بھی گرنے لگتے ہیں جس کو بال خورہ (داء الثعلب) کہتے ہیں، اس کا خارجی استعمال کیا جاتا ہے۔

ہوام یعنی کیڑے مکوڑوں کے کاٹنے سے جو سوزش اور جلن وغیرہ پیدا ہوتی ہے، اس کے ازالہ کے لیے اس کا پانی لگانا نفع بخش ہوتا ہے۔

اس سے حاصل ہونے والے مذکورہ بالا گوناگوں فوائد کو مدنظر رکھتے ہوئے، قدرت کی اس گرانقدر نعمت سے ہر انسان کو فائدہ اٹھانا چاہیے۔ اس کی زود یابی اسی موسم میں زیادہ ہوتی ہے جب اس کی ضرورت بار بار پیش آتی ہے۔ یعنی موسم سرما۔ ضروری نہیں کہ اس سے تیار کیے جانیوالے مرکبات کا نام معلوم کیا جائے اور ان کے حاصل کرنے کی زحمت اٹھائی جائے۔ اگر مرکبات بآسانی دستیاب ہوسکیں تو فبہا ورنہ اس کا تنہا استعمال بھی اس کمی کو پورا کرنے کے لیے کافی ہوسکتا ہے۔ آج بھی اگر زمانۂ قدیم کے مروجہ طریقۂ استعمال کو عملی جامہ پہنایا جائے تو میرے خیال سے یہ قدامت پسندی نہیں بلکہ حقیقت پسندی ہوگی۔ یعنی اپنے کھانے پینے کی چیزوں کا ایک جزو ادرک کو بھی سمجھنا چاہیے

طبری کا یہ نکتہ ہر وقت ذہن میں رہے
"ہر معتدل چیز لذیذ اور بدن کی محافظ ہوا کرتی ہے اور مفرط شے باعث الم اور مفسدِ بدن"
(فردوس الحکمۃ)

ایک ضروری تصحیح

---

۱۶ فروری ۱۹۸۳ء کے شمارہ میں صفحہ ۱۴ تا ۱۷ پروفیسر اقبال انصاری صاحب کا "حافظ ابن قیم" کے عنوان سے جو مضمون شائع ہوا ہے، اس کے صفحہ ۱۷ سطر ۱۹ پر کتابت کی غلطی سے عبارت چھوٹ گئی ہے۔ اس کا اضافہ کر کے سطر ۱۹ کو اس طرح پڑھا جائے

"ترجمہ اسوۂ حسنہ کے نام سے مولانا عبدالرزاق ملیح آبادی نے کیا ہے اور خود اصل کتاب کا اردو ترجمہ 'زاد المعاد' ہی کے نام سے رئیس احمد جعفری نے کیا ہے"

مدیر مسئول

ضیاء احمد بدایونی

علی گڑھ۔ چند یادیں

وقت کو گزرتے کیا دیر لگتی ہے کہنے کو تو نصف
صدی سے زیادہ زمانہ گزر گیا مگر کل کی سی بات معلوم ہوتی ہے
جب میں اپنے وطن بدایوں کے گورنمنٹ ہائی اسکول میں پڑھتا
تھا۔ اُسی زمانہ میں میرے چند عزیز ایم اے۔ او کالج علی گڑھ
میں زیرِ تعلیم تھے۔ یہ لوگ جب تعطیل میں گھر آتے تو علی گڑھ کی
خوش گوار یادیں سوغات میں لاتے اور ہم لوگوں کو وہاں
کے واقعات سناتے۔ انھیں میں ایک صاحب تھے جو مجھ سے
تین چار سال بڑے ہوں گے۔ نہایت سنجیدہ و شائستہ،
مہذب و متین، دین دار اور اخلاص شعار۔ وہ جب مجھ سے
ملتے تھے تو کالج اور بورڈنگ ہاؤس کی زندگی کا نقشہ کھینچ دیتے
تھے۔ طلبہ کا رکھ رکھاؤ، اساتذہ کا اپنے شاگردوں سے میل جول
انگریز پروفیسروں کا بے تکلف لڑکوں کے کمروں پر آنا،
اُن کی مشکلات سننا اور دکھ درد میں بھی ان کا ہاتھ بٹانا
بیماری میں اپنی کوٹھی سے پرہیزی کھانا پکوا کر خود لانا اور اپنے
سامنے پیار و شفقت سے کھلانا، گاہے گاہے طلبہ کو اپنے
یہاں چائے پر بلانا، اُن کا اور اُن کی لیڈیز کا کمالِ محبت سے
پذیرائی کرنا اور چلتے وقت برآمدے تک مشایعت کو جانا۔
غرض ایک عجیب اپنائیت کی فضا تھی جس کی نظیر کسی دوسری
درس گاہ میں نہیں ملتی تھی۔ عزیز موصوف جب تک یہ باتیں
کرتے میں ہمہ تن گوش بن کر سنتا اور دل ہی دل میں علی گڑھ

دیکھنے کا شوق پرورش پاتا۔ سچ پوچھیے تو علی گڑھ میرے
خوابوں کی بستی بن گیا تھا۔

کیا خبر تھی کہ یہ خواب ایک دن حقیقت کا روپ
اختیار کرے گا اور چند سال بعد مجھے استاد کی حیثیت سے اُس
مرکزِ علم و ادب میں آنا ہوگا جو میرے خوابوں کی بستی تھا۔
ہوا یوں کہ جب میں الہ آباد یونیورسٹی سے فارسی سے ایم اے
کرنے اور پھر وہاں فارسی ادب میں ریسرچ کے دو سال
گزارنے کے بعد وطن آیا تو ایک دن میرے محترم کرم فرما،
جو مجھ سے بے حد خلوص رکھتے تھے، فرمایا کہ قریشی صاحب[1] آئے
ہوئے ہیں۔ وہ تمہیں یاد کرتے تھے۔ یہ سن کر مجھے تعجب ہوا کہ
کیوں کہ اب تک مجھے قریشی صاحب سے تعارف کی عزت بھی
حاصل نہ تھی۔ بہرحال میں ان کی خدمت میں گیا۔ بڑے تپاک
سے پیش آئے اور اِدھر اُدھر کی باتوں کے بعد کہا کہ ہمارے
یہاں ایک جگہ خالی ہوئی ہے۔ آپ آجائیں تو اچھا ہے۔ میں
نے موصوف کی پیش کش کو شکریہ کے ساتھ قبول کیا اور
علی گڑھ جا کر مسلم یونیورسٹی انٹرمیڈیٹ کالج میں لیکچرار کی
حیثیت سے کام شروع کر دیا۔ یہ دسمبر ۱۹۲۶ء کی بات ہے

---

[1] قریشی صاحب کی زوجہ ثانیہ بدایوں کے خاندانِ سادات سے
تھیں۔ اسی سلسلہ میں موصوف اکثر بدایوں آتے رہتے تھے

آگے بڑھنے سے پہلے یہ بتادینا ضروری ہے کہ قریشی صاحب کون بزرگ تھے۔

پروفیسر عبدالمجید قریشی کا وطن تو پنجاب تھا لیکن وہ علی گڑھ میں طالب علمی اور ملازمت کا طویل زمانہ گزار چکے تھے۔ اور نہ صرف یہ بلکہ وہاں کی زندگی میں اس قدر رچ بس گئے تھے کہ یہ کہنا ہرگز مبالغہ نہ ہوگا کہ وہ اور علی گڑھ لازم وملزوم بن گئے تھے۔ مشہور تھا کہ چکرورتی نے ڈاکٹر ضیاء الدین کو پیدا کیا۔ ڈاکٹر ضیاء الدین نے قریشی کو اور قریشی نے حافظ عثمان کو۔ یہ سب حضرات ریاضی میں امتیازی مرتبہ رکھتے تھے غرض دو دو اور دو دو چار کی ممارست نے قریشی صاحب کو حقیقت پسندی سکھائی اور اسی کی بدولت اُن میں زندگی کے اقدار پر گہری نظر ڈالنے کی ادا آئی۔ اسی کے ساتھ ان کو فلسفہ وادب سے بھی خاصا ذوق تھا شاید اسی کا اثر تھا کہ وہ بیک وقت ایک بالغ نظر مدبر بھی تھے اور پاکیزہ جذبات کا پیکر بھی۔ مولانا روم نے جو کہا ہے کہ

کار پاکاں روشنی و گرمی است

خانۂ دماغ کی روشنی اور دل کی گرمی دونوں موصوف کی ذات کے اندر جمع کر دی تھیں۔ کشیدہ قامت، بارعب چہرہ اور شاندار مونچھیں۔ یہ تھے قریشی صاحب جو میرے علی گڑھ آنے کا باعث ہوئے۔ کبھی کبھی ایسا ہوا کہ لڑکوں نے ڈائننگ ہال کے انتظام سے ناراض ہو کر اسٹرائیک کر دی اور تمام ارباب حل وعقد اس گتھی کو سلجھانے سے قاصر رہے مگر قریشی صاحب نے جو سمجھتے تھے کہ کہاں نرمی کا محل ہے اور کہاں گرمی کا، منٹوں میں اپنے ناخن تدبیر سے اس عقدے کو یوں حل کر دیا کہ سب دنگ رہ گئے۔ علی گڑھ میں بڑے عظیم الشان مشاعرے ہوتے جن کا سہرا دو شخصوں کے سر رہتا قریشی صاحب اپنی وجاہت سے طلبہ کے جوش وخروش کا بار سنبھالتے اور مولانا احسن مارہروی نازک مزاج شعراء کی خاطر و مدارات کرکے کام نکالتے۔ میں نے ایسے افراد بہت کم دیکھے ہیں جن سے طلبہ ایک طرف ڈرتے ہوں اور دوسری طرف اُن کا دم بھی بھرتے ہوں۔ یہ بات قریشی صاحب میں پائی۔

جس کالج میں پہلی بار میرا تقرر ہوا اس کے پرنسپل قریشی صاحب ہی تھے۔ دو کلاس یونیورسٹی کے اور دو اسکول کے ملاکر انٹرمیڈیٹ کالج کی تشکیل عمل میں آئی تھی۔ یونیورسٹی اور اسکول کا دائرہ عمل اس سے الگ تھا۔ کالج کے اساتذہ میں چند اصحاب ایسے تھے جن کے علمی اکتسابات اور مخلصانہ تعلقات کی یاد اب تک دل میں جاگزیں ہے۔ ان میں مشتاق احمد صاحب خلف نواب وقار الملک مرحوم عبدالشکور صاحب، ڈاکٹر ناظم صاحب محمد حاذق صاحب اور شیخ علی جواد صاحب مرحوم خصوصیت سے قابل ذکر ہیں۔

عربی کی کہاوت ہے لِکُلِّ داخِلٍ دَهْشَةٌ (ہر نووارد کو گھبراہٹ کا سامنا ہوتا ہے) اس پر طرہ یہ کہ علی گڑھ کے طالب علموں کی شرارتوں کے قصے سن چکا تھا۔ تاہم کلاس لینا ضروری تھا۔ شروع شروع میں بعض طلبہ نے شوخ طبعی دکھائی مگر جلد ہی ان کو سمجھ آگئی۔ پھر تو یہ حال ہوا کہ کالج میں (اور کالج کے بعد یونیورسٹی میں) ان کا احترام اور میری شفقت ضرب المثل بن گئی۔ میں خدا کا شکر کرتا ہوں کہ علی گڑھ کے طویل زمانہ قیام میں ارباب اختیار کا معتمد علیہ اپنے رفقائے کار میں مقبول اور اپنے شاگردوں میں محترم رہا۔ بعد کو قریشی صاحب نے یہ نکتہ سمجھایا کہ علی گڑھ کے طلبہ اپنے اساتذہ کا صحیح جائزہ لینا جانتے ہیں۔ اگر کوئی استاد نالائق ہوتا ہے یا خواہ مخواہ رعب جماتا ہے یا کام کرنا نہیں چاہتا تو وہ اس کو چٹکیوں میں اڑا دیتے ہیں لیکن اگر کوئی ٹھکانے

کا آدمی پاتے ہیں تو اس کی دل سے عزت کرتے ہیں۔
میں جب علی گڑھ پہنچا ہوں تو وائس چانسلر
صاحب زادہ آفتاب احمد خاں تھے وہ ایک شکیل وجمیل انسان
تھے اور مین مین انگریز معلوم ہوتے تھے۔ بلکہ انگریز کا تو صرف
رنگ گورا ہوتا ہے۔ صاحب زادہ صاحب ہر طرح ایک پیکر جمال
تھے۔ بچپن سے ان کی قابلیت، علمیت، مذہبیت، دیانت داری
اور حق پسندی کے چرچے کانوں میں پڑے تھے۔ مذہب سے
لگاؤ تو ہمیشہ سے تھا لیکن آخر میں تو مذہب ان کی پوری زندگی
پر چھا گیا تھا۔ وہ قوم اور یونیورسٹی کی سچی لگن رکھتے تھے۔
ور دونوں کو بام عروج پر پہنچانے کے آرزومند تھے۔ بعض
وگ کہتے ہیں کہ مرحوم میں ضد اور اپنی رائے پر اصرار تھا
لہ میری ناقص رائے میں ہر اصول پرست اور حق پسند کو
یہ مرحلہ پیش آتا ہے۔ یہ زمانہ وہ تھا کہ مرحوم فالج کے حملے سے
صاحب فراش اور نشست وبرخواست سے معذور تھے۔ ۲۶ء
یں اچانک سنا کہ صاحبزادہ آفتاب احمد خاں نے ایک زبردست
مفلٹ چھپوا کر تمام ممبران کورٹ اور دوسرے ذمہ دار اعیان
وم کو بھیجا ہے۔ پمفلٹ کیا تھا گویا بم کا گولا تھا جس نے علی گڑھ
ی ساکن فضا میں قیامت کی ہلچل ڈال دی۔ جو تھا تصویر حیرت
نا ہوا تھا۔ ہر ایک کی زبان پر یہ الفاظ تھے۔ "دیکھیے کیا ہوتا
ہے، خدا خیر کرے۔" پمفلٹ کا مضمون کچھ اس قسم کا تھا۔

"میں نے اپنی وائس چانسلری کے زمانے میں
حد سے زیادہ کوشش کی کہ فلاں فلاں امور میں
اصلاحات بروئے کار لاؤں، مگر ہر ہر موقع پر
پرو وائس چانسلر (ڈاکٹر ضیاء الدین احمد)
میری کوشش کی راہ میں روڑے اٹکاتے رہے
اپنے انتخاب کے دوسرے روز ہی علی الصباح میں
یونیورسٹی کی مسجد میں گیا (یہ ماہ جنوری کی کوئی

ابتدائی تاریخ تھی)، اور موذن کی عدم موجودگی
میں خود ہی اذان دی۔ امام صاحب بھی غیر حاضر
تھے۔ آخر بہ مشکل چار یا پانچ طالب علم جو آگئے تھے
ان کے ساتھ فریضۂ فجر ادا کیا۔ جب جناب ناظم
دینیات سے اس عام بے توجہی کی وجہ پوچھی اور
دینیات سے متعلق بعض مسائل پر گفتگو کی تو وہ
کوئی جواب نہ دے سکے۔ حد یہ ہے کہ وہ یہ
بھی نہ بتا سکے کہ ایک ناظم کے ذمہ کیا فرائض
ہوتے ہیں۔ ان وجوہ سے مجبور ہو کر میں
یہ پمفلٹ شائع کرتا ہوں تاکہ ارباب اقتدار
جلد اصلاح کی طرف متوجہ ہوں۔"

علیا حضرت سلطان جہاں بیگم والیۂ بھوپال
ایک درد مند اور بیدار مغز رئیسہ اور علی گڑھ کی چانسلر
تھیں اور ممدوحہ کے فرزند نواب حمید اللہ خاں جو اعیان
ملک میں ملی حمیت اور گہری بصیرت کا بے مثال نمونہ اور
یونیورسٹی کے اولڈ بوائے تھے، ان کے مشیر کار تھے۔ جب
ان کی نظر سے یہ تحریر گزری تو ان کے حکم سے ان شکایات
مندرجہ بالا کی تحقیق کے لیے رحمت اللہ کمیشن کا قیام عمل
میں آیا جس کے صدر سر ابراہیم رحمت اللہ اور ارکان ڈاؤ
ممتاز ماہر تعلیم انگریز تھے۔ کہا جاتا ہے کہ اس کمیشن کے مصارف
اٹھارہ ہزار روپیہ ہوئے، جو اس زمانہ میں بڑی رقم سمجھے
جاتے تھے اور جو بیگم صاحبہ نے اپنی جیب خاص سے عطا فرمائے
ڈیڑھ دو سال کی مسلسل تگ و دو اور بند کمرے میں ذمہ دار
اصحاب کی شہادتوں کے بعد خدا خدا کر کے کمیشن کی رپورٹ
منظر عام پر آئی۔ جس کا ماحصل یہ تھا کہ ڈاکٹر صاحب کو ان
کی خدمات سے سبکدوش کیا جائے اور ادارے کا چارج
بانی کالج کے نامور پوتے سید راس مسعود کو سونپا جائے

جو اس زمانہ میں مملکتِ دکن کی تعلیمات کے اعلیٰ افسر تھے۔ منجملہ دوسری اصلاحات کے اساتذہ کا دو بدل اور انٹرمیڈیٹ کالج کی موقوفی بھی عمل میں آگئی۔ اس موقع پر صرف دو استاد کالج سے یونیورسٹی میں ترقی پر لیے گئے۔ شیخ عبدالرشید اور راقم السطور۔ یہ غالباً ۱۹۳۰ء کی تعطیل گرما کا واقعہ ہے۔

سید راس مسعود کے نام نے درحقیقت جادو کا کام کیا۔ دیکھتے دیکھتے علی گڑھ کی فضا یکسر تعلیمی وعلمی ہوگئی۔ اساتذہ میں ذمہ داری کا احساس اور طلبا میں اپنے فرائض کا پاس پہلے سے دوچند ہوگیا۔ جدھر دیکھو علمی چرچے، جہاں جاؤ تحقیق کے جلوے۔ نئے وائس چانسلر اپنی اصلاحی تجاویز کو روبہ عمل لانے کے لیے ایک مشہور ماہر تعلیم مسٹر ہارن کو پرووائس چانسلر کی حیثیت سے ساتھ لائے تھے جنھوں نے بڑی سرگرمی کے ساتھ حالات کو سدھارا مگر افسوس کہ ایک سال کے اندر ہی علی گڑھ کی سدوح کا شکار ہوگئے۔ خوش درخشید ولے دولت مستعجل بود۔

علی گڑھ آکر راس مسعود نے اپنی پالیسی کے بارے میں جو پہلی زلزلہ فگن تقریر کی وہ عمر بھر نہ بھولنے والی نہیں۔ وہ جس طرح ایک طلیق اللسان — NECESSITAS VERBA — (تاونا۔) تھے، اسی طرح ایک جادو بیان مقرر بھی۔ جب بولتے تھے ایسا لگتا تھا کہ ایک لشکر جرار دھاوا مارتا چلا آرہا ہے۔ اُن کو اردو اور انگریزی پر بے نظیر قدرت تھی۔ تقریر کا خلاصہ یہ تھا کہ اپنے مرحوم دادا کی امانت کی نگہداشت کرتے ہوئے ممکن ہے کہیں مجھ سے فیصلہ کرنے میں غلطی ہوجائے مگر میری نیت ہمیشہ نیک ہوگی۔[1]

اب میں یونیورسٹی کے شعبۂ فارسی میں منتقل ہوگیا۔ جہاں مدت تک لیکچرر اور ریڈر کے فرائض انجا

---

[1] نوٹ ۱؎ یہ جو کہا گیا محض قول نہ تھا بلکہ پورے طور پر عمل سے ہم دوش۔ میں سمجھتا ہوں کہ مرحوم کے لغت میں قول بلا عمل کے الفاظ بیگانہ تھے۔ میں نے سر سید اور جسٹس محمود کو نہیں دیکھا البتہ سید راس مسعود کو دیکھ کر کچھ اندازہ ہوا کہ عالی دماغ اور عالی ظرف ایسے ہوتے ہیں۔ ان سے پہلے نواب مزمل اللہ خاں صاحب (بھیکم پور) جو ایک نرم مزاج، علم دوست اور فیاض رئیس تھے منصب وائس چانسلری پر فائز تھے اور تمام سیاہ و سفید کا اختیار ڈاکٹر صاحب (ڈاکٹر ضیاء الدین) کے ہاتھ میں تھا اور یونیورسٹی کے معاملات پرانے ڈھرے پر چل رہے تھے۔ سید راس مسعود اور مسٹر ہارن کا آنا تھا کہ بالکل کایا ہی پلٹ گئی اور تمام امور میں خواہ تعلیمی ہوں یا انتظامی، کمیٹی کی سفارشات کے مطابق عمل ہونے لگا۔ حکومت میں ان کا یہ وقار کہ بڑے بڑے گورنمنٹ آف انڈیا کے یوروپین افسروں کو آدھا نام لے کر پکارتے تھے۔ والیانِ ملک میں یہ اعزاز کہ اعلیٰ حضرت نظام سے یونیورسٹی کے لیے لاکھوں لاتے تھے۔ پبلک لیڈروں میں یہ وقعت کہ ان کی دعوت پر کبھی گاندھی جی اور پنڈت جواہر لال نہرو اور کبھی علی برادران اور علامہ اقبال علی گڑھ آتے اور کئی کئی دن ان کے مہمان رہتے۔ یہ بھی سنادوں کہ سید صاحب مرحوم کی خدمت میں میری باریابی کی تقریب کیوں کر ہوئی۔ بات یہ تھی کہ سید صاحب جب تعلیم کے بعد یورپ سے تشریف لا رہے تھے ان کے اعزاز میں ارکان کالج نے ڈنر کا انتظام کیا تھا۔ میرے مخصوص کرم فرماؤں میں مرحوم عبدالعزیز پوری صاحب نے اصرار کیا کہ اس تقریب مسعود پر نظم ضرور ہونا چاہیے۔ مجھی حاذق صاحب نے فرمایا کہ میں خوش الحانی کے ساتھ بلند آواز سے پڑھ دوں گا۔ میں اکہ بجے لوگوں کے یہاں حاضر باشی اور معززمہمانوا

...تا رہا۔ یونیورسٹی کی فضا کالج کی فضا سے ملتی جلتی تھی۔
...ندگی یہاں زیادہ بھرپور، مکمل اور ہمہ جہتی نظر آتی تھی۔ گویا
...ہو دیا تھا اور یونیورسٹی سمندر۔ حکام یونیورسٹی ہمدرد

تھے۔ رفقائے کار قدردان اور طلبہ ادب شناس۔ بھر
اور کیا چاہیے۔ اس سے زیادہ کی کبھی ہوس ہی نہیں۔ یہ
سمجھ لیا کہ عام درس گاہ نہیں ہے جس میں بڑے چھوٹے،

...آمد پر قصیدہ نگاری خلاف وضع سمجھتا تھا، اور اب بھی سمجھتا ہوں) عذر کرنے لگا۔ بالآخر ان کا اصرار میرے انکار پر غالب
...یا اور میں نے ارتجالاً قاآنی کی زمین میں فارسی کے چند اشعار بطور تہنیت وتبریک لکھ لیے جب شب کو مجمع حضار میں پڑھے گئے
...سب نے بے حد پسند کیے اور سید راس مسعود کمال درجہ متاثر ہوئے۔ چنانچہ نظم کے اختتام پر مجھے طلب کیا اور نہایت اخلاق
...ے پرسش احوال کی اور فرمایا "مجھ سے ملتے رہنا" مرحوم کی عادت تھی کہ جب کسی نئے شخص سے ملتے تو اس کا امتحان ضرور لیتے
...راس خوبی کے ساتھ کہ پتہ نہ چلتا کہ امتحان ہو رہا ہے۔ جب پہلی بار [illegible] حاضر ہوا تو یاد ہے کہ انہوں نے مجھ سے غالب کا
...سب ذیل شعر دریافت فرمایا۔

گلہ ہے شوق کو دل میں بھی تنگئ جا کا — گہر میں محو ہوا اضطراب دریا کا

...میں نے صحیح مطلب بتایا تو بہت محظوظ ہوئے۔ ان کے ذہن میں اردو کلاسیکل لٹریچر کو مغربی up to date کے ساتھ اشاعت
...بیت پر گھر گھر پھیلانے کی اور ملک کے گوشے گوشے سے نوادر کتب لاکر علی گڑھ میں جمع کرنے کی ایک بڑی اسکیم تھی جس کو
...اہر کر کے فرمایا کہ آیا تم اس میں مجھے مدد دے سکتے ہو۔ میں نے عرض کی کہ جہاں تک میرے امکان میں ہے حاضر ہوں
...فسوس کہ ان کی عمر نے وفا نہ کی اور یہ اسکیم قول سے فعل میں نہ آسکی۔ وہ علی گڑھ سے بددل ہو کر بھوپال تشریف لے گئے
...ور وہیں داعی اجل کو لبیک کہا۔

راس مسعود کے علی گڑھ چھوڑنے پر ڈاکٹر ضیاء الدین جو پہلے پرو وائس چانسلر رہ چکے تھے، وائس
...انسلر منتخب ہوئے۔ اگرچہ راس مسعود اور ڈاکٹر صاحب میں نظریاتی اختلاف تھا مگر ڈاکٹر صاحب کے دماغ کی رسائی
...معاملہ فہمی اور کارگزاری میں کوئی شبہ نہ تھا۔ وہ ایک غریب گھر سے تعلق رکھتے تھے اور غریب طلبہ کی مشکلات خوب سمجھتے تھے
...ہ علی گڑھ کی ہر رگ سے واقف تھے اور اچھا کہو یا بُرا "معمولی مہتر سے لے کر اعلیٰ پروفیسر تک کا تقرر اپنے ہاتھ میں رکھنا
...پسند کرتے تھے۔ علی گڑھ والوں کا TACT (محل شناسی) مسلم ہے۔ اور ڈاکٹر صاحب TACT کا کامل نمونہ تھے۔
TACT پر ایک قصہ یاد آیا جو ایک دفعہ موصوف ہی نے بیان فرمایا تھا۔ کہتے تھے کہ ایک مرتبہ کسی سرکاری کمیٹی پر جانا
...ہو جس کے ممبر میرے سوا سب اعلیٰ انگریز عہدے دار بھی تھے۔ [illegible] پہاڑی پر تھا جہاں ایک اجڑے ہوئے ڈاک بنگلے
...اور چوکیدار کے سوا کچھ نہ تھا۔ ایک ساتھی نے کہا۔ ڈاکٹر! اس وقت چائے کی سخت خواہش ہے۔ تم کہا کرتے ہو کہ علیگڑین
...بڑے TACTFUL ہوتے ہیں اگر چائے پلواؤ تو جانیں۔ میں نے جواب دیا۔ ٹھہریے! سب انتظام ہوا جاتا ہے۔ یہ
...باتیں ہو ہی رہی تھیں کہ چوکیدار نے خبر دی کہ کوئی صاحب آپ سے ملنا چاہتے ہیں۔ بلایا تو معلوم ہوا کہ علاقے کے تحصیلدار
...ہیں اور ہم لوگوں کی آمد کی خبر اخبار میں پڑھ کر کئی میل سے ملاقات کے لیے آئے ہیں۔ یہ کسی زمانے میں علی گڑھ میں طالب علم

افراد ماحت کا سوال ہو۔ بلکہ ایک کنبہ ہے جس کے اندر استاد بزرگ خاندان یا باپ کی حیثیت رکھتا ہے اور شاگرد خوردوں یا اولاد کی۔ نتیجہ یہ ہوا کہ تمام طلبہ جن میں شریف صاحبزادے، امیرزادے، نواب زادے متوسط حال اور غریب ہر درجے کے نمائندے تھے پھر سب کی فطرت جدا، طینت جدا، طبیعت جدا، خصلت جدا۔ تاہم سب میرے خلوص کا جواب احترام

رہے تھے۔ میں نے ان سے پوچھا کیا یہاں چائے کا بندوبست ہو سکتا ہے۔ بولے۔ جی میں لیتا آیا ہوں۔ ذرا دیر میں میز چائے کے سامان، مکھن، ٹوسٹ، کیک اور پھلوں سے بھر گئی۔ میں نے دونوں ساتھیوں آواز دی اور وہ یہ لوازم دیکھ کر دنگ رہ گئے۔ ڈاکٹر صاحب پر اکثر اصحاب نکتہ چینی کرتے تھے لیکن اعتراض کے ساتھ ہی ان کے دو وصفوں کا اعتراف بھی کرتے تھے۔ یعنی اپنے مخالفوں کو بھی نقصان نہ پہنچانا اور علی گڑھ چھوڑنے پر بھی دہلی کے زمانۂ قیام میں فرزندگانِ درسگاہ کے کام آنا۔ اکثر دیکھا گیا ہے کہ ریل سے اتر کر گھر آئے اور فوراً بغیر لباس تبدیل کیے اپنے دفتر میں بیٹھ کر کاغذات دیکھنے لگے۔ حد ہو گئی کہ گھر کے اندر بیوی پر سکرات کا عالم ہے اور وہ باہر دفتر میں بیٹھے ہوئے یونیورسٹی میں کسی آنے والے معزز مہمان کی پذیرائی کے لیے ہدایات دے رہے ہیں۔ سر شاہ سلیمان کی وائس چانسلری کا دور بھی بڑا شاندار تھا۔ موصوف ان اعلیٰ اوصاف کے حامل تھے جو کسی قوم کے لیے بھی باعث نازش ہو سکتے ہیں۔ قانون، ریاضی، سائنس، عربی اور اردو میں ان کی ہستی نوادر عصر میں شمار ہونے کے قابل تھی۔ دماغ اور زبان اس قدر عجلت سے کام کرتے تھے کہ حیرت ہوتی تھی۔ اِدھر آپ نے اپنی بات مکمل نہیں کی اُدھر انھوں نے آپ کا مافی الضمیر سمجھ کر جواب دینا شروع کر دیا۔ بے مثال قابلیت اور اعلیٰ دنیاوی اعزاز کے باوجود وہ اسلامیت، مشرقیت اور کسر نفسی کا مکمل نمونہ تھے۔ شروع شروع میں جب وہ بیرسٹر ہو کر ولایت سے آئے اور اپنے والد ماجد کی خدمت میں الٰہ آباد حاضر ہوئے تو لوگوں نے دیکھا کہ جب والد جانے کے لیے اٹھنے لگے تو انھوں نے کمال ادب سے ان کی نعلین اٹھا کر سامنے رکھ دیں۔ دیکھنے والوں نے اسی وقت ان کے روشن مستقبل کی پیشین گوئی کر دی۔ چنانچہ وہ جوڈیشیل سروس کے اونچے سے اونچے مناصب پر سرفراز ہوتے۔ علی گڑھ کی وائس چانسلری کے زمانہ میں وہ دہلی سے ہر ہفتے میں دو دن کو تشریف لاتے اور اپنے سفر اور قیام کا بار خود اٹھاتے۔ حتیٰ کہ ڈائننگ ہال کے کھانے کے دام اپنی جیب سے دیتے اور رات کو کونسل کے کمرے میں آرام کر لیتے۔ نواب اسماعیل خاں ایک بھاری بھرکم پُر وقار شخصیت والے وائس چانسلر تھے۔ مگر وہ زیادہ دنوں تک وائس چانسلر نہ رہ سکے۔ ان کے بعد ڈاکٹر ذاکر حسین آئے۔

ذاکر صاحب جس بلند و بالا شخصیت کے مالک اور دل و دماغ کی جن عظیم صلاحیتوں کے جامع تھے۔ ان سے ایک دنیا واقف ہے۔ لیکن صحت کے روز افزوں انحطاط نے موصوف کو علی گڑھ چھوڑنے پر مجبور کیا اور بعد کو حکومتِ ہند کے اصرار نے ان کو اپنی جانب کھینچ لیا۔ جہاں گورنری، نیابت اور صدارت ان کی پذیرائی کی منتظر تھیں۔ زیدی صاحب ڈاکٹر ذاکر حسین کے نقشِ قدم پر چلے اور خاصے کامیاب رہے۔ ان کے بعد بدرالدین طیب جی کا زمانہ آیا اور علی گڑھ کے لیے نئی بشارت لایا۔ لوگوں کا خیال تھا کہ ایک آئی۔ سی۔ ایس یہاں کیا کامیاب ہو گا۔ مگر طیب جی نے

ے دیتے تھے۔ بارہا ایسا ہوا ہے کہ وہ لوگ اپنی درسیات
ہیں مدد لینے یا اپنی ذاتی مشکلات میں مشورہ کرنے کے
لیے میرے مکان پر آئے ہیں اور میں اپنی تمام مصروفیات
چھوڑ چھ چھ سات سات گھنٹوں تک ان کے کام میں
منہمک رہا ہوں۔ حقیقت یہ ہے کہ اس عظیم قومی درس گاہ
و محض اینٹ اور چونے کی عمارت تصور کرنا بڑی غلطی ہوگی۔
یہ سرسیّد اور ان کے لائق رفقاء[۲] کے خوابوں کی تعبیر ہے۔
یہ وہ درس گاہ ہے جس نے ہر زمانہ میں
بڑے بڑے مردانِ کار پیدا کیے۔ آفتاب احمد خاں، سیّد
نیل احمد، میر ولایت حسین اور حبیب اللہ جیسے فدایانِ
ملت، ڈاکٹر ضیاء الدین، ڈاکٹر ولی محمد، ڈاکٹر عبدالحق، مولوی
بیز مرزا جیسے فاضلانِ عصر۔ علی برادران، رفیع احمد قدوائی،
ج مہندر پرتاب، خواجہ غلام الثقلین، سر رضا علی، ڈاکٹر
مود، خواجہ عبدالمجید، سابق صدر پاکستان محمد ایوب،
شیخ عبداللہ، عبدالرب نشتر، نواب صاحب بھوپال،
یسے ممتاز رہنما۔ ڈاکٹر ذاکر حسین، غلام السیدین اور
بداللہ جیسے ماہرانِ تعلیم، مولانا ظفر علی، میر محفوظ علی،
فی عبدالغفار، مولوی عنایت اللہ، ڈاکٹر عبدالرحمٰن
بنوری، سجاد حیدر، سلطان حیدر، خوشی محمد ناظر،
سرت موہانی، فانی بدایونی جیسے سلطانِ ادب و شعرا اس کی
آغوش کے تربیت یافتہ ہیں۔ یہ وہ درس گاہ ہے جس کو ایشیا[۳] میں
مسلمانوں کا سب سے بڑا قومی و ثقافتی مرکز کہنا چاہیے۔
یہ دراصل سرسید کی علی گڑھ تحریک کا سب سے بڑا مظہر ہے۔
سرسید نے کن حالات کے تحت اس تحریک کی
بنا ڈالی، اس کی تفصیل میں نہ جانے کا وقت ہے، نہ ضرورت
کیونکہ سرسیّد کے سوانح اور درس گاہ کی تاریخ پر لکھنے والوں
نے بہت کچھ لکھا ہے۔ البتہ اتنا یاد رکھنا چاہیے کہ ۵۷ء کی جنگ
آزادی میں ناکام رہنے کے بعد قوم کا حال سراسر تباہ تھا۔
اس کا مستقبل تمام تر تاریک نظر آتا تھا۔ بالکل یہ کیفیت تھی
کہ جیسے گھٹا ٹوپ تاریکی چھائی ہو، بجلی چمک رہی ہو، بادل
گرج رہے ہوں، سمندر میں طوفان برپا ہو اور ایک شکستہ
کشتی بھنور میں پھنس گئی ہو ؎

شبِ تاریک و بیمِ موج و گردابے چنیں حائل

سچ ہے ایسی حالت میں کشتی اور اس کے ملاح پر جو کچھ گزرتی
ہوگی سبکسارانِ ساحل اس کا کیا اندازہ کر سکتے ہیں۔ یہ
کشتی ملّت کی کشتی تھی اور یہ ملاح سرسیّد۔
سرسید نے ۱۸۵۷ء کی شورش کے تباہ کن
اثرات بچشمِ خود دیکھے۔ یوں تو تمام ہندوستانیوں کو ناکامی
کا خسارہ اٹھانا پڑا، مگر مسلمان خاص طور سے انگریز کے انتقامی
جوش کا نشانہ بنے کیونکہ ہر جگہ ہندو مسلمانوں کی شورش کا

---

[۱] بے لاگ گفتگو، مدبرانہ اور ہمدردانہ روش سے اس طرح کام کیا کہ آج تک علی گڑھ والے ان کو محبت اور عزت سے یاد کرتے ہیں۔
۔ انہیں مخلصانہ تعلقات کا اثر ہے کہ اب بھی اس زمانہ کے طلبہ جو اکثر بفضلہٖ اعلیٰ مناصب علم و عمل پر فائز ہیں جب مل جاتے
ہیں تو انتہائی ارادت سے پیش آتے ہیں۔
[۲] سرسید کے رفقاء میں چراغ علی، سمیع اللہ خاں، محسن الملک، وقار الملک، زین العابدین، نذیر احمد، ذکاء اللہ، حالی، شبلی مشہور ہیں
جو نورتن کہا جائے تو بجا ہے۔
[۳] ایشیا کی قید اس لیے لگائی کہ افریقہ میں جامعہ ازہر مسلمانوں کا سب سے بڑا علمی مرکز ہے۔

واسطہ مغلیہ حکومت کے اقتدار کو بحال کرنا تھا۔ اُدھر انگریزوں
کو مسلمانوں سے نفرت اُدھر مسلمانوں کو انگریزوں سے وحشت
اس کے علاوہ انھوں نے اندازہ کیا کہ مسلمان مذہب کی جگہ
توہمات میں گھرے ہوئے ہیں۔ جدید تعلیم کو کفر سمجھتے ہیں۔
ادب میں تکلف اور لایعنی خیالات کے عادی ہیں، سیاست
سے بیگانے اور بیہودہ رسموں کے دیوانے ہیں۔ اس لیے انھوں
نے طے کیا کہ ان کو مذہب، تعلیم، ادب، سیاست اور سماج
کے جدید علمی حقائق سے روشناس کیا جائے، اسی تحریک کا
ایک مظہر ایم اے او کالج تھا جو اب خدا کے فضل سے یونیورسٹی
بن چکا ہے۔ اس پر قوم کی طرف سے جس قدر ان کی مخالفت
ہوئی اس سے کون ناواقف ہے۔ ان امور کی تفصیل یہاں
غیر ضروری ہے۔ با ایں ہمہ مناسب معلوم ہوتا ہے کہ ان کے
بارے میں جو چند غلط فہمیاں ہیں ان کی طرف اشارہ کر دیا
جائے۔

کہا جاتا ہے کہ ان کا مطمح نظر صرف یہ تھا کہ مسلمانوں کو
بڑے بڑے عہدے مل جائیں۔ ہمارے خیال میں معترض حضرات
نے یا تو حقیقت کو سمجھا نہیں، یا سمجھنے کی کوشش نہیں کی۔ انھوں
نے اسٹریچی ہال کا سنگِ بنیاد رکھے جانے کے وقت لارڈ لٹن
سے صاف کہا تھا کہ مجھے امید ہے کہ یہ پودا کبھی درخت بن جائے
گا جس کی شاخیں برگد کی طرح دور دور پھیلیں گی اور یہاں
سے فارغ ہونے والے ملک کے طول و عرض میں آزاد تحقیق،
رواداری اور اخلاق کا پیام پہنچائیں گے۔ کہا جاتا ہے کہ
انھوں نے مسلمانوں کو غلامی کا سبق پڑھایا۔ لیکن اعتراض
کرنے والے ان کی کتاب "اسباب بغاوتِ ہند" دیکھ لیتے
تو ایسا کہنے کی جرأت نہ کرتے۔

کہا جاتا ہے کہ انھوں نے ہندو مسلم تفرقہ کا بیج بویا۔ مگر یہ
الزام بھی عدم واقفیت پر مبنی ہے۔ خود سر سید رقم طراز ہیں

میں نے بار بار کہا ہے اور پھر کہتا ہوں کہ
ہندوستان ایک دلہن کی مانند ہے جس کی
خوبصورت اور رسیلی دو آنکھیں ہندو اور مسلمان
ہیں۔ اگر وہ دونوں آپس میں نفاق رکھیں گے
تو وہ پیاری دلہن بھینگی ہو جائے گی۔"

میرے زمانہ میں جو اساتذہ یہاں برسرکار تھے،
ان میں اکثر کی ہستی کسی یونیورسٹی کے لیے بھی سرمایۂ مباہات
ہو سکتی تھی۔ تاریخ میں پروفیسر حبیب، تعلیمات میں پروفیسر
حبیب الرحمٰن، فلسفے میں ڈاکٹر ظفر الحسن، معاشیات میں
ڈاکٹر ایل کے حیدر۔ سائنس میں پروفیسر بابر مرزا اور
کرنل حیدر خاں، شعبۂ دینیات میں مولانا سلیمان اشرف
اور مولانا راغب بدایونی، عربی میں مولانا میمن، اردو میں
پروفیسر رشید احمد صدیقی اور مولانا احسن مارہروی وغیرہم
کے علمی و عملی اکتسابات کے بیان کے لیے ایک دفتر چاہیے۔ مگر
بخوف طوالت چھوڑتا ہوں۔ البتہ جی نہیں مانتا کہ اپنے شعبے
(فارسی) کے رفقاء کے بارے میں چند جملے کہے بغیر گزر جاؤں
شعبۂ فارسی کے صدر ڈاکٹر ہادی حسن تھے جن کو قدرت نے
غیر معمولی ذہن اور حافظہ دیا تھا۔ سرو قد، خوبرو و خندہ پیشانی
کہ بات کریں تو منہ سے پھول جھڑیں، نقل کرنے پہ آئیں تو
روتوں کو ہنسائیں۔ جب وہ اسپیچ دیتے تھے تو ہزاروں
کے مجمع پر مکمل سکوت چھا جاتا تھا ـــــ وہ جو کسی نے کہا ہے
کہ کسی کی آنکھ میں جادو تری زباں میں ہے ـــ شاید
ان میں دونوں باتیں تھیں۔ میں نے خود دیکھا ہے کہ جب

لہ میں سید صاحب کی اکثر تاویلات کو نہیں مانتا۔

وہ انگریزی میں تقریر ختم کرچکے تو فاضل صدر جلسہ مسٹر ریز
باتھم پرو وائس چانسلر نے اعتراف کیا I CAN NOT
EXPRESS MYSELF SO BEAUTIFULLY
AS DR HADI HASAN HAS DONE
اسی طرح جب وہ فارسی میں گل افشانی گفتار پر آتے تو اچھے
اچھے ایرانی فضلاء تصویر حیرت بن جاتے۔ یونیورسٹی میڈیکل
کالج کے لیے قوم سے پچاس لاکھ کی رقم وصول کرلینا ڈاکٹر
ضیاء الدین کی کوشش اور ڈاکٹر ہادی حسن کی کاوش ہی کا
ثمرہ تھا۔ ہادی صاحب کی موت تمام احباب کے لیے دردناک
حادثہ تھی۔

شعبہ کے دوسرے استاد الحاج حمید الدین خاں
تھے جو بفضلہ بقید حیات ہیں۔ وہ علی گڑھ کے عاشق بھی ہیں
اور ناقد بھی۔ وقت کے اتنے پابند اور اصول کے اتنے سخت
کہ خواہ وائس چانسلر کے ہاں میٹنگ ہو یا ایم اے کا کلاس
ہو۔ اگر اول الذکر کو کوئی کام لگ گیا یا آخر الذکر پانچ منٹ
بعد آئے تو آپ قطعاً نہیں ٹھہرتے۔ پورٹ فولیو اٹھایا اور
یہ جا وہ جا۔ نہایت مدبر بےلوث اور بے حد بے باک۔ لوگ اس
کو ان کی درشت مزاجی پر محمول کرتے ہیں کریں۔ میں تو
اصول پرستی کہتا ہوں۔ یادش بخیر۔ محمد صادق انتہار کے
باغ و بہار اور بلا کے بذلہ سنج۔ دوستوں کے دوست ساتھیوں
پر شفیق۔

قارئین شاید خوش ہوں کہ میں نے اب تک
علی گڑھ کے عام ماحول اور خصوصاً وہاں کے طلبہ کی زندگی کے
بارے میں کچھ نہیں کہا۔ مجھے خود اس بات کا خیال ہے
مگر کیا کیا جائے، بات میں بات نکلتی چلی آئی ورنہ در اصل
ٹیپ کا بند تو یہی تھا۔ میں تو یہ جانتا ہوں کہ علی گڑھ کی
فضا بے تعصبی میں اور اس کے طلبہ امن پسندی میں مثالی
حیثیت کے مالک ہیں۔ شروع سے علی گڑھ کے دروازے
بغیر امتیاز مذہب و قوم ہر ایک کے لیے کھلے رہے ہیں۔ شاید
لوگوں کو یہ معلوم ہو کر تعجب ہوگا کہ ایم اے او کالج کے
سب سے پہلے گریجویٹ بابو ایشوری پرشاد ساکن ضلع
علی گڑھ تھے۔ وہاں کے طویل زمانہ قیام میں میں نے اساتذہ
کو بھی برتا اور طلبہ کو بھی پرکھا۔ لیکن بات چیت میں، برتاؤ
میں، رکھ رکھاؤ میں کبھی یہ سوال نہیں اٹھا کہ فلاں مسلمان
ہے اور فلاں ہندو۔ یا عمر سنی ہے اور زید شیعہ۔ غور کیجیے
تو یہ بڑی بات ہے۔ جمعہ یا عیدین میں جب اہل سنت کا جم غفیر
دوگانہ پڑھ کر مسجد سے باہر آتا ہے اور شیعہ حضرات نماز کے
لیے داخل ہوتے ہیں تو وہ دلکشا منظر دیکھنے سے تعلق رکھتا
ہے۔ آج ہر جگہ نوجوانوں کی قانون شکنی حد سے تجاوز کرچکی
ہے۔ علی گڑھ والوں کا ڈسپلن ضرب المثل ہوگیا ہے۔
استثنائی صورتیں کہاں نہیں ہوتیں لیکن فیصلہ سواد اعظم
کو دیکھ کر کیا جاتا ہے۔ ہمیں یاد ہے کہ جب گاندھی جی اور
علی برادران نے ترک موالات کا فیصلہ کیا؟ جب یورپ نے
ترکی کے "مرد بیمار" کا خاتمہ کرنا چاہا، جب بہار اور
کوئٹہ میں قیامت خیز زلزلہ آیا۔ جب علی گڑھ میں سیلاب
نے ستم ڈھایا تو یہی علی گڑھ کے فرزند تھے جو خدمت خلق
کے جذبہ سے سرشار اور سرفروشی کو تیار ہوگئے۔ آخر
میں شاعر کا ہمنوا بن کر مجھے یہ کہنا ہی پڑتا ہے کہ

دارم دلے ز آبلہ نازک نہاد تر
آہستہ پا نہم کہ سر خار نازک است (غالب)

منقول از رسالہ "آج کل" دہلی
جنوری ۱۹۷۱ء

فرخ جلالی
شعبۂ تاریخ
اے ایم یو علی گڑھ

عبدالرحمٰن حیرت
سرسید کے ایک قریبی ساتھی

سرسید کے کئی ساتھی کمال اور قومی خدمت میں ممتاز مقام کے مالک تھے۔ علی گڑھ تحریک پر مناسب کام نہ ہونے کے سبب سے علمی دنیا اور قومی حلقوں میں ان کے کام اور نام کو بھلا دیا گیا۔ سرسید نے جس اہم تعلیمی کام اور تہذیبی بیداری کو آگے بڑھایا، اس میں سرسید کے دوستوں اور رفیقوں کا معقول حصہ ہے۔

سرسید کے ایک ساتھی حافظ عبدالرحمٰن حیرت جھنجھانوی کے ادبی کمالات اور قومی خدمات کا تعارف کم ہوا ہے۔

حالیؔ نے اپنی کتاب "سرسید کی لائف الملقب حیاتِ جاوید" (اس سوانح عمری کا اصل نام یہی ہے[1]) میں عبدالرحمٰن حیرتؔ کے بارے میں غلام نبی خاں کی روایت سے لکھا ہے

"حافظ عبدالرحمٰن مرحوم جو سید محمود کے بچپن کے استاد تھے پینتالیس برس سرسید کے ساتھ رہے اور وہیں ان کا خاتمہ ہوا۔ مرتے وقت انھوں نے سرسید اور سید محمود کو بلایا۔ جب دونوں کو دیکھ لیا، فوراً روح پرواز کر گئی سرسید کو ان کے مرنے کا ایسا قلق ہوا کہ ایک وقت کھانا نہیں کھایا اور کئی دن تک ان کے مرنے کا رنج و الم رہا۔"

حالی - سرسید کی لائف الملقب حیات جاوید
صفحہ ۵۰۴

بظاہر حیرت کی بات ہے کہ حالیؒ نے اپنے ایک معاصر کا ذکر بحیثیت شاعر کے نہیں کیا۔ (نہایت افسوس سے لکھنا پڑتا ہے کہ حالیؒ نے بعض جگہ "سرسید کی لائف" میں حقائق سے چشم پوشی کی ہے)

خوش قسمتی سے جناب گیان چند جین کو عبدالرحمٰن حیرت کی دو مثنویاں مل گئیں اور اسی بنا پر ڈاکٹر گیان چند جین نے حیرت کو دوسرے درجہ کے مثنوی نگاروں میں شامل کر لیا۔ ڈاکٹر گیان چند جین نے حیرت کی دو مثنویوں کا ذکر کیا ہے[2]

[1] سرسید کی لائف الملقب حیاتِ جاوید - نامی پریس کانپور - ۱۹۰۱ء [2] ملاحظہ ہو اردو مثنوی شمالی ہند میں - گیان چند جین - ۱۹۶۹ - صفحہ ۶۵۴ - ۶۵۶

۱۔ جنگِ عشق

۲۔ ساقی نامہ

ڈاکٹر گیان چند جین کو شاید دیوان حیرت نہیں
ملا جو مطبع نول کشور سے فروری ۱۸۸۶ء میں چھپا تھا۔
اتفاق کی بات تھی کہ مارچ ۱۸۸۶ء میں حافظ حکیم عبدالرحمٰن
حیرت کا انتقال ہوگیا۔ اب ان کے کمالاتِ فن اور قومی خدمات
کا چرچا کون کرتا۔ سرسید کے دل سے لگی تھی۔ رو کر رنج
مٹا کر بیٹھ رہے اور دیوان شایع ہو کر گمنامی کے پردے
میں چھپ گیا۔

یہاں یہ ذکر بے جا نہ ہوگا کہ سرسید کا اکابر
دیوبند سے جو تعلق تھا، اس کی ایک اہم کڑی حافظ عبدالرحمٰن
بھی تھے۔

۱۳ مارچ ۱۸۸۶ء کے علی گڑھ انسٹی ٹیوٹ گزٹ
میں ادارہ کی طرف سے ایک تعزیتی نوٹ شایع ہوا۔ عبدالرحمٰن
حیرت علی گڑھ انسٹیٹیوٹ گزٹ کے مہتمم بھی رہے تھے۔
نوٹ یہ ہے۔

"حافظ عبدالرحمٰن صاحب مرحوم
حافظ صاحب نہایت نیک بزرگ و باخدا تھے
قرآن مجید ایسا عمدہ یاد تھا کہ متعدد رمضانوں
میں کل قرآن مجید ایک شب میں ختم کیا۔ علم
طب میں نہایت دستگاہ رکھتے تھے۔ علی گڑھ
کے غریب غربا کا علاج کرتے تھے۔ شاعر و
ناشر بھی تھے۔ حیرت تخلص کرتے تھے۔ ان کا
دیوان اور مثنویات اور انشاء فارسی ان
کی یادگار باقی ہیں۔ بہت برسوں تک ان کو
سینٹیفک سوسائٹی علی گڑھ سے تعلق تھا
(علی گڑھ انسٹیٹیوٹ گزٹ مع سپلیمنٹ جلد ۲۱ نمبر ۲۱ ۱۳ مارچ ۱۸۸۶ء)

ڈاکٹر اصغر عباس صاحب نے شاید سہواً
حیرت کو حسرت پڑھ لیا اور تحریر فرمایا کہ
"حافظ عبدالرحمٰن جھنجھانہ کے ایک ذی علم اور
صاحب تصنیف بزرگ تھے۔ حسرت تخلص
کرتے تھے۔"

سرسید کی صحافت از اصغر عباس۔ دلی ۱۹۷۵ء
ص ۸۹

ڈاکٹر گیان چند جین کو حیرت کی مندرجہ ذیل
مثنویوں کا علم نہیں ہو سکا۔ ممکن ہے کہ حیرت کا درجہ
ڈاکٹر صاحب کی نظر میں بڑھ جاتا۔

۱۔ اخگرِ عشق
۲۔ معاملاتِ عشق
۳۔ بطور مناجات بدرگاہ قاضی الحاجات
۴۔ مضمون میں ناپائیدار دنیا کے۔
۵۔ بطور تعزیت نامہ
۶۔ بطور مناجات نیم شبی
۷۔ دل کا غبار نکالنا (مثنوی ساتویں)
۸۔ مثنوی آہ دردناک
۹۔ مثنوی محمود
۱۰۔ حادثۂ دہلی
۱۱۔ سوسائٹی کی تعریف میں
۱۲۔ نامہ بنام حکیم محمد مشرف صاحب (کہ بتاریخ ۸ مئی ۱۸۶۷ء بطور مثنوی تھا)

ان مثنویوں کے موضوع عاشقانہ ہیں اور نصیحت و
قومی خدمت کے مختلف پہلوؤں کو بھی پیش کرتے ہیں۔
محمود نامہ میں سعدی کے کریما کا انداز ہے اور اس
میں دلنشین انداز میں اخلاقی اور عملی زندگی سے متعلق

ابھی یہ باتیں ملتی ہیں (سائین ٹیفک) سوسائٹی کی تعریف میں جو مثنوی ہے وہ نئے ادبی لہجے کی پہلی پکار ہے۔ چند منفرد اشعار ملاحظہ ہوں

بنائی یہ کر کر کے اک انجمن
کرتا ہوئے تحصیل کچھ علم و فن

فلاحت مساحت کی کیا کیا کلیں
جمع اس سوسائٹی میں کیا خوب ہیں

منگائے وہ آلات برقی عجیب
نہیں دیکھنے کو کب ہوئے تھے نصیب

بکھرا جو زرِ تب یہ پایا ثمر
کہ ہو جائیں گے ہندیں با ہنر

اس مثنوی کی وجہ سے نئی نظم کی تاریخ ۱۸۷۴ء سے پہلے لے جائی جا سکتی ہے۔

مثنوی انگم عشق کے ادبی حُسن اور محاکات پر اس وقت توجہ نہیں دی جا سکتی ہے۔ صرف دو شعر ملاحظہ ہوں

یہ پسینے پر پسینے آتے ہیں۔
جیسے پانی میں ابھی یاں نہاتے ہیں

رشکِ گل سے روئے گل شرماتے ہے
عرقِ خجلت میں ڈوبا جاتے ہے

مثنویات کے علاوہ دیوانِ حیرت میں بارہ قصیدے (اور کچھ تہنیت نامے بھی ہیں۔ کچھ قصیدے سرسید کی مدح میں ہیں۔ حیرت کے قصیدوں میں تمام فنی لوازم موجود ہیں۔

قصیدے کی تاریخ بغیر قصائد کے مکمل نہیں ہو سکتی۔ حیرت کی غزلیں عشق کی رنگینی اور حسن کی دلآویزی کا بہترین مظہر ہیں۔

اس عشق نے رکھا ہے نہیں مجھکو کہیں کا
ہے نقش میرے دل پہ کسی پردہ نشیں کا

کیوں جلسۂ عشاق میں آتا ہے تو زاہد
کیا راہ محبت بھی ہے رستہ کوئی دیں کا

تغزل کے علاوہ حیرت نے نعت رسول میں فدویانہ اور فنکارانہ مضامین خوب نظم کیے ہیں۔ ایک مقطع دیکھیے

حیرت جو ذائقے محمدؐ کی یاد میں
قند و شکر جہاں کے ہیں لیے کہاں لذیذ

عبدالرحمٰن حیرت کا سرسید کے استاد مولانا نورالحسن کاندھلوی سے خاص تعلق تھا۔ سرسید کے وہ طویل مدت تک رفیق اور شریک کار رہے۔ علی گڑھ انسٹیٹیوٹ گزٹ کے انتظام اور اہتمام میں مستقل حصہ لینا کوئی معمولی بات نہیں ہے اور پھر سرسید کے ساتھ رہنا اور ان کی سچی مذہبیت کا معترف رہنا حافظ عبدالرحمٰن کی عظمت اور صفاہت کی دلیل ہے۔

کیا یہ ممکن ہے کہ ہمارے دانش کدے عبدالرحمٰن حیرت کی طرف توجہ کریں۔

پرنٹر پبلشر قاضی معز الدین احمد نے لیتھو کلر پرنٹرس میں چھپوا کر سعد منزل تارینگلہ اے ایم یو علی گڑھ سے شائع کیا۔

کیا
آپ کی روزانہ کی خوراک سے
آپ کے بدن کو پوری قوّت اور
پورا فائدہ مِلتا ہے؟

اپنی روزمرّہ خوراک سے صحیح تغذیہ حاصل کرنا
اس بات پر منحصر ہے کہ آپ کا نظامِ ہضم کتنا
ٹھیک اور طاقتور ہے۔
سنکارا ہی ایک ایسا ٹانک ہے جس میں
طاقت دینے والے ضروری وٹامنوں اور معدنی
اجزا کے ساتھ چھوٹی الائچی، لونگ، دھنیا،
دارچینی، تیزپات، تلسی وغیرہ جیسی چودہ جڑی
بوٹیاں شامل ہیں۔ اس مرکب سے آپ کے
نظامِ ہضم کو طاقت ملتی ہے اور آپ کا بدن
اس کی مدد سے آپ کی روزمرّہ خوراک سے
صحیح تغذیہ اور بھرپور قوت حاصل کرتا ہے۔
Cinkara
سنکارا
ہر موسم اور ہر عمر میں
سب کے لیے بے مثال ٹانک
ہمدرد

جلد نمبر ۲ ۱۶ مارچ ۱۹۸۳ء شمارہ نمبر ۶

مسلمانوں کی رائے اور اُن کے خیالات، ہر ایک میں تقلید کرتے کرتے اور رسومات کے پابند رہتے رہتے ایسے پست اور پامال ہوگئے ہیں جن کے سبب کسی قسم کی ترقی کی تحریک اُن میں نہیں ہوتی پس جب تک کہ رائے کی آزادی ان میں پیدا نہ ہوگی، اُس وقت تک اُن میں تہذیب نہیں آئے گی۔"

(سر) سید احمد

خودسوزی قسط نمبر ۳	سید حامد
دینا نہ دینا	"
صحابہ کرام کا مثالی کردار	ابوالاعلیٰ مودودی
طلبا کا عربی عہد	شکیل احمد تمنا
سماج میں عورت کا مقام	اسرار حسین شیدا
رسوم و عادات	سرسید احمد خاں

فی پرچہ ایک روپیہ ششماہی ۱۱ روپے سالانہ ۲۰ روپے

بیرون ہند سے

فی پرچہ ایک ڈالر سالانہ ۱۵ ڈالر

ترسیل زر و خط و کتابت کا پتا

قاضی معزالدین احمد

صفدر منزل۔ تار نگر۔ اے ایم یو۔

علی گڑھ۔ یوپی

(202001)

مدیر: سید حامد وائس چانسلر
علی گڑھ مسلم یونیورسٹی

مدیر مسئول: قاضی معزالدین احمد

جلد نمبر ۲ ۱۶ر مارچ ۱۹۸۳ء شمارہ نمبر ۶

"تہذیب الاخلاق" فروری ۱۹۸۲ء میں دوبارہ جاری ہوا۔ ضرورت ہے کہ اس کی اشاعت کی توسیع کے لیے کوشش کی جائے۔ جن حضرات کا چندہ ختم ہو گیا ہے ان سے التماس ہے کہ وہ مزید ایک سال کے لیے رسالہ کے خریدار بنیں اور اپنے دوستوں کو بنائیں

سیّد حامد

مدیر

نمبر ۳

خودسوزی

جلد نمبر ۲ | ۱۶ مارچ ۱۹۸۳ء | شمارہ نمبر ۶

ہم نے کہا تھا کہ جہیز مانگنے کے روگ سے ہندوستانی مسلمان بچے ہوئے ہیں۔ یہ کہنا زیادہ صحیح ہوگا کہ وہ ایک حد تک بچے ہوئے ہیں۔ سماج کے اثرات کو فرد یا جماعت زیادہ حد تک روک نہیں سکتی پھر لالچ کو زیر کرنے والے ان مستثنیات میں سے ہیں جن سے کلیہ بنتا ہے۔ لہذا شمالی ہندوستان کے مسلمانوں میں بھی لڑکی والوں سے مطالبات کرنے کی بُری رسم چور دروازہ سے داخل ہو گئی ہے۔ اوّل تو خواتین کی عزت کا وہ بھرم جو اس دستور میں پنہاں ہے کہ پیغام یا درخواست لڑکے والے کی طرف سے جاتی ہے، آہستہ آہستہ اٹھتا رہا ہے۔ اچھے، تعلیم یافتہ اور برسرِ روزگار مسلمان لڑکوں کی کمی نے مسلمان لڑکیوں کے والدین کے لیے دشواریاں پیدا کر دی ہیں۔ پیام اب بھی لڑکے والوں کی طرف سے جاتا ہے، لیکن اکثر چھپا ہوا اشارہ لڑکی والوں کی طرف سے ہونے لگا ہے۔ گویا فراہمی اور مانگ والا بے رحم اقتصادی قانون اس پاکیزہ رشتہ پر بھی اثر انداز ہوا ہے جو کہ انسانی نسل کی بقا کا ضامن اور تہذیب و تمدن کی بنیاد ہے۔ اس بنیاد کی کجی ظاہر ہے جو حرص و ہوس کے مسالہ سے چنی گئی ہو۔ اشارہ کا جواب اکثر اشارہ سے دیا جاتا ہے یعنی ہم پیغام دینے کے لیے تیار ہیں لیکن آپ کیا دیں گے؟ اس طرح لڑکے والے صراحتِ سوال سے تو بچ جاتے ہیں لیکن حسن طلب کی غیرت سوز عادت سے محفوظ نہیں رہتے۔ یعنی طمع کی کار فرمائی یہاں بھی شروع ہو گئی اگرچہ طمع ایک خوشنما نقاب رُخ پر ڈال کر آئی۔ لالچ ابھی چور کی طرح دبے پاؤں داخل ہوئی ہے۔ تدارک نہ کیا گیا تو قزاقانہ آئے گی۔ ایسا ہوا تو نام بچے گا نہ ناموس۔ غنیمت ہے کہ پنہاں طلبی اور "سوالیہ اشارہ" کی یہ لعنت مسلمانوں میں عام نہیں ہوئی۔ قیاس کہتا ہے کہ یہ درمیانی طبقہ کے ایک حصہ تک محدود ہے۔ لیکن چنگاری کو آگ بنتے ہوئے دیر نہیں لگتی، اور آگ امتیاز برتنے

کی خوگر نہیں ہوتی۔ مسلمان والدین پتہ پانی کرنے والی اس فکر سے دوچار نہیں ہیں کہ لڑکے والوں کے مطالبات کیوں کر پورے ہوں گے۔ ان میں سے بیشتر کو یہ فکر ضرور دامن گیر ہے کہ لڑکیوں کو بَر کہاں ملیں گے۔ اچھے پڑھے روزگار یافتہ لڑکوں کی کمی اور اچھی تعلیم یافتہ لڑکیوں کی کثرت، آخر الذکر کے ماں باپ کے لیے سوہانِ روح بن گئی ہے۔ لیکن یہ بات اس وقت ہمارے موضوع کے دائرہ سے باہر ہے۔

ہمیں اس اثنا میں یہ جان کر تکلیف ہوئی کہ جنوبی ہند میں کیرالا کے مسلمان جو فی زمانہ اور باتوں میں شمالی ہند کے مسلمانوں سے بدرجہا بہتر ہیں، بے شرمی کے ساتھ جہیز مانگنے کی لعنت میں گرفتار ہیں۔ کوئی انھیں روکنے والا نہیں۔ چنانچہ جس طرح ہمارے ہندو بھائی اپنے لڑکوں پر اس کی روزگاری حیثیت کے مطابق ایک لیبل قیمت کا لگا دیتے ہیں، اسی طرح کیرالا کے پڑھے لکھے شہری مسلمانوں کا ایک طبقہ لڑکی والوں سے نذرانہ طلب کرنے لگا ہے۔ کیسی انوکھی بات ہے کہ پرائس ٹیگ (قیمت کا پرچہ) لڑکے پر لگا ہوا ہے اور بک رہی ہے لڑکی

"وہی ذبح بھی کرے ہے وہی لے ثواب اُلٹا"

بک رہی ہے لڑکی اور قیمت لڑکے والوں کے ہاتھوں میں جا رہی ہے۔

دلم بسوخت زحیرت کہ ایں چہ بوالعجبی است

اوپر کی سطروں سے پڑھنے والوں کا دھیان اس بات کی طرف گیا ہوگا کہ شادی کے سلسلہ میں لڑکی کی توہین اور لڑکے والوں کی ہوس کا یہ ننگِ انسانیت سلسلہ شہروں تک اور شہروں میں بھی درمیانی طبقہ کے ایک حصہ تک محدود ہے۔ گاؤں کی آبادی اور شہر کا ان پڑھ اور غریب طبقہ اس لعنت سے بچا ہوا ہے۔ اقبال نے خدا کی زبان سے کہلوایا تھا۔ ؎ "پردہ رکھتا ہے اگر کوئی تمہارا تو غریب"

غور کیجیے یہ بات بھی نرالی ہے کہ غریب لوگ اور ان پڑھ لوگ اس شرمناک لالچ اور جہالت سے محفوظ ہیں جو شادیوں کے سلسلے میں ہمارے خوشحال اور پڑھے لکھے ہندو بھائیوں اور بعض علاقوں میں ہمارے مسلمان بھائیوں سے سرزد ہوتی ہے جنھیں محفوظ ہونا چاہیے تھا وہی مبتلا پائے گئے۔ عجیب ستم ہے لیکن ہوس کا یہ سیلاب شہروں اور طبقوں تک محدود نہ رہے گا۔ شروعات شہروں اور پڑھے لکھوں اور خوشحالوں سے ہوتی ہے لیکن انجام سب کو اپنی لپیٹ میں لے لیتا ہے۔

یہ طلسم بھی اب ٹوٹ چکا ہے کہ جس جگہ ریاست فرد کی ضروریات کو پورا کرنے لگتی ہے وہاں سے لالچ کوچ کر جاتی ہے اور وہاں انصاف حکومت کرتا ہے۔ چین سے خبریں آ رہی ہیں کہ جن میں لڑکی کو ضائع کرنے کی کوششیں عام ہیں۔ گویا لڑکیوں کو خوش آمدید کہنے کے بجائے انھیں بارِ گراں سمجھا جاتا ہے۔ لڑکی کیا پیدا ہوئی والدین کی کمر ٹوٹ گئی۔ یہ عالم وہاں کا ہے جہاں ریاست مہد سے لحد تک کی ضمانت لیتی ہے؛ اس یقین کے ساتھ کہ انسان کا خاتمہ لحد پر ہے اور موت کے بعد کوئی زندگی نہیں۔ لیجیے یہ چین والے جاہلیت کے دور کے عربوں سے بھی بدتر نکلے جو لڑکیوں کو زندہ دفن کرنے کی کوشش کرتے تھے۔ اسلام نے اس شرمناک رسم کو ہمیشہ کیلیے بند کر دیا۔ اسلام ہی پہلا دین ہے جس نے سماج میں عورتوں کو عزت کا مقام اور وراثت کے حقوق دیے ہیں اور اب مسلمان بھی اس سیلاب میں بہ جانے کے خطرہ میں ہیں جو عورتوں کی توہین پر کمربستہ ہے جو اُن کی پیدائش کو آفتِ ناگہانی سمجھنے لگا ہے عبرت کا مقام ہے

(باقی آئندہ)

سید حامد

سیّد حامد

دینا نہ دینا*

ایک مالدار آدمی نے پوچھا "دینا کسے کہتے ہیں"؟

جواب ملا۔ "جب تم اپنی دولت میں سے دیتے ہو تو برائے نام دیتے ہو"

"جب تم اپنے میں سے دیتے ہو، تو کچھ دیتے ہو"

وہ لوگ بھی ہیں جن کے پاس بہت کچھ ہے اور وہ اس میں سے تھوڑا سا دے دیتے ہیں۔ وہ دیتے اس لیے ہیں کہ لوگ جانیں۔ ان کے من میں چھپی ہوئی یہ خواہش ان کے دینے کو اکارت کر دیتی ہے۔

ایسے لوگ بھی ہیں جن کے پاس بہت کم ہے اور وہ سب کچھ دے ڈالتے ہیں۔ یہ گروہ زندگی اور اس کی دریادلی میں اعتقاد رکھتا ہے، اس کا خزانہ کبھی خالی نہیں ہوتا۔

وہ لوگ بھی ہیں جو خوشی خوشی دیتے ہیں یہی خوشی ان کا انعام ہے۔

ایسے لوگ بھی ہیں جو تکلیف کے ساتھ دیتے ہیں۔ یہ تکلیف ان کا بپتسمہ ہے جو ان کو اخلاص کے حلقہ میں لے آتی ہے

کچھ لوگ ایسے بھی ہیں جو دیتے ہیں اور دیتے ہوئے نقصان یا تکلیف محسوس نہیں کرتے۔ وہ خوشی کی تلاش بھی نہیں کرتے؛ دیتے ہوئے انھیں یہ احساس بھی نہیں ہوتا کہ وہ کوئی کام ثواب کا کر رہے ہیں۔ وہ اس طرح دیتے ہیں جیسے سامنے کی وادی میں وہ لہلہاتا ہوا پھولدار پیڑ جو اپنی خوشبو ہوا میں بکھیر رہا ہے۔ ایسے دینے والوں کے ہاتھوں سے پروردگار کی مشیت ظاہر ہوتی ہے اور ان ہی کی آنکھوں کی اوٹ سے وہ دنیا پر مسکراتا ہے۔

مانگنے پر دینا اچھا ہے، پر بنا مانگے دینا اس سے بڑھ کر ہے۔

تمہارے پاس جو کچھ ہے ایک نہ ایک دن وہ سب کچھ دے دیا جائے گا۔

اس لیے ابھی دے ڈالو جب کہ دینے کا موسم تمہارے ہاتھ میں ہے، تمہارے وارثوں کے نہیں۔

تم کہتے ہو "ہم دیں گے ضرور لیکن صرف ان کو جو دراصل مستحق ہیں"

تمہارے باغ کے پیڑ تو یہ نہیں کہتے، اور

---

* اس اقتباس کو یہ سرخی مترجم نے دی ہے۔

نہ ہی تمہاری چراہ گاہ میں بھیڑوں کے گلے یہ کہتے ہیں
وہ تو اس لیے دیتے ہیں کہ وہ زندہ رہیں، دینا زندگی
ہے؛ مٹھی بند کر لینا، نہ دینا، موت ہے۔

اور تم ہوتے کون ہو کہ لوگ تمہارے
سامنے اپنے جگر کو چاک کر کے دکھاتے پھریں اور افتخار کا
جامہ تمہارے سامنے اُتار پھینکیں تاکہ تم ان کی اہمیت
کو برہنہ اور ان کے افتخار کو بے حجاب دیکھ سکو۔

پہلے اپنی خبر لو۔ بنا ہے تو دینے والے
ہو یا دینے کا ایک وسیلہ بن جاؤ۔ تم کیا دو گے؟ یہ
صرف زندگی ہے جو زندگی کو دیتی ہے یا دے سکتی ہے
تم ناحق سمجھتے ہو کہ تم دے رہے ہو۔ تمہارے حصہ میں تو
صرف دیکھنا آیا ہے۔ دینا کوئی اور ہی ہے۔"

خلیل جبران

[انگریزی ترجمہ سے ترجمہ]

بقیہ "سماج میں عورت کا مقام"

رنے کے لیے نہیں آتا بلکہ اس کے پاس جا کر داد خواہی کی جاتی ہے

اس کے علاوہ بھی خواتین کو کچھ مشکلات اور ہیں
ان کو اب بھی بہت سے تعلیمی اداروں میں ترقی کے مواقع نہیں دے
لئے۔ یونیورسٹیوں میں یکساں تعلیمی قابلیت اور تجربہ رکھنے کے
وجود ان کو مردوں کے مقابلے میں پوسٹ گریجویٹ تیچنگ کی
ہوتیں نہیں دی جاتیں۔ ممتحین بناتے وقت بھی کئی کالج
صاحب علم اور تجربہ کار اساتذہ کو نظر انداز کر دیا جاتا ہے۔
ی قسم کی دشواریاں ان کو دوسرے کاروباری اداروں اور
دفتروں میں بھی پیش آتی رہتی ہیں۔ مردوں کے مقابلے میں انہیں
یچے دھکیل دیا جاتا ہے۔ اس قسم کے امتیازی سلوک اور رکاوٹوں
دور کرنے کے لیے انہیں مل کر جدوجہد کرنا چاہیے۔

آخر میں خواتین کو ایک امکانی خطرے سے آگاہ کر دینا بھی
ضروری ہے۔ بیشک وہ اعلیٰ سے اعلیٰ تعلیم اور پیشہ ورانہ تربیت
حاصل کریں۔ معاشرے کی ترقی اور اصلاح میں مردوں کے
ساتھ بڑھ چڑھ کر حصہ لیں۔ زندگی کے ہر شعبہ میں ملکی مفاد کی
خاطر دیانت داری اور آزادی سے اپنے فرائض انجام دیتی رہیں
لیکن اتنی آزاد اور بے لگام نہ بنیں کہ امور خانہ داری اور
بچوں کی تربیت اور پرداخت سے بے پروا ہو جائیں اور
نسوانی شرم و حیا اور عفت و عصمت کا ہر حال میں پاس رکھیں
یہ چند ایسی خصوصیات ہیں جو زیادہ تر ان ہی کی ذات سے
مخصوص ہیں۔ انہی کے ساتھ طبقہ نسواں کا وقار وابستہ ہے
اگر ان کی طرف بے توجہی برتی گئی تو خلا پیدا ہو جائے گا۔ اور
خلا کا نتیجہ ہیجان و انتشار ہے۔ ان امور کی ذمہ داری باہر کے
کاموں میں ان کی شرکت کے منافی نہیں بلکہ معاون و مددگار
ہے۔ اگر ان سے انھوں نے غفلت برتی تو نہ صرف ان کی
نسوانیت کو بٹا لگے گا اور ان کی زندگی بے معنی ہو کر رہ جائے
گی بلکہ آنے والی نسلیں نکمی و نااہل بن کر ابھریں گی چنانچہ
ہم سے زیادہ بزعم خود ترقی یافتہ اور آزاد خیال ممالک آج
اس قسم کی بگڑی ہوئی صورت حال سے بیزار معلوم ہوتے
اور اس خطرے سے نپٹنے کی تدابیر پر سوچ بچار کر رہے ہیں
ان واقعات سے عبرت حاصل کرنی چاہیے۔
توقع ہے کہ یہ ہمدردانہ مشورہ صدا بصحرا ثابت نہ ہوگا۔

بقیہ صحابہ کرام کا مثالی کردار

لوگوں کے دلوں میں اُتر چکی ہوتی تھی۔ اسی وجہ سے جو
علاقے انھوں نے فتح کیے وہاں کی آبادی ان کی سیاسی
غلام نہیں بلکہ ان کی مرید اور معتقد بن گئی ......

[ماخوذ از سیرت اصحاب رسول۔ مولانا [illegible]]

مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودی

صحابہ کرامؓ کا مثالی کردار

دراصل اس عظیم تغیر کی وجہ کچھ اور تھی۔ جب مکہ معظمہ میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اسلام کی دعوت دیتے رہے، بہت کم لوگ اسے اور اس کے مضمرات کو سمجھ سکے۔ اس وقت صرف وہی لوگ اسے سمجھے جو بہت زیادہ اعلیٰ درجہ کا فہم و شعور رکھتے تھے، جو صاف اور بے کدورت ذہن رکھتے تھے اور اپنے اندر یہ صلاحیت رکھتے تھے کہ جاہلیت کے تمام تعصبات سے بالاتر ہو کر ایک حق بات کو محض حق ہونے کی بنا پر سمجھ بھی لیں، مان بھی لیں، عملاً اس کی پیروی اختیار بھی کر لیں اور پھر سر دھڑ کی بازی لگا کر اس کی علمبرداری کے لیے بھی اٹھ کھڑے ہوں۔

مگر جب ان صفات کی مختصر سی اصحابہؓ کرام کی جماعت تیار ہو گئی اور اس کو لے کر حضورؐ صلی اللہ علیہ وسلم نے مدینہ میں ایک اسلامی معاشرہ قائم کر دیا اور ایک آزاد اسلامی ریاست کی زمام اقتدار ہاتھ میں لے کر آپؐ نے اسلام کی پوری اصلاحی اسکیم کو اس معاشرے میں روبہ عمل لانا شروع کر دیا تو حالات یکسر تبدیل ہو گئے۔ اب لوگوں نے آنکھوں سے دیکھ لیا کہ یہاں کیسا امن ہے، کیسی نیکی اور خدا ترسی ہے۔ کیسی راست بازی اور ایمانداری ہے، یہاں کیسی عدالت ہوتی ہے، یہاں کس طرح اونچ نیچ برابر کی گئی ہے۔ یہاں کیسے اخوت اور مساوات قائم کی گئی ہے، یہاں کس طرح معاشی زندگی کی مشکلات اور الجھنوں اور خرابیوں کو رفع کیا گیا ہے۔ یہاں کتنا پاکیزہ ماحول ہے اور ستھرا اور کس قدر اعلیٰ درجے کا معاشرہ تیار کیا گیا ہے، جو تمام اخلاقی گندگیوں سے پاک ہے۔ اب آنکھیں رکھنے والے انسانوں کے لیے یہ ممکن نہ رہا کہ وہ اس روشنی کا انکار کر دیں جسے وہ علانیہ اپنے سامنے دیکھ رہے تھے۔

اس انقلاب کا نتیجہ یہ ہوا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے دنیا میں ایک پوری قوم ایسی تیار کر دی جس کی اجتماعی زندگی میں پورے کا پورا اسلام نافذ تھا، جس کے عقائد اور افکار و نظریات اسلامی تھے، جس کا مذہب خدائے واحد کے سوا کسی دوسرے کی بندگی اور پرستش سے آلودہ نہ تھا جس کی انفرادی سیرتیں اور اجتماعی اخلاق جاہلیت سے پاک ہو کر اسلام کے سانچے میں ڈھل چکے تھے۔ جس کا تمدن اسلامی تہذیب و تمدن کا نمونہ تھا اور جس کی ریاست کا پورا نظام اسلام کے قوانین پر چل رہا تھا۔ یہ پوری قوم اسلام کے لیے جینے اور اسلام کے لیے مرنے پر تیار ہو گئی۔ دنیا میں خدا کا کلمہ بلند کرنے کو اس نے اپنا قومی نصب العین بنا لیا اور اس کی ریاست کا مقصد وجود یہ قرار

پا گیا کہ جہاں اسے اقتدار حاصل ہو، وہاں اسلام کے اصولوں پر زندگی کا نظام چلائے اور جہاں اسے اقتدار حاصل نہیں ہے وہاں اسلام کی دعوت پھیلائے۔ اس طرح دنیا میں ایک پوری قوم ایسی تیار ہوگئی جو خود اسلام پر عامل تھی اور روئے زمین پر اسلام پھیلانا اس کا قومی مشن تھا۔ ایک مکمل ریاست ایسی وجود میں آگئی جو ایک طرف اپنے داخلی نظام میں اسلام کے اصولوں کا پورا عملی مظاہرہ کر رہی تھی اور دوسری طرف وہ اسلامی دنیا میں اسلام کی علمبردار تھی۔

ایسی ایک قوم اور ریاست بن جانے کے بعد جس طرح خلافتِ راشدہ کے زمانے میں اسلام پھیلا ہے، اس کے لیے تاریخ میں انفجار (EXPLOSION) کا لفظ استعمال کیا جاتا ہے۔ یعنی جیسے کوئی بم پھٹتا ہے اس طرح اسلام دنیا میں پھیلنا شروع ہوگیا۔ ایران اور روم کی سلطنتوں کے ماتحت جو لوگ رہتے تھے انھوں نے اپنی آنکھوں سے کیا معنی، کبھی اپنے تصور میں بھی وہ گورنر نہیں دیکھے تھے، جو سڑکوں پر پیدل چلیں، عام انسانوں کی طرح رہیں، ہر وقت اپنے دروازے ان لوگوں کے لیے کھلے رکھیں جنھیں کسی مدد کی ضرورت ہو، اور جس آدمی کو بھی کوئی تکلیف پہونچے وہ اُن کا دامن پکڑ کر کہہ سکے کہ مجھے یہ شکایت ہے اس کو رفع کیجیے۔ انھوں نے کبھی خواب میں بھی ایسے گورنر نہ دیکھے تھے اور نہ وہ سوچ سکتے تھے کہ دنیا میں ایسے بھی گورنر ہو سکتے ہیں لیکن جب اس مسلم معاشرے نے ان ممالک میں داخل ہو کر ایسے گورنر لوگوں کو اپنی آنکھوں سے دکھائی دیے تو آخر کتنے لوگ ایسے ہو سکتے تھے جو اندھے تعصب میں مبتلا ہو کر اس اخلاقی برتری کو تسلیم نہ کرلے۔

ان کی فوجیں [illegible] دنیا کے سامنے یہ نمونہ پیش کیا کہ ایک مفتوحہ شہر میں وہ داخل ہوتی ہیں، دونوں طرف بالاخانوں پر بنی ٹھنی عورتیں ان کے گزرنے کا تماشا دیکھنے کھڑی ہیں مگر ایک سپاہی بھی آنکھ اٹھا کر کسی ایک بالاخانہ کی طرف نہیں دیکھتا، پوری فوج گزر جاتی ہے اور اس کو پتہ نہیں چلتا کہ اوپر عورتیں کھڑی ہیں ......

...... ان فاتحوں نے اخلاق کا یہ نرالا کرشمہ بھی دکھایا کہ اگر دشمن کے دباؤ سے کبھی کوئی جیتا ہوا علاقہ انھیں چھوڑنا پڑ گیا تو نظم و نسق کے لیے عوام سے جو ٹیکس انھوں نے وصول کیے تھے وہ سب یہ کہہ کر واپس کر دیے کہ یہ ٹیکس ہم نے تمہاری حفاظت کی ذمہ داری ادا کرنے کے لیے وصول کیے تھے، اب چونکہ ہم اس ذمہ داری کو پورا نہیں کر سکتے اس لیے تمہارا روپیہ واپس کرتے ہیں۔ لوگ اس وقت تک جن حکمرانوں سے واقف تھے اُن کا حال یہ تھا کہ اگر انھیں کبھی کوئی علاقہ چھوڑنا پڑ جاتا تھا تو لیا ہوا پیسہ واپس کرنا تو درکنار جو کچھ لوگوں کے پاس ہوتا تھا وہ بھی لوٹ کر چلتے بنتے تھے۔ یہ اولیاء اور انبیاء کا سا اخلاق کسی حاکم گروہ میں دیکھنے کی کسی کو توقع نہ تھی کہ وہ سیاست اور ملک داری میں اس امانت اور دیانت سے کام لے گا۔

یہ تھی وہ اصل طاقت جس سے ابتدائی دور کے مسلمانوں نے دنیا کے ایک بڑے حصے کو مسخر کیا تھا۔ حقیقت یہ ہے کہ ان کی تلواروں نے جتنا کام کیا، اس سے کہیں زیادہ کام ان کے اخلاق اور کردار نے کیا۔ کیوں کہ ایک ایک آدمی پورے شعور کے ساتھ اسلام کو سمجھ کر ایمان لایا تھا اور سمجھنے کے بعد پھر اس کے مطابق اس نے اپنی سیرت بنائی تھی۔ اس لیے جس حیثیت میں انھوں نے کام کیا، اس میں اسلام کی صحیح نمائندگی کی اور اسی کی وجہ سے دنیا کی کوئی طاقت ان کے مقابلے میں نہ ٹھہر سکی ان کی تلوار کی کاٹ سے پہلے اُن کے اخلاق کی کاٹ

شکیل احمد تمنا
طبیہ کالج - اے ایم یو

طب کا عربی عہد

اکثر مورخین کی رائے کے مطابق پانچویں صدی عیسوی میں رومی شہنشاہیت کے خاتمے سے پہلے پندرھویں صدی کے وسط تک اس کا اطلاق ہوتا ہے، اس کی ابتداء عالم انسانی میں سب سے اہم بالشان واقعہ ظہور اسلام ہے خصوصاً دنیا میں اس کی جلد اشاعت اور عرب میں ایک عروج پر پہونچ جانا۔ ۶۳۲ء میں اسلامی نظام قائم ہونے کے بعد عربوں نے علمی اور طبی لحاظ سے جو مرتبہ حاصل کیا اور جو عظیم خدمات ان کے دور ایران میں انجام دیں، وہ تاریخ کے صفحات پر بکھری ہوئی ہیں۔ اُن کا یہ عہد نہ صرف عربی طب و علم الادویہ کی تاریخ کے لیے بلکہ پوری طبی تاریخ کے لیے سرمایۂ افتخار ہے۔

عربوں کے عہد زریں (عباسی عہد) یعنی ساتویں صدی عیسوی سے قبل عربی طب کو تین ادوار میں تقسیم کیا جا سکتا ہے

۱۔ زمانہ جاہلیت یا زمانہ قبل از اسلام
۲۔ عہد نبوی و عہد خلافت راشدہ
۳۔ عہد اموی

دراصل یہ تینوں دور خالص عربی اور دیسی طب سے تعلق رکھتے ہیں۔ اس عہد میں نہ دوسرے ممالک کے اثرات وہاں نظر آتے ہیں اور نہ دوسری چیزوں کی آمیزش محسوس ہوتی ہے۔ عربی طب کا یہ دور بنی امیہ تک رہا۔ اس کے بعد عباسی عہد سے طب کے جس دور کا آغاز ہ وہ خالص عربی اور مقامی معلومات کی نمائندگی نہیں کر مختلف اقوام اور ممالک کے لوگوں نے اس عہد میں عرب کی سرپرستی میں جو کارہائے نمایاں انجام دیے اور تراج جو بڑا کام انجام پایا (۳) کے نتیجے میں نہ صرف قدیم یونا طب میں گرانقدر اضافات ہوئے بلکہ دیسی عربی طب ڈھانچہ ہی بدل گیا۔ اس میں مقامی طب کے اثر سے ز بابل، یونان، روم، ایران اور ہند کے اثرات کی تھی۔ عہد زریں پر تبصرہ سے پہلے ان تینوں ادوار کا ضروری ہوگا

زمانہ قبل از اسلام

دوسری ہم عصر اقوام کے مقابلے میں عرب طبی ممتاز حیثیت نہیں رکھتے تھے۔ ظہور اسلام سے سال پہلے سے اگرچہ وہ طب کے ماہر چلے آتے تھے اعل ذوالفقار کی صورت میں ان کے یہاں طب موجود تھی۔ ج ان کی ذاتی معلومات و تجربات کے ساتھ بعض مورخین کے کلدانی طب کے اثرات بھی شامل تھے۔ لیکن دوسری فنی معلومات کی طرح ان کی طبی معلومات بھی نہایت محدود تھیں۔

عرب کے جغرافیائی محل وقوع سے ز

ذہنی و فکری تربیت کی وجہ سے یونانی، مصری و ہندی یہاں
تک کے ایرانی علوم کا اثر بھی نظر آتا ہے۔ اگرچہ دوسرے ممالک
سے ان کی تجارت کے روابط کا سلسلہ زمانہ دراز سے قائم
تھا اور ہندوستان کے ساحلی علاقہ تک ان کے قافلے آتے تھے
ہندوستان سے جو تجارتی اشیاء باہر جاتی تھیں ان میں
مثلاً صندل، کافور، تمر ہندی، جوز بوا، قرنفل، زنجبیل،
یاقوت، فلفل، قسط، بید، الائچی، عود، ریوند
چینی، دار چینی، توتیا، نارجیل، سھلانوا اور چھالیہ
وغیرہ طبی استعمال کی چیزیں ہوتی تھیں۔ لیکن اس کے
باوجود حیرتناک حد تک ان بیرونی ممالک کا کوئی قابل ذکر
اثر محسوس نہیں ہوتا۔ خود قرآن میں تین ایسی دواؤں
کا تذکرہ ملتا ہے جو سنسکرت سے لی گئی ہیں اور علم الادویہ
اور ہندوستان دونوں کے تعلق سے یہ ہمارے لیے بڑے
شرف کی بات ہے۔

۱ زنجبیل : جو زنجابر کی بگڑی ہوئی شکل ہے۔
۲- کافور : جو کپور کا معرب ہے
۳- مشک : جو شیکا سے بنایا گیا ہے۔

اس طرح احادیث میں جن بہت سی دواؤں کا
تذکرہ کیا گیا ہے ان میں تین دوائیں ایسی ملتی ہیں جنہیں
ان کی ہندی نسبتوں کے ساتھ موسوم کیا گیا ہے۔

(۱) تمر ہندی۔ (۲) عود ہندی (۳) قسط ہندی

تمر ہندی عربی ہی کے واسطے سے یورپ پہنچی۔
لیکن ان سب کے باوجود عربی علوم و تہذیب کی طرح
ان کی طب و ادویہ دیسی و مقامی تھی اور ان کے علاج
کے طریقے مخصوص تھے جن میں بیرونی اثرات کی آمیزش کم سے
کم شامل تھی۔

زمانہ جاہلیت میں عربوں کے یہاں علاج کے دو طریقے
رائج تھے۔

۱- طریقہ علاج کوہان

اس طریقہ میں جادو منتر۔ کعبہ میں جانوروں کی
کی قربانی، نذر و نیاز وغیرہ کے ذریعہ بیماری کو دور
کرنے کی کوششیں کی جاتی تھیں۔

بدو عرب جو جادو سے کام لیتے تھے تکلیف کی جگہ
عام طور پر اپنا لعاب دھن لگا دیتے تھے۔ Prof. E. G. Brown
نے مثال کے طور پر عربی شاعر جریر کا واقعہ نقل کیا ہے کہ
اس نے اپنی لڑکی ام غیلان کی شادی ابلق نام کے ایک ساحر
سے اس لیے کردی تھی کہ اس نے اپنے سحر کے ذریعہ اسے
مرض مشرعی سے نجات دلائی تھی۔

۲- طریقہ علاج حقیقی،

اس میں جڑی بوٹیوں سے کام لیتے تھے اور اعمال
جراحیہ بھی استعمال کرتے تھے۔ فصد، حجامت، کئی اور بتر
(Amputation) وغیرہ ان کے مقبول طریقے تھے۔ داغ
دینے کو وہ آخری علاج تصور کرتے تھے

"و آخر الدواء الکی" ان کا مشہور مقولہ تھا
انہیں دونوں طریقہ علاج کے مطابق اطباء کے پاس دو بکس
رہتے تھے۔ ایک میں عقاقیر اور دوسرے میں جادو منتر سے
متعلق چیزیں تھیں۔ قدیم عربی طب کا سب سے بڑا المیہ یہ
ہے کہ تاریخ نہ صرف حوالہ پیش کرنے سے قاصر ہے بلکہ
اس کے صفحات سے کسی طبیب کا پتہ نہیں چلتا۔ اگرچہ ان
کے یہاں لقمان کا نام ملتا ہے لیکن ان کے بارے میں
مفصل معلومات نہیں ملتی۔

ابن قفطی اور ابن ابی اصیبعہ دو طبی مورخین
گزرے ہیں۔ ابن قفطی نے "اخبار الحکماء" اور ابن ابی
اصیبعہ نے "عیون الانباء فی طبقات الاطباء" نامی کتابیں

لکھی ہیں ان مورخین نے پہلے عرب طبیب کی حیثیت سے جس شخص کا تذکرہ کیا ہے وہ حارث بن کلدا ثقفی" ہے۔ اسلام کے قریبی عہد سے تعلق رکھنے والے اس طبیب کے علاوہ اور کسی طبیب کا تذکرہ نہیں ملتا اور اب ہمارے لیے ان سے واقف ہونے کی کوئی سند نہیں ملتی۔

حارث بن کلدا محض ایک بدوی طبیب نہیں بلکہ یونانی طب کا باقاعدہ تعلیم یافتہ تھا۔ اس نے آنحضرت کا زمانہ پایا ہے اس نے جندیشاپور کے مشہور طبی مدرسہ میں تعلیم حاصل کی ہے۔ اس سے عربوں میں دوسری قوموں کے مقابلے ایرانی اثرات کا اندازہ لگایا جا سکتا ہے۔ ایران اور روم کی سرحدیں یوں بھی آپس میں ملی ہوتی تھیں، اس لیے دوسرے ملکوں کے مقابلے میں ایران سے عرب زیادہ متاثر تھے۔

حارث بن کلدا کو نوشیروان کے دربار میں حاضری کا شرف بھی حاصل تھا۔ نوشیروان سے اس کا طبی معاملہ بہت دلچسپ ہے۔ حارث نے حتی الامکان دوا سے بچنے اور استعمال کی صورت میں صرف ضرورت کی حد تک جاری رکھنے کی سفارش کی ہے اس کا کہنا تھا کہ بلا ضرورت دوا کا استعمال بھی مرض پیدا کرنے کا باعث ہوتا ہے۔ اس نے دوا، حقنہ، غذا، پانی اور پرہیز پر بھی اظہار خیال کیا ہے۔ پھلوں میں انار اور پھولوں میں بنفشہ اور گلاب کی تعریف کی ہے۔

دوسرا عرب طبیب نضر بن حارث ہے جس کے متعلق عام طور پر سمجھا جاتا ہے کہ وہ حارث بن کلدا ثقفی کا لڑکا ہے۔ E G Brown ۱۹۲۱ نے قزوینی کے حوالے سے لکھا ہے کہ وہ حارث بن کلدا ثقفی کا نہیں بلکہ حارث بن القمہ کا لڑکا تھا۔ قزوینی کے دلائل اگرچہ ہم تسلیم نہیں کرتے مگر ہمارے لیے یہ بات درست ہے کہ نضر بن حارث ابو سفیان کا دوست تھا۔ چونکہ اس نے اسلام کا زمانہ پایا۔ آنحضرتؐ نے اس سے استفسار کیا اور لوگوں کو اس سے علاج کے مشورے دیتے۔ پھر حضرت عمرؓ نے اپنے زمانہ میں اس کی طبی خدمات سے فائدہ اٹھایا۔ یہاں تک کہ امیر معاویہؓ نے اس کی طبی خدمات سے استفادہ کیا اور وہ بدر کے تقریباً ۴۵ برس بعد بھی زندہ رہا۔

عربوں کے پاس جن دواؤں کا استعمال عام تھا ان پر کسی طبی کتاب سے کبھی شہادت نہ مل سکے گی۔ ہمارے پاس اس سلسلے میں سب سے مستند ذریعہ شعرائے عرب کا کلام اور احادیث ہیں۔

اسلام سے قبل الاطباء کے نام ملتے ہیں ان میں ایک "ضماد بن ثعلبہ" ہے۔ طب و جراحت سے بطور ایک پیشہ اس کا تعلق تھا۔ آنحضرتؐ سے خاص دوستانہ تعلقات تھے۔ اعلان نبوت کے بعد جب یہ مکہ آئے ہوئے تھے، آنحضرتؐ کے پیچھے مخالفین نے لڑکوں کو لگا رکھا تھا اور وہ انھیں مجنوں کہہ رہے تھے۔ لڑکوں کو ان کے پیچھے دیکھ کر ضماد کو خیال ہوا کہ شاید آپؐ جنون میں مبتلا ہیں۔ چنانچہ انھوں نے آپؐ سے جنون کے علاج کے لیے کہا۔ آپؐ نے اسلام کی دعوت دی اور وہ اسلام لے آیا۔

عہد نبوی

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا زمانہ جو بہت مختصر مدت میں پھیلا ہوا ہے اس میں طب و ادویہ کی جو عام صورتِ حال تھی وہ قدیم عربی نظام طب ہی سے متعلق تھی آپؐ نے صحت و مرض کے تعلق سے جو کچھ فرمایا ہے اسے احادیث کے مجموعوں میں نہ صرف علیحدہ باب قائم کرکے مرتب کیا گیا ہے (چنانچہ بخاری کے ۸۰ ابواب طب پر ہیں) بلکہ

...وان پر مستقل کتابیں لکھی گئیں۔ ایسی احادیث کی تعداد تقریباً
...ہے، یہ قواعد حفظانِ صحت ادویہ و اغذیہ اور معالجہ امراض پر
...شتمل ہیں۔ اعتدالِ معیشت، وجوہ غسل، ختنہ، شادی،
...انے پینے میں اعتدال۔

المعدۃ بیت الداء والحمیۃ راس الدواء
(معدہ بیماری کا گھر ہے اور پرہیز اصل دوا ہے)
الافراط لسبب بالمرض
(زیادتی مرض کا سبب ہوتی ہے)

طب نبوی پر لکھی جانے والی کتابوں میں
...بونعیم عبداللہ اصفہانی، ابن قیوم جوزی، شمس الدین
...ھبی، جلال الدین سیوطی، ابو عباس، جعفر مستغفری
...ی بن موسیٰ رضا طبیب نیشاپوری، عبدالملک بن حبیب
...مد بن عمر جنینی وغیرہ ہیں۔

امین الدولہ ابن تلمیذ نے طب نبویؐ
...شرح کی ہے۔ اس طرح شمس الدین سمر بن طولون
...کتاب بھی اس سلسلے کی ایک کڑی ہے۔

اس موضوع پر عربی میں لکھی جانے والی
...تابوں کے علاوہ ترکی میں حمید احمد بن والی کی ایک کتاب
...ہے جسے اس نے ترکی کے وزیر کے نام منسوب کیا ہے۔

فارسی میں بھی چند کتابیں لکھی گئی
...یں۔ ان میں مثلاً اکبر ارزانی کی کتاب "طب نبوی" کے
...لاوہ ۱۱ویں صدی نصف اول کے حکیم غلام امام اکبرآبادی کا
..."معالجات نبوی" معروف بہ مجربات امامی ہے جس میں
...حادیث پر ادویہ کے خواص تحریر کیے گئے ہیں اور
...اس بات یہ ہے کہ خواص ادویہ یونانی کے بجائے خواص
...دویہ ہندیہ کو اس میں بیان کیا گیا ہے۔ طب نبوی
...ور ہندوستانی ادویہ کے تعلق سے یہ ایک اہم فارسی
کی کتاب ہے۔

ایک اور قابلِ ذکر کتاب "عطایا محمدیہ"
ہے جس میں ادویہ کو عنوان بنانے کے بجائے امراض
کو عنوان بنا کر مثلاً "ذات الجنب، ذات الریہ وغیرہ
ان کے تحت دوائیں بیان کی گئی ہیں۔

اردو میں لکھی جانے والی کتابوں میں
حافظ اکرام الدین واعظ کی "طب نبوی" بہت مقبول ہے
محی الدین کی کتاب "طبِ اسلامی" بھی اس سلسلہ کی
ایک چیز ہے۔

Mr Cyril Elgood نے جنینی اور سیوطی
کو بنیاد بنا کر طب نبوی Medicine of Prophet
کے نام سے انگریزی میں ترجمہ کیا ہے جو بلجیم سے شائع
کی گئی ہے۔

احادیث کے علاوہ خود قرآن میں صحت سے
متعلق متعدد احکامات ملتے ہیں۔ مثلاً شراب، خون مردہ،
لحم خنزیر کی ممانعت۔ اچھی غذا کے استعمال کی ہدایت
کھانے پینے میں اعتدال۔ شہد کے لیے فیہ شفاء
للناس وغیرہ مفید اصول صحت ہیں۔

قرآن میں نہ صرف شہد بلکہ بعض دوسری
دواؤں کے نام بھی آتے ہیں۔ ہماری دلچسپی کا خاص
پہلو یہ ہے کہ ان میں سے بعض ہندی الاصل دوائیں
بھی ہیں۔ بعض سنسکرت کے الفاظ کا استعمال بھی کیا
گیا ہے۔ چنانچہ کافور جو کپور کا معرب ہے۔ مشک کو
مشکا سے لیا گیا ہے اور زنجبیل جو زنجبار کی بدلی
ہوئی شکل ہے کو قرآنی الفاظ بننے کا شرف حاصل

احادیث میں جن ادویہ اور علاجی
تدابیر کا بیان ہے وہ دراصل قدیم تر عربی معلومات

کی بنیاد پر ہے۔ اس طرح احادیث کے طبی مجموعے میں ہم
آسانی سے قدیم عربی نظام طب کی جھلکیاں دیکھ سکتے
ہیں۔ اس کی حیثیت تشریعی نہیں ہے بلکہ تجرباتی ہے۔ اگرچہ
بعض لوگوں نے عقیدت کی بنا پر طب نبوی کے متعلق یہ
خیال ظاہر کیا ہے کہ وہ وحی سے علاقہ رکھتی ہے۔ لیکن
جیسا کہ ابن خلدون نے لکھا ہے کہ شریعت میں جس طب کا
ذکر ہے وہ یہی طب ہے۔ چنانچہ کھجور میں قلم لگانے سے
متعلق آپؐ نے فرمایا تھا کہ

"ان کاموں کو دنیا کے یعنی کھجور کے کاموں
کو تم بہتر جانتے ہو۔"

لہذا احادیث میں طب کا جو باب ہے اس کو شرعی
حیثیت نہیں دینی چاہیے۔ البتہ اگر کوئی عقیدت کے
تحت بطور تبرک آپؐ کی بتائی ہوئی دوا استعمال کرے
تو اس لحاظ سے فائدہ ہو سکتا ہے۔

عربوں کے یہاں بہت کم دوائیں
استعمال میں لائی گئی ہیں۔ داخلی استعمال کی دواؤں
میں شہد بطور خاص شامل رہتا تھا۔ احادیث میں جن
دواؤں کے نام ملتے ہیں۔ ان میں مثال کے طور پر ایلوا
کلونجی، شیر خشت، قسط، زیتون، سنا، سہر، ہلیلہ
سیاہ، خربزہ، بنفشہ، لہسن، حنا، سرکہ، عتیق،
انجیر، نمک، شہد، اونٹنی کا دودھ، سوختہ چٹائی کی راکھ
عنبر اور مشک وغیرہ ہیں

آپؐ کے زمانہ مبارک میں اطباء میں حارث بن
کلدا کے علاوہ ایک نام ابن ابی رمثہ تمیمی ملتا ہے جس
نے آپؐ کے دونوں شانوں کے درمیان مہر نبوت کو
گوشت کا ابھار سمجھ کر علاج کی اجازت چاہی تھی۔
ہندوستان کے تعلق سے ایک نام بیرزطنی
ہے تاریخ سے پتہ چلتا ہے کہ ہندوستان کی بعض قومیں
عرب میں رہتی تھیں۔ ان میں جاٹ (زط) بھی تھے عرب
میں زمانہ قدیم سے جاٹوں کی آبادی بصرہ سے عمان،
بحرین کے ساحلی مقامات اور یمن میں تھی۔ یمن ہی میں
بیرزطنی نامی ایک ہندوستانی معالج کسریٰ کے زمانے سے
موجود تھا جسے رسالت مآب کا زمانہ بھی ملا اور بعد میں
مشرف بہ اسلام بھی ہوا۔

بیرزطنی ہندی طریقہ علاج میں ماہر تھا
اس کے سلسلہ میں مشہور ہے کہ یہ پہلا شخص ہے،
جس نے ان علاقوں میں بھنگ کا بطور دوا استعمال
شروع کیا۔

اس عہد میں طب اور جراحت جس شکل
میں بھی تھی، جس سے ادویہ کی معلومات کا براہ راست
تعلق ہے۔ پتہ چلتا ہے کہ پلاسٹک سرجری بھی رائج
تھی۔ چنانچہ حدیث میں ملتا ہے کہ عرفجہ بن اسعد کی
ناک ایک جنگ میں ضائع ہو گئی تھی۔ انھوں نے ایک
چاندی کی ناک بنوائی۔ لیکن جب اس میں عفونت
پیدا ہو گئی تو آنحضرتؐ نے سونے کی ناک بنوانے کا
مشورہ دیا۔ چنانچہ انھوں نے سونے کی ناک بنوائی
اور پھر ٹھیک رہے۔ اس طرح سونے کے دانت
بنوانے اور دانتوں میں سونا بھرنے کی کثرت سے مثالیں
ملتی ہیں۔ چنانچہ حضرت عمر، حضرت عثمان، حضرت انس
حضرت عبداللہ بن عون اور حضرت موسیٰ بن طلحہ
رضی اللہ تعالیٰ عنہم کے نام ملتے ہیں۔

باقی آئندہ شمارہ میں ملاحظہ
فرمائیے۔

سید اسرار حسین شیدا
ریڈر شعبہ دینیات
اے ایم یو-

سماج میں عورت کا مقام!

انسان فطرتاً ایک سماجی حیوان ہے
دوسرے حیوانات کے مقابلے میں یہی صفت طرۂ امتیاز ہے
وہ اپنے ماحول اور سماج کو حالات کے مطابق ڈھال کر
ارتقائی منزلیں طے کرتا رہتا ہے۔ بخلاف اس کے دوسرے
حیوانات ابتدائے آفرینش سے جس حالت میں پیدا ہوئے
تھے، اب تک اسی حالت میں زندگی گزارنے پر مجبور ہیں
ان میں تبدیلی کے کچھ آثار نظر نہیں آتے۔ اس کے ساتھ ساتھ
خالق موجودات نے انسان کو دل و دماغ اور زبان و
بیان کی وہ صلاحیتیں بھی عطا کی ہیں جن کو کام میں لا کر
وہ سارے عالم پر اپنی حاکمیت کا سکہ بٹھا کر خلافت الٰہیہ
کے فرائض بھی انجام دے سکتا ہے۔

انسانی سماج میں عورت اور مرد برابر
کے شریک ہیں۔ اس پس منظر میں ہمیں یہ دیکھنا ہے کہ
اس ترقی اور برتری اور سماجی اُتار چڑھاؤ میں طبقۂ
نسواں کا کیا حصہ ہے۔ کیوں کہ انسان ہونے کے ناطے
عورت اور مرد میں کوئی فرق نہیں۔ دل و دماغ کی صلاحیتیں
عورت کو بھی مرد کے برابر عطا کی گئی ہیں۔ سماج کے تغیر و تبدل
میں ان کا بھی نمایاں حصہ ہے۔ آنے والی نسلوں کی
تولید و تناسل اور تربیت و پرداخت میں ان کا بڑا
ہاتھ ہے۔ یہ دوسری بات ہے کہ صنف نازک ہونے کی
وجہ سے وہ اکثر و بیشتر مردوں کی حاکمیت کا شکار رہی
آدم کی بائیں پسلی سے پیدا ہونے اور ان کو بہکا کر جنت
سے نکلوانے کے افسانے کو گھڑ کر ان کو اکثر نفرت و حقارت
کی نظر سے دیکھا جاتا رہا ہے لیکن جب کبھی ان کی گرفت
ڈھیلی ہوئی انھوں نے ہر میدان میں مردوں کے دوش
بدوش سماج کی بیش بہا خدمات انجام دی ہیں اور صحت مند
اور ترقی یافتہ تبدیلیوں کا باعث ہوئی ہیں۔

زمانہ ماقبل تاریخ کے واقعات و حالات
تو ہماری دسترس سے باہر ہیں۔ البتہ ابتدائی دور کی
تاریخ کے مطالعہ سے یہ نتیجہ ضرور اخذ کیا جا سکتا ہے کہ
اس زمانہ میں عورتوں کا سماج میں کوئی مقام ضرور تھا۔
ہندوستان کے ویدک دور اور یونان و روما نیز ایران
و مصر کی قدیم تہذیبوں میں عورتوں کی خاصی قدر و
منزلت اور سماج میں ان کی نمایاں شرکت کے آثار
ملتے ہیں۔ اُس دور میں عورتوں کی تعلیم پر کوئی کچھ زیادہ
پابندی نہیں تھی۔ خانگی اور خارجی معاملات میں ان سے
مشورہ بھی لیا جاتا تھا۔ شادی بیاہ میں بھی ان کی پسند
و ناپسند کا خیال رکھا جاتا تھا۔ مذہبی رسموں اور
تہواروں، میلوں اور جلسوں اور رنج و غم کی محفلوں
میں انھیں شرکت کی آزادی تھی۔ لیکن جوں جوں زمانہ

گزرتا گیا اور تہذیب و تمدن نے آگے قدم بڑھایا مردوں
کی خودغرضانہ چودھراہٹ اور عورتوں کی صنفی کمزوری
ان کی راہ میں حائل ہوتی چلی گئی۔ یہ جنگ و جدال اور
رقابت و کشمکش کا دور تھا۔ چنانچہ اس جنگی سماج میں
عورتوں کو کمزور و ناتواں سمجھ کر ان کو صرف پیچھے ہی نہیں
دھکیل دیا گیا بلکہ ان کے وجود کو ہی ایک قسم کا بوجھ
اور ننگ و ناموس کے لیے خطرہ سمجھا جانے لگا۔ آزادی
کے ساتھ ان کے چلنے پھرنے پر پابندیاں عاید کر دی گئیں
اور گھر کی چہار دیواری میں انھیں مقید کر دیا گیا۔ برائے
گھر کا دھن سمجھ کر ان کی تربیت و پرداخت میں غفلت
برتی گئی۔ حصول علم سے محروم کر دیا گیا۔ پسند کی شادی
کا ان سے حق چھین لیا گیا اور دوسری شادی ان کے
لیے ممنوع قرار دے دی گئی۔ دوسرے گھر ان کی شادی
کو بدنامی کا باعث سمجھا جانے لگا۔ جائیداد میں ورثہ سے
محروم کر دیا گیا۔ لڑکی کی پیدائش کو فال بد سمجھ کر کسی نہ
کسی طرح ان کے وجود کو ختم کر دینے کی ناپاک حرکتیں کی
جانے لگیں۔ شوہر کے مرنے کے بعد اس کی جلتی ہوئی چتا پر
بیٹھ کر جل جانا اُس کی اور اپنی مکتی کا ذریعہ قرار دیا گیا۔
بدقسمتی سے اگر کوئی مصیبت زدہ عورت اس آزمائش سے
بچ بھی جاتی تو زندگی بھر اس کو نفرت اور حقارت کا سامنا
کرنا پڑتا۔ اس لیے وہ بیچاری اس بھیانک مستقبل کے
خوف سے شوہر کی چتا پرستی ہو جانے کو ہی ان مصیبتوں
سے اپنی نجات کا باعث سمجھنے لگی۔

الغرض مردوں نے اپنی جھوٹی عزت
و آبرو کی خاطر اپنی مردانہ طاقت کا ناجائز استعمال کر کے
طبقہ نسواں کو قطعی ناکارہ ڈھنگا بنا دیا تھا اور دنیائے
انسانیت کی تقریباً نصف آبادی کو مفلوج و معطل کر کے
رکھ دیا تھا۔ یہ حالت کم و بیش فرق کے ساتھ دنیا کے
ہر خطے میں پائی جاتی تھی۔ بلکہ ریگزار عرب کی عورتوں کی
حالت مقابلتاً اور بھی بدتر تھی۔ وہاں لڑکی کی پیدائش ایک
قسم کی لعنت و ننگ و ناموس کی تباہی کا باعث سمجھی جاتی
تھی۔ بدنامی کے خوف سے اکثر لڑکیوں کو زندہ دفن کر دیا
جاتا تھا۔ سماج کے سارے حقوق ان سے چھین لیے گئے تھے۔
انسان بالکل بھول گیا تھا کہ انسانی سماج میں عورتوں کا
بھی کوئی حصہ ہے۔ الغرض دنیا کا معاشرہ یکطرفہ چل رہا تھا

ان اذیت ناک حالات میں دریائے رحمت
میں جوش آیا اور خالق کائنات نے دنیا کے اسی پست
ترین خطے میں پوری دنیائے انسانیت کے معاشرے
کی اصلاح کے لیے ایک ان پڑھ اور اُمّی رسول کو رحمۃ
اللعالمین بنا کر بھیجا اور ایک ایسا صحیفۂ آسمانی اس پر
نازل فرمایا جو رہتی دنیا تک انسانی دنیا کے لیے ایک مکمل
ضابطۂ حیات کی شکل میں ہمارے سامنے موجود ہے اس
خدائی تعلیم کی روشنی میں رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم
نے جہاں معاشرے کی اور برائیوں اور گندگیوں کو دور
کیا، وہاں عورتوں کو بھی اس ذلت آمیز پستی اور دلدل
سے نکال کر ان کے مساویانہ حقوق کا تحفظ کیا۔ جو لوگ
خوف شماتت سے اپنی لڑکیوں کو قتل یا زندہ دفن
کر دیتے تھے۔ قرآن حکیم نے ان پر بای ذنب قتلت
اور لاتقتلوا انساءکم کا حکم لگا کر روک لگا دی۔
لاتقتلوا اولادکم من املاق نحن نرزقکم وایاھم
کہہ کر غربت و افلاس کی وجہ سے اولاد کو مار ڈالنے
کو گناہ کبیرہ قرار دیا۔ اور ناداروں کی ہمت افزائی
کی کہ ان کو اور تم کو رزق دینے والے ہم ہی ہیں۔
تمہیں پریشان ہونے کی ضرورت نہیں۔

لم من نفس واحدہ فرماکر عورت اور مرد کے درجے میں
وات قائم کی طلب العلم فریضۃ علی کل مسلم ومسلمۃ
رو سے علم کا حاصل کرنا ہر مسلمان مرد اور عورت کے
فرض قرار دیا۔ اطلب العلم ولو کان بالصین
م دے کر چین جیسے دور دراز مقام پر بھی جاکر علم کا
ل کرنا لازمی قرار دیا۔

علم کو ہر مسلم مرد وعورت کا گمشدہ مال بتایا
ہاں بھی مل جائے اس کا اس کو حق دار ٹھہرایا۔ ان
ں کو سخت گناہ گار بتایا جو اپنے لڑکوں اور لڑکیوں
لیم سے محروم رکھ کر نکما بنا دیتے ہیں۔ لونڈیوں اور
یوں تک کو علم کے زیور سے آراستہ کرکے آزاد کر دینے
دیا گیا۔ عورت کو دنیوی معاش سے بے فکر رکھنے
ے ماں، بیٹی اور بیوی کی حیثیت سے مال ومتاع اور
داد میں وراثت کے حقوق متعین کیے۔ بیوہ عورت کو
ری شادی کرنے کا صرف حق ہی نہیں بلکہ حکم دیا گیا
شوہر کے مرنے کے بعد اس کی زندگی مایوسیوں و
یوں اور ذلت ورسوائی سے نہ گزرے۔ عورت
ر دونوں کو اپنی پسند کی شادی رچانے کا حق دیا گیا
دوسرے کی رضامندی کے بغیر نکاح کو ناجائز قرار دیا
عورت کا وقار قائم رکھنے اور مرد پر روک لگانے کے
نکاح سے پہلے مہر کی تعین کی پابندی لگادی گئی۔ پھر
داخلی زندگی میں مرد وعورت کے حقوق کو یکساں
گیا۔ معاشرے میں عورتوں کے ساتھ نیکی وانصاف
تاؤ ملحوظ رکھنے کی ہدایت کی گئی۔

اوپر جو کچھ بھی بیان کیا گیا ہے،
کی آیات واحادیث شریفہ کا خلاصہ اور ترجمہ
جن کا متن طوالت سے بچنے کے لیے پیش نہیں کیا جاسکا

ان امور پر غور کرتے ہوئے یہ ماننا پڑے گا کہ انسانی
معاشرے میں یہ سب سے بڑا انقلاب تھا جو اسلامی
تعلیم کی وجہ سے ہی رونما ہوا۔ دنیا کی کوئی قوم اس کی مثال
پیش نہیں کرسکتی۔ صدیوں تک اسلامی معاشرہ انہیں
خطوط پر چلتا رہا اور مرد وعورت دونوں سماج کی ترقی
میں برابر کے شریک رہے۔ اس کے نتیجے میں بہت سی
نامور خواتین ابھر کر سامنے آئیں۔ حضرت بی بی خدیجۃ الکبریٰؓ
حضرت بی بی عائشہ صدیقہؓ، اور دیگر امہات المومنین
حضرت بی بی فاطمہ زہراؓ حضرت زینبؓ، حضرت بی بی
رابعہ بصریؒ، خلیفہ ہارون الرشید کی بیوی زبیدہ
وغیرہ وغیرہ ان خواتین نے اپنی دینی ودنیوی خدمات
سے سماج پر ایک گہری چھاپ چھوڑی ہے۔ اسلام کے
بتائے ہوئے ان زریں اصولوں پر مدت تک اسلامی
سماج پھلتا پھولتا رہا ہے۔ مگر آگے چل کر مختلف ممالک
کے میل ملاپ اور وہاں کے سماجی تصورات اور ماحول
سے متاثر ہوکر دھیرے دھیرے اس میں انحطاط کے آثار
نمایاں ہونے لگے اور رفتہ رفتہ عورت کو پھر چہار دیواری
میں بند کر دیا گیا۔

طویل تاریخی رد وبدل کی داستان سے
گریز کرکے دور جدید کی طرف رجوع کیا جاتا ہے۔ اس
میں شک نہیں کہ جدید تعلیم کے حصول سے اس دور
میں طبقۂ نسواں میں اپنے حقوق کی بحالی کا احساس اجاگر
ہوا۔ دیگر ممالک کی طرح ہندوستان میں بھی بلا امتیاز
مذہب وملت، ہر فرقے اور طبقے کی خواتین میں بیداری
پیدا ہوئی۔ یکجہتی اور یگانگت کا احساس ابھر کر سامنے
آیا۔ مردوں کے مقابلے میں احساس کمتری جاتا رہا اور
آگے بڑھ کر سماج میں اپنے لیے موزوں مقام حاصل

کرنے کا رجحان تھا۔ تعلیم یافتہ خواتین نے جابجا انجمنیں قائم کیں اور ان کے ذریعہ اپنے حقوق کی بحالی کے مطالبات پیش کرنے شروع کر دیے۔

۱۹۱۷ء کا سال ہندوستانی خواتین کی تاریخ میں سنگ میل کی حیثیت رکھتا ہے۔ اس سال مسز سروجنی نائیڈو کی سرکردگی میں عورتوں کا ایک وفد مدراس میں وائسرائے ہند اور برطانوی سکریٹری آف اسٹیٹ مسٹر مونٹیگو سے ملا اور ایک عرضداشت پیش کی جس میں مردوں کے برابر سیاسی سماجی، اور رائے دہندگی کے حقوق کا مطالبہ کیا گیا۔ اس کی حمایت میں ہندوستان گیر پیمانہ پر ہر جگہ عورتوں کے جلسے اور مظاہرے ہوئے۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ برطانوی حکومت نے اس مسئلہ کا فیصلہ صوبائی مجالس قانون ساز کے سپرد کر دیا۔ خواتین کی بڑھتی ہوئی امنگوں کو دیکھ کر مردوں کے دلوں میں بھی ان کے ساتھ ہمدردی کے جذبات ابھرے۔ نیز قومی مقاصد کے حصول کے لیے انھوں نے اُن کی شرکت کو بھی ضروری سمجھا۔ چنانچہ خواتین کی کوششیں بار آور ہوئیں اور ۱۹۲۱ء سے ۱۹۲۹ء تک تمام صوبائی مجالس قانون ساز میں ان کے مطالبات پر ہمدردانہ رویہ اختیار کیا گیا اور اُن کے حقوق رائے دہندگی کو تسلیم کر لیا گیا۔ جس کے نتیجہ میں خواتین دھڑا دھڑ تمام صوبوں میں مجالس قانون ساز کی ممبر منتخب ہونے لگیں۔ پہلے ہی سال میں جنرل الیکشن لگ بھگ اسّی خواتین ممبر منتخب ہو کر آئیں پھر اپنے اجتماعی مفاد کے تحفظ کے لیے خواتین نے آل انڈیا ویمنس کانفرنس قائم کی۔ اس کے پلیٹ فارم سے وقتاً فوقتاً مزید حقوق کے مطالبات پیش کیے جاتے رہے۔ خواتین کی متحدہ کوششوں سے زندگی کے ہر شعبہ میں ان کو مردوں کے برابر حقوق حاصل ہوتے رہے اور سماج میں ان کا درجہ مردوں کے مساوی ہوتا چلا گیا۔ انیسویں صدی میں طبقہ نسواں کی جو افسوس ناک حالت تھی وہ بیسویں صدی کے آغاز سے صحتمندی اور خوشگواری کی طرف رجوع ہونے لگی اور اس صدی کی پانچویں دہائی تک وہ نئے ترقی یافتہ سماج کی تعمیر و ترقی میں مردوں کے دوش بدوش حصہ لینے لگیں۔ اس زمانہ کی ترقی یافتہ باعمل خواتین میں بلبل ہند شریمتی سروجنی نائیڈو، شریمتی کملا دیوی، نواب سلطان جہاں بیگم، شریمتی وجے لکشمی پنڈت، شریمتی رکمنی لکشمی شریمتی رستنی، شریمتی سیتاوتی دیوی، شریمتی میراین بیگم جعفر علی، بیگم محمد علی، شریمتی درگا بائی، بیگم شاہنواز، راج کماری امرت کور، بیگم حامد علی، اور بیگم آصف علی وغیرہ جیسی باہمت و باعمل تعلیم یافتہ خواتین کے نام نمایاں نظر آتے ہیں۔ دوسری طرف سیاست سے ہٹ کر اردو علم و ادب کے ذریعہ سماج کی ترقی میں عصمت چغتائی، رضیہ سجاد ظہیر، قرۃ العین حیدر وغیرہ جیسے درخشندہ ستارے آسمان ادب و صحافت پر نورافشاں دکھائی دیتے ہیں۔ سماج کے دکھ درد کے مداوے کی تحریک کے سلسلہ میں بھی بہت سی خواتین نمایاں خدمات انجام دیتی نظر آتی ہیں۔ مدر ٹریسا کی سماج سدھار اور انسانی ہمدردی کی غرض سے بے لوث خدمات پوری دنیا سے انسانیت سے خراج تحسین حاصل کر رہی ہیں۔ وہ اس ضعیفی کے عالم میں بھی خدمتِ خلق کے جذبے سے سرشار اس دکھی دنیا کی مصیبتوں کو دور کرنے کی جدوجہد میں ز[illegible] کا گزینی ہوئی ہیں۔ دنیا کے لگ بھگ چالیس

شہروں میں انھوں نے یتیموں، بیماروں، کوڑھیوں، اپاہجوں اور غریبوں کی امداد اور علاج معالجے کے لیے بڑے بڑے مراکز اور اسپتال کھول رکھے ہیں۔ ان کی ان مادرانہ خدمات کے لیے تمام دنیا سے انھیں لاکھوں روپیہ عطیہ کے طور پر مل رہا ہے۔ خود ان کو ان خدمات کے صلے میں متعدد ممالک سے بڑے بڑے اعزازات اور انعامات ملے مگر انھوں نے اپنا یہ ذاتی روپیہ بھی خدمتِ خلق کے کاموں پر صرف کر دیا۔ یہ صرف ایک خدا پرست اور انسان دوست خاتون کا کارنامہ ہے۔ اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ عورت اگر چاہے تو کیا کچھ نہیں کر سکتی۔

الغرض اسی قسم کی صاحبانِ علم و عمل خواتین کی قیادت میں عورتوں کا قافلہ روز بروز آگے بڑھتا گیا۔ بالآخر ان کی اس مہم جوئی کے نتیجہ میں ہندوستانی سماج میں ایک صحت مند اور خوشگوار تبدیلی رونما ہوئی اور ایک مشترکہ سماج کی بنیاد پڑ گئی۔ آج انسانی زندگی کا کوئی شعبہ ایسا نہیں جس میں عورتوں نے اپنی اہلیت اور سمجھ بوجھ کے جوہر اور کمالات دکھا کر یہ ثابت نہ کر دیا ہو کہ وہ مردوں سے کسی میدان میں پیچھے نہیں ہیں۔ سائنسی ایجادات ہوں یا علم و ادب کی تحقیقات، ملکی اور بین الاقوامی سیاست ہو یا سماجی اصلاح کے کارنامے ہوں یا ڈاکٹری و انجنیری کے کمالات، خلائی پرواز ہو یا پہاڑوں کی چوٹیوں پر چڑھنے کی مہمات، ہر جگہ عورت مردوں کے دوش بدوش کام کرتی نظر آئے گی۔

یہ حقیقت بھی اب کھل کر سامنے آگئی ہے کہ عورت کی فطری کمزوری کا افسانہ بھی من گھڑت تھا عورت اگر باعلم و باصلاحیت ہو تو بڑے سے بڑے ملک و قوم پر کامیابی کے ساتھ حکمرانی کر سکتی ہے۔ زمانہ ماضی میں بھی ایسی بہادر اور باصلاحیت خواتین نے بڑی خوبی اور خوش اسلوبی کے ساتھ حکومت کے انتظام و انصرام میں نمایاں کارنامے انجام دیے ہیں۔ برطانیہ میں ملکہ وکٹوریہ کا دور وہاں کی تاریخ میں عہدِ زریں کے نام سے موسوم ہے اور اب بھی وہاں ایک خاتون آئینی حکمراں ہے اور ایک خاتون مارگریٹ تھیچر وزارتِ عظمیٰ کے فرائض انجام دے رہی ہیں۔ ہمارے ملک کی تاریخ بھی ایسی باصلاحیت خاتون حکمرانوں سے خالی نہیں۔ رضیہ سلطانہ، نور جہاں بیگم، جھانسی کی رانی لکشمی بائی، اہلیا بائی اور بھوپال کی نواب سلطان جہاں بیگم وغیرہ ایسی غریب و رعایا پرور حکمراں گزری ہیں جنھوں نے بڑے تدبّر و دانشمندی و بہادری اور دلیری کے ساتھ حکمرانی کے فرائض انجام دیے ہیں۔ زمانۂ حاضرہ میں پڑوسی ملک لنکا کی شریمتی بندرا نائیکے اس جمہوری دور میں بڑی کامیابی سے وزارتِ عظمیٰ کی ذمہ داریوں سے عہدہ برا ہو چکی ہیں۔ دور کیوں جایے اس وقت ہمارے ملک میں جدید ہندوستان کے معمار آنجہانی پنڈت جواہر لال کی نام آور صاحبزادی شریمتی اندرا گاندھی وزیرِ اعظم کی حیثیت سے اس طویل و عریض ملک میں لگ بھگ تیرہ چودہ سال سے بڑی کامیابی اور نام آوری کے ساتھ ملک کا نظم و نسق سنبھالے ہوئے ہیں۔ اپنی ملک دوستی اور عوامی ہر دلعزیزی سے انھوں نے ہندوستان کے ستر کروڑ باشندوں کے دل موہ لیے ہیں۔ ان کی صلاحیت و معاملہ فہمی، تدبر و دانشمندی، بے خوفی و بہادری، جہانبانی اور اولوالعزمی کا ساری دنیا نے لوہا مان لیا ہے۔ اور ہر چھوٹا بڑا ان کی سیاسی دوراندیشی کا قائل ہو گیا ہے۔ ان کے طریقۂ نظم و نسق میں

حکمرانی کی شان نہیں بلکہ ملک و قوم کی خدمت گزاری کا جذبہ کارفرما ہے۔ انھوں نے اپنی تدبرانہ پالیسیوں سے ملک کو کہیں سے کہیں پہنچا دیا ہے اور اپنی غیر جانبدارانہ خارجہ حکمت عملی اور فلاحیانہ داخلی سرگرمیوں سے ساری دنیا میں ملک کے وقار کو بلند کر دیا۔ اس کا نتیجہ ہے کہ آج ہمارا ملک دنیا کے چند ترقی یافتہ ممالک میں سمجھا جاتا ہے صرف یہی نہیں بلکہ دفاعِ ملکی اور حملہ آور دشمن کو پسپا کرنے اور ایک بے دست و پا قوم کے تحفظ اور استحکام کے لیے شانہ بشانہ لڑ کر فتح مندی حاصل کرنے میں انھوں نے ایک آزمودہ اور تجربہ کار جنرل کے فرائض بھی کامیابی کے ساتھ انجام دیے ہیں۔ آج اس ستر کروڑ کے ملک کی آبادی میں کوئی ان کی ہمسری کا دعویٰ نہیں کر سکتا۔

این سعادت بزورِ بازو نیست
تا نہ بخشد خدائے بخشندہ

ان تمام واقعات اور مشاہدات کی رو سے یہ بات اب بالکل کھل کر سامنے آگئی ہے کہ اگر عورت اپنی صلاحیتوں کو بروئے کار لائے تو وہ کیا کچھ نہیں کر سکتی۔ وہ اپنے علمی اور عملی صلاحیتوں کو کام میں لا کر معاشرے میں بڑے سے بڑا خوش آیند انقلاب پیدا کر سکتی ہے۔ چنانچہ اس کے مظاہر آج زندگی کے ہر شعبہ میں نظر آ رہے ہیں۔ معاشرے کی یہ صحت مند اور ترقی یافتہ تبدیلی عورت کی مساویانہ شرکت کا نتیجہ ہے۔ یہ سب علم کی دین ہے۔ علم ایک بڑی طاقت ہے اور جہالت سب سے بڑی کمزوری۔ علم سے انسان کے دماغ میں وسعت و بلندی، بے خوفی اور خود اعتمادی کا احساس اجاگر ہوتا ہے۔ چنانچہ اس سماجی انقلاب میں تعلیم نسواں کا بڑا دخل ہے۔

سماج کی اس خوشگوار ترقی میں جہاں ملک کے دوسرے تعلیمی اداروں نے بڑی مدد کی ہے، وہاں علی گڑھ کے ویمنس کالج نے بھی بلا امتیاز مذہب و ملت بڑا نمایاں کردار ادا کیا ہے۔ بالخصوص مسلم خواتین کے ابھارنے اور ان کو میدانِ عمل میں لا کر کھڑا کرنے میں اس کا بڑا ہاتھ ہے۔ آج جو تعلیم یافتہ اور باصلاحیت مسلم خواتین ہر جگہ نظر آتی ہیں، یہ اسی ادارے کی دین ہے۔ خدا مغفرت کرے مرحوم شیخ عبداللہ اور ان کی اہلیہ اعلیٰ بی کی جنھوں نے اپنی مسلسل چالیس سالہ جد و جہد سے اس کو جنم دے کر اس درجے تک پہونچا ان کی آبیاری سے جو پود پھوٹ کر نکلی وہ اب ہر جگہ پھلتی پھولتی نظر آ رہی ہے۔ یہاں یا ملک کے دوسرے حصوں میں جو مسلم خواتین تعمیری کاموں میں حصہ لیتی نظر آئیں گی اُن میں سے اکثر اپنی مرحوم پاپا میاں اور اعلیٰ بی کی روحانی اولاد پائی جائیں گی۔ اس تعلیمی ادارے کی فارغ التحصیل طالبات آج ہر جگہ زندگی کے ہر شعبہ میں خواہ وہ سرکاری یا غیر سرکاری ادارہ، اسکول ہو یا یونیورسٹی۔ فنی تجربہ ہو یا ٹیکنیکل مرکز، کارخانہ ہو یا انڈسٹری، شانے سے شانہ ملا کر کام کرتی نظر آئیں گی۔ اسی کالج کی پاس شدہ اکثر خواتین پارلیمنٹ اور صوبائی مجالس قانون ساز میں پہنچ کر ملک کے فلاح و بہبود کے کاموں اور سماجی اصلاح کی اسکیموں میں اپنے مفید مشوروں اور تعاون سے قوم کی بے لوث خدمات انجام دے رہی ہیں۔ مثال کے طور پر محترمہ محسنہ قدوائی اور ان کے خاندان کی کئی نامور خواتین اسی کالج کی پیداوار ہیں جنھوں نے فلاح و بہبود اور سماج سدھار کے نمایاں کارنامے انجام دیے ہیں اور آج قوم کی یہ محسنہ مرکزی پارلیمنٹ میں شریمتی اندرا گاندھی کے خوابوں کو بروئے کار لانے میں

دل وجان سے ان کے ساتھ تعاون کر رہی ہیں۔ الغرض
اس کالج کے قیام اور اس کی درجہ بدرجہ ترقی میں پا بامیاں
کے ساتھ ساتھ ان کی تعلیم یافتہ اور روشن خیال بیگم اعلیٰ بی
کی بے لوث خدمات نمایاں طور پر کارفرما نظر آتی ہیں —
وران کے بوئے ہوئے بار آور درخت کے ثمرات سے اب
سلم و غیر مسلم خواتین لطف اندوز ہو رہی ہیں۔
اللہ تعالیٰ طبقہ نسواں کے ان محسنوں کو کروٹ کروٹ
نت نصیب کرے! آمین یا رب العالمین!!
اگرچہ اپنی لگاتار مساعی وجد و جہد سے خواتین
نے اپنے بیشتر حقوق منوانے میں کامیابی حاصل کی ہے اور
ماج میں بھی انھوں نے اپنا ایک مقام بنا لیا ہے۔ مگر اب بھی
ہ ایسے پیچیدہ مسائل ہیں جن کا حل کرنا ان کے پرسکون
ستقبل کے لیے ضروری ہے۔ مثلاً شادی بیاہ کے موقع پر
ہیز کے لین دین کا مسئلہ جس نے ہمارے سماج میں ایک
یانک شکل اختیار کر لی ہے۔ یہ مسئلہ اگرچہ ملک کے
یش پسند اور صاحب نمود و نمائش امیروں و رئیسوں
پیدا کردہ ہے مگر اس کی وبا متوسط اور غریب گھرانوں
ں بھی پھیلتی جا رہی ہے۔ شادی کے لیے باقاعدہ سودے
زی ہوتی ہے اور لڑکے والے زیادہ سے زیادہ جہیز
مطالبہ کرتے ہیں یا خود بیچارا لڑکی والا اپنی لڑکی کے
ناسب بر حاصل کرنے کے لیے اپنا سب کچھ داؤں پر لگا
یتا ہے جو غریب اور نادار لوگ ہیں ان کو اس موقع پر
صیبت سے دوچار ہونا پڑتا ہے۔ کچھ لے دے کے شادی
ی ہو گئی تو حریص اور درندہ صفت لڑکے والے صلح
نے مزید کا مطالبہ شروع کر دیتے ہیں اگر ان کی خواہش
ری نہ ہوئی تو لڑکی کو پریشان کر کے اس کی زندگی کو
جیرن کر دیتے ہیں۔ زندگی سے تنگ آ کر یہ شادی شدہ
لڑکی یا تو خودکشی کر کے اپنی جان چھڑا لیتی ہے۔ یا پھر
یہ انسان نما درندے کسی نہ کسی طرح اس کی زندگی کا
خاتمہ کر کے نئے سودے کی تلاش شروع کر دیتے ہیں۔
ایسے دردناک واقعات آجکل اکثر منظر عام پر آ رہے ہیں
حکومت نے اس کے لیے امتناعی قوانین بھی بنا رکھے ہیں
اور ان کو سخت تر کرنے کے لیے مزید غور و خوض ہو رہا
ہے۔ مگر قانون سے یہ مسئلہ حل ہوتا نہیں نظر آتا۔ اس سے
بچنے کے لیے بہت سے ہتھکنڈے استعمال کیے جا سکتے ہیں
اس کا حل بھی خود خواتین کے ہاتھ میں ہے۔ اس کے لیے
ہندوستان گیر پیمانے پر تحریک کی ضرورت ہے۔ خواتین
کو اپنے اتحاد اور اشتراکِ عمل سے پہلے مردوں کو اپنا ہم آہنگ
اور سوسائٹی کو مجبور کر دینا چاہیے کہ وہ اس کالے دھندے
کو سماج دشمن کاروبار قرار دیں اور ایسے افراد اور
گھرانوں کا سماجی بائیکاٹ کریں اور خواتین جہاں کہیں ایسا
دھندا دیکھیں وہاں کے ناپسندیدہ افراد کا منہ کالا کر کے
سر بازار تشہیر کرنے پر مجبور کریں۔ جب ایسی سودے
بازی سے واسطہ پڑے تو لڑکی شادی کرنے سے خود
انکار کر دے اور اپنی صلاحیت کے مطابق کسب معاش
کر کے باعزت زندگی بسر کرنے کو ترجیح دے۔ والدین
کا بھی فرض ہے کہ وہ لڑکیوں کو زیور علم سے آراستہ
کر کے اس قابل بنا دیں کہ وہ کسی کی محتاج نہ رہیں۔
جو روپیہ جہیز پر صرف ہوتا وہ لڑکیوں کی تعلیم پر صرف
کر دیا جائے۔ اسی طرح اس لعنت کا سد باب ہو سکتا
ہے۔ پھر اس قسم کی سودے بازی یا اس کے عواقب
کا کہیں سے پتہ چلے تو فوراً مل جل کر قانون کا دروازہ
کھٹکھٹایا جائے اور معقول بیانات اور اشتہاروں کے
ساتھ قانونی چارہ جوئی کی جائے قانون خود کسی کی مدد

باقی صفحہ ۔۔۔ پر

(سر) سید احمد خاں

رسوم وعادات

[منقول از تہذیب الاخلاق جلد اول نمبر اول بابت یکم شوال ۱۲۸۷ھ یوم جمعہ عید الفطر]

جو لوگ کہ حسنِ معاشرت اور تہذیب اخلاق و شائستگی پر بحث کرتے ہیں، ان کے لیے کسی ملک یا قوم کے کسی رسم و رواج کو اچھا اور کسی کو برا ٹھہرانا نہایت مشکل کام ہے۔ ہر ایک قوم اپنے ملک کے رسم و رواج کو پسند کرتی ہے اور اسی میں خوش رہتی ہے کیونکہ جن باتوں کی بچپن سے عادت اور موانست ہو جاتی ہے وہی دل کو بھلی معلوم دیتی ہیں لیکن اگر اسی پر اکتفا کریں تو اس کے معنی یہ ہو جاویں گے کہ بھلائی اور برائی حقیقت میں کوئی چیز نہیں ہے۔ بلکہ صرف عادت پر موقوف ہے۔ جس چیز کا رواج ہو گیا، عادت پڑ گئی وہی اچھی ہے اور جس چیز کا رواج نہ ہوا اور عادت نہ پڑی وہی بری ہے۔

مگر یہ بات صحیح نہیں۔ بھلائی اور برائی فی نفسہٖ مستقل چیز ہے۔ رسم و رواج سے البتہ یہ بات ضرور ہوتی ہے کہ کوئی اس کے کہنے پر نام نہیں دھرتا، عیب نہیں لگاتا کیونکہ سب کے سب اس کو کرتے ہیں۔ مگر ایسا کرنے سے وہ چیز اگر فی نفسہٖ بری ہے تو اچھی نہیں ہو جاتی۔ پس ہم کو صرف اپنے ملک یا اپنی قوم کی رسومات کے اچھے ہونے پر بھروسہ کر لینا نہ چاہیے۔ بلکہ نہایت آزادی اور نیک دلی سے اس کی اصلیت کا امتحان کرنا چاہیے، تاکہ اگر رسم میں کوئی ایسی بات ہو جو حقیقت میں بد ہو اور بسبب رسم و رواج کے ہم کو اس کی بدی خیال میں نہ آتی ہو تو معلوم ہو جاوے اور وہ بدی ہمارے ملک یا قوم سے جاتی رہے۔

البتہ یہ کہنا درست ہوگا کہ جبکہ ہر گاہ معیوب اور غیر معیوب ہونا کسی بات کا زیادہ تر اس کے رواج و عدم رواج پر منحصر ہو گیا ہے تو ہم کس طرح کسی امر کے رسم و رواج کو اچھا یا برا قرار دے سکیں گے۔ بلاشبہ یہ بات کسی قدر مشکل ہے مگر جب کہ یہ تسلیم کر لیا جاوے کہ بھلائی یا برائی فی نفسہٖ بھی کوئی چیز ہے تو ضرور ہر بات کی فی الحقیقت بھلائی یا برائی قرار دینے کے لیے کوئی نہ کوئی طریقہ ہوگا۔ پس ہم کو اس طریقہ کی تلاش کرنے اور اسی کے مطابق اپنی رسوم و عادات کی بھلائی یا برائی قرار دینے کی پیروی کرنی چاہیے۔

سب سے مقدم اور سب سے ضروری امر اس کام کے لیے یہ ہے کہ ہم اپنے دل کو تعصبات سے اور ان تاریک خیالوں سے جو انسان کو سچی بات کے سننے اور کرنے سے روکتے ہیں خالی کریں اور اس دلی نیکی سے جو خدا تعالیٰ نے انسان کے دل میں

بھی ہے۔ ہر ایک بات کی بھلائی یا برائی دریافت کرنے
پر متوجہ ہوں۔

یہ بات ہم کو اپنی قوم اور اپنے ملک اور
دوسری قوم اور دوسرے ملک دونوں کے رسم و رواج
کے ساتھ برتنی چاہیے تاکہ جو رسم و عادت ہم میں بھلی
ہے اس پر مستحکم رہیں اور جو ہم میں بُری ہے اس کے
چھوڑنے پر کوشش کریں اور جو رسم و عادت دوسروں
میں اچھی ہے اس کو بلا تعصب اختیار کریں اور جو اُن
میں بُری ہے اس کے اختیار کرنے سے بچتے رہیں۔

جب کہ ہم غور کرتے ہیں کہ تمام دنیا کی
قوموں میں جو رسوم و عادات مروج ہیں، انھوں نے
کس طرح ان قوموں میں رواج پایا ہے تو باوجود
مختلف ہونے ان رسومات و عادات کے ان کا مبدا
اور منشا متحد معلوم ہوتا ہے۔

کچھ شبہ نہیں ہے کہ جو عادتیں اور
رسمیں قوموں میں مروج ہیں، ان کا رواج یا تو ملک
کی آب و ہوا کی خاصیت سے ہوا ہے یا ان اتفاقیہ
امور سے جن کی ضرورت وقتاً فوقتاً بضرورت تمدن
و معاشرت کے پیش آتی گئی ہے یا دوسری قوم کی تقلید
و اختلاط سے مروج ہو گئی ہیں۔ یا انسان کی حالت ترقی
یا تنزل نے اس کو پیدا کر دیا ہے۔ پس ظاہراً یہی چار
سبب ہر ایک قوم اور ہر ایک ملک میں رسوم و عادات
کے مروج ہونے کا مبدا و منشا معلوم ہوتے ہیں۔

جو رسوم و عادات کہ بمقتضائے
آب و ہوا کسی ملک میں رائج ہوئی ہیں اُن کے سچ اور
درست ہونے میں کچھ شبہ نہیں، کیوں کہ وہ عادتیں
قدرت اور فطرت نے ان کو سکھلائی ہیں جس کے سچ
ہونے میں کچھ شبہ نہیں، مگر صرف اُن کے برتاؤ کا طریقہ
غور طلب باقی رہتا ہے۔

مثلاً ہم یہ بات دیکھتے ہیں کہ کشمیر میں اور
لندن میں سردی کے سبب انسان کو آگ سے گرم ہونے
کی ضرورت ہے۔ پس آگ کا استعمال ایک نہایت سچی
اور صحیح عادت دونوں ملکوں کی قوموں میں ہے۔ مگر
اب ہم کو یہ دیکھنا ہے کہ آگ کے استعمال کے لیے یہ بات
بہتر ہے کہ مکانات میں ہندسی قواعد سے آتش خانہ بنا کر
آگ کی گرمی سے فائدہ اٹھاویں یا مٹی کی کانگڑیوں میں
آگ جلا کر گردن میں لٹکائے پھریں جس سے گورا گورا
پیٹ اور سینہ کالا اور بھونڈا ہو جاوے۔

طریق تمدن و معاشرت روز بروز انسانوں
میں ترقی پاتا جاتا ہے اور اس لیے ضرور ہے کہ ہماری
رسمیں و عادتیں جو بضرورت تمدن و معاشرت مروج ہوئی
تھیں، ان میں بھی روز بروز ترقی ہوتی جاوے اور
اگر ہم اپنی ان پہلی ہی رسموں اور عادتوں کے پابند
رہیں اور کچھ ترقی نہ کریں تو بلاشبہ بمقابل ان قوموں کے
جنھوں نے ترقی کی ہے، ہم ذلیل اور خوار ہوں گے،
اور مثل جانوروں کے خیال کیے جاویں گے۔ پھر خواہ اس
نام سے ہم بُرا مانیں یا نہ مانیں۔ انصاف کا مقام ہے کہ
جب ہم اپنے سے کمتر اور نا تربیت یافتہ قوموں کو ذلیل
اور حقیر مثل جانوروں کے خیال کرتے ہیں تو جو قومیں کہ
ہم سے زیادہ شائستہ اور تربیت یافتہ ہیں اگر وہ بھی
ہم کو اسی طرح حقیر اور ذلیل مثل جانوروں کے سمجھیں تو
ہم کو کیا مقام شکایت ہے، ہاں اگر ہم کو غیرت ہے تو
ہم کو اس حالت سے نکلنا اور اپنی قوم کو نکالنا چاہیے
دوسری قوموں کی رسومات کا اختیار کرنا

اگرچہ بے تعصبی اور دانائی کی دلیل ہے مگر جب وہ رسمیں اندھے پن سے صرف تقلیداً بغیر سوچے سمجھے اختیار کی جاتی ہیں تو کامل ثبوت نادانی اور حماقت کا ہوتی ہیں۔ دوسری قوموں کی رسومات اختیار کرنے میں اگر ہم دانائی اور ہوشیاری سے کام کریں تو اس قوم سے زیادہ فائدہ اٹھا سکتے ہیں۔ اس لیے کہ ہم کو اس رسم سے موانست نہیں ہوتی اور اس سبب سے اس کی حقیقی بھلائی یا بُرائی پر غور کرنے کا، بشرطیکہ ہم تعصب کو کام میں نہ لاویں، بہت اچھا موقع ملتا ہے۔ اس قوم کے حالات دیکھنے سے جس میں وہ رسم جاری ہے، ہم کو بہت عمدہ مثالیں سینکڑوں برس کے تجربے کی ملتی ہیں جو اس رسم کے اچھے یا برے ہونے کا قطعی تصفیہ کر دیتی ہیں۔

مگر یہ بات اکثر جگہ موجود ہے کہ ایک قوم کی رسمیں دوسری قوم میں بسبب اختلاط اور ملاپ کے اور بغیر قصد و ارادے کے اور ان کی بھلائی اور بُرائی پر غور و فکر کرنے کے بغیر داخل ہو گئی ہیں۔ جیسا کہ ہندوستان کے مسلمانوں کا بالتخصیص حال ہے کہ تمام حالاتِ زندگی بلکہ بعض امورات مذہبی میں بھی ہزاروں رسمیں غیر قوموں کی بلا غور و فکر اختیار کر لی ہیں یا کوئی نئی رسم مشابہ اس قوم کی رسم کے ایجاد کر لی ہے مگر جب ہم چاہتے ہیں کہ ہم اپنے طریق معاشرت اور تمدن کو اعلیٰ درجے کی تہذیب پر پہنچا دیں، تاکہ جو قومیں ہم سے زیادہ مہذب ہیں وہ ہم کو بنظر حقارت نہ دیکھیں تو ہمارا فرض ہے کہ ہم اپنی تمام رسوم و عادات کو بنظر تحقیق دیکھیں اور جو بُری ہوں ان کو چھوڑیں اور جو قابل اصلاح ہوں ان میں اصلاح کریں۔

جو رسومات کہ بسبب حالت ترقی یا تنزل کسی قوم کے پیدا ہوتی ہیں وہ رسمیں ٹھیک ٹھیک اس قوم کی ترقی اور تنزل یا عزت اور ذلت کی نشانی ہوتی ہیں۔

اس مقام پر ہم نے لفظ ترقی یا تنزل کو نہایت وسیع معنوں میں استعمال کیا ہے اور تمام قسم کے حالات ترقی و تنزل مراد لیے ہیں۔ خواہ وہ ترقی و تنزل اخلاق سے متعلق ہو، خواہ علوم و فنون اور طریق معاشرت اور تمدن سے اور خواہ ملک و دولت و جاہ و حشمت سے۔

بلاشبہ یہ بات تسلیم کرنے کے قابل ہے کہ دنیا میں کوئی قوم ایسی نہیں نکلنے کی جس کی تمام رسمیں اور عادتیں عیب اور نقصان سے خالی ہوں۔ مگر اتنا فرق بیشک ہے کہ بعض قوموں میں ایسی رسومات اور عادات جو درحقیقت نفس الامر میں بُری ہوں کم ہیں اور بعض میں زیادہ اور اسی وجہ سے وہ پہلی قوم پچھلی قوم سے اعلیٰ اور معزز ہے اور بعض ایسی قومیں بھی ہیں جنھوں نے انسان کی حالت ترقی کو نہایت اعلیٰ درجے تک پہنچایا ہے اور اس حالت انسانی کی ترقی نے ان کے نقصانوں کو چھپا لیا ہے جیسے ایک نہایت نفیس اور عمدہ شیریں دریا تھوڑے سے گدلے اور کھاری پانی کو چھپا لیتا ہے یا ایک نہایت لطیف شربت کا بھرا ہوا پیالہ لیمو کی کھٹی دو بوندوں سے زیادہ تر لطیف اور خوشگوار ہو جاتا ہے اور یہی قومیں ہیں جو اب دنیا میں سویلیزڈ یعنی مہذب گنی جاتی ہیں اور درحقیقت اس لقب کی مستحق بھی ہیں۔

میری دلسوزی اپنے ہم مذہب بھائیوں
کے ساتھ اسی وجہ سے ہے کہ میری دانست میں ہم مسلمانوں
میں بہت سی رسمیں جو درحقیقت نفس الامر میں بُری
ہیں، مروج ہوگئی ہیں جن میں سے ہزاروں ہمارے
پاک مذہب کے بھی برخلاف ہیں اور انسانیت کے بھی
مخالف ہیں اور تہذیب و تربیت و شائستگی کے بھی
برعکس ہیں اور اس لیے میں ضرور سمجھتا ہوں کہ ہم
سب لوگ تعصب اور ضد اور نفسیات کو چھوڑ کر ان
بُری رسموں اور بدعادتوں کے چھوڑنے پر مائل ہوں
اور جیسا کہ ان کا پاک اور روشن ہزاروں حکمتوں
سے بھرا ہوا مذہب ہے، اسی طرح اپنی رسومات
معاشرت اور تمدن کو بھی عمدہ اور پاک و صاف کریں
اور جو کچھ نقصانات اس میں ہیں، گو وہ کسی وجہ سے
ہوں، ان کو دور کریں۔

اس تحریر کو یہ نہ سمجھا جاوے کہ میں
اپنے تئیں ان بدعادتوں سے پاک اور مبرا سمجھتا ہوں
یا اپنے تئیں نمونہ عادات حسنہ جتاتا ہوں، یا خود ان
امور میں مقتدا بننا چاہتا ہوں حاشا و کلا، بلکہ میں
بھی ایک فرد انہیں افراد میں سے ہوں جن کی اصلاح
دلی مقصود ہے، بلکہ میرا مقصد صرف متوجہ کرنا اپنے
بھائیوں کا اپنی اصلاح پر ہے اور خدا سے امید ہے کہ
جو لوگ اصلاح پر متوجہ ہوں گے، سب سے اول ان کا چیلا
اور ان کی پیروی کرنے والا میں ہوں گا۔ البتہ مثل
مخمور کے خراب حالت میں چلا جانا اور روز بروز بدتر
درجے کو پہنچتا جانا اور اپنی عزت کا اور نہ قومی عزت
کا خیال و پاس رکھنا اور جھوٹی شیخی اور بے جا غرور
میں پڑے رہنا مجھ کو پسند نہیں ہے۔

ہماری قوم کے نیک اور مقدس لوگوں
کو کبھی کبھی یہ خیال غلط آتا ہے کہ تہذیب اور حسن معاشرت
و تمدن صرف دنیاوی امور ہیں جو صرف چند روزہ ہیں
اگر ان میں ناقص ہوئے تو کیا اور کامل ہوئے تو کیا
مگر ان کی اس رائے میں قصور ہے اور ان کی نیک دلی
اور سادہ مزاجی اور تقدس نے ان کو اس عام فریب
غلطی میں ڈالا ہے جو ان کے خیالات ہیں ان کی صحت
اور اصلیت میں کچھ شبہ نہیں، مگر انسانی امور متعلق
اور تمدن و معاشرت سے کسی طرح علیحدہ نہیں ہو سکتا
اور نہ شارع کا مقصود ان تمام امور کو چھوڑ دینا تھا
کیونکہ قواعدِ قدرت سے یہ امر غیر ممکن ہے۔ پس اگر ہماری
حالت تمدن و معاشرت ذلیل اور معیوب حالت پر
ہوگی تو اس سے مسلمانوں کی قوم پر عیب اور ذلت
عائد ہوگی اور وہ ذلت صرف ان افراد اور اشخاص پر
منحصر نہیں رہتی، بلکہ ان کے مذہب پر منحصر ہوتی ہے
کیوں کہ یہ بات کہی جاتی ہے کہ مسلمان یعنی وہ گروہ
جو مذہب اسلام کا پیرو ہے نہایت ذلیل و خوار
ہے۔ پس اس میں درحقیقت ہمارے افعال و عادات
قبیحہ سے اسلام کو اور مسلمانوں کو ذلت ہوتی ہے
پس ہماری دانست میں مسلمانوں کی حسن معاشرت
اور خوبی تمدن اور تہذیب، اخلاق و تربیت و شائستگی
میں کوشش کرنا حقیقت میں ایسا کام ہے جو دنیاوی
امور سے جس قدر متعلق ہے اس سے بہت زیادہ
معاد سے علاقہ رکھتا ہے اور جس قدر فائدے کی اس
سے ہم کو اس دنیا میں توقع ہے اس سے بہت
بڑھ کر اس دنیا میں جس کو کبھی فنا نہیں۔

(از مقالات سرسید۔ مرتبہ مولانا اسمٰعیل پانی پتی)

علی گڑھ مسلم یونیورسٹی۔ علی گڑھ

اشتہار نمبر ۸۳-۸۲/ ۱۸

مندرجہ ذیل اسامیوں کے لیے مطلوبہ فارموں پر درخواستیں مطلوب ہیں

۱۔ ریڈرس:۔

شرح تنخواہ 1200 - 50 - 1300 - 60 - 1900 روپیہ اور دیگر الاؤنس

۱۔ ریڈر ان جنرل میڈیسن (عارضی لیکن مستقل ہونے کی امید) ڈپارٹمنٹ آف میڈیسن

استعداد:۔

لازمی (۱) ایم بی بی ایس یا میڈیکل کونسل آف انڈیا سے تسلیم شدہ کوئی مساوی استعداد

(۱۱) ایم ڈی (میڈیسن)/ ایم ڈی (جنرل میڈیسن) ایم آر سی پی (یوکے سے ۱۱ر نومبر ۱۹۷۸ء سے قبل حاصل شدہ) یا میڈیکل کونسل آف انڈیا سے تسلیم شدہ کوئی ڈگری۔

تدریسی/تحقیقی تجربہ

کسی میڈیکل کالج میں بحیثیت لکچرر جنرل میڈیسن پانچ سالہ تجربہ

پسندیدہ (۱) اس موضوع پر مطبوعہ تحقیقی کام

۲۔ ریڈر ان نیفرولوجی (پلان پوسٹ) ڈپارٹمنٹ آف میڈیسن

استعداد

لازمی (۱) ایم۔بی۔بی۔ایس یا میڈیکل کونسل آف انڈیا سے تسلیم شدہ کوئی مساوی استعداد

(ii) ڈی ایم (نیفرولاجی) ایم ڈی (میڈیسن) اور نیفرولاجی میں دو سالہ خصوصی ٹریننگ
تدریسی/تحقیقی تجربہ
کسی میڈیکل کالج میں بحیثیت لکچرر ان نیفرولاجی پانچ سالہ تجربہ
(iii) پسندیدہ :- اس موضوع پر مطبوعہ تحقیقی کام

۳- ریڈر ان پیتھالوجی (ہیماٹالوجی اینڈ بلڈ بینک۔ ڈپارٹمنٹ آف پیتھالوجی
استعداد
لازمی:(i) ایم بی بی ایس یا میڈیکل کونسل آف انڈیا سے تسلیم شدہ کوئی مساوی استعداد
(ii) ایم ڈی (پیتھالوجی)/ ایم ڈی (پیتھالوجی اینڈ بیکٹریالوجی)/ ایم ڈی پیتھالوجی معہ بیکٹریالوجی)
پی ایچ۔ ڈی (پیتھالوجی)/ ڈی ایس سی (پیتھالوجی) میڈیکل کونسل آف انڈیا
سے تسلیم شدہ دوسری متبادل استعداد
تدریسی/تحقیقی تجربہ
بحیثیت لکچرر پیتھالوجی (ہیماٹالوجی اینڈ بلڈ بینک) کسی میڈیکل کالج کا پانچ سالہ تجربہ
پسندیدہ:- اس موضوع پر ہندوستانی یا غیر ملکی جرائد میں مطبوعہ اعلیٰ پایہ کا تخلیقی اور تحقیقی کام

۴- ریڈر ان فزیالوجی ۔ ڈپارٹمنٹ آف فزیالوجی
استعداد
۱- لازمی (i) ایم بی بی ایس یا میڈیکل کونسل آف انڈیا سے منظور شدہ کوئی مساوی استعداد
(ii) ایم ڈی (فزیالوجی) ایم بی بی ایس معہ ایم ایس سی (فزیالوجی)/ پی ایچ۔ ڈی (میڈیکل
فزیالوجی)۔ ڈی ایس سی (میڈیکل فزیالوجی)/ میڈیکل کونسل آف انڈیا سے منظور
شدہ دوسری مساوی استعداد
تدریسی/تحقیقی تجربہ
کسی میڈیکل کالج میں بحیثیت لکچرر فزیالوجی ۵ سالہ تجربہ
۲- پسندیدہ- ہندوستانی اور غیر ملکی جرائد میں مطبوعہ اعلیٰ پایہ کا تخلیقی تحقیقی کام

۵- ریڈر ان ریڈیالوجی۔ ڈپارٹمنٹ آف ریڈیالوجی
استعداد
۱- لازمی(i) ایم بی بی ایس یا میڈیکل کونسل آف انڈیا سے تسلیم شدہ کوئی مساوی استعداد
(ii) ایم ڈی/ ایم ایس (ریڈیالوجی)
تدریسی/تحقیقی تجربہ

کسی میڈیکل کالج میں بحیثیت لکچرر ریڈیالوجی ۵ سالہ تجربہ

۶۔ ریڈر ان مینورو۔ سائیکٹری۔ ڈپارٹمنٹ آف میڈیسن

استعداد

۱۔ لازمی (۱) ایم بی بی ایس یا میڈیکل کونسل آف انڈیا سے تسلیم شدہ کوئی مساوی استعداد

(۱۱) ایم ڈی (سائیکٹری)/ ایم ڈی (سائیکالوجیکل میڈیسن)/ ایم ڈی (میڈیسن) اور سائیکالوجیکل میڈیسن میں ڈپلومہ/ میڈیکل کونسل آف انڈیا سے تسلیم شدہ کوئی مساوی استعداد

تدریسی/ تحقیقی تجربہ

کسی میڈیکل کالج میں بحیثیت لکچرر سائیکٹری پانچ سالہ تجربہ

پسندیدہ۔ اس موضوع پر ہندوستانی اور غیر ملکی جرائد میں مطبوعہ اعلیٰ پایہ کا تخلیقی تحقیقی کام

۷۔ ریڈر ان سرجری (بائیوکیمسٹ) ڈپارٹمنٹ آف جنرل سرجری

استعداد

۱۔ لازمی (۱) ایم بی بی ایس یا میڈیکل کونسل آف انڈیا سے تسلیم شدہ کوئی مساوی استعداد

(۱۱) ایم ڈی (بائیوکیمسٹری)/ ایم بی بی ایس مع ایم ایس سی (بائیوکیمسٹری)/ پی ایچ ڈی (میڈیکل بائیوکیمسٹری)، ڈی ایس سی (میڈیکل بائیوکیمسٹری)/ میڈیکل کونسل آف انڈیا سے تسلیم شدہ کوئی مساوی استعداد۔

تدریسی/ تحقیقی تجربہ

کسی میڈیکل کالج میں بحیثیت لکچرر بائیوکیمسٹری پانچ سالہ تجربہ

(۲) پسندیدہ (۱) قلب/ دماغ کے جراحی عمل سے گزرنے والے بائیوکیمیکل مریضوں کی دیکھ ریکھ کا تجربہ

(۱۱) ہندوستانی اور غیر ملکی جرائد میں مطبوعہ تخلیقی و تحقیقی کام

۸۔ ریڈر ان فارماکالوجی۔ ڈپارٹمنٹ آف فارماکالوجی

(۱) استعداد

لازمی (۱) ایم بی بی ایس یا میڈیکل کونسل آف انڈیا سے تسلیم شدہ کوئی مساوی ڈگری

(۱۱) ایم ڈی (فارماکالوجی)/ ایم ڈی (فارماکالوجی اینڈ تھراپیوٹکس)/ ایم بی بی ایس اور ایم ایس سی (فارماکالوجی)/ پی ایچ ڈی (میڈیکل فارماکالوجی)/ ڈی ایس سی (میڈیکل فارماکالوجی)/ میڈیکل کونسل آف انڈیا سے تسلیم شدہ کوئی مساوی ڈگری

تدریسی/ تحقیقی تجربہ

کسی میڈیکل کالج میں بحیثیت لکچرر فارماکالوجی پانچ سالہ تجربہ
(۱) پسندیدہ:- ہندوستانی اور غیر ملکی جرائد میں اس موضوع پر طبع شدہ تخلیقی تحقیقی کام

لکچررس

شرح تنخواہ - ۷۰۰ - ۴۰ - ۱۱۰۰ - ۵۰ - ۱۶۰۰ روپیہ اور دیگر الاؤنس

۹۔ لکچرر ان جنرل سرجری- ڈپارٹمنٹ آف جنرل سرجری (عارضی)

استعداد

(۱) لازمی (۱) ایم بی بی ایس یا میڈیکل کونسل آف انڈیا سے تسلیم شدہ کوئی مساوی استعداد

(۲) ایم ایس (سرجری)/ایم ایس (جنرل سرجری)/میڈیکل کونسل آف انڈیا سے تسلیم شدہ کوئی مساوی استعداد

تدریسی/تحقیقی تجربہ

اس مضمون میں تسلیم شدہ مطلوبہ پوسٹ گریجویٹ استعداد

(۲) پسندیدہ (۱) اس مخصوص مضمون میں طبع شدہ تحقیقی کام

(۲) پوسٹ گریجویٹ استعداد حاصل کرنے کے بعد مطب کا تجربہ

۱۱ لکچرر ان مائیکرو بائیولوجی (وائرولوجی)۔ ڈپارٹمنٹ آف مائیکرو بائیولوجی

استعداد

(۱) لازمی (۱) ایم بی بی ایس یا میڈیکل کونسل آف انڈیا سے تسلیم شدہ کوئی استعداد

(۲) ایم۔ڈی (بیکٹریالوجی)/ایم ڈی (مائیکرو بائیولوجی)/ایم ڈی (بیکٹریالوجی معہ پیتھالوجی) ایم ڈی پیتھالوجی اینڈ بیکٹریالوجی)/ایم بی بی ایس معہ ایم ایس سی (میڈیکل بیکٹریالوجی)/ایم ایس سی (میڈیکل مائیکرو بائیولوجی)/پی ایچ ڈی (میڈیکل بیکٹریالوجی)/پی ایچ ڈی میڈیکل مائیکرو بائیولوجی)/ڈی ایس سی (میڈیکل بیکٹریالوجی)/ڈی ایس سی (میڈیکل مائیکرو بائیولوجی)

تدریسی/تحقیقی تجربہ

اس مضمون میں تسلیم شدہ مطلوبہ پوسٹ گریجویٹ استعداد

۱۱۔ لکچرر ان فورنسک میڈیسن (عارضی لیکن مستقل ہونے کی امید) ڈپارٹمنٹ آف فورنسک میڈیسن

استعداد

(۱) لازمی ایم بی بی ایس یا میڈیکل کونسل آف انڈیا سے تسلیم شدہ کوئی مساوی استعداد

(ii) ایم ڈی فورنسک میڈیسن

تدریسی / تحقیقی تجربہ

(iii) پسندیدہ۔ اس مضمون کی تدریس کا تجربہ

۱۲ لکچرر اِن کارڈیو گرافی۔ ڈپارٹمنٹ آف میڈیسن

استعداد۔

۱۔ لازمی (i) ایم بی بی ایس یا میڈیکل کونسل آف انڈیا سے تسلیم شدہ کوئی مساوی استعداد

(ii) ڈی ایم (کارڈیو گرافی) / میڈیکل کونسل آف انڈیا سے تسلیم شدہ کوئی مساوی استعداد

تدریسی / تحقیقی تجربہ

اس مضمون میں تسلیم شدہ مطلوبہ پوسٹ گریجویٹ استعداد

اس مخصوص مضمون میں طبع شدہ تحقیقی کام

غیر معمولی استعداد اور تجربہ کے حامل امیدواروں کو ابتدا ہی میں اعلیٰ تنخواہ دی جاسکتی ہے۔ جن امیدواروں کو انٹرویو کے لیے طلب کیا جائے گا۔ ان کو ریل کا ایک طرفہ سیکنڈ کلاس کا کرایہ بطور ٹی۔اے۔ ادا کیا جائے گا۔

درخواستوں کے متعلقہ فارم اور ہدایات اسسٹنٹ رجسٹرار سلیکشن کمیٹی کے دفتر سے دو روپیہ نقد (علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کے فائننس آفس کے کیش سیکشن میں جمع شدہ) ادائیگی کے بعد یا دو روپیہ کے انڈین پوسٹل آرڈر کے جو فائننس آفیسر مسلم یونیورسٹی کے نام واجب الادا ہو بھیج کر حاصل کیے جاسکتے ہیں۔

خط کے ہمراہ 23 × 10 سم سائز کا ایسا لفافہ جس پر خود کا پتہ تحریر ہو بھیجنا ضروری ہوگا۔

فارم وصول ہونے کی آخری تاریخ ۲۲ مارچ ۱۹۸۳ء ہے۔ نامکمل اور تاخیر سے موصول ہونے والی درخواستوں پر غور نہیں کیا جائے گا۔

نوٹ:۔ موزوں امیدواروں کو مستقبل میں خالی ہونے والی جگہوں پر تقرر کے لیے خاص طور پر بنائے گئے پینل میں رکھا جائے گا

ضمیر احمد خاں

رجسٹرار

علی گڑھ مسلم یونیورسٹی علی گڑھ

اشتہار نمبر ۸۳-۸۲/۱۹

مندرجہ ذیل اسامیوں کے لیے مقررہ فارموں پر درخواستیں مطلوب ہیں۔ جو افراد ایک سے زائد پوسٹوں کے لیے امیدوار ہوں ان کو ہر اسامی کے لیے الگ الگ درخواست دینا ضروری ہے

۱۔ ڈوولپمنٹ آفیسر۔ علی گڑھ مسلم یونیورسٹی علی گڑھ۔
شرح تنخواہ:۔ ۱۱۰۰ - ۵۰ - ۱۶۰۰ روپیہ اور ضوابط کے تحت جو بھی الاؤنس ہوں
استعداد۔ اچھے تعلیمی پس منظر کے ساتھ کم ازکم گریجویٹ ہو۔ امیدوار کو انتظامی امور کا کم ازکم پانچ سالہ تجربہ ہونے کے ساتھ ساتھ پلاننگ ڈوولپمنٹ اور پالیسی امور کو لاگو کرنے کا تجربہ ہو۔ سائنس/انجینرنگ کے علم رکھنے والے امیدوار کو ترجیح دی جائے گی

۲۔ سینئر ٹیکنیکل اسسٹنٹ۔ ڈپارٹمنٹ آف سرجری (دو عارضی اسامیاں لیکن مستقل ہونے کی امید)
شرح تنخواہ۔ 550۔ 27 - 750 - EB - 30 - 900 روپیہ اور دیگر الاؤنس
استعداد

لازمی ۱) سائنس گریجویٹ ہونے کے علاوہ اِس مضمون کی لیبارٹری ٹیکنک کی ٹریننگ۔
ترجیحی۔ WHO کوڈنگ سسٹم میں میڈیکل ریکارڈنگ کا بھرپور تجربہ' لائبریری سائنس میں ڈپلومہ۔ لائبریری کتابوں کی کوڈنگ و کیٹلاگنگ کے علاوہ الیکٹرونک سیکیکل ڈیٹا پروسیسنگ مشین کو چلانے کا تجربہ۔

۳ پروفیشنل اسسٹنٹ۔ ڈپارٹمنٹ آف اِسلامک اسٹڈیز (عارضی لیکن مستقل ہونے کی امید)
شرح تنخواہ۔ 550 - 25 - 750 - EB - 30 - 900 روپیہ اور دیگر الاؤنس
استعداد۔

لازمی۔ ایم اے اسلامک اسٹڈیز/عربی/فارسی اور لائبریری سائنس میں ڈپلومہ

پسندیدہ (۱) السنۂ مشرقیہ کا کوئی امتحان (عالم، فاضل، کامل وغیرہ)
(۱) اچھا نقشہ ساز
(۲) کسی لائبریری کے اورینٹل سیکشن میں کام کا تجربہ اور فارسی/اردو/عربی کتابوں کی دیکھ بھال

۴۔ ریڈیو تھیراپسٹ۔ جواہر لال نہرو میڈیکل کالج ہسپتال (مستقل)
شرح تنخواہ :- 445-15-560-EB-20-700 روپیہ اور دیگر الاؤنس
استعداد :- بی ایس سی (اس کے مساوی) کوئی ڈگری۔ ریڈیو گرافی میں ایکس رے ٹیکنیشن ٹریننگ کسی تدریسی ادارہ میں ریڈیو تھیراپسی کے کام کا کم از کم پانچ سالہ تجربہ

۵۔ فزیو تھیراپسٹ۔ جواہر لال نہرو میڈیکل کالج (مستقل) دو اسامیاں
شرح تنخواہ 445-15-560-EB-20-700 روپیہ اور دیگر الاؤنس
استعداد :- ہائی اسکول یا اس کے مساوی۔ کسی تسلیم شدہ طبی ادارہ سے فزیو تھیراپسی میں منظور شدہ ڈپلومہ۔ یا اس کے مساوی کوئی استعداد۔ اس مضمون میں تعلیم سالہ اور آبادکاری کے میدان میں یکسالہ تجربہ۔

۶۔ وارڈ سسٹر/وارڈ ماسٹر۔ میڈیکل کالج ہسپتال (تین اسامیاں)
شرح تنخواہ 445-15-560-EB-20-700 روپیہ اور دیگر الاؤنس
استعداد :- میٹریکولیشن یا اس کے مساوی کوئی استعداد۔ جنرل نرسنگ اور مڈوائفری میں ڈپلومہ کے علاوہ نرسنگ کی کسی بھی صوبائی کونسل میں رجسٹریشن۔ بحیثیت اسٹاف نرس پانچ سال تجربہ۔ جن امیدواروں نے وارڈ سسٹر کا کورس کیا ہے، انھیں ترجیح دی جائے گی۔

۷۔ ٹیکنیکل اسسٹنٹ (کیمسٹ)۔ (عارضی)۔ ڈپارٹمنٹ آف فارماکالوجی۔
شرح تنخواہ :- 425-15-500-EB-15-560-20-700 مع دیگر الاؤنس
استعداد :-
لازمی کیمسٹری/بائیو کیمسٹری میں سائنس گریجویٹ۔
پسندیدہ :- ڈپارٹمنٹ آف فارماکالوجی/فارمیسی میں تین سالہ تجربہ

۸۔ پروجیکشنسٹ :- ڈپارٹمنٹ آف آپتھلمالوجی
شرح تنخواہ 425-15-560-EB-20-640 اور دیگر الاؤنس

استعداد :۔ گریجویٹ۔ آڈیو وژیوول ٹیکنکس میں ڈپلوما/ٹریننگ اور بحیثیت آڈیو وژیوول ٹیکنیشن پانچ سالہ تجربہ۔ ایسے امیدواروں کو ترجیح دی جائے گی جنھوں نے کسی میڈیکل کالج میں کام کیا ہو یا بحیثیت پروجیکشنسٹ متعلقہ ڈپارٹمنٹ میں کام کا تجربہ ہو۔

پسندیدہ ۔ آلات کی دیکھ ریکھ کی ٹریننگ

نوٹ :۔ منتخب ہونے والے شخص کو آڈیو وژیوول کے تمام آلات اور آڈیٹوریم کی دیکھ بھال کرنا ہوگا

سینیر انسٹرومنٹ میکینک (۲ مستقل اسامیاں) انجینرنگ کالج ورکشاپ

شرح تنخواہ 425-15-500-15-560-20-700 روپیہ اور دیگر الاؤنس

استعداد

لازمی اسپیشل ٹریڈ میں سرٹیفکٹ اور کسی تسلیم شدہ ادارہ کا پانچ سالہ تجربہ

پسندیدہ لیت مشین کے ذریعہ سرانجام پانے والے تمام کاموں کی آگاہی۔ مثلاً فیسنگ، سرفیسنگ، اسکریو کٹنگ (جس میں مختلف النوع اسکریو اور تھریڈ شامل ہیں) ٹیپر، کروڈ ٹرننگ وغیرہ۔ اس کے علاوہ امیدوار ورکشاپ کی دوسری مشینوں جیسے شیپر ملنگ، ڈرلنگ پلانر وغیرہ پر بھی کام کر سکے۔

پرسنل اسسٹنٹ برائے پرنسپل یونیورسٹی پالی ٹیکنک (عارضی)

شرح تنخواہ ۱۔ 425-15-500 EB 15-560-20-700

استعداد

لازمی (۱) آرٹس، سائنس یا کامرس گریجویٹ۔ کسی کالج / یونیورسٹی میں بحیثیت پرسنل اسسٹنٹ یا اسٹینوگرافر یا ایسی ہی کسی متبادل پوسٹ پر کام کرنے کا تین سالہ تجربہ، مختصر نویسی اور انگریزی ٹائپنگ کی اچھی معلومات

پسندیدہ :۔ انجینرنگ / ٹیکنیکل ادارہ میں کام کا تجربہ

انیستھٹسٹ ٹیکنیشن۔ جواہر لال نہرو میڈیکل کالج ہسپتال

شرح تنخواہ۔ 425-15-500 EB 15-560-20-700 مع دیگر الاؤنس

استعداد

(۱) لازمی میٹرکیولیٹ یا اس کے مساوی کوئی امتحان۔ سرٹیفکیٹ آف نرسنگ۔ بحیثیت انیستھٹسٹ اسسٹنٹ کسی میڈیکل کالج ہسپتال میں کام کا عملی تجربہ

(۲) پسندیدہ انستھیسیا کے آلات اور ان کی دیکھ ریکھ کی جانکاری

نوٹ :۔ اس جگہ کے لیے موزوں امیدوار کے لیے بشرط ضرورت سلیکشن کمیٹی مطلوبہ استعداد کو ختم کر سکتی ہے

۱۲۔ سینیئر لیبارٹری اسسٹنٹ۔ ڈپارٹمنٹ آف اناٹمی (مستقل)

شرح تنخواہ۔ 380 - 12 - 500 - EB - 15 - 560 روپیہ اور دیگر الاؤنس

استعداد

سائنس کے مضامین کے ساتھ ہائر سکنڈری اور سابقہ تجربہ

۱۳ سینیئر لیبارٹری اسسٹنٹ۔ ڈپارٹمنٹ آف مائیکرو بائیولوجی (مستقل)

شرح تنخواہ۔ 330 - 6 - 380 - EB - 12 - 500 - EB - 15 - 560 روپیہ اور دیگر الاؤنس

استعداد۔ سائنس مضامین کے ساتھ ہائر سکنڈری اور مائکرو بایولوجی میں تجربہ

۱۴ کلرک گریڈ I (اکاونٹس) ڈپارٹمنٹ آف اناٹمی (مستقل)

شرح تنخواہ۔ 330 - 6 - 380 - EB - 12 - 500 - EB - 15 - 560 روپیہ اور دیگر الاؤنس

استعداد

بی اے۔ بی ایس سی، بی کام اور سرکاری، نیم سرکاری یا کمرشیل ادارہ میں کیمیکل و آلات وغیرہ کی خریداری اور حساب کتاب رکھنے کا پانچ سالہ تجربہ

پسندیدہ:۔

امپورٹ کے طریقہ کار اور پورٹ (Port) سے مال کی ڈلیوری کے سلسلہ میں پیش آمدہ ضروریات کی معلومات کے علاوہ انگریزی کی جانکاری

نوٹ:۔ موزوں امیدوار کے سلسلہ میں استعداد کو ختم کیا جاسکتا ہے

۱۵۔ اسٹاف نرسیز۔ جواہر لال نہرو میڈیکل کالج۔ علی گڑھ مسلم یونیورسٹی۔ علی گڑھ

شرح تنخواہ:۔ 425 - 640 روپیہ اور دیگر الاؤنس۔

استعداد

میٹرکولیشن یا اس کے مساوی کوئی استعداد۔ کسی تسلیم شدہ ادارہ سے جنرل نرسنگ اور مڈوائفری کا ڈپلومہ اور کسی اسٹیٹ میں رجسٹریشن اور بحیثیت جنرل ڈیوٹی نرس ایک سال کا تجربہ

۱۶۔ نرسنگ اسسٹنٹ، اجمل خاں طبیہ کالج ہسپتال (مستقل)

شرح تنخواہ 260 - 6 - 326 - EB - 8 - 350 روپیہ اور دیگر الاؤنس۔

استعداد

لازمی ہائی اسکول۔ مددگار (AUXILLARY) نرس یا اس کا متبادل ڈپلوما

پسندیدہ

(۱) کسی تسلیم شدہ ہسپتال میں بحیثیت نرسنگ اسسٹنٹ تین سال کا تجربہ

(۲) اردو نوشت وخواند کا علم

غیر معمولی استعداد یا تجربہ کے حامل امیدواروں کو ابتداء ہی سے اعلیٰ تنخواہ سے شروعات دی جاسکتی ہے۔ جب امیدواروں کو انٹرویو کے لیے بلایا جائے گا انھیں بطور T.A. ریلوے کے سکنڈ کلاس کا یک طرفہ کرایہ ادا کیا جائے گا۔

متعلقہ فارم اور ضروری معلومات اسسٹنٹ رجسٹرار (سلیکشن کمیٹی) مسلم یونیورسٹی سے دو روپیہ نقد ادائیگی (مسلم یونیورسٹی کے فائننس آفس کے کیش سیکشن میں جمع شدہ) یا بذریعہ انڈین پوسٹل آرڈر جو فائننس آفیسر مسلم یونیورسٹی کے نام واجب الادا ہو بھیج کر حاصل کی جاسکتی ہیں۔ مگر ساتھ میں ۲۳×۱۰ سم سائز کا خود کا پتہ لکھا ہوا لفافہ بھیجنا ضروری ہے۔ درخواست موصول ہونے کی آخری تاریخ ۲۳ر مارچ ۱۹۸۳ء ہے۔ نامکمل یا تاخیر سے موصول ہونے والی درخواستوں پر غور نہیں کیا جائے گا۔

ضمیر احمد خاں
رجسٹرار

علی گڑھ مسلم یونیورسٹی، علی گڑھ

اشتہار نمبر ۸۳-۸۲/۲۰

مندرجہ ذیل اسامیوں کے لیے مقررہ فارموں پر درخواستیں مطلوب ہیں۔

۱۔ پروفیسر آف اسٹرابسمالوجی۔ ڈپارٹمنٹ آف آپتھلمالوجی
۲۔ پروفیسر آف ریٹینا سروس۔ ڈپارٹمنٹ آف آپتھلمالوجی

شرح تنخواہ 1500-60-1900-100-2500 125/2-2500 روپیہ اور دیگر الاؤنس

استعداد

I- لازمی (۱) ایم بی بی ایس یا میڈیکل کونسل آف انڈیا سے تسلیم شدہ کوئی مساوی استعداد
(۲) ایم ایس (آپتھلمالوجی)/ایم ڈی (آپتھلمالوجی) یا میڈیکل کونسل آف انڈیا سے تسلیم شدہ کوئی مساوی استعداد

تدریسی/تحقیقی تجربہ
کسی میڈیکل کالج میں بحیثیت ریڈر آپتھلمالوجی چار سالہ تجربہ

II پسندیدہ (۱) شمار نمبر ایک کی اسامی کے لیے اسٹرابسمالوجی
۲ شمار نمبر ۲ کی اسامی کے لیے ریٹینل سرجری کا تجربہ
(۳) ہندوستانی اور غیر ملکی جرائد میں اس تخصص/میدان میں مطبوعہ تخلیقی کام

۳۔ پروفیسر آف اکیولر تھیرا لوجی۔ ڈپارٹمنٹ آف آپتھلمالوجی

شرح تنخواہ۔ 1500-60-1900-100-2000-125/2-2500 روپیہ اور دیگر الاؤنس

استعداد۔ لازمی (۱) ایم بی بی ایس یا میڈیکل کونسل آف انڈیا سے تسلیم شدہ کوئی مساوی استعداد

(ii) ایم۔ایس (آپتھلمالوجی) ایم ڈی (آپتھلمالوجی) ایم ڈی (بیتھالوجی) / ایم ڈی (پتھالوجی اینڈ بیکٹریالوجی) یا میڈیکل کونسل آف انڈیا سے تسلیم شدہ کوئی مساوی استعداد

تدریسی / تحقیقی تجربہ

کسی میڈیکل کالج میں بحیثیت ریڈر کام کا چار سالہ تجربہ

پسندیدہ۔

1) ترجیحی طور پر کسی آپتھلمالوجی ڈپارٹمنٹ میں آپتھلمک پتھالوجی کا تجربہ

2) ہندوستانی اور غیر ملکی جرائد میں طبع شدہ تخلیقی کام

غیر معمولی تجربہ اور قابلیت کے حامل امیدواروں کو ابتدا ہی سے اعلیٰ تنخواہ سے شروعات دی جا سکتی ہے۔ جن امیدواروں کو انٹرویو کے لیے طلب کیا جائے گا انھیں بطور .T.A ریلوے کے سکینڈ کلاس کا یکطرفہ کرایہ ادا کیا جائے گا۔

مطلوبہ درخواست فارم اور ہدایات اسسٹنٹ رجسٹرار (سلیکشن کمیٹی) مسلم یونیورسٹی کے دفتر سے 2 روپیہ نقد (مسلم یونیورسٹی کے فائننس آفس کے کیش سیکشن میں جمع شدہ) ادائیگی کے بعد یا انڈین پوسٹل آرڈر جو فائننس آفیسر مسلم یونیورسٹی کے نام واجب الادا ہو بھیجے جانے پر حاصل کیے جا سکتے ہیں۔ مگر اس کے ساتھ سنٹی میٹر 10 × 23 کا ایک لفافہ جس پر خود کا پتہ تحریر ہو بھیجنا ضروری ہے۔ درخواست وصول ہونے کی آخری تاریخ ۳۰ مارچ ۱۹۸۳ء ہے۔
نامکمل یا دیر سے موصول ہونے والی درخواستوں پر غور نہیں کیا جائے گا۔

ضمیر احمد خاں
رجسٹرار

علی گڑھ مسلم یونیورسٹی

علی گڑھ

تصحیح

اشتہار نمبر ۱۹/۸۲-۸۲ کے ذریعہ مشتہر کی گئی ڈپارٹمنٹ آف سرجری میں سینئر ٹیکنیکل اسسٹنٹ (ریکارڈنگ) کی پوسٹ کو منسوخ سمجھا جائے کیونکہ یہ اسامی پہلے مشتہر ہو چکی ہے

ضمیر احمد خاں

رجسٹرار

پرنٹر پبلشر قاضی معز الدین احمد مطبع لیتھو کلر پرنٹرس، علی گڑھ مقام اشاعت۔ صفدر منزل تاد بنگلا اے ایم یو علی گڑھ

Ramu topped in exam
I didn't
Poor performance in the class damages his self-confidence
He can surely regain self confidence if parents care to
give him two slices of bread everyday with
DIMAGHEEN
A nourished mental tonic
Dawakhana Tibbiya College
ALIGARH MUSLIM UNIVERSITY. ALIGARH-202001
Phone : 3629 Gram : "DAWAKHANA

کیا
آپ کی روزانہ کی خوراک سے
آپ کے بدن کو پوری قوت اور
پورا فائدہ ملتا ہے؟

اپنی روزمرّہ خوراک سے صحیح تغذیہ حاصل کرنا اس بات پر منحصر ہے کہ آپ کا نظامِ ہضم کتنا ٹھیک اور طاقتور ہے۔

سنکارا ہی ایک ایسا ٹانک ہے جس میں طاقت دینے والے ضروری وٹامنوں اور معدنی اجزا کے ساتھ چھوٹی الائچی، لونگ، دھنیا، دارچینی، تیزپات، تلسی وغیرہ جیسی چودہ[14] جڑی بوٹیاں شامل ہیں۔ اس مرکب سے آپ کے نظامِ ہضم کو طاقت ملتی ہے اور آپ کا بدن اس کی مدد سے آپ کی روزمرّہ خوراک سے صحیح تغذیہ اور بھرپور قوت حاصل کرتا ہے۔

سنکارا

ہر موسم اور ہر عمر میں
(سب کے لیے [illegible] ٹانک)

جلد نمبر ۲ یکم اپریل ۱۹۸۳ء شمارہ نمبر ۷

"ہندوستان کے مسلمانوں کے عقائد مذہبی جو ان کی کتابوں میں لکھے ہیں وہ اور ہیں اور جو اُن کے دلوں میں ہیں اور جن کا اُن کو یقین بیٹھا ہوا ہے وہ اور ہیں۔ ہزاروں عقائد شرکیہ ان کے دلوں میں ہیں۔ پس اپنے عقائد حقیت اسلام کے مطابق کرنا تہذیب اور شائستگی حاصل کرنے کی اصل جڑ ہے۔"

(سر) سید احمد

فی شمارہ ایک روپیہ ششماہی ۱۱ روپے سالانہ ۲۰ روپے

بیرون ہند

فی پرچہ ایک ڈالر سالانہ ۱۵۔ ڈالر

ترسیل زر و خط و کتابت کا پتا

قاضی معز الدین احمد۔

صفدر منزل۔ تار بنگلہ۔ اے ایم یو

علی گڑھ یوپی۔ (202001)

پندرہ روزہ
علی گڑھ

تہذیب الاخلاق

مدیر: سید حامد وائس چانسلر
علی گڑھ مسلم یونیورسٹی
مدیر مسئول: قاضی معز الدین احمد

جلد نمبر ۲ یکم اپریل ۱۹۸۳ء شمارہ نمبر ۷

شئے لطیف

بچپن میں سنا تھا "فلاں صاحب میں شئے لطیف کی کمی ہے"۔ ذہن میں یہ تاثر تھا کہ یہ جملہ ایسے شخص کے لیے کہا جاتا ہے جس میں بھونڈا پن پایا جائے۔ اب اندازہ ہوتا ہے کہ "شئے لطیف" سے نہ فکر کی لطافت مراد ہے نہ اظہار کی نفاست۔ شئے لطیف دراصل تناسب کے احساس کا دوسرا نام ہے۔ کوئی بات کہاں کہی جانی چاہیے، کس طور کہنی چاہیے، اس کا صحیح فیصلہ انسان شئے لطیف کی رہنمائی کے بغیر نہیں کر سکتا۔

آپ کی نظر سے ایسے لوگ گزرے ہوں گے جنھیں اپنی قسمت سے ہمیشہ یہ شکایت رہی ہے کہ وہ سچی اور کھری بات کہتے ہیں۔ پھر بھی کوئی اُن کی باتیں سنتا۔ لوگ الٹے ان کے خلاف ہو جاتے ہیں۔ جہاں انھوں نے بات شروع کی لوگوں نے تیوری چڑھائی کہ دیکھیے اب کیا آتا ہے۔ بجائے اُن کی سچائی کی تعریف اور پذیرائی کرنے کے لوگ ان کی باتوں سے مکدر ہونے لگتے ہیں اور بعض تو دشمنی پر اتارو ہو جاتے ہیں۔ یہ بے محل بولنے والے سوچتے بھی نہیں کہ بات موقع دیکھ کر کرنی چاہیے۔ بے موقع بات جراحت کا سامان بہم پہونچاتی ہے یا استہزا کا۔ جو لوگ سچ بات کہہ کر، بغیر ارادۂ اصلاح کے دوسروں کا دل دکھاتے ہیں وہ سچائی کو بدنام کرتے ہیں اور بہتوں کو سچائی سے بدگمان کر دیتے ہیں۔ بات کہتے وقت یہ تو سوچ ہی لینا چاہیے کہ اس بات کا اثر کیا ہوگا۔ اگر بات کا اثر بُرا ہونے کا ڈر ہے تو بات کہی ہی کیوں جائے۔ کیا صرف اس وجہ سے کہ وہ زبان پر آگئی ہے یا اس بنا پر کہ حقیقت بےنقاب ہونے کے لیے بےتاب ہے [illegible]

کوئی غلط قدم اُٹھایا اور آپ نے اسے برملا بُرا بھلا کہنا شروع کر دیا تو تقریباً ہوگا۔ وہ ضد پکڑ جائے گا اور اپنے دل میں آپ کے لیے کدورت یا عداوت کو جگہ دے دے گا۔ آپ پہلے تو اصلاح کرنے اس کے بجائے آپ نے مخاطب کو اس کی غلطی میں راسخ کر دیا۔ اور اسے اپنا دشمن بھی بنا لیا۔

آپ کسی سے ملنے گئے۔ اس کے اختیار میں ہے کہ آپ کا کام بن جائے۔ لیکن آپ سوال کے بجائے چھوٹتے ہی مطالبہ کرنے لگے، حکم دینے لگے، جھگڑنے لگے تو اس کا اختیار تمیزی جو آپ کے مسئلے کو حل کرنے میں صرف ہوتا، اسے الجھانے میں لگا دیا جائے گا۔ بات کرنے کا ڈھنگ زندگی کی اہم ترین چیزوں اور کامیابی کے اہم ترین وسائل میں سے ہے۔ اگر ڈھنگ مناسب ہے تو بات بن جائے گی، نارَوا ہے تو بات بگڑ کر رہے گی۔

کس وقت بات کرنی چاہیے اور کس وقت دم سادھ لینا چاہیے، اس کا فیصلہ ہمیں روز کرنا پڑتا ہے۔ صحیح فیصلہ احساس تناسب کے بغیر ممکن نہیں۔ آپ کو اپنے افسر سے شکایت ہے۔ آپ اس کا ذکر جا بجا کرتے پھرتے ہیں۔ گویا شکایات کے دوچند ہو جانے کا بہ نفس نفیس انتظام کر رہے ہیں۔ یاد رکھیے آپ کے کلمات موصوف تک ضرور پہنچ جائیں گے۔ "مناسب" یعنی نامناسب اضافوں کے ساتھ۔ اس سے بہتر ہوتا کہ آپ موصوف سے خود بات کر لیتے اور بات کرتے ہوئے اس احساس کا اظہار کر دیتے کہ انھیں آپ کی خوشحالی اور آپ کے مستقبل میں دلچسپی ہے اور اس امید کو زبان دیتے کہ آپ کو ان کی ہمدردی پر اعتماد ہے۔ یاد رکھیے

کہ ہر انسان ان توقعات کو جو دوسرے لوگوں کے متعلق ہیں، پورا کرنے کی کچھ کوشش ضرور کرتا ہے۔ جس مسئلہ میں آپ نے کسی دوسرے کو ابتدا سے شریک کر لیا وہ مسئلہ آپ کی طرح خود اس کا مسئلہ بن جاتا ہے۔ بات یہاں بھی نہیں رکتی۔ ماہرین نفسیات کہتے ہیں کہ ہر فرد ان توقعات کو بھی جو خود اسے اپنی ذات سے ہیں، پورا کرتا ہے یا اس دِشا میں آگے بڑھتا ہے۔ جبھی تو کہتے ہیں کہ اپنی ہمیشہ کو شکستوں کی یاد یا ہار کے تصور سے گرد آلود نہ کرو۔ ناکامیوں اور نااہلیوں کو بھول جاؤ۔ اور اپنی کامیابیوں اور کارگزاریوں کو یاد رکھو۔ اس طرح تم اپنی ہمیشہ میں آب و رنگ بھر دو گے جو تمھارے اندر اعتماد اور افتخار پیدا کر کے تم سے بڑے بڑے کام کرائے گی۔ جیسے جیسے نئی نئی کامیابیاں تمھیں حاصل ہوں گی، پرانی ناکامیوں کی یاد خزاں کے پتوں کی طرح جھڑتی چلی جائیں گی اور نئی کامیابیاں بہار کی کونپلوں کی طرح حافظہ میں پھوٹا کریں گی۔ تمھارا تصور تمھارے متعلق جو پیکر بنائے گا اس میں ولولہ، اعتماد، قوتِ تسخیر جلوہ گر ہوگی۔ ناکامیوں اور شکستوں کے اسباب کا جلد ہی تجزیہ کر کے ان کی حوصلہ شکن یاد کو ہمیشہ کے لیے دفن کر دو۔

جو لوگ شیخی کے عادی ہیں یا خود ستائی سے باز نہیں آتے وہ بھی انھیں محرومیوں میں سے ہیں جنھیں لطیف جن سے کترا کر نکل گئی۔ مان لیجیے کہ آپ افلاطون ہیں مگر اس شخص کو جس سے آپ بات کر رہے ہیں، آپ کے افلاطون ہونے سے کیا ملتا ہے، اس کے پاس اس یا وہ گوئی کو سننے سے لذت

آپ ضد میں گے تو خود وہ بھی آپ کی
... بھری لے گا لیکن جلد ہی اکتا جائے گا۔
... آپ کی صحبت سے گریز کرنے لگے گا۔ آپ اگر واقعی
... ہیں تو آپ کو خود اس کا اعلان کرنے کی
... ہوگی آپ کی دانشمندی سورج کی کرنوں
... طرح دنیا میں پھیل جائے گی۔

ایک گروہ ان اشخاص کا ہے جو اپنی تعریف
نہیں کرتے لیکن اپنا اور اپنے گھر والوں کا ذکر کرتے
... نہیں تھکتے۔ یہ خیال ان کے دماغ پر اپنا سایہ
نہیں ڈال پاتا کہ آپ کے گھرانے کے متعلق دوسروں
... دلچسپی کیوں ہونے لگی۔ اور ان لوگوں کی تو
... سماج میں کمی نہیں جو آپ کے پاس آ کر گھنٹوں
... جائیں گے اور باتیں کیے جائیں گے یا خاموش بیٹھے
... گے۔ دونوں صورتوں میں انھوں نے آپ کا وقت
... کیا اور آپ کے سکونِ خاطر کو برہم کیا۔ وہ سمجھتے ہیں
... اپنی صحبت کا شرف بخش کر وہ آپ پر احسان کر رہے
ہیں حالانکہ دراصل انھوں نے آپ کو عتاب میں
مبتلا کر دیا ہے۔ ایسے لوگوں کو انگریزی میں "بور"
کہتے ہیں۔ ان کے ساتھ شئے لطیف کا انتساب ناممکن ہے

اور ایسے لوگ بھی ہیں اپنے ارد گرد مل
جائیں گے جو شیخی مارنے کے بجائے اس کے برعکس
عمل کرتے ہیں یعنی اپنی کم مائیگی اور نااہلی کا وقت
بے وقت اعلان کرتے ہیں۔ انھیں کرید کر دیکھیے تو
پتہ چلے گا کہ اپنی ذات گرامی کے متعلق انھیں دل ہی
دل میں بہت خوش فہمیاں ہیں اور یہ خوش فہمیوں کی
... ایک کا بہروپ بھر کر زبان پر آتی ہے
... اپنے انکسار ذاتی کو اصل عنوان برہنہ ہونے سے

بچایا جا رہا ہے۔ بعض حضرات اس انکسار میں دعوت
ستائش کو کروٹ لیتے ہوئے دیکھتے ہیں۔ موصوف
کے پاس صرف ایک صورت ستائش حاصل کرنے کی
ہے۔ اپنے آپ کو برا بھلا کہنا، نیچا دکھانا، ذرۂ ناچیز
بتانا۔ مخاطب کے پاس اس کے سوا کوئی چارہ نہیں
رہے گا کہ موصوف جو کچھ کہہ رہے ہیں اس کی تردید
کرے اور ان کی تعریف کے پل باندھے تاکہ محترم کی
تفریط اور اس کی افراط سے ایک اوسط نکل آئے
جو حقیقت کے قریب تر ہو۔ یا کم از کم مخاطب پر
یہ الزام نہ آئے کہ محترم اپنی جو ہجو کر رہے ہیں وہ
اس میں برابر کا شریک ہے۔ بہرحال یہ انکسار جھوٹا
انکسار ہے، پُر فریب انکسار ہے اور اس کا شمار
خصائلِ حمیدہ میں کرنا فریب کھانے والوں کے لیے
بھی دشوار ہے۔ جھوٹے انکسار سے پُر خلوص خودبینی
بہتر ہے۔ شئے لطیف کا پہرہ جہاں ہٹا، اس طرح
کے نفسیاتی آسیب دل و دماغ میں داخل ہو جاتے
ہیں اور زبان کے میدان میں آ کر داد شجاعت دیتے
ہیں۔

یوں تو شئے لطیف کی کمی اپنے اظہار کے لیے
زبان کی محتاج بھی نہیں۔ اس کے ناگفتہ کرشمے بھی
کوئی کم نہیں۔ بے محل اور بے موقع کام کئی لوگ ناحق
کر گزرتے ہیں۔ جو بات کسی موقع پر نہ کہنی چاہیے جو
کام کسی موقع پر نہیں کرنا چاہیے وہی کرتے ہیں۔
اور سب کو خفت، پشیمانی اور الجھن میں مبتلا
کرتے ہیں۔

زندگی کا تجربہ جتنا وسیع ہوتا ہے اور
انسانوں کے باہمی تعلقات اور ان کے ردِ عمل کے

[illegible] میں قدر ملتا ہے اسی قدر یہ بات کھلتی
جاتی ہے کہ انسان کے لیے تناسب کا احساس بے حد ضروری
[illegible] ہے۔ اگر یہ [illegible] وہ ہر قدم پر [illegible]
[illegible] اور [illegible] اسی [illegible] رہ جائے [illegible]
اتنی وسیع، یہ زندگی اتنی پیچیدہ، یہ تجربات اتنے گوناگوں
اور حالات کی صورتیں باہم دگر اس قدر مختلف اور
باہمی معاملات اتنے نازک، اور افراد کی انا اس قدر
استیلا طلب اور مختارات اتنے وافر، راہیں اتنی کثیر
اور کسی ایک لمحہ میں کچھ کہنے یا کرنے کے امکانات اس
قدر متنوع ہوتے ہیں کہ تناسب کا احساس اگر رہنمائی
اور یاوری نہ کرے تو فرد ٹکرا ٹکرا کر ٹکڑے ٹکڑے ہو جا
سکتا ہے اور جوں جوں آگے بڑھے منزل سے دور
ہوتا چلا جائے۔ اس قدر دور کہ مرکز کی طرف واپس
آسکنے کی صورت باقی نہ رہے۔ مرکز سے دور ہونے
کا انجام کیا ہے پارہ پارہ ہو جانا، بکھر جانا۔ یہی انجام
اس شخصیت کا ہوتا ہے۔ احساس تناسب جس کی شیرازہ
بندی نہیں کرتا وہ شخصیت منقسم شخصیت کی سعد
پر منڈلانے لگتی ہے

یہ احساس تناسب ہی ہے جو بات کی
تہہ تک پہونچاتا ہے۔ ورنہ انسان کے حواس خمسہ دماغ
کی طرف ہزاروں لاکھوں تاثرات اور پیغامات بھیجتے رہتے
ہیں۔ غریب دماغ ان کے ہجوم سے گھبرا جائے اور
اسی طرح ہاتھ پاؤں مارنے لگے جیسے ڈوبتا ہوا انسان
موجوں کی یورش میں دیوانہ وار ہاتھ پاؤں مارتا ہے
یہ احساس تناسب ہے جو ان ہزاروں پیغامات میں سے
جو حواس دماغ کو بھیجتے ہیں [illegible]
[illegible] کو تحت الشعور [illegible]
[illegible]
[illegible]
تناسب یا [illegible] کی [illegible] میں آجاتی [illegible]
کا دوسرا نام قوت انتخاب ہے۔

طالب علموں کے لیے احساس تناسب کو آزمانے
اور اس کو پروان رکھنے کا ایک موقع فراہم کیا جاتا ہے
امتحان میں ایک طویل عبارت دے دی گئی اور کہا گیا کہ
اس کا خلاصہ لکھو اس کا لب لباب بتاؤ۔ جواب سے اندازہ
ہو جاتا ہے کہ امتحان دینے والے میں تناسب کا احساس
کس حد تک ہے، کس پایہ کا ہے۔

زندگی میں ہر قدم پر فیصلے کرنا پڑتے ہیں یعنی
کئی راہوں کئی مختارات میں سے ایک کو چننا پڑتا ہے اور
اکثر ایسا ہوتا ہے کہ فیصلہ کرنے کے لیے ایک ثانیہ سے
زیادہ نہیں ملتا۔ زندگی کے امتحان میں جو پرچہ
آپ کو آئے دن بلکہ متواتر کرنا پڑتا ہے وہ سینکڑوں
کثیر المختارات معروضی سوالات پر مشتمل ہوتا ہے
اگر آپ کو قدرت نے شئے لطیف سے نوازا ہے اگر
اگر آپ کو احساس تناسب کی دولت ملی ہے
تو آپ زندگی کے اس امتحان میں پورے اتریں
گے ورنہ اس بحر زخار میں بے سمت [illegible]
کھاتے رہیں گے۔ یہ شئے لطیف بالکل نہ ہو تو مرض
لاعلاج ہے۔ تھوڑی بہت ہو تو اس کو [illegible]
اور [illegible] جا سکتا ہے [illegible]

طلبہ سے خطاب

۳۰ جنوری ۱۹۸۳ء کو طلبہ کی یونین نے علی گڑھ تحریک پر ایک سیمینار منعقد کیا تھا۔ اس سیمینار میں پرو وائس چانسلر صاحب نے طلبہ کو خطاب کرتے ہوئے کہا۔

عزیزانِ گرامی

علی گڑھ تحریک علم اور عقل، روشنی اور تازہ ہوا امید اور ولولہ، درد اور خلوص کی تحریک تھی۔ اس نے ستم رسیدہ اور مظلوم مسلمانوں کو مایوسی اور غصہ سے چھٹکارا دلایا۔ اس نے ان کے مرجھائے ہوئے دلوں کو زندگی کا حوصلہ دیا۔ اس نے انھیں یہ بھی سمجھا دیا کہ خود غرضی اور نفسی نفسی سے ہرگز کام نہ چلے گا۔ کوئی طبقہ، کوئی قوم کوئی ملت اس وقت تک ترقی نہیں کرسکتی جب تک کہ اس کے افراد انفرادی مفاد کو اجتماعی مفاد پر ترجیح دیتے نہیں گے۔ اور جب تک ان میں تعمیری اداروں کو ڈھنگ سے کام چلانے کی صلاحیت پیدا نہ ہوگی۔ اس نے یہ حقیقت بتائی کہ جہالت انسان کے لیے سب سے بڑا نقص ہے اور کوئی قوم جہالت دور کیے بغیر ترقی نہیں کرسکتی۔ اس تحریک نے علم کی اشاعت سے بھی زیادہ [illegible] کو سمجھا وہ نقطۂ نگاہ کی تبدیلی کا تھا۔ یعنی [illegible] ہمارے فیصلے جذبات پر نہیں عقل پر مبنی ہونے چاہئیں۔ اس نے ہندوستانی مسلمانوں میں علم اور عقل کی بالادستی کو رواج دینے کی کوشش کی

اس نے انھیں یہ بھی سکھایا کہ الگ تھلگ رہ کر کڑھنے اور سلگنے یا ڈیڑھ اینٹ کی مسجد بنا لینے سے کچھ حاصل نہیں ہوتا۔ ہمیں سب کے ساتھ مل کر چلنا ہے اور تہذیب حاضر اور وطن عزیز کی برکتوں اور نعمتوں سے دوسروں کے ساتھ بہرہ اندوز ہونا ہے۔ اس تحریک نے جہالت کے ازالہ اور اخلاق و اطوار کی تہذیب و اصلاح کا کام بہ یک وقت انجام دیا۔

اس تحریک کے بانی سید احمد خاں علیہ الرحمۃ نے، جن کے قد و قامت کے سامنے گزشتہ دو سو سال کے بیشتر قد آور مسلم رہنما پستہ قد نظر آتے ہیں، اپنی تحریک کو نہ صرف خلوص اور ولولہ بلکہ دانش مندی، حکمت عملی اور بصیرت کے ساتھ چلایا جو کچھ فی الوقت ممکن تھا اس کو انجام دینے کی کوشش کی۔ موقع اور محل کا خیال رکھا اور کسی وقت اصلاح کے تدریجی پہلو کو نظر انداز نہیں کیا۔ مثلاً انھوں نے لڑکیوں کی جدید تعلیم کو اس وقت چنداں اہمیت نہ دی۔ کیوں کہ وہ جانتے تھے کہ اس کا وقت ابھی نہیں آیا ہے بلکہ [illegible] تربیت سے جو انھوں نے [illegible] کیا

وہ بھی اسی وجہ سے۔ سید احمد خاں نے اپنے ذمہ کوئی ایسا کام نہ لیا جو ہر چند کہ اچھا تھا مگر اس وقت در خور عمل نہ تھا۔ انھوں نے اپنی تحریک کو چند گنے چنے مقاصد پر مبنی رکھا اور اسے اور اپنے خلوص کو مقاصد کی بہتات اور تعبیروں کی کثرت سے بکھرنے نہیں دیا۔ انھوں نے اصولوں پر کوئی مفاہمت روا نہ رکھی لیکن فروعات اور معاملات میں اس لچک اور داد و ستد کو آلۂ کار بنایا جس کے بغیر پیشرفت ناممکن تھی۔ سید احمد خاں نے حکومتِ وقت سے تعلقات کو خوشگوار بنایا۔ وہ جانتے تھے کہ اگر مسلمان اسی طرح برہمی، علیحدگی اور غم و غصہ کا شکار بنے رہے تو علم، روزگار اور اصلاح کی دوڑ میں وہ اس قدر پیچھے رہ جائیں گے کہ شبہ ہونے لگے گا کہ وہ کبھی دوڑے بھی تھے؟ انھوں نے محمڈن اینگلو اورینٹل کالج کی بنا ہندو مسلم اتحاد پر ڈالی۔ ایسے اتحاد پر جس میں اقلیت کی عزتِ نفس اور اس کی روایات اور مفادات محفوظ رہیں۔

علی گڑھ تحریک بمشکل ستر سال چلی آغاز میں انتہائی زور و شور کے ساتھ۔ برصغیر کے ایک کونے سے دوسرے کونے تک وہ علم اور تازہ ہوا اور روشنی بکھرتی چلی گئی۔ لیکن ۳۰ سال کے بعد ہی انحطاط شروع ہو گیا، اور گزشتہ ۳۵، چالیس سال میں اس انحطاط نے شدت پکڑ لی۔

وہ خلوص وہ دردمندی جس سے اس تحریک اور اس کی علامت علی گڑھ یونیورسٹی نے توانائی حاصل کی تھی، مفقود ہو گئی اور اس کی جگہ خود غرضی نے لی۔ علی گڑھ یونیورسٹی اور علی گڑھ تحریک کے ساتھ وفاداری، ہمدردی اور ہمنوائی کا اعلان ہر کوچہ و بازار سے ہوتا ہے لیکن یہ اعلان کرنے والے کیا یونیورسٹی کا حق ادا کرنے کے لیے کبھی تیار ہوئے کیا انھوں نے حقوق و مطالبات کے نقار خانہ میں فرائض اور خدمت کی آواز بھی کبھی کان میں پڑا۔ یہ سچ ہے کہ یونیورسٹی کے آڑے وقت میں اس کے بیرونی ہمدرد قربانی دینے کے لیے بے محابا آگے بڑھے۔ لیکن خود گھر والوں نے کیا کیا اور کب تک۔ علی گڑھ میں نفسی نفسی کا یہ کاروبار جب تک جاری رہے گا کوئی محیر العقول اصلاح تو در کنار، خاطر خواہ اصلاح بھی اس ادارہ کی نہ ہو سکے گی۔ آیئے ہم سب اپنے گریبان میں منھ ڈال کر دیکھیں کہ آیا ہم اپنی ذات پر ادارہ کو ایک لمحہ بھی ترجیح دینے کے لیے تیار ہیں؟

تعلیم کی توسیع کی رفتار بھی رک گئی اور اب ہندوستانی مسلمانوں کا شمار تعلیمی اعتبار سے ملک کے پسماندہ طبقات میں ہے۔

اور ایک بات جس میں علی گڑھ تحریک کبھی بھی دربار نہ ڈال سکی، ہماری جذباتیت ہے۔ عقل کی بالادستی کو ہم نے دراصل کبھی تسلیم نہیں کیا۔ ہم [illegible] جذبات بنے رہے اور اب بھی ہیں۔ چنانچہ ہم اپنے بھلے برے میں امتیاز نہیں کر سکتے۔ امکانات عواقب اور نتائج کو عقل کی روشنی میں پرکھ نہیں پاتے۔ بار بار ہم دھوکا اور ٹھوکر پیہم کھاتے رہتے ہیں۔ جذبوں پر دھیان دیتے ہیں اور عقل اور [illegible] پیش رفت کی راہ سے منھ موڑ لیتے ہیں۔

علی گڑھ تحریک کا دوسرا اہم حصہ آل انڈیا مسلم ایجوکیشنل کانفرنس تھی جو [illegible] ایک عرصے خاموشی اختیار کر رکھی ہے۔ [illegible] ضرورت ہے کہ [illegible] تحریک کو نئی

مولانا وحید الدین خاں

یہ وقت کا سوال ہے نہ کہ قیمت کا

آکسفورڈ یونیورسٹی ۱۱۶۳ء میں قائم ہوئی۔ اس کے ہرے ہرے لان ساری دنیا میں مشہور ہیں۔ ایک امریکن کروڑپتی نے اس کے لان دیکھے تو وہ ان کو بہت پسند آگئے۔ انھوں نے چاہا کہ ایسا ہی لان ان کی کوٹھی میں بھی ہو

"ایسا لان کتنے ڈالر میں تیار ہو جائے گا" انھوں نے آکسفورڈ کے مالی سے پوچھا۔

"مفت میں"۔ مالی نے سنجیدگی کے ساتھ جواب دیا۔

"وہ کیسے"؟

"اس طرح کہ آپ اپنی زمین کو ہموار کرکے اس پر گھاس جما دیجیے۔ جب گھاس بڑھے تو اس کو کاٹ کر اوپر سے رولر پھیرا کیجیے۔ یہ عمل برابر کرتے رہیے جب پانچ سو سال پورے ہوں گے تو ایسا ہی لان آپ کے یہاں تیار ہو جائے گا۔ یہ وقت کا سوال ہے نہ کہ قیمت کا۔"

شام کو سورج آپ کے اوپر غروب ہو جائے اور آپ دوبارہ صبح کا منظر دیکھنا چاہیں تو آپ کو پوری رات انتظار کرنا ہوگا۔ رات کا وقفہ گزارے بغیر آپ دوبارہ صبح کے ماحول میں آنکھ نہیں کھول سکتے۔ آپ کے پاس ایک بیج ہے اور آپ اس کو درخت کی صورت میں دیکھنا چاہتے ہیں تو آپ کے لیے اس کے سوا چارہ نہیں کہ ۲۵ سال تک انتظار کریں۔ اس سے پہلے آپ کا بیج ایک سرسبز و شاداب درخت کی صورت میں کھڑا نہیں ہو سکتا۔ اسی طرح قدرت کے تمام واقعات کے ظہور کے لیے ایک "وقت" مقرر ہے۔ کوئی واقعہ اپنے وقت مقرر سے پہلے ظہور میں نہیں آتا۔

وقت سے مراد وہ مدت ہے جس میں ایک طریق عمل جاری ہو کر اپنی تکمیل کو پہنچتا ہے۔ قدرت کے پورے نظام میں یہی اصول کارفرما ہے۔ انسان کے سوا بقیہ کائنات میں یہ اصول براہ راست خدائی انتظام کے تحت قائم ہے اور انسان کو اپنا مطلوب وقت اس کو اپنی زندگی میں اختیار کرنا ہے۔ کائنات اپنے پورے نظام کے ساتھ انسان کو یہ عملی سبق دے رہی ہے کہ واقعات کے ظہور کے لیے وہ کونسی حقیقی تدبیر ہے جس کو اختیار کرکے آدمی اس دنیا میں کامیاب ہو سکتا ہے۔

شخصی زندگی کی تعمیر کا معاملہ ہو یا قومی زندگی کی تعمیر کا، دونوں معاملات میں انسان کے لیے واحد صورت یہ ہے کہ وہ آغاز سے اپنا سفر جاری کرے اور مطلوبہ مدت سے پہلے نتیجہ دیکھنے کی تمنا نہ کرے ورنہ اس کا انجام اس مسافر جیسا ہوگا جو ایک دوڑتی ہوئی ٹرین میں بیٹھا ہوا اور اسٹیشن آنے سے پہلے اسٹیشن پر اترنا چاہے۔ ایسا مسافر اگر وقت سے پہلے اپنے ڈبہ کا دروازہ کھول کر باہر کود پڑے تو اس کے بعد وہ جہاں پہنچے گا وہ قبر ہوگی نہ کہ اس کی مطلوبہ منزل۔ ہر کامیابی ملتی ہے لیکن وہ چیز مانگتی ہے وہ وقت ہے مگر کامیابی کی یہی وہ قیمت ہے جو آدمی دینے کے لیے تیار نہیں ہوتا۔

کا ترجمہ [illegible] ہیں [illegible]
[illegible] انتہائی دلچسپی لی۔ اطباء
[illegible] تقرر کئے ہیں۔ چنانچہ امیر معاویہ کے
طبیبوں میں "ابن اثال" ایک ممتاز نام ہے۔ یہ ادویہ
مفردہ و [illegible] کیمیات کا زبردست ماہر تھا۔ امیر معاویہ
[illegible] اس کی مہارت پر بہت اعتماد کرتے تھے۔ انھوں
نے اس [illegible] کو حمص کا گورنر بھی مقرر کیا تھا۔ کسی
معتبر کتاب میں اس کی کسی تصنیف کا تذکرہ نہیں ملتا ہے۔

امیر معاویہ کے اطباء میں "ماسرجویا"
بڑے مرتبے کا نام ہے۔ مروان بن حکم کے ایماء پر اس
نے اہرن القس کی کتاب کناش کا سریانی سے عربی میں
ترجمہ کیا۔ اس کے علاوہ کتاب العین اور کتاب الاغذیہ
بھی اس کی تصانیف میں شامل ہیں۔ عربی عہد میں لکھی
جانے والی عربی کتابوں میں یہ بالکل ابتدائی تصانیف
ہیں۔ اس کے پہلے کسی عربی تصنیف یا ترجمہ کا حوالہ
نہیں ملتا ہے۔

امیر معاویہ ہی کے طبیبوں میں ایک ابوالحکم
ادویہ کی معرفت اور ان کے علم میں بہت بڑھا ہوا تھا۔ اس
نے سو سال کی عمر پائی اور پانچویں اموی خلیفہ عبدالملک
بن مروان کے عہد تک دربار خلافت سے وابستہ رہا۔ ابن
اثال کے بعد اس نے یزید بن امیر معاویہ کے طبیب
کی حیثیت سے بھی خدمات انجام دیں۔

[illegible] کے زمانہ میں بھی یہ سرگرمیاں
[illegible] جب [illegible]
[illegible]
[illegible]
[illegible]

ہاتھ پر اسلام قبول کیا۔ تخت خلافت پر متمکن ہونے
کے بعد جب انھیں [illegible] میں ماسرجویا کی کناش ملی جسے
مروان نے دیوان [illegible] کر دیا تھا۔ عمر بن عبدالعزیز
نے اس کی افادیت یا عدم افادیت جاننے کی [illegible]
چالیس روز تک استخارہ کیا اور اس کی افادیت کے
اندازے کے بعد پھر اس کی متعدد نقلیں ملک کے مختلف
حصوں میں تقسیم کرائیں۔ اس واقعہ سے اس عہد کی مذہبی
زندگی کے ساتھ ہی طب اور ادویہ کی اہمیت اور اس کے
سلسلہ میں دی جانے والی توجہ کو محسوس کیا جا سکتا
ہے۔ مروان کے خاندان میں خلافت آنے کے بعد ان
میں سے تقریباً ہر خلیفہ کے سلسلے میں یہ بات نوٹ کرنی
چاہیے کہ انھوں نے اپنے اپنے زمانہ میں اطباء کی باقاعدہ
سرپرستی کی۔ چنانچہ ہشام بن عبدالملک کے بارے میں
کہا جاتا ہے کہ وہ جو خضاب استعمال کرتا تھا وہ ہندوستان
سے درآمد کیا جاتا تھا۔ اس طرح نہ صرف مفرد ادویہ
بلکہ بعض مرکبات بھی ہندوستان سے منگائے جاتے
تھے۔ اس زمانہ میں عطاروں اور ادویہ فروشوں کی
کثرت کا یہ عالم تھا کہ یزید کے زمانہ میں جب مدینہ پر
حملہ ہوا تو جو فوجیں اس کے مقابلے کے لیے نکلیں ان
میں عطاروں کے مشک فروش بھی شامل تھے۔ ان کا جھنڈا
بھی الگ تھا اور ان کی تعداد تقریباً تین سو تھی۔ ادویہ
فروشوں کی یہ کثرت طب اور عطاری کی مقبولیت اور
اطباء کی بڑھتی ہوئی تعداد کا نمایاں ثبوت ہے۔ اس
[illegible] سے یہ اندازہ [illegible]
[illegible]
[illegible]
[illegible]

سریانی کے علاوہ فارسی سے بھی اس عہد
کا ترجمہ کا آغاز ہوا چنانچہ عبدالملک بن مروان کے
عہد میں سرجون کاتب نے فارسی کی بعض کتابیں عربی میں
منتقل کیں۔ اموی عہد مشرق میں اگرچہ ۹۱ سال کے
بعد ختم ہو گیا لیکن مغرب میں اس کے ہاتھوں جس عظیم
الشان سلطنت کی بنیادیں قایم ہوئیں اور وہاں طب
و ادویہ کی جو گراں قدر خدمات انجام پائیں وہ خود ایک
مستقل موضوع کی حیثیت رکھتا ہے
"تیاذوق" نے ابدال ادویہ پر ایک رسالہ اس
عہد میں تصنیف کیا۔

عباسی عہد

عربی عہد کے مطالعہ میں دور قبل از اسلام
عہد نبوی و خلافت راشدہ اور عہد اموی خالص دیسی
اور مقامی طب کی حیثیت رکھتے ہیں۔ اس کے بعد عہد
عباسی سے ۷۵۰ء سے شروع ہوتا ہے جس طب کا
آغاز ہوا وہ صحیح معنی میں طب یونانی ہے۔ یونان میں
طب و ادویہ کے جس نظام کو قایم کیا گیا وہ تقریباً ۵۰۰
برس یونان اور پھر ۶۰۰ برس سے کچھ زیادہ روم میں
فروغ پا کر روم میں چرچ کے زیر اثر فروغ سے زیادہ
اس کو تنزل حاصل ہوا بعد آخری تقریباً ۵۰ برس کا
زمانہ نہایت انحطاط کا زمانہ ہے، جب عربوں کو یہ ورثہ
ملا تو انھوں نے نہ صرف اس کی حفاظت کی بلکہ اس
کی ہر شاخ میں غیر معمولی اضافات کیے اور اپنی تحقیق
اور علمی [illegible] نئے حلوہات کو [illegible]
[illegible] کے [illegible]
کی [illegible]

درجہ حاصل کر چکی تھی۔ عربوں نے اگرچہ طب کے ہر شعبہ
کو اپنی توجہ کا مرکز بنایا لیکن علم الادویہ میں ان کے
اضافات خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔ نہ صرف مفرد ادویہ
کی تعداد کے لحاظ سے بلکہ ادویہ کے قدیم معلوم خواص
میں بھی انھوں نے اپنے تجربات کے ذریعے اضافہ کیا
یونان کے نمائندہ مصنف دیسقوریدوس کے یہاں
ادویہ کی تعداد چھ سو تھی۔ عربوں کے یہاں یہ تعداد
پندرہ سو تک پہنچی۔ گویا تقریباً نو سو دوائیں انھوں
نے دریافت کیں۔ ان میں سے صرف ابن بیطار نے
تقریباً تین سو دواؤں کا اضافہ کیا ہے۔ یونانی ادویہ
کے تحلیل و تجزیہ کے فن سے ناآشنا تھے۔ عربوں نے
اس کو خاص طور پر اہمیت دی۔ اسی طرح یونانیوں
کے یہاں صرف ادویہ کے مزاج بیان کیے گئے تھے لیکن
درجات سے بحث نہیں کی گئی تھی۔ عربوں نے مختلف
درجات قائم کیے۔ اس طرح علم کیمیا کی مدد سے انھوں
نے فن دوا سازی کو نئی راہیں دکھلائیں اور میڈیسنل
کیمسٹری اور فارمیسی کی بنیادیں قایم کیں۔ مرکبات کا قوام
یونانی صرف شکر سے تیار کرتے تھے۔ عربوں نے شہد شامل
کر کے قوام تیار کیا جس سے مرکبات کی عمر میں اور
ان کے تحفظ میں مدد ملی۔ علم الادویہ میں عربوں
کے امتیازات کو تقریباً پچاس عنوانات کے تحت
بیان کیا جا سکتا ہے۔
کسی بھی قوم کی ابتدائی کام کی طرح عربوں
نے بھی طبی اعتبار سے کام شروع کیا۔ ابتدائی عرصہ
نقل اور ترجمہ کی حد تک محدود رہا۔ [illegible]
[illegible] تک کا زمانہ دور ترجمہ کہلاتا ہے جس
میں زیادہ [illegible] یونانی [illegible]

کتابیں منتقل کی گئیں۔ بغداد کے بیت الحکمت سے اس سلسلہ میں بہت مدد ملی۔ اس کا حصہ پوری طرح محسوس کیے جانے کے قابل ہے۔ ترجموں کا یہ کام باقاعدہ منصوبے کے تحت شروع کیا گیا۔ ہر مضمون کی معیاری اور مستند کتابوں کا انتخاب کر کے انھیں ترجمے کے لیے اختیار کیا گیا۔ چنانچہ ادویہ میں بھی دیسقوریدوس [illegible]سطوس اور جالینوس کی کتابوں کو اہمیت دی گئی۔ اس سلسلہ میں حنین بن اسحاق (اور اس کے خاندان جس میں اسحٰق بن حنین، حبش بن الاعسم) ثابت بن قرہ اور اس کا خاندان یوحنا ابن ماسویہ کی بڑی خدمات ہیں۔ خاندان بختیشوع کا تذکرہ بھی ضروری ہے جس کی مسلسل چھ نسلوں نے بجا طور پر اس عہد میں طب پر حکمرانی کی ہے اور اپنے فضل و کمال حذاقت اور فن دانی کی وجہ سے اس کو ممتاز مرتبہ حاصل ہے

اس عہد میں ہندوستان سے جو ماہرین بغداد بلائے گئے، انھوں نے سنسکرت کی متعدد کتابوں کو عربی میں منتقل کیا ان میں "کنکا" "منکا" ابن دھن، صالح بن سہیل کی خدمات کا اعتراف کرنا چاہیے ان کی وجہ سے یونانی طب کے علاوہ عربی عہد کے محققین کو آیورویدک کے مطالعہ کا موقع ملا۔

اموی عہد میں ترجمہ شدہ چند کتابوں

جن میں مشہور کتابیں تھیں اس ترجمہ کے سو سالہ دور میں جو کتابیں عربی میں ترجمہ کی گئیں ان کی تعداد سیکڑوں سے متجاوز ہے۔ یہی وجہ ہے کہ جب عربوں میں طبع زاد مصنفین کا دور شروع ہوا تو انھوں نے طب [illegible] [illegible] اور ہر موضوع کی [illegible] انھوں نے

وہ علمی شاہکار پیش کیے جن کی قدر و منزلت آج بھی [illegible] کی جاتی ہے۔ یہ بڑی حیرت کی بات ہے کہ ان ابتدائی طبع زاد مصنفین میں بیشتر کے بارے میں یہ بات صحیح ہے کہ وہ قدیم زبانوں بالخصوص یونانی زبان اور سنسکرت سے بالکل ناآشنا تھے۔ جن مصنفین کے بارے میں بعض لوگوں نے ان زبانوں کے جاننے کا دعویٰ بھی کیا ہے وہ نسبت بھی زیادہ قوی نہیں ہے۔ ابن سینا کے بارے میں پورے وثوق سے کہا جا سکتا ہے کہ وہ ان زبانوں سے ناواقف تھا۔ حالانکہ وہ عربی عہد کا سب سے مستند اور نمائندہ مصنف تھا

طبع زاد مصنفین کی صف اول میں جن لوگوں کا شمار ہے ان میں "علی بن ربن طبری" علی ابن عباس مجوسی، ابو سہل مسیحی، زکریا رازی اور شیخ الرئیس ابن سینا خاص ہیں جن کی علی الترتیب فردوس الحکمت، کامل الصناعۃ، کتاب المائۃ [illegible] اور القانون فی الطب شاہکار تصانیف ہیں۔ علم الادویہ کے نقطہ نظر سے ابو منصور موفق کا نام لینا ضروری ہے جس نے متعدد کتابیں لکھیں۔

سید کاظم نقوی
صدر شعبۂ دینیات شیعہ
اے ایم یو۔ علی گڑھ

(پہلی قسط)

مذہب کیوں اور کس لیے؟

بعض تعلیم یافتہ اشخاص کہتے ہیں کہ ہم خدا اور دوسرے مابعد الطبیعی مسائل کے متعلق کیوں غور وخوض کریں؟ ایسے مسائل کہ جو احساس اور تجربے کے دائرے سے باہر ہیں، جن کے ماننے اور نہ ماننے کا ہماری زندگی پر کوئی مفید یا مضر اثر نہیں پڑتا ہے ان کی بابت تحقیق کرنے کا نتیجہ صرف اپنا قیمتی وقت ضائع کرنا ہے ایک عقل مند آدمی کو ایسے مسائل کے متعلق غور وخوض کرنا چاہیے جن کا انسان کی زندگی سے تعلق ہے، جن کی گرہ کھولنا اس کی زندگی کو بہتر بنا سکے ہمارا بس مادے اور نیچر سے سابقہ ہے۔ اس کے دوسرے مسائل کی بابت سوچ بچار اور تحقیق کرنا حماقت ہے

ایسے اشخاص کا خیال ہے کہ جن لوگوں نے اپنے لیے کسی مذہب کو پسند کر لیا ہے، ان کا فریضہ ہے کہ اپنی رفتار وگفتار بلکہ اپنے خیالات وافکار تک میں اس مذہب کے اصول وقوانین کی حتی الامکان پابندی کریں ان کی زندگی کے تمام انفرادی اور معاشرتی شعبوں میں دینی تعلیمات کی جھلک نظر آنا چاہیے۔ ہماری عقل ان کے لیے ضروری قرار دیتی ہے کہ ان کا کوئی عمل مذہبی حدود وقیود کے باہر نہ ہو۔ لیکن ایسے آزاد خیال اشخاص کے لیے مذہبیات کے متعلق تحقیق کرنا ہرگز ضروری نہیں ہے جنہوں نے مذاہب عالم میں سے ابھی کسی دین کا انتخاب نہیں کیا ہے۔ جو ابھی کسی قانون اور تعلیم کے پابند نہیں ہوئے ہیں۔ کیا انسانی زندگی فطری طور پر مذہب سے وابستہ ہے؟ کیا آدمی بغیر مذہب کے زندگی نہیں بسر کر سکتا؟ کیا افراد انسانی اور ان کے مختلف معاشرے بالخصوص مذہبی اخلاقی اقدار کے اپنے حقیقی کمالات کی منزل تک نہیں پہنچ سکتے؟ آخر کیا ضروری ہے کہ بیٹھے بٹھائے لوگ مذہب کی بابت تحقیق اور ریسرچ کرنے کا درد سر مول لیں؟ اپنی آزادیوں کو پابندیوں سے بدلیں؟ اپنی راحتوں کو خیرباد کہہ کر زحمتوں اور تکلیفوں میں گرفتار ہوں؟

غور کرنے سے پتہ چلتا ہے کہ اس خیال کی حیثیت ایک غلط فہمی سے زیادہ نہیں ہے اس کو مختلف رخوں سے رد کیا جا سکتا ہے۔

۱۔ انسانی فطرت کس چیز کی پیاسی ہے؟

ہر وہ شخص جس کو "انسان" کہا جا سکے، اپنی عقل اور فطرت کے اشاروں سے منزل کمال کی طرف بڑھنا چاہتا ہے۔ وہ جس فضا اور جس ماحول میں بھی ہو عقل اور فطرت کے بنائے ہوئے اس راستے سے بال برابر ہٹتا نہیں ہے۔ اس کے شخصی اور قومی حالات میں جتنی چاہے تبدیلیاں ہوں لیکن اس خط سیر میں کوئی تبدیلی نہیں ہو سکتی ہے۔ کوئی طالب علم جو یونیورسٹی میں

تحصیل علم کر رہا ہے، کوئی جفاکش مزدور جو کسی فیکٹری کے اندر اپنے کام میں سرگرمی کے ساتھ مشغول ہے، کوئی زبردست عالم اور دانشور جو ہزاروں کتابوں کے پڑھنے اور گہرے علمی مطالعہ کی تحقیق میں منہمک ہے، کوئی سائنس داں جو کسی تجربہ گاہ کے طاقتور ساماحول میں طرح طرح کی آزمائشیں کر رہا ہے، یہ سب کے سب اپنی اپنی منزل کمال تک پہنچنا چاہتے ہیں۔ ان کے دلوں میں اپنی ذات اور قوم کے لیے ایک شاندار تابناک مستقبل کی آرزو کروٹیں بدل رہی ہے اسی لیے انھیں ان جانفشانیوں اور غیر معمولی محنتوں پر آمادہ کیا ہے۔ چوں کہ ان میں سے ہر ایک کا مقصد منزل کمال تک پہونچنا ہے۔ اس لیے اس تک پہنچنے کے سلسلے میں ہر قسم کا درد دکھ، ہر قسم کی زحمت، سختی اور تھکن ان کے واسطے راحت و آسائش کا سبب ہے، فطرت کی آواز اور عقل و ضمیر کا حکم ان لوگوں کا پشت پناہ اور مددگار ہے۔

تلاش کمال کا یہ جذبہ نوع انسانی سے مخصوص نہیں ہے بلکہ جانوروں میں بھی مکمل طور سے موجود ہے۔ وہ بھی اپنے کمال کے خواستگار ہیں، وہ بھی اپنی منزل کمال کی طرف رواں دواں ہو کر ہر قسم کی رکاوٹوں کو اپنے راستے سے ہٹانے کی کوشش کرتے ہیں۔ وہ ہمیشہ ایسی چیزیں چاہتے ہیں جو ان کی زندگی کے ساتھ سازگار ہوں۔ وہ ایسی چیزوں سے ہر وقت فراری ہیں جو ان کے فطری تقاضوں کو نقصان پہنچائیں اس بارے میں انسان اور جانور کے درمیان صرف یہ فرق ہے کہ کمال چاہنے کا جذبہ جانور کی بہ نسبت انسان میں زیادہ طاقتور ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ انسان کو ہر چیز کے لیے عقل موجود ہے جس سے بیچارہ جانور محروم ہے۔

کمال طلبی کا یہ جذبہ اتنا ہمہ گیر ہے کہ اس کے دائرے سے کوئی انسان باہر نہیں ہے۔ دیا ن صحیح الفاظ میں یوں کہا جائے کہ تمام افراد انسانی کی دلی خواہش ہے کہ وہ اپنی منزل کمال کی جانب آگے بڑھیں ان کی تمام کوششیں اور کاوشیں اسی راہ میں ہوں شاید ساری دنیا میں ڈھونڈنے سے بھی کوئی ایک آدمی بھی ایسا نہ ملے جسے اپنے فائدے اور کمال سے لگاؤ ہو جو ایسی چیزوں کو پسند کرے جن سے اسے نقصان پہنچے۔ کسی اور کا کیا ذکر اس اصول سے وہ لوگ تک مستثنیٰ نہیں ہیں جو نہایت قابل نفرت، ذلیل کاموں کا ارتکاب کیا کرتے ہیں۔ جو اپنی قیمتی زندگی کو وقتی لذت اندوزی کی خاطر تباہ کر دیتے، جو نشیلی چیزوں کا استعمال کر کے اپنے تمام اعضاء رئیسہ کو بیکار بنا لیتے ہیں۔ یہ لوگ بھی بخیال خود کمال کی طرف بڑھ رہے ہیں۔ یہ دوسری بات ہے کہ انھوں نے راہ کمال سے بھٹک کر اپنی لذتوں کا سرمایہ انہیں بہت کا عود کو سمجھ لیا ہے۔

معلوم ہوا کہ تمام افراد انسانی ہی استکمال کی تلاش میں ہیں۔ اس سلسلے میں ان کی دوڑ دھوپ اور جد و جہد کی محرک دو چیزیں ہیں۔ ایک مسلک فطرت اور دوسرے فرمان عقل۔

صحیح تعلیم و تربیت سے محرومی کی بنا پر یہ ممکن ہے کہ یہ سمجھنے میں انسان سے چوک ہو جائے کہ اس کے لیے کمال کیا چیز ہے؟ ایسا ہو سکتا ہے کہ وہ اپنے حقیقی کمال کا راستہ طے کرنے کے بجائے الٹا تنزل کے راستے پر چل پڑے۔

[illegible]

واضح اور نمایاں بات ہے کہ انسان کے
معلومات جتنے بلند ہوں گے اتنی ہی اس کی قوت فکر بلند
اور کامل ہوگی۔ کیوں کہ انسانی عقل و فکر کا اپنے معلومات
سے گہرا تعلق ہے۔ جس قدر انسانی معلومات کا دائرہ
وسیع ہوگا، اسی کے مطابق عقل انسانی کے دائرے میں
وسعت پیدا ہوگی۔ دوسرے لفظوں میں یوں کہا جائے
کہ انسانی معلومات کی ترقی اور بلندی خود ذہنی اور
عقلی طاقت کی بلندی اور ترقی ہے (فرید گار جہاں)

جو لوگ انسانوں کے ڈاکٹر انجام دیتے ہیں، وہی
مویشیوں، گھوڑوں، بھینسوں، بیلوں اور گدھوں کے
ڈاکٹری بھی انجام دیتے ہیں۔ کچھ لوگ آدمیوں کا علاج کرتے
اور کچھ چوپایوں، درندوں اور پرندوں کا علاج کرتے
ہیں۔ سب کی بیماریاں اور ان کے علاج کے طریقے بھی
تقریباً یکساں ہیں۔ لیکن سماج میں آدمیوں کے معالج
ڈاکٹروں کو جو عزت و احترام حاصل ہے، وہ جانوروں
گھوڑوں، گدھوں کے معالج ڈاکٹروں کو نصیب نہیں
ہے جیسی بڑی بڑی تنخواہیں اور فیسیں آدمیوں
کے ڈاکٹروں کو ملتی ہیں ان سے جانوروں کے معالج
ڈاکٹر محروم ہیں، کیوں؟ صرف اس لیے کہ انسان کا
درجہ جانور سے بلند ہے۔ جو آدمیوں کے طریقۂ علاج سے
واقف ہو وہ اس شخص سے یقیناً بلند اور معزز ہے جو
حیوانات کے طریقہ علاج کا ماہر ہو۔

جوتا بنانے والا چمار کہلاتا ہے اور سوٹ
سینے والا ٹیلر ماسٹر، جو مزدوری درزی کو ملتی ہے
اس کی آدھی بھی چمار نہیں پاتا ہے، کیوں؟ اس
لیے کہ جوتے کی لوگوں کی نگاہ میں وہ وقعت نہیں ہے
جو لباس کی سوسائٹی میں ہے۔ جوتے کی مرمت کرنا بھی ہنر ہے
اور سوٹ سینا بھی ایک ہنر ہے لیکن ایک ہنر دوسرے
ہنر سے باوقار ہے۔ اسی لیے ایک کا جاننے والا دوسرے
کے جاننے والے سے اشرف اور زیادہ با عزت ہے۔

ہوائی جہاز کا پائلٹ اور آپ کی کار کا ڈرائیور
دونوں اپنے اپنے کام میں ماہر ہیں۔ ایک کے قابو میں
ہوائی جہاز کی مشنری اور دوسرے کے کنٹرول میں
موٹر کار کی مشنری ہے۔ لیکن ہوائی جہاز کے پائلٹ
کو جو تنخواہ ملتی ہے اس کی آدھی بھی موٹر ڈرائیور کو نہیں
ملتی۔ کیوں؟ اس لیے نا کہ کہاں ہوائی جہاز اور کہاں
سڑکوں پر ماری ماری پھرنے والی یہ بیچاری کاریں! نہ
ہوائی جہاز کی برابری یہ کاریں کر سکتی ہیں، نہ پائلٹ
کی ہمسری کا دعویٰ موٹر ڈرائیور کر سکتے ہیں

ایک شخص نے کیمسٹری اور لٹریچر دو مضمونوں
میں پی ایچ ڈی کیا ہے، دوسرے اس کے دوست نے
صرف لٹریچر میں۔ کیا یونیورسٹی کے ارباب حل و عقد
دونوں کو ایک نظر سے دیکھیں گے؟ معاشرے میں دونوں
کو ایک درجہ میں رکھا جائے گا؟ ہرگز نہیں، جو شخص
دو مضمونوں میں پی ایچ ڈی ہے اس کی معلومات
اس شخص سے یقیناً زیادہ وسیع ہیں جس نے صرف
ایک مضمون میں یہ درجہ حاصل کیا ہے۔ اسی لیے
کبھی دونوں کو برابر نہیں سمجھا جا سکتا

اس گفتگو کا نتیجہ یہ نکلا کہ عقل اور فکر
کی رفعت اور وسعت کا دارومدار اس کے معلومات
کی بلندی اور وسعت پر ہے۔ کامل ترین اور اعلیٰ
ترین ذہن و عقل وہ ہے جو کامل ترین اور اعلیٰ
ترین موجودات کی طرف متوجہ ہو اور اس کے مقابلہ
اس کے برعکس پست تر۔ دماغ وہ ہے جس کے

معلومات انتہائی پست، حقیر اور محدود ہوں۔

اب اس تشریح کی روشنی میں دیندار اور بے دین شخص کے عقائد اور نظریات کا جائزہ لیتے ہوئے موازنہ فرمایئے کہ کس کے معلومات بلند اور کس کے معلومات پست ہیں؟

مذہب سے بیگانہ شخص کا عقیدہ ہے کہ اس کائنات کو جس طاقت نے پیدا کیا ہے وہ ایک کمسن بچے کے برابر بھی عقل کی مالک نہیں ہے، وہ طاقت اندھی، بہری، مجبور، گونگی اور محدود ہے۔ اس کے برخلاف دینداروں کا عقیدہ ہے کہ اس عالم رنگ و بو کو ایک ایسی ذات نے پیدا کیا ہے جو سراوجود ہی وجود ہے۔ اس میں عدم کا کوئی شائبہ نہیں ہے۔ وہ ازلی ہے، ابدی ہے وہ ہر چیز سے بے نیاز ہے۔ تمام کائنات اس کی بارگاہ کی بھکاری ہے۔ وہ سمیع و بصیر ہے، حی و قیوم ہے، مرید و متکلم ہے، اس کی حکمت غیر محدود، اس کا علم غیر محدود اس کی قدرت غیر محدود ہے۔ مذہب سے بیگانہ شخص کا خیال ہے کہ عالم وجود بس ان ہی چیزوں میں محدود ہے، جنھیں ہم دیکھ رہے ہیں یا جن کو نیچرل سائنس نے ثابت کیا ہے۔ اس کے مقابلہ میں دین دار شخص کا نظریہ ہے کہ علم و معرفت کا ذریعہ احساس اور تجربے کے دائرے میں محدود نہیں ہے۔ عالم اس دنیا سے بہت زیادہ وسیع ہے جو ہمارے احساسات اور مشاہدے کے دائرے میں آنے کے قابل نہیں ہے، فرشتے ہیں، لیکن ہماری آنکھیں نہ انھیں دیکھ سکتی ہیں، نہ ہمارے کان ان کی آوازوں کو سن سکتے ہیں۔ ہمارے ارد گرد جنات یا بعض لوگوں کے بقول "اجنّہ" پھیلے ہوئے ہیں جن کی کارگزاریوں کی ہمیں خبر نہیں ہے۔ اس عالم محسوس کے علاوہ نہ جانے کتنے غیر محسوس عوالم ہیں۔ یہ عالم ناپائیدار اور فانی ہے۔ اس کے علاوہ دوسرا عالم پائیدار اور باقی ہے۔

بے دین شخص کے نزدیک انسان بس مادی ہی مادی ہے۔ اس کے سراپائے وجود کی تشکیل نرے مادے سے ہوئی ہے۔ زندگی طرح طرح کے عناصر کی ترکیب کا نام ہے۔ موت ان کے تتر بتر ہو کر خواص طبیعیہ میں مل جل جانے کا نام ہے۔ انسان کی زندگی چند روزہ ہے۔ وہ کسی حیثیت سے بھی باقی رہنے والا نہیں ہے۔ اس کے اور دوسرے جانوروں کے درمیان کوئی غیر معمولی فرق نہیں ہے۔ وہ ان ہی کی ایک ترقی یافتہ شکل ہے۔ اس کے برخلاف مذہب کے پرستار کے نزدیک انسان اور جزوں سے مرکب ہے، جسم اور روح، روح مادی نہیں، غیر مادی چیز ہے۔ اس کے ادراکات وسیع ہیں۔ کوئی مادی چیز اس کے علم و اطلاع سے مانع نہیں ہو سکتی۔ کسی چیز میں اس کا حجاب بننے کی سکت نہیں ہے۔ اس کی کارگزاری ہمارے سونے اور جاگنے دونوں حالتوں میں جاری رہتی ہے اور دل کے چھپے ہوئے بھیدوں سے، وہ چشم و ابرو کے باریک اور نازک اشاروں سے، وہ ہماری خفیانہ کانا پھوسی سے، وہ ہماری نیتوں اور ارادوں سے، وہ افلاک کی بلندیوں اور زمین کی تہوں میں چھپی ہوئی چیزوں سے بخوبی واقف ہے۔ اس کا وجود باقی اور پائیدار ہے، موت میں یہ دم خم نہیں ہے کہ اس کے قدموں کو چھو سکے۔ وہ انسان کے جسم کو فنا کر سکتی ہے، لیکن اس کی روح تک ہاتھ نہیں لگا سکتی ہے۔

لامذہب شخص انبیاء، اولیاء، ائمۂ مذہب کو ایک مصلح انسانیت سمجھتا ہے، اس کا اعتقاد ہے کہ وہ ہمارے جیسے ایک انسان تھے، لیکن غیر معمولی انسان، وہ بھی ہماری طرح غلطیاں کرتے، دھوکے کھاتے، بھولتے چوکتے تھے، قانون الٰہی کی خلاف ورزی ہم سے ہی نہیں ان سے بھی ہوتی تھی۔

اس کے مقابلے میں مذہبی اشخاص کا نظریہ ہے کہ انبیاء، مرسلین، اولیائے الٰہی اور ائمہ مذاہب اگرچہ نوع انسانی کے فرد تھے۔ لیکن چونکہ وہ گناہوں، قانون الٰہی کی خلاف ورزیوں کے برے نتائج سے اسی طرح مکمل طور سے واقف تھے جس طرح ہمیں آگ کے جلانے اور زہر کے سبب ہلاکت ہونے کا علم و یقین ہے۔ اس کے علاوہ وہ خدا ترسی کے بھی اعلیٰ درجہ پر فائز تھے۔ انھیں اپنی نفسانی خواہشوں پر بھی مکمل تسلط حاصل تھا۔ لہٰذا ان سے قانون الٰہی کی مخالفت کا سرزد ہونا اسیطرح نظام اسباب و نتائج کے خلاف تھا جس طرح کسی ملک کے شہنشاہ یا صدرِ جمہوریہ کے لیے یہ محال ہے کہ وہ دو بجے رات کو پڑوسی کی دیوار پھاند کر اس کے گھر میں المینیم کی ایک حقیر سی شیٔ چرانے کی غرض سے اترے۔ جس طرح یہ غیر ممکن ہے اسی طرح انبیاء اور ائمہ سے گناہ کا ارتکاب غیر ممکن ہے وہ گنہگار نہیں، بے گناہ ہیں، خطاکار نہیں، بے خطا ہیں، یہ کمال انسانیت ہی کا تقاضہ ہے کہ انسان بھول چوک سے الگ رہے۔

لامذہب شخص کا خیال ہے کہ انسان کی زندگی بس اسی دنیوی زندگی میں محدود ہے۔ ساٹھ، ستر، اسی برس یا اس سے زیادہ زندہ رہنے کے بعد اسے نیست و نابود ہو جانا ہے۔ مرنے کے بعد سناٹا ہی سناٹا، نیستی ہی نیستی ہے۔

لیکن مذہبی شخص یقین رکھتا ہے کہ انسان مرنے کے بعد ہرگز نیست و نابود نہیں ہوتا ہے۔ انسان ابدی زندگی کا مالک ہے۔ صرف اس کی رہائش گاہ بدل جاتی ہے اس کے رہن سہن کا انداز بدل جاتا ہے۔

فی الحال ہم یہ فیصلہ نہیں کرنا چاہتے کہ مذہبی شخص کے خیالات صحیح ہیں یا لامذہب شخص کے، ہر منصف مزاج شخص سے صرف یہ سوال کرنا چاہتے ہیں کہ ان دونوں مختلف الخیال آدمیوں میں سے کس کے معلومات بلند اور وسیع ہیں۔ مذہبی شخص کے معلومات اور خیالات میں بلندی اور وسعت ہے یا بیدین اور لامذہب شخص کے عقائد اور نظریات میں؟

یقیناً ہر منصف مزاج، عقلمند شخص یہی جواب دے گا کہ جہانتک معلومات اور عقائد کا تعلق ہے وہ بلاشبہ مذہبی شخص کے بلند ہیں۔

جب مذہبی معلومات اور تصورات بلند ہیں تو یقیناً ان کی بلندی انسانی عقل کی بلندی کا موجب ہے۔ اس لیے انسان چاہیے کہ مذہبی مسائل کی بابت اس غرض سے غور و خوض کرنا چاہیے کہ انسان کی عقل کامل اور بلند ہو، جہاں دوسرے کمالات کا حاصل کرنا عقل و فطرت کے مطالبہ کو پورا کرنا ہے، وہاں ذہنی طاقت کے کمال کا خواہاں ہونا بھی عقل و فطرت کا تقاضہ ہے۔

نوٹ:۔ یہ سلسلۂ مضامین کتاب "آفریدگار جہان" اور کتاب "راہ خداشناسی" سے ماخوذ ہے۔

مولوی وحیدالدین خاں

امکان کبھی ختم نہیں ہوتا

مغرب کی طرف پھیلی ہوئی پہاڑیوں کے اوپر سورج ڈوب رہا تھا۔ آفتابی گولے کا آدھا حصہ پہاڑ کی چوٹی کے نیچے جا چکا
وہ آدھا حصہ اوپر دکھائی دیتا تھا۔ تھوڑی دیر کے بعد پورا سورج ابھری ہوئی پہاڑیوں کے پیچھے ڈوب گیا۔
اب چاروں طرف اندھیرا چھانے لگا۔ سورج دھیرے دھیرے اپنا اجالا سمیٹتا جا رہا تھا۔ بظاہر ایسا معلوم ہوتا تھا کہ سلا
ل گہری تاریکی میں ڈوب جائے گا۔ مگر عین اس وقت جب کہ یہ عمل ہو رہا تھا آسمان پر دوسری طرف ایک اور روشنی ظاہر
شروع ہوئی۔ یہ بارھویں کا چاند تھا جو سورج کے چھپنے کے بعد اس کی مخالف سمت سے چمکنے لگا اور کچھ دیر کے بعد پوری
روشن ہو گیا۔ سورج کی روشنی جانے پر زیادہ وقت نہیں گزرا تھا کہ ایک نئی روشنی نے ماحول پر قبضہ کر لیا۔
"یہ قدرت کا اشارہ ہے"۔ میں نے اپنے دل میں سوچا کہ "ایک امکان جب ختم ہوتا ہے تو اسی وقت دوسرے امکان
ناز ہو جاتا ہے۔ سورج غروب ہوا تو دنیا نے چاند سے اپنی بزم روشن کر لی۔

اسی طرح افراد اور قوموں کے لیے بھی ابھرنے کے امکانات کبھی ختم نہیں ہوتے۔ زمانہ اگر ایک بار کسی کو گرا دے تو
ی اس دنیا میں اس کے لیے مایوس ہونے کا کوئی سوال نہیں۔ وہ نئے مواقع کو استعمال کر کے دوبارہ اپنے
لے کا سامان کر سکتا ہے۔ ضرورت صرف یہ ہے کہ آدمی دانش مندی کا ثبوت دے اور مسلسل جدوجہد سے
نہ اکتائے۔

یہ دنیا خدا نے عجیب امکانات کے ساتھ بنائی ہے۔ یہاں مادہ فنا ہوتا ہے تو وہ توانائی بن جاتا ہے۔ تاریکی
ہے تو اس کے بطن سے ایک نئی روشنی برآمد ہو جاتی ہے۔ ایک مکان گرتا ہے تو وہ دوسرے مکان کی تعمیر کے لیے
ن خالی کر دیتا ہے۔ یہی معاملہ انسانی زندگی کے واقعات کا ہے۔ یہاں ہر ناکامی کے اندر سے ایک نئی کامیابی کا امکان
رد ہے۔ دو قوموں کے مقابلے میں ایک قوم آگے بڑھ جائے اور دوسری قوم پیچھے رہ جائے تو بات یہیں ختم نہیں
باتی۔ اس کے بعد ایک اور عمل شروع ہوتا ہے۔ بڑھی ہوئی قوم کے اندر عیش پرستی اور سہولت پسندی آجاتی
۔ دوسری طرف بچھڑی ہوئی قوم میں محنت اور جدوجہد کا نیا جذبہ جاگ اٹھتا ہے۔

اس کا مطلب یہ ہے کہ خدا کی اس زمین میں کسی کے لیے پست ہمت یا مایوس ہونے کا سوال نہیں۔ حالا
بظاہر کتنے ہی ناموافق دکھائی دیتے ہوں، اس کے آس پاس آدمی کے لیے ایک نئی کامیابی کا امکان موجود ہوگا۔
ا کو چاہیے کہ اس نئے امکان کو جانے اور اس کو استعمال کر کے اپنی کھوئی بازی کو دوبارہ جیت لے۔

سر سید احمد خان

رسم و رواج کی پابندی کے نقصانات

ہم اپنے اس آرٹیکل کو بعض بڑے بڑے حکیموں کی تحریروں سے اخذ کر کے لکھتے ہیں۔ کیا عمدہ قول ایک بڑے دانا کا ہے کہ انسان کی زندگی کا منشا یہ ہے کہ اس کے تمام قویٰ اور جذبات نہایت روشن اور شگفتہ ہوں اور ان میں باہم نامناسبت اور تناقض واقع نہ ہو بلکہ سب کامل کر ایک کامل اور نہایت متناسب مجموعہ ہو، مگر جس قوم میں کہ پرانی رسم و رواج کی پابندی ہوتی ہے اور ان رسموں پر نہ چلنے والا ملعون اور حقیر سمجھا جاتا ہے وہاں زندگی کا منشا معدوم ہو جاتا ہے۔

ایک اور بڑے دانا شخص کی رائے کا یہ نتیجہ ہے کہ آزادی اور اپنی خوشی پر چلنا جہاں تک کہ دوسروں کو ضرر نہ پہنچے ہر انسان کی خوشی اور اس کا حق ہے پس جہاں کہیں معاشرت کا قاعدہ جس پر کوئی چلتا ہے خاص اس کی خصلت پر مبنی نہیں ہے بلکہ اگلی روایتوں پر یا پرانی رسم و رواج پر مبنی ہے تو وہاں انسانوں کی خوش حالی کا ایک بڑا جزو موجود نہیں ہے اور جو کہ خوشحالی ہر فرد بشر کی اور نیز کل لوگوں کی ترقی کا بہت بڑا جزو ہے تو اس ملک میں جہاں رسموں کی پابندی ہے وہ جزو بھی نایبد ہوتا ہے۔

کسی شخص کی یہ رائے نہیں ہوگی کہ آدمیوں کو بجز ایک دوسرے کی تقلید کے اور کچھ مطلق نہ کرنا چاہیے اور نہ کوئی شخص یہ کہے گا کہ آدمیوں کو اپنی اوقات بسری کے طریقے اور اپنے کاروبار کی کارروائی میں اپنی خوشی اور اپنی رائے کے مطابق کوئی بات بھی کرنی نہ چاہیے۔ سیدھا طریقہ یہ ہے کہ آدمی کو اس کی جوانی میں اس طرح سے تعلیم ہونی چاہیے کہ اور لوگوں کے تجربوں سے جو نتیجے تحقیق ہو چکے ہیں ان کے فوائد سے مستفید ہو اور پھر جب اس کی عقل پختگی پر پہنچے تو خود ان کی بھلائی اور برائی کو جانچے۔

بے سوچے اور بے سمجھے رسومات کی پابندی کرنے سے گو وہ رسمیں اچھی ہی کیوں نہ ہوں، آدمی کی ان صفتوں کی ترقی اور شگفتگی نہیں ہوتی جو خدا تعالیٰ نے ہر آدمی کو جدا جدا عنایت کی ہیں۔ ان قوتوں کا برتاؤ جو کسی چیز کی بھلائی اور برائی دریافت کرنے اور کسی بات پر رائے دینے اور دو باتوں میں امتیاز کرنے اور عقل و فہم کو تیز رکھنے، بلکہ اخلاقی باتوں کی بھلائی اور برائی تجویز کرنے میں مستعمل ہوتی ہیں، صرف

[illegible]

پسند یا ناپسند کرنے کا اختیار حاصل ہو۔ جو شخص کوئی بات رسم کی پابندی سے اختیار کرتا ہے وہ شخص اس بات کو پسند یا ناپسند نہیں کرتا اور نہ ایسے شخص کو اس بات کی تمیز یا خواہش میں کچھ تجربہ حاصل ہوتا ہے اخلاقی اور عقلی قوتوں کی ترقی اس صورت میں حاصل ہوتی ہے جب کہ وہ استعمال میں لائی جاویں۔ ان قوتوں کو اوروں کی تقلید کرنے سے کسی بات کی مشق حاصل نہیں ہوتی۔ بلکہ ایسے شخص کے لیے بجز ایسی قوتِ تقلید کے جو بندر میں ہوتی ہے اور کسی قوت کی حاجت نہیں۔

البتہ جو شخص اپنا طریقہ خود پسند کرتا ہے وہ اپنی تمام قوتوں سے کام لیتا ہے۔ زمانہ حال پر نظر کرنے کے لیے اُس کو قوتِ تخلیق درکار ہوتی ہے اور انجام کار پر غور کرنے کے لیے قوتِ تجویز اور اس کا تصفیہ کرنے کو قوتِ استقرار اور بُرا بھلا ٹھہرانے کو قوت امتیاز اور سب باتوں کے تصفیے کے بعد اس پر قایم رہنے کے لیے قوتِ استقلال اور یہی سب کام ہیں جو انسان کے کرنے کے لائق ہیں۔ آدمی مثل ایک کل کے نہیں ہے کہ جو اس کے واسطے مقرر کر دیا ہے اُسی کو انجام دیا کرے بلکہ وہ ایک ایسا درخت ہے جو ان کی اندرونی قوتوں سے جو خدا نے اس میں رکھی ہیں اور جن کے سبب سے وہ زندہ مخلوق کہلاتا ہے ہر چہار طرف پھیلے اور بڑھے، پھولے اور پھلے۔

جوامر کہ پسندیدہ اور تسلیم کے قابل ہے وہ یہ ہے کہ لوگ اپنی فہم اور اپنی عقل سے کام لیں اور رسم و رواج کی پابندی بھی ایک معقول طور پر رکھیں یعنی جو عمدہ اور مفید ہیں ان کو اختیار کریں جو قابلِ اصلاح ہوں ان میں ترمیم کریں اور جو بُری اور خراب ان کی پابندی چھوڑ دیں نہ یہ کہ اندھوں کی طرح یا [illegible] کی مانند ہمیشہ اسی سے پیٹے رہیں

یہ بات خیال کی جاتی ہے کہ رسومات کی پابندی نہ کرنے سے آدمی خراب کاموں اور بُری باتوں میں مبتلا ہو جاتا ہے، مگر یہ بات صحیح نہیں ہے۔ اس [illegible] کہ انسان کی ذات میں جیسے کہ ایک خراب کام کرنے [illegible] قوتیں اور جذبے ہیں ویسے ہی ان کے روکنے کی [illegible] قوتیں اور جذبے ہیں، مثلاً ایمان یا نیکی جو ہر انسا[ن] کے دل میں ہے۔ پس خراب کام ہونے کا باعث یہ [illegible] ہے کہ اس نے رسومات کی پابندی نہیں کی، بلکہ یہ ہے کہ اس نے ایک قسم کی قوتوں اور جذبوں کو شگفتہ اور شاداب اور قوی کیا ہے اور دوسری قسم [کی] قوتوں اور جذبوں کو نیز وہ اور ضعیف۔ اگر رسو[م] کی پابندی نہ رکھنے کے ساتھ انسان کا ایمان ضعیف ہو یا وہ دلی نیکی جو ہر انسان کے دل میں ہے پژ[مردہ] نہ ہو تو بجز عمدہ اور پسندیدہ باتوں کے اور کسی با[ت] [کا] ارتکاب نہ ہو۔

ہمارے زمانہ میں ہر شخص اعلیٰ سے لے [کر] ادنیٰ تک رسم و رواج کا ایسا پابند ہے جیسے کوئی شخ[ص] ایک بڑے زبردست حاکم کے نیچے اپنی زندگی بسر کرتا [ہو] کوئی شخص یا کوئی خاندان اپنے دل سے یہ بات نہیں پوچھتا کہ ہم کو کیا کرنا چاہیے اور ہمارے مناسب [حال] ہماری پسند اور ہماری پسند کے لائق کیا بات ہے یا جو عمدہ صفتیں ہم میں ہیں ان کا [illegible] ہے کس طرح پر ممکن ہے اور کون سی بات ان کی [ترقی] اور شگفتگی کی معاون ہے بلکہ وہ اپنے دل سے یہ [illegible]

ی کرمبی حالت اور رتبے کے کونسی چیز مناسب ہے
رتبے اور مقدور کے آدمی کس رسم ورواج کے
طابق کام کرتے ہیں اور اگر کوئی اس کسے بھی زیادہ
و توت ہوا تو وہ اپنے دل سے اس سے بھی زیادہ بدتر
وال کرتا ہے اور یوں پوچھتا ہے کہ جو لوگ مجھ سے برتر
یں اور رتبے اور مقدور میں زیادہ ہیں وہ کن رسموں
کو بجالاتے ہیں تاکہ یہ شخص بھی ویسا ہی کر کر انہی کی
سی شان میں شامل ہو۔

اس بات سے یہ نہ سمجھنا چاہیے کہ جو لوگ
اس طرح پر رسومات کو بجالاتے ہیں وہ اپنی خواہش اور
مرضی سے ان رسومات کو اور چیزوں پر ترجیح دیتے ہیں
اور ترجیح دے کر پسند کرتے ہیں؛ نہیں، بلکہ حقیقت یہ
ہے کہ ان لوگوں کو بجز ایسی بات کے جو رسمی ہوتی ہے
اور کسی بات کی خواہش کرنے کا موقع یا اتفاق نہیں ہوتا
اور اس لیے طبیعت خود متحمل اور مطیع رسموں کی پابند
ہو جاتی ہے۔ یہاں تک کہ جو باتیں دل کی خوشی کی کرنی
ہوتی ہیں ان میں بھی اوروں کے مطابق کام کرنے کا
خیال اوّل دل میں آتا ہے۔ غرض یہ کہ ان کی پسند وہی
ہوتی ہے جو بہت سے لوگوں کی ہے۔ وہ صرف ایسی
باتوں کے پسند کرنے پر راغب ہوتے ہیں جو عام پسند
ہوں اور مذاق اور اصلی سلیقہ جو رسم ورواج کے
مطابق نہ ہو اس سے ایسی ہی گریز کی جاتی ہے جیسے کہ
جرموں سے یہاں تک کہ اپنی خاص طبیعت کی پیروی
نہ کرتے نہ کرتے ان میں اپنی طبیعت ہی باقی نہ رہتی کہ
جس کی پیروی کریں اور ان کی ذاتی قوتیں بالکل پژمردہ
اور بے کار رہنے کے سبب بالکلیہ ضائع ہو جاتی ہیں
اور وہ شخص اپنی دلی خواہش کرنے اور ذاتی خوشی
اٹھانے کے قابل نہیں رہتے اور عموماً ایسی طبع زاد رائیں
یا خیالات نہیں رکھتے جو خاص ان کی اصلی خوشی سے مخصوص
ہوں۔ اب غور کرنا چاہیے کہ انسان کی ایسی حالت پسندیدہ
ہوسکتی ہے یا نہیں۔

رسومات جو مقرر ہوئی ہیں غالباً اس زمانہ
میں جب کہ وہ مقرر ہوئیں مفید تصور کی گئی ہوں گی مگر اس
بات پر بھروسہ کرنا کہ وہ درحقیقت ایسی ہی ہیں محض
غلطی ہے۔ ممکن ہے کہ جن لوگوں نے ان کو مقرر کیا اُن
کی رائے میں غلطی ہو اور ان کا تجربہ صحیح نہ ہو۔ اُن کا
تجربہ نہایت محدود اور صرف چند اشخاص سے متعلق ہو
یا اس تجربہ کا حال صحیح صحیح بیان نہ ہوا ہو یا وہ رسم اس
وقت اور اس زمانہ میں مفید ہو الّا حال کے زمانہ میں
مفید نہ رہی ہو بلکہ مضر ہو یا وہ رسم جن حالات پر قایم
کی گئی تھی کسی شخص کی وہ حالت نہ ہو۔ غرض کہ رسموں
کی پابندی میں مبتلا رہنا ہر طرح پر نقصان کا باعث
ہے۔ اگر کوئی اور نقصان نہ ہو تو یہ نقصان تو ضرور ہے
کہ آدمی کی عقل اور دانش اور جودتِ طبع اور قوتِ
ایجاد باطل ہو جاتی ہے۔

یہ بات بے شک ہے کہ کسی عمدہ بات کی
ایجاد کی لیاقت ہر ایک شخص کو نہیں ہوتی بلکہ چند دانا
شخصوں کو ہوتی ہے جن کی پیروی اور سب لوگ کرتے
ہیں لیکن رسم کی پابندی اور اس قسم کی پیروی میں
بہت بڑا فرق ہے۔ رسومات کی پابندی میں اس کی
بھلائی و برائی و مفید و غیر مفید و مناسب حال و
مطابق طبع ہونے یا نہ ہونے کا مطلق خیال نہیں کیا
جاتا اور بغیر سوچے سمجھے اس کی پابندی کی جاتی ہے
اور دوسری حالت میں بوجہ پسندیدہ ہونے کے اور

لیے دوسری حالت میں جو قوتیں ترقی کی انسان
تیں وہ معدوم و مفقود نہیں ہوتیں، الاّ پہلی حالت
معدوم و نابود ہو جاتی ہیں۔

رسم کی پابندی ہر جگہ انسان کی ترقی کی مانع و
م ہے۔ چنانچہ وہ پابندی ایسی قوت طبعی کے جس کے
بہ سے بہ نسبت معمولی باتوں کے بہتر بات کہنے کا
ر کیا جاوے برابر مخالف رہتی ہے اور انسان کی
ل حالت کا اصلی باعث ہوتی ہے۔

اب اس رائے کو دنیا کی موجودہ قوموں
ال سے مقابلہ کرو۔ تمام مشرقی اور ایشیائی
ں کا حال دیکھو کہ ان ملکوں میں تمام باتوں کے
ے کا مدار رسم و رواج پر ہے۔ ان ملکوں میں
ب اور استحقاق اور انصاف کے لفظوں سے
ون کی پابندی مراد ہوتی ہے پس اب دیکھ لو کہ
قی یا ایشیائی قوموں کا جن میں مسلمان بھی داخل
کیسا ابتر اور خراب اور ذلیل حال ہے۔

ان مشرقی یا ایشیائی قوموں میں بھی
زمانے میں قوتِ عقل اور جودتِ طبع اور مادۂ ایجاد
موجود ہوگا جس کی بدولت وہ باتیں ایجاد ہوئیں
ب رسمیں ہیں، اس لیے کہ ان کے بزرگ ماں
یٹ سے تربیت یافتہ اور حسنِ معاشرت کے فنون
واقف پیدا نہیں ہوئے تھے، بلکہ یہ سب باتیں انھوں
نی محنت اور علم اور عقل اور جودتِ طبع سے ایجاد
یں اور انہی وجوہات سے دنیا کی نہایت بڑی
ذی اور مشہور قوموں سے ہو گئے تھے۔ مگر اب
حال دیکھو کہ کیا ہے۔ انہی رسومات کی پابندی
ن کا حال یہ ہوا ہے کہ اب وہ ایسی قوموں کے

محکوم ہیں اور ایسے لوگوں کی آنکھوں میں ذلیل ہیں
جن کے آبا و اجداد اس وقت جنگلوں میں آوارہ پھرا
کرتے تھے جس وقت ان قوموں کے آبا و اجداد عالی
شان محلوں میں رہتے تھے اور بڑے بڑے عبادت خانے
اور مکانات شاہی اور شہنشاہی محل بنواتے تھے۔
اس کا سبب یہی تھا کہ اُس زمانے میں اُن قوموں میں
رسم کی پابندی مطلق نہ تھی اور جو کسی قدر تھی تو اس کے
ساتھ ہی آزادی اور ترقی کا جوش ان میں قائم تھا۔

تواریخ سے ثابت ہے کہ ایک قوم کسی قدر
عرصہ تک ترقی کی حالت پر رہتی ہے اور اس کے بعد
ترقی مسدود ہو جاتی ہے مگر یہ دیکھنا چاہیے کہ یہ ترقی
کب مسدود ہوتی ہے۔ یہ اس وقت مسدود ہوتی ہے
جب کہ اس قوم میں سے وہ قوت اُٹھ جاتی ہے جس
کے سبب سے نئی نئی باتیں پیدا ہوتی ہیں اور ٹھیک ٹھیک
مسلمانوں کا اس زمانہ میں یہی حال ہے، بلکہ میں نے
غلطی کی کیونکہ ترقی مسدود ہونے کا زمانہ بھی گزر
گیا اور تنزل اور ذلت و خواری کا زمانہ بھی انتہا
درجہ کو پہنچ گیا۔

ممکن ہے کوئی شخص یہ بات کہے کہ یورپ
کی قوموں میں بھی جو اس زمانہ میں ہر قسم کی ترقی کی
حالت میں شمار ہوتی ہیں، بہت سی رسمیں ہیں اور
ان رسموں کی نہایت درجے پر پابندی ہے تو وہ
قومیں کیوں ترقی پر ہیں؟

یہ اعتراض سچ ہے اور درحقیقت
یورپ میں رسموں کی پابندی کا نہایت نقصان ہے
اور اگر اس کی اصلاح نہ ہوتی رہے گی۔ جیسا کہ
اب تک ہوتی رہی ہے۔ تو ان کو بھی بدنصیبی کا دن

پیش آویگا مگر یورپ میں اور مشرقی ملکوں کی پابندی رسومات میں ایک بڑا فرق ہے یورپ میں رسومات کی پابندی ایک عجیب اور نئی بات ہے نے کو مانع تو ہے مگر رسومات کی تبدیلی کا کوئی مانع نہیں۔ اگر کوئی شخص عمدہ رسم نکالے اور سب لوگ پسند کریں فی الفور پرانی رسم چھوڑ دی جاوے گی اور نئی رسم اختیار کر لی جاوے گی اور اس سبب سے ان لوگوں کے قوائے عقلی اور حالت تمیز اور قوت ایجاد ضائع نہیں ہوئی۔

تم دیکھو کہ یہ پوشاک جو اب انگریزوں کی ہے ان کے باپ دادا کی نہیں ہے، بالکل اپنی پوشاک بدل دی ہے ہر درجہ کے لوگوں کا جو مختلف لباس تھا اس رسم کو چھوڑ دیا گیا ہے اور ضرور سمجھا گیا ہے کہ ہر شخص ایک سا مثل اوروں کے لباس پہنے۔ اس وقت کوئی رسم یورپ میں ایسے درجے پر نہیں ہے کہ اگر کوئی شخص کوئی رسم اُس کے برخلاف، مگر اس سے عمدہ ایجاد کرے اور لوگ اس پر اتفاق کریں، اسی وقت تبدیل نہ ہو سکے اور اسی تبدیلی کے ساتھ ان کی ترقی بھی ہوتی جاتی ہے۔ چنانچہ نئی نئی کلیں ہمیشہ ایجاد ہوتی رہتی ہیں اور تاوقتیکہ ان کی جگہ بہتر کلیں ایجاد نہ ہو جاویں، وہ دستور رہتی ہیں۔ ملکی معاملات اور تعلیم میں بلکہ اخلاق میں، بلکہ مذہب میں ہمیشہ ترقی کے خواہاں ہیں پس یہ تصور کرنا کہ یورپ بھی مثل ہمارے مگر دوسری قسم کی رسموں میں مبتلا ہے، محض نادانی اور ناواقفیت کا سبب ہے البتہ یورپ میں اور بالتخصیص انگریزوں میں جو بات نہایت عمدہ اور قابل تعریف اور لائق خواہش کے ہے اور درحقیقت بغیر اس کے کوئی قوم مہذب اور تربیت یافتہ نہیں ہو سکتی وہی بات اس کے تنزل کا باعث ہوگی۔ بشرطیکہ اس کی اصلاح نہ ہوتی رہے گی اور وہ یہ ہے کہ تمام انگریز جو حب وطن میں نامی ہیں اس بات پر نہایت کوشش اور جانفشانی کر رہے ہیں کہ کل قوم کے لوگ یکساں ہو جاویں اور سب اپنے خیالات اور طریقے یکساں مسائل اور قواعد کے تحت حکومت کریں اور ان کوششوں کا نتیجہ انگلستان میں روز بروز ظاہر ہوتا جاتا ہے جو حالات کہ اب خاص خاص لوگوں اور فرقوں کے پائے جاتے ہیں اور جن کے سبب ان کی خاص خاص عادتیں قائم ہوئی ہیں وہ اب روز بروز ایک دوسرے کے مشابہ ہوتی جاتی ہیں۔ انگلستان میں اس زمانہ سے پہلے مختلف درجوں کے لوگ اور مختلف ہمسایوں کے لوگ اور مختلف پیشہ والے گویا جدی جدی دنیا میں رہتے تھے۔ یعنی سب کا طریقہ اور عادت جدا جدا تھی، اب وہ سب طریقے اور عادتیں ہر ایک کی ایسی مشابہ ہو گئی ہیں کہ گویا سب کے سب ایک محلے کے رہنے والے ہیں۔ انگلستان میں بہ نسبت سابق کے اب بہت زیادہ رواج ہو گیا ہے کہ لوگ ایک ہی قسم کی تصنیفات کو پڑھتے ہیں اور ایک ہی سی باتیں سنتے ہیں اور ایک ہی سی چیزیں دیکھتے ہیں اور ایک ہی سے مقاموں میں جاتے ہیں اور یکساں باتوں کی خواہش رکھتے ہیں اور یکساں ہی چیزوں کا خوف رکھتے ہیں اور ایک ہی سے حقوق اور آزادی سب کو حاصل ہے اور ان حقوق اور آزادیوں کے قائم رکھنے کے ذریعے بھی یکساں ہیں اور یہ مشابہت اور مساوات روز بروز ترقی پاتی جاتی ہے اور تعلیم و تربیت کی مشابہت اور مساوات۔ اس کو اور زیادہ وسعت ہوتی ہے۔ تعلیم کے اثر سے تمام لوگ عام خیالات کے اور غلبہ اور رائے کے پابند ہوتے جاتے ہیں اور جو عام ذخیرہ حقائق اور مسایل اور رایوں کا موجود ہے

ں پر سب کو رسائی ہوتی ہے۔ آمد و رفت کے ذریعوں
رقی سے مختلف مقاموں کے لوگ جمع اور شامل ہوتے
ں اور ایک جگہ سے دوسری جگہ چلے جاتے ہیں اور اس
سبب سے بھی مشابہت مذکور ترقی پاتی ہے۔ کارخانوں
ر تجارت کی ترقی سے آسائش و آرام کے وسیلے اور
ے زیادہ شائع ہوتے ہیں اور ہر قسم کی عالی ہمتی
بڑی سے بڑی اولوالعزمی کے کام ایسی حالت کو
گئے ہیں کہ ہر شخص ان کے کرنے کو موجود و مستعد
تا ہے۔ کسی خاص شخص یا گروہ پر منحصر نہیں رہا ہے
اولوالعزمی تمام لوگوں کی خاصیت ہوتی جاتی ہے اور
سب پر آزادی اور عام رائے کا غلبہ بڑھتا جاتا
، اور یہ تمام امور ایسے ہیں جیسے انگلستان کے تمام
ں کی رائیں اور عادتیں اور طریق زندگی اور قواعد
شرت اور امورات رنج و راحت یکساں ہوتے جاتے
ں اور بلاشبہ ملک اور قوم کے مہذب ہونے کا اور
لی پر پہنچنے کا یہی نتیجہ ہے اور ایسا عمدہ نتیجہ ہے کہ
س سے عمدہ نہیں ہو سکتا۔

مگر باوصف اس کے ہم اس نتیجہ کو،
بشرطیکہ اس کی اصلاح نہ ہوتی رہے، باعث تنزل
ر دیتے ہیں تو ضرور ہم کو کہنا پڑے گا کہ کیوں یہ
عمدہ نتیجہ باعث تنزل ہو سکتا۔ سبب اس کا یہ ہے کہ
ب سب لوگ ایک سی طبیعت اور عادت اور خیال
ہو جاتے ہیں تو ان کی طبیعت میں سے وہ قوتیں
ئی باتوں کے ایجاد کرنے اور عمدہ عمدہ خیالات کے
دا کرنے اور قواعد حسن معاشرت کو ترقی دینے کی
ب زائل اور کمزور ہو جاتی ہیں اور ایک زمانہ ایسا
ا ہے کہ ترقی ٹھہر جاتی ہے اور پھر ایسا زمانہ ہوتا
ہے کہ تنزل شروع ہو جاتا ہے۔

اس معاملے میں ہم کو ملک چین کے
حالات پر غور کرنے سے عبرت ہوتی ہے۔ چینی بہت
لئیق آدمی ہیں، بلکہ اگر بعض باتوں پر لحاظ کیا جائے
تو عقلمند بھی ہیں اور اس کا سبب یہ ہے کہ ان کی
خوش قسمتی سے ابتدا ہی میں ان کی قوم میں بہت
اچھی اچھی رسمیں قائم ہو گئیں اور یہ کام ان لوگوں کا
تھا جو اس قوم میں نہایت دانا اور بڑے حکیم تھے۔

چین کے لوگ اس باب میں مشہور و معروف
ہیں کہ جو عمدہ سے عمدہ دانش اور عقل کی باتیں ان کو
حاصل ہیں، ان کو ہر شخص کی طبیعت پر بخوبی منقش کرنے
کے واسطے اور اس بات کے لیے کہ جن شخصوں کو وہ
دانش مندی کی باتیں حاصل ہیں، ان کو بڑے بڑے
عہدے ملیں، نہایت عمدہ طریقے ان میں رائج ہیں اور
وہ طریقے حقیقت میں بہت ہی عمدہ ہیں بے شک جن
لوگوں نے اپنا ایسا دستور قائم رکھا انھوں نے
انسان کی ترقی کے اسرار کو پا لیا اور اس لیے چاہیے
تھا کہ وہ قوم تمام دنیا میں ہمیشہ افضل رہتی مگر
برخلاف اس کے ان کی حالت سکون پذیر ہو گئی ہے
اور ہزاروں برس سے ساکن ہے اور اگر ان کی
کبھی کچھ اور ترقی ہوگی تو بے شک غیر ملکوں کے لوگوں
کی بدولت ہوگی۔ اس خرابی کا سبب یہی ہوا کہ اس
تمام قوم کی حالت یکساں اور مشابہ ہو گئی اور سب
کے خیالات اور طریق معاشرت ایک سے ہو گئے اور سب
کے سب یکساں قواعد اور مسائل کی پابندی میں
پڑ گئے اور اس سبب سے [illegible]
کو روز بروز ترقی ہوتی ہے ان [illegible] سے محروم ہو گئے

پس جب کہ ہم مسلمان ہندوستان کے رہنے والے جن کی رسومات بھی عمدہ اصول اور قواعد پر مبنی نہیں ہیں بلکہ کوئی رسم اتفاقیہ اور کوئی رسم بلا خیال اور قوموں کے اختلاط سے آگئی ہے جن میں ہزاروں نقص اور برائیاں ہیں اور پھر ہم ان رسوموں کے پابند ہوں نہ اُن کی بھلائی برائی پر غور کریں اور نہ خود کچھ اصلاح اور درستی کی فکر میں ہوں بلکہ اندھا دھوندی سے انہی کی پیروی کرتے چلے جاویں تو سمجھنا چاہیے کہ ہمارا حال کیا ہو گیا ہے اور آئندہ کیا ہونے والا ہے۔

ہماری نوبت چینیوں کے حال سے بھی رسومات کی پابندی کے سبب بدتر ہو گئی ہے اور ہم میں خود اتنی طاقت نہیں رہی کہ ہم اپنی ترقی کر سکیں۔ اس لیے بجز اسکے کہ دوسری قوم ہماری ترقی اور ہمارے قوائے عقلی کی تحریک کا باعث ہو اور کچھ چارہ نہیں بعد اسکے کہ ہمارے قوائے عقلیہ تحریک میں آجاویں اور پھر قوت ایجاد ہم میں شگفتہ ہو تب ہم پھر اس قابل ہوں گے کہ خود اپنی ترقی کے لیے کچھ کر سکیں۔

مگر جب کہ ہم دوسری قوموں سے از راہ تعصب نفرت رکھیں اور کوئی نیا طریقہ زندگی کا گو وہ کیسا ہی بے عیب ہو اختیار کرنا صرف بسبب اپنے تعصب یا رسم و رواج کی پابندی کے معیوب سمجھیں تو پھر ہم کو اپنی بھلائی اور اپنی ترقی کی کیا توقع ہے۔

مگر چونکہ ہم لوگ مسلمان ہیں اور ایک مذہب رکھتے ہیں جس کو ہم دل سے سچ جانتے ہیں اس لیے ہم کو مذہبی پابندی ضرور ہے اور وہ اس قدر ہے کہ جو بات معاشرت اور تمدن اور زندگی بسر کرنے اور دنیوی ترقی کی اختیار کرتے ہیں اس کی نسبت اتنا دیکھ لیں کہ وہ مباحات شرعیہ میں سے ہے یا محرمات شرعیہ میں سے۔ در صورت اول بلا شبہ ہم کو اختیار کرنا چاہیے [illegible] رسم کے اعد بالکل ناواس بات سے کہ لوگ ہم کو برا کہتے ہیں یا سبب اس کو اختیار کرنا ضرور بلکہ واسطے ترقی قومی کے فرض ہے۔

خدا مسلمانان را بہمیں کار توفیق دہد۔ آمین

(از "حالات سر سید" مرتبہ مولانا محمد اسماعیل پانی پتی)

بقیہ "مسلم یونیورسٹی میں علمی و تحقیقی سرگرمیاں"

افتتاحی تقریبات کینیڈی ہال میں ہوئیں۔ [illegible] صاحب کی تلاوتِ کلام پاک سے تقریب کا آغاز ہوا۔ اس کے بعد وائس چانسلر جناب سید حامد صاحب نے مندوبین اور مہمانان کا خیر مقدم کیا۔ پھر یونیورسٹی ترانہ پیش کیا گیا۔ ترانے کے بعد مہمان خصوصی محترمہ مسز محسنہ قدوائی نے کانفرنس کا افتتاح فرمایا۔ اس کے بعد پروفیسر بی این ایس والیا صدر انڈین اکاڈمی آف پیڈیاٹرکس۔ پی۔ جی۔ آئی۔ چنڈی گڑھ نے اپنا مرکزی خیال کا خطبہ "صحت اطفال چھٹے پلان میں" عنوان پر پیش فرمایا۔ اس کے بعد بی این سکسینہ نے تقریر فرمائی۔ آخر میں آرگنائزنگ سکریٹری پروفیسر زینت انصاری نے تمام مندوبین اور مہمان خصوصی کا شکریہ ادا کیا۔ قومی ترانہ کے ساتھ افتتاحی تقریبات ختم ہوئیں۔ مجلس مذاکرہ کی نشستیں جواہر لال نہرو میڈیکل کالج میں منعقد ہوئیں۔ تمام نشستیں علمی مباحثے اور سامعین کی تعداد کے اعتبار سے کامیاب رہیں۔ مندوبین نے اپنی تقاریر میں انتظامات کی عمدگی کو سراہتے ہوئے پروفیسر مسز زینت انصاری کا شکریہ ادا کیا۔

مہمانوں کی ضیافت طبع کے لیے رات کے کھانے سے بیشتر ثقافتی پروگرام کے عنوان سے قوالی کا بھی اہتمام کیا گیا۔ جسے تمام حاضرین نے پسند فرمایا۔

بیت اللہ انصاری
جے این میڈیکل کالج
اے ایم یو۔ علی گڑھ

مسلم یونیورسٹی میں علمی و تحقیقی سرگرمیاں

مسلم یونیورسٹی علی گڑھ میں جواہر لال نہرو میڈیکل کالج کے زیر اہتمام ہندوستان کی نیورو سائنس (NEURO SCIENCE) سوسائٹی کی نیشنل کانفرنس اور یونیورسٹی گرانٹس کمیشن کے مالی تعاون سے Advances in Neuro Endocr-inal Regulation of Fertility Behaviour کے عنوان پر ایک سمپوزیم ۵ر اور ۶ر فروری ۱۹۸۳ء منعقد ہوا۔ کانفرنس کا افتتاحی اجلاس کنیڈی ہال میں ہوا۔ جناب قاری عتیق الرحمٰن صاحب نے تلاوت کلام پاک سے تقریب کا آغاز فرمایا۔ وائس چانسلر جناب سید حامد صاحب نے کانفرنس کا افتتاح فرمایا اور اپنی افتتاحیہ تقریر میں دماغ پر تحقیقی کام کی اہمیت پر روشنی ڈالتے ہوئے کہا کہ انسان منصب انسانیت پر اپنے دماغ کی وجہ سے فائز ہے۔ فاضل وائس چانسلر نے کہا کہ انسان نے ایٹم کو کئی حصوں میں تقسیم کر دیا ہے اور GENETIC CODE توڑنے پر قدرت حاصل کر لی ہے۔ مگر سربستہ رازوں کا مجموعہ دماغ اس کے لیے ایک چیلنج کی حیثیت رکھتا ہے یادداشت شعور اور رجحانات کی تفہیم آج بھی نامکمل ہے۔ اب انسان نے دماغ کے نشیب و فراز میں چھان بین اور تحقیق کرنا شروع کر دیا ہے۔ لیکن چونکہ دماغ ایک بے حد پیچیدہ عضو ہے اس لیے دماغ پر تحقیقی کام کرنے کے لیے بین العلومی طرز فکر INTER DISCIPLINARY APPROACH ناگزیر محسوس ہوتی ہے

وائس چانسلر کی افتتاحیہ تقریر کے بعد یونیورسٹی ترانہ ہوا جسے تمام حضرات نے بہت پسند کیا

پروفیسر بی این سکسینہ چیرمین مجلس استقبالیہ نے مندوبین کا خیر مقدم کیا اور افعال دماغ کی اہمیت کا ذکر کرتے ہوئے انھوں نے کہا کہ دماغ کے رازوں کو جاننے اور افعال دماغ کی بہتر تفہیم کے لیے علم کی توسیع ہونا چاہیے اور تمام محققین کو مشترکہ جدوجہد کرنی چاہیے اور باریک بینی کے ساتھ تفتیش کا کام جاری رکھنا چاہیے۔ انھوں نے کہا کہ صلاحیت تولید اور میلانات دماغ کے ایک ہی مراکز کے تابع ہیں

مہمان خصوصی ڈاکٹر آئی جی بجاج ڈاکٹر جنرل، میڈیکل اینڈ ہیلتھ سروسز، حکومت ہند، نے دماغ پر تحقیقی کام کے سلسلے میں بین العلومی طرز فکر کی ضرورت کو تفصیل سے بیان کیا۔ انھوں نے کہا کہ ہمارے ملک کی طرح ترقی پذیر ممالک میں کوئی بھی فرد واحد یا صرف ایک شعبہ دماغ پر مکمل تحقیق کے لیے ضروری سامان اور آلات کو حاصل نہیں کر سکتا۔ انھوں نے قیمتی آلات یونیورسٹی میں ایک مرکز پر اکٹھا کرنے اور مرکزی تحقیقی سہولیات فراہم کرنے کی ضرورت پر زور دیا۔ تاکہ تحقیقی سہولیات سے [illegible] کرنے والے تمام حضرات مناسب

لالی میں منعقد ہو سکیں۔

پروفیسر ایس ایس پرمار، چیف آف دی ڈپارٹمنٹ آف فزیالوجی، یونیورسٹی آف نارتھ ڈکوٹا یو ایس اے نے مندوبین کی جانب سے کانفرنس کے سلسلے میں کیے گئے عمدہ انتظامات کو سراہا اور اس دماغ کے لیے بین العلومی کوشش کی اہمیت اور ضرورت پر روشنی ڈالی۔ انھوں نے جواہر لال نہرو میڈیکل کالج اور INTER DISCIPLINARY BRAIN — RESEARCH CENTER — میں ہونے والے تحقیقی کاموں کی بھی تعریف کی۔

تقریب کی تمام کاروائیاں دو آرگنائزنگ سکریٹریز پروفیسر مہدی حسن اور پروفیسر اوم مینڈرل کی مشترکہ نظامت کے تحت انجام پذیر ہوئیں۔ آرگنائزنگ سکریٹری پروفیسر مہدی حسن نے مہمان خصوصی کا شکریہ ادا کیا کہ انھوں نے علی گڑھ تشریف لانے کی زحمت گوارہ فرمائی۔ پروفیسر مہدی حسن نے یونیورسٹی گرانٹس کمیشن کا بھی شکریہ ادا کیا جس کے مالی تعاون سے سمپوزیم منعقد ہوا۔ علاوہ ازیں انھوں نے عطیات پیش فرمانے والے تمام حضرات خصوصاً نواب رحمت اللہ خاں شروانی کا، ان کی سرپرستی اور مالی امداد کے لیے، اور تمام رضاکار حضرات و ملک و بیرون ملک سے آئے ہوئے مندوبین کا شکریہ ادا کیا۔ قومی ترانہ کے ساتھ کانفرنس کی تقریبات اختتام پذیر ہوئیں۔

مجلس مذاکرہ کی نشستیں میڈیکل کالج میں منعقد ہوئیں۔ تمام نشستوں میں سامعین کی تعداد امید افزا رہی۔ مختلف نشستوں میں ۸۵ علمی مقالے پیش کیے گئے جن کے بعد نتیجہ خیز مباحثے ہوئے۔

پروفیسر پرمار نے ان نشستوں کی تعریف کرتے ہوئے کہا کہ ان کی علمی اہمیت ہندوستان سے باہر ہونے والی کانفرنسوں یا نشستوں سے کسی طرح کم نہیں۔ پروفیسر پرمار کے علاوہ ڈاکٹر ایس ایس کینیا رے (بھابھا اٹامک ریسرچ سینٹر بمبئی) ڈاکٹر بی پی سود (راجکوٹ (گجرات) اور ڈاکٹر موہن کمار (کیرالا) قابل ذکر شخصیتوں نے علمی مباحثے میں حصہ لیا۔

مجلس عامہ کی نشست میں پروفیسر پرمار نے انڈین اکاڈمی آف نیورو سائنس کی تجویز پیش کی جو اتفاق رائے سے منظور کی گئی۔ پروفیسر پی۔ این سکسینہ اکاڈمی کے پہلے صدر منتخب ہوئے۔ پروفیسر مہدی حسن، ڈاکٹر پی کے سیٹھ (آئی۔ٹی۔آر۔سی لکھنؤ) اور پروفیسر ایس ایس پرمار (یو۔ ایس۔ اے) علی الترتیب نائب صدر، سکریٹری اور سکریٹری برائے بین الاقوامی امور منتخب ہوئے۔

آخر میں مندوبین نے انتظامات کی تعریف کرتے ہوئے آرگنائزرس کا شکریہ ادا کیا۔ یہ بھی طے پایا گیا کہ انڈین اکاڈمی آف نیورو سائنس کی اگلی نشست لکھنؤ میں منعقد ہو۔

افتتاحیہ اجلاس کی تمام کاروائیاں ۷ فروری ۱۹۸۳ء کو صبح ساڑھے آٹھ بجے آل انڈیا ریڈیو سے نشر کی گئیں۔

نیورو سائنس کانفرنس کے بعد انڈین اکادمی آف پیڈیاٹرکس کی اتر پردیش شاخ کی پانچویں سالانہ کانفرنس ۱۲ فروری ۱۹۸۳ء کو ڈپارٹمنٹ آف پیڈیاٹرکس، جواہر لال نہرو میڈیکل کالج کے زیر اہتمام مسلم یونیورسٹی میں منعقد ہوئی

جلد نمبر ۲ ۱۶ اپریل ۱۹۸۳ء شمارہ نمبر
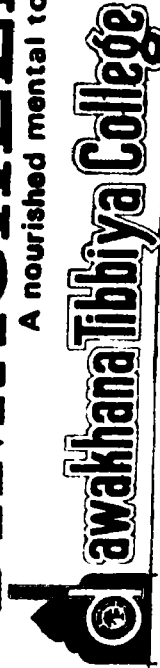
سب سے بڑا عیب ہم میں خود غرضی کا ہے اور
اور یہی مقدم سبب قومی ذلت اور نامہذب ہونے
کا ہے۔ ہم میں سے ہر ایک کو ضرور ہے کہ رفاہِ عام
کا جوش دل میں پیدا کریں اور یقین جانیں کہ
خود غرضی سے تمام قوم کی اور اس کے ساتھ اپنی
بھی بربادی ہوگی۔

(سر) سید احمد

فی پرچہ ایک روپیہ ششماہی ۱۱ روپے

سالانہ ۲۰ روپے

بیرونِ ہند سے

فی پرچہ ایک ڈالر سالانہ ۱۵ ڈالر

ترسیلِ زر و خط و کتابت کا پتہ۔

قاضی معزالدین احمد

صفدر منزل۔ تار بنگلہ۔ اے ایم یو۔ علی گڑھ

یوپی۔ انڈیا۔

ررہ روزہ

تہذیب الاخلاق

علی گڑھ

مُدیر: سید حامد وائس چانسلر
علی گڑھ مُسلم یونیورسٹی

مُدیر مسئول: قاضی معزالدین احمد

جلد نمبر ۲ ۱۶ / اپریل ۸۳ ۱۹ء شمارہ نمبر ۸

خود سوزی

گذشتہ سے پیوستہ

قسطوں میں لکھنے کے کچھ فائدے
ں کچھ نقصان - ایک فائدہ یہ کہ اگر لکھنے والے کے
س سکون اور فرصت کے لمحات کم ہیں تو بھی وہ اپنے
الات کو پڑھنے والوں تک پہنچا سکتا ہے؛ دوسرا
ر کڑوی دوا اور پھیکی سیٹھی غذا اگر مقدار میں کم
؛ تو گوارا کرلی جائے گی۔ نقصان یہ کہ ایک ہفتہ
درہ دن یا ایک ماہ کے وقفے میں وہ اثر زائل ہونے
ا ہے جو مضمون کے ابتدائی جزو نے پہلی قسط کی
کل میں پیدا کیا تھا - اور اس غریب پڑھنے والے کا
ا تصور جس نے صرف ایک شمارہ پر نظر ڈالی تھی
یا لکھنے کی ایک بات کو قسطوں میں کہنا تجارتی ہتھکنڈہ
ے؛ پڑھنے والے کو مجبور کیا جارہا ہے کہ صرف ایک مضمون
یلے ایک شمارہ اور خریدے۔ لیکن "تہذیب الاخلاق"
ایک اصلاحی پرچہ ہے۔ اسے تجارت سے کیا غرض؟

"خود سوزی" کے اِس قسط وار سلسلہ کی
شروعات اِس طرح ہوئی کہ سیّد حامد مصروفیت
کی بنا پر کئی شماروں میں غیر حاضر رہا اور اس غفلت
پر اسے فہمائش کی گئی - ایک ساتھ ایک بسیط مضمون
لکھنے کا وقت نہیں ملا تو چھوٹے چھوٹے ٹکڑوں میں
وقت کو اسیر کیا اور ہر بار چند سطریں لکھ دیں۔
لکھنے والے کو ہرگز یہ غلط فہمی نہیں ہے کہ پڑھنے والے
اس کے مضمون کی قسطوں کا انتظار کرتے ہوں گے
قسطوں کے لیے دراصل اگر کوئی جواز ہے تو داستان
گو کے پاس۔ اس کا ہنر ہی یہ تھا کہ کہانی کو ایک نازک
اور صبر آزما موڑ پر پہنچا کر باقی داستان کو دوسری
صحبت یا دوسری رات کے لیے اٹھا رکھے۔
آپ کو یاد ہوگی الف لیلہ کی بنیادی کہانی
کہ ایک بادشاہ ہر روز اپنے شبستاں میں ایک نئی
دوشیزہ کو بر سبیل عقد طلب کرتا اور صبح ہوتے اُسے
مروا ڈالتا۔ عیش و عشرت اور قتل و غارت گری کی

ہاراتیں گزر گئیں، تب شہرزاد کی باری آئی جسے
نے حسن کے ساتھ ذہانت بھی دی تھی۔ یہ اجتماع
قدر نادر ہے کون نہیں جانتا۔ شہرزاد کو داستان
ئی کا ہنر آتا تھا۔ چنانچہ کہانی وہ اِس انداز سے
رع کرتی کہ پو پھٹتے وقت کہانی اپنے توڑ پر پہونچتی
بادشاہ مجبور ہو جاتا کہ ایک رات کے لیے اور اسے
ن کی امان دے دے۔ الف لیلہ جس میں
راتوں کا بیان ہے انھی کہانیوں کا مجموعہ ہے۔
کہانی سے دوسری کہانی نکلتی چلی گئی۔ کسی شاعر
کہا ہے:

آنکھ کھولی الف لیلے کا سماں دیکھا کیے
زندگی کو داستاں در داستاں دیکھا کیے

چاسر نے، جسے انگریزی شاعری کا بادا آدم مانا
ہے، کنٹربری کی کہانیوں میں الف لیلے کی ترکیب
یک گونہ فائدہ اٹھایا ہے۔ کنٹربری جانے والے
راستہ بہلانے کے لیے باری باری کہانیاں
ناتے ہیں لیکن اس میں الف لیلے کی صناعی اور
ت میں سے بات نکلنے اور داستان میں سے
ستان پیدا ہونے کا لطف نہیں ہے۔ گو کردار نگاری کا
الف لیلیٰ کنٹربری ٹیلس کی پاسنگ بھی نہیں۔
بات خود کو جلانے سے شروع ہوئی
تذکرہ چھڑ گیا شادیوں کے مکروہ مطالبات اور
یانک نتائج کا۔ ہندوؤں اور مسلمانوں، شمال والوں
جنوب والوں کا اس معاملے میں کیا رُخ ہے،
ں کی بات بھی ہوئی۔ تان اس پر ٹوٹ رہی ہے
نسان نے عورتوں کے ساتھ طرح طرح کے ظلم روا
ہیں۔ اِسلام پہلا مذہب ہے جس نے عورتوں
کے حقوق کو مانا اور ان کو عزت کی جگہ پر بٹھایا۔ لیکن
آہستہ آہستہ مسلمان بھی اپنے دین کو طاق پر رکھ کر
عورتوں کی حق تلفی اور ان کی اہانت کرنے لگے ہیں۔
مغرب میں بمبئی اور دکن میں حیدرآباد کو لیجیے۔ ان
شہروں میں دوسرے ملکوں سے ایسے لوگ آتے ہیں
جن کی روایتیں اور قدریں مٹی کے تیل میں ڈوب چکی ہیں،
اور جو اپنی بدچلنی کو شریعت کے لبادہ سے ڈھانکنے
کی کوشش کرتے ہیں۔ یہ پیران فرتوت بھولی بھالی،
معصوم لڑکیوں کے والدین کو شادی کا پیام دیتے ہیں
اور وہ بے زر، بے بس اور بے غیرت والدین اپنی لڑکیوں
کی شادی ان بوالہوس درندوں کے ساتھ کر دیتے
ہیں۔ اس امید میں کہ شاید اللہ تعالیٰ رحم فرمائے
اور ان کی بیٹی جو سیانی ہو کر بھی گھر میں بیٹھی ہوئی ہے
ٹھکانے سے لگ جائے۔ ہندوستان میں بے شمار
مسلمان لڑکیاں سیانی ہو کر گھروں میں بیٹھی رہ جاتی
ہیں اس کی الگ ایک المناک داستان ہے جس کی تفصیل
کو ایک مستقل مضمون درکار ہوگا۔ اجمال اس کا یہ ہے
کہ آزادی اور تقسیم ہند کے بعد پڑھے لکھے اور خوشحال
مسلمان ماں باپ کے لیے لڑکیوں کی شادی ایک بہت
کٹھن مسئلہ بن گئی ہے۔ خوشحال اور ہونہار لڑکوں
کی ایک پوری نسل پاکستان چلی گئی۔ لڑکیاں بیچاری
یہیں والدین کے ساتھ رہ گئیں۔ ظاہر ہے ان کے لیے
اس حیثیت کے بر ملنا دشوار ہو گیا جس کی وہ ماں
باپ کے گھر عادی رہی ہیں۔
شمالی ہندوستان کے مسلمان جنھوں
نے ملازمت اور زمین داری پر تکیہ کر رکھا تھا دونوں
سے محروم ہو گئے۔ اس کے بعد جو مسلمان لڑکے اُٹھے

وہ بدلے ہوئے حالات اور سکڑتے ہوئے امکانات
سے بددل ہو کر محنت اور ولولہ سے دستکش ہو گئے۔
یا انھوں نے پیشوں اور مناصب کے لیے کوشش کرنا
چھوڑ دیا جو اعلیٰ تعلیم کے راستہ سے حاصل ہوتے ہیں
لڑکیوں نے تعلیم میں زیادہ دلچسپی لینا شروع
کی کر تعلیم کے بغیر شادی مشکل تھی اور ایسے لڑکوں
کی تعداد کم ہو گئی تھی جن کے پاس علم بھی ہو اور معقول
حیثیت بھی۔ ـــــ لڑکیاں مسلمان لڑکوں سے تعلیم
میں اکثر آگے نکل گئیں۔ اب ان کے لیے مناسب رشتہ
ملنا اور دشوار ہو گیا کہ وہ خوشحال ماں باپ کی بیٹیاں
اور علم اور اس سے وابستہ امیدوں کی سرمایہ دار
تھیں۔ چنانچہ وہ محرومی کی آگ میں جلتی رہتی ہیں
اور فکر کی آنچ سے ان کے والدین زندگی بھر تپتے
رہتے ہیں۔ جلتے رہتے ہیں۔

مسلمان لڑکوں میں اگر غیرت ہوتی حوصلہ ہوتا
تو وہ اپنے لیے نہ سہی اپنی بہنوں کی خاطر سخت جانفشانی
کرتے اور علم اور حیثیت حاصل کرتے تاکہ مسلمان لڑکیوں
کے لیے ہم علم، ہم حیثیت اور ہم اطوار لڑکے باآسانی
مل جاتے اور غیر مسلموں سے مسلمان لڑکیوں کی شادی
کا فتنہ سر ہی نہ اٹھا پاتا۔

جملہ معترضہ ختم ہوا۔ بمبئی اور حیدرآباد
میں جو ناٹک کھیلا جا رہا ہے اس کا خاتمہ المیہ پر ہوتا
ہے۔ ہوس کی پیاس بجھانے کے بعد یہ ظالم اجنبی اپنی
بیویوں کو طلاق دے دیتے ہیں اور وہ غریب اپنی
زندگی بدنامی، تنگی اور رسوائی میں کاٹتی ہیں۔ اس ناٹک
میں "ولین[1]" کئی ہیں۔ ایک تو وہی ریاکار، زردار
بوالہوس جو شادی کا سوانگ رچا کر دراصل زنا بالجبر کا
ارتکاب کرتے ہیں۔

وہ عقد جس میں زندگی بھر کی رفاقت، انسیت
اور ہمہ گیر شرکت اور ہمدردی اور باہمی خیر خواہی کا
تصور نہ ہو، اُسے عقد کہنا روا نہیں۔ ایسی شادی جس
کا مقصد صرف جنسی تشفی ہو کسی تاویل کے ذریعہ جائز نہیں
ہو سکتی۔ مرد ہوس آمادہ، عورت ڈری ہوئی سہمی ہوئی کہ
مرد کی ہوس پوری ہونے کے بعد اس بیچاری کا انجام کیا ہو
یہ صورتِ حال شادی کے بجائے مجرمانہ حملہ سے قریب تر ہے
اس میں عیاشی، لذت کوشی اور بہیمیت موجود ہیں۔ محبت، رفاقت
اور محبت کے ثمر یعنی اولاد کا تصور اور اس کو پروان چڑھانے
کی امنگیں مفقود ہیں۔

وہ اخلاق باختہ قاضی جو ان اعمال شنیعہ کو دین کی
سند دے دیتے ہیں۔ وہ جانتے ہیں کہ یہ ظلم ہے، جہالت
ہے، گناہ ہے اور پھر بھی وہ ایسے نکاح پڑھانے میں ذرا
سا تامل نہیں کرتے۔ اس طرح ایک طرف وہ ایک ایسی
بیماری کو بڑھاوا دیتے ہیں جو سماج کو کھوکھلا کر رہی ہے
دوسری طرف وہ تھوڑے سے روپیوں کے لیے مذہب
کو بدنام کرتے ہیں۔ دین جو عین حق ہے اس کا رشتہ
وہ جھوٹ اور فریب سے جوڑ رہے ہیں اور اس کو
ہوسناکی کا آلۂ کار بنا رہے ہیں۔ قصور بے شک
اس میں والدین کا بھی ہے اور صریحاً ہے ان کے بعد
خطا ان لڑکیوں کی ہے جو اپنے ماں باپ کی عزت بچانے
اور ان کی پریشانی دور کرنے کے لیے ایک ایسی بات
پر راضی ہو جاتی ہیں جو مذہب کے خلاف ہے، انسانیت
کے برعکس ہے اور جو ان کی زندگی کو ہمیشہ کے لیے برباد
کر دیتی ہے۔ انھیں چاہیے کہ اس طرح نکاح پڑھانے سے

---
[1] VILLAIN

صاف انکار کر دیں۔ اللہ تعالیٰ کے احکام اور ماں باپ کی خواہش کو بالکل نظر انداز کرنا ہوگا۔ معاشرہ کا بھی فرض ہے کہ ان غریبوں کو اس ظلم و جہل اور بے حسی سے بچائے۔

خود سوزی دونوں کرتی ہیں۔ وہ ہندو لڑکیاں جو طمع کا ہدف بنتی ہیں اور وہ مسلمان لڑکیاں جو اس طرح کی عارضی اور بازاری شادی بدرجۂ مجبوری کر کے تمام عمر کڑھتی رہتی ہیں، جلتی رہتی ہیں۔ الٰہی ہمارا سماج کتنا بے درد اور کیسا بے حس ہو گیا ہے۔

ہم خود سوزی کی اُن مثالوں کی طرف اشارہ کر کے گزر جائیں گے جن سے رجوع کسی بڑے مقصد کی تکمیل کے لیے کرنا پڑے۔ یورپ میں بہت سے لوگ جنھوں نے اپنے عقائد تبدیل کرنے سے انکار کیا، آگ میں جلا دیے گئے۔ Jesuits نے اس بے دردی کو قانون کی شکل دینے اور اسے جا بجا نافذ کرنے میں کلیدی کردار ادا کیا۔ ہم ان سب شہیدوں کو سلام کرتے ہیں جنھوں نے زندہ جلنے کی زہر گداز موت کو اصول و عقاید کی تبدیلی پر ترجیح دی۔ انسانیت ایسے ہی لوگوں کے دم واپسیں سے باقی ہے۔ انگلستان میں بادشاہ نے رڈلے اور لیٹمر RIDLEY and LATIMER کو شاہی مذہب کی پیروی نہ کرنے پر زندہ جلا دیا۔ جس وقت کہ وہ دونوں جلائے جانے کے لیے باندھے جا رہے تھے، ان کے چہروں پر نہ خوف تھا نہ ہراس نہ مایوسی؛ اگر کچھ تھا تو عزم اور اعتماد۔ ایک نے دوسرے سے کہا "جو آگ ہم آج روشن کر رہے ہیں وہ ایک دن ساری دنیا کو روشن کر کے رہے گی"۔ یہ کہا اور جان جان آفریں کے سپرد کر دی۔ اس طرح کہ آگ کے شعلوں سے گوشت بھن گیا، چربی پگھل گئی اور ہڈیاں تڑخنے لگیں۔

اس سے بھی شاید بڑی قربانی ان بدھ بھکشو کی ہے جنھوں نے ویت نام میں اپنے وطن کی آزادی کے لیے شعلہ آشام موت کو آغوش مادر سمجھا۔ ہندوستان میں خود سوزی کے ایک حادثہ نے ایک نئی ریاست کی بنا ڈالی۔ یہی حادثہ آگے چل کر ہندوستان کی تقسیم کا باعث بن بیٹھا۔ جلنے والے نے خود سوزی ایک مقصد کے تحت کی، اور وہ مقصد اس کے مرنے کے بعد حاصل ہو بھی گیا۔ مقصد کچھ بھی اور اس کے نتائج خواہ اچھے نہ بھی نکلیں، خود سوزی کی بنیاد یہاں حسن نیت اور ایثار پر تھی۔ اسلام اس قسم کی خود سوزی کو بھی گوارا نہیں کرتا۔ احتجاج اور اصلاح کے اور طریقے بھی ہیں۔ کسی فرد کو اپنی جان لینے کا اختیار نہیں ہے۔

جاپانی جس کام یا طریقے کو لیتے ہیں اسے پایۂ کمال تک پہونچا دیتے ہیں۔ چنانچہ انھوں نے خودکشی کو فرار اور بزدلی کی سطح سے اٹھا کر جوانمردی اور ہمت اور عزت نفس کے مقام پر پہونچا دیا ہے لیکن ابھی تک خود سوزی کی اس قسم کا ذکر نہیں آیا جو آگ یا وبا کی طرح پھیل گئی ہے۔ اور جس نے ہماری نئی نسل کو اپنے چنگل میں اس طرح لے لیا ہے کہ راہِ فرار مسدود ہو گئی ہے۔

باقی آئندہ۔

سید حامد

حکیم احسان اللہ
شعبہ طب و جراحت
اجمل خاں طبیہ کالج ۔ اے ایم یو

آملہ ۔ سردار ادویہ

آملہ ایک مشہور ہندوستانی درخت کا پھل ہے۔ ملک کے تمام حصّوں میں اس کے درخت پائے جاتے ہیں۔ آملہ کے درخت دو قسم کے ہوتے ہیں۔ ایک خود رو (جنگلی) دوسرا مزروعہ (بستانی) آملہ کے خودرو درخت جنگلوں مثلاً صحرائے گوداوری اور دریاؤں، ندیوں کے کنارے جیسے دریائے جمنا کے کنارے کثیر تعداد میں پائے جاتے ہیں۔ طبّی و صنعتی افادیت اور استعمال کی کثرت کے سبب ان کے باقاعدہ باغات لگائے جاتے ہیں۔ ہندوستان کے صوبۂ بنگال، بہار، یوپی، پنجاب، مدھیہ پردیش اور مہاراشٹرا وغیرہ میں وسیع پیمانے پر آملہ کی کاشت کی جاتی ہے۔ ہندوستان کے علاوہ پاکستان، سری لنکا اور چین وغیرہ ممالک میں بھی آملہ کے درخت بڑی تعداد میں پائے جاتے ہیں۔ بستانی آملہ جنگلی آملوں کے مقابلہ میں بڑا ہوتا ہے۔ بنارسی آملہ عمدہ مانا جاتا ہے

آملہ کو آنولہ اور بعض علاقوں میں اسے اونرا بھی کہتے ہیں۔ سنسکرت میں اس کو آدی پھل (ابتدائی پھل) کہتے ہیں۔ جس سے اس پھل کے قدیم ہونے کی طرف اشارہ ملتا ہے۔ عربی زبان میں اس کا معرب آملج مستعمل ہے۔

آملہ کروی (گول) شکل کا گودہ دار پھل ہے جس کا قطر ½ ۱ انچ تک ہوتا ہے۔ عموماً خام حالت میں ان کی رنگت سبز اور پختہ ہونے پر سبز مائل بہ زردی ہو جاتی ہے۔ سنترہ کی مانند آملہ کا گودہ بھی قاشوں میں منقسم ہوتا ہے لیکن بخلاف سنترہ اس میں قاشوں کی تعداد متعین ہوتی ہے یعنی چھ(۶) قاشیں ہوتی ہیں۔ بیرونی سطح پر چھ ہلکی طولانی دھاریاں ہوتی ہیں جو مغز آملہ کی چھ قاشوں کی بیرونی اور سطحی نشاندہی کرتی ہیں۔ انھیں دھاریوں کے بالمقابل اندر کے سخت حصّے، جسے گٹھلی کہتے ہیں، پر چھ ابھری ہوئی سخت ریشہ دار دھاریاں پائی جاتی ہیں اور گٹھلی کے اندر قاشوں کی تعداد کے برابر یعنی چھ عدد بیج پائے جاتے ہیں۔

ذائقہ و مزاج

آملہ کا ذائقہ ترش اور کسیلا ہوتا ہے تازہ آملوں میں ترشی اور خشک آملوں میں کسیلا پن غالب ہوتا ہے۔ آملے کا ذائقہ اس کے مزاج اور فوائد کی طرف رہنمائی کرتا ہے۔ آملہ کا مزاج سرد اور خشک ہوتا ہے۔ اس سے مراد یہ ہے کہ آملہ کے استعمال سے جسم میں سردی اور خشکی کی کیفیت پیدا ہوتی ہے

آملے کو چند مرتبہ دودھ میں پکا لینے یا اس کو مربّی اور شربت کی شکل دینے کے بعد اس کے مزاج کی خشکی بڑی حد تک کم ہو جاتی ہے۔

طبّی وصنعتی افادیت

آملے کے درخت کے تمام حصے (جڑ، شاخیں، پتیاں، پھول اور پھل وغیرہ) اپنے اندر طبّی وصنعتی افادیت رکھتے ہیں اور ہر دو حیثیت سے استعمال کیے جاتے ہیں۔ لیکن پھلوں کو دونوں حیثیتوں سے آملے کے دیگر تمام حصوں پر فوقیت حاصل ہے۔ زیرِ نظر مضمون میں خاص طور سے آملہ کے پھلوں کی طبّی افادیت کا تذکرہ مقصود ہے۔

آملہ کے درخت کے سبھی حصوں میں ٹینین (TANNIN) کی خاصی مقدار پائی جاتی ہے ٹینین کی مقدار آملے کے دوسرے حصّوں کی بہ نسبت پھلوں میں زیادہ، ۲۸ فیصد ہوتی ہے۔ آملہ کے پھل اور اس کے دوسرے تمام حصوں کا استعمال رنگائی کی چیزیں، اشیاء دباغت، خضاب اور روشنائی وغیرہ کی تیاری میں کیا جاتا ہے۔

آملہ کا استعمال ہر طبقہ اور سماج کے لوگ کسی نہ کسی شکل میں کرتے ہیں۔ طبّی نقطۂ نظر سے آیورویدک اور یونانی دونوں میں آملہ کو بڑی اہمیت حاصل ہے۔ چرک اچاریہ نے مختلف نظامِ جسمانی پر اس کے منفعت بخش اثرات کے پیشِ نظر آملہ کو "دواؤں کا سردار" قرار دیا ہے۔ اپنی ظاہری شکل وصورت میں کرۂ ارض سے مشابہ اس مختصر سے پھل میں طبّی فائدوں کی ایک دنیا آباد ہے۔ آملہ سے حاصل ہونے والے فوائد کا انحصار اس کے اندر پائے جانے والے مختلف قسم کے اجزاء پر ہے۔ مغز آملہ میں حیاتین، متعدد غیر نامیاتی اجزاء (INOR-GANIC SUBSTANCES)، نباتی ریشے اور روغن (ESSENTIAL-OIL) وغیرہ پائے جاتے ہیں۔ آملے کے گودہ میں اسّی فیصد سے زیادہ مائی حصہ ہوتا ہے۔ کاربوہائیڈریٹ اور نباتی ریشے کی مقدار علی الترتیب ۱۴ فیصد اور ۳ فیصد سے زائد ہوتی ہے۔ علاوہ ازیں اس میں کیلشیم، لوہا اور معدنیات کا الگ الگ فیصد بہت قلیل یعنی ایک فیصدی سے بھی کم ہوتا ہے۔ آملہ میں PECTIN (پکٹن) کی مناسب مقدار پائی جاتی ہے۔

حیاتین اسم بامسمّٰی یعنی جسم کے لیے از بس ضروری ہوا کرتے ہیں۔ آملے حیاتین "ج" (VITAMIN C) کے حصول کا بہترین قدرتی ماخذ ہیں۔ اس میں وٹامن سی کی مقدار دیگر ترش پھلوں مثلاً سنترہ، لیموں وغیرہ کے مقابلہ میں بہت زیادہ پائی جاتی ہے۔ ایک آملہ میں وٹامن سی کی مقدار دو سنتروں سے حاصل کی جانے والی مقدار سے زیادہ ہوتی ہے۔ وٹامن سی کی یومیہ مقدار کی فراہمی کے لیے ۱۰ - ۱۲ گرام آملہ کافی ثابت ہو سکتا ہے۔ جب آملہ فضائی درجۂ حرارت پر ہوا میں خشک ہوتا ہے تو اس کے اندر موجود وٹامن سی کے فیصد میں غیر معمولی نقصان (یعنی دو تہائی سے بھی زیادہ) واقع ہوتا ہے۔ اس طرح خشک آملہ میں حیاتین کا فیصد بہت کم رہ جاتا ہے۔

جسمِ انسان کے بیشتر نظام سے تعلق رکھنے والی بیماریوں میں آملہ کا کامیاب استعمال عرصۂ دراز

سے اطباء کے معمول میں ہے۔ اس مقصد کے لیے آملہ
کی تازہ اور خشک دونوں اقسام تقریباً یکساں طور
پر استعمال کی جاتی ہیں۔ بہت سے امراض و عوارض
میں آملہ داخلی اور خارجی دونوں طریقوں سے مستعمل ہے

داخلی استعمال

داخلی طور پر استعمال کرنے سے ایک طرف اگرچہ
جسم کے لیے ضروری معدنی اجزاء کی فراہمی بہم پہونچاتا
ہے تو دوسری جانب مختلف مرضی کیفیات سے نجات
دلانے میں کارآمد ثابت ہوتا ہے۔ آملہ بعض اجزاء
ضروریہ مثلاً لوہا (IRON) کے انجذاب میں سہولت
پیدا کرتا ہے۔ حمرۃ الدم (HAEMOGLOBIN)
کی تولید اور خون کے کریات حمرا (ERYTHROCYTES)
کی صحتمند اور بہتر افزائش میں بھی مدد کرتا ہے۔ اس
طرح یہ خون کے اندر پائی جانے والی چار رنگ (سرخ،
سفید، زرد اور سیاہ) کی رطوبات (جن کو بقراط نے
(460 - 377 BC) نے اخلاط کی اصطلاح سے یاد
کیا ہے) کے اندر تعفن اور فساد پیدا ہونے سے
باز رکھتا ہے۔ امراض سے مقابلہ کی قوت (قوت مدافعت)
آملہ کے استعمال سے قوی ہوتی ہے۔

اس کے علاوہ آملہ کا استعمال سفید
ریشہ دار انسجہ (COLLAGEN- TISSUES)
ہڈی، کری اور دانتوں وغیرہ کی نشوونما میں معاونت
کرتا ہے۔ مذکورہ بالا جملہ فوائد میں تر و تازہ آملہ
یا اس کا مربہ زیادہ موثر ہوتا ہے

نظام ہضم کی بیماریاں بہت عام ہیں
ان میں بدہضمی (INDIGESTION) دست،
پیچش اور متلی وغیرہ کا شکار ہر عمر و جنس کے لوگ
ہوتے ہیں۔ پیچش کی ایک قسم اور ہوتی ہے جو خونی
کہلاتی ہے جس کا حملہ پہلی کے مقابلہ میں زیادہ تکلیف
دہ ہوتا ہے۔ ان تمام صورتوں میں تنہا آملہ کا مربہ
یا شربت یا ہم وزن آملہ اور دھنیا کا بھگایا ہوا
پانی یا شربت آملہ میں لیموں کا رس ملا کر پلانا نفع بخش
ثابت ہوتا ہے۔ آملہ عضلات معدہ (MUSCLES
OF STOMACH) کی قوت کو دوبالا کرتا ہے اور
بھوک میں اضافہ کا سبب بنتا ہے۔

معدہ کی ایک اور پریشان کن بیماری جو کچھ
کم عام نہیں ہے جس کو تیزابیت (ACIDITY)
کہتے ہیں۔ دراصل اس میں معدہ کی اندرونی جھلی سے
حموضت معدی (HCL) کا اخراز طبعی مقدار سے
تجاوز کر جاتا ہے جس کے اسباب مختلف ہوا کرتے
ہیں۔ یہ موقع ان کی تفصیلات میں جانے کا نہیں ہے۔
ابتداء میں اگر پرہیز و علاج کر لیا جائے تو اس کا
ازالہ آسان ہوتا ہے۔ بے توجہی اور لاپرواہی کی
صورت میں یہ تکلیف ازمان پذیر ہوکر قرحہ (ULCER)
کی استعداد پیدا کرنے کا پیش خیمہ ثابت ہو سکتی ہے
اس بیماری کا مریض عموماً کھانے کے بعد معدہ میں بوجھ،
بدہضمی اور کبھی متلی اور قے وغیرہ کیفیات محسوس کرتا
ہے۔ پیاس، معدہ کے مقام پر جلن اور سوزش
دبانے سے کبھی درد وغیرہ بھی اس کی علامات میں
سے ہیں۔

کبھی جگر کا نقص فعل جلن، بدہضمی، منہ کے
ذائقہ کی تلخی اور پیاس وغیرہ کا سبب بنتا ہے
ان تمام صورتوں میں تنہا خشک آملوں کا باریک
سفوف بنا کر عرصہ تک استعمال اور ساتھ ہی مربہ

مسالہ وغیرہ گرم چیزوں سے پرہیز، مذکورہ تکالیف
تخفیف اور ان سے چھٹکارا دلانے میں معاون
ثابت ہوتا ہے۔

جنینی زندگی (جب بچہ رحم مادر میں
ہوتا ہے) کے آخری مہینوں میں قلب کی حرکت وجود
میں آتی ہے اور اس دم سے تا دم آخر اس کا سلسلہ
ہر وقت جاری رہتا ہے۔ قلب کے حرکت کرنے میں
انسانی ارادے کو کچھ دخل نہیں۔ حالت صحت میں
قلب کی حرکات غیر محسوس طریقے پر ہوتی رہتی ہیں
لیکن بعض بیماریوں میں قلب کی رفتار تیز ہونے کے
ساتھ محسوس بھی ہونے لگتی ہے جس کو اختلاج قلب
(PALPITATION) کہتے ہیں۔ علاوہ اختلاج قلب
وحشت و گھبراہٹ اور ضعف قلب وغیرہ دیگر بیماریاں
ہیں جن میں شیخ الرئیس (AD. 980-1037) نے آملہ
کے استعمال کو عجیب التاثیر تحریر کیا ہے۔ ان بیماریوں
میں آملہ بالخصوص اس کے مربی کا استعمال قلب کی
قوت کو بڑھانے اور اس طرح پورے جسم کے اندر
دوران خون میں بہتری لانے کے لیے مفید ثابت ہوتا ہے

دماغی کمزوری، نسیان (بھولنے کی
بیماری) دردِ سر، دوران سر (چکر) وغیرہ عصبی
بیماریوں میں بھی آملہ (مربہ) کا استعمال منفعت بخش
ثابت ہوتا ہے۔

جلدی امراض (SKIN DISEASES)
مثلاً جلد کی رنگت میں غیر طبعی تغیر کا واقع ہونا، جلد کے
اوپر چیونٹیوں کے رینگنے اور جھنجھناہٹ کا احساس اور
خارش وغیرہ عوارضات میں تنہا آملہ (کسی بھی شکل
میں) یا اس کے مرکبات کا استعمال سودمند ہوتا ہے

دیگر: آملہ اور نیم کی خشک پتیاں دونوں کو برابر
وزن میں لے کر ان کا سفوف ۳ گرام روزانہ صبح و
شام استعمال کریں۔

خارجی استعمال

خارجی طور پر بھی آملہ کے استعمال کو بڑی
وسعت حاصل ہے۔ جوف دہن (ORAL CAVITY)
کے مختلف اعضاء کی بیماریوں میں اس کے استعمال
سے فائدہ حاصل کیا جاتا ہے۔ مسوڑھوں سے خون
کا بہنا (GINGIVITIS) منھ میں چھوٹے
چھوٹے چھالوں کا پیدا ہو جانا (STOMATITIS)
وغیرہ میں تازہ آملوں کا چبانا اور آملہ یا اس کے
پتوں کو پکا کر اس پانی سے کلی کرنا مفید ہوتا ہے

آشوب چشم (CONJUNCTIVITIS)
جس میں آنکھوں کی سب سے بیرونی جھلی میں ورم لاحق
ہوتا ہے جس کے نتیجے میں سرخی، سوزش اور برابر
پانی کا بہنا وغیرہ تکلیف دہ کیفیات پیدا ہو جاتی
ہیں۔ ایسی صورت میں تازہ آملوں میں شگاف
لگانے سے جو پانی نکلتا ہے یا اس کو کچلنے سے جو
پانی حاصل ہوتا ہے اس کو آنکھوں میں لگانے سے
آرام پہونچتا ہے۔

دورِ حاضر کا سب سے زیادہ ترقی یافتہ
فیشن، بالوں کا فیشن ہے۔ یہ فیشن ملکی قومی وملی
اور لسانی وجنسی وغیرہ تمام حدود وقیود سے
بالاتر ہے اور روز افزوں ترقی پذیر ہے، لیکن
یہ بات بہت ہی غور طلب ہے کہ جس طرح بالوں
کی تزئین و تلوین ([illegible]) کے جدید طریقے
تراش خراش کی نت نئی طرزیں چمکدار و تابدار

نانے کی مختلف مصنوعی تدبیریں فروغ پا رہی ہیں اسی
رح بالوں کی مختلف النوع بیماریاں بھی عام ہوتی جا رہی
ں۔ بالوں کا گرنا، ان کا قبل از وقت سفید ہو جانا
ن کی چمک کا کم یا زائل ہو جانا، ان کے نمو میں نقص
واقع ہونا وغیرہ تشویش ناک بیماریاں ہیں۔
تازہ آملوں کو کچل کر پانی میں ابال
۔ یا خشک آملوں کو رات بھر پانی میں بھگو دیں
ہ صبح کو ابال کر اس پانی سے بالوں کو برابر دھوتے
ہنا دیگر قیمتی اور مصنوعی اشیاء کے استعمال سے
، نیاز کر دیتا ہے۔ آملہ میں پائی جانے والی انقباض
ں قوت، حموضت، لونیت اور دہنیت وغیرہ خصوصیاً
بالوں کو گرنے سے روکنے، ان کو دراز کرنے، چمکدار
بنانے اور ان کی طبعی رنگت یعنی سیاہی کو قائم رکھنے
میں اہم کردار ادا کرتی ہیں۔ چرک اچاریہ نے اس
ضمن میں لکھا ہے کہ آملوں میں ایک قسم کی حرارت
پائی جاتی ہے جو بالوں کی غذا کو جذب کرکے لاتی
ہے اور بالوں کو اپنی طبعی حالت میں قائم رکھتی ہے۔
مذکورہ بالا امراض (داخلی وخارجی)
کے علاوہ اور بھی دیگر بیماریوں میں اس سے فائدہ
حاصل کیے جاتے ہیں۔ لیکن خوفِ طوالت اس بات
کی اجازت نہیں دیتا کہ ان سب کو اس مضمون میں
شامل کیا جائے، اس لیے انھیں پر بس کرتا ہوں۔

معذرت

شمارہ نمبر ۸ بابت ۱۶ اپریل ۸۳ء تاخیر سے شائع ہو رہا ہے۔ "تہذیب الاخلاق"
قدردانوں کو ماہ اپریل کے آخر تک ملے گا۔ افسوس ہے کہ تہذیب الاخلاق سے متعلق سبھی افراد آخر ۱۹۸۲ء سے کسی نہ کسی
یشانی میں مبتلا ہیں۔ راقم الحروف (مدیر مسئول) عرصے سے دردِ عرق النساء میں مبتلا ہے۔ سردیوں میں مرض نے شدت اختیا
لی اور سکون و اطمینان سے کام کرنا دشوار ہو گیا۔ الحمد للہ اب طبیعت کچھ بہتر ہوئی ہے تو کام کی طرف توجہ ہوئی اور قلم ہاتھ میں لیا ہے
رسالہ کے انتظامی امور میں ہاتھ بٹانے والے زاہد صاحب دسمبر ۸۲ء سے متعدد بیماریوں کا شکار رہے ہیں۔ وہ ابھی
ن قابل ہی ہوئے تھے کہ راقم کا ہاتھ بٹائیں کہ اُن کے دادا یعنی اکرام اللہ خاں صاحب (مسلم یونیورسٹی کے خان خاناں اور
ذیب الاخلاق کی اشاعت میں مددگار) کے والد کا انتقال ہو گیا (انا للہ وانا الیہ راجعون)۔ دعا کیجیے کہ اللہ تعالیٰ
ن کو اپنے جوارِ رحمت میں جگہ دے اور متعلقین کو صبر عطا فرمائے۔ والد کے انتقال کے صدمہ کے فوراً بعد کانپور کے
سٹیشن پر گاڑی میں سوار ہوتے ہوتے ان کو اس حادثہ کی خبر ملی کہ ان کے صاحبزادہ موٹر سائیکل کی زد سے
وچار ہوئے اور رامہ آباد میں جہاں وہ برسرِ روزگار رہے، ہسپتال میں داخل ہیں۔ ان سب حالات کا رسالہ
ہذیب الاخلاق کی ادارت و اشاعت پر اثر پڑا۔ مختلف قسم کی دشواریاں پیدا ہوتی رہیں۔ اب حالات بہتر ہو رہے
یں۔ امید ہے کہ تہذیب الاخلاق کے قدردانوں کی شکایت کا دور اب ختم ہو جائے گا۔ دعا کیجیے کہ اللہ تعالیٰ
سالہ کو بادِ سموم سے محفوظ رکھے۔

مدیر مسئول۔

از۔ امان اللہ خاں خسروانی
پرنسپل اسلامیہ کالج۔ اٹاوہ

سالانہ رپورٹ ۸۳-۱۹۸۲ء اسلامیہ کالج۔ اٹاوہ

جناب صدر، مہمان خصوصی محترم جناب سید حامد صاحب، آنریری منیجر صاحب، ممبران منیجنگ کمیٹی و ممبران اسلامیہ ایجوکیشنل ایسوسی ایشن اٹاوہ، عزیز مہمانان، ممبران اسٹاف اور عزیز طلبا۔

اللہ تعالیٰ کا شکر اور احسان ہے کہ آج ہم اس عظیم الشان ادارے کے چورانوے ویں سالگرہ کا closing function منانے کے لیے اکٹھا ہوئے ہیں۔ یہ بھی ہم سب کے لیے انتہائی مسرت اور شادمانی کا موقع ہے کہ اس جلسہ کے مہمان خصوصی مشہور ماہر تعلیم، مایہ ناز مدبر اور ملک کے نامور منتظم اور ہماری قومی و ملی درسگاہ کے سربراہ جناب محترم سید حامد صاحب ہیں۔ میں اس ادارے کے اساتذہ اور طلباء کی جانب سے جناب والا کا بیحد ممنون و شکر گزار ہوں کہ آپ نے اپنی گوں ناگوں مصروفیات میں سے کچھ وقت اس درسگاہ کے لیے بھی عطا فرمایا اور ہم لوگوں کی ہمت افزائی فرمائی۔

جناب والا! ہماری قومی درسگاہ مسلم یونیورسٹی علی گڑھ سے اس ادارے کا شروع ہی سے بڑا ہی قریبی تعلق رہا ہے۔ اس سلسلہ میں مجھے حضرت اسرار آبادی کا ایک مشہور شعر یاد آتا ہے

کہا کس نے مسلمانوں کا ملجا ہے نہ ماویٰ ہے
خدا رکھے ہمارا بھی علی گڑھ ہے اٹاوہ ہے

حضرات! اس ادارے کی تاریخ نہ صرف بہت پرانی ہے بلکہ اس کا ماضی بھی بڑا درخشاں رہا ہے۔ ۱۸۸۸ء میں ڈاکٹر مولوی بشیر الدین صاحب مرحوم نے ایک معمولی مکتب کی حیثیت سے اس کی ابتدا کی تھی۔ پھر ان کی کوششوں اور عظیم قربانیوں سے یہ چھوٹا سا مکتب پندرہ سال کے عرصہ میں نہ صرف یو پی بلکہ ملک کا ایک منفرد ادارہ بن گیا اور ۱۹۰۴ء میں اسے ہائی اسکول تسلیم کر لیا۔

۴۰ سال بعد ۱۹۴۴ء میں کانپور کے مشہور صنعت کار حافظ محمد صدیق مرحوم و مغفور کے مالی تعاون سے یہ اسکول حافظ محمد صدیق اسلامیہ انٹر کالج بنا دیا گیا۔ اس ادارے نے ملک کے لیے نامور سیاستداں، مایہ ناز ماہر تعلیم، اعلیٰ منتظمین، بلند پایہ شاعر و ادیب اور ہر دل عزیز کھلاڑی پیدا کیے اور ہزارہا ایسے نوجوانوں کو تربیت دی جنھوں نے ملک کی آزادی کی جدّ وجہد اور ملک کے بنانے اور سنوارنے میں اپنا کردار نہایت خلوص و محبت اور جانفشانی سے ادا کیا۔ ان میں ڈاکٹر ذاکر حسین صاحب مرحوم ڈاکٹر سید محمود صاحب مرحوم، ڈاکٹر محمد حسین مکّا مرحوم

ڈاکٹر یوسف حسین خاں مرحوم، مرزا عظیم بیگ چغتائی مرحوم، پروفیسر حبیب الرحمٰن صاحب مرحوم، شیخ نفیس الحسن صاحب مرحوم اور آنجہانی راجہ پرمانند اور بہت سے نام ملک کی سیاسی وادبی وسماجی تاریخ میں جگمگا رہے ہیں

جناب والا! مجھے یہ کہتے ہوئے بھی بڑا فخر محسوس ہو رہا ہے کہ آج بھی ہمارے قومی وملّی ادارے مسلم یونیورسٹی علی گڑھ میں اس ادارے کے سابق طلبا اور اساتذہ بڑی اہم اور قابل تعریف خدمت انجام دے رہے ہیں۔ مثلاً پروفیسر محمد شبیر خاں صدر شعبہ معاشیات پروفیسر فصیح الحسن رضوی شعبۂ کومرس اور جناب اکرام اللہ خاں صاحب پبلک ریلیشن آفیسر ان میں سرفہرست ہیں۔

خدا کا شکر ہے آج بھی یہ ادارہ نہ صرف ضلع اٹاوہ بلکہ پورے صوبہ میں منفرد حیثیت رکھتا ہے اور عوام کے ہر طبقہ میں مقبول ومعروف ہے۔ پچھلے سال اس کی کارکردگی کی رپورٹ آپ کے سامنے پیش کر رہا ہوں

اس وقت اساتذہ کی تعداد کالج میں ۴۵، پرائمری سیکشن میں ۱۹ اور لڑکیوں کے اسکول میں ۱۴ ہے۔ اس وقت طلباء کی تعداد ۱۰۴۲ ہے۔ ان میں انٹرمیجیٹ کلاسز میں فیکلٹی وائز تعداد اس طرح ہے۔

سائنس	۹۹
کامرس	۱۱۴
ایگری کلچر	۹۰
آرٹ	۶۴

ہائی اسکول کلاسز میں ۳۴۱ اور جونیر کلاسز میں ۳۳۱ طلباء ہیں۔ ان کے علاوہ پرائمری سیکشن میں ۵۵۰ اور لڑکیوں کے اسکول میں ....

اس وقت کالج میں ۴۶ اساتذہ، ۴ دا اہلکار اور ۱۷ چوتھے درجے کے ملازم کام کرتے پرائمری سیکشن اور لڑکیوں کے اسکول میں ا[illegible] داستانیاں اعلیٰ تعلیم یافتہ اور تربیت شدہ ہ[illegible]

۱۹۸۲ء میں سالانہ امتحانات کے نتا[illegible] اس طرح تھے۔

انٹرمیجیٹ	۶۱ فیصدی	۱۵	فرسٹ کلا[illegible]
ہائی اسکول	۶۷ "	۹	"
جونیر ہائی اسکول	۶۱ "	۸	"
لڑکیوں کا ہائی اسکول	۱۰۰ فیصدی	۲	فرسٹ کلا[illegible]

۶۔ سکنڈ ڈویژن

لڑکیوں کا جونیر ہائی اسکول

۱۰۰ فی صدی ۸ فرسٹ کلاس ۱۷ سکینا[illegible]

نتائج کو اور بہتر بنانے کے لیے کوششیں جاری ہ[illegible] اور امید ہے اس سال اور بہتر نتائج سامنے آئیں

کوکریکلر ایکٹیویٹیز۔ درس وتدریس

درس وتدریس کے ساتھ کھیل کو[illegible] مباحثے، ادبی اور ثقافتی ایکٹویٹیز، جنرل نالج۔ مختلف ٹیسٹ اور دوسری Activities پر [illegible] زور دیا جاتا ہے۔

ان [illegible] Activities کا انتظام طلبا[illegible] پارلیمنٹ کرتی ہے۔ ملک کے سیاسی ڈھانچے کو سا[illegible] رکھ کر اس ادارے میں پارلیمنٹری سسٹم رائج کیا[illegible] ہے۔ پارلیمنٹ کے دو ایوان (Lower House) ہو[illegible] ہیں۔ Upper House میں کھیلوں کے کپتا[illegible] مختلف سوسائٹیوں اور ایسوسی ایشنس کے صد[illegible] اور سکریٹری ہوتے ہیں۔ ان کی تعداد ۴۶ ہے

اس میں کچھ طلباء کے منتخب کیے ہوئے اور کچھ
اساتذہ کے Nominate کیے ہوئے ممبران ہوتے
ہیں۔

Lower House میں مختلف کلاسوں سے
طلباء کے منتخب کیے ہوئے نمائندے۔ class Reps
representatives۔ ہوتے ہیں، ان کی تعداد ۲۰ ہے
ان دونوں Houses کے مشترکہ اور علیحدہ علیحدہ جلسے
ہوتے ہیں۔ ان جلسوں میں بجٹ پاس ہوتا ہے۔
Boys Fund کو خرچ کرنے کے لیے مختلف سب کمیٹیوں
کے لیے نمائندے چنے جاتے ہیں۔ سال بھر کے لیے Co-
curricular Activities کا لائحہ عمل تیار
کیا جاتا ہے اور طلباء کی فلاح و بہبود کے لیے مختلف
مسائل پر بحث و مباحثہ ہوتا ہے۔ اس طرح اس
پارلیمنٹ کے ذریعہ طلباء میں جمہوری اقدار پیدا کرنے
کی کوشش کی جاتی ہے اور انھیں کالج کے انتظام میں
براہ راست حصہ لینے کا موقع دیا جاتا ہے

طلباء کی پارلیمنٹ کی سب کمیٹی نے جو
سالانہ رپورٹ پیش کی ہے، اس کا خلاصہ آپ حضرات
کے سامنے پیش کر رہا ہوں۔

کھیل کود:

تعلیم کے ساتھ ساتھ کھیل کود میں
بھی ہمارے کالج کا نام سرفہرست رہتا ہے۔ اس سال
ہماری ہاکی ٹیم ضلع میں جونیئر ہاکی ٹورنامنٹ میں
WINNER رہی۔ پانچ طلباء الہ آباد ریجنل ٹیم کے
لیے منتخب ہوئے جنھوں نے صوباتی ٹورنامنٹ آگرہ
میں حصہ لیا۔ کرکٹ کی ٹیم بھی ماتھر کرکٹ ٹورنامنٹ
میں فائنل تک پہنچی۔ یہیں کے۔کے۔ پوسٹ گریجویٹ کالج
کے ساتھ میچ میں ایک اچھے اور جاندار کھیل کا مظاہرہ
کرتے ہوئے RUNNER رہی۔ ان کھیلوں کے علاوہ
دیگر اسپورٹس میں بھی ہمارے طلباء نے حصہ لیا اور
انعامات پائے

Debating Society

کالج کی ڈیبیٹنگ سوسائٹی ہر سال کالج طلباء
کے مابین تقریر و مباحثہ کے مقابلے کراتی ہے۔ اس سوسائٹی
کی سرگرمیوں کے نتیجے میں ہمارے کالج کے طلباء ہر سال
ضلعی سطح اور صوباتی سطح کی DEBATES میں انعام
اور شیلڈ جیت کر لاتے ہیں۔ اس سال ابھی حال میں ضلع
نمائش ڈبیٹ میں Sanjay Saxena نے اول انعام
حاصل کیا۔ فارسٹ ڈپارٹمنٹ کے زیر اہتمام ایک ڈبیٹ
میں ہمارے کالج کے طالب علم بھدوریا درجہ XII نے
تین سو روپے کا نقد انعام اور سرٹیفکیٹ حاصل کیا

ہندی سبھا۔

ہندی سبھا نے بھی ہر سال کی طرح اس
بار بھی کئی تحریری اور تقریری مقابلے طلباء میں کرائے
اور اس کا اختتام رسکھان دوس (Raskhan Diwas)
پر ہوا۔ جو ہندی کے مشہور شاعر 'رسکھان' کی یاد میں
منایا گیا اور اس میں کے۔کے۔ پوسٹ گریجویٹ ڈگری
کالج اٹاوہ کے صدر شعبۂ ہندی پروفیسر ایل ایل
ورما بحیثیت چیف گیسٹ تشریف لائے۔

بزم ادب

بزم ادب بھی طلباء میں ایک ACTIVE
انجمن ہے جو سال میں کئی بار مختلف جلسوں، تحریری
و تقریری مقابلوں کا اہتمام کرتی ہے۔ ان ادبی سرگرمیوں
کا نقطۂ عروج کل ۱۹ فروری کی شام کو صوبائی سطح پر

ہونے والا ایک ادبی سمپوزیم تھا جو حضرت جوش ملیح آبادی
کی یاد میں کیا گیا۔ اِس ادبی سمپوزیم کے مہمان خصوصی
جناب پروفیسر خواجہ شمیم احمد صاحب تھے۔ سمپوزیم
میں کئی باہر کی ٹیموں نے حصہ لیا۔ اِسلامیہ کالج اٹاوہ
کی ٹیم مقالہ خوانی اور نظم خوانی میں اوّل آئی۔ لیکن قاعدہ
کے مطابق اے۔ ایم۔ خواجہ میموریل شیلڈ مشترکہ طور
پر منٹو سرکل ہائی اِسکول مسلم یونیورسٹی علی گڑھ اور
اِسلامیہ انٹر کالج فیروز آباد کو دی گئی جو دوئم درجہ
پر قرار دی گئیں۔

History & Civics Assosiation

اِس ایسوسی ایشن کے زیرِ اہتمام بھی ہر سال
کئی مفید کام انجام دیے جاتے ہیں جن میں بہت اہم
اور خاص ظفر میموریل کوئیز ٹورنامنٹ ہے۔ جنرل
نالج کے اِس کوئیز ٹورنامنٹ میں ضلع کے اِسکولوں
اور کالجوں کی ٹیمیں حصّہ لیتی ہیں۔ اِس حصہ میں ہمارے
کالج کی ٹیم WINNER رہی۔ لیکن قاعدہ کے
مطابق شیلڈ RUNNER ٹیم گورنمنٹ انٹر
کالج اٹاوہ کو دی گئی

یونیسکو کلب:۔ یہ کلب بچّوں میں بین الاقوامی
بھائی چارگی اور باہمی اخوت کا جذبہ بیدار کرنے کے
لیے سرگرم ہے۔ اِس کلب کا U.S.O اور Unisco سے
الحاق بھی ہے۔

یہ کلب طلباء میں جنرل نالج بڑھانے کے
لیے جنرل نالج ٹیسٹ کا اہتمام بھی کرتا ہے۔ طلباء
U.S.O. General knowledge. Test
میں ہر سال حصہ لیتے ہیں اور کامیابی حاصل کرتے
ہیں۔ ایک طالب علم سدھیر شکلا نے آل انڈیا جنرل
نالج ٹیسٹ (جو بھوپال میں ہوا تھا) میں چوتھی پوزیشن
حاصل کی۔

سوسائٹی آف اسلامک اسٹڈیز۔

یہ سوسائٹی طلباء میں دینی جذبات کے
فروغ کے لیے کام کرتی ہے۔ سیرت رسول پاکؐ کے
سلسلہ میں انعامی تقریری و تحریری مقابلے کراتی ہے
اور دینی جلسوں کا انعقاد بھی عمل میں آتا ہے۔ اِس
سوسائٹی کے زیرِ اہتمام ۸ فروری کی شام ایک جلسہ
سیرت النبی منعقد ہوا۔ جس کے مہمان خصوصی مسلم یونیورسٹی
علی گڑھ کے پروفیسر مولانا تقی امینی صاحب تھے۔ جن
کی بصیرت افروز تقریر سننے کے لیے اساتذہ، طلباء
اور شہر کے باذوق حضرات بڑی تعداد میں موجود تھے۔

Other Associations

اِن ایسوسی ایشنز اور Societies کے
علاوہ انگلش ایسوسی ایشن، سائنس ایسوسی ایشن
ایگریکلچر ایسوسی ایشن، کامرس ایسوسی ایشن،
جغرافیہ اور معاشیات ایسوسی ایشن اور بال سبھا
بھی سال بھر اپنے اپنے دائرۂ کار میں مفید کام
انجام دیتی رہتی ہیں۔ جن سے طلبہ کی فکر و نظر کی
تربیت ہوتی ہے۔ ہر ہفتہ سنیچر کو آخری دو
PERIOD اِن تمام سوسائٹیوں اور
انجمن کے جلسوں اور سمپوزیم کے لیے وقف کر دیے
جاتے ہیں۔ جن میں کالج کے طلباء بڑے ذوق
و شوق سے حصہ لیتے ہیں۔

Parent Teachers Association

کالج میں کئی سال سے PTA سرگرم
عمل ہے۔ ہر سال طلبا کو انعامات اور غریب طلباء کو

مالی امداد دینے کے علاوہ پچھلے سال سے ایک اچھے استاد کو P.T.A. Award بھی دینے کا فیصلہ کیا گیا ہے۔ اس سال جناب جیسوال صاحب اسپیشل سیشن جج اٹاوہ کی صدارت میں ایک سب کمیٹی بنائی گئی تھی اس سب کمیٹی نے اساتذہ کے مختلف کاموں کا جائزہ لینے کے بعد فیصلہ کیا ہے کہ اس سال یہ ایوارڈ ہمارے ہندی کے استاد شری سدھ گوپال چوہان صاحب کو دیا جائے۔ ایک تعریفی سند کے ساتھ مبلغ ۲۵۰ روپیہ نقد اس ایوارڈ کے تحت چوہان صاحب کو پیش کیے جائیں گے۔ سال گذشتہ جب یہ ایوارڈ شروع کیا گیا تھا تو یہ سردار احمد (علیگ) کو دیا گیا تھا۔ P.T.A اور بھی مفید کام انجام دے رہی ہے۔ پچھلے سال ہمارے باغ کا فوارہ P.T.A کا ہی بنوایا ہوا ہے۔ اس سال کالج ہال کے لیے ایک نیا دروازہ P.T.A نے بنوایا ہے اور فوارہ، باغ کے دروازوں، کالج کے Gates پھاٹک وغیرہ پر رنگ و روغن کا کام بھی P.T.A نے ہی کیا ہے۔ ان کاموں کا مقصد صرف مالی امداد کی بات نہیں ہے۔ بلکہ ان کا مقصد یہ ہے کہ کالج کا رشتہ سماج سے مضبوط ہو اور طلبار کے والدین کو کالج کے انتظام میں دلچسپی پیدا ہو۔ اس سلسلہ میں مجھے بڑی مسرت ہے کہ کالج کے ایک سابق طالب علم (Old Boy) اور P.T.A کے جوائنٹ سکریٹری جناب ثمر محمد خاں کی کوششوں کا بڑا دخل ہے۔ موصوف بڑی جانفشانی اور خلوص سے P.T.A کے کاموں میں حصہ لیتے ہیں۔

Educational Projects

کالج کی ایک اور اہم خصوصیت اس کے Education Project ہیں۔ ان پروجیکٹس کو نہ صرف حکومت اتر پردیش بلکہ حکومت ہند اور Unesco نے قابل قدر قرار دیا ہے۔ ۱۹۸۰ء میں صوبہ کی حکومت سے ہمارے ایک پروجیکٹ Increase General knowledge کو پانچ ہزار کا عطیہ مل چکا ہے۔ Unesco کی طرف سے کتابوں اور رسالوں کی شکل میں ہر سال امداد ملتی رہتی ہے اور پچھلے سال Unesco کی طرف برمنگھم ... Vice chairman کے language cabe مسٹر سنی ہم نے تین ہفتے کے لیے کالج میں تشریف لائے تھے اور ہمارے اساتذہ اور طلبار کو انگریزی کی لیاقت بڑھانے میں مدد فرمائی تھی۔ آپ کو یہ جان کر بھی خوشی ہوگی کہ U.S.O کی بین الاقوامی کانفرنس میں جو ستمبر ۱۹۸۳ء میں صوفیہ (بلغاریہ) میں ہونے والی ہے مجھے مدعو کیا گیا ہے۔ دعوت نامہ کا Initial Letter آ گیا ہے۔ تفصیلی دعوت نامہ کا انتظار ہے۔ پچھلے سال U.S.O کی طرف سے صوبہ اتر پردیش سے ہمارے کالج کے لیکچرار جناب فضل الدین صاحب ڈائرکٹر یونسکو کلب (Unisco club) کو ٹریننگ کے لیے مدراس بلایا گیا تھا۔ اس سال کالج کے ایک سائنس ٹیچر جناب برہم پرکاش گپتا کو ...pmental Science کے سیمینار میں حصہ لینے کے لیے مدعو کیا گیا تھا۔ موصوف پچھلے ہفتے ہی دہلی سے اس سیمینار میں شرکت کر کے واپس آئے ہیں۔

ان تمام کارکردگیوں اور طلبار کی سیرت و کردار کی تشکیل و تعمیر کے مقدس کاموں

ساتھ ساتھ ان ضروریات کا ذکر بھی اشارتاً ضروری
سمجھتا ہوں جن کی طرف لال فیتہ شاہی کے باعث ابھی
کوئی توجہ نہیں دی جا رہی ہے۔ دو سال سے
ہ میں عربی کے ایک استاد کی جگہ خالی ہے۔ کیوں کہ
ن جگہ پر کام کرنے والے ایک استاد سعودی عرب
چکے ہیں، پھر بھی محکمہ تعلیم کو بارہا یاد دہانی کرانے پر
نئے استاد کی تقرری کی اجازت نہیں مل رہی
نتیجہ یہ ہے کہ عربی کی تعلیم دو سال سے بند ہے
افسوس ہے اور شکایت بھی کہ اقلیتی ادارہ ہونے
باوجود ہمیں عربی کی تعلیم کے لیے ایک استاد رکھنے
اجازت اور اس کا اختیار نہیں ہے۔

یہی حال Physical Education
کا بھی ہے۔ یہ مضمون اب ہائی اسکول تک لازمی قرار
دیا گیا ہے۔ لیکن اس کے لیے ہمارے پاس کوئی استاد
نہیں ہے۔ صرف ایک N.D.S. Instructor
حکومت کی طرف سے دیے گئے ہیں جو اتنے بڑے کالج
کے لیے ناکافی ہیں۔ محکمہ کو بار بار لکھا جاتا ہے لیکن کوئی
شنوائی نہیں ہوتی۔

درجات کی کمی، کمروں کا آج کی ضرورتوں کے
مطابق بڑا نہ ہونا اور لائبریری کی علیحدہ عمارت کی عدم
موجودگی کی بھی ہمارے تعمیری کاموں میں رکاوٹ ڈالتی
میں اس ملی و قومی کار خیر کی طرف اہل خیر اور
صاحب حیثیت کی توجہ کا متمنی ہوں۔

آخر میں ایک بار پھر اپنے محترم مہمان خصوصی عالی
جناب سید حامد صاحب کی تشریف آوری کے لیے تہہ دل
سے ممنون ہوں کیوں کہ اُن کی ذات گرامی علم و عمل کا جیتا
جاگتا پیکر ہے جس کے دائمی اثرات ہمارے ادارہ کے
بامقصد کاموں اور ہماری Missionary Spirit
کو تقویت دیں گے۔ اور ہمارے حوصلے نئی قوت حاصل
کر سکیں گے۔

آج کے اس جلسہ میں شرکت کرنے والے اور
اپنا قیمتی وقت دینے والے تمام حاضرین کا بھی شکر گزار
ہوں، ان کے تعاون کے لیے احسان مند ہوں۔

میں اپنے بزرگ اور صدر اسلامیہ ایجوکیشنل
ایسوسی ایشن، عالی جناب الحاج عبیدالرحمٰن خاں شروانی
صاحب کا بھی ممنون کرم ہوں جن کی تقدیس، جن کے
اخلاص اور جن کے دردمندی و قومی کے سایہ میں ہمارا یہ کاروانِ
علم و فن آگے بڑھ رہا ہے۔ میں اپنے محترم منیجر جناب [illegible]
صاحب کا بھی شکر گزار ہوں جن کی ہمہ وقت رہنمائی اور
ادارہ کی ترقی کے لیے شب و روز فکر و جدوجہد ہمارے
لیے انتہائی اطمینان اور مسرت کی بات ہے۔

میں ممبران منیجنگ کمیٹی اور ممبران اسلامیہ
ایجوکیشنل ایسوسی ایشن کا بھی ممنون ہوں جن کی خصوصی
توجہ اور ہمدردی ہمارے نیک مقاصد کے فروغ میں مددگار
ثابت ہوتی ہے۔

میں محکمہ تعلیم کی اہم شخصیت اور ضلع انسپکٹر آف
اسکولس محترم جناب ہر پرشاد چترویدی صاحب کا
شکریہ ادا کرنا بھی اپنا فرض سمجھتا ہوں جن کے علم اور
جن کی خصوصی دلچسپی اور عنایات ہمارے لیے لائق قدر و
منزلت ہیں۔

آخر میں میں تمام مہمانان اور بچوں کے سرپرستوں کی
تشریف آوری کے لیے بھی ممنون اور شکر گزار ہوں،
جنھوں نے اس جلسہ میں تشریف لاکر حسب معمول اپنا
تعاون عطا کیا۔

حکیم محمد حسین خاں
رام پور۔

حالی سرسیّد اور رام پور

مادر ہند زرخیز بھی رہی ہے اور مردم خیز بھی۔ اس نے ہر دور میں رشی، منی، صوفی سادھو اور سنت پیدا کیے۔ اوتاروں کا جنم بھی ہوتا رہا ہے۔ جنھوں نے علوم و فنون کی دنیا میں ملک و ملت کا نام روشن کیا ہے۔ اردو زبان کو بھی ایک اوتار کی جنم داتا ہونے کا فخر حاصل ہے جس کو خواجہ الطاف حسین حالیؔ کے نام سے جانا جاتا ہے۔

گاندھی جی حالی کی زبان اور بیان کے شیدائی تھے۔ وہ حالی کی مناجات بیوہ کو ہندوستانی زبان کی نمائندہ کتاب سمجھا کرتے تھے تو حالی کے مربّی و محسن سرسیّد اپنی فرمائش پر لکھی ہوئی مسدس کو اپنے لیے نجات، تصور کرتے تھے۔ چنانچہ وہ اپنے تبصرہ میں لکھتے ہیں۔

بیشک میں اس نظم کا محرک ہوں اور اس کو میں اُن اعمال حسنہ میں سے سمجھتا ہوں کہ جب خدا مجھ سے پوچھے گا کہ تو دنیا سے کیا لایا تو میں کہوں گا حالی سے مسدس حالی لکھوا لایا ہوں اور کچھ نہیں۔

یہ دراصل مسلم قوم کی تاریخ بدحالی و بداعمالی کی ایک انقلاب آفریں نظم ہے۔

حالی کی نیک نفسی، انسان دوستی، سیکولر کردار اور حب الوطنی کے تو سب ہی معترف ہیں لیکن جسٹس محمود جنھوں نے حالی کو برت کر دیکھا تھا، وہ سب سے الگ ہی بات کہتے ہیں، کہ اگر خدا کسی انسان کو سجدہ کرنے کا حکم دیتا تو میں حالیؔ کو سجدہ کرتا۔

علامہ اقبالؒ فرماتے ہیں ؎

مشہور زمانے میں ہے نام حالی
معمور مئے حق سے ہے جام حالی
میں کشور شعر کا نبی ہوں اقبال
نازل ہے مرے لب پہ کلام حالی

حالی کے عقیدت مندوں کا دائرہ تو بہت وسیع ہے اور ان کی شخصیت و خدمات پر کافی لکھا جا چکا ہے۔ لیکن ابھی تک حالی کے اہل رامپور اور شہر رامپور سے تعلق پر روشنی نہیں ڈالی جا سکی ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ جب ۱۹۷۱ء میں شمالی ہندوستان میں روہیلہ حکومت قائم ہوئی تو وزارت خارجہ اور پولیٹکل رکارڈس آفس وغیرہ راجہ کنور سین کا ئستھ کے سپرد کر دیے گئے اور آخر تک یعنی یکم جولائی ۱۹۴۹ء تک یہ اہم محکمہ انھیں کے خاندان میں چلتا رہا۔ علاوہ نوابین اور حکام کے کوئی شخص اس خفیہ خزانہ سے باخبر نہ ہو سکا اور افسوس یہ ہے کہ آج بھی اس

موضوع کا حق ادا کرنے کے مواقع حاصل نہیں ہیں۔

جب ۱۹۳۷ء میں پہلی مرتبہ ریاست رامپور کی طرف سے منتخب مکاتیب غالب شائع ہوئے تو اہلِ علم کو احساس ہوا کہ اس محکمہ میں کچھ اہم علمی و سیاسی شخصیتوں کی دستاویزات محفوظ ہیں۔ لیکن ریاستی عہد میں یہ کام نہ ہو سکا۔

حالی نوابین رامپور کو بچپن ہی سے جانتے تھے مگر جب ۱۸۵۴ء کو نواب یوسف علی خاں نواب ہوئے تو حالی نے ان کی شان میں ایک فارسی قصیدہ اور ایک مالی امداد کی درخواست روانہ کی۔ لیکن کچھ سیاسی اسباب کی بنا پر نواب صاحب کی طرف سے وئی کارروائی نہیں ہوئی۔ جب ۲۱ اپریل ۱۸۶۹ء کو واب یوسف علی خاں کا انتقال ہو گیا اور نواب کلب علی ماں تخت نشین ہوئے تو حالی نے ۳۴ اشعار کا عربی صیدہ اور ایک مالی امداد کی فارسی درخواست غالب ے واسطے سے روانہ کی۔ اس میں غالب نے حالی کے ساتھ انصاف نہیں کیا۔ تعارفی خط میں ایسی باتیں لکھی ہیں جس سے مقصد سائل مجروح ہوتا ہے۔ ادھر غالب ، نواب کلب علی خاں کے ساتھ کچھ ایسی غیر شائستہ کات کی تھیں جس کی وجہ سے نواب صاحب غالب کو لیا اچھا شاعر اور بُرا آدمی خیال کرنے لگے تھے۔ کچھ ہی مد بعد حالی اور نواب کلب علی خاں میں گہری دوستی وگئی اور خط و کتابت تحفہ و تحائف کا سلسلہ شروع ہو گیا۔ اور سر سید احمد خاں و نواب کلب علی خاں و الی قوم کی اصلاح اور تعمیر نو میں اور علمی ترقی کی مشترکہ دوجہد میں لگ گئے۔ اپریل ۱۸۵۸ء سے ۱۲ مئی ۱۸۶۳ء تک سر سید مراد آباد کے صدر الصدور رہے

اسی دوران قومی تعلیم کا پروگرام بنایا گیا جس پر ابتدائی تجربات کے بعد ۲۴ مئی ۱۸۷۵ء میں مدرسۃ العلوم کی شکل میں عملدرآمد کیا گیا۔ نواب کلب علی خاں کو مدرسہ کی رسم افتتاح میں شریک ہونا تھا مگر کچھ ممبران سے اختلاف کی وجہ سے علی گڑھ نہ جا سکے۔ سر سید نے اپنی افتتاحی تقریر میں فرمایا۔ "ہم احسانمندی اور فخر کے ساتھ نواب محمد کلب علی خاں بہادر والی رامپور کا نام بیان کرتے ہیں جن کو کمیٹی کے پیٹرن ہونے کی حیثیت سے ہماری کوشش کے ساتھ گہرا تعلق ہے اور جنہوں نے بڑی دریا دلی سے اپنی فیاضی ظاہر فرمائی ہے"

سر سید اور نواب کلب علی خاں میں ہونے والی ملاقاتیں اور مراسلات سر سید حالی اور دیگر تحریک علی گڑھ سے وابستہ افراد کا انفرادی و اجتماعی طور پر رامپور بار بار آنا اور مختلف امور میں نواب کلب علی خاں اور دیگر رسار رامپور سے مشورہ کرنا بڑی اہمیت رکھتا ہے، دراصل علی گڑھ تحریک اور رامپور تحقیق کا مستقل موضوع ہے۔ بقول سر سید مدرسۃ العلوم کے لیے علی گڑھ میں زمین کا انتخاب، حصول اور ابتدائی تعمیرات کے لیے سرمایہ فراہم کرنا نواب کلب علی خاں کا رہین منت ہے۔ کچھ تعلیمی امور میں سر سید سے حالی اور نواب کلب علی خاں کو اختلاف بھی تھا۔ نواب صاحب عوامی فلاح کے ساتھ اسلامیات کو عربی زبان میں مسلمانوں کے لیے ضروری قرار دیتے تھے۔ چنانچہ وہ ۲۳ مئی ۱۸۷۴ء کے ایک فرمان بنام وابستگان مدرسۃ العلوم مسلمانان علی گڑھ میں واضح طور پر اپنے خیالات کا اظہار فرماتے ہیں۔

۱ اصل خط فارسی میں ہے۔ زبان نہایت بلیغ

فصیح ہے جس کا اردو ترجمہ یہ ہے ۔]
" ابتدا کرتا ہوں اللہ کے نام سے جو
رحمٰن و رحیم ہے ۔
میں اللہ کا شکر گزار بندوں کی طرح اس
کی تعریف و توصیف بیان کرتا ہوں اور محمد صلعم و ان
کے آل و اصحاب سب پر درود و سلام بھیجتا ہوں ۔

مہر
خادم حضرت خیر البشر، خاکسار حرمین و
شریفین کلب علی خاں بہادر فرزند دل پذیر
دولت انگلیشیہ ۱۲۹۰ھ

کیا ساعت سعید ہے کہ ہمارے مہربان
دوست خان صاحب سید احمد خان بہادر سی۔ ایس
آئی جج مقدمات عدالت خفیہ بنارس تشریف لائے
سید صاحب عام مخلوق کی تعلیم کے سلسلہ میں ہمیشہ
کوشش کرتے رہتے ہیں اور اب انھوں نے ایک
مدرسہ بنام "مدرسۃ الحمیدیہ" شہر علی گڑھ میں جس
کو کول سمجی کہا جاتا ہے، جاری کیا ہے اور اس کے
انتظام کے لیے مجلس شوریٰ جس کو اصطلاح ہند
میں کمیٹی کہا جاتا ہے، مقرر فرمائی ہے اور اب ارباب
کمیٹی ہماری خدمت میں شفقت و مہربانی، اعانت
و امداد کے لیے درخواست گزار ہے یہ اللہ تعالیٰ کا
بڑا فضل و کرم ہے کہ ہم ہمیشہ ہمیشہ جی و جان سے رفاہِ
عام اصلاح جمہور اور کار خیر کے کاموں میں حصہ لیتے
رہتے ہیں۔ خاص طور پر ہمیں اہل اسلام، خوش عقیدہ
مسلمان، غلامان حلقہ بگوش خیر الانام علیہ افضل
الصلوٰۃ والسلام کا مفاد عزیز ہے۔ لہذا ہم ارباب
کمیٹی کی درخواست کو منظور کرتے ہیں اور سلطنت کے
گھوڑے میدان سخاوت میں چھوڑتے ہیں وہ اس طرح
کہ دس ہزار روپیہ نقد بہ سلسلہ تعمیر عمارت اور سنو
روپیہ ماہوار ہمیشہ اس رقم سے ملا کرے گا جو ہم
نے حج بیت اللہ کو جاتے وقت کار خیر کے لیے وقف
کر دی ہے اور حکومت ہند کے پاس ہے۔ اس
سلسلہ میں ہم نے صاحب ریجنٹ بہادر کو لکھ دیا ہے
کہ یہ رقم ہمیشہ ہمیشہ کے لیے مقرر کی گئی ہے۔ پس
ارباب کمیٹی کو چاہیے کہ اس رقم کو ترقی و تعلیم علوم
دینیہ مثلاً فقہ، تفسیر، حدیث بزبان عربی مسلک
ارباب حق اہل سنت والجماعت کے مطابق خرچ کرتے
رہیں اور اگر خدا نخواستہ تعلیم علوم دین متین کا
سلسلہ موقوف ہو گیا تو یہ ماہوار عطیہ بند کیا جا سکتا
ہے۔

مجھے امید ہے کہ ارباب کمیٹی میری اس تحریر کو
بطور سند اپنے پاس رکھیں گے اور خیر خواہی و دعائے
دولت اقبال میں مشغول رہیں گے اور ہمیشہ بدعتوں
کو ختم کرنے ظلمتوں کو مٹانے خلاف شرع نقوش
مٹانے پر کمر بستہ رہیں گے اور روز و شب رضا جوئی
خدا و حبیب خدا ("اگر سو جی جان ہوں تو کر دوں
میں ان پر فدا") حاصل کرنے میں سعی بلیغ کرتے
رہیں گے۔ در اصل وہی ہے کاسۂ سر، ہے جس میں
یہ صدائے حق ہو۔

اور پھر میں صلوٰۃ و سلام بھیجتا ہوں ختم المرسلین
پر ۔

صدا رہے نام اللہ کا جو رب العالمین ہے

مکتوبہ
۲۴ مئی ۱۸۷۴ء

حالی کو یہ معلوم تھا کہ تحریک سرسید میں سرکار رواں کلب علی خاں ہیں اور وہ علی گڑھ تشریف لا رہے ہیں چنانچہ حالی نے اس جلسۂ افتتاح میں نواب صاحب کی شان میں پڑھنے کے لیے ایک اہم اردو قصیدہ لکھا جس کے ۲۹ اشعار ان کے دیوان میں موجود ہیں اور یہ نوٹ ہے ۔

"میں نے یہ قصیدہ نواب ممدوح کی شان میں اس وقت لکھا تھا جب وہ مدرستہ العلوم کا پیٹرن ہونا منظور کر چکے تھے۔ دس ہزار نقد اور بارہ سو کی جاگیر مدرسہ کو دینا منظور کر لی تھی۔ نواب کلب علی خاں کی علمی دلچسپی کے بارے میں شمس الاخبار مدراس ۲۵ مارچ ۱۸۶۶ء کے شمارے میں تحریر کرتا ہے۔

نواب کلب علی خاں والی رامپور نے .... اپنی رعایا کے لڑکے اور لڑکیوں کی تعلیم و تدریس کے لیے متعدد مدارس قائم کیے ہیں اور پڑھائی کے قوانین مقرر کر دیے ہیں۔

(۱) ریاست کا جو لڑکا یا لڑکی مدرسہ میں داخل ہوگا بالفعل اس کو منجانب سرکار ماہانہ روپیہ ملا کرے گا اور پھر ہر ایک کی استعداد و لیاقت کے موافق مشاہرہ میں اضافہ ہوتا جائے گا۔

عورتوں کی تعلیم کے واسطے اور علم و ہنر سیکھنے کی جانب نواب صاحب نے بہت توجہ دی ہے۔ اور تعلیم یافتہ استانیاں مقرر کی ہیں مگر ان کی تنخواہ بہت کم ہے۔ اس قدر کم تنخواہ پر علم عربی اردو اور سنسکرت پڑھانے والی عورتیں بہت کم ملیں گی دیگر ممالک غیر کے اخبارات اور اہل علم نے کلب علی خاں کی علم دوستی صنعتوں سے دلچسپی کی توصیف کی ہے۔

نواب کلب علی خاں، حالی اور سرسید بڑی حد تک یکساں فکر و عمل کے انسان تھے۔ اس وجہ سے تینوں میں گہری دوستی تھی جس کا اظہار ان حضرات کی خط و کتابت سے بخوبی ہوتا ہے۔ ۱۸۷۷ء میں دہلی دربار ہونے والا تھا جس میں نواب کلب علی خاں سرسید اور حالی بھی مدعو تھے۔ اس موقع پر حالی نے نواب کلب علی خاں کی شان میں ۸۰ اشعار کا ایک طویل فارسی قصیدہ لکھا۔ جس کے بارے میں خود رقم طراز ہیں۔ اس قصیدہ کی تمہید اس وقت لکھی گئی تھی جب کہ شاعرانہ خیالات میں پہلے پہل انقلاب پیدا ہوا تھا اور مبالغہ سے نفرت ہونے لگی تھی۔ انہیں دنوں پہلا دربار قیصری منعقد ہونے والا تھا جو ۱۸۷۷ء میں بمقام دہلی وقوع میں آیا۔ چونکہ نواب صاحب کی شرکت کی قوی امید تھی اور انھوں نے سرسید کی امداد میں سب سے پہلے سبقت کی تھی اور ان سے فی الجملہ تعارف تھا اس وجہ سے انہیں کو اس قصیدہ کا ممدوح قرار دیا اگرچہ وہ علالت کی وجہ سے شریک دربار نہ ہو سکے اس وجہ سے یہ قصیدہ ان کی خدمت میں بوجہ دلی خواہش پیش نہ ہو سکا۔

اس قصیدہ کا ایک شعر ہے ؎

ورود حضرت نواب در دہلی بداں ماند
کہ آب رفتہ سوئے آبداں باز آید از دریا

اس شعر پر حالی نے نوٹ لکھا ہے۔

" یہ اشارہ ہے اس زمانہ کی طرف جبکہ نواب ممدوح کلب علی خاں کے والد ماجد نواب یوسف علی خاں دہلی میں بہ حالت طالب علمی مقیم تھے اور نواب ممدوح کلب علی خاں صغر سنی میں ان کے ساتھ رہتے تھے۔ یہ حالی کی محبت ملّی اور حب الوطنی تھی کہ

بجائے انگریز حکمراں کے جس کے اعزاز میں دربار منعقد
ہو رہا تھا اور جس سے انعام و اکرام کی زیادہ توقع تھی
ایک معمولی اپنے ہم وطن رئیس کی شان میں قصیدہ لکھا -
تقریباً بیس سال تک حالی اور کلب علی خاں میں مراسلت
رہی اور یگانگت باقی رہی - ۲۴ مارچ ۱۸۸۷ء کو
نواب کلب علی خاں کا انتقال ہوگیا - اس دوران جو
مراسم حالی اور اہل رامپور کے درمیان پیدا ہوگئے تھے
وہ برابر بڑھتے رہے - لیکن سرکاری حیثیت مدارالمہام
رامپور جنرل عظیم الدین خاں کی وجہ سے سرسید اور شبلی
کی زیادہ رہی اور ریاست نے ان دونوں حضرات کی
کافی مالی مدد کی -

۲۷ فروری ۱۸۸۹ء کو نواب سرسید حامد علی خاں
والی رامپور ہوئے اور نواب صاحب نے دیگر خیرخواہان
ریاست اور اہل علم حضرات کے ساتھ حالی کو بھی رامپور
آنے کی دعوت دی - حالی فوری تو نہیں آسکے - لیکن
انہوں نے ۲۰ اشعار کا فارسی قطعہ تہنیت پیش کیا -
جس کا ایک شعر ہے

مہرباں بر خود گمانش کرد دام
تا چہ تعبیر آرد ایں فرخندہ خواب

حالی نے اس کی شان نزول یہ تحریر کی ہے
"مسند نشینی کے چند سال بعد نواب ممدوح نے
خاکسار کو رامپور یاد فرمایا تھا - اس وقت اول یہ قطعہ
بھیجا تھا - اس کے بعد راقم خود گیا -"

عہد حامدی میں حالی کے تعلقات رامپور
سے بہت وسیع ہوگئے - آنا جانا بھی زیادہ ہوگیا - اس کی
وجہ یہ تھی کہ حالی کے کچھ قریبی عزیز دار رامپور میں ملازم
تھے - دوست احباب عقیدتمندوں اور شاگردوں کا بھی کافی
حلقہ تھا - خاص طور پر حالی کے شاگرد مولوی فرخ حسن کی تعلیم
نواب مصطفیٰ خاں شیفتہ کے بچوں کے ساتھ جہانگیر آباد
میں حالی کے ہاتھوں ہوئی تھی - اس وقت ریاست میں
نواب حامد علی خاں کے اتالیق و استاد تھے - خاندان شیوخ
میں مولانا محمد علی و شوکت علی سے بھی حالی کی مراسلت تھی
اس وجہ سے خطوط حالی میں رامپور اور اہل رامپور کا ذکر
کثرت سے ملتا ہے اور وہ اہل رامپور کے ہر دکھ میں رنجیدہ
اور خوشی میں خوش نظر آتے ہیں - ۱۵ اگست ۱۸۹۸ء کو
خواجہ تصدق حسین صاحب کو لکھتے ہیں -

رامپور کی امداد کا حال تمہاری تحریر نیز پیسہ اخبار سے
مفصل معلوم ہوا - میں نہیں جانتا کہ یہ سید احمد کی روح کا
تصرف ہے یا مسلمانوں کے دن پھرنے والے ہیں کہ ایک مسلمان
رئیس با اختیار کو کالج کے ساتھ اس قدر ہمدردی پیدا ہوئی
ہے - خدا تعالیٰ حکیم اجمل خاں اور نواب محمد اسحاق خاں مدار
المہام رامپور کو جزائے خیر دے یہ سب ان کی کوشش کا نتیجہ
ہے -" ایک اور خط میں لکھتے ہیں -

" رامپور سے خطوط آتے ہیں - ان میں وبائی ہوا کی
شکایت ہے - خدا اپنے بندوں پر رحم کرے - رامپور کے علاقہ
ہنوائی میں تار نہیں جاتا اس لیے پوسٹ آفس نے تار بھیجنے
سے انکار کر دیا - عجب تشویش میں جان گرفتار ہے - کالج
کام کاج سب بند ہیں -"

۲۵ دسمبر ۱۸۹۶ء کو حالی رامپور تشریف لائے
اور کتب خانہ رامپور کی معائنہ بک پر ایک تفصیلی نوٹ تحریر
کیا اور تجاویز پیش کیں - حالی آخری مرتبہ رامپور میں محمڈن
ایجوکیشنل کانفرنس کے اجلاس منعقدہ دسمبر ۱۹۰۰ء میں
شرکت کی غرض سے تشریف لائے - یہ اجلاس رامپور کی
تاریخ کا اہم واقعہ تھا - اس کی تیاری برسوں سے ہورہی

تھی۔ نواب محسن الملک، نواب وقار الملک، نواب فتح نواز جنگ، علامہ شبلی، مولوی نذیر احمدؒ، مولوی ذکاء اللہ، علی برادران، سر آغا خاں، سر رضا علی صاحبزادہ آفتاب احمد خاں، مولوی وحید الدین سلیم وغیرہ مشاہیر ملک وملت رامپور میں شریک اجلاس ہوئے۔

حالی نے اس جلسہ کے لیے خاص طور پر ایک ۵۲ اشعار کی نظم لکھی اور "شکریہ والیٔ رامپور" اس کا نام رکھا۔ گویا کہ اہل رامپور کے واسطے سے ملک وملت کو حالی کا یہ پیغام تھا۔

اس کے چند اشعار یہ ہیں۔

صاحبو سمجھو نہ اس جلسہ کو ہرگز سرسری
ہیں مرادیں اور امیدیں کوٹ کوٹ اس میں بھری
اب تک اس جھاڑ کی سینکوں کا گو بندھن نہ تھا
جہل سے لڑنے کو تھی اک فوج لیکن بے سری
اہل ملک وجاہ جو ہیں قوم کی امید گاہ
سب نظر آتے تھے ہمدردی کی تہمت سے بری
جان و دل ہز ہائنس حامد علی خاں پر نثار
جو ہوا ہے اک متاع فخر کا مشتری
آج سے وہ سب مسلمانوں کا سرتاج ہے
دے رہی ہے یہ شہادت قوم کی مجلس بڑی
جان لی ہے قوم کی اس نے اگر درماندگی
مان لی ہے قوم نے بھی دل سے اس کی سروری

حالی کی یہ طویل اخلاقی نظم ہے، جس کا ایک بند اس طرح شروع ہوتا ہے۔

"یاد ہے اے رامپور اپنا تجھے عہد کہن"

حالی کے بڑھاپے کا سب سے بڑا واقعہ مسجد کانپور کا قتل عام تھا۔ جہاں انگریزوں نے نہتے ہندوستانیوں پر فائرنگ کی اس موقع پر حالی نے ملک وملت کو اپنا آخری پیغام قومی یکجہتی اور ہندو مسلم اتحاد سے متعلق مولانا محمد علی جوہر رامپوری کو دیا جو انھوں نے اپنے اخبار ہمدرد ۱۸ اکتوبر ۱۹۱۳ء میں شائع کیا۔ وہ پیغام یہ ہے۔

صدشکر وطن سے کوچ نفرت نے کیا
گھر اہل وطن کے دل میں الفت نے کیا
تقریروں سے ہو سکا نہ تحریروں سے
جو کار نمایاں کہ مصیبت نے کیا

حالی کا انتقال تو ۱۳ دسمبر ۱۹۱۴ء کو ہوا لیکن اس رباعی کے بعد وہ کوئی شعر نہ کہہ سکے۔

یہ بات پورے اعتماد سے کہی جا سکتی ہے کہ حالی نے جس خوش عقیدگی کا اظہار نظم ونثر اردو و فارسی اور عربی میں اہل رامپور، شہر رامپور اور شہریار رامپور سے کیا ہے، وہ کسی کے حصے میں نہیں آیا۔

علی گڑھ مسلم یونیورسٹی علی گڑھ

اشتہار نمبر ۸۴-۸۳/۱

مندرجہ ذیل اسامیوں کے لیے مقررہ فارموں پر درخواستیں مطلوب ہیں۔

پروفیسرس

شرح تنخواہ - ۱۵۰۰ - ۶۰ - ۱۸۰۰ - ۲۰۰۰ - ۲/۱۲۵ - ۲۵۰۰ روپیہ اور دیگر الاؤنس

۱۔ پروفیسر آف فزکس۔ ڈپارٹمنٹ آف فزکس

۲۔ پروفیسر آف پالیٹکل سائنس۔ ڈپارٹمنٹ آف پالیٹکل سائنس

۳۔ پروفیسر آف پالیٹکل سائنس (انٹرنیشنل ریلیشنز) ڈپارٹمنٹ آف پالیٹکل سائنس

استعداد

آ۔ لازمی۔ (۱) متعلقہ مضمون میں کسی ہندوستانی جامعہ سے فرسٹ کلاس یا ہائی سیکنڈ کلاس میں ماسٹر ڈگری یا اس کے مساوی کوئی غیر ملکی استعداد۔

(ب) ڈاکٹریٹ کے معیار کا تحقیقی یا اعلیٰ پایہ کا مطبوعہ کام

(ج) پوسٹ گریجویٹ کلاسز کی تدریس کا دس سالہ اور تحقیقی کام کی رہنمائی کا قدرے تجربہ

آ۔ پسندیدہ۔ شمار نمبر ۳ کے تحت پروفیسر آف پالیٹکل سائنس (انٹرنیشنل ریلیشنز) کے لیے تخصیص یا بین الاقوامی تعلقات کے موضوع کی تدریس اور تحقیقی کام کی رہنمائی کا تجربہ

ریڈرس

شرح تنخواہ - ۱۲۰۰ - ۵۰ - ۱۳۰۰ - ۶۰ - ۱۹۰۰ روپیہ اور دیگر الاؤنس

۴۔ ریڈر ان لائبریری سائنس۔ ڈپارٹمنٹ آف لائبریری سائنس

۵ ریڈر ان میتھیمٹکس۔ ڈپارٹمنٹ آف میتھیمٹکس

۶ ریڈر ان اسلامک اسٹڈیز۔ ڈپارٹمنٹ آف اسلامک اسٹڈیز

۷۔ ریڈر ان ایرانین اسٹڈیز ۔ ڈپارٹمنٹ آف اسلامک اسٹڈیز
۸۔ ریڈر اِن انگلش ۔ ڈپارٹمنٹ آف انگلش
۹۔ ریڈر اِن ایجوکیشن ۔ ڈپارٹمنٹ آف ایجوکیشن

استعداد

۱۔ لازمی (ا) کسی ہندوستانی جامعہ سے فرسٹ کلاس یا ہائی سکنڈ کلاس میں ماسٹر ڈگری یا اس کے مساوی کوئی غیر ملکی استعداد

(ب) ڈاکٹریٹ کے معیار کا تحقیقی یا اعلیٰ پایہ کا مطبوعہ کام

(ج) پوسٹ گریجویٹ کلاسیز کی تدریس کا کم از کم پانچ سالہ اور تحقیقی کام کی رہنمائی کا قدرے تجربہ

شمار نمبر ۴ کے تحت ریڈر اِن ایرانین اسٹڈیز کے لیے فارسی / اسلامک اسٹڈیز میں ماسٹر ڈگری ہونا ضروری ہے ۔

(۱۱) پسندیدہ شمار نمبر چار کے تحت ریڈر اِن لائبریری سائنس کے لیے

(۱) کسی ہندوستانی جامعہ سے فرسٹ کلاس یا ہائی سیکنڈ کلاس میں ایم اے یا ایم ایس سی یا ایم کام کی ڈگری یا ان کے مساوی کوئی غیر ملکی استعداد

(۱۱) INSDOC یا DRTC سے ڈاکومینٹیشن کی اہلیت

شمار نمبر ۶ کے تحت ریڈر اِن اسلامک اسٹڈیز کے لیے
عربی اور اسلامی تاریخ کا علم

شمار نمبر ۷ کے تحت ریڈر اِن ایرانین اسٹڈیز کے لیے
فارسی اور جدید ایران کی تاریخ کا بھرپور علم ۔

نوٹ : وہ افراد جو اشتہار نمبر ۸۳ - ۸۲ / ۱۴ کی بنیاد پر ریڈر اِن ایجوکیشن کی اسامی کے لیے درخواست دے چکے ہیں ان کو دوبارہ درخواست دینے کی ضرورت نہیں ہے ۔ ان کی سابقہ درخواست پر ہی غور کیا جائے گا ۔

لکچررس

شرح تنخواہ ۔ ۷۰۰ - ۴۰ - ۱۱۰۰ - ۵۰ - ۱۶۰۰ روپیہ معہ دیگر الاؤنس

۱۰ لکچرر ان سنی تھیالوجی - ڈپارٹمنٹ آف سنی تھیالوجی
۱۱ لکچرر ان سنی تھیالوجی ویمنس کالج

استعداد

(۱) لازمی - فرسٹ یا ہائی سیکنڈ کلاس کے ساتھ مسلسل بہترین تعلیمی ریکارڈ (سیون پوائنٹ اسکیل میں B) سنی دینیات یا عربی یا اسلامک اسٹڈیز میں ماسٹر ڈگری یا انگریزی کی موزوں و مناسب استعداد کے ساتھ کسی مشہور مدرسہ سے درس نظامی کا فاضل یا ماسٹر ڈگری کے مساوی کوئی غیر ملکی استعداد -

(۲) پسندیدہ (۱) پی ایچ ڈی ڈگری یا اعلیٰ پایہ کا مطبوعہ کام
(۲) یونیورسٹی یا کسی مشہور مدرسہ میں تدریس کا تجربہ

۱۲ لکچرر ان اسلامک اسٹڈیز - ڈپارٹمنٹ آف اسلامک اسٹڈیز

استعداد

(۱) لازمی (ا) ڈاکٹریٹ ڈگری یا اعلیٰ پایہ کا مطبوعہ کام
(ب) فرسٹ کلاس یا ہائی سیکنڈ کلاس کے ساتھ مسلسل بہترین تعلیمی ریکارڈ (سیون پوائنٹ اسکیل میں B) متعلقہ مضمون میں ماسٹر ڈگری یا کسی غیر ملکی یونیورسٹی سے کوئی مساوی ڈگری

اگر سلیکشن کمیٹی اس نتیجہ پر پہنچے کہ کسی امیدوار کا تحقیقی کام جیسا کہ اس کی تھیسس سے ظاہر ہے یا اس کا مطبوعہ کام بہت اعلیٰ پایہ کا ہے تو وہ (-ب) کے تحت دی ہوئی مطلوبہ استعداد کو ختم کر سکتی ہے -

اور اگر ڈاکٹریٹ ڈگری یا اس کے مساوی مطبوعہ کام کا حامل کوئی امیدوار میسر نہ آئے یا بصورت دیگر وہ موزوں نہ ہو تو اس صورت میں اچھے تعلیمی ریکارڈ کے حامل امیدوار (اس صورت میں ایم فل ڈگری یا مطبوعہ معیاری کام کو وزن دیا جائے گا) کا تقرر کیا جا سکتا ہے بشرطیکہ اس کو تحقیقی کام کا دو سالہ تجربہ ہو یا اس نے کسی ریسرچ لیباریٹری یا آرگنائزیشن میں دو سال کام کیا ہو - ایسے امیدوار کے لیے لازم ہوگا کہ وہ اپنی تقرری سے پانچ سال کے اندر ڈاکٹریٹ کی ڈگری حاصل کرے یا اعلیٰ پایہ کے تحقیقی کام کا ثبوت پیش کرے - ورنہ اس کو مستقبل میں اس وقت تک کوئی سالانہ ترقی نہ دی جائے گی جب تک وہ ان ضروریات کو پورا نہ کرے

iii پسندیدہ:۔ ڈگری/پوسٹ گریجویٹ کلاسیز کی تدریس کا تجربہ
نوٹ:۔ موزوں امیدواروں کو مستقبل میں خالی ہونے والی جگہوں پر تقرری کے لیے پینل پر رکھا جا سکتا ہے
غیر معمولی استعداد اور تجربہ کے حامل امیدواروں کو شروع ہی سے اعلیٰ تنخواہ سے ابتدار دی جا سکتی ہے۔ انٹرویو کے لیے طلب کیے جانے والے امیدواروں کو بطور T.A. ریلوے کے سیکنڈ کلاس کا یک طرفہ کرایہ ادا کیا جائے گا۔

مطلوبہ فارم اور ہدایات اسسٹنٹ رجسٹرار (سیلکشن کمیٹی) کے دفتر سے ۲ روپیہ نقد مسلم یونیورسٹی کے فائنس آف کے کیش سیکشن میں جمع شدہ) یا بذریعہ انڈین پوسٹل آرڈر جو فائنس آفیسر مسلم یونیورسٹی کے نام واجب الادا ہو کے ہمراہ 23x10cm کا ایسا لفافہ جس پر خود کا پتہ تحریر ہو بھیج کر حاصل کیے جا سکتے ہیں۔ درخواست وصول ہونے کی آخری تاریخ ۲ مئی ۱۹۸۳ء ہے۔ نامکمل اور تاخیر سے موصول ہونے والی درخواستوں پر غور نہیں کیا جائے گا۔

منیر احمد خاں
رجسٹرار

علی گڑھ مسلم یونیورسٹی علی گڑھ

اشتہار نمبر ۸۴-۸۳/۲

درج ذیل اسامیوں کے لیے مقررہ فارموں پر درخواستیں مطلوب ہیں

۱۔ پرنسپل اجمل خاں طبیہ کالج۔

شرح تنخواہ:۔ ۱۵۰۰-۶۰-۱۸۰۰-۱۰۰-۲۰۰۰-۱۲۵/۲-۲۵۰۰ روپیہ اور دیگر الاؤنس

استعداد

(۱) لازمی (ا) قانونی اور آئینی طور پر قائم شدہ کسی یونیورسٹی/بورڈ/فیکلٹی/انڈین میڈیسن کے کسی ادارہ سے حاصل شدہ ڈگری/ڈپلوما یا اس کے مساوی کوئی استعداد

(ب) بحیثیت پروفیسر قرار واقعی تجربہ

(۲) پسندیدہ کسی میڈیکل کالج میں انتظامی تجربہ

۲۔ پرنسپل ویمنس کالج

شرح تنخواہ:۔ ۱۵۰۰-۶۰-۱۸۰۰-۱۰۰-۲۰۰۰-۱۲۵/۲-۲۵۰۰ روپیہ اور دیگر الاؤنس

استعداد

آرٹس اور سائنس میں اعلیٰ تعلیمی استعداد کا حامل امیدوار مزید براں کسی ویمنس کالج میں سینئر پوسٹ پر رہ کر تدریسی اور انتظامی تجربہ

نوٹ:۔ صرف خواتین امیدوار درخواست دیں۔

۳۔ ریسرچ ایسوسی ایٹ (عارضی) ڈپارٹمنٹ آف ہسٹری

شرح تنخواہ:۔ ۱۲۰۰ روپیہ ماہوار

استعداد

(ا) لازمی (ا) ڈاکٹریٹ ڈگری یا اعلیٰ پایہ کا مطبوعہ کام

(ب) فرسٹ یا ہائی سیکنڈ کلاس کے علاوہ متواتر اچھا تعلیمی ریکارڈ (سیون پوائنٹ اسکیل میں B) ہسٹری میں ماسٹرس ڈگری یا کسی غیر ملکی یونیورسٹی سے کوئی مساوی ڈگری۔

(ج) ریسرچ تجربہ

(ا) پسندیدہ:- درخواست دہندہ کے تحقیقی موضوع سے متعلق اور مواد سے متعلقہ زبان کا علم

نوٹ معینہ مدت کی بنیاد پر تقرر کیا جائے گا۔

غیر معمولی تجربہ اور قابلیت کے امیدواروں کو شروع ہی سے اعلیٰ تنخواہ سے ہی ابتدا کی جا سکتی ہے۔ انٹرویو کے لیے طلب کیے جانے والے امیدواروں کو بطور A.T ریلوے کا یکطرفہ کرایہ ادا کیا جائے گا۔

متعلقہ فارم اور ہدایات اسسٹنٹ رجسٹرار (سلیکشن کمیٹی) کے دفتر سے دو روپیہ نقد کی ادائیگی (مسلم یونیورسٹی کے فائننس آفس کے کیش سیکشن میں جمع شدہ) یا بذریعہ انڈین پوسٹل آرڈر جو فائننس آفیسر مسلم یونیورسٹی کے نام واجب الادا ہو اور اس کے ہمراہ 23×10 سم کا ایسا لفافہ جس پر خود کا پتہ تحریر کیا ہو بھیج کر حاصل کیے جا سکتے ہیں۔ فارم موصول ہونے کی آخری تاریخ ۲ / مئی ۱۹۸۳ء ہے۔

نامکمل اور دیر سے موصول ہونے والی درخواستوں پر غور نہیں کیا جائے گا۔

منیر احمد خاں

رجسٹرار

علی گڑھ مسلم یونیورسٹی۔ علی گڑھ

نوٹس

پری یونیورسٹی کے امتحان کے علاوہ پرائیویٹ طور پر شریک ہونے والی وہ خواتین امیدوار (صرف ہندوستانی شہری) جو بحیثیت ٹیچر امیدوار۔ یا ایکس امیدوار کے یونیورسٹی کے مختلف امتحانات میں شریک ہونے کی مجاز ہوں ان کو ہدایت کی جاتی ہے کہ وہ مطلوبہ داخلہ فارم ۲۵ اپریل ۱۹۸۳ء سے قبل کنٹرولر آف ایگزامینیشن کے دفتر میں جمع کر دیں۔ درخواست کے ہمراہ تمام اسناد کی نقول اور رجسٹریشن فیس کی رسید منسلک کی جائے۔

درخواست کے فارم کنٹرولر آف ایگزامینیشن کے دفتر سے طلب کیے جا سکتے ہیں جو لوگ فارم بذریعہ ڈاک طلب کرنے کے خواہش مند ہوں وہ درخواست کے ہمراہ خود کا پتہ لکھا ہوا لفافہ روانہ کریں۔ درخواست پر امتحان کا نام واضح طور پر لکھا جائے۔
۱۰ روپیہ لیٹ فیس کے ہمراہ امتحان فارم ۳۰ اپریل ۱۹۸۳ء تک لیے جا سکتے ہیں

۳۰ اپریل کے بعد موصول ہونے والی درخواستیں قبول نہیں کی جائیں گی۔

این محی الدین

کنٹرولر آف ایگزامینیشن اینڈ ایڈمیشن۔

پرنٹر پبلشر قاضی معز الدین احمد۔ مطبع فوٹو کلر پرنٹرز مقام اشاعت صفدر منزل تار بنگلہ اے ایم یو علیگڑھ

Ramu topped in exam
I didn't
Poor performance in the class damages his self-confidence'
He can surely regain self confidence if parents care to
give him two slices of bread everyday with
DIMAGHEEN
A nourished mental tonic
Dawakhana Tibbiya College
ALIGARH MUSLIM UNIVERSITY. ALIGARH-202001
Phone : 3629 Gram : "DAWAKHANA

آپ کی روزانہ کی خوراک سے
آپ کے بدن کو پوری قوّت اور
پورا فائدہ ملتا ہے؟

جلد نمبر ۲ یکم مئی ۱۹۸۳ء شمارہ نمبر ۹

بہت سی تلاش اور جستجو میں نے کی اور خیال دوڑایا

کہ وہ کیا چیز ہے جس کے حاصل کرنے کے لیے عقل بھی صرف آلہ

ہے تو خیال میں آیا کہ وہ چیز علم ہے جس کے معنی دانستن ہیں

تب میں سمجھا کہ مجھ کو اور جانوروں سے زیادہ جو کچھ کرنا

ہے وہ صرف تمام باتوں کی اصلیت دریافت کرنا ہے۔

(سر) سید احمد خاں

قیمت فی پرچہ ایک روپیہ ششماہی ۱۱ روپے سالانہ بیس روپے

بیرونِ ہند سے

قیمت فی پرچہ ایک ڈالر سالانہ ۱۵ ڈالر

ترسیلِ زر و خط و کتابت کا پتا

قاضی معز الدین احمد
صفدر منزل، تار بنگلہ۔ اے ایم یو۔ علی گڑھ 202001
یوپی۔ انڈیا

پندرہ روزہ
تہذیب الاخلاق
علی گڑھ

مدیر: سید حامد وائس چانسلر
علی گڑھ مسلم یونیورسٹی

مدیر مسئول: قاضی معزالدین احمد

جلد نمبر ۲ یکم مئی ۱۹۸۳ء نمبر شمارہ نمبر ۹

خودسوزی

(گذشتہ سے پیوستہ)

کسی نے یہ نہ دیکھا ہوگا کہ انسان اپنی گاڑھی کمائی کو آگ لگانے کے لیے صرف کرے لیکن کروڑوں انسان آج کل یہی کر رہے ہیں۔ وہ سگریٹ پیتے ہیں سگریٹ یا بیڑی پھیپھڑوں کو جلا ڈالتی ہے۔ انسان میں کسی جسمانی کام کو لگاتار اور بنا تھکے ہوئے کرنے کا دم باقی نہیں رہتا۔ بڑے بڑے ہونہار کھلاڑیوں کے خوابوں امیدوں اور امکانوں کو اس منحوس عادت نے جلا ڈالا ہے۔ یہی نہیں سگریٹ پینے والا صحت جلد کھونے، جلد مرنے اور سرطان جیسی موذی بیماری میں مبتلا ہونے کا خطرہ مول لیتا ہے۔ کوئی کہہ سکتا ہے "دنیا میں، اس وادیٔ حرماں میں رکھا ہی کیا ہے کہ انسان عمر خضر کے خواب دیکھے یا دیر تک جینے کا جتن کرے"۔ مان لیا بابا اس غمکدہ سے جلد رخصت ہونا اچھا، لیکن ایڑیاں رگڑ رگڑ کر جان دینے کو کس نے کہا ہے؟ اپاہج اور معذور بن کر زندگی کے آخری ایام کاٹنا اور عزیزوں پر بوجھ بن کے جینا کہاں کی دانشمندی ہے؟" وہ روپیہ جو بیڑی اور سگریٹ پر صرف ہوتا ہے، اگر اچھی غذا کے لیے استعمال ہو تو صحتیں کتنی سنبھل جائیں جس پونجی یا جن وسائل کو ہم بدن اور تندرستی بنانے کے کام میں لاتے، اسے ہم بدن کو مسمار، دل کو کمزور، پھیپھڑے کو چھلنی خون کو آلودہ اور صحت کو برباد کرنے کے لیے استعمال کر رہے ہیں کوئی یقین کر سکتا ہے کہ انسان، بظاہر بھلا چنگا انسان، پڑھا لکھا اچھی عادتوں والا انسان اس قسم کی حرکت کر سکتا ہے؟ وہ اپنے صحت کے خرمن کو اپنے ہاتھوں سے پھونک سکتا ہے؟

ابھی تک ہم نے خودسوزی کی ان قسموں کا ذکر کیا تھا جہاں ذرا سی دیر میں جیتا جاگتا انسان

راکھ کا ڈھیر ہو جاتا ہے۔ لیکن خود سوزی کی جس قسم کا تذکرہ اب کیا جا رہا ہے وہ سخت جان، صبر آزما اور دیر طلب ہے۔ اس کی آنچ تلے جو آگیا وہ عمر بھر جلتا ہے ہانپ ہانپ کر جیتا ہے اور سسک سسک کر مرتا ہے کینسر اس کی پذیرائی کرتا ہے۔ معذوری اور لاچاری اس کا ساتھ دیتی ہیں۔ قبر بہت جلد اس کے پیروں کو اپنی گرفت میں لے لیتی ہے۔ دھڑ پیروں کا ساتھ کب دے گا، کچھ مہینے یا کچھ سال اس بات کا فیصلہ کر دیں گے۔ ہمارے یہاں یہ بیماری مردوں تک محدود رہے کیوں کہ یہاں اتنی عورتیں خود کو پل بھر میں جلا کر راکھ کر دیتی ہیں کہ دوسری عورتوں کے لیے دھیمی آنچ سے زندگی بھر خود کو جلانے کی ضرورت نہیں رہتی۔ جیسے کوٹا اسی طرح پورا ہو گیا۔

لیکن یہ بات بھی ہم یقین سے نہیں کہہ سکتے۔ زیادہ خوشحال پڑھی لکھی اور جدید مزاج خواتین اب ہمارے ملک میں بھی نکوٹین کی ملکہ کے ساتھ پینگ بڑھانے لگی ہیں۔ شاید وہ سمجھتی ہیں کہ سگریٹ پینے سے چھب میں اضافہ ہوتا ہے، کشش بڑھتی ہے، نوک پلک درست ہوتی ہے۔ اور وہ حجاب اور فاصلہ کم ہو جاتا ہے جو ہمارے سماج میں مرد عورتوں کے ساتھ روا رکھتے ہیں۔ کش لے کر دھواں اڑانے کی ادا میں دعوت بھی ہے اور شانِ دلربائی بھی، اشتعال اس پر مستزاد۔

بہر کیف سگریٹ ہیں خواہ اسے مرد منہ لگائیں خواہ عورتیں، برائی اور نقصان کے علاوہ کچھ بھی نہیں۔ لوگ یہ سمجھتے ہیں کہ وہ زنجیرہ دار کش لیتے رہیں گے تو ان کی گنتی دانشوروں میں ہوگی۔ عورتیں یہ سمجھتی ہیں کہ اس طرح ان کے اعمال کا حسن اور ہونٹوں کی گرمی اور سج دھج واشگاف ہو گئی۔ تینوں غلطی پر ہیں۔ وہ سایہ کا پیچھا کر رہے ہیں، ٹوٹے کا سودا کر رہے ہیں، جان کو بیچ کر عارضی کو پہلو سے لگا رہے ہیں۔ باطن کو ظاہر پر قربان کر رہے ہیں۔ خود سوزی کی یہ وبا عالمگیر ہے، نئی نسل اس بُری عادت میں اسیر ہے۔ بجلو جھنگلی ڈال کر دور رکھی ہی جایا کرتی تھیں، اب چنگی کی زد میں خود آگئی ہیں اور اب پھنکا جاتی ہیں۔ انسان نے ٹھان لی ہے کہ پھیپھڑوں کو جلا ڈالے، دل کو گھائل کر دے، خون میں آلودگی بڑھا دے۔ قویٰ میں اضمحلال لے آئے، دماغ کو دھندلا دے۔ انگلیاں ہونٹ اور دانت پیلے پڑ جائیں۔ منہ سے بدبو آنے لگے۔

سگریٹ پینے والے حالات سے برد آزما ہونے کی صلاحیت بتدریج کھو بیٹھتے ہیں اور جب کبھی ان کی زندگی میں نازک موڑ آتے ہیں مشکل مسائل یا حوادث کا سامنا ہوتا ہے تو وہ عقل و ہوش کو گہنا دینے والے سگریٹ کو اور زیادہ کثرت کے ساتھ پیتے ہیں۔ ایک سگریٹ سے دوسرا سگریٹ جلاتے ہیں۔ دشمن سے عہدہ برا ہونے کا یہ انوکھا انداز ہے کہ اپنے دفاع کو کمزور کر دیا جائے اور دشمن کی رہبری اور پذیرائی کے لیے دود آگیں چراغاں کیا جائے۔ ہوش و حواس کو دھندلاہٹ سے گھیر لیا جائے۔ اپنے سکون کو مکدر کر دیا جائے اپنے شعور اور سوجھ بوجھ کو ماؤف کرنے کے جتن کیے جائیں۔ انسان ویسے ہی بہت سی مجبوریوں کا اسیر، بہت سے حوادث کا ہدف ہے۔ اس صورت حالات کا واحد حل ایک دوسرے کی مدد کرنا ہے، چہ جائیکہ اپنے اختیار اور اعتماد کو اور کمزور کیا جائے۔ لعنتوں کو دعوت دی جائے مجبوریوں کو بڑھایا جائے، بُری عادتیں اختیار کی جائیں۔ کوئی مورکھ ہو گا جو اپنی ڈھال میں خود چھید کرے گا۔ اپنے تن بدن میں خود آگ لگائے گا۔

باقی آئندہ

سید حامد

خطاب

علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کی طرف سے "الازہر" کی خدمت میں جشن ہزار سالہ کے موقع پر پیغام خیر سگالی کا اقتباس[1]

حضرت شیخ الازہر خواتین وحضرات

مجھے بجا طور پر فخر ہے کہ اس یادگار موقع پر آپ سے خطاب کرنے اور آپ کی خدمت میں دلی مبارکباد پیش کرنے کی سعادت حاصل ہوئی۔ میں یہ ہدیۂ تبریک اپنے وطن عزیز اپنے ممتاز دارالعلوم اور خود اپنی جانب سے پیش کر رہا ہوں۔ میرے لیے یہ عزت کی بات ہے کہ مجھے "الازہر الشریف" کے ہزار سالہ جشن میں شرکت کے لیے یاد کیا گیا ہے۔ یہ کہنا تحصیل حاصل ہوگا کہ الازہر نے دینی علوم اور عربی زبان اور ادب کی نمایاں خدمات کی ہیں اور کر رہا ہے۔ علاوہ بریں اس عظیم جامعہ کو یہ امتیاز بھی حاصل ہے کہ اس نے وطن عزیز کو بالترتیب فرانسیسیوں اور انگریزوں کے تسلط سے رہا کرانے کی تحریک میں بڑا اہم کردار ادا کیا۔ اس کے کلاہ کے پروں میں ایک اضافہ چھٹی دہائی کے آغاز میں ہوا جب اس نے جدید علوم کی تدریس وتحقیق کو بھی اپنے نصاب میں شامل کر لیا۔

جس دارالعلوم کی نمائندگی کرنے میں ہندوستان سے حاضر ہوا ہوں، اس نے میرے ملک میں تعلیم کی عام توسیع میں بالعموم، اور مسلمانان ہند کی تعلیمی نہضت میں بالخصوص، بڑا اہم حصہ لیا ہے۔ ہمارا جامعہ دین اسلام اور اس کی روایات میں پیوست ہے؛ اس پر مستزاد جدید علوم کی تعلیم۔ علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کا آغاز گزشتہ صدی کے آخری ربع کی شروعات میں ہوا، ایک مدرسہ کے طور پر، جس نے دو سال کے اندر محمڈن اینگلو اورینٹل کالج کی شکل اختیار کی اور جسے ۱۹۲۰ء میں یونیورسٹی کا درجہ مل گیا۔ اس دارالعلوم کے عظیم بانی سید احمد خاں نے اپنی زندگی کو تعلیمی اور سماجی اصلاح کے لیے وقف کر دیا تھا۔ یہ قدر منجملہ بہت سی دوسری قدروں کے ان کے اور ان کے عظیم معاصر شیخ محمد عبدہ کے درمیان درمیان مشترک تھی، جن کا تعلق الازہر سے تھا

---

[1] اصل پیغام عربی میں ہے جو جناب مسعود ندوی نے ترتیب دیا، اس کا ترجمہ انگریزی میں پروفیسر محمود الحق نے اور انگریزی سے یہ ترجمہ سید حامد نے کیا

ابتدا ہی سے جامعہ علی گڑھ کو مسلمانانِ ہند کی تعلیمی اور سماجی فلاح کی تحریک کا مرکز بنایا گیا تھا

اس یونیورسٹی میں ۹۵ شعبے ہیں جو ۵ فیکلٹیوں کے درمیان بٹے ہوئے ہیں۔ اس میں ایک طرف مطالعاتِ اسلامی، مغربی ایشیا، دینیات، عربی، فارسی اردو وغیرہ کے شعبے ہیں تو دوسری طرف سائنس، انجنیئرنگ اور طب کی فیکلٹیاں ہیں۔ ہندوستان ... چشمۂ فیض سے بہرہ اندوز ہوتے ہیں اور بیرونی ممالک سے بھی۔ فی الوقت باہری طلبہ کی تعداد ۴۰۰ ہے۔ یہ تقریباً ۴۰ ملکوں سے تعلق رکھتے ہیں۔

الازہر الشریف اور جامعۂ علی گڑھ میں اتنی باتیں مشترک ہیں کہ باہمی تعاون کو ناگزیر ہو جانا چاہیے۔ گزشتہ ایام میں علی گڑھ سے طلبہ یہاں آئے۔ الازہر نے بھی اپنے طلبہ اور علماء کو علی گڑھ عربی زبان پڑھانے کے لیے بھیجا۔ ان میں شیخ جمال احمد المنا اور شیخ سعد الدین الشمس شامل تھے۔ ان دونوں حضرات نے ہمارے شعبۂ دینیات سے فضیلتِ تحقیق (پی ایچ۔ ڈی) حاصل کی۔ ہمیں افسوس ہے کہ اہلِ علم کا یہ تبادلہ کم ہوتا چلا گیا۔ اس زرّیں موقع سے فائدہ اٹھاتے ہوئے میں جناب والا سے درخواست کروں گا کہ دونوں یونیورسٹیوں کے درمیان تعاون کا ایک مفصل منشور تیار کیا جائے۔ اب اساتذہ، طلبہ، وفود اور مطبوعات کا باضابطہ تبادلہ زنجیرِ تعاون کی پہلی کڑی ہوگا۔ تحقیق میں اشتراک بھی اس تعاون کا جزو ہو سکتا ہے۔ کیا میں امید کروں کہ قاہرہ میں میرے قیام کے دوران میں، جو دراصل ارمغانِ تہنیت پیش کرنے کے لیے ہے، ہماری جامعات کے درمیان تعاون اور اشتراکِ عمل کے خطوط متعین ہو سکیں گے۔

اجازت دیجیے کہ پایانِ گفتگو میں ایک بار پھر میں عظیم دار العلوم الازہر الشریف کے جشنِ ہزار سالہ کی تقریب میں جناب والا اور جناب والا کی توسط سے اہلِ ازہر کی خدمت میں پرخلوص پیغامِ تہنیت و تبریک پیش کروں۔

یہ کہنے کی چنداں ضرورت نہیں کہ ہندوستان میں الازہر کا نام گھر گھر لیا جاتا ہے اور ہمارے تعلیم یافتہ طبقہ کو الازہر سے گہری عقیدت ہے۔ یہاں ان غیر معمولی ترقیوں کی تفصیل بیان کرنا شاید بے محل ہوگا جو میرے ملک نے اپنے جمہوری اور سماج دوست آئین کے تحت ۱۹۴۷ء میں آزادی حاصل کرنے کے بعد اب تک کی ہیں۔ ہمارے دونوں ملکوں کے درمیان دوستی کے روابط بہت قدیم اور بہت استوار ہیں۔ یہ بات کہ ناوابستہ تحریک، جس کا چوتھی کا اجلاس میرے ملک میں ابھی حال ہی میں ہوا ہے، جواہر لعل نہرو، جمال عبد الناصر اور مارشل ٹیٹو کی مساعیِ جمیلہ سے وجود میں آئی تھی۔

اپنی گزارش کے خاتمہ پر میں بارگاہِ رب العزت میں دعا کرتا ہوں کہ الازہر کی زندگی کا دوسرا ہزار سالہ دور پہلے دور سے بھی زیادہ شاندار اور معنی خیز ثابت ہو۔ آمین

سیّد حامد

۱۸ مارچ ۱۹۸۳ء

قاضی خالد رضی احمد

تاثرات

نشہ بندی پر سیمینار

سہ روزہ "دعوت" مورخہ ۱۹ مارچ ۱۹۸۳ء میں مولانا ابواللیث صاحب، امیر جماعت اسلامی کا نشہ بندی پر ایک مضمون شائع ہوا۔ مولانا نے یہ مضمون نشہ بندی سیمینار میں ۱۲ مارچ کو پڑھا۔ اس سیمینار کا اہتمام آل انڈیا نشہ بندی کونسل نے کیا تھا۔ سیمینار آریہ سماج ہال، چاندنی چوک دہلی میں منعقد ہوا۔ مولانا نے آل انڈیا نشہ بندی کونسل کے جنرل سکریٹری جناب روپ نارائن صاحب کو ایک خط میں نشہ بندی کے سلسلہ میں کونسل کی تمام کوششوں میں مکمل تعاون کا یقین دلایا۔

۱۹ مارچ ۱۹۸۳ء کو مولانا نے جو مقالہ سیمینار میں پڑھا اس میں نشہ بندی کے سوال پر سیر حاصل روشنی ڈالی گئی۔ اسلام کے دینی نقطۂ نظر کے علاوہ عام سماجی اور طبی نقطۂ نظر سے نشہ بندی خصوصاً شراب نوشی پر روشنی ڈالی گئی اور اس کے مہلک نتائج کا ذکر کیا۔

جماعت اسلامی کے اس اقدام سے وقت کی ایک اہم ضرورت پوری ہوئی۔ ہندو مسلم تعلقات کو خوشگوار بنانے کے لیے یہ ضروری ہے کہ ملک کے سماجی کاموں میں ہندو مسلمان مل جل کر حصہ لیں۔ اس طرح آپس میں تعلقات خوش گوار ہوں گے اور غلط فہمیاں جو ایک دوسرے کے خلاف ہیں، دور ہوں گی۔ بدقسمتی سے ہمارے ملک میں سماجی کاموں کی طرف توجہ کم ہے یہ کام اگر کیے بھی جاتے ہیں تو ہندو مسلمان اپنے اپنے طور پر کرتے ہیں۔ مل جل کر نہیں۔ یہ معمولی بات نہیں کہ نشہ بندی کونسل کے سیمینار میں مسلمانوں کی ایک ذمہ دار جماعت نے حصہ لیا اور اُن کا نقطۂ نظر پیش کیا اور پھر اپنے بھرپور تعاون کا یقین دلایا۔ کیا اچھا ہو کہ مسلمانوں کی دوسری تنظیمیں بھی اس کام میں حصہ لیں۔ ہندو مسلمان مل جل کر سماجی اصلاحی کوشش کریں۔

ملک کی اقتصادی ترقی کی کوششیں تو حکومت کرتی ہے، لیکن ملک کے عوام کی معاشرتی اور تہذیبی اصلاح و ترقی حکومت کی جگہ عوام کے خادموں ہی کو کرنی چاہیے۔ اس طرح ہندو مسلم عوام سے ان کا تعلق براہ راست پیدا ہوگا اور وہ ان کے مسائل اور اصلاحی ضرورتوں کو بخوبی پورا کر سکیں گے اور اسی راہ سے ہندو مسلم تعلقات خوشگوار ہو سکیں گے۔

نشہ بندی کی تحریک کو گھر گھر پہنچانے کی ضرورت ہے اور ان کوششوں میں اگر اردو سے زیادہ انگریزی اور ہندی مفید ہو تو انہیں زبانوں کو استعمال کرنے میں مسلمانوں میں کوئی جھجک نہ ہونی چاہیے اور پھر نشہ بندی ہی نہیں جوا بازی بھی عوام کو برباد کیے جا رہی ہے۔ اخبارات اور رسائل میں بڑے بڑے انعامات کا عوام کو لالچ دے کر جوا کھیلنے کی دعوت دی جاتی ہے۔ دہلی میں گلی گلی اور گھر گھر جوا کھیلا جاتا ہے۔ چھوٹے بچے تاش لیے ہوئے گلیوں میں جوا کھیلتے نظر آئیں گے۔ اگر ہمارے اہلِ وطن

ں جوئے بازی کو ناپسند کرتے ہوں تو پھر ہندو مسلمان
صلاح پسند لوگوں کو جوا بازی کے خلاف عوام کا ضمیر بیدار
رنا چاہیے لیکن اگر ایسا نہ ہو اور اہل وطن اس کو برا
سمجھتے ہوں تو پھر مسلم جماعتوں کو مل جل کر اور اگر اتحاد
نصیب نہ ہو تو علیحدہ علیحدہ جوا بازی کے خلاف مسلمانوں
کی رائے عامہ تیار کرنی چاہیے۔

تحریک پیام انسانیت

ملک میں روز افزوں
انتشار اور بدنظمی پھیلتے ہوئے دیکھ کر محترم مولانا ابوالحسن
علی ندوی نے تحریک "پیام انسانیت" شروع کی۔ تحریک
گو بروقت ہے اور ضروری ہے لیکن دیکھنا یہ ہے کہ
اس تحریک کی کامیابی کے امکانات کیا ہیں؟ ہمارے
نوجوان ہر قسم کی بداعتدالیوں کے مرتکب ہو رہے ہیں
ملک کی ترقی کی طرف کسی کی توجہ نہیں۔ ذاتی اغراض کے
لیے ہر شخص رواں دواں ہے۔ انسانوں کا خون سب سے
زیادہ ارزاں ہے۔ ملک کے افلاس کو دور کرنے میں
حکومت ناکام ہے۔ ملک کے ذمہ دار لوگ اور دانشور
ان حالات کی اصلاح کی طرف متوجہ نہیں۔ کوئی آواز
اٹھتی ہے تو یورپ اور امریکہ کے ترقی یافتہ ممالک کے
نوجوانوں کی حالت کا ذکر کر کے اس ملک کے نوجوانوں
کی بداعتدالیوں کا جواز پیش کیا جاتا ہے۔ جب ملک کے
ذمہ دار لوگوں کا رویہ یہ ہو تو پھر پیام انسانیت
جیسی تحریک کی کامیابی کے امکانات کیا ہو سکتے ہیں؟
بہر حال مایوسی کفر ہے اور حالات کی [illegible] کے لیے
کوشش فرض ہے۔

علی میاں حال ہی میں علی گڑھ تشریف
لائے تھے۔ یہاں انھوں نے طلباء اور اساتذہ کو
خطاب کیا اور تحریک انسانیت پر روشنی ڈالی۔
ہم یہاں ہفت روزہ ترجمان سے ان کی ایک تقریر
نقل کرتے ہیں۔

مولانا نے ہندوستانی حالات کا تجزیہ کرتے ہوئے
کہا کہ

آج ہمارا ملک بڑے بڑے حالات سے دوچار ہے
ہندوستان کی روح کبھی اس طرح بیمار نہیں
ہوئی کہ آج ظلم اور بےحیائی کو گوارہ کیا جا رہا
ہے۔ اور اس کو ایک فلسفہ بنایا جا رہا ہے
مجھے ڈر ہے کہ ہندوستان کا ضمیر کہیں مر تو
نہیں گیا ہے۔ اتنے بڑے ملک میں کہیں
دردمندوں کی آواز سنائی نہیں دیتی۔
اور ہمارا ضمیر تعطل کا شکار ہو گیا ہے۔ آج
ہر طرح کی آوازیں سنائی دیتی ہیں مگر انسانی
حقوق کی پامالی پر کوئی رونے والی آنکھ نہیں
اور کوئی جلنے والا دل نظر نہیں آتا۔ آج پورے
سماج میں ظلم کا مزاج پیدا ہو گیا ہے جس سماج میں
ظلم پھیلنے لگا ہو اور پسندیدگی کی نگاہ سے دیکھا
جانے لگا ہو، وہ ملک کبھی ترقی نہیں کر سکتا۔
انھوں نے کہا کہ ایسے نازک مرحلے میں خدا کے نیک
بندوں کو میدان میں آنے کی ضرورت ہے تاکہ انسانیت کو موت
سے بچایا جا سکے۔ انھوں نے مسلم یونیورسٹی کے کردار پر
بحث کرتے ہوئے کہا کہ اس ادارہ نے مولانا محمد علی جوہر جیسے
فرزند پیدا کیے جنھوں نے ظلم و جبر کے خلاف انگریزوں سے
جنگ کی اور تحریک خلافت میں ایک اعلیٰ مقام پایا۔ آج
ہندوستان کا معاشرہ ایک بار پھر آپ سے وقت کا سپاہی
مانگ رہا ہے۔ آپ اس معاشرے کو ظلم سے بچائیے۔
اخلاقیات کا جھنڈا بلند کر کے اس ملک کو بچانے کے لیے میدان
عمل میں آیئے۔" انھوں نے عربی کا مقولہ پیش کرتے ہوئے
کہا کہ "اپنے بھائی کی مدد کرو چاہے ظالم ہو یا مظلوم۔ ظالم
کی مدد یہ ہے کہ اس کا ہاتھ پکڑ لو۔ مظلوم کی مدد یہ ہے
کہ اس پر ظلم نہ ہونے پائے۔ معاشرے کو چاہیے کہ وہ ظالم کا
ہاتھ پکڑے اور اس کو ظلم نہ کرنے دے۔ آج اس بگڑے
معاشرے کو صحیح اور حق پسند انسانوں کی ضرورت ہے۔

سید کاظم نقوی
صدر شعبۂ دینیات شیعہ
اے ایم یو علی گڑھ

دوسری قسط

مذہب کیوں اور کس لیے؟

نقصان سے بچنا فطری ہے

تاریخ عالم بتاتی ہے کہ انسان اپنے تمام ادوار زندگی میں یہ مانتا رہا ہے کہ اس کائنات کا ایک خالق ہے۔ اس کا یہ عقیدہ انتہائی قدیم اور پختہ ہے انسان کو کبھی اس کے صحیح ہونے کے متعلق شک نہیں ہوا ہے۔ ہر زمانے میں ایسے لوگ بہت کم رہے ہیں جو اس کے قائل ہوں کہ اس عالم کی پیدائش میں علم و شعور اور ارادے کا دخل نہیں ہے۔

مشہور مصری عالم محمد فرید وجدی لکھتے ہیں

"زمین کی کھدائی کے ذریعہ گذشتہ لوگوں کے آثار کی جتنی بھی جستجو کی جاتے، بت پرستی ان کے مدرکات میں سب سے زیادہ نمایاں نظر آتی ہے۔"

یہی اس عبارت سے چند سطر قبل لکھتے ہیں۔

"خدا کے وجود کا اعتقاد انسان کے موجود ہونے کے ساتھ پیدا ہوا ہے"

[دائرۃ المعارف مادہ "دین" ص۳۳]

خدا کو ماننے والوں کی کثیر اور عظیم جماعت میں صرف جاہل عوام نہیں بلکہ بڑے بڑے عالی قدر سائنسداں بڑے بڑے بلند مرتبہ فلاسفہ، عظیم الشان محققین اور موجدین نظر آتے ہیں۔ وہ لوگ کہ جنہوں نے جدید تمدن کی بنیادیں رکھی ہیں، موجودہ علوم و فنون کی رونق جن کی جانفشانیوں [کی] طفیل ہے، جن کے غیر معمولی علم و دانش کو ساری دنیا مانتی ہے، ایسے اشخاص یک زبان ہو کر کہہ سکتے ہیں کہ دنیا کا یہ نظام ایک عظیم الشان عقل و فکر، ایک قادر و طاقتور خالق کا اثر ہے۔ یہ عالم رنگ و بو کا حسن و لطافت، یہ کائنات کے حیرت انگیز نقش و نگار ایک زبردست نقاش کے قلم قدرت کا نتیجہ ہیں۔ انھوں نے اسی پر اکتفا نہیں کی ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ خالق نے انسان کو ایک مخصوص غرض اور مقصد کے لیے پیدا کیا ہے۔ اس نے انسان کی خلقت کا مقصد اپنے برگزیدہ پیغمبروں کے ذریعہ بیان بھی کر دیا ہے۔ اس نے اس مقصد کو پورا کرنے کی خاطر انسان کے واسطے کچھ فرائض مقرر کیے ہیں۔ اس کی جانب سے فرماں برداروں کے لیے ان کی اطاعت کے صلے اور نافرمانوں کے واسطے سزائیں معین ہوتی ہیں۔

دوسری طرف ہمیں یہ بھی نظر آتا ہے کہ بہت سے بلند کردار، پاک و پاکیزہ سیرت کے اشخاص نے دعویٰ کیا کہ ہم خدا کے رسول اور اس کے سفیر ہیں۔ ان کی زندگی کا پورا دور درخشاں نظر آتا ہے ان کے دامن پر کسی اخلاقی کمزوری کا دھبہ نہیں دکھائی

دیتا۔ ان کی شخصیت بلند اخلاق و اوصاف کے لحاظ سے ایک نمونے کی حیثیت رکھتی ہے۔ انھوں نے اپنا پیغام پہونچانے کے لیے اس میں کسی قسم کی فداکاری اور جانبازی میں دریغ نہیں کیا۔ ان میں سے اکثر و بیشتر نے لوگوں کو راستے پر لانے کے لیے اپنی جانیں قربان کر دیں۔ ان کی یہ حیرت انگیز فداکاری، ہمہ جانبہ قربانی پکار پکار کر اعلان کر رہی ہے کہ وہ اپنے راستگو ہونے کا پختہ عقیدہ رکھتے تھے۔

ہمارے سامنے مذہبی عقائد کا جھنڈا ایک ایسی جماعت کے ہاتھ میں ہے جس میں بڑے بڑے مفکرین، علوم و فنون کے عظیم ماہرین، ان کے علاوہ بلند اور پاکیزہ ترین اخلاق و صفات کے حامل اشخاص ہیں۔ کیا عقائد مذہبی کے بارے میں اس گروہ کا متفق الکلمہ ہونا ہمارے لیے یہ ضروری قرار نہیں دیتا ہے کہ ہم اس کے بارے میں غور و خوض کریں؟ کیا یہ بعید نہیں ہے کہ ایسے عظیم المرتبت اشخاص غلط راستے پر گئے ہیں، ان سب نے غلطی کی ہو؟ حقیقت یہ ہے کہ ایسے بے لوث، بے غرض، پاک و پاکیزہ اشخاص کی متفقہ رائے ہمارے دل میں ان کے خیال اور دعوے کے صحیح ہونے کا عقیدہ پیدا کرتی ہے، کیونکہ ان کے درمیان ہمیں ہزاروں سائنس داں، علم و معرفت اور صنعت کے ماہرین، بلند اخلاق و اوصاف کے مالک نظر آتے ہیں۔

انسان ان علوم کے ماہرین، تہذیب و تمدن کے بانیان، انسانی بلند اخلاق و صفات کے مالک اشخاص کے متعلق کتنی ہی بدگمانی سے کام لے لیکن اس کا ہرگز ہرگز انکار نہیں کر سکتا کہ کسی مسئلے میں ان کے متفق الکلمہ ہونے سے کم از کم انسان کے دماغ میں یہ شبہ ضرور پیدا ہوتا ہے کہ ان کا عقیدہ صحیح ہو۔

آیا اس صورت میں جب کہ ہمیں یہ شک ہو کہ اس کائنات کا ایک خالق ہے، جب کہ یہ شک ہو کہ اس کا رشتہ زندگی مرنے کے بعد نہیں ٹوٹتا، جب کہ یہ شک ہو کہ اس خالق نے انسان کے لیے کچھ فرائض مقرر کیے ہیں، جب کہ یہ احتمال ہو کہ اس دنیا کے علاوہ ایک دوسرے عالم میں ہر شخص کو اس کے اچھے اور برے اعمال کی جزا و سزا دی جائے گی، آیا ان صورتوں میں یہ صحیح ہے کہ انسان معمولی معمولی چیزوں کے متعلق تحقیق کرے لیکن ان مسائل کے بارے میں تحقیق نہ کرے؟ ہر شے کے بارے میں سوچے لیکن مذہب کے بارے میں نہ سوچے؟ ہر راز کو معلوم کرنے کی کوشش کرے لیکن یہ پتہ چلانے کے درپے نہ ہو کہ وہ خود بخود وجود میں آگیا ہے یا کسی طاقت نے اُسے ارادے اور اختیار سے پیدا کیا ہے۔

کیا ہماری عقل ہمیں اجازت دیتی ہے کہ ہم خدا اور آخرت کے مسئلے سے چشم پوشی کر لیں؟ ایسا مسئلہ جس کا دائمی خوش بختی اور بدبختی سے تعلق ہے۔ دنیا کا کوئی انسان تحقیق کرنے سے پہلے یہ دعویٰ نہیں کر سکتا کہ خدا، آخرت، جزا، سزا کے تمام مسائل ایک بے حقیقت، محض خیالی چیز ہیں۔ ممکن ہے کہ کوئی غیر ذمہ دار شخص جہالت سے کام لیتے ہوئے زبان سے ایسا کہہ دے، لیکن اس کا دل گواہی دے گا کہ اس نے غلط کہا۔ ایسی صورت میں ایسے اہم مسئلہ کے متعلق ہماری عقل ہمارا کیا فریضہ قرار

دیتی ہے؟ جو شخص ایسے عظیم الشان مسئلے کے متعلق غور و
خوض کرنے کے لیے آمادگی کا اظہار نہ کرے کیا اسے انسان
کہا جا سکتا ہے؟

ہر قسم کے نقصانات سے بچنا انسان کی فطرت
کا مطالبہ ہے۔ چاہے وہ نقصان یقینی ہو اور چاہے
احتمالی ہو۔ ہم رات کو سونے کے لیے اپنے بستر پر جانا
چاہتے ہیں۔ ایک چھوٹا سا بچہ چیخ کر کہتا ہے کہ سانپ
سانپ، سانپ۔ ہمارے بڑھتے ہوئے قدم رُک جاتے
ہیں۔ ہم ٹھٹھک کر پیچھے ہٹ جاتے ہیں۔ ہم اس بستر پر
اور شاید اس کمرے میں سونے پر تیار نہیں ہوتے،
لیکن دنیا کے ہزاروں سائنس داں، ایک لاکھ چوبیس
ہزار پیغمبر، کروڑوں، اربوں صاحبانِ عقل و شعور ان
کے ماننے والے ہم سے کہتے ہیں کہ خدا ہے، اس نے
انسان کے لیے کچھ فرائض قرار دیے ہیں۔ اطاعت شعاروں
کے واسطے بہشت اور اس کی نعمتیں، نافرمانوں کے لیے
جہنم اور اس کی انتہائی دردناک تکلیف دہ سزائیں
ہیں، لیکن ان کے کہنے سے ہم اتنا بھی متاثر نہیں ہوتے
جتنا ایک کمسن بچہ کے کہنے سے متاثر ہوتے ہیں!!

مذہب سائنس کی ترقی کا موجب ہے

کون انکار کر سکتا ہے کہ یہ علوم و فنون کا
زمانہ ہے۔ تعجب ہے کہ اس علم و دانش کے درخشاں
زمانے میں یہ کہا جاتا ہے کہ خدا اور ایسے ہی ما بعد
الطبیعہ امور کے متعلق غور و خوض کرنے کی ضرورت
نہیں ہے۔ حالانکہ خدا کا اعتقاد علم و دانش کا محرک
علم و دانش کا سرچشمہ، علم و دانش کے وجود میں لانے
کا سبب ہے۔ یہ عقیدہ کہ ایک علیم و حکیم طاقت نے
اس عالم کو اپنے ارادے اور اختیار سے مخصوص اصول
و قوانین کے مطابق مرتب اور منظم صورت سے پیدا
کیا ہے۔ انسان کو تحقیق اور جستجو پر تیار کرتا ہے۔
اس کے برخلاف مادی طرزِ فکر صرف یہی نہیں کہ
انسان کو تحقیق کے لیے آمادہ نہیں کرتا بلکہ اس کے
طائرِ عقل و فکر کو پرواز سے روکتا ہے۔

خدا پرستوں کا نظریہ ہے کہ اس عالم کو ایک
قادر اور توانا ہستی نے پیدا کیا ہے۔ اس کی خلقت
ایک صحیح نظام کی بنیاد پر ہے۔ یہ عالم آفرینش کہ جو
خدا کی کارگزاری کا نتیجہ ہے۔ مرتبا اور منظم اصول
و قوانین کے ماتحت وجود میں آیا ہے۔ اگر انسان
تحقیق و جستجو کرے تو وہ برابر موجوداتِ عالم کے
پوشیدہ اسرار و رموز سے باخبر ہوتا رہے گا۔

اس خیال کے مقابلے میں مادہ پرستوں کا
نقطۂ نظر ہے کہ یہ عالم آفرینش اندھے، بہرے، گونگے
ناسمجھ اتفاقات کا نتیجہ ہے۔ اس عالم کو پیدا کرنے
والی طاقت ایک کمسن بچے کے برابر بھی عقل و شعور
نہیں رکھتی ہے۔ جو چیز بے عقل اور بے شعور قوت
کا اثر ہو یقیناً اس کی خلقت میں کسی غرض اور مقصد
کا لحاظ بے معنی بات ہے۔ اگر بالفرض عالم کے گوشہ
و کنار میں کوئی ایسی چیز دستیاب ہو جائے جو
منظم اور مرتب صورت میں ہو تو یہ ایک اتفاق ہوگا
اتفاقات کے نتیجے میں نظم و ترتیب کا موجود ہونا
ایک ایسا کمزور احتمال ہے جو صفر کے برابر ہے جسے
کوئی عقلمند ہرگز باور نہیں کر سکتا۔

ہمیں اس سے مطلب نہیں کہ خدا پرستوں
کا نظریہ صحیح ہے یا مادہ پرستوں کا نظریہ۔ ہم آپ
سے صرف یہ دریافت کرنا چاہتے ہیں کہ ان دونوں میں

ڈاکٹر رشید الوحیدی
جامعہ ملیہ اسلامیہ

ماں باپ کا درجہ

آج کے دور میں بڑوں بزرگوں کا ادب و لحاظ قطعی اُٹھتا جا رہا ہے۔ جس کے نتیجے میں رزق، علم، عمر اور کمائی غرض ہر چیز سے خیر و برکت ختم ہو گئی ہے۔ جب کہ خدا کے رسول کا حکم یہ ہے کہ بڑوں کا ادب کرو چاہے وہ تمہارا ہم مذہب ہو یا کسی دوسرے مذہب کا بزرگ ہو پھر ستم تو یہ کہ ماں باپ ایسی انمول عظیم اور بے مثال دولت کی بھی ناقدری ہونے لگی ہے۔ ماں باپ کا درجہ کیا ہے؟ خدا کے نزدیک ان کا کتنا بڑا مرتبہ ہے؟ ان کی خدمت اور عزت سے کتنا بڑا انعام اور ان کی بے ادبی سے کتنا بڑا نقصان اور عذاب ہے۔ اللہ پاک کے اور اس کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کے فرمان کی روشنی میں کچھ ہم اس چیز کو بیان کریں گے۔

نبی کریم کی یہ حدیث پاک بہت مشہور ہے اور ہم اس حدیث کو ہر شخص سے سنتے ہیں اور ہمارے لیے یہ نہایت قابل غور بھی ہے

الجنة تحت اقدام الامهات
(جنت ماؤں کے پیروں کے نیچے ہے)

جس کے مبارک قدم کے نیچے جنت ہو وہ ذات کتنی بلند و بالا ہے۔ اس کا صاف مطلب یہ ہے کہ جنت اگر کسی کو حاصل کرنی ہے تو دل و جان سے اس کو ماں کی خدمت کرنی ہوگی۔ ان کی عزت کر کے ان کو خوش کرنا ہوگا۔ اللہ پاک کا فرمان ہے

واعبدوا اللہ ولا تشرکوا بہ شیئاً و بالوالدین احسانا

اللہ کی عبادت کرو اس کے ساتھ کسی کو شریک نہ ٹھہراؤ اور اپنے ماں باپ کے ساتھ حسن سلوک کرو[1]

دوسری آیت شریف ہے۔

وقضیٰ ربک الا تعبدوا الا ایاہ وبالوالدین احسانا

اور حکم کر چکا تیرا رب کہ نہ پوجو اس کے سوائے اور ماں باپ کے ساتھ بھلائی کرو[2]

ایک اور جگہ فرمایا:

قل تعالوا اتل ما حرم ربکم علیکم الا تشرکوا بہ شیئا وبالوالدین احسانا

تو کہہ! تم آؤ میں سنا دوں جو حرام کیا ہے تم پر تمہارے رب نے کہ نہ شریک کرو اس کے ساتھ کسی چیز کو اور ماں باپ کے ساتھ نیکی کرو[3]

نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا فرمان ہے

برباد ہو گیا، برباد ہو گیا، برباد ہو گیا۔ لوگوں نے سوال کیا۔ کون یا رسول اللہ! صلی اللہ علیہ وسلم! آپ نے فرمایا کہ وہ شخص جس نے ماں باپ دونوں کو یا ایک کو بڑھاپے تک پایا پھر جنت میں داخل نہ ہو گیا[4]

(مطلب یہ ہے کہ ان کی خدمت کر کے جنت میں نہ چلا گیا)

[1] سورہ نساء آیت ۳۶۔ [2] الاسراء آیت ۲۳۔ [3] آیت ۱۵۱۔ [4] مسلم، کتاب البر

حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد گرامی ہے
"اللہ پاک کی رضا باپ کی رضا میں ہے اور
اللہ پاک کا غصہ باپ کے غصے کی وجہ
سے ہے" [1]
حضرت ابوالدرداءؓ کی روایت ہے۔
حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:
"باپ جنت کے دروازوں میں سے درمیانی
دروازہ ہے۔ جس کا جی چاہے اس دروازے
کی حفاظت کرے اور جو چاہے اسے برباد کردے" [2]
یہ آیات اور احادیث ماں باپ کے حقوق کو بھی بتاتی ہیں۔
اور اس سے یہ بھی معلوم ہوا کہ ہم ان کے ساتھ بھلائی کی خدمت
اور عزت کرکے سعادت و کامیابی کا کتنا اونچا مقام حاصل
کرسکتے ہیں۔ اور ان کی بے ادبی اور نافرمانی کرکے کس
قدر ذلت اور تباہی و بربادی کے کتنے گہرے غار میں گرسکتے
ہیں۔ خدمت اور بھلائی کا اونچا سے اونچا جو درجہ ہوسکتا
ہو، ہمیں ان کے لیے کرنا چاہیے، شیخ امام محمد آفندی اپنی
نہایت قیمتی کتاب "النور المبین" میں تحریر
فرماتے ہیں:

ومن کمال البر ان تبذل مالک
وتحفظ مالھما وتأکل بعد اکلھما
وتنام بعد نومھما وتلبس بعد
لبسھما وتجتھد ان تعمل ما ییسرھما
ولو کانا کافرین۔

"بھلائی کا مکمل درجہ یہ ہے کہ ان کے اوپر
اپنا مال خرچ کرو، ان کا مال بچاؤ۔ پہلے ان
دونوں کو کھلاؤ پھر خود کھاؤ، پہلے (ان کی
خدمت کرکے ان کا سب کام پورا کرکے) ان
کو سلاؤ پھر خود سو، پہلے ان کو پہناؤ پھر
خود پہنو اور کوشش کرو کہ وہی کام کرو جس
سے وہ دونوں خوش ہوتے ہیں۔ چاہے وہ
دونوں کافر ہی ہوں" [3]

جی ہاں، چاہے ماں باپ کافر ہی ہوں پھر بھی ان کی
خدمت فرض ہے۔
حضرت اسماء بنت ابی بکرؓ کے پاس اُن کی
والدہ آئیں جو مشرکہ تھیں۔ انھوں نے حضورؐ
سے ان کے ساتھ رویے کے بارے میں سوال
کیا، آپؐ نے احترام اور عزت کرنے کا حکم
دیا۔ [4]

اور دور کیوں جائیے! اپنے بزرگوں میں حضرت مولانا
عبید اللہ سندھیؒ، حضرت شیخ الہندؒ کے تربیت یافتہ
اور چہیتے شاگرد کی والدہ سکھ تھیں، آپ ہمیشہ ان کا خیال
رکھتے تھے۔ مالی اور جسمانی خدمت کے لیے حاضر رہتے تھے۔
اپنے مال کو جمع رکھنا اور والدین کے مال سے خرچ کرتے
رہنا یا ان کے پیسوں کو اپنی اولاد پر خرچ کرنا یہ سب بڑی
بدبختی، بدنصیبی کی بات ہوگی۔ اِس طرح اپنی شریک حیات
کی ضرورتوں اور ناز نخرے میں بوڑھے والدین کو بھول
جانا، فراموش کردینا سخت عذاب کی بات ہے۔ یہ نہیں کہ
ماں باپ کی خدمت میں لگ کر بیوی بچوں کو بھول جائے۔ یہ
بھی عذاب ہی کی بات ہوگی۔ دونوں کے حقوق اپنی اپنی جگہ
ہیں۔

پھر اس کا عذاب آخرت میں تو ہے ہی، دنیا میں اس
کی سزا یہ ملتی ہے کہ ایسے شخص کی اولاد بڑھاپے میں اس کے
ساتھ بے خبری اور بے توجہی کا معاملہ کرتی ہے۔
معلوم نہیں بوڑھے ماں باپ (یا ان میں سے کوئی
ایک جو موجود ہے) کب رخصت ہوجائیں اور یہ نعمت چھن
جائے۔ اس لیے خوب دل لگا کر ان کی خدمت کرنی

[1] ترمذی کتاب البر [2] ترمذی کتاب البر (برباد کردے یعنی اپنے اوپر دروازے کو بند کر لے)
[3] نور المبین ص ۲۶۵ [4] کتاب البخاری باب الجزیہ والادب

ہے۔ ماں باپ کی خدمت اور ان کے دل سے نکلی ہوئی دعائی برکت سے جسمانی عافیت و آرام، عمر میں خیر و برکت، رزق میں وسعت و برکت، اپنی اولاد میں تابعداری و فرمانبرداری، ان کی طرف سے سرور و اطمینان بہت سی دنیاوی نعمتیں یقیناً نصیب ہوں گی، پھر یہ تو دنیا کی لذتیں ہیں۔ اللہ پاک مرنے کے بعد اپنے یہاں جو انعامات دیں گے ان کا تو اندازہ ہی نہیں کیا جا سکتا۔

واقعہ یہ ہے کہ ایسی ذات کا حق تو ادا ہی نہیں ہو سکتا جیسی ماں باپ کی مقدس ذات ہے، بچپن سے غور کیجیے جب بچہ کسی قابل نہیں ہوتا، اس کی پرورش اور تربیت میں اپنے بہترین مالی، اپنی جان، رات کی نیند، دن کا چین سب قربان کر دیا۔ ماں بچے کی ذرا سی تکلیف پر تڑپ اٹھی۔ باپ نے سیکڑوں محنتوں شفقتوں سے اس کی ضروریات پوری کی۔ کیا ایسی ذات کا بدلہ ممکن ہے؟ ہرگز نہیں۔ اگر اولاد اپنی کھال اور بدن کے چمڑے کاٹ کر والدین کو جوتیاں پہنا دے تب بھی ان کا حق ادا نہیں ہو سکتا۔ ایسی مبارک ذات کہ وہ جو بھی دعا تمہارے لیے کر دے، اللہ پاک ضرور سن لیں گے۔ اب چاہے ان کی دعا لے کر دونوں جہاں میں عیش کر لو اور چاہے ان کو ناراض کر کے دونوں جہاں کی بربادی لے لو۔ کیوں کہ اگرچہ ماں باپ بد دعا نہ کریں (یہ ان کی محبت ہے) مگر اتنی بات اپنی جگہ طے ہے کہ

عقوق الوالدین موجب لسوء الخاتمۃ۔ نعوذ باللہ۔
ماں باپ کی نافرمانی سے سوء خاتمہ کا ڈر رہتا ہے۔ اللہ تعالیٰ ہم سب کی اس سے حفاظت فرمائے۔"

جس خوش نصیب کو ماں باپ دونوں یا دونوں میں سے کوئی ایک زندہ سلامت مل جائیں تو وہ یہ سعادت حاصل کرے جس کا ذکر اوپر ہوا۔ اور اگر قسمت سے دونوں نہیں ہیں، ان کی خدمت اور ان کے ساتھ نیکی کر کے اللہ رضا حاصل کرنے کا موقع پھر بھی باقی ہے۔ صرف نوعیت بدل گئی ہے۔ خوش نصیب اور کامیاب ہے وہ شخص جو والدین کے انتقال کے بعد بھی ان کے ذریعہ اپنی آخرت اور جنت بنا لے جائے اور اللہ اور اس کے رسول کو خوش کر لے۔ اس کا طریقہ ایسا ہوگا کہ ہمیشہ ہمیشہ ہر ہر وقت، نماز کے بعد پانچوں وقت اور ہر مبارک مجلس میں خواہ وہ علمی مجلس ہو یا ذکر و اذکار کی، والدین کے لیے دعا کرے، ان کے لیے استغفار کرے تھوڑا یا زیادہ چاہے ایک سورت، ایک آیت پڑھ کر ان کی روح کو بخشتا رہے، ثواب پہنچاتا رہے۔ صدقہ خیرات کر کے، غریبوں کی مدد کر کے، بھوکوں کو کھانا کھلا کر کے، مسکینوں کے ساتھ ہمدردی کر کے اس کا ثواب والدین کی روح کو بھیجتا رہے ماں باپ کو سکون ہوگا۔ اللہ کے نزدیک ان کے درجات بلند ہوں گے اور اللہ پاک اس شخص سے بے انتہا خوش ہوں گے۔ اس کے علاوہ والدین کے اعزا، رشتے دار، ملنے ملانے والوں، دوستوں کی رضا اور خوشی کا بھی سبب ہوگا۔

سچ تو یہ ہے کہ اللہ کے بعد انسان پر ماں باپ کا احسان ہے۔ اور اللہ پاک نے (جیسا کہ آپ نے پیچھے دیکھا) اپنی اور اپنے رسول کی اطاعت کے ساتھ ساتھ والدین کی فرماں برداری اور احسان کا ذکر فرمایا ہے۔ اس سے ماں باپ کی اطاعت، خدمت کا درجہ اور مقام طے ہو جاتا ہے۔ اب جس کے دل میں ایمان ہوگا، اللہ اور اس کے رسول کی محبت ہوگی، وہ ضرور اس حکم کو سر آنکھوں پر رکھے گا اور دنیا دار انسان کے لیے بھی اس میں دعوت اور عبرت ہے۔ کہ ماں باپ کی خدمت، ان کی خوشی سے دنیا بھی سنور جاتی ہے پھر کیا عجب کہ ایسے لوگوں کے لیے ان کی ایک دعا آخرت کی کامیابی کا سامان بھی کر دے۔

عبدالعزیز ٹونکی

غذائی نظام پر بین الاقوامی کانفرنس

علی گڑھ مسلم یونیورسٹی میں شعبۂ جغرافیہ کے تحت ایک بین الاقوامی کانفرنس دنیا کے غذائی نظام بالخصوص ہندوستان کا غذائی نظام پر ۱۵ سے ۲۰ فروری ۱۹۸۳ء تک منعقد ہوئی۔ سید حامد صاحب وائس چانسلر مسلم یونیورسٹی نے کانفرنس کی صدارت کی اور پروفیسر محمد شفیع چیرمین شعبۂ جغرافیہ نے جو دنیا کے غذائی نظام پر تحقیق کے بین الاقوامی کمیشن کے صدر بھی ہیں کانفرنس کے بنیادی مقاصد اور افادیت پر خصوصی خطبہ پیش کیا۔

کانفرنس میں ۱۰۰ مندوبین نے شرکت کی جو علاوہ ہندوستان کے مغربی جرمنی، جاپان، عراق، لیبیا، تھائی لینڈ، نیپال، یوگینڈا سے آئے تھے۔ کی نمائندگی سوشل سائنس کے ریجنل ایڈوائزر (بنکاک) نے کی۔ کانفرنس میں ۸۰ سے زائد مقالے پیش کیے گئے، اور ان پر سیر حاصل تبادلۂ خیال ہوا۔

جناب سید حامد صاحب نے اپنے صدارتی خطبے میں بتلایا کہ اس وقت دنیا میں غذائی لحاظ پر ایک تضاد پایا جاتا ہے۔ ایک طرف تو ترقی یافتہ ممالک میں غذا کی بہتات ہے اور دوسری طرف ترقی پذیر ممالک میں اس کی قلت ہے جس کے نتیجے میں غذائیت کی کمی آزار اور بیماریاں ہیں۔ انھوں نے FAO کے حوالے سے بتایا کہ دنیا کی ایک تہائی آبادی، دنیا کی دو تہائی غذائی پیداوار استعمال کرتی ہے۔ جب کہ باقی دو تہائی آبادی، ایک تہائی غذائی پیداوار استعمال کر پاتی ہے جس کے نتیجے میں دائمی طرح لاغری اور زبوں حالی کا شکار ہے۔ انھوں نے یہ بھی بتایا کہ اس وقت دنیا کی چار سو کروڑ آبادی ہے۔ خیال کیا جاتا ہے کہ اس صدی کے خاتمہ پر سات سو کروڑ ہو جائے گی اور ۲۱ ویں صدی کے نصف تک ڈیڑھ ہزار کروڑ تک پہنچے گی جس کے لیے موجودہ غذائی ذخیروں سے آٹھ گنا زیادہ ذخیروں کی ضرورت پڑے گی۔ انھوں نے ہندوستان کی بڑھتی ہوئی آبادی کے پیش نظر ملک میں غذائی پیداوار کے اضافہ کی طرف توجہ دلائی۔ یہ اضافہ نہ صرف اس لیے ضروری ہے کہ وہ بڑھتی ہوئی آبادی کے لیے کفیل ہو بلکہ تغذیہ کی مقدار بھی کافی ہو اور صحت بخش ہو۔ آپ نے اس طرف بھی توجہ دلائی کہ پیداوار میں اضافہ کے ساتھ ساتھ عوام کی قوت خرید میں بھی اضافہ ہونا چاہیے۔ لیکن پیداوار میں اضافہ ماحولیاتی توازن کے ساتھ ہو۔ اگر پیداوار میں اضافہ ماحول میں آلودگی پیدا کرتا ہے اور ماحولیاتی توازن میں خلل پیدا کرتا ہے تو بجائے فائدے کے دیرپا نقصان ہوگا۔ سید حامد صاحب نے اپنے خطبے پر

عظم مسز اندرا گاندھی کا وہ خطبہ یاد دلایا جو انھوں
دم میں Nations کی "خوراک و
ت کی تنظیم" کے روبرو دیا تھا۔ اس خطبے میں
ں نے کشمیر کی وہ مثل دہرائی جس میں کہا گیا ہے
خوراک انسان کو اس وقت تک ملتی رہے گی
انک جنگلات قایم ہیں۔"

پروفیسر محمد شفیع، چیرمین شعبۂ جغرافیہ جو
الاقوامی غذائی کمیشن کے بھی چیرمین ہیں، انھوں
پنے خصوصی خطبے میں دنیا کی غذائی صورت حال
جائزہ لیتے ہوئے بتایا کہ کس طرح غذا کی تقسیم میں
تی پائی جاتی ہے۔ آپ نے FAO کے حوالے سے
یا کہ دنیا میں پچاس کروڑ سے زیادہ افراد بھوک
ر فاقہ کا شکار ہیں جب کہ ترقی یافتہ ملکوں میں
سے چالیس فیصدی لوگ کثیر خوراکی (over-eating
ر موٹاپے کا شکار ہیں اور جو اس سے پیدا ہونے
لی بیماریوں کے سلسلہ میں اتنا روپیہ خرچ کرتے ہیں
تمام ترقی پذیر ممالک کی کل قومی پیداوار (Gross
National Product) کے نصف کے برابر
ے۔ آپ نے ہندوستان کا جائزہ لیا اور بتلایا
ملک میں پچھلے تبلیس (۳۲) سالوں میں غلے کی پیداوار
مستقل اضافہ ہوا ہے اور یہ ۱۹۵۰ء کے مقابلے
ن گنا ہوگئی ہے۔ لیکن اسی عرصے میں ملک کی آبادی
دگنی ہوگئی ہے جس کے نتیجے میں ملک کے آدھے سے
یادہ لوگوں کی غذائیت میں اور توانائی میں کمی
گئی ہے۔ پروفیسر محمد شفیع نے غلے کے تحفظ کے
سئلے پر بھی روشنی ڈالی اور بتایا کہ ترقی یافتہ
ملکوں میں غلے کے تحفظ پر تقریباً ۳ سے ۴ فیصد کا

غلے کا نقصان ہوتا ہے جبکہ ایک اندازے کے مطابق
تقریباً ۴ کروڑ ۲۰ لاکھ ٹن سالانہ ہے۔ ہندوستان میں
یہ نقصان ۱۰ فیصدی تک ہے جس کا مطلب تقریباً
ایک کروڑ ۳۰ لاکھ ٹن یا ۱۴ ارب روپے سالانہ ہے
پروفیسر محمد شفیع نے غذائی پیداوار کے سلسلے میں ایک
مربوط اور جامع نظریہ تیار کرنے کے لیے کہا جس میں
"کھیت پر غلے کی پیداوار" کاشت کے بعد کے مراحل
مثلاً غلہ کا سکھانا، اس کی نقل وحرکت، حفاظت، خرید و
فروخت، مناسب رقبے پر غلے کی پیداوار، مناسب
قیمت کا تقرر وغیرہ شامل ہوں۔

مغربی جرمنی کے مشہور جغرافیہ داں اور بین الاقوامی
جغرافیائی رسالہ "جیو جرنل" کے ایڈیٹر ڈاکٹر ولف
نے عالمی غذائی نظام پر زور دیا اور بتایا کہ دنیا کی
قومیں اس بات پر متفق ہیں کہ دنیا سے غذائی بحران
بھوک اور فاقہ جلد از جلد ختم کیا جائے اور اس کے
لیے ضروری ہے کہ ترقی پذیر ممالک میں خاص طور پر
پیداوار میں اضافہ ہوا اور غلے کے ذخیرہ اندوزی کے
سلسلے میں جو نقصانات ہوئے ہیں وہ ختم ہوں اور
عوام کی قوتِ خرید میں اضافہ ہو۔ ڈاکٹر ولف نے ہندوستان
میں غلے کے تحفظ کے سلسلے میں جو کوششیں ہو رہی
ہیں ان کی تعریف کی اور حکومت معمولی اور چھوٹے
کسانوں کو جو مدد دے رہی ہے، اس کو سراہا۔

جاپان کے پروفیسر اشی نے جاپان کی
زراعت کے خود کفیل ہونے کا ذکر کیا اور بتایا کہ ان
کے ہاں غلے اور خاص طور پر چاول کی پیداوار ملکی
ضروریات کے لیے پوری ہے اور جاپان کو کسی غذائی بحران
کا سامنا نہیں کرنا پڑ رہا۔ انھوں نے اس بات کی

طرف توجہ مبذول کرائی کہ پیداوار بڑھانے کے سلسلے میں ولایتی کھاد کے استعمال سے ماحولیاتی نظام پر ناخوشگوار اثرات پڑ رہے ہیں اور توانائی کا بے جا استعمال ہو رہا ہے۔

عراق کے پروفیسر ہنی اور پروفیسر داہاش نے گورنمنٹ کی ان کوششوں کا ذکر کیا جن کے نتیجے میں ملک میں غلہ کی پیداوار میں اضافہ ہوا ہے اور جس سے عوام کے تغذیہ کی صورت حال میں بہتری پیدا ہوئی ہے۔ ہندوستان کے غذائی نظام کی تعریف کرتے ہوئے آپ نے دونوں ملکوں میں تعاون پر زور دیا۔

لیبیا کے پروفیسر نجم نے بتایا کہ لیبیا کو غلے کے سلسلے میں خودکفیل ہونے کی ضرورت ہے اور ترقی پذیر ممالک غلے کی فی ایکڑ پیداوار اس قدر بڑھا سکتے ہیں کہ اپنی ضروریات پوری کر سکیں۔ دنیا کی آبادی کے تیزی سے بڑھنے اور اس کے لیے غذائی ضروریات پوری کرنے کے سلسلے میں کہا کہ اس بات کی ضرورت ہے کہ غذائی سسٹم پر ایک مربوط نظر ڈالنی چاہیے۔

یوگینڈا کے پروفیسر اوملا نے ایک دلچسپ پہلو پر نظر ڈالی اور بتایا کہ لوگوں کی غذائی عادتوں میں تبدیلی ہو رہی ہے۔ انھوں نے بتلایا کہ یوگنڈا میں وہ لوگ جو مغربی طرز کی غذا استعمال کرنے لگے تھے، اب وہ دیسی غذا کی طرف واپس آ رہے ہیں اور انھوں نے کیلے، فکا، آلو وغیرہ کا استعمال شروع کر دیا ہے۔

علی گڑھ کے سینیر پروفیسر محمد انس نے (جو آج ہم میں نہیں ہیں) زمین کی ملکیت کا زرعی پیداوار پر جو اثر پڑتا ہے، اس کی وضاحت کی تھی اور اس بات پر زور دیا تھا کہ جب تک زمین کی ملکیت کا جو ڈھانچہ ہے اس کو اس طرح سے نہ بدلا جائے گا کہ کاشتکار خود زمین کا مالک ہو، پیداوار میں خاطر خواہ اضافہ نہیں ہوگا۔

غذائی نظام اور اس سے متعلق بہت سے پہلوؤں پر مختلف مضامین میں بھی روشنی ڈالی گئی ہے غلے کی پیداوار بڑھانے کے سلسلے میں، غلے کی ذخیرہ اندوزی کے سلسلے میں، غلے کی فروخت اور نقل و حرکت کے سلسلے میں، شہری آبادی کی غلے کی ضروریات کے سلسلے میں، تغذیے کے سلسلے میں، زرعی زمین کے قطعوں کے سائز کے سلسلے میں مضامین پیش کیے گئے اور ان پر بحث ہوئی۔

ملک کے باہر سے آئے ہوئے اور ہندوستان کی یو پی سے ناشناس مندوبین کے لیے دو Tours رکھے گئے۔ ایک آگرہ کا جس میں آگرہ شہر کی تاریخ اور جغرافیہ بتایا گیا اور شہر کے مختلف اور اہم مقامات دکھائے گئے۔ دوسرا ٹور علی گڑھ کے قریب ایک گاؤں کا تھا جس میں مندوبین گاؤں اور گاؤں کے لوگوں سے بہ نفس نفیس ان کے حالات اور زراعت کا مطالعہ کر سکیں۔

کانفرنس کے آخر میں کئی تجویزیں متفقہ طور سے پاس ہوئیں۔ لیبیا اور عراق کے مندوبین نے اعلان کیا کہ ۱۹۸۴ء اور ۱۹۸۵ء میں علی الترتیب اس بات کے امکانات ہیں کہ کانفرنس ان کے ملک میں ہو۔ یہ تجویز بھی پاس ہوئی کہ علی گڑھ میں اس کا سکریٹریٹ (Secretariat) قائم کیا جائے اور ایشیا، افریقہ اور جنوبی امریکہ کے ممالک سے رابطہ قائم کیا جائے۔

زندگی کی قوت پنہاں کو کر دے آشکار
تا یہ چنگاری فروغ جاوداں پیدا کرے

سرسید احمد خاں کے رفیق
نواب محسن الملک

سید احمد خاں کے رفقاء میں نواب محسن الملک کی خاص جگہ تھی۔ سید صاحب مرحوم کے انتقال کے بعد وہی ان کے اصلی جانشین ہوئے اور علی گڑھ کالج کے سکریٹری منتخب کیے گئے۔

مسلمانوں کی واقفیت نہ ملک کی تاریخ سے ہے اور نہ اپنی تاریخ سے۔ یہاں تک کہ تحریک آزادی کی تاریخ سے ہم آشنا نہیں۔ اور اس تحریک میں جو مسلمانوں کا حصہ تھا اس سے ہم اہل وطن سے بھی زیادہ ناواقف ہیں۔ اکثریت کے ذمہ دار لوگ اگر مولانا محمد علی سے زیادہ محمد علی کلے سے واقف ہیں اور سر اجمل خاں کو حکیم اجمل خاں مرحوم خیال کرتے ہیں تو ہماری معلومات بھی ان قومی مجاہدوں کے بارے میں کچھ زیادہ نہیں۔

نواب محسن الملک انیسویں صدی کے نوابوں کے خاندان سے تعلق نہ رکھتے تھے اور نہ کوئی امیر و کبیر تھے۔ وہ ایک معمولی آدمی تھے اور اپنی محنت اور قابلیت کی بنا پر ترقی کر کے گمنامی کی حالت سے نکل کر ملک گیر نیک نامی اور شہرت کے درجہ تک پہنچے تھے۔ گویا وہ ان لوگوں میں سے تھے جو جوہر ذاتی سے مرتبۂ کمال کو پہنچ جاتے ہیں۔ ان کی زندگی دس روپے ماہانہ کی تنخواہ سے شروع ہوئی۔ اور تین ہزار روپیہ ماہانہ تنخواہ تک پہنچی۔

ان کا نام سید مہدی علی تھا۔ وطن اٹاوہ (یو۔پی کا ایک شہر) تھا۔ ابتدائی تعلیم اٹاوہ ہی میں حاصل کی۔ کلکٹری میں ملازم ہو گئے۔ کچھ دن بعد اہل مد ہو گئے اور پھر ترقی کرتے کرتے حیدرآباد پہنچے اور وہاں ریونیو سکریٹری کے عہدہ تک ترقی کی۔ محسن الملک ان کا خطاب تھا جو ان کو حیدرآباد میں دیا گیا تھا۔ حیدرآباد کی اس ملازمت سے سبکدوش ہو کر انھوں نے سید احمد خاں کے پاس آ کر علی گڑھ میں قیام کیا اور باقی زندگی قومی خدمت کے لیے وقف کر دی۔ سر سید احمد خاں کا انتقال ۱۸۹۸ء میں ہوا۔ ۱۸۹۹ء میں سید مہدی علی (محسن الملک) کا انتخاب علی گڑھ کالج کے سکریٹری کی حیثیت سے ہوا۔ وہ ۱۶ راکتوبر ۱۹۰۷ء کو شملہ میں اس دارِ فانی سے رخصت ہوئے۔ حالی نے ان کی وفات پر ایک درد بھرا قطعہ کہا اس کے چند اشعار حسب ذیل ہیں ؎

وہ ملک کا محسن وہ مسلمانوں کا غم خوار
سر کر کے مہم قوم کے کام آ گیا آخر
سید کا بدل قوم کو مشکل سے ملا تھا
اس کو بھی وہی قوم کا غم کھا گیا آخر

یوں جیتے ہیں یوں مرتے ہیں قوموں کے فدائی
دنیا کا تماشا یہ وہ دکھلا گیا آخر
مہدی کے لیے قوم عزادار ہے ساری
کہرام ہے کشمیر سے تا راس کماری

محسن الملک کی یادگار چند کتابیں اور وہ مضامین ہیں جو سید احمد خاں کے جاری کردہ تہذیب الاخلاق میں شایع ہوئے۔ یہ مضامین محسن الملک کا ادبی کارنامہ ہے۔ ایک مضمون محسن الملک نے تمثیلی رنگ میں لکھا تھا۔ اس مضمون کے اقتباسات ذیل میں تحریر ہیں۔

موجودہ تعلیم وتربیت کی شبیہ۔ ایک روز خیال نے مجھے عالم مثال تک پہنچایا اور اس طلسم کدے کو جہاں سب چیزوں کی شبیہ اور تمام حالتوں کی تصویر مصورِ قدرت نے کھینچ رکھی ہے دکھایا، درحقیقت میں نے اسے ویسا ہی پایا جیسا سنا کرتا تھا۔ بلا شبہ وہ ہماری حالتوں کا آئینہ اور ہمارے خیالوں کی تصویر کا مرقع ہے جب میں اس طلسم خانہ کی مغربی جانب پہنچا تو ایک چار دیواری دیکھی جو میرے خیال سے بھی زیادہ مضبوط تھی۔......... میں نے وہاں ایک رفیق پایا جس کا نام خرد تھا۔ اس سے حقیقت اس کی پوچھی تو اس نے کہا کہ اس کے اندر ایک پر فضا باغ ہے جسے جنت عدن بھی دیکھے تو شرمندہ ہو۔......... میں چندے اس باغ میں رہا مجھ کو اپنی صورت کا کوئی رفیق نہ ملا جس سے دل بہلاتا...... آخر بعد چند سال کے مشرق کی طرف مجھے ایک چار دیواری نظر پڑی جس کی صورت بھی ویسی ہی تھی اور چشمہ بھی ویسا ہی تھا جہاں سے میں نکلا تھا مگر دروازہ کھلا ہوا اور دیوار شکستہ... میں نے اپنے رہنما سے پوچھا۔ اس نے کہا یہ وہ باغ نہیں ہے، دوسرا ہے۔ پہلے اس باغ کی طرح آراستہ تھا۔ خزاں کی ہوا نے اس کو سکھا دیا اور زمانے کے انقلاب نے پامال کر دیا۔ جب میں نے ان چشموں کا حال پوچھا تو خرد نے تحقیق نامی رفیق کو میرے ساتھ کر دیا۔ اس کے ساتھ میں ان دونوں کی حقیقت دریافت کرنے چلا...... تب تاریخ نامی ایک روشن ضمیر ملا۔ اس نے کہا کہ ہزار برس ہوتے ہیں، تب میں اس باغ میں آیا تھا۔ نہایت تر و تازہ سبز و شاداب تھا۔ جیسا وہ باغ جو تم نے اول دیکھا تھا۔ اس باغ کی نہروں میں صاف چشمہ کا پانی آتا تھا اور گندے چشمے پر پتھر رکھا ہوا تھا۔ مگر سرکتے سرکتے اب چشمے پر آ گیا ہے۔ تب تو میں نے خیال کیا، اس پتھر کو ہٹا دوں۔ چنانچہ میں ہمت کو ساتھ لے کر چلا۔ مگر چند خونخوار وحشی درندوں نے مجھ پر حملہ کیا اور پتھر سرکانے پر مجھ کو موت کا خوف دلایا۔ میں جان بچا کر ہٹا...... میں نے چاہا کہ اس خیال کو چھوڑ دوں اور پتھر جیسا ہے ویسا ہی رہنے دوں، پر استقلال نامی ایک رجز خواں نے میرا دل بڑھایا اور مجھے ایک تدبیر بتائی۔ اس نے کہا۔ میں نے ایمان نامی فقیر سے سنا ہے کہ اس چشمے کا ایک کھودنے والا ہے، وہ سب مشکل حل کر سکتا ہے۔ مگر بڑی مشکل سے انسان کی رسائی اس تک ہو سکتی ہے۔ اس کی راہ میں اول تو مصیبت کا ایک بڑا میدان لق و دق ملتا ہے جس میں سوائے آنکھ کے پانی کے پینے کو بھی کچھ نہیں۔ اگر اس سے بچ گئے تو رسوائی اور بدنامی کے سات سمندر ملتے ہیں۔ جہاں صبر کی ٹوٹی پھوٹی کشتی کے سوا عبور کا کوئی ذریعہ نہیں۔ تب دروازہ اس کا ملتا ہے جہاں اخلاص کی نذر پیش کرنی پڑتی ہے اور دعا کے پاک صاف

ہاتھوں کے ذریعہ پہنچائی جاتی ہے۔ تب وہ نذر قبول ہوتی ہے اور اجابت کا خلعت ملتا ہے ...... پس اگر تم کو اس پتھر کے سرکانے کی خواہش ہے تو وہاں تک جاؤ۔ اگر اس تک تمہاری رسائی ہوئی اور اس نے تمہاری نذر لے لی تو وہ اقبال کو تمہارے ساتھ کرے گا۔ جب تم اس کو لوگوں کے سامنے لاؤ گے، سب کی آنکھیں کھل جائیں گی جو اب بند ہو رہی ہیں۔ تب وہ اپنے سوکھے ہوئے باغ کو دیکھ کر تعجب کریں گے اور تمہارے ساتھ پتھر سرکانے پر مستعد ہوں گے ....

جب میں عالم مثال سے لوٹا اور لوگوں سے قصہ کہا تو وہ سب ایک ایک لفظ کی حقیقت مجھ سے پوچھنے لگے۔ میں صرف یہ کہہ کر "جو باغ ہرا بھرا میں نے مغرب میں دیکھا وہ علوم و فنون جدیدہ کا باغ ہے جس کے پھل پھول ہم اپنی آنکھ سے دیکھتے ہیں، یہ ہمارا دل بہلانے والا وہاں کوئی نہیں ہے اور جو باغ خشک میں نے مشرق میں دیکھا وہ ہمارے ہی علوم قدیمہ کا باغ ہے جس کی ویرانی اور خزاں کی کیفیت ہمارے سامنے ہے وہ پتھر جو سرچشمہ پر آ گیا ہے، جہالت ہے۔ وہ ندی نالے گندے پانی کے رسم و رواج کی پابندی، نیچی نما تعصب، علم نما نادانی، کھوٹا زہد، جھوٹی شیخی، جاہلانہ تقریر، عامیانہ غلامی، ضرر انگیز حرارت، وحشیانہ تعلیم و تربیت ہے جس کا نتیجہ مسخ انسانیت ہے جو اپنی آنکھوں سے دیکھتے ہیں۔ اور جس کا علاج ہم سوائے دعا کے کچھ نہیں پاتے" چپ ہو رہا۔

انتخاب از تاریخ ادب اردو

مرتبہ حامد حسن قادری۔ صفحہ نمبر ۲۸۵۔

بقیہ مضمون مذہب کیوں اور کس لیے؟

ہے کون سا نظریہ موجودات عالم کے اسرار و رموز کی تحقیق پر آپ کو آمادہ کرتا ہے؟ یہ نظریہ آپ کو تحقیق پر تیار کرتا ہے کہ تمام موجودات کو ایک صاحب عقل و شعور طاقت نے اپنے ارادے اور اختیار سے مخصوص اغراض و مقاصد کا لحاظ کرتے ہوئے منظم اور مرتب شکل میں پیدا کیا ہے یا یہ نظریہ آپ کو چھان بین کرنے پر ابھارتا ہے کہ یہ عالم بے شمار ایٹموں کے اتفاقاً اکٹھا ہو جانے کی وجہ سے وجود میں آ گیا ہے؟ اس کی خلقت میں کسی ارادے کا دخل نہیں ہے۔ اس کے وجود کا کوئی مقصد نہیں ہے اگر اس کی کسی چیز میں نظم و ترتیب دکھائی دے تو وہ اندھے، بہرے، ناسمجھ اتفاقات کا نتیجہ ہے؟

ظاہر ہے کہ صرف خدا پرستوں کا نظریہ وہ ہے جو انسان سے فرمائش کرتا ہے کہ آگے بڑھو اور کائنات کے چھپے ہوئے بھیدوں کا پتہ چلانے کی کوشش کرو۔ جب تک ایک محقق کے دل کی گہرائیوں میں یہ عقیدہ موجود نہ ہو کہ یہ عالم وجود مرتب و منظم ہے، اس میں علل و معلولات، اسباب و نتائج کے سلسلے موجود ہیں اس وقت تک وہ ہرگز تحقیق و جستجو کی زحمت نہیں برداشت کرے گا۔

(سر) سید احمد خان

طریقۂ زندگی

(تہذیب الاخلاق بابت ۱۵ جمادی الثانی ۱۲۸۸ھ)

قوموں کی عزت یا ذلت اُن کی رسم و رواج اور ان کے طریقۂ زندگی اور کبھی کبھی ان کے مذہب سے بھی علاقہ رکھتی ہے۔ تمام قوموں میں بہت سی رسمیں وحشیانہ اور ناتربیت یافتہ زمانہ کی اب تک چلی آتی ہیں۔ مگر تربیت یافتہ قوموں نے ان رسموں کو تراش تراش کر ایسا کر لیا ہے کہ ان میں وحشیانہ پن مطلق نہیں رہا، بلکہ نہایت فرحت بخش اور دلکش ہو گئی ہیں اور ناتربیت یافتہ قومیں اب تک بدستور وحشیانہ طور سے ان کو برتتی ہیں اور اسی لیے پہلی قومیں پچھلی قوموں کو ذلت اور حقارت کی نظر سے دیکھتی ہیں۔

اکثر قوموں نے قدیم زمانہ میں طریقۂ زندگی بمقتضائے آب و ہوا ہر ایک ملک کے اختیار کیا تھا جو اکثر نہایت سادہ و حقارت آمیز تھا، مگر تربیت یافتہ قوموں نے اس میں اصلاح کرتے کرتے اعلیٰ درجہ کی ترقی اور شائستگی پر پہونچا دیا اور ناتربیت یافتہ قومیں اسی جہالت میں پڑی رہیں اور اس لیے پہلی قوموں کی آنکھ میں ذلیل و خوار ہیں۔

یہ امر بھی بہت واقع ہوا ہے کہ بسبب دھونے فنون و ہنر کے ہر ایک قوم نے جو طریقۂ زندگی بسر کرنے کا اختیار کیا تھا وہ اس زمانہ میں حقیر نہ تھا، مگر حال کے زمانہ میں ذلیل ہو گیا۔ چنانچہ جس قدر فن و ہنر و صنعت کاری نکلتی آتی اسی قدر تربیت یافتہ قوموں نے ساز و سامان سے اپنے طریقۂ زندگی کو آراستہ کر لیا اور جنھوں نے ایسا نہ کیا وہ ویسے ہی حقیر و ذلیل ناتربیت یافتہ رہیں۔

طریقۂ زندگی سے قوموں کی ذلت و عزت کا ہونا ایک ایسا امر ہے جس سے کوئی انکار نہیں کر سکتا مگر ہم چند مثالوں سے اس کو اور زیادہ واضح کرتے ہیں۔ ہندوستان میں کنجروں کی قوم کو دیکھو جو ایک لنگوٹی باندھے رہتی ہے اور نہایت میلا بدن اور نجس ہاتھ پاؤں رکھتی ہے اور نہایت میلے بدبودار برتن استعمال میں لاتی ہے۔ غذا بھی ان کی نہایت کثیف ہے اور طرز کھانے کا بھی ایسا بُرا ہے جسے دیکھ کر گھن آتی ہے۔ پس وہ قوم اپنے طریقۂ زندگی کے ذلیل ہونے کے سبب ہماری آنکھ میں کیسی ذلیل و خوار معلوم ہوتی ہے۔

اب ان قوموں کو دیکھو جن سے درجہ بدرجہ طریقۂ زندگی کی اصلاح میں ترقی کر لی گئی ہیں، مثلاً ہمارا

جن کا لباس اور طریقۂ زندگی گبروں سے بدرجہا اچھا
ہے۔ وہ ہماری آنکھ میں ویسے ذلیل نہیں ہیں۔
چماروں کی بہ نسبت عام غریب گنواروں کا لباس
اور طریقۂ زندگی بدرجہا نہایت عمدہ اور اچھا ہے۔ وہ
ہماری آنکھ میں چنداں ذلیل نہیں۔ ہم کبھی ان کے گھر
بھی جاتے ہیں، ان کے ہاں کا پانی بھی پیتے ہیں۔ ان
کے گھر کی پکی ہوئی روٹی بھی کھاتے ہیں اور کچھ نفرت
نہیں کرتے۔

علاوہ ان کے تین قومیں اور ہندوستان
میں ہیں جو اپنے تئیں مؤدب و مہذب، تربیت یافتہ
اور شائستہ سمجھتی ہیں۔

ہندو، مسلمان، انگریز، ان تینوں
قوموں کا جو طریق لباس اور طرز زندگی اور کھانے پینے
کی رسم اور اٹھنے بیٹھنے کی عادت ہے، اس سے تمام
لوگ ہندوستان کے بخوبی واقف ہیں۔ مگر اس میں
کچھ شک نہیں کہ ان تینوں قوموں میں سے جس قوم کا
طریقہ اعلیٰ ہے وہ قوم باقی دو قوموں کو ایسا ہی ذلیل
اور ناتربیت یافتہ اور قابل نفرت کے سمجھتی ہے جیسے
کہ ہم اپنے سے ادنیٰ قوموں کو سمجھتے ہیں۔

مسلمان اپنی دانست اپنے لباس
اور اپنی مجلس میں نہایت آراستگی اور شان و شوکت
کرتے ہیں اور اپنے دسترخوانوں کو انواع انواع
طرح کے لذیذ کھانوں سے اور خوبصورت خوبصورت
سونے اور چاندی، چینی اور بلوریں برتنوں سے
آراستہ کرتے ہیں۔ مگر جو قوم کہ ان سے بھی زیادہ
لباس میں اور کھانے پینے کے طریق میں زیادہ صفائی
رکھتی ہے، وہ ان کو اسی حقارت اور ذلت سے دیکھتی ہے

جو لوگ کہ چمچے اور کانٹوں سے کھاتے ہیں اور
ہر دفعہ رکابیاں چھری کانٹے چمچے بدلتے جاتے ہیں، جب
وہ ہم مسلمانوں کو ہاتھ سے کھاتے دیکھتے ہیں تو ان کو
نہایت نفرت اور کراہیت آتی ہے۔

ترکوں نے اگرچہ اپنا طریقہ بدل دیا ہے مگر مصری عورتیں اب
تک میز پر کھانا رکھ کر اور ہاتھ سے کھاتی ہیں۔ تھوڑے دن ہوئے کہ
پرنس آف ویلز یعنی ولیعہد سلطنت انگلستان مع پرنسس آف
آف ویلز یعنی ولی عہد بیگم کے مصر میں سیر کو تشریف
لے گئے تھے۔ اسماعیل پاشا خدیو مصر کی ماں نے
پرنسس آف ویلز یعنی ولیعہد بیگم کی محل سرائے
زنانہ میں دعوت کی اور اپنے ساتھ کھانا کھلایا۔
پرنسس آف ویلز کے ساتھ مس ولیم گرے صاحبہ بھی
بطور مصاحب کے تھیں اور دعوت میں بھی شریک
تھیں۔ انھوں نے وہاں سے واپس آکر سفر کا حال
لکھا ہے۔ چنانچہ جو کچھ انھوں نے طریق کھانا کھانے
کی نسبت لکھا ہے اس کا انتخاب ہم اس مقام پر
لکھتے ہیں تاکہ یہ بات معلوم ہو کہ دوسری قوم جو ہم
سے زیادہ صفائی سے کھاتی ہے ہمارے کھانا کھانے
کے طریق کو کیسا خیال کرتی ہے۔

مس صاحبہ ممدوحہ اس طرح پر لکھتی
ہیں کہ "کھانے کے کمرے کے اندر چاندی کی
ایک گول میز بچھی ہوئی تھی۔ فرش سے ایک فٹ اونچی
اور ایک بڑا خوان معلوم ہوتی تھی۔ اس کے گرد
گدے بچھے ہوئے تھے۔ ہم سب آلتی پالتی مار کر میز
کے گرد گدوں پر ہو بیٹھے۔ خدیو مصر کی ماں کی
دائیں طرف پرنسس آف ویلز بیٹھیں اور پھر
سب بیگمات درجہ بدرجہ بیٹھیں۔

سب سے پہلے ایک قاب میں مرغ کا شوربا
اور چانول یعنی خشکہ آیا اور سپی کے چمچے ملے۔ مگر نہ
چھری تھی نہ کانٹا تھا۔ اس کے بعد مٹن آیا اور دفعہ
دفعہ بیس قسم کے کھانے آئے جو ہاتھوں سے اور انگلیوں
سے توڑ توڑ کر کھائے جاتے تھے۔

جس قدر مجھ کو اس سے نفرت ہوئی اور
پھریری آ آ کر قے ہونے کی نوبت ہوئی، ایسی کبھی
نہیں ہوئی۔ کھانے میں انگلیوں کا ڈبویا جانا دیکھ
کر اور انگلیوں سے توڑ کر کھانے سے ایسی نفرت اور
گھن آتی تھی کہ میں نے ایک آدھ دفعہ تو کھانے سے
انکار کر دیا، مگر جو بیگم کہ میرے پاس بیٹھی ہوئی تھیں
انہوں نے جانا کہ میں شرماتی ہوں تو ہر دفعہ کھانا اپنے
ہاتھ سے لے کر میری رکابی میں رکھ دیتی تھیں اور
ایک دفعہ شوربے میں سے پیاز نکال کر میرے آگے
رکھ دی۔ اور میرا جی متلاتا جاتا تھا کھانے پر شراب
...ق نہ تھی، انتہیٰ مخلصاً

مس گرے صاحبہ کا جو یہ حال ہوا بلاشبہ
وہ اس کا سبب یہ تھا کہ اس طرح پر کھانے کی
ان کو عادت نہ تھی، مگر انصاف سے ہم کو اس بات
کا اقرار کرنا چاہیے کہ چھری اور چمچے سے کھانا اور
ہر ایک کے کھانے کے لیے جدا برتنوں کا ہونا بہ نسبت
ہاتھ سے کھانا کھانے کے زیادہ عمدگی و صفائی اور
نفاست رکھتا ہے۔

یہ بات کہی جاتی ہے کہ ہاتھ سے کھانا
سنت ہے اور اس کو حقیر سمجھنا کفر تک نوبت پہنچا
دیتا ہے۔ ہم اس رائے کی صحت و سقم کی بحث سے
قطع نظر کر کے اس کو تسلیم کرتے ہیں اور جو یہ کہتے
ہیں کہ ان بزرگوں کی آدھی پیروی کرنا باعث ذلت
ہے۔ اگر مسلمان یہ بھی گوارا کریں کہ مرغن کھانے جن سے
ہاتھ اور منہ بھر جاتا ہے اور یہی امر باعث نفرت اور
گھن آنے کا ہوتا ہے، چھوڑ دیں اور جو کے بن چھنے آٹے
کی سوکھی روٹی ککڑی یا کھجور سے کھایا کریں تو ان
بزرگوں کی پوری پوری پیروی ہو گی اور اس وقت
کوئی بھی ہاتھ سے کھانے پر نفرت نہ کرے گا۔ مگر یہ
نہیں ہو سکتا ہے کہ کھانے تو ہوویں فرعونی اور طریق
کھانے کا ہو سنونی۔

ہم کو خدا کا شکر کرنا چاہیے کہ اس نے ہم کو
اپنی نعمتیں عطا کی ہیں۔ ہم ان کو استعمال کریں اور
عملی طور پر اس کا شکر بجا لاویں اور جب کہ ہم یہ خیال
کریں کہ ان شان کی چیزوں کا ہم بنظر تکبر و غرور
استعمال نہیں کرتے بلکہ بطور ادائے شکر ولی النعم
استعمال کرتے ہیں اور مسلمانوں کی قوم کو غیر قوموں
کی نگاہ میں جو ذلت ہے اس سے نکالتے ہیں، جس
میں اسلام کی بھی عزت ہے تو اس وقت تو ہم چمچے
اور چھری کانٹے سے کھانا مندوبات اور مستحبات سے
کم نہیں سمجھتے۔ کما قال علیہ الصلوٰۃ والسلام
"انما الاعمال بالنیات"۔

انیسویں صدی میں دنیا کی جو فضا تھی اس کے تحت
سر سید نے اپنے تاثرات کا اظہار کیا اور بہت خلوص نیت
کے ساتھ کیا۔ اسلامی تعلیمات اور سنت نبوی کے تحت کھانا کھانے
سے پہلے اور بعد میں ہاتھ دھونے کی ہدایت ہے۔ منہ صاف کرنے اور
دانت صاف کرنے کی تاکید ہے۔ ہاتھ سے کھانا کھانا اس کے بعد کسی قسم
گھن کا سبب نہیں ہونا چاہیے۔ جدید تحقیق کے مطابق ہاتھ سے کھانا

ہمدردی

ہر کوئی اپنی آپ ہمدردی کرتا ہے۔

تہذیب الاخلاق جلد نمبر ۱ نمبر ۳ بابت یکم ذی قعدہ ۱۲۸۷ھ

کیا دھوکے کی چیز ہے! کیا بھلاوے میں پڑے ہیں جو سمجھتے ہیں کہ دوسروں کی مصیبت میں مدد کرنا ہمدردی کرنا ہے۔ کیا قدرت کا کوئی کام بے فائدہ ہے؟ نہیں۔ گو ہم بہتوں کے سمجھنے سے عاجز ہیں۔ کیا ہم اس فائدے میں شریک نہیں؟ نہیں بے شک واسطہ یا بلا واسطہ یا بواسطہ در واسطہ شریک ہیں۔ پھر دوسرے کی مدد کرنا کہاں رہا بلکہ اپنی آسائش کے کسی وسیلے کے اپنی مدد آپ کرنا ہوا، اس لیے جو لوگ ہمدردی کرتے ہیں، وہ حقیقت میں اپنی آپ مدد کرتے ہیں اور جو نہیں کرتے وہ خود اپنی آسائش کے وسیلے کو نقصان پہنچاتے ہیں۔

ہمدردی کا لفظ ہمارے خیال ایسی امداد کی طرف لے جاتا ہے جو رنج و مصیبت کی حالت میں ہو لیکن اگر ہم مصیبت کے لفظ کی اصلی مراد پر غور نہ کریں تو ہم دور غلطی میں پڑیں۔

عام مفہوم مصیبت کا جو اس لفظ سے ہماری سمجھ میں آتا ہے کوئی مستقل مفہوم نہیں ہے بلکہ نسبتی مفہوم معلوم ہوتا ہے۔ جو چیز کہ ایک کے لیے مصیبت ہو ممکن ہے کہ دوسرے کے لیے نہ ہو۔ وہ عادت اور استعمال سے ایسی منکشف ہو جاتی ہے کہ مصیبت معلوم نہیں ہوتی۔ وہ کسی جوش کے سبب سے ایسی بدل جاتی ہے کہ بالکل راحت سمجھ میں آتی ہے۔ بایں ہمہ یہ تمام مفہوم نسبتی ہیں اور جو اصلی مفہوم ہے وہ ایسی حالت کا ہونا یا واقع ہونا ہے جو قدرتی فرحت اور راحت کے برخلاف ہو۔

اس حالت کا ہونا غیر اختیاری حالت کا ہونا ہے اور واقع ہونا اختیاری حالتوں کا، مگر پچھلی حالت اگر نتیجہ کی ناعلمی یا نقصانات غیر مندی کے سبب سے ہے تو مجازاً وہ پہلی ہی سی ہے ورنہ حقیقت میں وہ مصیبت نہیں بلکہ ہنر ہے اور اس لیے اس میں ہمدردی نہیں، پس اصلی یا اصلی سی مصیبت میں کسی کی مدد کرنا البتہ سچی ہمدردی ہے۔

رحم اور موانست اور ہمدردی شاید نتیجے میں متحد ہوں مگر ہر ایک کا منشا مختلف ہے۔ رحم ایک قدرتی نیکی ہے جو ہم جنس اور غیر ہم جنس دونوں کے ساتھ برتی جاتی ہے۔ موانست کا اثر صرف ہم جنسوں ہی میں پایا جاتا ہے۔ ہمدردی جو عقل کے نتیجوں میں سے ہے، ذی عقل ہی میں ہو سکتی ہے اور اس لیے صرف انسان ہی میں منحصر ہے۔ پس جس میں ہمدردی اس کی انسانیت میں نقصان ہے۔

قدرتی قاعدے کے مطابق ہمدردی کے بہ تفاوت اپنی آسائش کے وسیلوں کے بقدر درجے ہیں، جس طرح کہ باپ، بھائی، جورو، بچے پھر اور درجہ بدرجہ کے رشتہ مند، پھر اپنے ملک کے پھر اپنے ہمسایہ ملک کے، پھر اس سے دور کے ملک کے باشندے

درجہ بدرجہ ہماری آسائش کے وسیلے ہیں۔ اسی طرح اس
قادر مطلق کی کامل قدرت نے ہمدردی کے رشتے کی
مضبوطی اور استواری کو بھی درجہ بدرجہ بنایا ہے۔ باپ
کو بیٹے سے جو جوش ہمدردی ہے وہ پوتے سے نہیں اور
جو پوتے سے ہے وہ پڑپوتے سے نہیں۔ اسی طرح یہ
رشتہ جتنا کہ بڑھتا جاتا ہے اتنا ہی گھٹتا جاتا ہے اور
جب وہ اپنے ملک یا ہمسایہ ملک یا اس سے دور کے
ملک تک پہنچتا ہے تو اور بھی پتلا ہو جاتا ہے۔

بعض کہتے ہیں کہ یہ ایک دھوکہ ہے
اور اگر دھوکہ نہیں ہے اور یہ متفاوت درجے قدرتی
ہیں تو ان جان بیٹے اور ان پہچان باپ میں کیوں وہ
ہمدردی نہیں۔ حقیقت میں یہ صرف ایک خیال ہے
جس سے موانست پیدا ہوتی ہے اور وہی باعث ہمدردی
ہے۔ نفرت جو اس کی ضد ہے اس کا بخوبی ثبوت
کرتی ہے کہ جب وہ پیدا ہوتی ہے تو باوجود موجود
ہونے قدرتی رشتے کے کچھ بھی ہمدردی نہیں رہتی۔

بیشک ایسا یا ایسا سا ہوتا ہے، مگر اس میں
کچھ غلطی بھی ہے۔ قریب رشتے والا بہ نسبت دور کے
رشتے والے کے بلاشبہ ہم سے زیادہ جزئیات رکھتا ہے
اور اسی طرح بعید بہ نسبت ابعد کے۔ پھر اگر وہ جزئیت
قدرتی ہے تو وہ ہمدردی بھی قدرتی ہے۔ ہاں موانست
اس کو نہایت تیز کر دیتی ہے اور کبھی ایسی جو قدرتی
سی معلوم ہوتی ہے نفرت اس کی تیزی کو دباتی ہے۔
اور کبھی اس کو ایسا کر دیتی ہے جو بجھی ہوئی سی معلوم
ہوتی ہے۔ انجان بیٹے اور ان پہچان باپ میں
جو وہ چمکتی نہیں، نہ اس لیے کہ وہ نہیں ہے بلکہ اس
لیے کہ ان میں انسانیت کا ایک بڑا جزو جو علم یعنی
دانستن ہے وہ نہیں ہے۔ مگر تعجب یہ ہے کہ جو
ہمدردی اعلیٰ ہے وہ مذمت میں اعلیٰ اور صفت میں
ادنیٰ ہے اور جو ادنیٰ ہے وہ مذمت میں ادنیٰ اور
صفت میں اعلیٰ ہے اس لیے کہ ایک میں کھونا قدرتی
صفت کا اور دوسرے میں متصف ہونا قدرتی صفت
میں ہے۔

قریبوں سے ہمدردی نہ کرنی نہایت بدخصلت
قابل سزا کے ہے، اس لیے کہ قدرت کے نہایت مستحکم
قاعدے کو توڑنا ہے اور کچھ بڑی صفت نہیں۔ کیوں
کہ قدرت نے اس کے کرنے پر مجبور کر رکھا ہے۔
بعیدوں سے ویسی نہ کرنی کچھ سخت مذمت نہیں اس
لیے کہ قدرت کے کسی مستحکم قاعدے کی برخلافی نہیں اور
کرنی نہایت عمدہ صفت ہے، کیوں کہ قدرت کے منشا
کو بدرجہ اتم کامل کرنا ہے۔

افسوس ہے کہ یہ عمدہ صفت کبھی دھوکا
کھا کر معیوب بھی کر دی جاتی ہے جب کہ پہلی کو ادنیٰ صفت
سمجھ کر چھوڑتے ہیں اور دوسری کو اعلیٰ صفت سمجھ کر
پکڑتے ہیں۔ مگر پہلی کے چھوڑنے کی برائی دوسری کی
بھلائی کو بھی لے ڈوبتی ہے۔ پس سچی ہمدردی وہی ہے
جو قدرت کے قانون کے مطابق اور قدرت کی منشا
کی تکمیل کے لیے ہو۔

کیا عمدہ اور سہل طور پر عام عمل درآمد
کے لائق کر دیا ہے۔ اس مضمون کو بڑی قدرت والے
اور معاشرت و تمدن کے زبردست قانون جاننے
والے نے جب کہ ہم سے یوں کہا۔

لیس البر ان تولوا وجوهكم قبل
المشرق والمغرب ولكن البر من
آمن بالله واليوم الآخر والملائكة
والكتاب والنبيين وآتى المال
على حبه ذوي القربى واليتامى
والمساكين وابن السبيل والسائلين
وفي الرقاب"

ترجمہ: نیکی یہی نہیں ہے کہ منہ کرو اپنے مشرق
کی طرف یا مغرب کی طرف۔ لیکن نیکی وہ ہے
جو کوئی ایمان لاوے اللہ پر اور پچھلے دن پر

اور فرشتوں پر اور کتاب پر اور نبیوں پر اور دلیوے مال اس کی محبت پر قرابت والوں کو
اور یتیموں کو اور محتاجوں کو اور راہ کے مسافر کو اور مانگنے والے کو اور گردن
چھڑانے میں۔)
جو عمدہ ترتیب دی ہے اس میں بتائی ہے وہ بالکل قانون قدرت کے مطابق ہے جس سے یقین ہوتا ہے
کہ جس نے قدرت کے قانون کو بنایا ہے اسی نے یہ عملی قانون ہم کو دیا ہے۔ بیشک دونوں کا بانی ایک ہی
ہے جس کے فعل اور قول دونوں کا ایک ہی مقصد ہے۔

نمائشی حق پرستی

کبھی ایسا ہوتا ہے کہ پتھر کے اوپر کچھ مٹی جم جاتی ہے۔ اس مٹی کے اوپر سبزہ اُگ آتا ہے۔ بظاہر دیکھنے میں ایسا معلوم ہوتا ہے جیسے وہ کوئی کھیت ہو۔ لیکن اگر زور کی بارش ہو جائے تو مٹی سمیت سارا سبزہ بہہ جاتا ہے اور اس کے بعد صرف پتھر کی صاف چٹان باقی رہ جاتی ہے جو ہر قسم کی ہریالی اور نباتات سے بالکل خالی ہوتی ہے۔

یہی معاملہ اکثر انسانوں کا ہے۔ وہ دیکھنے میں بظاہر بالکل ٹھیک معلوم ہوتے ہیں۔ ظاہری طور طریق میں بہت "شاداب" نظر آتے ہیں۔ مگر حالات کا ایک حملہ ان کی ساری شادابی اور ہریالی کو ختم کر دیتا ہے۔ اس کے بعد ان کی شخصیت ایک سوکھے پتھر کی مانند ہو کر رہ جاتی ہے۔

ایک شخص جو بات چیت میں شرافت اور معقولیت کی تصویر بنا ہوا تھا وہ عملی تجربہ کے وقت اچانک ایک نامعقول انسان بن جاتا ہے۔ ایک شخص جو انصاف اور انسانیت کے موضوع پر تقریر کر رہا تھا وہ عمل کے موقع پر بے انصافی کا طریقہ اختیار کر لیتا ہے۔ ایک شخص جو مسجد کے رکوع اور سجدہ میں تواضع کا مظاہرہ کر رہا تھا وہ مسجد کے باہر انسانوں کے ساتھ معاملہ کرنے میں گھمنڈ اور خود پسندی کا مجسمہ بن جاتا ہے۔ ایک شخص جو دوسروں کو عالی ظرفی اور حقوق رسی کی تلقین کر رہا تھا، جب اس کا بیا وقت آتا ہے تو وہ بغض، حسد اور ظلم کے راستے پر چلنے لگتا ہے۔

یہ دنیا امتحان کی دنیا ہے یہاں ہر آدمی کی آزمائش ہو رہی ہے۔ یہ آزمائش معمول کے حالات میں نہیں ہوتی بلکہ غیر معمولی حالات میں ہوتی ہے۔ مگر عجیب بات ہے کہ آدمی عین اس وقت ناکام ہو جاتا ہے جب کہ اس کو سب سے زیادہ کامیابی کا ثبوت دینا چاہیے۔

لوگ باتوں میں حق پرستی کا ثبوت دے رہے ہیں۔ حالاں کہ حق پرستی وہ ہے جس کا ثبوت عمل سے دیا جائے۔ لوگ دوستی کے وقت خوش اخلاق بنے رہتے ہیں۔ حالاں کہ خوش اخلاق وہ ہے جو بگاڑ کے وقت خوش اخلاق ثابت ہو۔ لوگ خدا کے سامنے تواضع کی رسم ادا کر کے مطمئن ہیں۔ حالاں کہ کسی کا متواضع ہونا یہ ہے کہ وہ بندوں کے ساتھ معاملہ کرنے میں تواضع پر قائم رہے۔

ماخوذ از الرسالہ دہلی

پرنٹر پبلشر قاضی معزالدین احمد۔ مطبع لیتھو کلر پرنٹرس علی گڑھ۔ مقام اشاعت صفدر منزل تارنگلہ اے ایم یو علی گڑھ

” نوجوانوں کی پریشانی کا اصل سبب زندگی کا تضاد ہے۔ وہ بیک وقت اتنی متضاد چیزیں دیکھتے ہیں۔ گھر کا نقشہ کچھ دیکھتے ہیں، باپ دادا کی روایت کچھ سنتے ہیں اسکول یا کالج جاکر کچھ سنتے ہیں۔ ادب پڑھتے ہیں اور لٹریچر دیکھتے ہیں تو اس میں کچھ اور دعوت پاتے ہیں۔ ٹیلی ویژن اور ریڈیو پر وہ تفریح حاصل کرتے ہیں۔ وہ ان کو کچھ اور سکھاتا ہے اس نے ایسا کنفیوژن (Con-fusion) پیدا کر دیا ہے، ایک ایسا دماغی تضاد اور انتشار پیدا کر دیا ہے کہ فیصلہ نہیں کر پاتے۔ جب تک یہ حالت ہے کہ ایک گاڑی میں دو گھوڑے جتے ہوئے ہیں، ایک مشرق کی طرف لے جا رہا ہے اور ایک مغرب کی طرف لے جا رہا ہے۔ اس گاڑی اور گاڑی پر بیٹھنے والے مسافر کا اللہ ہی حافظ ہے۔ یہ تضاد سوسائٹی سے، ہمارے نظام تعلیم سے ختم ہونا چاہیے“۔

مولانا علی میاں کے افکار۔

جلد نمبر ۲ ۱۶ مئی ۱۹۸۳ شمارہ نمبر ۱۰

پس اے میرے پیارے نوجوان ہم وطنو اور
اے میری قوم کے بچو! اپنی قوم کی بھلائی پر کوشش
کرو، تاکہ اخیر وقت میں اس بڈھے کی طرح نہ پچھتاؤ
ہمارا زمانہ تو اخیر ہے۔ اب خدا سے یہ دعا ہے
کہ کوئی نوجوان اُٹھے اور اپنی قوم کی بھلائی میں
کوشش کرے، آمین

دستخط سیّد احمد

قیمت فی پرچہ ایک روپیہ ششماہی ۱۱ روپے

سالانہ ۲۰ روپے

بیرونِ ہند سے

فی پرچہ ایک ڈالر سالانہ ۱۵ ڈالر

ترسیل زر و خط وکتابت کا پتا

قاضی معز الدین احمد

صفدر منزل۔ تار بنگلہ۔ اے ایم یو

علی گڑھ 202001

یوپی۔

پندرہ روزہ تہذیب الاخلاق علی گڑھ

مدیر: سید حامد وائس چانسلر
علی گڑھ مسلم یونیورسٹی

مدیر مسئول: قاضی معز الدین احمد

جلد نمبر ۲ — ۱۶ مئی ۱۹۸۳ء — شمارہ نمبر ۱۰

خودسوزی

گذشتہ سے پیوستہ

ایسا لگتا ہے کہ خودسوزی کا یہ سلسلہ (مضامین) ختم ہونے میں نہیں آئے گا۔ قاہرہ سے واپسی میں چند گھنٹے دبئی میں ٹھہرنے کا اتفاق ہوا۔ روزنامہ "The Gulf News" (اخبار خلیج) میں ایک سرخی پر نظر پڑی "صحافت کی اخلاقیات پر شبہ کا نشان" نیویارک کے پاس ایک قصبہ جیکسن ویل میں سیسل انڈریوز جو چھتوں کی مرمت کیا کرتا تھا اور جس میں بے روزگاری کا مقابلہ کرنے کی سکت باقی نہ رہی تھی، مقامی ٹیلی ویژن اسٹیشن کو فون کیا کہ وہ امریکہ میں بے روزگاری کے خلاف احتجاج کے طور پر خود کو نذر آتش کر دے گا۔ اسٹیشن نے پولس کو اطلاع دی، پولس نے مذکورہ جگہ کو چھان ڈالا مگر کوئی نہ ملا۔ اسی اثنا میں کیمرہ مین رونلڈ سمنس (۳۰) اور ساؤنڈ مین گیری ہیرس (۲۱) وہاں پہونچے تو انڈریوز نظر آیا۔ وہ نشہ میں شرابور تھا۔ انھوں نے اسے باتوں میں لگائے رکھا اس امید میں کہ شاید پولس آجائے اور وہ لوٹ کر نہ گئی اور انڈریوز نے دیا سلائی جلائی اور اپنے سینے کے قریب لے گیا۔ انھوں نے کیمرا تیار کر لیا۔ اینڈریوز کو دوبارہ دیا سلائی جلانی پڑی۔ تب آگ نے اسے پوری طرح اپنی آغوش میں لے لیا۔ تب کہیں ہیرس اُسے بچانے کے لیے دوڑا۔ نیم سوختہ اینڈریوز ہسپتال میں داخل ہے۔ اس المناک ڈرامے کے ۳۷ سیکنڈ کیمرہ کی گرفت میں آگئے اور ٹیلی ویژن پر دکھائے گئے اور اخباروں میں بھی اس واقعہ کا چرچا ہوا۔ اس واقعہ سے اہل صحافت میں بحث چھڑ گئی ہے۔ ضمیر اور قدروں کا سوال اٹھ کھڑا ہوا ہے۔ سمنس اور ہیرس کا کہنا ہے کہ ان کا ضمیر صاف ہے۔ انھوں نے اپنا فرض انجام دیا۔ ان کا فرض ہے کہ حادثات کو بوقت وقوع اپنی گرفت میں لے آئیں۔

ایک دوسرے صحافی نے کہا "ان سوالوں میں سے جن کا جواب نہیں دیا جا سکتا، ایک یہ بھی ہے کہ اگر کیمرہ والا نہ پہنچتا تو کیا پھر بھی اینڈریوز خود کو جلاتا۔ اس کے علاوہ کیا اس تشہیر سے دوسرے لوگوں کی ہمت افزائی نہ ہوگی جو توازن اور عدم توازن کی سرحد پر ہیں۔"

کاد قرتا می ایکا دوسرے صحافی نے تبصرہ کیا

ہم طویل اور تلخ اداریے اس موضوع پر لکھتے ہوئے ہیں جھجکتے کہ کیپٹن، ڈاکٹر اور دوسرے پیشہ ور اخلاق حدوں سے بچاتے ہیں لیکن بعض اعتبارات سے ہمیں زندگی در صورت پر ڈکیتوں اور ڈاکٹروں سے زیادہ اختیار ہے۔ اس کے باوجود ہم کسی ضابطے یا کوڈ کو ماننے کے لیے تیار ہیں نہیں۔

بہر کیف زنیبت سے بے زار ایک بے روزگار کی احتجاجی خودسوزی نے ایک ایسا مسئلہ چھیڑ دیا ہے جو در اصل ہمارے دور کے میر ترین مسائل میں سے ہے۔ بیشتر صحافی یہ سمجھتے ہیں کہ انھوں نے کسی واقعہ کو جلد از جلد چھپوا دیا تو ان کا فرض پورا ہو گیا۔ وہ معاشرہ، انسانیت یا زندگی کے تئیں اپنے آپ کو ذمہ دار نہیں سمجھتے۔ یہ نادان اتنا بھی نہیں جانتے کہ ہر شئے جو عرضی وجود میں آتی ہے، ہر حادثہ جو وقوع پذیر ہوتا ہے۔ وہ زندگی کا ایک عضو ہے اور اسے زندگی سے الگ کرنا ایک طرف اسے مفلوج دوسری طرف خود اس کی زندگی کو مسموم کرنا ہے۔ ایک زمانہ تھا مصنفین کے ایک گروہ نے اپنی تخلیقات کو زندگی سے بالاتر سمجھنا چاہا اور ادب برائے ادب کا نعرہ بلند کر دیا۔ انجام کیا ہوا؟ رسوائی ہوا خیزی۔ جو کچھ وجود میں آتا ہے یا لایا جاتا ہے، جو حرکت بھی ہوتی ہے زندگی کے دائرہ میں اور زندگی کے لیے ہوتی ہے۔ جب مصنفین کا یہ حال ہوا تو صحافی کس شمار میں ہیں صحافیوں سے مراد ان سب لوگوں سے ہے جو ابلاغ کا کام کرتے ہیں۔ جو پیغام پہونچاتے ہیں، ابلاغ کے ذرائع میں بڑی طاقت ہے رائے عامہ کو بنانے اور بگاڑنے کی، عوام پر اثر انداز ہونے اور ان کے نقطہ نظر اور ردعمل کو ڈھالنے کی یہ طاقت سنبھال سکتی ہے، سدھار سکتی ہے سنوار سکتی ہے یہی طاقت بگاڑ سکتی ہے۔ فسادات اور شر پیدا کر سکتی ہے، برباد کر سکتی ہے ہر ذمہ دار آدمی کوئی بات کہنے یا کام کرنے سے پہلے یہ سوچتا ہے کہ اس کام کے نتائج اچھے ہوں گے کہ برے۔ اس ذمہ داری کا سے لاتعلق کیوں کر رہ سکتے ہیں کہ ان کے ہاتھوں میں قلم کی سب سے بڑی طاقت ہے۔

ان کا مقصد ہونا چاہیے انسان کی فلاح، زندگی کی پاکیزگی معاشرہ کی سنجیدہ باخبری۔ لیکن بہت سے صحافیوں اور ایڈیٹروں نے سنسنی کو مقصود اور شہرت کو ذریعہ بنا لیا ہے۔ کوئی اچھا تعمیری کام جو خاموشی اور سنجیدگی کے ساتھ کیا جا رہا ہے ان کے لیے درخور اعتنا نہیں ہوتا کیوں کہ ان ہی کی زبان میں اس میں خبر کا پہلو News Value نہیں۔ اگر کسی بڑی بستی میں نظم و ضبط اور سنجیدگی نظر آئے تو وہ اسے گورستان کی خاموشی سے تعبیر کریں گے، اگر ہنگامہ برپا ہو گا تو ان کی پو بارہ ہے۔ ایک بے روزگار آدمی زندگی سے تنگ آ کر جان دے رہا ہے انسانی فعل میں دیا سلائی لگانے کی دیر ہے اور امریکہ کے دو ابلاغیے اسے جلنے دے رہے ہیں کہ اگر وہ جلنے کا اعلان کرنے کے بعد بچا لیا جاتا ہے تو خبر کے لحاظ سے اس کی کوئی اہمیت نہیں رہتی اور اگر جلتا ہے اور اس کی تصویر ہاتھ آگئی تو پھر وارے نیارے ہیں۔ دنیا میں دھوم مچ جائے گی۔

پہلے ذکر آ چکا ہے کہ خود کو جلانے والوں کی دو قسمیں ہیں۔ ایک وہ کہ آگ دکھائی اور بھک سے اڑ گئے۔ دوسرے وہ جو تمام عمر جلتے رہتے ہیں۔ کبھی غم کی آنچ میں کبھی لوگوں سے ٹکرا کر جیسے پتھروں کے ٹکرانے سے چنگاریاں پیدا ہوتی ہیں۔ کچھ لوگ قدرت کی طرف سے زخم خوردہ ہیں اور محرومی کی آگ میں جلتے ہیں انھیں شاید جلنے کا حق بھی ہے لیکن جلنے کے بجائے اگر وہ اپنے اچھے پہلوؤں پر اور دوسروں کی محرومیوں پر نظر ڈالتے تو زندگی کو زیادہ سکون کے ساتھ گزار سکتے۔

ہم نے سوختن کے مصدر کی گردان کر دی۔ قارئین بھی اس جلنے جلانے سے اکتا گئے ہوں گے، ہم بھی تنگ آ چکے ہیں۔ جلنے جلانے کی ایک آخری شکل کا ذکر کر کے اس سلسلہ کو ختم کرتے ہیں۔ صرف یہی شکل ہے جو سراہنے کے لائق ہے یعنی دلسوزی دوسروں کے لیے اپنے دل کو جلانا، دوسروں کے درد سے بے تاب ہو جانا، ہمدردی کرنا، غمخواری کرنا کہ انسانیت اسی سے عبارت ہے اور انسان کی فضیلت اسی میں پنہاں ہے اور تہذیب کی منتہا کا راز یہی ہے۔

خیر مشتمد۔

خودسوزی کا تتمہ

مضامین کا وہ سلسلہ جو خودسوزی کے عنوان سے قسط وار تہذیب الاخلاق میں چھپتا رہا، پایۂ تکمیل کو پہونچ چکا ہے۔ لیکن واقعات اور حادثات کو ہونے سے کوئی نہیں روک سکتا۔ جہیز مانگنے کی لعنت کی دو مثالیں ہمارے علم میں حال ہی میں آئی ہیں۔ انھیں تتمہ کی شکل میں شایع کیا جارہا ہے

الامین سوسائٹی کی دعوت پر بنگلور جانے کا اتفاق گزشتہ ماہ میں ہوا۔ وہاں پتہ چلا کہ جنوبی ہند کے مسلمانوں میں جہیز مانگنے کی شرمناک عادت کیرالا تک محدود نہیں بلکہ کرناٹکا اور آندھرا پردیش میں بھی پھیلی ہوئی ہے۔ اللہ رحم فرمائے۔

آج ۱۰ مئی ۱۹۸۳ء کے قومی آواز لکھنؤ میں ایک سرخی پر نظر پڑی۔

عورت کی لاش قبر سے کھود کر نکالی گئی

سسرال والوں پر جلاڈالنے کا الزام

واقعہ اس طرح بتایا جاتا ہے کہ بجنور ضلع کے باشندے مسٹر محمد طاہر کی شادی سیتاپور کی لڑکی عشرت جہاں کے ساتھ ہوئی تھی۔ شوہر اپنی بیوی سے سائیکل اور گھڑی کا مطالبہ کرتا رہا۔ ایک روز لڑکی کے باپ کو اطلاع ملی کہ ان کی بیٹی کوٹھے سے گر کر مر گئی ہے۔ اس کی لاش کو جلد تا سے دفن کردیا گیا۔ ان کی درخواست پر پولس نے لاش قبر سے نکالا۔ وہ جلی ہوئی تھی۔ ظاہر ہے کہ بے غیرتی اور سفاکی کا یہ سلسلہ ہندوؤں اور مسلمانوں دونوں کو اپنی گرفت میں لے چکا ہے۔ ہندوستان کے علاوہ یہ لعنت شاید کسی اور ملک میں نہ ملے گی۔ اور ہم مہذب ہونے کا دعویٰ کرتے ہیں۔

سید حامد

بقیہ مضمون انسانیت کا مستقبل

ہٹ کر حاضرین کو تاکید کی کہ وہ زیادہ سے زیادہ تعداد میں نرسری اسکول قائم کریں جن میں انگریزی ذریعہ تعلیم ہو۔ کیوں کہ غیر مسلم نرسری اسکولوں میں جو تعلیم دی جاتی ہے وہ مسلم بچوں کے لیے انتہائی مضر ہے اور اس تعلیم کی وجہ سے ہماری نئی نسل پر ہندو مت غالب آتا جا رہا ہے

مولانا نے فرمایا کہ

صاحب استعداد مسلمان مسجدیں بنالینے کو ہی عبادت سمجھتے ہیں جب کہ صرف رواجی نیکیوں سے ملتِ اسلامیہ قائم نہیں ہو سکتی۔ وقت کے تقاضوں اور جدید فتنوں کو سمجھ کر چیلنجوں کا ہمیں مقابلہ کرنا ہوگا تاکہ ہم اپنی نئی نسل کا ایمان بچا سکیں۔

مولانا نے مزید کہا کہ

کلکتہ اپنی وسعت کے اعتبار سے ایک ملک ہے۔ اس ملک میں مسلمانوں کو چاہیے کہ کثیر تعداد میں ایسے نرسری اسکول قایم کریں جن میں نظم وضبط اور صفائی ہو ایسے مکتب قایم کرنے سے کیا فائدہ جہاں ہمارے بچے میلے کچیلے رہتے ہوں اور گالیاں بکتے ہوں۔ اور کھاتے پیتے مسلمان اپنے بچوں کو وہاں بھیجنے سے گریز کریں۔

ڈاکٹر ایس ایم وسیم — شعبہ کامرس

فرقہ وارانہ تشدد

ذمہ داری ایک ایک کی ....

تاریخ میں ہندوستان کا ذکر ہمیشہ فخر کے ساتھ کیا جاتا رہا ہے۔ دورِ قدیم میں بھی ہندوستان ایک اہم ملک خیال کیا جاتا تھا۔

طویل غلامی کٹا اور ملک آزاد ہوا۔ آزادی نے ہر ہندوستانی کے دل میں آرزوؤں اور امیدوں کو جنم دیا۔ ہر ہندوستانی کے دل میں یہ تمنا تھی اور ہے کہ ہندوستان دوسرے ممالک کے شانہ بہ شانہ ترقی کی منزلیں طے کرتا رہے اس مقصد کی تکمیل کے لیے ملک میں پنچ سالہ منصوبے تیار کیے گئے۔ ان منصوبوں کے نشانوں Targets کی تکمیل کے لیے یہ ضروری ہے کہ ہر فرد اپنی استعداد بھر ترقی اور تعمیر کے کاموں میں ہاتھ بٹاتا رہے۔ حقیقت یہ ہے کہ ترقی ہوئی — سماجی اور اقتصادی ترقی، جس کی وجہ سے معیار زندگی بلند ہوا اور آرام اور سکون بہتوں کے حصے میں آنے لگا۔ یہ اور بات ہے کہ اکثر و بیشتر تو وہی ہوا جس کی تلاش تھی۔ لیکن کبھی ایسا نہیں ہوا! دولت اور سماجی اور اقتصادی مواقع کے بٹوارے میں کچھ خامیاں بھی نظر آئیں۔ مگر اس میں کم و بیش ذمہ داری سب ہی کی ہے۔

افراد سے مل جل کر گروہ بنتے ہیں اور انھیں گروہوں کا مجموعی نام 'سماج' ہے۔ اگر آپس میں کوئی نامناسب بات ہو جاتی ہے، یا کوئی ناخوشگوار واقعہ پیش آجاتا ہے تو ہم اکثر ایک دوسرے کو قصوروار ٹھہراتے ہوئے سارے سماج کو موردِ الزام قرار دیتے ہیں۔ کبھی یہ کہتے ہیں کہ ذمہ داری سماجی اداروں کی ہے۔ دراصل اس کا مطلب اس کے سوا اور کچھ نہیں کہ ہم خود اپنے آپ کو قصوروار ٹھہرا رہے ہیں۔ رابندرناتھ ٹیگور نے کیا خوب کہا ہے:

> اگر افراد ایک دوسرے کے قریب آتے ہوئے بھی، انسانیت کے تقاضوں کو نظر انداز کرتے ہیں تو یہ امر، یقیناً خودکشی کے مترادف ہے"۔

دراصل ہمیں سماج میں اس کا حصہ بن کر پُروقار انداز سے جینا چاہیئے۔ تاکہ ایک انسان کی حیثیت سے انسانیت کا دامن ہمارے ہاتھ سے نہ چھوٹ جائے۔ اگر ہم انسانیت کا دامن مضبوطی سے پکڑے رہیں گے تو "ہم" رابندرناتھ ٹیگور ہی کے الفاظ میں "وہ اس وقت کا انتظار کر رہے ہوں گے جب وقت کی روح خود اپنے آپ کو ایک مکمل انسانی حقیقت میں ڈھال لے گی اور انسانوں کے آپس کے تعلقات انسانی وحدت کا نمونہ بن جائیں گے"۔ اس لیے یہ ہمارا فرض ہے کہ ہم علیحدہ علیحدہ اور مل جل کر اپنی اپنی ذمہ داریاں پوری کریں۔ اسی صورت میں سماج ترقی کر سکتا ہے۔

اقتصادی ترقی ہو یا سماجی، راستے میں بہت سی رکاوٹوں کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔ مثال کے طور پر فرقہ واریت ہی کو لیجیے۔ یہ دراصل ایک زہریلے مادے کی طرح ہے۔ اس کا پنپنا ملک کی سالمیت، اس کی ناداری اور سماجی و اقتصادی ترقی کے لیے بلاشبہ نقصان دہ ہے

بلکہ اس کا خیال تک صاف و شفاف دل کے آئینہ میں دھوئیں کی مانند ہے۔ جب کبھی بھی یہ آگ بھڑکتی ہے تو نہ یہ کہ کاروبار ٹھپ ہو کر رہ جاتا ہے، بلکہ ملک کی دولت اور اس کے وسائل، جنھیں بڑی محنت و جانفشانی سے جمع کیا جاتا ہے، سب برباد ہو جاتے ہیں۔ دولت کی پیداوار رک جاتی ہے جس کا اثر صارفین [CONSUMERS] اور ان کے معیار زندگی پر پڑتا ہے۔ قیمتوں میں اضافہ بھی اس کی وجہ سے ہوتا ہے کیوں اشیاء کی سپلائی (SUPPLIES) پر بھی اثر پڑتا ہے۔ پیداوار رک جاتی ہے اور کارگری ٹھپ ہو کر رہ جاتی ہے۔ انسانوں کی محنت کا استعمال نہ ہونے کی وجہ سے مزدوروں کے حصے میں بربادی آتی ہے۔ پیشہ وارانہ مہارت (PROFESSIONAL SKILLS) رکھنے والے بےشمار مزدور جن میں فنکار بھی شامل ہوتے ہیں، بدقسمتی سے اس آگ میں جل جاتے ہیں۔ یہ سب ہی باتیں ملک کے مستقبل پر اثر انداز ہوتی ہیں اور بقول فراق گورکھپوری:

جب جب اسے سوچا ہے دل تھام لیا ہے
انسان کے ہاتھوں انسان پہ کیا گذری ہے

ہم ملک میں مختلف گروہوں کی صورت میں رہتے ہیں۔ ہر فرقہ کو سیکولر دستور میں اس کے دستور کے تحت، مذہبی آزادی بھی عطا کی گئی ہے۔ ہم سب ہی چاہے کسی بھی مذہب یا ذات سے تعلق رکھتے ہوں، اپنے اپنے عقائد پر قائم رہ سکتے ہیں۔ یہی نہیں بلکہ آزادانہ طور سے اسے ظاہر بھی کر سکتے ہیں اور مذاہب یا کسی ایک مذہب کے ماننے والوں کی فلاح و بہبود کے لیے کوئی بھی مناسب اقدام کر سکتے ہیں۔ البتہ یہ بات ملحوظ خاطر رہنا چاہیے کہ کسی دوسرے مذہب کے ماننے والوں کے جذبات کو ٹھیس نہ پہونچے۔ 'انسانی حقوق' کے ذیل میں اقوام متحدہ کے اعلامیہ میں کہا گیا ہے کہ "یہ امر واقعہ ہے کہ انسانی حقوق کی پامالی اور ان کے نظر انداز

کیے جانے کی وجہ سے اکثر وحشیانہ اقدامات سرزد ہوتے ہیں جنھوں نے انسان کے ضمیر کو مجروح کیا۔" بات دراصل یہ ہے کہ خود غرضی خواہ وہ ایک فرد ہی کی طرف سے کیوں نہ ہو، ایک نازیبا مذموم فعل ہے۔ یہی خود غرضی جب مذہب کے نام آگے بڑھا دی جاتی ہے تو سنگین معاملہ بن کر ابھرتی ہے۔ عام طور پر سماج دشمن عناصر فرقہ واریت کی آگ مذہب، زبان اور اپنی تہذیب کے نام پر بھڑکاتے ہیں۔ لیکن وہ اس حقیقت کو بھول جاتے ہیں کہ دنیا کا کوئی بھی مذہب آپس میں بیر رکھنا نہیں سکھاتا۔ کوئی بھی ذی فہم انسان حسد، جلن اور تعصب کی تعلیم نہیں دیتا۔ اور کوئی بھی تہذیب محبت اور بھائی چارے کے خلاف نہیں ہے۔ پھر یہ جھگڑے کیسے؟ لیکن اگر آدمی اپنی آدمیت چھوڑ دے تو بقول مرزا غالب:

بس کہ دشوار ہے ہر کام کا آساں ہونا
آدمی کو بھی میسر نہیں انساں ہونا

سنسکرت میں کہا گیا ہے [illegible]

[ساری دنیا انسانی برادری (میرا کنبہ) ہے] اور یہ کہ جو اپنے برابر سب کو سمجھے وہی عالم ہے [illegible] [illegible] اگر افراد صحیح تعلیمات پر عمل کرنے لگیں تو سارے جھگڑے مٹ جائیں اور ہم سب متحد ہو کر سماجی اور معاشی طور سے بیمار معاشرے کی اصلاح میں لگ جائیں گے۔ ترقی مستقبل کا مژدہ سنائے گی اور وقت کی الجھی زلفیں سنور جائیں گی۔

ہمیں بات بات پر بلا وجہ غصہ نہیں کرنا چاہیے نہ ہی ہر مسئلہ کو فرقہ واریت کا رنگ دینا چاہیے۔ جنگ آزادی کے بوڑھے مرد مجاہد بہادر شاہ ظفر کے الفاظ میں:

ظفر آدمی اس کو نہ جانیے گا
وہ ہو کیسا ہی صاحب فہم و ذکا

جسے عیش میں یادِ خدا نہ رہی۔
جسے طیش میں خوفِ خدا نہ رہا۔

آتش نے انسانیت پر زور دیتے ہوئے کہا ہے

کفر و اسلام کی کچھ قید نہیں ہے آتش
شیخ ہو یا کہ برہمن ہو پر انسان ہوئے

اگر ہم مذہب کی اعلیٰ تعلیمات کو دیکھیں تو سب ہی اس بات کی طرف اشارہ کرتے ہوئے نظر آئیں گے کہ ہم الگ الگ ہوتے ہوئے بھی دراصل ایک ہی خاندان کے افراد کی طرح ہیں۔ اونچ نیچ کا فرق بے معنی اور غیر مناسب ہے۔ فرق ہو بھی تو اعمال کی منزل میں ہونا چاہیے۔ انجیل مقدس میں لکھا ہے کہ تم اپنے ہمسایہ سے اپنے برابر محبت کرو۔

قرآن کریم کا ارشاد ہے

تعاونو علی البر والتقویٰ ۰ ولا
تعاونوا علی الاثم والعدوان

(تم ایک دوسرے سے نیکی و پرہیزگاری میں تعاون کرو۔ مگر (دیکھو!) گناہ و زیادتیوں میں ایک دوسرے سے (ہرگز) تعاون نہ کرنا)

جو اپنے کو انسان کہے اس پر لازم ہے کہ انسانیت کے تقاضے بھی پورے کرے۔ اپنی بھلائی کے ساتھ ساتھ دوسروں کی بھلائی کو بھی مدّنظر رکھے۔

ہم سب ہی تہذیب و تمدن سے مالا مال ہیں۔ پھر یہ فرقہ واریت کیوں سر اٹھاتی رہتی ہے وہ صاف ظاہر ہے — خودغرضی جو کبھی معاشی ہوتی ہے اور کبھی سیاسی اور سماجی۔ کسی بھی سماج میں دو طبقوں پر مشتمل افراد رہتے ہیں — ایک تعلیم یافتہ اور دوسرا غیر تعلیم یافتہ۔ فرقہ واریت کا سوال ہمیں منجملہ اور باتوں کے، سماجی ڈھانچے اور تعلیمی اداروں کے ماحول تک لے آتا ہے۔ بے پڑھے لکھے طبقے کی طرف بھی، پڑھے لکھے لوگوں کی ذمہ داری ہے۔ فرقہ واریت کے بھیانک نتائج کو خود سمجھنا اور دوسروں کو بھی سمجھانا تعلیم یافتہ افراد میں سے ہر ایک کی ذمہ داری ہے۔

ملک میں مختلف مذاہب کے ماننے والے رہتے ہیں۔ ان میں سے کسی بھی مذہب کے ماننے والے مختلف شہروں، گاؤں اور محلوں میں الگ الگ اکثریت یا اقلیت میں ہو سکتے ہیں۔ لہٰذا محلوں اور گاؤں میں اکثریتی طبقے والوں کی بڑی ذمہ داری ہے۔ انھیں اقلیتی طبقے کے افراد کا دل ہاتھ میں لینا ہوگا۔ مناسب اور صحت مند ماحول میں انسان کے نیک خیالات پروان چڑھتے ہیں۔ غیر مناسب ماحول، غیر صحت مند خیالات اور رجحانات کو ہوا دیتا ہے۔ کبھی کبھی معمولی سا شک بڑے سے بڑے جھگڑوں کا باعث بن جاتا ہے۔ جس طبقے کو نقصان اٹھانا پڑتا ہے، اس میں بچاؤ والی فرقہ واریت (Defensive Communalism) پنپنے لگتی ہے جو دھیرے دھیرے خود نقصان دہ اور مذموم فعل بن کر ابھرنے لگتی ہے

آخر اس مرض کی دوا کیا ہے؟ یہ کون نہیں کہے گا کہ اگر فرقہ واریت سر اٹھائے تو انتظامیہ کو اسے سختی کے ساتھ کچل دینا چاہیے لیکن یہ یا اس طرح کے دوسرے سمجھاؤ مسئلہ کا عارضی حل ہیں۔ دراصل فرقہ واریت کا اصلی حل تو یہ ہے کہ رجحانات اور خیالات بدلیں اور ہم سب ہی ہندوستان کے شہری کی حیثیت سے آپسی بھائی چارے اور ایک ہی خاندان کے افراد کی طرح مل جل کر اکٹھا رہنے لگیں۔

پنڈت جواہر لال نہرو نے ۱۵ اگست ۱۹۴۷ء کو آزادی ملتے وقت کہا تھا

"... ایک نیا ستارہ ابھر رہا ہے — یورپ میں آزادی کا ستارہ — ایک نئی امید جاگ رہی ہے — بہت

باقی صفحہ نمبر ـــ پر

حضرت مولانا اشرف علی صاحب تھانویؒ کے

غیر مطبوعہ ملفوظات

... ایک موقعہ پر مولانا تھانویؒ نے فرمایا کہ مجھ کو علم کے پڑھانے سکھانے کا اتنا زیادہ اہتمام نہیں ہے جس قدر تہذیب و اخلاق و دیانت کا۔ کیوں کہ لکھنے پڑھنے کا اہتمام تو ہر جگہ ہوتا ہے لیکن اخلاق کی طرف کسی کو خیال بھی نہیں ہے۔ مثلاً میں اس پر زیادہ نظر نہیں کرتا کہ کس نے جماعت سے نماز پڑھی کس نے نہیں پڑھی۔ کیوں کہ اوّل تو عذر کا احتمال ہے۔ دوسرے اس میں صرف فاعل کا حرج ہے کسی دوسرے کو نقصان یا تکلیف نہیں ہوتی بخلاف اس کے کہ کسی سے کوئی حرکت خلافِ تہذیب سرزد ہو۔ اس کا اس لیے اچھی طرح تدارک کیا جاتا ہے کہ اس میں دوسروں کو تکلیف ہوتی ہے۔

حضرت مولانا تھانویؒ کی دو بیویاں تھیں دونوں کے ساتھ برابر یکساں عدل کا سلوک کرتے تھے جیسا کہ شریعت کا حکم ہے، حضرت والا کو خاص اہتمام تھا اور حضرت والا رحمہ نے ایک کامل نمونہ اس عدالت کا امتِ محمدیہ کے سامنے رکھا۔ ظاہر ہے کہ یہ عدل اور انصاف مساوی دو بیویوں کے ساتھ برتنا کوئی آسان کام نہیں ہے، بہت بہت مشکل کام ہے اس لیے جب بعض لوگوں نے حضرت والا سے یہ کہا کہ آپ نے تو دو دو بیویاں رکھنے کا دروازہ کھول دیا تو حضرت والا نے جواب دیا کہ نہیں بلکہ بند کر دیا ہے۔ کیوں کہ جب لوگ یہ دیکھیں گے کہ تعدل اور انصاف اور برابری کا سلوک دو بیویوں کے ساتھ کرنا اتنا دشوار کام ہے تو وہ دو بیویاں رکھنے کی ہمت ہی نہ کر سکیں گے۔

حضرت والا نے اپنی پہلی بیوی کا مہر پانچ ہزار روپیہ رکھا تھا جو باوجود ان کے معاف کرنے کے ادا کر دیا تھا۔ کیوں کہ مرد کو اتنی غیرت چاہیے کہ اپنی بیوی کے ساتھ خود احسان کرے، نہ کہ اس کے احسان کا بدلہ لے۔

حضرت والا حتی الامکان اپنی بیویوں پر کوئی بوجھ نہیں ڈالتے۔ یہاں تک کہ کسی خاص کھانے کی بھی کبھی فرمائش نہیں کرتے اُن کے گھر میں ان نہایت ہشاش بشاش

خوش خوش آتے جاتے اور نہایت بڑی اور
لطف و بے تکلفی کا برتاؤ فرماتے نہایت نرم
لہجہ میں گفتگو فرماتے اور ان کے عزیزوں
یا مہمان عورتوں کے بچوں سے خوب مزاح
فرماتے اور ان کو چھیڑتے رہتے۔
ایک بار حضرت والا نے فرمایا کہ
میں تو بعض اوقات چولھے کے پاس ہی بیٹھ کر
بلا تکلف کھانا کھا لیتا ہوں اور بوقت ضرورت
پانی کا گھڑا بھی خود اٹھا کر رکھ دیتا ہوں۔
کبھی اتفاق سے دسترخوان پر اگر پانی نہ ہوا
تو بجائے کسی سے مانگنے کے خود ہی گھڑے
کے پاس جا کر پی لیتا ہوں۔
غرض کہ حاکم کی طرح گھر والوں سے سلوک
نہیں کرتے تھے بلکہ بہت بے تکلف ہشاش بشاش
بیویوں کے ساتھ رہتے تھے۔
حضرت والا بیویوں کے ساتھ اچھا سلوک
کرنے کی عام طور سے بہت تاکید کرتے تھے اور
جب سنتے کہ کوئی شوہر اپنی بیوی کے ساتھ تشدد
ظلم اور زیادتی کرتا ہے تو حضرت والا بہت
کڑھتے اور فرماتے کہ عورتیں بے چاریاں
ہر طرح بس شوہر ہی کے بس میں اور اس کے
رحم و کرم پر ہوتی ہیں۔ سوائے شوہر کے
اور ان کا کون ہوتا ہے۔ لہذا ان کے ساتھ
ہر حال رحم ہی کا برتاؤ کرنا چاہیے اور ہندوستان
کی عورتیں تو عموماً اپنے شوہر کی فدائی ہوتی
ہیں ان کے اوپر تشدد اور ظلم تو اور بھی بے رحمی
ہے۔ اور عموماً پاکدامن بھی ایسی ہوتی ہیں جیسے
جنت کی حوریں۔ مردوں میں تو شاید ہی کوئی
ایسا بچا ہو جس نے غیر عورت کو دیکھ کر دل
میں کوئی وسوسہ شیطانی اپنے دل میں نہ لایا
ہو۔ اور شریف سو میں عورتیں قریب قریب
سب ہی ایسی ہیں کہ ان کو کبھی عمر بھر بھی کسی غیر مرد
کی طرف کا وسوسہ شیطانی تک نہ آیا ہوگا۔

حضرت والا کو اپنی دونوں بیویوں کی
راحت و آرام و عافیت کا بہت زیادہ خیال
رہتا تھا۔ دونوں کی بیماری کے علاج کے لیے
ہر قسم کی تکلیفیں اور اخراجات برداشت کر کر کے
دور دور کے شہروں میں علاج کے لیے ہر قسم کی
تکلیفیں برداشت کیں اور خود تشریف لے گئے
اور بعض دفعہ اسپتالوں میں بھی ٹھہرا کر ان کا
علاج کرایا اور خود باہر میدان میں قیام فرمایا
ایک بار پہلی بیوی کے چھت پر سے گر جانے کی
خبر سنی جب خود ظہر کی سنتیں پڑھ رہے تھے، فوراً
نیت توڑ دی اور گھر تشریف لے جا کر ان کی
تیمارداری فرمائی۔ جب سب ضروری انتظامات
کر چکے تب واپس آ کر نماز ظہر ادا کی۔
حضرت والا نے اس بنا پر کہ اپنے بعد
بھی بیویوں کی آسائش کی فکر سنت ہے، اپنے
بعد اپنی دونوں بیویوں کی کفالت کے لیے وصیت
بھی فرمائی۔

اسی طرح ایک مرید سے جن کو نہ بیوی
سے دلچسپی تھی، نہ بیوی کے حقوق ادا کرنے کی
قدرت تھی، یہ معلوم فرما کر کہ وہ اپنی بیوی کو
غالباً اپنے بڑے بھائی کے گھر پر چھوڑ آئے تھے
فرمایا کہ ایسی حالت میں بیچاری کو معلق نہ رکھا
جائے، اس کا تصفیہ کر کے اور اس سے یکسوئی
حاصل کر کے آؤ۔ چنانچہ جب وہ ان کو طلاق
دے کر آئے، اس وقت ان کی تعلیم و
تلقین شروع کی۔

(بشکریہ تعمیر حیات۔ لکھنو)

محمد اللہ خاں
سہاور

فضول رسم ورواج اور ان سے نجات

ہم اپنے سماج میں پھیلے ہوئے بیجا اور فضول رسم و
واج سے چھٹکارا حاصل کرنا چاہتے ہیں تو سب سے پہلے
ہیں یہ سمجھ لینا چاہیے کہ یہ آسان کام نہیں ہے اور اس مقصد
حاصل کرنے کے لیے بڑے استقلال، تحمل، دانشمندی اور
خلاص کے ساتھ مسلسل جدوجہد کرنی ضروری ہے۔ دنیا کا
ر سماج بُرے سے بُرے رسم ورواج کو چھوڑنے کے لیے
ھی بڑی مشکل سے آمادہ ہوتا ہے۔ کسی سماج میں زندگی
ے جو طریقے قدامت یا کسی دوسری وجہ سے اجتماعی شکل اختیا
ر لیتے ہیں اور ان پر قبول عام کی مہر لگ جاتی ہے تو ان
ریقوں کو ٹکسالی سکّے جیسی حیثیت حاصل ہو جاتی ہے اور
لوگ ان طریقوں کو اختیار نہیں کرتے، انھیں حقارت کی
گاہ سے دیکھا جاتا ہے اور وہ اپنی سوسائٹی میں نکو بن
اتے ہیں۔ بلکہ کچھ صورتوں میں ایسے لوگوں کو کسی نہ کسی شکل
ں اپنے سماج کے جبر واستبداد کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔
ر یہی وہ قوت ہے جو ہر قسم کے رسم ورواج کو قائم رکھتی
ہے اور جس کے خوف سے لوگ ان طریقوں کے چھوڑنے سے
بھی مجبور رہتے ہیں کہ جنھیں وہ دل سے بُرا سمجھتے ہیں۔
ر جوان کے لیے سخت نقصان دہ ہوتے ہیں

دنیا کے کسی بھی سماج کی بلندی یا پستی کا
ندازہ اُن رسم ورواج ہی سے لگایا جاتا ہے جو اس سماج
ں رائج ہوتے ہیں۔ اس سلسلہ میں مسلمانوں کے عروج و
وال کی تاریخ کا گہری نظر سے مطالعہ کیا جائے تو بڑی
رت حاصل ہوتی ہے۔ جو دور مسلمانوں کے عروج کا تھا
جب قیصر وکسریٰ کے تاج ان کے قدموں میں لوٹ رہے
تھے اور دنیا کی سیاسی، علمی اور تہذیبی رہنمائی ان کے ہاتھوں
میں تھی، اس وقت ان کے جو رسم ورواج تھے، ان میں اور
ان واہیات رسم ورواج میں زمین وآسمان کا فرق نظر آتا ہے
کہ جب وہ اپنی ہر خصوصیت ختم کرنے کے بعد زمانہ کی بیرحم
ٹھوکروں کا نشانہ بن گئے۔

مسلمانوں کے دورِ عروج میں ان کے روزمرہ
کے مشاغل مردانہ مشاغل تھے۔ مثلاً تیراندازی، گھوڑوں کی
سواری، تیراکی، ورزش، بنوٹ، خونخوار درندوں کا شکار
کشتی، لمبے لمبے دشوار گزار سفر۔ زندگی کے مختلف معاملات
کی تحقیق وجستجو — اور اُن کے علمی فنی اور عملی کارناموں
کی تو کوئی حد ہی نہ تھی۔ انھوں نے زندگی کے جس میدان
کی طرف رخ کیا، اُسے اپنی محنت، دانشمندی اور فنی
مہارت کے ذریعہ بامِ عروج پر پہنچا دیا وہ کسی مقام
پر ٹھہر جانا اپنے عمل کی توہین سمجھتے تھے۔ وہ آرام کرتے
تھے، تازہ دم ہو کر نئی منزلیں سر کرنے کے لیے وہ تفریح
کرتے تھے، دل ودماغ اور روح کی بالیدگی حاصل کرنے
کے لیے۔ زندگی کی اس گہما گہمی میں ہمارے بزرگ وہ رسم و
رواج کس طرح اختیار کر سکتے تھے جو ان کے کاہل، بے مصرف
اور پست حوصلہ اخلاف نے اختیار کیے یا جو رواج اس
وقت ہماری انفرادی اور اجتماعی زندگی کو گھن کی طرح
چاٹ رہے ہیں۔

ہمارے بزرگوں کو نہ اتنی فرصت تھی اور
نہ ان کے کام کرنے والے دماغ فضول رسم ورواج کی
تشکیل کرنے کی طرف متوجہ ہو سکتے تھے۔ انھیں تو ہر

وقت اپنے روحانی اور مادی مقامات کو بلند کرنے کی فکر
دامن گیر رہتی تھی اور اسی فکر نے انھیں دنیا کی امامت کے
درجہ پر فائز کر رکھا تھا۔ لیکن جب ان کے اخلاف کی نگاہوں
سے وہ بلند مقامات اوجھل ہو گئے تو ان کے دن اور رات
کبوتر بازی، تیتر بازی، ہر وقت چوسر و شطرنج کھیلنے، شادی
بیاہ کے موقعوں پر رنڈیوں اور وقت جیسی قیمتی چیز کو برباد
کرنے، جھوٹی شان و شوکت کا اظہار کرنے کے لیے بچوں کے
عقیقہ، بسم اللہ اور ختنہ پر لٹھ لٹانے میں لطف آنے لگا
اسلامی تہذیب کی سادگی کے بجائے عجمی رنگ ریلیوں نے
مسلم سماج کو اپنے رنگین جالوں میں اس مضبوطی سے جکڑ
لیا کہ اگر اس سے نکلنے کی کوشش کی جاتی ہے تو ان کے پھندے
اور زیادہ مضبوط ہو جاتے ہیں۔ لیکن اس وقت مسلم سماج
جس دور سے گزر رہا ہے وہ بڑا نازک اور پریشان کن دور
ہے۔ طرح طرح کی پریشانیوں اور آفتوں نے مسلمانوں کو چاروں
طرف سے گھیر لیا ہے۔ ان کی اقتصادی حالت خراب ہو چکی ہے اور
مسلسل ابتر ہوتی جا رہی ہے۔ ایسی صورت میں وہ ان مہمل
رسم و رواج کو بوسیدہ اور گندے کپڑوں کی طرح اٹھا کر
پھینک نہ دیں گے تو ان کاموں کے لیے پیسہ اور وقت
کس طرح بچا سکیں گے جو ان کے عروج بلکہ وجود کی
برقراری کے لیے انتہائی ضروری ہے۔

فی زمانہ مسلم سماج فضول اور انتہائی
مہنگے رسم و رواج کے وزنی بوجھ کے نیچے دبا ہوا بُری
طرح کراہ رہا ہے۔ چند گنے چنے دولت مند شیخی خوروں
کی تو میں بات نہیں کہتا لیکن ان غلط رسم و رواج کے
بوجھ نے عامۃ المسلمین کی کمر توڑ دی ہے اور وہ اس
بوجھ کو اپنے اوپر سے ہٹا دینے کے لیے ہر وقت بے چین
رہتے ہیں لیکن اپنی سوسائٹی کے لعن و طعن کے خوف
سے یہ کام نہیں کر سکتے۔ مہمل رسم و رواج کو پورا کرنے
کے لیے لوگ اپنی زمینیں فروخت کر دیتے ہیں۔ برتن گروی
رکھ دیتے ہیں، گھر بیچ دیتے ہیں۔ مقروض ہو جاتے ہیں۔
ایسا نہ کریں تو اپنی لڑکیوں کو قیمتی جہیز کس طرح دیں۔
لڑکوں کی بارات میں ناچ گانے، باجے گاجے، آتش بازی
کا کس طرح انتظام کریں۔ اپنے بزرگوں کی وفات کے بعد
ان کی دسویں بیسویں اور چہلم کے موقعوں پر دیگیں کس طرح
پکوائیں اور یہ سب کچھ نہ کریں تو عزیزوں اور دوستوں
کی زہریلی تنقید سے کس طرح بچیں۔

اس جگہ میں یہ بات صاف کر دینا ضروری
سمجھتا ہوں کہ میں فاتحہ اور چہلم وغیرہ کے جائز و ناجائز
ہونے کی بحث میں پڑنا نہیں چاہتا۔ یہ میرا میدان بھی نہیں
ہے۔ اس سلسلہ میں جو کچھ عرض کر رہا ہوں اسے صرف
رواجی اور اقتصادی پہلو سے ہی ملاحظہ کیا جائے۔ جو
حضرات فاتحہ اور چہلم وغیرہ کو ایصال ثواب کا ذریعہ سمجھتے
ہیں وہ اس عمل کو ضرور اختیار کریں۔ لیکن اتنے ہی پاؤں
پھیلائیں جتنی چادر ہو۔ اس قسم کے کاموں میں اللہ تعالیٰ
نیت دیکھتا ہے، بریانی اور قورمے کی دیگیں نہیں دیکھتا
کوئی شخص صرف ایک خوراک کھانے پر فاتحہ دے کر کسی
بھوکے آدمی کو کھلا سکتا ہو تو وہ قرض کے پیسے سے
دیگیں کیوں پکوائے۔

اس قسم کے فضول اور بے جا رسم و رواج
سے ۹۸ فیصدی مسلمان سخت پریشان ہیں اور ان سے
جلد از جلد چھٹکارا بھی حاصل کرنا چاہتے ہیں، لیکن انھیں
ترک کر دینے کی اس لیے ہمت نہیں کرتے کہ ان کی ہنسی
اڑائی جائے گی، ان پر لعنت بھیجی جائے گی۔ انھیں مطعون
کیا جائے گا۔ ایسی صورت میں ملت اسلامیہ کو اس
خرافات سے کس طرح نجات حاصل ہو سکتی ہے؟ یہ ایک
اہم اور پیچیدہ سوال ہے جس کا ایک ہی جواب ہو سکتا
ہے کہ کسی بھی برائی کو ختم کرنے یا اچھائی کو رائج کرنے
کے لیے زبردست انسانی قوت کی ضرورت ہوتی ہے
اور وہ قوت اس طرح فراہم ہوتی ہے کہ خدا کے کچھ نیک
بندے اس برائی کو شدت سے محسوس کرتے ہیں پھر
اسے ختم کرنے کی تدبیریں سوچتے اور انھیں عمل میں لانے
کی کوشش کرتے ہیں۔ پہلے وہ کوششیں انفرادی

ہوتی ہیں۔ اس کے بعد کچھ ہم خیال لوگ ایک دوسرے
کے خیالات سے آگاہ ہوتے ہیں تو وہ آپس میں ملتے ہیں
تبادلہ خیال کرتے ہیں۔ اپنی انفرادی کوششوں کو اجتماعی
شکل دے کر انھیں منظم کرتے ہیں۔ اس سے کام کی قوت
اور وزن میں اضافہ ہوجاتا ہے۔

ابتدائی مرحلہ میں اس تحریک کا مذاق
بنایا جاتا ہے۔ اس کے چلانے والوں کو پریشان کیا
جاتا ہے۔ لیکن ان لوگوں کے دلوں میں اخلاص اور اپنے
مشن کی کامیابی کا بھرپور یقین ہوتا ہے تو وہ ان حرکتوں
سے ذرا بھی نہیں گھبراتے۔ بلکہ اس سے ان کے عزائم میں
اضافہ ہوتا ہے اور وہ اپنی کوششوں کو اور زیادہ
تیز کر دیتے ہیں۔ یہاں تک کہ وہ اپنے نیک مقاصد میں
کامیاب ہوجاتے ہیں۔

ہمارے سماج میں ایسے دردمند
اور مخلص لوگوں کی کمی نہیں ہے جو ملت اسلامیہ کو
فضول رسم ورواج کی چکی میں پستا ہوا دیکھ کر خون کے
آنسو بہاتے اور دل سے چاہتے ہیں کہ ان غلط اور
تباہ کن رسم ورواج کا چلن ختم ہو کر ملت کو آسودگی
حاصل ہوجائے۔ وہی لوگ مل کر بیٹھیں اور اپنے دلی
مقاصد کو حاصل کرنے کے لیے اجتماعی طور پر ہر ممکن
کوشش کریں۔ تحریر و تقریر اور اپنے عملی نمونوں کے
ذریعہ لوگوں کے سامنے اپنی بات رکھیں تو انشاء اللہ
ان کی آواز صدا بہ صحرا ثابت نہ ہوگی۔ بلکہ ان کی بات
کھلے دل ودماغ سے سنی جائے گی۔ اور اس پر عمل
بھی کیا جائے گا اور ان دردمند حضرات کا یہ کارنامہ
اتنا عظیم الشان ہوگا کہ اس کے تعلق سے ملت کی سماجی
تاریخ انھیں ہمیشہ یاد رکھے گی۔ لیکن اس مہم کو سر کرنے
کے لیے سب سے زیادہ موثر ہتھیار کام کرنے والوں
کا عملی نمونہ ہوگا۔ یہ نہ ہوا تو تحریر و تقریر اور جلسے
جلوس سے کوئی خاص فائدہ حاصل نہ ہو سکے گا۔

حال ہی کا واقعہ ہے کہ ایک کھاتے پیتے
اور متمول شخص کو اس کے احباب اور محلے والوں نے
کندھے پر چنوں کی گٹھری لادے اور ہاتھ میں چھوٹا
سا ترازو لیے آواز لگا کر چنے فروخت کرتے ہوئے
دیکھا تو ان کی حیرت کی کوئی انتہا نہ رہی اور وہ یہ سمجھے
کہ ان صاحب کے دماغ میں فتور پیدا ہوگیا ہے۔
ان سے ان کی اس حرکت کی وجہ دریافت کی گئی تو
انھوں نے مسکرا کر بڑی شائستگی سے جواب دیا۔

"آپ لوگ میرے لیے بالکل پریشان نہ
ہوں۔ اپنا کام دیکھیں اور مجھے اپنا کام کرنے
دیں۔"

لوگوں نے ان صاحب میں دیوانگی کا کوئی اثر محسوس
نہ کیا تو انھیں اس طرف سے تو اطمینان ہوگیا لیکن
حیرت اپنی جگہ قائم رہی۔

ان صاحب نے اپنے دوستوں کی حیرت رفع
کرنے کی کوشش بھی نہیں کی اور کئی دن تک بڑے اطمینان
سے چنے بیچنے کا کام کرتے رہے۔ اس کا یہ اثر ہوا
کہ چند ہی روز میں ان کے حلقۂ تعارف میں کئی نوجوانوں
نے چھوٹی چھوٹی دکانیں کھول لیں، ٹھیلے لگانے اور
گٹھریاں لادنے لگے۔

وہ صاحب اپنے عمل کے بجائے تحریر تقریر
کے ذریعہ اپنے ہاتھ سے کام کرنے کی خیر و برکت سمجھانے کی
کوشش کرتے تو انھیں اپنے مقصد میں وہ کامیابی حاصل
نہ ہوتی جو خاموش عملی درس کے ذریعہ حاصل ہوئی۔
چنانچہ ملت اسلامیہ کے جو مخلص فرزند مسلمانوں کو
بیجا اور فضول رسم ورواج سے نجات دلانے کے خواہشمند
ہیں وہ اخلاص اور سمجھداری سے کام کریں تو
انشاء اللہ اس سے بہت
مفید اور دور رس
نتائج حاصل ہوں گے۔

سید مہدی علی خاں (محسن الملک)

مسلمانوں کی ترقی اور تنزل کے اسباب

ایک طویل بحث کے بعد آخر میں لکھتے ہیں:

....غرض کہ سارا قرآن اور ساری تعلیم ہمارے ہادیؐ کی یہی ہے کہ وہ استعداد جو بدو فطرت میں خدا نے رکھی ہے، وہ کام میں لائی جاوے، اور دنیا و دین کی ساری نعمتیں حاصل کی جاویں۔ قرآن سر ویلیم کی بھی ہوئی وہ زنجیر نہیں ہے جس میں ہم دنیاوی ترقیات کے لیے جکڑے ہوئے ہیں بلکہ برخلاف اس کے وہ ان بندوں کو توڑنے والے ہیں جو عیسائیت نے یا عیسائیوں نے انسانوں پر اس سے روکنے کے لیے لگائے تھے۔ غور کرو خدا کی اس جھڑکی پر جو رہبانیت اور جوگی بننے کے لیے ہے۔ من حرم زینۃ اللّٰہ التی اخرج لعبادہٖ (کس نے خدا کی وہ نعمت حرام کی جو خدا نے بندوں کے لیے پیدا کی)۔ پھر خدا کی یہ آیت جو دنیاوی لذتوں سے متمتع ہونے کے لیے ہے۔ کلوا من طیبات ما رزقنٰکم واعملوا صالحًا" اچھی چیزیں جو ہم نے روزی کی ہیں، کھاؤ اور اچھے کام کرو...... دیکھو کیسا عام اجازت نامہ ہے خدا کا دنیا کمانے کے لیے۔ فانتشروا فی الارض وابتغوا من فضل اللّٰہ (زمین پر پھیل جاؤ اور خدا کی روزی تلاش کرو)۔ پھر خدا اپنے اچھے بندوں کو کیا دعا سکھاتا ہے۔ ربنا اٰتنا فی الدنیا حسنۃ وفی الآخرۃ حسنۃ (اے خدا ہم کو دنیا اور آخرت میں بھلائی دے۔) یعنی دنیا اور دین دونوں کی بھلائی۔ جبکہ قرآن کے یہ احکام ہوں اور طلب معیشت اور تجارت اور کسب حلال کے لیے صاف صاف ترغیبیں اور بشارتیں، جیسا کہ ہمارے ہادیؐ نے طلب معیشت کے لیے فرمایا ہو۔ ان من الذنوب ذنوبًا لا یکفرہا الا الہم فی طلب المعیشۃ۔ (بعض ایسے گناہ ہیں جن کا کفارہ صرف یہ ہے کہ معاش کی فکر میں رنج اُٹھایا جاوے) اور تجارت کے لیے ارشاد کیا ہو کہ التاجر الصدوق یوم القیامۃ مع الصدیقین والشہداء (سچا سوداگر قیامت کے دن صدیقوں اور شہیدوں کے ساتھ اُٹھے گا)، اور طلب دنیا کے لیے صاف صاف لفظوں میں یہ خوشخبری سنائی ہو کہ من طلب الدنیا حلالًا تعففًا عن المسئلۃ وسعیًا علٰی عیالہٖ و تعطفًا علی جارہٖ لقی اللّٰہ وجہہ کالقمر لیلۃ البدر (جو شخص دنیا کو بطریق حلال تلاش کرتا ہے اور جس کا مقصد سوال کرنے سے بچنا اور آل اولاد کے لیے کوشش اور

قطراتِ خون کا شمار

مورخین کے فراہم کردہ اعداد و شمار کی رو سے عہد نبوی میں (۸۲) مرتبہ جنگی مقاصد کے لیے نقل و حرکت کرنے
کی ضرورت پڑی ان میں سے (۲۹) میں خود نبی اکرمؐ نے شرکت فرمائی۔ انھیں اصطلاح میں غزوات کہتے ہیں اور
سرایا میں حضورؐ تشریف نہیں لے گئے۔ انھیں سرایا کہتے ہیں۔ ان تمام غزوات اور سرایا میں کل (۲۵۹) مسلمان
شہید ہوئے اور (۷۵۹) مخالفین۔ کل ملا کر (۱۰۱۸) کو اس تعداد کو ۸۲ پر پھیلایئے تو اوسط تقریباً (۱/۲ ۱۲)
بنتی ہے۔ یہ ہیں قطرات خون، نچوڑ ”وحشت و بربریت کی ان خونچکاں داستانوں کا جو مخالفین اسلام
اسلامی شمشیر کی طرف منسوب کر کے دنیا کو اس دین سے خوفزدہ کرتے رہتے ہیں۔ نو سال کے عرصہ میں تمام
لڑائیوں میں مقتولین کی تعداد (۱۰۱۸) کو دیکھیے اور دوسری طرف اس دور تمدن و تہذیب اور عصر علم و عقل کے
اختلافات و تنازعات کے نتائج کو سامنے رکھیے، صاف نظر آجائے گا کہ وحشت اور بربریت کا دور کون سا ہے
وہ ہیں ان اعداد و شمار کو جو ۱۸-۱۹۱۴ء کی جنگ عظیم نے دنیا کے سامنے پیش کیے۔ یا پھر دوسری
عالمگیر جنگ ۴۵-۱۹۳۹ء میں دیدۂ عبرت کے سامنے آ چکے۔ آج ہزاروں تک کی نوبت
معمولی فسادات میں پہنچ جاتی ہے۔

پھر اس (۱۰۱۸) کی تعداد میں آپ کو غیر مصافی آبادی کا ایک فرد بھی دکھائی
نہ دے گا۔ غیر مصافی آبادی تو ایک طرف، غزوۂ بدر میں حضورؐ نے یہاں تک فرما دیا تھا کہ جو لوگ
قریش کی طرف سے مجبوراً میدان جنگ میں لائے گئے ہیں انھیں بھی قتل نہ کیا جائے۔ نیز ان میں
سے معصوم بچے یا بیگناہ عورت کا سر بھی آپ کو دکھائی نہ دے گا۔ کہ حضورؐ نے تاکیداً حکم دے
رکھا تھا۔

لا تقتلوا شیخاً فانیاً ولا طفلاً ولا صغیراً ولا امرأۃً (ابوداؤد)
یعنی کسی کہن سال بوڑھے یا بچے یا کمسن عورت کو قتل مت کرو۔
(ماخوذ از معراج انسانیت)

بقیہ مسلمانوں کی ترقی......

ہمسایہ پر مہربانی کرنا ہوتا ہے، اس کا منہ خدا کی ملاقات کے وقت چودھویں رات کے چاند کا سا
ہوگا)، تو کیا ایسا مذہب دنیا کی خوشیوں کے حاصل کرنے کے لیے انسان کے پاؤں کی زنجیر ہے
ہرگز نہیں بلکہ وہ ان کے لیے خط آزادی ہے۔“

بقیہ مضمون فرقہ وارانہ تشدد

...ں سے خیالات میں یہی آرزو حقیقت میں
...ا رہی ہے۔ یہ ستارا کبھی نہ ڈوبے اور
...مید کبھی نہ جھٹلائی جائے“

ملک کی سالمیت اور ہمارا اتحاد اسی حقیقت
کے ضامن ہیں۔

انسانیت کا مستقبل

مولانا سید ابوالحسن علی ندوی کی کلکتہ کی ایک تقریر سے چند اقتباسات

مولانا سید ابوالحسن علی ندوی نے کہا

مسلمان مجموعی آبادی میں اپنے آپ کو اکثریت اور اقلیت کے پیمانے سے نہ ناپیں بلکہ یہ دیکھیں کہ نمک یا شکر کی تھوڑی سی مقدار کس طرح پوری دیگ کو متاثر کرتی ہے اور پورے کھانے میں پیوست ہوجاتی ہے۔ اسی طرح مسلمان جس ملک میں رہتے ہیں، اس ملک کی رگوں میں خون کی طرح پیوست کرجائیں، ان کا وجود اتنا ضروری اور اہم ہو کہ ان کے بغیر سارے ملک کا جسم بے جان سمجھا جائے۔

مسلمانوں کو باہمی اخوت کا رشتہ مضبوط و مستحکم بنانے کی تلقین کرتے ہوئے حضرت مولانا نے فرمایا کہ

مسلمان اسی وقت معزز ہوسکتے ہیں جب خود ملت مضبوط اور مستحکم ہو۔ ہر شخص اپنے نقطۂ نظر سے سوچے گا تو کام نہیں چلے گا۔ اس لیے ہجرت کے پہلے سال ہی خدا نے وحی نازل کی تھی کہ اگر مسلمانوں نے اپنے ذاتی مفاد کو اجتماعی مفاد پر ترجیح دی تو صرف انھیں کا نہیں بلکہ ساری انسانیت کا مستقبل تباہ ہوجائے گا۔

مولانا نے بڑی دلسوزی سے فرمایا کہ

زندگی کا کوئی اعتبار نہیں اور پتہ نہیں کہ کلکتہ پھر کبھی آنے کا موقع ملے گا یا نہیں۔ اس لیے جی چاہتا ہے کہ میں اپنے ہر موئے تن کو زبان دے دوں اور آپ کے دلوں میں اتر جاؤں۔ انسانیت کی کھیتی کو ہمیشہ کھاد کی ضرورت پڑتی ہے۔ وہ کھاد (ذاتی مفادات کی قربانی) مسلمان ہی فراہم کرسکتے ہیں۔

مسلمان جہاں بھی ہوں اپنی دولت اور صلاحیت کا استعمال صحیح طور پر کریں۔ موصوف نے کہا کہ دوسرے مذاہب میں عبادت کا تخیل بہت تنگ ہے لیکن اسلام نے اس میں وسعت پیدا کرکے انقلاب پیدا کیا اور اس کا دائرہ اتنا وسیع کردیا کہ حصول معاش یہاں تک کہ جنسی خواہشات کی جائز طریقے سے تکمیل عبادت شامل ہے عابد و زاہد ہونے کا مطلب ہرگز یہ نہیں کہ آدمی تارک الدنیا ہوکر ہمیشہ دھیان گیان میں مگن رہے۔ اللہ تعالیٰ تک پہونچنے کے لیے بہت سے راستے ہیں۔ جائز تجارت کے ذریعہ بھی اس کا قرب حاصل کیا جاسکتا ہے، بال بچوں کی کفالت، محتاجوں اور معذوروں کی امداد عبادت میں داخل ہے اور اس کی سخت تاکید کی گئی ہے۔ اس لیے ظاہر ہے کہ بال بچوں کی کفالت کے لیے حصول معاش کی کوششوں میں مصروف ہونا ہوگا۔ وہ مصروفیت تجارت کی شکل میں بھی ہوسکتی ہے اور ملازمت کی صورت میں بھی۔ اگر اس جائز مصروفیت کے آغاز سے پہلے اپنی نیت درست کریں تو تجارت اور ملازمت کی مصروفیت کو عبادت بنایا جاسکتا

مولانا نے مسلمانوں کی نئی نسل کی تعلیم و تربیت پر گفتگو کرتے ہوئے عام روایت اور طریقے سے

سر سید احمد خاں

تکمیل

(تہذیب الاخلاق جلد اول نمبر اول بابت یکم شوال ۱۲۸۷ھ)

ایک فارسی مشہور مثل ہے کہ "ہر کمالے را زوالے" مگر اس کے معنی اور اس کی وجہ بخوبی سمجھ میں نہیں آتی تھی۔ ایک بڑے حکیم نے اسی مطلب کو نہایت عمدگی اور وضاحت سے بیان کیا ہے۔ اس کا یہ قول ہے کہ "ہم کو اپنے تئیں درجۂ کمال پر پہنچا ہوا سمجھنا ہی زوال کی نشانی ہے"۔ اور بلاشبہ ایسا ہی ہوتا ہے۔ اس لیے کہ جب کوئی شخص یا قوم کسی بات میں اپنے تئیں کامل سمجھ لیتی ہے تو اس میں سعی اور کوشش اور زیادہ تحقیقات اور نئی نئی باتوں کی ایجاد سے باز رہتی ہے۔ اور رفتہ رفتہ اس چیز کو جس میں کامل سمجھا جاتا تھا، زوال آجاتا ہے۔

کامل مطلق بجز ذات باری کے اور کوئی نہیں ہے۔ پس جو کچھ کہ خدا نے کیا یا کہا وہ تو اپنی قسم میں کامل ہے اور اس کے سوا اور کوئی چیز جو انسان نے کی ہو یا کہی ہو کامل نہیں ہے، کیوں کہ قابلِ سہو خطا ہونا انسان کی شان سے ہے۔ اگر یہ بات اس طرح پر نہ ہوتی تو انبیاء علیہ الصلوٰۃ والسلام پر وحی کا نازل ہونے کی ضرورت نہ رہتی۔ پس ان تمام چیزوں کو جو انسان سے ایجاد ہوئی ہیں یا نتائج عقلِ انسانی ہیں ان کو کامل سمجھ لینا ہماری ہمیشہ غلطی اور ہمارے تنزل و ادبار کی ٹھیک نشانی ہے۔

کسی شخص یا کسی قوم کو کسی چیز میں کا
لینا بہت سی خرابیوں اور نقصانوں کا باعث ہوتا ہے
جو چیز کہ حقیقت میں کامل نہیں ہے ہم اس
غلطی سے کامل سمجھ لیتے ہیں
ہم میں ایک استغنا پیدا ہوتا ہے جس سے
اس کے اور کسی بات یا تحقیقات کو حقارت سے
دیکھتے ہیں اور اس بات کے فائدے سے محروم رہتے
لوگوں کے اعتراض کے سننے کو گوارا نہیں
اور اس سبب سے اپنی غلطی پر متنبہ نہیں ہوتے ا
جہل مرکب میں پھنسے رہتے ہیں۔ کوشش سے جو ا
ترقی کا فائدہ ہے، اس کو ہاتھ سے کھو بیٹھتے ہیں۔
خدا نے جو ہم کو عقل دی ہے اور جس کا
فائدہ ہے کہ جہاں تک ہو سکے ہم اس کو کام میں
لادیں، اوروں پر بھروسہ کرکے اس کو بیکار کر دیتے
ایسا کرنے میں ہم صرف اپنا ہی نقصا
نہیں کرتے، بلکہ آئندہ نسلوں کو بھی بہت بڑا نقصا
پہنچاتے ہیں۔ کیوں کہ ہماری اور ہماری آئندہ
نسلوں کی عقل اور جودتِ طبع اور تیزی ذہن ا
طاقت انتقال ذہنی اور قوت ایجاد سب مٹ جاتی
اور صرف اوروں کی تقلید پر ہماری چال رہ جاتی
ہے اور ہم ٹھیک اس مثل کے مصداق ہو جاتے
ہیں "چارپائے برو کتابے چند"

ہم مسلمانوں نے اپنے میں اِس نقص کو
یت درجہ پر پہنچا دیا ہے اور جو نقصان دینی و دنیوی
ہے ہم نے اُٹھائے ہیں ان کی کچھ انتہا نہیں۔ بھلا
باتوں کو اس وقت رہنے دو اور صرف اس بات
ور کرو کہ دنیوی علوم اور دنیوی کاروبار اور دنیا
باہمی معاشرت اور مجالست اور رسوم و عادات اور
تعلیم اور تربیت اور ترقی علم مجلس میں کیوں نہ ہم
شش کریں اور جس طرح اور قوموں نے اِن باتوں
ترقی کی ہے، ہم بھی کیوں نہ اسی طرح ترقی کریں۔
ارسطو کچھ ہمارا مذہبی پیشوا نہ تھا جو ہم اس کے
دم اور فلسفے اور اس کے الٰہیات کو ناقابل غلطی کے
جھیں۔ بوعلی کچھ صاحب وحی نہ تھا کہ اس کی طب کے
وا اور کسی کو نہ مانیں جو علوم دنیوی ہم مدت دراز
ے پڑھتے آتے تھے، اور جو اپنے زمانے میں ایسے تھے
۔ اپنا نظیر نہیں رکھتے تھے اور ان کے پابند رہنے کے لیے
ہم پر کوئی خدا کا حکم نہیں آیا تھا پھر کیوں ہم اپنی
نکھ نہ کھولیں اور نئے نئے علوم اور نئی نئی چیزیں
جو خدا تعالیٰ کی عجائبات قدرت کے نمونے ہیں اور جو روز
بروز انسان پر ظاہر ہوتی جاتی ہیں، ان کو کیوں نہ دیکھیں
یہ جو کچھ ہم نے کہا یہ صرف خیالی ہی باتیں
نہیں ہیں، بلکہ اس وقت دنیا میں ہمارے سامنے اس
کی مثالیں بھی موجود ہیں۔
ہم دیکھتے ہیں کہ دنیا میں دو قسم کی قومیں
ہیں جن میں سے ایک نے اپنے باپ دادا کو درجۂ کمال
پر پہنچا ہوا ناقابل سہو و خطا سمجھ کر ان کے علوم و فنون
اور طریق معاشرت کو کامل سمجھا اور اسی کی پیروی پر
چلتے رہے اور اس کی ترقی اور بہتری پر نئی چیزوں
کے اخذ و ایجاد پر کچھ کوشش نہیں کی اور دوسری
نے کسی کو کامل نہیں سمجھا اور ہمیشہ ترقی میں اور نئے
نئے علوم و فنون و طریقہ معاشرت کے ایجاد میں کوشش
کرتے رہے۔ اب دیکھ لو ان دونوں میں کیا فرق
ہے اور کون تنزل اور کون ترقی کی حالت میں ہے
ہندو اور مسلمان دو قومیں ہیں جو پچھلی لکیر
کو کامل سمجھ کر اُسی کو پیٹتے آتے ہیں۔ انگریز، جرمن
اور فرنچ ایسی قومیں ہیں جو ہمیشہ ترقی کی کوشش
میں ہیں۔ ایک زمانہ تھا کہ وہ پہلی قومیں علم و ہنر
و تربیت و شائستگی میں اپنے دور میں اپنی ہم عصر
قوموں سے مقدم اور اعلیٰ تھیں اور شاید مسلمانوں
کو یہ بھی عزت تھی کہ وہ یورپ کی بعض قوموں کے
لیے بمنزلہ استاد کے گنے جاتے تھے، مگر اسی عیب نے
جو اُن قوموں میں تھا اور اب بھی ہے اور اسی خوبی
نے جو پچھلی قوموں میں تھی اور اب بھی ہے، ٹھیک ٹھیک
معاملہ بالعکس کر دیا ہے۔ اب یورپ کی قومیں ایشیا
کی قوموں سے علم و ہنر، تربیت و شائستگی میں اعلیٰ
ہیں۔ پس میرا مطلب صرف یہی ہے کہ ہماری قوم کو بھی
چاہیے کہ اپنے دماغ کو ان بیہودہ خیالات سے جنھوں
نے ان کی سمجھ اور عقل کو بالکل خراب کر رکھا ہے اور
ان کی تمام خوبیوں کو خیالات فاسد کی کیچڑ میں لتھڑ پتھڑ
کر دیا ہے، خالی کریں اور علوم و فنون اور تہذیب
و شائستگی میں ترقی کرنے کی کوشش کریں اور انصاف
سے دیکھیں کہ ان کی تہذیب و شائستگی میں نقصان
ہونے کے سبب سے ان کی قوم کی کیسی بدنامی ہے اور
عمدہ اخلاق اور قواعد کو جو خدا تعالےٰ نے مذہب اسلام
کی بدولت ان کو دیے تھے، بری طرح سے استعمال میں
لانے اور ان کو بدصورت کر دینے سے غیر قومیں اِسلام کو
ہماری نالائقی کی بدولت کیسی حقارت اور نفرت سے
دیکھتی ہیں۔ کیسے خندہ زن اشارات اور کنایات اس
پر کرتی ہیں اور ہماری شامت اعمال کو نتیجہ مذہب
اسلام ٹھہراتی ہیں۔ ان کا ایسا کہنا اور خیال کرنا
کچھ بیجا نہیں ہے۔ اِسلام کوئی مٹی کا پتلا نہیں ہے
جس کو کوئی دیکھ سکے۔ مسلمانوں کی حالت اور ان کے

باقی صفحہ نمبر ۔۔۔ پر

اتحاد کب قائم ہوتا ہے

سر ایچ۔ اے۔ آر گب (۱۹۷۱ء - ۱۸۹۵ء) مشہور مستشرق ہیں۔ وہ انگریزی کے علاوہ عبرانی، عربی، آرامی وغیرہ زبانیں جانتے تھے۔ انھوں نے اسلام اور اسلامی تاریخ کو پڑھنے میں اپنی ساری عمر صرف کردی۔ پختہ عیسائی ہونے کے باوجود انھیں سلطان صلاح الدین ایوبی سے خاص دلچسپی تھی۔ انھوں نے سلطان کے پانچ معاصر مصنفین کی تحریروں کا گہرا مطالعہ کیا تھا — ابن ابی طے، ابن الاثیر، قاضی بہاء الدین ابن شداد، عماد الدین، القاضی الفاضل۔

پروفیسر گب نے سلطان صلاح الدین ایوبی سے متعلق مراجع کا گہرا مطالعہ کرنے کے بعد لکھا ہے کہ اسلام کی تاریخ میں صدیوں کے بعد یہ منظر دکھائی دیا کہ ایک مسلم حکمراں مسلسل تین سال تک جنگ کے میدان میں اپنی فوجوں کے ساتھ رہ کر ایک متحد دشمن کا مقابلہ کرتا رہا۔ سلطان صلاح الدین اگرچہ کوئی بہت بڑے جنگی ماہر یا کوئی خاص تجربہ کار حکمراں نہ تھے۔ اس کے باوجود ان کی غیر معمولی کامیابی کا راز ان کی یہ صلاحیت تھی کہ وہ صلیبی حملہ آوروں کے خلاف اپنی قوم کے مختلف عناصر اور ان کی باہم متصادم سیاسی قوتوں کو ایک محاذ پر یکجا اور متحد کرسکتے تھے۔

سلطان صلاح الدین ایوبی کی بے غرضی، ان کی فیاضی، ان کی سادگی، ان کی تواضع، ان کی ایمانداری اتنی بڑھی ہوئی تھی کہ موافق اور مخالف دونوں ہی ان کا اعتراف کرنے پر مجبور ہوتے تھے۔ ان کی یہی خصوصیات تھیں جنھوں نے ان کو اس قابل بنایا کہ وہ مسلمانوں کی مختلف قوتوں کو ساتھ لے کر دشمن کا متحدہ مقابلہ کریں اور کامیاب ہوں (خلاصہ)

Studies on the Civilization of Islam.

یہ ایک حقیقت ہے کہ کسی قوم کی سب سے بڑی طاقت اتحاد ہے اور اتحاد کا سب سے بڑا راز یہ ہے کہ قوم کے ذمہ داروں کے اندر یہ مزاج ہو کہ وہ دوسروں کا اعتراف کرتے ہوں۔ ان کے سینہ میں اتنی کشادگی ہو کہ وہ دوسروں کو ان کا واقعی مقام دے سکیں۔ وہ اپنی ذات کو نمایاں کرنے سے زیادہ اجتماعی مقاصد کو نمایاں کرنے میں دلچسپی رکھتے ہوں۔

اپنے آپ کو دوسروں کے قریب لے جانے کا نام اتحاد ہے۔ مگر اکثر لوگ دوسروں کو اپنے قریب لانے کا نام اتحاد سمجھ لیتے ہیں۔

مراسلہ

بخدمت جناب مدیر
تہذیب الاخلاق
صدر منزل۔ تارنگلہ
مسلم یونیورسٹی۔ علی گڑھ

مکرمی سلام مسنون

"تہذیب الاخلاق" کا شمارہ نمبر ۸ مورخہ ۱۵-۷-۹۳ ملا۔ اس میں اسلامیہ انٹر کالج اٹاوہ کی سالانہ رپورٹ دیکھی اعداد و شمار بڑے متاثر کن ہیں کہ صاحب انٹرمیڈیٹ میں پندرہ فرسٹ کلاس ہیں۔ واہ واہ! کیا کہنے ہیں۔ لیکن ان میں مسلم کتنے ہیں؟ یہ اعداد و شمار سے ظاہر نہیں ہوتا۔ میں بتاتا ہوں۔ — صفر —

۱۹۷۷ء سے لے کر ۱۹۸۲ء تک چھ سال میں اسلامیہ کالج سے اٹھاون ۵۸ غیر مسلم طلباء فرسٹ ڈویژن لائے ہیں اور صرف ایک عدد مسلم صاحبزادے انٹر بورڈ میں فرسٹ ڈویژن لا پائے۔

ہائی اسکول بورڈ امتحان میں بھی گذشتہ کئی سال سے شریک ہونے والے مسلم طلباء کی تعداد گھٹتی جا رہی ہے اور انٹر میں بھی گھٹتی جا رہی ہے۔ کالج ماشاء اللہ خوب ترقی کر رہا ہے، دن دونی رات چوگنی۔ لیکن مسلم طلباء اس کالج میں ہائی اسکول اور انٹر دونوں بورڈ امتحانوں کی سطح پر سال بہ سال پیچھے جا رہے ہیں۔

میں خود اس کالج سے وابستہ ہوں۔ کئی سال سے اس کے محترم پرنسپل صاحب، لائق صد احترام صدر صاحب اور محترم سکریٹری صاحب کی توجہ اس طرف دلا رہا ہوں کہ ایک اسلامیہ کالج کا مقصد وجود مسلم طلباء کی تعلیم کو فروغ دینا ہے۔ لیکن اس کالج میں بپا ہوتا نظر نہیں آتا۔

محترم شیخ الجامعہ جناب سید حامد صاحب سے بھی التماس ہے کہ جب وہ کسی مسلم یا اسلامیہ ہائی اسکول یا کالج میں مہمان خصوصی بن کر تشریف لے جائیں اور وہاں ان کی خدمت اقدس میں اس کالج کے عظیم الشان کارنامے پیش کیے جائیں تو وہ اتنا ضرور پوچھ لیا کریں کہ ادارے کے نہایت شاندار نتائج میں مسلمانوں کا کیا حصہ ہے اور آپ سے بھی دست بستہ التماس ہے کہ جب کسی مسلم یا اسلامیہ کالج کی رپورٹ اپنے موقر رسالے میں شائع فرمائیں تو فرسٹ کلاس کی کثیر تعداد میں "نتھوا"، "خیرا"، "بدھو" کے نام بھی گن لیا کریں۔

میں فرقہ پرست نہیں ہوں (حالاں کہ کوئی مجھے کہے تو میں پرواہ نہیں کرتا) لیکن ایک نہایت سیکولر اور شدید طور پر محب وطن ہندوستانی کی حیثیت سے میں یہ سمجھتا ہوں کہ مسلم طلباء کو تعلیم میں آگے لانا، اس وقت اس ملک کی اور اس ملک کے رہنے والوں کی یعنی ہندوؤں کی سب سے بڑی خدمت ہے۔ جن مسلم و اسلامیہ اداروں میں مسلم طلباء کی تعلیم کو فروغ نہیں ہو رہا ہے، وہاں سب سے پہلے اسی بات کی طرف توجہ دینے کی ضرورت ہے۔

بصد خلوص و احترام
والسلام
احقر
اے آر شیروانی

اس دور میں ایسا کون مسلمان ہوگا جس کی توجہ مسلمانوں کی تعلیم کی طرف نہ ہو اور وہ ان کی تعلیم میں پستی پر گریہ و زاری نہ کرتا ہو لیکن جب تک مسلم طلباء کثرت سے اسکولوں میں داخل نہ ہوں گے اور ان کے والدین ان کی تعلیم و تربیت کی طرف متوجہ نہ ہوں گے

صورت حال میں تبدیلی مشکل ہے۔
آزادیٔ وطن کے بعد مسلمانوں میں یہ خواہش تو پیدا ہوئی ہے کہ ان کے بچے تعلیم حاصل کریں۔ لیکن ابھی وہ اپنے بچوں کی تعلیم و تربیت کی نگرانی کی طرف متوجہ نہیں۔ اور خود مسلم طلبار کو نہ تعلیم حاصل کرنے سے دلچسپی ہے نہ اچھا ڈویژن لانے سے۔ ان حالات کی اصلاح اس وقت ہو سکتی ہے جب ایک ملک گیر تعلیمی تحریک شروع کی جائے اور کوئی بے نفس اس خدمت میں سر بکف جٹ جائے۔

(وقت م ا)

وائس چانسلر کے نام ایک خط سے اقتباس

ڈیر وائس چانسلر صاحب

۱۵ اور ۲۰ فروری ۱۹۸۳ء کے درمیان آپ کے یہاں دنیا کے غذائی نظاموں پر جو بین الاقوامی کانفرنس شعبۂ جغرافیہ کے زیر اہتمام منعقد ہوئی۔ اس نے کثرت میں وحدت کا جلوہ دکھایا ایسا لگتا تھا کہ یہ شعبہ ایک چھوٹا سا بھارت ہے۔ جہاں ہر شخص کو اپنے طرز حیات کو خوش دلی کے ساتھ برتنے کے سارے مواقع فراہم ہیں۔ علاوہ بریں اس کانفرنس میں بیرون ملک سے جو نمائندے آئے تھے انھوں نے ہندوستان کی سیکولر پالیسی کا عملی زندگی میں اپنی آنکھوں سے مشاہدہ کیا۔

پروفیسر جسبیر سنگھ
زراعتی جغرافیہ کے پروفیسر
کروکشیتر یونیورسٹی
ہریانہ

[انگریزی سے ترجمہ]

علی گڑھ مسلم یونیورسٹی علی گڑھ

داخلہ نوٹس نمبر ۱

تعلیمی سال ۸۴ ، ۸۳ ۱۹ء

درجہ گیارہ میں ۱۰ + ۲ سسٹم کے مطابق داخلہ

قومی طریقہ تعلیم کی تعمیل میں علی گڑھ مسلم یونیورسٹی نے یہ فیصلہ کیا ہے کہ تعلیمی سال ۸۴-۸۳ء میں تعلیم کا ۱۰ + ۲ نظام اختیار کیا جائے، اس نئے نظام کو متعارف کرنے کے نتیجے میں سال ۸۳-۱۹ء میں پری یونیورسٹی درجہ میں کوئی داخلہ نہیں ہوگا۔ یہ فیصلہ کیا گیا ہے کہ سال ۱۹۸۳ء سے ۱۰ + ۲ تعلیمی نظام شروع کرنے کے لیے درجہ گیارہ بھی یونیورسٹی میں ان کے لیے شروع کیا جائے جو ہائی اسکول یا اس کے مساوی امتحان کو پاس کر کے آئیں گے۔ اس لیے ایسے امیدوار جنھوں نے اس یونیورسٹی سے ہائی اسکول کا امتحان پاس کیا ہے یا اس کے مساوی امتحان ملک کے یا بیرونی ممالک کے کسی ایسے ادارے سے پاس کیا ہو جو اس یونیورسٹی سے تسلیم شدہ ہو، اور جو اس میں داخلے کے لیے مطلوبہ کم از کم لیاقت رکھتے ہوں، اور ساری شرائط پوری کرتے ہوئے وہ مقررہ داخلے کے فارم کو بھر کر داخلہ کی درخواست دے سکتے ہیں۔ ایسے طالب علم جنھوں نے درجہ گیارہ پاس کیا ہے انھیں درجہ ۱۲ میں داخل کیا جائے گا۔ یہ کلاس تعلیمی سال ۸۵-۱۹۸۴ء سے شروع ہوگا۔

تعلیمی نظام ۱۰ + ۲ کے نفاذ کے نتیجہ میں موجودہ ہائی اسکول کے امتحان کی جگہ سکنڈری اسکول سرٹیفکیٹ امتحان ہوگا۔ درجہ (۱۲) بارہ میں کامیابی کے ساتھ تعلیم مکمل کرنے والے طلبہ کو سینئر سکنڈری اسکول سرٹیفکیٹ دیا جائے گا اور ایسے طالب علم بی اے (آنرس)، بی ایس سی (آنرس)، بی کام (آنرس) کے تین سالہ ڈگری کورس میں داخلہ کے لیے با لیاقت تسلیم کیے جائیں گے۔

۲ + ۱ اسٹیج پر سینیر سکنڈری کورس کی تفصیلات کے مطلوبہ لیاقت اور کم از کم لیاقت کے لیے داخلہ کے ضوابط وغیرہ انفارمیشن بلیٹن کے ذریعہ نوٹی فائی کیا جا چکا ہے، داخلہ درخواست کے فارم اور انفارمیشن بلیٹن اسسٹنٹ رجسٹرار (ایڈمیشنز) پوسٹ بکس نمبر 52 علی گڑھ مسلم یونیورسٹی علی گڑھ 202001 سے یا پرنسپل آف یونیورسٹی اسکولس یا سپرنٹنڈنٹ پبلیکیشن ڈویژن آف دی یونیورسٹی سے مئی ۸۳ء کے دوسرے ہفتہ سے حاصل کیے جا سکتے ہیں۔

داخلہ فارم مذکورہ شعبوں سے حاصل کرنے کے لیے مبلغ ۳/- روپے (تین روپے) نقد یا کراسڈ انڈین پوسٹل آرڈر جس کی ادائیگی فائننس آفیسر علی گڑھ مسلم یونیورسٹی علی گڑھ کے حق میں ہو اس کے ذریعہ ادا کرنا ہوگا، جو امیدوار درخواست کے فارم ڈاک کے ذریعہ حاصل کرنا چاہتے ہوں وہ ایک درخواست فارم کے لیے اپنا پتہ لکھا ہوا ۱۲ × ۲۸ سینٹی میٹر کے سائز کا ایک لفافہ جس پر مبلغ ۱٫۷۵ روپے (ایک روپیہ پچھتر پیسے) کا پوسٹل ٹکٹ چسپاں ہو بھیجنا ہوگا۔ ایسی حالت میں اگر کوئی امیدوار درخواست کا فارم رجسٹرڈ ڈاک سے منگانا چاہتے ہیں تو انھیں خود کا پتہ لکھا ہوا مذکورہ لفافہ پر ۴٫۵۰ روپے (چار روپے پچاس پیسے) کا پوسٹل ٹکٹ چسپاں کرکے بھیجنا ہوگا۔ اگر ایک سے زیادہ درخواست کے فارم مطلوب ہوں تو درخواست کے ساتھ ہر فارم کے لیے الگ الگ ٹکٹ لگا خود کا پتہ لکھا ہوا لفافہ روانہ کریں۔

پوری طرح سے مکمل بھرے ہوئے درخواست کے فارم مبلغ پانچ روپے (۵/۰۰) رجسٹریشن فیس برائے نصاب تعلیم کے ایڈمیشن کے لیے الگ الگ کراسڈ انڈین پوسٹل آرڈرز کے ذریعے ادائیگی فائننس آفیسر علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کے حق میں ہو، اس کے ساتھ اسسٹنٹ رجسٹرار (ایڈمیشنز)، پوسٹ بکس نمبر 52 علی گڑھ مسلم یونیورسٹی علی گڑھ ۲۰۲۰۰۱ کے پاس ۷ جولائی ۱۹۸۳ء کو شام پانچ بجے (۵٫۰۰ بجے) تک یا اس سے قبل پہنچ جانا چاہیے۔ تاریخ مذکورہ کے بعد موصول ہونے والی درخواستوں پر غور نہیں کیا جائے گا۔

دستخط

این معین الدین

کنٹرولر آف اگزامس اور ایڈمیشن

علی گڑھ مسلم یونیورسٹی - علی گڑھ

نوٹس داخلہ نمبر 2
برائے جولائی ۸۳ء سیشن

حسب ذیل مضامین کے ایم ڈی / ایم ایس اور ڈپلوما کورسوں کے لیے درخواستیں مطلوب ہیں۔

ایم ڈی:-
(a) فزیالوجی (b) فارماکولوجی (c) پیتھالوجی (d) مائکروبایولوجی e پیڈیاٹکس (f) پریونیٹو اینڈ سوشل میڈیسن (g) آبسٹٹرکس اینڈ گائناکولوجی (h) جنرل میڈیسین (i) ریڈیوڈائنوسس (j) ریڈیو تھراپی (k) بایوکیمسٹری

ایم ایس۔
a اناستھزیولوجی (b) اناٹمی (c) جنرل سرجری (d) آرتھوپیڈک سرجری۔ (e) اپتھالوجی (f) ای این ٹی (لارنگولوجی اینڈ اوٹولوجی)

ڈپلوما کورسز
(a) اوپتھالوجی (b) آرتھوپیڈک سرجری (c) اناستھیسولوجی (d) لارنگولوجی اینڈ اوٹولوجی (e) گائناکولوجی اینڈ آبسٹٹرکس (f) چائلڈ ہیلتھ (g) ڈی ایم آر ڈی۔ (h) ڈی ایم آر ٹی۔

داخلے کی بنیاد میرٹ۔ جس کا داخلے کے امتحان کے ذریعہ تعین کیا جائے گا۔ نیز سابقہ ریکارڈ ہوگا۔ جن امیدواروں نے تین سپلیمنٹریز میں شرکت کے بعد ایم بی بی ایس پاس کیا ہے، داخلے کے مستحق نہیں ہوں گے۔ جو امیدوار کسی مضمون میں دوبار فیل ہوئے ہوں گے اس مضمون میں داخلے کے مستحق نہیں ہوں گے۔ البتہ دیگر متعلقہ اسپیشلٹیز کے لیے درخواست دے سکتے ہیں۔ داخلے کا امتحان 5-6-1983 کو دس بجے صبح سے بارہ بجے دوپہر تک ہوگا۔ داخلے کے امتحان

کے لیے امیدواروں کو علیحدہ سے اطلاع نہیں دی جائے گی۔ اہل امیدواروں سے گزارش ہے کہ ایک دن قبل ایڈمیشن آفس سے انٹرنس ٹیسٹ کارڈ حاصل کرلیں۔ اہل امیدواروں کو اپنی درخواستیں حسب ذیل فارم میں پیش کرنی چاہئیں جن کے ساتھ ایک تازہ پاسپورٹ سائز فوٹو اور پانچ روپیہ کا پوسٹل آرڈر منسلک ہونا چاہیے، جو فائنس آفیسر اے ایم یو علی گڑھ کو واجب الادا ہو۔ اس لحاظ سے پیش کرنی چاہیئں کہ زیادہ سے زیادہ 31-5-83 تک اسسٹنٹ رجسٹرار (ایڈمیشنز) پوسٹ بکس نمبر 52، علی گڑھ مسلم یونیورسٹی علی گڑھ ۲۰۲۰۰۱ کے پاس پہونچ جانا چاہیں۔ نامکمل اور تاخیر سے پہونچنے والی درخواستوں کو زیر غور نہیں لایا جائے گا۔

درخواست کا پرد فارما

۱ کورس کا نام ....

۲ درخواست دہندہ کا نام ....

۳ باپ/شوہر کا نام ....

۴ تاریخ پیدائش ....

۵ قومیت اور ریاست ....

۶ موجودہ پتہ ....

۷ آیا

۸ اگر ملازم ہوں تو

(ا) شیڈولڈ کاسٹ

(اا) پست درجہ کا ممبر ہے ؟

۹۔ عہدہ اور تنخواہ

۱۰ رجسٹریشن نمبر

۱۱ اکاڈمک ریکارڈ (برائے ایم بی بی ایس فرسٹ پروفیشنل، سکنڈ پروفیشنل، فائینل پروفیشنل

پارٹ (ا)

" (اا)

امتحانات پاس کرنے کا سال ....

ادارے کا نام ....

کوششوں کی تعداد ....

پوزیشن اگر کوئی ہو ....

ڈسٹنکشن اگر کوئی ہو۔ ....

میرٹ اسکالرشپ کی تفصیلات

۱۲۔ جس مضمون کے لیے درخواست پیش کی جارہی ہے اس کے لیے نمبروں کی فیصد تعداد ....

۱۳ ان پروفیشنل امتحانوں کے نمبروں کی ۵ فیصد سے زائد کل میزان کی جو ۶۰ فیصد سے زائد ہو۔ شرح فیصد۔

۱۴ اشاعت / ریسرچ کا کام اگر کوئی ہو۔

۱۵ ۸ روٹیری انٹرن شپ اور (۸)، ہاؤس جاب کی تفصیلات سرٹیفیکٹوں کے ہمراہ)

۱۶ امیدوار کے دستخط مع تاریخ ....

دستخط

این موئیدین

کنٹرولر آف ایگزامینشنز اینڈ ایڈمیشنز

ناشر: قاضی معزالدین احمد　مطبع لیتھو کلر پرنٹر علی گڑھ　مقام اشاعت معفد منزل تار بنگلہ اے ایم یو،

Ramu topped in exam

I didn't

Poor performance in the class damages his self-confidence
He can surely regain self confidence if parents care to
give him two slices of bread everyday with

DIMAGHEEN

A nourished mental tonic

Dawakhana Tibbiya College

ALIGARH MUSLIM UNIVERSITY, ALIGARH-202001
Phone : 3629 Gram : "DAWAKHANA

Regd. No. L/ALG-247

شمارہ نمبر ۱۱ یکم جون ۱۹۸۳ء جلد نمبر ۲

... دوست ہمیشہ اپنے دوست کی نیکیوں کو بڑھاتا ہے اور
دشمن عیبوں کو، اس لیے ہم کو اپنے دشمن کا زیادہ احسان مند
ہونا چاہیے کہ وہ ہم کو ہمارے عیبوں سے مطلع کرتا ہے۔ اگر
ہم نے اس کے طعنوں کے سبب ان عیبوں کو چھوڑ دیا تو
دشمن سے ہم کو وہی نتیجہ ملا جو ایک شفیق استاد
ملنا چاہیے تھا۔

(سر) سید احمد

چھٹی رسالہ

مذہب کیوں اور کس لیے ۔ مولانا کاظم نقوی

دھرم سمایینا — مولانا تقی امینی

تعمیر کی طاقت

ہماری خانہ ویرانی — مولانا شوکت علی (مرحوم)

آرم اسٹرانگ کا قبول اسلام

فرد سے قوم تک — فرخ جلالی

چند تجاویز — محسن الملک

خود غرضی اور قومی ہمدردی — سید احمد

خط وکتابت و ترسیل زر کا پتا ۔

قاضی معز الدین احمد
صفدر منزل، تار بنگلہ، اے ایم یو، علی گڑھ
(202001)

مدیر: سید حامد وائس چانسلر
علی گڑھ مسلم یونیورسٹی

مدیر مسئول: قاضی معز الدین احمد

شمارہ نمبر ۱۱ — یکم جون ۱۹۸۳ء — جلد نمبر ۲

قیمت فی پرچہ	ایک روپیہ
ششماہی	۱۱ روپے
سالانہ	۲۰ روپے

بیرون ہند سے

فی پرچہ	ایک ڈالر
سالانہ	۱۵ ڈالر

چٹھی رساں

دو لڑکیاں پریشان بس کے اڈے پر کھڑی ہر مسافر سے جو دہلی کی بس کی طرف آتا تھا، کچھ کہتی تھیں اور پھر مایوس ہو کر ایک طرف کھڑی ہو جاتی تھیں۔ جوں جوں بس کی روانگی کا وقت قریب آتا تھا، ان لڑکیوں کی پریشانی بڑھتی جاتی تھی۔ یہاں تک کہ بس کے چلنے کا وقت آ گیا اور کنڈکٹر جو باہر کھڑا تھا بس میں داخل ہوا اور مسافروں کو آواز دی کہ وہ بس میں اپنی اپنی سیٹ پر آ کر بیٹھ جائیں۔ کنڈکٹر کی للکار سن کر لڑکیاں اور گھبرائیں اور پیچھے سے ادھر ادھر دیکھنے لگیں۔ گھبراہٹ میں خود بھی بس میں آ گئیں اور مسافروں سے پوچھنا شروع کر دیا کہ آپ دہلی جا رہے ہیں۔ ایک مسافر نے جھنجھلا کر کہا۔ کہہ تو دیا تم سے کہ یہ بس دہلی جا رہی ہے اور سب مسافر دہلی کے ہی ہیں۔ سب دفتر جائیں گے۔ کس کے پاس سمے ہے کہ وہ تمہاری چٹھی لیے پھرے؟ لڑکیاں یہ سن کر بڑی خفیف ہوئیں۔ ان کی پریشانی اور بڑھ گئی۔ کنڈکٹر نے چلا کر کہا۔ بس جا رہی ہے۔ اترتی کیوں نہیں۔ وہ خاموش نہ رہ سکیں اور بھرائی ہوئی آواز سے بولیں یہ خط بہت ضروری ہے۔ ہماری ماں بہت بیمار ہے ہم اپنے بھائیوں کو ماں کی بیماری کی خبر دینا چاہتے ہیں۔ کوئی سجن اگر دریبہ کی طرف جا رہے ہوں تو کشٹ کر کے یہ چٹھی ہمارے بھائیوں کی دوکان پر پہنچا دیں۔ ڈرائیور نے انجن اسٹارٹ کر دیا۔ بس کو جنبش ہوئی۔ مسافروں نے لڑکیوں کی طرف سے منہ پھیر لیا۔ کئی مسافر ایک ساتھ بولے۔ سب دفتر جا رہے ہیں۔ اب کس کے پاس دریبہ جانے کا وقت ہے۔" بس کو دیر ہو رہی ہے۔ نیچے اتر جاؤ۔" کنڈکٹر نے کہا۔

بس کی رفتار تیز ہونے لگی۔ یکایک کنڈکٹر نے بس روکنے کے لیے گھنٹی بجائی۔ ایک نوجوان سے جو بس کی طرف لپکا ہوا آ رہا تھا۔ کنڈکٹر نے کہا بابو جی! آج تو آپ نے بہت دیر کر دی۔ آپ کو آتا دیکھ کر بس روکی ہے۔ بس جلدی سے آ جاؤ۔ نوجوان ایک تعلیم یافتہ پھرتیلا آدمی تھا۔ چند ہی ماہ ہوئے تھے اس نوجوان نے ایک مقابلے کے امتحان میں کامیابی حاصل کی تھی۔ ہر سنیچر کو مرادنگر آ جاتا تھا اور گھر والوں سے مل کر پیر کی صبح کو دہلی واپس چلا جاتا تھا۔ قصبہ والے سب ہی اس کو پہچانتے تھے۔ کنڈکٹر نے خالی سیٹ کی طرف اشارہ کر کے "بابو جی" کو بیٹھنے کو کہا اور لڑکیوں سے غصے سے کہا تم اترتی کیوں نہیں۔ بس کو دیر ہو رہی ہے۔ نوجوان نے جو ابھی بس میں داخل ہوا تھا پوچھا کیا بات ہے۔ لڑکیوں نے بس سے اترتے ہوئے کہا ہماری ماں بیمار ہے۔ دریبہ میں ہمارے بھائیوں کی دوکان ہے ان کو ماں کی بیماری کی یہ چٹھی بھیجنا ہے۔ نوجوان نے خط لینے کے لیے ہاتھ بڑھا دیا اور خط لے کے پوچھا لفافہ پر پتا تو پورا لکھا ہوگا نا؟ لڑکیوں کے مایوس چہروں پر خوشی کی ایک لہر دوڑ گئی۔ نوجوان کو خط دیتے ہوئے ہاتھ جوڑ کر نمستے کیا۔ جلدی جلدی

چلتی بس سے اترتے ہوئے" لفافہ پر پورا ایڈریس ہے۔ دونوں نے ایک ساتھ کہا۔ بس تیز ہو گئی۔

ایک مسافر جو نوجوان کو مراد نگر آتا جاتا دیکھتا تھا" بولا اب کہاں آپ دریبہ جائیں گے اور ان کی دوکان تلاش کریں گے۔ دفتر کو دیر ہو جائے گی۔ دوسرے مسافر نے کہا۔ "بابوجی بڑے دیالو ہیں۔ چٹھی ضرور پہونچا دیں گے" پھر بابوجی سے پوچھا۔ آپ تو [illegible] کالونی میں رہتے ہیں نا؟ میں نے آپ کو وہیں دیکھا ہے۔ آپ اتنی دور چٹھی دینے کہاں جائیں گے۔ بس ٹکٹ لگا کر ڈال دیجیے گا۔ شام تک مل جائے گا۔ شہر شہر میں اسی دن ڈاک بٹ جاتی ہے۔

نوجوان نے مسافروں پر مسکراتے ہوئے نظر ڈالی اور گردن کے اشارے سے ان کی ہمدردی کا شکریہ ادا کیا اور خالی سیٹ پر بیٹھ گیا۔ اپنا چمڑے کا پورٹ فولیو کھولا۔ خط اس میں رکھ دیا اور اخبار نکال کر پڑھنے لگا بس آٹھ بجے دہلی پہونچی۔ محمود نے گھڑی دیکھی۔ کچھ سوچا اور اپنے کوارٹر کا رخ کیا۔ نو بجے کے قریب ضروریات سے فارغ ہو کر گھر سے نکلتے ہوئے پڑوسی کے گھر سے ایک دوست کو ٹیلی فون کیا اور اطلاع دی کہ وہ دفتر کسی قدر لیٹ پہونچے گا اور ملازم سے کہا کہ وہ دوپہر کے کھانے پر نہ آئے گا۔ محمود نے پھر گھڑی پر نظر ڈالی اور پورٹ فولیو میں کچھ ٹٹولتے ہوئے اسکوٹر میں بیٹھ کر پرانی دہلی کا رخ کیا۔ سڑک پر ہر گاڑی مرکزی حکومت کے دفتر کی طرف دوڑ رہی تھی، لیکن محمود کا رخ پرانی دہلی کی طرف تھا۔ ساڑھے ۹ بجے دریبہ کلاں پر اسکوٹر جا رکا۔ محمود نے پورٹ فولیو میں سے خط نکال کر دریبہ میں دوکانوں کے بورڈوں پر نظر ڈالتا ہوا داخل ہو گیا۔ ایک سنار کی دوکان پر اس کی نظر پڑی۔ وہ وہیں رک گیا۔ صبح کا وقت تھا دوکانیں کھل رہی تھیں۔ گپتا جی کی دوکان پر ایک ملازم جھاڑ پونچھ میں لگا ہوا تھا۔ محمود نے پوچھا۔ گپتا جی کہاں ہیں؟ ملازم نے بے رخی سے نوجوان کو دیکھا اور اپنے کام میں مصروف ہو گیا۔ محمود نے پھر پوچھا۔ گپتا جی کی یہی دوکان ہے نا؟ ملازم جھنجھلا کر بولا۔ کہتے کیوں نہیں کون سے گپتا جی۔ یہاں تو سب گپتا جی ہیں۔ محمود نے لفافہ پر پورا نام دیکھ کر ملازم کو بتایا تو وہ پھر غصّہ سے بولا۔ بڑے لالہ ۹ ۱۲ بجے آئیں گے۔ ان کے آنے کا کوئی ٹھیکا نہیں۔ نہ بھی آئیں۔ کچھ کہا نہیں جا سکتا۔ بتاؤ کیا کام ہے۔ محمود نے پوری کتھا سنائی تو ملازم بولا۔

" لالہ جی تو دیر میں آئیں گے ابھی تو دس بھی نہیں بجے تم چٹھی چھوڑ جاؤ۔ یا پھر ٹھہرو چھوٹے لالہ جی آتے ہوں گے"

محمود نے گھڑی دیکھی۔ پونے دس بجے تھے۔ اس نے سوچا ابھی تو وقت ہے۔ لیکن اتنا نہیں کہ وہ زیادہ دیر ٹھہر سکے۔ اسی وقت ایک صاحب ادھیڑ عمر کے صاف ستھرے چنتیں پڑے ہوئے سفید کپڑے پہنے گلے میں سونے کی زنجیر ڈالے آگئے۔ ملازم بولا تو تمہاری قسمت سے آج تو بڑے لالہ جی خود ہی آگئے۔

لالہ جی محمود کی طرف مخاطب ہوئے۔ محمود نے لالہ جی کے ہاتھ میں چٹھی دیتے ہوئے کہا "یہ آپ کی ہی ہے نا؟"

لالہ جی بولے یہ تو کملا کی معلوم پڑتی ہے۔ کیا آپ مراد نگر سے آ رہے ہیں۔ محمود نے جواب میں جی ہاں کہا اور آداب کر کے رخصت ہونا چاہا۔ بڑے لالہ جی بولے۔ بیٹھیے کچھ پینے کو [illegible] ٹھنڈا یا گرم۔ ارے رام لال لالہ کی دوکان سے بابوجی کے لیے گرم گرم جلیبیاں لا۔ بابوجی گرم جلیبیاں کھائیے۔ یہ دیسی گھی کی بنائی ہے۔ دہلی کا مشہور حلوائی ہے۔ ارے جلدی جا اور دیکھ سموسے بھی لائیو۔ جلدی سے دے جا اور پھر جا کر [illegible] لالہ جی نے ایک سانس میں بہت کچھ کہہ ڈالا [illegible] آپ [illegible] دفتر کا وقت ہو رہا ہے۔ محمود یہ کہتا ہوا گپتا جی سے رخصت ہوا۔ گپتا جی نے خط پڑھا۔ گھبرا کر [illegible] مراد نگر [illegible] بہت بیمار ہے۔ [illegible]

سید کاظم نقوی
صدر شعبۂ دینیات شیعہ
اے ایم یو

تیسری قسط

مذہب کیوں اور کس لیے

ہمارا اخلاقی سدھار کس طرح ہو ؟

انسان کی فطرت میں کچھ جذبات، میلانات اور رجحانات راسخ ہیں، ان ہی کے اوپر اس کی زندگی کا دار و مدار ہے۔ ان میلانات و رجحانات کے بغیر انسان زندہ نہیں رہ سکتا، وہ نیست و نابود ہو جائے گا، لیکن یہ فطری میلانات اسی وقت انسانی معاشرے کی سعادت اور خوش بختی کا ذریعہ بن سکتے ہیں جب کہ وہ نقطۂ اعتدال پر ہوں، ان میں کسی قسم کی افراط و تفریط نہ ہو۔

عورت اور مرد کے اندر جنسی میلان فطری ہے۔ اس پر نسلِ انسانی کی بقا موقوف ہے۔ لیکن اگر انسان اس فطری جذبہ کو سیراب کرنے کے سلسلے میں معقول حدود کا لحاظ نہ رکھے تو وہی اس کی تباہی اور بربادی کا سبب بن جائے گا۔

حبِ نفس اور خودخواہی کے جذبہ میں یقیناً انسان کی بقا کا راز پوشیدہ ہے۔ اگر انسان کو اپنی ذات سے محبت نہ رہے تو وہ اپنے کو باقی رکھنے کے لیے کوئی کوشش نہیں کرے گا، پھر وہ خطروں میں گھرے گا اور انھیں اپنے سے دور کرنے کے واسطے کوئی قدم نہیں اٹھائے گا۔ رفتہ رفتہ اس کا چراغ زندگی خاموش ہو جائے گا۔ اسی طرح اگر انسان کو اپنی ذات سے محبت حدِ اعتدال سے بڑھ جائے تو اس صورت میں بھی بدبختی کے سوا کوئی نتیجہ آنکھوں کے سامنے نہیں آئے گا۔

غیظ و غضب کا جذبہ یقیناً فطرت کا عطیہ ہے، انسان کے باقی رکھنے میں اس کا بڑا ہاتھ ہے۔ خطرے کے سامنے کے آنے کے بعد یہی غیظ و غضب کا جذبہ انسان کی تمام مادی اور معنوی قوتوں کو دفاع کے لیے آمادہ کر دیتا ہے۔ اگر کسی شخص میں غصہ کا جذبہ موجود نہ ہو تو اس کے تمام انفرادی اور قومی حقوق کا پامال کر دیا جانا یقینی ہے۔ پھر وہ خطروں کو اپنے سے دور نہیں کر سکے گا۔ لیکن اگر یہی جذبۂ غیظ و غضب مناسب حدود سے آگے بڑھ جائے، انسان معمولی معمولی باتوں کی وجہ سے آگ بگولہ ہونے لگے تو اس کا نتیجہ معاشرے کی تباہی اور بربادی کے علاوہ کچھ نہیں ہے۔ یہی حال انسان کے دوسرے فطری رجحانات اور میلانات کا ہے۔ اگر انھیں اعتدالی نقطے پر نہ لایا جائے، ہر شخص پاگلوں کی طرح اپنے سرکش جذبات کے سیراب کرنے کی کوشش کرے تو اس کا انجام یہی ہے کہ تمدنی زندگی کا محل مسمار، ہر طرف فتنہ اور ہنگامہ کا بازار گرم ہو جائے۔ ظلم اور ناانصافی کے سوا کچھ نظر نہ آئے کمزوروں کے لیے زمین تنگ ہو جائے، ان کے حقوق روند ڈالے جائیں۔ نوعِ انسانی کے درمیان طبقاتی اختلافات کا فاصلہ برابر بڑھتا جائے

کوئی شبہ نہیں ہے کہ ہر شخص چاہتا ہے کہ
اس کے فطری میلانات سو فیصدی عملی جامہ پہنیں۔ اس
کی کوئی آرزو تشنۂ تکمیل نہ رہے۔ اکا دکا لوگ ایسے
ملیں گے جن کے فطری میلانات خود بخود نقطۂ اعتدال
پر ہوں، جو دوسروں کے منافع سے اپنے مفادات کے ٹکراؤ
کے موقع پر میانہ روی اور توازن کے خواستگار ہوں۔

اب یہ غور کرنے کی ضرورت ہے کہ ان سرکش
تر فطری رجحانات اور جذبات پر کیوں کر قابو پایا جا سکتا
ہے؟ انھیں نقطۂ اعتدال پر لانے کا بہترین ذریعہ
یہ ہے کہ معاشرے کے تمام افراد ایک قادر و توانا،
ہر حیثیت سے زبردست ہستی کے سامنے اپنے کو جوابدہ
سمجھیں۔ وہ یقین رکھیں کہ وہ ذات ہر وقت تنہائی اور
لوگوں کے مجمع میں ان کے تمام اعمال کی نگراں ہے
ان کا یہ عقیدہ ہو کہ جن اشخاص کے میلانات اور جذبات
نقطۂ اعتدال پر نہیں ہوں گے، انھیں سخت ترین سزاؤں
کا مقابلہ کرنا ہوگا۔ لوگوں کے دل و دماغ میں ذمہ داری
کے احساس کی صرف یہی صورت ہے کہ وہ ایک دانا اور
توانا، حاضر و ناظر، علیم و حکیم، خبیر و بصیر خدا پر
ایمان لائیں۔

ہمیں ایسے اشخاص دکھائی دیتے ہیں جو
فقیر و محتاج اور تنگدست ہونے کے باوجود دوسروں
کے اموال کی طرف ہاتھ نہیں دراز کرتے۔ جنسی جذبات
کے پورے جوش و خروش کے باوجود پاکدامنی کا دامن نہیں
چھوڑتے۔ کسی مادی منصب، کسی دنیوی عہدے کے
حاصل کرنے کی خاطر کوئی ناجائز طریقہ نہیں اختیار
کرتے ہیں۔ وہ اپنے فطری جذبات و میلانات کو سیراب
کرتے، لیکن اعتدال اور توازن کے پابند رہتے ہیں
اس پارسائی، اس میانہ روی، اس اعتدال پسندی
کا سرچشمہ صرف خدا، روز آخرت، وہاں کی جزا اور
سزا پر ایمان کے علاوہ کچھ نہیں ہے۔

حقیقت یہ ہے کہ اخلاقی فضائل اور
بلند انسانی صفات ہمارے ضمیر میں داخل ہیں، اچھائیوں
کی طرف میلان، برائیوں سے دوری انسانی فطرت کا
تقاضہ ہے۔ کوئی عقلمند آدمی امانت کو برا اور خیانت
کو اچھا نہیں سمجھ سکتا، آپ کو کوئی شخص نہیں مل
سکتا جس کے لیے وعدہ وفائی بری اور وعدہ خلافی
اچھی صفت ہو۔ راست گوئی قلم آفرینش نے ہر ایک کے
صفحۂ فطرت پر لکھ دی ہے۔ ہر راست گوئی کا پابند
ہے۔ یوں ہی عفت اور پاکدامنی فطرت بشری کی
پکار ہے۔ اس لیے ناپاک اشخاص بھی شہرت و شہوت
اپنے کو پاکدامن اور پارسا ظاہر کرتے ہیں۔ چور، ڈاکو
جب چوری کا مال آپس میں تقسیم کرنا چاہتے ہیں تو
ایک دوسرے کو عدل و انصاف کی پابندی کے بارے
میں نصیحت کرتے ہیں۔

انسان کی ذات بہت سے اخلاقی فضائل
سے متصف ہونے کی صلاحیت موجود ہے۔ ان کے
بارآور ہونے کے کچھ اسباب اور شرائط ہیں۔ مذہب
جزا اور سزا کے تصور کے ذریعہ بلند انسانی صفات کی
مکمل پرورش کر سکتا ہے۔ مذہب کے پیش کیے ہوئے
دستورالعمل میں یہ صلاحیت ہے کہ وہ ان صفات
کو پروان چڑھائے۔ اس نے انسان کو بتایا ہے
کہ اگر تم اچھے صفات اختیار کروگے تو تمہیں اس کا
انعام ملے گا۔ اس کے برخلاف برے صفات اختیار
کرنے کی شکل میں تمہیں انتہائی تکلیف دہ سزائیں بھگتنا
پڑیں گی۔ ہم اس کے منکر نہیں ہیں کہ علمائے اخلاق
کے ہدایات بلند انسانی صفات کی پرورش میں بے اثر
ہیں۔ اس بارے میں ان کی راہنمائی کے معنی ہیں کوئی
پر زور تقریر، کوئی دلپذیر تحریر۔ ان کے ہدایات کے
عملی جامہ پہننے کا کوئی سامان موجود نہیں ہے۔

مذہب نے ایک طرف اخلاقی فضائل
سے افراد انسانی کو متصف بنانے کے لیے انتہائی
جامع اور موثر راہنمائی کی۔ دوسری طرف اپنے

ہدایات پر عمل کرنے کے لیے آخرت کا تصور پیش کیا۔ یہ بتایا کہ وہاں انسان کو ہر بات کا عوض ملے گا۔ انصاف پسند مفکرینِ عالم کا اتفاق ہے کہ مذہب اخلاق کی پناہ گاہ ہے بغیر مذہب کے اخلاق کی نشو ونما کا کوئی ذریعہ نہیں ہے۔ کھلی ہوئی بات ہے کہ اخلاقی فضائل مثلاً پاکدامنی امانت داری، راستی، درستکاری، فداکاری، یتیموں، بیواؤں، حاجت مندوں کی خبرگیری اکثر اوقات بہت سی مادی محرومیوں، دنیوی گھاٹوں کا سبب ہے۔ ایک پاکدامن اور عفت مآب عورت کو بہت سی امانت اندوزیوں کا سامان چھوڑنا پڑے گا۔ سچ بولنے کی وجہ سے انسان کبھی نقصان برداشت کرتا ہے۔ ایسی صورت میں کوئی معقول وجہ نہیں ہے کہ انسان اخلاقی فضائل کی پابندی کرکے گھاٹے میں رہے، لیکن اگر اس کا عقیدہ ہو کہ یہ وقتی اور دنیوی محرومیاں بلا عوض اور بلا صلہ نہیں ہیں، یہاں میں محروم رہوں۔ لیکن ایک وقت آئے گا جب مجھے ان اخلاقی فضائل کی پابندی کی جزا ملے گی۔ اگر انسان کو یہ یقین ہو کہ اخلاقی پستیاں چاہے دنیا میں میرے لیے طرح طرح کی لذتیں فراہم کریں، لیکن آخرت میں مجھے ان کی وجہ سے سخت ترین سزائیں بھگتنا پڑیں گی تو اس کی عقل اس سے مطالبہ کرے گی، جذبۂ حبِ نفس محرک بنے گا کہ انسان اخلاقی فضائل سے متصف ہو اور اخلاقی پستیوں سے کنارہ کشی اختیار کرے

وہ زندگی کہ جس میں خدائے حاضر وناظر کا تصور نہ ہو، وہ زندگی جس میں آخرت اور وہاں کی جزا اور سزا کا عقیدہ نہ ہو، انسان کے لیے ایسا خالص مادی ماحول تیار کرتی ہے جس میں ہر طرح کے انسانی اخلاق و اوصاف مر جاتے، ایسے ماحول میں انسان کے تمام افعال واعمال کا محور اس کے دنیوی فوائد اور اغراض ہوتے ہیں۔ ایسی صورت میں کوئی وجہ نہیں ہے کہ کسی یتیم کی انسان خبرگیری کرے، کسی بیوہ کا سرپرست بنے، ہاں ایسے مادی، خودغرض ماحول میں انسان کمزوروں اور ناداروں کی خبرگیری اس وقت کیا کرتا ہے جب اسے خوف ہو کہ ایسا نہ کرنے کی شکل میں وہ بغاوت کردیں گے۔ وہ ہماری اینٹ سے اینٹ بجادیں گے۔ ان کی زبان بندی کے لیے انھیں مست اور مدہوش بنانے کی غرض سے ضرورت ہے کہ کبھی ان کی اشک شوئی کی جائے۔ کسی حد تک انھیں محرومی کے اندھیرے کنویں سے نکالا جائے۔

مادی ذہنیت کے اشخاص کے بالکل برخلاف وہ لوگ کہ جو خدا کو مانتے، اس کے علم و اطلاع کے قائل اور وہاں کی جزا وسزا میں کامل عقیدہ رکھتے ہیں وہ بغیر کسی مادی محرک کے بے لوثی کے ساتھ یتیموں، بیواؤں محتاجوں کی دست گیری کے لیے کمربستہ رہتے ہیں، انھیں معلوم ہے کہ ان کو آخرت میں ان کے اعمال کی کئی گنا زیادہ جزا ملے گی۔

جب کوئی شخص خدا کو نہ مانتا ہو، آخرت کا قائل نہ ہو، وہاں کی جزا وسزا کا عقیدہ نہ رکھتا ہو، جب اسے یہ یقین ہو کہ میرے اعمال کا مجھے کوئی مادی عوض ملنے والا نہیں ہے تو وہ کیوں اور کس لیے اپنے مصالح کے خلاف، اپنے رشتہ داروں کے مصالح کے خلاف صرف عدالت وانصاف کو ملحوظ رکھتے ہوئے کوئی اقدام کرے؟

بقیہ "فرد سے قوم تک"

کرسٹان نہ ہو جائیں۔ یہاں کالج میں مشرق اور مغرب گلے مل رہے ہیں۔ سڈنس اور مولوی محمد اکبر پڑھا رہے ہیں شبلی اور آرنلڈ جج ہیں۔ نئی زندگی کے زمزمے ہیں۔ قومی مرثیے قصیدوں کا لہجہ اختیار کرچکے ہیں۔ ناکامی سامنے ہے۔ لیکن امید کا دامن نہیں چھوٹتا۔ جہالت اور تنگ نظری سے مقابلہ ہے مگر علم کی قوت شکست نہیں مانتی۔ اب فرد قوم بن چکا ہے۔

یہی سر سید کا تاباں چہرہ ہے جو اب تک چمکتا رہا ہے۔ ۱۸۹۸ء آگیا ہے۔ سید احمد سر سید بن کر رخصت ہو رہا ہے اور ۱۸۵۷ء کو چالیس برس گزر چکے ہیں۔

مولانا تقی امینی
علی گڑھ

دھرم سمیلن

۵ ار مئی ۱۹۸۳ء کو ہری دوار میں دھرم سمیلن ہوا جس میں تمام مذاہب کے نمائندوں نے حصہ لیا۔ جلسہ کا افتتاح وزیر اعظم شریمتی اندرا گاندھی نے کیا۔ مسلمانوں کی نمائندگی مولانا تقی امینی ناظم دینیات مسلم یونیورسٹی علی گڑھ نے کی۔ اس دھرم سمیلن میں تقریر کرتے ہوئے مولانا نے فرمایا۔

الحمد للہ وکفی وسلام علی عبادہ الذین اصطفیٰ۔ اما بعد:

پرائم منسٹر صاحبہ، بھائیو اور بہنو، ہم سب کی خوش قسمتی ہے کہ یہاں مذہب کے نام پر جمع ہوئے ہیں۔ یہ مذہب ہی کی خصوصیت ہے کہ امیر و غریب شاہ و گدا افسر و ماتحت سب کو ایک پلیٹ فارم پر اکٹھا کر کے زندگی کے سفر پر روانہ کرتا ہے۔

مذہب دراصل سچائی کے اس پروگرام کا نام ہے جو اللہ کی طرف سے اس کے پیغمبروں کے ذریعہ آتا رہا ہے۔ اس کی حیثیت انکشاف حقیقت (REVE-LATION OF TRUTH) کی ہے جو اپنی ذات سے خود ایک آئیڈیل ہے محض سماجی عمل (SOCIAL-ACTIVITY) کی نہیں ہے کہ جس کا اپنا کوئی آئیڈیل نہیں ہوتا۔ جو چیز انکشاف حقیقت کی حیثیت رکھتی ہے وہ اس وقت تک باقی رہتی ہے جب تک سماج اس کی اجازت دیتا ہے اور اگر اس کی جگہ کوئی اور عمل یا طریقہ اختیار کر لیا گیا تو پھر وہ چیز تاریخی بن جاتی ہے۔

یہ سچائی کا پروگرام اللہ کی طرف سے ہر دور و زمانہ میں آیا اور جب تک ایمانداری کے ساتھ اس پر عمل درآمد باقی رہا، اس کو تازہ دم بنانے کی ضرورت محسوس نہ ہوئی۔ لیکن جب ذاتی اغراض و مفاد کا اس پر غلبہ ہو گیا اور لوگوں نے اس میں تبدیلی کر دی تو پھر اللہ نے ازسرنو اس کو زندگی اور توانائی بخشی تاکہ اس کی قائدانہ حیثیت برقرار رہے اور اسی کے زیر سایہ زندگی اور سماجی ترقی کی منزلیں طے کرتے رہیں۔

قرآن حکیم اور دوسری مذہبی کتابوں میں سچائی کا پروگرام لانے والے تمام پیغمبروں کا ذکر نہیں کیا گیا صرف انھیں کا ذکر ہے جن کی قوموں نے ابتدائی تمدن کی تعمیر میں حصہ لیا تھا اور جن کا ذکر و تذکرہ اس وقت کے لوگوں میں پایا جاتا تھا سب کی تفصیل بیان کرنے کی ضرورت نہ تھی۔ ہدایت و رہنمائی کے منصب پر صرف ان کو تسلیم کر لینا کافی تھا۔

چنانچہ یہ موجود ہے۔ مثلاً

ورسلا قد قصصنٰھم علیک من قبل ورسلا لم نقصصھم علیک
(آپؐ سے پہلے بہت سے رسولوں کا ہم نے آپؐ سے ذکر کیا اور بہت سوں کا ذکر نہیں کیا[1])

لکل امۃ رسول
ہر امت کے لیے رسول آیا ہے[2]

لکل قوم ھاد
ہر قوم کے لیے ہدایت کرنے والا آیا ہے[3]

سچائی کا یہ پروگرام اس وقت تک برابر آتا رہا جب تک انسان کی قوتوں اور صلاحیتوں میں پختگی اور خود اعتمادی پیدا نہیں ہو گئی اور جب یہ دیکھ لیا گیا کہ ان میں اس درجہ پختگی اور خود اعتمادی آ گئی ہے کہ اب "ایک گائڈ بک" دے کر اور اس کی حفاظت کا بندوبست کرکے زندگی کے سفر کو جاری رکھا جا سکتا ہے تو اس سلسلہ کو بند کر دیا گیا۔ اگر اس مرحلہ میں بھی سلسلہ کو جاری رکھا جاتا تو انسان کی خود اعتمادی کو ٹھیس پہونچتی اور پھر تعمیر و ترقی کی وہ شکلیں نہ وجود میں آتیں جو سلسلہ بند کرنے کے بعد وجود میں آ گئی ہیں۔

سچائی کے اس پروگرام میں ہمیشہ یکجہتی رہی اور اس کی بنیادی تعلیمات میں کبھی اختلاف نہ رہا۔ مثلاً ایمان و اعتقاد، عبادت و فرماں برداری، طہارت و پاکی، نیکی و بدی، پاکیزگی و گندگی وغیرہ کے بیان کرنے میں یہاں تک یکجہتی برقرار رہی کہ ایک کا ماننا سب کا ماننا اور ایک کا انکار سب کا انکار قرار پایا

لا نفرق بین احد من رسلہ[4]
(ہم رسولوں میں کسی کے درمیان تفریق نہیں کرتے ہیں)

اختلاف اور بیہ جا دوجو کچھ نظر آتا ہے وہ بعد کا پیدا کردہ ہے جس کو دور کرنے کے لیے ضروری ہے کہ مذہب کی اصل تعلیمات کو کھلے ذہن کے ساتھ تلاش کیا جائے اور اس میں کسی عصبیت و فرقہ واریت کو جگہ نہ دی جائے جس مذہب کی جو بات صحیح نظر آئے اس کے تسلیم کرنے میں دیر نہ کی جائے۔

اسی طرح مذہب کو ایمانداری کے ساتھ زندگی میں رچایا اور بسایا جائے۔ یہ نہ ہو کہ جب تک مذہب سے فائدہ حاصل ہوتا رہے اس کو استعمال کیا جاتا رہے اور جہاں اس کا ٹکراؤ اپنے فائدے اور ذاتی غرض سے ہو، اس کو خیرباد کہہ دیا جائے۔

اللہ پر سچا ایمان کیے بغیر مذہب کا نام لینا بے کار ہے۔ ایمان جان لینے اور مان لینے کا نام نہیں ہے بلکہ کسی چیز کا دل میں اتر جانا، بیٹھ جانا، رگ و ریشہ میں سرایت کر جانے کا نام ہے۔ اللہ سے اس قسم کا تعلق قائم ہونے کے بعد تمام کاموں میں اللہ کی مرضی اور اس کے بندوں کی بھلائی معلوم کرنے کی فکر ہوتی ہے جس سے یکجہتی پیدا ہوگی اور ایک ایسا سماج وجود میں آئے گا جس میں ملک اور قوم کی بہتری ہو اور ان تمام باتوں اور کاموں سے پرہیز ہو جن میں ایک فرد کا بھی نقصان ہوتا ہو۔ کیونکہ پیغمبروں نے اللہ اور بندوں کے درمیان جو رشتہ بتایا ہے وہ یہ ہے

الخلق کلھم عیال اللہ فاحبھم الی اللہ انفعھم لعیالہ[5]
(تمام کنبہ اللہ کا کنبہ (خاندان) ہے اللہ کو محبوب وہ شخص ہے جو اللہ کے خاندان کو زیادہ نفع پہنچانے والا ہے)

---

[1] سورہ نساء آیت ۱۶۵۔ [2] یونس آیت ۴۷ [3] رعد آیت ۷
[4] بقرہ آیت ۲۸۵ [5] جامع صغیر بحوالہ طبرانی و سیرۃ ابن ہشام ج ا

تعمیر کی طاقت

چینی مفکر کنفیوشس کا قول ہے۔ " ایک چھوٹا چراغ روشن کرنا اس سے بہتر ہے کہ تم تاریکی کو بُرا کہو"
کیونکہ ہم تاریکی کو بُرا کہہ کر تاریکی کو دور نہیں کر سکتے لیکن ہم اگر تاریکی میں ایک چراغ جلادیں تو تاریکی اپنے
آپ جاتی رہے گی۔

رات نے اگر آپ کے چاروں طرف اندھیرا پھیلا دیا ہو تو اس کے خلاف لفظوں کا طوفان اُٹھا کر آپ اس سے
نجات نہیں پا سکتے۔ البتہ اگر آپ ایک شمع حاصل کر کے اس کو جلا دیں تو آپ دیکھیں گے کہ رات کے باوجود آپ
کا ماحول روشن ہو گیا ہے۔

بُرائی کو ختم کرنا ہے تو بھلائی کا آغاز کر دیجیے۔ آپ کو لوگوں کی طرف سے بد سلوکی کا تجربہ ہو تو آپ
ان کے ساتھ حسن سلوک کے ساتھ پیش آئیے۔ لوگ ظالم بنے ہوئے ہوں تو آپ انصاف کرنا شروع کر دیجیے
لوگ آپ کے ساتھ امتیاز برت رہے ہوں تو آپ اس پر صبر کر کے اپنی کمیوں کی تلافی میں لگ جایئے لوگ آپ کو
اپنی تنقیدوں کا نشانہ بنائے ہوئے ہیں تو آپ ان کو نظر انداز کر کے اپنے اصل کام میں مصروف ہو جایئے
یہی کسی مسئلہ کو حل کرنے کا واحد طریقہ ہے۔ اس کے سوا جتنے طریقے ہیں وہ مسئلہ کو الجھانے والے ہیں نہ کہ
مسئلہ کو حل کرنے والے۔

باقی صفحہ آئندہ پر

بقیہ دھرم سمیلن

إن العباد کلهم اخوة
(سب بندے بھائی بھائی ہیں)
الناس بنو آدم و آدم من
تراب
(سب لوگ آدمؑ کی اولاد ہیں اور آدمؑ
مٹی سے پیدا کیے گئے ہیں۔)
پیغمبروں نے بندوں کو اللہ سے محبت
کی تاکید کی اور یہ بھی بتایا کہ اللہ سے محبت
کا راستہ اس کی خدمت میں سے ہو کر گزرتا
ہے۔
مذہب پر عمل کرنے میں بندوں کی خدمت نظر انداز
نہ ہونی چاہیے۔ ورنہ مذہبی ہونے کا سرٹیفکٹ وہاں
سے نہ ملے گا، جہاں سے مذہب آیا ہے۔ پھر اس خدمت
میں کسی "ریزرویشن" کی گنجائش نہ ہونی چاہیے کہ وہ
سب ہی کا اللہ ہے۔ خواہ بندوں کا تعلق کسی فرقہ
و مسلک سے ہو۔ اگر فرقہ و مسلک کی تفریق روا رکھی
گئی تو نہ صرف یہ کہ یک جہتی کو نقصان پہنچے گا بلکہ
مذہبی ہونے کی "سند" خطرے میں پڑ جائے گی۔

آخر میں دعا ہے کہ دھرم سمیلن کامیاب
ہو اور اس سے یک جہتی کو آگے بڑھانے میں
مدد ملے۔ آمین۔

ایک مسلم نوجوان ایک مسجد میں امام مقرر ہوئے۔ اس مسجد کے بارے میں مشہور تھا کہ یہاں کوئی امام ٹھہرتا نہیں وہاں جتنے امام آئے سب تھوڑے تھوڑے دنوں کے بعد بیزار ہو کر چلے گئے۔ مسجد کے لوگ اماموں کو بہت کم تنخواہ دیتے تھے ان کو عزت کی نظر سے تو دیکھنے کا سوال ہی نہ تھا۔

نوجوان کے اندر تعمیری مزاج تھا۔ اس نے سوچا میرے پیش رو جو چیز مطالبہ کے ذریعے حاصل نہ کر سکے میں اس کو انشاء اللہ عمل کے ذریعہ حاصل کروں گا۔ اس نے خاموشی کے ساتھ یہ فیصلہ کیا کہ وہ نہ صرف اپنے مقررہ فرائض کو بحسن و خوبی ادا کرے گا بلکہ فرائض سے زیادہ کام کرنے کی کوشش کرے گا۔ وہ مسجد کی صفائی کا پہلے سے زیادہ اہتمام کرتا۔ مسجد سے ملی ہوئی زمین پہلے خالی پڑی رہتی تھی۔ اب اس نے اس کی صفائی کر کے وہاں سبزی اور پھول لگا دیے اور آبپاشی اور محنت کر کے اس کو سبزہ زار بنا دیا۔ محلہ کے لڑکے جو صبح و شام کھیل کود میں رہتے تھے ان کو مسجد میں بلا کر پڑھانا شروع کر دیا۔ اسی کے ساتھ وہ لوگوں کی تلخ باتوں کا جواب بھی میٹھے انداز میں دیتا۔ وہ لوگوں کی بدسلوکی ... با وجود ان کے ساتھ اچھا سلوک کرتا۔

اس قسم کے کاموں کا نتیجہ یہ ہوا کہ اس نے مسجد والوں کے دل جیت لیے۔ لوگ اس سے اتنا خوش ہوئے کہ اپنے آپ اس کی تنخواہ بڑھا دی۔ اس کو کثرت سے تحفے تحائف ملنے لگے۔ ہر آدمی اس کو عزت کی نظر سے دیکھنے لگا۔ لوگوں کی خواہش ہوئی کہ اس کے لیے ایسا انتظام کریں کہ وہ یہاں مستقل رہنے لگے۔ یہاں سے چھوڑ کر کہیں اور نہ جائے۔ چنانچہ اس کے لیے مسجد سے متصل ایک رہائشی کوارٹر بنا دیا گیا تا کہ وہ اپنے گھر والوں کو وہاں لائے۔ اور دل جمعی کے ساتھ وہاں رہے۔

زندگی کا یہی راز ہے جس کو شیکسپیر نے ان لفظوں میں بیان کیا ہے۔ تمہیں کیا چاہیے! جو کچھ بھی تمہیں چاہیے اس کو مسکراہٹ کی طاقت سے حاصل کرو نہ کہ تلوار کی طاقت سے۔ بیشتر لوگوں کا حال یہ ہے کہ وہ بغیر سوچے سمجھے محض وقتی جذبات کے تحت کام کرتے ہیں۔ اگر وہ سوچ سمجھ کر کام کریں تو انھیں معلوم ہو کہ وہ جو کچھ "تلوار" کے ذریعہ حاصل کرنا چاہتے ہیں، اس کو وہ مسکراہٹ کے ذریعہ زیادہ بہتر طور پر حاصل کر سکتے ہیں۔

آدمی کو بیک وقت دو چیزوں کی ضرورت ہے۔ پیسہ اور اخلاق۔ پیسہ آپ کو آپ کی ضرورتیں دیتا ہے اور اخلاق آپ کو لوگوں کے درمیان اچھی طرح رہنے کے قابل بناتا ہے۔ آدمی کو اگر اپنی مادی ضرورتوں کو پورا کرنے کے لیے پیسہ چاہیے تو اسی کے ساتھ اس کو لوگوں کے ساتھ اچھا نباہ کرنے کے لیے اچھا اخلاق بھی چاہیے۔ مگر اکثر آدمی پہلی چیز حاصل کرنے کے لیے محنت کرتے ہیں اور دوسری چیز حاصل کرنا بھول جاتے ہیں۔ چین کی ایک کہاوت میں ان دونوں چیزوں کی اہمیت کو بڑی خوبی کے ساتھ بیان کیا گیا ہے۔ "اگر تمہارے پاس دو پیسے ہوں تو ایک سے روٹی خریدو اور دوسرے سے پھول۔ روٹی تمہیں زندگی دے گی اور پھول تم کو جینے کا ڈھنگ سکھائے گا۔"

(منقول از "الرسالہ")

مولانا شوکت علی

ہماری خانہ ویرانی

مولانا شوکت علی ۱۰ مارچ ۱۸۷۳ء کو پیدا ہوئے اور ۲۷ نومبر ۱۹۳۸ء دہلی میں ان کا انتقال ہوا۔ رسالہ جامعہ نے ان کا ایک مضمون "ہماری خانہ ویرانی" اپنے اکتوبر ۱۹۸۲ء کے شمارہ میں شائع کیا تھا۔ یہ مضمون روزنامہ "خلافت" بمبئی کے شمارہ مورخہ ۱۵ اپریل ۱۹۳۰ء میں پہلی بار چھپا۔ "تہذیب الاخلاق" رسالہ جامعہ سے اس مضمون کو لے کر نقل کر رہا ہے۔

ہندوستان کے عوام کو جن لوگوں نے بیدار کیا اور تحریک آزادی میں حصہ لینے کے لیے تیار کیا، ان میں مولانا محمد علی اور ان کے بڑے بھائی مولانا شوکت علی خصوصیت کے ساتھ قابل ذکر ہیں۔ ان کی خدمات کو ہندوستان بھلا نہیں سکتا۔ لیکن انھوں نے جہاں ملک کی آزادی کی تحریک میں حصہ لیا، وہاں جب وقت آیا تو مسلمانوں کے شہری حقوق کے تحفظ کا سوال بھی اٹھایا۔ اس پر ان کے اور کانگریس کے بعض لیڈروں کے درمیان اختلاف ہوا اور کانگریس ان سے دور ہٹ گئی۔ افسوس ہے کہ ان کی اس تنظیم میں کوئی جگہ نہ رہی۔ بالآخر وہ بھلا دیے گئے۔

خوشی ہوئی کہ حال ہی میں ان دونوں بھائیوں کی خدمات کا ذکر کانگریس کے بعض حلقوں میں ہوا اور ان کی یاد تازہ ہوئی۔ ایک حقیقت پسند ہندوستانی کے نزدیک ان دونوں رہنماؤں کی عظمت اسی میں نہیں ہے کہ وہ تحریک آزادی کے قائد تھے، بلکہ اس میں بھی ہے کہ جب وقت آیا تو وہ آزاد ہندوستان میں مسلمانوں کے شہری حقوق کے تحفظ کے بارے میں مسلمانوں کو مطمئن کرنے کے طلب گار ہوئے۔

کانگریس نے ایسے بہت سے لیڈروں کی یاد تازہ کی ہے جو کانگریس سے گو تعلق نہ رکھتے تھے، لیکن ہندوستان کے عوام کی انھوں نے کسی نہ کسی حیثیت سے خدمت کی تھی۔ کانگریس اگر ایسے مسلم لیڈروں کی یاد بھی تازہ کرے جنہوں نے مسلم عوام کی خدمت کی اور ان کو بیدار کیا، تو یہ کانگریس کی عظمت کی دلیل ہوگی۔ کاش ایسا شعور کانگریس کے حلقوں میں پیدا ہو اور وہ ایک سیاسی پارٹی نہیں ملک کی قومی تنظیم ہو جائے۔

ق۔ م۔ ا

آگ سا ہے در و دیوار پہ سبزہ غالب
ہم بیاباں میں ہیں اور گھر میں بہار آئی ہے

پانچ برس ۱۵ء سے ۱۹ء کے آخر تک وطن سے دور تلب صاحب لینسڈون اور چھندواڑہ میں نظر بند رکھا اور بعد کو ترقی دے کر چھندواڑہ سے بیتول جیل لے گئے جہاں ہم کو بند رکھا۔ اس طرح پانچ برس

تو انگریز کے حکم سے پہلے زمانہ جنگ تک ہم لوگ وطن سے
دور نظر بند رہے اور اس عرصہ میں خوب خانہ ویرانی ہوئی
جب دسمبر ۱۹ء کی آخری تاریخوں میں بیتول جیل سے رہا
ہوئے تو سیدھے امرتسر کانگریس کی شرکت کے لیے گئے۔
اور وہاں کانگریس کے ممبر بنے اور اس کے اجلاس کے
علاوہ مسلم لیگ میں شریک ہوئے اور میں نے پہلی خلافت
کانگریس کی صدارت کی جس نے باقاعدہ جمعیۃ خلافت کا کام
کرنے کا حکم دیا۔ ان جلسوں سے فارغ ہو کر ہم چند دن کے
لیے رامپور گئے جہاں ہمارے عزیز ہم وطنوں نے محبت کا
ثبوت دیا اور عزیزوں سے مل کر ہم بھی خوش ہوئے۔ اگرچہ
ایک سال پیشتر ایک ہفتہ کے اندر انفلوئنزا سے چار جوان
موتیں ہوئی تھیں۔ ہندوستان کے مسلمانوں اور ہندوؤں
نے ایسے پرجوش خیر مقدم کیے کہ حکومت اور بہت سے کمزور
ہماری ہر دلعزیزی دیکھ کر خوف زدہ ہو گئے اور بالآخر
جب کہ ہم علی گڑھ اپنے پرانے مادر کالج کی دعوت پر وہاں
جا رہے تھے کہ گورنر بٹلر کا حکم نامہ کہیے یا اشارہ کہیے
ہز ہائنس نواب صاحب رامپور کو ملا اور انھوں نے حکم دیا
کہ علی گڑھ جانا اور سیاسی کام چھوڑ دو، ورنہ وطن میں آنے
کی اجازت نہ ہوگی، ہم بٹلر کو بے نقط سنا کر وطن
چھوڑنے پر مجبور ہو گئے اور افسوس کے ساتھ حکم کی
تعمیل کی۔

حیف در چشم زدن صحبت یار آخر شد
روئے گل سیر ندیدیم و بہار آخر شد

اس گیارہ برس کے عرصہ میں سوا بچے اور بچوں
سے ریل کے ویٹنگ روم میں سال میں ایک دو مرتبہ ملنے
کے گیارہ برس تک اپنے گھروں کو دیکھنا نصیب نہیں ہوا
نہ عزیزوں کی قبر پر فاتحہ پڑھ سکے۔ دور سے ہاتھ
اٹھا کر دعا مانگ لیا کرتے تھے اور ان کی یاد سے جب
کاموں سے فرصت ملتی تھی، دل تڑپا لیا کرتے تھے۔
بی اماں جب قریب المرگ تھیں تو اس خیال سے کہ ہم اپنے
پرانے آقا کے منشا کے خلاف کر کے بدنام ہو جائیں اور ان کے

حکم کو پس پشت ڈال کر گھر میں نہ آ جائیں۔ باوجود ڈاکٹروں
اور طبیبوں کے اختلاف کے کہ ملنا اور تین میل پالکی
میں اسٹیشن جانا تقریباً موت کے مترادف ہوگا انھوں
نے اس کی پرواہ نہ کی بلکہ احتجاجاً دوا پینا اور غذا کھانا
ترک کر دیا، سب مجبور ہو ان کو پالکی میں اسٹیشن لے
آئے اور ایک دن ویٹنگ روم میں رہیں اور وہاں
ارادہ کر لیا کہ ہمارے ساتھ دہلی چلیں گی اور اس کے
ساتھ ساتھ وصیت کر دی کہ اگر میں مرادآباد کے
قریب جان دوں تو مجھ کو بلاقی صاحب رحمۃ اللہ علیہ
کے مزار کے قریب مرادآباد میں دفن کرنا، اگر وہاں
جگہ نہ ملے تو حضرت باقی باللہ صاحب کے مزار شریف کے
قریب پہاڑ گنج دہلی میں دفن کرنا۔ دہلی تک زندہ پہنچنے
کی امید نہ تھی مگر ان کی روحانی قوت جسم کی قوت پر
غالب آگئی۔ اور وہ تین مہینے دہلی میں زندہ رہیں
اور نومبر ۲۴ء میں دنیا سے رخصت ہو گئیں۔ انا للہ
و انا الیہ راجعون۔ دہلی میں اپنے نقش بندی
خاندان کے بزرگوں کے زیر سایہ دفن ہوئیں۔ محمد علی
کی دو جوان لڑکیاں شادی کے کچھ دن بعد ہی دنیا سے
رخصت ہو گئیں۔ ایک علی گڑھ میں کالج کے قبرستان
میں دفن ہیں اور ایک دہلی میں چوسٹھ کھمبے کے قبرستان
میں۔ میرا لڑکا شاہد مرحوم بھی دہلی میں اپنے چھوٹے
بھائی ساجد کے ہم پہلو آرام کرتا ہے۔ اور اسی کے
پاس حمیدہ بانو کا مرقد ہے۔ یہ موتیں اور یہ قبریں
ہماری غریب الوطنی کا پتہ دیتی ہیں۔ کسی پرانے شاعر
نے کیا خوب کہا ہے۔

مسکن کا پتہ خانہ بدوشوں سے نہ پوچھو
جس جا پہ گئے بیٹھ وہی ہے وطن اپنا

اس گیارہ برس کی عمر میں بار ہا سر ہائنس نواب صاحب
نے ہم سے اور حکیم اجمل خاں صاحب مرحوم سے فرمایا کہ
وہ ہم کو رامپور آنے کی اجازت دے دیں گے۔ گورنمنٹ
انگریزی کا کوئی حکم نہیں تھا، صرف انگریزوں کی خوشنودی

حاصل کرنے کے لیے انھوں نے یہ کام کیا تھا۔ اگرچہ دلی میں ہماری عزت کرتے تھے اور رامپور کے باہر دہلی اور بھی ہر جگہ ملتے تھے اور ہم کو کھانے وغیرہ میں شامل ہونے کے لیے اصرار کرتے تھے۔ مگر تعجب تھا کہ وطن جانے کی اجازت نہیں دیتے تھے۔ افریقہ سے واپس آنے کے بعد میں نے ارادہ کر لیا تھا کہ اس مسئلہ کا قطعی فیصلہ کر لیا جائے اور اس لیے لاہور سے واپسی پر میں نے ہز ہائنس سے خط و کتابت شروع کر دی، جس کا ہز ہائنس پر ضرور اثر ہوا تھا۔ صرف ان کی محبت اور اپنی خاندانی روایات کی بنا پر ہم نے اس مسئلہ پر بہت توجہ نہیں کی تھی اور یہ بھی نہیں چاہتے تھے کہ اپنے ذاتی اور خاندانی معاملات کو اہمیت دے کر پبلک کے سامنے لائیں۔ غالبًا اسی اپریل یا مئی کے مہینے میں ویسے ہی فیصلہ ہو جاتا کہ اس عرصہ میں ہز ہائی نس پر فالج کا دورہ پڑا اور ہمارے منصوبے بیکار ہو گئے۔ ۴۲ برس سے ہز ہائنس سے میرے میری ذاتی محبت کے تعلقات ہیں۔ یہ ہی نہیں کہ چار پشت سے ہم نے ان کا نمک کھایا تھا بلکہ جب میری عمر ۱۵ سال کی تھی اور ہز ہائی نس کی ۱۳ سال کی، ہم ایک دوسرے کے ساتھ کرکٹ و ٹینس کھیلتے تھے اور بعد کو جب میں محکمہ افیون میں کلکٹر ہو گیا تھا تو تعلقات اور زیادہ بڑھ گئے تھے۔ اور وہ ہمارے اور ہمارے خاندان کے مربی تھے۔ اسٹیٹ سے روپیہ قرض لے کر محمد علی کو آکسفورڈ میں تعلیم دلائی تھی جس کو بعد میں ہم نے اور بی اماں نے ادا کر دیا تھا۔ ان سے مالی امداد طلب کرنے کا حق ہم کو ضرور ہے اور ہم ضرور طلب کریں گے مگر ان پر فالج کے دورے نے ہمارے منصوبوں کو منتشر کر دیا۔ میں ۱۹ مارچ ۱۹۳۰ء کو بچوں سے ملنے کے لیے رامپور گیا اور ہز ہائی نس کی مزاج پرسی کی اجازت طلب کی مگر وہی جواب شام کو ملا کہ تم خلافت کا کام چھوڑ دو، جس پر میں ہمیشہ ہی ایک شعر پڑھ دیا تھا۔

عمر تو ساری کٹی عشقِ بتاں میں مومن
آخری عمر میں کیا خاک مسلماں ہوں گے

بعد کو معلوم ہوا کہ اسی شام کو پرائیویٹ سکریٹری نے ہز ہائی نس کو فون پر اطلاع دی کہ شوکت علی اسٹیشن پر آیا ہوا پڑا ہے۔ بیماری کی حالت میں پرانے محبت کے تعلقات تازہ ہو گئے اور حکم دیا کہ مجھ کو فورًا بلا لیا جائے۔ مگر اسٹیشن سے ڈاک گاڑی میں دہلی کے لیے روانہ ہو چکا تھا۔ دوسرے روز صبح جب کہ ہم جمعیۃ العلماء کے پہلے اجلاس سے واپس آئے جس میں سب کو متحد ہو کر سارد ا ایکٹ کے خلاف کام کرنے کا مشورہ دیا تو تار ملا کہ فورًا موٹر سے رامپور آؤ۔ چنانچہ تمام پانچ بجے کی گاڑی سے ہم دونوں دہلی سے روانہ ہو کر رات کو رامپور پہنچے۔ اسٹیشن پر ہمارے بڑے بھائی ذوالفقار علی صاحب اور زاہد علی ملے اور ان سے سب حالات معلوم ہوئے۔ رات کو ویٹنگ روم میں سوئے اور صبح کو ہمارے آنے کی اطلاع ہوئی تو ہمارے لیے موٹر آئی اور ہم خاص باغ کو ٹھی میں جو اس دس برس کے عرصہ میں بدل کر ایک عالی شان محل ہو گئی ہے، پہنچے اور سب دوستوں سے ملے۔ اس محل کے قریب ہی میرا باغ اور چھوٹا سا بنگلہ ہے جس کی بنا خود ہز ہائی نس نے رکھی تھی اور جو گیارہ برس سے میں نے نہیں دیکھا تھا۔ سو کچے بیگہ میں آم اور دیگر پھولوں کا باغ ہے، پیڑ اب خوب بڑھ گئے تھے اور چھوٹا سا بنگلہ جس سے مجھ کو بہت محبت ہے، گنجان پیڑوں میں نظر آیا اور پرانے واقعات کی یاد کو تازہ کر گیا اور مجھے غالب مرحوم کا شعر یاد آ گیا۔

نقصاں نہیں جنوں میں بلا سے ہو گھر خراب
سو گز زمیں کے بدلے بیاباں گراں نہیں

رامپور کا بچہ بچہ ہم سے محبت رکھتا ہے۔ افسرانِ اعلیٰ سے لے کر غریب سے غریب اسامی اور خادم سے ہم نے معانقہ کیا اور وطن آنے پر ان کی مبارکباد

قبول کی - بعد مغرب ہز ہائی نس بیدار ہوئے اس وقت ہم
دونوں بھائی اور میرے دونوں لڑکے زاہد علی اور
عابد علی مع اپنے بڑے بھائی ذوالفقار علی صاحب کے ہم
سلام کو گئے - حسب معمول ہز ہائی نس کے ہاتھوں اور
پاؤں کو چوما اور ان کو بیمار اور کمزور دیکھ کر دلی
صدمہ ہوا اور ہز ہائی نس کے اس کہنے پر " ارے
شوکت! میں تو اپاہج ہوگیا " ہمارے سب کے آنسو نکل
گئے - باوجود ہز ہائی نس کے بار بار روکنے پر ہم لوگ
دس پندرہ منٹ کے بعد اٹھ کر چلے آئے - کیونکہ ڈاکٹر
کا حکم تھا کہ مریض سے زیادہ باتیں نہ کی جائیں - چلتے
وقت بڑے بھائی نے عرض کیا کہ اب تک گھر نہیں گئے
ہیں، مکان پر جانے کی اجازت دی جائے تو ہز ہائی نس
نے حکم دیا کہ جائیں اور اپنے مکان پر ٹھیریں - دوپہر کو
جب ہم محل پہنچے تو ولی عہد بہادر اور باقی صاحبزادے
دونوں کو ہز ہائی نس نواب صاحب مالیر کوٹلہ اور دیگر
مہمانوں کے ساتھ لنچ کھانے کے لیے لے گئے جو محل کے
عالی شان کھانے کے کمرہ میں ہو رہا تھا، پر لطف گفتگو
رہی - نواب صاحب مالیر کوٹلہ سے پرانا تعارف تھا
اور ہم سے ہمیشہ نہایت محبت کا برتاؤ فرما رہے تھے
اس کے بعد صاحبزادوں نے سرکار کے حکم کے مطابق
ہم کو سارا محل دکھایا - جو نہایت وضع دار اور آراستہ
ہے اور جس میں بہت کچھ اضافہ کر دیا گیا ہے اور نیا
باغ تو ایک بڑے پارک کی طرح مرغزار اور سبزہ زار
بنا ہوا تھا - نواب صاحب سے ملنے کے بعد رات کا
کھانا کھا کر قریب ۱۱ بجے کے ہم گھر پہنچے - راستہ میں
وطن کی چپہ چپہ زمین سے محبت کی بو آ رہی تھی اور
گھر کے قریب تو ہر جگہ کو غور سے دیکھتے تھے کہ گیارہ
برس میں کیا کیا تبدیلیاں واقع ہوگئی ہیں، مکان پر
پہنچے تو جس مکان میں سب پیدا ہوئے تھے اس کو
منہدم کا ایک اونچا ڈھیر پایا - جس کو بچوں نے ہموار کر کے
ہاکی کھیلنے کا میدان بنا لیا ہے - زنانہ اور بڑے مکان

کی دیوار بھی ٹوٹ گئی تھی اور مکان کے بڑے دا
کے سامنے جو برآمدہ تھا وہ بھی گر گیا تھا - صرف
چھوٹے کمرے رہ گئے تھے جن کو زاہد علی غسل خ
طور پر استعمال کرتے تھے - ہر مصیبت کے موقع پ
مرحوم بھی یاد آتے ہیں - کیا خوب کہا ہے

اگا ہے گھر میں ہر سو سبزہ ویرانی تماشا کر
مدار اب کھودنے پر گھاس کے ہے میرے درباں

بچے انتظار کر رہے تھے - ہماری موٹر کی آواز سن
دوڑ پڑے اور ہر طرف سے ہم کو چمٹ گئے - ب
بچیاں دروازہ میں انتظار میں کھڑی تھیں، اسٹیشن
ہمارا اسباب آگیا تھا - ہم سب بڑے دالانو
گئے - روشنی میں رات کو مکان اچھا معلوم ہوتا تھ
رات اس کی خستہ حالی کی پردہ داری کر رہی تھی - اما
مرحومہ کا نہ ہونا تعجب خیز تھا مگر اس گھر کی رو
ہماری اکلوتی بہن سے تھی جو مجھ سے چھوٹی اور محمد
بڑی تھی، ان سے بے حد محبت تھی اور ہم ایک دو
کے دوست تھے - میری بیوی کے انتقال کے بعد چو
برس تک میرے بچوں کو انھوں نے ہی پالا تھا ا
میری سب ملکیت کا وہی انتظام کرتی تھیں - اس
کی یاد نے سب کو رنجیدہ کر دیا - ہم نے وضو کر
نماز عشاء پڑھی اور شکر ادا کرنے کے نفل بھی ادا کیے
وطن سے محبت کے اظہار میں ہم ذرا نہیں شرما
قریب دو گھنٹے تک ہم بچوں اور عزیزوں سے با
کرتے رہے اور پھر سو گئے - صبح کو دوسرے ع
کے گھر ملنے گئے اور اس کے بعد قبرستان جانے
اشتیاق تھا - چنانچہ اول نئے قبرستان میں گئے
بہن دفن تھیں اور عزیز بھی جن کا ہماری غیر حاض
میں انتقال ہوا تھا - پرانے خاندانی قبرستان م
نہ تھی - اس لیے دوسرا قبرستان اس زمین م
بنوایا ہے جہاں ہمارے خاندان کے پیر و مرشد
نقش بندی سلسلہ کے اول سے مدفون تھے -

دونوں کو بہن کی قبر کا پتہ نہیں چلا۔ کیوں کہ اس پر کوئی کتبہ نہ تھا۔ نئی نئی قبریں بنی ہوئی تھیں۔ سب پر فاتحہ پڑھا اور پھر پرانے قبرستان میں گئے۔ جہاں دادا، والد، بھائی، بہن اور سب عزیز دفن ہیں اور جہاں پر سفید سنگ مرمر کی قبر میں میری مرحومہ بیوی دفن ہے اور اس کے پاس ہی آٹھ فٹ لمبی اور چھ فٹ چوڑی جگہ بنی ہوئی ہے۔ جہاں اگر خدا کو منظور ہوا تو میں سپرد خاک ہوں گا۔* قبروں کی حالت اچھی نہ تھی۔ سب کو بوسہ دیا۔ سب پر فاتحہ پڑھا اور آدھ گھنٹہ مرحومہ کی قبر پر بیٹھ کر قرآن شریف پڑھا۔ اور پھر سلام علیک کہہ کر واپس آیا، دوسرے دن اپنے بھانجے اور داماد نعمان علی خاں کو لے کر بہن کی قبر پر گیا وہاں بھی کچھ دیر ہم دونوں بھائی رہے اور سب غیر حاضر عزیزوں کو سلام علیک کر کے بڑے قبرستان میں گئے اور آدھ گھنٹہ عزیزوں کی یاد میں اور خود اپنی موت کی یاد میں صرف کیا اور اس کے بعد اپنے دوسرے شہر کے مکان کو دیکھا جو مرحومہ بیوی کے ترکے میں ملا تھا اور جس میں خود مرحومہ پیدا ہوئی تھیں۔ اس مکان کی ویرانی کو دیکھ کر از حد صدمہ ہوا۔ بڑے دالان سب گر گئے ہیں۔ صحن میں مٹی کا ڈھیر تھا، خدا کا شکر ہے کہ وہ ایک کمرہ بچا ہوا ہے جس میں مرحومہ پیدا ہوئی تھیں۔ ناہد صاحب نواب چھتاری کو لکھ کر بھیجوں گا کہ وہ دو تین سو روپیہ لگا کر اس مکان کو اس قابل کر دے کہ اب کی برسات میں گر نہ پڑے۔ قلب کو اس کھنڈر کو دیکھ کر تکلیف ہوئی۔ مگر غالب مرحوم کے ان اشعار سے تسکین ہوئی

گریہ چاہے ہے خرابی مرے کاشانے کی
در و دیوار سے ٹپکے ہے بیاباں ہونا
گھر ہمارا جو نہ روتے بھی تو ویراں ہوتا
بحر گر بحر نہ ہوتا تو بیاباں ہوتا

کوئی ویرانی سی ویرانی ہے
دشت کو دیکھ کے گھر یاد آیا

ان ویرانوں کو دیکھ کر ہنسی بھی آگئی۔ کیوں کہ ایک طرف نئی دولت کے ملنے کے چرچے ہو رہے ہیں، اور دوسری طرف خدا نے ہماری بریت کے لیے ایسے سرٹیفکٹ دکھیے ہیں۔ ہم خوش ہیں کہ اب تک ان آزمائشوں میں ہم پورے اترے ہیں اور انشاء اللہ آخر وقت تک چاہے کچھ کیوں نہ ہو تمام مخالفین اسلام کا ہر طرح مقابلہ کریں گے اور انشاء اللہ اسلام کی فتح اپنی آنکھوں سے دیکھیں گے۔ تعجب تو یہ ہے کہ کل تک جو ہندو ہمارے قصیدے پڑھتے تھے، بڑا بھائی بڑا بھائی کہہ کر سر پر بٹھاتے تھے۔ آج صرف اس بنا پر کہ ہم مسلمانوں کے جائز حقوق مانگتے ہیں اور مسلمانوں کو انگریزوں کی غلامی سے نکالنا چاہتے ہیں اور مہا سبھائی ہندوؤں کے جال سے بھی، تو اب دنیا کا کوئی عیب نہیں جو ہم دونوں بھائیوں میں نہ ہو "انگریزوں سے روپیہ لے کر ایمان بیچ رہے ہیں" اور افسوس تو یہ ہے کہ ایک جھوٹے بیان کے مطابق وہ بھی ایک بہت چھوٹی اور حقیر رقم پر، جو میرا حق ہے اور جس کو بارہ برس سے میں نے طلب بھی نہیں کیا، جھوٹ کی کوئی انتہا نہ رہی ہے۔ خدا کا شکر ہے کہ ہمارے سینکڑوں غریب مسلمان دوست ایسے ہیں جو ہماری تھوڑی بہت ضروریات پورا کر دیتے ہیں۔

نکالا چاہتا ہے کام تو طعنوں سے کیا غالب
ترے بے مہر کہنے سے وہ تجھ پر مہرباں کیوں ہو

رہی ہماری خانہ ویرانی تو ہم اس سے خوش ہیں خدا ہم کو صلہ دے گا۔ غالب کے چند شعر ہمارے جذبات کی ترجمانی کرتے ہیں۔

---

* افسوس کہ یہ آرزو پوری نہ ہوئی جامع مسجد دہلی کے مشرقی دروازے کے سامنے سرمدؒ کے مزار کے قریب مدفون ہیں۔

کم نہیں وہ بھی خرابی میں پہ وسعت معلوم
دشت میں ہے مجھے وہ عیش کہ گھر یاد نہیں
کم نہیں جلوہ گری میں ترے کوچے سے بہشت
یہی نقشہ ہے ولے اس قدر آباد نہیں
شوریدگی کے ہاتھ سے ہے سر وبال دوش
ہے سبزہ زار ہر در و دیوار غمکدہ
جس کی بہار یہ ہو پھر اس کی خزاں نہ پوچھ

جہاں بہت رنج و صدمہ ہوا وہاں یہ دیکھ کر خوشی ہوئی کہ عزیزی زاہد علی اور میری چھوٹی لڑکی عذرا اور ان کی پھوپھی نے میری تمام تصویریں اور سامان بہت احتیاط سے رکھا ہے اور پرانے کاغذات کو بھی ضائع ہونے نہیں دیا، ان کی خوش انتظامی میں خدا کرے اور اضافہ ہو۔ تین روز گھر ہے مگر ہر وقت کام کی یاد دماغ پر سوار تھی۔ وطن کی نمانہ ویرانی دیکھ کر ہم دونوں بمبئی آگئے ہیں تاکہ مسلمانوں کو مفسدوں کی فتنہ پردازی سے نجات دلائیں۔

ہم لطف کے بندے ہیں خدا کی قسم اے داغ
ہم سے نہ کبھی ناز ستم گر کے اٹھیں گے۔

بقیہ چند تجاویز

متعلقہ صفحہ نمبر

ہیں جاہل باتوں کو سن کر غصہ میں نہ آویں گے بعد ان باتوں کو نیچریانہ کلام سمجھ کر اس سے متنفر نہ ہوں گے اور یہ سن کر کہ صنعت و حرفت کا سکھانا اور اس کی ہدایت کرنا اصل عبادت ہے، کہنے والے کو نیچری اور کافر نہ کہیں گے۔ جب کہ ہادیان طریقت کا یہ حال ہو اور وہ خود سیدھی راہ سے بھٹکے ہوئے ہوں تو قوم اور امت کیوں کر منزل مقصود پر پہنچ سکتی ہے۔

بقیہ مضمون "خود غرضی اور قومی ہمدردی"

متعلقہ صفحہ نمبر

اور اگر ہم سے پوچھو تو ثواب بھی نہیں۔ گدھا کھایا کھیت جس کا پاپ نہ پن۔

اسلام کا صحیح مسئلہ یہی ہے کہ اسی کام کے کرنے میں ثواب ہے جس کی ضرورت ہے، دیکھو کوئی اجر ہجرت سے زیادہ نہ تھا جس کی اس وقت بڑی ضرورت تھی۔ فتح مکہ کے بعد کچھ بھی نہ تھا۔ جیش اسامہ کی تیاری کے لیے جو چیا ٹکے کا اسباب (حضرت) ابو بکر صدیقؓ نے حاضر کیا جس کی ضرورت تھی مگر اب اس کی برابری کوہ احد کے برابر سونا بھی نہیں کر سکتا۔ یہ سچا اصول مذہب اسلام کا ہے، مگر کوئی بھی اس کی پروا نہیں کرتا۔

قوم کی حالت اور اسلام کی حرمت کیسی ہی خراب ہوتی جاوے اس کے اسباب پر غور کرنے اور اس کے رفع کرنے کا کسی کو خیال نہیں ہے۔ اپنے خیال کے مطابق جو اپنے ثواب اور دوسرے جہاں میں اپنے چین کرنے کے کام سمجھتے ہیں، وہ کرتے ہیں۔ پھر کس طرح خیال ہو سکتا ہے کہ وہ قومی ہمدردی کے کام ہیں بلکہ ٹھیٹ خود غرضی ہے اور امید ہے کہ وہ کبھی حاصل نہ ہوگی۔

(از مقالات سر سید - مرتبہ مولانا محمد اسماعیل پانی پتی
ناشر:- مجلس ترقی ادب۔ لاہور)

مضامین صاف اور صفحہ کے صرف جانب
تحریر فرمائیں۔
خط و کتابت و ترسیل زر کے لیے پتا
قاضی معز الدین احمد
معرفت منزل [illegible] علیگڑھ

آرمسٹرانگ کا قبولِ اسلام

خبر تو صرف اتنی ہی تھی کہ امریکہ کا ایک خلاباز دائرہ اسلام میں داخل ہو چکا ہے۔ بات غیر معمولی نہ تھی ایسا ہوتا ہی رہتا ہے۔ خدا جن تبدیلوں کو توفیق دیتا ہے یا جو لوگ حق کی تلاش و جستجو میں رہتے ہیں ان پر زندگی کی حقیقت کھل ہی جاتی ہے۔

لیکن یہ خبر اہمیت اس لیے اختیار کر گئی کہ دینِ حق قبول کرنے والا یہ وہ انسان ہے جو کائنات کی تاریخ میں سب سے پہلے چاند پر پہنچا تھا۔ ساری دنیا میں اس کے نام کی دھوم مچ گئی تھی۔ اس قدر شہرت یافتہ اور پڑھے لکھے فرد کی طرف سے تبدیلی مذہب کا اقدام بہت سوں کے نزدیک حیرت انگیز تھا حالاں کہ حیرت و تعجب کا کوئی پہلو اس میں بھی نہ تھا اسلام تو اس کائنات کا سب سے بڑا حق ہے اسے قبول کر لینا خود قبول کرنے والے کی سعادت ہے۔ ہاں مسلمانوں کے لیے خوشی کا مقام اس لیے تھا کہ ان کی عالمی ملت میں ایک اور فرد کا اضافہ ہو گیا ہے۔ اس حد تک تو بات درست تھی۔ لیکن ہمارے جذباتی حلقوں کی طرف سے اس پر جس طرح شادمانی و مسرت کا اظہار کیا جا رہا تھا وہ زیادہ پسندیدہ نہ تھا۔

پھر ہوا یہ کہ چاند پر جانے والے نے خبر کی تردید کر دی اور اس طرح بات ختم ہو گئی۔ تردید شائع کرنے میں بعض اخبارات نے کچھ زیادہ ہی جوش دکھایا تھا۔ اس میں شبہ نہیں کہ ہماری ملت کے ان جذباتی لوگوں کو بڑی مایوسی اور خفت ہوئی ہو گی جو آرمسٹرانگ کے قبولِ اسلام کو ایک بہت بڑا واقعہ سمجھ کر جا بجا خوشی کا اظہار کر رہے تھے اور ان عیسائی مشنریوں نے اطمینان کا سانس لیا ہو گا جو آرمسٹرانگ کے قبولِ اسلام سے پریشان تھے۔ دراصل اس پورے واقعہ کا یہی ایک ایسا پہلو ہے جس پر غور کرنے کی ہم سب کو ضرورت ہے۔ یہ حقیقت ہے کہ ہماری ملت کا ایک بڑا حصہ بہت جذباتی واقع ہوا ہے۔ ذرا ذرا سی بات پر خوش اور معمولی سی بات پر غمگین ہو جاتا ہے۔ یہ بھی درست ہے اس طرح اس کے اسلام سے قلبی تعلق کا اظہار ہوتا ہے لیکن اکثر حالات میں ہماری یہ جذباتیت ہمارے لیے نقصان کا سبب بھی بن سکتی ہے۔ بعض اوقات چھوٹی چھوٹی باتوں کے بڑے نتائج ظاہر ہوتے ہیں اور معاملہ کچھ سے کچھ ہو جاتا ہے۔

آرمسٹرانگ نے قبولِ اسلام اور پھر اس کی تردید کی خبر بھی کسی کی شرارت ہو۔ کسی نے یہ خبر اس نیت سے پھیلائی ہو کہ آئندہ اگر کوئی مشہور آدمی واقعی اسلام قبول کرے تو لوگوں کو یقین کرنے میں پس و پیش ہو۔

امکان ہر بات کا ہے بات اس شخص کی بھی سچ ہو سکتی ہے جس نے حال ہی میں آرمسٹرانگ سے ایک اسلام پسند صحافی کی براہ راست گفتگو کی خبر پڑھ کر تبصرہ کیا تھا کہ ممکن ہے ادھیڑ عمر ہونے والا آرمسٹرانگ نہ ہو اور کوئی ہو نیز یہ کہ آرمسٹرانگ واقعی مسلمان ہو چکا ہو لیکن امریکہ حقیقت کو دبانے کی کوشش کر رہا ہو۔ کیوں کہ اس خبر سے عیسائی تبلیغی مشن گھبرا گئے ہیں۔

بات کچھ بھی ہو ہمیں سنجیدگی اور توازن کا دامن نہیں چھوڑنا چاہیے۔ ہمارے نزدیک معیار صرف اسلام ہے اگر کوئی اسے قبول کرتا ہے تو وہ خود اپنی بھلائی کے لیے کرتا ہے اور اس سے دور ہے تو اس میں اسی کا نقصان ہے۔

فرخ جلالی
شعبۂ تاریخ

فرد سے قوم تک

فکر سے فرد کی پہچان ہوتی ہے۔ دنیا میں بہت سے لوگ ایسے ہوتے ہیں جو مستقبل سے بے پروا اور حال سے بے خبر رہتے ہیں اور اپنی اسی سوچ اور سمجھ کو تقدیر کا لکھا مانتے ہیں۔ ایسے لوگوں کی منزل متعین کرنا مشکل ترین سمجھا اور مانا جاتا ہے۔ عقل اور وجدان کی بڑائی اور عظمت اسی میں ہے کہ پورے سماج کی ترقی کے لیے ان لوگوں کو متوجہ اور باعمل بنانے کی پوری کوشش کی جائے اور کامیابی کو سود اور نقصان کے پرانے پیمانوں کے بجائے توجہ اور مجموعی ترقی کے میزان اور اوزان سے ناپا جائے۔ چھوٹی کامیابیاں بڑی کامرانیوں کی نقیب ہوتی ہیں۔

اپنی ضرورت کے لیے ہر جاندار کچھ نہ کچھ عمل کا مظاہرہ کرتا ہے۔ انسان کا شرف اور وصف یہ ہے کہ وہ وسیع تر مفاد اور منظر کو اپنے سامنے رکھتا ہے اور وہ پریشانی یا خوشی کے عالم میں یہ بھول جائے تو یہ صورت معافی کے قابل ہوتی ہے لیکن فرد کی یہ بھول اگر بڑھ جاتی ہے تو وہ خود غرضی کے چکر میں پھنس جاتا ہے۔ اس کے دائروں کی دنیا سکڑتی جاتی ہے۔ وہ سماج سے بغاوت کے بجائے شرارت اور ظلم کو اپنا خفیہ یا کبھی کبھی ڈھٹائی سے مشرب بنا لیتا ہے

اس دنیا میں بہت سے لوگ ایسے گزرے ہیں جو سماج کی ترقی سے کبھی مایوس اور پشیمان نہیں ہوئے۔ انھوں نے شعور اور ضمیر کی آواز کو صحرا اور گنبد میں نہیں کھونے دیا بلکہ اندھیرے میں چراغ کی توانائی اور رعنائی کو برقرار رکھا۔ اپنی چھوٹی سی کوشش کو پھیلایا، لکھا اور اس پر عمل کی پوری کوشش کی اور یوں وہ فرد قوم کی تمنا اور تشکیل بن جاتا ہے۔

سوال یہ اٹھتا ہے کہ ایسے فرد کی امید کا سہارا کیا ہوتا ہے۔ کیا مخالف ماحول مایوسی کی بے دست و پائی ہے یا عمل اور فکر کے میدان میں امید کا شامیانہ کافی ہے۔

یہ بات بھی یاد رکھنا چاہیے کہ بڑی اور اچھی بات یا اچھا عمل فرد کو مقبول اور محبوب نہیں بنا دیتے ہیں بلکہ اعلیٰ فکر کی افادیت کے قابل تلاش کرنا بھی اچھی بصیرت کی ایک عمدہ نشانی اور نوا ہے۔

دوسروں کے لیے اپنی شخصیت کا عرفان یا تلاش ایک مشکل مسئلہ ہے۔ لیکن اگر غور سے دیکھا جائے تو یہ زیادہ کٹھن اور کٹھور ریکھا نہیں ہے۔

قیمتی پتھر کے پہلو تراش دیے جائیں تو نئی کرنوں کی تعداد میں اضافہ ہو جاتا ہے۔ جو اجالے میں جاذب نظر اور اندھیرے میں مینارۂ نور ہوتا ہے

بے یقینی اور شک تو ہر شخص کے کونے میں چھپا بیٹھا ہوتا ہے مگر آرزو اور امید کا سیلاب بھی اس کو بہت دور لے جاتا ہے۔

تشکیل

۱۸۵۷ء سے چالیس برس قبل دہلی کے ایک
شتی رئیس کے یہاں ایک توانا اور تندرست بچّہ جنم
لیتا ہے۔ اس کے امیر اور عالم نانا اس کو پیار سے "بجاٹ"
تے ہیں۔ بچپن میں اس کو اپنے زمانہ کے بڑے صوفی کی
ت اور باشعور ماں کی تربیت ملتی ہے۔ ابتدائی
دم پڑھنے کے بعد وہ دہلی کے شریفوں کی طرح علم طب
ں پڑھتا ہے۔ خالی اوقات میں خلقِ خدا کی خدمت اور
ں دلچسپیوں کو قائم رکھنے کا ایک سلسلہ ہاتھ آتا ہے
ن جلد ہی طبیعت فیصلہ کرتی ہے کہ فرد کا علاج میری
ل نہیں ہے۔

قانع اور وضع دار باپ اس فانی دنیا سے
مت ہو جاتا ہے۔ بزرگوں کی میراث اور لال قلعہ کی
ی مگر دھندلاتی زندگی پر نظر جاتی ہے۔ نئی حکومت
بساط اکبر اور جہانگیر کے آگرہ میں بچھی ہوئی ہے۔
اکا غاپچہ طے کر کے سزا اور جزا کا بوریہ معین ہو) لے
وہ آگرہ پہنچ جاتا ہے۔ عدالت کی ابتدائی ملازمت
کامیابی کے زینے تک یہ پہنچ جاتا ہے۔ ملازمت کے
سلسلہ میں آگرہ، دہلی، فتح پور سیکری، رہتک،
نور، مراد آباد، غازی پور، علی گڑھ اور بنارس
ں رہنا ہوتا ہے۔ عدالت کی میزان اور قانون کے
دوں کی ترجمانی ہوتی رہتی ہے

اس کے اندر کئی چہروں والا مصنف
ڑائی لیتا ہے۔ پہلے مورخ جنم لیتا ہے۔ پھر مذہب
ر تصوف کا خوبصورت کتابی چہرہ سامنے آجاتا ہے۔ سائنس
اقلیدس کی دلآویز خطوط اپنی طرف متوجہ کرنا
ہتے ہیں سب میں کچھ نہ کچھ انہماک رہتا ہے۔ بے قرار
بت برابر سوچ میں ہے کہ کس طرح زیبا کو چاہوں
میں ۱۸۵۷ء کا ہنگامہ اپنی تمام حشر سامانیوں
ا کے سامنے آجاتا ہے۔ محکوم اور مظلوم کھڑے ہو جاتے
ہیں۔ حاکم پہاڑوں میں چھپ جاتے ہیں یا خاک و خون
میں ملنے لگتے ہیں۔ وہ اس عالم میں انتہائی وثوق کے
ساتھ حکومت کی قانونی تبدیلی علاقہ کے قدیم خاندان
میں منتقل کرا دیتا ہے۔ مگر ان سے حکومت نہیں چلتی۔
آزادی اور بغاوت کی لے میں تیزی آجاتی ہے۔ ظالم
حاکم پھر سے کامیاب ہو جاتے ہیں۔ انتقام اور آزادی
کا دور دورہ ہوتا ہے۔ اس کی بوڑھی ماں، جوان
پارسا بیوی اور چھوٹے چھوٹے بچے دہلی میں ہیں —
بھیانک کی چند طویل راتیں چالیس برس کے جوان کو
ساٹھ برس کا بوڑھا بنا دیتی ہیں۔

ہندوستان میں بغاوت ناکام ہو چکی ہے۔
اب ۱۸۵۸ء آگیا ہے۔ اب اس جوان بڑھے کی
منزل کیا ہو!

ماں اور بچے دہلی سے آجاتے ہیں مگر ہزاروں
کا سرمایہ لٹ چکا ہے۔ راستہ بتانے والی ماں میرٹھ
میں رخصت ہو جاتی ہے اور نئی حکومت اس کو ایک
بڑا زمیندار بنانا چاہتی ہے مگر اب اس فرد کے اندر
قوم جنم لیتی ہے۔ ایک نیا تجربہ، ایک نیا احساس،
ایک نئی منزل۔

اب — کبھی نئی تہذیب اور حکومت کے مرکز کلکتہ
کا سفر کبھی نئی دانشمندی کے مرکز لندن کا سفر!

ایک گمشدہ خزانہ کی تلاش۔ اپنے لیے نہیں
قوم کے لیے نئی اصلاح۔ نئی دیوانگی۔ تعلیم و تربیت
کی نئی تحریکیں۔ سائنٹفک سوسائٹی، سائنس کی عظمت
نئی کتابوں کی اشاعت۔ اب تو اپنی لکھی ہوئی کتابیں
بھی نہیں پہچانی جاتیں —

اور محمڈن اینگلو اورینٹل کالج کی تحریک
کالج کالج کالج
اپنے اور بیگانے خفا۔ زمیں دار اور حاکم ناراض!
مگر قوم کی لگن مخالفوں سے بے پرواہ کر دیتی ہے —
نئے رئیس اپنے بچوں کو پڑھانا نہیں چاہتے، کچھ

باقی صفحہ نمبر ۹ پر

سیّد مہدی علی خاں (محسن الملک)

چند تجاویز

۱۸۸۶ء میں سرسید نے آل انڈیا محمڈن اینگلو اورینٹل کانگریس قائم کی۔ اس تنظیم کے قایم کرنے کا مقصد مسلمانوں کو جدید تعلیم حاصل کرنے کی ترغیب دینا، ملک میں اسکول اور کالج قائم کرنا اور مسلمانوں کے افلاس کا علاج کرنا تھا۔ لیکن یہ تنظیم بے عملی کا شکار ہوگئی۔ سیّد مہدی علی خاں نے (نواب محسن الملک) جو سرسید کے رفیق تھے، سرسید کو بمبئی سے ۲۰ر اکتوبر ۱۸۹۶ء میں ایک خط میں ایجوکیشنل کانگریس کی اصلاح کے سلسلہ میں چند تجاویز تھیں۔ اس خط میں ایجوکیشنل کانگریس کے تعطل کے جہاں اور اسباب لکھے ہیں، وہاں یہ بھی لکھا ہے کہ لوگوں کے دل سرد اور جوش اور دلولے ٹھنڈے پڑتے جاتے ہیں اور نظم اور قصائد نے اس مجلس کو بزم مشاعرہ بنا دیا ہے اور واہ واہ اور قاہ قاہ کی آوازوں نے اس مجلس کو بجائے قومی مجلس کے ایک دل لگی کا جلسہ کر دیا ہے۔

سیّد مہدی علی خاں کی ایجوکیشنل کانگریس میں آخری تقریر ۳۱ر اکتوبر ۱۹۰۶ء کو ہوئی۔ اس تقریر کا اقتباس حسب ذیل ہے۔

آل انڈیا محمڈن ایجوکیشنل کانگریس کا نام ۱۸۸۶ء کے حالات اور ملک کی فضا کے تحت تجویز ہوا تھا۔ بعد میں آہستہ آہستہ بدلتا رہا۔ پہلے لفظ کانگریس کی جگہ کانفرنس ہوا پھر باقی نام بھی بدل دیا گیا اور آل انڈیا مسلم ایجوکیشنل کانفرنس پورا نام ہوگیا اور وہ آج تک باقی ہے۔

ق - م - ل

......پس باوجود ان تمام باتوں کے اس مجلس کا ترقی نہ کرنا بلکہ روز بروز اس میں تنزل ہونا ایک حیرت انگیز معاملہ ہے۔ مگر میرے نزدیک کوئی اور بڑا قوی سبب اس کا سوائے اس کے نہیں ہے کہ وقت سے پیشتر مجلس کے مقام اور مجلس کی کارروائی سے لوگوں کو اطلاع نہیں ہوتی۔ جب بہت ہی تھوڑا وقت رہ جاتا ہے تب لوگوں کو اطلاع ہوتی ہے کہ فلاں مقام پر اس کا اجلاس ہوگا اور

چونکہ دوسرے لوگ اس کی اشاعت اور اس میں شریک ہونے کے لیے ترغیب دینے کی تدبیریں نہیں کرتے اس لیے چند پرانے ارکان اور چند مدرسہ کے طلباء اور چند وزیٹر کے باہر سے نئے نئے لوگ نہیں آتے اور بوجہ اس کے کہ رزولیوشن بہت کم پیش کیے جاتے ہیں اور ان پر تنگی وقت سے بحث کی نوبت نہیں آتی۔ لوگوں کے دل سرد ہوتے اور ان کے دلولے اور جوش ٹھنڈے

ہوتے جاتے ہیں' ورنظم وقہ مائد نے اس مجلس کو بزم مشاعرہ بنا دیا ہے اور واہ واہ قاہ قاہ کی آواز نے اس مجلس کو بجائے قومی مجلس کے ایک دل لگی کا جلسہ کر دیا ہے۔"

نواب محسن الملک کی کانفرنس کی تقریروں میں حسب ذیل آخری تقریر ہے جو کانفرنس کے انیسویں میں ۳۱ر دسمبر ۱۹۰۶ء کو ہوئی تھی۔ جس کا اقتباس حسب ذیل ہے۔

حضرات! کانفرنس کے اب تک کامیاب نہ ہونے کا اصل سبب یہ ہے جو میں نے بیان کیا۔ رہی قوم کی حالت، اس میں بھی کسی قسم کی ترقی نظر نہیں آتی، لہٰذا ان کی اصلاح اور فلاح کے آثار معلوم ہوتے ہیں۔ بلکہ روز بروز ان کا افلاس بڑھتا جاتا ہے اور ان کی قوتیں دن بدن منتشر اور ضائع ہوتی جاتی ہیں۔ اس کا سبب کچھ پوشیدہ نہیں ہے۔ اس لیے کہ قوموں کی صلاح و فلاح دو فرقوں پر منحصر ہے، اول علماء دوسرے امراء، مگر علماء اپنے اصلی فرائض کا خیال نہیں رکھتے اور زمانہ کی رفتار اور زمانہ کی ضرورتوں کو نہیں دیکھتے... مثلاً اگر کسی عالم سے کہا جائے کہ اس زمانے میں جب کہ مسلمان مفلس اور تباہ ہو رہے ہیں اور علوم و فنون جدیدہ اور سائنس کی تعلیم کی ہدایت کیجیے اور صنعت و حرفت سیکھنے کی ترغیب دیجیے تو وہ یہ کہہ کر کہ سائنس اسلام کے مخالف ہے اور صنعت و حرفت دنیاداروں کا کام ہے، ہماری بات کو نہایت نفرت سے سنیں گے اور الدنیا جیفۃ وطلابہا کلاب[1] کہہ کر مسلمانوں کو اور نفرت دلائیں گے۔ حالاں کہ یہ باتیں اور اس قسم کی ہدایت و نصیحت اس زمانے میں ان پر فرض کفایہ ہے اور اس کے ادا نہ کرنے سے وہ خود گنہگار ہو رہے ہیں اور ساری قوم کو عذاب میں مبتلا کر رہے ہیں اور وہ دیکھتے ہیں کہ بوجہ ناواقفیت علوم اور نہ جاننے صنعت و حرفت کے وہ دنیا کی اور قوموں کے مقابلے میں ذلیل و خوار ہیں مگر وہ ہرگز اس کی ہدایت نہ کریں گے اور بجز نماز جنازہ اور دفن میت اور جواب سلام وغیرہ کے ان باتوں کو فرض کفایہ نہ سمجھیں گے۔ ہمارے زمانے کے ایک مصری عالم نے اس افسوس ناک حالت کو دیکھ کر نہایت رنج و غم سے یہ لکھا ہے کہ انھیں علماء کا فرض کفایہ سے ناواقف ہونا اصلی سبب اس کا ہے کہ ساری قوم صنعت و حرفت کے فوائد سے محروم ہو گئی ہے...... اس کی تائید میں وہ عالم لکھتا ہے کہ اس وقت جو شخص مسلمانوں میں کسی صنعت کے زندہ کرنے یا آلہ کے ایجاد کرنے یا کوئی کمیٹی قائم کرنے یا صنعتی مدرسہ جاری کرنے کے لیے آمادہ ہو جائے گا تو شریعت کے حکم کے مطابق اس نیک کام کا، اور قیامت تک اس پر عمل کرنے والوں کا اس کو اجر ملے گا اور یہ شخص قوم میں اعلیٰ درجہ کا مصلح اور مجدد ہوگا۔ اسے لکھ کر وہ عالم صاف صاف کہتا ہے کہ مغربی علوم میں جو قرآن مجید کے سمجھنے کا ذریعہ ہیں اور اسلامی علوم میں کچھ فرق نہیں ہے کیونکہ وہ بقائے زندگی کا ذریعہ ہے اور یہ روحانی زندگی قائم رکھنے کا وسیلہ ہے۔ بغیر ان دونوں کے اسلام اور ایمان کی تکمیل نہیں ہو سکتی......

حضرات! کچھ ایسے عالم اس وقت ہم میں

باقی صفحہ ۱۶ پر

[1] دنیا مردار ہے اور اس کا طالب سگ مردار خوار

خودغرضی اور قومی ہمدردی

[تہذیب الاخلاق جلد ۵ نمبر ۸ بابت یکم شعبان ۱۲۹۳ھ]
صفحہ نمبر ۹۶

جہلا لفظ تو بہت پرانا ہے، مدت سے ہم سنتے چلے آئے ہیں، مگر یہ پچھلا لفظ تو چند روز سے پیدا ہوا ہے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ یکم شوال ۱۳۰۱ سنہ ہجری کے بعد اس کی پیدائش ہوئی ہے، مگر ضرور ہے کہ پچھلے زمانے میں بھی اس کی جگہ کوئی اور لفظ بولا جاتا ہوگا۔

پچھلے زمانہ پر جب ہم نگاہ کرتے ہیں تو قومی ہمدردی کی بہت سی نشانیاں پاتے ہیں۔ جدھر جاؤ ادھر ہزاروں کھنڈرات مسجدوں اور پلوں اور کنوں اور مہمان سراؤں کے پاؤگے۔ ہزاروں لاکھوں روپے لگا کر لوگوں نے قوم کے آرام کے لیے مہمان سرائیں بنوائی تھیں، مسجدیں بنوائی تھیں، کنویں کھدوائے تھے، پل بنوائے تھے جن کے نشانات اب بھی پائے جاتے ہیں۔ سنہری مسجدیں بنوائیں جن کے بڑے بڑے برج سونے کے کام سے منزق تھے۔ نرے سنگ مرمر کی مسجدیں بنوائیں جو موتی مسجدوں کے نام سے مشہور ہوئیں۔ چینی کی کامدار سراؤں کے دروازے، مسجدوں کے گنبد تیار کرائے جو آج تک اسی آب و تاب سے موجود ہیں۔ اس سے بھی زیادہ کیسی بڑی بڑی عالی شان خانقاہیں تعمیر کیں۔ ان کے بنانے میں لاکھوں روپے خرچ کیے۔ دیہات معافی کی جاگیریں دیے جن کی لاکھوں روپے کی آمدنی قومی ہمدردی میں صرف ہوتی

تھی۔ ہاں مدرسہ وغیرہ بنانے کا اس قدر خیال نہ تھا مگر پھر بھی مدرسے جاری کیے تھے۔ جب تاریخ کی کتابوں کی بہت تلاش کرو تو معلوم ہوگا کہ فیروز شاہ کے دہلی میں کوئی مدرسہ تھا اور کچھ زیادہ نشان نہیں ملتا۔ دہلی کے پرانے کھنڈرات میں تلاش کرو تو اکبر کے عہد میں ماہم انگہ کی بنائی مسجد اور اس کے گرد کوٹھریاں پائی جاتی ہیں جس کو لوگ ماہم انگہ کا مدرسہ مشہور کرتے ہیں۔ غالباً اس میں چند اندھے قرآن حفظ کرتے ہوں گے۔ نہایت مشہور اور پر رونق شاہجہاں کے عہد میں چند لداؤ کی کوٹھریاں شاید پچیس تیس ہوں، جامع مسجد کے نیچے بنی ہوئی تھیں جو دار البقا کے نام سے مشہور تھیں اور لوگ کہتے ہیں کہ شاہجہانی مدرسہ تھا اور غالباً جس قدر ادعیہ مثل ختم خواجگان و ختم بخاری اور ختم دلائل الخیرات واسطے سلامتی شاہجہاں کے ہوتے تھے، وہ سب اسی میں ہوتے تھے۔ اس سے زیادہ مدرسوں کے بنانے کی ضرورت نہ تھی۔ کیوں کہ بہت سے طالب علم متفرق مسجدوں میں رہتے تھے۔ تیل بتی ان کو مطالعہ کے لیے ملتی تھی۔ نذر و نیاز، مردوں کی فاتحہ، سوم، چہلم کے بہاردوں کے صدقوں کی بہت روٹیاں مسجد کے طالب علموں کو مل جاتی تھیں۔ ان کا نمونہ ہمارے زمانہ تک بھی موجود تھا۔ پنجوری اور

پنجابی کٹڑا اور کشمیری کٹڑا کی مسجدوں اور شاہ عبدالعزیز صاحب کے مدرسے اور حضرت شاہ غلام علی صاحب کی خانقاہ میں سے بہت سے طالب علم مردوں کی روٹیاں کھانے اور فاتحہ درود پڑھنے کو ملتے تھے۔ اب بھی قومی ہمدردی میں کچھ کسر نہیں رہی ہے۔ دیکھو اس گئے گزرے زمانے میں بھی مسلمانوں نے کیسی ہمت کی ہے، کس قدر روپیہ خرچ کر کر جامع مسجد دہلی کی مرمت کی ہے۔ دلی کی پرانی عیدگاہ کا چبوترا بڑھایا جاتا ہے۔ اس کا فرش درست کیا جاتا ہے، تاکہ قوم کو نماز پڑھنے میں زمین کا اونچا نیچا تکلیف نہ دے۔ سہارنپور میں دیکھو کئی لاکھ روپے خرچ کر کر جامع مسجد نئی بنائی ہے اور پرانی مسجد کو چھوڑ دیا ہے دیوبند میں دیکھو کیسی عالی شان مسجد بنائی جاتی ہے۔ اس زمانہ میں اگلے زمانوں سے بھی زیادہ مدرسے جاری ہوتے جاتے ہیں۔ دیکھو پنجاب میں کتنے مدارس اسلامیہ جاری ہیں۔ دہلی میں اسلامی مدرسہ جاری ہوا، لکھنؤ میں اسلامی مدرسہ قائم ہوا۔ دیوبند کے مدرسہ کا تو کوئی پوچھنا ہی نہیں۔ افتخار العلماء و فخر الکملا۔ امام اعظم عہد شیخ زمان و صاحبین دوران مدرس و مہتمم ہیں۔ پھر سہارنپور میں، انبیٹہ میں مدارس اسلامی موجود ہیں۔ غرضیکہ بہت سی جگہ مدارس جاری ہیں۔ پھر قومی ہمدردی کے لفظ کو نیا لفظ کہنا صحیح نہیں۔ ہاں شاید یہ ترکیب لفظی نئی ہو، مگر اس مضمون کا پہلے بھی ضرور کوئی لفظ ہوگا۔ ہماری یاد سے جاتا رہا ہے۔ جب کہ ہم یہ باتیں سنتے اور خیال کرتے ہیں تو دل میں خیال پیدا ہوتا ہے کہ بے شک ہم لوگوں میں قومی ہمدردی قدیم سے چلی آتی ہے اور اب بھی بہت پائی جاتی ہے مگر جب زیادہ غور کر کے دیکھتے ہیں تو وہ سب دھوکا ہی دھوکا پایا جاتا ہے۔ قطع نظر اس بحث کے کہ یہ کام قوم کو مفید ہیں اور قوم کو ان کی ضرورت ہے یا اس سے زیادہ اور چیزوں کی ضرورت ہے، جب ان لوگوں کے جنھوں نے یہ کام کیے اور کر رہے ہیں دل سے پوچھو تو معلوم ہوگا کہ وہ یہ تمام کام اس خیالی جوش میں کر رہے ہیں کہ ہم بڑے ثواب کے کام میں مصروف ہیں اور ثواب کی گٹھریاں باندھ رہے ہیں۔ مرتے ہی یہ سب کام ہم کو بہشت میں لے جاویں گے اور بہشت میں بڑے بڑے درجے پاویں گے۔ تاج ہمارے سر پر ہوگا اور ایک موتی کا محل جنت میں ملے گا۔ حوریں تصرف کو ہوں گی جن کو ہمارے سوا کسی نے چھوا بھی نہ ہوگا۔ پھر ان کی تعداد چار پر بھی محدود نہ ہوگی، بے انتہا جتنی چاہو۔ غلمان بھی نہایت خوبصورت معلوم نہیں تصرف یا خدمت کو ملیں گے۔ باغ ہوگا، میوہ ہوگا، نہریں ہوں گی، شراب ہوگی پئیں گے اور چین کریں گے اور کہا کریں گے کہ حافظ نے کیسا غلط یہ شعر کہا تھا:

بدہ ساقی مے باقی کہ در جنت نخواہی یافت
کنار آب رکنا باد و گلگشت مصلیٰ را

ہم بھی نہایت ادب اور صدق دل سے کہتے ہیں کہ یہ سب کچھ ہوگا، خدا ہم کو بھی نصیب کرے، مگر یہ تو فرمایئے کہ یہ سب کام خود غرضی کے ہیں یا قومی ہمدردی کے۔ کوئی کہے میں تو نہ مانوں کہ یہ کام قومی ہمدردی کے ہیں۔ یہ تو بالکل ایسے ہی کام ہیں جیسے کہ ایک رند مشرب دنیا میں ان ہی عیشوں کو حاصل کرنے کو کرتا ہے۔ اس میں اور ان میں اتنا فرق ہے کہ انھوں نے نقد کو نسیہ پر چھوڑا ہے اور دوسرے جہاں میں ان عیشوں کے حاصل کرنے کی لالچ سے یہ کام کیے ہیں۔ غور کرنے کی بات ہے کہ باغبانوں سے اپنے چین کے لیے مزدوری دے کر باغ لگوانا، مزدوروں کو مزدوری دے کر اپنے آرام کے لیے محل چنوانا۔ کلال کو دام دے کر اپنی عیاشی کے لیے شراب کھنچوانا اور علاوہ اس کے روپے خرچ کر کر سامان عیش اور لذائذ نفسانی کا جمع کرنا کیا قومی ہمدردی گنی جاوے گی؟ نعوذ باللہ ہرگز نہیں، یہ تو عین خود غرضی ہے۔ پھر وہ باتیں جو ثواب کے لالچ سے کی جاتی ہیں کیوں قومی ہمدردی گنی جاویں گی۔

باقی صفحہ نمبر ۱۶ پر

علی گڑھ مسلم یونیورسٹی علی گڑھ

داخلہ نوٹس نمبر ۱

تعلیمی سال ۸۴ ، ۸۳ ۱۹ ء

درجہ گیارہ میں ۱۰ + ۲ سسٹم کے مطابق داخلہ

قومی طریقہ تعلیم کی تعمیل میں علی گڑھ مسلم یونیورسٹی نے یہ فیصلہ کیا ہے کہ تعلیمی سال ۸۴-۸۳ء میں تعلیم کا ۱۰ + ۲ نظام اختیار کیا جائے۔ اس نئے نظام کو متعارف کرنے کے نتیجے میں سال ۸۴ء میں پری یونیورسٹی درجہ میں کوئی داخلہ نہیں ہوگا۔ یہ فیصلہ کیا گیا ہے کہ سال ۸۳ء سے ۱۰ + ۲ تعلیمی نظام شروع کرنے کے لیے درجہ گیارہ بھی یونیورسٹی میں ان کے لیے شروع کیا جائے جو ہائی اسکول یا اس کے مساوی امتحان کو پاس کرکے آئیں گے۔ اس لیے ایسے امیدوار جنھوں نے اس یونیورسٹی سے ہائی اسکول کا امتحان پاس کیا ہے، یا اس کے مساوی امتحان ملک کے یا بیرونی ممالک کے کسی ایسے ادارے سے پاس کیا ہو جو اس یونیورسٹی سے تسلیم شدہ ہو اور جو اس میں داخلے کے لیے مطلوبہ کم از کم لیاقت رکھتے ہوں اور ساری شرائط پوری کرتے ہوئے وہ مقررہ داخلے کے فارم کو بھر کر داخلے کی درخواست دے سکتے ہیں۔ ایسے طالب علم جنھوں نے درجہ گیارہ پاس کیا ہے، انھیں درجہ ۱۲ میں داخل کیا جائے گا۔ یہ کلاس تعلیمی سال ۸۵-۸۴ ۱۹ء سے شروع ہوگا۔

تعلیمی نظام ۱۰ + ۲ کے نفاذ کے نتیجہ میں موجودہ ہائی اسکول کے امتحان کی جگہ سکنڈری اسکول سرٹیفکٹ امتحان ہوگا۔ درجہ (۱۲) بارہ میں کامیابی کے ساتھ تعلیم مکمل کرنے والے طلبہ کو سینیر سکنڈری اسکول سرٹیفکٹ دیا جائے گا اور ایسے طالب علم بی اے (آنرز)، بی ایس سی (آنرز)، بی کام (آنرز) کے تین سالہ ڈگری کورس میں داخلہ کے لیے بالیاقت تسلیم کیے جائیں گے۔

+۲ اسٹیج پر سینیر سکنڈری کورس کی تفصیلات کے مطلوبہ لیاقت اور کم از کم لیاقت کے

لیے داخلہ کے ضوابط وغیرہ انفارمیشن بلیٹن کے ذریعہ نوٹی فائی کیا جا چکا ہے، داخلہ درخواست کے فارم اور انفارمیشن بلیٹن اسسٹنٹ رجسٹرار (ایڈمیشنز) پوسٹ بکس نمبر ۲ دی علی گڑھ مسلم یونیورسٹی علی گڑھ ۲۰۲۰۰۱ سے یا پرنسپل آف یونیورسٹی اسکولس یا سپرنٹنڈنٹ پبلی کیشن ڈویژن آف دی یونیورسٹی سے مئی ۸۳ء کے دوسرے ہفتے سے حاصل کیے جا سکتے ہیں۔

داخلہ فارم مذکورہ شعبوں سے حاصل کرنے کے لیے مبلغ تین روپیہ نقد یا کراسڈ انڈین پوسٹل آرڈر جس کی ادائیگی فائنانس آفیسر علی گڑھ مسلم یونیورسٹی علی گڑھ کے حق میں ہو اس کے ذریعہ ادا کرنا ہوگا، جو امیدوار درخواست کے فارم ڈاک کے ذریعہ حاصل کرنا چاہتے ہیں وہ درخواست فارم کے لیے اپنا ایک پتہ لکھا ہوا ۱۲ × ۲۸ سینٹی میٹر کے سائز کا ایک لفافہ جس پر مبلغ ۱٫۷۵ روپے (ایک روپیہ پچھتر پیسے) کا پوسٹل ٹکٹ چسپاں ہو، بھیجنا ہوگا۔ ایسی حالت میں اگر کوئی امیدوار درخواست کا فارم رجسٹرڈ ڈاک سے منگانا چاہتے ہیں تو انھیں خود کا پتہ لکھا ہوا مذکورہ لفافہ بہ ۴٫۵۰ (چار روپے پچاس پیسے) کا پوسٹل ٹکٹ چسپاں کر کے بھیجنا ہوگا۔ اگر ایک سے زیادہ درخواست کے فارم مطلوب ہوں تو درخواست کے ساتھ ہر فارم کے لیے الگ الگ ٹکٹ لگا خود کا پتہ لکھا ہوا لفافہ روانہ کریں۔

پوری طرح سے مکمل بھرے ہوئے درخواست کے فارم مبلغ پانچ روپے (۵٫۰۰) رجسٹریشن فیس برائے نصاب تعلیم کے لیے لینشی کے لیے الگ الگ کراسڈ انڈین پوسٹل آرڈر کے ذریعے ادائیگی فائنانس آفیسر علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کے حق میں ہو، اس کے ساتھ اسسٹنٹ رجسٹرار (ایڈمیشن) پوسٹ بکس نمبر ۲ دی علی گڑھ مسلم یونیورسٹی علی گڑھ ۲۰۲۰۰۱ کے پاس ۱۴ جولائی ۱۹۸۳ء کو شام پانچ بجے (۵٫۰۰ بجے) تک یا اس سے قبل پہنچ جانا چاہیے۔ تاریخ مذکورہ کے بعد موصول ہونے والی درخواستوں پر غور نہیں کیا جائے گا۔

دستخط

ابن معیدین

علی گڑھ مسلم یونیورسٹی۔ علی گڑھ

نوٹس داخلہ نمبر ۲

برائے جولائی ۱۹۸۳ء سیشن

حسب ذیل مضامین کے ایم ڈی/ایم ایس اور ڈپلومہ کورسوں کے لیے درخواستیں مطلوب ہیں

ایم ڈی

(ا) فزیالوجی (ب)، فارماکولوجی (ج)، پیتھالوجی (د)، مائکروبائیولوجی (ہ) پیڈیاٹرکس
(و)، پریونٹو اینڈ سوشل میڈیسن (ز)، آبسٹٹرکس اینڈ گائناکولوجی (ح)، جنرل میڈیسن
(ط) ریڈیوڈائیگنوسس (ی)، ریڈیوتھراپی۔ (ک) بائیوکیمسٹری

ایم ایس

(ا) اناستھیزیولوجی (ب)، اناٹمی (ج)، جنرل سرجری (د)، آرتھوپیڈک سرجری
(ہ)، اوپتھالمالوجی (و)، ای این ٹی۔ (لارنگولوجی اینڈ اوٹولوجی)

ڈپلوما کورسز

(ا) اوپتھالمالوجی۔ (ب)، آرتھوپیڈک سرجری (ج)، اناستھیزیولوجی (د)، لارنگولوجی اینڈ اوٹولوجی (ہ)، گائناکولوجی اینڈ آبسٹٹرکس (و)، چائلڈ ہیلتھ (ز)، ڈی ایم۔آر۔ڈی۔ (ح) ڈی ایم آر ٹی۔

داخلے کی بنیاد میرٹ جس کا داخلے کے امتحان کے ذریعہ تعین کیا جائے گا۔ نیز سابقہ ریکارڈ ہوگا۔ جن امیدواروں نے تین سپلیمنٹریز میں شرکت کے بعد ایم بی بی ایس پاس کیا ہے، داخلے کے مستحق نہیں ہوں گے۔ جو امیدوار کسی مضمون میں دوبار فیل ہوئے ہوں گے، اس مضمون میں داخلے کے مستحق نہیں ہوں گے۔ البتہ دیگر متعلقہ اسپشلیٹز کے لیے درخواست دے سکتے ہیں۔ داخلے کا امتحان 5-6-1983 کو دس بجے صبح سے بارہ بجے دوپہر تک ہوگا۔ داخلے کے امتحان

کے لیے امیدواروں کو علیحدہ سے اطلاع نہیں دی جائے گی۔ اہل امیدواروں سے گزارش ہے کہ ایک دن قبل ایڈمیشن آفس سے انٹرنس ٹیسٹ کارڈ حاصل کریں۔ اہل امیدواروں کو اپنی درخواستیں حسب ذیل فارم میں پیش کرنی چاہیں جس کے ساتھ ایک تازہ پاسپورٹ سائز فوٹو اور پانچ روپیہ کا پوسٹل آرڈر منسلک ہونا چاہیے جو فائننس آفیسر اے ایم یو علی گڑھ کو واجب الادا ہو، اس لحاظ سے پیش کرنی چاہیں کہ زیادہ سے زیادہ 23-5-1993 تک اسسٹنٹ رجسٹرار (ایڈمیشن) پوسٹ بکس نمبر 52 'علی گڑھ مسلم یونیورسٹی علی گڑھ 202001 کے پاس پہونچ جانا چاہیں۔

نامکمل اور تاخیر سے پہونچنے والی درخواستوں کو زیر غور نہیں لایا جائے گا۔

درخواست کا پروفارما

۱ کورس کا نام

۲ درخواست دہندہ کا نام

۳ باپ/شوہر کا نام

۴ تاریخ پیدائش

۵ قومیت اور ریاست

۶ موجودہ پتہ

۷ آیا

۸ اگر ملازم ہوں تو

۹ سیڈول کاسٹ

۱۰(الف) پست درجہ کا ممبر ہے؟

۹ عہدہ اور تنخواہ

رجسٹریشن نمبر

۱۱ اکاڈمک ریکارڈ

پری فیشنل ، سیکنڈ پروفیشنل ، فائنل پروفیشنل

پارٹ (۱)

پارٹ (۱۱)

امتحانات پاس کرنے کا سال

ادارے کا نام

کورسوں کی تعداد ....
پوزیشن اگر کوئی ہو ....
ڈسٹنکشن اگر کوئی ہو ....

میرٹ اسکالرشپ کی تفصیلات

۱۲ جس مضمون کے لیے درخواست پیش کی جا رہی ہے اس کے لیے نمبروں کی فیصد تعداد ....

۱۳ ان پروفیشنل امتحانوں کے نمبروں کی ۵۵ فیصد سے زائد کل میزان کی جو ۷۵ فیصد سے زائد ہو۔ شرح فیصد۔

۱۴ اشاعت/ریسرچ کا کام اگر کوئی ہو۔

۱۵ ہاؤس جاب کی تفصیلات (سرٹیفکیٹوں کے ہمراہ) روٹیری انٹرن شپ اور

۱۶ امیدوار کے دستخط مع تاریخ ....

دستخط

این معیدین
کنٹرولر آف اگزامینشنز اینڈ ایڈمیشنز

علی گڑھ مسلم یونیورسٹی، علی گڑھ

اشتہار نمبر ۸۴-۸۳/۶

مقررہ فارموں پر مندرجہ ذیل اسامیوں کے لیے درخواستیں مطلوب ہیں۔

فیکلٹی آف میڈیسن

پروفیسر

شرح تنخواہ:- ۱۵۰۰-۶۰-۱۸۰۰-۱۰۰-۲۰۰۰-۱۲۵/۲-۲۵۰۰ روپیہ اور دیگر الاونس

۱۔ پروفیسر آف اناٹمی۔ ڈپارٹمنٹ آف اناٹمی (مستقل)

استعداد

(۱) ایم بی بی ایس یا میڈیکل کونسل آف انڈیا سے تسلیم شدہ استعداد

(۲) ایم ایس (اناٹمی)/ ایم ایس سی (اناٹمی)/ پی ایچ ڈی (میڈیکل اناٹمی) ڈی ایس سی میڈیکل اناٹمی) یا میڈیکل کونسل آف انڈیا سے تسلیم شدہ کوئی استعداد
کسی میڈیکل کالج میں بحیثیت ریڈر اناٹمی تحقیق/تدریس کا پانچ سال تجربہ

(۱) پسندیدہ

اس مخصوص مضمون میں اوریجنل ریسرچ پبلی کیشن کے علاوہ تحقیق میں مشغول ہو اور ڈاکٹریٹ سطح پر کی جانے والی تحقیق کی رہنمائی کا تجربہ رکھتا ہو۔

ریڈرس

شرح تنخواہ ۱۲۰۰-۵۰-۱۳۰۰-۶۰-۱۹۰۰ روپیہ اور دیگر الاونس

ریڈر ان پیتھالوجی (پیتھالوجی اینڈ بلڈ بینکنگ) ڈپارٹمنٹ آف پیتھالوجی۔

استعداد لازمی۔

(۱) ایم بی بی ایس یا میڈیکل کونسل آف انڈیا سے تسلیم شدہ کوئی مساوی ڈگری

(ii) ایم ڈی (پیتھالوجی)/ایم ڈی (پیتھالوجی اینڈ بیکٹریالوجی)/ایم ڈی (پیتھالوجی مع بیکٹریالوجی)/ پی ایچ ڈی (پیتھالوجی)/ ڈی ایس سی (پیتھالوجی)۔ میڈیکل کونسل آف انڈیا سے تسلیم شدہ کوئی مساوی استعداد۔
کسی میڈیکل کالج میں بحیثیت لکچرر پیتھالوجی (ہیماٹالوجی اینڈ بلڈ بینکنگ) تدریس/تحقیق کا پانچ سالہ تجربہ
پسندیدہ:۔ ملکی اور غیر ملکی جرائد میں اِس تخصص میں شائع شدہ اوریجنل ریسرچ۔

3 ریڈر اِن فزیالوجی۔ ڈپارٹمنٹ آف فزیالوجی۔
استعداد
ا۔ لازمی:(i) ایم بی بی ایس یا میڈیکل کونسل آف انڈیا سے تسلیم شدہ کوئی مساوی استعداد
(ii) ایم ڈی (فزیالوجی)/ ایم بی بی ایس مع ایم ایس سی (فزیالوجی)/ پی ایچ ڈی (میڈیکل فزیالوجی)/ ڈی ایس سی (میڈیکل فزیالوجی)
میڈیکل کونسل آف انڈیا سے تسلیم شدہ کوئی مساوی استعداد
کسی میڈیکل کالج میں بحیثیت لکچرر فزیالوجی تدریس/ تحقیق کا پانچ سالہ تجربہ
(ii) پسندیدہ: ملکی اور غیر ملکی جرائد میں اِس تخصص میں شائع شدہ اوریجنل ریسرچ۔

4۔ ریڈر اِن کلیات شعبۂ کلیات (مستقل)
استعداد
(ا) لازمی (i) بی یو ٹی ایس/ بی یو ایم ایس/ بی یو ایم ایم ایس یا قانونی طور پر قائم شدہ کسی یونیورسٹی/ خود مختار بورڈ/ فیکلٹی/ طب ہندی کے امتحان کا ادارہ سے طب یونانی میں کوئی مساوی ڈپلوما/ ڈگری۔
کسی تسلیم شدہ ادارہ میں طب یونانی کی تدریس کا پانچ سالہ تجربہ
(ii) پسندیدہ:۔ قانونی طور پر قائم شدہ کسی یونیورسٹی/ ادارہ سے طب یونانی میں پوسٹ گریجویٹ استعداد
اس موضوع پر شائع شدہ اوریجنل مضامین/ کتاب
اردو/ عربی/ فارسی/ انگریزی کا علم

لکچررس
شرح تنخواہ:۔ ۷۰۰-۴۰-۱۱۰۰-۵۰-۱۶۰۰ روپیہ اور دیگر الاؤنس
5 لکچرر اِن نیوروسرجری (۲ اسامیاں)، ڈپارٹمنٹ آف جنرل سرجری (ایک مستقل۔ ایک عارضی)

استعداد

(۱) لازمی (۱) ایم بی بی ایس یا میڈیکل کونسل آف انڈیا سے تسلیم شدہ کوئی مساوی استعداد
(ii) ایم کا ایچ (نیوررو سرجری) یا میڈیکل کونسل آف انڈیا سے تسلیم شدہ کوئی مساوی استعداد
تدریسی / تحقیقی تجربہ
اس مضمون میں مطلوبہ پوسٹ گریجویٹ استعداد

پسندیدہ: (۱) اس موضوع پر شائع شدہ تحقیقی کام
(ii) تدریسی تجربہ

(۵) لکچرر ان کارڈیالوجی - ڈپارٹمنٹ آف میڈیسن

استعداد

(۱) لازمی - ایم بی بی ایس یا میڈیکل کونسل آف انڈیا سے تسلیم شدہ کوئی مساوی استعداد
(ii) ڈی ایم (کارڈیالوجی) میڈیکل کونسل آف انڈیا سے تسلیم شدہ کوئی مساوی استعداد
تدریسی / تحقیقی تجربہ
اس مضمون میں مطلوبہ پوسٹ گریجویٹ استعداد
(ii) پسندیدہ اس تخصص میں مطبوعہ تخلیقی کام

(۶) لکچرر ان آپتھلمالوجی - ڈپارٹمنٹ آف آپتھلمالوجی (عارضی لیکن مستقل ہونے کی امید)

استعداد

(۱) لازمی (۱) ایم بی بی ایس یا میڈیکل کونسل آف انڈیا سے تسلیم شدہ کوئی مساوی استعداد
(ii) ایم ایس (آپتھلمالوجی) / ایم ڈی (آپتھلمالوجی) / میڈیکل کونسل آف انڈیا سے تسلیم شدہ کوئی مساوی استعداد
تدریسی / تحقیقی تجربہ
اس مضمون میں مطلوبہ پوسٹ گریجویٹ استعداد
(ii) پسندیدہ پتھالوجی / آنکولوجی / سیگمنٹ میں تدریسی اور تحقیقی تجربہ

8 لکچرر ان ای این ٹی - ڈپارٹمنٹ آف اوٹو رینولرنگولوجی

استعداد

(۱) لازمی (۱) ایم بی بی ایس یا میڈیکل کونسل آف انڈیا سے تسلیم شدہ کوئی مساوی استعداد
(ii) ایم ایس (اوٹو رینولرنگولوجی)
تدریسی / تحقیقی تجربہ
اس مضمون میں پوسٹ گریجویٹ استعداد

۹۔ لکچرر۔ اور پیڈیاٹرک سرجن۔ ڈپارٹمنٹ آف پیڈیاٹرکس

استعداد

۱۔ لازمی (۱) ایم بی بی ایس یا میڈیکل کونسل آف انڈیا سے تسلیم شدہ کوئی مساوی استعداد

(۱۱) ایم سی ایچ (پیڈیاٹرک سرجری)

تدریسی / تحقیقی تجربہ

اس مضمون میں مطلوبہ پوسٹ گریجویٹ استعداد

(۱۱) پسندیدہ:۔ اس تخصص میں مطبوعہ تحقیقی کام

۱۰۔ لکچرر ان پیڈیاٹرکس۔ ڈپارٹمنٹ آف پیڈیاٹرکس

استعداد

۱۔ لازمی (۱) ایم بی بی ایس یا میڈیکل کونسل آف انڈیا سے تسلیم شدہ کوئی مساوی استعداد

(۱۱) ایم ڈی (پیڈیاٹرکس)

تدریسی / تحقیقی تجربہ

اس مضمون میں مطلوبہ پوسٹ گریجویٹ استعداد

(۱۱) پسندیدہ (۱) بحیثیت رجسٹرار پیڈیاٹرکس / مساوی کسی پوسٹ پر کسی تعلیمی ادارہ میں تدریس کا تین سالہ تجربہ

(۱۱) اس مضمون میں مطبوعہ مضامین

غیرمعمولی استعداد رکھنے والے اور تجربہ رکھنے والے افراد کو ابتدا ہی سے اعلیٰ تنخواہ سے شروعات کی جاسکتی ہے۔ انٹرویو کے لیے طلب کیے جانے والے امیدوار کو بطور فیس ریلوے کے سکنڈ کلاس کا یکطرفہ کرایہ ادا کیا جائے گا

مطلوبہ فارم اور معلومات اسسٹنٹ رجسٹرار (سلیکشن کمیٹی) رجسٹرار آفس مسلم یونیورسٹی سے دو روپیہ نقد ادائیگی (مسلم یونیورسٹی کے فائننس آفس کے کیش سیکشن میں جمع شدہ) یا فائننس آفیسر مسلم یونیورسٹی کے نام واجب الادا کراسڈ پوسٹل آرڈر بھیج کر حاصل کیے جاسکتے ہیں۔ مگر اس کے ہمراہ 23x10 سے سائز کا ایسا لفافہ جس پر خود کا پتہ تحریر ہو، بھیجنا ضروری ہے۔ درخواستیں موصول ہونے کی آخری تاریخ ۲۲ جون ۱۹۸۳ء ہے نامکمل اور تاخیر سے موصول ہونے والی درخواستوں پر غور نہیں کیا جائے گا

نوٹ:۔ موزوں امیدواروں کو مستقبل میں ہونے والے تقررات کے لیے بنائے جانے والے پینل میں رکھا جاسکتا ہے

ضمیر احمد خاں

رجسٹرار

علی گڑھ مسلم یونیورسٹی - علی گڑھ

اشتہار نمبر ۸۴-۸۳/۷

مندرجہ ذیل اسامیوں کے لیے مقررہ فارموں پر درخواستیں مطلوب ہیں۔ جو اشخاص ایک سے زائد پوسٹوں کے لیے امیدوار ہوں، ان کے لیے لازم ہے کہ وہ ہر پوسٹ کے لیے الگ الگ درخواست دیں۔

ریڈرس

شرح تنخواہ:- ۱۲۰۰ – ۵۰ – ۱۳۰۰ – ۶۰ – ۱۹۰۰ روپیہ اور دیگر الاؤنس

(۱) ریڈر اِن باٹنی - ڈپارٹمنٹ آف باٹنی (مستقل)
۲- ریڈر ان باٹنی - ویمنس کالج (مستقل)
۳- ریڈر اِن پرشین ڈپارٹمنٹ آف پرشین (مستقل)
۴- ریڈر اِن پرشین ویمنس کالج (مستقل)
۵ ریڈر اِن لا (مرکنٹائل لا) ڈپارٹمنٹ آف لا (مستقل)
۶ ریڈرس اِن لا - ڈپارٹمنٹ آف لا (عارضی)

استعداد

(۱) لازمی (الف) متعلقہ مضامین کسی ہندوستانی یونیورسٹی سے فرسٹ کلاس یا ہائی سکنڈ کلاس کا ماسٹر ڈگری
یا
اس کے متبادل غیر ملکی استعداد
(ب) ڈاکٹریٹ یا اس کے مساوی ریسرچ ڈگری یا اعلیٰ پایہ کا علمی کام
(ج) پوسٹ گریجویٹ کلاسز کی تدریس کا پانچ سالہ تجربہ اور تحقیقی کام کی نگرانی کا قدرے تجربہ

(ii) پسندیدہ شمار نمبر ۳ کے تحت ڈپارٹمنٹ آف پرشین میں ریڈر کی پوسٹ کے لیے

(i) فارسی ادبیات عالیہ (کلاسیک) کا عمیق مطالعہ۔

(ii) ہندوستان میں عہد مغلیہ سے قبل کے فارسی ادب پر تحقیق

(iii) تحقیقی کام بنیادی اور تخلیقی ہو۔

شمار نمبر ۴ کے تحت ویمنس کالج میں ریڈر کی پوسٹ کے لیے

(۱) فارسی ادبیات عالیہ (کلاسیک) کا عمیق مطالعہ

(۲) بنیادی اور تخلیقی انداز کا تحقیقی کام

لکچررس

شرح تنخواہ ۷۰۰ - ۴۰ - ۱۱۰۰ - ۵۰ - ۱۶۰۰ روپیہ اور دیگر الاونس

۷۔ لکچرر شیعہ تھیالوجی - ڈپارٹمنٹ آف شیعہ تھیالوجی (عارضی)

۸۔ لکچرر ان بنگالی ڈپارٹمنٹ آف ہندی

استعداد

۱۔ لازمی (۱) ڈاکٹریٹ ڈگری یا اعلیٰ پایہ کا تحقیقی کام

(ب) کسی ہندوستانی یونیورسٹی سے مسلسل اچھے تعلیمی ریکارڈ کے ساتھ فرسٹ کلاس یا ہائی سکنڈ کلاس میں ماسٹر ڈگری (سیون پوائنٹ اسکیل میں B)

یا

کسی غیر ملکی یونیورسٹی سے اس کے مساوی ڈگری

اگر سلیکشن کمیٹی اس نتیجہ پر پہونچے کہ کسی امیدوار کا تحقیقی کام جیسا کہ اس کی تھیسس یا مطبوعہ کام سے ظاہر ہے، بہت اعلیٰ معیار کا ہے تو (ب) کے تحت متذکرہ بالا استعداد میں نرمی برتی جا سکتی ہے۔ اور اگر ڈاکٹریٹ ڈگری یا متبادل تحقیقی کام کا حامل کوئی امیدوار موزوں قرار نہ پائے تو مسلسل اچھے تعلیمی ریکارڈ کے حامل امیدوار کا اس جگہ پر تقرر کیا جا سکتا ہے [ایم فل یا اس کے مساوی ڈگری یا اعلیٰ پایہ کا تحقیقی کام کے حامل امیدوار کو فوقیت دی جائے گی] بشرطیکہ امیدوار کو ریسرچ کا دو سالہ تجربہ ہو یا اس نے ریسرچ لیبارٹری/ آرگنائزیشن میں کام کا عملی تجربہ ہو۔ ایسی صورت میں امیدوار کے لیے لازم ہوگا کہ وہ اپنی تقرری کے پانچ سال کے اندر ڈاکٹریٹ ڈگری حاصل کرے یا اعلیٰ پایہ کا تحقیقی کام کرنے کا ثبوت پیش کرے۔ بصورت دیگر سالانہ ترقی اس وقت تک نہ ہوگی جب تک وہ متذکرہ بالا ضروریات کو پورا نہ کرے۔

(ii) پسندیدہ: شمار نمبر ۷ کے تحت شعبہ دینیات شیعہ لکچرر کے لیے

علی گڑھ مسلم یونیورسٹی یا بغداد یونیورسٹی یا تہران یونیورسٹی سے شیعہ دینیات میں

بی ایچ ڈی یا حکومت عراق یا ایران کی طرف سے تسلیم شدہ کسی ادارہ سے
اجتہاد کی ڈگری یا شیعہ دینیات کے مضمون میں علمی یا مطبوعہ کام کے علاوہ
حکومت ہند کے تسلیم شدہ کسی ادارہ میں بی ٹی ایچ سطح کی کلاس کو پڑھانے
کا تجربہ

نوٹ :۔ شیعہ دینیات میں ماسٹرس ڈگری یا کسی مشہور شیعہ مدرسہ کا فاضل
اور انگریزی کی معقول معلومات۔
شمارہ نمبر ۸ کے تحت شعبہ ہندی میں بنگالی لکچرر کے لیے
ہندی کی معلومات اور تدریسی / تحقیقی تجربہ

اعلیٰ تعلیمی استعداد کے حامل امیدواروں کو ابتدا ہی سے اعلیٰ تنخواہ سے شروعات کی جا سکتی ہے۔ انٹرویو کے لیے طلب کیے جانے والے امیدواروں کو بطور ٹی اے صرف سیکنڈ کلاس کا یکطرفہ کرایہ ادا کیا جائے گا۔

مطلوبہ درخواست فارم اور ہدایات اسسٹنٹ رجسٹرار (سلیکشن کمیٹی) مسلم یونیورسٹی علی گڑھ سے دو روپیہ نقد ادائیگی (مسلم یونیورسٹی کے فائنانس آفس کے کیش سیکشن میں جمع شدہ) یا مسلم یونیورسٹی کے فائنانس آفیسر کے نام واجب الادا ہو کراسڈ پوسٹل آرڈر کے بھیجے جانے پر حاصل کیا جا سکتا ہے۔ جس کے ہمراہ ۲۳×۱۰ سم سائز کا ایسا لفافہ جس پر خود کا پتہ تحریر ہو بھیجا جانا ضروری ہے۔

درخواست موصول ہونے کی آخری تاریخ ۲۵ر جون ۸۲ء ہے۔

نامکمل اور تاخیر سے موصول ہونے والی درخواستوں پر غور نہیں کیا جائے گا

نوٹ :۔ موزوں امیدواروں کو مستقبل میں ہونے والے تقررات کے لیے بنائے جانے والے پینل میں رکھا جا سکتا ہے۔

(دستخط)

ضمیر احمد خاں

رجسٹرار

احمدی نابینا اِسکول

علی گڑھ مسلم یونیورسٹی علی گڑھ

نابینا لڑکوں اور لڑکیوں کی تعلیم مفت

احمدی نابینا اِسکول مسلم یونیورسٹی کا ایک ہائی اِسکول ہے اور گیارہویں اور بارہویں درجوں کی
پڑھائی بھی جلدی شروع کی جائے گی۔ اس اِسکول میں پڑھنے، رہنے، کھانے اور دوسری سہولتوں کا انتظام مفت ہے
لڑکیوں کے رہنے کے لیے ہوسٹل الگ ہے۔ ۷ سال سے ۱۱ سال تک کے ہر قوم کے اندھے لڑکے اور لڑکیوں کو اس اِسکول میں
داخل کیا جاتا ہے۔ پہلے کسی دوسرے ادارے میں تعلیم حاصل کیے ہوئے بچوں کو ٹرانسفر سرٹیفکٹ کے مطابق داخل کیا جا سکتا ہے

اِس اِسکول میں عام درسی مضامین کے علاوہ کئی کرافٹ سکھائے جاتے ہیں۔ کچھ خاص طرح کے کورس مثلاً
ٹیچر ٹریننگ، اسٹینوگرافی (مع ڈکٹا فون ٹائپنگ)، موسیقی، کپڑے اور کرسی کی بنائی وغیرہ کی بھی تعلیم دی جاتی
ہے۔ لڑکیوں کو ان چیزوں کے ساتھ ہی سینا پرونا، کڑھائی وبنائی اور کھانا پکانا بھی سکھایا جاتا ہے۔ کھیل کود
کا مستقل انتظام ہے۔ اعلیٰ تعلیم حاصل کیے ہوئے اساتذہ کی مدد سے ان بچوں کو تعلیم دی جاتی ہے۔

داخلہ کے لیے پرنسپل، احمدی نابینا اسکول، علی گڑھ مسلم یونیورسٹی علی گڑھ کو فوراً درخواست دیں۔

منیجر
احمدی نابینا اِسکول
نزد شمشاد مارکیٹ،
علی گڑھ مسلم یونیورسٹی علی گڑھ

یہ پانچ باتیں اللہ کی رحمت سے محروم کر دیتی ہیں۔

۱- شرک جلی، بنی اسرائیل نے جب گو سالہ پرستی اختیار کی تو ان پر ذلت مسلط کر دی گئی اور اللہ نے فرمایا کہ وہ مجرموں کو اسی طرح سزا دیتا ہے اور قدرت کا قانون ہے کہ ادھر کسی فرقہ یا طبقہ یا برادری شرک جلی میں مبتلا ہوئی ادھر بے برکتی آئی مسلمان توحید کے امین ہیں لیکن ان میں بھی دوسروں کے اثر سے یا خود غرض اور مفاد پرست رہنماؤں کی وجہ سے شرک یا شرکیہ رسوم و رواج آجاتے ہیں اور خدا سب کچھ برداشت کر لیتا ہے لیکن شرک کو برداشت نہیں کرتا۔

۲- وہ گناہ جن سے خدا کا غضب نازل ہوتا ہے۔ وہ گناہ جو گھروں میں ہوتا جو محلوں میں ہوتا ہے، جو چیزیں اللہ نے حرام کی ہیں، حرام رشتے ناجائز تعلقات جن سے اللہ نے اس کے رسولؐ نے منع فرمایا ہے۔ شراب نوشی، جوا بازی یہ وہ چیزیں ہیں جو اللہ کی مدد سے محروم کرتی ہیں اور بے برکتی کا سبب بنتی ہیں۔

۳- ظلم، اللہ تعالیٰ اپنے بندوں پر ظلم کو برداشت نہیں کرتا۔ کسی معاشرہ میں کسی کمزور طبقہ پر ظلم ہو خدا کی رحمت سے محرومی کا سبب ہے۔ بعض دفعہ ایک ظلم نے سلطنتوں کے تختے الٹ دیے ہیں، ایک بیوہ کی آہ اور ایک یتیم کی فریاد نے انقلاب برپا کر دیا ہے۔

۴- غرور اللہ کو ناپسند ہے اور صحابہ کرام کے لشکر کو بھی اس نے اس سے مستثنیٰ نہیں کیا، غزوۂ حنین میں مسلمانوں کو اپنی کثرت تعداد پر اعتماد ہوا تو ان کو شکست ہو گئی اور انھیں پسپا ہونا پڑا

۵ ملّت کے ملی تقاضوں سے غفلت کہ ہر شخص اپنے کام میں مگن ہو اپنی دولت اور تجارت کی فکر کرے ملی مسائل سے کوئی دلچسپی نہ ہو، اپنے ذاتی مفادات کو ملی مفادات پر ترجیح دے یہ خود غرضی اور انانیت قوموں کو کہیں سے کہیں پہونچا دیتی ہے

[مولانا سید ابوالحسن علی ندوی]

THE MOHAMMEDAN SOCIAL REFORMER

تہذیب الاخلاق

شمارہ نمبر ۱۲ ۱۶ر جون ۱۹۸۳ء جلد نمبر ۲

میں نے تمہارے لڑکوں کی تعلیم پر جو کوشش کی ہے
اس سے تم یہ نہ سمجھو کہ میں اپنی پیاری بیٹیوں کو بھول
گیا ہوں، بلکہ میرا یقین ہے کہ لڑکوں کی تعلیم پر
کوشش کرنا لڑکیوں کی تعلیم کی جڑ ہے۔ پس جو
خدمت میں تمہارے لڑکوں کے لیے کر رہا ہوں،
درحقیقت وہ لڑکوں لڑکیوں دونوں کے
لیے ہے۔"

(سر) سید احمد

ناموں میں کیا رکھا ہے	سیّد حامد
مذہب کیوں اور کس لیے	مولانا سید کاظم نقوی
سرسیّد: ایک تعارف	عتیق احمد صدیقی
رسومات اور مسلمان	مولانا محمد الیاس صدیقی
مشتاق حسین (وقار الملک)	
سرسید کی تعلیمی تحریک اور نظامی بدایونی	مقیم الدین بدایونی
عزم و حزم	سیّد احمد

یونیورسٹی کے شب و روز

شعبۂ اردو میں ادبی نشست

سمپوزیم میں مرکزی وزراء کی شرکت

چیرمین یو جی سی مسٹر مادھوی شاہ کی آمد

راس مسعود ہال کا سالانہ جلسہ

پندرہ روزہ

تہذیب الاخلاق علی گڑھ

مُدیر: سید حامد وائس چانسلر
علی گڑھ مُسلم یونیورسٹی

مُدیر مسئول: قاضی معزالدین احمد

شمارہ نمبر ١٢ ١٦/جون ١٩٨٣ء جلد نمبر ٢

قیمت فی پرچہ	ایک روپیہ
ششماہی	١١ روپے
سالانہ	٢٠ روپے

بیرونِ ہند سے

فی پرچہ	ایک ڈالر
سالانہ	١٥ ڈالر

ترسیل زر وخط وکتابت کا پتا
قاضی معزالدین احمد
صفدر منزل۔ تار بنگلہ۔ اے ایم یو۔ علی گڑھ یو۔پی۔
(202001)

سیّد حامد

ناموں میں کیا رکھا ہے؟

سرخی صورت سوال ہے۔ جواب ملے
ا "بہت کچھ" افراد کو چھوڑیے، اداروں پر نظر ڈالیے
ن کے ناموں سے نام رکھنے والوں کی ذہنیت اور
ز فکر کا اندازہ ہوتا ہے۔
سماج نے ایک ادارہ کو پاگل خانہ کا
م دیا تھا۔ یعنی پاگلوں کا گھر۔ اس نام میں ... ایک اور
تغیر ملے گی۔ ہمدردی اور انسانیت اور رحم دور
ور نظر نہ آئے گا۔ گویا بیچارے پاگل انسان نہیں
نور ہیں۔ یہ نام سن کر وہ سماں سامنے آجاتا ہے
پھٹے کپڑوں میں ایک سہما ہوا انسان جس کی آنکھوں
ے خوف اور دہشت ٹپک رہی ہے، بھاگا ہوا جا رہا ہے
ور لڑکے پتھروں اور آوازوں سے اس کا
پا کر رہے ہیں۔ یہ سماں عبرتناک ہے اور شرمناک
ی۔ ظالم سماج نے پہلے تو ایک فرد پر ظلم ڈھا کر اس کے
ماغی توازن کو برباد کر دیا اور پھر اس خطا پر کہ
ہ اپنا دماغی توازن کھو بیٹھا ہے، وہی سماج شکاری
ڈں کی طرح اس کے پیچھے پڑ گیا۔ ذہن روم کے
شندوں کی اس شیطانی تفریح کی طرف جاتا ہے کہ
ن کسی شخص خصوصاً نچلے طبقہ کے فرد نے قواعد کی
لاف ورزی کی یا استبداد کے خلاف سر اٹھایا، اس
بھوکے شیر کے رحم و کرم پر چھوڑ دیا اور ایمفی تھیٹر
ں بیٹھے ہوئے ہزارہا انسان اس منظر سے لطف اندوز

ہو رہے ہیں کہ سہمے ہوئے آدمی کو شیر کس طرح چشم زدن
میں پھاڑ کھاتا ہے، ٹکڑے ٹکڑے کر دیتا ہے۔
انوکھی بات ہے، الفاظ کی ترتیب سے
ان کے مفاہیم میں تبدیلی آجاتی ہے۔ "خانہ" اگر کسی
ترکیب کا آخری جزو ہو تو اس میں بسا اوقات اس
میں ایک پہلو تحقیر یا برائی کا آجاتا ہے۔ مثلاً شراب خانہ،
پاگل خانہ، قحبہ خانہ (کبھی کبھی نہیں بھی آتا ہے جیسے
دواخانہ، شفاخانہ)۔
جسے پاگل خانہ کہا جاتا تھا، اسے اب "دماغی
ہسپتال" کہنے لگے ہیں۔ نیا نام یہ بتاتا ہے کہ سماج
اب ان لوگوں کو جو ہوش و حواس کھو بیٹھے ہیں حقارت
اور بربریت کے ساتھ نہیں دیکھتا۔ اسے احساس ہے
کہ جو لوگ پاگل ہیں وہ گنہگار نہیں ہیں۔ گنہگار اور
ذمہ دار خود سماج ہے اور سماج پر اس کی ذمہ داری
ہے کہ ان کے ساتھ انسانیت اور رحم کا برتاؤ کرے
اور ان کا علاج کرائے اور انھیں ہوش و حواس
کے دیار میں واپس لا کر آباد کرے۔
آج کی صحبت میں ہم صرف ایک اور
نام کا ذکر کریں گے۔ یتیم خانہ۔ یعنی یتیموں کے رہنے
کی جگہ۔ ہندی میں اسے اناتھالے अनाथ आलय
اور انگریزی میں ORFHANAGE کہتے ہیں۔ ان
سب میں تحقیر اور اگر تحقیر نہیں تو بے حسی اور بے تعلقی

ا شائبہ ملتا ہے۔ یہ نام اس مکان کے مکینوں کو عام
نسانوں کے حلقے سے نکال باہر کرتا ہے۔ اس کے مقابلہ
یں اسی ادارہ کے لیے ایک دوسرا نام سنیے۔ "بچوں
کا گھر"۔ کتنا اچھا اور پیارا نام ہے یہ۔ جو بچے
بچوں کے گھر میں رہتے ہیں، ان کو یہ احساس ہوتا
ہوگا کہ وہ اپنے گھر میں رہ رہے ہیں۔ وہ بے آسرا
ور بے سہارا یتیم نہیں۔ جیسے اور بچے ہیں ویسے
ہی وہ ہیں۔ دنیا ان کے ساتھ دوسرے بچوں کا
سا برتاؤ کرتی ہے۔ ان کے لیے بھی وہی امکانات
ہیں جو دوسرے بچوں کے لیے۔ دیکھیے ان بچوں کی
نفسیات پر، جو اس ادارہ میں پلے بڑھیں گے اور
خود سماج کے نقطۂ نگاہ پر اس کام کا کتنا اچھا اثر
پڑے گا۔ نام میں بہت کچھ رکھا ہے۔ سعدی کا
قطعہ یاد آرہا ہے

پدر مردہ را سایہ بر سر فگن
غبارش بیفشان و خاکش بکن

جس بچے کا باپ نہ رہا ہو اس پر اپنی شفقت
سے سایہ کرو۔ اس کے غبار کو جھاڑ دو اور اس
کی خاک کو دور کر دو۔ غبار اور خاک سے یہاں
دل اور جسم دونوں کی طرف اشارہ ہے

ان سطور کا آغاز سوال اور جواب سے
ہوا تھا۔ مناسب ہے اگر انجام بھی اسی پر ہو۔
آپ بتا سکتے ہیں جس ادارہ کو ہم بے دردی اور
بے حسی سے یتیم خانہ کہتے ہیں اسے "بچوں کے گھر"
جیسا محبت بھرا نام جس شخص نے دیا، خود اس
کا نام کیا تھا؟

جواب: "ذاکر صاحب"

بقیہ مضمون "مذہب کیوں اور کس لیے"

نگاہ میں دنیا کی چند روزہ مادی زندگی کو اس
کا مقصود اصلی نہ بننے دیں۔ وہ مذہبی عقائد جو
انسان کے دماغ میں خدائے علیم و حکیم کی قضا و قدر
کا خیال راسخ کر کے آفات ارضیہ و سماویہ کے ناخوشگوار
اثرات سے اسے محفوظ رکھیں۔ وہ مذہبی عقائد جو انسان
کو ابدی زندگی کا مالک بنا کر اندیشۂ فنا کی ہولناک
مایوسی سے اس کو بچالیں کیا اس قابل نہیں ہیں
کہ انسان ان کے متعلق غور و خوض کرے؟

صرف مذہب سکون و اطمینان عطا کرتا ہے
مذہب سے روگرداں ہو کر انسان کے لیے اضطراب
ہی اضطراب، پریشانی ہی پریشانی ہے۔

هو الذی انزل السکینة فی قلوب المؤمنین "اور وہ خدا وہ ہے جس
نے سکون کا سرمایہ صرف مومنین کے دلوں
پر نازل کیا ہے"

(قرآن: فتح ۴)

بقیہ مضمون "مشتاق حسین"

کے ساتھ کرتی رہے۔ اب جو معاملات کانپور کے متعلق
مسلمانانِ صوبہ متحدہ کے سامنے ہیں، یہ ایک ایسا موقع
ہے کہ اگر ہم نے اس کو بغیر کافی توجہ کے ہاتھ سے
جانے دیا تو ایک ٹاکر نہیں، آئندہ ہم کو توقع رکھنی چاہیے
کہ ہر ایک سب انسپکٹر ہمارے لیے ٹاکر ثابت ہوگا۔ اگر
اس وقت ہم نے اعتدال و استقلال سے کام لیا تو اس
کا نتیجہ یہ ہوگا کہ کوئی بڑے سے بڑا حاکم کبھی دفعتہ
ہمارے جذبات کے خلاف کارروائی کرنے میں بہت
زیادہ احتیاط برتے گا اور اب یہ ہمارے ہاتھ میں
ہے کہ اپنی آزادی و عزت کو برقرار رکھیں یا
پیروں کے تلے پامال ہونے دیں۔

(ماخوذ از داستان تاریخ ادب اردو)

چوتھی قسط

سید کاظم نقوی
صدر شعبۂ دینیات شیعہ اے ایم یو

مذہب کیوں اور کس لیے؟

یہ بے چینیاں کس طرح دور ہوں؟

اس بات کا نہ ماننا انصاف کے خلاف ہے کہ انسان نے اپنے وسیع علوم و فنون کی بدولت بہت سے مشکلات پر قابو پا لیا ہے۔ وہ پچھلے زمانے کی طرح بالکل کمزور اور بیچارہ نہیں رہا ہے۔ ایک وقت میں وہ اپنے زبردست دشمن جراثیم سے ناواقف تھا۔ اس لیے اسے ان سے مقابلے کا طریقہ بھی معلوم نہ تھا۔ جراثیم کے انکشاف اور ان کے نیست و نابود کرنے کے طریقے سے واقفیت کے بعد اسے بہت سی لاعلاج بیماریوں سے نجات مل گئی ہے وہ پہلے کب جانتا تھا کہ دولت و ثروت کے اصلی خزانے زمین کے سینے میں چھپے ہوئے ہیں۔ جب مختلف چیزوں کے معدن کے چہرے سے علم و تحقیق کے طاقتور ہاتھوں نے نقاب ہٹائی تو اسے موقع ملا کہ وہ نوع انسانی کے آرام و راحت کے لیے طرح طرح کے وسائل اور ذرائع ایجاد کرے۔

کون اس واقعیت پر پردہ ڈال سکتا ہے کہ صنعت کے میدان میں انسان اتنا آگے بڑھا، اتنا آگے بڑھا کہ اب اس کے ہاتھوں نے فضاؤں کے دروازے اس کے سامنے کھول دیے ہیں۔ اس نے چاند میں آدمی بھیج کر بلا لیا ہے۔ طبابت کے فن میں اس نے اتنی ترقی کی کہ شاید وہ وقت نزدیک ہے کہ جب قدرتی دل اور گردے کا کام مصنوعی دل اور گردے سے لینے لگے۔

ایک طرف یہ غیر معمولی، حیرت انگیز، قابل فخر، علمی اور فنی کامیابیاں ہیں۔ دوسری طرف ہماری آنکھوں کے سامنے یہ حقیقت ہے کہ ان تمام مادی ترقیوں کے باوجود انسان کا دل مطمئن نہیں ہے اس کا نفس سکون کی نعمت سے محروم ہے۔ حالانکہ خوش بختی اور خوش نصیبی کی بنیاد اور اس کا سرچشمہ یہی سکون نفس اور اطمینان قلب ہے۔ نہ جانے اس کی کیا وجہ ہے کہ انسان جتنا جتنا صنعت کے میدان میں آگے بڑھ رہا ہے، مادی علوم میں ترقی کر رہا ہے۔ جتنی جتنی جسمانی راحت اور آسائش میں فراوانی پیدا ہو رہی ہے، اتنے اتنے نفسیاتی مشکلات بڑھ رہے ہیں ذہنی اور دماغی الجھنوں میں اضافہ ہو رہا ہے۔ ایسا محسوس ہوتا ہے کہ مادی ترقی اور نفسیاتی اضطراب ایک دوسرے کے ہمراہ ہیں، یہ لازم و ملزوم کی حیثیت رکھتے ہیں ان دونوں کے درمیان جدائی نہیں ہو سکتی۔

یہ صحیح ہے کہ انسان تمام ادوار زمانہ میں کسی نہ کسی حد تک اضطراب، تشویش اور پریشانی کا شکار رہا ہے۔ لیکن کسی زمانے میں موجودہ دور کی طرح وہ خوف و ہراس اور دماغی الجھنوں سے دوچار نہیں دکھائی دیتا ہے۔

امریکہ جو اس وقت دنیا کا سب سے بڑا صنعتی مرکز ہے وہاں کے نوجوانوں میں آدھے کم از کم ایک مرتبہ بزور اضطراب و اختلاج کے واسطے ڈاکٹر

کے پاس جاتے ہیں۔ صرف امریکہ کے اسپتالوں میں اٹھارہ لاکھ مریض نفسیاتی [illegible] میں گرفتار [illegible] کے علاج کی ضرورت سے قرار دی گئی ہے۔

امریکہ کے ڈاکٹروں کی رپورٹ سے ظاہر ہوتا ہے۔ وہاں کے ہر آٹھ آدمیوں میں سے ایک شخص اپنی عمر کا ایک حصہ ایسے اسپتالوں میں بسر کرتا ہے جہاں نفسیاتی بیماریوں کا علاج کیا جاتا ہے۔ دوسری جنگ عظیم کے موقع پر امریکہ کسی جگہ اپنی فوج بھیجنے سے پہلے سپاہیوں کا طبی معاینہ کراتا تھا۔ اس معاینہ کے بعد پتہ چلتا تھا کہ [illegible] سپاہیوں میں سے ایک شخص دماغی اور نفسیاتی کمزوری میں مبتلا ہے۔ اس کی وجہ سے اسے فوجی خدمت سے معاف کر دیا جاتا تھا۔

اگر امریکہ اور تمام دوسرے صنعتی ممالک کا اس سلسلہ میں ہر سال جو اعداد و شمار دنیا کے سامنے پیش کرتے ہیں تو یہ حقیقت لوگوں کے دماغ میں پیوست ہو جاتی ہے کہ موجودہ زمانہ دور اضطراب، دور تشویش اور دور دیوانگی ہے۔ گویا یہ دماغی پریشانی، ذہنی کوفت اور اضطراب، انتشار، نفسیاتی الجھن اس صنعتی تہذیب کا ناخوشگوار رخ ہے جو انسانیت ادا کر رہی ہے۔

بے چینی کے اسباب اور ان کا حل

(الف)

کون انکار کر سکتا ہے کہ انسان کی حرص و طمع غیر محدود ہے۔ دوسری طرف اس کی قوتیں انتہائی محدود ہیں۔ ہر شخص چاہتا ہے کہ اس کی تمام آرزوئیں پوری ہو جائیں اس کے دل کی کوئی تمنا تشنہ تکمیل نہ رہ جائے۔ لیکن ہوتا یہ ہے کہ انسان کی امیدوں کا دسواں حصہ بھی مشکل سے پورا ہوتا ہے۔ اسی [illegible] اور دنیا پرستی کا نتیجہ کہلاتے ہیں اضطراب، تشویش، ذہنی اطمینان کا فقدان [illegible] شخص کے دماغ کا ہر گوشہ دنیا طلبی اور [illegible] زر پرستی سے بھرا ہوا ہے جس کا مقصد زندگی ہے زیادہ سے زیادہ دولت سمیٹنا، زیادہ سے زیادہ جسمانی قوتوں سے لطف اندوز ہونا وہ اگر سو فیصدی اپنے مادی مقاصد کو پورا نہ کر سکے تو اس کا لازمی نتیجہ ہے نفس کا اضطراب، دل کی بے چینی، دماغ کا پریشان رہنا۔

مذہب اپنے مدبرانہ تعلیمات کے ذریعہ انسان کے جذبات حرص و طمع میں اعتدال پیدا کر دیتا ہے۔ مذہب جاہ طلبی اور ثروت اندوزی کی کوششوں کو معتدل بناتا ہے۔ وہ انسان کو عزت نفس، خودداری، نیکوکاری، قناعت پسندی اور پرہیزگاری کی دعوت دیتا ہے۔ اس نے اس بارے میں صرف واعظانہ ہدایت پر اکتفا نہیں کی بلکہ ناجائز اور نقصان رساں حرص و طمع کو گھٹانے کے لیے انسان کو آگاہ کیا ہے کہ اس دنیا کے علاوہ ایک دوسرا عالم ہے جہاں اسے اس کی غلط کاریوں کی سخت ترین سزائیں دی جائیں گی۔ مذہب نے تصور آخرت پیدا کر کے انسان کے رخ کو دنیا کی طرف سے کسی حد تک ہٹایا ہے اس کی جاہ طلبی اور دنیا پرستی کے جذبہ میں توازن پیدا کیا ہے۔

مذہب نے انسان کو ہدایت کی کہ جب دنیا کی زندگی چند روزہ ہے تو اسے مقصد اعلیٰ قرار دینا بیوقوفی ہے۔ اس کی پوری کوشش یہ ہونا چاہیے کہ وہ آخرت کو بنائے اور سنوارے۔

(ب)

کس کے پیش نظر نہیں ہے کہ یہ دنیا مصائب و شدائد کی آماجگاہ ہے۔ ہر شخص اپنی زندگی کے دوران طرح طرح کے مصائب میں گرفتار ہوتا ہے۔ نہ جانے کتنی محرومیاں اور شکستیں اسے برداشت کرنا پڑتی ہیں۔ کتنے عزیز اس سے جدا ہوتے ہیں۔ جانے کتنے آفات ارضی و سماوی سے وہ دوچار ہوتا ہے۔ حقیقتاً یہ دنیا رنج و غم، طوفان، آندھی، سیلاب، زلزلے، قحط سالی بے ثباتی کا نام ہے۔ یہ دنیا نادان خوش قسمتوں اور دانا بدنصیبوں کی بستی ہے۔ ان میں سے ہر چیز انسان کو

پریشان اور بے چین کرنے کے لیے کافی ہے۔ اس طوفانی
دنیا میں جہاں زندگی کی کشتی مصائب و آلام کے سمندر
میں چھپے ہوئے پہاڑوں سے ٹکرا ٹکرا کر پاش پاش
ہو جاتی ہے۔ کوئی ایسی چیز ہونا ضروری ہے جو انسان کے
دل اور دماغ کو سکون عطا کرے۔ یہی قلبی سکون اس کی
ٹوٹی ہوئی کشتی کو ساحل نجات تک پہونچا سکتا ہے۔
مذہب رہنمائی کرتا ہے کہ مذہب اس
مصائب سے بھری دنیا میں تنہا نہیں ہے۔ رحیم و کریم
قادر و توانا خالق اس کا پشت پناہ ہے۔ وہ خالق
کہ جو انسان سے زیادہ اس کے فائدے اور نقصان سے
باخبر ہے۔ یہ عقیدہ مصائب و شدائد کے ناخوشگوار
اثرات کو پھلنے پھولنے کا موقع نہیں دیتا ہے۔ کیوں کہ
انسان [illegible] ہے کہ جن حالات سے بھی وہ دوچار
ہے وہ اس حکیم و علیم، قادر و توانا خدا کا فیصلہ ہیں
جس کے تمام کام مخصوص مصلحتوں پر مبنی ہیں۔ مذہب
انسان سے کہتا ہے کہ مصیبتوں میں مبتلا ہونے کے موقع
پر صبر سے کام لینا چاہیے۔ یہ آخرت کے غیر معمولی اجر و
ثواب کے حاصل ہونے کا سبب ہے۔

ایک غلط فہمی کا دفعیہ

غلط فہمی نہ ہونا چاہیے، مصائب و آلام
میں گرفتاری کو فیصلۂ الٰہی سمجھنے کا یہ مطلب نہیں ہے کہ
ہر قسم کی سختیوں کو انسان برداشت کرتا رہے۔ چاہے
وہ غلط اور فاسد معاشرے کی پیدا کی ہوئی ہوں۔ انسان
ہاتھ پر ہاتھ دھرے بیٹھا رہے اور صاحبان زور و زر
اس پر ہر طرح کے ظلم کرتے رہیں۔ مذہب ان مصائب
و شدائد کو فیصلۂ خدا کا نتیجہ قرار دیتا ہے جو انسان
کی کارگزاری [illegible] بلکہ اس کے تصور و تخیل سے بالاتر ہیں۔
ایسی مصیبتوں کے مقابلے میں مذہب انسان کو صبر و تحمل
کی ہدایت کرتا ہے۔ مثلاً زلزلے، سیلاب، آندھیاں
طوفان، دوستوں اور عزیزوں کی موت۔ یہ وہ
مصائب و آلام ہیں جن میں انسان اچانک گرفتار ہو جاتا ہے
ان کا تعلق تقدیر خداوندی سے ہے جس کے سامنے سر جھکانے
کے سوا کوئی چارہ نہیں ہے۔ لیکن جن مصیبتوں اور سختیوں
کا سبب معاشرے کا غلط اور فاسد نظام ہو ان کا تقدیر الٰہی
سے کوئی تعلق نہیں ہے۔ ہمارا فریضہ ہے کہ ہم ایکا کر کے
ایسے معاشرے کو سدھارنے کی کوشش کریں۔ ظالموں کو
ظلم کرنے کا موقع نہ دیں۔ ایسا طبقاتی اختلاف نہ پیدا ہونے
دیں کہ کچھ لوگوں کے جسموں پر انتہائی قیمتی کپڑے ہوں اور
کچھ لوگ چیتھڑے لگائے رہیں۔ ایک گروہ کے دسترخوان
پر کئی کئی قسم کی مرغن غذائیں ہوں اور دوسرے نان شبینہ
کے لیے محتاج ہوں۔ کچھ لوگ مختلف موسموں کی مناسبت سے
مختلف عالی شان محلوں میں زندگی بسر کریں اور کچھ اشخاص
کے پاس ان کی ضرورت کے مطابق سر چھپانے کے لیے معمولی
سا مکان بھی نہ ہو۔ مذہب غلط اور فاسد نظام معاشرہ
کے لائے ہوئے مصائب اور شدائد کے اوپر صبر کرنے کی
ہرگز ہدایت نہیں کرتا ہے۔ بے شک آفات ارضیہ و
سماویہ میں مبتلا ہونے کے موقع پر مذہبی عقائد انسان
کے لیے تشفی و تسلی کا سامان فراہم کرتے ہیں۔ یہ سامان
ان لوگوں کے لیے موجود نہیں ہے جو وجود خدا کے قائل
نہیں ہیں۔ جو یہ عقیدہ نہیں رکھتے کہ اس دنیا کے علاوہ
ایک دوسرا عالم موجود ہے۔ جہاں دنیا کی محرومیوں اور
مصیبتوں کا عوض ملے گا۔

(ج)

ہر شخص کو یقین ہے کہ اسے ایک نہ ایک دن
مرنا ہے، اس نے اس دنیا میں جو دولت اکٹھا کی ہے
جو بڑے بڑے مکانات بنائے ہیں، جو عظیم الشان جائیدادیں
فراہم کی ہیں۔ اپنے ملک اور قوم کے درمیان جو غیر
معمولی اثر و رسوخ حاصل کیا ہے وہ سب رہ جائے
گا اور انسان چلا جائے گا۔ موت کا تصور عام طور سے
ہر ایک کے لیے انتہائی ناخوشگوار ہے خصوصیت سے
ان لوگوں کے واسطے جو یہ یقین رکھتے ہیں کہ مرنے کے

بعد انسان کی کتاب زندگی بند ہو جاتی ہے جن کا عقیدہ
یہ ہے کہ جو کچھ ہے وہ یہی دنیا ہے۔ اسے چھوڑنے کے بعد
کوئی عالم نہیں ہے جہاں انسان کو منتقل ہونا اور زندگی
بسر کرنا ہو۔ ایسے لوگوں کی زندگی کا آخری دور بڑی
مایوسی، پژمردگی اور تنگ دلی کے ساتھ گزرتا ہے۔
اس دور میں کبھی انسان کے دل و دماغ پر ایسا نفسیاتی
دباؤ پڑتا ہے کہ اس کی کارگزاری کی قوت جواب دے
دیتی ہے۔ وہ ایک مفلوج شخص کے مانند ہو جاتا ہے۔
ظاہر ہے کہ ایسا شخص جو انتہائی عیش و آرام اور بے فکری
میں زندگی بسر کر رہا ہے جب یہ اعتقاد رکھے گا کہ موت فنا
کا دروازہ ہے۔ موت کے بعد تاریکی ہی تاریکی، سناٹا ہی
سناٹا ہے تو اپنے کو فنا کی چوکھٹ پر دیکھ کر عجیب و
غریب مایوسی اور ناامیدی کا شکار بن جائے گا اور
اس کی بقیہ زندگی انتہائی تلخ اور ناخوشگوار ہو جائے گی
یہی وجہ ہے کہ جس ماحول پر خالص مادیت
چھائی ہوئی ہے، جہاں کے لوگ دنیا طلبی، مادہ پرستی
اور لذت اندوزی کو صرف اپنا مقصدِ زندگی بناتے ہوئے
ہیں۔ جن کی آرزوئیں غیر محدود اور امکانات محدود
ہیں جو دنیا کو آفاتِ ارضیہ اور سماویہ سے بھرا ہوا
دیکھتے، اپنے کو طرح طرح کی محرومیوں کا شکار پاتے، موت
کو فنا کا دروازہ سمجھتے ہیں وہ ہمیشہ بے چین، رنجیدہ،
پژمردہ اور مایوس نظر آتے ہیں۔ خصوصیت سے
آخر عمر میں ان کیفیتوں کا بوجھ نمایاں طور سے بڑھ
جاتا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ مادہ پرست انسان، مذہبی
عقائد سے محروم انسان زبان سے چاہے نہ کہے، لیکن وہ
ایک پناہ گاہ کی تلاش میں ہے جو اس کی مضطرب روح کو
اطمینان عطا کرے۔ یہ مادہ پرست انسان کبھی نشہ آور
چیزوں کے دامن میں پناہ لیتا، کبھی اپنے کو حوصلے کی گود
میں ڈال دیتا ہے۔ اس کا مقصد یہ ہے کہ اس کے عقل و
احساس کی قوتیں تباہ ہو جاتی ہیں تو ہوں، کوئی پرواہ نہیں
ہے، لیکن کم از کم وہ کچھ دیر کے لیے بے خبری کے عالم میں
چلا جائے، وہ اپنے کو بھول جائے، اس کے دل و دماغ کے
اوپر جو ناقابل برداشت بوجھ پڑ رہا ہے اس سے چھٹکارا مل جائے
— ایک طبقہ نے سینما، تھیٹر، ناچ گانے کو پناہ گاہ بنایا،
انھوں نے اس سے چشم پوشی کر لی کہ ان چیزوں کا اعصاب
کے اوپر کتنا گہرا اثر پڑتا ہے۔

رفتہ رفتہ ان تمام چیزوں سے طبیعت اکتا گئی،
وقتی سکون ضرور حاصل ہوا لیکن آہستہ آہستہ اس نے ساتھ
چھوڑ دیا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ کچھ لوگوں نے خودکشی کر ڈالی کچھ بالآخر
بیمار ہو کر اسپتال میں داخل ہو گئے اور کچھ بقیہ زندگی تلخی،
مایوسی، پژمردگی کے ساتھ بسر کر کے قبر میں پہونچ گئے۔

مذہب نے انسان کے دماغ میں معاد کا
تصور پیدا کیا، اس نے بتایا کہ انسان کا رشتۂ زندگی کبھی
ٹوٹنے والا نہیں ہے، موت کے ہاتھوں میں یہ دم نہیں
ہے کہ اسے توڑ سکے۔ موت ابدیت کا دروازہ ہے
عزرائیل جو قبض روح پر مامور ہیں، حقیقتاً ہماری زندگی
کے امتداد ہیں۔ یہ دنیوی زندگی ابدی زندگی کا پیش خیمہ ہے

معاد کے عقیدہ نے انسان کی اس دنیوی
مادی زندگی میں چہل پہل پیدا کر دی۔ مذہب نے انسان
کے چہرے سے پژمردگی چھین کر اسے بارونق بنا دیا، مایوسیوں
کے بادل چھٹ گئے، امیدوں کی بجلیاں چمکنے لگیں۔ خصوصیت
سے مذہب نے بوڑھے اشخاص کے دل و دماغ کے غیر معمولی
بوجھ کو اٹھا کر ان کا دل ہلکا کر دیا۔

آخرت کی زندگی اور وہاں کی نعمتوں کی خوشخبری
دے کر ان کے چہرے سے رنج و غم کی جمی ہوئی گرد کو
دور کر دیا۔ فرمایئے اور انصاف سے فرمایئے کہ وہ
مذہبی عقائد جو اپنے اخلاقی بلند تعلیمات کے ذریعہ انسان
کے جذبۂ حرص و طمع میں توازن اور اعتدال پیدا کر دیں،
وہ مذہبی عقائد جو آخرت کی نہایت سخت سزاؤں کے
وسیلے سے جذبۂ حرص و ہوس کو کمزوروں کے حقوق
پائمال کرنے سے روک دیں۔ وہ مذہبی عقائد جو انسان کی

باقی صفحہ نمبر ۳۰ پر

۱۶ جون ۱۹۸۳

عتیق احمد صدیقی
شعبۂ اردو۔ اے ایم یو۔ علی گڑھ

سرسیّد۔ ایک تعارف

انیسویں صدی کے ہندوستان میں جو عظیم ہستیاں عدم سے وجود میں آئیں اور جنھوں نے ہندوستان کے مستقبل کی تعمیر و تشکیل میں گرانقدر خدمات انجام دیں، ان میں سرسیّد بڑی اہمیت کے مالک ہیں۔ انھوں نے تاریخ کے ایسے موڑ پر شعور کی آنکھ کھولی جہاں سے مستقبل تو کجا حال کو بھی واضح طور پر دیکھنا مشکل تھا۔ بساطِ سیاست پر ہندوستانی، بالخصوص مسلمان، بازی ہار چکے تھے، لیکن ۱۸۵۷ء تک بلکہ اس کے بعد بھی دیر تک اعترافِ شکست کے لیے تیار نہیں تھے۔ بڑی تعداد تو صورتِ حال سے بے خبر یا بے نیاز تھی۔ ایک مختصر سی تعداد جسے حقیقت کا احساس تھا اور جس کی عقابی نگاہیں سینۂ وجود کے پار دیکھ سکتی تھیں، جو کسی غم میں مبتلا تھی اس طبقہ کے لیے زمانے کی نامساعدت تو مسلم ہو چکی تھی، سوال یہ تھا کہ انجام سے بے نیاز ہو کر راہ ستیزہ اختیار کی جائے یا حالات کے جبر سے مصالحت کر کے نئی زندگی کا منصوبہ بنایا جائے۔ سرسیّد نے دوسری راہ اختیار کی۔ مگر یہ نہ بے شعوری پائی تھی، نہ خوف زدہ ہزیمت خوردگی اور نہ مکمل خود سپردگی، بلکہ یہ باشعور مصالحت تھی اس شعور میں درخشاں ماضی کا تصور بھی تھا، حال کے تہلکات و مصائب اور تقاضوں کا گہرا احساس بھی اور ایک خوشگوار، صحت مند اور باعزت مستقبل کی تعمیر کا جذبہ بھی۔ یہ امتزاج معمولی بات نہ تھی اس کے لیے ایک ہمہ گیر مگر معتدل شخصیت، گہرے تدبّر و تفکر، بے پناہ بے باکی و جرأت اور بے لوث کاوش کی ضرورت تھی۔ قدرت نے سرسیّد کو یہ اور ایسی ہی بہت سی صلاحیتیں ودیعت کی تھیں اور انھوں نے ان سب صلاحیتوں سے بھرپور کام لیا۔

اس دور کے عرف عام کے مطابق انھوں نے کوئی اعلیٰ تعلیم نہیں پائی تھی۔ صرف متوسط کتابوں تک پڑھ کر زندگی کے عملی میدان میں داخل ہو گئے اس کا ان کو خود بھی احساس تھا اور دورانِ ملازمت انھوں نے یہ ضرورت محسوس کی کہ جو کتابیں ابتدا میں پڑھ چکے تھے، ان کو پھر تازہ کریں اور اعلیٰ کتابوں میں سے بھی کچھ پڑھیں۔ یعنی وہ حال پر مطمئن اور قانع نہیں تھے، بلکہ خوب سے خوب تر کی جستجو ان کے ذوقِ علمی کو برابر مہمیز کر رہی تھی۔ تعلیم کی اس کمی کو ان کی زبردست قوتِ عمل نے پورا کر دیا۔ ان کے اندر استخراجِ نتائج اور استنباطِ مطالب کی عجیب و غریب صلاحیت موجود تھی۔ اسی سے انھوں نے مخالفین کے اعتراضات کے جوابات دیے، اسی سے ایک نئے علم الکلام کی بنیاد ڈالی، اسی سے زمانہ کی ہوا کو پہچانا اور اس کے تقاضوں کے مطابق لائحۂ عمل طے کیا۔

غور کیجیے تو مسلمانانِ ہند کی تاریخ میں کسی ایک فرد نے قومی زندگی کو اس قدر متاثر نہیں کیا

جتنا کہ سرسید نے۔ انھوں نے معاشی، معاشرتی، تمدنی
ثقافتی، علمی، تعلیمی، مذہبی غرض زندگی کے سب ہی میدانوں
میں ہلچل پیدا کردی۔ مسلمانان ہند سیکڑوں سال سے
جس جمود کا شکار تھے وہ ٹوٹ گیا۔ رکے ہوئے پانی میں
تموج پیدا ہوا۔ تصورات میں تبدیلی پیدا ہونا شروع ہوئی
سوچنے سمجھنے کے انداز بدل گئے اور یہ سب تغیر و تبدل
ایک عظیم [illegible]ب پر منتج ہوئے۔ ان کی سخت ترین مخالفتیں
ہوئیں، کفر والحاد کے فتوے ان پر لگائے گئے
ازراہ تحقیر ان کو کرسٹان کہا گیا، لیکن زمانہ نے ثابت
کردیا کہ سرسید کا نقطۂ نظر درست تھا۔ ان کے مخالفین
کو بھی اس کا اعتراف کرنا پڑا۔ ایک صدی بھی نہیں گزری
تھی کہ کفر و الحاد کے فتوے لگانے والے ان کو مصلح
قوم کے نام سے یاد کرنے لگے، ان کا نام علیہ الرحمہ کے
ساتھ لیا جانے لگا اور ان کی کوششوں کے نتیجہ کو
نشاۃ ثانیہ سے تعبیر کیا گیا۔

سید احمد خاں نے شعور کی آنکھ کھولی تو
خود کو دوراہے پر کھڑا پایا۔ ایک طرف مغل اقتدار کی آخری
نشانی شاہی دربار تھا، جس سے ان کے والد، نانا اور
دیگر اہل خاندان وابستہ رہے تھے۔ خود ان کے والد
نے کم عمری میں ہی انھیں دربار سے خلعت دلانا شروع
کردیا تھا اور یوں ان کو دربار شاہی میں رسائی کے
ایسے مواقع حاصل تھے جن کے لیے دوسرے آرزو کرتے
تھے اور حاصل نہ کرپاتے تھے۔ اسی دربار سے وابستگی
کی آرزو نے مرزا غالب جیسے نابغۂ روزگار کو ایک
عرصے بیتاب رکھا۔ دوسری طرف انگریزوں کی بڑھتی
ابھرتی قوت تھی، جس کے بارے میں ہندوستانیوں
بالخصوص مسلمانوں کے دلوں میں طرح طرح کے شکوک
وشبہات تھے۔ سید احمد خاں نے اپنے رشتہ داروں
کی مخالفت کے باوجود قلعہ شاہی سے تعلق منقطع کرکے
سرکار انگریزی کی نوکری اختیار کرنے کا فیصلہ کیا۔
یہ محض جذباتی فیصلہ نہیں تھا، کیوں کہ جذبات کا تقاضا
اس کے برعکس ہوتا۔ ان کی دوربیں نگاہوں نے آنے
والے زمانے کی پرچھائیوں کو دیکھ لیا تھا اور ان کی
عقل سلیم نے ان کی رہنمائی کی۔ انھوں نے اس نظام
کا حصہ بننا پسند نہیں کیا، جس کی تباہی مقدر ہوچکی تھی۔
اس کو نہ زمانہ سازی کہا جاسکتا ہے نہ موقع پرستی
بلکہ یہ ان کی زمانہ شناسی اور حقیقت پسندی کا تقاضا
تھا۔ ان کی اس حقیقت پسندی ہی نے آگے چل کر ان سے
وہ واضح اصلاحی پروگرام مرتب کرائے جن کے باعث
مخالفتوں کے طوفان اٹھ کھڑے ہوئے۔ لیکن جن کی
بدولت وہ ہندوستانی مسلمانوں کے ذہن کو عہد وسطیٰ
کے ماحول سے نکال کر جدید دور میں لانے میں کامیاب
ہوسکے۔

۱۸۵۷ء کے تہلکات نے تمام سوچنے والے
ذہنوں کو جھنجھوڑ کر رکھ دیا تھا۔ لیکن اس کا ردِ عمل
مختلف لوگوں پر مختلف انداز میں ظاہر ہوا۔ بعض صرف
رو دھو کر بیٹھ رہے۔ بعض نے حالات کی سنگلاخ
چٹانوں سے ٹکرا کر جان دے دی۔ بعض نے ماضی کی
طرف سفر شروع کردیا، بعض طوفان کے اس دھارے
میں تنکے کی طرح بہہ گئے، لیکن سرسید پر اس کا جو اثر
ہوا، ان کی زبان ہی سے سنیے:

"غدر کے بعد نہ مجھ کو اپنا گھر لٹنے کا رنج تھا، نہ
مال و اسباب کے تلف ہونے کا۔ جو کچھ رنج
تھا اپنی قوم کی بربادی کا اور ہندوستانیوں
کے ہاتھ سے جو کچھ انگریزوں پر گزرا، اس کا
رنج تھا۔ جب ہمارے دوست مرحوم مسٹر
شکیسپر نے جن کی مصیبتوں میں ہم اور ہماری
مصیبتوں میں وہ شریک تھے، بعوض اس
وفاداری کے تعلقہ جہاں آباد جو سادات
کے ایک نامی خاندان کی ملکیت اور لاکھ روپے
سے زیادہ مالیت کا تھا، مجھ کو دینا چاہا تو
میرے دل کو نہایت صدمہ پہونچا۔ میں نے

اپنے دل میں کہا کہ مجھ سے زیادہ کوئی نالائق
دنیا میں نہ ہوگا کہ قوم پر تو بربادی ہو اور میں
ان کی جائیداد لے کر تعلقہ دار بنوں۔ میں نے
اس کے لینے سے انکار کیا اور کہا کہ میرا ارادہ
ہندوستان میں رہنے کا نہیں ہے اور درحقیقت
یہ بات بالکل سچ تھی۔ میں اس وقت ہرگز
نہیں سمجھتا تھا کہ قوم پھر پنپے گی اور کچھ عزت
پائے گی اور جو حال اس وقت قوم کا تھا مجھ
سے دیکھا نہیں جاتا تھا۔ چند روز میں اسی
خیال اور غم میں رہا۔ آپ یقین کیجیے کہ اس غم
نے مجھے بڈھا کر دیا اور میرے بال سفید کر دیے
جب میں مراد آباد میں آیا جو ایک بڑا غمکدہ ہماری
قوم کے رئیسوں کی بربادی کا تھا اس غم کو کسی
قدر اور ترقی ہوئی۔ مگر اس وقت یہ خیال
پیدا ہوا کہ نہایت نامردی اور بے مروتی کی
بات ہے کہ اپنی قوم کو اس تباہی کی حالت
میں چھوڑ کر میں خود کسی گوشۂ عافیت میں جا بیٹھوں
نہیں! اس کی مصیبت میں شریک رہنا چاہیے
اور جو مصیبت پڑے اس کو دور کرنے میں
ہمت باندھنی قومی فرض ہے۔ میں نے ارادہ
ہجرت موقوف اور قومی ہمدردی کو پسند کیا۔"

قوم، قومی فرض اور قومی ہمدردی وغیرہ کے
[illegible]ورات کو سید احمد خاں نے پہلی مرتبہ ایک واضح شکل
[illegible]ی۔ انھوں نے اس تصور میں کل اہل ہند اور بالخصوص
[illegible]ہ مسلمانان ہند کو شامل کیا، انھوں نے اجتماعی کاموں
[illegible] داغ بیل ڈالی اور اپنے قول و فعل سے جملہ اہل ہند
[illegible] "یک تائی اور یک جہتی" کی برابر تلقین کرتے رہے۔ عقیدہ
[illegible]ل، نسل، زبان اور علاقہ کے اختلافات کے باوجود وہ
[illegible] ملک کی یگانگت و اتحاد کا درس دیتے رہے۔ اگر
[illegible] طرف انھوں نے اہل کلمہ کو قرآنی استدلال سے ایک
[illegible]سرے کا بھائی قرار دیا تو دوسری طرف وطنی رشتہ

کی اہمیت پر زور دیا۔ وہ لکھتے ہیں:

"مگر ہم کو یہ بات بھی نہیں بھولنا چاہیے
کہ ان روحانی بھائیوں کے سوا اور بھی
ہمارے وطنی بھائی ہیں۔ گو وہ ہمارے
ساتھ اس کلمہ میں جس نے ہم مختلف
فرقوں کو ایک قوم اور آپس میں روحانی
بھائی بنایا ہے، شریک نہیں ہیں۔ مگر بہت
سے تمدنی امور ہیں جن میں ہم اور وہ مثل
بھائیوں کے شریک ہیں۔ اسی زمین پر ہندوستان
کی ہو یا پنجاب کی، دکن کی ہو یا بنگالہ کی، ہم
دونوں رہتے ہیں۔ اسی ملک کی ہوا سے
اسی ملک کے پانی سے، اسی ملک کی پیداوار
سے دونوں کی زندگی ہے۔ ہزاروں امور
تمدن ایسے ہیں کہ بغیر ہمارے ان کو اور
بغیر ان کے ہم کو چارہ نہیں۔ ہمسایہ کا ادب
ہمارے مذہب کا جزو ہے اور یہی ہمسائیگی
وسعت پاتے پاتے ہم ملکی و ہم وطنی کی وسعت
تک پہنچ گئی ہے۔"

جدید دور کی ترقیات کی بنیاد جدید تعلیم پر
تھی اور اس سے پیدا ہونے والی تھی۔ جدید تہذیب و
معاشرت۔ لیکن تہذیب و معاشرت کے جدید تصور کے
بغیر جدید تعلیم کی طرف متوجہ ہونا بھی مشکل تھا۔ اس
لیے انھوں نے اپنی ساری توجہ تعلیم و اصلاح تہذیب و
تمدن پر صرف کر دی۔ تہذیب الاخلاق نام کا رسالہ
اسی مقصد سے جاری کیا گیا۔ گو کہ اپنی ان کاوشوں
کے سلسلے میں ان کو خواہی نخواہی بہت سے دوسرے
امور کی طرف بھی متوجہ ہونا پڑا اور بہت سے مذہبی
مسائل بھی بحث و گفتگو کا موضوع بنے۔ مقاصد تہذیب
الاخلاق کا بیان کرتے ہوئے وہ لکھتے ہیں:

"اسٹیل اور ایڈیسن کو اپنے زمانہ میں
ایک بات کی بہت آسانی تھی کہ ان کی تحریر

اور ان کے خیالات جہاں تک کہ تھے تہذیب
وشائستگی وحسن معاشرت پر محدود تھے۔
مذہبی مسائل کی چھیڑ چھاڑ ان میں کچھ نہیں
تھی۔ ہم بھی مذہبی خیالات سے بہت بچنا
چاہتے ہیں مگر ہمارے ہاں تمام رسمیں اور
عادتیں مذہب سے ایسی مل گئی ہیں کہ
بغیر مذہبی بحث کیے ایک قدم بھی تہذیب و
شائستگی کی راہ میں نہیں چل سکتے۔ جس بات
کو کہو کہ چھوڑو، فوراً جواب ملے گا کہ مذہباً
ثواب ہے اور جس بات کو کہو کہ سیکھو، اس
وقت کوئی بولے گا کہ مذہباً منع ہے۔ پس
ہم مجبور ہیں کہ تہذیب وشائستگی اور حسن
معاشرت کے سکھانے میں ہم کو مذہبی بحث
کرنی پڑتی ہے۔

مذہبی بحث کا ایک عجیب سلسلہ ہے
کہ ایک چھوٹی سی بات پر بحث کرنے کے لیے
بڑے بڑے مسائل اور اصول مذہب بحث
میں آجاتے ہیں اور اس لیے لاچار ہم کو
کبھی فقہ سے بحث کرنی پڑتی ہے اور کبھی
اصول فقہ سے اور کبھی حدیث سے بحث کرنی
ہوتی ہے اور کبھی اصول حدیث سے۔ اور
کبھی تفسیر سے بحث کرنی ہوتی ہے اور
کبھی اصول تفسیر سے۔ پس ہندوستان
میں صرف اسٹیل اور اڈیسن ہی کی ضرورت
نہیں ہے بلکہ مقدس لوتھر کی بھی بڑی
حاجت ہے۔"

ان کی اس طرح کی کوششوں کو نہ صرف شک
و شبہ کی نظر سے دیکھا گیا۔ بلکہ ان کے سلسلہ میں اس
قوم کی طرف سے شدید ردعمل کا بھی اظہار ہوا جس
کی فلاح کے جذبات سے ان کا دل معمور تھا اور جس
کی رفتار کی بحالی کے لیے انھوں نے خود کو دامے، درمے،
قدمے، سخنے وقف کر دیا تھا۔ انھیں دائرہ اسلام سے
خارج قرار دیا گیا، کبھی کرسٹان کہہ کر پکارا گیا، کبھی
انگریزوں کا ایجنٹ کہا گیا اور ان کے تصورات کو مذہب
کے منافی اور اسلام دشمن کہہ کر ان کے خلاف اشتعال
پیدا کرنے کی کوشش کی گئی۔ یہ درست ہے کہ انھوں
نے بہت سی وہ باتیں کہیں اور کہیں جو اس دور کے عام
اور عوامی تصورات سے مختلف تھیں۔ صدیاں گزرنے
کے ساتھ بہت سے رواج اور تہذیبی امور مذہب کا
جز تصور کیے جانے لگے تھے۔ سرسید نے ان کو مذہب
سے الگ کر کے دیکھنے پر زور دیا۔ سرسید نے اس
پر بھی زور دیا کہ نصوص قرآنی اور احادیث کی روشنی
میں علمائے سلف نے جو رائیں قائم کی تھیں وہ اپنے
زمانے کے احوال و کوائف کے مطابق تھیں اور ہم
ان کی کورانہ تقلید کے مکلف نہیں ہیں۔ ہمیں اپنے دور
کے تقاضوں کی روشنی میں ان احکام کو سمجھ کر اپنی
رائیں قائم کرنے کا حق حاصل ہے۔ انھوں نے اس
بات پر خاص طور سے زور دیا کہ اسلام عین فطرت
ہے۔ اس لیے اس کے جملہ احکام اور اس کی تعلیمات
مطابق عقل ہیں۔ اگر عقل واستدلال سے ہم ان کو
سمجھیں اور دوسروں کو سمجھائیں تو اس سے اسلام
کی حقانیت ثابت ہوگی۔ قرآن کی بہت سی تشریحات
اور تعبیرات علوم یونانی کی روشنی میں کی گئی تھیں،
ان علوم کی صداقت مشتبہ ہو چکی ہے اور ان کی افادیت
بھی باقی نہیں رہ گئی ہے۔ اس لیے ان پر مبنی تعبیرات
کا ازسرنو جائزہ لینے کی ضرورت ہے اور ضروری
ہے کہ جو تعبیرات آج کے مسلمات پر پوری نہ اتریں
ان کو مسترد کر دیا جائے۔ خطبات احمدیہ میں انھوں
نے لکھا:

قرآن مجید کی نسبت بھی جس کے ہر ایک
لفظ کو مسلمان وحی مانتے ہیں، مذہب اسلام
میں جس قدر آزادی حاصل ہے، کسی دوسرے

مذہب میں نہیں ہے۔ ہم نے قرآن مجید
کے سچ ہونے کو بھی اس کے سچ ہونے سے مانا
ہے۔ ٹھیٹ مذہب اسلام کی رو سے ہر
ایک شخص کو آزادی ہے کہ خود قرآن مجید
کے احکام پر غور کرے اور جو ہدایتیں اس
میں پاوے اس پر عمل کرے۔ کوئی شخص
کسی دوسرے کی رائے اور اجتہاد اور
سمجھ کا پابند نہیں ہے۔"

ان کی یہ طرزِ فکر دراصل ان کی گہری
مذہبیت کی دین تھی۔ اور اس کے پیچھے تحفظ مذہب کا
احساس کارفرما تھا۔ علوم جدیدہ کی یلغار، مغربی عقلیت
پرستی کے رجحانات کی عام مقبولیت اور پھر عیسائی
مشنریوں کی جارحانہ یورش اور تبلیغی کوششیں ایسے
عوامل تھے جن کا سامنا اسلام کو تھا۔ اسلام کو بہت
سی ان باتوں کے لیے بھی بدنام کیا جا رہا تھا جن کا
تعلق اسلام سے نہ تھا۔ بلکہ رسم و رواج کی وجہ سے وہ
باتیں مسلمانوں کی زندگی کا جزو بن گئی تھیں۔ سرسید
اسلام کی حقیقی، منقح اور منور صورت پیش کرنا چاہتے
تھے، اسی جذبے نے ان سے خطبات احمدیہ لکھائی۔ یہی
جذبہ رسالہ ابطال غلامی، تفسیر السمٰوات، تبیین الکلام
وغیرہ لکھنے کا محرک ہوا۔ بقول حالی:

"ہمارے نزدیک جہاں تک کہ ان کی لائف
شہادت دیتی ہے اور جس قدر کہ ان
کے حالات، افعال اور اقوال سے ظاہر
ہوتا ہے، ان کی تمام تر ترقیات کا منبع
ان کے کل مقاصد عالیہ کا محرک اور ان کی
ہر منزل کا رہبر مذہب کے سوا اور
کوئی چیز قرار نہیں پا سکتی۔"

ان کی اس سچی مذہبیت نے ان کو وہ
آزادی فکر اور آزادی رائے اور جرأت وبیباکی عطا
کی کہ انھوں نے سخت ترین مخالفتوں کے طوفان میں
بھی اپنی بات کو بانگ دہل کہنے میں باک نہیں کیا۔
انھوں نے حکومت کے جبر و تعدی کا خیال کیے بغیر اپنے سچے
اور دلی خیالات کا اظہار کیا۔ انھوں نے اپنی حقیقی رائے
ظاہر کرنے میں نہ کسی اور رعایت کو مدنظر رکھا، نہ خوف و
خطر سے گھبرائے۔ ۱۸۵۷ء کی رستخیز بے جا کے بعد جب
ہنگامۂ دار و گیر برپا تھا، معمولی سی معمولی شبہ پر
لوگوں کو سخت ترین سزائیں دی جا رہی تھیں، املاک
و اموال ضبط ہو رہے تھے اور بے دریغ پھانسیاں
دی جا رہی تھیں، اس وقت سید احمد خاں نے رسالہ
"اسباب بغاوت ہند" لکھ کر جس جرأت کا ثبوت دیا
اس کی مثال مشکل سے ملے گی۔ انھوں نے واشگاف
طور پر حالات کا تجزیہ کیا، ان غلط اقدامات اور پالیسی
کی نشان دہی کی جو فاتحین نے اختیار کی تھیں، حکومت
کو ہندوستانی مزاج اور تہذیب کی طرف توجہ دلائی
جس کو نظر انداز کرنے کی وجہ سے ناراضگی پھیلی اور
ان بہت سے الزامات کی پرزور تردید کی جو جوش
غضب میں حکومت کی طرف سے "رعایائے ہندوستان"
پر لگائے جا رہے تھے۔ انھوں نے حکومت انگلستان
سے پرزور اور مدلل انداز میں مطالبہ کیا کہ ہندوستانیوں
کو ان تمام مجالس اور اداروں میں نمائندگی ملنی
چاہیے جو اہل ہند کے لیے قوانین وضع کرنے کے
ذمہ دار ہیں۔ یہ شاید پہلی آواز تھی جو جمہوری حق
کے لیے کسی ہندوستانی نے اٹھائی۔ بڑی ناانصافی
اور حق ناشناسی ہوگی اگر اسے اس درخت کا بیج
نہ تصور کیا جائے جو آگے چل کر تناور ہونا شروع
ہوا تو نیابت گی، حق رائے دہندگی، ہوم رول
مکمل آزادی وغیرہ اس سے متفرع ہوئے۔ پھر
انھوں نے یہ نہیں کیا کہ اس رسالے کو لکھ کر دہ خاموشی
سے رکھ لیتے یا اپنے اہل قوم میں شائع کرتے کہ ان کو
عوامی مقبولیت حاصل ہوتی بلکہ انھوں نے اس کو
انھیں لوگوں کو روانہ کیا جو اس تنقید کا ہدف تھے۔

یعنی حکومت انگلستان اور وہاں کے ممبران پارلیمنٹ۔ اس
میں سخت خطرات تھے۔ دوستوں نے ازراہ خیر خواہی ان
کو اس فعل سے باز رکھنا چاہا، لیکن وہ اپنے ارادے
سے نہیں ہٹے۔ اس لیے کہ اس تحریر سے ان کا مقصد
عوام میں اشتعال پھیلانا تھا، نہ ان کی حمایت حاصل
کرنا، نہ ان کو بغاوت پر اکسانا بلکہ جو غلطیاں سرزد
ہو چکی تھیں اور زبردست قومی نقصان ہو چکا تھا اور
برابر ہو رہا تھا اس کے تدارک کی سبیل کرنا تھی، جو
تباہی ہو چکی تھی اس کی تلافی کرنا تھی اور اس زبردست
بربادی کے بعد قوم کی باز تعمیر کرنا تھی۔ سچ پوچھیے تو
یہیں سے ان کا قومی شعور ابھرنا شروع ہوا۔ قومی
دردمندی اور دل سوزی کے وہ جذبات پیدا ہونا
شروع ہوئے جنھوں نے ان کو تاحین حیات مضطرب
و بے چین رکھا۔ اس دلسوزی کے احساس کو انھیں
کی زبان سے سنیے:

"میں نے صرف اس خیال سے کہ کیا راہ ہے
جس سے قوم کی حالت درست ہو، دور دراز
سفر اختیار کیا اور بہت کچھ دیکھا جو دیکھنے
کے لائق تھا۔ میں آپ کو یقین دلاتا ہوں
کہ جب میں نے کوئی عمدہ چیز دیکھی، جب کبھی
عالموں اور مہذب آدمیوں کو دیکھا، جب
کبھی علمی مجلسیں دیکھیں، جہاں کہیں عمدہ
مکانات دیکھے، جب کبھی عمدہ پھول دیکھے
جب کبھی کھیل کود عیش و آرام کے جلسے
دیکھے، یہاں تک کہ جب کبھی کسی خوبصورت
شخص کو دیکھا، مجھ کو ہمیشہ اپنا ملک اور
اپنی قوم یاد آئی اور نہایت رنج ہوا کہ
ہائے ہماری قوم ایسی کیوں نہیں؟ جہاں
تک ہو سکا ہر موقع پر میں نے قومی ترقی
کی تدبیروں پر غور کیا...."

سرسید کی زندگی کا نصف حصہ (یعنی
۱۸۵۷ء کے بعد کی پوری زندگی) اسی مقصد
کے حصول کی لگن، اس کے لیے ان تھک کوشش
اور تدبیر گری میں گزرا۔ وہ چاہتے تھے کہ ان
کی قوم۔ بالعموم ہندوستانی اور بالخصوص
مسلمانان ہند۔ علوم و فنون، تہذیب و شائستگی
اور دنیاوی جاہ و حشمت کے اعلیٰ ترین درجہ
پر فائز ہو اور یورپی اقوام سے جو اس وقت
ان تمام امور میں بہترین نمونے پیش کر رہی تھیں
کسی طرح پست تر نہ رہے اور اپنے قومی تشخص
کو برقرار رکھتے ہوئے، ملک میں ایک باعزت
زندگی گزار سکے۔ انھوں نے اپنی علمی جد و جہد کے
ساتھ اپنے قلم کا بھی بھرپور استعمال کیا اور تقریر
و تحریر کے ذریعے برابر اپنے خیالات کا اظہار و ابلاغ
کرتے رہے۔ ان کی تحریریں نہ صرف ہمارے ادبی
سرمایہ کا بیش بہا حصہ ہیں، بلکہ ان تحریروں کا
پیغام آج بھی ہمارے لیے راہ نما بن سکتا ہے۔

نوٹ:
یکم جون کے شمارہ میں مولانا تقی امینی صاحب
کی "دھرم سمیلن میں تقریر" عبارت کتابت میں
چھوٹ گئی ہے۔ اس کو اس طرح پڑھا جائے

"جو چیز انکشاف حقیقت کی حیثیت رکھتی ہے وہ
ہمیشہ باقی رہتی ہے اور اسکی روشنی میں زندگی اور
سماج کا مطالعہ ہوتا رہتا ہے۔ اور جو چیز محض سماجی
عمل کی حیثیت رکھتی ہے وہ اس وقت تک باقی رہتی
ہے جب تک سماج اس کی اجازت دیتا ہے اور اگر اس
کی جگہ کوئی اور عمل یا طریقہ اختیار کر لیا گیا تو پھر وہ
چیز تاریخ بن جاتی ہے۔"

محمد الیاس صدیقی

رسومات اور مسلمان

مولانا محمد الیاس صاحب صدیقی کا یہ مضمون دو تین ماہ گزرے ہم کو ملا تھا۔ مضمون مضامین کے فائل میں رکھ دیا گیا۔ چونکہ صرف ایک ورق تھا، اس لیے مضامین میں گم ہوگیا اور نظروں سے اوجھل ہوگیا۔ اب ۱۶ جون کے شمارہ میں اشاعت کے لیے دیا جارہا ہے۔ مولانا محترم سے اس تاخیر پر معذرت خواہ ہوں۔

مسلمان جن غیر اسلامی رسوم ورواج میں مبتلا ہیں۔ راقم کا خیال ہے کہ جب تک ان کی نشاندہی نہ کی جائے اور مدلل مضامین نہ لکھے جائیں اس وقت تک مسلمانوں کے کان پر جوں تک نہ رینگے گی اور یہ بھی ہے کہ جب رسم ورواج کی اصلاح کے لیے کوشش ہوگی، اس کو ناپسند کیا جائے گا سرسید نے سیکڑوں کی گالیاں سنیں۔ ان کو کافر و مردود کہا گیا لیکن جو راہ انھوں نے اختیار کی اس کو ترک نہ کیا۔ نہ معلوم ہم اس استقامت کا ثبوت دے سکیں گے یا نہیں۔ لیکن ہم مولانا سے درخواست کریں گے کہ وہ ان رسوم ورواج کا بھی ذکر فرمائیں جو معاشرے کو گھن کی طرح کھا رہی ہیں۔ لیکن محتاط انداز میں۔ اور ان رسومات کا ذکر ہو جن کا تعلق مذہب سے نہ ہو۔

— مدیر مسئول

دنیا کے ہر ملک، ہر قوم اور ہر مذہب میں کم و بیش رسومات پائی جاتی ہیں۔ جن کا تعلق مذہب سے کم، آب وہوا، کلچر، تہذیب، اور معاشرے سے زیادہ ہوتا ہے۔ لیکن آج کل مسلمانوں نے اپنی بہت سی رسوم کو جزو مذہب سمجھ لیا ہے۔ ظاہر ہے اس سے مذہب کی بنیاد کمزور ہوتی ہے اور اعتقاد ضعیف ہوتا ہے۔

مسلمانوں میں پائی جانے والی ان رسومات کو موٹے طور پر دو حصوں میں تقسیم کیا جا سکتا ہے ایک وہ جو اونچے طبقہ میں رائج ہیں۔ دوسرے وہ جو اوسط اور نچلے طبقے میں پائی جاتی ہیں۔

اونچی فیملی میں رائج رسومات سودیشی کم اور بدیشی زیادہ ہیں۔ بدیشی سے میرا مطلب یہ ہے کہ جو حکمراں طبقہ سے آئی ہیں۔ تاریخ شاہد ہے کہ لودھی دور حکومت تک سلاطین کے یہاں ہندی مسلمان امیر اور درباری کی شکل میں کم ایرانی، تورانی اور افغانی زیادہ تھے مگر مغلوں کے زمانہ میں یہ بات نہیں رہی۔ اس طرح ہندی مسلمانوں کا میل جول حکمراں طبقہ سے ہوا اور وہ ساری رسومات جو مغل اپنے یہاں سے لائے تھے یا یہاں دولت کی بھرمار نے ان میں پیدا کیا، اسی

طبقہ کے ذریعہ باہر آئیں۔ اور ان لوگوں نے اس کو اختیار کرنا حکمرانی کی نشاندہی سمجھی۔ آج آپ کسی ایسے گھرانے کا مشاہدہ کیجیے جو کبھی دولت مند تھا، مگر آج مفلوک ہے۔ تعلق چوں کہ اسی طبقے سے ہے اس لیے شادی بیاہ اسی طبقہ میں ہونا ضروری لہٰذا رسومات بھی وہی۔ نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ ایسے لوگ پیدائش سے لے کر موت تک ایسی خرافات رسوم میں مبتلا رہے جس سے ان کی مالی حالت بد سے بدتر ہوتی جاتی ہے۔ مگر رسومات کے چھوڑنے پر طعن و تشنیع اور بدنامی کا ڈر مجبور کرتا ہے اور جیسے بھی ہو اس کو نباہنا فرض سمجھتے ہیں۔ خواہ کتنی ہی زیر باری کیوں نہ ہو۔

نچلے اور اوسط طبقے میں رائج رسومات ہندو رسومات کو ذرا سا پھیر بدل کر کے اسلامی کرن کر لیا گیا ہے۔ وجہ یہ ہے کہ یہ طبقہ ایسے ماحول میں رہتا ہے جہاں ہندو تہذیب کا اثر زیادہ ہے لیکن اس سے بھی زیادہ صحیح بات یہ ہے کہ یہ طبقہ بیشتر تبدیلی مذہب سے وجود میں آیا ہے خون کے ذرات ابھی باقی ہیں۔ اس لیے اطمینان قلب کا سہارا بھی انھیں طریقوں میں زیادہ ملتا ہے۔ اس طبقہ کے بیشتر رسومات معمولی تغیر و تبدل کے کے ساتھ ہندوؤں جیسے ہیں۔ خواہ وہ مرنے جینے کے ہوں یا شادی بیاہ کے۔ یہ ضرور دیکھنے میں آرہا ہے کہ ۴۷ کے پرآشوب دور کے بعد گاؤں گاؤں میں مساجد اور مکاتب کھلتے جا رہے ہیں۔ اس طرح جدید تعلیم کی پسماندگی فیصدی کے اعتبار سے تو تقریباً بڑھ رہی ہے جو باعث تشویش ہے مگر دینی تعلیم کا اوسط کچھ ضرور بڑھا ہے۔ مثل ہے کہ مصیبت میں خدا یاد آتا ہے۔

شمالی ہند میں جہاں اردو پیدا ہوئی تھی وہاں کی ریاستی حکومتوں نے بہ یک جنبش قلم اسے ختم کر دیا

ع عدو شود سبب خیر گر خدا خواہد

عام مسلمان اس سے مایوس تو ضرور ہوا لیکن احساس ملی نے مجبور کر دیا کہ اپنے مذہبی سرمایہ کو محفوظ رکھنے کے لیے اردو کی بقا کا انتظام کیا جائے۔ دینی تعلیمی کونسل وجود میں آئی اور ہر قریہ و دیہات میں مکاتب کا جال سا بچھتا جا رہا ہے۔ جس سے پرائمری درجہ تک اردو ذریعہ تعلیم سے پڑھائی کا انتظام ممکن ہو جاتا ہے۔ اُن سے اوپر دینی تعلیم کے مراکز بھی کھلتے جا رہے ہیں۔ یہ تو ظاہر ہے کہ جب بدن کا ایک عضو سلب ہوتا ہے تو دوسرے عضو میں قدرتی طور پر تھوڑی طاقت بڑھ جاتی ہے۔ مثلاً ایک نابینا کی قوت سماعت تیز ہوتی ہے تاکہ اس کا کام چلتا رہے۔ مزید برآں تبلیغی جماعتیں برابر مصروف عمل ہیں جو خاص طور سے امر بالمعروف اور نہی عن المنکر پر زور دیتی ہیں۔ انھوں نے بھی جاہلی رسومات کو کم کرنے میں بڑی حد تک مدد کی ہے۔

ایک بڑی قباحت یہ ہے کہ کچھ لوگ بہتیری رسومات کی سرحد مذہب سے جوڑ دیتے ہیں اور انھیں فرسودہ اور بے ہودہ رسومات میں تھوڑا سا مذہب کا رنگ دے دیتے ہیں تاکہ اطمینان قلب کو اور سہارا مل جائے۔ یہ خود غرض عالم محض سستی شہرت اور مقبولیت کے لالچ میں ایسا غلط کام کرتے ہیں اور اسے خاص اسلامی شکل دینے کی کوشش کرتے ہیں جس سے عام اور جاہل آدمی کا رجحان اس طرف ہو جانا مشکل نہیں رہ جاتا۔ ایسی رسومات اور بھی خطرناک اور نقصان دہ ہوتی ہیں کیوں کہ سماجی رسومات سے اعتقاد متزلزل نہیں ہوتا۔ صرف اسراف زر ہی کا نقصان ہے مگر جو رسومات مذہب سے جوڑ دی جاتی ہیں ان سے اسراف زر کے علاوہ اعتقاد کے متزلزل ہونے کا زیادہ خطرہ رہتا ہے جس سے کم ہمتی اور احساس کمتری کا پیدا ہونا یقینی ہو جاتا ہے جو کسی فرد سے بڑھ کر قوم کے لیے خطرناک ہوتا ہے۔

آج ہم اسی دور سے گزر رہے ہیں فضول رسومات ہماری رگ و پے میں سرایت کیے ہوئے ہیں

باقی صفحہ نمبر ۳۰ پر

(سر) سیّد احمد خاںؒ کے رفیق

مشتاق حسین (وقار الملک)

انگریزوں کی حکومت کے دور میں مسلمانوں میں جن رہنماؤں نے بیداری پیدا کی اور جدید تعلیم حاصل کرنے کی طرف ان کو متوجہ کیا، ان میں سید احمد خاں (سرسید) سب سے پہلے فرد تھے۔ ان کے متعدد رفیق تھے جنھوں نے ان کی تحریک کو ترقی دینے میں اپنا وقت صرف کیا۔ انھوں نے مسلمانوں میں بدلے ہوئے حالات کو سمجھنے کی صلاحیت پیدا کی اور ان کو جدید تعلیم حاصل کرنے کی طرف متوجہ کرتے رہے۔ ان میں سید مہدی علی (محسن الملک) اور مشتاق حسین (وقار الملک) قابل ذکر ہیں۔ بیسویں صدی شروع ہونے تک ملک کے حالات بدل چکے تھے۔ مسلم دانشور جنھوں نے جدید تعلیم حاصل کی وہ جدید سیاسی و ملکی حالات سے متاثر تھے۔ مسلمانوں میں انھوں نے سیاسی بیداری پیدا کی اور ان میں قابل ذکر حسرت موہانی، مولانا ابوالکلام آزاد، مولانا محمد علی مولانا شوکت علی، مولانا ظفر علی خاں ہیں۔

اس وقت مسلمانوں میں دو رجحان عام تھے ایک تو یہی (سر) سید احمد خاں کا۔ یعنی جدید تعلیم حاصل کرو اور حکومت وقت سے فائدہ اٹھاؤ۔ دوسرا رجحان یہ تھا کہ جدید تعلیم تو حاصل کرو لیکن حکومت وقت کی شاطرانہ چالوں کے خلاف آواز بھی اٹھاتے رہو۔ اس دوسرے رجحان کے لیڈر اس دور میں زیادہ مقبول ہوئے۔ مشتاق حسین جو سرسیّد کے رفیق تھے ان کی زندگی میں یہ دوسرا رجحان مسلمانوں میں مقبول ہوگیا تھا اور مشتاق حسین کی کارگزاریاں علی گڑھ کی درسگاہ تک بیشتر محدود رہ گئی تھیں۔ اس دور میں ایک اور عظیم شخصیت مولانا شبلی نعمانی کی تھی۔ یہ تھے تو سید احمد خاں کے زمرہ میں لیکن بیسویں صدی کے رجحانات کی تائید کرتے تھے۔ گو ان کا وقت علمی کاموں کے لیے وقف تھا لیکن وہ حکومت وقت سے غیر مشروط مفاہمت کے خواہاں نہ تھے۔ مشتاق حسین کا انتقال اکتوبر ۱۹۱۷ء میں ہوا۔ گو ان کی مقبولیت مسلمانوں میں کم ہوگئی تھی، لیکن مشتاق حسین (وقار الملک) ایک بڑے زبردست کردار کے مالک تھے۔ ان کی زندگی کے حالات مختصراً یہاں پیش کیے جاتے ہیں۔

ن م ا

مشتاق حسین نام، امروہہ (ضلع مرادآباد) کے رہنے والے ۱۸۳۹ء/۱۲۵۴ھ میں پیدا ہوئے۔ والد کا نام شیخ تفضل حسین ہے۔ ان کے اجداد میں ایک بزرگ دیوان عبدالمومن خاں تھے۔ جو شاہجہاں

بادشاہ کے عہد میں دیوان تن کے عہدے پر ممتاز تھے
یہ عہدہ وزارت سے کم نہ تھا۔ شاہی بجٹ اور منصب و
جاگیر کی عطا و ترقی اسی عہدے سے متعلق تھی۔ مشتاق
حسین کمبوہ خاندان سے تعلق رکھتے تھے۔ والد کا انتقال
ان کی شیر خوارگی کے زمانے میں ہوگیا تھا۔ والدہ نے تربیت
کی۔ رسمی تعلیم سے فارغ ہو کر سب سے پہلے اسی سرکاری
مدرسے میں جہاں خود تعلیم حاصل کی تھی ۱۸۵۹ء میں
ملازم ہوئے۔ ۱۸۶۰ء میں سخت قحط پڑا۔ جابجا محتاج
خانے قائم ہوئے۔ امروہے کے محتاج خانے کا انتظام ان
کے سپرد ہوا۔ اس کے بعد عدالت صدر الصدور علی گڑھ
میں سررشتہ دار اور پھر منصرم ہوئے۔ ۱۸۷۳ء میں
تحصیلداری کا امتحان پاس کر کے نائب تحصیلدار ہوئے۔
گورنمنٹ نے علی گڑھ کی میونسپلٹی کا ممبر بھی مقرر کر دیا۔
۱۸۷۴ء میں سرسید کے ساتھ گورکھپور، بستی وغیرہ
کے قحط کا انتظام کیا۔

مشتاق حسین سرکاری ملازمت کے علاوہ سرسید
کے ساتھ قومی کام بھی کرتے رہے۔ ۱۸۶۶ء میں سائنٹفک
سوسائٹی کے ممبر منتخب ہوئے۔ ۱۸۶۷ء میں ایک مدرسہ
مفید الخلائق جاری کیا۔ ۱۸۶۹ء میں سررشتہ تعلیم کے
ممبر ہوئے اور مدارس ضلع کے نگراں رہے۔ اسی سال
مشتاق حسین بطور خود کثیر چندہ جمع کر کے ایک یونانی
شفاخانہ اور دواخانہ جاری کیا۔ ۱۸۷۰ء میں رسالہ
تہذیب الاخلاق جاری ہوا تو اس میں مضامین لکھے
اور اکثر لکھتے رہے۔ ۱۸۷۱ء میں جب سرسید نے
کمیٹی خواستگار تعلیم مسلمانان کی طرف سے ایک مضمون
لکھوانے کا اعلان کیا تو مشتاق حسین نے بھی مضمون
لکھا اور اس پر دوسرے نمبر کا انعام دیا گیا۔ سوسائٹی
اور اس کے پریس اور تہذیب الاخلاق کا انتظام بھی
مشتاق حسین کے سپرد تھا۔

۱۸۷۴ء میں حیدرآباد کے مدار المہام
سرسالار جنگ اول کو سلطنت دکن کے لیے بہترین مدبروں
کی تلاش ہوئی۔ سرسید سے بھی مشورہ کیا۔ انھیں کی سفارش
سے مولوی مہدی علی مرحوم کمبوہ وقار الملک بھی حیدرآباد گئے
اس سے پہلے یہ واقعہ پیش آیا کہ وقار الملک نماز کے نہایت
پابند تھے۔ کچہری میں جب ظہر کی نماز کا وقت آتا اٹھ کر
نماز پڑھنے چلے جاتے۔ علی گڑھ میں جب یہ صورت پیش آئی
تو مسٹر کالون کلکٹر نے روکا۔ مشتاق حسین نے نہ مانا۔ کلکٹر
نے ضد کی۔ انھوں نے استعفیٰ دے دیا۔ لیکن اس
قصور پر برخاست کرنا مصلحت کے خلاف تھا، چھ مہینے
کی رخصت دے دی۔ اس عرصہ میں اللہ تعالیٰ نے
رزق کا دوسرا دروازہ کھول دیا۔ ۱۸۷۵ء کے شروع
میں مشتاق حسین حیدرآباد بلالیے گئے۔

وقار الملک مشتاق حسین دوبار حیدرآباد
گئے۔ پہلی بار ۱۸۷۵ء سے ۱۸۷۹ء تک رہے۔ جب حیدرآباد
میں مدار المہام (سرسالار جنگ)، صدر المہام (سرآسمان
جاہ)، امیر کبیر (نواب رشیدالدین خاں) اور ریذیڈنٹ
سر رچرڈ میڈ کے باہم تعلقات خوشگوار نہ تھے اور مولوی
مشتاق حسین کو ان ہی افسروں سے سابقہ پڑتا تھا۔
مولوی مشتاق حسین دیانت، فرض شناسی اور اخلاقی
جرأت میں ایسا مضبوط کیرکٹر رکھتے تھے کہ دنیا کی کوئی طاقت
ان کو مرعوب نہ کرسکتی تھی۔ ایک مرتبہ سرسالار جنگ نے
چاہا کہ نواب صاحب اپنی اصلی رائے کے خلاف سرآسمان
جاہ کے سامنے رائے ظاہر کریں۔ مشتاق حسین نے انکار
کردیا۔ سرسالار جنگ اس پر ناخوش ہوگئے۔ مشتاق
حسین نے فوراً استعفیٰ بھیج دیا اور لکھ دیا کہ میں کل ہی
اپنے وطن جانا چاہتا ہوں۔ لیکن جیسے مشتاق حسین متدین
اور راست باز تھے، ایسے ہی سرسالار جنگ فراخ دل اور
قدر شناس تھے۔ استعفا دیکھ کر نواب صاحب کو بلایا
صاف طور پر اپنی غلطی کا اعتراف کر لیا کہ بیشک مجھے کوئی
حق نہ تھا کہ غلط بیانی پر مجبور کرتا۔ اس ملاقات میں
دونوں پر رقت کا عالم طاری تھا۔ وقار الملک نے
استعفا واپس لے لیا۔ لیکن امیر کبیر اور ریذیڈنٹ وقار الملک

کے مخالف تھے۔ انھوں نے کچھ عرصہ بعد موقع پاکر سر سالار جنگ
پر زور ڈالا کہ اگر مولوی مشتاق حسین برخاست نہ کیے گئے
تو ہماری آپ کی دوستی میں فرق آجائے گا۔ مشتاق حسین
اس وقت رخصت پر وطن آئے ہوئے تھے۔ ان کو اس
بات کا علم ہوا تو فوراً سر سالار جنگ کو لکھا کہ میں نہیں
چاہتا کہ میرے سبب سے آپ لوگوں میں نا اتفاقی ہو اور
ریاست کے کاروبار میں خلل آئے۔ آپ بے تامل مجھے
خدمت سے سبکدوش کر دیجیے۔ میں خوش ہوں گا کہ یہ بھی
مجھ سے اپنی سرکار کی ایک عمدہ خدمت ادا ہوئی۔ چنانچہ مولوی
صاحب کو علیحدہ کر دیا گیا لیکن سر سالار جنگ نے سیکرٹ
سروس فنڈ سے چار سو روپیہ ماہوار مقرر کر دیا اور
وقار الملک علی گڑھ میں بیٹھے ہوئے سرکار نظام کی خدمت
انجام دینے لگے۔ اس عرصہ میں قانون مال گزاری مرتب
کیا اور دفتروں کے قواعد و ضوابط بنائے۔

ساڑھے تین سال کے بعد جب امیر کبیر
کا انتقال ہوگیا اور سر رچرڈ میڈ ریذیڈنٹ چلے گئے تو
سر سالار جنگ نے وقار الملک کو پھر بلا لیا۔ اس موقع
پر سر سالار جنگ نے اپنے قلم سے خط لکھا (مرقومہ ۲۷ جمادی
الاول ۱۲۹۹ھ مطابق ۱۸۸۲ء) فارسی میں خط ہے،
مشتاق حسین کو "عدالت پناہ" القاب لکھا ہے۔ مولوی
صاحب فوراً چلے گئے اور پھر دس بارہ سال خدمت
کر کے سات سو روپیہ ماہوار پنشن پر واپس آئے۔

مولوی مشتاق حسین حیدر آباد میں سر سید کے قومی
کاموں میں اعانت اور خاص کر علی گڑھ کالج کے استحکام
میں امداد کرتے رہے۔ ہزاروں روپے اپنے پاس سے
دیے۔ جب ان کی تنخواہ میں اضافہ ہوتا تھا تو پہلے مہینے
کا اضافہ سر سید کو بھیج دیتے تھے۔ جب سر سید ۱۸۸۸ء
میں حیدر آباد گئے تو ان کے ساتھ دورہ کر کے وہاں
کے امیروں سے چندہ دلوانے کے علاوہ ڈیڑھ ہزار
روپے اپنی طرف سے بتقریب دورہ دعوت پیش کیا
حیدر آباد سے آکر ہمہ تن کالج کی خدمت میں مصروف
ہوگئے۔ کالج کی کوئی عمارت، کوئی شعبہ، کوئی مصرف ایسا نہ
تھا جس میں وقار الملک کی مالی امداد شامل نہ ہو۔

۱۹۱۰ء میں جب ہز ہائی نس سر آغا خاں نے ایجوکیشنل
کانفرنس کے اجلاس ناگپور میں علی گڑھ کالج کو مسلم یونیورسٹی
بنانے کی تجویز پیش کی اور گورنمنٹ کی منظوری کی امید دلائی
تو وقار الملک نے اس کے لیے ایسی جان توڑ کوشش کی کہ
ڈیڑھ سال میں تیس لاکھ روپے کے قریب چندہ جمع کر لیا۔
لیکن اس سخت جسمانی محنت سے ان کی صحت پر بہت بار پڑ گیا
اور اگست ۱۹۱۲ء میں ضعف و علالت کے سبب سے
مستعفی ہوگئے۔ لیکن پھر بھی وہی دھن لگی رہی اور ۱۹۱۵ء
تک ہر قومی و مذہبی تحریک و خدمت میں لگے رہے۔ جنگ
بلقان و طرابلس کے سلسلہ میں مجروحین طرابلس کے لیے اپنے
گاؤں کا ایک حصہ فروخت کر کے ایک ہزار روپیہ چندہ
دیا۔ بنگال کی تقسیم کی تنسیخ، کانپور کی مسجد مچھلی بازار کے
انہدام، ایران میں روس کی مداخلت وغیرہ تمام واقعات
پر بڑی آزادی اور دلیری کے ساتھ اظہار رائے کرتے
رہے۔

وقار الملک اچھے لیڈر کے ساتھ اچھے ادیب بھی
تھے۔ بے ریائی، بے خوفی، سادگی اور صفائی ان کے دل
زبان اور قلم تینوں کے یکساں اور اٹل اصول تھے۔ انھوں
نے تہذیب الاخلاق میں کثرت سے مذہبی و قومی مضامین
لکھے اور آخر عمر تک مختلف اخباروں میں حسب ضرورت لکھتے
رہے۔ ان کی تحریر کا مختصر نمونہ پیش کیا جاتا ہے۔

اگست ۱۹۱۳ء میں مسجد کانپور کی شکست کے سلسلہ
میں بقول وقار الملک "ہنگامہ محشر" برپا ہوا۔ یہی ان کے
مضمون کا عنوان ہے جو انھوں نے اس واقعہ کے متعلق
لکھا تھا۔ اس میں اپنی بے لاگ، اور بے دھڑک رائے لکھتے ہیں۔

" بدمزاج سے بدمزاج حاکم بھی زیادہ عرصہ
تک اپنی بدمزاجی پر قائم نہیں رہ سکتا، اگر
رعایا اپنی آزادی کی حفاظت اعتدال اور استقلال

باقی صفحہ نمبر ۴۳ پر

مقیم الدین بدایونی
ڈپارٹمنٹ آف بزنس ایڈمنسٹریشن
اے ایم یو۔

سرسید کی تعلیمی تحریک اور نظامی بدایونی

مولانا نظامی بدایونی نے محمڈن اورینٹل کالج میگزین وانسٹی ٹیوٹ گزٹ، علی گڑھ مورخہ ۱۵ جولائی ۱۸۹۹ء میں ایک مضمون بعنوان "مدرسۃ العلوم کی نسبت ایک غیر شخص کے خیالات" تحریر کیا تھا۔ یہ وہ زمانہ تھا جب کہ نظامی بدایونی بسلسلہ ملازمت شاہجہانپور میں قیام پذیر تھے۔ جیسا کہ ان کی سوانح حیات "نظامی بدایونی" سے معلوم ہوتا ہے وہ ۱۸۹۰ء سے سرسید کی تعلیمی اور قومی تحریکوں میں دلچسپی لینے لگے تھے لیکن یہ ان کا پہلا مضمون ہے جس میں انھوں نے اپنے خیالات کا اظہار کھل کر کیا ہے اور یہی خیال ان کے آئندہ قومی کاموں کی بنیاد ثابت ہوا۔ انھوں نے اس کے چند ہی سال بعد ملازمت ترک کر کے اپنا ذاتی اخبار "ذوالقرنین" بدایوں سے نکالا اور اس کے ساتھ نظامی پریس کے نام سے ۱۹۰۳ء میں پریس قائم کیا جس کے ذریعہ سے وہ اپنی وفات ۱۹۴۷ء تک ملک اور قوم کی خدمت کرتے رہے ہندوستان کے مسلمانوں کی ترقی کی کوئی ایسی تحریک نہ تھی جس میں انھوں نے بڑھ چڑھ کر حصہ نہ لیا ہو خصوصاً مسلم ایجوکیشنل کانفرنس اور مسلم یونیورسٹی کی بیش بہا خدمات انجام دیں۔ آج جب کہ اس مضمون کو لکھے ہوئے ۸۰ سال ہو چکے ہیں لیکن اس کی اہمیت اور افادیت میں کوئی فرق نہ ہوا۔ اس کو پڑھ کر ہم آج کے حالات کے مطابق اپنی ترقی کا راستہ بنا سکتے ہیں۔

ہمارے اندر جو کمزوری اور نا امیدی کی حالت پیدا ہو گئی ہے، اس کی بہت کچھ اصلاح ہو سکتی ہے۔ اب اصل مضمون شروع ہوتا ہے۔

" اس مضمون میں علی گڑھ کالج کی خوبیوں کی مفصل فہرست لکھنا یا اس کی انتظامی معاملات پر ریمارک دینا مقصود نہیں ہے بلکہ یہ دکھلانا چاہتا ہوں کہ مجھے اس کالج سے جو ایک قسم کی محبت اور ہمدردی ہے اور وہاں کے طالب علموں سے طبیعت قدرتی طور پر مانوس معلوم ہوتی ہے۔ اس کی کیا وجہ ہے۔ میرا خیال ہے کہ ہر مسلمان اگر وہ میری طرح اس معاملہ میں تھوڑی دیر غور کرے گا تو وہ میری طرح سے بلکہ مجھ سے زیادہ کالج کا خیر طلب اور ہمدرد ہو جائے گا۔ مجھے اپنا مضمون شروع کرنے سے پہلے یہ بھی لکھنا ضروری ہے کہ اس مضمون کے لکھنے کا خیال میرے دل میں کیوں آیا۔ ۱۵ مئی ۱۸۹۹ء کو کالج میگزین میں "ایک ... بیرونی طالب علم کے خیالات" کو پڑھ کر میں نے سوچا کہ باوجود اس کے کہ ۱۸۷۵ء سے اب تک ۲۴ برس گزر چکے ہیں، اس عرصہ میں کالج نے نمایاں کامیابی بھی دکھلائی اور سید صاحب مرحوم کے مذہبی خیالات کی مخالفت کی آگ بھی بہت کچھ فرو ہو گئی لیکن اب بھی مسلمانوں کے بہت سے پرانے شہر اور قصبے ایسے باقی ہیں کہ جن کے رہنے والے مسلمان مدرسۃ العلوم کی تعلیم کی قدر نہیں کرتے جیسے کہ اس

جدید طالب علم کی تحریر سے معلوم ہوتا ہے اور خود میری ذاتی واقفیت اس کی تائید کرتی ہے۔ کیونکہ میں بھی اس طالب علم کی طرح ایسے ہی شہر کا رہنے والا ہوں جہاں علی گڑھ کالج اور سید صاحب کے مخالفوں کا ایک بڑا گروہ موجود ہے اور جہاں کے مسلمان شہروں کی یہ حالت ہے کہ صبح سے شام تک بیکار زندگی بسر کریں یا کچہری کے برآمدہ میں مقدمہ بازوں کی باتوں میں دن کاٹیں اور جب شام ہو تو اپنے گھروں پر بیٹھ کر انھیں مقدمات کی گپ شپ کیا کریں یا شادی بیاہ میں بیجا مصارف اور قرض کے لین دین کی تدبیریں سوچیں انھیں بالکل خبر نہیں کہ مہذب دنیا میں ان کی قوم کا کیا درجہ ہے اور اس پر کیا گزر رہی ہے۔ مغربی علوم نہ سیکھنے سے مسلمان کس حال کو پہونچ گئے ہیں اور قومی تعلیم کیا چیز ہے اور وہ کس طرح حاصل ہو سکتی ہے۔ یہی وہ باتیں ہیں جن پر غور کرنے سے میرے دل نے اس بات کا فیصلہ کر دیا مدرستہ العلوم ہی مسلمان بچوں [illegible] آپ ایسا تعلیمی گھر ہے کہ جہاں کی تعلیم سے [illegible] حاصل کر سکتے ہیں ترقی سے میرا یہ مطلب نہیں ہے کہ بہت سے مسلمان ملازمت میں اعلیٰ درجہ حاصل کر لیں یہ تو صرف فروعی ترقی ہے۔ اصلی ترقی یہ ہے کہ یہاں کی تعلیم سے مسلمانوں میں ایک قسم کی روشن خیالی اور روشن دماغی پیدا ہو جائے اور وہ اس بات کو سمجھنے لگیں کہ ہم تنزل کی حالت میں ہیں اور یہی ترقی کی پہلی منزل ہے۔ یہ اسی کالج کی تعلیم کا اثر ہے کہ یہاں کے طالب علم باہم اعلیٰ درجہ کا خلوص اور سچی محبت رکھتے ہیں۔ اس کی وجہ کیا ہے۔ صرف یہی کہ کالج نے ان سب کو ایک رنگ میں رنگ دیا ہے یعنی ان سب کا مقصد ایک ہی ہے۔

....

بقیہ رسومات اور مسلمان

جس سے ہماری اولوالعزمی، بلند حوصلگی ختم ہوتی جا رہی ہے۔ رسومات سے جو سب سے بڑا نقصان ہے وہ یہی ہے۔ وحدانیت کا قایل ہر مسلمان ہے مگر عملی طور پر ایسا نہیں ہے۔ جس سے انھیں فضولیات میں مشغول و مصروف ہو جانا ضروری ہو جاتا ہے اور خدا کی صفات فراموش ہو جاتی ہیں اور اس کی جگہ پر غلط عقائد آ جاتے ہیں جو قوم کو گھن کی طرح کھا جاتے ہیں جو زندہ رہتے ہوئے بھی مردہ ہو جاتی ہے اور دنیا میں سوائے ذلت کے کچھ ہاتھ نہیں آتا۔

اب سوال یہ ہے کہ ایسی حالت میں کیا کرنا چاہیے۔ وہ رسومات جو جہالت کی پیداوار ہیں یا جن کا رشتہ مذہب سے جوڑ دیا گیا ہے ختم کیا جائے۔ اسلام نے وحدانیت کا جو تصور پیش کیا ہے اس میں ان کا قطعی گزر نہیں ہے۔ بقول غالب کے

ہم موحد ہیں ہمارا کیش ہے ترک رسوم
ملتیں جب مٹ گئیں اجزائے ایماں ہو گئیں

غالب جیسے آدمی نے یقیناً اسے پہچان لیا تھا، جس کی نشاندہی اسلام نے کی تھی اسلام ایک سادہ اور فطری مذہب ہے جس میں دوسری آرائشوں کی قطعی گنجائش نہیں ہے۔

تکلف سے بری ہے حسن ذاتی
قبائے گل میں گل بوٹا کہاں ہے

بہرحال اگر ہندی مسلمانوں کو خود اعتمادی سے سرفراز ہونا ہے تو رسومات کی اس دلدل سے نکلنا ہوگا تاکہ وہ اپنے حقوق کو منوانے کے اہل ہو سکیں۔

عزم و جزم

تہذیب الاخلاق بابت ماہ رمضان ۱۲۹۷ھ

یہی ایک شے ہے جو انسان کو دین و دنیا دونوں میں کامیاب کرتی ہے، مگر یہ ایک دوسری چیز کا نتیجہ ہوتا ہے، جس کو مسٹر فاسٹر نے ڈسیژن آف کیریکٹر یعنی تصفیۃ العمل سے تعبیر کیا ہے۔ یعنی اس بات کا فیصلہ کہ میں کیا ہوں گا اور کیا کروں گا۔ درحقیقت انسان کے لیے اس کا فیصلہ نہایت ضرور ہے۔ بلکہ جب انسان بچپن کی حالت میں ہوتا ہے اور اس امر عظیم کا فیصلہ خود کرنے کے لائق نہیں ہوتا تو اس کے مربیوں کا فرض ہے کہ وہ خود اس کے لیے اس کا فیصلہ کریں اور جب وہ خود اس امر کے فیصلے کے لائق ہو تو اس کو اختیار ہوگا کہ خواہ اسی فیصلے کو بحال رکھے اور چاہے منسوخ کرکے خود اس کا فیصلہ کرے۔ تمام سویلائزڈ ملکوں میں ایک عام رواج ہے کہ جب بچہ تعلیم پانے کی عمر کو پہنچتا ہے تو اس کے مربی اس امر کا فیصلہ کرتے ہیں اور اس فیصلے کے مطابق اس کی تعلیم و تربیت کا بندوبست کرتے ہیں، مگر افسوس ہے کہ ہمارے ملک اور بالتخصیص ہماری قوم کے بزرگوں کو اس بات کا کہ وہ اپنی اولاد کے لیے اس امر عظیم الشان کے فیصلے کی تدبیر کریں، کچھ بھی خیال نہیں ہے۔ وہ پیشہ ور جن کو ہم حقارت سے دیکھتے ہیں، اس بات کا بخوبی تصفیہ کر لیتے ہیں کہ جو ہم ہیں وہی وہ ہوگا۔ بقول شخصے

میراث پدر خواہی علم پدر آموز

مگر ہماری قوم کے ان لوگوں کا کیا حال ہے جو اپنے تئیں اشراف (نسبی اشراف نہ حقیقی اشراف) یا دولت مند، صاحب جاہ و حشم سمجھتے ہیں کیا ان کا بھی یہ خیال ہے کہ جو ہم ہیں، وہی وہ ہوگا؟ اگر یہی ہو تو وہ نہایت غلطی پر ہیں۔

کوئی زمانہ انسان پر ایسا نہیں گزرتا۔ کہ اس کو اس امر کے تصفیے کی حاجت نہ ہو صرف اتنا فرق ہے کہ جس طرح رفتہ رفتہ یہ امر عظیم الشان ہوتا جاتا ہے، اسی کے موافق اس کا تصفیہ بھی اعظم الشان ہوتا جاتا ہے۔ ایک اہل پیشہ کا لڑکا ابتدائی عمر سے اس کا فیصلہ کر لیتا ہے کہ میں وہی ہوں گا جو میرا باپ ہے اور وہی کروں گا جو میرا باپ کرتا ہے۔ ایک طالب علم جو ابتدائی تعلیم شروع کرتا ہے۔ جب تک وہ اس کا فیصلہ نہ کرے کہ میں کیا ہوں گا اور کیا کروں گا ــــــ اس کو تعلیم میں کبھی کامیابی نہیں ہوتی۔ بہت سے طالب علموں کو ہم دیکھتے ہیں کہ وہ کسی قسم کی تعلیم شروع کرتے ہیں اور پھر اس سے گھبرا کر چھوڑ دیتے ہیں۔ اس کا سبب درحقیقت یہی ہوتا ہے کہ انھوں نے اس بات کا کہ وہ کیا ہوں گے اور کیا کریں گے بخوبی فیصلہ نہیں کیا اور اسی سبب سے ان میں عزم جزم پیدا نہیں ہوا جو تمام مشکلات کو آسان کرنے والا اور ہر ایک موقع پر غالب آنے والا ہے۔

اس زمانے کے بعد انسان پر ایک ایسا زمانہ آتا ہے جس میں اس امر کا تصفیہ زیادہ تر عظیم الشان ہو جاتا ہے۔ جب وہ اپنی ضروری تعلیم و تربیت سے فارغ ہوتا ہے اور ایک قسم کی تمیز اور سمجھ حاصل کرتا ہے تب اس کو خود اپنے آپ سے پوچھنا ہوتا ہے کہ میں کیا ہوں گا اور کیا کروں گا۔ اس وقت اس امر کا تصفیہ بلاشبہ نہایت نازک اور عظیم الشان ہو جاتا ہے۔ اگر وہ اس کے تصفیہ پر قادر نہیں ہوتا تو ہمیشہ خراب و خستہ رہتا ہے اور اگر بخوبی تصفیہ کر لیتا ہے اور تصفیے میں کوئی غلطی بھی نہیں کرتا تو اس میں عزم جزم پیدا ہوتا ہے اور ضرور بالضرور وہ اس میں کامیابی حاصل کر لیتا ہے۔ اس سے ثابت ہوتا ہے کہ جو انسان اس بات کا فیصلہ نہیں کر لیتا کہ وہ کیا ہو گا اور کیا کرے گا دنیا میں محض لاشئ ہے۔

بہت سے لوگ ہیں جو اس تصفیے کا مدار عارضی امور پر رکھتے ہیں جیسے کہ ہماری قوم کے رئیسوں اور دولت مندوں کا حال ہے۔ وہ خیال کرتے ہیں کہ جو اتفاقیہ ریاست اور دولت ہمارے ہاتھ آ گئی ہے وہ ہمیشہ ہمارے ہاں رہے گی ان کی اولاد سمجھتی ہیں کہ ہم کو ایسی موروثی جائداد ہاتھ آنے والی ہے کہ جس عیش و آرام سے ہم بسر کرنا چاہیں گے بسر کر سکیں گے اور اس پر وہ یہ فیصلہ کرتے ہیں کہ ہم کو کچھ نہ ہونا چاہیے۔ ہم امیر ہوں گے، رئیس ہوں گے، تعلقدار ہوں گے اور راکھیں کے سے کام کریں گے اسی خیال نے ہماری قوم کے رئیسوں اور رئیس زادوں اور تعلقداروں اور تعلقدار زادوں کو ڈبو دیا ہے۔ مگر وہ اس خیال میں بڑی غلطی پر ہیں۔ امور عارضی کو نہ قیام ہے اور نہ وہ ایک حال پر رہتے ہیں اور نہ وہ اس امر کے تصفیے سے کہ میں کیا ہوں گا اور کیا کروں گا کچھ علاقہ رکھتے ہیں۔ یہ سوال عارضی امور سے علاقہ نہیں رکھتا بلکہ انسان کی ذات سے تعلق رکھتا ہے اور وہ یہ پوچھتا ہے کہ میں کیا ہوں گا، یعنی کیا چیز اپنے میں پیدا کروں گا اور پھر جو چیز مجھ میں پیدا ہو گی اس سے کیا کروں گا۔

بہت سے لوگ ہیں جو ہر ایک چیز کا نتیجہ فائدہ مذہبی قرار دیتے ہیں اور اس میں کچھ کلام نہیں کہ فائدہ مذہبی ہر ایک چیز کا ضروری نتیجہ ہونا چاہیے۔ مگر وہ لوگ فائدہ مذہبی کے لفظ کو خاص معنو میں محدود کرتے ہیں اور جب وہ یہ دیکھتے ہیں کہ ایک شخص کو جس نے اپنا اور اپنے عمل کا بخوبی تصفیہ کیا تھا اور اس میں کامیاب بھی ہوا تھا اس کو کچھ نتیجہ اس کا نہیں ملا ہے تو وہ سب امور کو تقدیر پر منحصر کرتے ہیں اور اس بات کے تصفیے کی کہ میں کیا ہوں گا اور کیا کروں گا کچھ ضرورت نہیں سمجھتے۔ اسی خیال نے ہماری قوم کے لوگوں بپست ہمت کر دیا ہے اور عزم و جزم کا مادہ ان میں سے کھو دیا ہے۔ اس مقام پر میں اس مسئلہ میں بحث کرنا نہیں چاہتا۔ مگر میں یہ کہتا ہوں کہ اگر یہی ہو تو بھی دو جدا گانہ باتوں کو غلطی سے مخلوط کر دیا جاتا ہے۔ میں کیا ہوں گا اور کیا کروں گا ایک جداگانہ امر ہے اور اس سے کیا پاؤں گا ایک جداگانہ سوال ہے۔ پس اگر پچھلا سوال تقدیر ہی پر محمول ہو تو پہلے سوال کو پچھلے سوال سے کچھ تعلق نہیں ہے۔

فائدہ مندی کے معنوں کو محدود کرنا سب سے پہلی غلطی ہے۔ بڑی فائدہ مندی اسی میں ہے کہ انسان اس امر کا تصفیہ کرے کہ میں کیا ہوں گا اور کیا کروں گا۔ ایک بڑے فلاسفر کا قول ہے کہ دنیا میں سب سے زیادہ خوش زندگی سور کی سی زندگی ہے اور سب سے زیادہ رنجیدہ زندگی سقراط کی سی زندگی ہے۔ مگر میں اس خوش زندگی کے مقابلے میں اس رنجیدہ زندگی کو پسند کرتا ہوں۔ جو لوگ کہ اپنا اور اپنے عمل کا تصفیہ نہیں

کرلیتے اور اتفاقیہ دولت کو پہنچ جاتے ہیں، بلاشبہ
خوش زندگی بسر کرتے ہیں۔ مگر ان کی وہ خوش زندگی
سور کی سی خوش زندگی ہے جس کو بجز سور کے اور
کوئی انسان پسند نہیں کرسکتا۔ سقراط کی زندگی
جس کو رنجیدہ زندگی سے تعبیر کیا ہے، درحقیقت وہی
خوش زندگی ہے۔ اس زندگی اور دوسری قسم کی
زندگی میں ایسا ہی فرق ہے جیسا کہ روحانی اور جسمانی
چیز میں ہے۔ پس ہر انسان کو اس پچھلی خوش زندگی
حاصل کرنے میں کوشش کرنی اور اس پہلی خوش
زندگی سے پرہیز کرنا واجب ہے۔

قطع نظر اس کے انسان خواہ سور کی
سی خوش زندگی اختیار کرے خواہ سقراط کی سی رنجیدہ
زندگی دونوں کے لیے اس امر کا تصفیہ کہ میں کیا ہوں گا
اور کیا کروں گا ضرور ہے۔ بغیر اس کے انسان کچھ کر
ہی نہیں سکتا۔ نہ وہ سور کی سی خوش زندگی حاصل
کرسکتا ہے نہ سقراط کی سی رنجیدہ زندگی۔ دنیا میں
بہت بڑے بڑے خدا پرست گزرے ہیں۔ جنھوں نے
اپنا عیش و آرام جان و مال اپنی دانست میں خدا کے
لیے صرف کیا ہے۔ دنیا میں بہت بڑے بڑے بادشاہ
گزرے ہیں جنھوں نے عظیم الشان فتوحات حاصل کی
ہیں۔ دنیا میں بہت بڑے بڑے ذی علم گزرے ہیں
جن سے دنیا نے بے انتہا فائدہ حاصل کیا ہے۔ دنیا
میں بہت بڑے بڑے رفارمر گزرے ہیں جنھوں نے
اپنی قوم کی بھلائی و اصلاح میں اپنی جانوں کو بھی
ذائع کیا ہے۔ دنیا میں ایسے بے رحم اور قاتل سفاک
غارت گر گزرے ہیں، جنھوں نے ایسے ایسے بے رحم
کام کیے ہیں جن کو سن کر انسان حیران رہ جاتا ہے
مگر ان میں کوئی بھی ایسا نہیں تھا جس نے یہ تصفیہ نہ
کرلیا ہو کہ میں کیا ہوں گا اور کیا کروں گا۔ پس
سعادت حاصل کرنی چاہو یا شقاوت سب کی جڑ
اس امر کا تصفیہ کر لینا ہے کہ میں کیا ہوں گا اور کیا
کروں گا۔

مسٹر فاسٹر نے کیا عمدہ بات کہی ہے کہ جس
شخص میں اس امر کے فیصلہ کرنے کی قوت نہیں ہے
وہ ان دو سوالوں کا کہ تم کیا ہوگے اور کیا کروگے؟
کچھ جواب نہیں دے سکتا۔ انسان جب کوئی کام کرنا
چاہتا ہے تو مختلف حالتیں اس کو پیش آتی ہیں۔
کبھی وہ یہ سوچتا ہے کہ یہ کام اختیار کرنا چاہیے کبھی
کہتا ہے کہ نہیں۔ جب وہ اس کی خوبیوں پر خیال کرتا
ہے تو اس کے کرنے کا ارادہ کرتا ہے اور جب اس
کی مشکلات پر خیال کرتا ہے تو ڈگمگا جاتا ہے اور قوت
فیصلہ نہ ہونے سے اس کے اختیار کرنے یا نہ کرنے کا
فیصلہ نہیں کرسکتا۔ کبھی ایسا ہوتا ہے کہ چند امور
اس کے سامنے ہوتے ہیں وہ ایک کی بھلائی برائی پر
غور کرتا رہتا ہے۔ مگر قوت فیصلہ نہ ہونے سے ان
میں کسی کو بھی اختیار نہیں کرسکتا۔

سب سے زیادہ مشکل اس کو اس وقت پیش
آتی ہے کہ جب وہ اس گروہ کی جس میں وہ ہے کسی
رسم و رواج کی برائی پر مطلع ہوتا ہے اور اس کو ترک
کرنا یا تبدیل کرنا چاہتا ہے۔ ادھر تو اس کے دل میں
رسم و رواج کی برائی کے خیالات پیدا ہوتے ہیں اور
ادھر اپنے لوگوں کی لعن وطعن اور دوستوں کی ہنسی
اور اغیار کی دل لگی اور اپنے حالات کو نقل محفل ہونے
اور نامہذبوں کی پھبتیوں اور بدطینتوں کی دشنام
دہی کے خیال سے اس کا دل گھبرا جاتا ہے اور قوت
فیصلہ کی کمزوری سے اپنے لیے کچھ فیصلہ نہیں کرسکتا
وہ یہ نہیں جانتا کہ میں کیا ہوں گا اور کیا کروں گا
پس ہماری خواہش اپنی قوم سے اور اپنی قوم کے نوجوانوں
سے یہی ہے کہ بخوبی اس امر کا تصفیہ کریں کہ وہ کیا
ہوں گے اور کیا کریں گے کیوں کہ بغیر اس امر کے تصفیے
کے ان کو کسی قسم کی کامیابی نہیں ہوسکتی۔

ماخوذ از مقالات سرسید۔ مرتبہ مولانا محمد اسماعیل پانی پتی

مسلم یونیورسٹی کے شب و روز

شعبۂ اردو میں ادبی نشست

پاکستان کے مشہور شاعر جناب احمد فراز ور شان الحق حقی صاحب کے اعزاز میں انجمن اردو کے لئے شعبۂ اردو علی گڑھ مسلم یونیورسٹی علی گڑھ کی جانب ۷ ایک استقبالیہ دیا گیا جن میں طلبہ وطالبات اور یونیورسٹی ، مختلف شعبوں کے اساتذہ کی کثیر تعداد نے شرکت کی۔ جلسہ کی صدارت سید حامد صاحب شیخ الجامعہ نے کی۔ جناب احمد فراز۔ شان الحق حقی اور ڈاکٹر معین احسن جذبی نے اپنے کلام سے سامعین کو محفوظ فرمایا۔ آخر میں پروفیسر ثریا حسین صدر شعبۂ اردو نے تمام مہمانوں کا شکریہ ادا کیا۔

سمپوزیم میں مرکزی وزراء کی شرکت

علی گڑھ مسلم یونیورسٹی میں حکومت ہند کی وزارت سیاحت کے تعاون سے غذائی ٹیکنالوجی سے متعلق ایک انسٹی ٹیوٹ قائم ہوگا۔ اس بات کا اعلان مرکزی وزیر سیاحت و شہری ہوا بازی جناب خورشید عالم خاں نے آل انڈیا منیجریم میں صدارتی خطبہ دیتے ہوئے فرمایا بزنس منیجمنٹ پر دو روزہ سمپوزیم آل انڈیا منیجریم "کا اہتمام مسلم یونیورسٹی کے ڈپارٹمنٹ آف بزنس ایڈمنسٹریشن کے تحت علی گڑھ منیجمنٹ ایسوسی ایشن نے کیا تھا جس کا افتتاح حکومت ہند کے وزیر تجارت شری وشوا ناتھ پرتاب سنگھ نے کیا۔

معزز مہمانان اور مندوبین کا خیر مقدم کرتے ہوئے وائس چانسلر جناب سید حامد صاحب نے بتایا کہ اگست ۱۹۸۱ء میں یونیورسٹی کھلنے کے بعد مسلسل ۷۵ فیصد حاضری پر زور دیا گیا۔ موجودہ دور میں ملک کی دوسری یونیورسٹیاں اس کی نظیر پیش نہیں کر سکتیں اور اس کا اعتراف وائس چانسلرس کانفرنس اور وزارت تعلیم دونوں کو ہے۔

آپ نے فرمایا کہ مسلمانوں اور اقلیتوں کے تعلق سے وزیر اعظم نے جن اقدامات کا اعلان کیا ہے اس سے نئے مواقع نکلیں گے اور مسلمان بھی قومی تعمیر کے مہتم بالشان کام میں بھرپور حصہ لے سکیں گے۔

ایم بی اے کے طلباء کو خراج عقیدت پیش کرتے ہوئے آپ نے فرمایا کہ ہمارے یہ طلباء کسی دوسرے ادارہ کے طلبہ سے کسی طرح کم نہیں اور اس جلسہ کا انتظام اور اہتمام ان کی تنظیمی صلاحیت کا بیّن ثبوت ہے۔

مرکزی وزیر تجارت شری وشوا ناتھ پرتاب سنگھ نے اپنی تقریر میں مسلم یونیورسٹی کو زبردست خراج عقیدت پیش کرتے ہوئے قومی زندگی میں اس کے عظیم رول کو سراہا۔ آپ نے فرمایا کہ

ہندوستانی سماج کی ترقی کے لیے لازم ہے کہ سماج
ہر طبقہ کو اس کا مقام ملے۔ آپ نے فرمایا کہ منیجمنٹ
بہترین اصول یہ ہے کہ دستیاب وسائل کا مناسب
تعمال کیا جائے۔ انتظامیہ کی مقصدیت اور اس کا
یح ادراک ہو اور اس کے تحت جو ذمہ داریاں
ر ہوتی ہیں ان کی بھرپور آگاہی ہو۔
مسلم یونیورسٹی کے توسیعی پروگراموں میں
نے اپنی وزارت کے بھرپور تعاون کا یقین دلایا۔
مرکزی وزیر مملکت برائے صنعت و شہری
ابادی جناب خورشید عالم خاں نے اپنی صدارتی
ریر میں یونیورسٹی کے اقلیتی کردار کی بحالی کا تذکرہ
ہوئے اسے ایک قومی یونیورسٹی سے تعبیر کیا۔ آپ
رمایا کہ ملک کے دیگر تعلیمی اداروں میں مسلم یونیورسٹی
لوکرازم کا ایک درخشاں نمونہ ہے۔ آپ نے فرمایا
وم نے ہند اقلیتوں اور بالخصوص مسلمانوں کے
روزگار کے مواقع فراہم کرنے کی اہمیت سے آگاہ
۔ آپ نے فرمایا کہ وزیر اعظم اس مسئلہ کے حل کے
وشاں ہیں اور ابھی حال ہی میں انھوں نے نجی اور
ری زمرہ میں قائم صنعتوں کی اس طرف توجہ مبذول
ی ہے۔

فیکلٹی آف کامرس کے ڈین اور صدر شعبہ
بیسر حفیظ الدین نے اپنی تقریر میں شعبہ کے قیام
اب تک کی سرگرمیوں اور علمی پیش رفت کا جائزہ
اور شعبۂ منیجمنٹ میں ریڈر ڈاکٹر نجم الحسن نے
نار کے اغراض و مقاصد پر روشنی ڈالی۔
اس کانفرنس میں ملک بھر سے منیجمنٹ
ماہرین کے علاوہ صنعت و تجارت سے تعلق رکھنے
ے پچاس سے زائد نمائندگان نے شرکت کی۔

ین یو جی سی مسز مادھوری شاہ کی آمد

یونیورسٹی گرانٹس کمیشن کی چیئرمین شریمتی مادھوری
شاہ نے ۲۰ مئی کو علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کے جواہر لال
نہرو میڈیکل کالج کے اسپتال میں مزید ایک سو پچاس
بستروں کے لیے نئی عمارت کا سنگ بنیاد رکھا۔ اس طرح
اب اسپتال میں بستروں کی کل تعداد پانچ سو ہو جائے
گی۔ نیا وارڈ جدید ترین سامان سے آراستہ ہوگا۔

اس موقع پر مسز شاہ کا استقبال کرتے
ہوئے وائس چانسلر جناب سید حامد صاحب نے
مسلم یونیورسٹی کے ترقیاتی اور توسیعی منصوبوں کے
لیے بروقت اور فراخ دلانہ امداد پر کمیشن کی چیئرمین
کا شکریہ ادا کیا۔ پانچسو طلبا کے لیے زیر تعمیر اقامت
گاہ اور اسپتال کا تذکرہ کرتے ہوئے آپ نے بتایا
کہ یو جی سی نے یونیورسٹی کے تدریسی اور غیر تدریسی
عملہ کی رہائشی عمارات کے لیے دو کروڑ چالیس لاکھ روپیہ
دینے کا وعدہ فرمایا ہے جس سے مکانوں کی قلت
پر بڑی حد تک قابو پایا جا سکے گا۔

اس موقع پر تقریر کرتے ہوئے مسز
شاہ نے یونیورسٹی کے ترقیاتی منصوبوں میں کمیشن کے
بھرپور اشتراک کا یقین دلایا۔ یونیورسٹی میں پانچسو
طلبا کی رہائش کے لیے زیر تعمیر ہاسٹل کا تذکرہ کرتے
ہوئے آپ نے فرمایا کہ مسلم یونیورسٹی نے اس
سلسلہ میں دی جانے والی گرانٹ کو جس طرح استعمال
کیا ہے وہ ایک ریکارڈ کی حیثیت رکھتا ہے اور
دوسروں کے لیے مشعل راہ ہے۔ آپ نے امید
ظاہر کی کہ اسپتال کی تعمیر کے بعد اس کے عملہ کے سامنے
ایک ہی جذبہ ہوگا جسے خدمت سے تعبیر کرتے ہیں۔
آپ نے حفظان صحت، پرسنل منیجمنٹ وغیرہ سے
متعلق نئے کورسز شروع کیے جانے کی اہمیت پر
زور دیا جن کی آج کے عہد میں صنعتی ترقی کے ساتھ
ساتھ اہمیت بڑھتی جا رہی ہے۔

مسز مادھوری شاہ اپنے دو روزہ
قیام کے دوران عبداللہ ہال سروجنی نائیڈو ہال

بھی تشریف لے گئیں۔ دونوں ہالوں میں طالبات نے انھیں شاندار استقبالیہ دیا۔ پانچ ممبروں پر مشتمل یو جی سی کی ایک اہم کمیٹی مسٹر شاہ کی سربراہی میں علی گڑھ آئی تھی اس میں یو جی سی کے وائس چیرمین پروفیسر رئیس احمد اور مسٹر آر کے چھابرا بھی شامل تھے۔

راس مسعود ہال کا سالانہ جلسہ

مسلم یونیورسٹی کے راس مسعود ہال کے سالانہ جلسہ میں مرکزی وزیر مملکت برائے ریلوے جناب سی کے جعفر شریف بحیثیت مہمان خصوصی شریک ہوئے۔

راس مسعود ہال کے سینئر ہال (مانیٹر) مسٹر کمال الدین سلیمان نے اپنی سالانہ رپورٹ میں ہال کی تعلیمی اور تہذیبی سرگرمیوں پر سیر حاصل روشنی ڈالی اور وزیر موصوف کی خدمت میں ایک میمورنڈم پیش کیا جس کے ذریعہ انھوں نے سفر میں طلبا کو پیش آمدہ مشکلات کی طرف توجہ مبذول کرائی۔

اپنی تقریر میں مسٹر جعفر شریف نے بعض مطالبات کے فوری حل کا یقین دلایا۔ تالیوں کی گونج میں آپ نے گومتی ایکسپریس کے علی گڑھ میں رکنے کا اعلان فرمایا۔ کیرالا کرناٹک ایکسپریس اور دکشن ایکسپریس میں علی گڑھ کے طلبا کے لیے برتھوں کا کوٹہ مقرر ہوگا۔ اور علی گڑھ سے گزر کر مشرق کی جانب جانے والی ہر سپر فاسٹ ٹرین میں طلبا کے لیے اضافی برتھ ریزرو رہے گی مخصوص تیوہاروں کے مواقع پر ریلوے کنسیشن کے سلسلہ میں آپ نے فرمایا کہ حکومت نے ہمیشہ ہی طلبا کے تمام جائز مطالبات کو نہ صرف تسلیم کیا ہے بلکہ اس کے حل کے لیے مقدور بھر کوشش بھی کی ہے۔ کنسیشن کے اس مطالبہ پر آپ نے اپنی وزارت کی طرف سے ہمدردانہ غور کا یقین دلایا۔

اپنی تقریر میں آپ نے فرمایا کہ نوجوانوں کے لیے اصل مسئلہ روزگار کی فراہمی کا ہے۔ اقلیتوں اور خصوصاً مسلمانوں کے تعلق سے وزیراعظم نے جن اقدامات کا اعلان کیا ہے، اس کا تذکرہ کرتے ہوئے آپ نے فرمایا کہ تمام اقدامات اس وقت تک کاغذی رہیں گے ہوں گے جب تک آپ جیسے نوجوان اس کے لیے خود کو تیار نہ کریں اور اس میں اپنے حصہ کو حاصل کرنے کے لیے جدوجہد مسلسل نہ کریں۔ آپ نے فرمایا کہ وزیراعظم کی ہدایات کے مطابق ہر سیلکشن بورڈ میں اقلیتوں کا ایک نمائندہ لازمی طور پر شامل ہوگا جو اس پر نظر رکھے کہ انتخاب میں کسی قسم کی بے قاعدگی نہ ہو۔

علی گڑھ کے طلبا کو آپ نے مشورہ دیا کہ وہ تہذیبی سفیر بنیں اور دوسری یونیورسٹیوں کے طلبا سے رابطہ قائم کریں۔ خاص طور پر جنوب کی یونیورسٹیوں میں جائیں اور وہاں کے طلبا کو اپنے یہاں مدعو کریں تاکہ ایک دوسرے کو سمجھنے کا موقع ملے۔

اس جلسہ میں طلبا نے مختلف ادبی و ثقافتی پروگرام پیش کیے۔ جلسہ کی صدارت وائس چانسلر جناب سید حامد صاحب نے فرمائی۔ ہال کی طرف سے منعقدہ مختلف مقابلوں میں کامیاب ہونے والے طلبا کو اس موقع پر وزیر موصوف نے انعامات اور سرٹیفکٹ تقسیم کیے۔

مضامین صاف اور صفحے کی ایک جانب تحریر ہوں۔

خط و کتابت اور ترسیل زر کے لیے پتہ مکمل اور صاف تحریر فرمائیں۔

علی گڑھ مسلم یونیورسٹی، علی گڑھ

داخلہ نوٹس نمبر ۱

تعلیمی سال ۸۴، ۸۳ ۱۹ ء

درجہ گیارہ میں ۱۰+۲ سسٹم کے مطابق داخلہ

قومی طریقہ تعلیم کی تعمیل میں علی گڑھ مسلم یونیورسٹی نے یہ فیصلہ کیا ہے کہ تعلیمی سال ۸۴، ۱۹۸۳ء میں تعلیم کا ۱۰+۲ نظام اختیار کیا جائے۔ اس نئے نظام کو متعارف کرنے کے نتیجے میں سال ۸۳ ۱۹ء میں پری یونیورسٹی درجہ میں کوئی داخلہ نہیں ہوگا۔ یہ فیصلہ کیا گیا ہے کہ سال ۸۳ء سے ۱۰+ ۲ تعلیمی نظام شروع کرنے کے لیے درجہ گیارہ بھی یونیورسٹی میں) ان کے لیے شروع کیا جائے جو ہائی اسکول یا اس کے مساوی امتحان کو پاس کر کے آئیں گے۔ اس لیے ایسے امیدوار جنھوں نے اس یونیورسٹی سے ہائی اسکول کا امتحان پاس کیا ہے یا اس کے مساوی امتحان، ملک کے یا بیرونی ممالک کے کسی ایسے ادارے سے پاس کیا ہو جو اس یونیورسٹی سے تسلیم شدہ ہو اور جو اس میں داخلے کے لیے مطلوبہ کم از کم لیاقت رکھتے ہوں اور ساری شرائط پوری کرتے ہوئے وہ مقررہ فارم داخلے کو بھر کر داخلے کی درخواست دے سکتے ہیں۔ ایسے طالب علم جنھوں نے درجہ گیارہ پاس کیا ہے، انھیں درجہ بارہ میں داخل کیا جائے گا۔ یہ کلاس تعلیمی سال ۸۵- ۸۴ ۱۹ء سے شروع ہوگا۔

تعلیمی نظام ۱۰+ ۲ کے نفاذ کے نتیجے میں موجودہ ہائی اسکول کے امتحان کی جگہ سکنڈری اسکول سرٹیفکٹ امتحان ہوگا۔ درجہ ۱۲ (بارہ) میں کامیابی کے ساتھ تعلیم مکمل کرنے والے طلبہ کو سینیر سکنڈری اسکول سرٹیفکٹ دیا جائے گا اور ایسے طالب علم بی اے (آنرس) بی ایس سی (آنرس) اور بی کام (آنرس) کے تین سالہ ڈگری کورس میں داخلہ کے لیے

با لیاقت تسلیم کیے جائیں گے۔

+۲ اسٹیج پر سینیر سکنڈری کورس کی تفصیلات کے مطلوبہ لیاقت اور کم از کم لیاقت کے لیے داخلہ کے ضوابط وغیرہ انفارمیشن بلیٹن کے ذریعہ نوٹیفائڈ کیے جائیں گے۔ ... کے فارم اور انفارمیشن بلیٹن اسسٹنٹ رجسٹرار (ایڈمیشنز) پوسٹ بکس نمبر 52 علی گڑھ مسلم یونیورسٹی علی گڑھ ۲۰۲۰۰۱ سے یا پرنسپل آف یونیورسٹی اسکولس یا سپرنٹنڈنٹ پبلیکیشن ڈویژن آف دی یونیورسٹی سے مئی ۱۹۸۳ء کے دوسرے ہفتہ سے حاصل کیے جاسکتے ہیں

داخلہ فارم مذکورہ شعبوں سے حاصل کرنے کے لیے مبلغ تین روپیہ نقد یا کراسڈ انڈین پوسٹل آرڈر جس کی ادائیگی فائنس آفیسر علی گڑھ مسلم یونیورسٹی علی گڑھ کے حق میں ہو اس کے ذریعہ ادا کرنا ہوگا۔ جو امیدوار درخواست کے فارم ڈاک کے ذریعہ حاصل کرنا چاہتے ہیں وہ درخواست فارم کے لیے اپنا ایک پتہ لکھا ہوا ۱۲ + ۲۸ سینٹی میٹر کے سائز کا ایک لفافہ جس پر مبلغ ۱/۷۵ (ایک روپیہ پچھتر پیسے) کا پوسٹل ٹکٹ چسپاں ہو، بھیجنا ہوگا۔ ایسی حالت میں اگر کوئی امیدوار درخواست کا فارم رجسٹرڈ ڈاک سے منگانا چاہتے ہیں تو انھیں خود کا پتا لکھا ہوا مذکورہ لفافہ پر ۴/۵۰ (چار روپیہ پچاس پیسے) کا پوسٹل ٹکٹ چسپاں کرکے بھیجنا ہوگا۔ اگر ایک سے زیادہ درخواست کے فارم مطلوب ہوں تو درخواست کے ساتھ ہر فارم کے لیے الگ الگ ٹکٹ لگا کر اپنا پتہ لکھا ہوا لفافہ روانہ کریں

پوری طرح سے مکمل بھرے ہوئے درخواست کے فارم مبلغ پانچ روپے (۵/۰۰) رجسٹریشن فیس پر ایک نصاب تعلیم کے لیے لیمنٹن کے لیے الگ الگ کراسڈ انڈین پوسٹل آرڈر کے ذریعہ ادائیگی فائنس آفیسر علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کے حق میں ہو۔ اس کے ساتھ اسسٹنٹ رجسٹرار (ایڈمیشن) پوسٹ بکس نمبر 52 علی گڑھ مسلم یونیورسٹی علی گڑھ ۲۰۲۰۰۱ کے پاس

۷ جولائی ۱۹۸۳ء کو شام پانچ بجے (۵.۰۰ بجے)

تک یا اس سے قبل پہنچ جانا چاہیے۔ تاریخ مذکورہ کے بعد موصول ہونے والی درخواستوں پر غور نہیں کیا جائے گا۔

دستخط

امین معیدین

پرنٹر پبلشر قاضی معزالدین احمد۔ مطبع لیتھوکلر پرنٹرس علی گڑھ مقام اشاعت۔ صفدر منزل تار بنگلہ اے ایم یو علی گڑھ

کیا
آپ کی روزانہ کی خوراک سے
آپ کے بدن کو پوری قوت اور
پورا فائدہ ہو پاتا ہے؟
سنکارا
ہر موسم اور ہر عمر میں
سب کے لیے بہترین ٹانک
ہمدرد

شمارہ نمبر ۱۳   یکم جولائی ۱۹۸۳ء   جلد نمبر ۲

"انصاف کا مقام ہے کہ جب ہم اپنے سے کمتر اور ناتربیت یافتہ قوموں کو ذلیل اور حقیر مثل جانوروں کے خیال کرتے ہیں تو جو قومیں کہ ہم سے زیادہ شائستہ اور تربیت یافتہ ہیں اگر وہ بھی ہم کو اسی طرح حقیر اور ذلیل مثل جانوروں کے سمجھیں تو ہم کو کیا مقام شکایت ہے، ہاں اگر ہم کو غیرت ہے تو ہم کو اس حالت سے نکلنا اور اپنی قوم کو نکالنا چاہیے۔"

(سر) سیّد احمد

رمضان شریف — سیّد حامد

مذہب کیوں اور کس لیے — سیّد کاظم نقوی

مسلم اقلیت کی مشکلات کا موثر حل — مرتبہ مقتدیٰ حسن ازہری

پاکیزہ جذبات — حکیم محمد اقبال حسین

کیسا غلط خیال ہے کہ زمانہ برسرِ تنزل ہے — منشی محمد ذکاء اللہ

سرسیّد کی والدہ مرحومہ — خواجہ الطاف حسین حالی

خط و کتابت و ترسیل زر کا پتا

قاضی معز الدین احمد

صفدر منزل - تار بنگلہ - اے ایم یو -
علی گڑھ - 202001 یوپی

پندرہ روزہ

تہذیب الاخلاق
علی گڑھ

مدیر: سید حامد وائس چانسلر
علی گڑھ مسلم یونیورسٹی

مدیر مسئول، قاضی معزالدین احمد

شمارہ نمبر ۱۳ یکم جولائی ۱۹۸۳ء جلد نمبر ۲

قیمت فی پرچہ	ایک روپیہ
ششماہی	۱۱ روپے
سالانہ	۲۰ روپے

بیرون ہند سے

فی پرچہ	ایک ڈالر
سالانہ	۱۵ ڈالر

سیّد حامد

رمضان شریف

جیساکہ آپ جانتے ہیں، رمضان خیر و برکت کا مہینہ ہے۔ خیر و برکت، عبادت و ریاضت، ضبط اور نفس کشی کا مہینہ۔ اس سے یہ نہ سمجھیے کہ یہ باتیں صرف ایک ماہ کے لیے ہیں اور باقی گیارہ مہینے اِن پابندیوں سے آزاد ہیں۔ مہینوں اور دنوں میں اس قسم کا فرق ہو ہی نہیں سکتا۔ جو باتیں اچھی ہیں، جو باتیں ضروری ہیں، وہ ہمیشہ ہر لمحے اچھی ہیں، ضروری ہیں۔ ہاں ایک مہینہ اس لیے چن لیا گیا ہے کہ ان باتوں کی طرف یکسوئی کے ساتھ بھرپور اور بھرسک دھیان دیا جائے۔ گویا ایک سبق بار بار دہرایا جا رہا ہے تاکہ آنے والے گیارہ مہینوں میں اس کے نقوش دھندلے نہ ہو پائیں گھڑی میں چابی دی جاتی ہے تو وہ ایک مقررہ مدّت تک چلتی رہتی ہے۔ بیٹری کو بھی ایک عرصہ کے بعد پھر چارج کیا جاتا ہے۔ کوئی انسان تنہا بیٹھ کر عبادت کرے ریاضت کرے یہ ایک اچھی بات ہے اس کے نتیجے میں اس کی اخلاقی اصلاح اور تربیت ضرور ہوگی لیکن اگر ایک ماہ کو اجتماعی عبادت و ریاضت کے لیے مخصوص کر دیا جائے، اس طرح کہ جدھر دیکھو لوگ اپنے پیدا کرنے والے، اپنے پالنے والے کو یاد کر رہے ہیں، اور اس کی راہ میں سختیاں جھیل رہے ہیں، بُری خواہشات کو دبا رہے ہیں، کچل رہے ہیں، اور خود کو نفس کی تہوں، روح کی گہرائیوں تک نظم و ضبط کا عادی بنا رہے ہیں، تو اس کا اثر سو گنا زیادہ ہوگا۔ گویا افراد کی تعداد سے ان کی نیکیوں اور عبادتوں کو ضرب دیا جا رہا ہے۔ روحانی امدادِ باہمی کا یہ زرّیں سلسلہ ایک ماہ تک رات دن دہرایا جاتا ہے۔ خدا کے بندے اس کی تسبیح و تہلیل میں کچھ اس طرح مصروف نظر آتے ہیں جیسے پو پھوٹتے وقت چڑیاں مل کر اپنے پیدا کرنے والے کی حمد و ثنا کے گیت گاتی ہیں۔

فارسی شاعر شیخ سعدیؒ نے لکھا تھا کہ بادل اور ہوا، چاند اور سورج اور آسمان ہر وقت کام میں لگے ہوئے ہیں تاکہ انسان روٹی پائے اور اسے غفلت

ساتھ نہ کھائے۔ ساری کائنات جس
یے سرگرم عمل اور تابع فرمان ہے۔ اس
ان کو یہ بات زیب نہیں دیتی کہ وہ
ٰ کے حکم سے سرتابی کرے۔ رمضان میں
ی عبادتوں اور ریاضتوں کی کثرت
شدت پیمانِ وفا کی تجدید ہے۔ کہ اے
! ہم تیرے بندے ہیں، تیری عبادت
تے ہیں اور تجھ سے ہی مدد اور نصرت
طلب گار ہیں۔ ہمیں توفیق دے کہ ہم
عبادت اور تیرے بندوں کی خدمت
ں۔ ہمیں حوصلہ دے کہ ہم بُری خواہشوں
دامن جھٹک دیں۔ ہمیں طاقت دے
ود کو اس طرح تپائیں کہ ساری آلائشیں
کر بھسم ہو جائیں اور ہم کندن کی
نکھر جائیں، چمک جائیں۔

لہٰذا روزہ صرف دن بھر کھانا نہ
نے، پانی نہ پینے کا نام نہیں ہے۔ یہ تو
بے شمار پابندیوں میں سے صرف ایک
بدی ہے جو روزہ دار اپنے اوپر عاید
تے ہیں۔ بلکہ یہ ان ہمہ گیر پابندیوں
ایک ظاہری شکل ہے۔ ظاہری شکل
کھو کر باطنی مقصد کو بھول جانا ہرگز
نہ ہوگا۔ روزہ کا مقصد ہے خود کو
ائے الٰہی کے تابع کرنا۔ اندرونی بُرائیوں
خلاف جہاد کرنا۔ اس نظم و ضبط کو
ے اندر اتار لینا، کائنات جس پر قائم
۔ خود غرضی، نفس پروری، بغض، کینہ،
حسد اور بے دردی سے دامنِ دل کو پاک
کرنا اور انسانوں کی خدمت مدد اور
دستگیری کرنا۔ مسلمان پر یہ بڑی پابندی
لگائی گئی ہے کہ اپنی عبادت کے فوائد
کو اپنی ذات تک محدود نہ رکھے۔ عبادت
کو خود غرضی کی تہمت سے بچائے۔ اُسے
معاملات کے ساتھ شیر و شکر کر دے۔
خالق کی عبادت، اِنسانوں کی خدمت اور
ان سے محبت کی طرف کشاں کشاں لے
جاتی ہے اور اگر ایسا نہ ہو تو سمجھو کہ
تمہاری عبادت میں کچھ کھوٹ، نیت میں کچھ
فتور ضرور ہے۔ پھر تو تمہاری عبادت
ایک ایسا جسم ہے روح جسے چھوڑ کر چلی
گئی ہو۔ عبادت سچائی اور پاکبازی، ایفائے
عہد اور دردمندی کو اپنے جلو میں
لاتی ہے۔ اگر نہ لائے تو سمجھ لو کہ اس
میں یا تو انانیت یا خود غرضی یا بے حسی
یا ریاکاری شامل ہو گئی۔

ریاکاری سے زیادہ مہلک کوئی اخلاقی
بیماری نہیں۔ اگر عبادت دنیا کو دکھانے
کے لیے کی گئی تو وہ سراسر فریب ہے
جبھی تو اِسلام نے یہ بات واضح کر دی ہے
کہ ہمارا جینا اور مرنا، گہوارہ سے قبر تک
کا سفر، سب اللہ کے لیے ہے۔ اگر عبادت
ظاہری سطح پر کی گئی تو وہ گناہ تو نہیں
لیکن اسے ثواب میں داخل نہیں کریں گے
جس طرح ٹکریں مارنے سے نماز نہیں ہوتی

سی طرح فاقہ کر لینے سے روزہ نہیں ہوتا۔
نماز پڑھتے وقت، روزہ رکھتے وقت
ہن اور دل اس مقصد سے معمور ہونا چاہیں
بن کے لیے یہ عبادتیں کی جا رہی ہیں۔ عبادتوں
کا مقصد روح کو برائیوں سے پاک کرنا، اخلاق
و سنوارنا، گھمنڈ اور خود غرضی سے نجات
دلانا اور دل میں انسانیت کا درد پیدا
کرنا کہ یہی ذریعہ خالق تک رسائی کا ہے۔
ور یہی طریقہ ہے اس کا شکر ادا کرنے کا
بعض لوگ روزہ اس انداز سے
رکھتے ہیں گویا وہ خدا اور اس کے بندوں
پر احسان کر رہے ہیں۔ روزہ اگر نفس کی
[illegible] کی طرف لے جائے تو پھر تن کی لاغری
کام نہ آئے گی۔ اس بات پر گھمنڈ کرنا کہ
ہم روزہ رکھ رہے ہیں اور ان لوگوں
کو جو روزہ نہیں رکھ سکے، حقارت سے دیکھنا
روزہ کی توہین اور تخریب ہے۔ دل میں
یہ بھی خیال آنا کہ ہم بہتوں سے اچھے ہیں
وہ روزہ نہیں رکھتے، ہم رکھ رہے ہیں،
روزہ کو بے سود اور بے اثر کر دینے کے لیے
کافی ہے۔

وہ لوگ نادان ہیں جو روزہ کو،
جو سراپا رحمت ہے، خلق کے لیے باعث
زحمت بنا دیتے ہیں۔ جو ہمارے اکثر محلوں
میں رمضان شریف کے دوران رات بھر
بڑی چہل پہل اور گہما گہمی رہتی ہے۔ یہاں
تک بھی ٹھیک ہے لیکن اس چہل پہل کے
ساتھ شور و غل بھی ہوتا ہے جو بسا
اوقات ان ہمسایوں کی نیندیں حرام کر دیتا
ہے جو مذہبًا روزے کے پابند نہیں
یا پابند ہونے کے باوجود روزہ نہیں رکھ
پا رہے ہیں۔ اس عنوان شور مچانا اور
خلق خدا کو تکلیف پہنچانا اور سکون میں
خلل ڈالنا گویا رمضان شریف جیسے پاکیزہ
مہینہ کو بدنام کرنا اور مذہب کی روح
کو مجروح کرنا ہے۔ تم خلق خدا کے لیے
رحمت بن کر آئے ہو۔ تمھارے اعمال
اور تمھاری عبادات کا اثر دوسروں پر
خوشگوار اور خوش انجام پڑنا چاہیے۔
یہ بھی دیکھا گیا ہے کہ لوگ روزہ
کو فاقہ میں بدل دیتے ہیں۔ سحری کھائی
دن کسی طرح بھوکے پیاسے گزار لیا، روزہ
افطار کیا اور کھانا کھانے بیٹھ گئے اور
کھانا بھی اس طور کھایا گویا دن بھر کے
بھوکے رہنے کی تلافی ان پر واجب
ہو گئی ہو۔ روزہ کو عبادت اور نفس کشی
کا مرتبہ جب ہی حاصل ہوتا ہے جب
نمازیں پابندی کے ساتھ پڑھی جائیں
اور جب دھیان شکم اور حلق سے
زیادہ، کہیں زیادہ اللہ کی طرف اور اس
کی مخلوق کو راحت پہنچانے کی ہو۔ جو لوگ
روزہ رکھ کر جھنجھلاتے ہیں، غصہ کرتے
ہیں، کاٹنے کو دوڑتے ہیں، انھیں روزہ
سے کچھ حاصل نہیں ہوتا۔ جو لوگ روزہ

کے دوران بُری باتیں زبان پر لاتے ہیں، بُرے خیالات سے زبان کو آلودہ کرتے رہتے ہیں، وہ نفع کے بجائے ٹوٹے کا سودا کرتے ہیں اور وہ لوگ جو افطار کرتے ہی ان اخلاقی پابندیوں کو خیرباد کہہ دیتے ہیں جو دن میں انھوں نے اپنے اوپر روا رکھی تھیں، روزہ کی روح سے ناآشنا رہتے ہیں۔

اللہ تعالیٰ اپنے حقوق سے غفلت کو نظر انداز بھی کردے مگر بندوں کے حقوق سے پہلوتہی کو معاف نہیں کرتا۔ اس الزام سے حذر کرو کہ فلاں شخص اپنی عبادت کی وجہ سے اپنے فرائضِ منصبی سے غفلت برتتا رہا ہے۔ حق العباد کا مواخذہ بہت سخت ہوتا ہے اور اس بازپرس کے وقت عبادت بھی کام نہیں آتی۔ عبادات کی پابندی کرتے وقت اس کا اہتمام لازم ہے کہ فرائض منصبی کو اور زیادہ انہماک کے ساتھ انجام دیا جائے۔ نماز اور روزہ کو کام نہ کرنے یا نہ پڑھنے یا کم پڑھنے کا بہانہ نہ بناؤ۔

برادرانِ وطن میں یہ تصور بہت عام ہے کہ مسلمان دن بھر روزہ رکھتے ہیں اور رات بھر کھانا کھاتے ہیں۔ ہمارے روزہ کو وہ اکثر دن کے فاقہ اور رات کی پُرخوری سے تعبیر کرتے ہیں۔ کچھ تو برادرانِ وطن ہمارے ساتھ زیادتی کرتے ہیں اور کچھ ہم روزہ کے ساتھ دونوں زیادتیوں کو بند کرنا ہے۔ انھیں بتانا ہے کہ روزہ ضبطِ نفس کے سوا کچھ نہیں۔

اور خود کو یہ راہ دکھانا ہے کہ عبادت رسوم کا نام نہیں۔ عبادت وہ رشتہ ہے جو فرد کو خالق اور مخلوق کے ساتھ جوڑتا ہے، جو بُرائیوں کی کمر توڑتا ہے اور انسان کو اچھے رجحانات کی طرف لے جاتا ہے۔

غور کیجیے تہذیب نام ہی ضبطِ نفس کا ہے۔ جانوروں اور جاہلوں کو ضبط کرتے ہوئے کس نے دیکھا ہے۔ اخلاق باختہ اور دریدہ دہن لوگ کب ضبط کرپاتے ہیں۔ گھمنڈ کے نشہ میں ہوش ہی نہیں عناں بھی ہاتھ سے جاتی ہے۔ اپنے روز مرّہ کا جائزہ لیجیے۔ دوسروں سے ہر قدم پر واسطہ پڑتا ہے۔ وہ کبھی آپ کے ساتھ ناانصافی کرتے ہیں، کبھی آپ کے احساسات کو مجروح کرتے ہیں۔ کبھی خود آپ کو ان کی بے ضرر باتیں بھی ناگوار ہوتی ہے۔ اور جب آپ تنہا ہوتے ہیں تو آپ کے دل میں اچھے بُرے ہر طرح کے خیالات آتے ہیں۔ اس بات کی کسوٹی کہ آپ کس حد تک مہذب ہیں اکثر صرف یہ ہوتی ہے کہ آپ دوسروں کے رویہ پر اپنی خفگی، جھنجلاہٹ اور غصّہ کو اور اپنے بُرے خیالات اور وسوسوں کو کس طرح دباتے ہیں، کیوں کر ان پر قابو پاتے ہیں۔ اگر انسان جو کچھ وہ محسوس کرتا اور سوچتا رہا ہے، اسے ضبط نہ کرے تو جینا دوبھر ہوجائے ہر وقت تصادم اور سرپھٹول ہوتی رہے جن دو آدمیوں کو دست وگریباں نظر آئیں گے۔ پہلے گلا پھاڑ پھاڑ کر چیخیں گے، پھر

ہاتھا پائی کی نوبت آئے گی، ایک دوسرے کو
پھاڑ کھائیں گے۔ انسان کا ناموس، اس کا
بھرم، اس کی اجتماعی تسخیرات سب ضبطِ نفس کی
رہینِ منت ہیں۔ باہمی تعاون اسی کا ثمرہ ہے
اور ابتدائے آفرینش سے لے کر اب تک مل جل
کر بنی نوع انسان نے جو ترقیاں کی ہیں اور
جو خوشیاں سمیٹی ہیں اور دنیا کو جس طرح سجایا
ہے سنوارا ہے وہ سب ضبطِ نفس کی دین ہے
روزہ ضبطِ نفس کی سب سے موثر تربیت ہے
اور رمضان شریف کا مبارک مہینہ اور
ضبط و تشفی کا یہ تواتر روح کی طہارت اور
تقویت اور اخلاق کی تہذیب کا سب سے کارگر
ذریعہ ہے۔

سید حامد

۱۷/جون ۱۹۸۳ء

بقیہ مضمون پاکیزہ جذبات

نہیں آنے دیتے کہ کوئی ان سے مانگ بیٹھے۔ نتیجہ اس
کا یہ ہوتا ہے کہ ان کی روح ہمیشہ ہی تکلیف واذیت
میں رہتی ہے اور اس کا اثر ان کے نظام جسمانی پر
کبھی نہ کبھی ضرور پڑ کر رہتا ہے۔

آج کل کون ہے جو کسی نہ کسی الجھن اور
پریشانی میں گرفتار نہیں ہے۔ گھریلو، کاروباری اور
اجتماعی قسم کی بے شمار الجھنیں اور پریشانیاں ہیں جو
آدمی کو ہمہ وقت گھیرے رہتی ہیں۔ ظاہر ہے کہ ہم
ان سے اپنے دماغ کو بالکل فارغ تو نہیں کر سکتے۔
لیکن اگر ہم ہمت سے کام لیں اور ہزاروں ایسے لوگوں
کی زندگیوں کو دیکھیں جو ہم سے بھی کہیں زیادہ پریشان
ہیں اور اپنی پریشانیوں اور الجھنوں کا تجزیہ کر کے اطمینان
کے ساتھ حل کرنے کی کوشش کریں تو وہ حل
ہو سکتی ہیں اور ہماری پریشانیوں میں بڑی حد تک
کمی ہو سکتی ہے۔ ہر وقت یہ بات سوچتے رہنا کہ مجھے
یہ بننا چاہیے تھا اور یہ کچھ فوائد حاصل ہونا چاہیے تھے
اور اس پر کڑھتے رہنا ہمیں کہیں کا نہ رکھے گا۔ جو بُرا
وقت گزر چکا اور جو گزر رہا ہے اس کے متعلق یہ سوچتے
رہنا کہ یہ بد قسمتی ہمارے ہی حصہ میں کیوں آگئی،
ان تکلیفوں اور سختیوں میں کوئی کمی نہیں لا سکتا
لہٰذا ہمیں چاہیے کہ ہم اپنے دماغ کو بے بنیاد خوف
مایوسی اور تلخیوں سے کلیتہً آزاد کرنے کی کوشش
کریں۔ اور تعمیری اور اخلاق کو نشو و نما دینے والے
کاموں میں لگے رہیں۔

بقیہ ”سرسید کی والدہ مرحومہ“

جس سے اس کو کافی سزا مل سکتی تھی، میرے ہاتھ
آگئے اور اتفاق سے اس وقت مجسٹریٹ بھی وہ شخص
تھا جو اس کے پھانسے کی فکر میں تھا۔ میرے نفس نے
مجھ کو انتقام لینے پر آمادہ کیا۔ میری والدہ کو جب
میرا یہ ارادہ معلوم ہوا تو انھوں نے مجھ سے کہا کہ سب
سے بہتر تو یہ ہے کہ درگزر کرو اور اگر بدلا لینا ہی
چاہتے ہو تو اس زبردست حاکم کے انصاف پر چھوڑ
دو جو ہر بدی کی پوری سزا دینے والا ہے۔ اپنے
دشمنوں کو دنیا کے کمزور حاکموں سے بدلہ دلوانا بڑی
نادانی کی بات ہے۔“

ان کے اس کہنے کا مجھ پر ایسا اثر ہوا کہ اس
دن سے آج تک مجھ کو کبھی اپنے کسی دشمن سے یا بدخواہ
سے انتقام لینے کا خیال نہیں آیا۔ اور امید ہے کہ
کبھی نہ آئے گا۔ بلکہ انھیں کی نصیحت کی بدولت میں
یہ بھی نہیں چاہتا کہ آخرت میں خدا اس سے میرا
بدلہ لے۔

[از حیات جاوید ۔ خواجہ الطاف حسین حالی]

سید کاظم نقوی
صدر شعبۂ دینیات شیعہ
اے ایم یو۔ علی گڑھ

پانچویں قسط

مذہب کیوں اور کس لیے؟

ترقی یافتہ معاشرہ

معاشرے کے متعلق سماجیات اور قانون کی کتابوں میں بڑی لمبی چوڑی بحثیں نظر آتی ہیں۔ ان تمام بحثوں سے ہمیں سروکار نہیں ہے۔ جب ہم معاشرے کا مفہوم سمجھنے کے لیے تھوڑا سا غور کرتے تو اس نتیجہ تک پہنچتے ہیں کہ معاشرہ ان افراد کے مجموعے کا نام ہے جو اپنے گوناگوں اغراض کی تکمیل کے لیے ایک دوسرے سے وابستہ ہو گئے ہوں۔ معاشرہ، یعنی ایسے اشخاص جو نفسیات، روحیات، خیالات، رواسم و عادات کے لحاظ سے ایک دوسرے کے مانند اور میل جول کی خاطر باہم نزدیک ہو گئے ہوں۔

سماجیات کے ماہرین نے طویل تحقیقات کے بعد اس حقیقت کا اقرار کیا ہے کہ انسان فطری طور سے اجتماع پسند واقع ہوا ہے۔ وہ بالکل تنہائی میں رہ کر زندگی نہیں بسر کر سکتا، وہ اپنے فطری جذبات اور اندرونی احساسات کی بنا پر مجبور ہے کہ سب کے ساتھ مل جل کر رہے۔ اس کا سبب یہ ہے کہ وہ دیکھتا ہے کہ میں اکیلا زندگیوں کی دشواریوں کا مقابلہ نہیں کر سکتا، میں تنہا کمالات کی منزلوں تک نہیں پہونچ سکتا۔ کم از کم دوسرے اشخاص کا تعاون اپنے مقاصد کے حصول کو آسان ضرور بنا دیتا ہے۔ وہ مجبور ہے کہ ان ذہنی اور جسمانی قوتوں سے مدد لے جو دوسروں کے قبضے میں ہیں۔ عام طور سے لوگ اتنے فیاض اور سخی نہیں ہیں کہ وہ اپنی طاقتوں سے مفت دوسروں کو فائدہ اٹھانے کا موقع دے دیں۔ بالآخر یہ مشکل ذہنی اور جسمانی طاقتوں کے تبادلے سے حل ہوتی ہے۔ یعنی ہم دوسروں کے سرمایے سے فائدہ اٹھائیں اور وہ ہماری طاقتوں سے بہرہ مند ہوں۔

سماجیات کے بعض جاننے والوں کا خیال ہے کہ تمدنی زندگی کے شروع میں پیدائش اس طرح ہوئی ہے کہ انسان کو اپنا پیٹ بھرنے کے لیے شکار کی ضرورت تھی وہ اکیلا اس مہم کو سر نہیں کر سکتا تھا، کیونکہ درندہ جانور اس کو پھاڑ کھانے کے واسطے ہر طرف جنگلوں میں پھیلے ہوئے تھے۔ انسان مجبور تھا کہ چند آدمیوں کو رفیق کار بنا کر شکار کی غرض سے نکلے۔ اس خیال کے صحیح ہونے کے ہم منکر نہیں ہیں۔ لیکن یہ ضروریات زندگی میں سے صرف ایک ضرورت کی تکمیل کے لیے دوسرے افراد سے مدد حاصل کرنے کی وجہ نمایاں کرتا ہے۔ اس کے علاوہ دوسری ضرورتوں کے پورا کرنے میں انسان کیوں دوسروں کی اعانت کا محتاج ہے۔ اس پہلو پر اس خیال سے کوئی روشنی نہیں پڑتی ہے۔ واضح بات ہے کہ افراد انسانی کے درمیان دائمی میل جول اور تعلقات کا لازمہ ہے کہ ان کے مفادات ایک دوسرے سے ٹکرائیں۔

ممکن ہے کہ یہاں پر کوئی شخص یہ سوال کر بیٹھے کہ ایسی صورت میں اس تمدنی زندگی کا فائدہ کیا ہے؟ اگر انسان بیابانوں، جنگلوں، پہاڑوں کے دروں میں زندگی بسر کرے تو وہ اس تمدنی زندگی سے ہزار درجہ بہتر ہے جس کا قطعی لازمہ یہ ہے کہ لوگ ایک دوسرے کے حقوق کو پامال کریں، ان کے مفادات ٹکرائیں اور ان کے درمیان بات بات پر لڑائیاں اور خون خرابے ہوں۔

معلوم ہونا چاہیے کہ مذکورہ صورت حال اس وقت پیش آئے گی، جب انسان اپنی حقیقی روحِ اجتماعی کو خیرباد کہہ دے۔ جب وہ اپنے فطری تقاضوں سے غلط فائدہ اٹھائے۔ ان مفاسد کا دروازہ بند کرنے کے لیے ضروری ہے کہ ایک مکمل معاشرہ وجود میں لایا جائے جس کی بنیاد صحیح وسالم انسانی فطرت کے اوپر ہو اس طرح کے ترقی یافتہ روحانی معاشرے کے اصول کا خلاصہ مندرجۂ ذیل باتوں میں کیا جاسکتا ہے۔

۱- افراد انسانی کے باہمی تعلقات کا استحکام

۲- تمام لوگوں کے حقوق کی مکمل حفاظت

۳- افراد انسانی کی تربیت اور انھیں منازل کمال تک پہونچانے کا سامان فراہم کرنا۔

اگر کسی معاشرے میں ان تینوں بنیادی چیزوں کا لحاظ کیا جائے تو اس کا نتیجہ یہ ہوگا کہ اس کے تمام افراد معاشرتی اور سماجی پہلو کے لحاظ سے منزل کمال تک پہنچ جائیں گے۔ وہ اپنی تمدنی زندگی سے ہر طرح فائدہ اٹھائیں گے۔

تعاون اور باہمی امداد کی بنیاد پر اجتماعی زندگی کے وجود میں آنے کے بعد افراد معاشرہ کے لیے فرائض کی تعین اور ہر ایک کی ذمہ داری کے حدود کا مسئلہ ابھرتا ہے۔ خصوصیت سے یہ پیش نظر رہنے کی صورت میں کہ انسان خودخواہ اور خودغرض واقع ہوا ہے۔

جب خودخواہی کا جذبہ نقطۂ اعتدال سے آگے قدم بڑھاتا ہے اور سرکشی کرنے پر تلتا ہے تو "جس کی لاٹھی اس کی بھینس" کے اصول پر وہ دوسروں کے حقوق کو روندنے کی کوشش کرتا ہے۔ یہی وہ نقطہ ہے جہاں قانون کے وجود کی ضرورت نمایاں ہوتی ہے۔ کچھ اصول وقوانین ہونا چاہییں جن سے معاشرے کے تمام افراد کے حقوق کا تعین اور تحفظ ہو۔ جو ہر شخص کے فرائض کے حدود معین کریں، دوسروں کے حقوق پامال کرنے والے مجرمین کے لیے سزا کی نوعیت اور مقدار مقرر کریں

سماجی زندگی کی گاڑی چلنے کے لیے ان قوانین کا سرچشمہ کیا ہو؟

کیا قانون خود انسان اپنے دماغ سے وضع کرے؟

ہر قوم، ہر سماج کے درمیان خواہ وہ کتنا ہی پسماندہ ہو ایک طاقت موجود ہے جو فیصلہ کرتی ہے کہ یہ اچھا ہے، یہ برا ہے، یہ بدصورت ہے، یہ خوب صورت ہے، یہ مفید ہے، یہ مضر ہے، یہ حق ہے، یہ باطل ہے، یہ ظلم ہے، یہ انصاف ہے۔ اس طاقت کی راہنمائی سے نکتہ رس، باریک بیں، صاحب بصیرت اشخاص اجتماعی زندگی کے لیے صحیح خطوط بنا سکتے ہیں۔ وہ یہ بتا سکتے ہیں کہ لوگوں کی کارگزاری کے حدود کیا ہونا چاہییں؟

انسان جس طرح اپنی عقل کے اشاروں سے اپنے شخصی کاموں میں اچھے اور برے کے درمیان امتیاز پیدا کرتا، برائیوں سے بچتا اور اچھائیاں اختیار کرتا ہے۔ اسی طرح وہ اس کی راہنمائی کے صدقے میں ایسے مستحکم، معقول قواعد وضوابط بنا سکتا ہے جو معاشرے میں نظم وضبط، امن وامان پیدا کریں۔ جو لوگوں کے درمیان روابط اور تعلقات خوشگوار اور مستحکم کریں جو ان کی ایسی ذہنیت بنائیں جو اقوام وملل کی راہنما بنے۔ وہ انھیں بتائیں کہ کیوں کر جینا اور جینے دینا چاہیے؟

انسانی عقل کا دائرۂ حکومت کیا ہے؟

مانا کہ آدمی میں ایک پوشیدہ قوت موجود ہے

جو نیک وبد، مفید و مضر کو پہچانتی اور اس کے بعد انسان
کو ہدایت کرتی ہے کہ وہ نیک صفات سے متصف ہو،
ناپسندیدہ اوصاف کو اپنے پاس پھٹکنے نہ دے، قابلِ
مدح کام کرے، مذموم افعال سے اپنا دامن بچائے
لیکن سوال یہ ہے کہ تمام لوگ، ہر کس و ناکس عقل کی راہنمائی
سے حق و باطل کے درمیان امتیاز پیدا کرسکتا ہے ؟
کیا عقل سے کوئی چوک نہیں ہوتی ہے ؟ کیا عادتیں،
رسم و رواج، غلط تعلیم و تربیت، ماحول کی تبدیلیاں
سبز اور نیلی عینکوں کی طرح عقل کی آنکھوں پر چڑھ کر
واقعیتوں کا اصلی روپ بدل نہیں دیتی اور صحیح فیصلہ
کرنے سے اسے عاجز نہیں بنا دیتی ہیں ؟ کیا عقل
انسانی میں یہ صلاحیت ہے کہ وہ بے کم و کاست ان
قوانین کا انکشاف کرے جو دنیا میں موجود ہیں ؟ آیا
وہ انسان کہ جو مختلف اسباب کے زیر اثر ہے ایسے
قوانین بنا سکتا ہے جو سماج کی مصلحتوں اور اس کے
مفادات کی پوری پوری حفاظت کریں ؟

مان لیا کہ انسانی عقل ہر جگہ حقیقت بین ہے،
ہر موقع پر وہ صحیح فیصلہ کرنے کی صلاحیت رکھتی ہے
لیکن کیا خود انسان کے فطری رجحانات، میلانات اور
عارضی مفادات اسے اجازت دیں گے کہ وہ اپنی تشخیص
کے مطابق قانون بنائے یا اسے تیار کرکے اس کے
مطابق عمل کرے ؟

عقل کی رنگ پذیری

اس کا انکار نہیں کیا جا سکتا کہ بہت سے
مقامات پر عقل صحیح فیصلہ کر دیتی ہے، لیکن اسے
کبھی نہیں جھٹلایا جا سکتا کہ عادات و رواسم، طرز تعلیم
و تربیت، اقتصادی اور معاشی حالات اس کے
فیصلے پر اثر انداز ہوتے ہیں۔ کبھی ایسا ہوتا
ہے کہ مذکورہ امور عقل سے حقیقت بینی کی خاصیت
چھین لیتے ہیں۔ حق و باطل کی تشخیص میں اس سے
غلطی بھی ہو جاتی ہے، مختلف قسم کی عینکیں اس کی
آنکھوں پر چڑھ جاتی ہیں۔

۱۔ مثلاً آدمی کا مار ڈالنا، اس کا جیتا جاگتا دفن
کر دینا ہمارے نزدیک بدترین کام ہے۔ ہمارا دماغ
لوگوں کے مار ڈالنے اور جیتا جاگتا دفن کر دینے سے
انتہائی متاثر ہوتا ہے۔ ہمارا غیروں کے لحاظ سے
یہ عالم ہے۔ اپنے گھر کے عزیز ترین لوگوں کے قتل
کر ڈالنے اور زندہ درگور کر دینے کا کیا سوال ؟
لیکن ہم سب جانتے ہیں کہ ملک عرب میں اور
اس کے دوسرے مقامات پر ایسے اشخاص موجود
تھے جو بتوں پر اپنے بچوں کو بھینٹ چڑھا دیتے تھے
ایسے سنگدل بھی تھے جو اپنی لڑکیوں کو زندہ درگور
کر دیتے تھے، ایسے غیرت دار بھی تھے جو قبیلے کے
کے ان جوانوں کی زندگی کا خاتمہ کر دیتے جو ان
کی لڑکیوں کے شوہر بننا چاہتے تھے۔

ممکن ہے کہ اسے وحشی اور غیر متمدن لوگوں کا
عمل کہہ کر ٹال دیا جائے۔ اس سے یہ ثابت نہیں ہوتا
کہ رسم و رواج کا رنگ تعلیم یافتہ اور مہذب اشخاص
کے دماغوں پر بھی چڑھ جاتا ہے۔

جواب میں عرض ہے کہ جانوروں کو اپنی غذا بنانا دنیا
کے اکثر و بیشتر حصوں میں صحیح اور پسندیدہ بات سمجھا
جاتا ہے۔ بلکہ کہا جا سکتا ہے کہ بہت سے لوگوں کے
لیے گوشت کا استعمال ضروری ہے، لیکن کیا تمام ہندوؤں
کو غیر مہذب اور غیر متمدن کہہ دیا جائے گا جو حیوانات
کے ذبح کرنے اور ان کا گوشت کھانے کو مذموم
سمجھتے ہیں۔

۲۔ دنیا کے اکثر اقوام وملل عورت و مرد کے
درمیان آزادانہ جنسی روابط کو اچھا نہیں جانتے
لیکن اس کے باوجود فرانس کے سے متمدن ملک
میں ایک منظم جماعت موجود ہے جو جنسی آزادی
کو بلا کسی قید و شرط کے پسند کرتی ہے۔

۳- آج کل سرمایہ داری کا نظام یورپ اور امریکہ کے بیشتر ملکوں میں رائج ہے۔ بڑی بڑی حکومتیں بڑی شدت سے اس کی طرف داری کر رہی ہیں۔ اس کے مقابلے میں نظام اشتراکیت کا اقتدار تمام کمیونسٹ ممالک میں ہے۔ ان کی حکومت کی بنیاد شخصی مالکیت کے منسوخ کرنے اور تمام سرمایہ لوگوں کے ہاتھوں سے چھین لینے کے اوپر ہے۔ درحقیقت اس وقت پوری دنیا سرمایہ داری اور کمیونزم کے دو بلاکوں پر تقسیم ہو گئی ہے۔ ان میں سے ہر ایک کا عقیدہ ہے کہ تمام افراد انسانی کو خوش حال بنانے کا راستہ صرف ان کے اقتصادی نظام کی پیروی ہے۔

دونوں میں سے ہر ایک کے طرف دار اقتصادیات اور معاشیات کے سیکڑوں ماہرین ہیں۔ ان میں سے ہر ایک اپنے مقاصد کو پورا کرنے اور اپنے مدمقابل کو زیر کرنے کے لیے ایڑی چوٹی کا زور لگائے ہوئے ہیں۔ ہر قسم کی علمی، سیاسی، فوجی طاقت اس سلسلہ میں صرف کر رہا ہے۔ ہر ایک کی کوشش ہے کہ وہ اس مقابلے میں دوسرے پر غالب آجائے۔

۴- اکثر و بیشتر مشرقی قوموں میں ماں باپ کا احترام، کمزور اور نادار اشخاص کی امداد انتہائی مقدس اخلاقی اصول میں سے ہے۔ اسی لیے ہر ملک میں اسپتال، یتیم خانے اور پاگل خانے قائم کیے گئے ہیں۔ لیکن جنوبی افریقہ کے بعض مقامات پر دیکھا گیا ہے کہ اگر کسی شخص کی ماں اسے مارنے کا ارادہ کرتی تو قانون بیٹے کو یہ اجازت دیتا ہے کہ وہ اپنی ماں کو قتل کر دے

بعض قوموں میں رواج ہے کہ جن لوگوں کو قوم کے لیے بے فائدہ قرار دیا جاتا، انھیں مار ڈالا جاتا ہے۔ یہ لوگ چاہے بیگانہ ہوں یا اپنے ماں باپ۔ بارہا سیاحوں نے دیکھا ہے کہ لڑکے اپنے بوڑھے یا بیمار ماں باپ کو قتل کر رہے ہیں۔ (مبانی فلسفہ ص ۳۴۸)

یہ چند مذکورہ نمونے بتاتے ہیں کہ انسانی عقل خطا اور لغزش سے بالاتر نہیں ہے۔ وہ بھی غلط راستے پر چلتی ہے۔ یقیناً عقل بڑی اچھی راہنما ہے لیکن سو فیصدی اس کی راہنمائی اور اس کے فرمان پر بھروسہ نہیں کیا جا سکتا ہے۔ کیونکہ آپ نے دیکھا کہ اس پر غلط تعلیم و تربیت اور رسم و عادات کا اثر پڑ جاتا ہے۔ وہ کبھی حقائق اور واقعیات تک پہنچنے سے محروم رہتی ہے۔

ہم ماں باپ کے ساتھ ان کے مرتے دم تک حسن سلوک کرنا، بوڑھے، کمزور، نادار اشخاص کو سہارا دینا ممدوح سمجھتے ہیں۔ لیکن اسی کرۂ زمین کے اوپر ایسے لوگ بھی موجود ہیں جو انھیں بیکار اور بے فائدہ ہونے کی صورت میں قتل کر ڈالنا مستحسن اور ضروری جانتے ہیں۔

ہم جانوروں کا ذبح کرنا، ان کے گوشت کو اپنی غذا بنانا عقل کے فیصلے کے مطابق پاتے ہیں لیکن اسی کو بعض برادران وطن حکم عقل کے خلاف سمجھتے ہیں۔

مغربی حکومتیں نظام سرمایہ داری کو سو فیصدی قوم کی خوش حالی کی ضامن سمجھتی ہیں۔ لیکن اشتراکی ممالک اسے بالکل غلط اور نقصان رساں جانتے ہیں۔ ان کے نزدیک وہ سماج کی تمام بدبختیوں کا سرچشمہ ہے۔ ان کی نظر میں بلند ترین اقتصادی نظام کمیونزم ہے۔ شخصی مالکیت کو ختم کر کے تمام سرمایہ حکومت کے ہاتھ میں دے دینا چاہیے۔

کیا یہ کہا جا سکتا ہے کہ جنوبی افریقہ کے بعض مقامات کے تمام باشندے، عربستان کے زمانہ جاہلیت کے تمام لوگ جو ماں باپ اور اپنی اولاد کو قتل کر دیتے تھے، کلیتاً عقل کی نعمت سے محروم تھے؟

کیا یہ صحیح ہے کہ کرۂ زمین کی آدھی آبادی کو جو شخصی مالکیت کو ختم کرنے اور نظام اشتراکی کی

طرف دار ہے، احمق اور ضمیر فروش سمجھا جائے؟
انصاف پسندی کا تقاضا ہے کہ دنیا صاف صاف لفظوں میں اقرار کرے کہ یہ اختلاف آرار، یہ عقائد و نظریات کا غیر معمولی ٹکراؤ بلند آواز سے اعلان کر رہا ہے کہ عقل دوسری چیزوں کے رنگ میں رنگ جاتی، وہ رسم و رواج کے زیر اثر حقیقت شناسی اور واقعیت بینی کی خاصیت اپنے ہاتھ سے دے دیتی، وہ گھبرا کر ایک ہی مسئلے کے بارے میں مختلف اور متضاد فیصلے کرنے لگتی ہے۔ یہ بھی ہوسکتا ہے کہ بدترین کام صرف اس لیے کہ انھیں برابر دہرایا جاتا ہے۔ محض اس واسطے کہ انھیں بلا استثنا سب لوگ کرتے ہیں، عقل کی نگاہوں میں ممدوح قرار پا جائیں۔ ان کی برائی ان سے جدا ہو جائے انھیں غلط کے بجائے صحیح سمجھا جانے لگے
یہ عقل جو مختلف رنگوں میں رنگ جاتی، یہ عقل جو اپنے فیصلوں میں قدم قدم پر ٹھوکریں کھاتی ہے، ایسی عقل کے کاندھوں پر قانون سازی کا سنگین اور ذمہ دارانہ بوجھ کیسے ڈالا جاسکتا ہے۔ قانون سازی کے مسئلہ میں اس پر بھروسہ کرنا کہاں تک صحیح اور معقول ہوسکتا ہے؟
یہ بھی ملحوظ رہے کہ انسان کے معلومات بہت محدود ہیں۔ وہ لوگوں کے تمام جسمانی اور نفسیاتی تقاضوں کا احاطہ نہیں کرسکتا۔ ایسے جامع اور ہمہ گیر اصول و قوانین بنانا انسان کے بس سے باہر ہے جن میں فقط افادیت ہی افادیت ہو، مضرت کا کوئی شائبہ نہ ہو۔
ہمیں برابر یہ منظر دکھائی دیتا ہے کہ دنیوی قانون داں آج سر جوڑ کر بیٹھتے اور اصول و قوانین وضع کرتے ہیں، لیکن بعد کو ان کی کمزوریاں سامنے آتی ہیں اور ان میں طرح طرح کی ترمیموں کے پیوند لگائے جاتے ہیں۔ ان تمام کوششوں کے باوجود کبھی ایسے قوانین کہ جو پورے طور پر انسانی فطرت کے مطابق ہوں، ایسے قوانین جن میں انسان کے چھوٹے سے چھوٹے جسمانی اور روحانی تقاضوں کا لحاظ رکھا گیا ہو ایسے قوانین کہ جن میں کسی فرد یا گروہ کے مفاد کو خصوصی طور پر پیش نظر نہ رکھا گیا ہو، صرف وہ ہستی بنا سکتی ہے جس نے انسان کے جسم اور روح کو پیدا کیا ہو، جو ہر طرح مستغنی اور بے نیاز ہو، اس کا کوئی مفاد کسی سے وابستہ نہ ہو، سب کا ہاتھ اس کے سامنے پھیلا ہوا ہو، سب اس کی عنایت اور فیض کے محتاج ہوں۔ مذہب ان ہی اصول و قوانین کے مجموعے کا نام ہے، جو خدا نے اپنی صوابدید سے اپنے بندوں کا مفاد ملحوظ رکھتے ہوئے بنائے ہوں۔

بقیہ مضمون: "مسلم اقلیت کی مشکلات کا موثر حل"

پوچھا کہ اونٹ مانگنے آئے ہو، لیکن کعبہ کے متعلق کچھ نہیں کہتے؟
عبدالمطلب نے جواب دیا کہ میں اونٹ کا مالک ہوں۔ اس لیے اس کی واپسی کا سوال کر رہا ہوں۔ رہا کعبہ تو اس کا مالک اس کی حفاظت کرے گا
اسی طرح آپ کوشش کیجیے۔ اگر آپ کا کام اللہ کی راہ میں ہوگا تو اللہ تعالیٰ اسے ضرور باقی رکھے گا۔ آپ دوسرے اداروں کے ذمہ داروں سے ملیے، ان اداروں میں اپنے طلبہ کے داخلہ کے لیے کوشش کیجیے۔ ضرور آپ کی آواز سنی جائے گی اور تعلیم کے سلسلہ میں یہ یاد رکھیے کہ نقش اول دینی تعلیم کو بنائیے اور گھروں میں بچوں کو دینی تعلیم دیجیے۔"
آخر میں سید حامد صاحب نے ذمہ داران اسکول کا شکریہ ادا کرتے ہوئے تقریر ختم کی۔ پھر جائے پر مجلس کا اختتام ہوا۔

ڈاکٹر مقتدیٰ حسن ازہری (علیگ)

مسلم اقلیت کی مشکلات کا موثر حل

مسلم یونیورسٹی کے وائس چانسلر سید حامد صاحب کی بصیرت افروز تقریر

ملتِ اسلامیہ کی اصلاح و ترقی کے لیے
روجہد اور مناسب موقعوں پر مسلمانوں کے ذہن و فکر
صحیح رخ دینے اور ان کے عزم و حوصلہ کو تقویت پہنچانے
کوشش مسلم دانشوروں اور علماء و مصلحین نے
میشہ کی ہے اور کم و بیش اس کے نتائج سامنے آئے ہیں
س چیز کی تلقین اسلام نے بھی کی ہے اور قوموں کے
رج و زوال کی تاریخ سے بھی یہ سبق ملتا ہے۔ لیکن
قات اصلاحی کوشش کرنے والوں کے سامنے بڑے
ہت شکن نتائج آتے ہیں اور قوم کی طرف سے ان کو
سرد مہری ہی نہیں بلکہ بد سلوکی کا بھی صلہ ملتا ہے۔
لیکن تاریخ یہ بھی بتاتی ہے کہ بعض مصلحین نے اس
رح کے ناسازگار حالات میں بھی اپنا فرض ادا کیا' انھیں
نے والی نسلوں نے ہمیشہ اچھے الفاظ سے یاد کیا اور
م کو ان کی مساعی سے دور رس فوائد حاصل ہوئے۔

ملتِ اسلامیہ کی فلاح و بہبود کے لیے جب
تگو ہوتی ہے تو جس موضوع پر سب سے زیادہ
جہ مبذول کی جاتی ہے وہ تعلیم کا موضوع ہے۔ بلاشبہ
لیم ہر قوم کے لیے اور ہر دور میں بے حد ضروری
ے۔ اس کے بغیر کسی قوم یا فرد کی ترقی کا تصور عبث
ے۔ اسلام نے بھی ایک فطری دین اور دائمی دستورِ حیات
کی حیثیت سے تعلیم کو بہت زیادہ اہمیت دی ہے
وحی کا پہلا پیغام اقرأ (یعنی پڑھو) کی دلنشین تعلیم سے
شروع ہوا۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم اور صحابہ کرام رض
نے اس سلسلہ میں روشن مثالیں قائم کیں۔ پھر بعد
کے ادوار میں مسلم حکمرانوں اور عوام نے علم کی ایسی
نشر و اشاعت اور سرپرستی کی کہ پچھلی تاریخ میں
اس کی نظیر مشکل ہے

بنارس میں مسلم یونیورسٹی کے وائس چانسلر
محترم سید حامد صاحب کی تشریف آوری کی مناسبت
یہاں کے بعض تعلیمی و سماجی خدمات کے اداروں کا معائنہ
کرنا تھا۔ اس لیے ان کے اس دورہ پر بھی ملت کے
اصلاح کے اسی پہلو کا رنگ غالب رہا۔

چونکہ محترم سید حامد صاحب ہندوستان
کی عظیم تاریخی دانش گاہ کے وائس چانسلر ہیں۔ انھیں
مسلمانوں کی بہبود کے مسائل سے غیر معمولی دلچسپی
ہے اور ان کے سینہ میں ایک حساس و درد مند
دل ہے۔ اس لیے ان کے دورۂ بنارس کی اس
تقریر کا مختصر اقتباس مع تاثراتی سطور "محدث" میں
پیش کیا جاتا ہے۔ تاکہ اس مفید تقریر سے ملت
کے اہل فکر افراد کو روشنی حاصل ہو سکے اور

مسلمانوں کی بہبود و ترقی کے لیے صحیح خطوط پر مزید
نت واخلاص سے کام کریں۔

مورخہ ۸ رمئی ۱۹۸۲ء بروز یکشنبہ جناب
سید حامد صاحب بنارس تشریف لائے۔ اسی دن آپ
بنارس کے جامعہ اسپتال کا معائنہ فرمایا۔ علی گڑھ
ابنائے قدیم کی ایک نشست میں شریک ہوئے اور
پھر شام میں مسلم ہائر سکنڈری اسکول اربورہ کی
ف سے دیے جانے والے عصرانے میں حاضرین کو
طاب کیا۔

سید حامد صاحب کی تقریر سے پہلے پروفیسر
محمد رفیق خاں صاحب (گاندھین انسٹی ٹیوٹ راجگھاٹ)
نے معزز مہمان کا تعارف کراتے ہوئے بتایا کہ سید حامد
صاحب کی بنارس تشریف آوری یہاں کے مسلمانوں
کی دیرینہ خواہش کی تکمیل ہے اس کے لیے خود پروفیسر
صاحب اور اسی طرح جامعہ سلفیہ بنارس کے ذمہ داران
کوشش کرچکے تھے۔ پھر انھوں نے سید حامد صاحب کی
علمی زندگی، اور ملکی و سماجی خدمات پر روشنی ڈالی اور
بتایا کہ علی گڑھ مسلم یونیورسٹی سے پہلے بھی معزز مہمان کو
مسلمانوں کے مسائل کا مطالعہ کرنے اور ان کی مشکلات
کا حل سوچنے کے مواقع حاصل رہ چکے ہیں۔

تعارفی کلمات کے بعد سپاس نامہ پیش
کیا گیا، پھر اسکول کے سکریٹری ڈاکٹر اقبال صاحب
نے اسکول کی مختصر رپورٹ پیش کی جس میں بتایا کہ
اسکول شروع میں مدنپورہ میں قائم ہوا۔ اس کے
اولین سرپرستوں میں چند اشخاص کے نام یہ ہیں۔

۱۔ حافظ عبدالرحمٰن (مرحوم) ۲۔ مولانا عبدالمجید
حریری (مرحوم) ۳۔ مولانا عبدالمتین (مرحوم)
۴۔ الحاج محمد فاروق (مرحوم) ۵۔ الحاج محمد صدیق
مدظلہ ۶۔ ماسٹر اکبر خاں لودھی وغیرہ

ان کلمات کے بعد مہمان خصوصی محترم سید حامد
صاحب نے اپنی پرمغز جوابی تقریر کی جسے حاضرین نے
بڑی توجہ اور انہماک سے سنا۔ تقریر کا ہر لفظ
ان کے لیے حرکت وعمل کا پیغام تھا۔

سید حامد صاحب نے سب سے پہلے اسکول
کے ذمہ داران کا شکریہ ادا کیا۔ پھر اسکول کی
تاریخ اور ترقی کی رفتار کے سلسلہ میں آل انڈیا
مسلم ایجوکیشنل کانفرنس کا جو ذکر آیا تھا، اس سے متعلق
فرمایا۔

"اس تذکرہ سے بہت سی پرانی یادیں تازہ
ہوگئیں۔ ملک میں مسلمانوں کی تعلیم سے اس کانفرنس
کا گہرا تعلق تھا۔ اس کے خطبات مسلمانوں کے تعلیمی
سفر میں سنگ میل کی حیثیت رکھتے ہیں۔ ان تاریخی
خطبات سے صاف طور پر اندازہ ہوتا تھا کہ علی گڑھ
مسلم یونیورسٹی ایک مرکز ہے۔ جس سے پھوٹنے والی
شعاعوں میں ایک شعاع یہ کانفرنس ہے جس کے واسطے
سے ملک کے ہر خطے میں بسنے والے مسلمانوں کو روشنی
ملتی ہے۔"

مسلم اسکول کی رپورٹ میں ادارہ کی متنوع
مشکلات اور عدم ترقی کے اسباب کا ذکر تھا۔ مسلم
اداروں کو ہر جگہ اسی طرح کی صورت حال کا سامنا ہے
اور ہمارے دانشور و مفکرین جہاں کہیں جاتے ہیں انھیں
اسی نوعیت کے شکوے سننے کو ملتے ہیں۔ سید صاحب
نے اس پر اپنے تاثرات کا اظہار کرتے ہوئے فرمایا:

"عام مسلم ادارے ہر جگہ خستہ حالی کا شکار ہیں۔ مجھے
مرادآباد، بلندشہر اور گورکھپور کے اسکولوں کا حال قریب
سے معلوم ہے۔ جب کہ انھیں مقامات پر دوسرے ادارے
برابر ترقی پذیر ہیں۔ یہ صورت حال ہمارے لیے تازیانہ
عبرت ہے۔ شمالی ہند میں یہ الم انگیز منظر زیادہ نظر
آتا ہے۔ تعلیم کے سلسلہ میں ہماری بے توجہی پوری طرح
عیاں ہے۔ ہمیں یہ شکایت ہے کہ زمانہ ہمارے خلاف
ہے۔ لیکن کبھی ہم نے یہ سوچا کہ کیا ہم خود اپنے
خلاف نہیں؟

من از بیگانگاں ہرگز نہ نالم
کہ با من ہرچہ کرد آں آشنا کرد

یقین کیجیے کہ اگر ہم اسی حالت پر باقی رہے تو حرفِ غلط کی طرح مٹا دیے جائیں گے"۔

شمالی و جنوبی ہند کے مابین موازنہ کرتے ہوئے موصوف نے فرمایا کہ

"جنوبی ہند میں مسلمانوں کا تعلیمی معیار شمالی ہند کے مسلمانوں سے اچھا ہے۔ لیکن اگر وہاں کے غیر مسلموں سے ان کا موازنہ کیا جائے تو یہ تسلیم کرنا پڑے گا کہ مسلمان وہاں بھی دوسروں سے پیچھے ہیں۔ اور اس کا اصل سبب یہ ہے کہ ہمیں اپنے فرض کا احساس نہیں۔ ہم اولاد کی تعلیم کے سلسلے میں صرف مالی تعاون کو کافی سمجھتے ہیں۔ بلکہ صحیح تربیت کے لیے یہ تصور مضر ہے مجھے انٹرویوکیشن کے ذریعہ معلوم ہوا کہ پسماندہ اقوام کے لڑکے مقابلے کے امتحان میں مسلم لڑکوں سے تعداد میں بھی زیادہ ہوتے ہیں اور قامت اور صلاحیت میں بھی اچھے ہوتے ہیں۔ اس بیان کا یہ مدعا نہیں کہ ہمتوں کو پست کیا جائے۔ بلکہ مقصد یہ ہے کہ اس صورتِ حال کو ہم اپنے لیے پیغام عمل سمجھ کر اپنی جد وجہد تیز کر دیں اور اپنی ترقی کے لیے خود کوشش کریں۔ ہمیں کسی ایسی ملک گیر قیادت کا انتظار نہیں کرنا چاہیے جو ہماری مشکلات کو حل کرے۔ ایسی قیادت کا موجودہ حالت میں وجود مشکل ہے۔ "مردے از غیب بروں آید کارے بکند" والی بات کسی اور موقع کے لیے ہے۔ اس وقت ہر شخص کو اپنا دائرہ عمل و رسوخ میں کوشش کرنا چاہیے۔ دو سو سال میں صرف ایک سر سید مرحوم کی شخصیت ایسی نظر آتی ہے جنھوں نے مسلمانوں کی تعلیمی اصلاح و ترقی کے لیے مثبت قدم اٹھایا، ان کے علاوہ ہر میدان میں بہت سی نمایاں شخصیتیں موجود تھیں لیکن ان کے حصّہ میں یہ دولت نہ آئی۔ ہمیں اصلاح کے لیے اپنے گھر اپنے محلہ اور اپنے شہر سے ابتدا کرنی چاہیے۔ ہمیں مقابلہ میں دشواریوں کا مزید سامنا ہے۔ لیکن اس صورتِ حال سے نمٹنے کے لیے کمر کسنے کی ضرورت ہے۔ سہل نگاری اور خوش خرامی سے مسئلہ کا حل نہ ہوگا۔ علم کا سرمایہ ہر دس سال میں دوگنا ہو جاتا ہے۔ ہم اگر جفاکشی و جہد مسلسل سے کام نہ لیں گے تو اس رفتار کا ساتھ نہ دے سکیں گے۔

ہندوستان میں مسلمانوں کو بحیثیت اقلیت گوناگوں مشکلات و مصائب کا سامنا ہے۔ ان مصائب کو دور کرنے کے لیے ان کی طرف سے متعدد کوششیں بھی ہوتی رہتی ہیں۔ لیکن ایسا محسوس ہوتا ہے کہ ابھی اس مسئلہ کے حل ہونے کا وقت نہیں آیا ہے۔ مسلم مفکرین اور مصلحین کی طرف سے اس موضوع پر ہمیشہ کچھ نہ کچھ لکھا اور کہا جاتا رہا ہے۔ لیکن عام طور پر دیکھا جاتا ہے کہ مسلم اقلیت کی مشکلات کے حل کی بات کرتے ہوئے جدید دور کے مسلم دانشور دین و مذہب کا نام بالکل نہیں لیتے۔ گویا مشکلات کے حل کے لیے دین اسلام سے کسی طرح کی توقع نہیں کی جا سکتی۔ لیکن محترم سید حامد صاحب کا نقطۂ نظر اس سلسلہ میں دوسرے دانشوروں سے مختلف ہے۔ چنانچہ انھوں نے اپنی تقریر میں اس موضوع پر روشنی ڈالتے ہوئے فرمایا

"اقلیت کی بقا و خوش حالی کے لیے تین باتیں ضروری ہیں:

۱۔ اول یہ کہ اقلیت اپنے دین و مذہب کی سختی سے پابندی کرے اور ہمیشہ اس کے ذریعہ اپنے شیرازہ کو منظم رکھے۔

۲۔ دوم یہ کہ محنت و ریاضت سے کام لے اپنی قوت بازو کے ذریعہ آگے بڑھنے کی کوشش کرے۔ جانفشانی و تندہی سے کام لے کر اکثریت کا مقابلہ کرے اور ملک کی تعمیر میں دوسروں سے پیچھے نہ رہے۔

۳۔ سوم یہ کہ ملک کی اکثریت کے ساتھ

خوشگوار اور شگفتہ تعلقات رکھے۔

ہندوستانی مسلمانوں کے سامنے ایک اہم مسئلہ باہمی اتفاق و اتحاد کا بھی ہے۔ اس کے لیے ہر طرف سے آوازیں اٹھ رہی ہیں۔ لیکن اب تک اتفاق و اتحاد کا کوئی ایسا عملی نمونہ سامنے نہیں آسکا جس سے یہ توقع کی جاسکے کہ آئندہ ہندوستانی عوام اپنے مسائل کو حل کرنے کے لیے ایک پلیٹ فارم پر جمع ہو جائیں گے یہ نہیں کہا جاسکتا کہ اتحاد و اتفاق کی ضرورت کا احساس مسلمانوں کے کسی ایک طبقہ کو ہے بلکہ حقیقت یہ ہے کہ ہر دردمند دل میں یہ آرزو پوشیدہ ہے، ہر شخص اس پر اظہار خیال کرتا ہے اور مسلمانوں کی موجودہ پراگندگی و گروہ بندی پر کڑھتا ہے۔ سید حامد صاحب جیسے دانشور نے مسلمانوں کے انتشار کا ذکر کرتے ہوئے فرمایا:-

"ہم کو ترقی کرنے کے لیے اپنے اندر احساس تناسب پیدا کرنا چاہیے۔ آج ہم جزوی مسائل پر لڑتے ہیں لیکن اہم مسائل کو نظر انداز کر دیتے ہیں۔ پہلے یہ مرض جنوب کے مسلمانوں میں نہ تھا لیکن اب وہاں بھی یہ فتنہ پہنچ گیا۔ چنانچہ حیدرآباد وغیرہ میں ایسے واقعات پیش آئے ہیں۔ ستم یہ ہے کہ جس ملت کی بنیاد توحید پر تھی اور جس میں اتحاد و اتفاق پر غیر معمولی زور دیا گیا تھا، آج اسی کا اتحاد پارہ پارہ ہے۔ ہمارے اتحاد و اتفاق کی واضح بنیاد خود ہمارے دین میں موجود ہے لیکن ہم نے اسے بھی نظر انداز کر دیا۔ علامہ اقبالؒ نے فرمایا تھا:

منفعت ایک ہے اس قوم کی نقصان بھی ایک
ایک ہی سب کا نبی دین بھی ایمان بھی ایک
حرم پاک بھی اللہ بھی قرآن بھی ایک
کیا بڑی بات تھی ہوتے جو مسلمان بھی ایک
فرقہ بندی ہے کہیں اور کہیں ذاتیں ہیں
کیا زمانہ میں پنپنے کی یہی باتیں ہیں۔

علامہ اقبالؒ نے جو سوال کیا تھا وہی سوال حالی اور دوسرے مصلحین بھی کرتے ہیں۔ ہمارے اداروں میں جو اختلافات ہیں، ان سے کیا کوئی فائدہ ہے؟ ہرگز نہیں۔ ضرورت ہو تو انسان اختلاف کر سکتا ہے، بحث کر سکتا ہے۔ لیکن بلا وجہ اختلاف کا کیا فائدہ۔ ہم پرانے مسائل کو کیوں اٹھاتے ہیں۔ ہمیں مستقبل سے متعلق سوچنا چاہیے۔ ماضی سے نہیں۔ ماضی سے ہم سبق سیکھ سکتے ہیں۔ اختلافات کے لیے مواد فراہم کرنے کی کوشش نہیں کرنا چاہیے۔ ہمیں اپنی اصلاح کے لیے خود قدم اٹھانا چاہیے۔ اللہ تعالیٰ ہمارے دلوں کا حال جانتا ہے۔ وہی قیامت کے دن ہمارے مابین فیصلہ فرمائے گا، ہم کیوں فیصلہ کرتے ہیں؟ ایک شخص اگر اسلام کا اقرار کرتا ہے اور اس کی طرف سے مسلمانوں کی مخالفت یا تخریب کا کوئی عمل ظاہر نہیں ہوتا تو ہمیں اس پر بھروسہ کرنا چاہیے۔ یقین کیجیے تخریب کے لیے اختلاف اور تعمیری کاموں سے گریز تباہی کا پیش خیمہ ہے"

ملک کی تقسیم کے بعد مسلمانوں کے جو مسائل الجھے ہوئے ہیں ان میں ایک مسئلہ اردو زبان کا ہے اس کے لیے مسلمانوں نے نظری کوشش زیادہ کی ہے۔ اور عملی کم۔ یہ مسئلہ چونکہ اب تک نہ سلجھ سکا، اس لیے اردو زبان و ادب کے مستقبل کے بارے میں ہر شخص غیر مطمئن بلکہ مایوس ہے۔

سید حامد صاحب نے اس موضوع پر اظہار خیال کرتے ہوئے اردو کی گتھی کو سلجھانے کے لیے عملی پہلو کی جانب اشارہ کرتے ہوئے فرمایا:

اردو زبان و ادب کے انحطاط کا بڑا سبب یہ ہے کہ اردو پڑھنے والے کم ہوتے جا رہے ہیں کسی زبان کا ادب اسی وقت ترقی کر سکتا ہے جب اس کے ادیب کو عزتِ نفس کے ساتھ

اپنا تخلیقی سلسلہ جاری رکھنے کا موقع ملے۔ آج
اردو کی کتابیں فروخت نہیں ہوتیں۔ اہل قلم کو
اکاڈمیوں اور ریڈیو کے پروگراموں کا سہارا لینا
پڑتا ہے۔ اس صورت حال کے اندر کسی اعلیٰ ادب
کی تخلیق کی توقع عبث ہے۔ آج مدراس اور
کرناٹک میں اردو کے تحفظ کے لیے کوشش
ہو رہی ہے حالاں کہ اردو ان کی مادری
زبان نہیں۔ ہمیں اس سے سبق حاصل کرنا
چاہیے۔ ہم اتنی بڑی تعداد میں ہوتے ہوئے
بھی اپنی زبان کا تحفظ نہیں کر سکتے۔ حالانکہ
یہودیوں نے ہم سے کم ہوتے ہوئے اور
سخت ترین حالات کا سامنا کرتے ہوئے بھی
اپنی مذہبی زبان عبرانی کو آج تک محفوظ رکھا
ہے۔ بلکہ اس کو برابر ترقی دے رہے ہیں
اردو کو بچانے کے لیے ہمیں اس کو اپنے
گھروں پر رائج کرنا اور اس کی تعلیم دینا
چاہیے۔ ہماری روایت رہی ہے کہ گھروں
میں بڑی بوڑھی عورتیں اردو وغیرہ کی
تعلیم دیا کرتی تھیں، اسی سلسلہ کو فروغ
دینا چاہیے۔ اس لیے بھی اردو کا تحفظ ضروری
ہے کہ اس زبان میں ہمارا عظیم دینی و علمی
و تمدنی سرمایہ موجود ہے۔ اگر ہم یہ سمجھتے
ہوں کہ ریڈیو اور فلموں کے ذریعہ اردو
محفوظ رہ جائے گی تو یہ ہماری سادہ لوحی
ہے۔ ہمیں سطح کو نہیں دیکھنا چاہیے بلکہ
اسے کرید کر گہرائی میں پہونچنے کی کوشش
کرنا چاہیے۔

آج ضرورت ہے کہ ہم باعزت
زندگی کے لیے اور مشکلات میں اپنی بقا کے
لیے کوشش کریں اور ملک کی ترقی میں
حصہ لیں۔ ہم تعلیم میں بہت زیادہ پسماندہ
ہیں۔ لیکن اس بات کا احساس بہت
تھوڑے لوگوں کو ہے۔ ان کا تناسب
۵ یا ۱۰ فی صد سے زیادہ نہیں۔ ہمیں اپنی
مدد آپ کرنے کے لیے تیار ہونے کی ضرورت
ہے۔ حالی اور اقبال کے پیغام کو مشعل
راہ بنا کر چلنے کی ضرورت ہے۔ ہمیں دنیا
کے حالات کے مطالعہ سے اور اپنے تجربات
سے فائدہ حاصل کرنا چاہیے۔ دل میں
ملت کا درد پیدا کرنا چاہیے ہماری
نئی نسل اپنے ماضی سے واقف نہیں، اسے
اپنے مصلحین کی نصیحتوں کا علم نہیں۔ اقبال
کا کلام اور حالی کی مسدس ان کو پڑھانا
چاہیے۔ مسدس کی اہمیت کا اندازہ کرنے
کے لیے یہ جاننا چاہیے کہ سرسید کہا کرتے
تھے کہ اللہ تعالیٰ قیامت کے دن پوچھے گا
کہ اپنی نجات کے لیے کیا کام کیا ہے؟ تو
میں جواب دوں گا کہ حالی سے مسدس
لکھوایا ہے"۔

اسکول کے ذمہ داران کو مشورہ دیتے
ہوئے سید صاحب نے فرمایا:

" آپ جن منصوبوں کو نافذ کرنا چاہتے ہیں
ان کو نافذ کیجیے اور مستقبل سے متعلق اندیشہ
کو راہ نہ دیجیے۔ اسکول کو ترقی دیجیے
لڑکیوں کا کالج قائم کیجیے اور ہمت سے
کام لیجیے۔"

بے خطر کود پڑا آتش نمرود میں عشق
عقل ہے محو تماشائے لب بام ابھی

عقل کی لب بامی نے قوم کو شل کیا ہے
ابرہہ جب کعبہ کو منہدم کرنے کے لیے
آیا تو عبدالمطلب اپنے اونٹ واپس
لینے کے لیے اس کے پاس گئے۔ انھوں نے

بقیہ صفحہ ۱۱ پر

حکیم محمد اقبال حسین

پاکیزہ جذبات

جیسے جیسے وقت گزرتا جاتا ہے ہماری عمر میں بھی اضافہ ہوتا جاتا ہے ۔ بچپن سے لڑکپن، لڑکپن سے جوانی اور جوانی سے آگے بڑھاپے کا دور شروع ہو جاتا ہے اور اس امر کا متقاضی ہوتا ہے کہ نظام جسمانی میں تحلیل اور گھساؤ کا عمل کم سے کم واقع ہو۔ تاکہ ہماری قوتیں زیادہ سے زیادہ مدت تک محفوظ اور قائم رہ سکیں۔ ہم عمر کی مدت کو سالگرہوں کی اصطلاح میں شمار کرتے ہیں اور کہتے ہیں کہ یہ ہماری چالیسویں سالگرہ آگئی اور یہ ہماری ساٹھویں سالگرہ آگئی۔ حالاں کہ اگر بہ نظر غائر دیکھا جائے تو جو چیز ہمیں بوڑھا کرنے والی ہے وہ سالوں کا اضافہ نہیں ہے بلکہ ہماری بُری عادات اور رذیل و ادنی خصلتیں ہیں جو ہمارے جسم و دماغ کو بوڑھا کر دیتی ہیں۔ ہم میں سے بہت سے ایسے ہیں جو بڑھاپے کے سامنے ہتھیار ڈال دیتے ہیں اور اس سے بچنے اور محفوظ رہنے کی کوشش نہیں کرتے۔ بالکل اسی طرح جیسے کوئی دریا میں گر کر پانی کے بہاؤ کے ساتھ بہتا چلا جائے اور یہ محسوس تک نہ کرے کہ خدا نے اسے تیرنے کی قوت بھی عطا کی ہے وہ کوشش کرتا تو معمولی سی جد و جہد سے وہ پانی کے دھارے کے ساتھ بہنے کے بجائے اس میں سے تیر کر نکل سکتا تھا۔

اس کا یہ مطلب نہیں ہے کہ ہم اپنی جوانی کو ایک غیر معین مدت تک قائم رکھ سکتے ہیں۔ یہ سوچنا تو بیوقوفی کی بات ہوگی۔ جو کچھ ہم کر سکتے ہیں وہ تو بس اتنا ہی ہے کہ کچھ سالوں کے لیے بڑھاپے کو موخر کر دیں اور اپنے آپ کو بہت سے تکلیف دہ عوارض سے بچالیں اور یہ بھی کچھ کم نہیں ہے۔

آپ نے دیکھا ہوگا کہ بہت سے لوگ ابھی پنشن کی عمر کو پہنچتے بھی نہیں کہ وجع القلب، قروح معدہ و امعاء (معدہ و آنتوں کا زخم) اور اسی طرح کے دوسرے عوارض میں مبتلا ہو جاتے ہیں۔ وہ اپنے ذہن و دماغ اور نظام جسمانی پر اتنا بار ڈال دیتے ہیں کہ بیمار پڑ جاتے ہیں۔ حالاں کہ معمولی سی کوشش سے وہ اس بار سے خود کو بچا سکتے تھے۔

بعض لوگ حسد، کینہ اور تخریب پسندی کا شکار ہو جاتے ہیں اور جل جل کر اپنے آپ کو گھن لگا لیتے ہیں۔ ہماری روزمرہ کی زندگی سے اس کی بے شمار مثالیں مل جائیں گی۔ مثلاً زید سے بکر کو کوئی نقصان پہنچ جاتا ہے۔ بکر اپنے اس نقصان کی تاب نہ لا کر زید کو جوابی نقصان پہنچانے کی فکر میں لگ جاتا ہے اور چاہتا ہے کہ اسے نقصان پہنچا کر اپنا حساب بیباق کرلے۔ مگر جلد موقع نہ پاکر سخت الجھن میں مبتلا رہتا ہے۔ اس کے دل میں ایک آگ ہر وقت سلگتی رہتی ہے۔ طرح طرح کی

تجویزیں سوچتا ہے اور رات دن اسی فکر میں لگا
رہتا ہے کہ کب موقع ملے اور کب میں زید کو نقصان
پہنچاؤں - یہاں تک کہ اس کی راتوں کی نیند حرام
ہو جاتی ہے۔ بکر کو خبر بھی نہیں ہوتی، وہ تو آرام
اور سکون سے رہتا ہے مگر زید صاحب ہیں کہ مستقلاً
ذہنی کوفت اور جلن میں مبتلا رہتے ہیں۔ چنانچہ
اس مستقل کوفت اور جلن کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ
اس کا نظامِ ہضم خراب ہو جاتا ہے اور پھر یہاں سے
دوسرے متعدد عوارض کا ایک منحوس چکر شروع
ہو جاتا ہے۔

بعض صاحبان حرص و لالچ میں مبتلا ہو کر
بے تحاشا روپیہ جمع کرنے کی دھن میں لگ جاتے ہیں
تاکہ وہ جب قبر میں پہنچیں تو امیر ترین آدمی کہلائیں
دولت جمع کرنے کی دھن ان کی زندگی کی مدت کو
اس حد تک کم کر دیتی ہے کہ انہیں جمع شدہ دولت کو
استعمال کرنے کی نوبت بھی نہیں آتی۔

اس طرح خوف آدمی کے قلب و اعصاب
کو نہایت کمزور کر دیتا ہے۔ ایک کہانی مشہور ہے
کہ ایک حاجی کی ملاقات طاعون سے ہوئی - اس نے
طاعون سے پوچھا کہ حضرت اب کہاں کا قصد ہے؟
طاعون نے جواب دیا کہ بغداد جا رہا ہوں اور وہاں
پانچ ہزار آدمیوں کی جان لوں گا - کچھ دن بعد اسی
حاجی نے طاعون کو واپس آتے ہوئے دیکھا اور کہا
کیسے حضرت! آپ نے تو کہا تھا کہ میں پانچ ہزار آدمیوں
کی جان لوں گا۔ وہاں پہنچ کر تو آپ نے پچاس ہزار
کو ختم کر دیا۔ طاعون نے جواب دیا - جی نہیں، میں
نے تو ۵ ہزار کی جان لی تھی باقی تو محض خوف سے
مرے ہیں۔

خیر یہ تو قصے کہانی کی بات ہے۔ لیکن
اس میں خوف سے متعلق جو یہ بات بتائی گئی ہے کہ
وہ کس درجہ مہلک اور خطرناک ہے وہ اپنی جگہ سو فیصدی
صحیح ہے - جدید تحقیقات اور تجربات کی رو سے بھی
آج یہ امر ایک ثابت شدہ حقیقت ہے کہ جسم اور
دماغ ایک ناقابلِ تقسیم وحدت ہے - ہمارا دماغ
ہمارے جذبات کا مرکز ہے اور ان جذبات کا
اثر ہمارے نظام جسمانی پر بھی برابر پڑتا رہتا ہے۔

ذرا کبر و غرور کو اپنے اوپر مسلط ہونے
کا موقع دے دیجیے۔ پھر دیکھیے کہ اعصاب میں
کس درجہ تناؤ پیدا ہو جاتا ہے۔

ذرا غیظ و غضب کا دورہ اپنے اوپر پڑنے
دیجیے پھر دیکھیے کہ یہ کس طرح آپ کے دورانِ
خون میں حدت پیدا کرتا اور قلب کو متاثر کرتا
ہے۔

ذرا لالچ اور حرص کو اپنے اوپر قبضہ کرنے
دیجیے پھر دیکھیے کہ یہ کس طرح آپ کو گھن کی طرح کھا
جائے گا اور خرابیٔ جگر کے باعث آپ کے چہرے
پر زردی کھنڈ جائے گی - ذرا نفرت اور حسد کو
اپنے دل میں موجزن ہونے دیجیے پھر دیکھیے کہ یہ
کس طرح آپ کے خون کے دباؤ کو بڑھا دیتا ہے۔
اور جسمانی اعتبار سے کسی کام کا نہیں چھوڑتا -

جب حقیقتِ حال یہ ہے تو میں نہیں سمجھتا کہ
جسمانی صحت کا کوئی تصور اپنے ذہن کو غلط قسم کے
جذبات و تصورات سے پاک کیے بغیر آپ کر سکتے ہیں

اچھے جذبات و تصورات درحقیقت ہمارے
جسم کے انجن کے لیے ایک صحیح قسم کے ایندھن کا کام
کرتے ہیں - آپ کی کار کا انجن مٹی کے تیل سے بھی چل
سکتا ہے لیکن اس کے لیے صحیح ایندھن مصفیٰ پٹرول
ہے - اگر آپ اس میں صحیح ایندھن استعمال کریں گے
تو آپ کی کار کے انجن کی قوتِ کارکردگی بڑھ جائے
گی اور زیادہ عرصہ تک بغیر خراب ہوئے چل سکتا ہے
بالکل اسی پر آپ اپنی جسمانی حالت کو قیاس کر لیجیے
اگر آپ کے اندر ہمدردی، رحم، عفو و درگزر، صلۂ رحمی

حسنِ ظن، رجائیت اور شادباشی جیسی اعلیٰ خصلتیں
موجود ہیں تو گویا آپ کے جسم کے انجن کے اندر بہت
عمدہ قسم کا ایندھن موجود ہے اور وہ آپ کے جسم
کی گاڑی کو منزلِ مقصود پر بغیر راستہ میں خراب ہوئے
پہنچا دے گا۔ لیکن اگر اس کے برعکس آپ کے اندر
خود غرضی، حسد، نفرت، خوف، حرص، کینہ پروری
جیسی بُری اور ادنیٰ خصلتیں ہیں تو گویا آپ کے جسم میں
غلط قسم کا ایندھن ہے اور وہ آپ کی گاڑی کو مشکل
ہی سے منزل پر پہنچا پائے گا۔ اور راستے میں متعدد
بار خراب ہوگا۔ اس سے معلوم ہوا کہ ہماری بیماریوں
کے اسباب میں ہماری رذیل خصلتیں اور ہمارے کردار
کے مذموم صفات کو بہت بڑا دخل ہے اور اگر طبیب
یا ڈاکٹر ہماری اِن پوشیدہ خرابیوں کا جائزہ نہیں لے
سکتے تو کم سے کم ہم خود اس اہم نکتہ کو سمجھ کر پیدائشِ
امراض کے اِس نفسیاتی پہلو سے کسی طرح بھی صرفِ نظر
نہ کریں اور اپنی اِن پوشیدہ اور چھپی ہوئی خرابیوں
اور معایب کو دور کرنے کی فکر کریں۔

سمندر میں برف کا بڑے سے بڑا تودہ بھی
بہت چھوٹا سا نظر آتا ہے۔ اب اگر کوئی جہازران
برف کے تودے کا جو تھوڑا سا حصہ باہر نظر آرہا ہے
اس کو دیکھ کر سمجھ لے کہ یہ میرے جہاز کو نقصان
نہیں پہنچا سکتا اور اس کے اس تین چوتھائی حصہ
کا کوئی نوٹس نہ لے جو پانی کے اندر چھپا ہوا ہے
تو وہ اپنے جہاز کو شدید خطرے میں مبتلا کر دے
گا۔ اسی مثال پر آپ اپنی ذہنی کیفیات اور ادنیٰ
خصائل و جذبات کو قیاس کریجیے جو دماغ کے اندر
چھپے ہوئے ہیں اور نظر نہیں آتے۔ ہمارے دماغ
کے اندر ذاتی تجربات و مشاہدات کا ایک بہت بڑا
ذخیرہ ہوتا ہے۔ ہم کوشش کرتے ہیں کہ ناخوشگوار
واقعات اور تلخ تجربات کو بھلا دیں۔ لیکن وہ
ہمارے تحت الشعور میں رہتے ہیں اور ان کا
اثر ہمارے نظامِ جسمانی پر پڑتا ہے۔

جدید طبی لٹریچر کو دیکھنے سے معلوم ہوتا
ہے کہ اب مغربی طب انسانی عوارض کے اس نفسیاتی
پس منظر کا تھوڑا بہت ادراک کرنے لگی ہے اور اس
امر کی توقع ہو چلی ہے کہ بیماریوں کے اس نفسیاتی پس
منظر پر کام کیا جائے، تو یہ حقیقت کھل کر سامنے آجائے
گی کہ ہمارے جسمانی عوارض کی پیدائش میں ہماری ذہنی
اور جذباتی کیفیت کچھ کم اہمیت نہیں رکھتی۔ چنانچہ
برٹش میڈیکل ایسوسی ایشن نے گٹھیا کے اسباب کی چار
سالہ تحقیقات کی جو رپورٹ شائع کی ہے یہاں اس کے
چند اقتباسات ملاحظہ فرمایئے اور دیکھئے کہ اس میں
بیماری کی نفسیاتی پس منظر کو کس قدر اہمیت دی
گئی ہے۔

"مریض کے جوڑوں میں درد اس وجہ سے
ہوتا ہے کہ اس کا ذہن اور دماغ کوفت
اور تکلیف میں مبتلا ہے۔"

"لندن کے سینٹ اسٹیفن ہسپتال میں
چار سال تک ۱۰۹ مریض لندن کے دو ماہرین
کے زیرِ مطالعہ رہے۔ تمام مریض شدید
تکلیف اور درد کی شکایت کرتے تھے لیکن
جب ان کا تفصیلی معائنہ کیا گیا تو گٹھیا کی
کوئی علامت ان میں نہیں پائی گئی۔ ان
میں سے نصف مریضوں میں سخت قسم کی
ذہنی پریشانی پائی جاتی تھی۔ شدید قسم کی
مایوسی اور تلخی جو نہایت پریشان کن
ماحول کی پیداوار ہوتی ہے ان میں عام
تھی ان میں سے بعض مریضوں کے مزاج
میں بڑی تندی اور سختی پائی جاتی تھی"

اعداد و شمار سے یہ بھی معلوم ہوا کہ مردوں
کے مقابلے میں عورتوں کو گٹھیا کی شکایت زیادہ
ہوتی ہے۔ اس رپورٹ کے اختتام پر جو سفارشات

کی گئی تھیں ان کا خلاصہ یہ ہے:-

"گٹھیا کی روک تھام اور علاج کے لیے جو اسکیم قومی پیمانے پر کی جا رہی ہے۔ اس میں نفسیاتی پس منظر کی تحقیق و تشخیص کے لیے کافی سہولتیں فراہم کی جانی چاہیں اور معالجین کو چاہیے کہ وہ گٹھیا کے علاج و تدارک کے لیے عضلات و رباط سے ماورا، مریضوں کی خانگی و عائلی زندگی، ان کی اقتصادی حالت اور کام کرنے کی جگہوں کا جائزہ ضرور لیں"۔

یہ رپورٹ ۱۹۵۱ء میں پیش کی گئی تھی یعنی آج سے بتیس۳۲ سال پہلے۔ ممکن ہے امریکہ اور یورپ میں علاج معالجہ میں اس رپورٹ کی سفارشات پر عمل کیا جاتا ہو۔ یہاں تو بیشتر معالجین کو یہ خبر بھی نہ ہوگی کہ ایسی کوئی تحقیق بھی ہوئی ہے اور علاج الامراض میں نفسیاتی عنصر کا بھی کوئی دخل ہو سکتا ہے۔ حکیم اجمل خاں مرحوم اور لکھنوی مکتب فکر کے بعض اطبا ر تک تو یہ طریقہ رائج تھا کہ مریض کے معائنہ کے وقت جہاں وہ اس کے نظام جسمانی کا جائزہ لیتے تھے، وہاں وہ اس کے ماحول خانگی معاملات اور اس کی انفرادی مزاجی کیفیات کو پیش نظر رکھتے تھے اور اپنی ہدایات اور تجویز میں اس نفسیاتی عنصر کو اچھی خاصی اہمیت دیتے تھے۔ لیکن اب تو طب مشرق کے حاملین بھی بس رواروی میں علاج کرتے ہیں۔ حالاں کہ میرے نزدیک تشخیص اور ازالۂ مرض کے لیے یہ نفسیاتی عنصر جسمانی اور عضوی اسباب کے مقابلہ میں خاص طور پر آج کل کی معاشرتی زندگی میں کچھ زیادہ ہی اہمیت رکھتا ہے۔ سوال پیدا ہوتا ہے کہ اس صورت حال کا تدارک کس طرح کیا جائے۔ صرف دواؤں سے تو اس قسم کے عوارض پر قابو نہیں پایا جا سکتا۔ اس کا جواب یہ ہے کہ اس قسم کے نفسیاتی پس منظر کی موجودگی میں کوئی تجربہ کار معالج محض دواؤں سے کبھی علاج نہیں کرے گا۔ بلکہ وہ مریض کی مکمل ہسٹری ریکارڈ کرے گا اور نفسیاتی علاج میں وہ سب سے پہلے اس امر کا مشورہ دے گا کہ ماضی کی تلخیوں اور ناکامیوں کو بھلانے کی کوشش کی جائے بعض لوگوں کو یہ عادت کہ وہ پرانی تلخیوں کو کرید کرید کر سامنے لاتے ہیں اور خوب کڑھتے ہیں، نہایت تکلیف دہ اور ضرر رساں ثابت ہوتی ہے۔ ایسے لوگ جسمانی اعتبار سے کبھی صحت مند نہیں دیکھے گئے۔ چنانچہ انھیں چاہیے کہ وہ ہمیشہ اپنے سے زیادہ تکلیف اور مصیبت میں مبتلا لوگوں کو دیکھیں اور اپنے برے اور خراب دنوں کو یاد کرنے کے بجائے ایسے ہزاروں لوگوں پر نگاہ رکھیں جو اپاہج، مفلوج، نابینا اور پاگل ہو گئے ہیں اور اللہ تعالیٰ کا شکر ادا کریں کہ اس نے انھیں بہت سی تکالیف و شکایات سے بالکل محفوظ رکھا ہے۔ ایسے ذہن کے پیدا کرنے کا نتیجہ یہ ہوگا کہ وہ بڑی حد تک بیماریوں سے محفوظ رہیں گے۔

ایسے لوگوں کو دوسرا مشورہ یہ ہے کہ وہ اپنے معاملات کی طرف متوجہ ہونے کے بجائے ان لوگوں کی امداد و اعانت کی طرف متوجہ ہوں، جو ان کے مقابلے میں زیادہ گرے ہوئے اور پست ہیں۔ وہ اپنے آپ کو ان کی دیکھ بھال اور امداد کی طرف لگا دیں گے تو اپنی تکالیف اور شکایات کو بھول جائیں گے۔ ہر وہ گھڑی جو دوسروں کی امداد و اعانت میں صرف ہوگی آپ دیکھیں گے کہ وہی آپ کے لیے حقیقی سکون و راحت کی ہوگی۔ اس لیے کہ ہمارا دماغ یک طرفہ راستہ ہے جس وقت وہ دوسروں کے متعلق سوچ رہا ہوگا تو اپنے متعلق نہیں سوچ سکتا۔

بہت سے لوگ محض اپنی اغراض اور مفادات ہی کے گرد گھومتے رہتے ہیں۔ جہاں کسی کو کچھ دینے کا سوال آیا اور وہ پیچھے ہٹ گئے۔ امداد و اعانت سے ہمیشہ گریزاں رہتے ہیں اور ایسا موقع

باقی صفحہ نمبر ۶ پر

منشی ذکاء اللہ مرحوم

کیسا غلط خیال ہے کہ زمانہ بر سرِ تنزّل ہے

منشی ذکاء اللہ ۱۸۳۲ء میں دلی میں پیدا ہوئے۔ ان کے والد کا نام حافظ ثناء اللہ اور دادا کا نام حافظ بقاء اللہ تھا۔ منشی ذکاء اللہ کی تعلیم و تربیت اُن کے دادا کی آغوش میں ہوئی۔

دلی کالج کے شعبہ مشرقی میں منشی ذکاء اللہ نے تعلیم حاصل کی۔ ان کے اساتذہ میں مولانا امام بخش صہبائی اور ماسٹر رامچندر تھے۔ اس دور میں دینِ مسیح کی تبلیغ ملک میں بڑے پیمانے پر ہوتی تھی۔ حکومت ان تبلیغی کوششوں میں اعانت کرتی تھی۔ سیکڑوں ہندوستانی عیسائی ہوگئے تھے۔ ماسٹر رامچندر ان میں سے تھے۔ منشی ذکاء اللہ پر ماسٹر رامچندر کی تعلیم و تربیت کا اثر غالب تھا۔ منشی ذکاء اللہ نے درس و تدریس کا مشغلہ اختیار کیا۔ وہ آگرہ کالج میں اردو ادبیات کے استاد رہے۔ ۱۸۵۸ء میں مرادآباد اور بلند شہر میں انسپکٹر مدارس کے عہدے پر فائز رہے۔ وہ نارمل اسکول دہلی کے ہیڈ ماسٹر رہے اور میو سنٹرل کالج میں بھی انھوں نے پڑھایا۔ اور آخر میں علی گڑھ کالج میں ریاضیات کے آنریری پروفیسر رہے اور مدرستہ العلوم میں رورکی کے انجینئرنگ کالج کے لیے لڑکوں کو تیار کرتے رہے۔

منشی ذکاء اللہ اپنے دور کے مشہور دانشور تھے۔ اس دور میں منشی ایک صاحب علم کو ہی کہا جاتا تھا۔ اس بنا پر ذکاء اللہ منشی کہلائے۔

منشی ذکاء اللہ نے مغربی علوم سے ہندوستانیوں کو آشنا کیا۔ وہ سرسید کی سائنٹفک سوسائٹی کے بھی ممبر تھے۔ انھوں نے اس سوسائٹی کی انگریزی کی علمی کتب کا اردو ترجمہ کیا۔ ان کی درسی کتب کے تراجم بیسویں صدی کے ابتدائی سالوں تک داخل نصاب رہے۔ پھر انگریزی میں بھی نئی کتابیں آنے لگیں تو پرانی کتب کے تراجم خارج از نصاب ہوگئے اور نئی کتب کا ترجمہ کرنے کے لیے منشی ذکاء اللہ بھی نہ رہے۔ ۷ نومبر ۱۹۱۰ء کو وہ انتقال کر گئے۔

بچپن سے آخر عمر تک منشی ذکاء اللہ کی ایک ہی وضع قطع رہی۔ انگرکھا، کالی گول ٹوپی، دلی کا سلیم شاہی جوتا۔ انھوں نے ساری عمر پہنا۔ وہ بڑے با اخلاق اور صاحبِ کردار تھے۔ غرور و تمکنت ان میں نام کو نہ تھا۔ خاموشی کو چرب زبانی پر

ترجیح دیتے تھے۔ انھوں نے بہت سی کتابیں ترجمہ کیں اور تالیف کیں۔ لیکن زمانہ نے نہ صرف ان کی کتابوں کو بھلایا، خود ان کو بھی بھلا دیا۔

ان کا مشہور مضمون "کیسا غلط خیال ہے کہ زمانہ بر سر تنزل ہے" تہذیب الاخلاق میں شائع کیا جا رہا ہے

زمانہ کے تنزل سے ہماری مراد ساری دنیا کے تنزل سے بحیثیت مجموعی ہے، کسی خاص شخص یا خاندان و ملک و ملت سے نہیں ہے۔

دنیا میں یہ بات بھی ہوتی آئی ہے کہ پیرانِ سال خوردہ کا ایک گروہ ہوتا ہے کہ وہ ہمیشہ صبح و شام زمانۂ قدیم کی حمد و ثنا کا وظیفہ پڑھتا ہے اور زمانہ حال پر تبرا بھیجتا ہے اپنے زمانہ کی وہ ایسی تصویر بناتا ہے جس کا ہر جزو اور عضو بدنما اور برا معلوم ہو اور زمانۂ قدیم کی باتوں کا ایسا بت بناتا ہے کہ جس کی ہر ادا اور انداز دل ربا ہو۔ اس کے دل میں یقین ہوتا ہے کہ جو صاحب فضل و کمال اور جامع صفات جلال و جمال پہلے زمانہ میں گزرے ہیں، اب وہ خواب و خیال میں بھی نظر نہیں آتے جو پیغمبران سخن ہو چکے ہیں ان کا نظیر و عدیل ہونا محالات سے ہے جو سرور سر احسن آرا پہلے پیدا ہوئے ہیں، ان کا اب پیدا ہونا ساز معدوم کی صدا ہے۔ غرض کہ وہ انسان کے ایسے دشمن ہو جاتے ہیں کہ وہ اس کی انسانیت ہی کو اپنی باتوں میں اڑانا چاہتے ہیں۔ رات دن یہی بڑبڑایا کرتے ہیں کہ اب دین و دنیا کی ساری خوبیاں ختم ہو گئیں۔ جتنے کمال تھے ان کا زوال آ گیا جتنے عیب تھے ان کا کمال ہو گیا۔ نقص کی بیشی اور کمال کی کمی ہے۔ سپہ گری، دست کاری، صناعی، خوش خلقی نیک سیرتی، مروت، فتوت جودت، سخا، حلم و حیا، استقامت و استقلال۔ غرض جتنے اعلیٰ درجہ کی روحانی اور عقلانی خوبیاں تھیں سب کی سب رخصت ہو گئیں۔ یہاں تک کہ پہلی خوبیاں بھی پہلی سی نہیں۔ نہ پہلے سے اب رستم تہمتن قوی بازو، توانا تنومند آدمی پیدا ہوتے ہیں۔ نہ آدمیوں کی عمریں پہلی سی ہوتی ہیں نہ وہ قدیمی صحیح المزاجی ہے۔ یہاں تک کہ ان کے دماغ میں مالیخولیا ہو جاتا ہے کہ وہ کہتے ہیں کہ موسموں میں بھی پہلا سا اعتدال نہیں رہا۔ نہ برسات میں وہ بارشیں ہیں نہ موسم گرما میں وہ گرمی، نہ موسم سرما میں وہ سردی۔ سرے سے آفتاب کی حرارت اور زمین کی برودت ہی کم ہو گئی۔ پیداوار ارضی زمین کے اندر تحت الثریٰ کو چلا جاتا ہے۔ آسمان اب اور ہی چکر کھا رہا ہے۔ ہندوستان میں ہندو بیٹھا ہوا بک رہا ہے۔ پہلے ست جگ تھا اب کلجگ ہے۔ مسلمان بڑبڑا رہا ہے کہ یہ تیرھویں صدی ہے۔ پھر اپنے کلام کی تائید میں شعرا کے اشعار، بزرگوں کے قول مذہبی، بیقین گو تماں بیاں ہو رہی ہیں۔ کوئی بہ آواز حزیں حافظ کی یہ غزل پڑھ رہا ہے ؎

این چہ شور است کہ در دور قمری بینم الخ

جب کوئی بڑے میاں اپنا بکواس سے میرے کان کھاتے ہیں تو میں بھی ان سے عرض کرتا ہوں کہ ہاں حضرت سچ ہے کہ اس میں شک نہیں کہ پہلے زمانے کی بعض خوبیوں اور کمالوں میں زوال آ گیا ہے مگر اس کی جگہ زمانہ حال میں بہت سی خوبیاں اور فضل و ہنر اور کمال پیدا ہو گئے ہیں۔ اور بہت سے عیوب قدیم زمانہ کے اب مٹ گئے ہیں۔ اگر زمانہ کی ترقی اور تنزل کو میزان عدالت میں عقل مستقیم سے تولیے تو اس زمانہ کی ترقی کا پلڑا ایسا

بھاری ہوگا کہ پہلے زمانے کی ساری خوبیاں اس کے پاسنگ
بھی نہ چڑھ سکیں گی جنہوں نے زمانہ کے حالات کی
تحقیقات کو پایۂ کمال پہنچایا ہے۔ ان کا قول یہ ہے کہ
زمانہ کی چال اس خط میں ہے۔ ابتدا بائیں طرف سے
ہے اور ترقی کا منہ دائیں طرف یعنی زمانہ آگے بڑھ
کر پیچھے کو ہٹتا ہے مگر اس ہٹنے میں بھی پہلے زمانہ سے
بھی آگے بڑھا ہوا رہتا ہے، یہ معلوم ہوتا ہے کہ وہ
پیچھے اس لیے ہٹتا ہے کہ اپنے میں زور پیدا کر کے آگے
جست اور زقند مارے غرض دنیا روز بروز ترقی
کرتی جاتی ہے۔ اس کی ترقی کی ہزاروں باتوں میں
سے دو چار کا بیان بطور مشتے نمونہ از خروارے
کرتا ہوں اور ان کے دلائل بھی ساتھ ساتھ دیتا ہوں
شاید کوئی نوجوان یہ کہے کہ آپ سب باتوں کے بتانے
میں کیوں بخل کرتے ہیں؟ وہ کس روز کے لیے
اٹھا رکھے ہیں؟ تو میں بڑے میاں کی طرف آنکھ
سے اشارہ کر کے کہوں گا کہ آپ جانتے ہیں کہ میں
کس سے مخاطب ہو رہا ہوں۔ وہ دو چار باتیں ہی
میری سن لیں اور آپے سے باہر نہ ہوں تو بہت
غنیمت جانوں۔

جس بات پر بوڑھے ہماری بڑی جان
کھاتے ہیں، وہ یہ ہے کہ آج کل کے زمانے میں جیسا
آدمیوں کا اخلاق بگڑ گیا ہے، ایسا پہلے کبھی نہیں
ہوا۔ پہلے لوگوں کے جیسے اخلاق، اوضاع، اطوار
اچھے تھے، ایسے ہی اب برے ہیں۔ یہ ان کی خود
بد طینتی اور خبث باطنی ہے کہ ہم کو بد جانتے ہیں
زمانۂ حال میں روز یہ سننے میں آتا ہے کہ آج یہ
علم و ہنر میں ایجاد ہوئی کل وہ، مگر کبھی یہ نہیں
سنا جاتا کہ قتل، چوری، راہزنی، قزاقی، ٹھگی،
ڈکیتی میں کوئی بات ایسی ایجاد ہوئی کہ جس میں
متقدمین استاد نہ تھے۔ روزگار کا قاعدہ ہے کہ
وہ گردش سے خالی نہیں رہتا۔ انقلاب اس کی شان
سے ہے۔ ہر زمانے کے دستور کے موافق جرائم شمار
ہوتے ہیں۔ اب اگر ارتکاب جرائم کا شمار زمانہ حال
اور ماضی کا کیا جائے تو اس سے معلوم ہوگا ان
کی تشدد اور سختی میں بہت نرمی ہو گئی ہے۔

پہلے زمانے کا یہ دستور تھا کہ جرائم نہایت وحشیانہ
اور خارج از انسانیت ان سے سرزد ہوتے تھے۔
اگر زید اپنے ہمسایہ یا کسی دوست عمرو سے باتوں
ہی باتوں میں ناراض ہو گیا تو جھٹ بھٹا سا سر اس
کا اڑا دیا اور جی میں آئی تو دشمن کے گھر میں آگ لگا
کر اس کے خان و مان کو بھسم کر دیا۔ مگر اب زمانے
کا یہ طور نہیں رہا۔ اگر زید کی عمرو سے دشمنی ہوتی ہے تو
دونوں منہ پر ایسے ملتے ہیں کہ گویا دونوں دوست
ہیں۔ ہاں پیٹھ پیچھے ایک دوسرے کا خاکہ اڑاتے ہیں
اور ایک دوسرے کی نیک نامی کو بٹہ لگاتا ہے۔
اگر زید عمرو کا ایسا دشمن ہو جائے کہ اس کی جائیداد
کا مالک ہونا چاہے تو پہلے زمانے کے موافق یہ نہیں کرنے
کا کہ خانہ جنگی کر کے عمرو کو مار ڈالے اور اس کی جائداد
پر قبضہ کر لے بلکہ کسی حکمت اور ترکیب سے عمرو کو قرض
کے جال میں پھنسا دے گا اور اس کے سود کے ہیر
پھیر میں لا کر نالش کرے اور جب عمرو روٹیوں کو محتاج
ہو جاوے گا تو اس کے جیل خانہ میں بھجوانے کے لیے
کمبل خریدے گا اور جائداد قرق کرائے گا۔ اگر عمرو
اس تذلیل کے ساتھ جینے کو مرنے سے بہتر سمجھے اور
اپنے تئیں طمانچہ مارلے تو یہ اس کی حماقت ہے۔
دشمن کا اس میں کیا قصور ہے۔ اگر زمیندار کاشتکار
کی سرکشی پر ناراض ہو جاتا ہے تو یہ نہیں ہوتا کہ
اس کا سر مارے جوتیوں کے پلپلا کر دے اور اس
کے گھر کو اپنے گاؤں سے اکھڑوا کر پھینک دے۔
جورو بچوں سے اس کے بھیک منگوائے، اس کے
منہ پر مرچوں کا توبڑا چڑھائے، اگاڑی پچھاڑی
بندھوا کے گھاس کھلوائے مگر اس کے دق اور

حیران کرنے اور مفلس بنانے کے لیے جھوٹی نالشیں کرے گا
غرض اس زمانے میں جب کوئی ایسے اشد اسباب دشمنی
کے جمع ہوجاتے ہیں کہ ایک دوسرے کے قتل کرنے پر ہاتھ
اُٹھاتا ہے۔ ورنہ پہلے زمانہ کی طرح بات بات پر قتل انسانی
نہیں ہوتا۔ اب جو لوگ یہ شکایت کرتے ہیں کہ جھوٹ فریب
دغا کا بازار گرم ہے تو اس کا سبب یہ ہے کہ جرائم کبیرہ
مقاتلت سے انسان نے اجتناب کیا ہے اور اس کے عوض
میں ان جرائم صغیرہ دغا و فریب کو اختیار کیا ہے۔ اگر
پہلے زید اور عمرو میں دشمنی ہوتی تو دونوں میں سے
ایک کبھی نہ ہوتا یا ایک رہتا، دشمنی کا قصہ پاک ہوتا۔
انسان نے اخلاق میں ایسی ترقی کی ہے کہ وہ جاں ستانی
نہیں کرتا، مگر دشمنی قائم رکھتا ہے۔ اس لیے آپس میں
بجائے تیغ بازی کے دغا بازی کی چالبازیاں ہوتی ہیں
پس جو لوگ اس زمانے کی بد اخلاقی کی دلیل بتاتے ہیں
وہ اس کے حسن اخلاق کی ترقی کی شہادت دیتے ہیں۔ یہ
چھوٹی چیزیں اس نے بڑے جرموں کے عوض اختیار کی ہیں
پس جب انسان کے بدگروہ میں اخلاق کی یہ ترقی ہو
کہ اس نے جرائم کبیرہ سے توبہ کی تو نیک گروہوں کا ذکر
ہے۔ اب دیکھنا چاہیے کہ انسان نے اپنی طرز معاشرت
میں کس قدر ترقی کی ہے کہ وہ پہلے آدمیوں کو کبھی خواب
میں بھی دکھائی نہیں دی۔ اوّل اس نے وہ تعصب جو
اس کو غیر ملکوں کی چیزوں کے استعمال میں تھا، چھوڑ دیا
خذ ما صفا ودع ما کدر پر عمل شروع کیا۔ آج کل
کسی شریف کے در دولت پر جایے اور اس کے ہر
خانے کو دیکھیے تو اس سے یہ بات ظاہر ہو جائے گی۔
باغ کو دیکھیے تو ساری دنیا کے منتخب پھول اس کے
باغ میں ہیں۔ لباس و پوشاک کو دیکھیے تو سر پر ٹوپی
ترکی ہے تو جسم پر فرانس کا کوٹ ہے جس میں بوتام
انگلستان کے لگے ہوئے ہیں۔ کسی چیز میں یہ تخصیص نہیں
نہیں معلوم ہوتی کہ وہ اپنے ملک کی وضع کا متعصب ہے
کتب خانے کی سیر کیجیے تو ایک ہی طرح مختلف علوم و
فنون و مذاہب مختلفہ کی کتابیں دھری ہیں۔ ان سے
معلوم ہوتا ہے کہ اس کو کس فن کا زیادہ شوق ہے۔
میز پر دسترخوان چنا دیکھیے تو طرح طرح کی نعمتیں موجود
ہیں۔ اگر ایک پیالے میں گائے کا عمدہ مسکہ یا گھی دھرا
ہے تو دوسرے پیالے میں فرانس کے رنگترے کا مربّا اور
تیسرے میں چین کا ادرک کا مربّا دھرا ہے جس سے معلوم
ہوتا ہے کہ صاف باطن، نیک باطن، نیک طینت ساری
دنیا کے آدمیوں کے ہاتھوں کو ایک سا سمجھتا ہے، جن کی
بنائی ہوئی چیزوں کے کھانے کو یکساں جانتا ہے۔ کسی
انسان کے ہاتھوں پر نجاست کا احتمال کرنا خباثت قلبی کا
اظہار کرنا ہے۔ پھر اگر گفتگو مذہب کی کیجیے تو یہ بھی معلوم
نہیں ہوگا کہ کس مذہب کا آدمی ہے۔ جس تعظیم و تکریم
ادب سے وہ اپنے مذہب کا ذکر کرے گا اسی طرح
اوروں کے مذہب کا۔ جو کلمات تعظیم حضرت عیسیٰ کی نسبت
زبان پر آویں گے وہی بدھ اور کنفیوشش کی نسبت
غرض اس کے تمام اوضاع و اطوار اور طرز معاشرت
سے یہ معلوم ہوگا کہ وہ سارے بنی نوع انسان کو
اپنا بھائی سمجھتا ہے اور اس کو کسی کے ساتھ نفرت
نہیں ہے۔ نہ وہ کسی کو کافر کہتا ہے نہ کسی کو ملاکش
بتاتا ہے۔ غرض کوئی بُرا لفظ اس کی زبان پر نہیں آتا۔
بھلا یہ شرافت کا برتاؤ پہلے انسانوں کے ذہن میں
کب تھا۔ پہلی بسم اللہ تو ان کی یہ ہوتی تھی کہ اپنے
سوا سارے انسانوں کا نام اوّل سے ایسا رکھتے
تھے کہ جس سے خباثت باطنی ظاہر ہوتی تھی۔

اب مذہب پر خیال کیجیے کہ پہلے اس کے کیا
اصول تھے، اب کیا ہیں۔ جن باتوں کو متقدمین یہ جانتے
تھے کہ ان سے انسان ملکی صفات بن کر فرشتہ ہے
وہ حقیقت میں ان کو بہائم سیرت بنا کر وحشی جانور
بناتی تھیں۔ انھوں نے خلاف فطرت (نیچر) تزکیہ نفس
کے لیے جو چلہ کشی اور خلوت نشینی و مجاہدات و کم خوابی
بے خوراکی اور استغراق ذات اور فنا فی الفنا ہونا مقرر

کیا تھا، اس کا نتیجہ سوا اس کے کہ انسان کے دماغ
میں خلل پیدا ہو اور کیا تھا۔ دنیا اور مافیہا سے قطع
تعلق کرنا سوا اس کے کہ انسان کو جانور بنادے اور
کچھ نہ تھا۔ اب اس کی جگہ یہ اصول قائم ہوئے ہیں کہ
انسان اپنے دل و دماغ کو کام میں لاکر دنیا کی ساری
چیزوں سے، جو نفع ان سے اٹھا سکتا ہے، اٹھائے۔ یہی
اس کی فرشتہ منشی ہے۔ اس کا قطع تعلق کرنا بہائم سیرتی
ہے۔ ایک آدمی جوگی بن کر پہاڑ کی چوٹی پر جا بیٹھے تو اس
سے کوئی نفع انسانیت کو نہیں پہونچے گا۔

اب گورنمنٹ کی طرز پر خیال کیجیے کہ پہلے بادشاہ
معاذ اللہ دوسرا خدا سمجھا جاتا تھا۔ اس کی فضول خرچیوں
کے لیے ہزاروں غریبوں کا گلا کاٹا جاتا تھا۔ اب بادشاہ
حقیقت میں کاٹ کی پتلی ہوتی ہے جو سارے کام فرمانروائی
کے لیے چلاتا ہے اور اس کے عوض کچھ رعایا سے اپنی ذاتی
فضول خرچی کے لیے نہیں مانگتا اور مزدوروں کی طرح
اپنے کام کی مزدوری پاتا ہے گو پہلے ملکوں میں کبھی کبھی
شخص محبت قومی اور ملکی میں نامور گزرے ہیں اور ان
کے حالات نہایت مبالغے کے ساتھ لکھے گئے ہیں، وہ
کتنے ہیں ؟ انگلیوں کے پوروں پر گنے جاتے
ہیں اور یہ کون لوگ تھے ؟ وہی جن کے ہاتھوں میں
عنان سلطنت تھی۔ کبھی یہ نہیں ہوا کہ سارے ملک کے
ملک کو یا قوم کی قوم کو جوش و ولولہ محبت پیدا ہوا
ہو۔ اب دیکھتے ہیں کہ ملک کے ملک ایسے ہیں کہ سر
ادنیٰ و اعلیٰ، سقہ، دھوبی، بھنگی، ارذل سے ارذل
آدمی محبت قومی پر مرتا ہے اور اپنے ملک پر جان فدا
کرنے کو فخر جانتا ہے۔

علم و ہنر کی ترقیوں کا کیا ذکر کروں، ریل
تار ایسے ہیں کہ عقل کے اندھوں کو بھی دکھائی دیتے
ہیں۔ یہ چیزیں پہلے کبھی متقدمین کے خیال میں گزری
تھیں ؟ یہ بات اور ہے کہ کوئی بھنگ کے نشے میں
کہہ دے کہ پہلے آکاش پر ریل چلتی تھی اور تخت جمشید
پر ریل کی تصویر بنی ہوئی ہے۔ علم طب کو دیکھیے کہ پہلے
کسی زمانے میں انسان کو اعضائے انسانی بنانے میں
یہ ید طولیٰ پیدا ہوا تھا ؟ اب ٹانگ ٹوٹے تو لنگڑوں
کی ٹانگیں وہ بنائی جاتی ہیں کہ بازاروں میں دوڑ کی
شرط باندھ کر دوڑتے ہیں۔ پوپلوں کے دانت وہ
بنائے جاتے ہیں کہ جس وقت وہ ان کو کمانی پر چڑھا کر
منھ میں لگائیں تو یہ معلوم ہو کہ ابھی دودھ کے دانت
ٹوٹ کے دانت نکلے ہیں اور ہزاروں چیزیں علم طب میں
ایسی ایجاد ہوئی ہیں کہ ہزاروں بچے ضعیف الخلقت ان
کی بدولت زندہ رہتے ہیں۔ انھیں قدرتی ضعیف الجثوں
کو دیکھ کر ضعیف العقل یہ کہتے ہیں کہ پہلے جیسے آدمی قوی
اور توانا پیدا نہیں ہوتے۔ یہ نہیں سمجھتے کہ پہلے اسباب
ان ضعیفوں کے زندہ رہنے کے کہاں تھے۔ قوی آدمی
زندہ رہ سکتے تھے جو اسباب تنزل کے زمانے کے وہ بتلاتے
ہیں، اس کی ترقی کی بدولت پیدا ہوئے ہیں۔

"یہ اعتراف کرتے ہوئے کبھی نہ
شرماؤ کہ تم غلطی پر تھے۔
دوسرے لفظوں میں، تم آج کل
سے زیادہ سمجھ رکھتے
ہو۔"

سوئفٹ

سرسیّد کی والدہ مرحومہ

سرسیّد کی والدہ خواجہ فرید کی تینوں بیٹیوں میں سب سے بڑی تھیں۔ ان میں قدرتی قابلیت معمولی عورتوں سے بہت زیادہ تھی۔ وہ صرف قرآن مجید پڑھی ہوئی تھیں اور ابتدا میں فارسی کی کچھ ابتدائی کتابیں بھی پڑھی تھیں مگر اولاد کی تربیت کا ان میں خدا داد ملکہ تھا۔ سرسید کہتے تھے کہ جب میں ان کو سبق سناتا، یا نئے سبق کا مطالعہ ان کے پاس بیٹھ کر دیکھتا تو وہ ایک لکڑی جس میں سوت کی گندھی ہوئی تین لڑیں باندھ رکھی تھیں، اپنے پاس رکھ لیتیں۔ وہ خفا تو اکثر ہوتی تھیں مگر ان سوت کی لڑوں سے کبھی مجھے مارا نہیں۔"

سرسیّد لکھتے ہیں کہ جس زمانہ میں میری عمر گیارہ بارہ برس کی تھی میں نے ایک نوکر کو جو بہت پرانا اور بڈھا تھا کسی بات پر تھپڑ مار دیا والدہ کو بھی خبر ہوگئی۔ تھوڑی دیر بعد جب میں گھر میں آیا تو انھوں نے نہایت ناراض ہو کر کہا کہ اس کو گھر سے نکال دو۔ جہاں اس کا جی چاہے چلا جائے۔ یہ گھر میں رہنے کے لائق نہیں رہا۔ چنانچہ ایک ماما میرا ہاتھ پکڑ کر گھر سے باہر لے گئی اور سڑک پر لا کر چھوڑ دیا۔ اس وقت میری خالہ کے گھر سے جو بہت قریب تھا، دوسری ماما نکلی اور خالہ کے پاس لے گئی۔ انھوں نے کہا کہ دیکھو آپا جی تم سے بہت ناراض ہیں۔ میں تم کو کوٹھے پر ایک مکان میں چھپا دیتی ہوں۔ وہاں سے باہر نہ نکلنا ورنہ وہ ہم سے بھی ناراض ہو جائیں گی۔" میں تین دن تک وہاں چھپا رہا۔ تیسرے دن خالہ صاحبہ مجھے والدہ کے پاس لے گئیں۔ تاکہ قصور معاف کرائیں۔ انھوں نے کہا کہ اگر اس نوکر سے قصور معاف کرالے گا تو میں بھی معاف کر دوں گی۔ جب میں نے ڈیوڑھی میں جا کر نوکر کے آگے ہاتھ جوڑے تب قصور معاف ہوا۔

سرسیّد کی والدہ کی دانش مندی اور دور اندیشی ذیل کی حکایت سے بخوبی ثابت ہوتی ہے۔ سرسیّد کہتے تھے کہ جب دبیر الدولہ نے وزارت سے دوسری بار استعفا دے دیا تو کچھ دنوں بعد مہاراجہ رنجیت سنگھ نے اپنا معتمد اور ایک معقول رقم سفر خرچ کے لیے ان کے پاس بھیجی اور لاہور بلایا سارا کنبا چاہتا تھا کہ وہ منظور کریں مگر ان کی بڑی بیٹی یعنی میری والدہ نے کہا کہ خدا نے آپ کو اس قدر دیا ہے کہ جس طرح چاہیں آپ آرام سے بسر کر سکتے ہیں اور اس سے کچھ اور زیادہ ہو جائے تو بھی آپ کے

آرام وآسائش میں کچھ زیادتی نہیں ہوسکتی۔ آپ کا مہاراجہ رنجیت سنگھ کی عملداری میں جانا اور اس سلطنت کے اختیار لینے اور ہم سب کا انگریزی عملداری میں رہنا اچھا نہیں معلوم ہوتا۔ میں تو ہرگز صلاح نہیں دیتی کہ اس ضعیفی کے زمانے میں کہ آپ کی طبیعت بھی اکثر علیل رہتی ہے آپ لاہور کا ارادہ کریں۔"
دبیر الدولہ کے دل پر ان کے کہنے کا ایسا اثر ہوا کہ لاہور جانے سے انکار اور سفر خرچ واپس کر دیا اور پھر کبھی کوئی تعلق اختیار نہیں کیا۔

سرسید کا بیان ہے کہ میرے بڑے بھائی کے مرض الموت میں والدہ ہر وقت ان کے پاس بیٹھی رہتی تھیں۔ ایک مہینے تک یہی حال رہا۔ جب ان کا انتقال ہوگیا۔ سب لوگ گریہ وزاری کرنے لگے۔ والدہ کی آنکھوں سے بھی آنسو جاری تھے۔ اتنے میں صبح کی نماز کا وقت ہوگیا۔ انھوں نے وضو کرکے نماز پڑھی اور اشراق تک مصلے ہی پر بیٹھی رہیں۔ انھیں دنوں میں ایک رشتہ داری کی بیٹی کی شادی ہونے والی تھی تمام سامان شادی کا ہوچکا تھا۔ صرف چار دن تاریخ عقد میں باقی تھے۔ جب یہ حادثہ ہم پر گزرا تو ان لوگوں نے دستور کے موافق شادی ملتوی کرنی چاہی میری والدہ نے جب یہ سنا تو اس واقعے کے تیسرے دن ان کے گھر گئیں اور کہا میں شادی میں آئی ہوں ماتم تین دن سے زیادہ نہیں ہوتا اور شادی کے ملتوی کرنے سے تمہارا بڑا نقصان ہوگا۔ جو خدا کو منظور تھا وہ ہو چکا، تم شادی کو ہرگز ملتوی نہ کرو جب کہ میں خود تمہارے گھر آئی ہوں اور شادی کی اجازت دیتی ہوں تو اور کوئی کیا کہہ سکتا ہے۔"

سرسید کہتے تھے کہ "جو کچھ آمدنی ہوتی تھی اس میں سے پانچ فیصدی کے حساب سے میری والدہ علیحدہ رکھتی جاتی تھیں اور اس سرمایہ کو حسن انتظام کے ساتھ نیک کاموں میں صرف کرتی تھیں۔ کئی جوان لڑکیوں کا ان کی امداد سے نکاح ہوا۔ اکثر پردہ نشین عورتیں جو معاش سے تنگ ہوتیں، ان کی پوشیدہ خبر گیری کرتیں۔ غریب خاندانوں کی جوان لڑکیاں جو بیوہ ہوجاتیں ان کو دوسرا نکاح کرنے کی نصیحت کرتیں اور دوسرے نکاح کو برا سمجھنے والوں سے نفرت کرتیں۔ غریب رشتہ داروں کے گھر جاتیں اور خفیہ یا کسی حیلے سے ان کی امداد کرتیں۔ بعض رشتہ دار مردوں نے ایسی عورتوں سے نکاح کر لیا تھا جن سے ملنا معیوب سمجھا جاتا تھا، مگر وہ ان کے گھر برابر جاتیں اور ان کی اولاد کے ساتھ شفقت سے پیش آتیں۔"

سرسید کہتے تھے کہ "میری تمام ننھیال کو شاہ عبدالعزیز اور ان کے خاندان سے عقیدت تھی مگر میری والدہ کو شاہ غلام علی صاحب سے بیعت اور عقیدت تھی۔ شاہ صاحب کے یہاں منت اور نذر و نیاز کا کہیں پتہ نہ تھا۔ ان کی عادت تھی کہ جب کوئی اپنی حاجت لے جاتا تو سب حاضرین سے کہتے کہ دعا کرو خدا اس کی حاجت پوری کرے۔ یہی عقیدہ میری والدہ کا تھا۔ انھوں نے خود کوئی منت یا نذر و نیاز کبھی نہیں مانی تعویذ یا گنڈے پر اور تاریخوں یا دنوں کی سعادت و نحوست پر ان کو مطلق اعتقاد نہ تھا۔ لیکن اگر کوئی کرتا تو اس کو منع کبھی نہیں کرتیں اور یہ کہتیں کہ اگر ان کو منع کیا جائے اور اتفاق سے وہی امر پیش آجائے جس کے خوف سے وہ ایسا کرتے ہیں تو ان کو یقین ہوجائے گا کہ ایسا نہ کرنے سے یہ ہوا۔ اگر ایسا نہ کیا جاتا تو یہ نہ ہوتا۔ سرسید کا بیان ہے کہ میری ننھیال والے اگرچہ عام توہمات میں مبتلا نہ تھے مگر شاہ عبدالعزیزؒ کے یہاں جو کچھ ہوتا تھا اس پر سب اعتقاد رکھتے تھے۔ شاہ عبدالعزیز اور ان کے ہاں کے اور بزرگ بچوں کو ایک گنڈا دیا کرتے تھے اور اس کے ساتھ ایک تعویذ ہوتا تھا، جس میں ایک ہندسہ یا حرف سفید مرغ کے خون سے

سکھاجاتا تھا اور جس بچے کو دیاجاتا اس کو بارہ برس کی عمر تک انڈا یا مرغی کھانے کی ممانعت ہوتی تھی۔ سید حامد اور سید محمود کو بھی ان کی ننھیال والوں نے وہ گنڈے پہنائے تھے۔ باوجود اس کے میری والدہ جب کبھی وہ ان کے ساتھ کھانا کھاتے اور کھانے میں انڈا یا مرغی ہوتی تو وہ بے تامل ان کو کھلا دیتیں۔

سرسید کہتے تھے کہ اس زمانے میں جب کہ میرے مذہبی خیالات ذاتی تحقیق پر مبنی ہیں، اب بھی میں اپنی والدہ کے عقائد میں کوئی ایسا عقیدہ جس پر شرک یا بدعت کا اطلاق ہو سکے نہیں پاتا۔ البتہ وہ یہ سمجھتی تھیں کہ قرآن پڑھ کر بخشنے کا یا فاتحہ دلا کر کھانا تقسیم کرنے کا ثواب مردے کو پہنچتا ہے۔ مگر میں ان دونوں باتوں کا قایل نہیں ہوں۔ عبادت بدنی میں تو نیابت کا مطلق قائل نہیں اور عبادت مالی میں بھی اس لیے کہ متوفی اپنی زندگی میں کچھ مال کسی کار خیر کے لیے کسی کے سپرد کر جائے اور کسی صورت میں نیابت کا قایل نہیں ہوں۔

سرسید کا بیان ہے کہ جب میں دہلی میں منصف تھا تو میری والدہ کی نصیحت تھی کہ جہاں تم کو ہمیشہ جانا ضرور ہے وہاں کبھی سواری پر جایا کرو اور کبھی پیادہ پا جایا کرو۔ زمانہ کا کچھ اعتبار نہیں۔ کبھی کچھ ہے اور کبھی کچھ۔ پس ایسی عادت رکھو کہ ہمیشہ اس کو نباہ سکو۔ چنانچہ میں نے جامع مسجد اور خانقاہ میں جانے کا یہی طریقہ رکھا تھا کہ اکثر پیدل اور کبھی کبھی سواری پر جایا کرتا تھا۔

سرسید کی والدہ جیسی سمجھ دار اور دانش مند تھیں اس سے زیادہ نیک دل اور پاک سرشت تھیں۔ سرسید کا بیان ہے کہ مساۃ زینن ایک لاوارث بڑھیا تھی۔ میری والدہ اس کی خبر گیری کرتیں۔ جب میں دہلی میں منصف تھا اتفاق سے میری والدہ اور زینن دونوں ایک ساتھ بیمار ہوئیں اور دونوں کی بیماری بھی ا[illegible]ی تھی۔ حکیم نے والدہ کے لیے کسی قدر افاقے کے بعد ایک معجون کا نسخہ جو قیمتی تھا، تجویز کیا، مگر جس قدر تیار ہوا تھا وہ مقدار میں ایک ہی بیمار کی چند روزہ خوراک تھی۔ میں اس معجون کو تیار کر کے والدہ کے پاس لے گیا اور ان سے کہہ دیا کہ اتنے دنوں کی خوراک ہے۔ انھوں نے لے لی۔ مگر اس خیال سے کہ یہ زینن کو بھی مفید ہوگی لیکن اس کو کون بنوا کر دے گا، انھوں نے خود اس معجون کو نہیں کھایا اور برابر زینن کو کھلاتی رہیں۔ زینن کو اس سے بہت فائدہ ہوا۔ مگر والدہ بھی بغیر اس معجون کے استعمال کے اچھی ہو گئیں۔ چند روز بعد میں نے کہا کہ معجون نے آپ کو بہت فائدہ دیا وہ ہنسیں اور کہا کیا بغیر دوا کے خدا صحت نہیں دے سکتا۔ آخر معلوم ہوا کہ وہ ساری معجون زینن ہی نے کھائی۔ مگر خدا نے صحت دونوں کو عطا کی۔

سرسید کہتے تھے کہ میرے بھائی سید محمد خاں اور حکیم غلام نجف خاں میں بہت دوستی تھی۔ ایک دوسرے کو بھائی کہتے تھے۔ میں بھی حکیم صاحب کو بڑے بھائی کے برابر سمجھتا رہا۔ مگر بھائی کے انتقال کے بعد ایک دفعہ حکیم صاحب مجھ سے کچھ ناراض ہو گئے اور ہمارے ہاں آنا چھوڑ دیا۔ مگر میں بدستور ان کے ہاں جاتا رہا اور مدت تک میں نے کچھ خیال نہیں کیا۔ لیکن آخر کو میں نے بھی ان کے ہاں جانا کم کر دیا۔ جب والدہ کو اس بات کی خبر ہوئی تو بہت افسوس کیا اور مجھ سے کہا کہ جس بات کو تم خود اچھا نہیں سمجھتے وہی بات آپ کرتے ہو۔ اگر وہ نہیں ملتے تو نہ ملیں، تم بدستور ملتے رہو۔

سرسید نے اس کا ہم سے ذکر کیا کہ جب میں صدر امین تھا تو اس کے ساتھ میں نے کچھ سلوک کیا تھا اور ایک سخت مواخذے سے اس کو بچایا تھا مگر ایک مدت کے بعد اس نے در پردہ میرے ساتھ برائی کرنی شروع کی اور مدت تک میری شکایت کی گمنام عرضیاں صدر میں بھیجتا رہا۔ آخر تمام وہ ثبوت

باقی صفحہ نمبر ۶ پر

علی گڑھ مسلم یونیورسٹی علی گڑھ

اشتہار نمبر ۸۴ - ۸۳ / ۸

حسب ذیل جگہوں کے لیے مجوزہ فارموں پر درخواستیں مطلوب ہیں۔ جو امیدوار ایک سے زیادہ جگہوں کے لیے درخواست دینا چاہتے ہیں، انھیں ہر جگہ کے لیے علاحدہ علاحدہ درخواست ارسال کرنی چاہیے۔

پوسٹ گریجویٹ ٹیچر (فزکس) (عارضی) برائے ایس ٹی ہائی اسکول

تنخواہ کا اسکیل :- ۵۵۰ - ۲۵ - ۷۵۰ - ای بی - ۳۰ - ۹۰۰ روپے اس کے علاوہ بھتے بھی دیے جائیں گے

تعلیمی قابلیت : ۱- لازمی - متعلقہ مضمون میں ماسٹر ڈگری یا دہلی یونیورسٹی کا متعلقہ مضمون میں پوسٹ گریجویٹ ڈپلوما۔

۱۱ قابل ترجیح : مضمون ہذا کو کسی کالج یا کسی ہائی / ہائر سکنڈری اسکول کی کلاسوں کو انگریزی / اردو اور ہندی زبانوں میں پڑھانے کا تجربہ اور اہلیت

پوسٹ گریجویٹ ٹیچر (کیمسٹری) (عارضی) برائے ایس ٹی ہائی اسکول۔

تنخواہ کا اسکیل :- ۵۵۰ - ۲۵ - ۷۵۰ - ای بی - ۳۰ - ۹۰۰ روپے۔ بھتے اس کے علاوہ

تعلیمی لیاقت

(۱) لازمی: متعلقہ مضمون میں ماسٹر ڈگری یا مضمون ہذا میں دہلی یونیورسٹی کا پوسٹ گریجویٹ ڈپلوما۔

یا

میٹرکولیشن کے بعد کسی تسلیم شدہ یونیورسٹی سے کم از کم ۶ سال کے مطالعہ کے بعد بائیو کیمسٹری میں ایم ایس سی ڈگری (صرف کیمسٹری ٹیچروں کے لیے)

قابل ترجیح:- کسی کالج یا کسی ہائی / ہائر سکنڈری اسکول میں انگریزی/اردو اور سندھی میں مضمون ہذا کو پڑھانے کا معقول تجربہ و اہلیت۔

۳- **پوسٹ گریجویٹ ٹیچرس (انگلش)**:(عارضی) برائے ایس ٹی ہائی اسکول

تنخواہ:- ۵۵۰- ۲۵- ۷۵۰- ای بی ۳۰- ۹۰۰ روپے - بھتے اس کے علاوہ

تعلیمی لیاقت (۱) متعلقہ مضمون میں ماسٹر ڈگری کا اس شرط کے ساتھ کہ (اے) ڈگری یا تعلیم سے متعلق تسلیم شدہ ڈپلومہ یا (بی) انٹرمیڈیٹ [illegible] کو پڑھانے کا تین سالہ تجربہ (بی)

(سی) سینٹرل انسٹی ٹیوٹ آف انگلش اینڈ فارن لینگویجیز کا انگریزی کا پڑھانے کا ڈپلومہ

(۱) قابل ترجیح :- کسی کالج یا ہائی / ہائر سکنڈری اسکول کی کلاسوں میں مضمون ہذا کے پڑھانے کا معقول تجربہ اور اہلیت

۴ **پوسٹ گریجویٹ ٹیچر** (تاریخ):- مستقل، برائے ایس ٹی ہائی اسکول

تنخواہ:- ۵۵۰- ۲۵- ۷۵۰- ای بی - ۳۰ - ۹۰۰ روپے بھتے اس کے علاوہ

تعلیمی لیاقت (۱) لازمی:- متعلقہ مضمون میں ماسٹر ڈگری۔ ان شرائط کے ساتھ (اے) ڈگری یا تعلیم کا تسلیم شدہ ڈپلومہ یا (بی) انٹرمیڈیٹ یا بالائی کلاسوں کو پڑھانے کا تین سالہ تجربہ

(۱۱) قابل ترجیح:- کسی کالج یا ہائی / ہائر سیکنڈری اسکول کی کلاسوں کو انگریزی / اردو اور سندھی میڈیم میں متعلقہ مضمون کو پڑھانے کا معقول تجربہ و اہلیت

کھیلوں اور گیمز سے دلچسپی رکھنے والے امیدواروں کو ترجیح دی جائے گی

۵- **پوسٹ گریجویٹ ٹیچر** (فارسی) (عارضی) مگر بعد میں مستقل کیے جانے کا امکان) برائے ایس ٹی ہائی اسکول

تنخواہ ۵۵۰- ۲۵- ۷۵۰- ای بی ۳۰- ۹۰۰ روپے - بھتے اس کے علاوہ

تعلیمی لیاقت:- (۱) لازمی متعلقہ مضمون میں ایم اے یا متعلقہ زبان میں آنرز اور انگریزی میں انٹرمیڈیٹ

(۱۱) تعلیم میں ڈگری یا تسلیم شدہ ڈپلومہ یا انٹرمیڈیٹ یا بالائی کلاسوں کو پڑھانے کا تین سالہ تجربہ

(۱۱) قابل ترجیح:- کسی کالج یا ہائی / ہائر سیکنڈری اسکول میں متعلقہ مضمون کو پڑھانے کا معقول تجربہ اور اہلیت۔ جو امیدوار ماسوائے نصاب سے متعلق سرگرمیوں کی تنظیم کاری کی اہلیت اور تجربہ رکھتے ہیں انھیں ترجیح دی جائے گی۔

۶ **ٹرینڈ گریجویٹ ٹیچرز** (میتھمیٹکس و سائنس): (۵ جگہیں) مستقل برائے ایس ٹی ہائی اسکول

تنخواہ:- ۴۴۰ - ۲۰ - ۵۰۰ - ای بی - ۲۵ - ۷۰۰ ای بی ۲۵ - ۷۵۰ روپے - بھتے اس کے علاوہ

تعلیمی لیاقت:- (۱) لازمی بیچلر ڈگری میتھ، فزکس اور کیمسٹری کے ساتھ اور پڑھائی کے بارے میں ڈگری / ڈپلوما یا بی ایس سی میتھمیٹکس، فزکس، کیمسٹری۔ بی ایڈ آف ریجنل کالج آف ایجوکیشن این سی ای آر ٹی

قابل ترجیح:- کسی کالج یا کسی ہائی / ہائر سیکنڈری اسکول کی کلاسوں کو انگریزی / اردو اور سندھی میڈیم میں مضمون ہذا کو پڑھانے کا معقول تجربہ اور اہلیت

۷۔ ٹرینڈ گریجویٹ ٹیچر: (سوشل اسٹڈیز:) مستقل برائے ایس ٹی ہائی اسکول
تنخواہ:۔ ۴۴۰۔ ۲۰۔ ۵۰۰ ای بی ۲۵۔ ۷۰۰۔ ای بی ۲۵۔ ۷۵۰ روپے بھتے علاوہ
تعلیمی لیاقت (۱) لازمی۔ گریجویٹ، جس کے پاس تاریخ کے کوئی بھی دو مضمون رہے ہوں۔ پولیٹیکل سائنس اکونومکس، جغرافیہ اور کامرس ڈگری کے امتحان میں اور تعلیم کی تسلیم شدہ ڈگری یا ڈپلوما
(۲) متعلقہ مضمون میں بی اے آنرز) اور تعلیم کی کسی تسلیم شدہ ڈگری یا ڈپلومہ۔
قابل ترجیح:۔ کسی کالج یا ہائی/ ہائر سیکنڈری اسکول میں انگریزی/اردو اور ہندی میڈیم میں متعلقہ مضمون کو پڑھانے کا معقول تجربہ اور اہلیت

۸۔ ٹرینڈ گریجویٹ ٹیچر مین (فزیکل ٹریننگ انسٹرکٹر) (دو اسامیاں) مستقل برائے ایس ٹی ہائی اسکول
تنخواہ:۔ ۴۴۰۔ ۲۰۔ ۵۰۰۔ ای بی۔ ۲۵۔ ۷۰۰۔ ۲۵۔ ۷۵۰ روپے۔ بھتے اس کے علاوہ
تعلیمی لیاقت (۱) لازمی (۱) کسی تسلیم شدہ یونیورسٹی کی تین برس والی فزیکل ایجوکیشن کی بیچلر ڈگری یا (۲) کسی تسلیم شدہ یونیورسٹی کی بی پی ایڈ کی ڈگری یا (۳) کسی تسلیم شدہ یونیورسٹی یا انسٹی ٹیوشن کا ڈی پی ایڈ جو کہ کم از کم ایک اکاڈمک سیشن کی تربیت پر مبنی ہو۔ بشرطیکہ کہ ڈپلومہ کے داخلہ سے متعلق تعلیمی لیاقت، ایک یونیورسٹی کی ڈگری پر مبنی رہی ہو۔
قابل ترجیح:۔ بچوں کو ہاکی، کرکٹ، فٹ بال اور والی بال کی کوچنگ دینے کی لازمی صلاحیت، اور اس کے علاوہ غیر نصابی سرگرمیوں کی تنظیم کاری کے تجربہ کو فوقیت دی جائے گی۔

(۹) ٹرینڈ گریجویٹ ٹیچر (لائف سائنس): (عارضی) برائے ایس ٹی ہائی اسکول
تنخواہ:۔ ۴۴۰۔ ۲۰۔ ۵۰۰۔ ای بی۔ ۲۵۔ ۷۰۰۔ ای بی ۲۵۔ ۷۵۰ روپے۔ بھتے اس کے علاوہ
تعلیمی لیاقت: ضروری۔ بوٹنی اور زولوجی میں بی ایس سی، بی ایڈ یا بی ایس سی ہوم سائنس دہلی یونیورسٹی سے بی ایڈ کے ساتھ یا ریجنل کالج برائے تعلیم این سی ای آر ٹی کی بی ایس سی، بی ایڈ کی ڈگری
قابل ترجیح:۔ کسی کالج یا ہائی/ ہائر سیکنڈری اسکول میں انگریزی/اردو اور ہندی میڈیم کے ذریعہ کلاسوں کو متعلقہ مضمون پڑھانے کا معقول تجربہ اور اہلیت

(۱۰) ٹرینڈ ٹیچرز (جغرافیہ) (مستقل) برائے ایس ٹی ہائی اسکول
تنخواہ:۔ ۴۴۰۔ ۲۰۔ ۵۰۰۔ ای بی ۲۵۔ ۷۰۰۔ ای بی۔ ۲۵۔ ۷۵۰ روپے۔ بھتے اسکے علاوہ
تعلیمی لیاقت
(۱) ضروری انگریزی ادب کے ہمراہ جغرافیہ میں بی اے (آنرز) (۲) تعلیم میں ڈگری/ ڈپلوما
(۱۱) قابل ترجیح: کسی کالج یا ہائی/ ہائر سیکنڈری اسکول میں متعلقہ مضمون کو پڑھانے کا معقول تجربہ

(۱۱) پرائمری ٹیچر (سائنس۔ (مستقل)۔ ایس ٹی ہائی اسکول
تنخواہ:۔ ۳۳۰۔ ۱۰۔ ۳۸۰۔ ای بی۔ ۱۰۔ ۴۵۰۔ ۱۲۔ ۵۰۰ روپیہ ای بی ۱۵۔ ۵۶۰ روپیہ جمع الاونسز۔

کوالیفیکیشنز :-
لازمی - میٹرک - ٹرینڈ سائنس کے ساتھ پسندیدہ - بچوں کو انگریزی/ہندی اور اردو میڈیم کے ذریعے پڑھانے کی اہمیت

(۱۲) پرائمری ٹیچرز (جنرل) (مستقل) - دو آسامیاں - ایس ٹی ہائی اسکول
تنخواہ :- ۳۳۰ - ۱۰ - ۳۵۰ - ای بی ۱۰ - ۳۸۰ - ۱۲ - ۵۰۰ - ای بی ۱۵ - ۵۶۰ جمع الاونسز
کوالیفیکیشنز - لازمی میٹرک ٹرینڈ -
پسندیدہ :- بچوں کو انگریزی/اردو اور سندی میڈیم کے ذریعہ پڑھانے کی اہمیت
انگریزی میڈیم اسکولوں میں کام کا تجربہ رکھنے والوں کو ترجیح دی جائے گی

۱۳- پرائمری ٹیچر (ریاضی) عبداللہ نرسری اسکول
تنخواہ :- ۳۳۰ - ۱۰ - ۳۵۰ - ای بی - ۱۰ - ۳۸۰ - ای بی ۱۲ - ۵۰۰ - ای بی ۱۵ - ۵۶۰ روپے جمع الاونسز
کوالیفیکیشنز :-
لازمی - ہائر سیکنڈری ٹرینڈ زنانہ ریاضی ٹیچر - انگریزی بولنے کی مہارت
پسندیدہ :- (۱) کھیل - پی ٹی ، رقص اور ڈرامہ کا اہتمام کرانے کی صلاحیت
(۲) اسی حیثیت میں انگلش میڈیم اسکول میں پڑھانے کا کم ازکم پانچ کا تجربہ

اعلیٰ قابلیت اور تجربہ کے حامل امیدواروں کو شروع میں زیادہ تنخواہ دی جا سکتی ہے
انٹرویو کے لیے طلب کیے جانے والے امیدواروں کو سنگل سیکنڈ کلاس ریلوے کرایہ کے برابر سفر الاونس دیا جائے گا -
چھپے ہوئے درخواست فارم اور ہدایات اسسٹنٹ رجسٹرار (سلیکشن کمیٹی) سے پانچ روپے (تین روپے روزگار فیس اور دو روپے بطور درخواست فارم فیس) کی نقد ادائیگی پر (جو کیش سیکشن فائننس آفس اے ایم یو میں جمع کرانی ہوگی) یا فائننس آفیسر اے ایم یو کے نام ایک انڈین پوسٹل آرڈر کے ذریعے یا ذاتی طور پر اپنے پتے والا لفافہ بھیج کر طلب کیے جا سکتے ہیں

رجسٹرار

بہ نشر پبلشر قاضی معزالدین احمد - مطبع لیتھو کلر پرنٹرس مقام اشاعت - صفدر منزل - تار بنگلہ اے ایم یو علی گڑھ

جلد نمبر ۲ | یکم اگست ۱۹۸۳ء | شمارہ نمبر ۱۵

اے صاحبو! ہر کوئی تسلیم کرتا ہے کہ تعلیم نہ ہونے سے قوم کا حال روز بروز خراب ہوتا جاتا ہے۔ قوم کے بچّے اخراجاتِ تعلیم کے سرانجام نہ ہونے سے ذلیل اور رذیل ہوتے جاتے ہیں۔ میں نے کوئی پہلو ایسا نہیں چھوڑا جس سے قوم کے غریب بچّوں کے اخراجاتِ تعلیم میں مدد پہنچے، مگر افسوس! کامیابی نہیں ہوئی۔ خود لوگوں سے بھیک مانگی، مگر قلیل ملی، والنیٹر بنانے چاہے، مگر بہت کم بنے اور جو بنے ان سے کچھ بن نہ آئی۔ بس میں اسٹیج پر اس لیے آیا ہوں کہ قوم کے بچّوں کی تعلیم کے لیے کچھ کر سکوں۔"

(سر) سید احمدؒ

معہودِ ذہنی	سیّد حامد
اخلاق	عارفہ کمال
گھروں میں پائے جانے والے ضرر رساں کیڑے	سید فیروز حمید
تاثیر طعام	حکیم سیّد کمال الدین حسین ہمدانی
ڈاکٹر سی وی رمن	اندر جیت لال
حیات سر سیّد	مولانا الطاف حسین حالی مرحوم

قیمت فی پرچہ ایک روپیہ ششماہی ۱۱ روپے سالانہ ۲۰ روپے

بیرونِ ہند سے

فی پرچہ ایک ڈالر سالانہ ۱۵ ڈالر

ترسیل زر و خط و کتابت کا پتا

قاضی معز الدین احمد
صفدر منزل، قمار بنگلہ۔
اے ایم یو۔ علی گڑھ 202001

پندرہ روزہ

تہذیب الاخلاق علی گڑھ

مدیر: سید حامد وائس چانسلر
علی گڑھ مسلم یونیورسٹی

مدیر مسئول: قاضی معز الدین احمد

جلد نمبر ۲ یکم اگست ۱۹۸۳ء شمارہ نمبر ۱۵

یوں ہاتھ نہیں آتا، وہ گوہر یک دانہ!
یک رنگی و آزادی اے ہمت مردانہ!

یا سنجر و طغرل کا آئین جہانگیری
یا مرد قلندر کے انداز ملوکانہ!

یا حیرت فارابی، یا تاب و تب رومی
یا فکر حکیمانہ، یا جذب کلیمانہ!

یا عقل کی روباہی، یا عشق ید اللّٰہی
یا حیلۂ افرنگی، یا حملۂ ترکانہ!

یا شرع مسلمانی، یا دیر کی دربانی
یا نعرۂ مستانہ، کعبہ ہو کہ بت خانہ!

میری ہیں فقیری میں، شاہی میں غلامی میں
کچھ کام نہیں بنتا، بے جرأت رندانہ!

علامہ اقبال

سیّد حامد

مہودِ ذہنی

عنوان کی ثقالت سے نہ گھبرایئے' جو بات آج کہی جائے گی وہ بہت سادہ سی ہے۔ سرخی اس انداز کی ہے کہ زبان گڑ مڑ یا کھا جائے اور مفہوم اتنا عام فہم کہ سب کی سمجھ میں آجائے۔ مہودِ ذہنی سے مراد وہ باتیں ہیں جو کہنے والے کے ذہن میں ہوتی ہیں۔ اکثر ایسا ہوتا ہے کہ جو بات وہ کہنے جاتا ہے وہ سب کی سب نہیں کہتا۔ وہ یہ تصور کر لیتا ہے کہ موضوعِ گفتگو کے متعلق جو باتیں اس کے ذہن میں ہیں وہ سننے والے کے ذہن میں بھی ہوں گی سننے والا ان باتوں پر اپنے حساب سے اور اپنی سماعت کے مطابق غور کرتا ہے۔ ظاہر ہے کہ اس کے فرشتوں کو بھی خبر نہیں کہ کہنے والے نے جو کچھ کہا ہے' اس کے علاوہ کیا کیا سوچ رکھا ہے۔ چنانچہ جو بات اس تک پہنچتی ہے وہ اس بات سے بہت کم ہوتی ہے جو کہنے والا کہنا چاہ رہا تھا۔ وہ جو کہنا چاہ رہا تھا وہ کچھ ملفوظ تھا (یعنی لفظوں کی گرفت میں آگیا تھا) اور کچھ مقدّر (یعنی دل ہی دل میں رہ گیا تھا۔ اس کی بابت قیاس کر سکتے ہیں)۔ جو ملفوظ تھا وہ سننے والے تک پہنچ گیا' جو مقدّر تھا' اس کی اسے آہٹ بھی نہ ملی۔ جو خبر اس تک پہونچی وہ ادھوری رہی معانی و مفاہیم بیان کرنے کی تقصیر سے اکثر گھایل ہو جاتے ہیں۔ ابلاغ کی تنگی' تفہیم کا نقص' بات کی نارسائی' رابطہ کی ناتوانائی اور غلط فہمی بارہا اس طرح بھی جنم لیتی ہیں۔ روزمرہ کی زندگی میں مہودِ ذہنی طرح طرح سے تکلیفیں پہونچاتا ہے' ستم ڈھاتا ہے اور چھوٹی بڑی ترشیوں'

تلخیوں کی طرف بسا اوقات لے جاتا ہے۔ زبان و بیان کی کوتاہ دستیوں سے قطعِ نظر' بات کو پوری صراحت کے ساتھ نہ کہنے کی عادت عملی زندگی میں خود ہمارے اور دوسروں کے لیے تکلیف' تشویش' الجھن اور پریشانی کا سبب بن جاتی ہے۔ مثلاً آپ آج شام سفر پر نکلنے والے ہیں۔ کثرتِ استعمال سے آپ کا پرانا زخم رسیدہ سوٹ کیس کئی جگہ سے نکل گیا ہے۔ آپ نے خادم سے کہا۔ بازار لے جاؤ اور اس کی ٹھیک سے مرمت کرادو۔ وہ بازار گیا دوکاندار نے کہا اس میں کام بہت ہے۔ ایک ہفتہ کے بعد ملے گا۔ خادم نے کہا۔ بھائی صاحب جلدی ضرورت ہے صاحب سفر پر جا رہے ہیں۔ اس نے کہا اچھا کل اتوار ہے' پرسوں شام کو لے لینا۔ اور سب کام چھوڑ کر تمہارا کام کر دیں گے۔ وہ بیچارہ خوش خوش لوٹا کہ جو کام ایک ہفتہ میں ہونے والا تھا' اسے میں نے دو روز میں کرلینے کے ڈول ڈال دیے۔ شام کو صاحب دفتر سے آئے۔ پوچھا تو پتہ چلا کہ سوٹ کیس دو روز بعد ملے گا۔ "چھوکرے" پر برس پڑے کہ احمق تجھے معلوم نہیں کہ میں آج شام کو جا رہا ہوں۔ ابھی واپس جا' جیسا ہے ویسا ہی لے آ۔ ڈوری باندھ کر کام چلا لوں گا۔ بیچارہ دوڑا ہوا گیا تو معلوم ہوا کہ دوکان بند ہو چکی ہے۔ ڈوریوں سے بندھا ہوا سوٹ کیس پھر بہتر تھا' اب کپڑے پوٹلی میں باندھ کر لے جانے پڑیں گے۔ غریب نوکر کی جو شامت آئی

سوالگ رہی۔ اب سوال صرف اتنا سا باقی ہے کہ احمق کون تھا آقا یا خادم۔ جواب ہم آپ کی صوابدید پر چھوڑتے ہیں۔ احمق کوئی ہو مجرم وہی معہود ذہنی پر تکیہ کرنے کی عادت تھی جو بہت عام ہے اور جو اکثر خلق خدا کے اوقات کو تلخ کرتی اور اس کے کاموں کو بگاڑتی رہتی ہے۔ زباں الگ خراب ہوتی ہے۔ خون کے دباؤ کا اچانک بڑھنا اس پر مستزاد۔ آپ کا کیا جاتا اگر اسے بتا دیتے کہ ہمیں آج ہی سفر پر جانا ہے اور سوٹ کیس کی مرمت اسی لیے کرائی جا رہی ہے۔

"خود سوزی" کے سلسلہ میں آپ دیکھ چکے ہیں کہ لڑکے اور لڑکے والوں کی شرمناک لالچ ہر طرف گھروں میں آگ لگاتی جا رہی ہے۔ سماج، بیچاری عورتوں کی بلی دے رہا ہے۔ پہلے مہینوں اور ہفتوں میں ایسی خبریں آتی تھیں، اب کوئی دن خالی نہیں جاتا۔ اس روز اخبار میں تھا کہ صرف دلی میں اس قسم کی موتوں کا اوسط یومیہ ۲ پڑ رہا ہے[1] لالچ نے لوگوں کو اندھا کر دیا ہے، پاگل بنا دیا ہے۔ قارئین شاید ہمارے ذہنی توازن پر بھی سوالیہ نشان لگا رہے ہوں گے کہ ہم خواہ کچھ بھی لکھیں، اس میں شاہ چارلس کے سر کی طرح خود سوزی کا موضوع ضرور سر اٹھائے گا۔ مان لیا بابا کہ جہیز کی لالچ اور لڑکے کی تجارت انتہائی شرمناک عادت ہے۔ یہ ہمارے وقار کو مجروح کرتی ہے۔ اس کے آگے ہمارا روحانیت کا دعوا کھوکھلا لگتا ہے۔ دنیا میں اور کہیں انسانی گوشت کی اس عنوان اور اس بے غیرتی کے ساتھ تجارت نہیں ہوتی۔ یہ سب کچھ تسلیم، لیکن کیا دنیا میں اور کوئی موضوع باقی نہیں رہا جس پر قلم اٹھایا جائے۔ اور اگر موت ہی کو موضوع بنایا ہے تو سڑک کے حادثوں میں بھی تو روز سیکڑوں موتیں ہوتی ہیں۔ اگر جلنے سے کچھ موتیں ہو گئیں تو کیا غضب ہوا۔ اور پھر مضمون کی بے ربطی کی بھی تو کوئی حد ہوتی ہے۔ معہود ذہنی کی بات کرتے کرتے ذہن اور قلم دونوں بھٹک گئے اور جلنے جلانے کی بات کرنے لگے۔"

قارئین کی جھنجھلاہٹ سر آنکھوں پر۔ اگر جان کی اماں پائیں تو عرض کریں کہ جہیز کی موتیں (اس ترکیب کے طنز پر غور کیجیے۔ حکما تو کہتے ہی چلے آئے ہیں کہ شادی اور غم توأم ہیں) کھلے ہوئے مطالبہ کی بنا پر کم ہوتی ہیں؛ توقعات، قیاسات اور ناگفتہ مانگوں کی وجہ سے زیادہ۔ لڑکے والوں نے کہا اسکوٹر دو، ٹی وی سیٹ دو، گھر کا پورا فرنیچر دو اور بیس ہزار روپیہ نقد دو۔ لڑکی کا باپ قرض لے گا، بھیک مانگے گا، چوری کرے گا اور جو کچھ لاکھ جتن کر کے پس انداز کیا ہے وہ نکالے گا، بیوی کے گہنے بیچے گا، رشوت لے گا اور یہ مانگ پوری کر دے گا۔ اور اگر اتنا روپیہ فراہم کرنا اس کے بس کا روگ نہیں تو مجبور ہو کر دل پر پتھر رکھ کر کہہ دے گا کہ بہن جی ہماری اتنی حیثیت نہیں۔ لیجیے رشتہ ہی نہیں ہوا تو جلنے جلانے کی نوبت کیوں آنے لگی۔ یہ نوبت تو اکثر وہاں آتی ہے جہاں لڑکے والے کہتے ہیں۔ گھر پر بھگوان کا دیا سب کچھ ہے۔ ہمیں کیا ضرورت کہ شادی کر کے تجوری بھریں۔ ہمیں تو سندر اور گن وتی لڑکی کی تلاش تھی سو مل گئی۔ ہم زبان سے کچھ نہیں کہیں گے۔ آپ کی لڑکی ہے۔ آپ اسے جو دینا چاہیں دیں، ہم بیچ میں کہاں آتے ہیں"۔ جس وقت زبان سے یہ ارشاد ہوتا ہے اسی وقت ذہن کھچڑی پکانا شروع کر دیتا ہے کہ "سمدھی ملج کی دو ہی تو بیٹیاں ہیں، تین بیٹے ہیں۔ ایک بیٹے کی شادی ہو چکی ہے۔ بہو ڈھیروں دولت لائی ہو گی۔ پھر ان کی نوکری چھوٹی اور تنخواہ کم سہی لیکن اوپر کی آمدنی تو کافی ہو گی۔ یہ ضرور

[1] شمدن شہر سے نکلا ہے اور اب اس کا جنازہ شہر سے نکل رہا ہے۔

ہمارے بیٹے کو نہال کر دیں گے۔" اور جب دیکھتے ہیں کہ بہو نے ان امیدوں اور ان قیاسات اور ان محلوں کو جو انھوں نے بنائے تھے مسمار کر دیا تو کچھ دن پہلے کا معہودِ ذہنی جو ابھی تک سراپا تہذیب بنا ہوا تھا، سانپ کی طرح پھن اٹھاتا ہے اور سمدھیانہ کو نوکِ زبان سے ڈسنا شروع کرتا ہے۔ بے چاری لڑکی سے اپنے ماں باپ کی بے عزتی اور بے بسی نہیں دیکھی جاتی۔ اسے جان دیتے ہی بنتی ہے۔ اگر لڑکے والے شروع ہی میں سودے کی بات کر لیتے تو لڑکی اور لڑکی والوں کو یہ دن کیوں دیکھنا پڑتا۔ ہمارے پاس اس کا وقت نہیں کہ اس کا تجزیہ کریں کہ لڑکے والوں نے چپ کیوں سادھی تھی۔ کیا تہذیب اور انسانیت نے انھیں مانگ نہ کرنے پر مجبور کیا؟ اگر ایسا تھا تو شادی کے بعد تہذیب اور انسانیت غوطہ کیوں لگا گئیں؟ شاید یہ بات کو لپیٹ کر کہنے کی عادت کا اثر ہوگا جو بعض لوگوں کی سرشت میں داخل ہوتی ہے یا اسے جرأت کی کمی پر محمول کیجیے۔ یہ بھی ہو سکتا ہے کہ تھوڑی دیر کے لیے ان کے دل میں طمع کے دلدل سے اوپر اٹھنے کا جذبہ پیدا ہوا ہو یا ان سب محرکات کا مجموعی اثر تھا جس نے حسنِ اخلاق اور شائستگی، ایثار اور دل آسائی اور خوش گوئی کے یہ گل کھلائے۔ لیکن قیاس کہتا ہے کہ لڑکے والوں کی طمع نے کوئی تحدید قبول نہ کی ہوگی۔ انھوں نے سوچا ہوگا کہ لڑکے کا بھاؤ گرانا نری مورکھتا ہے اور اتنا بڑھانا کہ گاہک ہمت ہار جائے غیر مخلوط حماقت۔ بات گول رکھو۔ جب لڑکی بیاہ کر آ جائے گی تو اسے یرغمال بنا کر جو چاہیں گے وصول کر لیں گے۔ پھر کسی کی مجال کہ ہماری مانگیں نہ مانتے۔ آپ نے ایسے سرجنوں کی لرزہ خیز داستانیں سنی ہوں گی جو مریض کا پیٹ چاک کر کے آپریشن کو بیچ میں چھوڑ کر فیس کے متعلق من مانے مطالبات کرتے تھے اور مریض کے بے بس عزیزوں سے منہ مانگی مراد پاتے تھے۔ یہی حال لڑکے والوں کا ہے۔ حرام کی کمائی دونوں کھاتے ہیں۔ فرق صرف یہ ہے کہ ایک اپنے ہاتھ کے ہنر سے اور دوسرا بیٹے کے وجود سے۔ انسان گرتا ہے تو اسفل سافلین کی خبر لاتا ہے۔

دیکھیے آپ نے معہودِ ذہنی کا ستم، بات کو ناگفتہ رکھنے کا ظلم، توقعات کو زبان نہ دینے کا جور، قیاسات کی دنیا میں رہنے کا فتنہ اور ابہام کو رہنما بنانے کا فساد۔

زبان کے متعلق پھبتی کسی گئی ہے کہ یہ خیالات اور جذبات کو چھپانے کا ذریعہ ہے۔ جی ہاں، ہوتے ہیں ضرور ہوتے ہیں۔ ایسے بھی خیالات، ایسے بھی جذبات جن کو چھپانے ہی میں عافیت ہے۔ ایسے لمحات بھی آتے ہیں جب کھری کھری سنانے میں جان یا سکون کا جوکھم ہوتا ہے یا جب صاف صاف بات کہنے سے مخاطب کو غیر ضروری جراحت پہونچتی ہے۔ لیکن ڈپلومیسی کو نظر انداز کر دیجیے اور روز مرہ کی ملاقاتوں کی غیر اہم باتوں کو اور شعر اور شاعری اور فنکاری کو، تو یہ کلیہ ماننا پڑے گا کہ افراد کے باہمی تعلقات اور معاملات کی صحت کے لیے صراحت اور وضاحت بہت ضروری ہے۔ قیاس اور ابہام کا ان میں دخل نہ ہونا بہتر، معہودِ ذہنی کا عمل نہ ہونا اولیٰ۔ ورنہ گاڑی پٹری سے بار بار اترے گی۔ حادثے ہوں گے، ترشیاں، تلخیاں، شکر رنجیاں ہر قدم پر آپ کی پذیرائی کریں گی۔ زندگی میں غم ویسے ہی کیا کم ہیں کہ انسان اپنی مساعی سے ان میں اضافہ کرے۔

اگر آپ کے دل میں ہماری بات ابھی تک نہ اتری ہو اور آپ سمجھتے ہوں کہ اس عام عادت میں کوئی خطرہ نہیں کہ مخاطب کے متعلق یہ تصور کر لیا جائے کہ وہ نہ صرف آپ کی گفتگو بلکہ گفتگو کرتے وقت آپ کے ذہن میں جو کچھ گزر رہا ہے اس سے بھی واقف ہے اور وہ آپ کی بات کو بالکل اسی طرح سمجھ رہا ہے،

جیسے آپ سمجھ رہے ہیں، تو ایک اور مثال دینے کی
اجازت دیجیے۔ معاہدے جب ہوتے ہیں خواہ وہ
کمپنیوں کے درمیان ہوں، خواہ حکومتوں، خواہ افراد
کے مابین تو پہلے بات چیت کے ذریعہ سمجھوتا کیا جاتا ہے
اس وقت ایسا محسوس ہوتا ہے کہ ہر بات طے ہوگئی
لیکن جب معاہدہ کو قلمبند کرنے چلتے ہیں، مسودہ
تیار ہوتا ہے، اس پر بحث ہوتی ہے تو پتہ چلتا ہے
کہ دونوں فریق اپنے معہودِ ذہنی کے مطابق سمجھوتے
کو الگ الگ معنی پہنا رہے تھے، پھر سے بحث شروع
ہوجاتی ہے اور ایک ایک لفظ پر ہوتی ہے تب کہیں
ایک دوسرے کا مفہوم اور مقصود واضح ہوتا ہے اور
اتفاق اور اتحاد کی راہ نکلتی ہے۔ مضمرات کے
متعلق ایک دوسرے کے تصورات کے درمیان بڑی
دوری تھی۔

مینیجمنٹ اور انتظام کا یہ اہم اصول ہے کہ
پالیسی اور احکام بالکل واضح ہوں۔ ان میں ابہام رہتا
ہے تو نیچے پہونچتے پہونچتے معنی کچھ سے کچھ ہوجاتے
ہیں اور احکام کی تعمیل اور پالیسی کا نفاذ کرنے
والے اپنے اپنے ڈھنگ سے اپنی اپنی فہم کے مطابق
ان پر عمل اور ان کو نافذ کرتے ہیں۔ جن لوگوں کا ذہن
مرتب اور عادتیں اور افعال سانچے میں ڈھلے ہوئے
ہوتے ہیں اور وہ جو کچھ کہتے ہیں ناپ تول کر صراحت
و قطعیت کے ساتھ کہتے ہیں۔ اس جگ میں ان ہی
کا طوطی بولتا ہے اور اس دنیا میں ان ہی کے حسن
تدبیر کا سکہ چلتا ہے۔ ان ہی کی بات مانی جاتی
ہے اور کامیابی ان ہی کے قدم چومتی ہے۔ ذہن
کی صفائی سے بات میں وضاحت آتی ہے اور بات
کی وضاحت سے ذہن صاف ہوتا ہے۔

بات کہیے تو کھری کہیے، کھرا لگتی کہیے، دل میں
اترتی کہیے، ذہن میں پیوست ہوتی کہیے۔ وہ بات
بھی کوئی بات ہوئی جو جناب شیخ کے نقشِ قدم کی
طرح یوں بھی ہے اور یوں بھی۔ اس بات سے سننے والے
کو نہ روشنی ملے گی نہ آگاہی نہ ہدایت۔ ملے گا تو الجھن
ملے گی اور ابہام اور تشویش و پیچ ملیں گے۔ بات پوری
کہیے۔ وہ کیا بات ہوئی جو روشنی کے بجائے تاریکی
لائے اور فیصلہ کی جگہ تردد کا پرچم بلند کرے، جو
معہودِ ذہنی کے سیاق وسباق سے ٹوٹ کر زبان
پر آئی ہو۔ یاد رکھیے کہ انسان جس طرح خود اپنے
تحت الشعور کو نہیں سمجھ پاتا اسی طرح دوسرے اس
کے معہودِ ذہنی کو نہیں سمجھ سکتے۔ لہٰذا آپ نہ خود
کو آزمائش اور تذبذب میں ڈالیے نہ دوسروں
کو۔ آپ اگر کچھ کہہ رہے ہیں تو بات کو پوری تفصیل
(دنیا اسے غیر ضروری تفصیل کہے گی، کہنے دیجیے) کے ساتھ
دہرایے تاکہ سننے والے کو کسی قسم کا شبہ نہ باقی رہے
اور وہ پہلو جو اس بات کے حوارین ہیں اور تلازمے
اور حاشیہ نشیں متعلقات، سبھی روشن ہوجائیں تاکہ
بات آئینہ کی طرح واقعہ اور ہدایت، واقعہ کی پوری
عکاسی کر سکے۔ سننے والے کو بھی چاہیے کہ بات کو اچھی
طرح سے ناپ تول کر دیکھ لے اور ضروری متعلقات
اور تاریک گوشوں کو سوالات کر کے روشنی میں لے
آئے۔ اس طریقہ یا عمل کو ہم نے گردھری ڈھنگ کا
نام دیا ہے۔ وجہ تسمیہ پھر کبھی بتائیں گے۔

سعدی نے کہا تھا کہ دو باتیں خلاف عقل
ہیں۔ یعنی بولنے کے وقت دم سادھ لینا کلی بھی
ہوسکتا ہے اور جزئی بھی۔ جو لوگ پوری بات نہیں
کہتے۔ وہ بھی عقل کے ساتھ دشمنی کرتے ہیں اور
فتنہ و فساد کے لیے نئی راہیں کھولتے ہیں۔ شعرائے
کرام کو یہاں چھوٹ دینی پڑے گی۔ شاعر کے
معہودِ ذہنی کی تلاش میں قارئین اور ناقدین کے
قافلے مسافتوں پر مسافتیں طے کیے چلے جاتے ہیں
اور اسرار ہیں کہ فاش ہونے میں نہیں آتے تم
گتھیاں ہیں کہ سلجھنے کا نام نہیں لیتیں۔ اور اشارہ،

کنایہ، تشبیہ، استعارہ شاعر کا اوڑھنا بچھونا ہیں۔
صراحت سے اسے گریز ہے۔ اس کی تخلیقی فضا دلنواز
ابہام سے تشکیل پاتی ہے۔ دھیمی دھیمی ٹھنڈی ٹھنڈی
چاندنی سے اس کے شبستاں میں روشنی ہوتی ہے
جن کا سحر دیکھی ہوئی اور معروف اور معمولی چیزوں
اور مناظر کو دلکشی میں نہلا دیتا ہے۔ ایسے طلسم خانہ
میں خورشید سے نامحرم کا گزر کہاں۔ وہ اگر در آیا
تو جال چور دروازہ سے نکل گیا۔ طلسم ٹوٹ گیا۔
سورج صراحت کا پرچم لے کر آتا ہے۔ چاند لطیف
اشاروں اور ابہام احتمال، قیاس اور خواب نوشیں
کے سایہ میں زمین کے طواف کو نکلتا ہے۔ پھر حیرت
کیوں کہ مجنوں کو قمر سے منسوب کرنے لگے ہیں۔
انگریزی بلکہ لاطینی زبان میں چاند اور جنوں کا مادہ
ایک ہی ہے۔ چاند کی کشش، اس کی سحر آفرینی
تسلیم، لیکن دنیا کے وجود اور زندگی کی بقا کی بات
جب آئے گی سورج کو چاند پر ترجیح دینا پڑے گی
وضاحت سے بات ہوگی تو زندگی کا کاروبار ڈھنگ
سے چلے گا۔ بات ڈھکے چھپے انداز سے، جھلکیوں میں،
بٹی ہوئی اور دائرہ دار ہوگی تو وحشت اور نصف
جنوں کا عالم دیکھنے میں آئے گا۔ شاعروں کو چھوڑیے
جنھیں قارئین اور ناقدین پر لگا کر اڑاتے ہیں اور
اپنے معہودِ ذہنی سے ان کے معہودِ ذہنی کو ان کے
معہودِ ذہنی سے ٹکراتے کر وہ چنگاریاں پیدا کرتے
ہیں جن سے نگاہیں خیرہ ہو جاتی ہیں۔ اس ٹکراؤ
سے ایک نیا مرکب وجود میں آتا ہے جو شاعر کے وہم
و گمان سے بھی پرے رہا ہوگا۔

عام اور سادہ رو انسانوں کی عافیت
اسی میں ہے کہ پیغام رسانی، ہدایت اور خطاب
اور ابلاغ کا جہاں تک تعلق ہے کہنے کی بات کو
ادھوری اور ان کہی نہ چھوڑیں۔ عام آدمی
خیریت اسی میں دیکھتا ہے کہ سورج کی روشنی
میں اپنا کام کرے اور دن چھپے گھر آ جائے۔ رات
کو باہر رہنے میں زر اور وقت کے ساتھ عزت اور
شہرت کا زیاں (اور بڑے شہروں خصوصاً ترقی یافتہ
ممالک کے بڑے شہروں میں) اور جان کا خطرہ بھی ہے۔
روزمرہ کی زندگی میں آپ کا ساتھ نہ تحت الشعور
دے گا نہ معہودِ ذہنی۔ ساتھ دیں گے تو صرف
عقل کی روشنی میں صاف صاف کہے ہوئے
دو بول۔

سیّد حامد
۲۷ جون ۱۹۸۳ء
چنڈی گڑھ۔

بقیہ مضمون ڈاکٹر سی۔ وی۔ رمن

جائے.... ویسے تو دوسرے لوگوں کے ترتیب
دیے ہوئے طریقوں پر چل کر تکنیکی مہارت تو حاصل
ہو سکتی ہے لیکن کسی عظیم انکشاف کی تخلیق نہیں ہو سکتی۔
اعلیٰ سائنسی انکشاف کے لیے خود سائنس داں کے اندر
قدرت اور کائنات دونوں کے رموز کو جستجو کی گہری
لگن کا ہونا لازمی ہے۔

ڈاکٹر ایک بہت عظیم استاد تھے، ان کی تقریر میں
ایک سحر تھا اور یہ تقریریں بڑی مدلل اور واضح ہوتی
تھیں۔ یہ قدرت کی دین تھی کہ وہ اپنی بات چیت کو دلچسپ
بنا دیتے تھے۔ وہ اکثر فرماتے تھے کہ اگر کوئی شخص اپنی
بات چیت یا تحریر میں اپنے خیالات کا بخوبی اظہار کر سکتا ہے
تو اس کا مطلب ہے کہ اس شخص کے تصورات منظم ہیں اور
وہ صحیح سمت میں سوچ بھی سکتا ہے خود ان کا یہ عالم تھا
کہ سائنس کی لطیف سی لطیف بات کو وہ بچوں کی زبان میں
بیان کر سکتے تھے۔ ڈاکٹر رمن ایسے سائنس داں صدیوں
کے الٹ پھیر کے بعد پیدا ہوتا ہے۔

(از۔ قومی راج)

عارفہ کمال
قصبہ رامپور۔ ضلع سہارنپور

اخلاق

"اخلاق" خلق کی جمع ہے۔ خلق ایک نفسانی ملکہ ہے جس کے سبب انسان اچھے کام بآسانی کرسکتا ہے۔ یعنی وہ حالت جس کی وجہ سے انسان نیک کام کر سکے اس کو خلق یا اخلاق حسنہ کہتے ہیں بنی نوع انسان کے ساتھ خندہ پیشانی اور خلوص سے پیش آنے والا شخص خوش اخلاق کہلاتا ہے۔

خوش اخلاق آدمی کی پہچان ہے، اس کی خوش بیانی، لوگوں سے خلوص و محبت، سخاوت، خوش مزاجی، بلند حوصلگی، جذبۂ خدمتِ خلق، تواضع، حلم، شجاعت، عفت، صبر و استقلال، صداقت، قناعت، شائستہ اطوار وغیرہ

خوش اخلاق شخص سب کے ساتھ محبت و مروت سے پیش آتا ہے اور سب کو اپنا دوست رکھتا ہے۔ ابوبکر واسطیؒ نے فرمایا"

"خلق عظیم یہ ہے کہ نہ تیری کسی سے دشمنی ہو اور نہ کوئی تیرا دشمن ہو۔"

صحیح بخاری کی ایک حدیث ہے۔

"اِنّ من احبکم الیّ احسنکم اخلاقاً۔

(تم میں وہ شخص میرے نزدیک زیادہ محبوب ہے جو زیادہ خلیق ہو")

اگر آپ اخلاق کے بارے میں جاننا چاہیں تو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی زندگیِ پاک کا بغور مطالعہ کیجیے۔ آپؐ تمام انسانوں سے زیادہ خوش خلق تھے۔ ہر ایک کے ساتھ نرمی سے پیش آتے۔ بیماروں کی دیکھ بھال اور تیمارداری کرتے تھے۔ عذر خواہ کا عذر قبول فرما لیتے تھے۔ کسی نے اُم المؤمنین حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا سے دریافت کیا کہ حضورؐ کے اخلاق کیسے تھے؟ حضرت عائشہؓ نے فرمایا "کیا تم نے قرآن نہیں پڑھا ہے؟ جو کچھ قرآن میں ہے وہ حضور پاکؐ کے اخلاق تھے"۔ یعنی قرآن انسان سے جو صفات طلب کرتا ہے وہ سب آپؐ میں موجود تھیں اور یوں آپؐ دنیا کے لیے مکمل نمونہ تھے۔

آپؐ کی ساری زندگی قرآن پاک کی عملی تفسیر تھی۔ خود قرآن نے اس کی شہادت دی اور کہا

" انک لعلیٰ خلقٍ عظیمo (پ ۲۹ سورۃ ۶۸ قلم)

(بے شک اے محمدؐ! آپ حسنِ اخلاق کے بڑے رتبے پر ہیں"

حضورؐ نے بھی فرمایا کہ میں دنیا میں اس لیے بھیجا گیا ہوں کہ محاسنِ اخلاق کو مکمل کر دوں"

ایک شخص نے حضورؐ سے سوال کیا کہ

"سارے عمل میں بہتر کون سا عمل ہے؟"

آپؐ نے فرمایا:

"حسن خلق"

ام المومنین حضرت عائشہ صدیقہ طیبہ طاہرہؓ سے

روایت ہے کہ حضور اکرمؐ نے فرمایا:

"اگر نرمی اور خوش اخلاقی نظر آنے والی چیز ہوتی تو خدا تعالیٰ کی پیدا کردہ چیزوں میں سے کوئی چیز اس سے زیادہ خوبصورت نہیں ہوتی۔ اور اگر بداخلاقی نظر آنے والی چیز ہوتی تو تمام مخلوقات میں اس سے زیادہ بدصورت اور کوئی چیز نظر نہ آتی۔

(مسند امام اعظمؒ)

حضور انورؐ سے دریافت کیا گیا کہ وہ کون سی چیز ہے جو سب سے بڑھ کر بہشت میں داخل ہونے کا موجب ہو سکتی ہے؟

آپؐ نے فرمایا:

"خدا کا خوف اور خوش خلقی"۔

ایک مرتبہ ایک شخص نے خدمتِ نبویؐ میں حاضر ہونا چاہا۔ آپؐ نے فرمایا:

"آنے دو۔ وہ اپنے خاندان میں برا ہے"

جب وہ آکر بیٹھا تو آپؐ نے نہایت لطف و محبت سے اس سے باتیں کیں۔ حضرت عائشہؓ کو تعجب ہوا۔ جب وہ اٹھ کر چلا گیا تو عرض کیا

"یا رسول اللہ! آپؐ اس کو اچھا نہیں جانتے تھے۔ لیکن جب وہ آیا تو آپؐ نے اس سے لطف و محبت سے گفتگو فرمائی"

ارشادِ نبویؐ ہوا

"اے عائشہؓ! بدترین آدمی وہ ہے جس کی بداخلاقی سے ڈر کر لوگ اس سے ملنا چھوڑ دیں"۔

حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا فرماتی ہیں کہ

میں نے حضورؐ کو فرماتے ہوئے سنا کہ مومن خوش اخلاقی کی برکت سے رات کو جاگنے والے اور دن کو روزہ رکھنے والے کا درجہ حاصل کر لیتا ہے (ابوداؤد)

حضرت ابو ہریرہؓ سے روایت ہے کہ حضور اکرمؐ نے فرمایا کہ

جو شخص خدا پر اور قیامت کے دن پر یقین رکھتا ہے، اسے چاہیے کہ اچھی بات کہے ورنہ چپ رہے۔ (بخاری شریف)

آپ دیکھتے ہیں کہ ہم اپنے ہمسایوں اور احباب اور رشتہ داروں کو اپنی خوش اخلاقی اور شیریں کلامی سے اپنا گرویدہ بنا لیتے ہیں۔ لیکن اس کے برعکس اگر ہم بداخلاقی اور تلخ کلامی سے پیش آتے ہیں تو لوگ ہم سے ملنا چھوڑ دیں گے اور ہمارے دشمن ہو جائیں گے۔

بارگاہِ الٰہی میں اس شخص کی دعا جلد مقبول ہوتی ہے جو اس کی جملہ مخلوقات سے خواہ وہ ادنیٰ ہو یا اعلیٰ، محبت اور ہمدردی کا برتاؤ کرے۔ ایسے شخص کا فراخ دل نہایت شفاف [illegible] قسم کی نیکیوں اور اوصافِ حمیدہ کا مسکن ہوتا ہے اور اخلاقِ حسنہ کی تمام صفات اس میں پائی جاتی ہیں۔

اگر آپ جاہل کو تعلیم دیں، غصہ ور کو ٹھنڈا کریں، مایوسوں کی ڈھارس بندھائیں، بیماروں کی تیمارداری کریں، مصیبت زدہ لوگوں کے کام آئیں، غیبت کرنے والے کو نصیحت کریں، مخلوقِ خدا کی خدمت کریں، ہر ایک کی عزت کریں، سب کے ساتھ مل جل کر رہیں اور خوش اخلاقی سے پیش آئیں تو سب لوگ آپ کی عزت کریں گے اور محبت اور خوش اخلاقی سے پیش آئیں گے

خوش اخلاق شخص دوسروں کو نصیحت کرتے وقت شیریں کلامی سے کام لیتے ہیں اور پیار و محبت سے سمجھاتے ہیں اس طرح سننے والے کو کڑوی نصیحت بھی بھلی لگتی ہے اور اس کے دل پر اثر انداز ہوتی ہے۔

باقی صفحہ نمبر ۱۲ پر

ڈاکٹر سید فیروز حمید (سمستی پور)
اور
مسز روحی عارفی (پٹنہ)

گھروں میں پائے جانے والے ضرر رساں کیڑے

ہمارے گھروں میں بہت سے ایسے کیڑے مکوڑے ہوتے ہیں جو اکثر دردِ سر بن جاتے ہیں۔ کچھ تو باورچی خانے میں ملتے ہیں اور کچھ کپڑوں میں۔ بعض کیڑے بیماریوں کو پھیلاتے ہیں اور بعض انسان کے جسم پر ہی پلتے ہیں۔ ان سے بچنے کے لیے یہ ضروری ہے کہ ہم ان کے متعلق اہم معلومات حاصل کریں۔ ایسے ہی چند کیڑوں کا ذکر ہم یہاں کریں گے۔

۱۔ جوں۔

جسم پر پلنے والا یہ کیڑا انسان کا سب سے قریبی دشمن ہے۔ عام طور پر یہ کیڑے بالوں میں اور جسم سے چپکے گندے کپڑوں میں پائے جاتے ہیں۔ مردوں کی بہ نسبت عورتیں ان کیڑوں سے زیادہ متاثر ہوتی ہیں۔ سر کا جوں ننھا سا کیڑا جو سیاہ رنگ کا ہوتا ہے، جسم سے خون چوستا ہے، جس کی وجہ سے تھکاوٹ اور سستی محسوس ہوتی ہے اور آدمی رفتہ رفتہ کمزور ہونے لگتا ہے۔ جوں کے کاٹنے سے جسم کے اس حصے میں کھجلی محسوس ہوتی ہے۔ یہ کھجلی جسم میں جوں کے رال کی وجہ سے ہوتی ہے جسے وہ اپنے منہ کے ذریعے خون چوستے وقت نکالتا ہے۔ علاوہ ازیں جوں سے ایک دوسرے طرح کی رطوبت بھی نکلتی ہے جس سے سر کے بال آپس میں جڑ جاتے ہیں اور پپڑیاں جم جاتی ہیں۔ انھیں پپڑیوں میں جوں انڈے دیتا ہے جو لیکھ کہلاتے ہیں۔ کپڑوں میں رہنے والا جوں جسے عام طور پر چلڑ بھی کہا جاتا ہے، سفید یا ہلکا سرخی مائل ہوتا ہے۔ یہ بھی جسم کی جلد سے اپنے باریک سونڈھ نما منہ سے خون چوستا ہے۔ ان کیڑوں کی مادہ کپڑوں کی سلائیوں کے درمیان انڈے دیتی ہے۔ گندا کپڑا پہننے والوں کے جسم پر ان کی بہتات رہتی ہے۔

جوں سے حفاظت کیسے کی جائے؟

جوں سے بچاؤ کا بہتر طریقہ یہ ہے کہ جسم اور کپڑوں کو صاف رکھا جائے۔ جوں سے بچاؤ کے لیے کئی طرح کے تیل جن میں دوائیں ملی ہوتی ہیں، بازاروں میں ملتے ہیں، ان کا استعمال فائدہ مند ہوتا ہے۔ مالاتھیون ملی ہوئی کئی دوائیں بازاروں میں ملتی ہیں مثلاً سائی بین یا لائی سل (lice kly)۔ ان دواؤں سے جوں بالوں ہی میں مر جاتے ہیں۔ ان دواؤں کو خشک بالوں میں جڑ تک اچھی طرح ملائیں اور چار پانچ گھنٹے کے بعد سر کو دوبارہ اچھی طرح صابن سے دھولیں۔ اگر دوبارہ جوں پھر ہو جائے تو پھر اسی دوا کو استعمال کرنا چاہیے۔ اس کے علاوہ زائی لین (xylene) اور تھوڑی سی ویسلین رات میں سوتے وقت سر پر رگڑ کر مل لیا جائے اور صبح اٹھ کر سر کو دھولیں تو جوں مر جائے گی۔ اسی طرح زیتون کا تیل سر میں ملنے اور پھر گرم پانی سے دھونے سے بھی جوں مر جاتے ہیں۔ اکثر دیکھا گیا ہے کہ عورتیں

ایک دوسرے کے بالوں کو کرید کر جوں نکالتی ہیں اور
انھیں ناخن پر مارتی ہیں۔ اس طرح جوں مارنے کے
بعد ہاتھ کو فوراً دھو لینا چاہیے۔ تاکہ مرے ہوئے جوں
کا ہاتھوں پر لگا ہوا مادہ کھانے کے ساتھ پیٹ میں نہ
داخل ہو جائے۔ اس مادے سے کئی قسم کی بیماریاں
ہو سکتی ہیں۔ ساتھ ہی خود اپنا بھی سر کھجلاتے وقت
انگلی کے ذریعے جوں کے انڈے آپ کے سر تک پہونچ
سکتے ہیں۔ کپڑوں میں پلنے والے جوں کو مارنے کے
لیے روزانہ استعمال میں رہنے والے کپڑوں کو خاص
طور پر گرم پانی سے دھو لینا چاہیے۔ اس کے علاوہ
کپڑوں کو مالاتھیون (Malathion) اور پانی کے
محلول میں تھوڑی دیر ڈبو کر رکھیں اور پھر برتن
میں پانی کے ساتھ کپڑوں کو گرم کریں اور بعد میں
اچھی طرح صابن سے دھو کر دھوپ میں خشک کر لیں
ایک بار جوں مر جائے تو ہمیشہ احتیاط کریں تاکہ
دوبارہ نہ ہو جائیں۔

۲۔ کھٹمل

خون چوسنے والے کیڑوں میں کھٹمل بھی
ایک اہم کیڑا ہے۔ جس گھر میں ایک بار کھٹمل داخل
ہو جائے وہاں سے مشکل سے ہی دور ہوتا ہے۔ تل
کے دانے جیسی شکل کا چپٹا، کتھئی رنگ کا یہ کیڑا آدمی
اور دوسرے دودھ دینے والے جانداروں اور
پرندوں کے جسم سے خون چوستا ہے۔ ان کا ایک مقام
سے دوسرے مقام تک پھیلنا بھی بہت دلچسپ ہے۔
چپٹے ہونے کی وجہ سے یہ بہت آسانی سے چارپائیوں
کی پٹیوں کے بیچ دراروں اور سوراخوں میں چھپ
جاتے ہیں۔ اگر بستر ایک جگہ سے دوسری جگہ پر
لے جایا جائے تو بھی اس کے ساتھ سفر کرتے ہیں
اور پڑوسیوں کے بستروں میں بھی جا گھستے ہیں۔
یہاں یہ ذکر بھی دلچسپی سے خالی نہ ہوگا کہ یہ کھٹمل تقریباً
ایک سال تک بغیر غذا کے زندہ رہ سکتا ہے۔ جہاں
کھٹمل ہوتے ہیں وہاں ایک خاص قسم کی بو ہوتی ہے۔
کھٹمل رات میں نکلنے والا کیڑا ہے۔ یعنی دن بھر چھپا
رہتا ہے اور رات کو حملہ آور ہوتا ہے۔ کھٹمل کے کاٹنے
کا جسم پر فوراً اثر نہیں ہوتا ہے۔ کچھ دیر بعد جسم کے کاٹے
ہوئے حصے میں تیز جلن کے ساتھ کھجلی پیدا ہو جاتی ہے
کھجلاہٹ کا یہ اثر کافی دیر تک رہ سکتا ہے، اس کے
ساتھ ہی ساتھ جسم پر لال نشان بھی ہو جاتا ہے۔

کھٹمل سے بچاؤ کا طریقہ

کھٹمل مارنے کے لیے جن کیمیائی ادویات کا
استعمال کیا جاتا ہے وہ زہریلی ہوتی ہیں۔ اس لیے اس
بات کا خیال رکھنا چاہیے کہ بچے اس کے قریب نہ آنے
پائیں۔ ان کو ختم کرنے کی دواؤں میں اہم ادویات
ڈائزینان (Diazinon)، ڈائٹاف (Diatoph)
وغیرہ ہیں۔ ان دواؤں کا ۰.۰۵ سے ۱٪ فیصد تک کا
محلول بنا کر کھٹمل والی چارپائی یا کرسیوں پر اس
طرح چھڑکا جائے کہ دوا سوراخوں کونوں اور جوڑوں
میں اچھی طرح چلی جائے۔ اس کے علاوہ میتھائل (Meth-
yl) برومائڈ (Bromide) میتھائل فارمیٹ
(Methyl formate) ایتھائل آکسائڈ (Ethyl Oxide)
(سب ہی بازار میں آسانی سے مل جاتے ہیں) یا پائریتھرم
کے سفوف کو چھڑکنے سے بھی کھٹمل مر جاتے ہیں۔ زمانہ
قدیم سے ہی کھٹمل مارنے کے لیے سورج کی شعاعوں کا
استعمال کیا جاتا رہا ہے۔ کھٹمل لگی چارپائی یا کرسی کو
دھوپ میں ڈال دیتے ہیں۔ عام طور پر سخت دھوپ
کی بنا پر کھٹمل ان اشیاء سے نکل کر مر جاتے ہیں۔ لیکن
تھوڑے بہت سخت جان پھر بھی رہ جاتے ہیں۔ ایسی
حالت میں بند کمرے میں ایک جگہ سبھی کھٹمل لگی چارپائیوں
اور فرنیچر کو رکھ کر کمرے کے درجۂ حرارت کو ۶۰
سے ۶۵ ڈگری تک کر دینا چاہیے۔ اس طرح کھٹمل کا
مکمل خاتمہ ہو جاتا ہے۔ گرمی بڑھانے کے لیے انگیٹھی کا

ہیٹر بھی جلایا جا سکتا ہے۔

۳۔ تل چٹا

باورچی خانہ، غسل خانہ، ٹائلٹ، اسٹور اور دوسرے کئی گندے مقامات پر بھورے لال رنگ کا تقریباً چار یا پانچ سینٹی میٹر لمبا، پنکھوں والا یہ کیڑا اکثر بڑی تعداد میں تاریک کمروں میں روشنی جلانے پر تیزی سے ادھر ادھر بھاگتا نظر آتا ہے۔ نر اور مادہ دونوں ہی یکساں طور پر نقصان دہ ہیں۔ تل چٹے دن کی روشنی میں اندھیری جگہوں میں چھپے رہتے ہیں۔ لیکن رات ہوتے ہی اپنی غذا کی تلاش میں نکل پڑتے ہیں۔ یوں تو غذا کی تلاش میں یہ جوتے، کتابوں، کپڑوں وغیرہ سبھی جگہ پہنچتے ہیں۔ لیکن باورچی خانہ میں گری پڑی اشیاء مثلاً روٹی کے ٹکڑے، آٹے، جھوٹے برتن وغیرہ میں خاص طور سے ملتے ہیں۔

تل چٹے سے بچاؤ کی ترکیب

تل چٹوں اور اس طرح کے دوسرے کیڑوں سے بچنے کے لیے باورچی خانہ اور دوسری جگہوں کی مکمل صفائی اور روشنی کا انتظام ضروری ہے۔ کم از کم ہفتہ میں ایک بار ڈبوں، کنستروں وغیرہ کی جگہوں کو تبدیل کر کے پانی کے ذریعہ ان کی صفائی بھی کر دیں۔ تل چٹوں کو اندھیرا بہت پسند ہے۔ اس لیے اشیاء خوردنی کو اس طرح رکھیں کہ ہر کونے میں دھوپ اور روشنی پہنچ سکے۔ جہاں تک کیمیائی دواؤں کا سوال ہے، کلورڈین (Chloradine) تل چٹا کو مارنے میں کارگر ثابت ہوتی ہے۔ ان جگہوں پر جہاں تل چٹا کے ملنے کا امکان ہو ۵ء۲ فیصد طاقت والی کلورڈین (Chloradine) دوا کا سفوف ڈالیے ڈی، ڈی، وی، پی یا نیووان کا پانی میں محلول بنا کر چھڑکنے سے بھی تل چٹا فوراً مر جاتا ہے۔ تل چٹوں کو مارنے کا آسان طریقہ یہ ہے کہ گھروں میں پڑے جوتے کے گتا کا ایک ڈبہ لیں۔ اس میں چاروں طرف کیل سے سوراخ کر دیں اور اندر چوکر یا موٹا آٹا تھوڑی سی چاشنی کے ساتھ ملا دیں۔ پھر اس میں کلورڈین (Chloradine) بورکس پاوڈر (Boric Powder) یا ڈی۔ ڈی۔ ٹی (D.D.T) پاوڈر ڈال دیں۔ کنارے میں دو تین بڑے سوراخ تل چٹوں کی آمد و رفت کے لیے کر دیں اور اسے ڈھک کر کسی کونے، باورچی خانہ یا اسٹور میں یا ایسی جگہ پر رکھ دیں جہاں روشنی اور ہوا کم آتی ہو اور تل چٹے زیادہ ملتے ہوں۔ اس طرح کے ڈبے دو تین جگہوں پر رکھ دیے جائیں تو پھر تل چٹوں سے مکمل چھٹکارا مل سکتا ہے۔

۴۔ مچھر

مچھر بھی ہمارے لیے کچھ کم نقصان پہنچانے والے نہیں ہیں۔ اگر یہ کہا جائے تو شاید غلط نہ ہوگا کہ ان کا کوئی ثانی نہیں ہے۔ موسم گرما میں خاص طور پر کھلی جگہوں پر یہ اڑتے ہیں تو ان کی موجودگی سے اکثر و بیشتر رات میں سونا مشکل ہو جاتا ہے۔ گرمی کے دنوں میں خاص کر جب کھلی جگہوں میں سونے کو طبیعت چاہتی ہے تو مچھر خون چوسنے کے لیے اڑانیں بھرتے ہیں۔ اس کے علاوہ مچھر ملیریا جیسی مہلک بیماری بھی پھیلاتے ہیں۔ اس ننھے سے گھریلو دشمن سے بچاؤ کے لیے خاص کر جہاں ان کی بہتات ہو، چاہیے کہ لوگ شام کے بعد ایسے کپڑے پہنیں جو ان کے جسم کا زیادہ سے زیادہ حصہ ڈھک سکیں۔ جسم کے کھلے حصوں پر مچھر سے بچنے والی کریم مثلاً اوڈوماس (Odomos) مل لیں۔ اس کے علاوہ رہائشی کمروں کی کھڑکیوں اور دروازوں پر مہین جالی بھی لگائیں۔ سوتے وقت مچھر دانی کا بھی ضرور استعمال کریں۔ مکان کے آس پاس ٹھہرا ہوا پانی

نہ رہنے دیں۔ مچھر کے انڈے دینے کی جگہوں، جیسے تالاب، نالے اور گڈھوں وغیرہ پر پٹرولیم تیلوں کا چھڑکاؤ کرنا چاہیے۔

گھر میں مچھر کی روک تھام کیسے کریں ؟

اس کے لیے ۲۰۰ ملی میٹر مالا تھیون کا محلول دیوار پر چھڑکنے سے مچھر مر جاتے ہیں۔ اس دوا کے علاوہ پائریتھرم (Pyrethrum) کے چھڑکاؤ سے بھی مچھروں کو قابو میں رکھا جا سکتا ہے اس کے لیے دو فیصد طاقت والا پائریتھرم استعمال کریں۔ بازاروں میں ملنے والی کئی ایسی دوائیں ہیں جیسے فلٹ بیگان یا فنیٹ وغیرہ۔ ان دواؤں کے چھڑکنے سے بھی مچھر مر جاتے ہیں۔ سب سے زیادہ کارگر Baygon بیگان ہے۔

۵ گھریلو مکھی

گرمی کے دنوں میں باورچی خانہ اور دوسری جگہوں پر ان کی تعداد کافی بڑھ جاتی ہے۔ ان مکھیوں سے کئی قسم کی بیماریاں پھیلتی ہیں۔ دودھ پیتے بچوں کو ان سے خاص طور پر محفوظ رکھنا چاہیے۔

مکھیوں کی روک تھام

گھریلو مکھیوں سے بچنے کے لیے گھروں کو فنائل سے روزانہ دھونا چاہیے اور فلٹ یا فنٹ جیسی دواؤں کو چھڑکنا چاہیے۔ ان دواؤں سے مکھی اور مچھر اور تل چٹے، سب ہی مر جاتے ہیں۔ جس گھر میں چھوٹے بچے نہ ہوں وہاں اخبار یا کسی بڑے کاغذ پر دانے دار بیگون (Baygon) دوا ڈال کر تھوڑی چینی ڈال دیں۔ مکھیاں اس پر آکر خود ہی مرتی رہیں گی۔ جس گھر میں مکھی زیادہ ہوتی ہیں وہاں صبح چہرے پر آکر زیادہ پریشان کرتی ہیں۔ اس لیے ضروری ہے کہ کھڑکیوں، دروازوں پر جالی لگا دی جائے۔ بازار میں فلائی فلیپر بھی اب ملنے لگا ہے۔ اس سے آسانی سے ایک دو مکھیوں کو مارا جا سکتا ہے۔

اس طرح ہم دیکھتے ہیں کہ گھروں میں پائے جانے والے یہ عام کیڑے ہمیں کس قدر نقصان پہنچاتے ہیں۔ لیکن عام طور پر لوگ انھیں نظر انداز کرتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ مختلف مقامات پر ان کی تعداد میں اچھا خاصا اضافہ ہوجاتا ہے اور مسائل پیدا ہوجاتے ہیں۔ لیکن اس حقیقت سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ انھیں ختم کرنے کے لیے بہت کچھ کیا جا چکا ہے اور اس میں کامیابی بھی ملی ہے۔ لیکن انھیں پورے طور پر ختم کرنے کے لیے ہمیں مختلف تدابیر اختیار کرنی ہوں گی۔ جن کا یہاں ذکر کیا گیا ہے۔ تاکہ ان سے پیدا شدہ بیماریوں کو ختم کیا جا سکے۔

منقول از "سائنس کی دنیا" سہ ماہی

بقیہ مضمون "اخلاق"

حکیم یا ڈاکٹر اگر خوش اخلاق ہوتا ہے تو اس کی تشفی آمیز باتوں اور اس کے ڈھارس بندھانے سے مریض کی آدھی تکلیف ختم ہوجاتی ہے اور وہ جلد تندرست ہوجاتا ہے۔ اگر کوئی خوش اخلاق شخص کاروباری آدمی ہے تو اس کی خوش اخلاقی سے اس کے کاروبار کی شہرت بڑھتی ہے اور کاروبار ترقی کرتا ہے۔ با اخلاق عہدہ دار لوگوں کی نظروں میں مقبول ہوجاتا ہے اور اسی کا اخلاق اس کی ترقی کا ذریعہ ہوجاتا ہے۔

خوش اخلاق آدمی کا مطلب دنیا اور دین دونوں میں جلد نکلتا ہے۔ غرض کہ خوش اخلاقی ایسی نعمت ہے اور ایسی بہترین دولت ہے جو دونوں جہان میں مفید ہے۔

ڈاکٹر حکیم سید محمد کمال الدین حسین ہمدانی
علی گڑھ

تاثیر طعام

انگریزی میں ایک مثل ہے کہ تندرستی دولت مندی سے بہتر ہے۔ گویا خوش نصیب وہ شخص ہے جس کو تندرستی حاصل ہے نہ کہ امیری۔ ناقص الصحت امیر مثل خزانچی کے ہے کہ خزانہ کو دیکھتا ہے مگر کام میں نہیں لا سکتا۔ اس زمانہ میں شاید ہی کوئی شخص ہوگا جو پوری تندرستی حاصل ہونے کا دعویٰ کر سکے۔ جو تندرست معلوم ہوتے ہیں ان کی حالت یہ ہے کہ کسی کا دل کمزور ہے کسی کا گردہ، کسی کو نزلہ ہے، زکام رہتا ہے تو کسی کا ہاضمہ خراب۔

صحت کی خرابی کی ایک بڑی وجہ یہ ہے کہ ہم کسی دوا کے استعمال سے قبل یہ ضرور معلوم کرتے ہیں کہ یہ دوا گرم ہے یا سرد یا یہ دوا کیا نفع اور کیا نقصان نہیں پہنچا سکتی ہے مگر غذا کے متعلق ہم کبھی نہیں پوچھتے کہ یہ کھانا کس بیماری میں فائدہ پہنچاتا ہے اور کس مرض میں نقصان۔ گویا کھانا ہمارے معدہ میں جاکر ہماری کسی بیماری میں دخل انداز نہیں ہوتا۔ بلکہ عام طور پر ایسا ہوتا ہے کہ ہم جو چاہتے ہیں کھائے چلے جاتے ہیں جس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ ہمارے بدن کے کسی مرض میں اضافہ ہوجاتا ہے جو بعض اوقات ہلاکت کی منزل تک پہونچا دیتا ہے۔

اگر ہم اشیائے خوردنی کی تاثیرات سے واقف ہوں تو ایسی چیزیں استعمال کریں جو ہماری بیماری کو ابھرنے ہی نہ دیں اور ہم کو حکیم یا ڈاکٹر کے پاس جانے کی ضرورت ہی باقی نہ رہے۔

ہندوستان میں جو کھانے استعمال ہوتے ہیں وہ طبی اصول پر تیار کیے جاتے ہیں اور ان کے اجزاء کی ترکیب بھی طبی انداز پر ہوتی ہے۔ غذاؤں میں استعمال کی جانے والی جملہ اشیاء کا مزاج اور افعال و خواص طبی کتب میں تفصیل کے ساتھ بیان کیے گئے ہیں۔ جن کا علم نہایت ضروری ہے تاکہ حسب مزاج اور حالات بدن ہم غذائیں استعمال کر سکیں اور جو غذائیں ہمارے مرض کے لیے مضر ہوں ان سے پرہیز کر سکیں۔

طب میں علاج بالغذاء (غذاؤں سے علاج) کو بڑی اہمیت دی گئی ہے۔ امراض کے دوران صحیح غذاؤں کا استعمال اسی وقت کیا جا سکتا ہے کہ جب ہم غذاؤں اور ان کے ترکیبی اجزاء کے افعال و خواص سے صحیح طور پر واقف ہوں۔ چند مشہور غذاؤں اور ان کے ترکیبی اجزاء کے افعال و خواص حسب ذیل ہیں

اناج GRAINS

اناج (GRAINS) گیہوں (Wheat)۔ مزاج اس کا گرم و تر ہے۔

خواص :- تندرستوں کے لیے عمدہ غذا ہے۔ بھوک لا

آٹے کی روٹی میدہ کی روٹی سے بہتر ہوتی ہے

چاول :-(Rice) مزاج معتدل ہوتا ہے

خواص :- صحت کے لیے مفید ہے۔ بدن کو فربہ کرتا ہے۔ منی کو بڑھاتا ہے، اگر دودھ کے ساتھ کھایا جائے۔

جو (Hordeum Vulgare Linn)۔ مزاج سرد و خشک ہوتا ہے۔

خواص :- جوش خون کو کم کرتا ہے۔ پیاس کو تسکین دیتا ہے۔ ستو اور ماش جو گرمی کی حدت کو بدن کو تسکین دیتے ہیں۔

چنا (Cicer arietinum Linn) مزاج گرم و خشک ہے

خواص :- بدن کو فربہ کرتا ہے۔ کمر کو قوت پہونچاتا ہے۔ خون صالح پیدا کرتا ہے۔ بواسیر کے لیے مفید ہے۔ ریاح پیدا کرتا ہے۔

ترکاریاں Vegetables

شلغم (Turnip) مزاج گرم و تر ہے۔

خواص :- بصارت کو تیز کرتا ہے۔ کھانسی میں مفید ہے۔ پیشاب لاتا ہے۔ پیٹ نرم کرتا ہے۔ سنگِ مثانہ میں مفید ہے۔

چقندر (Beet Root)۔ مزاج گرم و تر ہے

خواص :- بدن کو تری پہونچاتا ہے۔ بلغم دور کرتا ہے۔ کھانا تحلیل کرتا ہے۔ رنگ صاف کرتا ہے باہ کو طاقت دیتا ہے۔ خون کو جلا دیتا ہے۔ ریاح دور کرتا ہے۔

بیگن :- مزاج گرم و خشک ہے

خواص :- معدہ کو طاقت دیتا ہے۔ سوداء پیدا کرتا ہے۔ بواسیر کو بڑھاتا ہے۔ سفید بیگن زیادہ مضر ہوتا ہے۔

گاجر (Carrot) مزاج گرم و تر ہے۔

خواص :- معدہ کو طاقت دیتی ہے جو ہری منی کو بڑھاتی ہے۔ بلغم، کھانسی، دردِ سینہ، دردِ معدہ اور دردِ جگر کو دور کرتی ہے۔ پیشاب خوب لاتی ہے۔ سنگِ گردہ کو خارج کرتی ہے۔ استسقاء اور ذات الجنب (نمونیہ) کے واسطے مفید ہے اس کا حلوہ بھی مقوی باہ ہے۔ گاجر اگر گوشت کے ساتھ پکا کر استعمال کی جائے تو خلط صالح پیدا کرتی ہے۔

مولی (Raphanus sativus Linn) مزاج گرم و تر ہے۔

خواص :- ریاح پیدا کرتی ہے۔ ڈکار لاتی ہے اور پیشاب لاتی ہے۔ معدہ کو خراب کرتی ہے۔ دانتوں اور حلق کے واسطے مضر ہے۔ گردہ اور تلی کے امراض اور یرقان و استسقاء میں مفید ہے۔

اروی (Arum) مزاج گرم و تر ہے۔

خواص :- بدن کو فربہ کرتی ہے اور باہ کو طاقت دیتی ہے کھانسی، سینہ و حلق کے لیے مفید ہے۔ دستوں کو رفع کرتی ہے۔

کریلا :- مزاج گرم و خشک ہے۔

خواص :- مقوی اعصاب اور مقوی باہ ہے اور منی پیدا کرتا ہے۔ جریان کے واسطے مفید ہے۔ استسقاء، اور نقرس کو نفع دیتا ہے۔ پیٹ کے کیڑوں کو ہلاک کرتا ہے۔ گرم مزاج والوں کے لیے نقصان دہ ہے

گوبھی (Cauli flower) مزاج گرم اور خشک ہے۔

خواص :- قوت باہ پیدا کرتا ہے۔ نیند لاتا ہے۔ معدہ کے بخارات دماغ تک چڑھنے نہیں دیتا۔ چہرہ کا رنگ نکھارتا ہے

لوکی (Pumpkin) مزاج سرد و تر ہے۔

خواص:۔ مدر بول اور ملین طبع گرم مزاجوں اور صفراوی مزاجوں کے موافق ہے۔ سریع الاستحالہ ہے خلطِ صالح پیدا کرتی ہے۔ اس کا گودا تالو پر رکھنا دردِ سر حار اور سرسام میں مفید ہے اور بے خوابی کو نافع ہے۔

بھنڈی (Halucus ablemoscus) مزاج سرد اور تر ہے۔

خواص:۔ خون پیدا کرتی ہے اور بدن کو تری پہونچاتی ہے۔ گرم و خشک مزاج والے کے لیے مفید ہے۔

پالک:۔ مزاج سرد و تر ہے۔

خواص:۔ طبیعت کو نرم کرتا ہے۔ پیاس اور بخار میں مفید ہے۔ سل کے مرض میں فائدہ پہنچاتا ہے۔ حلق کے درد، سر کے درد اور درد کمر کو مفید ہے۔

خرفہ (Portulaca Oleracea Linn) مزاج سرد اور تر ہے۔

خواص:۔ صفرا کو دفع کرتا ہے۔ حابس حیض ہے۔ نگاہ کو کمزور کرتا ہے۔

میتھی (Trigonella froenum graecum Linn) مزاج گرم و خشک ہے۔

خواص:۔ خون پیدا کرتا ہے۔ پیشاب لاتا ہے۔ دردِ کمر اور دردِ جگر کو مفید ہے۔ نیز دردِ رحم کے واسطے مفید ہے۔

دالیں (Pulses)

مونگ:۔ مزاج سرد و خشک ہے

خواص:۔ حرارت خون اور صفرا کے جوش کو کم کرتی ہے اس واسطے گرمیوں میں اس کا استعمال اچھا ہے رگ اور پٹھوں کو طاقت دیتی ہے۔ نگاہ کو تیز کرتی ہے۔ گرم دردِ سر، گرم نزلہ اور کھانسی بخار میں مفید ہے۔

مسور:۔ مزاج معتدل۔

خواص:۔ دیر ہضم ہوتی ہے۔ سوداویت بڑھاتی ہے بواسیر کے لیے مضر ہے قابض ہوتی ہے۔ نفخ و قراقر پیدا کرتی ہے۔ پیشاب و حیض کو روکتی ہے۔

ارہر:۔ مزاج سرد و خشک ہے۔

خواص: قابض، نفاخ اور دیر ہضم ہوتی ہے۔ فساد خون اور اسہال صفراوی کے لیے مفید ہے

ماش:۔ مزاج سرد و خشک

خواص: مونگ کی دال کی مانند ہے مگر اس سے زیادہ بادی ہوتی ہے

مصالحہ (Spices)

پیاز (Alleum capa Linn) مزاج گرم و خشک ہے

خواص:۔ باہ زیادہ کرتی ہے۔ اور ہاضمہ میں مدد دیتی ہے

لہسن (Allium satinum Linn) مزاج گرم و خشک ہے۔

خواص:۔ خون کو رقیق کرتا ہے اور خون کے دباؤ کو اعتدال پر لاتا ہے۔ معدہ کی رطوبت کو جذب کرتا ہے۔ معدہ کے کیڑے مارتا ہے۔ فالج، رعشہ، ضیق النفس کے واسطے مفید ہے۔ پیشاب اور حیض لاتا ہے۔

مرچ سرخ (Pepper) مزاج گرم و خشک ہے۔

خواص:۔ بلغم کو خارج کرتی ہے۔ سدہ کھولتی ہے۔ دماغ سے رطوبت نکالتی ہے۔ خون میں حدت پیدا کرتی ہے۔ رگوں کا ڈھیلاپن دور کرتی ہے۔ حلق کے واسطے مضر ہے اور باہ کو نقصان دیتی ہے۔

مرچ سیاہ (Piper Nigrum Linn) مزاج گرم و خشک ہے۔

خواص:۔ اعصاب کو طاقت دیتی ہے۔ بلغم کو صاف کرتی ہے۔ ہضم کو قوی کرتی ہے اور حافظہ

کو بڑھاتی ہے۔

ہلدی (Curcuma Longa Linn) مزاج گرم و خشک ہے۔

خواص: یرقان، استسقاء، جگر اور بصارت کو مفید ہے۔

دھنیا (Coriandrum Sativum Linn) مزاج سرد اور خشک ہے

خواص: بخارات دماغ کی طرف چڑھنے نہیں دیتا۔ نیند خوب لاتا ہے۔ دانتوں کی جڑوں کو مضبوط کرتا ہے

لونگ (Syzygaromaticum) مزاج گرم و خشک ہے۔

خواص: مقوی ارواح و اعضاء رئیسہ ہے۔ فالج و لقوہ کے لیے مفید ہے۔ بلغمی دردِ سر کے واسطے مفید ہے مقوی مثانہ ہے۔

پودینہ (Mint) مزاج گرم و خشک ہے۔

خواص: تپ بلغمی و سوداوی کے لیے مفید ہے۔

لیموں (Citrus Medica Linn) مزاج سرد و تر ہے

خواص: گرمی کو تسکین دیتا ہے۔ قے و متلی میں مفید ہے تبخیر اور دردِ سر حار میں مفید ہوتا ہے، معدہ و جگر کو قوت دیتا ہے۔

ادرک (Zingiber Officinales Rosc) مزاج گرم و خشک ہے

خواص: حافظہ بڑھاتا ہے اور ہضم کو قوی کرتا ہے۔ معدہ اور جگر کے سدے کھولتا ہے۔ ریاح کو تحلیل کرتا اور باہ کو بڑھاتا ہے، معدہ کے کیڑوں کو مارتا ہے

زیرہ (Carum Carvi Linn) مزاج گرم و خشک ہے

خواص: قابض و محلل ریاح ہے معدہ، آنتوں اور جگر کو قوت دیتا ہے۔ بھوک بڑھاتا ہے۔ نفخ اور ہچکی کو دفع کرتا ہے۔ مدر بول و حیض ہے۔

الائچی خرد (Elettaria Cardamomum) مزاج گرم اور خشک ہے۔

خواص: مقوی معدہ، حلق کی رطوبات کو خشک کرتی ہے۔ دردِ سر اور صرع (مرگی) کے لیے مفید ہے۔ قلب کو قوت دیتی ہے اور خفقان کی مسکن ہے۔

الائچی کلاں (Amomum Subulatum Roxb) مزاج گرم و خشک ہے۔

خواص: مفرح، مقوی معدہ اور ہاضم طعام ہے۔ ڈکار لاتی ہے اور دستوں کو بند کرتی ہے۔

جائفل: مزاج گرم و خشک۔

خواص: مفرح، ہاضم غذا، مقوی معدہ و جگر اور محلل ریاح ہے۔

جاوتری (Myristica Fragrans Houtt) مزاج گرم و خشک ہے۔

خواص: مقوی معدہ و کبد باہ ہے۔ منہ کو خوشبودار بناتی ہے

بادیان (Pimpinella anisum Linn) مزاج گرم و خشک ہے۔

خواص: مقوی معدہ و بیناتی، دافع درد ریاح، مسکن دردِ سر ہے۔ حیض و پیشاب کو جاری کرتا ہے۔

اجوائن (Trochyspermum) مزاج گرم و خشک۔

خواص: فالج، لقوہ، رعشہ اور استرخاء کے لیے مفید ہے۔ سدہ کھولتی ہے اور پیٹ میں تلین پیدا کرتی ہے۔ عسر البول اور پتھری کے لیے بھی مفید ہے۔ کیڑے خارج کرتی ہے۔

رائی (Borassica Cernua) مزاج گرم و خشک ہے۔

خواص: ہاضم غذا اور دافع کرم معدہ، مسکن درد، مقوی باہ اور فالج و استرخاء کے لیے مفید ہے۔

......

اندرجیت لال
نئی دہلی

ڈاکٹر سی۔ وی۔ رمن

ڈاکٹر سی۔ وی رامن کو ۳۰ء میں نوبل انعام ملا۔ ایک صبح اخبارات میں یہ خبر شائع ہوئی تو ملک بھر میں خوشی کی لہر دوڑ گئی۔ کچھ ایسی ہی حالت ہوئی جیسی کہ کرکٹ کا ورلڈ کپ جیتنے پر حال ہی میں ہوئی تھی۔

انگریزی دور میں یہ خیال عام تھا کہ عقل و فہم، علم و ہنر، تہذیب و شائستگی تو یورپ کے لوگوں پر ختم ہے۔ ہندوستانیوں میں ایسی خصوصیات کہاں؟ لیکن ڈاکٹر رامن کے طبیعات میں نوبل انعام حاصل کرنے پر غلامانہ احساس کمتری کا کچھ تدارک ہوا۔

غالباً ۳۳ء کا نومبر آخر کا یا ۳۴ء کا شروع کا مہینہ تھا۔ جب ایک روز یکایک معلوم ہوا کہ ڈاکٹر سی وی رامن علی گڑھ آرہے ہیں اور شام کو یونین ہال میں تقریر کریں گے۔ بنگلور کے سید عبدالرحمٰن یا مشرقی بنگال کے احمد علی یونین کے وائس پریزیڈنٹ تھے۔ اس زمانہ میں یونین کا وائس پریزیڈنٹ صدارت کرتا تھا۔ چنانچہ سید عبدالرحمن یا احمد علی نے جلسہ کی صدارت کی اور معزز مہمان کو خوش آمدید کہا۔ ڈاکٹر رامن اپنی کرسی سے اُٹھے تو طلبا نے تالیوں سے معزز مہمان کا خیر مقدم کیا۔ جہاں تک یاد ہے ڈاکٹر رامن کے سر پر پگڑی تھی۔ بند گلے کا سیاہ کوٹ اور سفید دھوتی میں وہ ملبوس تھے۔ وہ مسکراتے ہوئے اُٹھے اور نہایت شیریں، سلیس انگریزی میں طلبا کو خطاب کیا۔

خیال تھا کہ سائنس کے موضوع پر تقریر ہوگی۔ اس کو کوئی کیا سمجھے گا۔ لیکن ڈاکٹر سی۔ وی رامن نے ایسی زبان میں خطاب کیا کہ موضوع کا ہر پہلو واضح ہوگیا۔ اور یہ احساس ہی نہ ہوا کہ سائنس کے کسی موضوع پر تقریر ہو رہی ہے۔

ڈائس پر ایک بلیک بورڈ رکھ دیا گیا تھا۔ ڈاکٹر رامن اس پر موضوع کی وضاحت کے لیے کچھ خطوط کھینچتے تھے۔ آخر میں انھوں نے ایک خط کھینچا اور ڈرامائی انداز میں یہ کہتے ہوئے بیٹھ گئے

"And This brought noble Prize to India"

ڈاکٹر رامن نے تالیوں کی گونج میں تقریر ختم کی۔ علی گڑھ کی روایت کے تحت دیر تک تالیاں

بجتی رہیں۔ اس طرح پر مسلم یونیورسٹی کے طلبا نے مادر وطن کے سپوت کو خراج تحسین پیش کیا
قاضی معز الدین احمد۔

ڈاکٹر سی وی رمن نے ایک بار کہا تھا "ملک کو ترقی کی طرف لے جانے والے سائنس دان تحقیق و تجربات کا کام کرتے ہوئے تنہائی کے گوشے ہی میں ملیں گے اور یہی وہ لوگ ہیں جن پر انسانیت ہمیشہ ناز کرے گی" اس میں کوئی شک کی بات نہیں کہ خود رمن اپنے اس قول کے مطابق اپنا زیادہ تر وقت اپنی لیبارٹری "رمن ریسرچ انسٹی ٹیوٹ بنگلور" ہی میں صرف کیا کرتے تھے، اور عمر کے آخری دس سالوں میں تو تقریباً وہیں کے ہو کر رہ گئے تھے۔ وہ کہا کرتے تھے "میں تنہائی کے گوشوں میں سائنس داں کی طرح عمر بسر کرنے کے حق میں ہوں۔ میں کام کرنے کا شوقین ہوں۔ میرا بنیادی ذوق سائنس ہی میں ہے اور مجھے سائنسی کاموں ہی سے سکون و مسرت ملتی ہے۔"

چندر شیکھر وینکٹا رمن، نومبر ۱۸۸۸ء کو ترو چراپلی میں پیدا ہوئے۔ بچپن ہی سے بلا کے ذہین اور لکھنے پڑھنے کے شوقین تھے۔ ترو چراپلی میں تعلیم کا خاطر خواہ انتظام نہ تھا۔ اس لیے رمن کے والد چندر شیکھر کو گاؤں سے ترمنا پلی رہنے آنا پڑا۔ یہاں رمن نے بی اے پاس کیا۔ رمن کے والد ہونہار تھے کہ گھر پر سائنس اور ریاضی پڑھایا کرتے تھے اور اسکول کے پرنسپل خاص طور پر وقت نکال کر انہیں انگریزی پڑھایا کرتے تھے۔

سی وی رمن بی اے میں پڑھتے تھے تو ان کے استاد نے ایک دن بھری جماعت میں ان سے پوچھا۔ کیا آپ واقعی بی اے کے طالب علم ہیں۔ جواب ملا جی ہاں! "بھلا آپ کی عمر کتنی ہوگی؟" استاد نے دوسرا سوال کیا۔ "برابر کی جناب" رمن نے جواب دیا۔ استاد بڑا حیران ہوا اور جب اسے مزید معلوم ہوا کہ اتنی کم سنی میں رمن اپنی لکھائی پڑھائی کے ساتھ ایک تحقیقاتی مضمون لکھ رہے تھے جو بعد میں ایک بین الاقوامی جریدے "نیچر" میں شائع ہوا تو استاد تو کیا سارا کالج حیران رہ گیا اور رمن کی ذہانت کی دھاک بیٹھ گئی۔ ٹھیک اسی زمانے میں رمن نے سوچ بوجھ سے بھرا ایک مضمون لکھا جو لندن کے فلاسفیکل میگزین میں شائع ہوا۔ ایسے مضامین سے رمن کی عزت بچپن میں ہی بہت بڑھ گئی تھی اور وہ دو سال بعد انڈین انسٹی ٹیوشن آف سائنس کے سکریٹری چنے گئے۔ سی وی رمن ۱۹۱۷ء میں کلکتہ یونیورسٹی میں طبیعات کے پروفیسر مقرر ہو گئے۔ ۱۹۲۱ء میں آپ نے آکسفورڈ میں ایک کانفرنس میں شرکت کی۔ چار ماہ کیلی فورنیا میں پروفیسر رہے۔ رمن نے اپنی زندگی میں بڑے انعام و اکرام اور اعزاز حاصل کیے۔ برطانوی سرکار نے انھیں "سر" کے خطاب سے نوازا اور ۱۹۳۰ء میں آپ کو بین الاقوامی اعزاز نوبل ملا۔ رمن نے انڈین اکاڈمی آف سائنس بنگلور ریسرچ انسٹی ٹیوٹ میں قابل قدر کام کیا۔ انھیں "بھارت رتن" اور روس کے لینن انعام سے بھی نوازا گیا۔ لینن انعام کے اعلان پر رمن نے اپنے خیالات کا یوں اظہار کیا۔ "میں نے کوئی سائنسی تحقیق اپنی ذاتی ترقی، جنگ یا تخریب کے لیے نہیں کی بلکہ میری ہر دم یہ خواہش رہی ہے کہ سائنسی تحقیق دنیا کی ترقی اور امن کے لیے کی جائے۔"

ڈاکٹر سی وی رمن کی سائنسی تحقیق اور صلاحیت کا یہ عالم تھا کہ ان کی دھاک کی وجہ سے انھیں گلاسکو، فیبرگ، بمبئی، بنارس، مدراس اور ڈھاکہ یونیورسٹیوں نے اعزازی ڈگریاں عطا کیں۔ آپ عمر بھر کئی سائنسی انجمنوں کے ممبر رہے اور علم، تحقیق اور انکشافات کے دروازے کھولتے رہے۔

ڈاکٹر رمن وقت کی بڑی قدر کرتے تھے اور زندگی کا کوئی لمحہ ضائع نہیں کرتے تھے۔ وہ اکثر کہا کرتے تھے "زندگی بے حسی کا نام نہیں ہے۔ جب تک سانس ہے نہ تھک کر بیٹھ کے ساتھ کام کرتے رہنا چاہیے اور کوئی تھکن یا مایوسی نہیں پیدا ہو سکتی۔" مہاتما گاندھی ڈاکٹر رمن کی بڑی قدر کرتے تھے اور خاص طور پر رمن کی سادہ مزاجی اور سادہ طرز زندگی کے قدر دان تھے۔ سادہ مزاجی کو رمن آخری دنوں تک نبھاتے رہے بلکہ انھیں ہندوستانیت پر بھرپور ناز تھا اور وہ اس کا اقبال بھی کرتے تھے۔ طبیعات رمن کا خاص موضوع تھا اور اسی موضوع پر انھیں بین الاقوامی شہرت نصیب ہوئی۔ ایک بار مہاتما گاندھی نے ڈاکٹر رمن سے پوچھا "آپ کو طبیعات سے کیا ملا

ملا" طبیعات کی بدولت مجھے خدا کی ایک جھلک دیکھنے کا موقع ملا"
ر سائنس داں رمن کو "رمن ایفیکٹ Raman Effect
سے بین الاقوامی عزت اور شہرت ملی۔ رمن ایفیکٹ کے متعلق
س کی دنیا میں ایک کہانی مشہور ہے۔ کہتے ہیں۔ ایک بار ڈاکٹر
ہوائی جہاز میں بیٹھ کر غیر ملکوں کی سیاحت کر رہے تھے۔ اس
ان کا جہاز سمندر کے اوپر سے پرواز کر رہا تھا۔ رمن نے سمندر
کی سطح پر نگاہ دوڑائی تو انھوں نے محسوس کیا کہ سمندر کے
نگ کچھ مختلف سا نظر آ رہا ہے۔ وہ اس جواز پر غور و فکر کرتے
بعد میں "رمن ایفیکٹ" کے نام سے ایک سائنسی تحقیق بن کر
آئی اور جسے سائنس کی دنیا نے تحقیق کے طور پر قبول کیا۔
ڈاکٹر سی وی رمن ایک اچھے خاصے انشا پرداز تھے آپ
عمر میں بیسیوں تحقیقی مضامین قلم بلند کیے کہتے ہیں صرف
فیکٹ پر ہی تیرہ سو مضامین دوسرے سائنس دانوں نے
اکٹر رمن کو روشنی کے موضوع سے بڑی دلچسپی تھی اور
موضوع پر انھوں نے گرانقدر تحقیقی کام بھی کیا۔ جس کی
بین الاقوامی شہرت کے سائنس داں آئین سٹائن نے بھی
کٹر رمن کے ایک انشائیے کا نمونہ ملاحظہ کیجیے۔ موضوع
ہی۔ ایک آب حیات "۔ انسان نے مقدس امرت یعنی
ات کی تلاش میں کئی صدیاں گزار دیں لیکن زندگی کا
مرت ہمارے سامنے پڑا ہے۔ یہ سب سیال مادوں
سے زیادہ عام ہے اور اس کا نام ہے پانی۔ اسی پانی
ان حیوان اور نباتات کی زندگی جاری و ساری ہے۔ اس
ضرورت ہے کہ پانی کے خواص پر بھرپور تحقیق کی جائے
اس موضوع پر تحقیق کی بڑی گنجائش ہے۔
اکٹر رمن نے سائنس کے چند پہلوؤں عنوانات سے آل
ریو مدراس سے چند مختصر تقاریر کیں جو آج بھی سائنس
میں بڑا درجہ رکھتی ہیں۔ ایک نشریہ میں آپ فرماتے
سائنس کا عالم فطرت کا ایک طالب علم ہے اور فطرت
الہام حاصل کرتا ہے۔ سائنس داں اپنے آپ کو دوسرے
طرح سخت ضابطے کا پابند بنا ڈالتا ہے۔ اس کے قواعد وہ
تیار کرتا ہے اور اس کو وہ منطق کہتا ہے "۔ فطرت کی تعمیر
کے لیے انسان کے جمالی اور ذہنی عمل بروئے کار لائے جاتے
ہیں اور سائنس میں یہ دونوں قسم کے عمل کام کرتے ہیں۔ اس
اعتبار سے سائنس بھی تخلیق کی اعلیٰ ترین شکل ہے "۔

ڈاکٹر رمن کو فنون لطیفہ سنسکرت ادب اور موسیقی سے
بڑی دلچسپی تھی۔ وہ سائنسی کاموں میں بہت زیادہ مصروف
رہنے کی وجہ سے کہا کرتے تھے "میں طویل عمر کا خواہش مند
ہوں۔ اس لیے نہیں کہ کچھ زیادہ عیش و عشرت کر سکوں بلکہ
اس لیے کہ میں موسیقی کی ان جھنکاروں سے فیض یاب ہو سکوں
جن سے ہونا چاہتا ہوں "۔ پھر بھی فرصت کے اوقات میں آپ
وائلن اور مردنگ بجایا کرتے تھے۔

علم و تحقیق کی یہ لو ۲۱ نومبر ۱۹۷۵ء کو ہمیشہ کے لیے گل ہو گئی
لیکن ہندستانی سائنس دانوں کے لیے ڈاکٹر رمن ایک زندگی
تحقیق و کامیابی سے بھری ہوئی مثال چھوڑ گئے۔ سابق صدر
جمہوریہ ہند نے رمن کی موت پر بڑے قابل قدر الفاظ میں
یوں لکھا۔

"رمن ایک عظیم شخصیت کے مالک تھے۔ ان میں تحقیق
اور تجسس کی بڑی لگن تھی جو دوسرے سائنس دانوں کو
دعوت فکر دے سکتی ہے۔ ان کی موت سے ہندوستان
ہی کا نہیں، بلکہ دنیا سے ایک عظیم سائنس داں اٹھ گیا ہے "۔

ڈاکٹر رمن کے لیے کام زندگی تھا اور سائنس ان
کی نظر میں خدا کا درجہ رکھتی تھی۔ آخری دنوں میں جب وہ
بہت بیمار ہو کر کمزور ہو گئے تو ڈاکٹروں سے کہا کرتے تھے۔
"میں اس بیکار زندگی کا کیا کروں گا؟"۔ ان کا کتب خانہ
ان کے عزیزوں کے لیے ہمیشہ کھلا رہتا تھا۔ ان کے کتب خانے
میں ایسی کتابیں بھی تھیں جو انھوں نے بچپن میں پڑھی تھیں
رمن کے ایک عزیز کے مطابق ایسی ایک کتاب پر کئی صفحات
پر "کیوں کہ"، "کس طرح"، "کیا یہ صحیح ہے" کے نشانات ملتے
ہیں۔ جس سے ظاہر ہوتا ہے کہ وہ سائنس کی ہر بات
یا ہر کلیے کو من و عن تسلیم نہیں کرتے تھے۔

ڈاکٹر رمن کا خیال تھا کہ عظیم سائنس آسانی سے
وجود میں نہیں آ سکتی۔ اگر محض تقلید ہی کو ایمان بنا دیا

باقی صفحہ نمبر ٦ پر

خواجہ الطاف حسین حالی مرحوم

حیاتِ سر سیّد

اب تک ہم سید احمد خاں مرحوم کے مضامین تہذیب الاخلاق میں شائع کرتے رہے ہیں سید احمد خاں کا ہر مضمون اپنے دور کے سماجی مسائل اور ملک کی تاریخ پر روشنی ڈالتا تھا اور سبق آموز بھی ہوتا تھا۔
اب ہم سید احمد خاں کی سوانح حیات مرتبہ مولانا الطاف حسین حالی کے جس کا نام حیاتِ جاوید ہے' اقتباسات شائع کر رہے ہیں ۔ یہ سب اقتباسات مسلمانوں کی معاشرتی خصوصیات' اخلاق و عادات' رسم و رواج پر روشنی ڈالتے ہیں اور اس دور کی تہذیبی تاریخ ہیں ۔
ق م ا

سر سید لکھتے ہیں کہ "میرے نانا صبح کا کھانا اندر زنانے میں کھاتے تھے۔ ایک چوڑا چکلا دسترخوان بچھتا تھا بیٹے بیٹیاں' پوتے پوتیاں' نواسے نواسیاں اور بیٹوں کی بیویاں سب ان کے ساتھ کھانا کھاتے تھے ۔ بچوں کے آگے خالی رکابیاں ہوتی تھیں۔ نانا صاحب ہر ایک سے پوچھتے تھے کہ کون سی چیز کھاؤ گے؟ جو کچھ وہ بتاتا وہی چیز چمچے میں لے کر اپنے ہاتھ سے اس کی رکابی میں ڈال دیتے ۔ تمام بچے بہت ادب اور صفائی سے ان کے ساتھ کھانا کھاتے تھے۔ سب کو خیال رہتا کہ کوئی چیز گرنے نہ پائے، ہاتھ کھانے میں زیادہ نہ بھرے اور نوالہ چبانے کی آواز منہ سے نہ نکلے۔ رات کا کھانا وہ باہر دیوان خانے میں کھاتے تھے۔ زنانہ ہو جاتا تھا۔ میری والدہ اور چھوٹی خالہ کھانا کھلانے آتی تھیں۔ ہم سب لڑکے ان کے سامنے بیٹھتے تھے۔ ہم کو بڑی مشکل پڑتی تھی۔ کسی کے پاؤں کا دھبا سفید چاندنی پر لگ جاتا تھا تو نہایت ناراض ہوتے تھے۔ روشنائی وغیرہ کا دھبا کسی کے کپڑے پر ہوتا تھا' اس سے بھی ناخوش ہوتے تھے۔ شام کو چراغ جلنے کے بعد ان کے پوتے اور نواسے جو مکتب میں پڑھتے تھے اور جن میں سے ایک میں بھی تھا' ان کو سبق سنانے جاتے تھے۔ جس کا سبق اچھا یاد ہوتا تھا اس کو کسی قسم کی عمدہ مٹھائی ملتی اور جس کو یاد نہ ہوتا اس کو کچھ نہ دیتے اور گھرک دیتے۔

گرمی اور برسات کے موسم میں اب بھی دلی کے اکثر باشندے سہ پہر کو جمنا پار جا کر پانی کی سیر دیکھتے ہیں اور تیرنے والے تیرتے ہیں۔ مگر پچاس برس پہلے وہاں اشراف تیرنے والوں کے بہت دلچسپ جلسے ہوتے تھے۔ سر سید کہتے تھے کہ "میں نے اور بڑے بھائی نے اپنے والد سے تیرنا سیکھا تھا۔ ایک زمانہ تو وہ تھا کہ ایک طرف دلی کے مشہور

تیر اک مولوی علیم اللہ کا غول ہوتا تھا جن میں مرزا مغل اور مرزا فضل بہت سر برآوردہ اور نامی تھے اور دوسری طرف ہمارے والد کے ساتھ سو سوا سو شاگردوں کا گروہ ہوتا تھا۔ یہ سب ایک ساتھ دریا میں کودتے تھے اور مجنوں کے ٹیلے سے شیخ محمد کی باؤلی تک یہ سارا گروہ تیرتا جاتا تھا۔ پھر جب ہم دونوں بھائی تیرنا سیکھتے تھے اس زمانہ میں بھی تیس چالیس آدمی والد کے ساتھ ہوتے تھے۔ انھیں دنوں میں نواب اکبر خاں اور چند اور رئیس زادے بھی تیرنا سیکھتے تھے۔ زینۃ المساجد کے پاس نواب احمد بخش خاں کے باغ کے نیچے جمنا بہتی تھی، وہاں سے تیرنا شروع ہوتا تھا۔ مغرب کے وقت سب تیراک زینۃ المساجد میں جمع ہو جاتے تھے اور مغرب کی نماز جماعت سے پڑھ کر اپنے اپنے گھر چلے آتے تھے۔ میں ان جلسوں میں اکثر شریک ہوتا تھا۔

تیراندازی کی صحبتیں بھی سرسیّد کے ماموں نواب زین العابدین خاں کے مکان پر ہوتی تھیں اور وہ کہتے تھے کہ "مجھے اپنے ماموں اور والد کے شوق کا وہ زمانہ جب کہ نہایت دھوم دھام سے تیراندازی ہوتی تھی، یاد نہیں۔ مگر جب دوبارہ تیراندازی کا چرچا ہوا وہ بخوبی یاد ہے۔ اس زمانے میں دریا کا جانا موقوف ہو گیا تھا۔ ظہر کی نماز کے بعد تیراندازی شروع ہوتی تھی۔ نواب فتح اللہ بیگ خاں، نواب سیّد عظمت اللہ خاں، نواب ابراہیم علی خاں اور چند شاہزادے اور رئیس اور شوقین اس جلسہ میں شریک ہوتے تھے۔ نواب شمس الدین خاں رئیس فیروز پور جھرکہ جب دلّی میں ہوتے تھے تو وہ بھی آتے تھے۔ میں نے بھی اسی زمانے میں تیراندازی سیکھی تھی اور مجھ کو خاصی مشق ہو گئی تھی۔ مجھے خوب یاد ہے کہ ایک مرتبہ میرا نشانہ جو تودے میں نہایت صفائی اور خوبی سے جا کر بیٹھا تو والد بہت خوش ہوئے اور کہا مچھلی کے جائے کو کون تیرنا سکھلائے۔" یہ جلسہ برسوں تک رہا۔ پھر موقوف ہو گیا۔"

اہل اللہ اور مقدس لوگوں کی عظمت کا خیال بچپن سے سرسیّد کے دل میں بٹھایا گیا تھا۔ وہ اپنے والد کے ساتھ اکثر شاہ غلام علی صاحب کی خدمت میں جاتے تھے اور شاہ صاحب سے ان کی عقیدت کا رنگ اپنی آنکھ سے دیکھتے تھے۔ وہ کہتے تھے کہ مرزا صاحب کے عرس میں شاہ صاحب ایک روپیہ ان کے مزار پر چڑھایا کرتے تھے اور اس روپے کے لینے کا حق میرے والد کے سوا اور کسی کو نہ تھا۔ ایک دفعہ عرس کی تاریخ سے کچھ پہلے ایک مرید نے شاہ صاحب سے اجازت لے لی کہ اب کی بار نذر کا روپیہ مجھے عنایت ہو۔ میرے والد کو بھی خبر ہو گئی۔ جب شاہ صاحب نے روپیہ چڑھانے کا ارادہ کیا تو والد نے عرض کی کہ میرے اور میری اولاد کے جیتے جی آپ نذر کا روپیہ کسی اور کو لینے کی اجازت دیتے ہیں شاہ صاحب نے فرمایا نہیں نہیں۔ تمہارے سوا کوئی نہیں لے سکتا۔ میں اس وقت صغیر سن تھا۔ جب شاہ صاحب نے روپیہ چڑھایا، والد نے مجھ سے کہا جاؤ روپیہ اُٹھا لو۔ میں نے آگے بڑھ کر روپیہ اُٹھا لیا۔"

دلی سے سات کوس دور مغلپور ایک جاٹوں کا گانو ہے۔ وہاں سرسیّد کے والد کی کچھ ملک بطور معافی کے تھی۔ اگر کبھی فصل کے موقع پر ان کے والد مغلپور جاتے تو ان کو بھی اکثر ساتھ لے جاتے اور ایک ایک ہفتہ گانو میں رہتے۔ سرسیّد کہتے تھے کہ "اس عمر میں گانو میں جا کر رہنا جنگل میں پھرنا، عمدہ دودھ دہی اور تازہ تازہ گھی اور جاٹنیوں کے ہاتھ کی پکی ہوئی باجرے یا مکئی کی روٹیاں کھانا نہایت ہی مزہ دیتا تھا۔"

سرسید کے والد کو اکبر شاہ کے زمانے میں
ہر سال تاریخ جلوس کے جشن پر پانچ پارچہ اور تین
رقوم جواہر کا خلعت عطا ہوتا تھا۔ مگر اخیر میں جیسا کہ
اوپر ذکر کیا گیا انھوں نے دربار کا جانا کم کر دیا تھا
اور اپنا خلعت سرسید کو باوجودیکہ ان کی عمر کم تھی
دلوانا شروع کر دیا تھا۔

سرسید کہتے تھے کہ "ایک بار خلعت ملنے کی تاریخ
پر ایسا اتفاق ہوا کہ والد بہت سویرے اٹھ کر قلعہ
چلے گئے اور میں بہت دن چڑھے اٹھا۔ ہر چند بہت
جلد گھوڑے پر سوار ہو کر وہاں پہنچا مگر پھر بھی دیر
ہو گئی۔ جب لال پردہ کے قریب پہنچا تو قاعدے کے
موافق اوّل دربار میں جا کر آداب بجا لانے کا وقت
نہیں رہا تھا۔ داروغہ نے کہا کہ بس اب خلعت پہن
کر ایک ہی دفعہ دربار میں جانا۔ جب خلعت پہن کر
میں نے دربار میں جانا چاہا تو دربار برخاست ہو چکا
تھا۔ اور بادشاہ تخت پر سے اٹھ کر ہوادار پر سوار
ہو چکے تھے۔ بادشاہ نے مجھے دیکھ کر والد سے جو اس
وقت ہوادار کے پاس ہی تھے، پوچھا کہ "تمہارا بیٹا
ہے؟" انھوں نے کہا "حضور کا خانہ زاد" بادشاہ
چپکے ہو رہے۔ لوگوں نے جانا کہ بس اب محل میں چلے
جائیں گے۔ مگر جب تسبیح خانہ میں پہنچے تو وہاں
ٹھہر گئے۔ تسبیح خانہ میں بھی ایک چبوترا بنا ہوا تھا
جہاں کبھی کبھی دربار کیا کرتے تھے۔ اس چبوترے
پر بیٹھ گئے اور جواہر خانے کے داروغہ کو کشتی جواہر
حاضر کرنے کا حکم ہوا۔ میں بھی وہاں پہنچ گیا تھا۔
بادشاہ نے مجھے اپنے سامنے بلایا اور کمال عنایت
سے میرے دونوں ہاتھ پکڑ کر فرمایا کہ دیر کیوں کی؟
حاضرین نے کہا۔ عرض کرو کہ تقصیر ہوئی۔ مگر میں چپکا
کھڑا رہا۔ جب حضور نے دوبارہ پوچھا تو میں نے
عرض کیا کہ سو گیا تھا۔ بادشاہ مسکرائے اور
فرمایا بہت سویرے اٹھا کرو۔ اور ہاتھ چھوڑ دیے
لوگوں نے کہا آداب بجا لاؤ۔ میں آداب بجا لایا۔ بادشاہ نے
جواہرات کی معمولی رقمیں اپنے ہاتھ سے پہنائیں۔ میں نے
نذر دی اور بادشاہ اٹھ کر خاص ڈیوڑھی سے محل
میں چلے گئے۔ تمام درباری میرے والد کو بادشاہ کی
اس عنایت پر مبارک باد دینے لگے۔" سرسید کہتے تھے
کہ اس زمانہ میں میری عمر آٹھ نو برس کی ہوگی۔ تقریباً
ان ہی دنوں میں راجہ رام موہن رائے جو برھمو سماج
کے بانی تھے ان کو اکبر بادشاہ نے کلکتہ سے بلایا تھا
تاکہ پنشن بادشاہی میں اضافہ کیلیے ان کو لندن بھیجا جائے
چنانچہ وہ بادشاہ کی طرف سے لندن بھیجے گئے اور
۱۸۳۱ء میں وہاں پہنچے۔ سرسید نے لندن جانے
سے پہلے ان کو متعدد دفعہ دربار شاہی میں دیکھا تھا۔

سرسید کی تعلیم

سرسید کہتے تھے کہ "مجھ کو اپنی بسم اللہ کی
تقریب بخوبی یاد ہے سہ پہر کا وقت تھا اور آدمی کثرت
سے جمع تھے۔ خصوصاً حضرت شاہ غلام علی صاحب بھی تشریف
رکھتے تھے۔ مجھ کو لا کر حضرت صاحب کے سامنے بٹھا دیا گیا
تھا۔ میں اس مجمع کو دیکھ کر ہکا بکا سا ہو گیا۔ میرے سامنے
تختی رکھی گئی اور غالباً شاہ صاحب ہی نے فرمایا کہ پڑھو
بسم اللہ الرحمن الرحیم۔ مگر میں کچھ نہ بولا اور حضرت صاحب
کی طرف دیکھتا رہا۔ انھوں نے مجھ کو اٹھا کر اپنی گود
میں بٹھا لیا اور فرمایا کہ ہمارے پاس بیٹھ کر پڑھیں گے
اور بسم اللہ پڑھ کر اقراء کی اول آیتیں مالم یعلم تک پڑھیں
میں بھی ان کے ساتھ ساتھ پڑھتا گیا۔" سرسید نے جب یہ ذکر کیا
تو بطور فخر کے اپنا یہ فارسی شعر جو خاص اسی موقع کے لیے
انھوں نے کبھی کہا تھا، پڑھا

بمکتب رفتم و آموختم اسرار یزدانی
ز فیض نقش بند وقت و جان جان جانانی

سرسید کہتے تھے کہ شاہ صاحب اپنی خانقاہ سے
کبھی نہیں اٹھتے تھے اور کسی کے ہاں نہیں جاتے
تھے۔ الا ماشاء اللہ صرف میرے والد پر

جو غایت درجہ کی شفقت تھی، اس لیے کبھی کبھی ہمارے گھر قدم رنجہ فرماتے تھے۔

بسم اللہ ہونے کے بعد سرسید نے قرآن مجید پڑھنا شروع کیا۔ ان کی ننھیال میں قدیم سے کوئی نہ کوئی استانی نوکر رہتی تھی۔ سرسید نے استانی ہی سے، جو ایک اشراف گھر کی پردہ نشین بی بی تھیں، سارا قرآن ناظرہ پڑھا۔ وہ کہتے تھے کہ

"میرا قرآن ختم ہونے پر ہدیہ کی مجلس جو زنانہ میں ہوئی تھی وہ اس قدر دلچسپ اور عجیب تھی کہ پھر کسی ایسی مجلس میں وہ کیفیت میں نے نہیں دیکھی۔"

قرآن پڑھنے کے بعد وہ باہر مکتب میں پڑھنے لگے۔ مولوی حمید الدین ایک ذی علم اور اہل بزرگ آدمی ان کے نانا کے ہاں نوکر تھے، جنھوں نے ان کے ماموؤں کو پڑھایا تھا۔ ان سے معمولی کتابیں کریما، خالق باری، آمد نامہ وغیرہ پڑھیں۔ جب مولوی حمید الدین کا انتقال ہوگیا تو اور لوگ پڑھانے پر نوکر ہوتے رہے۔ انھوں نے فارسی میں گلستاں، بوستاں اور ایسی ہی ایک آدھ اور کتاب سے زیادہ نہیں پڑھا۔ پھر عربی پڑھنی شروع کی۔ عربی میں شرح ملا، شرح تہذیب، میبذی، مختصر معانی اور مطول ما انا قلت تک پڑھی۔ مگر طالب علموں کی طرح نہیں بلکہ نہایت بے پروائی اور کم توجہی کے ساتھ۔ اس کے بعد ان کو اپنے خاندانی علم یعنی ریاضی پڑھنے کا شوق ہوا جس میں ان کی ننھیال کے لوگ دلی میں اپنا مثل نہ رکھتے تھے۔ انھوں نے اپنے ماموں نواب زین العابدین خاں سے حساب کی معمولی درسی کتابیں، تحریر اقلیدس کے چند مقالے، ہیأت میں شرح چغمنی تک اور ایک آدھ رسالہ متوسطات کا (جو مجسطی سے پہلے پڑھائے جاتے ہیں) پڑھا۔ مگر تمام رسالے متوسطات کے نہیں پڑھے اور نہ مجسطی کے پڑھنے کی نوبت پہنچی۔ کیونکہ آلاتِ رصد کا زیادہ شوق ہوگیا تھا۔ چنانچہ آلات رصد برجیندی اور چند رسالے مثل اعمال کرہ، اعمال اصطرلاب، رسالہ صنعت اصطرلاب، ربع مجیب، ربع مقنطر، بلزدن، جریب الساعۃ، پرکار تقسیم، پرکار متناسبہ اپنے ماموں سے پڑھے۔ اسی زمانے میں طب پڑھنے کا شوق ہوگیا۔ حکیم غلام حیدر خاں سے جو ایک خاندانی حکیم تھے، طب کی ابتدائی کتابیں مثل قانونچہ اور موجز وغیرہ پڑھنے کے بعد معالجاتِ سدیدی، شرح اسباب اور نفیسی امراضِ عین تک پڑھی اور چند ماہ تک ان کے پاس مطب بھی کیا۔ پھر پڑھنا چھوڑ دیا۔

جب انھوں نے پڑھنا چھوڑا ہے، اس وقت ان کی عمر اٹھارہ انیس برس کی تھی۔ اس کے بعد بطور خود کتابوں کے مطالعہ کا شوق برابر رہا۔ اور دلی میں جو اہل علم اور فارسی دانی میں نام آور تھے، جیسے صہبائی، غالب اور آزردہ وغیرہ ان سے ملنے کا اور علمی مجلسوں میں بیٹھنے کا اکثر موقع ملتا رہا۔ ۱۸۴۶ء میں جب کہ وہ فتح پور سیکری سے بدل کر دلی کی منصفی پر آئے، اس وقت جیسا کہ آگے ذکر کیا جائے گا، انھوں نے کسی قدر تحصیل علم میں ترقی کی۔

ماخوذ از
حیات جاوید
تالیف
مولانا الطاف حسین حالیؔ

علی گڑھ مسلم یونیورسٹی۔ علی گڑھ

اشتہار نمبر ۱۱/ ۸۳-۸۲ ۱۹ء

مندرجہ ذیل اسامیوں کے لیے مقررہ فارموں پر درخواستیں مطلوب ہیں۔

۱۔ پروفیسر آف اکیولر پتھالوجی ۔ ڈپارٹمنٹ آف آفتھلمالوجی

شرح تنخواہ:۔ ۱۵۰۰-۶۰-۱۹۰۰-۱۰۰-۲۰۰۰-۱۲۵/۲-۲۵۰۰ روپیہ اور دیگر الاونس

استعداد

۱۔ لازمی (۱) ایم بی بی ایس یا میڈیکل کونسل آف انڈیا سے تسلیم شدہ کوئی مساوی استعداد
(۱۱) ایم ایس (آپتھلمالوجی)/ایم ڈی (آپتھلمالوجی)/ایم ڈی (پتھالوجی)/ایم ڈی (پتھالوجی اینڈ بیکٹریالوجی)۔ یا میڈیکل کونسل آف انڈیا سے منظور شدہ کوئی مساوی استعداد
بحیثیت ریڈر ان پتھالوجی / آپتھلمالوجی کسی میڈیکل کالج میں تدریس/ تحقیق کا چار سالہ تجربہ۔

۱۱۔ پسندیدہ (۱) ترجیحاً کسی آپتھلمک ڈپارٹمنٹ میں آپتھلمک پتھالوجی کا تجربہ
(۱۱) ہندوستانی اور غیر ملکی جرائد میں اس مخصوص تخصص میں تخلیقی تحقیقی کام

۲۔ ریڈر ان نیورو۔سائیکیٹری۔ ڈپارٹمنٹ آف میڈیسن

شرح تنخواہ:۔ ۱۲۰۰-۵۰-۱۳۰۰-۶۰-۱۹۰۰ روپیہ معہ دیگر الاؤنس

استعداد:۔

لازمی (۱) ایم بی بی ایس یا میڈیکل کونسل آف انڈیا سے تسلیم شدہ کوئی مساوی استعداد
(۱۱) ایم ڈی (سائیکیٹری)/ایم ڈی (سائیکالوجیکل میڈیسن)/ایم ڈی ان میڈیسن معہ سائیکالوجیکل میڈیسن میں ڈپلوما۔ یا میڈیکل کونسل آف انڈیا سے تسلیم شدہ کوئی مساوی استعداد

کسی میڈیکل کالج میں بحیثیت لکچر ر سائنچر / یا تدریس / تحقیق کا پانچ سالہ تجربہ

پسندیدہ:۔ ہندوستانی اور غیر ملکی جرائد میں اس تخصص میں تخلیقی تحقیقی کام

غیر معمولی استعداد و تجربہ کے حامل امیدواروں کو ابتداء ہی سے اعلیٰ تنخواہ سے شروعات کی جا سکتی ہے۔

جن امیدواروں کو انٹرویو کے لیے طلب کیا جائے گا، ان کو ریلوے کے سکنڈ کلاس کا یکطرفہ کرایہ ادا کیا جائے گا۔

مقررہ درخواست فارم اور ہدایات اسسٹنٹ رجسٹرار (سلیکشن کمیٹی) رجسٹرار آفس مسلم یونیورسٹی علی گڑھ سے پانچ روپیہ (۳ روپیہ بحیثیت ایپلانمنٹ فیس اور دو روپیہ بحیثیت درخواست فارم فیس) یکمشت نقد ادائیگی کے ذریعہ (جو مسلم یونیورسٹی کے کیش سیکشن میں جمع کی جائے) اور اگر پوسٹل آرڈر کے ذریعہ ادائیگی ہو تو پوسٹل آرڈر فائننس آفیسر مسلم یونیورسٹی کے نام واجب الادا ہو۔ ذاتی طور پر یا سمت ۱۰ × ۲۳ کے لفافہ بھیج کر حاصل کیے جا سکتے ہیں۔ لفافہ پر خود کا پتہ لکھا ہونا ضروری ہے۔

درخواست موصول ہونے کی آخری تاریخ ۲۵ / اگست ۱۹۸۳ء چار بجے شام تک ہے

نامکمل اور دیر سے موصول ہونے والی درخواستوں پر غور نہیں کیا جائے گا

نوٹ:۔ موزوں امیدواروں کو آئندہ کے لیے خالی ہونے والی ممکنہ اسامیوں پر تقرر کے لیے بنائے جانے والے پینل میں رکھا جا سکتا ہے۔

ضمیر احمد خاں

رجسٹرار

علی گڑھ مسلم یونیورسٹی علی گڑھ

اشتہار نمبر ۱۲/۸۴-۸۳

مندرجہ ذیل اسامیوں کے لیے مقررہ فارموں پر درخواستیں مطلوب ہیں۔ جو امیدوار ایک سے زائد جگہوں کے لیے امیدوار ہوں ان کے لیے الگ الگ فارموں پر درخواست دینا ضروری ہے

پروفیسرس

شرح تنخواہ:- ۱۵۰۰-۶۰-۱۸۰۰-۱۰۰-۲۰۰۰-۲/۲۵۰۰ روپیہ اور دیگر الاؤنس

۱۔ پروفیسر آف سوشیالوجی - ڈپارٹمنٹ آف سوشیالوجی

۲۔ پروفیسر آف لنگوئسٹکس - ڈپارٹمنٹ آف لنگوئسٹکس -

استعداد

(ا) کسی ہندوستانی یونیورسٹی سے فرسٹ کلاس یا ہائی سیکنڈ کلاس میں ماسٹر ڈگری یا اس کے مساوی کوئی غیر ملکی استعداد

(ب) ڈاکٹریٹ معیار کا تحقیقی کام یا اعلیٰ معیار کا مطبوعہ کام

(ج) پوسٹ گریجوئیٹ کلاسیز کی تدریس کا کم از کم دس سالہ تجربہ اور تحقیقی کام کی رہنمائی کا قدرے تجربہ

ریڈرس

شرح تنخواہ:- ۱۲۰۰-۵۰-۱۳۰۰-۶۰-۱۹۰۰ روپیہ اور دیگر الاؤنس

۳۔ ریڈر ان سائیکالوجی - ڈپارٹمنٹ آف سائیکالوجی -

۴۔ ریڈر ان زولوجی۔ ڈپارٹمنٹ آف زولوجی۔
۵۔ ریڈر ان جیالوجی (ہائیڈروجیالوجی) ڈپارٹمنٹ آف جیالوجی

استعداد:
لازمی (۱) (ا) کسی ہندوستانی یونیورسٹی سے فرسٹ کلاس یا ہائی سکنڈ کلاس میں ماسٹرس ڈگری یا اس کے مساوی کوئی غیر ملکی استعداد
(ب) ڈاکٹریٹ معیار کا تحقیقی کام یا اعلیٰ معیار کا مطبوعہ کام
(ج) پوسٹ گریجویٹ کلاسیز کی تدریس کا کم ازکم پانچ سالہ تجربہ اور تحقیقی کام کی رہنمائی کا فدوے تجربہ

(۲) پسندیدہ: نمبر ۵ کے تحت ریڈر ان جیالوجی (ہائڈروجیالوجی) کی اسامی کے لیے امیدوار کو زیر زمین آبی ذخیروں (گراؤنڈ واٹر) کی ارضی تحقیقات کے سلسلہ میں عملی تجربہ ہونا چاہیے۔

۔ ریڈر ان کاسٹیوم ڈیزائن اینڈ ڈریس میکنگ (ویمنس پالی ٹیکنک)
استعداد:۔ ٹکسٹائل اور ملبوسات میں کم ازکم سیکنڈ کلاس ماسٹرس ڈگری یا اس کے مساوی پروفیشنل ٹیچنگ کا پانچ سالہ تجربہ۔
— یا —
ہوم سائنس یا اس کے مساوی کسی مضمون میں کم ازکم سیکنڈ کلاس بیچلرس ڈگری اور سات سالہ تجربہ جس میں پروفیشنل ٹیلرنگ/کاسٹیوم ڈیزائننگ کا ۲ سالہ تجربہ بھی ہو۔
نوٹ:۔ خواتین امیدواروں کو ترجیح دی جائے گی اور ان کو تجربہ کی مدت میں ایک سال کی چھوٹ بھی دی جاسکتی ہے۔

لکچرر:۔
شرح تنخواہ:۔ ۷۰۰ - ۴۰ - ۱۱۰۰ - ۵۰ - ۱۶۰۰ روپیہ اور دیگر الاونس۔

۔ لکچرر ان باٹنی۔ ڈپارٹمنٹ آف باٹنی
استعداد:۔ (ا) ڈاکٹریٹ ڈگری یا اعلیٰ معیار کا تحقیقی کام
(ب) مسلسل اچھے تعلیمی ریکارڈ (سیون پوائنٹ اسکیل میں B) کے ساتھ متعلقہ مضمون میں فرسٹ یا ہائی سکنڈ کلاس میں ماسٹرس ڈگری۔ یا کسی غیر ملکی یونیورسٹی سے اس کے مساوی ڈگری۔

اگر سیلیکشن کمیٹی اس نتیجہ میں پہنچ جائے کہ کسی امیدوار کا تحقیقی کام بہت اعلیٰ پیمانہ کا ہے جیسا کہ اس کی تھیسس یا مطبوعہ کام سے ظاہر ہو تو اس صورت میں (ب) کے تحت مطلوبہ استعداد میں نرمی برتی جاسکتی ہے۔

مزید برآں اگر ڈاکٹریٹ یا اس کے متبادل تحقیقی کام کا حامل کوئی امیدوار میسر نہ آئے یا اس عہدے کے لیے موزوں قرار نہ پائے تو مسلسل اچھے تعلیمی ریکارڈ کا حامل ایسے امیدوار (ایم فل یا اس کے مساوی ڈگری یا بلند پایہ تحقیقی کام کو فوقیت دی جائے گی) کا تقرر کیا جاسکتا ہے جس کو ریسرچ

کا دو سالہ تجربہ ہو۔ یا اس کو کسی لیباریٹری / آرگنائزیشن میں تحقیقی کام کا علمی تجربہ حاصل ہو۔ اس صورت میں اس کے لیے ضروری ہوگا کہ وہ اپنی تقرری سے پانچ سال کی مدت کے اندر ڈاکٹریٹ کی ڈگری حاصل کرلے۔ یا اعلیٰ پایہ کے تحقیقی کام کا ثبوت پیش کرے۔ ورنہ اس کو اس وقت تک کوئی سالانہ انکریمنٹ نہیں ملے گا، جب تک وہ ان شرائط کو پورا نہ کرے

غیر معمولی استعداد اور تجربہ کے حامل امیدواروں کو ابتدا ہی سے اعلیٰ تنخواہ سے شروعات کی جا سکتی ہے۔ جن امیدواروں کو انٹرویو کے لیے طلب کیا جائے گا ان کو بطور T.A. ریلوے کے سکنڈ کلاس کا ایک طرفہ کرایہ ادا کیا جائے گا۔

درخواست فارم اور ہدایات پانچ روپیہ نقد (علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کے فائننس آفس کے کیش سیکشن میں جمع شدہ) یا اسی قیمت کے انڈین پوسٹل آرڈر جو مسلم یونیورسٹی کے فائننس آفیسر کے نام واجب الادا ہو دیگر اسسٹنٹ رجسٹرار (سلیکشن کمیٹی) سے ذاتی طور پر یا 23 x 10 cm. کا ایسا لفافہ جس پر خود کا پتہ تحریر ہو بھیج کر حاصل کی جا سکتی ہے

درخواست موصول ہونے کی آخری تاریخ بیس اگست ۱۹۸۳ء ہے ۴ بجے شام تک ہے۔

نامکمل اور تاخیر سے موصول ہونے والی درخواستیں قابل قبول نہ ہوں گی۔

نوٹ:۔ موزوں امیدواروں کو مستقبل میں ہونے والی ممکنہ جگہوں پر غور کرنے کے لیے بنائے گئے پینل میں رکھا جا سکتا ہے۔

ضمیر احمد خاں
رجسٹرار

پرنٹر پبلشر قاضی معزالدین احمد۔ مقام اشاعت، صفدر منزل تار بنگلہ اے ایم یو علی گڑھ۔ مطبع۔ لیتھو کلر پریس
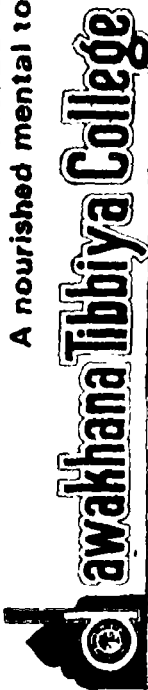
شمارہ نمبر ۱۶ ۱۶ر اگست ۱۹۸۳ء جلد نمبر ۲

اے ہندو اور مسلمانو! کیا تم ہندوستان کے سوا اور ملک کے رہنے والے ہو۔ کیا اِس زمین پر تم دونوں نہیں بستے؟ کیا اِسی زمین میں تم دفن نہیں ہوتے ہو یا اسی زمین کے گھاٹ پر جلائے نہیں جاتے: اسی پر مرتے ہو اور اسی پر جیتے ہو تو یاد رکھو کہ ہندو اور مسلمان ایک مذہبی لفظ ہے۔ ورنہ ہندو، مسلمان اور عیسائی جو اسی ملک میں رہتے ہیں، اس اعتبار سے سب ایک ہی قوم ہیں۔"

(سر) سید احمد
گورداسپور۔ ۲۷ر جنوری ۱۸۸۴ء

قیمت فی پرچہ ایک روپیہ ششماہی ۱۱ روپے سالانا بیس روپے

بیرون ہند سے

فی پرچہ ایک ڈالر سالانہ ۱۵ ڈالر

چیک اور ڈرافٹ پر صرف حسب ذیل نام لکھیں

K. M. Ahmad

رسالہ تہذیب الاخلاق یا کوئی اور نام نہ لکھیں

خط و کتابت کا پتہ

قاضی سعد الدین احمد۔ تار بنگلہ اے ایم یو۔ علی گڑھ۔ یو۔ پی (انڈیا)

پندرہ روزہ

تہذیب الاخلاق علی گڑھ

مدیر: سید حامد وائس چانسلر
علی گڑھ مسلم یونیورسٹی

مدیر مسئول: قاضی معز الدین احمد

جلد ۲ - ۱۶ر اگست ۱۹۸۳ء شمارہ ۱۶،۱۷

قارئین کرام

"تہذیب الاخلاق" کے احیا کو اب انیس مہینے ہونے کو آئے۔ یہ بات اطمینان بخش ہے کہ یہ رسالہ جس اصلاحی مقصد کو لے کر چلا تھا اس سے سرمو منحرف نہیں ہوا۔ اس نے عارضی لذت کو دائمی فلاح پر کبھی ترجیح نہیں دی۔ اس نے سنجیدہ اور فکر انگیز مضامین سے ہرگز گریز نہیں کیا۔

اگر آپ اس رسالہ کے بنیادی مقصد سے اتفاق رکھتے ہیں تو از راہ کرم اس کو خود بھی خریدتے رہیئے اور اپنے حلقے میں بھی اس کے لیے خریدار پیدا کیجیے۔ آپ کی شرکت سے ہماری ہمت اور رسالہ کی افادیت بڑھے گی۔

خیر اندیش
سید حامد

جس مقصد سے سرسید نے تہذیب الاخلاق جاری کیا تھا اور اب جاری ہوا ہے، وہ اس وقت پورا ہوگا جب اس کی اشاعت ہزاروں تک پہونچے گی۔ آپ سے درخواست ہے کہ رسالہ کی اشاعت ہندوستان اور بیرون ہندوستان میں بڑھانے میں ہمارا ہاتھ بٹائیے۔

اس کی اشاعت پر کافی روپیہ صرف ہوتا ہے۔ اخراجات پورے کرنے کے لیے ہمیں اشتہارات سے آمدنی کی ضرورت ہوتی ہے۔ ملک کے تاجروں سے درخواست ہے کہ وہ تہذیب الاخلاق میں اشتہار دے کر اپنی تجارت کو فروغ دیں اور رسالہ کے مقاصد کی اشاعت میں معاون ہوں۔

۲۱۶۸۳

راسف

سید حامد

بہیمیت یا تہذیب

۱۵ر جولائی ۸۳ء کے "انڈین ایکسپریس" میں " عورتوں کو ستانا — دہلی کے مردوں کا کھیل" کے عنوان سے ایک مضمون چھپا ہے۔ اس کا ترجمہ اور اقتباس ہم ذیل میں درج کر رہے ہیں۔

" خواتین کو جنسی انداز سے ستانا دلّی کے مردوں کا معروف اور محبوب مشغلہ بن گیا ہے۔ " حوا سے چھیڑ چھاڑ" EVE TEASING کی اصطلاح گویا اس رسم کو بہ طیب خاطر تسلیم کرتی ہے۔ اس اصطلاح کا مفہوم تو عام طور پر یہ لیا جاتا ہے کہ عورتوں کو دیکھ کر ہوسناک سیٹیاں بجائی جائیں اور آوازے کسے جائیں۔ لیکن راجدھانی کی عورتوں پر جو بیتا پڑتی ہے اس میں تذلیل بھی ہوتی ہے اور مردوں کا ان پر ظلم کر کے حظ اندوز ہونے کا پہلو بھی۔

" اندر پرستھ کالج کے سامنے چند لڑکیاں کھڑی ہوتی ہیں۔ موٹر سائیکل پر سوار دو نوجوان ان کے پاس آتے ہیں۔ انھیں بے باکی اور ہوس کے ساتھ گھورتے ہیں ان پر دست درازی کی کوشش کرتے ہیں۔ لڑکیاں اعتراض کرتی ہیں تو ان میں سے ایک لڑکا ایک لڑکی کے تھپڑ رسید کرتا ہے اور اس کا ہاتھ پکڑ کے موٹر سائیکل چلا دیتا ہے اور کئی گز تک چیختی چلاتی ہوئی لڑکی کو گھسیٹتا لے جاتا ہے۔"

" رام کرشنا پورم کی سرکاری کالونی میں دو لڑکیاں سڑک پر جا رہی ہیں۔ ایک نوجوان سائیکل پر آ رہا ہے۔ جب وہ ان کے برابر سے نکلتا ہے تو ان میں سے ایک لڑکی کی گردن پر تھوک دیتا ہے۔ بیچاری چلاتی ہے تو ہنس کر اس کے زخم پر نمک چھڑکتا ہوا نکل جاتا ہے۔"

بسوں میں، سینماؤں میں کالجوں میں بازاروں میں غرضکہ ہر جگہ عورتوں کو ستا کر لذت اندوز ہونے کا سین دیکھنے میں آتا ہے۔ عورتوں کو چھیڑنے والوں میں سے بعض ہوا میں پیار کا اشارہ کر کے یا بیہودہ فقرے کس کے مطمئن ہو جاتے ہیں۔ یہ عادت اتنی عام ہو گئی ہے کہ عورتیں اب اسے سڑک کے دوسرے خطرات کی طرح جیسے تیز رفتار سواریاں اور گڈھے بغیر احتجاج کے قبول کرنے لگی ہیں لیکن ان بدمعاشوں میں سے بعض کے حوصلے زیادہ بڑھے ہوئے ہیں۔ وہ لڑکیوں کو نوچتے ہیں۔ پیروں سے ان کے پیر دباتے ہیں، ان پر دست درازی کرتے ہیں۔ اپنے بدن کو ان کے جسم سے رگڑتے ہیں۔"

" یہ غنڈہ پن ہولی کے زمانہ میں اپنے شباب کو پہنچ جاتا ہے۔ عورتیں اب ہولی کے تصور سے کانپنے لگی ہیں۔ ایک ہفتہ پہلے نوجوانوں کی ٹولیاں سڑکوں پر شکار کی تلاش میں گھومتی ہیں اور عورتوں پر رنگ سے اور بنا رنگ کے یورش کرتی ہیں۔ ۱۹۸۱ء میں ہولی کے زمانہ میں دو سو نوجوانوں نے جو چھڑیوں اور لوہے کی سلاخوں سے لیس تھے، ہندو کالج اور سینٹ اسٹیفن کالج کے احاطوں پر چھاپہ مارا، لڑکیوں کو کلاس روم

سے کھینچ کر باہر نکالا اور ان کے ساتھ جی بھر کے دست درازی کی اور ارباب اختیار دیکھتے رہ گئے۔ بعض لڑکیوں کی تو ایسی گت بنی کہ انھیں گھر لوٹنے سے پہلے کپڑے بدلنا پڑے۔ سب سے افسوس ناک پہلو اس داستان کا یہ ہے کہ انتظامیہ اور طلبہ نے طالبات کو بچانے کی کوئی کوشش نہیں کی۔ طالب علموں نے تو خود کو غنڈوں کے خوف سے کمروں میں مقفل کر لیا اور پرنسپل اور اساتذہ کھڑکیوں سے ٹکٹکی دیکھتے رہے۔

بے حسی اور بزدلی کے اس قسم کے مظاہرے شہر شہر میں ہوتے رہتے ہیں۔ شاذ ہی ایسا ہوتا ہے کہ کوئی شخص عورتوں کی مدد کو آگے بڑھے۔ تختۂ مشق بنی ہوئی عورت جب مدد کے لیے چلاتی ہے تو بھی کسی کے کان پر جوں نہیں رینگتی۔

"چند ماہ ہوئے کالج کی ایک لڑکی کے ساتھ ۱۰ جوانوں نے ایک ہی بس میں چھیڑ خانی کی۔ ان میں سے ہر ایک باری باری لڑکی کے پاس گیا، اس کو پیار کیا اور بس سے اتر گیا اور مسافر دیکھتے رہے"۔

• ایک اور لڑکی کے ساتھ بس میں ایک نوجوان نے دراز دستی دکھائی۔ وہ چلائی تو نوجوان نے اسے تھپڑ مارا، دھینگا مشتی میں وہ بس سے گر گئی۔ کسی نے نوجوان کو روکنے یا پکڑنے کی کوشش نہیں کی۔ عام طور پر ڈرائیور اور کنڈکٹر بھی مزاحم نہیں ہوتے۔ بلکہ کبھی کبھی وہ دست درازی کے خود مرتکب ہو جاتے ہیں۔

۱۹۸۲ء میں پولیس نے عورتوں کے ساتھ چھیڑ خانی کے الزام میں ۲۶۲۶ گرفتاریاں کیں"۔

پولیس نے بہت سے اقدامات اس بری عادت کو روکنے کے لیے کیے ہیں۔ لیکن بات ابھی تک بنی نہیں۔ لڑکیوں کا کہنا ہے کہ پولیس کے جو خصوصی اسکواڈ کالجوں کے سامنے تعینات کیے گئے ہیں ان کا وقت اکثر گپ مارنے اور لڑکیوں کو گھورنے میں صرف ہوتا ہے۔"

"عورتوں کی تنظیموں نے بھی اس آوارگی کی طرف دھیان نہیں دیا۔ وہ کہتی ہیں کہ ان کے پاس افراد، وسائل اور وقت کی کمی ہے۔ اس لیے وہ جہیز سے متعلق مظالم اور مجرمانہ حملوں کے دفعیہ سے آگے نہیں بڑھ سکتیں"۔

"اس موضوع سے متعلق سیمناروں میں یہ تجویز بھی رکھی گئی کہ عورتیں آل پنیں اور پسی ہوئی مرچ (آلات دفاع کے طور پر) اپنے ساتھ رکھا کریں۔ لیکن یہ کوئی حل نہیں ہے۔ لفنگے شکار کھیلنے ٹولیوں میں نکلتے ہیں اور اگر اکیلے بھی ہوں تو ان کی طاقت کا پلہ عورتوں کے مقابلہ میں بھاری رہتا ہے۔ بلکہ جو عورت مقابلہ کرتی ہے اس کو اور زیادہ ذلت کا منہ دیکھنا پڑتا ہے"۔

اقتباس یہاں ختم ہوتا ہے۔ آج دلی کا نقشہ کھینچا گیا، کل مدراس کی باری ہے۔ اسی طرح سارے بڑے شہروں میں عورتوں پر مردوں کی شرمناک دست درازی کے حالات انڈین ایکسپریس میں چھاپے جائیں گے گویا یہ گھناؤنی بیماری ملک گیر ہے۔ کیا یہی وہ قدیم تہذیب اور روایتی شائستگی اور پاک دامنی ہے جس پر ہمیں فخر ہے۔ کیا ہماری بعض خواتین کا یہی مقدر ہے کہ شادی سے پہلے سر بازار لفنگے ان پر زبان درازیاں اور دست درازی کریں اور شادی کے بعد سسرال والے اور بے غیرت شوہر مال و زر کے مطالبات سے ان غریبوں پر عرصۂ حیات تنگ کر دیں اور ان میں سے بہت سی سسرال والوں کی ایذا رسانی سے تنگ آکر خود کو جیتے جاگتے آگ کے حوالے کر دیں اور جو خود نہ جلیں ان کو سسرال والے جلا ڈالیں۔

اللہ تعالیٰ نے انسان کو اشرف المخلوقات بنایا۔ ان کی سرشت میں اچھائیاں ہی اچھائیاں بھر دیں اور جب انسان کو گرایا تو تحت الثریٰ میں پہونچا دیا۔ یہ انسان نہیں جانور ہیں جو عورتوں کو ہوس اور بدزبانی اور دراز دستی، اور طمع اور ظلم کا تختۂ مشق

بناتے ہیں بلکہ یہ جانوروں سے بدتر ہیں۔ ان میں نہ شرم ہے نہ حیا، نہ محبت ہے نہ وفا۔ انسانیت انھیں چھو کر نہیں گئی۔ انھیں اندازہ نہیں کہ تہذیب اور انسانیت دونوں کا تقاضہ ہے کہ صنفِ نازک کی عزت کی جائے

ہم یہاں تک پہنچے تھے کہ ۱۶ر جولائی کے شمارہ پر نظر پڑی۔ آج ذکر مدراس کا ہے۔ وہاں بھی زن آزاری زندگی کا جزو بن گئی ہے۔ اگرچہ دلی کا مدراس مقابلہ نہیں کر سکتا۔ یہ بات پھر دہرائی جا سکتی ہے کہ فی زمانہ جنوب شمال سے اطوار و اخلاق اور نظم و ضبط کے لحاظ سے کہیں بہتر ہے۔ چلتے چلتے ایک بات اور کہہ دی جائے دنیا کو امریکہ نے بہت کچھ دیا۔ اہلِ امریکہ میں بہت سی خوبیاں ہیں۔ ولولہ ہے، جستجو ہے، علم کی طلب ہے ٹیکنولوجی پر گرفت ہے، جمہوری طرزِ فکر ہے۔ اپنے قدرتی اور افرادی وسائل کے بل بوتوں پر امریکہ نے تسخیر کائنات میں کارہائے نمایاں انجام دیے ہیں۔ اس نے آدمی کو چاند پر اتار دیا اور چاند سے بہت دور ان جہانوں تک اپنے بے جان لیکن زود نویس، عکس کار اور خبر رساں قاصد بھیج دیے جو ستاروں سے کہیں آگے ہیں۔ تجربہ، تجزیہ، تنظیم نے اسے سائنس ٹکنولوجی اور صنعت و تجارت اور بندوبست (منیجمنٹ) کا قافلہ سالار بنا دیا۔ طالع آزمائی اور مہم جوئی میں بھی اس نے باقی دنیا کو بہت پیچھے چھوڑ دیا۔ فلموں کی اقلیم میں بھی اس کا سکہ چلنے لگا۔ لیکن امریکہ نے نو دولتوں کی طرح روایات، اقدار اور آداب کے بندھنوں سے بھی خود کو آزاد کرا لیا۔ انجام ظاہر ہے۔ آوارگی، اوباشی، زر پسندی، مشین پرستی، اخلاق باختگی، اقدار سوزی۔ اچھا ہوتا اگر بات یہیں تک رہتی اور ہم یہ کہہ کر خاموش ہو جاتے کہ نئی دنیا کو اس کا طرزِ زندگی مبارک۔ لیکن ٹکنولوجی کے انقلاب نے عالم کی طنابیں کھینچ کر رکھ دیں اور نئی دنیا اور پرانی دنیا میں وقت اور دسترس کو دیکھتے ہوئے اتنا فاصلہ بھی نہیں رہا، جتنا پہلے ایک ریاست کے دو شہروں کے درمیان ہوتا تھا۔ امریکہ کی خوشحالی، اقبال مندی اور کارواں سالاری سے مرعوب ہو کر ساری دنیا اخلاق و اطوار، وضع و لباس طرزِ ادا، لب و لہجہ غرضیکہ سارے اسالیبِ زندگی میں اس توازن گم کردہ خطۂ زمین کی پیروی کرنے لگی۔ نظام جسمانی میں فساد ہو تو جلد پر پھوڑے، پھنسی، خارش اور ناسور کی شکل میں چھلک آتا ہے۔ ہپیوں پر نظر ڈالیے جو اپنے پھیپھڑوں اور تہذیب کی قدروں کو پھونکتے ہوئے ایک عرصہ تک چار دانگ عالم میں گھومتے رہے۔ ان مخصوص کلیساؤں کو دیکھیے جہاں ہمجنسوں کی شادی کا سوانگ رچایا جاتا ہے۔ "واٹر گیٹ" اور "لاک ہیڈ" کی داستانیں دہرا یے جو نئی دنیا کی سیاست اور تجارت کی بے ضمیری کا اعلان کر رہی ہیں۔ جرائم کے اعداد و شمار پر نگاہ دوڑائیے جن میں ۱۷ سال سے کم عمر والے شریک غالب ہیں۔ اسکولوں کی خورد سال طالبات میں بن بیاہی ماؤں کی تعداد پر غور کیجیے۔ امریکہ کے جسم پر یہ سارے پھوڑے پھنسیاں اور اس کے روئے زیبا پر یہ بدنما مہاسے صحتمند نگاہوں کو کراہت آمیز پسپائی پر مجبور کرتے ہیں اور خود امریکن انھیں ہنوز اپنے رخ روشن پر خال اور قد آور فربہی مایل جسم پر جوانی کے نقوش سمجھ کر نظر انداز کرتے ہیں۔ لیکن ستم یہ ہے کہ نئی دنیا جو کچھ آج کرتی ہے، پرانی دنیا اسے کل اختیار کر لیتی ہے مشرقی دنیا نے بہ استثنائے مشرقِ بعید نئی دنیا کا حوصلہ، ولولہ، محنت اور جستجو اور تجزیاتی اسالیب تو اختیار نہیں کیے لیکن بے راہ روی، بے ضمیری، بیجا ص، اطوار، اقدار سوزی، روایات کشی، مشین پرستی اور چمک دمک اور پرستشِ زر کو بلا تکلف اپنا لیا۔ انسانیت اور راست روی اور اخلاق و کردار کو روئے زمین پر امریکہ کے اثرات نے بُری طرح مسمار کیا ہے۔

خود ہمارے ملک میں اس کی مثال موجود ہے پنجاب کا صوبہ زندہ دلی، محنت، آگے بڑھنے کی لگن،

سنگلاخ زمینوں کو گلزار بنانے، پہاڑ کاٹ کر جوئے شیر لانے، ساری دنیا کو زیرِ قدم سمجھنے، زراعت اور صنعت کو اپنے نقطۂ عروج پر پہونچانے، مہم جوئی، طالع آزمائی کے لحاظ سے ہندوستان کی ریاستوں میں سرِ فہرست ہے۔ لیکن امریکہ کی طرح اس نے بھی سخت کوشی اور جانفشانی کے ساتھ ساتھ عیش کوشی اور کامرانی کو بھی شعار بنا لیا۔ اس نے اپنے راستے میں کوئی رکاوٹ قبول نہیں کی خواہ وہ سفر کی دشوریاں ہوں یا راہبروں کی مخالفت یا اقدار اور اصول۔ اس نے شمالی ہندوستان کی تہذیبی روایات کو چشم زدن میں پامال کر دیا۔ جہاں جہاں پنجابی گئے انھوں نے ریاضت اور حوصلہ مندی، بے اصولی زرپرستی اور بے عنوانی کی مثالیں قائم کر دیں۔ دلی جوان کے زیرِ اثر ہے اس نے اپنے اطوار اور اپنا زاویۂ نگاہ اہلِ پنجاب کی روش پر ڈھالا ہے۔ تفصیل میں جانے کا وقت نہیں، صنفِ نازک کے ساتھ جو برتاؤ ملک کی راجدھانی میں کیا جاتا ہے ایسا لگتا ہے کہ وہ اہلِ پنجاب کے اثرات کا رہینِ منت ہے۔ کیا عجب کہ دلہنوں سے جو مطالبات کیے جاتے ہیں اور جس کا انجام اکثر چتا پر ہوتا ہے وہ بھی اس زرپرستی، ہوس اور طمع کا نتیجہ ہوں جسے اہلِ پنجاب کی اقبال مندی اور خوش حالی نے سکۂ رائج الوقت بنا دیا ہے۔ ہمیں ایسا محسوس ہوتا ہے کہ دنیا کے ساتھ جو کچھ امریکہ نے کیا، ہندوستان کے ساتھ وہی پنجاب کر رہا ہے۔

اب ہم اپنے موضوع کی طرف لوٹتے ہیں زن آزادی کے اعداد و شمار میں سال بہ سال اضافہ کی مدراس پولیس کے ترجمان نے یہ توجیہ کی ہے کہ پولیس کے تعینات کیے جانے کے بعد وہ عورتیں جنھیں چھیڑا جاتا ہے، ہمت کر کے آگے آنے اور رپورٹ درج کرانے لگی ہیں۔ واللہ اعلم۔ گزشتہ ماہ کچھ نوجوانوں نے جن کے خلاف عورتوں کو چھیڑنے کی رپورٹ کی گئی تھی رپورٹ کرنے والے کے مکان پر دھاوا بولا اور اسے وہاں نہ پا کر اس کے لڑکے کو مار ڈالا۔

عام طور پر مردوں نے جن میں پولیس اور پولیس کی باوردی خواتین شامل ہیں اس رائے کا اظہار کیا کہ چھیڑخانی کے بہت سے واقعات کی ذمہ دار ایک حد تک خود عورتیں، بالخصوص کالج کی لڑکیاں ہیں۔

ایک پولیس آفیسر نے کہا کہ گزشتہ ماہ انھوں نے شکایت موصول ہونے پر ۱۵ نوجوانوں کو حراست میں لیا تھا۔ انھوں نے اپنی صفائی میں کہا کہ لڑکیوں نے اپنے ہوس انگیز لباس اور اداؤں سے ان کی ہمت افزائی کی تھی۔

ریڈی میڈ کپڑوں کی فیکٹریوں میں سپروائزر کام کرنے والی عورتوں کے خلاف گندی زبان استعمال کرتے رہتے ہیں۔ حالاں کہ ان کی مجال نہیں کہ مردوں کو اس طرح خطاب کریں۔

گندی بستیوں میں رہنے والی نیچے طبقہ کی عورتوں کو مقامی غنڈے اکثر ستاتے رہتے ہیں۔ ان کو اندھیری سڑکوں اور غریبوں کے گھر میں فراغت کا انتظام نہ ہونے سے خبثِ نفس کا اظہار کرنے میں مدد ملتی ہے۔

تعلیمی اداروں میں بعض اوقات استانیوں کے ساتھ خانگی نوکروں کا سا برتاؤ کیا جاتا ہے۔ لیڈی ڈاکٹروں کو سینئر ڈاکٹر چھیڑتے اور ستاتے ہیں۔

دیہاتی طبقہ میں عورتوں کو بعض اوقات دیوروں کی طرف سے چھیڑ چھاڑ اور جنسی آزار کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔

یہ تھا مدراس کی روداد کا خلاصہ جو انڈین اکسپریس میں شائع ہوئی۔ عورتوں کے خلاف بے عنوانی، بدتمیزی اور ظلم کی رفتار تیزی سے بڑھ رہی ہے۔ دوسرے امور کے علاوہ ان ہوسناک دراز دستیوں کی ایک وجہ مردوں اور عورتوں کا آزادانہ ملنا

ہے ۔ عورتیں گھر کی چار دیواری میں رہیں، گھر چلائیں
بچوں کی پرورش کریں یا باہر نکل کر مردوں کے
دوش بدوش کام کریں؟ اس سوال کا جواب
موجودہ زمانہ نے اپنے حالات اور شعور کے مطابق
دے دیا ہے۔ کیا یہ جواب اطمینان بخش ہے!
کیا عورتیں جب گھر سے نکل کر دفاتر وغیرہ میں کام
کرتی ہیں تو ان کے بچے غفلت اور بے تربیتی کا شکار
نہیں ہو جاتے۔ کیا نئی نسل میں ٹھہراؤ، ثبات، سکون
اور خوشی کی جو کمی ہے وہ بچپن میں ماں کی نگرانی اور
شفقت سے محروم رہ جانے کی وجہ سے تو نہیں۔
طفولیت کا ڈر اور بے اطمینانی، جوانی میں بے حسی،
بے دردی، بے مہاری کی شکل تو اختیار نہیں
کر لیتی؟

مغربی ممالک اور مشرقی ممالک کے حالات الگ،
ان کے مزاج مختلف؛ یہاں آبادی کی اتنی کثرت کہ
بے روزگاری، کم روزگاری اور غریبی ترقی اور
خوشی میں سدِ راہ ہیں۔ مغرب میں آبادی کی اتنی
قلت کہ صنعت اور تجارت اور خدمت کی اقالیم
میں مشینوں سے زیادہ سے زیادہ کام لیا جا رہا
ہے اور موٹے موٹے زیادہ محنت کے کاموں
کے لیے مزدور غریب ممالک سے درآمد کیے جاتے
ہیں۔ ان کی معاشیات کا انحصار مشینوں اور
سرمایہ پر، یہاں کی معاشیات کا انحصار افرادی
طاقت پر۔ مشرقی ممالک نے آزادی کے بعد
منصوبہ بند ترقی کا آغاز کیا تو اس فرق کو بھول
گئے۔ انھوں نے بڑی بڑی مشینیں درآمد کر لیں
چنانچہ بڑی صنعتوں میں اضافہ کے ساتھ روزگار
کے مواقع گھٹتے چلے گئے۔

اسی قسم کی غلطی ان ممالک نے مغرب
کی وضع پر عورتوں کو ملازمتوں اور ان کاموں
میں ڈال کر کی جو مرد ابھی تک کر رہے تھے۔ جہاں
لاکھوں مرد بے روزگار اور کروروں ہتک روزگار
تھے وہاں عورتوں کی مداخلت نے بے روزگاری
اور روزگاری کی شدت اور بڑھا دی۔ لیکن اس
مسئلہ پر اتنی آسانی سے محاکمہ نہیں کیا جا سکتا
اگر ملازمت نہ کریں تو وہ عورتیں کیا کریں جن
کی شادی نہ ہوئی ہو۔ لیکن زمانہ کی رفتار کے
مطابق دولت کی طرح روزگار بھی ان ہزارہا
خاندانوں نے سمیٹ لیا ہے جن میں میاں بیوی
دونوں کام کرتے ہیں اور لاکھوں گھرانے ایسے
ہیں جہاں نہ میاں کے پاس کوئی معقول دھندا
ہے نہ بیوی کے پاس۔

(باقی آئندہ)

سید حامد

[۱۶ر جولائی ۱۹۸۳ء]

بقیہ مضمون "ابتدائی طبی امداد"
متعلقہ صفحہ نمبر ۱۷

سے زیادہ اور جلد جلد پانی پلایے۔ اگر یہ پتہ چل
جائے کہ کون سا زہر استعمال ہوا ہے؛ مثلاً جراثیم
کش دوا یا امونیا وغیرہ تو اس کی بوتل پر اس کا
اثر دور کرنے والی اشیاء کی تفصیل درج ہوتی ہے
اسے پڑھیے اور اس کے مطابق عمل کیجیے۔ اگر یہ معلوم نہ
ہو کہ زہر کون سا ہے تو عالمی طور پر تسلیم شدہ مانع
نسخہ استعمال کیجیے۔ یعنی ایک حصہ گرم اور گہری چائے
(ایک کپ) ایک حصہ ملک آف میگنیشیا (چائے کے
کئی چمچے) اور دو توس چورے کی شکل میں

از ہمدردِ صحت (کراچی)
[جون ۱۹۸۳ء]

اقبال محی الدین

انٹارکٹیکا سے متعلق چند دلچسپ حقائق

۱۹۸۵ء تک ہندوستان ایک مستقل سائنسی تجربہ گاہ انٹارکٹیکا پر بنالے گا۔ اس بات کی یقین دہانی شعبہ بحری ترقیات کے سکریٹری ڈاکٹر سید ظہور قاسم صاحب نے دلائی ہے۔ پورے سال تک یہ سائنسی تجربہ گاہ کام کرتی رہے گی۔ تاکہ انٹارکٹیکا کی سائنسی معلومات مستقل طور سے ہوتی رہیں۔

حکومت ہند کے شعبہ بحری ترقیات نے انٹارکٹیکا کی پہلی اور دوسری مہم کا انتظام کیا تھا۔ اب وہ تیسری مہم کی تیاری میں مشغول ہے۔ سب سے اہم کام شعبہ کے سامنے یہ ہے کہ انٹارکٹیکا اور ہندوستان میں اسلانی سلسلہ براہ راست کیسے قائم کیا جائے۔ دوسرا اہم مسئلہ شعبہ کے سامنے یہ ہے کہ سائنسی تجربہ گاہ کو مستقل طور پر بجلی کیسے مہیا کی جائے اور تیسرا اہم کام شعبہ کے سامنے یہ ہے کہ انٹارکٹیکا میں آلات اور سائنسی سامان اور غذا کیسے اتنی زیادہ محفوظ طور پر اکٹھا کردی جائے تاکہ آنے والی سائنسی مہم کو یا مستقل سائنسی تجربہ گاہوں کو زیادہ سے زیادہ آسانیاں پیدا ہو جائیں۔

دوسری مہم کے سربراہ ڈاکٹر وی۔ کے رینا (ڈائرکٹر جیولاجیکل سروے آف انڈیا) نے خاص قسم کے لائٹ آواز آلات انٹارکٹیکا پر اس غرض سے نصب کیے تھے تاکہ ان سے فضا اور موسم کے بارے میں معلومات فراہم ہوتی رہیں۔ ڈاکٹر رینا نے آل انڈیا ریڈیو کو سیٹلائٹ ٹیلی فون کے ذریعہ بتایا کہ جو سامان اور سائنسی آلے وہ اپنے ساتھ لے کر آئے تھے ان کو 'پولر سرکل' نامی جہاز سے اتار کر (BASE CAMP) میں لے جایا گیا اور ٹیم کے سارے ممبران مستعدی سے اپنا کام کر رہے ہیں۔"

انٹارکٹیکا کی دوسری مہم ۲۸ دسمبر ۱۹۸۲ء کو براعظم پر پہونچی اور وہاں کے برفیلے ویرانے میں دو ماہ تک رہی اور مختلف سائنسی تجربات کرتی رہی۔ پہلی مہم نے جو سامان اور سائنسی آلات وہاں چھوڑ دیے تھے وہ مکمل طور پر کام کر رہے تھے اور سب سامان محفوظ تھا جس سے دوسری مہم نے پورا فائدہ اٹھایا۔ جب یہ مہم انٹارکٹیکا پر اتری تو پنگوئن چڑیوں نے ان کا استقبال کیا۔ حکومت ہند کے شعبہ بحری ترقیات کے سکریٹری اور ہندوستانی سائنسی مہم کے پہلے سربراہ ڈاکٹر سید ظہور قاسم صاحب نے دوسری سائنسی مہم کے بارے میں معلومات فراہم کیں اور آل انڈیا ریڈیو پر ان کا انٹرویو بھی لیا تھا۔ انھوں نے دوسری مہم کی سرگرمیوں کا ذکر بہت تفصیل سے کیا اور بتایا کہ جب ہمارا جہاز "پولر سرکل" ۲۸ دسمبر ۱۹۸۲ء کو انٹارکٹیکا کے نزدیک پہونچ رہا تھا تو بڑے بڑے برف کے تودے اور گلیشیر جو تقریباً ۱۰۰ کلو میٹر کے حدود اربعہ میں پھیلے ہوئے تھے، ہمارے جہاز کے نزدیک آتے رہے۔ "پولر سرکل" ان کی زد سے بچتا بچاتا بالآخر انٹارکٹیکا پر ۲۸ دسمبر ۸۲ء کو پہونچ گیا۔ ڈاکٹر قاسم نے بتایا کہ پنگوئن سیل اور دوسری چڑیاں جو انٹارکٹیکا میں پائی جاتی ہیں وہ زیادہ تر ایک خاص قسم کی مچھلی جسے (KRILL) کہتے ہیں کھاکر

زندہ رہتی ہیں۔ کرل اس قدر زیادہ مقدار میں انٹارکٹیکا
کے سمندروں میں پائی جاتی ہیں کہ ہر سال ۴۰ ملین ٹن
کرل انٹارکٹیکا سے دوسرے ممالک میں بھیجی جاسکتی ہیں
جو انسانی غذا کے طور پر استعمال میں لائی جاسکتی ہیں۔
اتنی مقدار میں پکڑنے کے باوجود کرل کی پیداوار میں
کوئی کمی نہیں ہوگی۔

انٹارکٹیکا کی زمین پر آبادی بالکل نہیں ہے۔ سوائے
برف کے اور کچھ نہیں پایا جاتا مگر انٹارکٹیکا کے چاروں
طرف جو سمندر ہیں ان میں بحری جانداروں کی کمی نہیں ہے
یہ کہنا غلط نہ ہوگا کہ ساری دنیا کے سمندر بحری جانداروں
سے اتنے زیادہ مالا مال نہیں ہیں جتنا کہ انٹارکٹیکا کے
سمندر۔ چونکہ ابھی تک ان میں مچھلیاں کرل اور دوسرے
پودے نہیں نکالے گئے۔ لہٰذا وہ دن بہ دن بڑھتے ہی
چلے گئے۔ پینگوئن اور سیل انٹارکٹیکا کے برف پر انڈے
دیتے ہیں اور ان کی آبادی بھی بڑھتی ہی جاتی ہے۔

سائنس دانوں کا خیال ہے کہ انٹارکٹیکا میں
بیش بہا معدنیات کا ذخیرہ ہے جن میں کوئلہ، تیل اور
گیس کے بہت بڑے ذخیرے ہیں۔ ان کے علاوہ یورینیم جیسے
قیمتی دھات بھی بطن انٹارکٹیکا میں چھپے ہوئے ہیں۔

سائنس دانوں کا یہ بھی خیال ہے کہ کسی زمانے
میں اب سے تقریباً ۲۰۰ ملین برس پہلے انٹارکٹیکا ہندوستان
افریقہ، لیٹن امریکہ اور آسٹریلیا سے جڑا ہوا تھا۔ تاریخ
کے اس پہلو کا مطالعہ بہت اہمیت رکھتا ہے۔ انٹارکٹیکا
دنیا کی تاریخ کی اہم کنجی کی حیثیت رکھتا ہے۔ یہ کثافت
سے بالکل پاک ہے۔ آواز و شور سے ناآشنا ہے، اور
جنوبی کرۂ ارض کا ایک اہم مقام ہے جو سمندری اور
بری کثافت کی میزان ہے جن سے اُن ممالک کی فضائی
کثافت کا تعین کیا جاسکتا ہے، جو بحر سند کے کنارے
واقع ہیں۔

انٹارکٹیکا کی ۹۰ فیصد زمین کا حصہ برف سے
ڈھکا ہوا ہے۔ بعض اوقات برف کے پہاڑ ۲ سے چار
کلومیٹر کی اونچائی تک پھیلتے چلے گئے ہیں۔ اس طرح انٹارکٹیکا
دنیا کے تازہ پانی کا بہترین ذخیرہ رکھتا ہے۔ اس کے
برف سے اور تازہ پانی سے "پیاسی دنیا" فیضیاب
ہوسکتی ہے۔

آج سے ۲۵ سال پہلے دنیا کے سات ممالک نے
انٹارکٹیکا پر اپنا قبضہ جمالیا تھا لیکن ۱۹۵۹ء میں ایک
معاہدہ کے تحت کسی بھی ملک کا دعویٰ اس براعظم
پر نہیں ہوگا اور انٹارکٹیکا کو صرف سائنسی تجربہ گاہ کے
طور پر استعمال کیا جائے گا اور کسی طرح کا نیوکلیائی دھماکہ
بھی یہاں نہیں کیا جائے گا۔ انٹارکٹیکا معاہدہ کے ممبران
کی تعداد ۱۴ ہے جن کا رتبہ صلاح کار کمیٹی کا ہوگا اور
ان کو ووٹ دینے اور (VETO) کرنے کا بھی اختیار
ہوگا دوسرے ممبران کے فیصلہ پر۔

انٹارکٹیکا کی جائے وقوع اور جغرافیہ

براعظم انٹارکٹیکا دنیا کے جنوب ترین حصے کے
بالکل وسط میں واقع ہے جس کا رقبہ ۱۴ ملین مربع
کلومیٹر ہے۔ یعنی یہ براعظم زمین کا (۱/۱۰) دسواں
حصہ گھیرے ہوئے ہے۔ یہ براعظم یورپ، آسٹریلیا، امریکہ
(USA) اور میکسیکو کو ملا دیا جائے تو اس سے بھی
بڑا ہے۔ ہندوستان اور چین کو ملا دیا جائے تو اس
سے بھی بڑا ہے۔ یہ دنیا کا سب سے ٹھنڈا، سب سے
زیادہ خشک، سب سے زیادہ تیز ٹھنڈی ہواؤں کا
برفیلا ریگستان ہے اور ساتوں براعظموں میں سب
سے زیادہ مشکل پہنچ کا براعظم ہے۔

دوسری مہم کا مقصد

دوسری مہم کا مقصد یہ تھا کہ زیادہ لوگوں
کو زیادہ دنوں تک اس برفیلے ریگستان میں رکھ کر
ان پر وہاں کی فضا کا ردّعمل دیکھا جائے۔ پہلی بار
۶ دسمبر ۱۹۸۱ء کو جو مہم انٹارکٹیکا گئی تھی اس میں
۲۱ ممبران تھے۔ اس بار ۲۸ ممبران تھے۔ پہلی مہم وہاں
دس روز رہی تھی لیکن دوسری مہم کو ۲ ماہ کا عرصہ

وہاں گزارنا پڑا۔ اس طرح موسم، برف، حیوانی و نباتاتی
زندگی، چٹانوں کی جانچ و نمونے اکٹھے کرنے سے لے کر کافی
بڑے علاقہ کی پوری پیمائش کرنے، ہوائی پٹی بنانے،
آب و ہوا درج کرنے کے آلات نصب کرنے، پچھلی بار
چھوڑے گئے آلات لانے اور برف ہی برف میں دو مہینے
گزارنے سے جسم پر پڑنے والے اثرات دیکھنے تک تمام کام
دوسری سائنسی مہم نے انجام دیے۔

پہلی مہم کے ممبران موسم دیکھنے کے جو آلات
دکشن گنگوتری میں لگا کر چھوڑ آئے تھے، ان کے کیسٹ
بھر چکے تھے اس کیسٹ (CASSET) کو نکال کر دوسرے
CASSETS لگائے گئے۔ اسے (Re-cramme) بھی
کیا گیا تا کہ پورے سال تک وہاں کی آب و ہوا میں
ہونے والی تبدیلیوں کو وہ ریکارڈ کرتا رہے۔ اس
بٹ کی ریکارڈنگ کا تجربہ گوا کے ادارہ بحری علمیات
ل کیا جا چکا تھا۔ اس دوسری مہم کی سب سے بڑی
ہمیت یہ ہے کہ وہ لوگ ایک مستقل سائنسی تجربہ گاہ کی
ہ کا تعین کر آئے ہیں اور آٹھ میٹر بورنگ کر کے جگہ
کی چٹانوں کے نمونے وہ لوگ اپنے ساتھ لے آئے
ں تا کہ ان کا تفصیلی تجزیہ کیا جا سکے۔ ایک مکمل نام بھی
لوگوں نے تیار کی ہے جس سے یہ فیصلہ کرنے میں
سانی ہوگی کہ انٹارکٹیکا میں مستقل سائنسی تجربہ گاہ کا
ے وقوع کہاں ہو؟ چٹانوں کے نمونوں کے علاوہ
لوگ کروڑوں سال پہلے کے برف کے نمونے بھی لائے
جو ہمیں ان دونوں کی کہانی بتائیں گے جب آج کا
زمین پر نام و نشان تک نہ تھا۔

اس طرح پہلی سائنسی مہم نے انٹارکٹیکا میں
م شروع کیا تھا، دوسری مہم نے اس کو ایک ٹھوس
دے دیا ہے۔ ان کی رپورٹ کے بعد تیسری مہم بھیجا
جائے گا۔ تا کہ زیادہ سے زیادہ مہم کے ممبر الگ
یادہ سے زیادہ مہم کے ممبران انجینئر اور سائنس داں
ٹیکا جا سکیں۔ فوجی انجینئروں کا انتخاب بھی کیا جا رہا

ہے۔ امید ہے ۱۹۸۵ء تک ہندوستان اپنی مستقل سائنسی
تجربہ گاہ انٹارکٹیکا میں قائم کر دے گا۔ مستقل سائنسی تجربہ گاہ
قائم کرنے کا یہ مقصد نہیں ہے کہ ہم وہاں کوئلہ، تیل یا لوہا
یا دوسری معدنیات بڑے پیمانہ پر نکالنا شروع کر دیں گے
ہمارا ارادہ تو سائنس کی بنیادی معلومات کو آگے بڑھانے
کا ہے۔ ہو سکتا ہے آگے چل کر کچھ فائدہ معاشی طور سے
بھی ہندوستان کو پہونچے۔ بہر حال یہ تو ثابت ہو ہی
گیا کہ جوکھم اٹھا کر بڑے سے بڑا کام کرنے میں ہندوستان
کے سائنس داں کسی سے پیچھے نہیں ہیں۔

انٹارکٹیکا میں کیے گئے سائنسی تجربات

انٹارکٹیکا میں جا کر تجربات کرنے کے لیے اتنا
روپیہ جو خرچ کیا جا رہا ہے اس کا مقصد کیا ہے؟ اس
بات کا جواب تو سائنس داں ہی دے سکیں گے کہ وہاں
سائنسی تجربہ کرنا ہمارے لیے کیوں ضروری ہے؟ ۱۹۶۸ء
میں انٹارکٹیکا کی برف میں تقریباً ڈیڑھ کلو میٹر کی گہرائی
تک کھدائی کرنے کے بعد سائنس دانوں نے ۴ میٹر لمبی اور
۱۲ سینٹی میٹر موٹی برف کے نمونے جمع کیے۔ دنیا کی مختلف
سائنسی تجربہ گاہوں کو ان کے نمونے تجربہ کرنے کے لیے
بھیجے گئے۔ ہاورڈ یونیورسٹی کے اڈورڈ فائرمین نے
ان پر تجربہ کیا اور کچھ دلچسپ نتائج پر پہونچے جو
مندرجہ ذیل ہیں

انٹارکٹکا میں سیکڑوں میٹر کی گہرائی میں بہت
پرانی ہوا کے بے شمار بلبلے جمع ہیں جن سے زمین کی
فضا کی کیفیت اور قدرتی تاریخ کے کئی عقدے حل
سکیں گے۔

ہندوستان کی دوسری مہم نے بھی کئی اہم
تجربات کیے اور بقول سربراہ مہم ڈاکٹر وی کے۔ رینا
انٹارکٹیکا ایک انوکھی تجربہ گاہ ہے۔ کیوں کہ یہاں جیسی
مشابہت اور کہیں نہیں ملتی۔ دنیا بھر کے تقریباً ۱۲۰۰
سائنس داں انٹارکٹیکا میں تجربہ کر رہے ہیں۔ ان کی
ملی جلی کوشش کا نتیجہ یقیناً بہت مفید ہوگا اور سائنسی

علم کو ترقی دینے میں امدادِ باہمی ہمیشہ مشعلِ راہ دکھاتی رہے گی۔ معاشی طور سے دنیا کے سارے ممالک مستفید ہوں گے اور ساتھ میں ہندوستان کو بھی اس سے فائدہ پہونچے گا۔ کرل مچھلی سے بے حد معاشی فائدہ پہونچے گا اور دنیا کی غذائی صورت حال کو بہتر بنانے میں کرل بہت اہم رول ادا کرے گی۔

انٹارکٹیکا کی دوسری سائنسی مہم کے

نامور سربراہ ڈاکٹر شیری دھر نے موسم کی معلومات کے اور درجۂ حرارت کے گھٹنے بڑھنے کی معلومات کرنے کے لیے ایک چھوٹا سا تجرباتی اسٹیشن قائم کر دیا تھا۔ دوسرے ملکوں سے موسم کی بار بار جو خبریں نشر ہوتی تھیں ان کا بھی ریکارڈ ڈاکٹر دھر کے پاس تھا۔ فوج کے ڈاکٹر شاستری نے برف کی دراروں پر اپنے تجربات کیے جن سے پتہ چلے گا کہ ان دراروں سے نکلی آواز فضا کو کیسے اور کتنی متاثر کرتی ہے۔ اس تجربہ سے ہمالیہ میں آنے والے طوفان کو سمجھنے اور ان کی پیشین گوئی کرنے میں مدد ملے گی۔ انھوں نے چٹانوں میں معدنیات کا پتہ لگانے کا بھی تجربہ کیا۔ انٹارکٹیکا کے پانی میں ۲۱۸ میٹر گہرائی تک درجۂ حرارت بھی ناپا گیا جس سے مچھلیوں کے پائے جانے کی گہرائی کا بھی علم ہوا

مقناطیسی کشش پر تجربات۔

ڈاکٹر متل نے دکھن گنگوتری میں قدرتی دولت کا پتہ لگایا۔ اس کے علاوہ انٹارکٹیکا کے متقبل کو جاننے کے لیے انھوں نے چٹانوں پر بھی تجربات کیے زمین کی مقناطیسی کشش کی ہلچل ناپنے کا تجربہ کیا گیا۔ ڈاکٹر لوڈس نے مقناطیسی کشش کو ناپنے کا بیڑا اٹھایا تھا۔ یہ مقناطیسی کشش کی ہلچل ساری زمین پر ہوتی ہے۔ لیکن انٹارکٹیکا میں یہ ہلچلیں بہت ہی زیادہ ہیں ان کی وجہ سے ریڈیو مراسلات کا سلسلہ ٹوٹ جاتا ہے اس طرح انٹارکٹیکا میں جو لوگ تجرباتی اسٹیشنوں پر رہتے ہیں ان کا بعض اوقات اپنے ملک سے یا دوسرے ملکوں سے ریڈیائی لہروں کے ذریعے رابطہ ختم ہو جاتا ہے۔ ڈاکٹر لوڈس نے خاص طور پر ان ارضی مقناطیسی ہلچلوں کی رکاوٹ ریڈیائی مراسلات پر نہ پڑے اور وہاں رہنے والوں کا رابطہ ہمیشہ اپنے ملک سے یا دوسرے ملکوں سے قائم رہ سکے۔

دکھن گنگوتری بیس کیمپ۔

اس مرتبہ (BASE-CAMP) کا نام دکھن گنگوتری بیس کیمپ رکھا گیا۔ اسی طرح دکھن گنگوتری ایڈوانس کیمپ اور دکھن گنگوتری ریسرچ کیمپ کے نام بھی رکھے گئے۔ وہاں سے ۱۰۰ کلومیٹر دور کی جس پہاڑی کو "دکھن گنگوتری" کا نام دیا گیا تھا۔ اس کے پاس کی ایک پہاڑی کو اس کی شکل کے مطابق "شیولنگ" نام دیا گیا۔ اس جگہ کا تجربہ کیا گیا تاکہ یہ معلوم ہو سکے کہ یہ جگہ مستقل سائنسی تجربہ گاہ کے قائم کرنے کے لیے مناسب ہے یا نہیں۔ سائنس والوں نے دیکھا کہ دکھن گنگوتری ایک "گلیشیر" ہے جس پر ایک طرف برف جمتی ہے تو اس کے پگھلنے سے دوسری طرف کوئی ۱۰-۱۲ کلومیٹر لمبی جھیل بن گئی ہے۔ یعنی اگر مستقل اسٹیشن وہاں بنا دیا جائے جہاں آدمی رہ سکیں اور تجربات کرتے رہیں تو وہاں پہونچنے کے لیے ہر بار ہیلی کوپٹر سے جھیل کو پار کر کے جانا پڑے گا۔ اس لیے یہ جگہ مناسب نہیں سمجھی گئی۔ دوسری مہم کے ممبران نے دوسری جگہ تلاش کی جہاں ایک مستقل سائنسی تجربہ گاہ بنائی جا سکے گی۔

دکھن گنگوتری سے تقریباً ۶۰ کلومیٹر آگے (بیس کیمپ سے ۲۰۰ کلومیٹر دور) دوسری مہم کے ممبران ایک بڑی پہاڑی پر گئے جس کا نام انھوں نے "وول تھاٹ ماؤنٹین" رکھا۔ دور سے یہ پہاڑ بالکل ہمالیہ کی طرح ہی لگتے تھے۔ یہ پہاڑ کوئی ۳۰-۴۰ کلومیٹر چوڑے ہوں گے اور تقریباً ۱ کلومیٹر تک پھیلے ہوں گے۔

برف پر ہوائی پٹی

برف پر ہوائی پٹی بنانا کوئی مشکل کام نہیں

ہے۔ ایک تو جہاز کو سطح پر ہی لینڈ کرنا پڑتا ہے پہیوں
پر نہیں۔ ہوائی پٹی صرف ہوا کا رخ دیکھ کر بنائی ہوتی
ہے اور تھوڑی برف کی جانچ پڑتال کرنا ہوتی ہے۔
کہ وہ سخت ہو۔ عام طور پر انٹارکٹیکا میں ہوا کا رخ
مشرق سے مغرب کی سمت میں ہوتا ہے۔ لہٰذا اسی رخ
پر ہندوستانی سائنسی مہم نے ہوائی پٹی بنا دی۔

فضائی اور موسمی تجربات۔

دوسری مہم کے نائب سربراہ ڈاکٹر سُری دھر
نے موسم کی معلومات کی ذمہ داری اپنے اوپر لے لی۔
انھوں نے فضا میں بڑے بڑے گیس کے غبارے بھی چھوڑے
جس میں موسمی آلات لگے ہوئے تھے۔ جو برابر اونچائی
سے موسم کے ردّ و بدل اور طوفان آنے یا نہ آنے کی
خبریں دے رہے تھے۔ آلات موسم کے درجہ حرارت
دباؤ، ہوا کی رفتار، سمت اور اوزون کا برابر علم ہم
پہنچا رہے تھے۔ سخت ٹھنڈک اور برف کی چادروں
میں گھرے ہوئے یہ دوسری مہم کے ممبران تندہی کے
ساتھ اپنے کام میں مشغول تھے۔

تجربات کے دوران مشکلات

ہماری دوسری سائنسی مہم جب انٹارکٹیکا پہ
پہونچی تو موسم ٹھیک تھا۔ ممبران ٹیم نے سارا ساز و
سامان "پولر سرکل" جہاز سے اتار کر ہیلی کاپٹر کے
ذریعہ بیس کیمپ تک پہنچایا۔ ٹیم کے ممبران نے مل
کر اپنے رہنے اور سامان و آلات کے رکھنے کے لیے
دو ہٹیں بنائیں جو طوفان کے زبردست تھپیڑوں کی تاب
نہ لا سکی اور اس کی چھت اڑ گئی۔ طوفان اتنا تیز تھا
کہ بہت مشکل سے اپنے آپ کو بچا پائے ورنہ کئی
لوگ اڑ گئے ہوتے۔

طوفانی اور برفانی ہوائیں مستقل طور
پر سائنسی تجربات کرنے میں رکاوٹ پیش کر رہی
تھیں۔ اس کے علاوہ ہر سائنس داں بغیر وقت
کی پرواہ کیے ہوئے اور بغیر سوئے ہوئے اپنے
اپنے کاموں میں لگے ہوئے تھے۔ چوں کہ انٹارکٹیکا
میں چھ مہینے تک رات اور چھ مہینے دن رہتا ہے لہٰذا
ہمارے سائنسدانوں کو دن ہی دن کا سامنا کرنا پڑا
جب ان کو بھوک لگتی وہ کھا لیتے اور جب ان کو نیند
آتی سو رہتے۔ اس طرح کے معمولات میں تبدیلی
بھی کافی پریشان کن رہی۔

برف کے ویرانے میں ہمارے سائنس
داں کو کبھی کبھی اپنے گھر اور بیوی بچے یاد آتے
تھے۔ ان سے رابطہ قائم کرنے کے لیے "پولر سرکل"
جہاز میں خلائی ٹیلی فون لگے ہوئے تھے۔ ڈاکٹر سُری
دھر نے (جو اس مہم کے نائب سربراہ تھے) اپنے
بیوی بچوں سے خلائی ٹیلی فون کے ذریعہ بات کی
ان کا کہنا تھا کہ بچوں کی آواز سن کر انھیں اتنی
زیادہ خوشی ہوئی کہ الفاظ اس لمحہ کو بیان نہیں کر سکتے
خلائی ٹیلی فون کو ڈائل کرنے کا طریقہ یہ تھا کہ پہلے
خلائی کوڈ نمبر ۱۰۰ کو ڈائل کیا جاتا تھا۔ اس کے بعد
اپنے گھر کا فون نمبر ڈائل کرنے پر اپنے خاندان والوں
سے بات ہو جاتی تھی۔ سائنس کا یہ کارنامہ کہ ہزاروں
میل دور برف کے ویرانے میں تن و تنہا بیٹھے ہوئے
سائنس داں خلائی فون کے ذریعے کسی وقت بھی اپنے
عزیزوں سے بات کر سکتے تھے، واقعی بہت تعجب انگیز
سائنسی کرشمہ نہیں تو اور کیا ہے؟

ان سب پریشانیوں سے دست و گریباں
ہوتے ہوئے دوسری ہندوستانی مہم کے سائنس داں
انٹارکٹیکا فتح کر کے اور اپنے مشن میں کامیابی حاصل
کر کے ڈیڑھ ماہ بعد ہندوستان واپس آئے۔ انھوں
نے جو سائنسی تجربات کیے، وہاں کی چٹانوں اور برف
کے نمونے لائے، موسم کی کیفیت سے متعلق جو اعداد و شمار
اپنے ساتھ لائے ان کے مزید سائنسی تجربے سے مستقبل
میں ہندوستان کو زبردست سائنسی اور معاشی

باقی صفحہ آئندہ پر

ہمارا کارواں

(ایک خط کے جواب میں)

تہذیب الاخلاق کے ۱۶ رجولائی کے شمارے میں عنایت علی صاحب (اورنگ آباد) کا مسلمان طالب علموں کی امتحانات میں کارکردگی کے بارے میں ایک مضمون شائع ہوا تھا۔ اس مضمون سے متاثر ہو کر یونس قاضی صاحب نے جو تہذیب الاخلاق کے مقاصد سے گہری دلچسپی رکھتے ہیں، ہمیں اپنے تاثرات سے مستفید فرمایا۔ ہماری خواہش ہے کہ تہذیب الاخلاق کے حلقہ کے دوسرے اصحاب کو بھی ان مسائل کے بارے میں غور و فکر کی دعوت دیں۔

قاضی صاحب لکھتے ہیں۔ "عام طور پر مسلمان گھروں میں پڑھنے لکھنے یا کوئی اور سنجیدہ کام کرنے کی فضا نہیں ہوتی۔ گھر تفریح اور آرام کی جگہ ہوتی ہے" "تین تین چار چار برس کے بچوں کو بڑے شوق سے والدین سنیما لے جاتے ہیں۔" "میرے پڑوس میں دو خاندان ہیں، جن کے بچے اسکول جاتے ہیں۔ ماں پڑھنے لکھنے میں بچوں کی مدد کرتی ہیں۔ اور اسکول سے آنے کے بعد ان کا ہوم ورک (HOME WORK) پابندی سے کراتی ہیں۔ اس کا نتیجہ یہ ہے کہ ایک صاحب کے دونوں نواسوں کو ۹۰ سے ۹۵ فی صد نمبر ملے۔ ایک صاحب کے پوتے نے نمبروں میں اسکول کے سارے ریکارڈ توڑ کر اسکول میں (ROLL OF HONOUR) کا خطاب بھی پایا۔"

قاضی صاحب خوشحال آدمی ہیں۔ پلاننگ کمیشن کے ایک اونچے عہدے پر فائز تھے۔ اب پنشن لے کر نئی دہلی میں ذاتی مکان میں رہتے ہیں۔ ان کے ملنے والے بھی خوشحال ہی ہوں گے۔ عام لوگوں کے گھر انے نہیں۔ جب تعلیم یافتہ خاندانوں کا یہ حال ہو تو پھر عوام کے گھروں کا کیا حال ہوگا۔ یہ بہت افسوس ناک واقعہ ہے کہ مسلمانوں کے گھروں کی فضا عام طور پر ایسی نہیں ہوتی جس سے بچوں میں احساس ذمہ داری پیدا ہو اور وہ اپنی زندگی کو خود اپنے لیے کار آمد بنائیں۔ اگر وہ اسکول جائیں گے تو پڑھنے لکھنے میں دلچسپی نہ لیں گے۔ اس کی طرف ان کی توجہ واجبی ہوگی اور اگر ان کے والدین نے ان کو کام سیکھنے پر لگا دیا تو توجہ سے نہ سیکھیں گے اور جب کام سیکھ کر کسی کارخانہ میں ملازم ہو جائیں گے تو بے دلی سے کام کریں گے۔ اجرت حاصل کر کے کئی کئی دن گھر بیٹھے رہیں گے۔ جیب خالی ہو جائے گی تو پھر کارخانے پہونچ جائیں گے۔ کاریگروں کی ان عادات کی شکایت عام ہے۔ مختصر یہ کہ ترقی کرنے کے لیے

بقیہ صفحہ گذشتہ کا

فائدہ پہنچے گا۔ دوسری مہم نے وہ جگہ بھی تلاش کر لی جہاں ہندوستان کا مستقل سائنسی تجربہ گاہ اسٹیشن قائم کیا جائے گا جس میں ہندوستانی سائنس والوں کی ایک ٹیم مستقل طور پر رہے گی اور تجربات کرتی رہے گی۔ امید ہے ایسی سائنسی تجربہ گاہ ۱۹۸۵ء تک انٹارکٹیکا میں قائم ہو جائے گی۔

بہ شکریہ یوجنا۔ نئی دہلی

(جولائی ۱۹۸۳ء)

انسان کو جن خصوصیات کی ضرورت ہوتی ہے۔ مسلمانوں میں وہ کم ہی ہوتی ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ ثانوی درجات تک پہونچتے پہونچتے مسلمان لڑکے خاصی تعداد میں تعلیم کا سلسلہ ترک کر دیتے ہیں۔ ہائی اسکول یا ہائر سکنڈری اسکول کا امتحان دینے والوں کی تعداد بہت کم رہ جاتی ہے اعلیٰ تعلیم کی طرف تو مسلمان طلبا کم ہی توجہ کرتے ہیں۔ جو اعلیٰ تعلیم حاصل کرتے ہیں وہ بس ڈگری حاصل کرنے کے لیے پڑھتے ہیں۔ ذوق اور شوق طلباء میں کم ہی ہوتا ہے۔ اس لیے آسان مضامین لے کر ڈگری حاصل کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ روزگار حاصل کرنے کے لیے مقابلے کے امتحان میں مسلمان بہت کم شریک ہوتے ہیں اور جو شریک ہو جاتے ہیں ان میں کم ہی کامیاب ہوتے ہیں۔

سینما ہال کی رونق مسلمانوں سے ہے۔ فلمی ادب بڑی تعداد میں ان ہی کے دم سے شائع ہوتا ہے۔ پھر ٹی وی ہے۔ ریڈیو ہے، مشاعرہ ہے، قوالی ہے۔ سب ہی سے مسلمانوں کو گہری دلچسپی ہے۔ ملک میں زمانہ کی ٹھوکریں بھی یہی سب سے زیادہ کھا رہے ہیں اور اسی سبب سے شاید سنبھل بھی جائیں۔ دستکاری سے ان کو خاص لگاؤ ہے۔ وہ دستکار بہت اچھے ہوتے ہیں۔ شاید ہی کوئی کارخانہ ہو جہاں وہ کام کرتے نظر نہ آئیں۔ آزاد ہندوستان میں کاروبار بڑھتا جاتا ہے۔ اس لیے دستکاری عروج ہے اور محنت کش پیٹ بھر لیتے ہیں۔ دستکاری سے کما کر کامیاب دستکار خود اپنا کاروبار شروع کر دیتے ہیں۔ یہ ملک کی اکثریت کو ناپسند ہوتا ہے اور فرقہ وارانہ فساد کا سبب ہوتا ہے۔ بس اس طرح افتاں و خیزاں ہمارا کارواں چل رہا ہے۔ یہ توقع کہ ان میں اہل علم پیدا ہوں، ایک خواب ہے۔ ان کے لیڈر تعلیم یافتہ اصحاب فہم و ذکا ہوں ایک دور از کار بات ہے گپ شپ اور شوریدہ سری سے کام نکل جائے نعرہ بازی ہی کافی ہو تو پھر محنت کی کیا ضرورت ہے

مسلمانوں کی محبوب زبان اردو ہے۔ اس میں کلام کے مجموعوں کے علاوہ کسی اور موضوع پر کتابیں کم ہی شائع ہوتی ہیں اور جو شائع ہوتی ہیں ان کا افکار تازہ سے دور کا تعلق نہیں ہوتا۔ اسلامیات پر کتابوں کی اشاعت کافی ہے لیکن ان میں بھی کوئی تازگی نہیں ہوتی۔ مشکل سے ہی کوئی فکر انگیز تالیف ہوتی ہے۔ بس ایک لفظوں کا دریا ہوتا ہے جو ہمیشہ طغیانی پر رہتا ہے۔ بیداری آئے تو کیسے آئے اور کل کی فکر ہو تو کیسے ہو؟

مسلمانوں کے معاشرہ کا ایک اور پہلو بھی دیکھیے۔ مسلمانوں کا نظام تعلیم ان کی تہذیبی ضروریات پوری کرتا ہے اور ان کی زندگی سے ہم آہنگ ہے۔ ان کے سیاسی اقتدار کے دورِ انحطاط میں علماء و فضلاء، اصحاب سیف و قلم پیدا ہوتے رہے اور ان سے مسلمان فیضیاب ہوتے رہے۔ یہ سلسلہ مولانا اسمٰعیل شہیدؒ اور سید احمد شہیدؒ پر بالاکوٹ میں ختم ہو گیا۔ لیکن پھر بھی ہمارا نظام تعلیم اہل علم پیدا کرتا رہا۔ ابو الکلام آزاد، شبلی، حالی اور سید سلیمان ندوی، ابو الاعلیٰ مودودی، ابوالحسن علی ندوی اور بہت سے اہل علم اس شمع کو روشن کیے رہے جس نے صدیوں ملت کو تازگی بخشی۔ لیکن جدید نظام تعلیم تو کلرک ہی پیدا کرتا رہا۔ یا شوریدہ سر قانون داں، وکیل اور بیرسٹر جنہوں نے تذبذب میں زندگی گزار دی۔ نہ دین کے رہے نہ دنیا کے ہوئے نہ اپنے رہے نہ پرائے ہوئے۔ پھر مسلم معاشرہ میں زندگی پیدا ہو تو کیسے ہو۔ پھر بھی ہم مایوس نہیں ہیں۔ ہمارا کارواں بادِ مخالف کا مقابلہ کرتا ہوا آگے بڑھ رہا ہے۔ گو رفتار بہت سست ہے لیکن بڑھتا چلا جاتا ہے۔

ق-م-ا-

ابتدائی طبّی امداد

سائرہ اپنے سات ماہ کے بچے بوبی کو غذا کھلا رہی تھی۔ اچانک بچے کا دم گھٹنے لگا۔ شاید غذا کا کوئی اتنا بڑا ٹکڑا بچے کے منہ میں چلا گیا تھا جسے وہ نگل نہیں پا رہا تھا۔ سائرہ نے ابتدائی طبّی امداد کی تربیت حاصل کی تھی۔ اُسے یہ معلوم تو تھا کہ اس موقع پر اسے کیا کرنا چاہیے۔ لیکن اپنے بچے کی حالت دیکھ کر وہ بدحواس ہو گئی اور سب کچھ بھول گئی کہ اسے کیا کرنا چاہیے۔ یہ صورتِ حال صرف سائرہ کے ساتھ ہی پیش نہیں آتی بلکہ اکثر لوگ اپنے قریبی رشتہ داروں یا عزیزوں کے ساتھ کوئی حادثہ پیش آجانے کی صورت میں اسی طرح بدحواس ہو جاتے ہیں۔ جذبات کی شدّت ان کے ذہن سے وہ تمام باتیں اور معلومات مٹا دیتی ہے جنھیں انھوں نے اب تک بڑی محنت اور کاوش سے حاصل کیا تھا حقیقت یہ ہے کہ ہم جو کچھ سیکھتے یا جو طریقے معلوم کرتے ہیں انھیں اگر وقتاً فوقتاً عملی طور پر دہرائے نہ رہیں تو وہ ہمارے ذہن سے نکل جاتے ہیں اور وقت پڑنے پر ہمیں یہ یاد نہیں آتا کہ اب ہمیں کیا کرنا چاہیے۔

ابتدائی امداد کے اصولوں کا درس پڑھ لینا ہی کافی نہیں ہوتا۔ انھیں بہت احتیاط کے ساتھ ذہن نشین کر لینا چاہیے۔ آپ کے علم میں جو بات آئی ہے اگر آپ کو اس پر مکمل یقین اور اعتماد ہو تو آپ وقت پڑنے پر اسے عمل میں بھی لائیں گے، لیکن شرط یہ ہے کہ یہ بات آپ کو اچھی طرح یاد بھی ہو۔

بہت سے والدین یہ چاہتے ہیں کہ ہنگامی حالات میں وہ بہترین عمل کا مظاہرہ کریں۔ ایسے و[illegible] کی سہولت کے لیے ہلالِ احمر، نیشنل سیفٹی کونسل [illegible] طبّی یا میڈیکل ایسوسی ایشن نے ہنگامی نوعیت کے اٹھارہ مواقع کی فہرست مرتب کی جو گھریلو سکور[illegible] درہم برہم کر دیتے ہیں۔ یہ فہرست مرتب کرنے [illegible] ساتھ ان اداروں نے ان طریقوں کی تفصیل [illegible] کی ہے جن کے ذریعے سے ایسے اوقات میں پیدا ہو[illegible] والی صورتِ حال کا مقابلہ کیا جا سکتا ہے۔

زخم یا خراشیں:۔

زخم یا خراش زدہ حصے کو بہتے ہو[illegible] پانی اور صابن سے دھو دیجیے اگر خون بہہ رہا [illegible] جراثیم سے پاک گاز کپڑے کی گدّی سی بنا کر ا[illegible] زخم کو دبا دیجیے۔ اِس طرح خون رک جائے گا جسم کے اس حصے پر ورم آگیا ہو یا سوزش [illegible] (جراثیم سے پاک گاز کپڑے کو ہلکے نمک کے محلو[illegible] بھگو کر) گیلی، لیکن گرم پٹی باندھ دینے سے [illegible] ہو گا، لیکن معمولی خراشوں کی صورت میں اسے [illegible] کرنے کے بعد کوئی دافع عفونت دوا لگا کر پٹی [illegible] دیجیے۔ آپ کو یہ معلوم ہونا چاہیے کہ آپ کے بچے [illegible] جسم میں کزاز [TETANUS] سے بچنے کی صلا[illegible] ہے یا نہیں۔ کیوں کہ کسی گندگی یا زنگ آلود [illegible] لگنے والا زخم [TETANUS INFECTION] چھوت کا مرکز بھی بن سکتا ہے۔

جانوروں کا کاٹنا:۔ زخم کو اچھی طرح

صابن سے دھوئیے۔ پھر اسے بہتے ہوئے پانی کے نیچے تقریباً
پانچ منٹ تک رکھیے۔ پھر جراثیم سے پاک پٹی باندھ کر فوراً
معالج سے مشورہ کیجیے۔ حملہ کرنے والے جانور کو زندہ
پکڑنا بہت ضروری ہے (خاص طور پر کتوں کو) تاکہ
ہلکاؤ یا جنون پیدا کرنے والے جراثیم کا سراغ لگایا جا سکے
یہ انتہائی مہلک ہوتے ہیں۔ لیکن انھیں فوری طور پر
ناکارہ بنایا جا سکتا ہے جس سے سگ گزیدگی سے
پیدا ہونے والے پاگل پن کی روک تھام کی جاتی ہے

آبلے پڑ جانا:-

بدن پر آبلے پڑ جانے کی صورت میں متاثرہ
جگہ کو صابن اور پانی سے اچھی طرح دھوئیے، لیکن آبلوں
کو نہ توڑیے۔ پھر ایک گلاس پانی میں ڈیڑھ چمچہ عام
نمک ملا کر محلول تیار کیجیے۔ ایک پھایہ گیلا کر کے اس
آبلے پر پھیریے۔ اوپر سے مانع جراثیم [illegible] کا
لیپ کر دیجیے۔ اس پر جراثیم سے پاک کیے ہوئے
کپڑے کی پٹی باندھ دیجیے۔ اگر متاثرہ جگہ پر سرخ لکیریں
سی کھنچی نظر آ رہی ہوں یا یہ جگہ متورم ہو گئی ہو تو بیماری
پھیلنے کا خطرہ ہوتا ہے۔ اس صورت میں فوراً اپنے
معالج سے رجوع کیجیے۔

پھوڑا، پھنسی یا دنبل:

بدن پر پھوڑا، پھنسی یا دنبل نکل آئے تو یہ
بات یاد رکھیے کہ اسے ہرگز دبانا یا ملنا نہیں چاہیے
اس اصول کا اطلاق مہاسوں پر بھی ہوتا ہے۔ ڈیڑھ
چمچہ نمک کو ایک گلاس گرم پانی ملا کر محلول تیار کیجیے
لیکن خیال رہے کہ پانی بہت زیادہ گرم بھی نہ ہو۔ [illegible]
ان پھوڑے، پھنسی یا دنبل کا منہ بھی بن جائے گا
جب یہ پھٹے تو اس کے مواد کو ہاتھ نہ لگائیے۔ کیوں
کہ اس طرح یہ مواد بدن کے دوسرے حصوں پر لگ
کر ان حصوں کو بھی متاثر کر سکتا ہے۔ مواد کو جراثیم
سے پاک گاز کپڑے کی گدی سے صاف کیجیے۔ پھوڑے،
پھنسیوں اور دنبل کی روک تھام کے لیے ذاتی صفائی
سب سے زیادہ موثر ہوتی ہے

خون بہنا:

بدن کے کسی حصے سے بہنے والے خون کو روکنے
کے لیے اس پر دباؤ ڈالنا بہترین طریقہ ہوتا ہے۔ جراثیم
سے پاک گاز کی تہوں کی گدّی بنا کر زخم پر رکھ دیجیے
اور اس وقت تک اسے دباتے رہیے جب تک خون
رک نہ جائے۔ اب شریانوں کا خون روکنے والے آلے
اس وقت تک استعمال نہیں کیے جاتے جب تک کہ جریان
خون کی نوعیت شدید نہ ہو۔ اگر مانع جراثیم گاز فوری
طور پر دستیاب نہ ہو۔ تو صاف رومال یا تولیے کو
زخم پر رکھ کر دبائیے۔ ہنگامی حالات میں زخم کو نہ
دبانے اور خون بہنے دینے کے مقابلے میں زیادہ بہتر
یہ ہے کہ بالکل صاف کپڑا نہ ہو تو نسبتاً میلے کپڑے
ہی سے زخم کو دبا دیا جائے۔ جراثیم لگ جانے کے مقابلے
میں زیادہ خون بہہ جانا زیادہ خطرناک ہوتا ہے۔

چوٹ لگ جانا:

جس ہاتھ یا پیر میں چوٹ لگی ہو تو اسے حرکت
دینے سے درد کم ہو جاتا ہے۔ چوٹ لگنے کے بعد پہلے
چوبیس گھنٹوں کے دوران برف کی تھیلی یا ٹھنڈی
پٹیاں استعمال کیجیے۔ اگر پھر بھی آرام نہ ہو تو گرم
پٹیاں استعمال کیجیے۔ اگر آپ کے بدن پر نیل پڑے ہوں
یا چوٹ کا نشان ہو، لیکن زخم نہ ہو تو فوراً اپنے
معالج سے رجوع کیجیے۔

جل جانا:

جسم اگر معمولی سا جل گیا ہو تو درد کم کرنے کے
لیے کوئی ہلکا سا مرہم استعمال کیجیے اور جلی ہوئی جگہ
پر گاز کی پٹی باندھ دیجیے۔ اگر زیادہ حصہ جل گیا ہو
تو فوراً اپنے معالج سے رجوع کیجیے جلے ہوئے حصے کو
جراثیم سے پاک گاز سے ڈھانک دیجیے۔ اسے ہوا سے
بچانے کے لیے اس پر پٹی باندھ دیجیے۔ متاثرہ آدمی کو
گرم رکھیے نیز اسے زیادہ تر لٹائے رکھیے۔

بے ہوشی:

اگر کوئی شخص بے ہوشی کی سی کیفیت محسوس
رہا ہو تو اسے لٹا دیجیے یا بٹھائے رکھیے، لیکن بٹھانے
صورت میں اس کا سر اس کے دونوں گھٹنوں کے
بیان ہونا چاہیے۔ اگر کوئی شخص بے ہوش ہو چکا
تو اسے اس طرح لٹائیے کہ اس کے دونوں کولہوں
نیچے کوئی کمبل یا گرم کوٹ رکھ دیا جائے۔ اس کے
ے ڈھیلے کر دیجیے۔ قمیص وغیرہ کے بٹن کھول دیجیے
اسے تازہ ہوا ملتی رہے۔ خوشبودار اشیا، یا امونیا
کے نتھنوں کے قریب لے جائیے یا تھوڑا سا پانی اس
ے پر چھڑک دیجیے۔ ہوش میں آجانے پر بھی اسے
یا پندرہ منٹ تک اسی جگہ لٹائے رکھیے۔

ہچکیاں:

متاثرہ شخص سے کہیے کہ وہ جتنی دیر ممکن
کے سانس روکے رہے۔ بعض اوقات ٹھنڈا پانی
ہچکیاں روکنے کے لیے کارآمد ہوتا ہے۔ یا ہو سکے
غذ کا ایک تھیلی اس کے منہ اور ناک کے پاس
طرح پکڑے رہیے کہ وہ کئی مرتبہ اسی تھیلی میں سانس
کاربن ڈائی آکسائڈ میں سانس لینے سے ہچکیوں کا
ت بننے والی ہوا کی نالی اور پردہ شکم کے پٹھوں
سکون مل جاتا ہے۔ تاہم مستقل ہچکیاں آتی رہیں
قاعدہ طبی توجہ کی ضرورت ہوتی ہے۔

کیڑوں کا کاٹنا:

بہت سے کیڑے ایسے ہوتے ہیں جو اگر
لیں تو زیادہ خطرناک بات نہیں ہوتی۔ ان پر
کی تھیلی رکھ دینے سے تکلیف میں کمی آجاتی ہے
یلا ائن لوشن یا رسوت لگا دینے سے کھجلی بھی ختم
اتی ہے۔ البتہ جسے کیڑے نے کاٹا ہو اسے متاثرہ
ر کھجانے سے منع کیجیے۔ کیوں کہ کھجانے سے تکلیف
بھی سکتی ہے اور پھیل بھی جاتی ہے۔ بعض افراد
ہد کی مکھیاں کاٹ لیں تو ان پر شدید ردِ عمل ہوتا
ہے۔ بدن پر ورم آجاتا ہے۔ اگر تکلیف شدید ہو تو
کاٹی ہوئی جگہ پر بند باندھ دیجیے۔ اور فوراً اپنے
معالج سے رجوع کیجیے۔

نکسیر:

(ناک سے خون بہنا) مریض کو اس طرح بٹھائیے
کہ اس کا سر تھوڑا سا آگے کی طرف جھکا ہوا ہو۔ اس
سے کہیے کہ وہ اپنے منہ سے سانس لے۔ ناک کے دونوں
نتھنوں کو ملا کر تھوڑی دیر تک دبائے رکھیے۔
ناک پر برف کی تھیلی یا ٹھنڈے پانی میں بھیگا ہوا کپڑا
رکھیے۔ اگر خون جاری ہے تو ناک کے دونوں نتھنوں
کو جراثیم سے پاک گاز پر ویزلین لگا کر بند کر دیجیے۔
گاز کو تھوڑی دیر تک نتھنوں میں رہنے دیجیے۔ خون
بند ہو جانے کے بعد بھی فوری طور پر اسے نہ نکالیے بلکہ
تھوڑی دیر تک اسی طرح چھوڑ دیجیے۔ بعد میں اس گاز
کو اتنی آہستگی سے نکالیے کہ خون کے جمے ہوئے چکتوں
کو ٹھیس نہ لگے۔ مریض کو مشورہ دیجیے کہ وہ کئی
گھنٹوں تک ناک نیچے کی طرف نہ جھکائے۔ سر پر لوٹے
سے ٹھنڈے پانی کی دھار ڈالنے سے بھی فائدہ ہوتا
ہے۔

زہریلی جھاڑیوں کی خراش:

بعض جھاڑیاں اور بیلیں زہریلی ہوتی ہیں
یہ بدن سے مس ہو جائیں تو بدن پر کھجلی ہو جاتی ہے
اور ددوڑے پڑ جاتے ہیں۔ کسی بچے کو جب ایسی جھاڑی
لگ جائے تو متاثرہ جگہ کو صابن اور گرم پانی سے
کئی بار دھوئیے۔ خیال رکھیے کہ صابن زیادہ مقدار
میں استعمال ہو۔ دھونے کے بعد اسپرٹ سے اسفنج
کر دیجیے۔ اگر یہ تمام تدابیر ناکام ہو جائیں اور
خارش باقی رہے یا ایک یا دو دن بعد ددوڑے نمودار
ہو جائیں تو معالج سے مشورہ کیجیے۔ اپنے بچوں کو
بتائیے کہ کون سی جھاڑیاں خطرناک یا زہریلی ہوتی ہیں
تاکہ وہ دوبارہ اس حادثہ کا شکار نہ ہوں۔

کیل چبھ جانا:

کسی کیل پر پیر پڑ جانے، سوئی گھس جانے،
ی کی نوک گھس جانے سے پیروں ہاتھوں میں زخم آجاتا
۔ ایسے ہی زخم تار، لکڑی اور دھات یا کانچ کے ٹکڑوں
بھی لگ جاتے ہیں۔ پٹاخوں کے اچانک چل جانے سے بھی
، زخم آتے ہیں۔ ان زخموں سے خون تو بہت کم بہتا ہے
ن ان کے پک جانے یا سیپٹک پھیل جانے کے امکانات بہر حال
ت زیادہ ہوتے ہیں۔ ان زخموں کے لیے ابتدائی طبی
داد کے طور پر زخم کے منہ پر دباؤ ڈالنا ضروری ہے۔
، خون رک جائے۔ اس کے بعد اس پر ہلکا مانع عفونت مرہم
ڈمن تازہ نیم کے پتوں کا جوشاندہ یا پوٹاشیم پرمیگنیٹ
حلول لگا دینا چاہیے۔ تاہم حکیم، ڈاکٹر سے ان کا معائنہ
انا بھی ضروری ہے۔ کیوں کہ یہ پٹھوں میں اینٹھن اور
سختی پیدا کرتے ہیں۔

کان میں کوئی چیز گر جانا:

بعض اوقات کان میں کوئی چیز گر جاتی ہے اگر
وئی کیڑا ہو اور اندر پھڑ پھڑا رہا ہو تو کان میں تیز
ش لائٹ ڈالنی چاہیے۔ یہ روشنی کیڑے کو اپنی طرف
ل کر لیتی ہے اور وہ باہر نکل آتا ہے دوسری صورت
ں ایک دو بوند گرم زیتون کا تیل ڈالنے سے کیڑا فوراً
ل ہو جاتا ہے۔ ہمارے ملک میں اس مقصد کے لیے
سوں کا تیل بھی استعمال کیا جاتا ہے۔ اس کے بعد آپ
کی پچکاری سے کان کی بیرونی نالی دھو دیں۔ کان
ا سیرپن یا کوئی دوسری سخت چیز نہیں ڈالنی چاہیے
ا کہ اس سے کان میں مستقل زخم ہو جاتا ہے۔ حقیقت
ہے کہ بہترین طریقہ تو ماہر سے رجوع کرنا ہی ہے۔

آنکھ میں کچرا پڑ جانا:

آنکھ چھونے سے پہلے اپنے ہاتھ دھو لیجیے۔ اگر
میں پڑی ہوئی چیز نظر آ رہی ہو تو اسے رومال کا
بھگو کر آسانی سے نکالا جا سکتا ہے۔ لیکن آنکھ
ری ہوئی چیز نظر نہ آ رہی ہو تو پھر اس کے لیے
ماہر چشم سے رجوع کیجیے، وہی اسے بہتر طور پر نکال سکتا ہے
آنکھ ملنے یا رگڑنے سے گریز کیجیے۔ کیوں کہ ایسا کرنے سے
خطرہ زیادہ ہو جائے گا۔ بورک ایسڈ کے محلول یا عرق
گلاب سے آنکھ دھونے سے آنکھ کی جھلی کی سوزش کم
ہو جائے گی۔

حلق میں تکلیف:

اگر کسی کو کھانسی ہو یا سانس لینے میں دشواری
ہو اور حلق میں کوئی چیز پھنس گئی ہو تو مریض کو سینے
سے سامنے کی طرف جھکا دیجیے یا اسے اس طرح لٹا دیجیے
کہ چہرہ نیچے کی طرف ہو اور شانے دونوں طرف پھیلے ہوئے
ہوں۔ پھر اس کے شانوں کی ہڈیوں کے درمیان
زور سے تھپتھپایے۔ اگر بچہ چھوٹا ہو تو اس کے
پیر پکڑ کر الٹا لٹکا دیجیے اور پیٹھ پر زور سے تھپتھپائیے
اگر پھنسی ہوئی چیز پھر بھی باہر نہ نکلے تو فوراً ہسپتال
کے ہنگامی شعبہ سے رجوع کیجیے۔

پھانس چبھ جانا:

پھانس خواہ چاندی کی ہو، لکڑی کی ہو،
کانچ کے ریزے کی ہو یا کسی دھات کی، اسے
فوری طور پر نکالنا ضروری ہے۔ اس کے لیے کوئی
سوئی وغیرہ استعمال کیجیے جس کا سرا یا تو آگ کی لو پر
گرم کیا گیا ہو یا اسے الکحل سے صاف کیا گیا ہو تاکہ
یہ جراثیم سے پاک ہو جائے۔ اس سوئی سے پھانس
فوراً نکال دیجیے۔ زخم کو آہستہ سے دبایے تاکہ ذرا
سا خون نکل آئے۔ اس کے بعد زخم کو صابن اور
پانی سے اچھی طرح دھو کر کوئی طبی مرہم یا محلول وغیرہ
لگا دیجیے۔ اگر پھانس گہری ہو اور متاثرہ جگہ متورم
ہو جائے یا سرخ نظر آنے لگے تو فوراً اپنے معالج کو
دکھایئے۔

زہر:

زہر کے علاج کا بنیادی اصول یہ ہے کہ اس
کو حل کر کے نکال دیا جائے۔ چنانچہ مریض کو زیادہ

باقی صفحہ نمبر ۶ پر

خواجہ الطاف حسین حالی مرحوم

تالیف آثار الصنادید

جس وقت وہ فتح پور سے بدل کر دلی آئے تھے' اس وقت ان کی عمر انتیس برس کی تھی یہاں آکر ان کو یہ خیال ہوا کہ جو کتابیں ابتدا میں نہایت کم توجہی اور بے پروائی سے پڑھی تھیں اور اب بالکل نسیاً منسیاً ہوگئی تھیں ان کو از سر نو غور اور توجہ سے پڑھیے۔ مولوی نوازش علی مرحوم جو دلی میں مشہور واعظ تھے اور تمام درسی کتابیں پڑھاتے تھے ان سے کچھ پچھلی پڑھائی کو تازہ کیا اور کچھ فقہ میں مثلاً قدوری، شرح وقایہ اور اصول شاشی، نور الانوار اور ایک آدھ اور کتاب پڑھی۔ مولوی فیض الحسن سے مقامات حریری کے چند مقامے اور سبعہ معلقہ کے چند قصیدے پڑھے اور مولانا مخصوص اللہ سے جو شاہ عبدالعزیز کے بھتیجے اور شاہ رفیع الدین کے خلف الصدق تھے، حدیث شروع کی۔ مشکوٰۃ اور ایک حصہ جامع ترمذی کا اور کسی قدر ابتدا صحیح مسلم کے پڑھے اور پھر قرآن مجید کی سند لی۔ بس اس سے زیادہ جیسا کہ سرسید خود اقرار کرتے تھے کہ انھوں نے استاد سے کچھ نہیں پڑھا۔

آثار الصنادید

اسی زمانے میں جب کہ وہ دلی میں منصف تھے ان کو عمارات شہر اور نواح شہر کی تحقیقات کا خیال ہوا۔ وہ کہتے تھے کہ " میں اپنی کل تنخواہ والدہ کو دے دیتا تھا۔ وہ اس میں سے پانچ روپے مہینا خرچ کے لیے مجھ کو دیدیتی تھیں۔ باقی میرے تمام اخراجات ان کے ذمہ تھے۔ جو کپڑا وہ بنا دیتی پہن لیتا تھا اور جیسا کھانا وہ کھلا دیتی تھیں کھا لیتا تھا۔" اس کا سبب یہ تھا کہ ان کے گھر کی آمدنی سے گھر کے اخراجات کو مشکل سے مکتفی ہوتی تھی۔ سرسید کے بڑے بھائی کا انتقال ہو چکا تھا جس سے ماہوار کی آمدنی کم ہوگئی تھی۔ قلعہ کی تنخواہیں کل بند ہوگئی تھیں۔ باپ کی ملک بھی بہ سبب حیات ہونے کے ضبط ہوگئی تھی۔ کرایہ کی آمد قلیل تھی صرف سرسید کی تنخواہ کے سو روپیہ تھے اور سارے کنبے کا خرچ تھا۔ سرسید ابتدا سے نہایت فراخ حوصلہ اور کشادہ دل تھے۔ خرچ کی تنگی کے سبب اکثر منقبض رہتے تھے۔ لہٰذا ان کو یہ خیال ہوا کہ کسی تدبیر سے یہ تنگی رفع ہو۔ سید الاخبار جو ان کے بھائی کا جاری کیا ہوا تھا کچھ تو اس کو ترقی دینی چاہی اور کچھ عمارات کے حالات ایک کتاب کی صورت میں جمع کر کے چھاپنے کا ارادہ کیا۔

سید الاخبار کا اہتمام اگرچہ برائے نام ایک اور شخص کے سپرد کر رکھا تھا مگر زیادہ تر خود اس میں مضامین لکھا کرتے تھے۔ لیکن یہ ایک مدت جاری رہ کر بند ہوگیا۔ مگر عمارات کی تحقیقات نہایت محنت اور عجلت کے ساتھ برابر جاری رہی۔ سرسید ہمیشہ تعطیلوں میں عمارات

کی تحقیقات کے لیے شہر کے باہر جاتے تھے اور جب کئی دن کی تعطیل ہوتی تھی تو رات کو بھی اکثر باہر رہتے تھے۔ ان کے ساتھ اکثر ان کے دوست اور ہمدم مولانا امام بخش صہبائی مرحوم ہوتے تھے۔

باہر کی عمارتوں کی تحقیقات کرنی ایک نہایت مشکل کام تھا۔ بیسوں عمارتیں ٹوٹ پھوٹ کر کھنڈر ہو گئی تھیں اکثر عمارتوں کے کتبے پڑھے نہ جاتے تھے۔ بہت سے کتبوں سے ضروری حالات معلوم نہ ہو سکتے تھے۔ اکثر کتبے ایسے خطوں میں تھے جن سے کوئی واقف نہ تھا۔ بعض قدیم عمارتوں کے ضروری حصے معدوم ہو گئے تھے اور جو متفرق اور پراگندہ اجزا باقی رہ گئے تھے، ان سے کچھ پتہ نہ چلتا تھا کہ یہ عمارت کیوں بنائی گئی تھی اور اس سے کیا مقصود تھا۔ کتبوں میں جن بانیوں کے نام لکھے تھے ان کا مفصل حال دریافت کرنے کے لیے تاریخوں کی طرف رجوع کرنے کی ضرورت تھی۔ بعض علمی عمارتوں کی حالت ایسی متغیر ہو گئی تھی کہ ان کی ماہیت معلوم ہونی مشکل تھی۔ پھر اکثر عمارتوں کے عرض و طول و ارتفاع کی پیمائش کرنی، ہر ایک عمارت کی صورتِ حال قلم بند کرنی، کتبوں کے چربے اتارنے اور ہر ایک کتبہ کو بعینہ اس کے اصلی خط میں دکھانا، ہر ٹوٹی پھوٹی عمارت کا نقشہ جوں کا توں مصوّر سے کھچوانا اور اس طرح کچھ اوپر سوا سو عمارتوں کی تحقیقات سے عہدہ برا ہونا فی الحقیقت نہایت دشوار کام تھا۔ سرسیّد کہتے تھے کہ "قطب صاحب کی لاٹھ کے بعضے کتبے جو زیادہ بلند ہونے کے سبب پڑھے نہ جا سکتے تھے۔ ان کے پڑھنے کو ایک چھینکا دو بلیوں کے بیچ میں ہر ایک کتبے کے محاذی بندھوا لیا جاتا تھا اور میں خود اوپر چڑھ کر اور چھینکے میں بیٹھ کر ہر کتبے کا چربہ اتارتا تھا۔ جس وقت میں چھینکے میں بیٹھتا تھا تو مولانا صہبائی فرطِ محبت کے سبب بہت گھبراتے تھے اور خوف کے مارے ان کا رنگ متغیر ہو جاتا تھا۔" سرسیّد کی آئندہ ترقیات کی گویا یہ پہلی سیڑھی تھی۔

باوجود اس قدر مشکلات کے آثار الصنادید کا پہلا ایڈیشن ڈیڑھ برس کے اندر اندر چھپ کر تیار ہو گ[یا]۔ اس ایڈیشن میں چار باب تھے۔ پہلا باب عمارات بیرو[نِ] شہر کے بیان میں۔ دوسرا باب لال قلعہ اور اس کی عما[رتوں] کے بیان میں۔ تیسرا باب خاص شہر شاہجہان آباد کی عمارتوں وغیرہ کے بیان میں۔ چوتھا باب د[لی] کے مشہور اور نامور لوگوں کے ذکر میں جو سرسیّد [سے] کچھ پہلے یا ان کے زمانے میں موجود تھے۔ پہلے باب میں تقریباً ۱۳۰ عمارتوں کا بیان ہے جن میں ہندو ا[ور] مسلمان دونوں کی عمارتیں شامل ہیں اور چند کے سو[ا] باقی ہر عمارت کا نقشہ اور کتبہ اس کے ساتھ دیا گیا۔ دوسرے باب میں ۳۲ عمارتوں کا بیان اور ۳[..] نقشے اور کتبے مندرج ہیں۔ تیسرے باب میں تقریباً حویلیوں، مسجدوں، مندروں، بازاروں، باولیوں اور کنوؤں وغیرہ کا بیان ہے۔ چوتھے باب میں اوّل کسی قدر ان شہروں، قلعوں اور محلوں کا بیا[ن] ہے جو سمت ۴۰۰ بکرمی سے لے کر آخر تک وقتاً فوقتاً اس سرزمین میں آباد ہوئے۔ اس کے بعد یہاں کی آب و ہوا اور زبان اردو کا ذکر ہے۔ پھر مشاہ[یر] اہل دہلی کا ذکر لکھا ہے جس میں ۱۲۰ مشائخ، علما[ء]، فقرا، مجاذیب، اطبا، قرا، شعرا، خوش نویس، [..] موسیقی داں وغیرہ کا بیان ہے۔ اگرچہ اس ایڈیشن کی عبارت قدیم طرز کی رنگینی اور مبالغہ اور تکلفا[تِ] باردہ کے سبب آج کل کے مذاق کے موافق بہت پھیکی اور بے مزہ ہو گئی تھی اور اس کے سوا اس میں اور بھی بہت سی کسریں اور فروگذاشتیں رہ گئی تھیں مگر مضمون کے لحاظ سے نہایت عبرت خیز تھی۔ اوّل کے تین باب دیکھ کر سرزمین دہلی کی قدیم شان و شوکت اور عظمت کی تصویر آنکھوں کے آگے آ جا[تی] ہے اور تھوڑی دیر کو دنیا سے دل سرد ہو جاتا ہے اور پچھلے باب سے دلی کا اخیر جھلکا آنکھوں کے

روبرو آجاتا ہے اور تعجب ہوتا ہے کہ جس شہر میں پچاس ساٹھ برس پہلے قوم کے اس قدر اہل اللہ، اہل قلم اور اہل ہنر موجود تھے آج وہاں چاروں طرف سناٹا نظر آتا ہے۔

الغرض یہ ایڈیشن ۱۸۴۷ء میں چھپ کر شائع ہوا۔ اسی زمانے میں مسٹر رابرٹس کلکٹر و مجسٹریٹ شاہجہاں آباد ولایت جاتے تھے۔ وہ ایک نسخہ آثار الصنادید کا ساتھ لے گئے اور وہاں جاکر اس کو رائل ایشیاٹک سوسائٹی میں پیش کیا۔ ممبران سوسائٹی نے اس کو بہت پسند کیا۔ اور کورٹ اوف ڈائرکٹرز کے بعض ممبروں نے مسٹر رابرٹس سے کہا کہ اگر اس کتاب کا ترجمہ انگریزی میں ہو جائے تو بہت بہتر ہے جب مسٹر رابرٹس ولایت سے واپس آئے تو انھوں نے سرسید کی شرکت سے اس کا انگریزی میں ترجمہ کرنا چاہا۔ اس وقت سرسید کو یہ خیال ہوا کہ جو کسریں پہلے ایڈیشن میں رہ گئی ہیں ان کی درستی اور اصلاح کی جائے۔ چنانچہ انھوں نے کتاب پر نظر ثانی کرکے اس کو ازسرنو مرتب کیا۔ جو کچھ ترمیم یا اصلاح یا اضافہ انھوں نے پہلے ایڈیشن میں کیا ہے اس کا مفصل ذکر طبع ثانی کے دیباچہ میں مندرج ہے۔ بڑی خوبی اس نئے ایڈیشن میں یہ ہے کہ اس کی عبارت میں بہ نسبت پہلے ایڈیشن کے نہایت سادگی ہے اور اس کا بیان ایشیائی مبالغوں اور تکلفات باردہ سے بالکل پاک ہے۔ اس ایڈیشن کے لیے سرسید نے نقشے بھی ازسرنو کمال اہتمام سے نہایت عمدہ تیار کرائے تھے مگر ابھی چھپنے نہ پائے تھے کہ غدر ہو گیا اور سب نقشے تلف ہو گئے۔ کچھ نقشے جو باب ملے ہیں وہ محمڈن اینگلو اورینٹل کالج کی لائبریری میں محفوظ ہیں۔ البتہ چوتھا باب جس میں دلی کے مشاہیر کا حال لکھا گیا تھا وہ اس ایڈیشن میں نہیں ہے۔ اس ترمیم اور اصلاح کے باعث دراصل مسٹر اڈورڈ ٹامس ہوئے تھے جو اس وقت دلی میں سیشن جج تھے۔ ان کو پرانی چیزوں کی تحقیقات کا نہایت شوق تھا۔ انھیں کے کہنے سے سرسید نے آثار الصنادید کو ازسرنو مرتب کیا تھا۔

یہ ایڈیشن ۱۸۵۴ء میں چھپ کر تیار ہو گیا تھا مگر نہ اس ایڈیشن سے اور نہ پہلے ایڈیشن سے سرسید کو جیسا کہ خیال تھا، کچھ فائدہ ہوا۔ دوسرے ایڈیشن کے تقریباً تمام نسخے غدر میں تلف ہو گئے۔ اور پہلے ایڈیشن میں بھی ایک شخص کی بدعہدی کے سبب جو اس کے چھاپنے کا ذمہ دار ہوا تھا، سراسر نقصان رہا۔ مسٹر رابرٹس کلکٹر و مجسٹریٹ دہلی نے سرسید کی شرکت سے اس کا ترجمہ کرنا شروع کیا تھا، مگر ابھی بہت کچھ ترجمہ کرنا باقی تھا کہ مسٹر رابرٹس کی دلی سے تبدیلی ہو گئی۔ پھر معلوم نہیں کہ وہ ترجمہ پورا ہوا یا نہیں اور کسی نے اس کا ترجمہ انگریزی میں کیا یا نہیں لیکن فرانس کے مشہور اورینٹلسٹ موسیو گارساں دتاسی نے ۱۸۶۱ء میں اس کا ترجمہ فرانسیسی زبان میں کرکے مشتہر کیا جس کی ایک جلد سرسید کو بھی بھیجی تھی اسی ترجمہ کو دیکھ کر لندن کی رائل ایشیاٹک سوسائٹی نے سرسید کو سوسائٹی مذکور کا آنریری فیلو مقرر کیا تھا۔ چنانچہ ۱۸۶۴ء میں اول مسٹر ریننا ہولڈ راسٹ سکریٹری سوسائٹی نے ف کی چٹھی مورخہ ۲۰ جون ۱۸۶۴ء سرسید کے نام اس مضمون کی پہونچی۔ کہ "یورپ میں آپ کی کتاب کی بہت قدر کی گئی ہے اور بہ اتفاق آراء چند ممبران سوسائٹی آپ اس سوسائٹی کے آنریری ممبر مقرر ہو گئے ہیں"۔ اس کے بعد جو ڈپلوما سوسائٹی نے سرسید کو بھیجا اس کا ترجمہ ذیل میں لکھا جاتا ہے

لندن ۴ جولائی ۱۸۶۴ء

گریٹ برٹن اور آئرلینڈ کی رائل ایشیاٹک سوسائٹی نے زیر سرپرستی ہر موسٹ اکسلنٹ مجسٹی وکٹوریا آج کی تاریخ سید احمد خاں

باقی سطور آئندہ پر

محمد مجتبیٰ صدیقی
علی گڑھ

یتیم خانہ یا بچوں کا گھر؟

رسالہ "صدق جدید" کی ۸ر جولائی ۱۹۸۳ء کی اشاعت میں مدیر رسالہ حکیم عبدالقوی صاحب نے سید حامد صاحب مدیر تہذیب الاخلاق کے اداریہ مضمون "ناموں میں کیا رکھا ہے" پر جو تہذیب الاخلاق کے ۱۶ر جولائی کے شمارہ میں شائع ہوا ہے "یتیم کی شرعی حیثیت" کے عنوان سے تنقید کی ہے۔ اس تنقید کی بابت کچھ عرض کرنا چاہتا ہوں۔

۱۔ میں تسلیم کرتا ہوں کہ شرع کے متعلق میرا علم کچھ زیادہ نہیں ہے۔ اس لیے میں شرعی مسائل پر بحث کرنے کی اہلیت نہیں رکھتا۔ مگر حکیم صاحب نے چند ایسی باتیں لکھ دی ہیں جن کو سمجھنے میں مجھے بیحد پس و پیش ہے۔ سید حامد صاحب نے صرف اتنا ہی کہا ہے کہ یتیموں کے لیے جو اقامت گاہیں بنائی جاتی ہیں ان کو اگر یتیم خانہ کہا جائے تو اس سے حقارت کا نہیں تو ایک بے تعلقی کا اظہار ضرور ہوتا ہے۔ اس نام سے یتیموں کو نفسیاتی طور سے یہ احساس ہوتا ہے کہ وہ اور بچوں کی طرح نہیں ہیں بلکہ ایک علیحدہ مخلوق ہیں۔ اس لیے یہ بہتر ہوگا کہ ایسی اقامت گاہوں کو "بچوں کا گھر" کہا جائے۔

۲۔ حکیم صاحب کا خیال ہے کہ یہ تجویز اسلامی نقطۂ نظر سے قطعاً صحیح نہیں ہے۔ قرآن نے خود رسول کریمؐ کو یتیم کہا ہے اور قرآن و حدیث میں یتیموں کے ساتھ سلوک کا کثرت سے ذکر آیا ہے۔ اس لیے لفظ "یتیم" میں تحقیر یا اہانت کا کوئی پہلو نہیں ہو سکتا۔ بلکہ اس لفظ کے استعمال میں اجر عظیم کا تصور بھی شامل ہے۔ اگر یتیم خانہ کا نام بدل کر ایک "غیر شرعی" نام یعنی "بچوں کا گھر" رکھ دیا جائے تو اس میں اجر و برکت کا تصور سے مفقود ہو جاتا ہے۔ اس خیال کو وہ اس کے منطقی نتیجہ تک لے جانے کے لیے یہ بھی کہتے ہیں کہ یتیم خانہ کے نام کی اس تبدیلی پر "شیخ سعدی" کا یہ شعر صادق آتا ہے۔

خلاف پیمبر کسے رہ گزید
کہ ہرگز بہ منزل نہ خواہد رسید

اس لیے اس پر "خلاف پیمبر" کا سو فیصدی اطلاق ہوتا ہے۔

۴۔ یہ ایک مسلمہ حقیقت ہے کہ اکثر ایک ہی لفظ سے تحقیر یا اہانت یا تعریف و ستائش کا اظہار اس بات پر منحصر ہوتا ہے کہ وہ کس ماحول

کو اس سوسائٹی کی آنریری ممبری کے
ساتھ نامزد کیا۔ جس کی سند میں یہ
ڈپلوما ان کو ارسال کیا جاتا ہے۔
دستخط اڈورڈ کول بروک۔ پریسیڈنٹ
ایچ ر النسن ڈائرکٹر
رین ہولڈ راسٹ۔ سکریٹری
[منقول از حیات جاوید]

یا کس سیاق وسباق میں استعمال ہوا ہے۔ ایک طرف
اگر اس سے عظمت کا اظہار ہو سکتا ہے تو دوسری
طرف ماحول بدل جانے سے تحقیر کا پہلو سامنے آجاتا
ہے۔ ۴۔ "خانہ" کا لفظ متعدد قسم کے ٹکڑوں کے لیے استعمال
کیا جاتا ہے۔ "خانہ خدا" اور "خانہ کعبہ" کے الفاظ
ہماری زبان پر چڑھے ہوئے ہیں۔ جب ہم ان کو اپنی
زبان سے ادا کرتے ہیں تو ہمارے سامنے صرف
عظمت کا تصور ہوتا ہے۔ اہانت کا خیال کہیں پاس
نہیں پھٹکتا۔ لیکن اگر ہم ایک دوسرا لفظ "کبوتر خانہ"
کہیں تو ذہن ایک حقیر گھر کے تصور کی طرف مڑجاتا
ہے۔ اس طرح کے بہتیرے خانہ جات ہیں۔ مثلاً مرغی
خانہ، شتر خانہ، فیل خانہ، غسل خانہ، چڑیا خانہ،
مویشی خانہ وغیرہ۔ یتیموں کی اقامت گاہوں کو اگر
اسی زمرے میں شامل کر دیجیے تو کیا اس سے ان کی
بے وقعتی ظاہر نہ ہوگی؟

۵۔ قرآن و حدیث میں بے شک یتیموں کے ساتھ
حسن سلوک کی ہدایت ایک دفعہ نہیں بار بار آئی ہے
مگر ان جگہوں پر اگر "یتیم" کا لفظ نہ لایا جاتا تو مفہوم
کس طرح ادا ہوتا۔ قرآن انسانوں کے لیے ایک
سرچشمہ ہدایت ہے۔ سورۃ والضحیٰ میں جس کا حوالہ
حکیم صاحب نے دیا ہے اللہ تعالیٰ نے اپنے احسانات
حضورؐ پر اس طرح جتائے ہیں۔

الم یجدک یتیماً فآویٰ ۵ ووجدک ضالاً
فھدیٰ ۵ ووجدک عائلاً فاغنیٰ

کیا اس نے تم کو یتیم نہیں پایا اور پھر ٹھکانا
فراہم کیا اور تمہیں ناواقف راہ پایا اور
پھر ہدایت بخشی۔ اور تمہیں نادار پایا اور
مالدار کر دیا۔

اس کے فوراً بعد ارشاد ہوتا ہے۔

فاما الیتیم فلا تقھر ۵ واما السائل فلا تنھر
واما بنعمۃ ربک فحدث

لہذا یتیم پر سختی نہ کرو۔ اور سائل کو نہ
جھڑکو۔ اور اپنے رب کی نعمت کا اظہار کرو

گویا اللہ تعالیٰ کا احسان جتانا بے مقصد نہیں تھا۔ بلکہ
اس میں یہ ہدایت مضمر تھی، جس کو بعد میں واضح کیا
گیا کہ انسان کو بھی خلق خدا کے ساتھ ویسا ہی رحم دلی
اور محبت کا برتاؤ کرنا چاہیے جیسا اللہ تعالیٰ اس
کے ساتھ کرتا ہے

۶۔ یہاں اللہ تعالیٰ یتیم کو یتیم نہ کہتا تو ہدایت
واضح نہ ہوتی۔ لیکن یہ کہاں کہا گیا ہے کہ یتیموں
کے لیے اگر اقامت گاہیں بناؤ تو لفظ "یتیم" ان کے نام
کا جزو ہو۔ "حصول اجر و برکت" کا یہ سستا نسخہ حکیم
صاحب نے اچھا تجویز کر دیا ہے۔ شیخ سعدیؒ کا
شعر بے شک صحیح ہے۔ لیکن نام کی اس تبدیلی پر
"خلاف پیمبر کا سو فیصدی اطلاق" کس طرح سے ہوتا
ہے۔ آخر پیمبر کے کس حکم کی خلاف ورزی کی گئی ہے
جس پر اتنا بڑا الزام عاید کیا جا رہا ہے؟

۷۔ شکر ہے کہ حکیم صاحب کو ڈاکٹر ذاکر حسین سے
اتنا حسن ظن ہے کہ وہ کہتے ہیں کہ اس غیر شرعی نام
یا اصلاح کی طرف "ان کی زندگی میں کوئی ان کو توجہ
دلاتا اور ان کی اس غلط فہمی کو دور کرتا کہ مسلمانوں
میں یہ یتیم کا لفظ کوئی درجہ حقیر نہیں رکھتا ہے تو وہ
ضرور اپنے اس مشورہ سے رجوع کر لیتے"۔ اب ان
کے عالم آخرت کا سفر اختیار کر لینے کے بعد یہ کون کہہ
سکتا ہے کہ وہ ایسا کرتے یا نہ کرتے۔ البتہ سید
حامد صاحب اپنے اس مشورہ سے رجوع کریں گے،
جیسا کہ حکیم صاحب نے امید ظاہر کی ہے یا نہیں تو یہ
سید صاحب جانیں۔

۸۔ اس سلسلہ میں حکیم صاحب سے یہ دریافت
کرنا غالباً نامناسب نہ ہوگا کہ انھوں نے ڈاکٹر
ذاکر حسین کی زندگی میں یہ سوال کیوں نہیں اٹھایا
کہ ان کو اپنی اس غلطی سے رجوع کر لینے کا موقع مل

مولانا محمد انعام صدیقی
کاندھلہ۔

اخلاق کی کرامت اور ہم

اسلام کا ایک اہم رکن اخلاق ہے۔ جب تک اخلاق انسان کے اندر نہیں ہے اس وقت تک انسانی زندگی مکمل نہیں ہے (قرآن حکیم نے کہا ہے) انک لعلی خلق عظیم۔ بیشک اے محمدؐ آپ بڑے اخلاق والے ہیں۔ اسلام دنیا میں اخلاق سے پھیلا ہے نہ کہ تلوار سے۔ آج ہمارے گھروں، گاؤوں، قصبات اور شہروں کی زندگی کو دیکھیں کس قدر خراب گزر رہی ہے۔ تمام گاؤں وقصبات اور شہر تک بد اخلاقی سے بریز ہیں۔ اور عدم استحکام رونما ہوچکا ہے جس سے ہر وقت فتنہ وفساد کا اندیشہ رہتا ہے۔ کوئی منٹ ایسا نہیں کہ انسان امن اور سکون کا سانس لے سکے اور اس بد اخلاقی اور عدم استحکام کا غلط اثر آج کل کے بچوں اور لڑکیوں پر پڑ رہا ہے۔ یہ ایک فطری امر ہے کہ بچوں کی تربیت والدین سے ہوتی ہے۔ جیسا طریقہ کار والدین اور عزیزان کا دیکھیں گے ویسا ہی وہ اپنائیں گے۔ اخلاق وکردار والا انسان پھل دار درخت کی طرح ہے۔ جس وقت درخت پر بہار کا نزول ہوتا ہے تو شاخیں اس کے وزن سے جھک جاتی ہیں اور ہر جاندار اس کی جانب رغبت کرتا ہے۔ یہی حال با اخلاق انسان کا ہے کہ دشمن بھی اس کے اردگرد جمع رہتے ہیں اور اس سے فوائد حاصل کرتے رہتے ہیں۔ اور پھر اسی طرح اثرات کا یہ سلسلہ دراز ہوتا چلا جاتا ہے۔ حدیث شریف میں آیا ہے۔ انما بعثت لاتمم مکارم الاخلاق۔ بیشک میں اخلاق کی تکمیل کے واسطے بھیجا گیا ہوں) اسی وجہ سے لوگوں کے دلوں میں اسلام کی

بقیہ گذشتہ صفحہ کا

جاتا۔ اس نئی اصطلاح کے رائج ہونے کے وقت صدق جدید کے بانی مولانا عبدالماجد دریا بادیؒ بقید حیات تھے۔ اس جدت کی اطلاع ان کو بھی ضرور ہوئی ہوگی۔ پھر ان جیسے باخبر اور نڈر صحافی نے اسی وقت ڈاکٹر صاحب کی گرفت کیوں نہیں کی۔ اگر نہیں کی تو ضرور انھوں نے اس میں کوئی بات خلاف شرع یا خلاف پیمبر نہیں پائی ورنہ وہ ایسے آدمی نہیں تھے کہ ڈاکٹر صاحب کو ان کی اس لغزش پر آسانی سے بخش دیتے۔

۹۔ یتیموں کے ساتھ واقعی سلوک کیجئے اگر "اجر عظیم" کی تمنا ہے تو اسکے لیے عمل کی ضرورت ہے۔ یتیم خانہ اور بچوں کا گھر کی بحث میں پڑنا سعی لاحاصل ہے۔ آسام میں نیلی اور اسکے لحقہ مواضعات میں مسلمانوں پر جو قیامت ٹوٹی ہے (شیخ سعدیؒ نے تاتاریوں کے ہاتھوں بغداد کی تباہی پر جو دردناک مرثیہ لکھا ہے اس کا یہ شعر صادق آتا ہے ؎

اے محمدؐ گر قیامت می برآری سر زخاک
سر برآور دیں قیامت در میان خلق بیں

(اے محمدؐ اگر آپ قیامت ہی کو مرقد سے باہر نکلیں گے تو ابھی نکل کر قیامت دیکھ لیجیے)۔

نیلی کی اس قیامت میں ہزاروں مسلمان شہید ہوئے اور ہزاروں بچے یتیم ہوگئے۔ ان یتیم بچوں کی آبادکاری کے لیے اگر ہم کچھ کریں تو بیشک اجر عظیم کے مستحق ہوں گے ورنہ باقی سب بیکار کی باتیں ہیں۔

۱۰۔ آخر میں حکیم صاحب سے استدعا ہے کہ "کفر" کا فتوی اتنی آسانی سے نیک بخت مسلمانوں پر نہ دیا کریں۔ یہ تو ان کا کام ہے کافر سازی جن کا مسلک ہے۔ صحافی کو اس سے کیا واسطہ؟

عزت اور عظمت بیٹھتی چلی گئی۔ ہم نے تو اپنے صحیح راستہ کو چھوڑ کر غلط راستہ اختیار کیا۔ اس لیے اسلام کی اشاعت اور ترقی میں رکاوٹ پیدا ہونے کا اندیشہ ہو گیا۔

حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں کہ حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم سے ایک شخص نے اندر آنے کی اجازت چاہی۔ آپؐ نے فرمایا۔ اپنی قوم میں شریر آدمی ہے اس کو اجازت دے دو۔ جب وہ شخص آ کر بیٹھ گیا حضورؐ اس کے ساتھ نہایت محبت سے پیش آئے۔ جب وہ شخص چلا گیا تو حضرت عائشہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا نے عرض کیا: "یا رسول اللہؐ! آپؐ نے اس کے متعلق فلاں بات فرمائی تھی۔ لیکن آپؐ ہی نے بڑی محبت سے کام لیا۔"

آپؐ نے ارشاد فرمایا

"تم کو بداخلاق کب دیکھا ہے۔ قیامت کے روز اللہ تعالیٰ کے نزدیک بدتر وہ شخص ہوگا جس کے شر سے لوگ اس کو چھوڑ دیں گے۔" یہ اخلاق ہیں سرورِ کائنات کے۔ ایسا شخص جو اپنی قوم میں شریر ہو اس کے ساتھ آقائے مدنی صلعم نے اپنے اخلاق کو اس طرح رکھا۔ جس طرح دوستوں کے ساتھ رکھتے ہیں۔ آج ہم لوگ بیٹھنے اور بولنے کے آداب سے بھی واقف نہیں۔ یہ بھی نہیں جانتے کہ اخلاق کیا چیز ہے اور کیا اس کے فوائد ہیں۔ با اخلاق انسان خاکسار و خوشحال ہوتا ہے۔ متکبر نہیں ہوتا۔

حضرت انس رضی اللہ تعالیٰ عنہ فرماتے ہیں کہ میں حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ جا رہا تھا۔ آپؐ اس وقت ایک نجرانی چادر (موٹی کنارے کی) اوڑھے تھے۔ اتنے میں ایک دیہاتی آ گیا اور چادر پکڑ کر اس زور سے کھینچا کہ آپؐ اس کے آگے کھنچ کر آ گئے اور چادر کے کنارے سے گردن مبارک کے ایک طرف نشان پڑ گیا۔ پھر دیہاتی کہنے لگا۔ محمدؐ تمہارے پاس خدا کا جو مال ہے اس میں سے مجھے بھی دینے کا حکم دیجیے۔ آپؐ نے اس کی طرف مڑ کر دیکھا اور ہنس دیے اور پھر آپؐ نے اس کو کچھ دینے کا حکم فرمایا۔"

یہ تھی اس رحمت عالم کی شانِ عالی۔ اور ان کے ماننے والوں کی حالت دیکھیے کہ ایسی باتیں بداخلاقی کی کرتے ہیں جس سے عام لوگوں کو اور گھر والوں کو بھی تکلیف ہوتی ہے۔

اس حدیث پاک سے ہماری زندگی کا کل بھید عیاں ہو گیا کہ تکلیف بھی اگر کسی کی جانب سے ہو تو بھی ہم اپنے اخلاق سے نہ گریں۔ اپنے اخلاق کو بلند رکھیں جیسا کہ خود پیغمبر خدا صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے اخلاق بلند رکھے اور اس دیہاتی کو مسکرا کر مال بھی عنایت فرمایا۔ یہی وجہ ہے کہ اسلام دن دونی اور رات چوگنی ترقی کرتا گیا۔

حضرت ابوہریرہؓ کہتے ہیں کہ حضور اقدس صلعم کی خدمت میں عرض کیا گیا کہ مشرکوں کے لیے بددعا فرمائیں تو آپؐ نے فرمایا کہ مجھے تو اللہ تعالیٰ نے رحمت بنا کر بھیجا ہے میں لعنت کرنے والا بنا کر نہیں بھیجا گیا۔ تو ہمارے لیے غور طلب بات یہ ہے کہ جب ہمارے پیغمبر خدا نے مشرکوں کے لیے دعا فرمائی تو ہم ان کے پیرو ہیں آپ کے امتی ہیں تو ہم کو اور بھی زیادہ سے زیادہ دعا کرنی چاہیے اور اب تو حال یہ ہے کہ ہم تو اپنوں کے لیے بھی دعا نہیں کرتے غیر کے لیے تو کب کریں گے اب تو ہم لوگوں کے اخلاق و عادات اس قدر بگڑ گئے ہیں کہ جس کی جتنی بھی تفصیل کی جائے کم ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ہم آج کے دور میں ذلیل و خوار ہو رہے ہیں اور مخالفین جب اور جس جگہ چاہتے ہیں اپنی من مانی کر کے ہماری بہو بیٹیوں کی عزت سے کھیلنے لگتے، جان و مال املاک تباہ و برباد کر دیتے ہیں۔ معاشی، اقتصادی نقصان پہونچا دیتے ہیں۔ جب تک ہم لوگ اپنی عادت اور اخلاق کو درست نہیں کریں گے اس وقت تک نہ ہمارا ایمان مکمل ہے اور نہ ہی ہماری جان و مال محفوظ ہے اور نہ ہی ہم عزت کی زندگی حاصل کر سکیں گے

علی گڑھ مسلم یونیورسٹی۔ علی گڑھ

اشتہار نمبر ۸۴-۸۳/ ۱۳

مندرجہ ذیل اسامیوں کے لیے مقررہ فارموں پر درخواستیں مطلوب ہیں۔

۱۔ پروفیسر آف فزیالوجی (مستقل) ڈپارٹمنٹ آف فزیالوجی

شرح تنخواہ۔ 1500 - 60 - 1800 - 100 - 2000 - 125/2 - 2500 روپیہ اور دیگر الاؤنس

استعداد (۱) ایم بی بی ایس یا میڈیکل کونسل آف انڈیا سے تسلیم شدہ کوئی مساوی استعداد

(۱۱) ایم۔ ڈی (فزیالوجی)

ایم بی بی ایس مع ایم ایس سی (فزیالوجی)

پی۔ ایچ ڈی (میڈیکل فزیالوجی)

ڈی ایس سی (" ")

بحیثیت ریڈر ان فزیالوجی کسی میڈیکل کالج میں تدریس/ تحقیق کا چار سالہ تجربہ

۲۔ ریڈر ان نیفرولاجی (پلان پوسٹ) ڈپارٹمنٹ آف میڈیسین

شرح تنخواہ:۔ 1200 - 50 - 1300 - 60 - 1900 روپیہ اور دیگر الاؤنس

استعداد:۔ لازمی

ایم بی بی ایس یا میڈیکل کونسل آف انڈیا سے تسلیم شدہ کوئی مساوی استعداد

ڈی۔ ایم (نیفرولاجی)/ ایم ڈی ان میڈیسین اور نیفرالاجی میں دو سال کی مخصوص ٹریننگ۔

بحیثیت لکچرر ان نیفرالاجی کسی میڈیکل کالج میں تدریس/ تحقیق کا پانچ سالہ تجربہ۔

پسندیدہ: اس تخصص میں مطبوعہ تحقیقی کام

۳۔ لکچرر ان انستھیسیالوجی۔ ڈپارٹمنٹ آف انستھیسیالوجی

شرح تنخواہ:۔ 700 - 40 - 1100 - 50 - 1600 روپیہ اور دیگر الاؤنس

استعداد لازمی:۔ ایم بی بی ایس یا میڈیکل کونسل آف انڈیا سے تسلیم شدہ کوئی مساوی استعداد۔

(ii) ایم ڈی (انستھیسیا لوجی)
(iii) ایم ایس (" ")
تدریس/ تحقیق کا تجربہ
اس مضمون میں مطلوبہ پوسٹ گریجویٹ استعداد
II پسندیدہ:۔ تحقیق کا رجحان اور مطبوعہ کام

۱۔ لکچرر ان آرتھوپیڈکس سرجری۔ ڈپارٹمنٹ آف آرتھوپیڈکس۔
استعداد: (i) ایم بی بی ایس یا میڈیکل کونسل آف انڈیا سے تسلیم شدہ کوئی مساوی استعداد۔
(ii) ایم ایس (آرتھوپیڈکس)
ایم سی ایچ (" ")
تدریسی/تحقیقی تجربہ
اس مضمون میں مطلوبہ پوسٹ گریجویٹ استعداد

غیر معمولی استعداد اور تجربہ کے حامل امیدواروں کو ابتدا ہی سے اعلیٰ تنخواہ سے شروعات دی جا سکتی ہے۔ جن امیدواروں کو انٹرویو کے لیے طلب کیا جائے گا ان کو بطور T.A. ریلوے کے سکنڈ کلاس کا یک طرفہ کرایہ ادا کیا جائے گا۔

مطلوبہ درخواست فارم اور ہدایات اسسٹنٹ رجسٹرار (سلیکشن کمیٹی) رجسٹرار آفس مسلم یونیورسٹی علی گڑھ کے دفتر سے پانچ روپیہ یکمشت ادائیگی کے بعد (مسلم یونیورسٹی کے فائننس آفس کے کیش سیکشن میں جمع شدہ) یا انڈین پوسٹل آرڈر کے ذریعہ (جو فائننس آفیسر کے نام واجب الادا ہو) ذاتی طور پر حاصل کر سکتے ہیں۔ یا ڈاک کے ذریعہ طلب کرنے پر ۲۳ × ۱۰ سم سائز کا ایسا لفافہ بھیجنا ضروری ہے جس پر خود کا پتہ تحریر ہو۔
درخواست موصول ہونے کی آخری تاریخ ۲۵ر اگست ۱۹۸۳ء (چار بجے سہ پہر تک) ہے۔
نامکمل اور تاخیر سے موصول ہونے والی درخواستوں پر غور نہ کیا جائے گا۔

نوٹ:۔ موزوں امیدواروں کو مستقبل میں خالی ہونے والی ممکنہ جگہوں پر تقرر کے لیے بنائے گئے پینل میں رکھا جا سکتا ہے۔

ضمیر احمد خاں
رجسٹرار

علی گڑھ مسلم یونیورسٹی۔ علی گڑھ

اشتہار نمبر ۸۴-۸۳/۱۴

مندرجہ ذیل اسامیوں کے لیے مقررہ فارموں پر درخواستیں مطلوب ہیں

۱۔ اسسٹنٹ انجینئر (مستقل) بلڈنگ ڈپارٹمنٹ
شرح تنخواہ: ۶۵۰-۳۰-۷۴۰-۳۵-۸۱۰-ای بی-۳۵-۸۸۰-۴۰-۱۰۰۰-ای بی-۴۰-۱۲۰۰ روپیہ اور دیگر الاونس۔
استعداد: کسی منظور شدہ ہندوستانی یونیورسٹی سے سول/مکینکل انجینئرنگ میں بیچلرس ڈگری اور کسی ایسے ادارے یا آرگنائزیشن میں جو واٹر سپلائی/سیوریج اور گندے پانی کی نکاسی کا کام سرانجام دیتا ہو، انہی کاموں کا کم از کم پانچ سالہ عملی تجربہ۔

یا

سول/مکینکل انجینئرنگ میں ڈپلومہ اور کسی ایسے ادارہ یا آرگنائزیشن میں جو واٹر سپلائی/سیوریج اور گندے پانی کی نکاسی کا کام سرانجام دیتا ہو انہی کاموں کا کم از کم دس سالہ تجربہ

۲۔ سینئر ٹیکنیکل اسسٹنٹ (چھٹی لینے کی وجہ سے خالی ہونے والی جگہ)۔ ڈپارٹمنٹ آف ریڈیالوجی
شرح تنخواہ: ۵۵۰-۲۵-۷۵۰-ای بی-۳۰-۹۰۰ روپیہ اور دیگر الاونس
استعداد لازمی: بی ایس سی یا کوئی متبادل استعداد۔ ایکسرے ٹیکنیشن پاس شدہ یا اطمینان بخش ٹریننگ حاصل کرنے کا ثبوت۔

(۲) پسندیدہ: ۲۰۰ بستروں پر مشتمل کسی ہسپتال میں بحیثیت ایکسرے ٹیکنیشین کام کرنے کا کم از کم چار سالہ تجربہ

۳۔ آرتھوٹسٹ: جواہر لال نہرو میڈیکل کالج (مستقل)
شرح تنخواہ: ۴۲۵-۱۵-۵۰۰-ای بی-۱۵-۵۶۰-۲۰-۷۰۰ روپیہ اور دیگر الاونس۔
استعداد: میٹریکولیشن یا کسی تسلیم شدہ ہسپتال کے اسپلنٹ ہاؤس میں کام کرنے کا عملی تجربہ۔ پراستھیٹک یا آرتھوٹکس میں ڈپلوما۔

۴۔ پروجیکشنسٹ کم میکینک۔ پوسٹ پارٹم پروگرام۔ ڈپارٹمنٹ آف گائناکالوجی
شرح تنخواہ: ۴۲۵-۱۵-۵۰۰-ای بی-۱۵-۵۶۰-۲۰-۷۰۰ روپیہ۔
استعداد: ۳۵ ایم ایم/۱۶ ایم ایم پروجیکٹر چلانے کا سرٹیفکیٹ/لائسنس اور اس ضمن میں کم از کم تین سالہ

تجربہ کا حامل ہونا ضروری ہے۔

پسندیدہ:- ان افراد کو ترجیح دی جائے گی جو پبلک ایڈریس سسٹم اور اے وی آکوپمنٹ کو چلانے کے اہل ہوں۔

۵۔ سینیر ریسرچ فیلو۔ ڈپارٹمنٹ آف اکانومکس۔

شرح تنخواہ ۱۵- ۴۷۰ - ۱۵- ۵۳۰ - ای بی ۲۰- ۶۵۰ - ۲۵ - ۷۵۰ روپیہ اور دیگر الاؤنس

استعداد: مسلسل اچھے تعلیمی ریکارڈ کے ساتھ کسی ہندوستانی یا غیر ملکی یونیورسٹی سے اکانومکس میں فرسٹ کلاس یا ہائی سکنڈ کلاس میں ماسٹرز ڈگری۔

پسندیدہ: درس وتدریس کا قدرے تجربہ اور اسٹیٹسٹکس اور کمپیوٹر پروگرامنگس کی واقفیت

۶۔ انسٹمنٹ میکینیشن، جواہر لال نہرو میڈیکل کالج ہسپتال

شرح تنخواہ ۴۲۵- ۱۵ - ۵۰۰ - ای بی - ۱۵- ۵۶۰ - ۲۰ - ۷۰۰ روپیہ اور دیگر الاؤنس

استعداد (۱) لازمی:- میٹرکولیٹ یا اس کے متبادل۔ سرٹیفیکیٹ آف نرسنگ۔ کسی تسلیم شدہ میڈیکل کالج میں بحیثیت انسٹمنٹ اسسٹنٹ تین سالہ عملی تجربہ

پسندیدہ:- انسٹیمیاس مستعمل آلات کے بارے میں جانکاری اور ان کی دیکھ ریکھ کا تجربہ

نوٹ: اگر کوئی امیدوار اس پوسٹ کے لیے موزوں قرار پائے تو اس کے لیے سیلکشن کمیٹی مطلوبہ استعداد میں رعایت دے سکتی ہے۔

۷۔ انسپکٹر، ڈپارٹمنٹ آف گارڈن اینڈ لینڈ

شرح تنخواہ ۱۵- ۴۲۵ - ۱۵ - ۵۶۰ ای بی ۲۰ - ۷۰۰ روپیہ اور دیگر الاؤنس

استعداد ہارٹی کلچر بحیثیت مضمون کے ہمراہ اگریکلچر میں گریجویشن اور کسی تسلیم شدہ باغ/ فارم میں کام کرنے کا پانچ سالہ تجربہ۔

۸۔ موٹر میکینک۔ جے این میڈیکل کالج ہسپتال

شرح تنخواہ ۱۵- ۴۲۵ - ۱۵ - ۵۶۰ - ای بی - ۲۰ - ۶۴۰ روپیہ اور دیگر الاؤنس

استعداد:-

۱۔ لازمی۔ موٹر میکینک میں آئی ٹی آئی سرٹیفیکیٹ اور کسی مشہور ورکشاپ میں کام کرنے کا کم سے کم سات سال کا تجربہ

یا

۲۔ ماتی اسکول اور کسی مشہور ورکشاپ میں کام کرنے کا دس سالہ تجربہ

II پسندیدہ: بھاری گاڑیاں چلانے کا لائسنس

نوٹ: موزوں واائق امیدواروں کے سلسلہ میں تجربہ میں چھوٹ دی جا سکتی ہے

۹۔ کلرک گریڈ I (اکاؤنٹس)۔ ڈپارٹمنٹ آف اناٹمی (چھٹی کی جگہ پر)

شرح تنخواہ ۳۳۰ - ۱۲ - ۵۰۰ ای بی ۱۵- ۵۶۰ روپیہ اور دیگر الاؤنس

استعداد (۱)

(۱) لازمی۔ بی اے/ بی ایس سی ... کام اور آلات اور کیمیکل وغیرہ کی خریداری اور

حساب رکھنے کا پانچ سالہ تجربہ جس میں سرکاری اور نیم سرکاری یا کمرشیل ادارے میں دفتری کام شامل ہے

پسندیدہ:۔ درآمدات سے اور ایکسپورٹ سے اشیا کے حاصل کرنے کی جانکاری اور انگریزی ٹائپ کا تجربہ

۱۰۔ پلمبر - بلڈنگ ڈپارٹمنٹ،

شرح تنخواہ:۔ ۳۳۰-۱۲-۵۰۰ ای بی-۱۵-۵۶۰ روپیہ اور دیگر الاؤنس۔

استعداد کسی آئی ٹی آئی/تسلیم شدہ ٹیکنیکل ادارہ سے پلمبر کا سرٹیفکیٹ اور بحیثیت فٹر عملی تجربہ

II پسندیدہ: اس کام کی اعلیٰ درجہ کی واقفیت

عمر:۔ ۲۵ سال سے کم نہ ہو

۱۱) ڈارک روم اسسٹنٹ: جے این میڈیکل کالج اسپتال (چھٹی کی جگہ پر)

شرح تنخواہ ۲۶۰-۶-۲۹۰ ای بی ۶-۳۲۶-۸- ای بی ۸-۳۹۰-۱۰-۴۰۰ روپیہ اور دیگر الاؤنس۔

استعداد، سائنس کے مضامین کے ساتھ ہائر سکنڈری - ایکس رے کے کام/فوٹوگرافی کا تجربہ اور کسی تعلیمی ادارے کے ڈارک روم میں کام کرنے کا تجربہ

نوٹ :۔ میڈیکل لیباریٹری ٹیکنالوجی (ریڈیالوجی) کے ڈپلوما کے حامل امیدوار کے لیے متذکرہ بالا استعداد میں رعایت دی جاسکتی ہے۔

۱) کلرک گریڈ II (پوسٹ ماسٹم پروگرام) ڈپارٹمنٹ آف ادبسٹرک اینڈ گائنا کالوجی

شرح تنخواہ:۔ ۲۶۰-۶-۲۹۰ ای بی ۶-۳۲۶-۸-۳۶۶- ای بی-۸-۳۹۰-۱۰-۴۰۰ روپیہ اور دیگر الاؤنس

استعداد:۔ ہائر سکنڈری یا پری یونیورسٹی دفتری کام کے علاوہ ٹائپنگ کی اچھی رفتار۔

بہتر تعلیمی اور غیر معمولی تجربہ کے حامل امیدوار کو ابتدا سے ہی اعلیٰ تنخواہ سے شروعات دی جاسکتی ہے۔ انٹرویو کے لیے طلب کیے جانے والے امیدواروں کو بطور T.A ریلوے کے سکنڈ کلاس کا ایک طرفہ کرایہ ادا کیا جائے گا۔

درخواست کے مطلوبہ فارم اور ہدایات اسسٹنٹ رجسٹرار سلیکشن کمیٹی کے دفتر سے یونیورسٹی کے فائننس آفس کے کیش سیکشن میں تین روپیہ نقد ادائیگی کے بعد (ایک روپیہ ایپلائمنٹ فیس اور دو روپیہ درخواست فارم فیس) یا فائننس آفیسر مسلم یونیورسٹی کے نام واجب الادا کراسڈ پوسٹل آرڈر کے ذریعہ ذاتی طور پر یا ۲۳×۱۰ سنٹی میٹر کا ایسا لفافہ جس پر خود کا پتہ تحریر ہو بھیج کر حاصل کیے جا سکتے ہیں۔

درخواست موصول ہونے کی آخری تاریخ ۵ ستمبر ۱۹۸۳ء ۴ بجے سہ پہر تک ہے۔ نامکمل اور تاخیر سے موصول ہونے والی درخواستوں پر غور نہیں کیا جائے گا

ضمیر احمد خاں
رجسٹرار

علی گڑھ مسلم یونیورسٹی۔ علی گڑھ

اشتہار نمبر ۸۴-۸۳/۱۵

مندرجہ ذیل پوسٹوں کے لیے مقررہ فارموں پر درخواستیں مطلوب ہیں جو لوگ ایک سے زائد پوسٹ کے لیے امیدوار ہوں ان کے لیے لازم ہے کہ وہ ہر جگہ کے لیے الگ درخواست دیں۔

۱۔ پوسٹ گریجویٹ ٹیچر (جغرافیہ) ایس ٹی ہائی اسکول (مستقل)
شرح تنخواہ:- ۵۵۰- ۲۵- ۷۵۰- ای بی- ۳۰- ۹۰۰- روپیہ اور دیگر الاؤنس۔
استعداد:

(۱) لازمی۔ جغرافیہ میں ماسٹرس ڈگری اور
(الف) تعلیمات میں ڈگری یا تسلیم شدہ ڈپلوما
یا
(ب) انٹرمیجیٹ یا اعلیٰ کلاسز میں تدریس کا تین سالہ تجربہ

(۲) پسندیدہ:- کسی کالج یا ہائی/ ہائر سکنڈری اسکول میں اس مضمون کو انگریزی، اردو اور ہندی کے ذریعہ پڑھانے کا تجربہ

۲۔ پوسٹ گریجویٹ ٹیچر (انگریزی) ایس ٹی ہائی اسکول (عارضی)
شرح تنخواہ:- ۵۵۰- ۲۵- ۷۵۰- ای بی- ۳۰- ۹۰۰ روپیہ اور دیگر الاؤنس
استعداد: (۱) لازمی:- اس مضمون میں ماسٹر ڈگری اور
(الف) تعلیمات میں ڈگری یا تسلیم شدہ ڈپلوما
یا
(ب) انٹرمیجیٹ یا ہائر سکنڈری کلاسز کو پڑھانے کا تین سالہ تجربہ
یا
(ج) حیدرآباد کے غیر ملکی زبانوں کے مرکزی انسٹی ٹیوٹ سے انگریزی تدریس کا ڈپلوما

(۲) پسندیدہ:- ہائی یا ہائر سکنڈری کلاسز کو انگریزی پڑھانے کا مناسب تجربہ

۳۔ پوسٹ گریجویٹ ٹیچر (میتھمیٹکس) ایس ٹی ہائی اسکول
شرح تنخواہ:- ۵۵۰- ۲۵- ۷۵۰- ای بی- ۳۰- ۹۰۰ روپیہ اور دیگر الاؤنس

استعداد۔ ایم۔ ایس سی (میتھمیٹکس) اور
(الف) تعلیمات میں ڈگری یا تسلیم شدہ ڈپلومہ
(ب)۔ انٹرمیڈیٹ یا اعلیٰ کلاسیز کی تدریس کا تین سالہ تجربہ
پسندیدہ:۔ کسی کالج یا ہائی اسکول/ہائر سکنڈری اسکول کی اعلیٰ کلاسیز میں اس مضمون کو انگریزی اردو اور ہندی کے ذریعہ پڑھانے کا مناسب تجربہ

۴۔ ٹرینڈ گریجویٹ ٹیچر (کامرس) ایس ٹی ہائی اسکول (عارضی)
شرح تنخواہ:۔ ۴۴۰ - ۲۰ - ۵۰۰ ای بی - ۲۵ - ۷۰۰ - ای بی - ۲۵ - ۷۵۰ روپیہ اور دیگر الاؤنس
استعداد:

۱۔ لازمی (الف) بی کام/بی کام (آنرز) اور تعلیمات میں ڈگری/ڈپلوما
ii پسندیدہ: ہائی/ہائر سکنڈری اسکول میں اس مضمون کی تدریس کا تجربہ

۵۔ ٹرینڈ گریجویٹ ٹیچر (سائنس۔ فزکس اور کیمسٹری) گرلس ہائی اسکول (۲ پوسٹ مستقل)
شرح تنخواہ:۔ ۴۴۰ - ۲۰ - ۵۰۰ - ای بی ۲۵ - ۷۰۰ ای بی ۲۵ - ۷۵۰ روپیہ اور دیگر الاؤنس
استعداد:

(i) لازمی:۔ (الف) مطلوبہ مضامین میں گریجویشن کے علاوہ ایجوکیشن میں ڈگری/ڈپلوما
یا
(ب) ریجنل کالج آف ایجوکیشن۔ این سی آر ٹی سے بی ایس سی/بی کام
یا
ریجنل کالج آف ایجوکیشن این سی آر ٹی سے بی ٹیک۔ بی ایڈ (صرف فزکس کے لیے)
پسندیدہ:۔ کسی کالج یا ہائی/ہائر سکنڈری اسکول میں اس مضمون کی تدریس کا موزوں تجربہ

۶۔ ٹرینڈ گریجویٹ ٹیچر (میتھمیٹکس) گرلس ہائی اسکول (تین پوسٹ۔ مستقل)
شرح تنخواہ: ۴۴۰ - ۲۰ - ۵۰۰ - ای بی ۷۰۰ ای بی ۲۵ - ۷۵۰ روپیہ اور دیگر الاؤنس
استعداد

لازمی۔ اس مضمون میں گریجویشن کے علاوہ تعلیمات میں ڈگری/ڈپلوما
پسندیدہ: کسی کالج یا ہائی/ہائر سکنڈری اسکول میں اس مضمون کی تدریس کا مناسب تجربہ

۷۔ ٹرینڈ گریجویٹ ٹیچر (لائف سائنس) گرلس ہائی اسکول (۲ پوسٹ مستقل)
شرح تنخواہ: ۴۴۰ - ۲۰ - ۵۰۰ - ای بی - ۲۵ - ۷۰۰ ای بی ۲۵ - ۷۵۰ روپیہ اور دیگر الاؤنس
استعداد:

لازمی۔ باٹنی اور زولوجی کے ساتھ بی ایس سی اور بی ایڈ
یا
(ب) دہلی یونیورسٹی سے بی ایس سی (ہوم سائنس) اور بی ایڈ (یا)
ریجنل کالج آف ایجوکیشن این سی آر ٹی سے بی ایس سی، بی ایڈ۔

پسندیدہ:- کسی کالج یا ہائی / ہائر سکنڈری اسکول میں اس مضمون کی تدریس کا تجربہ

۸۔ پرائمری ٹیچر (سنی دینیات) ایس ٹی ہائی اسکول (مستقل)

شرح تنخواہ: ۳۳۰ - ۱۰ - ۳۵۰ - ای بی - ۱۰ - ۳۸۰ - ۱۲ - ۵۰۰ - ای بی - ۱۵ - ۵۶۰ روپیہ اور دیگر الاؤنس

استعداد:

(۱) لازمی:- میٹرک - ٹریننڈ

(۱۱) پسندیدہ:- (۱) عربی استعداد (کوالیفیکشن) یا بی ٹی ایچ - پرائمری کلاسیز کو دینیات پڑھانے کا تجربہ

(۱۱) بچوں کو انگریزی اور و ہندی کے ذریعہ سنی دینیات پڑھانے کا تجربہ۔

۹) پرائمری ٹیچر (شیعہ دینیات) ایس ٹی ہائی اسکول (مستقل)

شرح تنخواہ:- ۳۳۰ - ۱۰ - ۳۵۰ - ای بی - ۱۰ - ۳۸۰ - ۱۲ - ۵۰۰ - ای بی - ۱۵ - ۵۶۰ روپیہ اور دیگر الاؤنس

استعداد: میٹرک، ٹرینڈ۔

(۱۱) پسندیدہ (الف) عربی استعداد (کوالی فیکیشن) یا بی ٹی ایچ - پرائمری کلاسیز کو دینیات پڑھانے کا تجربہ

(ب) بچوں کو انگریزی ہندی اور اردو کے ذریعہ دینیات کی تعلیم دینے کا تجربہ

اعلیٰ تعلیمی اور غیر معمولی تجربہ کے حامل امیدواروں کو ابتدا ہی سے اعلیٰ تنخواہ سے شروعات دی جا سکتی ہے۔

انٹرویو کے لیے طلب کیے جانے والے امیدواروں کو بطور T.A. ریلوے کے سکنڈ کلاس کا یک طرفہ کرایہ ادا کیا جائے گا۔

درخواست کے مطلوبہ فارم اور ہدایات اسسٹنٹ رجسٹرار (سلیکشن کمیٹی) کے دفتر سے یونیورسٹی کے نام فائنانس آفس کے کیش سیکشن میں پانچ روپیہ کی یکمشت ادائیگی کے بعد یا فائننس آفیسر مسلم یونیورسٹی کے نام واجب الادا کراسڈ پوسٹل آرڈر کے ذریعہ ذاتی طور پر یا سے 23×15 کا ایسا لفافہ جس پر خود کا پتہ تحریر ہو، بھیج کر حاصل کر سکتے ہیں۔

درخواست موصول ہونے کی آخری تاریخ ۳۰ ستمبر ۸۳ ۱۹ء کو ۴ بجے سہ پہر تک ہے نامکمل اور تاخیر سے موصول ہونے والی درخواستوں پر غور نہیں کیا جائے گا

ضمیر احمد خاں
رجسٹرار

پرنٹر پبلشر قاضی معزالدین احمد نے لیتھو کلر پریس میں چھپوا کر معقد منزل تار بنگلہ اے ایم یو علی گڑھ سے شائع کیا

شمارہ نمبر ۱۷ یکم ستمبر ۱۹۸۳ء جلد نمبر ۲

انسان کو چاہیے کہ اپنے مخالف سے بھی مخالفت کرنے میں سچائی اور راست بازی نیکی اور نیک دلی کو کام میں لاوے کہ یہی طریقہ اپنے مخالف پر فتح پانے کا ہے۔ ورنہ بعوض اپنے مخالف کے خود اپنے تئیں آپ رسوا کرنا ہے۔"

(سر) سید احمد

ڈرافٹ/چیک وغیرہ بھیجتے وقت صرف اس نام کو ہی تحریر فرمائیں

K. M. Ahmad

پتہ:- صفدر منزل - تار بنگلہ - اے۔ایم۔یو۔ علی گڑھ
(202001)

۲۰/۹/۸۳

پندرہ روزہ **تہذیب الاخلاق** علی گڑھ

مدیر: سید حامد وائس چانسلر
علی گڑھ مسلم یونیورسٹی

مدیر مسئول: قاضی معزالدین احمد

شمارہ نمبر ۱۷ یکم ستمبر ۱۹۸۳ء جلد نمبر ۲

قیمت فی پرچہ	ایک روپیہ
ششماہی	۱۱ روپے
سالانہ	۲۰ روپے

بیرونِ ہند سے

فی پرچہ	ایک ڈالر
سالانہ	۱۵ ڈالر

سیّد حامد

اخلاقی غور و خوض

دہلی یونیورسٹی کی مرکزی لائبریری میں تھوڑی دیر وقت گزارنے کے لیے پہونچ گیا تھا۔ شیلف پر سے ایک کتاب اٹھائی "اخلاقی غور وخوض، اس کی سطحیں، اس کا ڈھنگ اور اس کا مدّعا"[1]

کتاب آکسفورڈ کے کلیرینڈن پریس میں دو سال ہوئے چھپی ہے۔ مصنف کا نام آر۔ ایم ہیر (R.M. Hare) ہے۔

کچھ ورق الٹے۔ جن مسائل کا ذکر تھا، ان سے ہمارا روز سامنا ہوتا ہے۔ ہر چند اس کتاب سے ہم سرسری گزرے تاہم "تہذیب الاخلاق" کے قارئین کو اس کے بنیادی نکات سے روشناس کرانا بے محل نہ ہوگا۔ یہ کتاب گویا نقطۂ آغاز ہے ان مسائل پر نئے سرے سے سلسلۂ فکر کا۔

اخلاقیات کا ذکر چھڑ جائے تو ضمیر، مذہب، سماج اور عقل چاروں اس کی لپیٹ میں آجاتے ہیں۔ انسان فطرتاً بعض باتوں کو برا سمجھتا ہے اور بعض کو اچھا۔ یہ فیصلہ کرنے میں اسے عقل کی مدد درکار نہیں ہوتی۔ وہ اس فیصلہ پر بغیر غور وفکر کے پہنچتا ہے۔ جس طرح دن کو دن کہنے سے پہلے اسے سوچنا نہیں پڑتا، نہ رات کو رات کہنے سے پہلے۔ یہ شعور اس کی رگوں میں خون کی طرح رواں دو[اں] ہے۔ اسے فطرت، جبلّت، ضمیر اور اس قبیل کے بہت سے نام دیے گئے جو ہم معنی نہیں، ہر ایک کا مطلب ایک ہے۔ ان کے [...] سے یہ مفہوم واضح ہو جاتا ہے کہ انسان کے پا[س] نیک و بد میں امتیاز کرنے کے ذرائع اور ڈھنگ [...] جائزہ، منطق اور تنقید کے علاوہ بھی ہیں۔ ز[یر نظر] کتاب کا بنیادی خیال یہ ہے کہ تجزیہ کرنے وال[ی] فطری شعور نیک و بد کی کمک کے لیے طلب کی جا[تی] ہے۔ خصوصاً ان مقامات پر جہاں حل مشکل ا[ور] فیصلہ دشوار نظر آتا ہو۔ جہاں انسان کو دو [...] راہوں میں سے ایک کو چننا پڑتا ہو جب کہ [...] دونوں راہیں الگ الگ اخلاقی طور پر ناگزیر [نظر] آتی ہوں۔ ایک راہ کو چنا جائے تو جس راہ کو چھوڑا گیا وہ حسرت اور پشیمانی اور بے چینی [کی] چٹکیاں دل میں لیتی رہتی ہے کہ حیف صد حیف اپنے اخلاقی فرض سے روگردانی کی۔ اور اگر [...] اس راہ کو اختیار کر لیا جائے جسے چھوڑا تھا [تو] دوسری راہ کو چھوڑنا خفّت اور انفعال کا [باعث] بن جائے۔

---

1 Moral thinking, its levels, method and point.

اِس حاشیہ آرائی کے بعد ہم کتاب کی طرف
پھر لوٹتے ہیں۔ اس میں دو مثالیں دی گئی ہیں۔ جن کا
دہرانا وضاحت کے لیے ضروری ہے۔ مان لیجیے کہ آپ
نے ایک عرصہ سے اپنے بچوں سے وعدہ کر رکھا ہے کہ
ان اتوار کو ہم سب ایک ساتھ سیر اور پک نک اور
ذہنی دلچسپی کے لیے نکلیں گے۔ آپ کی بے اندازہ مصروفیت
کی وجہ سے بچے کبھی چھٹیاں منا ہی نہیں پاتے۔ ایک مدت
کے بعد انھیں دن بھر بے فکری کے ساتھ باہر گزارنے
کا موقع مل رہا ہے۔ عین اس وقت جب ماں باپ اور
بچے گھر سے نکلنے والے ہیں، ایر پورٹ سے فون آتا
ہے، ایک دوست کا جو آسٹریلیا سے آیا ہے، جو بیس
سال کے بعد آپ سے ملے گا۔ ایک اتوار کا دن ہی اس
کے پاس ہے۔ اس کی فرمائش ہے کہ آپ اس کو اور
اس کی بیوی کو مقامی میوزیم اور تعلیمی ادارے دکھادیں
اگر آپ اپنے مدت سے بچھڑے ہوئے دوست کی بات
مانتے ہیں تو بچوں پر کیا اثر ہوگا۔ ان کے شاداب شگفتہ
چہرے کملا جائیں گے۔ وہ منہ لٹکا کر منہ بسور کر رہ جائیں
گے۔ ان کے دِل ٹوٹ جائیں گے۔ وہ سمجھیں گے کہ ان کے
ماں باپ کو اپنے وعدہ کا پاس نہیں۔ ان کی دل شکنی
کے علاوہ جو بات آپ کو کھٹکے گی وہ یہ کہ آپ کی وعدہ
خلافی ان کی تربیت پر اثر انداز ہوگی۔ آپ انھیں سکھاتے
رہے ہیں کہ جو شخص اپنی بات کا پاس نہیں کرتا، اپنے
وعدہ کو پورا نہیں کرتا، اس کی کوئی شخصیت نہیں ہوتی
اس کے قول میں کوئی وزن نہیں ہوتا ہے۔ سماج میں اس کی
ساکھ باقی نہیں رہتی اور آپ خود وعدہ خلافی
کر رہے ہیں۔ بچے آپ سے اور آپ کی دوسری
نصیحتوں سے بدگمان ہو جائیں گے۔ دوسری طرف آپ
اپنے دوست کو نظر انداز کرتے ہیں۔ وہ آپ کے
بھروسہ پر آپ کے شہر میں اپنی بیوی کو لے کر آیا ہے،
اس امید کے ساتھ کہ آپ ان کی راہ میں آنکھیں بچھائیں
اور چند گھنٹے ہمدم دیرینہ اور اس کی شریکِ حیات

کے ساتھ گزارنے سے آپ کو بے اندازہ خوشی ہوگی۔
آپ کس منہ سے اس سے کہیں گے کہ عزیز دوست!
آج کا دن تو ہمیں بچوں کے ساتھ گزارنا ہے۔ ان سے
وعدہ ہے۔ ہم مجبور ہیں۔ حالاں کہ تم جانتے ہو کہ تمھارا
ملنا ہمارے لیے ملاقات مسیحا و خضر سے کم نہ ہوتا۔
اِس طرح کے چھوٹے موٹے مراحل ہمیں اکثر
درپیش ہوتے ہیں۔ دو اخلاقی فریضوں میں سے ایک
کو چننا پڑتا ہے۔ بسا اوقات متبادل فیصلوں کے
نتائج اور مضمرات پر غور کرنے کو کچھ وقت بھی مل جاتا
ہے۔ لیکن بعض اوقات زیادہ اہم فیصلے چشم زدن میں
کرنا پڑتے ہیں: سمندری لڑائی چھڑی ہوئی ہے۔ دشمن
کی آبدوز نے آپ کے بیڑے کے ایک جہاز کو مسمار کردیا
ہے۔ اس کے بچے ہوئے افراد جان بچانے کے لیے اوپر
آنے کی کوشش کر رہے ہیں۔ آپ جانتے ہیں کہ آبدوز
کا رخ اب آپ کے بیڑے کے دوسرے جہازوں کی
طرف ہوگا۔ ایک پل میں یہ فیصلہ کرنا ہے کہ آپ گولے
بارود کے پورے چارج سے آبدوز پر تہ آب حملہ کردیں
اور اسے فی النار والسقر کردیں۔ اگر ایسا نہ کیا
تو آپ کے فلیٹ کا ایک اور جہاز سارے افراد کے
ساتھ موت کے منہ کا نوالہ بن جائے گا۔ اور اگر
ایسا کیا تو آبدوز کے ساتھ آپ کے شکستہ جہاز کے
ساتھی جو اوپر آنے اور جان بچانے کی کوشش کر رہے
ہیں، لقمۂ اجل ہو جائیں گے۔ ہے نہ فیصلہ دشوار؟
دونوں میں سے جو فیصلہ کیجیے یکسوئی اور اطمینان
حاصل نہ ہوگا۔ ہاتھ آئے گی حسرت، خلش، پشیمانی۔
اب دو مثالیں ہم آپ کے سامنے رکھتے ہیں:
ایک بچہ علم کی جستجو میں تنہا گھر سے نکلتا ہے۔
اس کی ماں نے ایک عمر کی کمائی اس کے حوالے کردی ہے
کرتے کے اندر اسے اچھی طرح سی دیا ہے کہ نہ کسی کو
اس کی موجودگی کا گمان ہو، نہ اس کے گرنے کا امکان
باقی رہے۔ بے چاری ماں نے اپنے لختِ جگر کو وداع

تے ہوئے اسے صرف یہی دولت نہیں دی، ایک اور
ولت کو بھی زادِ راہ کے طور پر اس کے سپرد کیا۔ یعنی
بیٹا جھوٹ کبھی نہ بولنا، جب بولنا سچ بولنا۔" قافلہ
، ابھی آدھی مسافت ہی طے کی ہوگی کہ ڈاکوؤں نے
ن پر حملہ کیا۔ زر و مال سب لوٹ لیا۔ بچے کی باری
ی۔ اوپر سے ٹٹولا کچھ نہ ملا بچے کے پاس ہوتا بھی
۔ ضمناً پوچھ لیا کہ "تیرے پاس کچھ ہے"۔ بچے کو فیصلہ
نا ہے۔ ایک طرف علم کی پیاس اور ماں کی محنت کا
س۔ اس غریب نے عمر بھر کی کمائی بیٹے کے تحصیل علم
شوق کی نذر کر دی تھی۔ اب اگر بتاتا ہے کہ میرے
ن اس قدر روپیہ ہے تو ڈاکو سب چھین لیں گے
ں نے جو کچھ سالہا سال میں پس انداز کیا ہے ایک
میں برباد ہو جائے گا اور تحصیل علم کا ارمان بھی
میں گھٹ کر رہ جائے گا۔ اگر نہیں بتاتا تو
رفیاں تو بچ جائیں گی لیکن ماں کے حکم کی خلاف ورزی
گی کہ بیٹا ہمیشہ سچ بولنا۔ اس بچے کو زیادہ تامل
ہیں کرنا پڑا۔ اس نے پلک جھپکتے یہ فیصلہ کر لیا کہ
اشرفیوں تک ڈاکوؤں کی نگاہ اور ہاتھ نہیں
نچ سکے، میں ان کی موجودگی کا اعتراف اور اعلان
روں گا۔ جب اس نے کہا کہ "ہاں میرے پاس
ی اشرفیاں ہیں تو ڈاکو سمجھے کہ یہ ننگا لڑکا ہم
ے مذاق کر رہا ہے۔ اسے پکڑ کر اپنے سردار کے
س لے گئے۔" قارئین واقف ہیں کہ اس کے بعد
یا ہوا، یہ بچہ کون تھا اور کس طرح اس کی راست
بازی سے متاثر ہو کر ڈاکو ایمان لے آئے اور
نھوں نے توبہ کر لی۔

غور کیجیے نیا ؟ اس عورت کے دل پر کیا گزری
دگی جس نے آقا کے بچے کے بستر پر سے وہ پال
ہی تھی اور جسے رات میں نا قتور دشمن قتل کرنے
رہے تھے، اپنے بیٹے کو لٹا دیا اور آقا کے بچے کو
دوسری جگہ چھپا دیا۔ مامتا کہتی تھی کہ ماں جایا ہی

کائنات ہے۔ اس کو نو مہینے پیٹ میں رکھا، خونِ جگر
سے اس کو غذا فراہم کی۔ اتنے ارمانوں اور تکلیفوں
کے بعد وہ پیدا ہوا۔ کن امنگوں سے اسے پالا، بے درد
بن کر دشمن کے خنجر کے سپرد کر دیا جائے۔ ماں کی
مامتا کو کیا ہو گیا۔ ایسی ماں دھرتی کے ماتھے پر
کلنک ہے، ظالم ہے، قاتل ہے ڈائن ہے۔ وہ عورت
اپنے ضمیر سے یہ سب لعن طعن سنتی رہی، اس کا جگر
چھلنی ہو گیا۔ پھر یہ سوچا کہ جس بچے کو وہ پال رہی ہے
اسے اس کے حال پر چھوڑ دے۔ لیکن وفاداری
چلاتی ہوئی آگے بڑھی کہ اے بے وفا! تو نے جس مالک
کا نمک کھایا ہے، جس کے بچے کو اپنے بچہ کی طرح محبت
سے پالا، اس پر وقت پڑا ہے تو دور کھڑی ہو کر
تماشا دیکھے گی۔ پھر، راج کمار مارا گیا تو راج کا کیا ہوگا
فتنہ و فساد سر اٹھائیں گے اور خدا کی مخلوق اور
راجا کی رعایا مصیبت میں پھنس جائے گی۔ قارئین
جانتے ہیں کہ اس عورت نے وفا کو مامتا پر قربان
کر دیا۔ فیصلہ کتنا دشوار تھا۔ مگر اس وفا شعار
نے چھاتی پر پتھر رکھ کر بغیر آنکھ جھپکائے وہ دلیرانہ
فیصلہ کر لیا۔

فارسی کی مثل ہے کہ وہ جھوٹ جس میں
مصلحت شامل ہو، اس سچائی سے بہتر ہے جو فتنہ
اور فساد برپا کرے۔ بات اپنی جگہ پر صحیح ہے۔ لیکن
اس میں خطرہ یہ ہے کہ خود غرضی اور ہوس پیشہ
عقل حصول مقصد کے لیے مصلحت کے دائرہ کو بہت
پھیلا [illegible] ہے۔ ضمیر کی آواز کو دبانے کے لیے
مصلحت کی مدد اکثر حاصل کی گئی ہے۔ یہ پہچاننا بھی
کبھی دشوار ہو جاتا ہے کہ مصلحت منفعت کے
حدود میں کہاں سے قدم رکھ رہی ہے۔

چلتے چلتے ضمیر کی بات بھی ہو جائے جو اخلاقیات
کی اس برات کا نوشاہ ہے۔ جہاں تک نیک و بد میں
امتیاز اور اخلاقی فیصلے کرنے کا سوال ہے، ضمیر کی

راہنمائی کے بغیر بات آگے نہیں بڑھتی۔ اگر اسے زندہ
رکھا جائے تو ضمیر ہی وہ ذریعہ ہے جو ہمیں اخلاقی خطرات
سے دور رکھتا ہے اور جو برے وقت میں، جب
قدم ڈگمگانے لگیں، ہمارے کام آتا ہے۔ عقل جب
ہوس کی آلہ کار بن جاتی ہے اور گمراہ کرنے کے لیے
طرح طرح کی تاویلیں کرتی ہے، جب انسانوں کی ہر
طرف پھیلی ہوئی گمراہی بھلے آدمیوں کو نکو بنا دیتی ہے،
ضمیر اس وقت ہمیں بھٹکنے سے بچاتا ہے۔ لیکن ضمیر کی
بات نہ سنی جائے، اسے استعمال نہ کیا جائے تو وہ
روٹھ کر الگ ہو جاتا ہے اور انسان اس کی رہبری
سے خود کو محروم کر لیتا ہے۔ ضمیر کی آواز بعض اوقات
بہت دھیمی ہوتی ہے۔ اس وقت یہ طے کرنا بھی دشوار
ہوتا ہے کہ یہ ضمیر کی آواز ہے یا کوئی واہمہ۔ نوائے
سروش ہے یا صدائے ابلیس۔ عقل کی ہوس پیشگی
اور ضمیر کے ابہام، ضعف اور آزردگی کے رحم و کرم
پر انسان کو چھوڑا نہیں جا سکتا۔ اس لیے ہدایت کا
انتظام کیا گیا ہے۔ کتاب و سنت میں یہی اہتمام ہے

دروغ مصلحت آمیز کی بات ہو رہی تھی۔ آپ
نے دروغ شناس آلہ (lie detector) کا نام سنا
ہوگا۔ اس کی گرفت بھی نو آموزوں تک ہے۔ اس
کے شکنجہ میں وہی لوگ آپاتے ہیں جو بالعموم سچ بولتے
ہیں۔ اگر وہ کبھی جھوٹ بولیں تو چہرہ کی رنگت بدل
جاتی ہے۔ شفق کی لہریں اعلان کرتی ہیں کہ روزِ
روشن سے ہٹ کر شب تاریک میں قدم رکھا جا رہا
ہے اور اگر چہرے کی رنگت پر قابو پا لیا تو جلد کی
کہربائی خصوصیات میں تبدیلی آلہ کی مدد اور قابل
کی پردہ دری کے لیے آ جاتی ہے۔ ستم ہے کہ نہیں:
عادی دروغ گو جو ڈھیٹ ہوتے ہیں اور جن کا ضمیر
مرجھا چکا ہوتا ہے، دروغ شناس آلہ کو دھوکا دے
کر صاف نکل جاتے ہیں جو دروغ کے خوگر نہیں اور
جنھیں مصلحت یا وقتی کمزوری نے تھوڑی دیر
کے لیے بہکا دیا تھا۔

داخلی بصیرت اور ضمیر زندگی کے بعض پیچیدہ ام
میں تن تنہا واضح رہبری نہیں کر پاتے۔ انھیں عقل
مدد کے لیے بلانا پڑتا ہے۔ جہاں بصیرت دو متضاد
راہوں میں سے کسی کے حق میں فیصلہ نہ کر سکے و
عقل کی کمک درکار ہوتی ہے۔ عقل کے پاس تجزیہ
اور منطقی ڈھنگ سے استدلال کرنے اور بالآخر تر
دینے کے جو طریقے ہیں، اخلاقی دوراہوں پر ان سے
مدد مل جاتی ہے۔ ایسے موقعوں پر عقل ضمیر یا دا
بصیرت کے تابع فرمان رہتی ہے۔ بصیرت اور فراس
کے اشتراک عمل سے بہت سی گتھیاں سلجھ جاتی ہیں۔

ضمیر کو اگر کریدا جائے تو دو پرتوں پر نگا
پڑے گی۔ ایک تو وہ داخلی وصف جو برائی کی آہٹ پا
ہی الارم دیتا ہے، خطرہ سے آگاہ کرتا ہے۔ جو
اچھائی کی طرف کھینچتا ہے۔ اس وصف سے کچھ نہ
کچھ حصہ ہر انسان کو ملتا ہے۔ بعض انسان برے
ماحول کے تحت بداعمالیوں اور بے غیرتی اور بے حسی
سے اس کا گلا گھونٹ دیتے ہیں۔ اس کو گناہوں ا
ڈھٹائی کے بوجھ سے اس طرح دبا دیتے ہیں کہ کرو
لینا یا کسمسانا بھی دوبھر ہو جاتا ہے۔ وہ اس کی
فہمائش سے جھنجھلا اٹھتے ہیں، اس کی ناوقت حرکت
ان کے لیے سوہانِ روح بن جاتی، اس کی آواز
سے انھیں وحشت ہوتی ہے۔ اسے اکھاڑ کر پھینک
نہیں سکتے، اسے گاڑ دیتے ہیں، دفنا دیتے ہیں
لیکن یہ بظاہر نحیف و نازک ضمیر بہت سخت جان
وہ گناہ اور خود غرضی اور بداعمالی کے نیچے مدتوں
اسی طرح دبا رہے گا جیسے سرما میں پودے اور
بیج، گیاہ اور سبزہ برف کے نیچے دب جاتے ہیں
ایسا لگتا ہے کہ بہار کبھی نہیں آئے گی اور زمین
سبزہ و گیاہ سے ہمیشہ کے لیے محروم ہو گئی۔ لیکن اپریل
کا مہینہ آنے دیجیے۔ بظاہر مردہ سبزہ برف کی تہ کو

ٹر صابرہ خاتون
بۂ طبیعیات۔ اے ایم یو۔

الکٹرانکس اور جدید تحقیق

آج کی مشینی دنیا میں شاید ہی کوئی ایسا شعبہ ہو جس میں الکٹرانکس کو دخل نہ ہو۔ ریڈیو، ٹیلی ویژن، بیٹر اور مواصلاتی نظام اس کی عام سی مثالیں ہیں۔ یہ چیزیں عوام کے لیے بڑی سود مند ثابت ہوئی ہیں۔ ب سے ٹیلی ویژن سیاروں کی مدد سے چلنے لگے ہیں، دیہی عوام پر اس کا بڑا خوش گوار اثر پڑا ہے۔ الکٹرانکس جدید تحقیق کا کام جاری ہے اور اس بات کی کوشش کی جا رہی ہے کہ نئے سے نئی تکنیک استعمال کر کے ان آلات کو زیادہ معیاری اور معتبر بنایا جا سکے۔

الکٹرانکس کا مطلب ہے الکٹران کی سائنس الکٹرانوں کے بڑی مقداروں میں جمع ہونے اور بہنے سے بجلی بنتی ہے۔ جب یہ عمل زیادہ اونچے درجے پر کیا جاتا ہے تو اسے الکٹرانکس کہتے ہیں۔ اس کے لیے گیس بھری یا کم دباؤ پر کام کرنے والی نلیاں روایتی طور پر استعمال کی جاتی رہی ہیں۔ جنہیں الکٹرانک والو کہتے ہیں۔ ان کا استعمال جن آلات میں ہوتا ہے وہ ریڈیو ٹیلی ویژن، ریڈار، از خود دروازہ کھلنے اور بند ہونے کا سسٹم وغیرہ ہیں، جن سے ہم بخوبی واقف ہیں۔

پچھلے چالیس برس میں ٹھوس اشیاء کی طبیعیات یعنی سالڈ اسٹیٹ فزکس میں جو زبردست ترقی ہوئی ہے، اس سے الکٹرانکس کو بہت فائدہ ہوا شیشہ کی الکٹرانک نلیوں کے بجائے اب چھوٹے چھوٹے ٹھوس روے استعمال ہونے لگے جن میں جرمینیم یا سلی کن کے تھوڑے سے ایٹم داخل کر دیئے جاتے ہیں۔ تاکہ وہ نیم موصول یا سیمی کنڈکٹر بن جائیں

بہ صفحہ گذشتہ کا۔

ر باہر نکل آتا ہے۔ ضمیر بھی مدتوں کے بعد اسی سر اٹھائے گا۔ اس وقت پچھتانا کچھ کام نہ آئے گا اڈنگ گناہگاروں کے آخری ایام کو تلخ کر دیتا ہے۔ ہاں تو ضمیر کی بنیادی پرت انسان کے خمیر کا جزو ہوتی دوسری پرت اسے تربیت، ماحول، مذہب اور سماج ملتی ہے۔ اس طرح انسان اچھائی کا اس قدر عادی ہو ہے اور برائی سے اس قدر نفور کہ برائی کے خلاف ضمیر کا ل فوری اور مضبوط اور اس کی آواز اونچی ہو جاتی ہے وئی نقارہ ڈبو نہیں سکتا۔ اگر بچپن میں دین کے تعلیم و تربیت سے گہرے بٹھا دیئے گئے اور ماحول سماج ایسا ملا جو اخلاقی قدروں کا قدرداں تھا ر کا دائرۂ عمل وسیع، فیصلہ کرنے کی طاقت زیادہ اور حق و باطل کے مابین تمیز کرنے کی تمیز زیادہ ردار ہو جاتی ہے۔ اس طرح گویا پہلی پرت وہبی اور ری اکتسابی ہوتی ہے۔

سید حامد

ان کا حجم الکٹرانک نلیوں کے مقابلے میں کہیں کم ہوتا
ہے۔ اور بجلی سے بہت کم خرچ پر صفائی کے ساتھ استعمال
کیے جاسکتے ہیں۔ ٹھوس شکل میں ہونے کی بنا پر ان آلات
میں ہوا کا دباؤ کم کرنے کی کوئی ضرورت نہیں ہوتی
جس سے بہت سی پیچیدگیاں رفع ہو جاتی ہیں۔ بجلی
کی بہت کم قوت خرچ ہونے سے مزید فائدہ یہ ہے کہ
آلات گرم نہیں ہوتے۔ اس نئی الکٹرانکس کو سالڈ
اسٹیٹ الکٹرانکس کہتے ہیں۔

نیم موصلوں کو استعمال کرکے وہ مشہور
PN جنکشن بنائے جاتے ہیں جو مختلف الکٹرانک نلیوں
ڈایوڈ، ٹرایوڈ وغیرہ کی جگہ استعمال ہوتے ہیں
صرف ایک PN جنکشن ڈایوڈ کی جگہ لیتا ہے اور
اس طرح خفیف سگنلوں کو پہچاننے یعنی Detection
اور بجلی کی متبادل رو یعنی A.c-Current کو
سیدھی رو Direct Current میں
بدلتے یعنی Rectification کے کام آتا ہے۔
دو جنکشنوں کو NPN یا PNP شکل میں
یکجا بناکر ٹرایوڈ نلیوں کا کام لیا جاتا ہے۔ جن کے
ذریعہ خفیف سگنل بڑھائے جاتے ہیں جسے Amplification
کہتے ہیں یا سیدھی رو دے کر تھرتھراہٹ
پیدا کی جاتی ہے جسے Oscillation کہتے ہیں۔ ان
ٹھوس ٹرایوڈس کا نام ٹرانسسٹر ہے۔ اور انھیں
Modulation کے لیے بھی بے تکلف استعمال
کیا جاتا ہے۔ جس کے معنی ہوتے ہیں دو یا دو سے
زیادہ مختلف تواتر کی لہروں کو ایک دوسرے میں
پیوست کر دینا۔ اس کے برعکس عمل کو جس میں یہ
لہریں الگ الگ کی جاتی ہیں Demodulation
کہتے ہیں اور ان کے لیے بھی یہی آلات مناسب طور
پر استعمال ہوتے ہیں۔ ان عملوں کی مثال یہ ہے کہ
ریڈیو لہریں روشنی کی رفتار سے بہتی ہیں اور
ہوا میں بہت کم جذب ہوتی ہیں۔ ہم ریڈیائی نشر
کے وقت اُن پر آواز کی لہروں کو ڈال کے دور
دور بھیجتے ہیں اور پھر ریڈیو سننے سے پہلے انھیں
الگ الگ کر لیتے ہیں۔

دوسری جنگ عظیم کے بعد دنیا میں خلائی
دور کا آغاز ہوا۔ میزائل اور خلائی پرواز کی ضرورت
کے پیش نظر بیشتر ادارے اس جستجو میں لگ گئے
الکٹرانک آلات معتبر اور ایسے بنائیں جائیں جن کا
وزن اور سائز دونوں ہی کم سے کم ہوں۔ اس
طرح الکٹرانکس کے لیے نئی راہیں نکلیں اور بیشتر
الکٹرانک آلات نے ایک روئے کی تشکیل اختیار کر
ان کاوشوں کے نتیجے میں سالڈ سرکٹ، انٹیگریٹڈ
سرکٹ (INTEGRATED CIRCUIT)، مائکرو
الکٹرانکس (Micro Electronics) اور سالماتی الکٹرانکس
(Molecular Electronics) کا وجود ہوا۔

پرانی الکٹرانکس میں نلیوں اور مختلف الکٹرانک
عناصر مثلاً Capacitor، Resistors
اور INDUCTORS کو بیرونی تاروں
کے ذریعہ جوڑ جوڑ کر سرکٹ بنائے جاتے تھے
جس میں بڑی عملی دقتیں پیش آتی تھیں۔ لیکن
تاروں کی جگہ کسی غیر موصل ٹھوس پر موصل
لکیریں یا تہیں جماکر ٹھوس یا سالڈ سرکٹ
بنائے جاتے ہیں۔ پھر ایک قدم اور آگے بڑھے جس
میں انٹگریٹیڈ سرکٹ دھات کی پلیٹوں پر کیمیائی
عمل سے مجموعی طور پر چھاپ دیے جانے لگے۔ ان میں
صرف جگہ جگہ ٹرانسسٹر وغیرہ لگانا رہ گیا، تو انھیں
بھی سرکٹ بناتے وقت خلا میں جمایا جانے لگا۔ اور
انٹگریٹیڈ سرکٹ کی بنا پر الکٹرانکس میں بڑا استحکام
پیدا ہوا۔ یعنی سرکٹ میں جس چیز کی جو قیمت چاہتے
وہ من و عن مقرر کی جانے لگی اور آلات اتنے چھوٹے
ہو گئے کہ مائکرو الکٹرانکس وجود میں
آئی۔

اس سلسلہ میں جدید ترین کوششیں یہ
کی جارہی ہیں کہ روؤں (Crystals) کی جگہ
سالموں (Molecules) کا استعمال ہونے لگے
جن کے استعمال سے جسامتیں کم سے کم ہزار گنی اور
چھوٹی ہوجائیں گی اور ہم سالماتی الکٹرانکس تک جا
پہنچیں گے۔

الکٹرانکس کا استعمال کرتے ہوئے اس صدی
کی سب سے اہم ایجاد کمپیوٹر ہے جو دراصل انسان
کا بنایا ہوا مشینی دماغ ہے۔ اس کی سب سے بڑی
خوبی یہ ہے کہ یہ بڑی برق رفتاری سے کام کرتا ہے
جو سوالات حل کرنے میں انسان کو برس یا برس
لگ جاتے تھے وہ کمپیوٹر کی مدد سے چند گھنٹوں یا
منٹوں میں حل ہوجاتے ہیں۔ تعلیم کے میدان میں
کمپیوٹر کا تعاون قابل ستائش ہے۔ تعلیم کی ہر
سطح پر اس کا استعمال روز افزوں طور پر بڑھ
رہا ہے۔ فیکٹریوں اسپتالوں اور مختلف اداروں
میں اس کا استعمال کیا جانے لگا ہے۔ دنیا کی تمام
خلائی پروازیں اسی کے بل بوتے پر پروان چڑھ رہی ہے
خلائی راکٹ اور مصنوعی سیارے اسی کی مدد سے
نہ صرف کنٹرول کیے جاتے ہیں، بلکہ دوران سفر ان
کا زمین سے رابطہ بھی قائم رہتا ہے۔

ابتدائی کمپیوٹر میں الکٹرانک نلیاں استعمال
ہوتی تھیں۔ لیکن ۱۹۶۰ء کے بعد سے ان نلیوں کی
جگہ ٹرانسسٹر نے لے لی۔ جس کے استعمال سے کمپیوٹر
سائز میں بہت کمی آگئی۔ مگر انٹی گریٹیڈ سرکٹ
کی ایجاد نے تو کمپیوٹر کا سائز اور بھی مختصر کر دیا
آئندہ کچھ برسوں میں یہ بھی ممکن ہے کہ کمپیوٹر کے
کروڑوں پرزے اتنے باریک بننے لگیں کہ جب انھیں
ایک جگہ اکٹھا کیا جائے تو صرف چند مکعب سینٹی
میٹر ہی جگہ گھیریں۔ یہ کام الکٹران شعاعوں کو
مائیکرو مشینوں میں استعمال کرکے انجام پا سکتا
ہے جس سے اتنے باریک پرزے بننے لگیں گے کہ ان
کا استعمال ایک انچ کا ایک کروڑواں حصہ ہوگا۔

جدید الکٹرانکس کی مدد سے جو کارنامے انجام
پائے ان میں خلائی پرواز اپنا مقام آپ رکھتی ہے۔
خلا میں بھیجے گئے سیارے نہ صرف ملک کی مواصلاتی
اور پیغام رسانی کی صورت حال کو بہتر بنانے میں
کارگر ہوتے ہیں، بلکہ قدرتی مصائب مثلاً آندھی
طوفان اور سیلاب وغیرہ کی پیشن گوئی کرنے میں بھی
معاون ثابت ہوتے ہیں۔

فوجی الکٹرانکس کی اپنی الگ داستان ہے۔
دفاعی ضروریات کو پورا کرنے میں الکٹرانک آلات
بیش بہا خدمات انجام دے رہے ہیں۔ آگ پر
قابو پانا، اڑتے ہوئے جہاز کو مار گرانا، توپوں
کو داغنا اور ان کو قابو میں رکھنا، بحری جہازوں
اور آبدوز کشتیوں کی موجودگی اور جگہ سے باخبر
رہنا، کارخانے اور نیوکلیر ریکٹر وغیرہ کے علاقے پر
پہنچانا وہ دفاعی مراحل ہیں جو بغیر الکٹرانکس کی مدد
کے پایۂ تکمیل کو نہیں پہنچ سکتے۔ راڈار، میزائل اور
دوسرے جدید دفاعی آلات، جیسا کہ کہا جا چکا ہے
الکٹرانکس کے ہی مرہون منت ہیں۔

الکٹرانکس کمیشن کے زیر قیادت ہندوستان
میں الکٹرانکس کی خاصی ترقی ہوئی ہے۔ انواع و
اقسام کی الکٹرانک نلیاں اور ٹیلی ویژن ریسیور
(Receivers)، سیمی کنڈکٹر ڈوائسز (Semi-
Conductor Devices) اور بہت سے
دفاعی آلات جن میں اچھے قسم کے راڈار ٹیوب
شامل ہیں، بڑے پیمانے پر بنائے جارہے ہیں۔
سینٹرل الکٹرانکس انجینئرنگ ریسرچ انسٹی ٹیوٹ
کو اس ترقی میں نمایاں حیثیت حاصل ہے۔
مائیکرو الکٹرانکس کی تکنیک پر بھی تحقیق جاری ہے

باقی صفحہ آئندہ کالم نمبر ۱ میں

محمد انعام صدیقی
کاندھلہ

آخری قسط

اخلاق کی کرامت

حضرت عائشہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا فرماتی ہیں کہ رسول اللہ علیہ وسلم نے کسی بیوی کو اور کسی
[خا]دم کو اپنے ہاتھ سے کبھی نہیں مارا۔ ہاں اللہ کے راستے میں جہاد کرتے تھے اور حضور پر کوئی زیادتی کی جاتی تو
[آ]پ اپنے نفس کی خاطر اس کا بدلہ نہ لیتے تھے۔ ہاں اگر وہ چیز شریعت کے خلاف ہوتی اور اس کو کیا جاتا تو محض اللہ
[کے] واسطے اس کو سزا دیتے تھے (مشکوٰۃ)

حضرت انس رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ

"میری عمر آٹھ سال کی تھی کہ خدمت مبارک میں حاضر ہوا اور دس سال تک خدمت کی لیکن
کسی چیز کے ضائع ہونے پر آپ نے مجھے کبھی ملامت نہیں فرمائی۔ اگر گھر والوں میں سے کوئی
ملامت کرتا بھی تھا تو آپ فرما دیتے تھے کہ رہنے دو، جو کچھ ہوا تھا ہو گیا (مشکوٰۃ)

ان حدیثوں سے معلوم ہوا کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے اخلاق کس قدر بلند تھے اور معافی اور درگزر
[کی ع]ادت بھی کس قدر تھی۔ اخلاق میں بڑی قوت ہے۔ اس قوت کو حاصل کرو۔ انشاء اللہ تم قوی ہو جاؤ
اور لوگوں کے سامنے عزت سے دیکھے جاؤ گے۔

حضرت انس رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ رسول خدا صلی اللہ علیہ وسلم جب کسی شخص سے معافحہ
[کر]تے تو جب تک وہ شخص خود اپنا ہاتھ نہ کھینچ لیتا اپنے دست مبارک کو اس کے ہاتھ سے علیحدہ نہیں کرتے
[اور] جب تک وہ خود اپنا منہ نہ پھیر لیتا، حضور صلی اللہ علیہ وسلم اس سے اپنا منہ نہ پھیرتے۔ اور کبھی یہ نہ
[دیکھا] گیا کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم اپنا زانو گھٹنہ پاؤں اپنے بیٹھنے والے سے آگے بڑھا کر بیٹھے ہوں۔"

حضرت ابو درداء رضی اللہ عنہ نے فرمایا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا فرمان ہے کہ

"کوئی چیز زیادہ بھاری مومن بندے کے میزان میں قیامت کے دن اچھے
اخلاق سے زیادہ نہیں ہوگی۔ اور بیشک اللہ تعالیٰ برا کہنے والے سے
دشمنی رکھتا ہے"

ایک اور روایت میں ہے۔ "بیشک اچھے اخلاق والا اس کی وجہ
سے ایک درجہ بلند ہوتا ہے نماز اور روزے والے سے (الترغیب)
معلوم ہوا کہ اچھے اخلاق ہمارے اندر ضرور ہونے چاہیں۔
عزیز گرامی! ایسے انداز سے بات کرو کہ غمزدہ انسان کا غم بھی جاتا

[..]ی الکٹرانکس اور جدید تحقیق

امید ہے کہ جلد ہی ہندوستان
[..]ی الکٹرانک آلات کی تیاری میں
[..]فیل ہو جائے گا۔
[..]یہ آل انڈیا ریڈیو اردو سروس)

ہے۔ یہی اخلاق ہے۔

حضرت ابو ہریرۃ رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے سوال کیا گیا کہ کس چیز کی وجہ سے زیادہ تر آدمی جنت میں داخل ہوتے ہیں؟

حضور نے فرمایا

کہ زیادہ تر حسن اخلاق کی بنا پر

م کیا گیا کہ زیادہ تر دوزخ میں کس چیز کی وجہ ، داخل ہوں گے؟"

فرمایا: فتنہ اور شرمگاہ سے (یعنی بداخلاقی اور برائی سے)۔ (ترغیب وترہیب)

ہمارے گھر کی عورتوں کو تو معلوم ہی نہیں کہ کس ح بات کرنی چاہیے۔ اگر کسی نے گالی بھی دی تو سکرا کر بولنا چاہیے۔ یہی اخلاق اور ایمان کی دلیل ۔ اور اسی لیے حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا

" جنتی ہیں اخلاق والے"۔

حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں کہ رسول صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

بیشک کامل مومن ایمان کے اعتبار سے وہ ہے کہ اخلاق کے اعتبار سے وہ زیادہ اچھا ہو، اپنے اہل وعیال پر نرم ہو (یعنی بال بچوں پر)

ہم ہیں کہ ہمارے اندر اخلاق کا شائبہ ہی نظر ں آتا۔ اور اس نعمت عظمیٰ سے ہم محروم نظر آتے ہیں۔ جبکہ ایمان کی جڑ اخلاق ہے۔

حضرت انس رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم ارشاد گرامی نقل کرتے ہیں کہ

"بیشک بندہ اخلاق کے ذریعہ بلند مرتبہ کو پہنچتا اور آخرت میں اس کی منزل اور بلند ہوجاتی ہے ں کہ یہ تھوڑا عمل ہے اور برے اخلاق سے کے نچلے درجہ میں پہنچتا ہے۔ آج ذراسی بات بھی

مرد اور عورت کی طبیعت کے خلاف ہو گئی تو بگڑ جاتے ہیں۔ حالانکہ اخلاق تو یہ ہے کہ مسکرائے اور جنتی بن جائے لیکن ذراسی اس بھول اور غفلت سے ہم خود جنت سے محروم ہوتے جارہے ہیں۔

محترم حضرات! اخلاق کی بلندی جذبات پر قابو پانا ہے اور یہی اصل قوت ایمانی ہے۔ سیاسی تمدنی، معاشرتی، مذہبی اور زندگی کے تمام شعبوں میں اخلاقی زندگی کی تعمیر وتشکیل جذبات پر کنٹرول کیے بغیر حاصل نہیں ہوسکتی۔ جذبات انسان کی ایسی فطری کمزوری ہے جو انسانی دل ودماغ میں ہیجان برپا کرکے اس کی عقل سلیم کو فطرت کے سادہ ماحول میں کسی بات کو سوچنے سمجھنے سے محروم کردیتے ہیں اور اس کے نتیجہ میں انسان ہمیشہ غلط اقدام کربیٹھتا ہے اور بعد میں ساری عمر اس غلطی کا کفارہ ادا کرتا رہتا ہے۔

بداخلاقی جذبات، اشتعال، جوش، غصہ یہ سب چیزیں ہیں جو انسان کی صحیح قوت فکر کو چھین لیتی ہیں اور اسے افسوس ناک حرکتوں کے ارتکاب پر ابھار دیتی ہیں جو اس کے لیے تباہی کا باعث ہیں۔ اس کے برعکس ضبط، مسکراہٹ، درگزر، جذبات پر کنٹرول، اخلاقی زندگی اور سنجیدگی ایسی دولت ہے کہ جو آدمی کی زندگی میں عظمت، پابند کردار کے اثرات قائم کرنے اور اس کی شخصیت کو مکمل بنانے میں اپنا اہم رول ادا کرسکتا ہے

اللہ تعالیٰ سے تمام مسلمانوں کو با اخلاق اور بلند کردار، شریف النفس، حلیم الطبع بنانے کے لیے ہم سب دعا کریں۔ تاکہ مسلمانوں میں موجود یہ تمام خرابیاں دور ہوجائیں اور وہ ایک باعزت اور بامقصد زندگی گزار سکیں

وما علینا الا البلاغ۔

حکیم احسان اللہ
(بی یو ایم ایم ایس علیگ)
امرڈوبھا - بستی

علم دیدان امعاء: تاریخی پس منظر

طفیلیات جمع ہے طفیلیہ کی۔ یہ ایک اصطلاحی لفظ ہے جس کے معنی ہوتے ہیں دوسروں کے صدقے وطفیل زندگی گزارنا۔ اس اصطلاح کا اطلاق اپنے اسی مفہوم کے ساتھ نباتات وحیوانات کے بعض گروہوں پر یکساں طور سے ہوتا ہے۔

وہ زندہ اجسام جو جزوی یا کلی طور پر اپنے تغذیہ و رہائش کے لیے دوسرے ذی حیات کے سہارے کے محتاج ہوتے ہیں، طفیلیات کی اصطلاح سے یاد کیے جاتے ہیں۔ یہ زندہ اجسام دونوں طرح کے ہوسکتے ہیں خواہ ان کا تعلق نباتات سے ہو خواہ حیوانات کے کسی گروہ سے ان کو نسبت حاصل ہو جزوی طور پر طفیلیاتی زندگی گزارنے والے اجسام کے اندر حالات کے تحت خود کفیل زندگی گزارنے کی صلاحیت بھی موجود ہوتی ہے۔ یہ طفیلیات بڑے موقع شناس ہوتے ہیں یعنی جب تک ان کو اپنے میزبان سے سامان تغذیہ ملتا ہے، حاصل کرتے رہتے ہیں اور میزبان سے علیحدہ ہوجانے پر خود کفیل ہوجاتے ہیں۔ لیکن کلی طور پر اپنے تغذیہ و رہائش کے لیے دوسرے جاندار کے سہارے کے محتاج اجسام اپنے میزبان سے الگ رہ کر اپنے آپ کو زندہ نہیں رکھ سکتے۔ کیوں کہ قدرۃً ان میں خود کفیل زندگی گزارنے کی استعداد و صلاحیت کا فقدان ہوتا ہے۔

مخصوص قسم کے طفیلیات بقاء نوع و افزائش نسل کی غرض سے مختلف میزبانوں کی تلاش میں ہوتے ہیں اور میزبان کے کسی مخصوص عضو کو اپنی جائے رہائش قرار دیتے ہیں۔ اس مقصد کی حصول یابی کے لیے کچھ طفیلیات اپنے میزبان کے ظاہری سطح جسم کو منتخب کرتے ہیں۔ اس انتخاب میں بھی اس مخصوص حصہ جسم کو اپنی جائے رہائش بنانے میں ترجیح دیتے ہیں جو ان کے لیے زیادہ مناسب اور سازگار ثابت ہوسکتا ہے۔

طفیلیات کی یہ خصوصیت ان سے پیدا ہونے والی بیشتر بیماریوں کی تشخیصی علامات سے میں ایک مخصوص علامت تصور کی جاتی ہے۔ اس طرح کی سطح جلد و زوائد جلد مثلاً بال اور ناخن پر زندگی بسر کرنے والے اجسام "خارجی طفیلیات" کہلاتے ہیں۔

اسی طرح کچھ طفیلیات ایسے ہوتے ہیں جن کی جائے رہائش کوئی نہ کوئی اندرونی عضو بدن ہوا کرتا ہے۔ جس سے ان طفیلیات کو فطری وابستگی ہوتی ہے۔ اندرونی جسم نشو و نما حاصل

کرنے والے طفیلیات کو فطری وابستگی ہوتی ہے
پھیپھڑے، جگر (LIVER) اور قنال غذائی
(ALIMENTRY CANAL) وغیرہ تک رسائی
مختلف طریقوں اور راستوں سے حاصل کرتے ہیں
اور اپنے طبعی میلان کے تحت کسی خاص عضو یا جوف
(ORGAN OR CAVITY) میں سکونت پذیر ہو جاتے
ہیں۔ ان طفیلیات کو "داخلی طفیلیات" سے
موسوم کیا جاتا ہے۔

داخلی طفیلیات میں ایک گروہ ان متعدد
حیوانات پر مشتمل ہے جو کثیر الخلیات (Multicellu-
lars) ہوتے ہیں اور اپنے تغذیہ و بقائے نسل
کے لیے قنال غذائی کے کسی خاص حصہ کو منتخب کرتے
ہیں۔ اس مخصوص گروہ میں شامل حیوانات کو
دیدان امعاء (INTESTINAL WORM) کہتے ہیں

دیدان امعاء سے متعلق معلومات زمانۂ
دراز سے احاطۂ علم انسانی میں ہیں۔ اب سے ہزاروں
سال قبل جبکہ زمانۂ تہذیب کا ابتدائی دور تھا۔ لوگ
داخلی و خارجی طفیلیات سے واقف ہو چلے تھے۔ دیدان
امعاء کی بعض اقسام کے علاوہ مکھی، پسو اور جوئیں
وغیرہ کے علم سے لوگ بخوبی واقف تھے۔ مصری طب
جو کہ قدیم ہونے کے ساتھ ساتھ اپنے دور کی ترقی
یافتہ طب سمجھی جاتی ہے۔ اس زمانہ میں ہی مصریوں
نے اپنے علمی کارناموں کو مخصوص قسم کے کاغذ پر تحریری
شکل میں منضبط کرنے کا سلسلہ شروع کر دیا تھا۔
ایبرس پیپارس (EBERS-PAPYRUS 1550 B.C.)
اسی قسم کے علمی شاہ کاروں کا ذخیرہ ہے۔ جس میں
دیدان امعاء بالخصوص دیدان شریطیہ (CESTODES)
دیدان مدینہ (GUINEA WORM) اور دیدان اسطوانیہ
(NEMATODES) اور مثلاً کیچوے (ASCARIS)
وغیرہ کا ذکر ملتا ہے۔ علاوہ ازیں مکھی اور پسو وغیرہ
کے تذکرے بھی موجود ہیں۔

بابلی اور فارسی طب کا دامن بھی ان دیدان کے
علم سے خالی نہیں۔ ان کے یہاں بھی اس سمت میں خاص
توجہ دی گئی ہے اور متعدد دیدان اسطوانیہ کا
تذکرہ قلم بند ہوا۔

علم دیدان امعاء سے متعلق معلومات کی
تشریحات و تفصیلات پر خاطر خواہ کام کرنے اور
ان کو کتابی شکل دینے کا سہرا خصوصیت کے ساتھ
یونانی حکماء و فلاسفہ کے سر ہے۔ موجد طب حکیم بقراط
(460-370 BC) نے چند دیدان کی ماہیت، ان
کے اقسام اور ان سے پیدا ہونے والی بیماریوں کی
طرف بہتر رہنمائی کی۔ حکیم ارسطو (384-322 BC)
نے دیدان شریطیہ وغیرہ کے متعلق اپنے تشخیصی و
معالجاتی نظریات پیش کیے۔

اسکندر اعظم (355-323 BC) جو کہ
ارسطو کے تلامذہ میں سے تھا، اس نے بھی دیدان
امعاء پر قابل قدر کام کیا اور متعدد دیدان کی
شکل و شباہت، ان کی جائے پیدائش وغیرہ کی
طرف رہنمائی کی۔ اس نے دیدان امعاء کو سات
مختلف قسموں میں تقسیم کیا۔ جس میں کیچوے
(ASCARIS)، حب القرع (Tapeworm)
چنچنے (Threadworms) وغیرہ کے علاوہ
چار اور کرموں کا ذکر کیا۔ ان میں سے ایک کو اس
نے چیونٹے کے مشابہ بتایا جس میں حرکت تو ہوتی ہے
لیکن چیونٹی کی طرح منہ اور پیر نہیں ہوتے۔

تاوفرسطس (370-286 B.C.) یہ
ارسطو کا بھتیجا تھا اور اس کو بھی ارسطو سے شرف
تلمذ حاصل تھا۔ اس نے دیدان شریطیہ (Tape-
worms) کا مزید تفصیلی مطالعہ کیا اور دیدان
کے علاج پر توجہ دی۔ اس نے پہلی بار دیدان کے
علاج کے لیے جوہر سرخس کا استعمال کیا۔

ہیروڈوٹس (HERODOTUS) نے ایک

کرم شکن دوا کو تلاش کیا جس کو (CENIONIN)
کہتے ہیں اور مختلف دیدان پر اس کا کامیاب استعمال
کیا۔

ابن طبری[۱] نے جملہ حیوانات کو فضائی، مائی اور ارضی
تینوں گروہوں میں تقسیم کیا اور دیدان امعاء کو ارضی
گروہ کی خسیس اقسام میں شامل کیا۔ اس نے ان
دیدان کی پیدائش کا سبب بلغم غلیظ کو قرار دیا جو
کہ حرارت غریبہ کے اثر سے تعفن اور فساد قبول
کر لیتا ہے۔ اس نے چند دوائیں اس باب میں بیان
کیں جو کیڑوں کے قتل و اخراج میں مفید ہوتی ہیں
ابن عباس مجوسی (المتوفی ۹۹۴ء) نے بھی ان
کرموں کی تولید کا سبب بلغم غلیظ و تعفن کو قرار
دیا ہے۔

شیخ الرئیس (۹۸۰ - ۱۰۳۷ء) نے
اپنی مشہور زمانہ کتاب "القانون فی الطب"
میں دیدان کا مستقل ایک باب قائم کیا اور دیدان
کو چار قسموں میں تقسیم کیا۔ اس نے کرم کی تولید کے
اسباب معدہ اور ان کی جائے رہائش و پیدائش
علامات اور اصول تشخیص و علاج وغیرہ کے متعلق جو
وضاحت و صراحت پیش کی ہے، اس سے پہلے نہیں
ملتی۔ اگرچہ شیخ الرئیس نے بھی اس حد تک کہ
تولید کرم کا سبب گاڑھا فاسد بلغم ہوتا ہے، دوسرے
پیش رو حکماء کی تقلید کی ہے۔ لیکن دوسرے مقامات
پر اس نے فساد و تعفن کے سلسلے میں اچھوتے
نظریات پیش کیے ہیں۔ اس نے تعفن کے لیے اجسام
قبلیہ، غریبہ، مناسب مادہ اور مناسب حرارت
تینوں کی موجودگی کو ناگزیر کہہ کر یہ ثابت کر دیا
کہ تعفن بغیر جسم غریب کے ناممکن ہے۔ یہی آج
کا جدید ترین نظریہ تصور کیا جاتا ہے۔

دیدان کی پیدائش کو ایک زمانہ تک
نظری خلقت (Natural Product) خیال
کیا جاتا رہا۔ اور یہ نظریہ انیسویں صدی عیسوی
کی ابتدا تک اسی طرح تسلیم کیا جاتا رہا۔ اگرچہ بعض
یونانی حکماء نے بڑی حد تک اس سے انحراف کیا
لیکن انھوں نے بھی ان کرموں کی پیدائش کو دیگر
خارجی حیوانات خسیس پر قیاس کیا۔ اور یہ کہا کہ
جس طرح بیرونی دنیا میں ماحول کی غلاظتوں اور
گندگیوں کو ختم کرنے کے لیے مختلف قسم کے کیڑے
مکوڑے پیدا ہوتے ہیں۔ اسی طرح اندرونی جسم کے
مواد فاسدہ سے جسم کو پاک کرنے کے لیے قدرت
ان کرم ہائے امعاء کی تخلیق کرتی ہے۔ روڈالفی
(Rudolphi) جو کہ ۱۷۷۱ء میں پیدا ہوا اور
بریمسر (BREMSER) جن کا شمار ماہرین طفیلیات
کی قدآور شخصیتوں میں ہوتا ہے۔ ان لوگوں نے
بھی اسی خلقت فطریہ کے نظریہ کو تسلیم کیا۔

ایک وقت آیا جب ماہر علم طفیلیات ڈاکٹر
لینیس (LINNEAUS) نے اس قدیم نظریہ سے
اختلاف کیا اور اس نے یہ خیال پیش کیا کہ ابدان
و دیگر داخلی طفیلیات کی پیدائش فطری نہیں ہوتی۔
بلکہ خارجی دنیا میں جو بکثرت اجسام موجود ہیں وہ
غذائی اجزاء کے ساتھ اتفاقیہ طور پر اندرون جسم
داخل ہو جاتے ہیں۔ جس کے سبب یہ کرم و دیگر طفیلیات
وجود میں آتے ہیں۔

فرانسسکو ریڈی (Francesco Redi) - جس کا سن پیدائش ۱۶۲۶ عیسوی
ہے۔ اس کو علم طفیلیات میں بڑی دستگاہ حاصل

۱؎ اس کی ولادت کے متعلق قدرے اختلاف ہے۔ پھر بھی یہ کہا جاتا ہے کہ ۸۰۰ء اور ۸۰۰ء کے درمیان اس کی ولادت ہوئی اور وفات ۸۵۰ء بتائی جاتی ہے

تھی اور یہ بابائے "علم طفیلیات" کے ممتاز لقب
سے علمی دنیا میں مشہور و معروف ہے۔ سترھویں
صدی عیسوی میں دیدان طوال حیات (ASCARIS)
کے بارے میں پہلی مرتبہ اس نے یہ انکشاف کیا کہ
اس کرم کے نر و مادہ الگ الگ ہوتے ہیں اور
یہ بھی بتایا کہ مادہ انڈے دیتی ہے۔

انیسویں صدی عیسوی کے نصف اول
میں متعدد نئی اقسام کرم دریافت ہوئیں جن
میں سے دیدان شعریہ (Trichinella spiralis)
کا عضلات انسانی میں سب سے پہلے پی کاک (Pea-
cock) نے ۱۸۲۸ء میں مشاہدہ کیا پھر ۱۸۴۶ء
میں لیڈی (Leidy) نے خنزیر کے گوشت
میں اس کی موجودگی کا انکشاف کیا۔ گوز (Goeze)
نے دیدان شریطیہ بقریہ و خنزیریہ (TAENIA
SAGINATA & SOLIUM) کے مختلف پہلوؤں
پر روشنی ڈالی اور ان کو طفیلیات کی فہرست میں
شامل کیا۔ ۱۸۴۳ء میں ڈوبینی (RUBINI)
(۱۸۱۳ء - ۱۹۰۲ء) نام کے رومی ڈاکٹر نے دیدان
کلابیہ (ANKYLOSTOMA) کا پتہ لگایا پھر
۱۸۹۸ء میں مصری ڈاکٹر لوس (LOOSS) نے ان
دیدان کے لاروا (LARVA) کے جسم انسانی
میں نفوذ کرنے کا راستہ متعین کیا اور اس نے
بتایا کہ اس کی لاروا (LARVA) ان مقامات
کی جلد میں نفوذ کرتے ہیں۔ جہاں کی جلد نسبتاً
نرم اور پتلی ہوتی ہے۔ مثلاً پیر کی انگلیوں کی
گھائیاں پیر کے جوانب اور کبھی کبھی ہاتھ کی انگلیوں
کی گھائیاں وغیرہ۔ دیدان پر تجرباتی و مشاہداتی
کام زیادہ تر نصف و اواخر انیسویں صدی عیسوی
میں انجام پایا۔ اسی دور میں ہربٹ (HERBST)
نے ۱۸۵۰ء میں تجربہ کے طور پر جانوروں کے اندر
دیدان شعریہ کو داخل کیا۔ ۱۸۵۱ء میں دوسرے
سائنس داں جس کا نام "KUCHENMEISTER"
تھا، اس نے اس امر کا انکشاف کیا کہ جب دیدان
شریطیہ کا عددی کتوں میں منتقل کیا گیا تو بالغ کرم
کتوں میں پیدا ہوئے۔ دو سال بعد پھر اسی نے
اس بات کی نشاندہی کی کہ خنزیر کے اندر پائے جانے
والے دیدان جو نعیبہ (CYSTICERCUS) کو
اگر جسم انسانی میں داخل کیا جاتا ہے تو کچھ عرصہ
میں انسان کے اندر یہ بالغ کرم کی شکل اختیار
کر لیتے ہیں اور ان کے قطعات (Segments)
پاخانہ میں خارج ہونا شروع ہو جاتے ہیں۔

بیسویں صدی عیسوی کی ابتدا سے
قبل BRAWN, LOOSS, LIIHE, V.SIEBOLD
وغیرہ جرمن ماہرین طفیلیات BLANCHARD
اور LAIDY وغیرہ فرانسیسی RALLIET اور
(Theobold Smith) وغیرہ امریکی سائنس
دانوں نے اپنے گرانمایہ تجربات اور انکشافات
سے علم طفیلیات میں اضافے کیے اور معلومات کا
عظیم ذخیرہ چھوڑا جو آج ہمارے لیے سرمایہ کی
حیثیت رکھتا ہے۔

بقیہ مضمون "ہنسی بھی ایک دوا ہے"

کیا ہے کہ ہنسی سانس کی رفتار کو تیز کرتی اور خون
میں سے بخارات دخانیہ (کاربن ڈائی اوکسائڈ) کی مقدار
کو کم کرتی ہے۔

یہ حقیقت ہے کہ ڈاکٹر دواؤں کے بغیر ہنسی کو تجویز
کرنے لگے ہیں۔ کیوں کہ ہنسی صحت کو واپس لانے میں بہت موثر ہے
ڈاکٹر موڈی کہتے ہیں کہ بہت سی ایسی نمایاں
مثالیں موجود ہیں جن میں مسخروں نے ذہنی ضعف اور
مالیخولیا کے مریضوں کی حالت کو جن میں بعض نے چپ
سادھ لی تھی، درست کر دیا۔ خاموش مریض
بات چیت کرنے لگے۔ انھوں نے یہ رپورٹ بھی دی کہ ان کے
دوست جیب نے ایسے مریض کو شفایاب کر دیا جس کے سر میں پھوڑے
کے سبب سے درد سر رہتا تھا۔

مرتبہ اصغر عباس
شعبۂ اردو۔ اے۔ ایم۔ یو۔

علی گڑھ مسلم یونیورسٹی میں

ہندوستانی مسلمان: انکی تعلیم اور روزگار کے مسائل

پر دو روزہ سمینار [ایک رپورٹ]

علی گڑھ مسلم یونیورسٹی میں ایک دو
روزہ سمینار ہندوستانی مسلمانوں کے مسائل ان کی
تعلیم اور روزگار کے موضوع پر ہوا۔ یہ سمینار مسلم
یونیورسٹی علی گڑھ نے بزنس اینڈ امپلائمنٹ بیورو
دہلی کے تعاون سے منعقد کیا۔

اس سمینار میں پروفیسر اخلاق الرحمن قدوائی
گورنر بہار، مرکزی وزیر باحت جناب خورشید عالم
اور اقلیتی کمیشن کے چیرمین جسٹس محمد حمید اللہ
، جناب این۔ سی۔ سکسینہ جوائنٹ سکریٹری
پلاننگ کمیشن اور جناب حکیم عبد الحمید صاحب دہلوی
ہمدرد۔ و ملک کے مختلف حصوں سے آئے
دانشوروں کی ایک بڑی تعداد شریک ہوئی۔

ہندوستان میں مسلمانوں کی تعداد کل
کا بارہ فی صد ہے۔ لیکن جب ہم ہندوستان
مسلم آبادی کے تناسب میں اس کا جائزہ لیتے
ہیں ہمیں مسلمانوں کی معاشی اور تعلیمی پسماندگی
تشویش ناک کیفیات کا اندازہ ہوتا ہے۔ ہمارے
ملک کی تیزی سے ترقی نہ کرنے کا ایک بڑا سبب یہ
بھی ہے کہ یہاں مسلمان اپنی تعلیمی پسماندگی کی بنا پر ملک
کی ترقی میں وہ حصہ نہیں لے پا رہے ہیں جو انھیں لینا
چاہیے۔ مسلمانوں کے مسائل پر یہ دوسرا سمینار
تھا جو علی گڑھ میں منعقد ہوا۔ اس طرح کے اجلاس
ملک کے دوسرے حصوں میں بھی ہوں گے اور ان کا
مقصد ہندوستانی مسلمانوں کے مسائل کا اندازہ
لگانا اور ان مسائل کو حل کرنے کی راہیں تلاش
کرنا ہے۔

سمینار کا آغاز ۵ راگست ۸۳ء کو یونیورسٹی
کے کینیڈی ہال میں تلاوت کلام پاک سے ہوا۔ حاضرین
کی تعداد تقریباً دو ہزار سے زیادہ تھی۔ افتتاحی اجلاس
کی کارروائی علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کے وائس چانسلر
جناب سید حامد صاحب کے صدارتی خطبہ سے شروع
ہوئی۔ انھوں نے سمینار کے مقاصد کا ذکر کیا
اور فرمایا کہ سمینار میں جو دانشور شریک ہو رہے
ہیں ان کی تحقیقات سے ہماری حکومت اور ملک کے
دوسرے فرقوں کا ضمیر جاگے گا اور وہ مسلمانوں کی
بے دلی کے اسباب پر غور کریں گے۔ اس سمینار کے

نتائج مسلمانوں میں ملک کی ترقی کے لیے ایک جوش اور لگن پیدا کریں گے۔ مسلمانوں کی تعلیمی اور معاشی پسماندگی کے عوامل کا ذکر کرتے ہوئے وائس چانسلر نے کہا کہ مسلمانوں کی تعلیم کی طرف عدم توجہی، طرز کہن پر اڑنا، پڑھے لکھے اور بے پڑھے لکھے مسلمانوں کے درمیان ذہنی اور نفسیاتی فاصلہ اور عدم تعاون، لیڈر شپ کا فقدان اور مسلمانوں میں غیر محفوظ ہونے کا احساس یہ وہ اسباب ہیں جن کی وجہ سے ہندوستانی مسلمانوں میں مایوسی اور بے اعتمادی کا رجحان پیدا ہوا۔ اس کے علاوہ حد سے بڑھا ہوا جذبۂ انفرادیت اور مختلف مراحل پر مسلمانوں کے مسائل کے ساتھ امتیازی سلوک یہ وہ مسائل ہیں جو فوری توجہ کے طالب ہیں جناب سید حامد نے مسلمانوں کو صلاح دی کہ وہ اپنی اخلاقی اور اصلاحی مہم میں پورے خلوص کے ساتھ حصہ لیں۔ اسلام کی تعلیم سے فیضان اور بصیرت حاصل کریں اور ملک کے دوسرے فرقوں سے مل جل کر ہندوستان کی ترقی میں دل و جان سے لگ جائیں۔

اپنے افتتاحی خطبہ میں ڈاکٹر اخلاق الرحمٰن قدوائی نے موجودہ تعلیمی نظام میں تبدیلی لانے اور جدید سائنسی نقطۂ نظر اپنانے پر زور دیا۔ ان کی رائے میں انڈر گریجویٹ سطح پر پیشہ ورانہ کورسز کھولنے سے ہندوستانیوں کی پسماندگی عام طور پر اور مسلمانوں کی خصوصی طور پر دور ہوگی۔ اس کے علاوہ تعلیمی اداروں میں تعلیمی ماحول پیدا کرنے اور مقابلے کے امتحانات میں شرکت کی طرف مسلمانوں کی توجہ مبذول کرنے سے مسلمانوں میں بے روزگاری کا مسئلہ کم پیدا ہوگا

اس سیمنار کے مہمان خصوصی جسٹس محمد حمید اللہ بیگ نے کہا کہ اگر مسلمان کڑی محنت کریں تو روزگار کی دنیا میں ان کی اہمیت تسلیم کی جائیگی

سیمنار کی کنوینر پروفیسر مسز کشور شبیر خاں نے حاضرین کو بتایا کہ علی گڑھ مسلم یونیورسٹی میں سماجی علوم کا ایک بین العلومی تحقیقاتی مرکز قائم کیا گیا ہے۔ اس مرکز کا بنیادی کام ان مسائل کی تحقیق ہے جن کے حل سے سماجی انصاف اور معاشی استحکام حاصل ہوگا۔ یہ مرکز علمی اور نظریاتی طور پر ان مسائل پر خصوصی توجہ دے گا جن کا تعلق ہمارے ملک کی موجودہ ترقی سے ہے

اقلیتی کمیشن کے جوائنٹ سکریٹری جناب این سی سکسینہ نے اپنے تحقیقی مقالے میں کہا کہ مختلف ملازمتوں میں مسلمانوں کی تعداد روز بروز کم ہوتی جارہی ہے۔ یہاں تک کہ اقلیتی تعلیمی اداروں میں بھی مسلمان غیر مسلموں سے پیچھے ہیں۔ جناب سکسینہ کی رائے میں اس کا بنیادی سبب مسلمانوں میں تعلیم کی کمی ہے لیکن ساتھ ہی امتیازی برتاؤ کی شکایت کو بھی نظر انداز نہیں کیا جاسکتا۔ انھوں نے اپنے مقالے میں زور دیا کہ بڑی تعداد میں تعلیمی اور پیشہ ورانہ ادارے کھولنے کی ضرورت ہے۔ خاص طور سے ان جگہوں پر جہاں مسلمانوں کی بڑی آبادی ہو۔ جناب سکسینہ نے کہا کہ اقلیتی اداروں کو تسلیم کرنے کے سلسلے میں عملی مشکلات کو دور کیا جائے اور مسلمانوں کی تعلیم اور روزگار کے سلسلے میں مستند اعداد و شمار اکٹھے کیے جائیں۔ ایسا کرنے سے نہ صرف یہ کہ مسلمانوں کے ساتھ امتیازی سلوک کی شکایت کا جواب دیا جا سکے گا بلکہ اس سے مسلمانوں کی ترقی کا بھی اندازہ ہوگا۔ ایسے تربیتی اداروں کو کشادہ دلی سے امداد دینی چاہیے جو اعلیٰ ملازمتوں کے لیے مسلمان طلبا کو تیار کرتے ہیں۔ مسٹر سکسینہ نے مزید کہا کہ سرکاری اداروں اور پبلک سیکٹر میں تربیت یافتہ اور غیر تربیت یافتہ ملازمین کے لیے معروضی قسم کے تحریری امتحانات ہونے

چاہییں۔ ریاستی حکومتوں، مرکزی حکومت اور دوسرے
متعلقہ اداروں کو چاہیے کہ وہ اقلیتی کمیشن کو ایسے اعداد
وشمار بھیجیں جن سے یہ پتہ چل سکے کہ ان کے یہاں اقلیتی
فرقوں کو نمائندگی کا تناسب کیا ہے۔ مئی ۱۹۸۳ء میں
وزیر اعظم مسز گاندھی نے اقلیتی فرقہ کی ترقی کے لیے
جو ہدایتیں بھیجی ہیں ان پر وزارت داخلہ کو لازمی طور
پر عمل کرنا چاہیے۔

اس سمینار میں تقریباً تیس مقالے پیش
کیے۔ سمینار کا بنیادی مقصد ان معاشی اور تعلیمی مسائل
کی نشاندہی تھا جو اکثریتی فرقہ کے مقابلہ میں مسلمانوں
کو پسماندہ بنائے ہوئے ہیں۔ اس بات پر اتفاق رائے
تھا کہ صحیح اعداد وشمار ہی سے اقلیتی فرقہ کے نقصان
اور فائدہ کا اندازہ لگایا جاسکتا ہے اور ان کے مسائل
حل کرنے کے لیے مناسب لائحہ عمل تیار کیا جاسکتا ہے۔
سمینار کے دوسرے مقالات میں مسلمانوں کی ذہنی
معاشی، تعلیمی اور سماجی پسماندگی کے محرکات کا جائزہ
اعداد وشمار کے ذریعہ لیا گیا۔ اس امر پر تمام مقالہ
نگار متفق تھے کہ آبادی کے تناسب سے مسلمان تعلیم اور
روزگار کے میدان میں پیچھے ہیں اور روزگار اور
ملازمتوں میں ان کا حصہ دن بدن کم ہوتا جارہا ہے
اس سلسلہ میں مسلمانوں کو بیدار کرنے کا ذمہ رضا
کار تنظیموں کو لینا چاہیے۔ مقالہ نگاروں نے علی گڑھ
غازی پور، رام پور، بڑودہ، بجنور، پونے، کیرالا
آندھرا پردیش کے مسلمانوں کی تعلیمی اور معاشی
زندگی کے متعلق اہم اعداد وشمار پیش کیے جو
آئندہ اس سلسلہ کی تحقیقات کے لیے بہت مفید
ہوں گے

مرکزی وزیر سیاحت جناب خورشید عالم خاں
نے اپنی اختتامی تقریر میں فرمایا کہ ہمارے دستور
میں اقلیتی فرقوں کو سماجی انصاف، مذہبی آزادی،
تعلیمی اور ثقافتی تحفظ کی ضمانت دی گئی ہے

لیکن یہ ضمانت اسی وقت کارگر ہوسکتی ہے جب کہ
اقلیت مستقل ہوشیار رہے، اکثریت کے ساتھ
اس کا رشتہ دوستانہ ہو اور حکومت یہ تہیہ کیے
ہوئے ہو کہ جو وعدے آئین میں کیے گئے ہیں وہ
بہر صورت ایفا ہوں گے۔ وزیر موصوف نے کہا کہ
ہندوستان کی اقلیتوں کو ملک کی دفاعی افواج،
پولس اور دوسری فورسز میں مناسب نمائندگی ملنی
چاہیے۔ مذہب کی بنیاد پر جو غیر مساوی سلوک روا
رکھا جاتا ہے۔ اس کا سدباب حکومت کو کرنا ہوگا۔
انھوں نے کہا کہ مسلمانوں کو خود آگے بڑھ کر ملک
کی تعمیر میں جوش، لگن اور خوش دلی سے حصہ لینا
چاہیے۔

سمینار کی تین نشستیں ہوئیں۔ آخری اجلاس میں
یہ تجویزیں منظور ہوئیں:

- ★ سرکاری اور غیر سرکاری سائنسی اور
تکنیکی اداروں میں مسلمانوں کی تعلیم کی طرف
سنجیدگی سے توجہ دی جائے۔
- ★ علی گڑھ مسلم یونیورسٹی میں پیٹرو کیمیکل
انسٹی ٹیوٹ کے قیام کی تجویز پر فوری عمل کی
ضرورت ہے
- ★ ابتدائی سطح پر ہی نوجوانوں کے لیے ملازمتوں
کے سلسلے میں گائڈنس سروسز کا انتظام ہونا
چاہیے۔
- ★ اقلیتی کمیشن کو ایسے اعداد وشمار جمع کرنے
چاہییں جن سے ارباب حکومت کو اقلیتی
فرقہ کے مستقبل کو بہتر بنانے کی تدبیروں
میں مدد ملے اور رائے عامہ بھی اقلیتی فرقوں
کے حق میں ہموار ہوسکے۔

اس سمینار میں یہ سفارش بھی کی گئی کہ علی گڑھ
مسلم یونیورسٹی اور بزنس اینڈ امپلائمنٹ بیورو

باقی صفحہ نمبر ۲۳ پر

خواجہ الطاف حسین حالی

سرسید کے دو مضمون

تحقیق لفظ نصاریٰ۔

سرسید مرادآباد ہی میں تھے کہ ان کو معلوم ہوا کہ بعض اضلاع میں مسلمانوں کی بعض تحریریں ایام غدر کی ایسی پیش ہوئی جن میں انگریزوں کو لفظ نصاریٰ سے تعبیر کیا تھا۔ حکام نے اس لفظ کو بھی بغاوت کا لفظ سمجھا اور ان کے لکھنے والوں کو وہ سزائیں دی گئیں جو ان کی قسمت میں لکھی تھیں۔ اس وقت جیسا کہ سرسید نے لکھا ہے، مسلمانوں کی ہر ایک بات برے پہلو پر ڈھالی جاتی تھی۔ انگریزوں نے بعض مسلمانوں کی تحریروں میں اپنی نسبت نصاریٰ کا لفظ دیکھا تو یہ خیال کیا کہ جس طرح یہودی حضرت عیسیٰؑ کو حقارت سے ناصری (یعنی قریۂ ناصرہ کا رہنے والا) کہتے تھے، اسی طرح مسلمانوں نے انگریزوں کو نصاریٰ کے لفظ سے یاد کیا ہے۔

سرسید نے اس غلطی کو رفع کرنے کو فوراً مختصر رسالہ تحقیق لفظ نصاریٰ میں لکھا اور اس کو اردو اور انگریزی میں چھپوا کر حکام اور گورنمنٹ کو اس کے مضمون سے مطلع کیا۔ ہم کو اس کتاب کے لکھتے وقت وہ رسالہ دستیاب نہیں ہوا۔ مگر جو کچھ سرسید نے زبانی بیان کیا اس کا خلاصہ یہ ہے کہ نصاریٰ کا لفظ ناصرہ سے مشتق نہیں بلکہ نصر سے مشتق ہے اور مسلمان اس وجہ سے کہ قرآن سے ایسا ہی ثابت ہوتا ہے اس کو نصر سے مشتق سمجھتے ہیں، نہ ناصرہ سے کیوں کہ قرآن میں صاف آیا ہے کہ جب حضرت عیسیٰ نے کہا من انصاری الی اللہ تو حواریوں نے کہا "نحن انصار اللہ" اور اسی لیے حواریوں کی پیروی کرنے والوں اور عیسیٰؑ پر ایمان لانے والوں کو اسی صفت کے ساتھ جس کی حواریوں نے حامی بھری تھی، موصوف کیا گیا ہے اور ان پر نصاریٰ کا اطلاق کیا گیا ہے۔ قرآن میں کہیں قریہ ناصرہ کا ذکر نہیں آیا اور نہ کہیں حضرت عیسیٰ کو ناصری کہا گیا ہے۔ اس کے سوا قرآن سے صاف ظاہر ہوتا ہے کہ عیسائی آنحضرت کے زمانے میں خود اپنے تئیں نصاریٰ کہتے تھے جیسا کہ سورۃ مائدہ کی اس آیت میں بیان ہوا ہے۔ ولتجدن اقربہم مودۃ للذین آمنوا الذین قالوا انا نصاریٰ (یعنی محمد تو پائے گا اہل کتاب میں سب سے زیادہ مسلمانوں کا دوست ان کو جن کا قول ہے کہ ہم نصاریٰ ہیں)

جہاں تک کہ معلوم ہوا ہے کہ اس رسالہ کی اشاعت کے بعد پھر کسی سے اس لفظ پر مواخذہ نہیں ہوا۔ ہم نے سنا ہے کہ جب یہ رسالہ شائع ہوا تو کسی اخبار میں یہ لکھا گیا تھا کہ سید احمد خاں کا بیان غلط ہے۔ کیونکہ کسی شخص کو نصاریٰ کا لفظ کہنے پر سزا نہیں ہوئی۔ اس پر ایک معزز یورپین افسر نے اس کا جواب دیا اور یہ لکھا کہ خود ہمارے سامنے ایک شخص کو اسی جرم میں کانپور میں پھانسی دی گئی۔

انتظام قحط ضلع مرادآباد

۱۸۶۰ء میں جب کہ اضلاع شمال مغربی میں ایک

عام قحط پڑا تھا، اس وقت سرسید مراد آباد میں
صدر الصدور تھے۔ مسٹر جان اسٹریچی نے، جو اس وقت
وہاں کلکٹر تھے، اپنے ضلع کے قحط کا انتظام سرسید کے
سپرد کر دیا تھا۔ اس موقع پر قطع نظر لیاقت اور سلیقۂ
انتظام کے جو انسانی ہمدردی سرسید سے ظہور میں آئی،
وہ ہندوستانیوں کے لیے ایک عمدہ مثال ہے۔ سرسید کے
ایک قدیم دوست خود مراد آباد کے رہنے والے جو اس
وقت وہاں ملازم تھے، ان کا خیال ہے کہ سید احمد خاں
کو جو اس قدر عزت اور نیک نامی تمام ہندوستان میں
حاصل ہوئی، یہ اسی بھلائی کا اور نیکی کا ثمرہ ہے جو قحط
کے انتظام میں ان سے ظاہر ہوئی۔

محتاج خانہ کے حسنِ انتظام کا یہ حال تھا کہ
دو ہزار محتاجوں کو گھنٹہ بھر میں کھانا تقسیم ہو جاتا تھا
بیماروں کے لیے شفاخانہ اور ڈاکٹر موجود تھا، بیماروں
کو پرہیزی کھانا ملتا تھا۔ زچاؤں اور شیر خوار بچوں
کو دودھ یا کھیر ملتی تھی۔ مسلمانوں کے لیے مسلمان اور
ہندوؤں کے لیے ہندو کھانا پکاتے تھے۔ ہندو اپنے
قوم کے سوا کسی کے ہاتھ کا پکا ہوا کھانا نہیں کھاتے
تھے، ان کے لیے علیحدہ چوکے بنے ہوئے تھے۔ شہر کی
پردہ نشین اور عزت دار عورتیں جو محتاج خانہ میں
نہیں آ سکتی تھیں، ان کے پاس سوت کاتنے کے لیے
ڈیڑھ آنہ فی اسم اور ایک ایک پٹاری روئی کے گالوں
کی میر محلہ کی معرفت بھیج دی جاتی تھی۔ جب سوت کت کر
آ جاتا تھا تو اور روئی اور کاتنے کی اجرت بھیج دیتے
تھے۔ سرسید کے مراد آبادی دوست بیان کرتے ہیں
کہ اس زمانہ کی عورتیں جو اب تک جیتی ہیں وہ سید
احمد خاں کو اب تک دعائیں دیتی ہیں۔

سرسید صبح شام دونوں وقت بلاناغہ
محتاج خانہ میں خود جاتے تھے۔ ایک ایک بیمار کو دیکھتے
تھے، جن کنگالوں کی صورت اور حالت آنکھ سے دیکھی
نہ جا سکتی تھی، جن کے دست جاری ہوتے تھے اور
کپڑے بول و براز میں لتھڑے ہوئے ہوتے تھے، ان کو
سرسید اپنی گود میں اٹھا کر دوسری صاف جگہ احتیاط
سے جا کر لٹا دیتے تھے۔ ان کے کپڑے بدلواتے تھے
سر منڈواتے تھے، ہاتھ منہ دھلواتے تھے، دوا پلواتے
تھے، اور نہایت شفقت سے ان کے ساتھ پیش آتے
تھے۔ راجہ جے کشن داس صاحب سی۔ ایس۔ آئی جو
آخر کو سرسید کے گہرے دوست ہو گئے، اس وقت
تک ان سے ملاقات نہ تھی، ان کا بیان ہے کہ

"جب سرسید نے رسالہ 'لائل محمڈنز آف انڈیا'
نکالنا شروع کیا تو اس کے بعض فقروں
سے مجھے خیال ہوا کہ سید احمد خاں نہایت
متعصب آدمی ہیں اور ہندوؤں سے ان
کو کچھ ہمدردی نہیں ہے۔ اس وقت میرا
مصمم ارادہ ہو گیا تھا کہ اسی طرح ایک رسالہ
ہندو خیر خواہوں کے تذکرے میں نکالا جائے
انھیں دنوں مراد آباد میں میرا جانا ہوا
محتاج خانہ راہ میں پڑتا تھا، وہاں سرسید
سے مڈ بھیڑ ہو گئی۔ میں نے ان فقروں کا
ذکر کیا جن سے ان کے تعصب کا خیال ہوا
تھا۔ انھوں نے معذرت کی اور اپنے قلم
کی لغزش کا اقرار کیا۔ خیر یہ تو ایک اخلاقی
جواب تھا مگر جس شفقت اور ہمدردی سے
وہ اس وقت ہر مذہب اور ہر قوم کے
محتاجوں کے ساتھ پیش آ رہے تھے، اس
کو دیکھ کر میرا دل بالکل صاف ہو گیا اور
مجھے حیرت ہو گئی کہ یہ شخص کیسی پاک طبیعت کا
آدمی ہے؟ وہ دن ہے اور آج کا دن
ان کے ساتھ میری محبت روز بروز بڑھتی
گئی اور اب جو کچھ میرا اور ان کا معاملہ ہے
وہ سب پر ظاہر ہے۔"

محتاج خانہ میں شام کا کھانا سب محتاجوں کو دن

چھننے سے پہلے بٹ جاتا تھا۔ مگر جو بھلے مانس علانیہ محتاج
خانہ میں آنے سے شرماتے تھے، ان کو عام اجازت تھی
کہ رات کے اندھیرے میں آکر کھانا کھا جایا کریں۔ محتاجوں
کے کھانے کے لیے ہر ایک جنس عمدہ اوّل درجہ کی منگوائی
جاتی تھی۔ کھانے کے سوا ان کے لیے ضروری کپڑا بھی
تیار کیا جاتا تھا۔

باوجود ایسے اچھے انتظام کے جس قدر کم روپیہ
ضلع مرادآباد میں خرچ ہوا، ایسا کسی ضلع میں نہیں ہوا
سبب یہ تھا کہ جتنے آدمی عورت اور مرد محتاج خانے میں
کام کے لائق تھے، سب سے کام لیا جاتا تھا۔ بان اور
رسیاں بٹتے تھے، سوت کاتتے تھے، سڑکوں پر کام کرتے
تھے اور طرح طرح کے جو کام جو ان سے ہو سکتے تھے کرتے
تھے اور اس طرح ان کے کام کی اجرت سے ہر روز ایک
رقم کثیر جمع ہو جاتی تھی جو محتاج خانے میں صرف ہوتی تھی

محتاج خانہ کے علاوہ خود سرسید اپنی ذات
سے اور نیز ان کی نیک بی بی جو ان سے بھی زیادہ خدا
ترس تھیں، غریبوں اور محتاجوں کی خبرگیری کرتے تھے
ان کے مکان پر ہر روز ایک دیگ سالن کی اور روٹیاں
محتاجوں کو تقسیم ہوتی تھیں۔

جب اس محتاج خانہ کی رپورٹ اسٹریچی صاحب
نے گورنمنٹ میں بھیجی تو یہ انتظام ایسا پسند آیا کہ اور
اضلاع کے حکام کو بھی ایسا ہی انتظام کرنے کی ہدایت
ہوئی اور اسٹریچی صاحب کا نہایت شکریہ اور تعریف
کی گئی۔ مگر اسٹریچی صاحب نے صاف لکھ بھیجا کہ یہ تمام
کارروائی سید احمد خاں سب جج نے کی ہے۔ اگر شکریہ
اور تعریف کا مستحق ہے تو سید احمد خاں ہے۔

سرسید کو جب اسٹریچی صاحب نے قحط کا
انتظام سپرد کیا تھا تو سرسید نے صاف کہہ دیا تھا
کہ میں اس شرط پر انتظام کرتا ہوں کہ جتنے لاوارث
بچے آئیں گے ان میں جتنے مسلمان ہوں گے وہ مسلمانوں
کو اور جتنے ہندو ہوں گے وہ ہندوؤں کو سپرد
کیے جائیں گے۔ چنانچہ انھوں نے ایسا ہی کیا۔ جتنے لا
بچے آئے وہ ہندو مسلمانوں کے سوا کسی مشنری
نہیں لینے دیے۔ مگر جب ہدایت اسٹریچی صاحب
جو بچے جن کے سپرد کرتے تھے اس سے ایک اقرارنا
لکھوا لیتے تھے کہ ہم اس کو لونڈی یا غلام نہیں بنا
کے۔ ہوشیار ہونے کے بعد جہاں اس کا جی چاہے
اور جہاں چاہے چلا جائے۔

لیکن ہنوز قحط کا انتظام ختم نہیں ہو
پایا تھا کہ جان اسٹریچی مرادآباد سے بدل گئے اور
مسٹر پاور ان کی جگہ آئے۔ مشنریوں نے اسٹریچی صا
کے سامنے تو دم نہیں مارا مگر ان کے جاتے ہی مسٹر
پاور سے سرسید کی شکایت کی اور چاہا کہ تمام لاو
بچے جو ہندو مسلمانوں کو دیے گئے تھے وہ واپس
جائیں۔ اس زمانہ میں مسٹر الگزینڈر شکسپیر جو سرسید
کے نہایت دوست تھے مرادآباد میں جج تھے انھو
نے ہر چند سرسید کو سمجھایا کہ جتنے لڑکے اور لڑکیا
خاص تمہارے سپرد کی گئی ہیں وہ تم سے نہیں لی
گی مگر اور لوگوں پر اعتماد نہیں ہو سکتا کہ وہ ان
لونڈی غلام نہ بنائیں گے مگر سرسید نے ہرگز نہ ما
اور یہ کہا کہ

"میں نے اسی شرط پر قحط کا انتظام اپنے ذمہ
لیا تھا کہ لاوارث بچے مشنریوں کو نہیں
دیے جائیں گے اور اسٹریچی صاحب گورنمنٹ
میں رپورٹ کر چکے ہیں کہ لاوارث بچوں کا
اس طرح بندوبست کیا گیا ہے پس اس کے
خلاف کیوں کر ہو سکتا ہے۔ مجھے جس طرح
یہ گوارا نہیں کہ ایک سید کا بچہ مشنریوں
کو دیا جائے، اسی طرح یہ بھی گوارا نہیں کہ
ایک چمار کا بچہ ان کو دیا جائے۔"

مسٹر پاور کو جب سرسید کی ناراضگی کا حال معلوم
ہوا تو انھوں نے اس معاملہ پر غور کرنے کے لیے کمیٹی

باقی صفحہ نمبر ۲۳ پر

تاثرات

مسلم پرسنل لا

علمائے اسلام نے متفقہ طور پر چند سال ہوئے حکومت ہند سے درخواست کی تھی کہ اسلام کے پرسنل لا میں حکومت مداخلت نہ کرے اور جو بھی ایسا قانون بنے جس کا اثر اسلام کے پرسنل لا پر پڑتا ہو، حکومت اس قانون کے نفاذ سے مسلمانوں کو مستثنیٰ قرار دے۔ چنانچہ گزشتہ آٹھ دس سال کے دوران پارلیمنٹ میں جب بھی ایسے قانون کا مسودہ پیش ہوا جس سے مسلمانوں کا پرسنل لا متاثر ہوتا ہو، علمائے اسلام نے متفقہ طور پر اس کے خلاف آواز اٹھائی۔ حال ہی میں لے پالک کے بارے میں قانون کا ایک مسودہ پارلیمنٹ میں پیش ہوا تو مسلمانوں نے پھر احتجاج کیا۔ خوشی کی بات ہے کہ حکومت نے دور اندیشی کا ثبوت دیا اور اعلان کر دیا کہ ایسا کوئی قانون نہ بنے گا جو مسلمانوں کو قبول نہ ہو اور ان کو ایک بار پھر یقین دلایا کہ ان کے پرسنل لا میں کسی قسم کی مداخلت کا حکومت ارادہ نہیں رکھتی۔

علمائے اسلام کا کسی مسئلہ میں اتحاد ایک بڑے تعجب کی بات ہے۔ یہ اتحاد برابر قائم ہے یہ اور بھی تعجب کی بات ہے۔ اور ہمیں خوشی ہے کہ ہمارے علماء متحد ہیں اور کوئی اس اتحاد کو توڑنے میں ابھی تک کامیاب نہیں ہوا۔ ہم اس اتحاد کو مسلمانوں کی معاشرتی زندگی میں ایک نیک فالی خیال کرتے ہیں اور اس کو کمزور کرنے کے کسی اقدام کی حمایت کرنا پسند نہیں کرتے۔ حکومت گو مسلمانوں کے جذبات کا احترام کر رہی ہے۔ اور ان کو یقین دلا رہی ہے کہ ان کے پرسنل لا میں کسی قسم کی مداخلت نہیں کی جائے گی۔ لیکن بعض لوگ ایسی فضا پیدا کرنا چاہتے ہیں جس سے علمائے اسلام کا مطالبہ کمزور ہو جائے اور پارلیمنٹ کو مسلمانوں کے پرسنل لا میں مداخلت کا موقع مل جائے۔ مسلمانوں کا خیال ہے کہ اس قسم کی کوششیں حکومت کے اشارہ پر ہو رہی ہیں اور حکومت مسلم پرسنل لا میں مداخلت کے لیے موقع کی منتظر ہے۔

ہماری رائے میں جمہوری حکومت کو ہر قومیت اور ہر فرقہ کو اس کی تہذیب اور سماجی روایات کے تحفظ کے بارے میں مطمئن کرنا چاہیے۔ اگر ایسا ہوگا تو پورے ملک میں یکجہتی اور بھائی چارے کی فضا پیدا ہو جائے گی اور ہر قسم کی غلط فہمیاں رفع ہو جائیں گی۔

حال ہی میں ایک انگریزی کے روزنامہ میں پہلی بار ایک ادارہ بیت الحکمۃ دہلی کا نام دیکھا۔ اس ادارہ کے تحت ایک مجلس مذاکرہ منعقد ہوئی اور اس میں عورتوں کے حقوق اور آزادی کے بارے میں بعض مسائل پر بحث ہوئی۔ اخبار میں مختصر خبر تھی۔ کسی کا نام نہیں دیا گیا تھا۔ اخبار میں ضروری تفصیلات بھی نہ تھیں پھر اردو کے اخبارات سے کچھ تفصیلات معلوم ہو گئیں

بڑی خواہش تھی کہ مکمل رپورٹ ملے لیکن وہ حاصل نہ ہوسکی۔ چند روز بعد مجلس مذاکرہ کی کارروائی پر اخبارات میں جو تبصرہ ہوا، اس پر ایک بیان بیت الحکمت کی طرف سے موصول ہوا۔ افسوس ہے کہ وہ ہم شائع کرنے سے قاصر ہیں۔ ہمارا خیال ہے کہ اگر عورتوں کے مسائل کے بارے میں اصحاب بیت الحکمت واقعی کوئی مثبت قدم اٹھانا چاہتے ہیں تو وہ علماء سے گفتگو کریں۔ ہوسکتا ہے کہ گفتگو سے بھی کوئی نتیجہ برآمد نہ ہو لیکن مجلس مذاکرہ منعقد کرنے سے تو یہ مسائل کسی طرح حل ہو ہی نہیں سکتے بلکہ غلط فہمیاں پیدا ہوتی ہیں اور انتشار بڑھتا ہے۔ نکاح اور طلاق کے مسائل تو حل ہونے ہی چاہئیں۔ لیکن کیا کریں کس کس مسئلہ کے حل کی آرزو رکھیں اور کس کس کی حق تلفی پر آنسو بہائیں؟ جہاں کسی کے حقوق کا تحفظ ہی نہ ہو وہاں بیچاری عورتوں کے حقوق کا تحفظ کون کرے گا؟ اسلام عدل و انصاف کا علم بردار ہے اور کسی کو کسی کی حق تلفی کی اجازت نہیں دیتا۔ ایک مطلقہ کے حقوق کا کیا کہا جائے یہاں تو سہاگنوں کے حقوق کی ہر روز پامالی ہوتی ہے اور ہمارے ملک کی نصف آبادی کے قریب افلاس زدہ اور نان شبینہ سے محتاج ہے۔ طلاق سے تو عورتیں بے سہارا ہوتی ہیں۔ ان کا مسئلہ تو ضرور اہم ہے لیکن ان افلاس زدہ گھروں کے مردوں اور عورتوں کا کون سہارا ہے جو ہزاروں نہیں لاکھوں کی تعداد میں ملک میں ہیں۔

مسلم یونیورسٹی پر ڈاکومنٹری فلم

مجاز لکھنوی مرحوم نے غالباً ۱۹۳۳ء میں جب وہ مسلم یونیورسٹی میں پڑھتے تھے، ایک غزل نما نظم کہی تھی۔ اس میں اپنی مادر درس گاہ کے بارے میں گہری محبت اور تعلق خاطر کا اظہار کیا گیا۔ ان اشعار کی طرف اشتیاق محمد خاں صاحب کی توجہ ہوگئی — ان کو گانے سے گہری دلچسپی ہے اور وہ موسیقی کے رموز سے آگاہ ہیں۔ ڈاکٹر ذاکر حسین خاں صاحب مرحوم وائس چانسلر تھے۔ اشتیاق صاحب اسکول میں ٹیچر تھے اور ذاکر صاحب کے ہم وطن تھے۔ اشتیاق صاحب نے مجاز کے ان اشعار کو مسلم یونیورسٹی کے ترانے کی حیثیت سے تقریبات کے موقع پر گائے جانے کی تجویز پیش کی۔ ذاکر صاحب کو پسند آئی۔ انھوں نے اشتیاق صاحب کو ضروری تیاری کی ہدایت کی۔ جب یہ اشعار چند طالب علموں نے مل کر گائے تو ذاکر صاحب کو مسلم یونیورسٹی کے لیے یہ ترانہ پسند آگیا۔ آہستہ آہستہ طلبا نے بھی اس ترانے کو قبول کرلیا۔ اور اب یونیورسٹی کی کوئی تقریب ایسی نہیں ہوتی جہاں یہ ترانہ گایا نہ جاتا ہو۔

چند ماہ ہوئے اشتیاق صاحب علی گڑھ آئے تو پھر پرانی یادیں تازہ ہوگئیں۔ ان سے ان کے دوستوں نے چند بار میر و غالب، داغ و جگر اور دوسرے شعراء کی غزلیں سنیں۔ اشتیاق صاحب نے طلبا سے یونیورسٹی کا ترانہ سنا تو بڑے آزردہ خاطر ہوئے اور کہنے لگے کہ جس انداز سے میں نے یہ ترانہ گایا تھا وہ انھوں نے ترک کردیا ہے۔ چنانچہ اس کی انھوں نے اصلاح کی اور ترانہ گانے والے گروہ نے ان کی اصلاح قبول کی۔

اسی دوران ترانہ کی ڈاکومنٹری فلم بنانے کی تجویز، جو زیر غور تھی، عمل درآمد شروع ہوگیا۔ چند ماہ بعد شوٹنگ شروع ہوئی اور یونیورسٹی کی فضا

"یہ میرا چمن ہے میرا چمن"

کی دل دوز آواز سے گرما گئی اور پھر سنا

"جو طاق حرم میں روشن ہے وہ شمع یہاں بھی جلتی ہے
اس دشت کے گوشہ گوشہ سے اک جوئے حیات ابلتی ہے"

پھر فلم سازی شروع ہوئی اور ایک روز ختم ہوگئی

طلبا سب پڑھنے لکھنے اور امتحان کی تیاری میں مصروف ہوگئے اور بات آئی گئی ہوگئی۔

ایک روز سنا کہ دہلی میں مسلم یونیورسٹی پر فلم ریلیز ہوگئی ہے۔ ہفتہ عشرہ بعد کسی نے یکایک السلام علیکم کہا۔ دیکھا تو اشتیاق صاحب مسکراتے ہوئے چلے آرہے ہیں۔ بس ایک بار پھر وہی

"میرا چمن ہے میرا چمن"

کی دل فگار آواز یونیورسٹی میں گونج اٹھی۔ پھر کینیڈی ہال کے پردہ پر یونیورسٹی کا گوشہ گوشہ نظروں کے سامنے آگیا۔

سیّد ملت کی بنائی ہوئی وہ عمارت بھی جو گرمیوں کی دھوپ میں کھڑے ہوکر بنوائی گئی تھی۔ اور وہ عمارتیں بھی دیکھیں جو مغرب کی نقالی کا نتیجہ ہیں۔ لائبریری میں طلبا کو مطالعہ میں مصروف بھی دیکھا۔ جمنازیم میں لڑکوں کو ورزش کرتے ہوئے بھی پایا۔ تالاب میں تیرتے ہوئے دیکھا۔ ہندو طلبا کو دیکھا اور سکھ طلبا کو۔ سماجی علوم کی درسگاہ بھی دیکھی اور سائنس کے معملوں کو بھی دیکھا۔ لڑکیوں کے کالج کو بھی دیکھا اسکول کو بھی۔ انجینرنگ کالج کو بھی دیکھا اور میڈیکل کالج کو بھی۔ مختصر یہ کہ گوشہ گوشہ کو دیکھ لیا اور اس درسگاہ کے پرانے طلبا کو بھی دیکھا۔ ان کو بھی جو بخیر و عافیت ہیں اور ان کو بھی جن کی آواز ملک کے ہر گوشہ تک پہنچی تھی محمد علی اور شیخ محمد عبداللہ۔

فلم کو اشتیاق محمد خاں نے ہی ڈائرکٹ کیا تھا اور سنٹرل یونیورسٹی کے اولڈ بوائز کے لئے مشہور شاعر سردار جعفری صاحب نے [illegible]۔ یہ فلم ملک کی سب زبانوں میں اور ملک کے ہر شہر میں دکھائی جا رہی ہے۔

ق۔م۔ا۔

بقیہ مضمون۔ سرسید کے دو مضمون

اور ہندوستانیوں کی ایک کمیٹی مقرر کی۔ چوں کہ اس زمانہ میں ہندوستانی حد سے زیادہ ڈرے ہوئے اور سہمے ہوئے تھے اور انگریزوں کے خلاف کوئی کچھ نہیں کہہ سکتا تھا۔ سرسیّد اور ایک دو اور ممبروں کے سوا تمام کمیٹی کا اتفاق ہوگیا کہ جتنے بچے ہندو مسلمانوں کے سپرد کیے گئے ہیں وہ واپس لیے جائیں کیوں کہ ان پر ہرگز اعتماد نہیں کہ وہ ان کو لونڈی غلام نہیں بنائیں گے۔ آخر کار کمیٹی کی یہ رپورٹ منظور ہوگئی اور تمام لاوارث بچے ہندو مسلمانوں سے واپس لے کر مشنریوں کو دلوا دیے گئے۔ سرسیّد کے ہاں بھی پانچ چار لڑکے لڑکیاں رہتی تھیں اور ان کی بی بی ان کو کمال شفقت سے رکھتی تھیں۔ سرسیّد نے پہلے اس کے کہ کوئی ان سے مانگنے آئے فوراً ان کو کلکٹر کے پاس بھیج دیا۔ جاتے ہوئے وہ بچے زار و قطار روتے تھے اور ہرگز جانا نہیں چاہتے تھے۔ مگر مجبوراً ان کو بھیجنا پڑا۔

سرسیّد کہتے تھے کہ اس وقت میرا مصمم ارادہ ہوگیا تھا کہ جب کبھی موقع ملے تمام ہندو مسلمانوں سے چندہ کرکے کسی صدر مقام میں ایک بہت بڑا یتیم خانہ قائم کیا جائے جہاں ہندوستان کے لاوارث بچوں کی پرورش ہو اور ان کو تعلیم دی جائے۔ لیکن آخر کو یقین ہوگیا کہ جب تک ہندوستان میں تعلیم عام نہ ہوگی ان خرابیوں کا کلی انسداد کسی طرح نہیں ہوسکتا۔

(ماخوذ از حیات جاوید۔)

بقیہ۔ "ہندوستانی مسلمان:"

کے تعاون سے ایک ایسا یونٹ علی گڑھ میں قائم کیا جائے جس کا مقصد صحیح اعداد و شمار اکٹھا کرنا ہو تاکہ ان سے مسلمانوں کی ذہنی اور معاشی پسماندگی دور کرنے کے پروگرام میں مدد ملے۔

ہنسی بھی ایک دوا ہے

قہقہہ متعدی چیز ہے، اگر آپ اتنے خوش قسمت ہیں کہ اس کی چھوت آپ کو لگ جاتی ہے تو پھر آپ نہایت صحت مند اور پر کیف زندگی کی توقع کر سکتے ہیں۔

آپ نے کب آخری مرتبہ دل کھول کر اور پیٹ پکڑ کر قہقہے لگائے ہیں؟ یعنی اس طرح کی ہنسی ہنسے ہیں جس سے آپ کے سارے جسم میں بھونچال آگیا ہو اور آپ نے ایک منٹ کے لیے اپنے آپ کو کرسی کی پشت پر پھینک دیا ہو اور پھر دہرے ہوگئے ہوں۔ آپ کے ادپر اٹھے اور کھلے ہوئے منھ سے فلک شگاف آوازیں بے تحاشہ بلند ہو رہی ہوں، گوشہ ہائے چشم سے آنسو بہ نکلے ہوں اور آپ نے پیٹ اور پسلیوں کو درد کے مارے بازوؤں سے بھینچ لیا ہو۔ اسی حالت میں تنے ہوئے عضلات ڈھیلے ہوگئے ہوں۔ یہاں تک کہ لطف کے عروج کی حالت میں آپ کے اندر مٹھی باندھنے کی بھی سکت نہ رہی ہو۔

اگر آپ پر اکثر یہ بے ڈھب کیفیت طاری ہو جاتی ہے تو پھر اپنے آپ کو خوش نصیب تصور فرمایئے ہنسی مذاق نہیں بلکہ ایک سنجیدہ فعل اور اہم دوا ہے۔ اس کی حقیقت و اہمیت کا انکشاف حال ہی میں ہوا ہے۔ اگرچہ ڈاکٹر طویل عرصہ سے یہ قیاس کرتے چلے آئے ہیں کہ ہنسی جسم کے علاوہ دماغ کی بھی اچھی دوا ہے۔

۱۹۴۲ء میں فارسٹ بوراڈ نے لکھا تھا کہ قہقہہ دوران خون میں مدد دیتا ہے شکم کے عضلات کی مالش کرتا اشتہا کو چمکاتا اور بلند فشار خون کو پست کرتا ہے رجائیت (خوش امیدی) اور خود اعتمادی کو ابھارتا اور حزن و قنوطیت (یاس پمردری) کو پس پا کر دیتا ہے لیکن جب سے نارمن کزنس نے جو طویل عرصے تک "سیٹر ڈے ریویو" کے ایڈیٹر رہے ہیں، قہقہہ لگانے اور حیاتین ج کے استعمال سے اپنے آپ کو ایک مہلک بیماری سے نجات دلائی ہے تو قہقہہ کی شفا بخشی کی طاقت سے ان کی دلچسپی بڑھ گئی۔

اگرچہ بہت سے مواقع ایسے پیش آتے ہیں کہ آپ بے اختیار ہنس پڑتے ہیں، لیکن ہر ہنسی میں یہ خاصہ نہیں ہوتا۔ یہ بات ڈاکٹر ہنری اولسن نے کہی ہے۔

میری لینڈ کے ماہر نفسیات ڈاکٹر ولسن کہتے ہیں کہ علاج کی غرض سے مزاح اور مذاق کو دل آزار ہونے کے بجائے دل آسا اور روح پرور ہونا چاہیئے۔ طنز و تعریض کا ہنسی مذاق دوسروں

کی قیمت پر اپنے آپ کو 'سہلانا' خود بینی وخود آرائی ہے
حقیقت یہ ہے کہ آپ کیوں ہنستے ہیں' یہ
بات اتنی ہی اہم ہے جتنی یہ بات کہ کیسے ہنستے ہیں۔
"تمسخر اور چیز ہے اور علاج ہنسی دوسری شے ہے"
اس کی تشریح میں ڈاکٹر اولسن کہتے ہیں کہ ہنسی
مذاق کے تین درجات یا اقسام ہیں۔ طنز ان میں
سے ایک ہے۔ یہ تخریب پر مبنی ہوتا ہے۔ دوسری
قسم ہے ذومعنی لفظ کے مزاحیہ استعمال سے لطیفہ
پیدا کرنا یا ایسے 'الفاظ' کا استعمال جو تلفظ میں یکساں
ہو لیکن معنی میں مختلف (ضلع جگت) اس میں مثبت
خاصیت ہوتی ہے۔ اسی طرح ایک تیسری قسم ہے
عام مسخرگی، یعنی الٹی بات کی تحسین یعنی وہ بات
جو کسی مسلم خیال کے خلاف ہو یا ایسی بات جو بظاہر
مہمل معلوم ہوتی ہو، لیکن دراصل صحیح ہو یا وہ
بات جو زندگی کے مہملات کی تحسین پر مبنی ہو جو اس
قسم کا مسخرہ ہو، اس میں لوک اور سماجی ہوتی ہے
اور وہ ایسے اقدام کی صلاحیت رکھتا ہے جس کو
زندگی مسترد کرتی ہے۔ ڈاکٹر اولسن کہتے ہیں
"میں اس تیسری قسم کے مذاق کو پسند کرتا ہوں"
یہی رائے ریمنڈ موڈی کی ہے۔ جو کتاب "ہنسی پر
ہنسی" (LAUGH AFTER LAUGH) کے مصنف
ہیں۔

مسٹر موڈی کہتے ہیں کہ
"عام مذاق کا شعور رکھنے والا شخص دنیا
میں اپنے آپ اور دوسروں کو فاصلے سے
دیکھتا ہے۔ ایسے شخص کو زندگی کے تمسخر
کے ساتھ دیکھنے کی ایسی صلاحیت ہوتی
ہے، جس سے نہ اس کی اپنی محبت
یا عزت مجروح ہو، نہ عام انسانیت
کی۔"

زندگی کو بڑی اہمیت نہ دو۔

بیمار افراد خاص طور پر وہ لوگ یاسیت
کے شکار ہوتے ہیں، اس حالت پر بہت زیادہ فکرمند
ہوتے ہیں۔ ڈاکٹر اولسن کہتے ہیں "اکثر لوگوں کو مسائل
درپیش ہوتے رہتے ہیں، لیکن ایک شخص کے ادراک
واحساس سے ان کی مدت طویل یا مختصر ہوتی ہے۔ ہر
شخص کو منفی یا مثبت احساسات سے واسطہ پڑتا
رہتا ہے تو پھر مثبت پر کیوں نہ توجہ مرکوز کی جائے
یہ بات آپ کے انتخاب پر موقوف ہے
اگر آپ ہوشمند اور خوش فہم ہیں تو مثبت کا
انتخاب کریں گے۔ کیونکہ اگر منفی جذبات جیسے خوف
نفرت اور غصہ جسم کی مرض کے خلاف قدرتی مدافعتوں کو
کمزور کر سکتے ہیں تو مثبت جذبات کا اثر اس کے برعکس
ہونا چاہیے۔
ٹھیک یہی بات ہے جو اب ڈاکٹروں پر منکشف
ہوتی جا رہی ہے۔ اگرچہ ہنسی کی پیمائش پر کنٹرولڈ
(CONTROLLED) تجربات بہت شاذ کیے گئے ہیں
لیکن اتنا ضرور دریافت ہوا ہے کہ یہ نظریہ کہ خوش مذاقی
اچھی صحت کو پروان چڑھاتی ہے، درست ہے۔
نارمن کزنس کے معالجوں نے یہ ثابت کیا ہے کہ
ہنسی اس کی صحت پر واضح قابل پیمائش اثرات مرتب کرتی
ہے۔ ارساب یعنی رسوبات یا تلچھٹ کے تہہ نشین ہونے
کی شرح کی پیمائش کی۔ یہ پیمائش ہنسی سے ٹھیک پہلے اور
ہنسی کے کئی گھنٹے بعد بھی کی گئی۔ یہ اتفاقی پیمائشیں جسم کے
التہاب کی نشان دہی کرتی ہیں جو کہ کزنس کی بیماری کی
ایک بڑی خصوصیت تھی۔ کزنس کہتا ہے۔ "ہر مرتبہ کم از
کم ارساب پانچ ڈگری کم ہو جاتا تھا۔ یہ کمی معقول حد
تک نہیں ہوتی تھی، رکی بھی [illegible] تھی لیکن افزائش
پذیر تھی"

دوسرے ڈاکٹروں نے سائنسی طور پر ثابت

باقی صفحہ نمبر ۱۴ پر

علی گڑھ مسلم یونیورسٹی علی گڑھ

(شعبۂ داخلہ)

سیشن ۸۴-۱۹۸۳ء

اطلاع داخلہ نمبر ۶

جواہر لال نہرو میڈیکل کالج علی گڑھ مسلم یونیورسٹی علی گڑھ میں ڈپلوما اِن جنرل نرسنگ اینڈ مڈوائفری مشتمل بر تین سالہ جنرل نرسنگ اور ۶ ماہ کے مڈوائفری) کورس میں داخلے کے لیے اہل خاتون امیدواروں کی درخواستیں مطلوب ہیں۔

کم از کم اہلیت:- انٹرمیڈیٹ امتحان مجموعی طور پر کم از کم ۴۵ فیصد نمبروں کے ساتھ یا اس کے متبادل امتحان پاس۔ بہتر تعلیمی اہلیتوں کی حامل امیدواروں کو جن کے پاس سائنس کے مضامین اور انگلش ہوگی، ترجیح دی جائے گی۔

عمر کی حد:- کورس شروع ہونے کی تاریخ کو ہر امیدوار کی عمر ۱۷ سال سے کم اور ۳۵ سال سے زائد نہ ہو۔

داخلوں کی گنجائش:- تحریری امتحان اور انٹرویو کی بنیاد پر ۱۰ امیدوار منتخب کی جائیں گی تحریری امتحان (i) انگلش (ii) ابتدائی حساب (iii) جنرل نالج میں لیا جائے گا۔

وظیفہ:- داخلے کے لیے منتخب امیدواروں کو ۱۵۰/ روپیہ ماہانہ وظیفہ دیا جائے گا۔ اسٹیٹ نرسنگ کونسل کے ضوابط کے مطابق رہائش مفت اور دیگر سہولیات حاصل ہوں گی۔

درخواست دینے کا طریقہ:- اہل امیدوار حسب ذیل پروفارما کے مطابق درخواستیں جن

کے ساتھ پاسپورٹ سائز کے تصدیق شدہ تین فوٹوگراف اور رجسٹریشن اور امتحان داخلے کی فیس کے طور پر ۲۵/- روپے کا کراسڈ انڈین پوسٹل آرڈر (ناقابل واپسی) جو فنانس آفیسر اے ایم یو علی گڑھ کے حق میں واجب الادا ہو اس طرح پیش کریں کہ وہ اسسٹنٹ رجسٹرار (داخلہ) پوسٹ بکس نمبر 52 علی گڑھ مسلم یونیورسٹی علی گڑھ 202001 کے پاس زیادہ سے زیادہ 8-9-83 تک پہنچ جائیں۔

درخواست دینے کا طریقہ :-

۱۔ امیدوار کا نام (مس/مسز) بلاک حروف میں۔ ________

۲۔ تاریخ پیدائش، ________

۳۔ والد کا نام ________

۴۔ شوہر کا نام (جہاں ضروری ہو) ________

۵۔ جائے پیدائش۔ ________

۶۔ قومیت۔ ________

۷۔ ازدواجی کیفیت (غیر شادی شدہ / شادی شدہ / بیوہ / مطلقہ) ________

۸۔ والد / شوہر کا پیشہ ________

۹۔ خط و کتابت کا پتہ ________

۱۰۔ بچے (جہاں ضروری ہو، مع عمر اور جنس) ________

۱۱۔ آیا۔ ایس سی / ایس ٹی / بی سی سے متعلق ہیں؟ ________

۱۲۔ اگر ملازم ہوں تو ایمپلائر کا نام ________

۱۳۔ عہدہ اور تنخواہ ________

۱۴۔ تعلیمی ریکارڈ۔ ________

نام امتحان -	پاس کرنے کا سال	اسکول / بورڈ / یونیورسٹی کا نام	مضامین
ڈویژن مع نمبروں کی شرح فی صد کے۔			

۱۵۔ دو ریفریوں کے نام جو امیدوار کے رشتہ دار نہ ہوں۔

ڈکلریشن

۱۔ میں اسٹیٹ نرسنگ کونسل اور مسلم یونیورسٹی علی گڑھ کے رائج الوقت ضوابط کی سختی سے پابندی کروں گی۔

۲۔ میں کسی فوجداری مقدمہ میں ماخوذ نہیں ہوں نہ کسی عدالت میں میرے خلاف کوئی فوجداری

مقدمہ چل رہا ہے
۳۔ میں آخر میں جس ادارے میں تھی اس سے نہ تو ڈی بار کی گئی ہوں، نہ میرا رسٹی کیشن کیا گیا ہے
۴۔ میں نے جس کورس میں داخلے کی درخواست دی ہے اس کے لیے اپنے والدین کی اجازت حاصل کرلی ہے۔

دستخط والد/ سرپرست — دستخط امیدوار

امتحان داخلہ

حسب ذیل تاریخوں میں امتحان داخلہ اور انٹرویو ہوگا۔

امتحان داخلہ	12-9-83	۱۰ بجے صبح سے 12 بجے دوپہر تک
انٹرویو	13-9-83	۹ بجے صبح سے ایک بجے سہ پہر تک

امتحان داخلہ یا انٹرویو کے لیے علیحدہ سے کوئی اطلاع نہیں دی جائے گی۔ اہل امیدواروں کے لیے ضروری ہے کہ ایک دن قبل داخلہ سیکشن سے انٹرنیس ٹیسٹ کارڈ حاصل کریں۔
اگر منتخب کرلی گئیں تو داخلے کی تکمیل فوری طور پر کرانی ہوگی۔ اس لیے ان کو مشورہ دیا جاتا ہے کہ فیس اور مندرجہ ذیل کاغذات کی اصلوں کے ساتھ تیار ہو کر آئیں۔

۱۔ اہلیت کا امتحان پاس کرنے کا ثبوت مع مارک شیٹس
۲۔ جس ادارے میں آخری بار رہی ہوں وہاں کے کیریکٹر سرٹیفیکیٹ۔
۳۔ تاریخ پیدائش کے ثبوت کے طور پر ہائی اسکول سرٹیفیکیٹ۔
۴۔ اگر ملازم ہوں تو ایمپلائر کا نو آبجکشن سرٹیفیکیٹ۔
۵۔ تصدیق شدہ پاسپورٹ سائز کی تین فوٹو کاپیاں

نامکمل یا دیر سے موصول ہونے والی درخواستوں پر غور نہیں کیا جائے گا۔

(دستخط)
کنٹرولر آف ایگزامینیشنز اینڈ ایڈمیشنز

پرنٹر پبلشر قاضی معزالدین احمد۔ مطبع لیتھو کلر پرنٹرس۔ مقام اشاعت صفدر منزل تار بنگلہ اے ایم یو علی گڑھ

PROGRAMME OF EXAMINATIONS TO BE HELD BY - U.P.S.C IN YEAR 1984

Qualification	Age limit	Duration	کب ہوگا	امتحان کا نام اور نوٹیفکیشن کی تاریخ
ہائی اسکول یا مساوی	18—25 سال 1-1-84 کو	۱ دن	5-2-84	Stenographer's examination (اسٹینوگرافر کا امتحان) 20-8-83
ایم ایس سی جیالوجی یا مساوی امتحان	۲۱ سے ۳۰ سال ۱۰ جنوری ۸۴ء	۳ دن	20-3-84	Geologist Examination (جیالوجسٹ کا امتحان) 6-10-83
ایم بی بی ایس	۳۰ سال سے کم ۱ جنوری ۸۴ء	۱ دن	8-4-84	Combined Medical Serv Examination 15-10-83
	۱۹ — ۲۲ سال یکم جنوری ۸۵ء IMA اور Naval / Air force کے لیے OTS کے لیے (۱۹ سے ۲۳ سال)	۳ دن	6-5-84	Combined Defence Serv مئی ۸۴ء 20-10-83
ہائر سکنڈری یا مساوی امتحان	۱۶ سے ۱۸ سال ۱ جنوری ۸۵ء کو	۳ دن	17-5-84	National Defence Aca 15-11-83
بی-اے، بی ایس سی کی ڈگری یا Economics Statistics یا Maths میں	۲۱ سے ۲۸ سال ۱ جنوری ۸۴ء کو	۴ دن	26-6-84	Indian Economic/Statistical Service 14-1-84
			22-7-84	
Botany, Chemistry, Zoology Geology, Math, Physics or Agriculture or Engineering میں ڈگری۔	۲۱ سے ۲۸ سال ۱ جولائی ۸۴ء کو	۶ دن	22-7-84	Indian forest Servic 4-2-84
Engineering میں ڈگری یا مساوی امتحان۔	۲۰ سے ۲۸ سال ۱ اگست ۸۰ء	۹ دن	5-8-84	Engineering Serv 18-2-84
کسی یونیورسٹی سے ڈگری یا مساوی امتحان	۲۰ سے ۲۵ سال ۱ جنوری ۸۴ء کو	۲ دن	27-9-84	Assistant Gra Examination 21-4-84

didn't
DIMAGHEEN
Dawakhana Tibbiya College
ALIGARH MUSLIM UNIVERSITY ALIGARH 202001
DAWAKHANA

شمارہ نمبر ۱۸ ۔۔۔ ۱۶ر ستمبر ۱۹۸۳ء جلد نمبر ۲

"میں تم سے سچی بات کہتا ہوں کہ قومی تعلیم اور قومی عزت ہم کو اس وقت تک حاصل نہیں ہونے کی جب تک ہم اپنی تعلیم کا کام خود اپنے ہاتھ میں نہ لیں گے۔ گورنمنٹ کی قدرت سے خارج ہے کہ وہ ہمارے تمام مقاصد کی تکمیل کر سکے۔"

(سر) سید احمد

بہیمت یا تہذیب	سید حامد
خودسوزی یا خودکشی۔	محمد الیاس صدیقی
حافظ ابن کثیر	محمد اقبال انصاری
مغرب میں عورت کی حیثیت	قاری سید محمد رضوان اللہ
اسلامی تعلیمی مراکز۔ تاریخی پس منظر	اخلاق احمد۔
شادی خانہ آبادی	سید حامد
آئین اکبری کی تصحیح	خواجہ الطاف حسین حالی۔

خط و کتابت کا پتا

صفدر منزل۔ تار بنگلہ

اے ایم یو۔ علی گڑھ۔

پندرہ روزہ

تہذیب الاخلاق

علی گڑھ

مدیر: سید حامد وائس چانسلر
علی گڑھ مسلم یونیورسٹی

مدیر مسئول: قاضی معز الدین احمد

شمارہ نمبر ۱۸ | ۱۶ ستمبر ۱۹۸۳ء | جلد نمبر ۲

فی شمارہ	ایک روپیہ
ششماہی	۱۱ روپے
سالانہ	۲۰ روپے

بیرون ہند سے

فی پرچہ	ایک ڈالر
سالانہ	۱۵ ڈالر

سید حامد

بہیمیت یا تہذیب

گزشتہ سے پیوستہ

۱۷ جولائی کے انڈین اکسپریس (دہلی ایڈیشن) سے اقتباس ذیل میں درج ہے، یہ حیدرآباد کے نامہ نگار کے قلم سے ہے۔

" ایک اسٹیج آرٹسٹ کو اپنی ملازمت سے ہاتھ دھونا پڑا۔ کیوں کہ باتوں میں ریہرسلوں کے دوران وہ حکام بالا کی فرمائشیں پوری نہ کر سکی۔"

" ایک عورت حیدرآباد کے قریب ایک تھانہ میں لائی گئی۔ خطا، چھوٹی سی چوری۔ سزا، پولیس اسٹیشن میں مجرمانہ حملہ۔"

کئی انجمنیں عورتوں کو ستانے کے خلاف جہاد کر رہی ہیں، لیکن بے نتیجہ۔

" استری شکتی سنگٹھن" یا "تنظیم طاقت نسواں" کی سکریٹری نے کہا کہ حیدرآباد بھی جسے اپنی شائستگی اور روایات پر ناز تھا، اب دہلی کی پیروی کر رہا ہے کسی عورت کے لیے تنہا نکلنا بہت بڑی سزا ہے۔ مرد اس کا پیچھا کرتے ہیں، اس پر فقرے کستے ہیں اور سناٹا ہو تو اس پر حملہ کرنے میں بھی انھیں باک نہیں ہوتی۔

عورتوں کا ستانا کلکتہ میں بھی شروع ہو گیا۔ درمیانی طبقے کے بنگالی، دہلی اور ملک کے بعض دوسرے حصوں کے مقابلے میں، عورتوں کی زیادہ عزت کرتے ہیں۔ رپورٹ کیے ہوئے واقعات کی تعداد ۱۹۸۱ء میں ۶ تھی، ۱۹۸۲ء میں ایک۔ لیکن اعداد و شمار پر اعتبار کون کرے، خصوصاً ایسے معاملہ میں جہاں افشا کے بجائے اخفا کو مصلحتاً پسند کیا جاتا ہو۔

گزشتہ دس پندرہ سال میں کلکتہ کا اخلاقی معیار بہت گر گیا ہے۔ عورتوں کی اتنی عزت اب نہیں ہوتی جتنی کہ ہوا کرتی تھی۔ اس کی وجہ ہے ذہنیت کا تجارتی قالب میں ڈھل جانا۔

اخبارات اور رسالے ایسے اشتہارات چھاپتے ہیں، جن میں عورتوں کو بطور جنس کے دکھایا گیا ہے۔ فلموں کے اشتہارات بھی اسی رنگ میں رنگے ہوئے ہیں۔ عورتوں پر مجرمانہ حملہ اور انھیں زہرہ گداز سزائیں۔ عورت فلموں کا تانا بانا ہے۔ اسے خرید سکتے ہیں، بیچ سکتے ہیں اور لذت اندوز ہونے کے بعد اسے نکال باہر کر سکتے ہیں۔ عورتوں کے خلاف جسارت کرنے والوں کی مثالیں یہاں اب بھی کبھی کبھی سامنے آجاتی ہیں۔

زن آزاری

۲۲ جولائی۔ مدھیہ پردیش کے باوردی بھیڑیے زنا بالجبر کے علاوہ پولس والے بے سہارا عورتوں پر ہوس آمیز فقرے کستے ہیں اور ان کی طرف لذت طلب ڈھنگ سے بڑھتے ہیں۔ عورتوں کے ساتھ چھیڑ خانی زنا بالجبر کی ایک ہلکی شکل ہی تو ہے۔" اس علاقہ میں عورتوں کو خریدنا اتنا ہی آسان ہے، جتنا بھینسوں کو۔

جاگیردارانہ سماج میں کھیتوں میں مزدوری کرنے والی عورتیں مالداروں کی عزت کا سامان ہیں۔" زمیندار سمجھتے ہیں کہ ان کا پیدائشی حق ہے کہ ہر بجن عورتوں کو اپنے بستر میں جگہ دیں۔" شری چندر شیکھر نے اپنی پدیاترا کے دوران اس علاقے سے گزرتے ہوئے بتایا

" ادیواسی عورتوں کے متعلق یہ تصور عام ہے کہ انھیں ذرا سی ترغیب دو تو وہ تمہارے بستر کے اندر نظر آئیں گی۔" جھبوا کے ادیواسی ضلع میں ہزاروں نوجوان اِندور، زدھر اور دوسرے قصبات سے بھگوریا کے میلہ کا رُخ اس لیے کرتے ہیں کہ وہ آدی واسی عورتوں کے گداز بدن کی چٹکیاں لیں، تیروں سے انھیں کریدیں انھیں چھیڑیں اور اپنے جسم کو ان کے بدن سے ٹکرائیں۔

ایک لڑکی نے کہا کہ بسوں میں زیادہ تر مرد اپنی نگاہوں سے ہمیں برہنہ کرنے میں مشغول ہوتے ہیں قارئین کی نظر سے گزرا کہ دلی، مدراس حیدرآباد اور مدھیہ پردیش میں عورتوں کے ساتھ کس قسم کا برتاؤ روا رکھا جاتا ہے۔ ہم پھر دہرائیں گے کہ کسی قوم کے مہذب ہونے کی سب سے بڑی پہچان یہ ہے کہ اس میں عورتوں کا احترام کیا جاتا ہو۔ اس سلسلہ میں قولِ فیصل انگریزی مضمون نگار غالباً چارلس لیمب) کا ہے۔ جس نے کہا تھا کہ تعلیم یافتہ، خوشحال، با اثر اور خوش پوش خواتین کی عزت کون نہیں کرتا۔ مہذب ہونے کی کسوٹی یہ ہے کہ عورت کی بحیثیت عورت کے عزت کی جائے۔ خواہ وہ دھوبن، گھوسن یا مہترانی یا کنیز ہو۔ کچھ عرصہ پہلے کلکتہ میں یہی حال تھا۔ وہاں کسی کی مجال نہ تھی کہ کسی غریب یا خستہ حال عورت کو حقارت کی نگاہ سے دیکھ سکے۔ اسی بنا پر راقم یہ سمجھتا ہے کہ باوجود جذباتی اور ہنگامہ آرا ہونے کے اہل کلکتہ دراصل مہذب تھے۔

سوال یہ اُٹھتا ہے کہ اس مرض کا علاج کس طرح کیا جائے جو وبا کی طرح پھیل رہا ہے اور جسے زن آزاری، چھیڑ خانی، لذت کوشی اور اظہار ہوس کے نام دیے گئے ہیں۔ دراصل مذہب ہی ایسا ضابطۂ اخلاق ہے جس کے ابتدائی نقوش بد اطواری، بے شرمی، بدچلنی اور ہوس گفتاری کی راہ میں زندگی بھر حائل ہوتے ہیں۔ اگر یہ نقوش بچپن میں گہرے پڑ گئے تو گمراہی کے امکانات کم ہو جاتے ہیں اور اگر انسان بھٹکا بھی تو ایک باخبر، تربیت یافتہ اور بیدار ضمیر اسے سرزنش کرنا شروع کر دیتا ہے اور جس راہ سے وہ بھٹک گیا تھا، اس راہ پر واپس لے آتا ہے۔ مذہب کے علاوہ معاشرہ بھی اگر صالح اور جری ہو تو افراد شرمناک برائیوں سے بچ جاتے ہیں۔ مذہب کے ساتھ ساتھ معاشرہ کا صحتمند رجحان بھی فرد کے ضمیر کو بیدار اور گرم انتباہ رکھتا ہے۔

بہرکیف ہم ہندوستانیوں کے لیے جو ایک قدیم تہذیب سے بہرہ اندوز ہیں اور جنھیں مغرب کی مادیت کے مقابلہ میں اپنی روحانیت پر ناز ہے، یہ طور طریقے جن میں مرد بے حجاب اور ہوس ریشہ اور درندوں سے بدتر ہو جاتا ہے انتہائی شرمناک ہیں۔ پرائی بہو بیٹیوں کو نہ صرف تاکنا، جھانکنا بلکہ ان پر ہوس آمیز نگاہیں ڈالنا، ان کے متعلق گندے تصورات کو دل و دماغ میں رہ دینا اور موقع ملنے پر انھیں عصمت ستانا بے عزت کرنا اور مختلف طریقوں سے اور مختلف مدارج میں ہوس کا تختۂ مشق بنانا اس سے زیادہ رذالت اور دنائت تصور میں نہیں آتی۔

محمد الیاس صدیقی

خودسوزی یا خودکشی

آج کل اخبارات میں آئے دن "خود سوزی" کے واقعات پڑھنے کو ملتے ہیں۔ جن میں بیشتر ان بہوؤں کے ہوتے ہیں جو جہیز کم لے کر سسرال آتی ہیں یا جن کے شوہر، ساس سسر انتہائی حریص اور کم ظرف ہیں اور منہ کھول کر بے شرمی سے مطالبات کرتے ہیں اور ادا نہ ہونے کی صورت میں غریب بہو کو طرح طرح کی ایذائیں دیتے ہیں۔ کبھی وہ خود مجبور ہو کر اپنے کو جلا لیتی ہے اور کبھی گھر والے ہی ایسا کرنے میں دریغ نہیں کرتے۔

خدا کا شکر ہے کہ یہ واقعات ہمارے یہاں نہیں بلکہ ہندو سماج میں ہیں۔ اور اب یہ زخم ناسور بنتا جا رہا ہے۔ جب ہم غائر نظر سے اس کا مشاہدہ کرتے ہیں تو دو سبب اپنے سامنے ابھر کر آجاتے ہیں

۱۔ ہندو سماج میں دولت (لکشمی) کا بمنزلہ دیوتا کے قابل پرستش ہونا

۲۔ خود سوزی کو سماج میں عزت و احترام کا حامل سمجھا جانا۔

قدیم ہندو تاریخ اس بات کی گواہ ہے کہ عورتیں اپنے شوہر کے مرنے کے بعد از خود جل کر ستی ہو جایا کرتی تھیں۔ جب تک وہ حالات رہے، اس میں کوئی دشواری نہیں ہوئی۔ مگر زمانہ بدلا اور آگے بڑھا۔ تو عورتیں جلنے میں ہچکنے لگیں۔ صرف سماج کے ڈر سے ہی مجبوراً ستی ہوتی تھیں اور تب تاریخ شاہد ہے کہ سماج میں بدنامی کے خوف سے بیوہ کے اعزا و اقربا بجبر دل پر پتھر رکھ کر ستی کر لیتے تھے۔ ایک وہ وقت بھی آیا جب ستی ہونے والی عورتوں کے پیچھے جلوس باجے گاجے کے ساتھ چتا تک لے جاتا تھا۔ اسے حوصلہ افزائی کہیے یا خاموش رشوت ستی ہونے والی عورتوں کے "چورہ" بننے لگے۔ انھیں تقدس حاصل ہونے لگا اور اس قدر کہ اس پر عورتیں اور کوتاہ نظر مرد بھی پھول چڑھانے لگے۔ منتیں مانی جانے لگیں اور کم و بیش آج بھی یہ عقیدہ باقی ہے ایسے "چورہ" آج بھی نہ صرف باقی ہیں بلکہ عقیدت کے مظہر ہیں۔ ابھی حال ہی میں ایک عزیز نے ایک زمین تعمیر مکان کے لیے خریدی۔ اس میں پتھر کا ایک ٹیلہ سا تھا جسے "ستی کا چورہ" (مزار) مشہور کر کے اتنا شور و غل مچا کر نہ صرف مقامی لوگوں نے ہنگامہ کیا بلکہ سرحدی اضلاع کے آر۔ ایس۔ ایس نے دھاوا بول دیا۔ ضلع کے ایڈمنسٹریشن کا رخ دیکھ کر اتنا حصہ چھوڑ دیا گیا تب کہیں فرقہ وارانہ فساد ہوتے ہوتے بچا۔

کہنے کا مطلب یہ ہے کہ ستی ہونے والی عورتوں کو دیوتا کا درجہ دیا جانے لگا۔ بھلا ہو راجہ رام موہن رائے کا اور لارڈ ولیم بنٹنگ کا جنھوں نے عوام کے شور و غل کی پرواہ نہ کرتے ہوئے اس وحشیانہ رسم کو ذریعہ قانون بند کرا دیا۔ اگر یہ

قانون نہ بنا ہوتا اور ستی کی رسم بخوشی یا بجبر قائم رہتی تو اس ڈیڑھ سو سال میں نہ معلوم کتنی جانیں نذرِ آتش ہوئی ہوتیں۔ کتنے بچے یتیم الطرفین ہوئے ہوتے یہ ہے وہ پس منظر جس سے ہمارا ہندو سماج متاثر ہے۔ خون میں وہی ذرّات گردش کر رہے ہیں۔ خودسوزی کی عقیدت آج بھی دلوں میں موجود ہے احیاء پرست ہندو دوست آج بھی اس وحشیانہ رسم کو تقدس کی زبان میں بیان فرماتے ہیں۔ مذہبی کتب ان تقدس مآب داستانوں سے بھری ہیں۔ اس لیے زمانہ لاکھوں کروٹیں لے رجعت پسند حلقوں میں خودسوزی کا تقدس جڑ جما چکا ہے اور موقع ملنے پر اس کا سہارا لینا یقینی ہے۔ یہی وہ جذبۂ عقیدت اور ذہن تھا جس نے رمولو سے آندھرا ہولانے کے لیے خودسوزی کی پناہ لینے پر اکسایا اور یہی وہ ذہن تھا جس نے ارباب حکومت کو ایسی وحشیانہ حرکت کے عوض مطالبہ مان لینے کو مجبور کیا۔ ورنہ صاف ذہن کا تقاضہ تو یہ تھا کہ اس میں شہ دینے یا مدد دینے والوں کو خودکشی کرانے کے جرم میں سزائیں دی جاتیں۔

یہ عجیب ماجرا ہے کہ بروزِ عید قرباں
وہی ذبح بھی کرے ہے وہی لے ثواب الٹا۔

مگر ایسا نہ ہو سکا اور نہ مستقبل قریب میں ایسا ہونے کی امید ہے۔ اس لیے اگر ہندو بہوئیں خودسوزی کرتی ہیں یا کرائی جاتی ہیں تو اسے قابل نفرت نہیں سمجھا جاتا۔ سنجیدگی سے نوٹس نہیں لیا جاتا۔ حکومت جہیز کی روک تھام کے قانون بنا رہی ہے مگر ظاہر ہے جب تک جمہور کا مزاج اور معاشرہ نہ بدلے گا جہیز کی قبیح رسم کا مٹنا مشکل ہی نہیں ناممکن بھی ہے۔

شاردا ایکٹ ۱۹۲۸ء میں آیا اور تب سے کیا ہفتہ بھر کی عمر کے بچوں کی الٹی سیدھی شادیاں رک گئیں۔ ایکٹ نے قانون کی شکل اختیار کی۔ قانون آج بھی موجود ہے۔ مگر نابالغان کی شادیاں کھلے عام ہو رہی ہیں۔ اغلب ہے کہ اسی طرح جہیز کا قانون بھی صرف کاغذ کی زینت رہے گا عملاً فیل ہوگا۔

اب یہیں سے ایک خطرہ مسلم سماج کے لیے پیدا ہوتا ہے۔ ہمارے سماج میں بھی جہیز اسی طرح جاری و ساری ہے جیسے ہندو سماج میں۔ قانون شریعت میں لڑکیاں ترکہ میں حصہ دار ہیں مگر کتنے ماں باپ ہیں جو اس پر کاربند ہیں اور شاید اس لیے اچھے سے اچھا جہیز دینے اور لینے کی خواہش دن بہ دن زور پکڑتی جا رہی ہے اور نتیجہ یہ ہو رہا ہے کہ بہت سے غریب گھرانوں کی اچھی، خوبصورت، سلیقہ مند اور پڑھی لکھی لڑکیاں محض جہیز کی کمی کے خوف سے اچھا بر نہیں پا سکتیں۔ برخلاف اس کے مالدار گھرانوں کی جاہل پھوہڑ اور بدصورت لڑکیوں کے لیے اچھی سے اچھی شادی کی کمی نہیں، آئے دن کے مشاہدے اس کے شاہد ہیں۔

بڑھتا ہوا افراطِ زر اس میں بہت معاون ہو رہا ہے۔ بیرونی دولت اس آگ پر تیل کا کام کر رہی ہے۔ بہت سے معمولی گھرانوں کے جاہل لڑکے عرب ممالک سے پٹرو ڈالر کما کر لا رہے ہیں۔ اگرچہ تعلیم کے فقدان سے ان کی رہن سہن کا معیار تو نہیں بلند ہوا۔ سوچنے اور سمجھنے کی قوت میں اضافہ نہیں ہوا مگر نمائشی اخراجات کافی بڑھ گئے۔ شادی بیاہ میں محض واہ واہ کے لیے نوٹوں کے ڈھیر اور سامانوں کے انبار لگا دیے جاتے ہیں۔ تاکہ سماج میں اونچا مقام مل سکے۔ اس سے سماج میں ایک افراتفری کا پھیلنا یقینی ہے۔

تھوڑی دیر کے لیے تصور کیجیے ڈیڑھ دو ہزار روپیہ ماہوار پانے والا پروفیسر اپنی پوسٹ گریجویٹ اور سلیقہ مند لڑکی کی شادی میں اتنے پیسے نہیں خرچ کر سکتا جتنا ایک پٹرو ڈالر کمانے والا معمولی مکینک اپنی جاہل لڑکی کی شادی میں اتنے

کرسکتا ہے۔ وجہ ظاہر ہے۔ پروفیسر کا معیارِ زندگی بلند
ہے۔ اس کے ساتھ اس کی سماجی زندگی ہے وہ اتنے
پیسے بھی انداز نہیں کرسکتا مگر اس مکینک کے پاس
اس طرح کی کوئی چیز نہیں ہے۔

خلاصہ یہ ہے کہ اگر اسی طرح جہالت بڑھتی رہی
اس کی روک تھام نہ ہوئی جو بظاہر بہت مشکل معلوم
ہوتی ہے تو وہ دن دور نہیں جب مسلم سماج میں
کھلے عام مطالبے شروع ہو جائیں گے۔ اور اگر کسی طرح
ایسی شادی ہو بھی گئی اور مطالبات پورے نہ ہوئے
تو وہی خطرناک کہانی یہاں بھی شروع ہو سکتی ہے۔

خداوند قدوس کا لاکھ لاکھ شکر و احسان
ہے کہ ہم مسلمان گھر میں پیدا ہوئے۔ جہاں سوائے اللہ
کے نہ کوئی معبود ہے نہ رزاق۔ جہاں حشر و نشر، دوزخ
و بہشت پر ایمان لانا لازمی ہے۔ جہاں لاکھ لالچ ہونے
پر بھی زکوٰۃ، صدقات و خیرات ایمان کا ایک جزو سا بن
گیا ہے۔ جس کے ذریعہ دولت کے مجتمع ہونے کا سدباب
کیا گیا ہے۔ تاکہ دولت کا لالچ رگ و پے میں سرایت نہ
کر سکے۔ ہمیں لکشمی (دولت) کی پرستش سے روکا گیا۔
خود سوزی خودکشی کا ایک طریقہ ہے اور خودکشی کو
اسلام نے دنیا اور عقبیٰ دونوں کے لیے جرم قرار دیا
ہے۔ اقدام خودکشی پر دنیاوی عدالت سے بھی سزا
ہوگی اور عقبیٰ میں دوزخ ہی پناہ گاہ بتایا گیا۔

ہمارا آپ کا روز کا مشاہدہ ہے کہ جاہل سے
جاہل مسلمان جو نہ تو صوم و صلوٰۃ کا پابند ہے نہ ہی ارکان
دین سے واقف ہے جب اس سے خدا واسطے زکوٰۃ اور
صدقات کا مطالبہ ہوتا ہے تو باوجود اتنی تنگ دامانی
کے کچھ نہ کچھ دے ہی دیتا ہے۔ اور دوزخ کی صعوبتوں
کا ذکر سن کر جیتا خوف زدہ ہو جاتا ہے۔

؎ ذرا نم ہو تو یہ مٹی بڑی زرخیز ہے ساقی

اس لیے بجا طور پر یہ کہا جا سکتا ہے کہ ابھی بہت
دنوں تک شاید یہ مرض ہمارے اندر نہ پیدا ہو سکے مگر
تک کے۔ یہ روز افزوں جہالت، مذہب سے بیگانگی اور
عدم واقفیت اور بڑھتا ہوا افراطِ زر آگ پر تیل کا
کام کر رہا ہے۔ پھر ہم بھی اسی ہندوستانی سماج کا ایک
حصہ ہیں، گھلے ملے حالات، ان کے تقاضے۔ ہمیں بہت ہی
سنبھل کر قدم رکھنا ہے۔ ورنہ جس طرح شادی بیاہ
کی دوسری رسومات، جہیز اور دوسری قبیح باتیں بن بلائے
گھس آئی ہیں۔ خطرہ ہے کہیں یہ بلا بھی نہ گھس آئے۔

پس چہ باید کرد؟ یہ ایک سوال ہے جو
منہ کھولے ہمارے سامنے کھڑا ہے۔ ہمیں دعوت فکر دے
رہا ہے۔ سیدھا سادہ جواب تو یہ ہے کہ صحیح مسلمان
بن جائیے یہ اور اس سے بھی بڑے مسائل خود بخود
حل ہو جائیں گے۔

مگر یہ آسان کام نہیں ہے۔

؎ یہ شہادت گہ الفت میں قدم رکھنا ہے
لوگ آسان سمجھتے ہیں مسلماں ہونا

اس لیے سماجی کارکنوں، علماء کرام بلکہ ہر سنجیدہ
آدمی کا فرض ہے کہ جہاں کہیں بھی ایسے خطرات نظر
آئیں، بڑی شدومد اور دلیری کے ساتھ اس کی
مذمت کی جائے۔ اتنا ہی نہیں بلکہ تعلیم یافتہ اور
سمجھ دار لوگوں کا فرض ہے کہ خود اپنے معاملات میں
کشادہ دلی سے کام لیں۔ شادی کے سرد فر، جہیز کی
لعنت کو ٹھکرائیں۔ تاکہ عوام کے دلوں سے اسے ذریعہ
افتخار سمجھنے کا بھوت آسانی سے نکل سکے۔

تبلیغی جماعت اس سلسلہ میں قابلِ قدر کام
کر رہی ہے مگر وہاں بھی اجتماعات میں جو دو چار عقلمند
ہوتے ہیں وہ غرباء کے۔ شاید اہلِ دولت اسے گھٹیا
کام سمجھتے ہیں۔ تعلیم یافتہ طبقہ بھی اس طرف متوجہ
میں اپنا کسرِ شان سمجھتا ہے۔ لیکن آپ اس حقیقت
کو جھٹلا نہیں سکتے کہ اگر اس طرف سے غفلت برتی گئی
تو پھر بچنا مشکل ہو جائے گا۔ اور مجملہ دوسری

(باقی صفحہ آئندہ پر)

فاقہ اور صحت

فاقہ صحت کا ایک قدرتی اصول ہے اگر اس پر باقاعدہ عمل کیا جائے تو عموی صحت وعافیت کے
لیے بہت مفید ہے۔

یہ تو بہت مشہور اور مسلمہ بات ہے کہ اکثر امراض کی بنا معدہ ہے اور گاہ بہ گاہ فاقہ کر لینا معدہ اور
جگر کی صحت کے لیے بہت ضروری ہے۔ ہمارے اسلاف اس پر عمل کرتے تھے۔ اور بہت سی صحت بخش باتوں کی
طرح ہم نے اس کو بھی ترک کر دیا ہے۔

قدرت نے جانوروں کو اپنی صحت بحال رکھنے کے لیے بہت سی مفید باتیں جبلی طور پر سکھا دی ہیں۔ بہت
سی علاجی تدابیر کو حیوانات سے سیکھا ہے۔ مثلاً حقنہ سارس سے سیکھا ہے۔ اس کی گردن بہت لمبی ہوتی
ہے اور وہ اپنی چونچ کو اپنی مقعد میں داخل کر سکتا ہے۔ معدہ اور آنتوں کی تکلیف میں وہ چونچ میں پانی بھر
کر اور چونچ کو مقعد میں داخل کر کے معدے اور آنتوں کو صاف کر لیتا ہے۔

فاقہ کرنا اور بھوکا رہنا ہم معنیٰ نہیں ہے۔ یہ جسم پر تشدد کرنے کے مترادف بھی نہیں ہے بلکہ
ایک بالکل قدرتی عمل ہے۔ اس بات کے ثبوت کے لیے ہم جانوروں کی پیدائشی جبلت اور کھانے کی
عادات کو دلیل کے طور پر پیش کر سکتے ہیں۔

بلی اور کتے شکاری جانور ہیں۔ ان کو اپنی روزی حاصل کرنے کے لیے سخت محنت کرنی پڑتی ہے جنگلی
شیروں اور چیتوں کو عام حالات میں روزی حاصل کرنے کے لیے سخت محنت کرنی پڑتی ہے۔ شکار کی تحریک سے ان
کے معدے کی ہاضم رطوبات ان کے معدے میں رسنے لگتی ہیں اور جب وہ اپنے شکار کو پکڑ لیتے ہیں تو اس خوف
سے کہ پھر کھانے کو ملے نہ ملے ضروریات سے زیادہ کھا جاتے ہیں۔ انسان بھی حرص اور مزے کی خاطر ضرورت
سے زیادہ کھاتا ہے۔ پھر انسان غذا کو بلا ضرورت بھی کاٹ چھانٹ کر چھیل
چھال اور ضروری اجزا کو جدا کر کے اور بعض اغذیہ کو بلا ضرورت پکا کر
کھاتا ہے۔ درندے تقریباً پورے جانور کو بالوں جلد اور ہڈی سمیت
کھا جاتے ہیں۔ ایک دو دن اگر کچھ کھانے کو نہ ملے تو ان کا بدن نہیں
گھلتا۔ اور بے تاب و تواں نہیں ہوتے۔ اس کے برخلاف وہ زیادہ
چست اور پھرتیلے نظر آتے ہیں اور وہ غذا جو ان کے جسم میں ذخیرہ ہوتی
ہے، اس پر گزارہ کرتے ہیں۔

بقیہ خودسوزی یا خودکشی
ہوں کے یہ بھی تباہی کا ایک سبب
تھا۔ اور جو نکہ اس میں دعوت کا
منفی پہلو ہے اس لیے اس سیلاب کا
ناقص بہانے کا سینا ہیں فی
الانداز میں اس بلا کو روکنا چاہیے

شیخ سعدیؒ نے پرخوری کے باب میں گلستان
میں ایک قوی ہیکل پہلوان کی ایک حکایت لکھی ہے کہ
ایک قافلے کو سفر کے دوران چند دن تک کھانے کو کچھ
میسر نہ ہوا۔ جب تک کھانا میسر رہا، یہ پہلوان تمام
رستے میں گرز ہلانے اور پہلوانی کا مظاہرہ کرتا رہا
یہ عام پہلوانوں کی طرح پرخوری کا عادی تھا۔ اب
چند روز اس کو کھانے کو نہیں ملا تو نڈھال ہوگیا حتیٰ
کہ کمزوری سے چل بسا۔ اس کے برخلاف دبلے پتلے
لوگ جو زیادہ کھا جانے کے عادی نہیں تھے، ہلاک ہوجانے
سے محفوظ رہے۔ جب درندوں کو خوب شکم سیر ہوکر
کھانے کو مل جاتا ہے تو وہ اپنی پناہ گاہ میں آرام
سے لیٹے رہتے ہیں۔ خوب پانی پیتے اور مطمئن رہتے
ہیں۔ کئی کئی دن تک آرام کرتے اور سوتے رہتے ہیں۔

اس کے برخلاف پالتو درندوں مثلاً کتے کو
شکار تلاش کرنے کی ضرورت پیش نہیں آتی۔ اس لیے
ان کے معدے کی رطوبات کو اضافی تحریک نہیں پہنچتی
ان کو تیار کردہ صاف ستھری غذا بروقت دی جاتی
ہے۔ وہ بال، کھال اور ہڈی نہیں کھاتے جس سے
قدرتی طور پر ان کا معدہ اور آنتیں صاف ہوجایا کریں
اور نہ فاقہ اور آرام کا ان کو موقع ملتا ہے۔

پالتو کتوں کو اپنے وقت پر تیار شدہ راتب
مل جاتا ہے جتنی غذا ان کے سامنے رکھ دی جاتی ہے
ہڑپ کر جاتے ہیں، خواہ ضرورت سے زیادہ ہو۔ ان
کے نظام ہضم پر ضرورت سے زیادہ کھائی ہوئی غذا بار
بن جاتی ہے۔ وہ فضلات کو اچھی طرح خارج نہیں کرتے
اور جسم میں جو زہر بنتے ہیں وہ بھی اچھی طرح خارج
نہیں ہوتے۔ اسی لیے سالوتری (بیطار۔ جانوروں
کے معالج) یہ مشورہ دیتے ہیں کہ گھریلو یا پالتو حیوانات
کی صحت میں توازن کو برقرار رکھنے کے لیے ان کو فاقہ
کرانا بہت ضروری ہوتا ہے۔

غذائی نالی (قناۃ یا قنال غذائیہ)

نظام ہضم کی وہ نالی ہے جو (ALIMENTARY CANAL)
منہ سے لے کر مبرز (مقعد) تک چلی گئی ہے اور جس
سے مختلف اعضاء جڑے ہوئے ہیں۔ غذا کا ہضم کرنا
اس نالی کا کام ہے۔ یہی ساختوں میں غذا کو جذب کرتی
ہے اور فضلات کا اخراج کرتی ہے۔ غذا کے روک دینے
کے بعد بھی قناتِ غذائی اپنا فعل جاری رکھتی ہے۔ لیکن
کم تر درجہ میں جس سے باطنی اعضاء کو آرام کرنے کا اور
جسم کے نظام کو اپنی کثافتوں اور غیر ضروری غذا اور
فضلات کو اس فراغت کے دور میں صاف کردینے کی
مہلت فراہم ہوجاتی ہے۔ اس عمل کی مدد کرنے کے
لیے یہ بہتر ہوتا ہے کہ فاقے کو شروع کرنے سے پہلے
رات کو کوئی ہلکی سی مسہل دوا لے لی جائے۔ خود فاقہ
کے روز لہسن کے تیل کے کیپسول یا خود لہسن کو پیس
کر اور ہم وزن شہد ملا کر کھا لینا چاہیے۔ کیوں کہ
لہسن نہ صرف نہایت ہی قوی دافع عفونت و سرایت
ہے بلکہ آنتوں کو دیدان (کیڑوں) اور سرایتی عوارضات
سے محفوظ رکھتا ہے۔ اس دن خوب پانی پیا جائے۔
پانی کو مرغوب بنانے کے لیے اس میں شہد بھی شامل
کیا جاسکتا ہے۔ اس کو طب اسلامی میں ماء العسل
کہتے ہیں۔ یہ بلغمی امراض اور اعصاب و عضلات کو فضلات
سے صاف کرنے کے لیے بکثرت مستعمل ہے۔ ایک پائنٹ
پانی میں چائے کے دو چمچے شہد حل کیا جائے۔ بہتر
ہوگا کہ پانی کو ابال کر سرد کرلیا جائے تاکہ وہ گرد و
غبار، کدورتوں اور کلورین (جس کو آج کل پینے کے پانی
میں شامل کیا جاتا ہے) کے اثرات سے پاک صاف
ہوجائے اور زیادہ قابل قبول بھی ہوجائے۔ خاص
طور پر ان علاقوں میں یہ عمل کرنا ضروری ہے جہاں
کا پانی کھاری ہو۔

فاقے کے روز غذا مطلق نہ دی جائے۔ قلیل
سے قلیل غذا سے بھی اجتناب کیا جائے۔ اگر ہفتے میں
ایک دن مقرر کرکے فاقہ کرلیا جائے تو بہتر ہے ورنہ

پروفیسر محمد اقبال انصاری
صدر شعبۂ اسلامیات
اے ایم یو

حافظ ابن کثیر

حافظ ابن قیم (۱۲۹۲ - ۱۳۵۰ء) کے بعد، جن کا تذکرہ ۱۶ر فروری ۱۹۸۳ء کے تہذیب الاخلاق میں کیا جاچکا ہے، شیخ الاسلام امام ابن تیمیہ (۱۲۶۸ - ۱۳۲۸ء) کے دوسرے نامور شاگرد حافظ ابن کثیر ہیں جو آٹھویں صدی ہجری کے ایک بلند پایہ مفسر، مستند مورخ، جلیل القدر محدث، بے مثال فقیہ اور نامور مصنف تھے۔ اپنے زمانہ کے مروجہ علوم میں ان کو کامل دستگاہ حاصل تھی۔ بالخصوص تفسیر و تاریخ میں ان کا کوئی ہمسر نہ تھا اور ان علوم میں وہ بلاشبہ یگانۂ روزگار تھے۔

حافظ ابن قیم کی طرح انھوں نے بھی اپنے جلیل القدر استاد، امام ابن تیمیہ کی خدمت اور ان کی تعلیمات و بیش بہا تصانیف کی نشر و اشاعت میں کوئی دقیقہ فروگذاشت نہیں کیا اور شافعی ہونے کے باوجود متعدد مسائل میں اپنے جلیل القدر حنبلی استاد کی رائے سے اتفاق کیا۔ اس بنا پر اگر ان دونوں حضرات کو شیخ الاسلام ابن تیمیہ کا "صاحبین" کہا جائے تو بے جا نہ ہوگا۔ مگر افسوس ہے کہ ان کی زندگی کے حالات بہت کم ملتے ہیں اور اردو میں تو اب تک غالباً ضیاء الدین اصلاحی صاحب، رفیق دار المصنفین، اعظم گڑھ نے ہی ماہنامہ معارف اعظم گڑھ کی نومبر و دسمبر ۶۴ء اور جنوری ۱۹۶۵ء کی اشاعتوں میں کسی قدر تفصیل کے ساتھ ان پر مقالہ سپرد قلم کیا ہے۔ البتہ ڈاکٹر مسعود الرحمٰن خاں ندوی، ریڈر مرکز دراسات مغربی ایشیا، علی گڑھ مسلم یونیورسٹی نے ان کی مورخانہ حیثیت پر عربی میں مقالہ لکھ کر علی گڑھ مسلم یونیورسٹی سے

بقیہ صفحہ گذشتہ کا "فاقہ اور صحت"

دو ہفتے بعد اور یہ بھی نہ ہو سکے تو مہینے میں ایک بار فاقہ ضرور کرنا چاہئے۔ فاقے کے دوسرے دن ہلکی لیکن مقوی غذا استعمال کرنا چاہیے۔ دودھ انڈا یا دلیا یا کھچڑی استعمال کی جا سکتی ہے۔ پورا کھانا بیک وقت نہ کھایا جائے بلکہ تھوڑا تھوڑا کرکے دن میں کئی مرتبہ میں کھایا جائے تو بہتر ہے لیکن بلا بھوک کسی وقت نہ کھایا جائے۔ آپ اس طرح کا فاقہ کرکے تو دیکھیے۔ آپ کو بڑی راحت محسوس ہوگی۔ آپ کی آنکھیں روشن چمکدار اور صاف ہو جائیں گی۔ دماغ ہلکا اور صاف محسوس ہوگا۔ دلجمعی، خیالات میں یکسوئی اور توجہ و ایک طرف مرکوز کرنے کی صلاحیت میں اضافہ ہوگا۔

قدرتی علاج کرنے والوں کے علاج کی بنیاد ہی فاقہ کے اصول پر ہے۔ حسب ضرورت تین روز سے دس روز تک فاقہ کراتے ہیں۔ اس عرصہ میں کسی قسم کی ٹھوس غذا تجویز نہیں کرتے صرف پھلوں کا رس اور سبزیوں کا شوربا پلاتے ہیں۔ کسی قسم کی دوا اس عرصہ میں نہیں دیتے۔ اسکے علاوہ دوسری تدابیر اختیار کرتے ہیں۔ مزمن امراض کا اس سے بہتر کوئی علاج نہیں ہے۔ ان کی دوائیں بھی قدرتی جڑی بوٹیوں پر مشتمل ہوتی ہیں۔ یہ کوئی جدید طریقہ نہیں ہے۔ طب اسلامی میں ماء الجبن اور چوب چینی سے منضج بھی اسی اصول پر مبنی ہے بلکہ یہ طریقہ زیادہ مفید نہیں ہے اس جسم فضلات سے بالکل پاک و صاف ہو جاتا ہے۔

ی ایچ۔ ڈی کی ڈگری حاصل کی ہے اور بعد میں اس کے حصہ اول کو "ابن کثیر: حیاتہ و مؤلفاتہ" (علی گڑھ، ۱۹۷۰ء) اور حصہ دوم کو "ابن کثیر کمورخ" (علی گڑھ، ۱۹۸۰ء) کے عنوانات سے شائع کر دیا ہے اور ان کا ایک نہایت ہی پرمغز مقالہ "ابن کثیر: سیرت نگار رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم" کے عنوان سے ماہنامہ نقوش لاہور کے رسول نمبر جلد اول (دسمبر ۱۹۸۲ء) میں شائع ہوا ہے۔

حافظ ابن کثیر کا اصل نام اسماعیل، کنیت ابو الفداء اور لقب عماد الدین تھا اور اگرچہ ان کے والد کی کنیت ابو حفص، لقب شہاب الدین اور نام عمر بن کثیر (۶۴۰ — ۷۰۳ھ) تھا۔ مگر وہ باپ کی بجائے دادا کے نام پر ابن کثیر مشہور ہوئے اور اہل عرب بسا اوقات ایسا کرتے تھے۔ چنانچہ خود امام احمد بن حنبل کے دادا کا نام محمد تھا جو عام طور پر کتابوں میں بھی نہیں ملتا۔

حافظ ابن کثیر ملک شام کے صوبہ حما کے ایک گاؤں 'مجدل' میں پیدا ہوئے جو درحقیقت ان کا ننہال تھا اور ان کے والد شہاب الدین عمر بن کثیر آخر عمر میں وہاں منتقل ہو گئے تھے اور وہاں کے خطیب ہو جانے کی وجہ سے وہیں کی بود و باش اختیار کر لی تھی۔ البتہ ابن کثیر کے سن ولادت میں کچھ اختلاف ہے۔ بعض تذکرہ نگاروں نے ۷۰۰ھ لکھا ہے اور بعض نے ۷۰۱ھ۔ شیخ احمد محمد شاکر نے عمدۃ التفسیر کے مقدمہ میں، جو تفسیر ابن کثیر کا اختصار ہے، ۷۰۱ھ کو ترجیح دی ہے لیکن ۷۰۰ھ ہی صحیح ہے۔ اس لیے کہ خود ابن کثیر نے البدایۃ والنہایۃ میں جو ان کی ایک شہرہ آفاق تصنیف ہے، ۷۰۰ھ کے واقعات کے تحت اپنی ولادت کا بھی ذکر کیا ہے۔ مجدل منتقل ہونے کے چند سال بعد ہی ۷۰۳ھ میں ابن کثیر کے والد کا انتقال ہو گیا اور ۷۰۷ھ میں جب کہ ابن کثیر کی عمر صرف چھ سال کی تھی، ان کا خاندان دمشق منتقل ہو گیا اور یہیں ابن کثیر نے تعلیم حاصل کی۔ ابتدائی تعلیم اپنے بڑے بھائی کمال الدین عبدالوہاب (م ۷۵۰ھ) سے حاصل کرنے کے بعد دمشق کے مشہور اساتذہ سے شرف تلمذ حاصل کیا۔

ان کے اساتذہ میں شیخ الاسلام ابن تیمیہ کے علاوہ اسماء الرجال کی مشہور و مستند کتاب تہذیب الکمال فی اسماء الرجال کے مصنف ابو الحجاج جمال الدین یوسف بن عبدالرحمن المزی (۶۵۴ — ۷۴۲ھ) جو حدیث پر غیر معمولی دستگاہ کی بنا پر الحافظ الکبیر کہلاتے تھے اور دار الحدیث اشرفیہ کے تیئس ۲۳ سال تک مہتمم رہے تھے، خصوصیت کے ساتھ قابل ذکر ہیں۔ یہ ابن کثیر کے خسر بھی تھے۔ اس وجہ سے انہیں اپنے ان استاد سے استفادہ کے زیادہ مواقع ملے۔ دیگر تینتالیس ۴۳ مشہور اساتذہ میں سے:-

۱۔ مورخ الاسلام و شیخ المحدثین بالشام شمس الدین ابو عبداللہ محمد بن احمد الذہبی (۶۷۳ — ۷۴۸ھ) صاحب دول الاسلام، تذکرۃ الحفاظ و تجرید اسماء الصحابہ و سیر اعلام النبلاء اور العبر فی خبر من غبر وغیرہ

۲۔ علم الدین ابو محمد القاسم بن محمد البرزالی (۶۶۵ — ۷۳۹ھ) مشہور محدث و مورخ جنہوں نے المقتفی کے نام سے ابو شامہ المقدسی (۵۹۹ — ۶۶۵ھ) کی تاریخ کا ضمیمہ لکھ کر اس کو ۷۳۸ھ تک پہونچا دیا ہے۔

۳۔ کمال الدین ابو المعالی محمد بن علی الزملکانی (۶۶۶ — ۷۲۷ھ) جنہوں نے طلاق و زیارت کے مسئلہ میں امام ابن تیمیہ کے رسالہ کا جواب لکھا ہے۔

۴۔ عفیف الدین اسحٰق بن یحییٰ الآمدی (۰۰۰ — ۷۲۵ھ) جو اپنے وقت کے مشہور محدث تھے۔

۵۔ بہاء الدین القاسم بن المظفر بن عساکر (۶۲۹ — ۷۲۳ھ) جنہوں نے سات جلدوں میں ایک ضخیم معجم لکھی ہے۔

۶۔ شہاب الدین ابو العباس احمد بن ابی طالب الحجار

المعروف بابن الشحنة (۶۲۴-۷۳۰ھ)

۷- قاضی القضاۃ عزالدین ابوعمر عبدالعزیز بن محمد المعروف بابن جماعہ (۶۹۴-۷۶۷ھ) جن کی تصانیف میں ہدایۃ السالک الی المذاھب الاربعۃ فی المناسک ومختصر فی السیرۃ النبویۃ کافی اہم ہیں۔

۸- شمس الدین ابو نصر بن محمد الشیرازی (۶۲۹-۷۲۳ھ)

۹- برہان الدین ابو اسحاق ابراہیم بن عبدالرحمن الفزاری المعروف بابن فرکاح (۶۶۰-۷۲۹ھ) جنھوں نے فقہ شافعی میں ابو اسحاق شیرازی (م ۴۷۶ھ) کی "التنبیہ فی فروع الشافعیۃ" کی شرح لکھی اور اصول فقہ میں مشہور مالکی فقیہ ابن حاجب کی مختصر المنتہی المعروف لمختصر ابن حاجب پر حاشیہ لکھا۔

۱۰- شمس الدین ابوالثنا محمود بن عبدالرحمن الاصفہانی (الاصبہانی) (۶۷۴-۷۴۹ھ) جنھوں نے البیان کے نام سے مذکورہ بالا مختصر ابن حاجب کی شرح لکھی

۱۱- شمس الدین ابوعبداللہ محمد بن عمر المعروف بابن قاضی شہبہ (۶۹۱-۷۸۲ھ) جن کا لقب شیخ الشافعیہ تھا اور ان کا شمار کبار شافعیہ میں کیا جاتا تھا۔

کا ابن کثیر نے بارہا "شیخنا" کہہ کر خصوصیت کے ساتھ ذکر کیا اور انھیں اپنے مخصوص اساتذہ میں شمار کیا ہے۔ ان مقامی و خاص اساتذہ سے استفادہ کے علاوہ ابن کثیر نے حصول علم کی غرض سے قدس، نابلس بعلبک اور قاہرہ جیسے اس وقت کے اہم علمی مراکز کا دورہ کرکے وہاں کے اہم اساتذہ سے براہ راست استفادہ بھی کیا ہے۔ جنھوں نے خود ابن کثیر کے علم و فضل کا اعتراف کیا ہے۔

تحصیل علم کے بعد خود ابن کثیر نے درس و تدریس کا کام شروع کیا اور اس کا آغاز دمشق ہی کے مدرسہ نجیبیہ سے کیا جہاں ۱۱ جمادی الاولی ۷۳۶ھ کو پہلا درس دیا اور اس زمانے کے دستور کے مطابق دمشق کے علماء و فضلاء نے اس میں شرکت کی۔ ابن کثیر نے اس موقع پر قرآن مجید کی ایک آیت "انما یخشی اللہ من عبادہ العلماء (۲۸:۳۵)" کی تفسیر بیان کی جس سے شرکاء بے حد متاثر ہوئے۔ اور ان کے غیر معمولی علم و فضل اور دلنشیں طرز بیان کی تعریف کی۔ غالباً آخر عمر تک ابن کثیر اسی مدرسہ سے وابستہ رہے۔ لیکن بعض تذکرہ نگاروں نے ان کے مدرسہ فاضلیہ میں مدرس ہونے کا بھی ذکر کیا ہے۔ اس لیے زیادہ قرین قیاس یہ معلوم ہوتا ہے کہ جیسا کہ اس وقت دستور تھا کہ مشہور اساتذہ بیک وقت دو یا زائد مدارس میں مدرس یا شیخ الحدیث ہوا کرتے تھے، انھوں نے مدرسہ نجیبیہ سے وابستہ ہوتے ہوئے مدرسہ فاضلیہ کی مدرسی بھی قبول کرلی ہو۔ اس لیے کہ اپنے استاد مورخ الاسلام شمس الدین الذھبی (۶۷۳-۷۴۸ھ) کی وفات کے بعد ان کی جگہ مدرسہ صالحیہ کے شیخ الحدیث ہوجانے کی خود ابن کثیر نے صراحت کی ہے اور اسی طرح شیخ تقی الدین السبکی (۶۸۳-۷۵۶ھ) کی وفات کے بعد وہ کچھ عرصہ تک ان کی جگہ دارالحدیث الاشرفیہ الجوانیہ کے بھی شیخ الحدیث رہے۔

الغرض ابن کثیر نے اسی طرح اپنی ساری عمر درس و تدریس اور وعظ و ارشاد میں گزار دی۔ اور ان سے جو وقت بچتا، اسے عبادت و ریاضت اور تصنیف و تالیف کی نذر کردیتے۔ شب میں ٹمٹماتے ہوئے چراغ کی روشنی میں مطالعہ اور تصنیف و تالیف کا نتیجہ یہ ہوا کہ آخر عمر میں بصارت سے محروم ہوگئے اور بالآخر ۱۸ یا ۲۶ شعبان ۷۷۴ھ میں وفات پائی اور اپنی وصیت کے مطابق مقبرہ صوفیہ میں اپنے استاد شیخ الاسلام امام ابن تیمیہ کی قبر کے نزدیک دفن کیے گئے۔

ابن کثیر بے حد خلیق، حد درجہ ملنسار، نہایت

نیک دل اور بہت ہی متواضع تھے۔ لوگ ان کی بڑی قدر کرتے تھے۔ وہ عالم و فاضل ہونے کے ساتھ ساتھ شیریں بیان خطیب بھی تھے اور غالباً یہ بات انھیں ورثہ میں اپنے باپ سے ملی تھی۔ اسی لیے لوگ ان کی تقریر کے بے حد گرویدہ تھے۔ اور جوق در جوق اس میں شرکت کرتے تھے۔ ان کا حافظہ بے حد قوی تھا اور وہ بہت کم بھولتے تھے اور ہر علم ہر وقت مستحضر رہتا تھا۔ چنانچہ مشہور شافعی فقیہ ابو اسحاق ابراہیم بن علی شیرازی (م ۴۷۶ھ) نے فقہ میں التنبیہ فی فروع الشافعیہ کے نام سے جو کتاب لکھی تھی اور اس وقت بے حد متداول تھی ابن کثیر نے اٹھارہ سال کی عمر میں اس کے دلائل کی تخریج کی تھی اور تخریج ادلۃ التنبیہ نام رکھا تھا وہ انھیں آخر عمر تک ازبر رہی۔ اسی طرح مشہور مالکی فقیہ جمال الدین ابو عمر عثمان بن عمر المعروف بابن حاجب (۵۷۰ - ۶۴۶) منتہی السؤل والأمل فی علمی الاصول والجدل کے نام سے اصول فقہ و علم مناظرہ میں ایک مبسوط کتاب لکھی تھی اور بعد میں خود ہی مختصر المنتہی کے نام سے اس کا خلاصہ بھی کیا تھا جو مختصر ابن حاجب کے نام سے مشہور و متداول تھا ابن کثیر نے اس کی احادیث کی تخریج کی تھی اور تخریج احادیث مختصر ابن حاجب نام رکھا تھا اور یہ بھی پوری کی پوری انھیں زبانی یاد تھی۔

جیسا کہ اوپر ذکر کیا جا چکا ہے حافظ ابن کثیر کی شادی ان کے استاد شیخ جمال الدین المزی (۶۵۴ - ۷۴۲ھ) کی بیٹی کے ساتھ ہوئی تھی جن کا نام امۃ الرحیم زینب تھا۔ ان کی اولادیں سے حسب ذیل چار بیٹوں کا ذکر یا صرف نام ملتا ہے۔

۱۔ عز الدین عمر بن اسماعیل (۷۳۸ - ۷۸۳ھ)
۲۔ زین الدین عبدالرحمٰن بن اسماعیل (م ۷۹۲ھ)
۳۔ بدر الدین ابو البقا محمد بن اسماعیل (۷۵۹ - ۸۰۳ھ)
۴۔ شہاب الدین احمد بن اسماعیل۔

ان میں موخر الذکر کا صرف نام ان کی بیٹی اسماء بنت احمد کے تذکرہ میں ملتا ہے جو اپنے وقت کی مشہور محدثہ تھیں۔ بقیہ تین بیٹوں کا ذکر تو ملتا ہے مگر خود ان کی کسی تصنیف کا نام نہیں ملتا۔ بجز اس کے کہ انھوں نے اپنے والد کی تصانیف نقل کیں اور انھیں لکھنے پڑھنے سے دلچسپی تھی اور ان میں اول الذکر عز الدین عمر کو فقہ سے خصوصی لگاؤ تھا۔

ابن کثیر کی ساری عمر درس و تدریس اور تصنیف و تالیف میں گزری۔ نیز انھیں تمام مروجہ علوم پر کامل دستگاہ حاصل تھی۔ اس لیے انھوں نے تقریباً تمام ہی علوم پر کچھ نہ کچھ ضرور لکھا ہے اور ان کی چھوٹی بڑی تصانیف کی تعداد جن کا اب تک پتہ چل سکا ہے چھتیس[۳۶] ہے۔ ان میں گیارہ زیور طبع سے آراستہ ہو چکی ہیں، تین کے قلمی نسخے موجود ہیں اور بائیس[۲۲] کے صرف نام ملتے ہیں۔ مطبوعات میں زیادہ تر قرآنیات اور تاریخ و سیرت پر ہیں جن میں سے صرف چند کا میں مختصراً ذکر کروں گا۔

۱۔ التفسیر القرآن الکریم (قاہرہ: ۱۳۷۱ھ) ابن کثیر کی تصانیف میں اسے غیر معمولی اہمیت حاصل ہے اور جیسا کہ جلال الدین سیوطی (۸۴۹ - ۹۱۱ھ) کی رائے ہے اس نہج پر اس سے اچھی کوئی تفسیر نہیں لکھی گئی۔ دس جلدوں پر مشتمل اس کا قلمی نسخہ دار الکتب المصریہ، قاہرہ میں موجود ہے اور یہ سب سے پہلے ۱۳۰۰ھ میں قاہرہ ہی سے نواب صدیق حسن خاں (۱۲۴۸ - ۱۳۰۷ھ) کی تفسیر فتح البیان کے حاشیہ پر شائع ہوئی اس کے بعد اس کو تفسیر بغوی کے ساتھ اور علیحدہ بھی شائع کیا گیا۔ جس میں غالباً آخری ایڈیشن مطبع عیسیٰ البابی الحلبی قاہرہ کا ہے، جس کا شروع میں حوالہ دیا گیا ہے اور جو چار ضخیم جلدوں پر مشتمل ہے۔ اس کی غیر معمولی مقبولیت

واہمیت کے پیش نظر استاد احمد محمد شاکر نے
عمدۃ التفسیر کے نام سے اس کا اختصار کیا ہے
جسے دار المعارف، قاہرہ نے ۱۳۷۶ھ میں جلدوں
میں شائع کر دیا ہے۔ جب کہ ان سے قبل بھی
شمس الدین محمد بن علی البعلی المعروف با بن
الیونانیہ (۷۰۱-۷۹۳ھ) اور عفیف الدین
ابن سعید الدین الکارزونی تفسیر ابن کثیر کا اختصار
کر چکے تھے جن میں موخر الذکر شائع بھی ہو چکا تھا
تفسیر محمدی کے نام سے مولوی محمد، مدرس مدرسہ
محمدیہ عربیہ، دہلی و ایڈیٹر اخبار محمدی (پندرہ
روزہ) دہلی نے تفسیر ابن کثیر کا ۱۳۵۲ھ میں
اردو ترجمہ شائع کر دیا ہے اور غالباً اسی کو
کراچی کے کارخانہ تجارت کتب نے شروع میں
"حیات حافظ عماد الدین ابن کثیر" کے عنوان سے
عبدالرشید نعمانی کے مقدمہ کے ساتھ بلا تاریخ
شائع کر دیا ہے۔

فضائل القرآن (قاہرہ: ۱۳۴۷ھ) اسے سب سے
پہلے علامہ رشید رضا (۱۲۸۲-۱۳۵۴ھ) نے
تفسیر ابن کثیر کی نویں اور آخری جلد کے آخر میں
۱۳۴۷ھ میں شائع کیا اور بعد ازاں علیحدہ بھی
شائع کیا تھا۔

البدایۃ والنہایۃ (قاہرہ: ۱۳۵۱-۱۳۵۸ھ) یہ تفسیر
القرآن الکریم کے بعد ابن کثیر کی دوسری معرکۃ
الآرا تصنیف ہے جو بڑی تقطیع سولہ جلدوں
پر مشتمل ہے۔ پہلی تین جلدیں ابتدائے آفرینش
سے لے کر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی ولادت
وحی کے آغاز اور ۱ھ تک کے واقعات پر
مشتمل ہیں۔ اس کے بعد سن وار واقعات کا
بیان ہے جو مصنف کی وفات سے کچھ قبل
یعنی ۷۶۷ھ تک کے واقعات پر مشتمل ہیں۔ البتہ
سب سے آخر میں امیر منکلی بغا الشمسی کی وفات
کا ذکر ہے جو ۷۷۴ھ میں ہوئی۔ اس لیے زیادہ
قرین قیاس یہ معلوم ہوتا ہے کہ آخر کے چند
صفحات تلف ہو گئے۔ اس خیال کو مزید تقویت
اس بات سے ملتی ہے کہ علامہ ابن حجر عسقلانی
(۷۷۳-۸۵۲ھ) نے اس کی صراحت کی ہے اور
اسی لیے انباء الغمر بابناء العمر کو تاریخ ابن کثیر
کا ذیل شمار کرتے ہوئے اس میں ۷۷۳ھ سے
واقعات کا اندراج کیا ہے۔ البدایۃ والنہایۃ
کی آخری دو جلدوں میں آثار قیامت سے لے کر
قیامت تک پیش آنے والے معتبر احادیث کی روشنی
میں بیان کیے گئے ہیں اور اسی لیے ان دو جلدوں
کا نام جو آخری زمانہ کے فتن اور خونریز جنگوں کے
واقعات پر مشتمل ہے النہایۃ رکھا ہے۔ یہ آخری
دو جلدیں علیحدہ بھی "نہایۃ البدایۃ والنہایۃ"
کے نام شیخ محمد فہیم ابو عبید کی تحقیق کے ساتھ ۱۹۶۸ء
میں ریاض (سعودی عربیہ) کے مکتبۃ النصر الحدیثۃ
نے شائع کر دی ہیں۔

۴- السیرۃ النبویۃ (قاہرہ: ۱۳۸۴ھ) سیرت نبوی
تاریخ اسلام کا اہم ترین حصہ ہے۔ اس لیے
ابن کثیر نے اپنی تصانیف میں اسے خصوصی اہمیت
دی ہے اور اس موضوع پر ان کی چھوٹی بڑی چار
تصانیف ہیں جن میں یہ مطول سیرت نبوی جس کا
ابن کثیر نے اپنی تفسیر میں جابجا حوالہ بھی دیا اور
جسے مصطفیٰ عبد الواحد صاحب نے اپنے مقدمہ کے
ساتھ تحقیق کر کے چار جلدوں میں شائع کر دیا ہے
مگر یہ مصنف کی مذکورہ بالا شہرہ آفاق تصنیف
"البدایۃ والنہایۃ" سے من و عن ماخوذ ہے۔

۵- الفصول فی اختصار سیرۃ الرسول (قاہرہ ۱۳۵۸ھ)
اس کا ذکر "سیرۃ صغیرۃ" یا "الفصول فی سیرۃ الرسول"
کے نام سے بھی ملتا ہے۔ لیکن درحقیقت یہ کوئی نئی
تصنیف نہیں ہے بلکہ مذکورہ بالا "البشیر النصوح"

ڈاکٹر قاری سید محمد رضوان اللہ الازہری
صدر شعبہ سنی دینیات - اے ایم یو۔

مغرب میں عورت کی حیثیت اور اسلامی اثرات[1]

مغرب پر اسلام کے اثرات کے سلسلہ میں زندگی کے مختلف پہلوؤں پر اسلام کے اثرات کو مباحثہ کا موضوع قرار دیا جاسکتا ہے۔ چنانچہ میں اسلام سے پہلے اور بعد مغرب میں سماجی اور معاشرتی مرتبہ کو اپنے مباحثہ کا موضوع قرار دے کر کچھ حقائق پر روشنی ڈالنا چاہوں گا۔ یہ حقیقت ہے کہ عورت تعرف انسانیت ہے۔ اس کو نظر انداز کر کے نوع انسانی کے لیے جو بھی پروگرام بنے گا وہ ناقص اور ادھورا ہوگا۔ ان کے احتیاج کی نوعیت سماجی اور معاشرتی بھی ہے اور جنسی و نفسیاتی بھی۔ ایک طرف اجتماعی زندگی ان سے مطالبہ کرتی ہے کہ وہ قدم سے قدم اور شانہ سے شانہ ملا کر کام کریں۔ دوسری طرف جنسی تقاضے ان کو مجبور کرتے ہیں کہ وہ ایک دوسرے کے دامن میں سکون و اطمینان ڈھونڈیں اور بقائے زندگی اور تسلسل نسل انسانی کا باعث بنیں

اب دیکھنا یہ ہے کہ متوازن اور معتدل نظام زندگی ابتدائے آفرینش سے تاحال کہاں کہاں اور کس کس دور میں عمل در آمد ہوا ہے اور مذہبی اعتبار سے یہ متوازن ضابطۂ حیات کس نے پیش کیا ہے اور اس پر عمل کرنے اور نہ کرنے کے کیا نتائج اور اثرات مغربی دنیا پر برآمد ہوئے۔

اس حقیقت سے انکار نہیں کیا جاسکتا کہ اسلام سے پہلے عورت کی کوئی حیثیت نہ تھی۔ زندگی کے ہر مرحلہ میں نہ صرف مردوں کی محکوم و دست نگر تھی بلکہ اپنی ذاتی املاک کے تصرف تک سے محروم تھی۔ گھر کا مالک یعنی باپ یا شوہر جب چاہتا عورت کو گھر سے نکال دیتا

[1] یہ مقالہ اسلامک اسٹڈیز کے سیمینار میں پڑھا گیا۔

بقیہ صفحہ گذشتہ کا "حافظ ابن کثیر"

کا ہی اختصار ہے۔

۶۔ شمائل الرسول (قاہرہ: ۱۳۸۶ھ) اسے بھی مصطفیٰ عبدالواحد صاحب نے ایڈٹ کیا ہے جسے دار احیاء الکتب العربیہ کے مالک عیسیٰ البابی الحلبی نے شائع کیا ہے۔

۷۔ مولد رسول صلی اللہ علیہ وسلم (بیروت: ۱۹۶۱ء) ابن کثیر کے تذکرہ نگاروں نے ان کی اس تصنیف کا کہیں ذکر نہیں کیا ہے۔ البتہ اس کا ایک مخطوطہ مشہور مصری محقق ڈاکٹر صلاح الدین المنجد کو پرنسٹن یونیورسٹی (امریکہ) کی لائبریری میں مل گیا ہے جسے انھوں نے تحقیق کر کے اپنے مقدمہ کے ساتھ شائع کر دیا ہے جو ہمارے یہاں کی میلاد (مولود) شریف کی کتابوں سے بالکل مختلف ہے۔ ابن کثیر نے دمشق کی جامع منلغزی کے موذن عماد الدین ابو بکر کی فرمائش پر لکھا تھا جس میں آنحضرت کے آباء و اجداد کی ولادت و رضاعت اور اخلاق و شمائل کا ذکر ہے اور آخر میں آنحضرت کے چچا مکرمین حضرت ابو طالب اور حضرت عباس بن عبدالمطلب کے چند نعتیہ اشعار بھی ہیں۔

شوہر کو بیوی کے قتل کرنے تک کے اختیارات حاصل تھے
یہودی مذہب نے عورت کو اس جرم میں کہ اس نے
حضرت آدمؑ کو بہکایا تھا، ہمیشہ کے لیے مردوں کا محکوم
بنا دیا۔ عیسائیوں کا کہنا تھا کہ حضرت آدم علیہ السلام نے
دھوکا نہیں کھایا بلکہ عورت فریب کھا کر گناہ میں پھنسی (۱)

مغربی ممالک میں عورت کی سماجی پستی یونان سے
شروع ہوئی اور رفتہ رفتہ یہ رو سب ملکوں میں پھیل
گئی۔ اہل یونان کا قول تھا کہ آگ سے جل جانے اور
سانپ کے ڈسنے کا علاج ممکن ہے لیکن اس کے شر کا
مداوا محال ہے۔ رومی قانون میں عورت کی کوئی حیثیت
نہ تھی۔ شوہر بیوی کو قتل کر سکتا تھا۔ انیسویں صدی کے
وسط تک تمام مغربی ممالک میں عورت معمولی انسانی حقوق تک
سے محروم تھی۔ غلاموں کا سا برتاؤ، تعلیم سے محرومی تھی۔
میکس فنک جرمن مصنف نے لکھا ہے کہ عورت کو انسان
اور بندر کے درمیان جانور سمجھا جاتا۔ بیوی کو اپنی جائداد
کے منتقل کرنے کا اختیار نہ تھا۔ البتہ شوہر بیوی کی
جائیداد پر ہر طرح کا حق رکھتا تھا۔ انگلستان کے قانون
کے مطابق شوہر کو بیوی کے کوڑے مارنے کا حق حاصل
تھا۔ ۱۹۱۷ء میں پہلی بار کوڑے مارنے پر پابندی
لگائی گئی۔ روس میں بیوی کو مارنے کے لیے خسر کی
طرف سے کوڑا دولہا کو اس لیے دیا جاتا تھا کہ جب
چاہے وہ مارے۔ انگلستان کے قانون کی رو سے
شادی کے بعد مرد کی طبیعت میں کوئی تبدیلی نہیں آتی
تھی۔ مگر عورت صرف مرد کی شخصیت کا جزو بن کر رہ
گئی تھی۔ نان و نفقہ کا کوئی مناسب قانون نہ تھا اور
نہ عورت کو مرد کے خلاف مقدمہ دائر کرنے کا کوئی حق تھا
مرد اگر چاہتا تو عورت کو وراثت کے حق سے محروم کر سکتا
تھا۔ لیکن مرد عورت کی جائیداد کا جائز حقدار سمجھا
جاتا تھا۔ شادی ایک تجارت تھی جس کے ذریعہ والدین
اپنی لڑکیوں کو لڑکوں کے ہاتھ فروخت کرتے تھے۔
فرانس اور جرمنی میں بھی انیسویں صدی کے وسط تک
عورتوں کی ذلت اور تعلیمی پستی کا یہی حال تھا۔ ان تمام
باتوں کے باوجود بعض ایسے بھی مصنف تھے جنھوں نے
اسلامی تعلیمات سے متاثر ہو کر عورتوں کے حقوق دلوانے
کی سعی کی۔ ۱۵۰۵ء میں ایک جرمن فلسفی کورنیلیاس
اگریپا (Cornelius Agrippa) نے عورت کی
خوبیوں، اس کی دماغی صلاحیتوں، مرد اور عورت
مساوات، بعض باتوں میں مرد کی فضیلت پر ایک رسالہ
لکھا۔ اسی طرح (J. L. Vives) جے ایل وائیوس
نے عورت کی مکمل تعلیم کی حمایت کی۔ ۱۶۹۲ء میں دانیال
ڈیفو نے اپنی کتاب "تعلیم نسواں" میں عورتوں کی تعلیم
کی مخالفت کرنے والوں کی مذمت کی اور اسے دنیا کا
بدترین ظلم اور بربریت قرار دیا۔ (۲)

ممالکِ مغرب میں معاشرتی و اخلاقی زوال کا علاج کرنے
کے لیے یورپ میں مسیحیت کا زور رہا۔ مسیحی ضابطۂ حیات
میں بھی صنف نازک کے بارے میں بنیادی نظریہ یہ تھا
کہ عورت معاصیت کی ماں اور برائیوں کی جڑ ہے۔ آلام
انسانی کا آغاز اسی نے کیا۔ امام مسیحیت ترطولیان
(Tertullian) نے لکھا ہے کہ "وہ شیطان کے آنے کا
دروازہ ہے۔ وہ شجر ممنوعہ کی طرف لے جانے والی، خدا کے
قانون کو توڑنے والی ہے"۔

مسیحیت نے دوشیزگی و تجرد کی زندگی کو اخلاقی معیار
قرار دیا۔ بیویوں سے دور رہنا تقدس و تقویٰ اور
اعلیٰ کردار کی علامت بتلایا۔ خلع اور طلاق کی با لکل

۱۔ تاریخ اخلاق یورپ۔ لیکی،		پیدائش باب ۳
دو مہینے امریکہ میں۔ مغربی تہذیب میں عورت کا مقام۔ محمد رابع ندوی ص ۳۳۷ - لکھنؤ ۱۹۷۸ء
۲۔ ملاحظہ ہو ص ۳۸۲ تا ۳۸۹ مرتبہ تاراچند نئی دہلی ۱۹۶۸ء		عورت اسلامی معاشرہ میں۔ مولانا جلال الدین العمری ص ۲۱-۲۲

بازت نہ دی۔ شوہر کی موت کے بعد بیوی کو اور بیوی
موت کے بعد شوہر کو دوسرے نکاح کی اجازت تو
رکنار بلکہ [illegible] قرار دیا گیا (۱)

ان حالات میں اسلام کا جب آفتاب طلوع ہوا تو
ں نے عورت کو اللہ کی نشانیوں میں سے ایک نشانی
ر نعمت قرار دیا۔ حسن سلوک اور حسن معاشرت اور ر
ی کی تاکید کی۔ ماں، بہن، بیٹی اور بیوی کی حیثیت
ے اس کے حقوق مقرر کیے۔ وراثت میں اس کو برابر کا
ریک کیا اور بتایا کہ وہ تمہاری پوشاک ہیں اور تم
ن کی پوشاک" ھن لباس لکم وانتم لباس لھن
۱۔ بقرہ) عورت تمہاری خادمہ نہیں اور نہ تمہارا مال
جس طرح چاہو اس پر تصرف کرو۔ بلکہ صاف طور
ر کہا کہ عورتوں کا مردوں پر اتنا ہی حق ہے جتنا مردوں
ا عورتوں پر وَلَھُنَّ مِثْلُ الَّذِیْ عَلَیْھِنَّ بِالْمَعْرُوْف
(۱)۔ حقوق کے اعتبار سے دونوں کا درجہ برابر ہے۔
ردوں کو خاص طور پر یہ ہدایت فرمائی کہ عورتوں کے
اتھ معقول برتاؤ کرو" وعاشروھن بالمعروف"۔ مرد
و اگر عورت پر فضیلت دی گئی ہے تو اس کے اسباب
بھی جتلا دیے کہ مرد اپنا کفیل ہوتا ہے اور اپنی بیوی
بچوں کا بھی ذمہ دار ہوتا ہے۔

قرآن پاک میں ہے

" مرد عورتوں پر اس لیے حاوی ہیں کہ خدا نے
بعض کو بعض پر فضیلت دی ہے اور اس لیے بھی کہ وہ
پنا مال خرچ کرتے ہیں۔

الرِّجَالُ قَوّٰمُوْنَ عَلَی النِّسَآءِ بِمَا فَضَّلَ اللّٰہُ
بعضھم علیٰ بعض وبما انفقوا من اموالھم (نساء ۴: ۳۴)
قرآن کریم کے ان احکامات کے علاوہ رحمت للعالمینؐ

نے خود بھی ارشاد فرمایا۔

" تم میں سب سے بھلا وہ ہے جو اپنی بیوی کے لیے
بھلا ہے۔"

حضرت انس رضؓ سے روایت ہے کہ رسول اکرم صلی اللہ
علیہ وسلم نے فرمایا

" جو شخص دو لڑکیوں کی پرورش کرے یہاں تک کہ
وہ جوان ہو جائیں تو قیامت کے دن میرا اس کا ساتھ
(انگلیوں کو ملا کر فرمایا) اس طرح ہوگا۔"

حصول علم کے متعلق صاف طور پر حکم دیا کہ

" علم کا حاصل کرنا ہر مسلمان مرد و عورت پر فرض ہے"
طلب العلم فریضۃ علیٰ کل مسلم و مسلمۃ

اب دیکھنا یہ ہے کہ اسلام نے عورت کے لیے جو یہ
دینی اور دنیوی علوم کے دروازے کھولے تو کیا اس کا
مقصد صرف گھر کی چہار دیواری میں اپنے شوہر کی خدمت
یا بچوں کی پرورش ہے یا کچھ اور بھی؟ اسلام کی مقدس
تاریخ کے ایک ایک ورق اور ایک ایک صفحہ سے یہ بات
ثابت ہے کہ عورتوں نے زندگی کے ہر میدان میں قدم
رکھا ہے۔ آفتاب اسلام کی ضیا پاشیوں سے مغرب
نے ایسا نور اور فیض حاصل کیا کہ بہت ہی قلیل عرصہ
میں اس کی علمی قابلیت، اخلاقی و تمدنی خوبیوں نے
دنیا کو محوِ حیرت کر دیا (۵)

عورت کی اجتماعی زندگی پر خوشگوار نتائج مرتب
ہوئے، نکاح و طلاق کے قوانین میں نرمی برتی گئی۔ عورتوں
کے معاشی حقوق جو پہلے سلب کر لیے گئے تھے، بڑی حد
تک انھیں واپس دے گئے۔ اخلاقی نظریات کی اصلاح
کی گئی۔ معاشرت کے ان اصولوں میں ترمیم کر دی گئی
جن کی وجہ سے عورت صرف لونڈی بن کر رہ گئی تھی۔

---

۱ پردہ- ابوالاعلیٰ مودودی- ص ۱۷- ۲۲۔ دہلی ۱۹۶۹ء ۲ بقرہ ۲: ۲۲۷۔ ۳ بقرہ ۲: ۲۲۸۔
۴ نساء ۴- ۳۴- ۵- عورت اور اسلام - مفتی سعید احمد ص ۳۰ دیوبند ۱۳۶۸ھ - باکمال عورتیں
ص ۲۳- مولوی عبدالقیوم ندوی- عورت انسانیت کے آئینہ میں- ایم عبدالرحمٰن- ص ۱۰۰- ۱۰۶- تمدن عرب سید علی بلگرامی

اخلاق احمد
ادارۂ علوم اسلامیہ
اے ایم یو۔ علی گڑھ

اسلامی تعلیمی مراکز۔ تاریخی پس منظر

اسلامی تاریخ کی ابتدا ہی سے مساجد کو تعلیم کے لیے استعمال کیا جاتا رہا ہے۔ تعلیم کے لیے ہی نہیں بلکہ کبھی سیاسی مباحث اور اہم فیصلوں کے لیے بھی مساجد کو اہم سمجھا گیا۔ مساجد میں اکثر عدلیہ کے اجلاس بھی ہوتے تھے، جن میں انصاف کیا جاتا تھا۔ رسول اکرمؐ خود مسجد میں بیٹھتے تھے اور حلقہ بگوش افراد ان کے چاروں طرف بیٹھتے تھے۔ یہی نہیں، رسول مقبولؐ سیاسی اور سماجی مسائل پر بھی خود مسجد کے اندر مباحثہ کرتے تھے۔ دور عباسیہ میں مساجد کو معتزلہ کے خیالات کو مشتہر کرنے کے لیے استعمال کیا جاتا رہا ہے۔ العشری نے مسجد ہی میں الجبائی کے لکچر سنے۔ یہی نہیں، الغزالی کے بارے میں بھی کہا جاتا ہے کہ وہ دمشق میں مسجد کے ایک مینار ہی میں فروکش تھے۔

مسجد میں تعلیمی سرگرمیوں کے کچھ فوائد ہیں۔ اوّل تو یہ کہ مسجد میں تھوڑی سی تعمیر کے بعد الگ مکتب کی تعمیر کی ضرورت باقی نہیں رہتی۔ دوم جن افراد کو مسجد میں نماز کے لیے مقرر کیا جاتا ہے ان سے تعلیم کا کام بھی لیا جا سکتا ہے اور اس طرح ان مکاتب کے تعلیم کے اخراجات بہت کم ہو جاتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ مغل دورِ حکومت میں مکاتب کا ایک طویل سلسلہ اور جال سا پھیلا ہوا تھا۔ جہاں تک ان مکاتب کے اخراجات کا تعلق تھا، امراء اور اہل خیر افراد کے ہم بغل منت تھے۔ امراء فیاضی کے ساتھ ان کے اخراجات میں ہاتھ بٹاتے تھے۔ مغل دورِ حکومت میں ایک رئیس کا انتقال ہوتا تھا تو اس کی تمام جائداد بحق سرکار

بقیہ مضمون "مغرب میں عورت کی حیثیت ....."

لی درجے کی تعلیم و تربیت کے دروازے مردوں کی طرح
رتوں کے لیے بھی کھولے گئے۔ چنانچہ انھوں نے معاشرت میں
ست پیدا کی۔ رفاہِ عام کے بہت سے مفید کام کیے۔
دوں کی خدمت اور فنون خانہ داری میں کمال، یہ
ب کچھ اسلامی تعلیمات کے ہی پھل تھے۔ جن کا اظہار
ارھویں صدی عیسوی میں یورپ کے فلاسفہ اور
قلم نے عورتوں کے حقوق کی حمایت میں اس طرح کیا
نکی کے دروازے جو ان کے لیے بند تھے، ہمیشہ
لیے کھل گئے۔ انیسویں صدی میں اس صورتحال
نکا تیزی کے ساتھ ترقی کی اور بیسویں صدی
پہنچتے پہنچتے آج مغربی معاشرت نہ صرف بے اعتدالی
و شکار ہے بلکہ افراط و تفریط کا شکار ہے۔
ی زندگی کو خوش گوار و خوش حال بنانے کے
ب صرف یہی ایک راستہ ہے کہ عورت اور
ے تعلقات اور حقوق کے سلسلہ میں مغرب
ام کے بتائے ہوئے اصولوں اور ضوابط کو
ے احساس کی پیروی کرے۔ ورنہ یہ دنیا
ت میں جہنم بن جائے گی۔

ضبط ہو جاتی تھی اور خاندان کے افراد کو صرف تھوڑی سی جائداد چھوڑی جاتی تھی تاکہ ان کا گذارہ ہو سکے۔

"کسی بھی افسر کو اس کا حکم نہ تھا اور نہ اس سے امید کی جاتی تھی کہ وہ اپنی جائداد میں سے کوئی حصہ اپنے وارثوں کے نام منتقل کرے"۔

کوئی بھی افسر اپنی محنت سے جو کچھ دولت جمع کرتا تھا وہ اس کی موت کے بعد شہنشاہ کی ملکیت تھی اور وہ صرف یہ امید کرتا تھا کہ اس کے وارثوں کو گذارہ کے لیے شہنشاہ ایک رقم مخصوص کر دے گا اور اس کے بیٹوں کو مناسب جگہ فراہم کردی جائے گی۔[1]

ایک فرنچ مصنف کی تحریر کردہ رپورٹ کے مطابق گو اس رپورٹ میں شاید مبالغہ شامل ہے۔

"۱۶۴۱ء میں آصف خان کے انتقال کے بعد شاہ جہاں نے ۱۹ کروڑ روپیہ وصول کیا"۔[2] ایسی صورت میں یہ امراء اسی بات کو پسند کرتے تھے اور فوقیت دیتے تھے کہ اپنی جائداد اور دولت میں سے ایک حصہ تعلیمی مقاصد کے لیے ان مکاتب کے نام کردیں اس طرح مساجد کے نام اور مکاتب کے نام روپیہ یا جائداد وقف کرنے سے ایک طرف ان کی شہرت وعزت میں اضافہ ہوتا تھا اور دوسری طرف وہ اس نیک کام کے بدلہ اپنی بخشش کے دروازے کھلواتے تھے۔

تعلیم کے عام ہونے کے ساتھ ساتھ یہ محسوس کیا گیا کہ مساجد ان طلبہ کو تعلیم دینے کے لیے ناکافی ہیں۔ اسی طرح تعلیمی ترقی اور علم کی وسعت نے تعلیمی حلقہ کو وسیع کر دیا اور سیکولر تعلیم کی ضرورت محسوس ہوئی۔ جس کی وجہ سے مساجد میں تعلیم کا مقصد محدود ہو کر رہ گیا۔ تعلیم کے عام ہونے کی وجہ سے طلبہ کے رہنے کا مسئلہ بھی سامنے آیا اور مساجد ان طلبا کی اقامت کا بوجھ نہیں سنبھال سکتی تھیں۔ اسی طرح مساجد اعلیٰ تعلیم کے لیے ناکافی تھیں۔ اس طرح مساجد سے مکتب اور مکتب سے دوسری جگہوں پر تعلیم منتقل ہو گئی۔

سب سے پہلا ادارہ جو اعلیٰ تعلیم کے لیے قائم کیا گیا وہ بیت الحکمۃ تھا جو ۸۳۰ء میں خلیفہ المامون نے قائم کیا۔ لیکن جس ادارہ نے غیر معمولی شہرت حاصل کی وہ جامعہ ازہر ہے۔ مصر میں دور فاطمی میں خلیفہ چہارم المعز (۹۵۲-۹۷۵ء) کے زمانہ میں یہ قائم کیا گیا۔ یہ ایک مسجد ہی نہیں بلکہ علم شریعت وطریقت کا ایک عظیم ادارہ ہے۔ جامعہ ازہر میں تعلیم کا ایک مقصد یہ بھی تھا کہ فاطمی دور کے قوانین اور سنی قواعد وضوابط کو تعلیم میں رائج کیا جائے اسی کے ساتھ ساتھ فاطمی حکومت کے حق میں پروپیگنڈا کیا جا سکے۔ یہ مخصوص تربیت اس لیے بھی ضروری تھی کہ فاطمی طریق زندگی اور قوانین سنی طریقے سے مختلف تھے۔ جو مصر میں فاطمی دور سے پہلے رائج تھے۔[3] لیکن صلاح الدین نے مصر کی حکومت کی باگ ڈور سنبھالی تو اس نے شیعہ طریق کو ختم کرکے سنی طریق رائج کیا۔ "دس صدی کے بعد مسجد کو وہی مقام حاصل ہو گیا جس کے لیے وہ قائم کی گئی تھی"۔[4] ۱۹۵۸ء میں الناصر نے اس طرح رمضان کی محفل میں شرکت کی جیسے فاطمی کرتے تھے۔

1- Edwards S.M. and Garrett, H.L.O. Mughal Rule in India. Delhi 1956 pp 171-72

2- Ibid. p 122. quoted (letters of Aurangzeb, ed.. Bilimoria, ... xxviii ...)

3- Dodge, Bayard, Al-Azhar, A millennium of Muslim Learning Washington 1961 - p. 13

4. Ibid p. 187

شیعہ طرزِ زندگی اور طریق تعلیم کا اثر زائل کرنے کے لیے سلجوقی بادشاہ کے وزیر نظام الملک طوسی نے بغداد میں ایک مدرسہ قائم کیا۔ یہ مدرسہ موجودہ طریقۂ تعلیم اور کالج کے قریب تر تھا اور اسلامی دنیا میں کالجوں کے قیام کے لیے ایک نمونہ بنا۔ نظام الملک طوسی سے قبل بھی بہت سے کالج قائم ہو چکے تھے۔ لیکن اس ادارہ نے اسلامی سوسائٹی پر ایک عظیم اثر قائم کیا اور اس حقیقت سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ یورپ کے بہت سے بڑے اداروں نے اسی سے روشنی حاصل کی۔

ہندوستان میں سب سے پہلا مدرسہ جسے خاص اہمیت حاصل ہوئی، مدرسہ فیروز شاہی تھا۔ یہ مدرسہ ہندوستان میں قرون وسطیٰ میں سب سے منفرد تھا[5]۔ اسی دور میں دوسرے مدارس بھی تھے مثلاً خیر المنازل، مدرسہ ہیم انکا اور مدرسہ دار البقا لیکن یہ مدارس اپنی شہرت اور اہمیت کے لحاظ سے مدرسہ فیروز شاہی سے کم حیثیت رکھتے تھے اور ان کی شہرت بھی کم تھی۔

انگریزوں کی آمد کے بعد مدرسہ نظامیہ اور مکاتیب پر کاری ضرب لگی اور یہ محسوس ہونے لگا کہ مکاتب اور مدارس آپ اپنی موت مر جائیں گے۔ لیکن یہ مدارس کس طرح زندہ رہے اور یہ نظام آج تک کیسے قائم ہے یہ ایک کہانی ہے۔ کلکتہ کے مدرسہ کے قیام کے پس منظر میں بھی یہی بات کارفرما نظر آتی ہے کہ بنگال کے مسلمان دانشور مسلمانوں کے لیے ایک مدرسہ قائم کرنا چاہتے تھے جس میں امراء کے بچے تعلیم حاصل کر سکیں۔ اسی لیے ستمبر ۱۷۸۰ء میں گورنر جنرل وارن ہسٹنگز سے مسلمانوں کا ایک وفد ملا اور ان سے ایک مدرسہ کے قیام کی درخواست کی۔ اسی ۱۷۸۱ء میں اس مدرسہ کا قیام عمل میں آیا۔ تاکہ مسلمانوں کو فارسی عربی میں عبور حاصل ہو اور وہ ان قوانین سے واقف ہو سکیں جن کی رو سے عدالتوں میں مقدمات کا فیصلہ کیا جاتا تھا اور اس وقت خاص طور پر پولیس کے محکمے میں زیادہ تر حاکم مسلمان تھے[6]۔

اکتوبر ۱۷۸۱ء سے اس مدرسہ نے مولانا مجد الدین کے زیر نگرانی کام شروع کر دیا۔

اس زمانہ میں مدرسہ کا خرچ صرف ۶۲۵ روپے ماہانہ تھا جو گورنر جنرل وارن ہسٹنگز خود ادا کرتے تھے اور یہ سلسلہ ۲ ماہ تک قائم رہا۔

اس ادارہ کو جنرل وارن ہسٹنگز نے قائم کیا تھا اور وہ خود اس کا کفیل تھا۔ لیکن اس کے بعد انہوں نے سفارش کی کہ اس کا کام چلانے کے لیے کچھ گاؤں دے دیے جائیں اور اس مدرسہ کو جو زمین دی جائے اس کی دیکھ بھال کے لیے ایک افسر مقرر کیا جائے اور اس کو عوام کے خرچ سے علیحدہ رکھا جائے۔ اس سفارش کو ہندوستانیوں کی کونسل نے منظور کیا اور ۲۴ پرگنہ کے کچھ علاقے اور گاؤں اس مدرسہ کے پیر یل کے نام کر دیے گئے۔ یہ زمین اور جائداد مدرسہ محال کے نام سے پکاری جاتی تھی[7]۔

۱۸۲۰ء میں یہ مدرسہ حکومت کی زیر نگرانی آگیا اس کی وجہ مدرسہ کی بد انتظامی تھی۔ لیکن حکومت کا دخل صرف انتظامیہ تک محدود تھا اور طریقۂ تعلیم پر

5- Khaliq Ahmad Nizami, 'Studies in Medieval Indian History and Culture, Delhi, 1960 – PP. 73-74.

6- Mackenzie, H.H. Note on the State of Education in India. Selections from Educational Records of the Government of India, Delhi 1960 Vol. [illegible] P. 244.

اس کا کوئی اثر نہ پڑا۔

مدرسے سے فارغ التحصیل ہونے والوں کو سرکاری نوکریاں دی جاتی تھیں۔ ان میں سے زیادہ تر افراد عدلیہ میں ملازم ہوتے تھے۔ کیوں کہ اس مدرسہ کے فارغ التحصیل کو سرکاری ملازمت مل جاتی تھی۔ اس لیے بڑی تعداد میں طلبا اس طرف راغب ہوتے تھے ۵

اس مدرسہ میں پہلی مرتبہ ۱۸۵۷ء میں انگریزی زبان کی تعلیم شروع کی گئی اور عربی و فارسی کے دو علیحدہ شعبے قائم کیے گئے۔ اس طرح ثانوی تعلیم کا نظام شروع ہوا۔ اور ہائی اسکول کلکتہ یونیورسٹی سے رابطہ قائم ہوا۔ لیکن حکومت اس کی انتظامیہ سے ناخوش تھی اور اس لیے ۱۸۵۸ء میں بنگال کے گورنر نے اس مدرسہ کو ختم کرنے کا تذکرہ کیا۔ لیکن گورنر جنرل نے کونسل میں اس سفارش کو ماننے سے انکار کر دیا اور اس طرح مدرسہ کو نئی زندگی ملی۔

۱۸۶۳-۶۶ء تک مدرسہ کا نقشہ اس طرح تھا۔

خرچ	طلبا کی تعداد	
۱۰۹۳۷	۱۰۸	۱۸۶۳-۶۴
۱۰۳۱۷	۰۹	۱۸۶۴-۶۵ء
۱۶۳۸۹	۷۳	۱۸۶۵-۶۶ء

اس مدرسہ میں ماہانہ فیس صرف ۸ آنے تھی۔ ۵

۱۹۵۷ء میں شمس العلماء مولانا کمال الدین اس مدرسہ کے پرنسپل مقرر ہوئے۔ اس سے قبل صرف انگریز ہی اس عہدہ پر فائز رہتے تھے۔

کلکتہ کا مدرسہ صرف کلکتہ شہر کے افراد ہی کے لیے نہیں تھا۔ بلکہ اس کا اثر پورے بنگال پر تھا۔ مدارس اور مکاتب کا زیادہ تر قیام مشرقی بنگال میں ہوا تھا۔ مدارس کے امتحان کے لیے ایک مرکزی بورڈ کا خیال عمل میں آیا اس طرح یہ مدارس کلکتہ مدرسہ سے ملحق کر دیے گئے

۱۹۴۷ء کی تقسیم کے بعد مدرسہ کو پھر ایک زبردست آزمائش کا سامنا کرنا پڑا۔ اس مدرسہ سے جو مدارس ملحق تھے، وہ سب مشرقی پاکستان منتقل ہو گئے۔ اس کا عربی شعبہ بند ہو گیا اور امتحان کے لیے جو بورڈ تھا وہ توڑ دیا گیا۔ اور اس کو ہگلی محسن کالج سے ملا دیا گیا۔

۴ر اپریل ۱۹۴۹ء کو مدرسہ دوبارہ کھلا۔ وہ تمام مراعات واپس مل گئیں۔ امتحان لینے کے لیے بورڈ پھر قائم ہوا اور اب اس بورڈ کا نام مدرسہ ایجوکیشن بورڈ پکارا جاتا ہے۔ موجودہ بنگال کی حکومت نے اس نظام کو بہت اہمیت دی ہے آج مساجد میں جو مکاتب قائم ہیں ان کے معلموں کو بھی سرکار نے تسلیم کر لیا ہے اور ہر مدرسہ کو سرکاری اعانت حاصل ہے اور وہی مراعات مل رہی ہیں جو اسکولوں کو مل رہی ہیں۔ یہ ایک مثبت قدم ہے۔

بقیہ مضمون "شادی خانہ آبادی"

دیتی ہے یا علیحدگی کے دوران بیوی کی کفالت کا بار شوہر پر ڈالتی ہے۔ وہ ملاقی نہیں جدا کرتی ہے۔ ایسے مقدمات میں کبھی عصمت اور وفاداری کی بات آ سکتی ہے۔ کبھی طبائع کے اختلاف اور مزاجوں کی ناہم آہنگی کی اور کبھی کفالت اور نان نفقہ کی۔ لیکن چند روز کی بات ہے ایک ریاست کی عدالت عالیہ کے سامنے ایک ایسا مقدمہ پیش ہوا جس کا تعلق میاں اور بیوی سے تھا اور [illegible] جس میں مذکورہ بالا نوع میں سے کسی کو [illegible] آیا تھا۔ عدالت عالیہ کے ایک جج نے ایک خاتون وکیل سے شادی کر لی۔ نکاح کے دو بول گویا [illegible] ہو گئے۔ ہائی کورٹ کے ایک دوسرے جج نے یہ اعتراض کیا کہ اس شادی کے بعد محترمہ کے لیے اسی عدالت میں وکالت کرنا مناسب نہ ہوگا جج اول اور ان کے رشتہ داروں کے حلقہ کو ہر طرح کے اثرات سے بالاتر ہونا چاہیے۔ وکیل صاحبہ مذکورہ [illegible] سابق جج نواس کو ایک غلط امید متزوج کی یہ بات ایک آنکھ نہیں بھائی کہ ایک غلط اصول پر شادی ہو جانے کی سزا اس طرح [illegible] ان کی وکالت آزادی اور مختاری کے لالے پڑ جائیں گے۔ وہ نہ صرف شوہر بلکہ ہائی کورٹ کے دوسرے ججوں کے اجلاس میں بھی پریکٹس نہ کر سکیں گی۔

سید حامد

شادی خانہ آبادی

بنیادی حقوق ہمارے دستور کی اساس ہیں
ن کی بڑی خوبی یہ ہے کہ خوشحالوں کی خوشحالی میں
ن کے بل پر اضافہ ہوتا رہتا ہے۔ یہ حقوق انصاف، جمہوریت
ر مساوات کا دلفریب لبادہ پہن کر آتے ہیں اور
یروں کی تجوریاں بھرتے چلے جاتے ہیں۔ جمہوریت کا مدعا
راد عاسب کے لیے برابر موقع کی فراہمی ہے۔ عوام
حقوق کے تحفظ کے نام پر خواص کے وسائل میں
افہ اس کا رات دن کا کھیل ہے۔ کون غریب آدمی
جو سپریم کورٹ تک حقوق کے تحفظ کے لیے مقدمہ کو
جا سکتا ہو۔ اور اگر بہت سے غریب آدمیوں نے
کر یہ جسارت کر بھی لی تو مقدمہ کا آخری نتیجہ جو
بھی ہو، ضمنی اور فوری نتیجہ بالکل واضح ہے: وکیل
ب کی دولت میں اضافہ۔ اس اندھیر نگری میں جسے
ری دنیا کا نام دیا گیا ہے، غریبوں کے نام پر
کا استحصال بلا تکلف کیا جاتا ہے۔ اس پر مستزاد
ان کا دہ بار رجحان کے سر جاتا ہے؛ بنیادی حقوق
آخر شریک غالب وہی تو ہیں۔

مشہور طنز نگار سویفٹ نے ایک ایسے
کا ذکر کیا تھا جہاں یہ بحث کہ انڈے کو گول سرے
یلے سرے سے توڑا جائے شدید، طویل اور تباہ کن
ف کا سبب بن گئی تھی۔ اور کیوں نہ ہو اس
ان میں اختلاف ہی سے تو ساری چہل پہل ہے
ہ بغیر دنیا سونی ہو جائے۔ اور پھر اس سے
زیادہ اہم موضوع ہو بھی کیا سکتا ہے۔ انڈے کی غذائیت
سے کون سلیم الطبع انسان انکار کر سکتا ہے۔ اس میں
غذا کے اتنے ذخیرے بھرے ہوتے ہیں کہ ایک زندگی
وجود میں آتی ہے اور نشو و نما پاتی ہے۔ انڈے کو
بجائے اس کے کہ بچے کو وجود میں لائے اور اسے
غذا فراہم کرے، اشرف المخلوقات انسان اسے کام
و دہن کی لذت اور اپنی نشو و نما کے لیے بے محابا اپنے
تصرف میں لے آیا ہے۔ اس کے بعد لازمی یہ سوال
پیدا ہوگا کہ اس "کنٹینر (کن ٹے نر) اس سربمہر
گلاس تک رسائی کسی دروازہ سے ہونا چاہیے
"گول" کا ...وئے سخن وسعت، اور کرۂ ارض کی طرف
ہے۔ "نوکیلے سرے" کا انداز تیر بہ ہدف ہونے
کا ہے۔ اس میں سمت کا تعین ہے اور گولائی میں
ابہام کا چور چھپا ہوا۔ جبھی تو کہتے ہیں کہ اس نے
گول جواب دیا۔ یا کسی بات کو ٹالنے کا ذکر آتا ہے
تو کہتے ہیں گول کر دو۔ لیکن ہاکی اور فٹ بال کے میدان
میں اتر جائیے تو گول کی بے مقصدی اور بے سمتی
افعال کے تعین اور مقصد کے حصول میں تبدیلی ہو جاتی
ہے۔ بہرحال گول سرے اور نوکیلے سرے والوں کی
نوک جھونک ختم نہ ہونا تھی، نہ ہوئی۔

جہاں تک اقوام عالم کا تعلق ہے، اس قسم کی
معنی خیز اور ما بعد الطبیعاتی بحثوں کو پناہ اور
فروغ دینے میں گزشتہ صدیوں سے مسلمان پیش پیش

رہے ہیں۔ انھوں نے سارے غیر اہم کاموں اور بے مصرف جھگڑوں مثلاً قدرت کے مشاہدہ، کتابوں کے مطالعہ، جستجو، ریاضت، مہم جوئی، طالع آزمائی، تحصیل علم اور تحقیق کو خیر باد کہہ دیا ہے۔ تاکہ یکسوئی کے ساتھ ایسے اہم مسائل کو چھیڑتے ہوئے گلے اور چڑھی ہوئی آستینوں اور کف بھرے ہوئے دھن اور گردن کی ابھری ہوئی رگوں کا خراج دے سکیں جیسے نماز میں آمین کو دبی زبان سے ادا کیا جائے یا بلند آواز سے، رکوع میں جاتے وقت ہاتھوں کو کانوں تک اٹھا کے جائیں یا نہیں۔ شہیدان کربلا کی یاد میں سنی اور شیعہ ایک دوسرے کا خون ہر سال کتنے دنوں تک بہائیں، اور کتنے افراد کو اس ذریں موقع سے استفادہ کا موقع دیں۔ پیر کے حضور سجدہ کرنے کے باوجود موحّد ہونے کا دعویٰ کریں یا نہ کریں

اسلام جیسے ابتدائی سیدھے سادے، بے صیقل، صاف اور واضح مذہب کو جو طفل مکتب کی سمجھ میں آجائے اور جس پر عمل کرنے میں ذرہ برابر دشواری نہ ہو سادگی اور بے رنگی کی تہمت سے کیوں نہ بچائیں۔ اصول اصول کی جو لوگ رٹ لگاتے ہیں وہ آئین قدرت سے ناواقف ہیں۔ اصل کے معنی جڑ کے ہیں اور فرع کے معنی شاخ کے۔ پیڑوں پر نظر ڈالنے والے جڑوں کو کب دیکھ پاتے ہیں۔ تنا، ڈالیاں، ٹہنیاں، پھل پھول پتے اور کونپلیں ہی نظر آتی ہیں اور آنکھوں کو ٹھنڈک پہونچاتی ہیں۔ برگد کو بھول کر جلیے تو جڑوں کو صرف زیر زمین پائے گا۔ انھیں کھود دینے سے کیا حاصل جڑیں کھل جائیں گی۔ مٹی ہٹ جانے کی تو ٹہنیاں سوکھنے لگیں گی۔ پتیاں مرجھا جائیں گی۔ اسی لیے تو اب ایک عرصہ سے مسلمانوں کے رہنماؤں نے انھیں اصول کی پرخطر وادی میں قدم رکھنے سے روک دیا ہے۔ انھیں فروعات کے برگ و بار سے آگے بڑھنے نہ دیا کہ ان سے آنکھوں کو ٹھنڈک پہونچتی ہے اور ذہن پر

صیقل ہوتی ہے۔ اصول کی راہ میں ایک قباحت اور ہے۔ یہ راہ سیدھی ہے۔ کولھو کے بیل کی طرح ایک پٹے ہوئے راستہ پر آنکھ بند کر کے زندگی بھر چلتے رہیے۔ ذہانت کو اس راہ میں جوہر دکھانے کا موقع ہی نہیں ملتا۔ طبعزاد باتوں کے لیے دروازہ بند ہے۔ اس راہ سے انحراف، اجتہاد، ایجاد، اُپج، پرواز اور خوش خرامی کی راہیں چھوٹ ہی نہیں پاتیں۔ اصولوں کی بے کیف یک رنگی سے دل کیوں نہ گھبرائے۔ زندگی کیوں نہ اجیرن ہو جائے۔ اصولوں میں رکھا ہی کیا ہے۔ سوائے پابندیوں کے۔ انسان ویسے ہی کیا کم مجبور ہے کہ ایک مجبوری اصولوں کے نام پر اور بڑھائی جائے۔ انسانی فطرت بندشیں قبول نہیں کرتی اور اسلام دین فطرت ہے۔

ہم مذہبوں کو چھوڑیئے، ہم وطنوں کی بات کیجیے ہمارے ہم وطنوں نے جن امور میں مہارت حاصل کی ہے ان میں ایک مقدمہ بازی بھی ہے۔ جو لوگ اپنے معاملات کو عدالتوں میں لے جاتے ہیں ظاہر ہے کہ وہ جذبۂ حب وطن کے تحت ایسا کرتے ہیں اور ملک کی عدلیہ پر اپنے اعتماد کا اعلان اور اظہار کرتے ہیں۔ جس طرح وہ لوگ جو ہنگامے برپا کرتے ہیں اور جرائم کے مرتکب ہوتے ہیں وہ انتظامیہ کو سند اعتبار عطا کرتے ہیں، اسے تعطل اور بے کاری سے بچاتے ہیں۔ وہ لوگ جو ذخیرہ اندوزی، نفع خوری، محصول آشامی، [illegible] قانون کے سوراخوں اور خامیوں سے فائدہ اٹھاتے ہیں وہ مجلس قانون ساز پر بڑا احسان کرتے ہیں کہ اس کے بنائے ہوئے قانون کے نقائص کو طشت از بام کر کے ان کے سدھار کی سبیل نکالتے ہیں۔ اگر ایسا نہ ہوتا تو اصول پرستی، راست روی اس [illegible] کساد بازاری سے کیوں ہونے لگتا۔

آپ نے سنا ہوگا کہ میاں اور بیوی میں جب کسی آن کسی صورت نہیں بنتی تو عدالت کو اکثر بیچ میں لانا پڑتا ہے۔ بعض مقدمات میں وہ ان کی علیحدگی کا حکم

باقی صفحہ نمبر ۳۰ پر

خواجہ الطاف حسین حالی مرحوم

آئینِ اکبری کی تصحیح

جب سرسید دہلی میں منصف تھے تو بابو قطب الدین مرحوم نے جو دہلی کے ایک مشہور تاجر تھے، ان سے درخواست کی تھی کہ اگر آپ آئینِ اکبری پر ایک تفصیلی نظر ڈال کر اس کی تصحیح اور درستی کر دیں تو میں اس کو چھپوا دوں اور اس کے معاوضے میں آئینِ اکبری کے چھپے ہوئے نسخے قیمتی سو روپے تک آپ کی نذر کروں گا۔ سرسید نے منصفیٔ دہلی کی حالت میں وہیں کے ایک تاجر سے ایسا معاہدہ کرنا جائز نہ سمجھا۔ مگر چوں کہ ایسے مفید اور دشوار کاموں میں ان کا جی بہت لگتا تھا، بغیر کسی معاوضے کے انھوں نے یہ کام شروع کیا۔

آئینِ اکبری اول تو زبان اور طرزِ بیان کے لحاظ سے ایک نئی طرح کی کتاب تھی۔ دوسرے جس قسم کے مضامین اس میں بیان کیے گئے ہیں، فارسی لٹریچر میں کبھی اس قسم کے مضامین بیان نہیں ہوئے تھے۔ اس لیے اس کے پڑھنے سے جی ا[illegible] تھا۔ پھر آئینِ اکبری کے نسخے کاتبوں کے سہو و خطا سے اکثر مسخ ہو گئے تھے۔ اس لیے اس کا صحیح کرنا سخت دشوار تھا۔ سرسید نے اول جہاں تک مل سکے، اس کے متعدد نسخے بہم پہونچائے۔ اس میں ایک آدھ نسخہ صحیح بھی مل گیا اور اس طرح غلط اور صحیح نسخوں کے باہم مقابلہ کرنے سے ایک نسخہ سب سے زیادہ صحیح تیار ہو گیا۔ اس کے بعد انھوں نے فارسی، عربی، ترکی، ہندی اور سنسکرت کے اکثر غریب الفاظ کی شرح کی۔ جو اصطلا[حیں] اکبر کے زمانہ میں ہر ایک آئین کے متعلق تھیں یا خود ابوالفضل نے اختراع کی تھیں۔ ان کی جا بجا تشریح کی۔ اس زمانہ کے اوزان و نقود سے مطابقت کی۔ جن جدولوں میں مصنف نے کچھ خانے خالی چھوڑ دیے تھے اور تمام نسخوں میں وہ خانے خالی پائے گئے، ان کو اور کتابوں سے تحقیق کر کے معمور کیا۔ کہیں کہیں جدولوں میں خود مصنف نے غلطی کی تھی، اس کو بہت کوشش سے تحقیق کر کے صحیح کیا۔ بعض جدولوں میں ہندسوں کی جگہ حروف لکھے ہوئے تھے، ان کی قیمت ہندسوں میں بھی ظاہر کر دی۔ بعض جدولیں جو تمام نسخوں میں مختلف پائی گئیں وہ آئین کے انگریزی ترجمے کے مطابق جس میں ہر جدول نہایت صحت کے ساتھ لکھی گئی تھی، کتاب میں داخل کیں۔ اکثر جدولوں میں ایک خانہ اپنی طرف سے آخر میں اس لیے اضافہ کیا کہ اس سے پہلے خانہ کا مفہوم ہر شخص بآسانی سمجھ جائے۔ جہاں آئین میں سکوں کا بیان ہے وہاں چند اوراق بطور حاشیے کے اپنی طرف سے بڑھائے اور اکبر کے زمانے کے جس قدر سکے ابوالفضل نے بیان کیے تھے ان میں سے ہر ایک سکے کی دو دو تصویریں دے کر دونوں طرف جو الفاظ یا عبارت کندہ تھے، ان کو دکھایا اور اکبری کے زمانے کے

آٹھ سکے سونے اور چاندی کے ان کے علاوہ اور نشان دیے۔ اس کے علاوہ اور بہت سی مفید باتیں اضافہ کیں۔

پھر اصل آئین میں خال خال تصویریں تھیں۔ سرسید نے نہایت محنت وجانفشانی اور حسن اہتمام سے بے شمار تصویریں دلی کے لائق مصوروں سے کھچوا کر کتاب میں اپنے اپنے موقع پر داخل کیں۔ مثلاً ٹکسال کے متعلق تقریباً پچاس پچپن تصویروں کے دو بڑے بڑے مرقع کھچوائے جن میں مختلف کاریگر اپنے اپنے آلات اور ظروف اور اوزار لیے ہوئے جدا جدا کام کر رہے ہیں۔ اسی طرح فلزات کے متعلق ترازو ے ہواتی اور ترازوے آبی کی تصویر، شکار اور یورش کے موقع پر خیمہ گاہ بادشاہی کی تصویر، آئین چراغ خانہ کے متعلق اکبر کی آتش پرستی اور اس کے تمام لوازمات کی تصویر، آئین شکوہ سلطنت کے متعلق تمام سامان تزک واحتشام کی تصویریں، فیلخانہ اور ہاتھیوں کی پوشش اور ہاتھیوں کی کشتی کی تصویریں، علیٰ ہذا القیاس تمام پھل دار اور پھول دار درختوں کی تصویریں اور ہر ایک درخت کے ساتھ اس کی شاخ اور برگ و ثمر یا پھول اور پتے کی تصویریں، اوراق گنجفہ قدیم اور گنجفہ مخترعہ اکبری کی تصویریں اور تمام ہتھیاروں اور زیوروں کی تصویریں اور ان کے سوا اور بہت سی تصویریں کھچوا کر کتاب میں شامل کیں۔ چنانچہ مسٹر ایچ بلاک مین پرنسپل کلکتہ کالج نے جو ۱۸۷۳ء میں آئین کا انگریزی ترجمہ چھاپا ہے اور اس میں انھیں تصویروں کی نقل لی ہے جو سرسید نے فارسی آئین اکبری میں داخل کی تھیں۔

پہلی اور تیسری دو جلدیں اس طرح صحیح اور درست کر کے مطبع میں چھپنے کو بھیج دی گئیں مگر دوسری جلد کی تصحیح میں یہ مشکل پیش آئی کہ ابوالفضل نے آئین خراج کے متعلق جو تمام ہندوستان کا محاصل لکھا تھا، وہ حصہ تمام نسخوں میں مختلف پایا گیا اور کوئی ذریعہ اس کی تصحیح کا نہ تھا۔ اتفاق سے دلی میں سرسید کے نانا نواب دبیر الدولہ کے وقت کی ایک کتاب مل گئی جس میں سلطنت مغلیہ کے کل بادشاہوں کے عہد کا محاصل نہایت مفصل اور صحیح طور پر درج تھا، اس کتاب سے تمام محاصل جو اکبر کے زمانہ کا تھا نقل کر کے دوسری جلد بھی مکمل کی گئی اور ایک لمبا دیباچہ جو گویا آئین اکبری پر ایک مفصل ریویو تھا، تحریر کر کے دوسری جلد کے ساتھ دلی میں چھپنے کو بھیجا۔ لیکن افسوس ہے کہ یہ جلد ابھی چھپنے نہ پائی تھی کہ غدر ہو گیا۔ اور اس کے جس قدر فرمے چھپ چکے تھے اور تمام وہ مسودہ اور دیباچہ ... تلف ہو گئے۔ اب اس آئین اکبری کی جو سرسید نے صحیح کی تھی، صرف پہلی اور تیسری دو جلدیں مطبوعہ ... کہیں کہیں پائی جاتی ہیں۔

(... ... حیات جاوید)

پبلشر قاضی عزالدین احمد مطبع میٹو کلچر پرنٹرس۔ مقام اشاعت ... ... اے ایم یو ...

علم الانسان ما لم یعلم

مدیر
سید حامد
وائس چانسلر علی گڑھ مسلم یونیورسٹی
علی گڑھ

مدیر مسئول
نورالحسن نقوی
استاد شعبۂ اردو علی گڑھ مسلم یونیورسٹی
علی گڑھ

پندرہ روزہ

تہذیب الاخلاق

علی گڑھ

(جلد ۲) — یکم اکتوبر ۱۹۸۳ء — (شمارہ ۱۹)

مدیر:

سید حامد

وائس چانسلر علی گڑھ مسلم یونیورسٹی
علی گڑھ

مدیر مسئول:

نور الحسن نقوی

استاد شعبۂ اردو علی گڑھ مسلم یونیورسٹی
علی گڑھ

مندرجات

قیمت فی پرچہ ——— ایک روپیہ

ششماہی ——— ۱۱ روپے

سالانہ ——— ۲۰ روپے

بیرونِ ہند سے

فی شمارہ ——— ایک ڈالر

سالانہ ——— ۱۵ ڈالر

رابطہ

نورالحسن نقوی

شعبۂ اردو علی گڑھ مسلم یونیورسٹی علی گڑھ

پہلی ستمبر ۱۹۸۲ء کا تہذیب الاخلاق بعض تبدیلیوں کے ساتھ پیش خدمت ہے۔ ہمیں افسوس ہے کہ قاضی معز الدین احمد صاحب رسالے کی ادارت سے سبکدوش ہو گئے ہیں۔ قاضی صاحب کو صحافت و طباعت دونوں کا غیر معمولی تجربہ ہے۔ اُمید تھی کہ اُن کی راہنمائی میں اس رسالے کو مزید استحکام اور قبولِ علم حاصل ہوگا لیکن صحت نے اجازت نہ دی کہ وہ اس کام کو جاری رکھ سکیں۔ تاہم یقین ہے کہ اُن کے مشورے اور قلمی تعاون دونوں ہمیں حاصل رہیں گے۔

تہذیب الاخلاق کی ظاہری شکل و صورت میں جو تبدیلی کی گئی ہے وہ بھی آپ نے ملاحظہ فرمائی ہوگی۔ زیرِ نظر شمارہ فوٹو آفسیٹ پر شایع کیا گیا ہے۔ ظاہر ہے اس طرح چھپنے والا رسالہ سیکڑوں نہیں ہزاروں کی تعداد میں چھپتا ہے۔ چنانچہ موجودہ شمارے سے تعدادِ اشاعت میں بھی کافی اضافہ کر دیا گیا ہے۔ ایک مشکل یہ کہ علی گڑھ میں آفسیٹ کے کاتب ناپید ہیں اور اس کا پریس موجود نہیں۔ جو اس طریقِ طباعت کو پسند کرے اس کا ایک پاؤں علی گڑھ میں ہو تو دوسرا دلّی میں۔ خرچ میں اضافہ اِن سب کے علاوہ۔ مختصر یہ کہ خطرات سے پوری طرح باخبر ہونے کے باوجود ہم نے بیچ بھنور میں کشتی ڈالنے کی ہمت کی ہے۔ اب چاہے یہ ڈوبے یا پار لگے اور ڈوبے گی کیوں۔ خدا نے چاہا تو پار لگے گی۔ ہاں شرط یہ ہے کہ آپ کا بھرپور تعاون ہمیں حاصل ہو۔

تعاون کی پہلی صورت تو یہ ہے کہ تہذیب الاخلاق کا خود مطالعہ فرمائیے۔ اپنے عزیزوں اور دوستوں کو اس کے مطالعے کا شوق دلائیے خود مستقل خریدار بنیے اور اپنے رفیقوں کو خریدار بنوائیے۔ جو دوست دور یا ملک سے باہر ہیں انھیں خود نمونے کی کاپی بھیجیے اور خریدار بننے پر آمادہ کیجیے یا ہمیں اُن کا پتہ تحریر فرمائیے کہ ہم اُن سے رابطہ قائم کریں۔ سرسید نے جب "تہذیب الاخلاق" جاری کیا تھا اس وقت ملک میں ایک ایسے رسالے کی شدید ضرورت تھی۔ آج ہمیں پھر ایسے ہی حالات کا سامنا ہے۔ ضرورت ہے کہ اس وقت جو مسائل درپیش ہیں تہذیب الاخلاق میں اُن پر کھل کے گفتگو ہو اور اُن کا حل تلاش کیا جائے۔

تہذیب الاخلاق کے لیے مالی امداد سے زیادہ جس چیز کی ضرورت ہے وہ ہے آپ کا قلمی تعاون! یہاں ہمارے حلقۂ اہلِ قلم تو ہیں ہی جن کی سرپرستی ہمیں یقیناً حاصل رہے گی۔ لیکن ان نوجوانوں سے بھی ہم اُمیدیں وابستہ کیے ہوئے ہیں جنھوں نے باصلاحیت ہونے کے باوجود لکھنے کی طرف توجہ نہیں کی۔ آپ جہاں بھی ہیں، جس کام میں بھی مصروف ہیں اس کو جاری رکھتے ہوئے ملک و قوم کے مسائل پر سنجیدگی سے غور کرنا بھی آپ کا ایک اہم فریضہ ہے، سیاست، عمرانیات

اقتصادیات، مذہب، قانون، تاریخ، تعلیم، اسپورٹس، سائنس، طب
جس موضوع سے بھی آپ دلچسپی رکھتے ہوں اس پر قلم اٹھائیے۔ ادارہ
تہذیب الاخلاق شکریے کے ساتھ آپ کی نگارشات کو قبول کرے گا۔
دو باتوں کا خیال البتہ ضروری ہے۔ آپ کو علم ہے کہ رسالے کے صفحات
کی تعداد کم ہے۔ اس لئے بہرصورت اختصار سے کام لیجئے۔ رسالے
کے قارئین میں دانشوروں کے علاوہ طلبا اور نوجوان بھی شامل ہیں
اس لئے جہاں تک ممکن ہو آسان زبان اور عام فہم طرز بیان اختیار
کیجئے تاکہ آپ کے مخاطبین کا دائرہ وسیع ہو اور آپ کی بات آپکی
قوم کے نونہالوں تک بھی پہنچے۔

علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کے طلبا اور ملک کے کسی بھی گوشے
میں یا ملک سے باہر تعلیم حاصل کرنے والے اور نوجوان جو تعلیم سے
فارغ ہوکر عملی زندگی میں قدم رکھ رہے ہیں ان سب سے ہمیں کچھ عرض
کرنا ہے اور وہ یہ کہ آنے والے زمانے کی تقدیر تو آپ کو لکھنی
ہے۔ آپکے قلم کا جنبش میں آنا بہرحال ضروری ہے۔ ممکن ہے شروع
شروع میں آپ کا قلم اٹک اٹک کے چلے مگر چلتا رہا تو ایک دن ضرور
رواں ہوگا۔ مولانا حالی ایک بار مولوی ذکا اللہ سے ملاقات کو
تشریف لے گئے۔ خواجہ غلام السیدین کے والد خواجہ غلام الثقلین
بھی ساتھ تھے۔ یہ اس وقت نوعمر تھے اور تعلیم پا رہے تھے۔
حالی نے تعارف کرایا۔ مولوی صاحب نے پوچھا "کچھ لکھتے بھی ہیں؟"
"جواب ملا" نہیں ابھی تو صرف پڑھتے ہیں" انھوں نے کہا "ٹھیک
ہے۔ پڑھ لیں گے تو آپ سے آپ لکھنے لگیں گے۔ پیالہ بھر جائے
تو رِسے بغیر نہیں رہتا" مگر تجربہ بتاتا ہے کہ مولوی صاحب کا خیال
درست نہیں تھا۔ ذہن کی سمائی بے پناہ ہے۔ یہ پیالہ کبھی لبریز
نہیں ہوتا۔ مطالعے کی اہمیت سے کسے انکار۔ مطالعہ بھی کیجئے، غور و
فکر سے بھی کام لیجئے لیکن اس کا جو نتیجہ برآمد ہو اسے صفحات پر
منتقل بھی ہوجانے دیجئے۔ مطالعے کے ساتھ ساتھ لکھنے کی مشق
بھی ضروری ہے۔ قلم کو رکھ دو تو اسے زنگ لگ جاتا ہے۔ اس سے
کام لیتے رہو تو اس کی روانی بڑھتی جاتی ہے۔ بہت ہیں جنھوں نے
بے حساب علم حاصل کیا مگر لکھنے کی عادت نہ ڈالی۔ نتیجہ یہ کہ وہ آج
اپنے خیال کو لفظوں کا روپ دینے سے قاصر ہیں۔

مسلم یونیورسٹی کے طلبا اساتذہ اور طلبائے قدیم سے یہ توقع
رکھنے میں ہم حق بجانب ہوں گے کہ وہ مختصراً لکھیں کہ یہاں آنے سے پہلے ان
کے ذہن میں اس ادارے کا کیا تصور تھا، کیا امنگیں لے کے وہ
یہاں آئے، اسے کیسا پایا۔ یہاں کیا سیکھا، یہاں کی اقامتی زندگی
کا تجربہ کیسا رہا، کیا توقعات یہاں پوری نہ ہوسکیں اور یہاں کے
ماحول میں وہ کن تبدیلیوں کے خواہاں ہیں۔ قارئین نے پسند کیا
تو اس قسم کی تحریروں کو ایک مستقل عنوان کے تحت پیش کیا جاتا
رہے گا۔

ہمیں کچھ ایسا محسوس ہوا کہ تہذیب الاخلاق کی فضا ذرا بوجھل
اور زیادہ سنجیدہ ہوگئی ہے۔ زبان کا چٹخارہ تو افراد ہی کو نہیں قوموں
کو بھی لے ڈوبتا ہے۔ تاہم رسالے کو کسی حد تک دلچسپ بنانے کی
کوشش کی گئی ہے۔ اس شمارے میں علی گڑھ کی ایک نامور شخصیت
پر مختصر سا مضمون شامل ہے۔ ہماری خواہش ہے کہ یہ سلسلہ جاری
رہے۔ آپ نے یہاں کی کسی یادگار شخصیت کو، خواہ وہ استاد ہو۔
طالب علم ہو یا یونیورسٹی کا کوئی خدمت گار، نزدیک سے دیکھا ہو تو اس کے
بارے میں اپنے تاثرات لکھ کر ہمیں بھیجئے۔

ادبی مضمون، افسانہ، شاعری وغیرہ کی اس رسالے میں گنجائش
نہیں لیکن اس بار آپ ایک انگریزی نظم کا ترجمہ ملاحظہ فرمائیں گے جو
شاعری کے سوا کچھ اور بھی ہے۔ ایسے تراجم شامل اشاعت کیے جاسکیں گے۔
اس شمارہ میں امتحان اور اس کے مسائل پر شعبۂ قطعی کے ایک استاد

کا مضمون پیش کیا جا رہا ہے۔ تعلیم کے اختلافی اور پیچیدہ مسائل میں سے
ایک مسئلہ امتحان بھی ہے۔ اسے غیر ضروری بلکہ ضرر رساں بتانے والے ماہرین
تعلیم کی تعداد بھی کم نہیں۔ بعض لوگ ایک سالانہ امتحان کے بجائے پورے
سال کی کارکردگی یا ماہانہ آزمائشوں کو بہتر خیال کرتے ہیں۔ ایسے ماہرین
تعلیم بھی ہیں جو امتحان کی گردن ہی قلم کر دینا چاہتے ہیں اور سال بھر جماعت میں
شریک ہونے والے کو سند کا حقدار خیال کرتے ہیں رہی بات لیاقت کی، تو
اُنکی دلیل یہ ہے کہ اب ملازمتوں میں اسناد کہاں دیکھی جاتی ہیں اُمیدوار کو
سے کہہ دیا جاتا ہے کہ یہ رہا گیند بلّا اور یہ ہے میدان۔ دکھاؤ اپنے ہنر مطلب
یہ کہ ملازمتوں کے لیے مقابلے کا امتحان ہوتے ہیں۔ پھر تعلیم کے خاتمے پر امتحان
کیا معنی؟ جو امتحان کے حامی ہیں اُن میں سے اکثر موضوعی امتحان
(OBJECTIVE TYPE TEST) کے علمبردار ہیں کہ اس کے لئے
وسیع مطالعہ درکار ہوتا ہے اور اکتساب کی آزمائش یا جانچ بالکل قطعی اور
سائنسی ہوتی ہے۔ اس کے مخالفین کا کہنا ہے کہ اس کا رواج ایک گونگی اور
اظہار بیان سے عاجز نسل کو جنم دے گا۔ اس خرابی کی طرف اشارہ کیا جاتا ہے
کہ اس طریق امتحان میں سوال کے سامنے کئی جواب درج کر دیئے جاتے ہیں کہ
امیدوار صحیح جواب کی نشان دہی کرے۔ مثلاً پوچھا جاتا ہے کہ پہلی جنگ آزادی کب
لڑی گئی اور سامنے تین جواب لکھ دیئے جاتے ہیں: ۱۷۵۰ء میں ۱۸۵۷ء میں
۱۹۵۷ء میں۔ امیدوار نہ چکرایا ہو تو چکرا جائے۔ ماہرین کا کہنا ہے کہ غلط جواب
ہرگز طالب علم کے سامنے نہ آنے دو۔ ورنہ وہ صحیح اور غلط دونوں کو گڈمڈ کر دے گا۔
مراد یہ ہے کہ امتحان کے مسئلے پر شامل اشاعت مضمون کی روشنی میں غور کیجئے۔
اور اپنی رائے کم سے کم الفاظ میں لکھ کر ہمیں بھیج دیجئے۔ نومبر کے شمارے میں امتحان
کے موضوع پر ایک مذاکرہ شامل ہوگا۔ اسی کے لیے آپ کی رائے درکار ہے۔ مختلف
موضوعات پر مذاکروں کا یہ سلسلہ انشاء اللہ جاری رہے گا۔

اور اب آخری بات۔ تہذیب الاخلاق کو زیادہ موثر اور زیادہ دلکش
بنانے کے سلسلے میں جو تجاویز آپ کے ذہن میں ہوں وہ مرحمت فرمائیے۔ ان
پر غور کیا جائے گا۔ انھیں شکریے کے ساتھ شایع بھی کیا جائے گا۔

ایک ضروری اطلاع یہ ہے کہ وقت کی تنگی کے باوجود فیصلہ کیا گیا ہے
کہ تہذیب الاخلاق کا اگلا شمارہ "سرسید نمبر" ہوگا۔

نورالحسن نقوی

موت پر ہنسنے کا حوصلہ

علی گڑھ میں مڈل اسکول کی تعلیم مکمل کرنے کے بعد میں نے
انٹرمیجیٹ کالج میں داخلہ لیا۔ کالج کی عمارت منٹو سرکل کے نام سے مشہور
تھی اور اس کے چاروں ہاسٹل منٹو اے، منٹو بی، منٹو سی اور منٹو ڈی
کہلاتے تھے۔

داخلے کی کارروائی مکمل ہوگئی تو ساتھیوں نے مشورہ دیا کہ ایک
کام باقی رہ گیا ہے اُس سے بھی آج ہی فارغ ہو جاؤ۔ کالج کے پیچھے جا کر
"منٹو ای" میں اپنا نام درج کرا لو۔ میں منٹو ای کا پتہ پوچھتا ہوا روانہ
اب جس سے پوچھوں "بھائی منٹو ای کدھر ہے۔ مجھے وہاں بھی آج ہی
اپنا نام درج کرانا ہے"۔ وہ ہنستے ہنستے دہرا ہو جائے۔
آخر معلوم ہوا کہ اسکول کے شریر لڑکوں نے یونیورسٹی کے
قبرستان کو "منٹو ای" کے نام سے مشہور کر دیا ہے۔ مجھے اپنی درگت پر
خفت تو ہوئی مگر ہنسی بھی بہت آئی۔ چلو اس بہانے موت پر ہنسنے
کا حوصلہ تو پیدا ہوا۔

(خواجہ احمد عباس)

حال کی زد میں ہم اچانک آجاتے ہیں، کیونکہ ہم نے ماضی
کو نہ اچھی طرح جانا تھا اور نہ اس پر غور کیا تھا۔

جی۔ ایم۔ ٹریویلین

اطہر پرویز
شعبۂ اردو علی گڑھ مسلم یونیورسٹی
علی گڑھ

یادش بخیر

ہم نے اب سے ۴۲ سال پہلے علی گڑھ میں داخلہ لیا تو نہ پوچھیے کہ ہمارا کیا حال تھا۔ کتنے ڈرے سہمے تھے ہم لوگ دوسرے ملکوں میں بھی جاکر اتنا پھونک پھونک کر قدم نہ رکھتے ہوں گے جتنا ہم یہاں پر سنبھل کر چلتے تھے۔ جیسے فلم میں "سلوموشن" ہو رہا ہو۔ دو لفظوں نے ہم کو چاروں طرف سے گھیر رکھا تھا۔ "ٹریڈیشن" اور "سینیر"۔ اس سے پہلے ہمیں اُن سے سابقہ نہیں پڑا تھا۔ پھر معلوم ہوا کہ سینیر تو ہوا برادرِ بزرگ۔ اور ہم ہو گئے "برادرِ خورد"۔ ہمیں ایک لمحے کو اپنی ہلکی پھلکی ذلت کا احساس ہوا۔ لیکن پھر بہت جلد ہمیں اطمینان بھی ہو گیا۔ شام کے وقت ہمارے سینیر جو "بیک روم پارٹنر" تھے، ہمارے پاس آئے اور کہنے لگے کپڑے پہن لیجیے۔ ذرا شمشاد تک چلیں ہم نے تعمیلِ حکم میں جلدی جلدی کپڑے پہنے، برسات کی امس میں شیروانی کے تمام بٹن لگائے اور اُن کے ساتھ ہولیے۔ شمشاد کے نام سے ابھی ہم آشنا نہ ہوئے تھے اور یہ سوچ رہے تھے کہ نہ جانے یہ کون صاحب ہیں جن کے یہاں ہمیں جانا ہے۔ راستے میں سینیر نے ہمیں علی گڑھ کے بارے میں کچھ باتیں بتائیں اور ہم انھیں سنتے ہوئے ایک ریسٹوران میں جا پہنچے۔ نام بھی تھا عجیب سا۔ "کیفے ڈی پھیل" انھوں نے چائے برفی نمک پارے کا آرڈر دیا۔ ہم نے ڈرتے ڈرتے نمک پارے اور برفی کھائی۔ حالانکہ اس کے بعد اس ۴۲ سال کے عرصے میں سیروں برفی اور نمک پارے کھائے ہوں گے لیکن اگر اس وقت یاد ہے تو اسی نمک پارے اور برفی کا ذائقہ۔ ذرا سی دیر بعد بیرا بل لایا۔ میں پہلے ہی اس شش و پنج میں تھا کہ بل کی رقم کیسے ادا کرنی ہے۔ چنانچہ میں نے فوراً جیب میں ہاتھ ڈالا سینیر نے ایک اشارے سے مجھے روک دیا اور بڑے اطمینان سے ایک روپیہ طشتری میں رکھ دیا۔ یہ بل چھ آنے کا تھا۔ بیرا دس آنے واپس اسی طشتری میں لایا۔ سینیر نے ایک ادائے خاص سے اس میں سے نو آنے اٹھا لئے، ایک آنہ چھوڑ دیا۔ بیرے نے ہمیں سلام کیا اور ہم وہاں سے اُٹھے۔ میری عادت ہے ذرا زور سے بولنے کی۔ سینیر آہستہ آہستہ بات کر رہے تھے مجھے احساس ہوا کہ سڑک پر زور زور سے باتیں نہ کرنا چاہئیں۔ کمرے پر پہنچے تو سینیر نے مجھ سے کہا۔ "پارٹنر۔ کیفے میں آپ کو بل ادا کرنے کی ضرورت نہ تھی۔ یہ بات بڑی نامناسب

تھی۔ میں آپ کے ساتھ تھا۔ یہ میرا حق تھا۔ کیا آپ کبھی گھر میں
اپنے بڑوں کے سامنے ایسا کر سکتے ہیں؟ اور اس میں کوئی
ایسی بات بھی نہ تھی۔ سچی بات تو یہ ہے کہ جب ہم آپ کی طرح
جونیر تھے تو ہمارے سینیئر بل ادا کرتے تھے اور ہم دل ہی دل
میں سوچا کرتے تھے کہ کب ہم سینیئر ہوں اور کب ہمیں یہ سعادت
حاصل ہو۔ بارے آج وہ وقت آیا ہے تو ہمیں محروم کرنا چاہتے
ہیں۔ وقت گزرتے دیر نہیں لگتی ایک دن آپ بھی سینیئر ہونگے
اور آپ بھی اسی طرح اپنے جونیر کے ساتھ چائے پئیں گے۔"

یہ دن میری زندگی کا بڑا اہم دن تھا۔ ہم نے کتنی باتیں سیکھیں۔
صبح اسٹریچی ہال میں داخلے ہو رہے تھے۔ اسٹریچی ہال کے
سامنے ایک بھیڑ لگی ہوئی تھی۔ ہم بھی وہاں نئی سلک کی سفید
شیروانی زیب تن کئے کھڑے تھے۔ کھڑے کھڑے تھک گئے تو
دیوار سے ٹیک لگا کر کھڑے ہو گئے وہاں سے ہٹے تو مذاق کا نشانہ
بنے۔ بعد میں معلوم ہوا کہ پیٹھ پر دیوار کا لال نشان پڑ گیا تھا اور
ہر ایک پہچان گیا تھا کہ ہم نووارد ہیں۔

اسٹریچی ہال میں کچے لال رنگ کی پتائی ہوئی تھی۔ ذرا
چھو جانے سے رنگ چھوٹتا تھا۔ ذرا سی دیر میں معلوم ہوا کہ اسٹریچی
ہال نوواردوں کا حمام بن گیا ہے۔ کمرے پر آئے تو شیروانی پر پیچھے
گہرا لال داغ پڑا ہوا تھا۔ سینیئر نے کہا "پارٹنر دیوار سے ٹیک
لگا کر کبھی مت کھڑے ہوا کرو۔ اُسی بُری عادت کو چھڑانے کے
لیے تو ہر سال داخلوں سے پہلے دیواروں پر کچے لال رنگ کی پتائی
ہوتی ہے وہ دن ہے اور آج کا دن۔ قسم لے لیجئے جو ہم نے کبھی
کسی دیوار کا سہارا لیا ہو جس طرح اپنے پیروں پر کھڑے ہو کر
چلنا سیکھا اسی طرح زندگی بھر چلتے رہے اور ان ہی پیروں پر
کھڑے رہے۔ یہ کچھ سینیئر کی تربیت کا اثر تھا اور کچھ یونیورسٹی
کی تعلیم کا۔ یہ بات ذہن میں جم گئی کہ سہارے اپنے نشان چھوڑ
جاتے ہیں۔

یہ سینیئر کہیں ایک دو نہیں تھے، قدم قدم پر ان سے سابقہ
پڑتا تھا۔ پڑوس میں ایک الہ آباد کے شناسا کا کمرہ تھا۔ اگلے دن
ہم ان سے ملنے گئے۔ ہم سدا سے اپنے گھر میں رہتے آئے تھے۔ بچپن سے
پڑوسیوں کے گھر آنا جانا تھا کبھی اس کی ضرورت نہ پڑی کہ ہم دروا
کھٹکھٹا کر داخل ہوئے ہوں۔ علی گڑھ آئے تو اس کو بھی خالہ جی کا گھر سمجھ
دندناتے ہوئے دوست کے کمرے میں داخل ہو گئے۔ دوست نے
مسرت کا اظہار کیا۔ ہم لوگ بے تکلفی سے باتیں کرنے لگے کہ بیک روم
سے سینیئر کی آواز آئی "ارے بھائی کون صاحب آئے ہیں ہم بھی آتے
ہیں"۔ باہر نکلے تعارف ہوا۔ باتیں شروع ہوئیں۔ بار بار کہتے تھے "مجھے
پتہ نہ چلا کہ آپ کب آئے"۔ ایک بار بولے "شاید آپ کے جوتے کے
سول ربر کے ہیں۔ پندرہ بیس منٹ کے بعد ہم اپنے کمرے میں آگئے
لیکن ابھی شیروانی اُتاری بھی نہ تھی کہ کمرے پر کسی نے دستک دی۔ میں نے
کہا "کون صاحب ہیں تشریف لائیے"، دیکھا تو وہی ہمارے دوست کے
بیک روم پارٹنر تھے۔ کوئی بڑی معمولی سی بات یاد آگئی تھی۔ سو کہہ کر چلے
گئے۔ لیکن یہ سبق سکھا گئے کہ جب کسی کے کمرے میں جاتے ہیں تو دروازے
پر دستک دے کر داخل ہوتے ہیں۔ سو یہ عادت آج تک قائم ہے۔

میں آج سب کے سامنے اس کا اعتراف کرنا چاہتا ہوں کہ اساتذہ
نے کلاس روم میں جو کچھ پڑھایا اس کا بیشتر حصہ وقت کے ساتھ ذہن سے
محو ہو گیا ہے لیکن ہمارے استادوں اور سینیئرز نے جو تربیت دی تھی
وہ آج بھی ہماری روزمرہ زندگی کا حصہ ہے۔ سینیئر بھی ہمارے چھوٹے
موٹے اُستاد تھے۔ اُن کی زبان سے کبھی کوئی بُرا کلمہ نہیں نکلا۔ ناراضگی
میں کوئی ناشائستہ لفظ زبان پر نہ آیا۔ خیر اسے چھوڑیئے۔ ابھی ہمیں آئے
ہوئے زیادہ دن نہ ہوئے تھے کہ پارٹنر سے ہمارا اختلاف شروع ہو گیا
ہم دونوں ایک دوسرے کی کمزوریوں کو غور سے دیکھا کرتے اور اُن
کے بارے میں چہ میگوئیاں کرتے۔ یہ سلسلہ کچھ دن چلا۔ ایک دن ہما

سینیئر نے ہم دونوں کو "بیک روم" میں خاص طور پر بلایا۔ چائے کا اہتمام تھا۔ اب ہمارے اندر تھوڑا سا اعتماد پیدا ہو گیا تھا۔ لیکن سینیئر کا رعب اپنی جگہ پر تھا۔ چائے کے بعد انھوں نے ہم دونوں کو مخاطب کیا:

" میں چند روز سے دیکھ رہا ہوں کہ آپ لوگوں کے تعلقات میں وہ پہلی سی بات نہیں رہی۔ حالانکہ آپ دونوں بہت اچھے ہیں۔ پڑھنے لکھنے کا شوق ہے۔ پابندی سے کلاس جاتے ہیں۔ استادوں کی عزت کرتے ہیں بڑوں کا احترام کرتے ہیں لیکن جب میں نے غور کیا تو میرا اپنا خیال یہ ہے کہ اس اختلاف کا سبب یہ ہے کہ آپ لوگ ایک دوسرے کی کمزوریوں پر نظر رکھتے ہیں اور خوبیوں کی طرف توجہ نہیں دیتے۔ کمزوریاں کس میں نہیں ہوتیں۔ بے عیب تو خدا کی ذات ہے کیا آپ سمجھتے ہیں کہ ہوسٹلوں میں جتنے لڑکے رہتے ہیں سب کمزوریوں سے مبرا ہیں۔ انسان کمزوریوں اور اچھائیوں کا مجموعہ ہوتا ہے۔ علی گڑھ میں ہم سب ایک دوسرے کی کمزوریوں کے ساتھ رہنا سہنا سیکھتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ یہاں کے بارے میں اگر یہ کہا جائے کہ علی گڑھ کا طالب علم شیطان کے ساتھ بھی رہ سکتا ہے تو کوئی مبالغہ نہیں۔ اس لیے میری درخواست ہے کہ آپ دونوں اپنے تعلقات کو پھر سے نئے انداز سے قائم کریں۔"

سینیئر نے بڑی لمبی تقریر کی جو ہم لوگوں کے دلوں میں گھر کرتی چلی گئی اور اُن کی تقریر آخر میں اتنی موثر ہو گئی کہ بس ہم روتے روتے رہ گئے۔ کیونکہ ہمیں اپنے گھر کا خیال آیا۔ جب انھوں نے کہا " سوچیے کہ آپ لوگ اپنے بہن بھائیوں سے الگ ہوئے ہیں اور اب آپ ایک دوسرے کی رفاقت کر کے اِس کو پورا کر سکتے ہیں۔"

اُنھوں نے ہمیں گلے ملوایا اور ہم نے سینیئر سے معافی مانگی کہ ہمارے رویے سے اُن کو تکلیف ہوئی۔ پھر تو جو مسئلہ بھی ہوتا ہم اُن کی طرف رجوع کرتے اور سچ ہے کہ انھوں نے ہمیں جو محبت اور شفقت دی اس کو لفظوں کے ذریعہ ظاہر نہیں کیا جا سکتا۔ ہم اپنے کو برخوردار سمجھتے تھے۔ ہمارے دل میں اُن کی عزت روز بروز بڑھتی ہی چلی گئی اور جب وہ اپنی تعلیم ختم کر کے علی گڑھ سے روانہ ہوئے تو ہمیں یہ احساس ہوا کہ آج ہمارا بڑا بھائی ہمیں چھوڑ کر جا رہا ہے، سچ ہے اِسی کا نام سینیارٹی ہے اور اس کے بغیر میں علی گڑھ کا تصوّر ہی نہیں کر سکتا۔ ●●

ڈاکٹر ذاکر حُسین

اَچّھا اُستاد

اُستاد کی کتابِ زندگی کے سرورق پر "علم" نہیں لکھا ہوتا۔ "محبت" کا عنوان ہوتا ہے اُس کی زندگی کی جڑیں محبت کے سرچشمے سے سیراب ہوتی ہیں۔ اس لیے یہ وہاں اُمید رکھتا ہے جہاں دوسرے دل چھوڑ دیتے ہیں وہاں تازہ دم رہتا ہے جہاں دوسرے تھک جاتے ہیں۔ اسے وہاں روشنی دکھائی دیتی ہے جہاں دوسرے اندھیرے کی شکایت کرتے ہیں۔ یہ زندگی کی پستیوں کو بھی دیکھتا ہے لیکن ان کی وجہ سے اس کی بلندیوں کو بھول نہیں جاتا اور بڑے کی قدر کے ساتھ ساتھ چھوٹے کی اہمیت کو نظر انداز نہیں کرتا۔ فوق البشر کا تصوّر بھی آنکھوں کے سامنے رکھتا ہے شاگرد کی مدد کو اپنی زندگی کا افتخار جانتا ہے اور اس نوعمر کی طرف سے جب ساری دنیا مایوس ہو جاتی ہے تو بس دو آدمی ہیں جن کے سینے میں امید باقی رہتی ہے۔ ایک اُس کی ماں اور دوسرا اچھا استاد! ●●

انسان کے اطوار میں ہنسی سب سے زیادہ پردہ برانداز ہے۔ ہنسی طبیعت کی عکّاس ہے۔ بعض لوگوں کی ہنسی میں جعلی سکّوں کی جھنکار سنائی دیتی ہے۔

سڈنی ہیرس

خیال کی طاقت

راقم دولتِ مشترکہ کی یونیورسیٹوں کی انجمن کی طرف سے دوسرے مندوبین کے ساتھ برمنگھم سے آئرن برج (لوہے کا پل) گیا تھا۔ اس قصبے کا نام لوہے کے ایک تاریخی پل کے نام پر رکھا گیا ہے۔ دنیا میں لوہے کا یہ پہلا پل ہے اور آئرن برج کے قصبے کے ساتھ صنعتی انقلاب کی شروعات کا رشتہ جڑا ہوا ہے۔ آجکل عوام اور حکومت کوشاں ہیں کہ اس تاریخ ساز بستی کو نئے سرے سے اس طرح بسائیں کہ وہ تاریخ ساز عہد زندہ ہو کر نگاہوں کے سامنے آجائے۔

وہاں دوسری عمارتوں اور کارخانوں کے علاوہ ایک پریس بھی دیکھا جو سترھویں صدی کے مطابع کی طرح آثارِ قدیمہ کی شان رکھتا ہے۔ پریس جو کچھ چھاپتا ہے لوگ اسے ماضی کا ارمغان سمجھ کر ہاتھوں ہاتھ لیتے ہیں۔ راقم نے اس مطبع میں چھپا ہوا ایک پرچہ خریدا جس میں ایک نظم درج تھی۔ اس کا عنوان تھا "اگر" (۱۴) اس کا ترجمہ تہذیب الاخلاق کے قارئین کی نذر ہے۔ غالب نے کہا تھا:

عالم تمام حلقۂ دامِ خیال ہے

دراصل انسان کی صلاحیت بے کراں اور اس کے خیال کی تعمیری طاقت گمان و قیاس سے بڑھ کر ہے۔ ہم سب کچھ کر سکتے ہیں بشرطیکہ ہم خود پر اعتماد اور کامیابی کا یقین رکھیں۔

سید حامد

(برمنگھم، ۱۷ اگست ۱۹۸۳ء)

اگر تم نے سوچا کہ تم ہار گئے ہو، تو ہار یقینی ہے
اگر تم نے سوچا کہ یہ کام تمھارے بوتے سے باہر ہے،
تو یہ کام لازمی طور پر تمھارے بوتے سے باہر رہے گا۔

تم جیت کے خواہاں ہو ؛ لیکن تمھارے دل میں
اگر یہ خیال بس گیا کہ تم جیت نہیں سکتے ، تو یاد رکھو
کہ تم ہرگز جیت نہیں پاؤ گے۔
جس لمحہ یہ خیال تمھارے ذہن سے گزرا کہ تم
ناکامیاب ہوگے ، تو جان لو کہ تم واقعی اسی لمحے ناکامیاب ہوگئے۔
زندگی کا تجربہ اگر کوئی بات بتاتا ہے تو وہ یہ ہے :
کامیابی خیال کی کوکھ سے ، ارادے کے بطن سے پیدا ہوتی ہے۔
کامیابی اور ناکامیابی کا فیصلہ دل و دماغ کرتے ہیں
اگر تم نے کمتری کا احساس کیا
تو تم واقعی کمتر ہو کر رہ جاؤ گے۔
اگر تمھیں اونچا اٹھنا ہے تو خیال اور حوصلے کو بلند رکھو۔
جب تک خود پر اعتماد نہ کرو گے ،
تمھارے ہاتھ کچھ نہ آئے گا
یہ ضروری نہیں ہے کہ زندگی میں وہی لوگ کامیاب ہوں
جو طاقتور اور ذہین ہیں۔
فتح اسی کے قدم چومتی ہے
جسے آغاز سے ہی اپنی فتح کا یقین ہوتا ہے۔ ●●

سید حامد
وائس چانسلر علی گڑھ مسلم یونیورسٹی

مسلم یونیورسٹی میں

تعلیمی اور اقتصادی سیمنار

گذشتہ ماہ علی گڑھ مسلم یونیورسٹی اور ہمدرد فاؤنڈیشن کے بزنس اینڈ امپلائمنٹ بیورو کے اشتراکِ عمل سے علی گڑھ میں مسلمانانِ ہند کی تعلیمی اور روزگاری حالت پر غور و خوض کرنے کے لیے ایک دو روزہ سیمنار منعقد ہوا۔ یہ اس اہم سلسلے کی دوسری کڑی تھی۔ پہلا سیمنار گذشتہ سال دہلی میں کیا گیا تھا۔

مسلمانانِ ہند کا بہت بڑا المیہ یہ ہے کہ وہ اصول کو چھوڑ کر فروع سے الجھ جاتے ہیں۔ ان کا ذہن تعمیری کے بجائے تنقیدی اور اکثر تخریبی ہو جاتا ہے۔ ان میں اداروں کو چلانے اور منصوبہ بنانے اور اسے عملی جامہ پہنانے کی صلاحیت بہت کم رہ گئی ہے۔ ان کا ردِّ عمل عقل سے زیادہ جذبہ پر منحصر ہوتا ہے۔ ان کا زاویۂ نگاہ اجتماعی سے زیادہ انفرادی ہوتا ہے۔ یہ دونوں خصوصیات ان کی پیش رفت میں سدِّ راہ ہیں۔

تازہ ترین ثبوت علی گڑھ سیمنار کی بابت ردِ عمل میں ملے گا جو محض اس بنا پر کہ اس سیمنار میں اقلیتی کمیشن کے صدر جسٹس حمید اللہ بیگ نے شرکت کی تھی اس کے خلاف احتجاج کیا گیا۔ کسی نے رُک کر یہ سمجھنے کی زحمت گوارا نہیں کی کہ سیمنار نے کن مباحث پر غور کیا اور ان کے متعلق وہ کس نتیجہ پر پہنچا اور آئندہ کے لیے غور و فکر، سروے اور تحقیق کی کیا کیا راہیں نکلیں۔ بہتر ہے اس کا فیصلہ ہو جائے کہ اقلیتی کمیشن پر ہمیں اثر انداز ہونا چاہیئے اور اس سے فائدہ اٹھانا چاہیئے یا اسے ایسی مجلسوں اور محفلوں سے دور رکھنا چاہیئے۔ دور رکھنے کا نتیجہ کیا ہوگا۔ وہ کمیشن جو بالعموم اقلیتوں اور بالخصوص مسلمانوں کے مسائل پر غور اور تحقیق کرنے کے لیے ترتیب دیا گیا ہے مسلمانوں کی صورتِ حالات اور ان کے مسئلوں سے بے بہرہ رہ جائے گا اور ان کے حق میں کوئی مؤثر سفارش نہ کر سکے گا۔ اس گنہگار انسان کو جس کے ہاتھ میں اس وقت قلم ہے یقین کامل ہے کہ اگر مسلمانوں نے اوائل اسلام میں یہی رخ اختیار کیا ہوتا جو وہ گزشتہ چند صدیوں سے کر رہے ہیں تو اسلام مکہ معظمہ میں اور وہ بھی چند بزرگانِ دین تک محدود رہ جاتا۔ حیرت ہے کہ جو لوگ صرف خدا سے ڈرنے پر ایمان رکھتے ہیں وہ اپنوں اور بیگانوں کی نکتہ چینی سے کیوں کر خوف کھانے لگے۔ جو دین کہ دنیا کی رہبری کے لیے تھا۔ اس کے ساتھ یہ کیسا انوکھا برتاؤ ہے کہ اسے دنیا کی نگاہوں سے چھپا کر رکھا جاتا ہے۔ اس کے ماننے والے کھل کر بات کرنے کا یارا بھی نہیں رکھتے۔ جس دین نے مشاہدہ، فکر و غور، تدبر و تفکر، جستجو اور حرکت پر زور دیا تھا اس کے نام نہاد ماننے والوں کا واسطہ اب صرف جمود سے رہ گیا ہے۔ طریق کار دراصل یہ ہونا

چاہیے کہ اپنوں یا بیگانوں میں سے اگر کوئی شخص ایسی بات کہے جو مسلمانوں کے مسلک یا عمومی مفاد کے خلاف ہو تو ہمارے اہل فکر اس کا معقول اور مسکت جواب دیں۔ ہم زندہ ہیں اور اس دنیا کا اور انسانیت کا ایک حصّہ ہیں۔ اس لیے لوگ ہماری حالت، ہمارے مسلک، ہمارے نقطۂ نظر کے متعلق گفتگو ضرور کریں گے۔ ان کا منہ کوئی بند نہیں کر سکتا۔ اگر ہم خدانخواستہ مردہ ہوتے اور آثار قدیمہ میں گنے جاتے تو ہم پر مورّخانہ اور ترحّمانہ نظر ہی ڈالی جا سکتی تھی اور وہ بھی کبھی کبھی۔ ہمیں زندہ ہونے کا حق اور تاوان ادا کرنا ہے۔ ہم پر تبصرہ ہوگا، نکتہ چینی ہوگی۔ ہمارا موازنہ دوسروں کے ساتھ کیا جائے گا۔ ہمیں تبصرہ کی توضیح کرنا ہوگی۔ نکتہ چینی کا جواب دینا پڑے گا۔ یہ دیکھنا ہوگا کہ ہم دوسروں کے بالمقابل تولے جا رہے ہیں تو وہ شخص جو ترازو لے کر بیٹھا ہے۔ ڈنڈی تو نہیں مار رہا ہے۔ جو ڈنڈی مارنے پر تلا ہوا ہے وہ جب تولے گا تو ڈنڈی مارے گا۔ ڈنڈی پر نگاہ رکھنا اور اسے سیدھا رکھنا ہمارا کام ہے۔ لڑ جھگڑ کر نہیں، سمجھا کر، مباحثہ اور مناظرہ سے نہیں۔ استدلال، توجیح، توضیح، افہام و تفہیم سے کہ یہی طریقہ اللہ تعالےٰ نے کلام پاک میں اختیار کیا ہے اور اسی راہ پر چل کر اسلام کی اشاعت کی گئی تھی۔

جہاں تک اجتماعی کے بجائے انفرادی زاویۂ نگاہ کو اختیار کرنے کا تعلق ہے اس کی مثال بھی مذکورہ سیمنار سے مل جائے گی۔ ایک محترم صحافی کو اپنے قیام کے متعلق کچھ شکایات ہوئیں (جو ایک حد تک بجا تھیں)۔ ان کی آزردگی نے سیمنار کی تحقیر کی شکل اختیار کر لی۔ بہرکیف۔ جس طرح گلدار اپنے نقوش نہیں بدل سکتا ہندوستانی مسلمان بھی اپنی بے مصرف نکتہ چینی اور اپنی انفرادی انانیت کو چھوڑنے کی طرف ہرگز مائل نہیں ہے۔ بے کار نکتہ چینی سے ایک طرف نکتہ چیں کی قوتِ عمل بالکل ضائع ہو جاتی ہے تو دوسری طرف جس پر نکتہ چینی کی گئی اس کی ہمّت ٹوٹ جاتی ہے۔ اور اگر اس کا اخلاص جنون کی حد تک نہیں ہے تو وہ یہ کہہ کر کنارہ کش ہو جائے گا کہ بھاڑ میں جائیں وہ لوگ جو نکموں، کاہلوں، باتونوں، ناکاروں، لفاظوں ریاکاروں کو تو گوارا کر لیتے ہیں اگر گوارا نہیں کرتے تو صرف اس شخص کو جو ان کی حالت سدھارنا چاہتا ہے، انھیں آگے بڑھانا چاہتا ہے۔ وہی تو ایک ان کا دشمن ہے۔ جذبات کے ابال کو بہ طیب خاطر قبول کرتے ہیں لیکن حقیقت پسندانہ تجزیہ اور کسوٹی پر پرکھنے کے ڈھنگ پر چیں بہ جبیں ہو جاتے ہیں۔

فی الحال ہم ان بے شمار اور گراں قدر مقالوں کا ذکر نہ کریں گے جو مختلف اجلاسوں میں ماہرین تعلیم و ماہرین اقتصادیات نے پیش کیے۔ ہم خطبۂ صدارت اور مسٹر سکسینہ جوائنٹ سکریٹری اقلیتی کمیشن کی تقریر سے اقتباسات پر اکتفا کریں گے۔

" یہ تصور کیا جاتا ہے کہ علی گڑھ مسلم یونی ورسٹی جو ہندوستان کے مسلمانوں کو جدید دور سے عہدہ برآ کرنے کی تحریک کا مرکز تھی، مسلمانوں کے مسائل پر غور اور تحقیق کرے گی۔ یہ خواب ہنوز تشنۂ تعبیر ہے۔ یہ بات دراصل ایک نیک فال ہے کہ یونیورسٹی اب اس بات کے لیے تیار ہو چکی ہے کہ مسلمانوں کی سماجی اور اقتصادی حالت کے متعلق تحقیق و تفتیش اور معنی خیز غور و خوض کرے ...."

مرکزی اقلیتی کمیشن، اقلیتی پینل اور ریاستوں کے اقلیتی کمیشن اپنی سی کوشش کر رہے ہیں لیکن مسلمانوں کے مسائل ہنوز ان کی گرفت میں نہیں آسکے ہیں۔ ان کے متعلق اعداد و شمار

صفر کے برابر ہیں۔ مسلمان اپنی صورتِ حالات کے متعلق رائے صرف تاثرات کی بنا پر قائم کرتے ہیں۔ اگر اعداد و شمار فراہم ہو جائیں اور ان کا تجزیہ اور اشاعت کی جائے تو مندرجہ ذیل نتائج نکلیں گے:

۱۔ ملک اور قوم اجتماعی ضمیر کو دھکا لگے گا جس کے نتیجے میں دوسرے فرقے اور خود حکومت کا زاویۂ نگاہ مسلمانوں کے متعلق بدل جائے۔

۲۔ اور وہ بے حسی اور بے تعلقی جو مسلمانوں کو اپنی حالت کی نسبت ہے، ٹوٹ جائے۔

ہندوستانی مسلمانوں کے زوال کے اسباب حسب ذیل ہیں:

۱۔ تعلیم سے غفلت۔ جسے افلاس نے اور بڑھا دیا ہے۔

۲۔ تبدیلی کی مدافعت اور جدید زمانہ سے عہدہ برآ ہونے سے گریز۔

۳۔ ملت دو دنیاؤں میں بٹ گئی ہے۔ جنھیں ایک دوسرے سے کوئی سروکار نہیں۔ ایک دنیا جدید تعلیم یافتہ اور خوشحال مسلمانوں کی۔ دوسری دنیا دینی تعلیم حاصل کرنے والوں اور ان کے ساتھ ساتھ عام غیر تعلیم یافتہ مسلمانوں کی۔ اس خلیج کو جس نے ملت کو دو نیم کر دیا ہے، پاٹنا ہوگا۔

۴۔ ہمارے اندر مل کر کام کرنے کی صلاحیت مفلوج ہو چکی ہے۔ اس صلاحیت کے بغیر ترقی کی ہی نہیں جا سکتی۔

۵۔ ایک ایسی ملت میں جہاں زیادہ تعداد ان پڑھ اور غریب عوام کی ہے، تعلیم یافتہ، باثر اور صاحب منصب لوگ نادانستہ ان کا استحصال کرنے لگتے ہیں۔ اس سے ایک نقصان یہ بھی ہے کہ عوام صحت مند قیادت سے محروم ہو جاتے ہیں اور آگے بڑھنے کا ولولہ ہی باقی نہیں رہتا۔

۶۔ خوف اور غیر محفوظ ہونے کا احساس جو مسلمانوں کے ذہن میں جاگزیں ہو گیا ہے اس کے سایہ تلے ریاضت، جوش اور امنگ سب مرجھا جاتے ہیں۔ ہر وقت یہ خطرہ دامن گیر رہتا ہے کہ ہمارے ساتھ جب ہوگی، زیادتی ہوگی۔ انصاف کبھی نہ ہوگا۔ یہ ذہنیت کیوں پیدا ہوئی۔ اس کی تفصیل میں جانے کا وقت نہیں اور اس کے متعلق دو رائے ہو سکتی ہیں۔ لیکن اس بارے میں سب کو اتفاق ہوگا کہ یہ ذہنیت ناصحت مند اور مضر ہے۔ آئین کی غیر جانب داری کے باوجود مسلمانوں کی ایوانِ اقتدار میں نمائندگی برائے نام ہے۔ وہ شرکت کے حوصلہ انگیز احساس سے محروم رہتے ہیں اور اس ولولے سے بھی جو ملک کے ارتقا اور تعمیر نو کے جلو میں آتا ہے۔

۷۔ کچھ تو تعلیم کی کمی کی وجہ سے، کچھ خشم گیں علاحدگی اور کچھ بڑھی ہوئی انانیت کی وجہ سے بہت سے مسلمان تناسب کے احساس سے ہاتھ دھو بیٹھے ہیں۔ چنانچہ وہ چھوٹی چھوٹی۔۔۔ غیر اہم باتوں پر جھگڑتے رہتے ہیں اور اہم مسائل کو نظر انداز کر دیتے ہیں۔ معاشرہ کی خدمت کا ان کے یہاں صیغہ ہی نہیں اور سوشل سروس کے بغیر کوئی معاشرہ ترقی کر ہی نہیں سکتا۔ اگر افراد معاشرہ کی فلاح اور ترقی کے لیے کام کرنے کو تیار نہ ہوں گے تو معاشرہ ترقی کر ہی نہیں سکتا۔

۸۔ بہت سی سطحوں پر مسلمانوں کے خلاف امتیازی برتاؤ روا رکھا جاتا ہے۔ اس کی وجہ دوسروں کی عداوت اس قدر نہیں، جتنی ذات برادری اور اقربا پروری کی روایت۔

کسی اقلیت کے جاندار اور سرخ رو ہونے کے لیے مندرجہ ذیل تینوں شرطوں کا پورا ہونا ضروری ہے:

۱۔ وہ اپنے مذہب، ثقافت اور روایات پر سختی سے پابند رہے۔

۲۔ ریاضت اور جاں فشانی کے ذریعہ وہ اپنے آپ کو اکثریت

سے بہتر ثابت کرے۔

۴. وہ اکثریت کے ساتھ اپنے تعلقات شگفتہ رکھے۔

یہ بات انتہائی ضروری ہے کہ مسلمان اپنی تعلیمی پسماندگی سے جلد از جلد نجات حاصل کریں۔ اب دوسرا قدم جو اٹھانا ہے وہ یہ ہے کہ تحقیق، ریسرچ، سروے، جائزے اور اعداد و شمار کی فراہمی کا کام انتہائی سنجیدگی، سلیقہ اور ثابت قدمی کے ساتھ کیا جائے۔

اس کا خیال رکھنا ہوگا کہ مسلمانوں کے مسائل کو سارے ملک کے مسائل کے پس منظر میں دیکھا جائے۔ مسلمانوں کو چاہیے کہ مشترک مسائل کو حل کرنے کے لیے وہ برادران وطن کے ساتھ سر جوڑ کر اور قدم ملا کر آگے بڑھیں۔

مسٹر سکسینہ نے اپنی تقریر میں عبرت ناک اعداد و شمار دیے اور دو باتیں ایسی کہیں جو مسلمانوں کے ضمیر کو جھنجھوڑنے کے لیے کافی ہیں۔ انھوں نے ہمدردانہ تجزیہ کے بعد اس رائے کا اظہار کیا کہ ان ممالک میں جہاں مسلمانوں کی آبادی دوسرے طبقوں کے ساتھ مخلوط ہے، ہر جگہ مسلمان تعلیمی اعتبار سے پسماندہ نظر آئیں گے۔

دوسری بات جو سکسینہ صاحب نے کہی اس کا تخاطب صرف ہندوستان کے مسلمانوں سے تھا۔ اس کا مفہوم یہ تھا کہ اقلیت کی صورت حالات کی منطق یہ ہے کہ وہ اکثریت سے بہت زیادہ محنت کرے اور اس پر فضیلت حاصل کرے۔ اس منطق پر ممالک و اقوام کی تاریخ نے مہر لگادی ہے۔ ایک ہندوستان ہی ایسا ملک ہے جہاں اقلیت نے نہ محنت کی، نہ دوسرے فرقوں سے مقابلہ کا دم بھرا۔

باقی تقاریر اور مضامین کے اقتباسات بھی انشاء اللہ قارئین کی خدمت میں پیش کیے جائیں گے اور یہ بھی کہ مسلمانوں کی تعلیمی اور اقتصادی و معاشی پسماندگی کو دور کرنے کے لیے کیا کیا قدم علی گڑھ مسلم یونیورسٹی اٹھانا چاہتی ہے۔ ●●

بقیہ: صدر جمہوریہ مالدیپ کو اعزاز

سے وہ پوری طرح باخبر ہیں۔ انھوں نے ہندوستان کے مسلم نوجوانوں کی تعلیم کے لیے یہ ادارہ قائم کیا تھا۔ میں سمجھتا ہوں کہ اس ملک میں جہاں مسلمانوں کی ایک زبردست تعداد (ستر ملین) موجود ہے وہاں ایسے ادارے کی ضرورت ہے جہاں اسلامی علوم اور سائنس کی تعلیم دی جا سکے۔

اس کے بعد اُنھوں نے اپنے ملک کی تاریخ پر روشنی ڈالتے ہوئے فرمایا کہ بارہویں صدی عیسوی میں عام قبول اسلام کے بعد ہی اس ملک کو ناموری حاصل ہوئی اور اس نے سربلند ہو کے جینا سیکھا۔ اُنھوں نے ان تکلیف دہ حالات کا بھی ذکر کیا جن سے آج عالم اسلام دوچار ہے اور اس پر افسوس کا اظہار کیا کہ دنیا میں آج بھی زور زبردستی کا دور دورہ ہے۔ طاقتور ممالک کمزور ملکوں کے ساتھ غلاموں کا سا سلوک کرتے ہیں۔ اس لیے دنیا کو آج اسلام کی پہلے سے بھی زیادہ ضرورت ہے۔ اسلام آج بھی دنیا کو عدل سکھاتا ہے اور مسلمانوں کے خلاف تلوار اُٹھانے والوں کے ساتھ بھی لطف و کرم کا سبق دیتا ہے۔ قرآن حکیم میں صاف ہدایت کی گئی ہے کہ دین کے معاملے میں کوئی جبر نہیں۔ اسلام غیر مسلموں کے تحفظ کی ذمہ داری قبول کرتا ہے۔ اسلامی حکومتوں میں بہت سے غیر مسلموں نے اعلیٰ عہدے حاصل کیے۔ مسلمانوں کو چاہیئے کہ وہ اپنے ہادی کے نقش قدم پر چلتے ہوئے امن، تحمل اور رواداری کی روایت کو برقرار رکھیں۔ محبت و مفاہمت کا راستہ اختیار کریں، نفرت، عداوت اور تصادم کی فضا سے خود کو دور رکھیں۔ مختصر یہ کہ اپنے آقا کے بتائے ہوئے راستے پر چلیں۔

آخر میں معزز مہمان نے ایک بار پھر یونیورسٹی اور اس کے اراکین کا شکریہ ادا کیا اور یقین دلایا کہ یہاں جس طرح اُن کا شاندار خیر مقدم ہوا ہے وہ ہمیشہ اُن کے ذہن میں تازہ رہے گا۔ انھوں نے کہا مجھے یقین ہے کہ یہ ادارہ ایک ایسی نسل کو فروغ دینے میں کامیاب ہوگا جو ملک اور ملت اسلامیہ کے لئے قابل فخر ہو اور علم و دانش کی وہ مشعل جو ہمارے بزرگوں نے روشن کر کے موجودہ نسل کے حوالے کی تھی اسے اور بھی منور کر کے آئندہ نسلوں کو سونپا جاسکے گا۔ ●●

محمد قاسم صدیقی
شعبۂ تعلیم اے ایم یو علی گڑھ

امتحان

کیا، کیوں اور کیسے؟

کسی بھی اسکول میں امتحانات کا نظام اس کے تعلیمی معیار کا آئینہ دار ہوتا ہے۔ ہر دور میں تعلیم و تدریس کی کارکردگی اور طلبہ کی ذہنی صلاحیتوں اور ان کی علمی لیاقتوں کا تجزیہ امتحانات کے ذریعہ کیا جاتا ہے۔ امتحان بچوں کی تحصیل علم کا اندازہ لگانے کے لیے تعلیمی عمل کا ایک اہم حصہ ہے۔ اس امتحان سے استاد کو اپنے کام کا جائزہ لینے میں بھی آسانی ہوتی ہے۔ جائزہ کی مدد سے وہ خصوصی طور سے دو باتیں معلوم کرنا چاہتا ہے۔

(الف) جو تعلّم پیدا کرنا مقصود تھا، وہ کس حد تک پیدا ہوا ہے۔

(ب) یہ غایت حاصل کرنے میں اگر کچھ کمی باقی رہ گئی ہے تو اس کی کیا وجوہ ہیں۔

ایک اچھا جائزہ بہ یک وقت استاد کو اپنی کوششوں کی کامیابی سے بھی آگاہ کرتا ہے اور ان اسباب کی نشاندہی بھی کردیتا ہے جو اس کی راہ میں رکاوٹ بنے ہوئے ہیں۔ اس طرح جائزہ یا آزمائش یا امتحان تدریس کے عمل کا لازمی جزو ہے۔

اس امتحان کے ذریعہ ہی ہم طلبہ کی لیاقت و صلاحیت کا اندازہ کرتے ہیں اور تعلیمی کارکردگی کی قدر و قیمت کا اندازہ لگاتے ہیں

امتحان کے ذریعہ ہی طلبہ کی ذہنی و علمی صلاحیتوں کا تجزیہ بھی ہوتا ہے لیکن یہ ذہنی اور علمی صلاحیتیں غیر مادّی اور غیر مرئی ہیں۔ اِن کو نہ دیکھا جاسکتا ہے اور نہ کسی ٹھوس چیز کی طرح تولا جاسکتا ہے لیکن ان کا تجزیہ ضرور کیا جاسکتا ہے۔ امتحانات میں جو نمبر دیے جاتے ہیں وہ طلبہ کی ذہنی و علمی صلاحیتوں کی کمی بیشی کی وجہ سے ہوتے ہیں۔ امتحانات کی خامیاں ایک طرف لیکن طلبہ کی استعداد کو پرکھنے کے لیے ہمارے پاس اور کوئی وسیلہ نہیں۔ سکنڈری ایجوکیشن کمیشن اور دوسرے ایجوکیشن کمیشن نے امتحان میں بہتری کی صورت پیدا کرنے کے لیے طریقۂ امتحان میں تبدیلیاں کرنے کی سفارشات کیں۔ اسی لیے اب ماہرین تعلیم امتحان کے بجائے پیمائش قدر پر زور دے رہے ہیں جو ایک نئی اصطلاح ہے اور جس کا مفہوم امتحان سے زیادہ وسیع ہے۔ اس سے یہ پتہ چل جاتا ہے کہ ہم کہاں تک تعلیم کے مقاصد کو حاصل کرسکے ہیں اور کس حد تک کامیاب یا ناکام رہے ہیں۔

طلبہ کے امتحانات سے جہاں تعلیمی و تدریسی عمل بڑھتا ہے وہیں طلبہ کی خامیاں اور کمزوریاں پتہ چلتی ہیں۔ معلّم کی کارکردگی کی جانچ بھی ہوتی ہے۔ اگر طلبہ کے نتائج بہتر ہیں تو اس بہتری میں معلم کا نمایاں کردار ہوتا ہے۔ معلّم کی بہتر تدریس کی بدولت ہی طلبہ کی علمی صلاحیتیں

کو فروغ حاصل ہوتا ہے۔ اگر طلبہ کے نتائج بہتر نہیں ہیں تو اس سے یہ نتیجہ اخذ کیا جاسکتا ہے کہ معلّم کی محنت میں کہیں کمی واقع ہوئی اور معلّم کی تدریس تسلی بخش نہیں۔ N.C.E.R.T نے امتحانات اور جائزہ کے سلسلہ میں اپنی اشاعت "درسیات برائے دس سالہ اسکول" میں پیمائش پر زور دیا ہے۔

" درمیانی مرحلے سے تحریری امتحانات کو طلبہ کے مضامین میں پیمائش قدر میں جگہ ملنی چاہیے لیکن آزمائش کے کئی طریقے ہونے چاہئیں اور صرف تحریری امتحانات نہیں لینے چاہئیں اور تحریری امتحانات کے طریقوں میں بھی تبدیلی کی ضرورت ہے۔"

ہمارے ملک میں طلبہ کی تعلیمی کارکردگی کا تجزیہ کرنے کے لیے عام طور سے دو قسم کے امتحانات ہوتے ہیں اور ان ہی امتحانات کے ذریعہ ان کی درجہ بندی ہوتی ہے۔ اور تعلیمی عمل جاری رہتا ہے

(الف) زبانی امتحان

(ب) تحریری امتحان

اسی کے ساتھ تحریری امتحان بھی کئی طرح کے ہوتے ہیں۔

(۱) موضوعی امتحان یا طویل تحریری آزمائش۔
Long Essay type

۲۔ مختصر تحریری آزمائش۔ Short Answer type

(۳) معروضی امتحان۔ Objective type

موضوعی امتحان روایتی اور قدیم ہے۔ اس امتحان میں آٹھ دس سوال ہوتے ہیں اور ان میں سے چار پانچ چھ سوالات کے جوابات تحریر کرنا ہوتے ہیں۔ سوالات کی تعداد مدت کے تعیّن پر ہوتی ہے اس طرح کے امتحانات کی عام نوعیت مضمون نگاری کی ہوتی ہے۔ اس میں طلبہ اپنے خیالات، نظریات اور افکار کا آزادانہ اظہار کرتے ہیں۔ اس میں طلبہ کو اظہارِ خیال کی آزادی ہوتی ہے۔ وہ اپنی تحریر سے نفسِ مضمون کی وضاحت کرتے ہیں اور قوتِ تحریر سے اپنے جوابات کو کئی صفحات پر پھیلا دیتے ہیں۔ جن طلبہ میں قوتِ تحریر کی کمی ہوتی ہے وہ نقصان میں رہتے ہیں۔ اس طریقۂ امتحان سے طالب علموں کی قوتِ اظہار کو غیر معمولی اہمیت حاصل ہوجاتی ہے جو طلبہ اچھی نثر لکھنے پر قادر ہوں وہ الفاظ کے گورکھ دھندے میں گھر کر حقائق سے بے خبر رہ کر دل نشین تحریر سے ممتحن کو متاثر کرلیتے ہیں۔ اس طریق کی سب سے بڑی خامی یہی ہے کہ طلبہ کو جوابات کے رٹنے پر زور دیا جاتا ہے۔ قوت حافظہ کی طرف زیادہ توجہ دی جاتی ہے۔ اس طرح ذہنی قوتوں کو ایک غیر تعلیمی کام کی نذر کر دیا جاتا ہے۔

دوسری سب سے بڑی خامی یہ ہے کہ اس طریق سے طلبہ کی واقفیت کے ایک بہت تھوڑے حصّہ کا اندازہ ہوتا ہے اور نصاب کا پورا حصّہ شامل نہیں کیا جاتا۔ اگر طلبہ نے نصاب کا نصف یا چوتھائی حصّہ بھی خوب اچھی طرح دیکھ لیا تو ان کی کامیابی کے لیے کافی ہے۔ اس میں طلبہ کے نفسیاتی تقاضوں کا کوئی خیال نہیں رکھا جاتا۔

اس امتحان میں ممتحن کی شخصیت، اس کے نظریات، مزاج اور رجحانات اثر انداز ہوتے ہیں جس کی وجہ سے طلبہ کے بہتر سے بہتر جواب بھی متاثر ہوتے ہیں۔ اگر اسی کاپی کو دوسرے ممتحن کے پاس بھیجا جائے تو نمبروں میں فرق ہوگا۔ حال ہی میں "دوبارہ جانچ" سلسلہ اس بات کا گواہ ہے کہ تین ممتحنوں کو بیاں بھیجے جانے پر ان کے نمبروں میں کافی فرق پایا گیا۔ اس طرح طلبہ کی علمی صلاحیتوں کی صحیح جانچ نہیں ہوتی۔

مختصر تحریری آزمائش کا طریقہ نہ نیا ہے اور نہ فرسودہ اس طریقہ امتحان کا رواج ایک زمانہ تک رہا۔ لیکن رفتہ رفتہ

طویل تحریری آزمائش نے اسے پس پشت ڈال دیا تھا۔ آج کل پھر اس طرف توجہ دی جا رہی ہے۔ اس امتحان میں طویل تحریری آزمائش کی خامیاں بھی نہیں اور معروضی آزمائش کی کمی کو بھی پورا کرتا ہے۔ اس میں ذہنی صلاحیتوں کے ساتھ ساتھ قوت حافظہ قوتِ ادراک اور قوت استدلال تینوں کو جلا ملتی ہے۔ اس میں قوّت تحریر کی بھی جانچ ہوتی ہے اور معلومات کی بھی۔ اس میں نصاب کے زیادہ ترحصّہ کو شامل کر لیا جاتا ہے۔ اس کا ایک فائدہ وقت کی بچت بھی ہے۔

ہربرٹ سوونیین نے صحیح کہا ہے۔

" ہو سکتا ہے کہ امتحان کو اس طرح ترتیب دیا جائے کہ اس سے محض عمل حافظہ کی تربیت ہو اور طلبہ کم و بیش اہم چیزیں یاد کرنے پر اپنا سارا وقت صرف کر دیں۔ تاکہ امتحان میں ان اہم چیزوں کے بارے میں وہ کچھ لکھ سکیں۔ اس طرح یہ طریقہ علمی فضیلت کے تنگ سے تنگ دائروں کے اندر طلباء کے ذہنوں کو محدود کر دیتا ہے۔

برخلاف اس کے سوالات ایسے انداز میں بھی ترتیب دیے جا سکتے ہیں جن سے طلباء کو واقعات کے باہمی رشتے معلوم کرنے پڑیں اور ان واقعات کو معنی خیز مسائل حل کرنے میں استعمال کرنے کی ضرورت پیش آئے اور پوشیدہ نظریات اور اصولوں کو واضح کرنا پڑے۔ نیز طلباء میں جزئیات سے عام نتائج نکالنے کی تحریص پیدا ہو اور فکر و قیاس سے کام لینے کا موقع ملے۔ دوسرے لفظوں میں سوالات اس ڈھنگ کے ہو سکتے ہیں جن سے طلباء کو غور و فکر کرنے پر مائل کیا جا سکے۔ لہٰذا امتحان میں واقعات کے علم کی جانچ ہی کافی نہیں بلکہ اس میں اس بات کا بھی موقع ہونا چاہیے کہ طلباء کے ذہنی عوامل کی خوبی اجاگر ہو سکے۔

معروضی امتحان

معروضی امتحان جدید اور سائنٹفک ہیں اور روایتی امتحان سے بہتر ہیں۔ اس میں جانچ بھی معروضی ہوتی ہے۔ جب کہ موضوعی امتحان میں یہ موضوعیت پر منحصر ہوتی ہے۔ معروضی امتحان میں کسی فرد کی ذاتی رائے کا کوئی اثر نہیں پڑتا ہے۔ اس طرح امتحان معلومات کی چھوٹی اکائیوں پر مشتمل ہوتا ہے۔ اس امتحان میں اکتسابی مواد کی شناخت کی جاتی ہے۔ امتحان میں مختلف باتیں تحریر کی جاتی ہیں۔ اور ان باتوں کے لیے طلباء کا صحیح ردِّ عمل معلوم کیا جاتا ہے۔ اس امتحان میں طلباء جواب میں ایک جملہ بھی نہیں لکھتے صرف دیے ہوئے جوابات سے صحیح جواب کی شناخت کرنا ہوتی ہے۔ طلبہ بعض عبارت یا سوال کے آگے غلط یا صحیح کا نشان لگا دیتے ہیں۔ بعض سوالات کی عبارت میں خالی جگہوں میں کوئی مناسب اور صحیح لفظ دریافت کیا جاتا ہے۔ یا چند الفاظ خود پیش کر دیے جاتے ہیں اور ان میں سے کسی ایک صحیح لفظ کو خالی جگہ میں لکھنے کو کہا جاتا ہے۔ اس طرح کسی سوال میں متعلقہ سوال یا عبارت کا لفظ یا جواب دریافت کیا جاتا ہے۔ اس سوال میں کئی عبارت کے جملے تحریر کر دیے جاتے ہیں اور اس کے سامنے غیر متعلق لفظ یا جواب لکھ دیا جاتا ہے طلباء کو متعلقہ عبارت کا صحیح لفظ تلاش کر کے لکھنا ہوتا ہے۔ یہ امتحان پورے نصاب کا احاطہ کرتا ہے۔ اگر کسی طالب علم نے پورا نصاب یا پوری کتاب نہیں پڑھی تو اس کو جواب لکھنے میں دشواری ہوگی۔ اس امتحان میں نصابی معلومات اور مطالعہ کو مرکزی اہمیت حاصل ہے۔ اس طریقہ سے طلبہ کی حاضر دماغی اور ذہنی صلاحیت کا بخوبی تجزیہ کیا جاتا ہے۔ اس امتحان کی جانچ آسانی سے کی جا سکتی ہے۔ حصولِ تفہیم کا اندازہ طلباء کی ان قابلیتوں سے لگایا جا سکتا ہے جن کی جانچ معروضی جانچ کے ذریعہ کی جا سکتی ہے۔ یہ قابلیتیں اس طرح ہیں۔

(۱) مضمون سے متعلق واقعات اصولوں اور تجزیہ کے لیے

کیے گئے عام اور خاص طریقوں کے بارے میں علم حاصل کرنے کی قابلیت۔

(۲) واقعات اصولوں اور تجزیے کے طریقوں کی تفہیم کی قابلیت

(۳) اصطلاحات کو صحیح طریقے سے استعمال کرنے کی قابلیت۔

(۴) تصورات اور بیانات کو منطقی ڈھنگ سے منظم کرنے اور پیش کرنے کی قابلیت۔

معروضی امتحان کے فوائد

(۱) یہ امتحان طلبہ کی حاضر دماغی اور علمی صلاحیت اور نصابی مواد کی جانچ کا موثر وسیلہ ہے۔ طلبہ نے اگر پورے نصاب کا بغور مطالعہ کیا ہے تو وہ آسانی سے دیے ہوئے جوابات سے صحیح جواب کو منتخب کرسکتا ہے۔

(۲) طلبہ کو مختصر جواب دینا پڑتا ہے یا صرف نشان لگانا ہوتا ہے۔ اس لیے اس میں نہ خوش خطی متاثر کرسکتی ہے اور نہ بدخطی، اس میں طلبہ کی نہ لفاظی کو دخل ہے، نہ ان کی طرز تحریر، نہ ذخیرۂ الفاظ۔

(۳) یہ امتحان ممتحن کی ذات، اس کے نظریات ورجحانات اور تعصب سے پاک ہے۔

(۴) یہ امتحان طلبہ کو مطالعہ اور محنت کی ترغیب دیتا ہے۔

(۵) اس امتحان میں نتائج جلد مرتب کیے جاسکتے ہیں۔

(۶) اس امتحان میں نقل کی گنجائش نہیں۔

"اصول"

۱۔ معروضی امتحان پورے نصاب پر محیط ہونا چاہیے۔ تاکہ طلبہ کے وسیع مطالعہ کا اندازہ ہوسکے۔

۲۔ اس میں جو جوابات ہوں وہ واضح اور ایک ہی ہوں تاکہ طلبا صحیح جواب کو تحریر کرسکیں اور دوسرا جواب جگہ نہ لے سکے۔

۳۔ اس امتحان میں مختلف شکلوں سے سوالات کیے جائیں صرف ایک ہی شکل سے جواب نہ حاصل کیے جائیں۔

۴۔ سوالات مختصر اور سادے ہوں اس میں مشکل پسندی نہ ہو۔

۵۔ سوالات کے ساتھ حل کرنے کا طریقہ اور ہدایت واضح دی جائے اور ایک مثال بھی پیش کی جائے تو بہتر ہے۔ تاکہ طلبہ اس کے مطابق سوالات حل کرسکیں

۶۔ سوالات کے سامنے خالی جگہ جواب کے لیے چھوڑ دی جائے۔

۷۔ سوالات طلبہ کے ذہنی وعلمی استعداد کے مطابق تیار کیے جائیں۔

۸۔ سوالات کی تعداد وقت کے مطابق ہونی چاہیے۔

۹۔ سوالات اس طرح مرتب کیے جائیں کہ ان کے حل کرنے کے سلسلہ میں اتفاق کو دخل حاصل نہ ہو۔

۱۰۔ سوالات واضح اور صاف تحریر ہوں تاکہ طلبہ پڑھ سکیں

اردو میں معروضی آزمائش کے سوالات کچھ اس طرح ہوسکتے ہیں۔

۱۔ صحیح وغلط TRUE and FALSE

اس میں بہت سے بیانات دیے جاتے ہیں اور طالب علم کو اس کی صحت یا عدم صحت کی نشاندہی کرنی ہوتی ہے۔ طلبہ صحیح بیان کے یا مواد کے آگے صحیح کا نشان (✓) اور غلط کے آگے غلط کا نشان × لگادیتے ہیں۔ اس طرح کے سوالات

کو واقعات اور تصورات وغیرہ کی جانچ کے لیے استعمال کیا جاتا ہے۔ اس آزمائش میں ان کی اکتسابی معلومات کی تصدیق ہوتی ہے اور یہ معلوم کیا جاتا ہے کہ اُن کی حاصل کردہ معلومات کہاں تک درست ہے۔

مثال ۱ ذیل میں چند الفاظ درج ہیں ان میں سے کچھ کے ہجے صحیح اور کچھ کے غلط ہیں۔ آپ کے خیال میں جس لفظ کے ہجے صحیح ہیں، اس کے آگے (✓) کا نشان اور جس کے غلط ہیں اس کے آگے (×) کا نشان بنا دیجیے۔

(الف) طالب ( ) ( )
طنز ( ) ( )
طنبخ ( ) ( )
طلسم ( ) ( )
(ب) نفسیاتی ( ) ( )
تاریخی ( ) ( )
اقتصادی ( ) ( )
عمرانی ( ) ( )

کثیر الانتخاب آزمائش Multiple Choice Test

اس آزمائش میں ممتحن ایک سوال کے کئی جواب خود تحریر کر دیتا ہے۔ طلبہ ان جوابات سے صحیح جواب کو منتخب کرتے ہیں۔ کبھی کبھی بہت سے بیانات دے دیے جاتے ہیں ان میں صرف ایک بات حسب ذیل ہوتی ہے۔ طلبہ کو ان بیانات میں سے ایک کا انتخاب کرنا ہوتا ہے۔

مثال ۱ نیچے چار چار لفظوں کا مجموعہ دیا ہوا ہے۔ ہر مجموعے کے اوپر ایک بنیادی لفظ ہے۔ ہر چار لفظوں کے مجموعے میں سے وہ لفظ منتخب کیجیے جو بنیادی لفظ کے معنیٰ سے ملتا جلتا ہو۔ اور سامنے بنے ہوئے بریکٹ میں (✓) کا نشان لگا دیجیے۔

تاوان

(۱) بہادری ( ) ( )
(۲) جرمانہ ( ) ( )
(۳) الزام ( ) ( )
(۴) احساس ( ) ( )

" دنیا میں زندگی کا کوئی مقصد قرار دے لوگوں کا ایک پاکیزہ اصول رہا ہے۔"

یہاں لفظ پاکیزہ کے کیا معنیٰ ہیں۔

واضح
اچھا
صحیح
اعلیٰ

" خدا کی زمین باوجود وسعت کے اس پر تنگ ہوجاتی ہے۔"

زمین کے تنگ ہوجانے سے کیا مراد ہے۔

مواقع کا محدود ہوجانا۔
مواقع کا عطا نہ ہونا۔
واقع کا دستیاب نہ ہونا
محروم ہوجانا۔

تکمیلی آزمائش The completion test

اس آزمائش میں ممتحن سوال یا بیان میں نامکمل جملہ تحریر کرتا ہے اور جگہ چھوڑ دیتا ہے۔ طلبہ سے اس بیان یا عبارت کی تکمیل کے لیے کہا جاتا ہے۔ طلبہ صحیح لفظ کو سوال کے سامنے خالی جگہ میں لکھ دیتے ہیں۔ یا اسی جگہ بھر دیتے ہیں۔

انیسؔ دم کا ...... نہیں ٹھہر جاؤ۔

ـــــ لے کے کہاں سامنے ہوا کے چلے۔
ہم پرورش لوح و ـــــ کرتے رہیں گے
جو دل پہ گزرتی ہے ـــــ کرتے رہیں گے
قرۃ العین کے ناولوں میں سب سے مشہور ناول
ـــــ ہے۔
شعر العجم ـــــ کی سب سے اہم کتاب ہے۔

مقابلہ یا تعلق کی آزمائش MATCHING TEST

اس آزمائش میں ایک طرف سوالات یا بیانات تحریر کر دیے جاتے ہیں اور دوسری طرف اس کے سامنے جوابات تحریر کر دیے جاتے ہیں۔ لیکن دونوں طرف کی عبارت یا بیانات ایک دوسرے سے تعلق اور مناسبت رکھتی ہیں۔ طلبہ متعلقہ جواب کو یا اس کا نمبر عبارت کے سامنے خالی جگہ میں تحریر کر دیتے ہیں۔

(۱) غبار خاطر   اقبال   ( )
(۲) بانگ درا   فیض   ( )

اصناف بندی کی جانچ

اس طرح کی جانچ میں سوالات میں کچھ ایسے الفاظ کا گروپ طلبہ کے سامنے پیش کیا جاتا ہے۔ جن میں ایک لفظ باقی الفاظ سے مطابقت نہیں رکھتا۔ اسی لفظ کو طلباء سے چھانٹنے کو کہا جاتا ہے۔ اسی طرح سے اس جانچ میں مماثل جانچ کے چند عناصر پائے جاتے ہیں۔

(۱) ڈاکٹر   (۲) معلم   (۳) وکیل   (۴) مزدور

معروضی امتحان کے ان چھ شماروں سے ایک بات واضح ہوتی ہے کہ یہ سوالات صرف معلومات پر مبنی ہو سکتے ہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ زبان وادب کے پرچہ میں اس قسم کے سوالات زبان کی تدریس کے مقاصد کو پورا نہیں کر سکتا۔ زبان کی تعلیم کا مقصد ہرگز معلومات بہم پہنچانا نہیں ہے۔ بلکہ بچے کے ہاتھ میں قلم اور منھ میں زبان دینا ہوتا ہے۔ ان امتحانات سے ایک طالب علم قوت متخیلہ، قوت تحریر اور قوت تجزیہ کو بروئے کار لانے سے قاصر رہے گا۔ اشعار کے معنیٰ و مفہوم۔ کہانی کے کرداروں کا جائزہ مصنف کی خوبیاں اور خامیاں کس طرح ان سوالات کے ذریعہ سامنے لائی جا سکتی ہیں۔

صرف یہی نہیں کہ وہ اس مقصد میں ناکام ہیں۔ دوسرا پہلو یہ ہے کہ ان سوالات کے ذریعہ آپ ایک بڑی تعداد میں سے کچھ افراد کو چن لینے کا کام تو لے سکتے ہیں، لیکن قابلیت اور لیاقت کی جانچ نہیں ہو پاتی۔ اسی لیے آل انڈیا بورڈ آف سیکنڈری ایجوکیشن نے حال ہی میں اس طریقۂ کار کو ناقص قرار دیا ہے اور اب زیادہ زور مختصر تحریری آزمائش پر ہے۔

یہ طریقۂ کار چھوٹے درجات میں اور بھی نقصان پہنچاتا ہے۔ تعلیم کا ایک اصول یہ بھی ہے کہ ایک غلط جواب کو بچے کے سامنے پیش نہ کیا جائے۔ یہاں ہم اس کو صحیح جواب کے ساتھ غلط جوابات کی فہرست پیش کرتے رہیں جو نفسیاتی اعتبار سے غلط قدم ہے۔ ماہرین تعلیم بہت برسوں کی آزمائش کے بعد اس نتیجے پر پہنچ چکے ہیں کہ آزمائش کے تینوں طریقوں کو یکجا کرنا چاہیے اور ان سے استفادہ کرنا چاہیے تاکہ ہر ایک کے مثبت پہلوؤں سے فائدہ اٹھایا جا سکے۔

ڈاکٹر ایل کے حیدر

مختار مسعود

ڈاکٹر ایل. کے. حیدر علی گڑھ کے نامور فرزند، کامیاب معلّم اور ماہرِ معاشیات تھے۔ اُن کا ایک دلچسپ خاکہ یہاں پیش کیا جارہا ہے۔ اِس کے مصنّف عہدِ حاضر کے مقبول نثر نگار جناب مختار مسعود ہیں جو علی گڑھ کے قدیم طالب علم ہیں۔ ان پر مسلم یونیورسٹی بجا طور پر فخر کرسکتی ہے۔ اُن کی تصانیف — آوازِ دوست اور سفرِ نصیب — کو ادبی حلقوں میں بہت سراہا گیا ہے۔ تہذیب الاخلاق کے مختصر صفحات کے پیشِ نظر اِس خاکے میں کتر بیونت سے کام لیا گیا ہے۔

مدّت ہوئی کریم حیدر نامی ایک لڑکا پوٹھوار کے قصباتی اسکول میں پڑھتا تھا۔ ایک روز اسکول جاتے ہوئے وہ کچے دیہی راستے میں آنے والے مٹّی کے ڈلوں کو قدم قدم پر ٹھوکر مار رہا تھا۔ گھوڑے پر سوار ایک انگریز ادھر سے گزرا۔ اس نے گھوڑا روک کر لڑکے کو ایک نصیحت کی۔ "ہر انسان کا فرض ہے کہ وہ جذبے کو اظہار کے لیے بہترین مواقع فراہم کرے۔ ٹھوکر مارنے کو جی چاہے تو جاؤ فٹ بال کھیلو۔" وہ لڑکا پڑھنے اور کھیلنے کے لیے ایم۔ اے۔ او۔ کالج میں داخل ہوا۔ کالج میں فٹ بال کا کپتان بنا۔ طلبا کی یونین کا صدر منتخب ہوا۔ امتحان میں اوّل آیا۔ آغا خانی اسکالرشپ ملا۔ کیمبرج سے ڈاکٹریٹ ملی اور آخرکار وہ مسلم یونیورسٹی میں شعبۂ معاشیات کا پروفیسر اور صدر ہوا۔

ڈاکٹر ایل کے حیدر کو جب میں نے پہلی بار غور سے دیکھا تو وہ بڑے بارعب نظر آئے۔ یہ شروع کے دنوں کی بات ہے اور اب اس کی وجہ بھی سمجھ میں آتی ہے۔ میں لڑکپن کی سرحد کے پار زمینِ بے یاری کا مسافر تھا۔ جسم دبلا، نرخرہ بے قابو، آواز بے سُری اور قد لانبا۔ لمبے ہونے کی رفتار یہ تھی کہ ہر تین چار ماہ کے بعد ٹخنے پائینچوں سے جھانکنے لگتے۔ اُدھر ایک عمر رسیدہ، سنجیدہ اور جہاں دیدہ آدمی۔ ایک فربہ، کم گو اور بھاری بھرکم شخصیت۔ یورپ میں پڑھا ہوا اور انگریز حکومت کا مانا ہوا ماہرِ معاشیات۔ ہیرس ٹوئیڈ کا چارخانہ کوٹ اور برجس نما پلس فلور پہننے والا شخص جو عید کے روز شلوار قمیص اور مشہدی کلاہ و دستار میں نظر آتا۔ ایک سہ پہر گالف اسٹک لے کر بال اٹھانے والے پیش خدمتی کے ساتھ پیدل چلنے والا اور دوسری سہ پہر جرمن میم کے ہمراہ گھڑسواری کرنے والا صاحب۔ بہت سے لوگ جنھیں ڈاکٹر ایل کے حیدر کو نزدیک سے دیکھنے کا موقع نہیں ملا وہ انھیں نرا صاحب سمجھتے تھے۔

ڈاکٹر ایل کے حیدر کی کوٹھی میں خاموشی چھائی رہتی تھی۔ ڈاکٹر

حیدر اور اسٹیفنی حیدر دونوں خاموش طبع اور کم آمیز تھے۔ جملہ اولاد ایک بچی پر مشتمل تھی جسے پانچ سال کی عمر میں انھوں نے شملہ بھیج دیا اور دس سال کی عمر میں انگلستان۔ شملہ کانونٹ میں داخل ہونے کے بعد بچی کا تعلق ہر اس چیز سے ٹوٹ گیا جو اسے باپ کی میراث میں مل سکتی۔ زبان، ملک، روایات اور مذہب۔ البتہ شہسواری میں اس نے جلد ہی اتنا نام پیدا کیا کہ ایک ہاتھ میں کپ لیے اور دوسرے سے لگام تھامے اس کی تصویر ایک انگریزی روزنامے میں چھپی۔ پھر اس نے گھوڑے کو ایڑ لگائی اور وہ سرپٹ لندن پہنچ گیا۔ اِدھر ڈاکٹر حیدر کی کوٹھی میں خاموشی اور گہری ہوگئی۔ یہاں تک کہ نئے طلبا انھیں بے اولاد شمار کرتے اور ان کی الگ تھلگ اور بے تعلق زندگی کا سرا اس محرومی سے جوڑ دیتے۔ اپنی بیٹی ڈوروتھی اگینس فاطمہ حیدر کو انگلستان بھیجتے وقت والدین کا خیال تھا کہ وہ اُسے ہر سال بلایا کریں گے یا اس کے پاس جایا کریں گے۔ حالات پر کب کسی نے اپنی مرضی کے مطابق قابو پایا ہے۔ ولایت بھیجنے کے بعد وہ کوسوں دور بچی سے سالوں دور ہوتے چلے گئے۔ دوسری عالمی جنگ ان کے درمیان حائل ہوگئی۔

ادھر ڈاکٹر حیدر کی خدمات حکومت نے زرعی کمیشن کے لیے حاصل کرلیں۔ لارڈ لنلتھگو اس کمیشن کے صدر تھے۔ ان سے ڈاکٹر صاحب کے تعلقات استوار ہوگئے۔ جب کمیشن کا کام ختم ہوا تو لارڈ لنلتھگو وائسرائے مقرر ہوئے۔ خیال تھا کہ اب ڈاکٹر صاحب کسی بڑے عہدے پر مامور ہو جائیں گے لیکن ایک دن وہ خاموشی اور خوشی سے رئیس شعبۂ معاشیات مسلم یونیورسٹی کی حیثیت سے علی گڑھ واپس آگئے۔ ظرف اتنا بڑا کہ نئی دلی اس میں سما گئی تو چھلکا نہیں اور علی گڑھ کی مدرسی ملی تو بھی شکر سے لبریز رہا۔

مسلم یونیورسٹی میں ڈاکٹر ایل۔ کے۔ حیدر کو رہائش کے لیے ایک پھوس والا بنگلہ ملا۔ سامنے لان تھا، شمال میں شاگرد پیشہ ہے۔ اور باقی دو طرف جھاڑ جھنکاڑ۔ بنگلہ اور شاگرد پیشہ (جو اُن دنوں خاصی کالونی ہوا کرتا تھا) کے درمیان گھنے درختوں کے سایے میں گھوڑوں کے لیے چوبی کٹہرے بنے ہوئے تھے۔ تھوڑے فاصلے پر ایک پکّا اصطبل تھا۔

گرمیوں میں جب بہت سے ساتھی پہاڑوں کا رُخ کرتے ڈاکٹر ایل۔ کے۔ حیدر ہاتھ کا پنکھا جھلا کرتے اور کھدّر کا موٹا کرتا پہن لیتے کہ وہ پسینہ چوس لیتا ہے۔ جو لوگ پہاڑ پر نہ جاتے وہ گھر کو خس خانہ بنا لیتے۔ یہ اہتمام بھی ڈاکٹر صاحب کو پسند نہ تھا۔ البتہ اصطبل میں برف کی سلیں باقاعدگی سے لگائی جاتیں تاکہ بے زبان جانور کو تکلیف نہ ہو۔ سردیوں میں اکثر دیکھنے میں آتا کہ اصطبل سے ذرا سے فاصلے پر برگد تلے لکڑی کے دو چار گدّے پڑے ہوتے۔ ڈاکٹر ایل۔ کے۔ حیدر صبح سویرے کلہاڑی لے کر لکڑی پھاڑنے کی ورزش کیا کرتے۔ چھپٹیاں ملازموں کے حصّے میں آتیں تاکہ وہ آگ تاپ سکیں اور چولھا گرم کرسکیں۔ صاحب بہادر کے حصّے میں صرف وہ صحت مند خوشی آتی جو مسامات سے پسینے کی صورت پھوٹتی ہے۔ ڈاکٹر ایل۔ کے۔ حیدر ایک نیک دل اور سادہ لکڑہارے تھے۔

حیدر صاحب کے یہاں جو کھانا دونوں میاں بیوی کے لیے پکایا جاتا وہی ان تمام ملازمین میں تقسیم ہوتا جو تنخواہ مع خوراک پر ملازم تھے۔ ان کا سفید ریش باتمیز خانساماں ہمیشہ دھوبی کے دُھلے کلف لگے اُجلے کپڑے پہنا کرتا۔ باورچی خانے کا بیشتر کام اس کے نائب کے سپرد تھا۔ وہ ہنڈیا کو دم دیتا اور فارغ ہوکر بٹلر بن جاتا۔ گھر کی چابیاں بھی اسی کے پاس رہتیں۔ حساب بھی وہی رکھتا۔ دوسرے ملازمین پر بھی اسے اختیار حاصل تھا۔ عہد مغلیہ کے خان ساماں کی ایک گھریلو صورت۔ حیدر صاحب نوکر کو آواز

دینے کے خلاف تھے۔ وہ خود وقت پر حاضر ہونا یا اس وقت تک صاحب صبر سے کام لیتے اور انتظار کھینچتے۔ مسز اسٹیفنی حیدر البتہ ملازم کو بلانے کے لیے آہستہ آہستہ دوبار پکارا کرتیں۔ خدمت گار، خدمت گار۔ مسز حیدر جرمنی کے ایک رئیس گھرانے کی شایستہ خاتون تھیں۔

ڈاکٹر حیدر ضبط اور ضابطے کے آدمی تھے اور قول و فعل کے مرد۔ با اصول ایسے کہ اپنی نظروں میں سبکسار ہونے کو سب سے بڑی سبکی سمجھتے تھے۔ وہ منافقت کو شرک کے بعد سب سے بڑا گناہ جانتے تھے اور جب اسے عام ہوتے دیکھا تو اپنے خول میں سمٹ کر رہ گئے۔ مسلم یونی ورسٹی کے ایک وائس چانسلر کی دنیا داری کو دیکھا تو اپنے شعبۂ تدریس کے کالبد میں سکڑ کر رہ گئے۔ کہا کرتے تھے کچھ دعائیں ساری عمر مانگنی چاہئیں اور کچھ عمر کے مختلف حصوں میں۔ میں تو اب یہی دعا کرتا ہوں کہ خدایا اگر عمر لمبی دے تو بڑھاپا خوشگوار دینا۔ اس کے بعد وہ مسکرائے ان کی مسکراہٹ ہمیشہ شیر خوار بچے کی مسکراہٹ ہوتی تھی معصوم، بے اختیار اور لمحاتی!

۴۷ - ۱۹۴۶ء کا تعلیمی سال پروفیسر ایل۔ کے۔ حیدر کی مشغولی عمر کا آخری سال اور ایم۔ اے معاشیات میں میرا پہلا سال تھا۔ وہ کلاس میں اپنے نوٹس کی کاپی لاتے اور بیشتر وقت اس میں سے پڑھتے رہتے آہستہ آہستہ مگر پختہ لہجے میں۔ گاہے سر اٹھاتے اور ذراسی تشریح کرنے کے بعد سر جھکا لیتے۔ رعب اتنا کہ نچلا نہ بیٹھنے والے شوخ لڑکے بھی ان کے پیریڈ میں پہلو بدلنے سے احتراز کرتے۔ ایک آدھ بار وہ ناراض ہوئے ناخوشی چہرے پر اس شدت سے نمایاں تھی کہ اسے کسی فقرے یا کسی لفظ کے سہارے کی ضرورت نہ تھی۔ ساری جماعت دم بخود رہ گئی۔ بلڈ پریشر بڑا موذی ہوتا ہے۔

ملازمت کے بعد وہ اپنے وطن چلے گئے۔ پھر اپنی بچھڑی بیٹی سے ملنے انگلستان پہنچے اور وہیں انتقال کیا۔ ڈورو تھی انگیس

فاطمہ حیدر باپ کی طرح بھاری ماں کی طرح لمبی اور مزاج میں دونوں سے مختلف نکلی۔ آواز اونچی اور باتیں مسلسل۔ خوشی کے اظہار کے لیے کبھی قہقہہ لگاتی، کبھی چیخ مارتی۔ نچلا بیٹھنا تو اس نے سیکھا ہی نہ تھا۔ جب وہ گھوم پھر کے لوٹتی اور لندن کے اس کاٹیج میں داخل ہوتی جہاں وہ اپنی ماں کے ساتھ رہنے لگی تھی تو بھونچال سا آجاتا۔ چلتے پھرتے وہ کوئی واقعہ سناتی۔ کبھی اِس کمرے میں تو کبھی اُس کمرے میں۔ کبھی سیڑھیوں پر تو کبھی بالائی بیڈ روم میں۔ بیان جاری رہتا اور ماں کو وہ کہانی باورچی خانے میں تسلسل سے سنائی دیتی رہتی۔ وقفہ آتا تو سننے والا سمجھتا کہانی ختم ہو گئی یا گلا خشک ہو گیا۔ مگر ایسی کوئی بات نہ ہوتی۔ وہ اس وقت سگریٹ سلگانے یا کش لگانے میں مصروف ہوتی۔ کھانے کی میز پر میری اس سے گفتگو ہوئی تو سمجھ میں آیا کہ وہ شور مچا کر اپنے آپ کو بہلانے اور مصروف رکھنے کی کوشش کرتی ہے۔ اگر وہ خاموش ہو تو کوئی اس کے کانوں میں زور زور سے پکارتا ہے تم ڈوروتھی انگیس فاطمہ حیدر ہو۔ مساحت کا ایک نشان۔ ایک ایسا سہ حدّہ جہاں دو واضح راہیں مل کر ایک تیسری راہ مگر غیر واضح سمت میں نکل جاتی ہے۔

لندن سے بروک وڈ کا فاصلہ ریل گاڑی نے کوئی ایک گھنٹے میں طے کیا۔ جب میں بروک وڈ کے اسٹیشن پر اترا تو ایک مضافاتی شہر کا خیال ساتھ لے کر اترا۔ چھوٹا اور صاف ستھرا شہر جس کے اکلوتے بازار میں ساری رونق سمٹی ہوگی۔ بازار کے ارد گرد رہائشی بستی ہوگی۔ بستی کے گرد میلوں تک ہرے بھرے کھیت ہی کھیت ہوں گے۔ اسٹیشن کی عمارت سے باہر نکلا تو اس شہر کا نام و نشان بھی نہ پایا، جو میرے اندازے نے وہاں بسایا تھا۔ ایک اور ہی شہر آباد تھا۔ بہت بڑا اور بے جان جسے شہر خموشاں کہتے ہیں۔ میلوں میں پھیلا ہوا وسیع قبرستان جس کی چمن بندی کی ہوئی ہے۔ سرو،

سبزہ، قطعے، روشیں۔ روش روش اودے اودے نیلے نیلے پیراہن
والے پھولوں کے بجائے سنگ مرمر کی لوحیں قطار اندر قطار قبروں
کے سرہانے سوگوار کھڑی ہیں۔ میل بھر پیدل چلنے کے بعد مڑ کر دیکھا
تاحدِ نگاہ قبریں ہی قبریں، تاحدِ خیال موت ہی موت حشر کا پھیلا
ہوا میدان ہے۔ مُردوں کی حاضری لگ رہی ہے۔ ہر ایک نے
سنگ مرمر کا سرد اور بے جان ہاتھ اٹھایا ہوا ہے ـــ حاضر جناب۔
ذرا دیر پہلے میں لندن میں تھا۔ اُس میں اور اِس میں کتنا فرق ہے۔
شاید کوئی ایسا بڑا فرق بھی نہیں۔ لندن اگر زندوں کا برک وڈ ہے
تو برک وڈ مُردوں کا لندن ہے۔ دونوں گنجان اور آباد۔ ہر عمر،
مرتبے اور اقسام کے لوگوں سے بھرے ہوئے۔ ہر انسانی خوبی
اور خامی کو اپنے پہلو میں لیے ہوئے۔ ایک خواہشوں کا مسکن
دوسرا حسرتوں کا مدفن۔ دونوں جگہ مختلف محلے آباد ہیں اور
سڑکوں کا جال بچھا ہوا ہے۔

اس قبرستان میں کچی سڑک کے دوسری جانب مسلمانوں کا
محلہ واقع ہے۔ غریب اور ویران۔ نہ قطعہ بندی نہ چمن آرائی،
سبزہ خشک اور زرد۔ جھاڑیاں خود رو اور بے تراش۔ اس حصے
میں ایک چھوٹی سی پہاڑی پر ایک قطار میں ترک فضائیہ کے چند
افسروں کی قبریں ہیں۔ ان کے بعد اس پہاڑی پر اُگے ہوئے تنہا
درخت کے نیچے حسب وصیت ڈاکٹر ایل۔ کے۔ حیدر دفن ہیں۔
میں نے فاتحہ کے لیے ہاتھ اٹھائے اور اس شخص کو یاد کیا جس
نے ایک بار خود الزامی کے جذبے سے مغلوب ہو کر بظاہر اپنی
کامیاب دنیاوی زندگی کی بے ثمری کا یوں اعتراف کیا تھا۔

"میں نے ساری زندگی تعلیم سے فراغت تک فاصلہ
طے کرنے میں گذاری۔ برعظیم کے مسلمانوں کے لیے کچھ بھی
نہیں کیا حالانکہ میں اس کی اہلیت اور استطاعت رکھتا
تھا۔ اولاد ایک اور وہ بھی غیر ملکی۔ میں نے قوم کو کچھ بھی
نہیں دیا۔ ایسی زندگی بھی کوئی زندگی ہے۔ ایسا جینا
بھی کوئی جینا ہے۔"

زندگی ایک موج ہے۔ دریا سے اٹھنے کے بعد اگر وہ ساحل سے
نہ ٹکرائے تو بھنور کی آنکھ اور مرنے والے کی آنکھیں دونوں اس کے
ماتم میں روتی رہتی ہیں۔ میں قبرستان سے سر جھکائے خاموش یہ
سوچتا ہوا واپس چلا گیا اس کا بھی کوئی مداوا ہے۔ آواز آئی "ضمیرِ لالہ
میں روشن چراغِ آرزو کر دے۔" میں نے آرزو کا ایک چھوٹا سا چراغ
روشن کیا اور مڑ کر دیکھا۔ تاحدِ نگاہ چراغ ہی چراغ۔ تاحدِ خیال
روشنی ہی روشنی۔

●●

محبت

لوگ محبت کی بات اس طرح کرتے ہیں گویا یہ کوئی چیز
ہے جو تم دے سکتے ہو، جیسے مٹھی بھر پھول۔ تم ان
پھولوں کو کسی پر ڈال دو تو اسے ایک معطر بوجھ کے
علاوہ کیا ملے گا۔ محبت اس طرح دی ہی نہیں جا سکتی
محبت دراصل ایک طاقت ہے جس کے زور سے تم دوسری
چیزیں دے سکتے ہو۔ محبت محرک ہے۔ تم اس کی بدولت
کسی دوسرے شخص کو طاقت، توانائی، آزادی اور سکون
سے بہرہ ور کر سکتے ہو۔ محبت نتیجہ نہیں سبب ہے۔ یہ
ایک طاقت ہے دولت بھاپ اور بجلی کی طرح۔ اگر اس
کی مدد سے تم کوئی اور چیز نہیں دے سکتے تو یہ
بے مصرف ہے۔

آن مارو لینڈ برگ

ڈاکٹر سید محمد کمال الدین حسین ہمدانی
صدر شعبۂ طب و جراحت اجمل خاں طبیہ کالج
اے۔ ایم۔ یو۔ علی گڑھ

مسلم یونیورسٹی علی گڑھ میں طبیہ کالج کی بنا

طبیہ کالج مسلم یونیورسٹی علی گڑھ (جو ۱۹۶۹ء میں مسیح الملک حکیم اجمل خاں یادگار تقریب کے موقع پر، اجمل خاں طبیہ کالج کے نام سے موسوم ہوا) کی بنا کا سہرا آل انڈیا ویدک اینڈ یونانی طبی کانفرنس کے سر ہے۔ اس لیے کہ مسلم یونیورسٹی علی گڑھ میں طبی کالج کی بنا کی تحریک اسی کانفرنس کے چودہویں سالانہ اجلاس منعقدہ دہلی میں ہوئی۔ اس کانفرنس کا اجلاس پنجم بروز یکشنبہ ۸ مارچ ۱۹۲۶ء زیر صدارت جناب ویدگنیش دت صاحب شاستری گوالیار میں منعقد ہوا۔ اس میں صدر الاطباء جناب حکیم محمد الیاس خاں صاحب، شاگردِ رشید مسیح الملک حکیم اجمل خاں صاحب نے (جو جامعہ طبیہ، گلی قاسم جان بلی ماران دہلی کے پرنسپل ہوئے) حسب ذیل تجویز پیش فرمائی تھی۔

"آل انڈیا ویدک اینڈ یونانی طبی کانفرنس کا یہ جلسہ اپنی اسٹینڈنگ کمیٹی کے مرتب کردہ مسودہ جوابات کی جو اس نے یوپی گورنمنٹ کی طبی کانفرنس کمیٹی کے سوالات کے سلسلہ میں کمیٹی مذکور کے پاس بھیجا تھا تصدیق کرتا ہے اور اس سلسلہ میں نہایت ضروری سمجھتا ہے کہ گورنمنٹ مذکور کی طرف سے یونانی طبی کالج مسلم یونیورسٹی علی گڑھ کے اور آیورویدک کالج ہندو یونیورسٹی بنارس کے زیر اہتمام قائم کیا جائے۔

رئیس الاطباء حکیم محمد حسن صاحب قرشی نے (جو طبی کالج لاہور کے پرنسپل مقرر ہوئے) اس تجویز کی تائید میں تقریر فرمائی۔ پھر اس موضوع پر کہ آیا طبی کالج لکھنؤ میں قائم ہو یا علی گڑھ میں دیر تک بڑی سرگرم اور لطف انگیز تقریریں ہوئیں مگر آخر یہ تجویز کثرتِ رائے سے منظور ہوئی کہ طبیہ کالج مسلم یونیورسٹی علی گڑھ میں قائم ہو۔ (ملاحظہ ہو ماہنامہ الحکیم بابت ماہ اپریل ۱۹۲۶ء)

آل انڈیا ویدک اینڈ یونانی طبی کانفرنس کی چودھویں سالانہ رپورٹ جو ماہنامہ الحکیم بابت ماہ اپریل ۱۹۲۶ء میں شائع ہوئی ہے، اس کا ساتواں ریزولیوشن مسلم یونیورسٹی علی گڑھ میں طبیہ کالج کے قیام کی تحریک سے متعلق ہے۔ جس کی عبارت حسب ذیل ہے:

ساتویں ریزولیوشن میں بنارس ہندو یونیورسٹی کا شکریہ ادا کرتے ہوئے جس نے آیورویدک تعلیم کا انتظام اپنے یہاں کر دیا تھا مسلم یونیورسٹی علی گڑھ کی سنڈیکیٹ کو توجہ دلائی

گئی کہ اسی طرح یونانی طب کی تعلیم کا انتظام مسلم یونیورسٹی علی گڑھ میں کیا جائے۔

نیز اس اقدام پر اظہارِ مسرت کیا گیا کہ اکاڈمک کونسل مسلم یونیورسٹی علی گڑھ نے ۸ جنوری ۱۹۲۶ء کی میٹنگ میں یونانی طب کی تعلیم کے مسلم یونیورسٹی علی گڑھ میں جاری ہونے کے متعلق پیش کردہ تجویز کو منظور کر لیا ہے اور اس مقصد کی تکمیل کے لیے اسکیم مرتب کرنے کے لیے ایک سب کمیٹی قائم ہوگئی ہے۔ نیز یہ اظہار بھی کیا گیا کہ ایک طبی کالج قائم کرنے میں علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کو جس استحقاق و امتیاز کا درجہ حاصل ہے وہ ہندو یونیورسٹی بنارس کے برابر کا ہے جو امید کہ نظر انداز نہ کیا جائے گا" (ملاحظہ ہو ماہنامہ الحکیم بابتہ ماہ اپریل ۱۹۲۶ء)۔

چنانچہ مسلم یونیورسٹی علی گڑھ میں طبیہ کالج ۱۹۲۷ء میں قائم ہوا اور اوّلاً اسپتال کی عمارت یونانی اسپتال کے طرز پر تعمیر ہوئی طبیہ کالج کا سنگ بنیاد ۲۲ مارچ ۱۹۳۶ء کو پرنس اعظم جاہ بہادر آف دکن نے اپنے مبارک ہاتھوں سے رکھا جس کی روئداد حسب ذیل ہے:۔

" بروز یکشنبہ ۲۲ مارچ ۱۹۳۶ء صبح گیارہ بجے اسپیشل کونووکیشن مسلم یونیورسٹی علی گڑھ میں منعقد کیا گیا جس میں ہز اکسیلنسی لارڈ ولنگڈن وائسرے ہند کو ڈاکٹر آف لا کی ڈگری پیش کی گئی۔ اس تقریب میں ہز اگزالٹڈ ہائینس نظام الملک، آصف جاہ سر میر عثمان علی خاں بہادر فرمانروائے دکن نے معہ پرنس اعظم جاہ بہادر و پرنسز دُرِّ شہوار و پرنس معظم جاہ بہادر شرکت فرمائی۔

شام کو ۴ بج کر ۴۵ منٹ پر اسٹریچی ہال میں مسلم یونیورسٹی یونین کلب اور طبیہ کالج کی جانب سے پرنس اعظم جاہ بہادر اور پرنسز دُرِّ شہوار کا خیر مقدم کیا گیا۔ عہدیداران یونیورسٹی، ممبران اسٹاف اور مہمانان سب اس موقع پر حاضر تھے۔ پرو وائس چانسلر اور پریسیڈنٹ یونین کی تقریر کے بعد پرنس اور پرنسز نے پریسیڈنٹ یونین کی درخواست پر یونین کی دائمی اعزازی رکنیت منظور فرماتے ہوئے کلب کی کتاب پر دستخط فرمائے جس کے بعد شاہزادہ والاقدر اور شہزادیِ والاتبار کو سنہری ہار پہنائے گئے۔ اور آل مصطفیٰ صاحب طالب علم طبیہ کالج نے اپنی مدحیہ نظم سنائی۔

نظم کے بعد ڈاکٹر عطاء اللہ بٹ پرنسپل طبیہ کالج نے پرنس اعظم جاہ بہادر کے حضور میں مندرجہ ذیل اڈریس پیش کیا اور طبیہ کالج کا سنگ بنیاد نصب کرنے کی درخواست کی۔

سپاس نامہ

حضور والا!

یونانی طب کی یہ خوش قسمتی ہے کہ اس نازک دور میں جب کہ اس کے خیمۂ زندگی کی طنابیں شکستہ ہو رہی تھیں ایک طرف حکومت وقت نے اس کی سرپرستی کی یعنی مختلف مقامات پر طبی درسگاہیں قائم کر کے یونانی طب کی اساس کو مضبوط و مستحکم کیا۔ منجملہ اُن درسگاہوں کے طبیہ کالج علی گڑھ بھی ہے جو ۱۹۲۷ء میں معرض وجود میں آیا اور دوسری طرف علم پرور سلطنت آصفیہ نے مثل دیگر علوم و فنون کے یونانی طب کی ترقی کے لیے اعلیٰ معیار پر ایک طبیہ کالج کے قیام کی ایک اسکیم مرتب کرنے کا حکم صادر فرمایا۔

حضور والا! طبیہ کالج علی گڑھ نو سال سے قائم ہے اور یونیورسٹی کے زیر نگرانی پرورش پا رہا ہے۔ اس میں یونانی طب کی مدد کے لیے علوم جدیدہ کے تمام شعبے برسرکار ہیں۔ علاوہ اس کے تحقیقات ادویہ

کا ایک شعبہ بھی شامل ہے۔ طبیّہ کالج کی ذاتی عمارت
نہ ہونے کی وجہ سے جن دقتوں کا سامنا رہتا ہے
اُن کے دور ہونے کے بعد اس کی ترقی میں خاطر خواہ
اضافہ ممکن ہے۔ اس میں شک نہیں کہ ریاست
حیدرآباد دکن کی علم پروری اطراف ملک کے لیے
عام ہے۔ مگر علی گڑھ کی شہرت وعظمت میں دولتِ
آصفیہ کی بے دریغ فیاضی اور دستگیری کو خاص دخل
ہے۔

حضور والا، علی گڑھ جن پاکیزہ جذبات کا
حامل ہے اُن کی بنا پر میں نہایت ادب واعتماد کے
ساتھ عرض کروں گا کہ طبیّہ کالج کا قیام اور اس
کا عروج ہمارے قومی جذبات کا ایک جزو ہے۔ خدا
کا شکر ہے کہ آج ہماری کوششیں بار آور ہوئیں
اور ہمارے جواں سال اور جواں بخت شہزادۂ عالی
مقام کے مبارک ہاتھوں سے طبیّہ کالج کے سنگِ بنیاد
رکھنے کا مسعود دن آگیا جس کی یاد خصوصیت کے
ساتھ طبیّہ کالج کی تاریخ میں ہمیشہ تازہ رہے گی۔
ہمارے شہریارِ دکن خلد اللہ ملکہ نے ہماری
ذہنی و اخلاقی اصلاح کا انتظام فرمایا اور شہزادۂ دکن
ولیعہد بہادر ہماری جسمانی تکالیف کی چارہ سازی
کا سنگ بنیاد نصب فرمانے والے ہیں۔ ہم کو یقین ہے
کہ اب ہم اور ہماری قوم اور ابنائے وطن ہر قسم کی
روحانی و جسمانی کلفتوں سے نجات پا جائیں گے
اور یونانی طب بہت جلد اپنے کھوئے ہوئے وقار
کو حاصل کرلے گی۔ درحقیقت یہ احسان سلطنتِ آصفیہ
کے احسانات میں ایک اور عظیم الشان اضافہ ہوگا جو کہ سرکارِ
عالی کے طفیل آئندہ نسلوں کے لیے زندہ و یادگار
رہے گا۔

میں حضورِ والا کی خدمت میں طبیّہ کالج کی عمارت
کا سنگ بنیاد نصب کرنے کی استدعا کرتا ہوں اور یہ
میری خوش قسمتی اور مسلم یونیورسٹی کے لیے باعث فخر ہے کہ
اعلیٰ حضرت معظم نے حضور والا کو ہماری درخواست قبول
کرنے کی اجازت مرحمت فرمائی ہے۔

لہٰذا امید ہے کہ حضور والا ہماری درخواست قبول
فرماکر ہماری عزت افزائی فرمائیں گے۔

حضور والا کے خدّام
ممبران منتظمہ کمیٹی طبیّہ کالج

پرنس ممدوح الشان نے جواب میں اپنے خیر مقدم کا شکریہ ادا
کیا اور امید ظاہر کی کہ طبیّہ کالج ملک وملّت کے لیے بہت مفید ثابت
ہوگا۔ اس کے بعد جلوس کے ساتھ طبیّہ کالج کے مجوزہ احاطہ میں سنگِ بنیاد
نصب فرمانے کے لیے تشریف لائے۔ حاجی محمد صالح خاں صاحب شروانی
ممبر کورٹ نے نقرئی کرنی اور بسولی پیش کی اور والا شان پرنس نے
سنگِ بنیاد نصب فرماکر ارشاد فرمایا

"It has been well and truly laid"

(ترجمہ) میں اعلان کرتا ہوں کہ یہ حجر البنا ٹھیک طور پر اپنی جگہ
نصب کیا گیا ہے۔ (روداد آمد ہز اکسیلنسی وائسرائے گورنر
جنرل ہند، لارڈ ریکٹر اور ہز اگزالٹڈ ہائی نس حضور نظام چانسلر
مسلم یونیورسٹی علی گڑھ ۲۲ر مارچ ۱۹۳۶ء)۔ مذکورہ روداد
میں پرنس اعظم جاہ بہادر کی تصویر سنگ بنیاد نصب فرماتے ہوئے
شائع ہوئی ہے۔ مگر افسوس کہ یہ سنگِ بنیاد غائب ہے طبیّہ کالج

کی عمارت میں کہیں نظر نہیں آتا۔ افسرانِ مسلم یونیورسٹی کی توجہ اس جانب ضروری ہے۔

طبیہ کالج مسلم یونیورسٹی علی گڑھ کو فروغ دینے میں شفاء الملک حکیم محمد عبد اللطیف صاحب لکھنوی کا نمایاں حصہ ہے ۱۹۲۶ء میں جب طبیہ کالج قائم ہوا تو مسیح الملک حکیم اجمل خاں کی نظرِ انتخاب ان پر پڑی اور بحیثیت لیکچرار ان کا تقرر عمل میں آیا۔ ۱۳ اکتوبر ۱۹۲۶ء کو حکیم صاحب طبیہ کالج سے وابستہ ہوئے اور کچھ عرصہ کے بعد اپنی خدمات کی بنیاد پر وائس پرنسپل ہوئے ۱۹۴۹ء میں جب کہ ڈاکٹر عطاء اللہ بٹ صاحب عہدہ پرنسپلی سے ریٹائر ہوئے تو ڈاکٹر ذاکر حسین خاں صاحب وائس چانسلر مسلم یونیورسٹی علی گڑھ کی نظرِ انتخاب شفاء الملک پر پڑی اور آپ عہدہ پرنسپلی پر فائز ہوئے۔ پرنسپل کے علاوہ آپ پروفیسر معالجات ڈین فیکلٹی آف میڈیسن اور ڈائرکٹر آف ریسرچ ان یونانی میڈیسن بھی رہے۔ آپ کی پرنسپلی کے عہد میں طبیہ کالج میں طب و اطباء کو نمایاں مقام حاصل ہوا اور دہلی و لکھنؤ کی طرح علی گڑھ بھی طب یونانی کا ایک اہم مرکز قرار پایا۔

شفاء الملک نے ۱۹۵۵ء میں آل انڈیا یونانی طبی کانفرنس کی طرف سے قائم کردہ نصاب کمیٹی کے کنوینر کی حیثیت سے ایک جامع نصابِ تعلیم مرتب کراکے پیش کیا جو ایک بہترین طبی نصاب تھا جس میں طبی مضامین کو تشریح و تفصیل کے ساتھ شامل کیا گیا تھا۔

غرض کہ مسلم یونیورسٹی علی گڑھ میں طبیہ کالج کی بنا کا مقصد اصلی طبِ یونانی کو فروغ دینا ہے اور یہاں سے ماہر طبیب پیدا کرنا ہے تاکہ ملک کی طبی خدمات وہ صحیح طور سے انجام دے سکیں۔ لہٰذا اربابِ حل و عقد کا فرض ہے کہ وہ اسی مقصد کو پیشِ نظر رکھتے ہوئے مفید اسکیمیں جاری فرمائیں تاکہ طبیہ کالج کا بنیادی مقصد صحیح طور سے سرانجام پائے۔ ●●

صدر جمہوریہ مالدیپ کو اعزاز

ہزاکسیلینسی جناب مامون عبدالقیوم صدر جمہوریہ مالدیپ ۸ ستمبر کو دہلی کو پٹر سے علی گڑھ تشریف لائے یہاں ان کو ایک اسپیشل کانوکیشن میں اعزازی ڈگری عطا کی گئی۔

علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کے وائس چانسلر
صدر جمہوریہ مالدیپ کو اعزازی ڈگری عطا کر رہے ہیں

اس موقع پر وائس چانسلر جناب سید حامد نے معزز مہمان اور مالدیپ کی خاتونِ اوّل کا شکریہ ادا کیا کہ انھوں نے علی گڑھ مُسلم یونیورسٹی کو رونق بخشی جو صرف ایک ادارہ ہی نہیں بلکہ ایک عظیم تحریک کا مرکز بھی ہے۔ اس تحریک کے بانی اور روح رواں سرسید علیہ الرحمۃ تھے جن کی کوششوں سے ہندوستانی مسلمانوں کی زندگی میں ایک نئے دور کا آغاز ہوا۔ اُنھوں نے ہی اس عظیم الشان ادارے کی بنیاد ڈالی۔ سرسید ایک دیوقامت شخصیت کے مالک تھے انھیں ہم سے رخصت ہوئے پچاسی برس ہو گئے۔ اس طویل مدت میں ان کی عظمت کا احساس برابر بڑھتا ہی گیا ہے۔ سرسید نے مذہب، سیاست، ادب ہر میدان میں مسلمانوں کی راہنمائی کی۔ اُردو زبان و ادب پر اُن کے احسانات ناقابلِ فراموش ہیں۔ پچھلی دو صدیوں کے برصغیر میں کوئی ایسی شخصیت نظر

ہیں آتی جو ان کی ہمسری کر سکے۔ ان کی مقناطیسی شخصیت نے بہت سی زبردست ہستیوں کو اپنے گرد جمع کر لیا تھا۔ ان رفقائے سرسید کے کارنامے بھی ناقابلِ فراموش ہیں۔

اپنی تقریر کے آخر میں وائس چانسلر صاحب نے اس پر مسرت کا اظہار کیا کہ مہمانِ محترم کو عربی اور انگریزی دونوں زبانوں پر یکساں قدرت حاصل ہے اور وہ دونوں زبانوں میں روانی سے تقریر کرنے پر قادر ہیں۔

پرو وائس چانسلر پروفیسر بہاء الدین نے مہمانِ محترم کو اعزازی ڈگری کے لیے پیش کرتے ہوئے فرمایا۔

ہز ایکسیلنسی جناب مامون عبد القیوم صدر و وزیر دفاع جمہوریۂ مالدیپ ایک عظیم انسان دوست اور بلند پایہ مدبر ہونے کے ساتھ ہی گہرا مذہبی شغف بھی رکھتے ہیں۔ تیسری دنیا کے ملکوں میں وہ آزادی، جمہوریت اور امن کے علمبردار ہیں انھوں نے ہمیشہ غیر جانب داری کی حمایت کی ہے۔ یونیورسٹی نے انھیں ڈاکٹر آف لیٹرس کی اعزازی ڈگری عطا کرنے کا فیصلہ کر کے ایک نہایت مناسب قدم اٹھایا ہے۔

پرو وائس چانسلر صاحب نے مزید فرمایا کہ ان کی ولادت ۲۹ دسمبر ۱۹۳۷ء کو ہوئی۔ بچپن سے وہ ہونہار تھے اس لیے اپنے ہم سبقوں سے تعلیم میں سبقت لے گئے۔ اعلیٰ تعلیم کے لیے وہ جامعہ الازہر تشریف لے گئے وہاں سے انھوں نے ۱۹۶۴ء میں اسلامیات اور قانون کی اسناد حاصل کیں۔ ۱۹۶۵ء میں ڈپلوما ان ایجوکیشن حاصل کیا۔ ۱۹۶۵ء میں انھیں ایم۔ اے (اسلامیات) کی سند عطا ہوئی۔ بعد ازاں وہ تاریخ اسلام سے متعلق تحقیق میں مصروف ہو گئے۔ ۱۹۶۷ء سے ۱۹۶۹ء تک وہ قاہرہ کی امریکی یونیورسٹی میں معاون پروفیسر اور پھر احمد و بیلو یونیورسٹی نائیجیریا کے ایک کالج میں اسلامیات و فلسفے کے استاد رہے۔

۱۹۷۱ء سے انھوں نے خود کو ملکی سیاست کے لیے وقف کر دیا۔ اور اپنے ملک کی قسمت کو سنوارنے میں مصروف ہو گئے۔ ان کا ملک ۲۶ جولائی ۱۹۶۵ء کو آزاد ہو چکا تھا اور نومبر ۱۹۶۸ء میں اس نے ایک آزاد جمہوریت کا رتبہ حاصل کر لیا تھا۔ انھوں نے اپنے ملک کی معیشت کو سنوارنے کے لیے بہت کچھ کیا۔ اولاً وہ انتظامیہ سے منسلک رہے اور بڑے عہدوں پر ان کا تقرر ہوا۔ سری لنکا میں انھوں نے سفارت اور اقوام متحدہ میں اپنے ملک کی نمائندگی کے فرائض انجام دیئے۔ وزارت کا قلمدان بھی سنبھالا اور آخر کار ۱۱ نومبر ۱۹۷۸ء کو جمہوریۂ مالدیپ کے صدر منتخب ہوئے۔ اس کے بعد پرو وائس چانسلر صاحب نے معزز مہمان کی امن عالم، اتحاد و یگانگت اور پڑوسی ممالک سے دوستانہ تعلقات سے متعلق کوششوں کا ذکر کیا اور انھیں اعزازی ڈگری کے لیے وائس چانسلر صاحب کی خدمت میں پیش کیا جو عطا کی گئی۔

یونیورسٹی کے معزز مہمان صدر جمہوریۂ مالدیپ نے اس اعزاز کے لیے جو انھیں عطا کیا گیا، یونیورسٹی کا شکریہ ادا کیا۔ انھوں نے کہا کہ:۔

"ایک اسلامی یونیورسٹی جامعہ ازہر سے تعلیم پانے کے بعد دوسری اسلامی یونیورسٹی سے ڈگری حاصل کر کے میں بطور خاص فخر محسوس کر رہا ہوں۔ یہ اعزاز عطا کر کے آپ نے مجھ کو ہی نہیں نوازا بلکہ میرے ملک اور میرے تمام ہم وطنوں کی عزت افزائی کی ہے میں اپنی اور اپنے ملک کی طرف سے آپ کا شکریہ ادا کرتا ہوں۔ پروفیسر بہاء الدین نے میرے بارے میں جو کچھ فرمایا اس کے لیے میں شکر گذار ہوں۔

جناب وائس چانسلر، پرو وائس چانسلر، معزز مہمانان، خواتین و حضرات! آپ میں سے اکثر نے جزائر مالدیپ کا نام سنا ہوگا کیونکہ یہاں کے کچھ باشندے اس ادارہ میں تعلیم پا چکے ہیں۔ ہمارے جمہوریہ کے پہلے صدر جناب محمد امین دیدی مرحوم نے بھی یہاں تعلیم حاصل کی تھی۔ مرحوم نے لکھا ہے کہ:۔

اُن کے دل میں حب الوطنی کا جذبہ قیام علی گڑھ کے دوران ہی پیدا ہوا۔

ہمارے ملک کے کچھ ہی لوگ اس یونیورسٹی کی تاریخ سے بخوبی واقف ہوں گے لیکن اس عظیم ادارے کے لائق صد احترام بانی اور اُن کے شاندار کارناموں

علی گڑھ مسلم یونیورسٹی علی گڑھ

اشتہار نمبر ۸۴-۸۳/ ۱۸

مندرجہ ذیل آسامیوں کے لیے مقررہ فارموں پر درخواستیں مطلوب ہیں جو امیدوار ایک سے زائد پوسٹوں کے لیے امیدوار ہیں اُن کے لیے الگ الگ درخواستیں دینا لازم ہے۔

پروفیسرس:

شرح تنخواہ ۱۵۰۰-۶۰-۱۹۰۰-۱۰۰-۲۰۰۰-۲/۱۲۵-۲۵۰۰ روپیہ اور گرانی الاؤنس

۱- پروفیسر آف میکینیکل انجینرنگ - ڈیپارٹمنٹ آف میکینیکل انجینرنگ۔

استعداد:- (۱) لازمی

تحقیقی سرگرمیوں میں مشغول اور اعلیٰ پایہ کے مطبوعہ کام کے حامل نامور اسکالر جنھیں تدریس یا تحقیق کے دس سالہ تجربہ کے علاوہ ڈاکٹریٹ سطح تحقیق کی نگرانی کا تجربہ ہو۔ یا ممتاز انجینر/ٹیکنالوجسٹ جس نے اپنے میدان میں ایسے کارنامے نمایاں کئے ہیں جن سے علم میں معتدبہ اضافہ ہوا ہو۔

(۲) احتراقی انجینرنگ (COMBUSTION ENGINEERING) میں تخصص ہو۔

پسندیدہ: پوسٹ گریجویٹ کلاسیز کی تدریس کا تجربہ۔

نوٹ:- جو امیدوار اشتہار نمبر ۸۳-۸۲/۹ کے تحت درخواست دے چکے ہیں انھیں از سر نو درخواست دینے کی ضرورت نہیں انکی سابقہ درخواست پر ہی غور کیا

۲- پروفیسر آف میتھمٹکس (الجبرا) (عارضی لیکن مستقل ہونے کا امکان) ڈیپارٹمنٹ آف میتھمٹکس

۳- پروفیسر آف میتھمیٹکس (اپلائڈ میتھمٹکس) ڈیپارٹمنٹ آف میتھمٹکس

استعداد:- (۱) لازمی (الف) کسی ہندوستانی یا غیر ملکی یونیورسٹی سے متعلقہ مضمون میں فرسٹ یا ہائی سیکنڈ کلاس ماسٹر ڈگری

(ب) ڈاکٹریٹ کے معیار کی ریسرچ ڈگری یا اعلیٰ پایہ کا مطبوعہ کام۔

(ج) پوسٹ گریجویٹ کلاسیز کو پڑھانے کا دس سالہ تجربہ اور تحقیق کی رہنمائی کا قدرے تجربہ۔

پسندیدگی:- ڈیپارٹمنٹ آف میتھمٹکس کے تحت پروفیسر آف میتھمٹکس (الجبرا) آسامی نمبر ۲ کیلئے الجبرا میں ریسرچ کی نگرانی کا وسیع ترین تجربہ۔

ڈیپارٹمنٹ آف میتھمٹکس کے تحت پروفیسر آف میتھمیٹکس (اپلائڈ میتھمیٹکس) اسامی نمبر ۳ کے لئے اپلائڈ میتھمٹکس میں ریسرچ کی نگرانی کا وسیع تجربہ۔

لکچررس:-

شرح تنخواہ:- ۷۰۰-۴۰-۱۱۰۰-۵۰-۱۶۰۰ روپیہ اور دیگر الاؤنس

۴- لکچرر ان کیمسٹری (عارضی) ڈیپارٹمنٹ آف کیمسٹری

۵- لکچرر ان بائیوکیمسٹری (عارضی لیکن مستقل ہونے کی امید) ڈیپارٹمنٹ آف کیمسٹری

۶- لکچرر ان ایجوکیشن - ڈیپارٹمنٹ آف ایجوکیشن۔

۷- لکچرر ان بنگالی - ڈیپارٹمنٹ آف ہندی

۸۔ لکچرر ان کامرس۔ ڈیپارٹمنٹ آف کامرس

استعداد:۔ (۱) لازمی (الف) ڈاکٹریٹ ڈگری یا اعلیٰ پایہ کا تحقیقی کام۔

(ب) متعلقہ مضمون میں مسلسل اچھے تعلیمی ریکارڈ کے ساتھ (سیون پوائنٹ اسکیل میں بی) فرسٹ یا سیکنڈ کلاس میں ماسٹرس ڈگری یا کسی غیر ملکی یونیورسٹی سے اس کے مساوی کوئی ڈگری۔

انٹرڈسپلنری پروگرام کے تقاضوں کے تحت متذکرہ بالا (الف) اور (ب) کے تحت متعلقہ مضامین میں ڈگریاں۔

درآنحالیکہ سلیکشن کمیٹی اس خیال کی حامل ہو کہ کسی امیدوار کا تحقیقی کام جیسا کہ اس کی تھیسس سے ظاہر ہے بہت اعلیٰ پایہ کا ہے تو اس میں (ب) کے تحت مطلوبہ استعداد میں کمی کی جاسکتی ہے۔

مزید برآنکہ اگر کسی امیدوار کی ڈاکٹریٹ ڈگری یا اس کے متبادل تحقیقی کام موجود نہ ہو یا اس کو اس قابل نہ سمجھا جائے تو اس صورت میں مسلسل اچھے تعلیمی ریکارڈ کے حامل امیدوار کے متعلق بھی غور کیا جاسکتا ہے (ایم فل یا اس کے متبادل ڈگری یا اعلیٰ پایہ کے تحقیقی کام کے حامل امیدوار کو ترجیح دی جائے گی) بشرطیکہ اس کو ریسرچ کا دو سالہ تجربہ اور کسی لیبارٹیری/آرگنائزیشن میں عملی کام کا عملی تجربہ بھی ہو۔ اس صورت میں اس امیدوار کو اس شرط پر رکھا جاسکتا ہے کہ وہ پانچ سال کے عرصے میں ڈاکٹریٹ کی ڈگری حاصل کرے گا یا اعلیٰ پایہ کے تحقیقی کام کا ثبوت پیش کرے گا جس میں ناکامی کی صورت میں وہ اس وقت تک سالانہ ترقی کا مستحق نہ ہوگا جب تک وہ مطلوبہ ضروریات کو پورا نہ کرے۔

II۔ پسندیدہ:۔ نمبر ۵ کے تحت ڈیپارٹمنٹ آف کیمسٹری میں بائیوکیمسٹری کی آسامی کے لئے مطلوبہ کام اور بائیوکیمسٹری میں جدید رجحانات کے متعلق جانکاری نمبر ۶ کے تحت ڈیپارٹمنٹ آف ایجوکیشن میں لکچرر ان ایجوکیشن کی آسامی کے لئے

(i) فزکس اور میتھیمٹکس میں ڈگری اور تجربہ۔

(ii) ٹریننگ کالج یا ڈیپارٹمنٹ آف ایجوکیشن میں تدریس کا تجربہ۔

نمبر ۷ کے تحت ڈیپارٹمنٹ آف ہندی میں لیکچرر ان بنگالی کے لیے ہندی کا علم اور تدریس کا تجربہ

غیر معمولی قابلیت اور تجربے کے حامل افراد کو ابتدا ہی سے اعلیٰ تنخواہ سے شروعات دی جاسکتی ہے۔ انٹرویو کے لئے طلب کئے جانے والے امیدواروں کو بطور خاص A-T ریلوے سیکنڈ کلاس کا یکطرفہ کرایہ ادا کیا جائے گا۔

مطلوبہ فارم اور ہدایات مسلم یونیورسٹی کے رجسٹرار آفس کے اسسٹنٹ رجسٹرار (سلکشن کمیٹی) کے دفتر سے ۵ روپیہ نقد ادائگی (مسلم یونیورسٹی کے فائننس آفس کے کیش سیکشن میں جمع شدہ) یا فائننس آفسر مسلم یونیورسٹی کے نام واجب الادا انڈین پوسٹل بھیج کر حاصل کئے جاسکتے ہیں۔ اس کے لیے 23 x 10 cm کا ایک لفافہ جس پر خود کا پتہ تحریر ہو بھیجنا ضروری ہوگا۔

درخواست موصول ہونے کی آخری تاریخ ۱۵ اکتوبر ۱۹۸۳ء کو شام ۴ بجے تک ہے۔ نامکمل اور تاخیر سے موصول ہونے والی درخواستوں پر غور نہیں کیا جائے گا۔

نوٹ:۔ موزوں امیدواروں کو مستقبل میں خالی ہونے والی ممکنہ جگہوں پر تقرری کے لئے بنائے گئے پینل میں رکھا جاسکتا ہے۔

ضمیر احمد خاں
رجسٹرار

بہار نو بے بی ٹانک
بچوں کے تمام اعضا کو طاقت بخشنے اور دانت نکلنے کی تکلیف سے محفوظ رکھتا ہے
دماغین
تمام دماغی کام کرنے والوں کے لئے نایاب تحفہ
شربت نزلہ
کھانسی زکام. نزلہ کے لئے
خون صفا
خون کی خرابی پھوڑے پھنسی خارش اور داد وغیرہ کی دوا
چند مشہور اور پیٹنٹ دوائیں
دواخانہ طبیہ کالج مسلم یونیورسٹی علی گڑھ یوپی

EFORMER

تہذیب الاخلاق

مدیر

سید حامد

وائس چانسلر علی گڑھ مسلم یونیورسٹی
علی گڑھ

مدیر مسئول

نورالحسن نقوی

[illegible] علی گڑھ مسلم یونیورسٹی
علی گڑھ

پندرہ روزہ

تہذیب الاخلاق

علی گڑھ

سرسیّد نمبر

۱۶ اکتوبر ۱۹۸۳ء

جلد ۲ — شمارہ ۲۰

مندرجات

إن اللہ لا یغیر ما بقوم حتیٰ یغیروا ما بانفسہم

خدا نے آج تک اس قوم کی حالت نہیں بدلی ★ نہ ہو جس کو خیال آپ اپنی حالت کے بدلنے کا

بیداری کے آثار

کچھ لوگ ابھی تک نیند کے خمار میں ہیں۔ کچھ حرکت تو ان میں آئی ہے مگر ابھی انگڑائی لے کر اور کروٹ بدل کر پھر غافل ہو جاتے ہیں۔ کچھ لوگ ایسے ہیں کہ ابھی بدستور غافل پڑے سوتے ہیں اور کچھ ایسے ہیں کہ ہشیار ہوئے ہیں مگر بد مزاجی اور تند خوئی سے ضد میں آکر کمل تانے پڑے ہیں اور کہتے ہیں کہ ہاں ہم نہیں اٹھنے کے تمھارا کیا اجارہ ہے؟ ہم یوں ہی پڑے رہیں گے۔ بعضے ان میں سے اپنے پاس والوں کو کہتے ہیں کہ تم بھی پڑے رہو۔ مت اٹھو۔ سید احمد کون ہے جو جگاتا پھرتا ہے۔ ہم اسی بات کو سن کر خوش ہوتے ہیں اور دور ہی سے کھڑے کہتے ہیں کہ وہ اٹھے وہ کلبلائے۔ خدا نے چاہا تو سمجھدار بھی ہو جاویں گے۔ یہی رست و خیز ہماری قوم کے اقبال کی نشانی ہے۔ پتھر پسیجا تو سہی۔ اب کسی نہ کسی طرف بہ نکلے گا۔ لوہا پگھلا تو سہی۔ اب کچھ نہ کچھ ڈھل رہے گا۔ بند پانی کے بجز سڑ جانے کے اور کچھ نہیں ہوتا۔ پانی کو بہنا چاہیے۔ پھر کوئی نہ کوئی اپنا رستہ بنا لے گا۔ اس وقت ہماری ساری قوم میں اس بات کا غلغلہ ہے کہ ہماری حالت کچھ اچھی نہیں۔ قوم کے لیے کچھ کرنا چاہیے۔ کیا یہ صدا ان لوگوں کے دلوں میں جو قومی بھلائی چاہنے والے ہیں جان نہیں ڈال دیتی ہے؟

(سر سید)

★

قیمت فی پرچہ .... ایک روپیہ

سالانہ .... بیس روپے

بیرون ہند سے

فی شمارہ .... ایک ڈالر

سالانہ .... پندرہ ڈالر

★

رابطہ :

نور الحسن نقوی

شعبۂ اردو، علی گڑھ مسلم یونیورسٹی، علی گڑھ

★

ترسیلِ زر کا پتہ :

منظر عباس نقوی

شعبۂ اردو، علی گڑھ مسلم یونیورسٹی، علی گڑھ

★

ابتدائیہ:

ہم رسالہ کی بابت دو باتیں کہنے کی اجازت چاہیں گے۔ سید احمد علیہ الرحمۃ کے اصلاحی مقاصد کے حصول و اشاعت کیلئے ہم نے فروری ۱۹۸۲ء میں اُن کے مشہور رسالے "تہذیب الاخلاق" کو نئے سرے سے جاری کیا۔ رسالہ کی اہمیت کو دیکھتے ہوئے اس کی رسم اجرا جناب محمد ہدایت اللہ صاحب (نائب صدر جمہوریہ ہند) نے انجام دی۔ اس کی ادارت کی ذمہ داری قاضی معز الدین احمد صاحب نے سنبھالی۔ باوجود ناسازیٔ مزاج کے وہ اس ذمہ داری سے بخیر و خوبی عہدہ برآ ہوئے۔ ہمیں افسوس ہے کہ ناتندرستی کی وجہ سے اس منصب سے دستبردار ہو گئے ہیں۔ ان کی گرانقدر خدمات کیلئے ادارہ سپاس گذار ہے۔ ہمیں خوشی ہے کہ جناب نور الحسن صاحب نقوی نے ہماری درخواست پر اس بارِ گراں کو قبول کر لیا۔ اور یقین ہے کہ نئے مدیرِ مسئول کے زیرِ ادارت "تہذیب الاخلاق" خاطر خواہ ترقی کرے گا۔

قارئین کرام سے گزارش ہے کہ اگر آپ اس رسالہ کے مقاصد سے متفق ہیں تو اس کے خریداروں کی تعداد بڑھایئے اور اس کے لیے مضامین لکھیے۔ نور الحسن صاحب نقوی کے ذہن میں اس رسالے کی بابت بہت سے عزائم ہیں۔ ان کا شرمندۂ تکمیل ہونا آپ کے تعاون پر منحصر ہے۔ آپ نے دیکھا ہوگا کہ اس کی کتابت اب زیادہ واضح اور بہتر ہو گئی ہے اور رسالہ بہ حیثیت مجموعی دیدہ زیب ہو چلا ہے۔ ہمیں امید ہے کہ اس کا معیار بہتر ہوتا چلا جائے گا۔ اس سلسلے میں آپ کی تجاویز کا خیر مقدم کیا جائے گا۔ اس بار یوم سرسید پر ایک خصوصی شمارہ نکالنے کے علاوہ "تہذیب الاخلاق" نے نوبل لاریٹ پروفیسر عبد السلام کے مقالے کیلئے بھی ایک پورا شمارہ وقف کر دیا ہے۔

سید حامد

زادِ راہ اور راہنما

سرسید نے اخلاص کو زادِ راہ اور عقل کو راہنما بنایا تھا۔ عقل راہنما نہ ہو تو بات بنتی نہیں۔ عقل انسان کا امتیازی وصف ہے۔ لہٰذا جو لوگ انسان کہلاتے ہیں اور انسان کی حیثیت سے ترقی کرنا چاہتے ہیں وہ عقل کی رہنمائی کے بغیر ایک قدم آگے نہیں بڑھ پاتے۔ اسمیں کوئی شک نہیں کہ عقل، بے حس اور بے مہر عقل، کارہائے نمایاں انجام نہیں دے سکتی۔ اسے جذبہ کی رفاقت، تائید اور متابعت درکار ہوتی ہے۔ بغیر جذبہ کے عقل بے جان رہ جاتی ہے اور بغیر عقل کے جذبہ بے مہار اور خود سر ہو جاتا ہے۔ عقل کا کام ہے جذبہ کو قابو میں رکھنا اور اس سے کام لینا۔ عقل کا کام ہے بھلے اور برے میں امتیاز کرنا اور افعال کے نتائج سے آگاہ کرنا۔ جذبات منہ زور گھوڑوں کی طرح ہیں جن کی روک تھام صرف عقل کر سکتی ہے۔ اور کبھی کبھی ایسے مقامات بھی آتے ہیں جب عقل بھی نہیں کر سکتی۔

سرسید نے، جن کی نظر اجتماعی نفسیات پر گہری تھی، ہندوستانی مسلمانوں کی زبوں حالی کا جائزہ لیا تو یہ بات ان پر واضح ہو گئی کہ انہوں نے جذبات کو اوڑھنا بچھونا بنا لیا ہے، جذبات جس راہ پر انہیں چلاتے ہیں اس پر وہ چلتے ہیں۔ وہ اس نتیجہ پر پہونچے کہ جذبات کی رو میں بھلے اور برے نفع نقصان سے آنکھیں بند کر لینے کا انجام خودکشی ہے۔ لہٰذا انہوں نے عقل کی بالادستی اور علم کی رفاقت پر زور دیا تاکہ انفرادی

جذبات اجتماعی شعور کے تابع فرمان ہو جائیں۔ قارئین کرام واقف
ہیں کہ سرسید نے ہندوستانی مسلمانوں کی پیش رفت کیلئے علیگڑھ
سے وہ تحریک شروع کی جسے ہندوستانی مسلمانوں کی نشاۃ ثانیہ
سے تعبیر کیا جاسکتا ہے۔ یہ تحریک علم اور عقل کی تحریک تھی۔
ہم نے یوم سرسید پر ایک تقریر "مقام نیم تعبیر" کے عنوان
سے کی تھی۔ ماحصل اس کا یہ تھا کہ سرسید کا خواب شرمندۂ
نیم تعبیر ہوا۔ یہ تحریک پچاس سال چل کر مضمحل ہو گئی اور
اب رُو بہ زوال ہے۔

گذشتہ سال یوم سرسید پر ہم نے "تہذیب الاخلاق"
میں ایک مضمون "لنگ لیر" کے عنوان سے شائع کیا تھا جس
میں یہ دکھایا گیا تھا کہ ایک احسان فراموش بلکہ محسن کش
اور تیرہ باطن قوم نے اس عظیم رہنما کی نیت پر رکیک حملے
کیے اور اس کے دل کو طنز کے تیروں سے چھید ڈالا۔

آج کی صحبت میں ہمیں یہ دکھانا ہے کہ ہر چند کہ
یہ انسانی ڈائینمو، اس بطل جلیل کی غیر معمولی اصلاحی
طاقت کے تحت ایک ملت جہالت سے ناتہ توڑنے اور
علم سے رشتہ جوڑنے پر مجبور ہو گئی، تاہم اس نے
سرسید کے پیغام کو جو روشنی، عقل، سلامت روی،
ہوش و گوش، اعتدال، توازن، ثبات، صبر اور استقلال
کا پیغام تھا قبول نہیں کیا۔ اس نے ارزاں جذباتیت،
کم کوشی اور تن آسانی سے اپنا تعلق بنائے رکھا۔ اس
کا نتیجہ یہ ہے کہ ہندوستان میں بسنے والی قوموں
میں مسلمان سب سے زیادہ سادہ لوح، جذباتی، عاقبت
ناشناس، زود مشتعل اور فریب خور ہیں۔ یہ عام
کیفیت ہندوستانی مسلمانوں کی ہے جو اپنی انتہائی شدت
میں علی گڑھ مسلم یونیورسٹی میں دیکھی جاسکتی ہے۔ یوں
بھی یونیورسٹی کا مزاج تحقیق، تفتیش اور تجزیہ کا ہوتا
ہے۔ پس پر سرسید کی ساری تحریک مبنی تھی استدلال،
تحقیق اور تفحص پر۔ تاریخ کا بہت بڑا طنز ہے کہ اس
یونیورسٹی میں جو سرسید کی تحریک کا مرکز ہے، مزاج
کی تشکیل ان گھڑ اور بھونڈے اور بے صیقل اور ناتراشیدہ
جذبات پر ہوئی ہے۔ یہاں سے عقل اور ہوش و گوش اور
عاقبت اندیشی اور غور وخوض کو دیس نکالا مل گیا ہے۔

جس قدر تکلیف زندگی میں سرسید کو تنگ نظر
اور خصومت پیشہ معترضین کے پُرعناد اعتراضات
سے ہوئی ہوگی اس سے کہیں زیادہ ایذا انہیں پہونچے گی
اگر وہ دوبارہ زندہ ہو کر یونیورسٹی کے انداز مزاج اور
طرز نگاہ کو دیکھیں۔ انہیں یہ دیکھ کر کس قدر کرب ہوگا
کہ جس روش پر وہ نوجوانوں کے مزاج کو ڈھالنا چاہتے تھے
اس کے بالکل برعکس اُسے پا رہے ہیں۔ بڑے میاں سر
پیٹ لیں گے کہ الٰہی یہ کیا۔ وہ دیکھیں گے کہ تحقیق کی
جگہ افواہ، تفتیش کی جگہ اختراع، صداقت کی جگہ
دروغ، کاوش اور جانفشانی کی جگہ تن آسانی اور
چرب زبانی، نظم وضبط کی جگہ ہنگامہ خیزی اور دریدہ
دھنی نے لے لی ہے تو اس برصغیر میں انقلاب برپا کر دینے
کے باوجود وہ محسوس کریں گے کہ ان کی ساری مساعی
رائگاں ان کی کوششیں اکارت ہو گئیں۔ ان کا مقصد علم
کا لبادہ پہنانا نہ تھا بلکہ زاویۂ نگاہ کو درست کرنا
اس میں درستی کے بجائے کجی دیکھیں گے تو ان پر کیا
گزرے گی۔

سید حامد

بدرالدین طیب جی

سرسید، علی گڑھ اور میں

اٹھارہ برس پہلے کی بات ہے کہ میں نے اس یونیورسٹی میں وائس چانسلر کی حیثیت سے قدم رکھا۔ اس وقت تک میں علی گڑھ کے ماحول سے اجنبیت محسوس کرتا تھا۔ یونیورسٹی عمارات پر جابجا سرسید کی تصویریں آویزاں تھیں۔ میں جہاں جاتا محسوس ہوتا کہ سرسید کی پروقار اور مرعوب کن شخصیت ایک خاص بلندی سے مجھ پر نظریں جمائے ہوئے ہے لیکن اجنبیت کا احساس زائل نہ ہو سکا۔

ایسا نہیں ہے کہ سرسید میرے لیے بالکل اجنبی تھے۔ میں ان کے بارے میں تھوڑا بہت ضرور جانتا تھا لیکن جو کچھ جانتا تھا اس سے میرے ذہن میں کسی عظیم شخصیت کی تصویر نہیں ابھرتی تھی۔ غالباً اس کا بھی سبھی کو علم ہوگا کہ سرسید کی طرح میرے دادا بھی ہندوستانی مسلمانوں کے مسائل سے گہری دلچسپی رکھتے تھے اور ان کی ترقی کے خواہاں تھے لیکن دونوں کے سوچنے کا انداز مختلف تھا۔ ایک نے بمبئی میں انجمن اسلام قایم کی اور دوسرے نے علی گڑھ میں محمڈن اینگلو اورینٹل کالج۔

بہرحال قسمت کو یہ منظور تھا کہ سرسید کے قایم کیے ہوئے اس عظیم الشان ادارے کا بوجھ ایک دن میرے کندھوں پر رکھا جائے۔ اب یہ ضروری معلوم ہوا کہ میں سرسید کے بارے میں زیادہ سے زیادہ معلومات حاصل کروں اور ان کے سلسلے میں جو لٹریچر دستیاب ہو اس کا گہری نظر سے مطالعہ کروں۔ میں ان کے بارے میں جتنا زیادہ پڑھتا گیا اتنا ہی زیادہ ان کا مداح اور ان کی فہم و فراست کا قایل ہوتا گیا۔ دلچسپ بات یہ ہے کہ جن مذہبی معتقدات کے سبب وہ ساری زندگی ہدفِ ملامت بنے رہے مجھے انھی نے زیادہ متاثر کیا۔

سرسید کی فکر کے تمام پہلوؤں کا احاطہ کرنا تو خیر کسی طرح ممکن نہیں اور نہ میں ان کے افکار پر کوئی طویل مضمون لکھنے کا ارادہ رکھتا ہوں۔ یہاں موقع کی مناسبت سے ان کی صرف ایک رائے اور ان کی شخصیت کے صرف ایک پہلو پر روشنی ڈالنا چاہتا ہوں اور یہ ہے مخالف رائے دینے کا انداز، اختلاف کرنے کا طریقہ اور مخالفوں کو جواب دینے کا ڈھنگ۔

اس سے کون واقف نہیں کہ سرسید اختلاف رائے کو علم کے فروغ کا ذریعہ بتاتے تھے لیکن اختلاف کے بھی آداب ہوتے ہیں اور اس موضوع پر سرسید نے تفصیل سے لکھا ہے۔ مخالفتوں سے سرسید کو ساری زندگی واسطہ رہا لیکن انھوں نے کبھی شایستگی کا دامن نہ چھوڑا۔ میرے دادا بدرالدین طیب جی سے انھیں سخت اختلاف تھا اور انھوں نے شدت سے مخالفت کی لیکن متانت کے ساتھ۔ یہی رویہ میرے دادا نے اختیار کیا۔ انھوں نے محمڈن اینگلو اورینٹل کالج کو چندہ بھی دیا۔ اور سرسید کی آل انڈیا مسلم ایجوکیشنل کانفرنس کی حمایت بھی کی۔ مختصر یہ کہ دونوں کا انداز پروقار رہا۔ ان کے باہمی اختلافات

سے بھی ایک شان ٹپکتی تھی۔

علی گڑھ میں اختلافات کل بھی تھے، آج بھی ہیں، ہمیشہ رہیں گے اور رہنے چاہئیں لیکن کیا میرا یہ خیال درست نہیں کہ کل سرسید اور بدرالدین طیب جی کے درمیان جن مسائل پر اختلافات تھے ان کی اہمیت آج کے مسائل سے کہیں زیادہ تھی۔ ان کے سامنے ایسے مسائل تھے جن کی بنیاد پر آگے چل کر قوم کی قسمت کا فیصلہ ہونے والا تھا۔ آج ہم جن مسائل پر ایک دوسرے سے دست و گریباں ہیں وہ اکثر کم اہم، بعض اوقات غیر اہم اور کبھی کبھی تو بالکل نجی اور معمولی ہوتے ہیں۔ ہمیں ٹھنڈے دل سے غور کرنا چاہیے کہ کیا ہم باہمی اختلافات کے معاملے میں سرسید کی زندگی اور ان کے خیالات سے رہنمائی حاصل نہیں کر سکتے۔

یہ سب میں اس لیے عرض کر رہا ہوں کہ میرے دل میں علی گڑھ کا درد ہے۔ کبھی کبھی یہ خیال آتا ہے کہ کاش میں علی گڑھ کبھی نہ گیا ہوتا۔ کاش یہ ممکن ہوتا کہ وہاں جو ہو رہا ہے اس پر ملامت کر کے میں چپ ہو جاؤں لیکن یہ میرے بس کی بات نہیں۔ یہ میں کر نہیں سکتا۔ یوں کہ علی گڑھ میری رگ رگ میں اتر گیا ہے۔ مجھے اس سے جو دلی تعلق ہے اسے کسی مصلحت پر قربان نہیں کیا جا سکتا۔ علی گڑھ کبھی میرے دل سے محو نہیں ہو سکتا۔ وہاں کی سڑکیں، وہاں کے سبزہ زار، وہاں کے حسین درخت، عالی شان کتب خانہ، وہاں کے گھوڑے اور شکار کی پارٹیاں بھلائی جا سکنے والی چیزیں نہیں ہیں۔

ہم اس پر فخر کرتے ہیں کہ علی گڑھ یونیورسٹی ایک مسلم یونیورسٹی ہے۔ آج ملک میں ایک ایسی یونیورسٹی کی ضرورت اس دن سے بھی زیادہ ہے جب سرسید نے محمڈن کالج کی بنیاد ڈالی تھی۔ ہندوستانی مسلمان تعلیم کے میدان میں اپنے دوسرے ہم وطنوں سے آج بھی تقریباً اتنے ہی پیچھے ہیں جتنے سرسید کے زمانے میں تھے۔ زمینداری اور جاگیرداری کبھی کی ختم ہو چکیں۔ ان کے خاتمے سے مسلمانوں کی اقتصادی حالت اور بھی خراب اور خستہ ہو گئی۔ چنانچہ اب یونیورسٹی کو مالی امداد کے لیے حکومت کی طرف دیکھنا پڑتا ہے (ممکن ہے سرسید اسے بے غیرتی خیال کرتے) لیکن ذاتی طور پر مجھے اس صورت حال کا ذرا بھی ملال نہیں۔ حکومت جیسے ادارے سے امداد قبول کرنے میں ہمیں کیوں تامل ہو۔ کیا حکومت ہمارے تعاون سے نہیں چلتی اور اس میں مالی تعاون بھی شامل ہے۔ یہی امداد افراد سے حاصل ہو تو ہم انھیں اس امداد کے عوض کیا دیں۔ شکر گزاری کے چند الفاظ، جھوٹی خوشامد اور عمارتوں پر ان کے ناموں کی تختیاں لگا کر ان کی فیاضی کا اعتراف؟

یہ بات اچھی طرح ذہن نشین کر لینی چاہیے کہ صرف مسلم یونیورسٹی نام رکھ دینے سے کام پورا نہیں ہوتا۔ اسے صحیح معنی میں مسلم یونیورسٹی ہونا چاہیے اور یہ کہ نہ اسے صرف مسلمانوں کی تعلیمی ضرورتیں پوری کرنی چاہئیں بلکہ زندگی کے جملہ شعبوں میں مسلمانوں کی رہبری کرنی چاہیے۔ ان کے تمام مسائل پر غور یہیں ہوگا۔ ان کا حل یہیں سے نکلے گا۔ اسے وہ تدابیر کرنی ہوں گی جن سے مسلمان تعلیم، سیاست، اقتصادیات جملہ شعبوں میں آگے بڑھیں اور سربلند ہو کر جئیں۔

علی گڑھ مسلم یونیورسٹی ایک اہم تعلیمی امانت ہے، ایک عظیم ادارہ ہے اور ہماری قوم کی تہذیبی امانت ہے۔ علی گڑھ صرف اسی صورت میں قائم رہ سکتا ہے جب وہ ایسا ہو کہ ہم سب اس پر فخر کر سکیں۔ ہمیں غیر ضروری کاموں میں وقت ضائع کرنے کے بجائے ان عظیم مقاصد کو اپنانا ہوگا جو سرسید اور ان کے ساتھیوں کے پیش نظر تھے

پروفیسر اسلوب احمد انصاری

سرسیّد — ایک تاثّر

محترم وائس چانسلر صاحب، خواتین و حضرات!

یومِ سرسیّد تقریبات کو محض ایک رسم کے طور پر نہیں منانا چاہیے۔ حالاں کہ ہر رسم کی ایک متاثر کن اور پُر اسرار قوت ہوتی ہے جس کا اثر بالواسطہ طور پر اور زیریں سطح پر مرتب ہوتا ہے۔ اس موقع پر اس مخصوص تاریخی صورتِ حال کا معروضی تجزیہ ضروری ہے جس کے باعث سرسیّد احمد خاں جیسی دیو قامت شخصیت منصۂ شہود پر نمودار ہوئی۔

اس تجزیہ کا ایک جزو اس مشن کا مطالعہ بھی ہونا چاہیے جسے سرسیّد نے منتخب کیا اور تقریباً پایۂ تکمیل تک پہنچایا۔ اس ضمن میں اس صورتِ حال کو بھی مدِّ نظر رکھنا چاہیے جس سے اس دور میں مسلمانانِ ہند دوچار تھے۔ فیصلے کا خواہ کوئی بھی معیار اختیار کیا جائے، سرسیّد کا منظرِ عام پر آنا ایک اہم واقعہ ہے۔ وہ ایک مختلف الجہات شخصیت اور ایک زبردست جینیس تھے۔ وہ ایک متجسس دماغ اور مضطرب روح کے مالک تھے۔ ان میں غیر معمولی توانائی، جدت پسندی، اور صبر و تحمّل کی صلاحیتیں تھیں جن کی بدولت ان کے گرد مخلص رفقاء کا ایک حلقہ تیار ہو گیا۔ یہ رفقاء سیّاروں کی مانند ایک روشن مرکزی محور میں گردش کرتے رہتے تھے۔

سرسیّد کو اس تکلیف دہ صورت حال کا بخوبی اندازہ تھا جس میں ان کے ہم مذہب گرفتار تھے۔ یہ صورتِ حال ۱۸۵۷ء کے تاریخی المیے کا منطقی نتیجہ تھی۔ سیاسی، معاشرتی اور تعلیمی زندگی میں انگریزوں کے روز افزوں اثر سے بھی وہ بخوبی واقف تھے۔ اپنی بصیرت اور معروضیت کی بنا پر انھوں نے اس مرض کی صحیح تشخیص کی اور پوری دیانت داری کے ساتھ اس نتیجے پر پہنچے کہ انگریز حاکموں کے متعلق مسلمانوں کے رویے میں تبدیلی ضروری ہے، اسی میں ان کی بھلائی ہے۔ ان کے بظاہر متضاد بیانات کی توجیہ بھی اسی طور پر کی جاسکتی ہے کہ وہ مسلمانوں کے مسائل اور ان کے حل کے متلاشی تھے۔ میرے خیال میں ان کو غلط طور پر اور خواہ مخواہ رجعت پسند اور انگریزوں کا پٹھو سمجھا گیا جب کہ در حقیقت وہ ہمیشہ ایسے سمجھوتے کی تلاش میں سرگرم تھے جس سے مسلمانوں کو زیادہ سے زیادہ فائدہ پہنچ سکے۔ ان کو یقین تھا کہ حالات بدل چکے ہیں اور ان حالات میں انگریزوں سے تعاون کرنا مسلمانوں کے حق میں مفید ہے۔ سرسیّد ایک سچے محب الوطن اور وسیع المشرب انسان تھے۔ اسلامی نظامِ اقدار پر ان کا ایمان غیر متزلزل تھا۔ اور ان کا عقیدہ تھا کہ مسلمان جدید علوم، سائنس اور ٹیکنالوجی سے بہرہ ور ہو کر ہی اپنے لیے ایک روشن مستقبل کی تعمیر کر سکتے ہیں۔ ایک مصلح یا سیاسی

فائد کی بہ نسبت سرسید ایک بڑے روشن ضمیر اور صاحبِ بصیرت شخص تھے۔ اپنے سماجی شعور اور واضح بصیرت کی بنا پر ہی اس نئے نظام کی نشان دہی کر سکے جو آہستہ آہستہ مگر منطقی طور پر منظرِ عام پر آرہا تھا۔ ان کو جدید ہندوستان کا معمار کہا جاسکتا ہے کہ انھوں نے برصغیر میں نشاۃ ثانیہ کی داغ بیل ڈالی۔

اس درس گاہ کا بانی ہونے کے ناطے سرسید کو بنیادی طور پسا ایک ایسا ماہر تعلیم سمجھا جاتا ہے جس کی تمام تر دلچسپی ہندوستانیوں ور بالخصوص مسلمانوں کی تعلیم پر مرکوز تھی۔ ان کا خیال تھا کہ انگریزوں ے تعلقات استوار رکھنے اور سرکاری ملازمتیں حاصل کرنے کے لیے ہدید تعلیم اور نیا نظام تعلیم ہی واحد راستہ ہے۔ لیکن اس خیال کے ہلو بہ پہلو یہ شعور بھی کارفرما تھا کہ انگریزی زبان کے ذریعے جدید ائنسی علوم سے واقفیت مستقبل میں ترقی کے دروازے کھول دے ،۔ مسلمانوں سے متعلق نظام تعلیم کے بارے میں ان کا اصرار تھا یہ نظام تعلیم اسلامی نظامِ اقدار سے ہم آہنگ ہونا چاہیے۔ اسی کے ِیں نظر ان کے متعدد منصوبوں میں ایک منصوبہ قرآن کریم کی ایک جامع سیر لکھنے کا بھی تھا۔ اس تفسیر میں انھوں نے معتزلہ کا نظریہ اختیار کیا ،۔ یہ نظریات اٹھارویں صدی کے انگلستان میں نیچر سے لق معروف نظریات سے ہلکی سی مماثلت رکھتے ہیں۔ سرسید کی تعلیمی سی کا امتیازی پہلو مشرق اور مغرب، تقلید پرستی اور عقلیت پسندی نسی اور آزاد خیال کلچر کے مابین ایک امتزاج ہے۔ مسلمانوں اور زوں کو قریب لانے کے پُرخلوص جذبے کے تحت انھوں نے نہ صرف الاسباب بغاوتِ ہند" (۱۸۶۹ء) تحریر کیا بلکہ بائبل کی ایک ی تفسیر بھی لکھی تاکہ دونوں مذاہب میں مماثلت واضح ہو مسلمانوں سائیوں کے تعلقات بہتر ہوں۔ سرسید کا مقصد قارئین کو اس یقین دلانا بھی تھا کہ سائنسی تصورات اور اسلامی عقائد میں کوئی تضاد نہیں ہے لیکن یہ طرزِ فکر ایک طرح کی معذرت ہے۔

اس کے برخلاف اقبال یہ سمجھتے تھے کہ یونان کے علمی ورثے سے ماخوذ مغربی نظام اقدار دراصل اسلام کے ان بنیادی عقائد کی توسیع اور توضیح ہے جو قرونِ وسطیٰ میں تمام کارہائے زندگی میں مسلمانوں کے عظیم الشان عروج کا سبب بنے۔ سرسید اور اقبال دونوں ہی اقدار کے متلاشی تھے اور ان کا مقصد تاریخ کی تفہیم تھا۔ گو دو مختلف ادوار سے متعلق ہونے کے باعث ان دونوں کا نقطۂ نظر بالکل مختلف ہے۔ میرے خیال میں سرسید عقلیت پسندی پر اصرار اور وحی یا وجدان کے انکار کی بناء پر ایک انتہا پر کھڑے ہوئے نظر آتے ہیں۔ اس نکتے کی جانب اقبال نے اپنے مشہور 'خطبات' میں بھی اشارہ کیا ہے۔ سرسید غیر شعوری طور پر سائنسی کلچر اور لبرل کلچر کی دوئی پر بہت زیادہ زور دیتے ہیں۔ لبرل کلچر کے مقابلے میں سائنسی کلچر کو ترجیح دینے میں محتاط رہنے کی ضرورت ہے یہ نکتہ اقبال کی دور رس نگاہوں سے اوجھل نہ تھا۔ اس کی وجہ غالباً یہ ہے کہ اقبال کو مغرب سے پوری واقفیت بھی تھی اور ان کو ان خطرات کا بھی اندازہ تھا جو سائنسی کلچر کے فروغ کے نتیجے میں رونما ہو سکتے ہیں۔ یہاں سائنسی کلچر سے مراد روزمرہ کی زندگی میں سائنس سے حاصل ہونے والے مثبت فوائد نہیں ہیں۔

یہ عام طور پر سمجھا جاتا ہے کہ ایک سماجی مفکر کی حیثیت سے سرسید کا عظیم کارنامہ یہ ہے کہ انھوں نے قدامت پرستی ریاست پر کلیسا کی برتری اور آزادانہ فکر پر بندش کے ہم معنی قرونِ وسطیٰ کی فکر سے سماج کو یکسر آزاد کرنے اور نشاۃِ ثانیہ کے افکار کو فروغ دینے کی کوشش کی۔ یہ تصور مگر لیکن

اور بے بنیاد ہے۔ ہمارے اپنے مخصوص حالات کے پیشِ نظر یہ کہنا زیادہ صحیح ہوگا کہ سرسید اسلام کو، اس کے تمام بنیادی عقائد سے انحراف کیے بغیر، دورِ جدید سے ہم آہنگ کرنا چاہتے تھے۔ وہ اسلام کی عقلیت پسندی، مادی حقائق کی جستجو پر اس کے اصرار سیاسی اور معاشرتی انصاف پر مبنی اس کے اصولوں، دولت کی منصفانہ تقسیم اور اس کے غیر استحصالی معاشی نظام کو ہم عصر مغربی تہذیب کے سائنسی پہلوؤں سے ہم آہنگ کرنا چاہتے تھے۔ اسلام کسی صورت میں بھی مذہب کو غیر محدود اختیارات نہیں دیتا۔ بلکہ فرد کو حتی الامکان آزادی عطا کرتا ہے تاکہ وہ ملت کا ایک موثر اور متحرک جزو بن کر خیر کا خادم بن سکے۔

سرسید کی دلی خواہش ہمیشہ یہ رہی کہ مسلمان ملکی سیاست میں موثر رول ادا کر سکیں۔ ان کا یہ خیال بجا تھا کہ اگر مسلمان ہندوستان کی دوسری قوموں کے شانہ بشانہ نہ چل سکے تو پھر اس دلدل سے نکلنا ان کے لیے دشوار ہو جائے گا۔ اسی لیے انھوں نے اپنی تمام توانائی مسلمانوں کی تعلیمی اور معاشرتی فلاح و بہبود میں صرف کی۔ بلکہ اسی خیال سے انھوں نے مسلمانوں کو سیاست سے دور رہنے تک کا مشورہ بھی دیا۔

مدرستہ العلوم کے دروازے انھوں نے ذات پات عقائد یا سیاسی وابستگی کی تفریق کے بغیر ہر ایک کے لیے کھلے رکھے۔ اس ادارے نے ابتداء سے ہی سرسید کے سیکولرازم کو اپنا نصب العین بنایا۔ اس کی مثال ہندوستان میں کہیں اور نہیں ملتی۔ اس ادارے میں مسلم اور غیر مسلم طلباء اور اساتذہ کا تناسب ۴۰ : ۶۰ فی صد ہے۔ جب کہ اسی ملک کے دوسرے اداروں میں یہ تناسب نصف فیصد سے بھی کم ہے۔ ہمارے لیے سیکولرزم محض ایک بے معنی تکیۂ کلام نہیں بلکہ ہماری فکر کا ایسا لاینفک جزو ہے جس کا اثر روزمرہ کی زندگی پر بھی نمایاں ہے۔

سرسید کی مصروفیات بے اندازہ اور ان کی ذمہ داریاں بے شمار تھیں۔ اس کے باوجود انھیں اردو زبان کے استحکام اور اس کی نشوونما کی فکر دامن گیر رہی۔ انھیں اندازہ تھا کہ یہ سارے ملک کے لیے رابطے کی زبان ہے۔ وہ ہمیشہ اس کے لیے کوشاں رہے کہ یہ ترقی کرے اور جملہ علوم و سائنس کو اپنے دامن میں سمیٹنے کے قابل ہو جائے۔ ان کو اس بات کا بھی احساس تھا کہ مغرب سے رابطہ کا ذریعہ انگریزی زبان ہے اور اسے بھی زیادہ سے زیادہ عام کیا جانا چاہیے۔ وہ اس کو بھی ضروری خیال کرتے تھے کہ مقامی زبانیں اس سے استفادہ کریں۔ وہ دیکھ رہے تھے کہ انگریزی جدید علوم کا سرچشمہ ہے

سرسید نے حیات و کائنات کے ضمن میں عقلیت پسندی اور سائنسی طرزِ فکر کو اختیار کرنے، روایت اور تجربے، مشرق اور مغرب کے درمیان مفاہمت پیدا کرنے، اہلِ وطن میں رواداری اور وسیع القلبی پیدا کرنے اور سیکولرزم (جس کی اسلام خود اجازت دیتا ہے) کو مستحکم کرنے کی انتھک کوشش کی۔ لہٰذا یہ واقعی ایک مناسب قدم ہوگا کہ ہم مستقبل کا لائحہ عمل مرتب کرتے وقت اس عظیم بانی کے ان نظریات کو اپنی نظروں سے اوجھل نہ ہونے دیں جن کے وہ ساری زندگی علمبردار رہے۔

[سرسید تقریبات کے سلسلے کی ایک تقریر]

پروفیسر عتیق احمد صدیقی

۱۸۸۳ء بنام ۱۹۸۳ء

سرسید کی حیات میں ان کی رائے سے اختلاف کیا جاتا رہا آج بھی کیا جا رہا ہے، ان کے مذہبی افکار کی سخت ترین مخالفت کی گئی آج بھی کی جا سکتی ہے، مغربی تمدن کے بارے میں ان کے نقطۂ نظر کو اس وقت بھی نہیں سراہا گیا، اس کے بارے میں آج بھی شک و شبہ کیا جا سکتا ہے اور ایسے ہی بہت سے امور جن میں ان کی مخالفتیں ہوتی رہیں آج بھی بحث کا موضوع بن سکتے ہیں لیکن ایک بات اس سے مستثنیٰ ہے ان کی حیات میں ان کی تمام ترکاوشوں اور نیک کوششوں کے بارے میں یہ شبہ کیا جاتا رہا کہ وہ کسی بیرونی شہ پر مبنی ہیں۔ لیکن اب تمام حلقے، وہ بھی جو ان کے شدید مخالف تھے، یہ تسلیم کرتے ہیں کہ ان کے تمام اقدامات نیک نیتی پر مبنی تھے۔ خواہ ان سے غلطیاں سرزد ہوئی ہوں، ان کی کوششوں کے خاطر خواہ نتائج برآمد نہ ہوئے ہوں لیکن انھوں نے جو کچھ کیا اس میں سچّی قومی ہمدردی کے جذبات کارفرما رہے۔

قومی ہمدردی کے جذبات ان کے مزاج میں ابتدا سے شامل رہے ہوں گے۔ لیکن یہ بیدار ہوئے ۱۸۵۷ء کے بعد اور اس بیداری کا سبب بنے غدر کے دل شق کرنے والے واقعات۔ وہ اپنی ذاتی حیثیت میں جو کام انجام دے سکتے تھے ان کو اپنی بھرپور صلاحیت سے انجام دیا۔ لیکن وہ یہ بھی جانتے تھے کہ قومی کام اتنے بڑے ہوتے ہیں کہ ان میں اجتماعی کوشش کے بغیر کسی کامیابی کی امید نہیں کی جا سکتی۔ انھوں نے ایک جگہ لکھا کہ "ایک شخص میں اپنی مدد آپ کرنے کا جوش اس کی سچّی ترقی کی بنیاد ہے اور جب کہ یہ جوش بہت سے شخصوں میں پایا جاوے تو وہ قومی ترقی اور قومی طاقت اور قومی مضبوطی کی جڑ ہے۔" وہ اپنی تحریر سے تقریر سے، اپنے عمل سے قوم کے افراد کے دلوں میں اسی جوش کو پیدا کرنے کی کوشش کرتے رہے۔ غدر کے زمانے میں انھوں نے جو خدمات انجام دیں، ان سے قطع نظر ان کی پہلی قومی کوشش مرادآباد میں ایک مدرسہ کا قیام تھا۔ اس کے بعد وہ جہاں رہے وہاں تعلیمی ادارے قائم کرنے کے علاوہ انجمنیں بھی قائم کرتے رہے۔ انجمنوں کا قیام دراصل اسی مقصد سے تھا کہ جو کام انفرادی طور پر سرانجام نہیں ہو سکتا، اس کے لیے بہت سے اشخاص کے دلوں میں ولولہ پیدا کر دیا جائے اور ان کاموں میں قوم کے افراد کی زیادہ سے زیادہ شرکت ہو۔

اس وقت دیگر انجمنوں سے قطع نظر ہم اس انجمن کا ذکر کرنا چاہتے ہیں جس کی بنیاد سرسید نے اب سے سو برس پہلے یعنی ۱۸۸۳ء میں ڈالی تھی۔ یہ تھی محمڈن سول سروس فنڈ

ایسوسی ایشن۔ اگرچہ سرسیّد کی کوششوں میں کسی بھی کوشش
کا یہ مقصد نہیں رہا کہ اس کے نتیجے میں چند افراد کو ملازمتیں مل
جائیں لیکن مجموعی طور پر قومی ترقی اور فلاح کے جو نقشے وہ سوچتے
اور بناتے رہے۔ ان میں سرکاری ملازمتوں کو بھی ایک اہمیت
حاصل ہوگئی۔ انھوں نے خیال کیا اور بجا طور پر کیا کہ "کسی
قوم کی جب تک کہ وہ گورنمنٹ میں کچھ حصّہ نہ رکھتی ہو عزت نہیں
ہوسکتی"۔ گورنمنٹ میں حصّہ داری کی جہاں ایک شکل کونسلوں
اور ایسے اداروں کی رکنیت تھی، وہیں سرکاری ملازمتیں بھی
اس کی دوسری شکل تھیں۔ مسلمان پہلے ہی اپنے مخصوص حالات
کی وجہ سے تعلیمی پسماندگی کا شکار تھے اور اس طرح گورنمنٹ
میں ان کا درجہ بہت کم تھا۔ پھر اعلیٰ ملازمتوں کے لیے اعلیٰ
تعلیم کی ضرورت تھی جو انگلستان جاکر ہی حاصل کی جاسکتی تھیں
قوم کی کھوئی ہوئی عزّت اور وقار کی بازیافت کی جو چٹک
سرسیّد کے دل کو لگی ہوئی تھی، اسی نے ان سے مدرستہ العلوم
قایم کرایا تھا۔ سرسیّد جیسا انسان اس پر قناعت نہیں کرسکتا
تھا۔ قیام مدرسہ کو ابھی دس سال بھی نہ گزرے تھے کہ انھوں نے
ولایت کی تعلیم کے لیے جدوجہد شروع کردی۔ اس ایسوسی ایشن
کے دو مقاصد تھے۔ ایک تو یہ کہ ہونہار طالب علموں کو یورپ
کے سفر پر آمادہ کیا جائے اور دوسرے کم سے کم پانسو مسلمان
ممبر دو روپیہ ماہوار دینے والے پیدا کیے جائیں۔ تاکہ جو
طالب علم یورپ کے سفر کے اخراجات برداشت کرنے کی استطاعت
نہ رکھتے ہوں، ان کی مدد کے لیے روپیہ فراہم ہوجائے۔ سرسیّد
اپنی دھن کے پکّے تھے اور جب وہ کسی کام کے کرنے کی ٹھان لیتے
تو پورے انہماک سے اس میں لگ جاتے تھے۔ مگر مشکل یہ تھی کہ
جن لوگوں سے ان کو سابقہ تھا ان کی بے عملی ان کوششوں کو ناکام
کردیتی تھی۔ چنانچہ انھوں نے ممبران کی تعداد میں اضافہ کے لیے شمالی
ہند کے ہر ضلع میں اس ایسوسی ایشن کی شاخیں قایم کرنے کا ارادہ
کیا۔ لیکن کافی جدّوجہد کے بعد ممبران کی تعداد صرف ۲۹۹ تک پہنچ
سکی۔ یہ اراکین دو دو روپیہ ماہوار چندہ دیتے تھے۔ بعض نے وقتاً
فوقتاً کچھ زیادہ رقوم بھی دیں۔ لیکن انسان بالعموم اور زوال پذیر
قومیں بالخصوص کسی کام کو مستقل مزاجی کے ساتھ نہیں کرسکتیں چنانچہ
بقول حالی "کچھ عرصہ کے بعد سب کے ارادے سست ہوگئے اور
جیسا کہ ماہواری اور سالانہ چندوں کا ہمیشہ انجام ہوتا ہے، رفتہ
رفتہ چندہ دینا بند ہوگیا"

ایک عملی انسان کی طرح سرسیّد نے ممبر سازی اور رقوم کی
فراہمی پر ہی اکتفا نہیں کیا بلکہ انھوں نے کالج میں سول سروس کلاس
کے نام سے ایک علیحدہ جماعت بھی قایم کی جس میں درس و تدریس
کا انداز دوسری جماعتوں سے قدرے مختلف تھا۔ درسی مضامین
کی تعلیم کے علاوہ اس جماعت میں طلبا کو اس مقصد سے تیار کیا جاتا تھا
کہ وہ انگلستان جاکر یا سول سروس کے امتحان میں شریک ہوں
یا انگلستان کی کسی یونیورسٹی سے کسی مضمون میں اعلیٰ ڈگری حاصل
کریں یا کسی مخصوص پیشہ جیسے بیرسٹری، ڈاکٹری یا انجنیری کی تعلیم
حاصل کریں۔ اس بات کا تو ریکارڈ موجود ہے کہ اس جدّوجہد میں
چار ہزار ایک روپے جمع ہوئے لیکن اس کا کوئی ریکارڈ نہیں ملتا
کہ کتنے طلباء کو تشویق و ترغیب ہوئی، کتنوں نے سول سروس
کلاس میں شمولیت کی اور مناسب تیاری کی مگر اندازہ یہ ہوتا ہے
کہ اس سہولت کا فائدہ کسی نے بھی نہ اٹھایا ؎

مگر اس میں پڑتی "تھی" محنت زیادہ

حالی نے بڑے تاسف سے لکھا۔

"یہ تجویز اگر چل جاتی تو مسلمانوں کی ترقیِ تعلیم کے

حق میں نہایت مفید تھی۔ مگر اس تدبیر میں
کوئی کامیابی نہیں ہوئی اور آخر کار وہ کلاس
اور ایسوسی ایشن دونوں توڑ دی گئیں۔

اب یہ ۱۹۸۳ء ہے۔ ان واقعات کے سو سال بعد کا زمانہ
اب ملک میں تعلیم عام ہو چکی ہے۔ صرف مسلمانوں کے اعلیٰ طبقے
ہی نہیں بلکہ متوسط اور ادنیٰ طبقوں کے ہزارہا افراد نہ صرف
علی گڑھ مسلم یونیورسٹی (مدرسۃ العلوم کی ترقی یافتہ شکل)
میں زیر تعلیم ہیں بلکہ اطراف و اکناف ملک کی یونیورسٹیوں
اور کالجوں میں تعلیم حاصل کر کے نکل رہے ہیں۔ زندگی کے
مختلف شعبوں میں بے حد توسیع ہو چکی ہے اور روزگار
کے بہت مواقع پیدا ہو چکے ہیں۔ ایسے حالات پیدا ہو چکے ہیں کہ
کوئی طبقہ صرف ملازمتوں بالخصوص سرکاری ملازمتوں کے
سہارے اپنی بقا کا تصور نہیں کر سکتا۔ لیکن اس دانائے روزگار
کا وہ خیال جس کا اوپر ذکر ہوا کہ "کسی قوم کی جب تک کہ وہ گورنمنٹ
میں حصہ نہیں رکھتی ہو عزت نہیں ہو سکتی"، آج بھی اسی طرح
درست ہے۔ زمانے کے انقلابات اور سخت تھپیڑوں نے بہت
سے مزعومات باطل کو پاش پاش کر دیا ہے۔ زمانہ شناس طبقوں
نے اس کی نبض کی دھڑکنوں کو پہچان لیا ہے۔ مگر آہ ہم! کہ نہ
عبرت ہے نہ ذوق! اکبر خود تو "مدخولہ گورنمنٹ" تھے۔ لیکن انھوں
نے "لیلائے سول سروس" کی پھبتی کس کر بہت سے نوجوانوں
کے ذہنوں کو گمراہ کیا اور ہم اپنی ترنگ میں اس طرح کی کوشش
کو حقارت سے دیکھتے رہے۔ جیسے یہ ہمارے رتبۂ بلند سے فروتر
کوئی چیز ہے۔ ملک کے گراں خواب طبقے بیدار ہو چکے ہیں۔ پچھڑے
اور گرے پڑے طبقے کھڑے ہو رہے ہیں۔ مگر ہم پر سکر کی ایسی
کیفیت طاری ہے کہ شاید شور نشور بھی ہمیں اس سے باہر نہ
لا سکے۔ ذرا آیئے حالات پر ایک طائرانہ نظر ڈالیں۔

دس پندرہ سال پیشتر علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کے چند اساتذہ
نے بانیٔ درسگاہ کی تحریک کو پھر زندہ کرنا چاہا۔ اب کہ ملک آزاد
ہو چکا تھا۔ اور سول سروس ولایت کی بات نہیں رہ گئی تھی، بہت
سی دشواریاں ختم ہو چکی تھیں۔ امتحان اب گھر میں ہو رہا تھا، صرف
حوصلہ کی ضرورت تھی۔ یہاں کے اساتذہ نے اپنی خدمات بلا معاوضہ
پیش کیں اور سول سروس کلاسوں کا انتظام ہو گیا۔ دلی میں
ٹریننگ کی جو سہولتیں تھیں، ان سے استفادہ کا اہتمام کیا گیا۔ وہاں
کی اولڈ بوائز ایسوسی ایشن نے مختلف طریقوں سے مدد کی۔ اس
کے بعض ارکان نے اس کام کو ایک مشن کے طور پر اپنا لیا۔ لائبریری
اور کچھ متفرق مصارف کے لیے دیگر حضرات کے علاوہ الحاج عبید الرحمٰن
خاں شروانی صاحب نے ایک خطیر رقم کا انتظام کرا دیا۔ لیکن ان تمام
کوششوں کا نتیجہ بھی گذشتہ صدی کی کوششوں سے کچھ مختلف نہیں
نکلا۔ فرق صرف اتنا سا رہا کہ ان کوششوں کو ابھی تک ترک نہیں
کیا گیا۔

اس دوران یونیورسٹی میں طالب علموں کی تعداد دس ہزار
سے سولہ ہزار کے درمیان رہی۔ اگر اس کا ایک فیصدی حصہ بھی اس
طرف متوجہ ہوتا تو ۱۹۸۳ء میں کم از کم ۱۶۰ طالب علموں کو شامل
ہونا چاہیے تھا۔ کامیابی یا ناکامیابی کا تو دوسرا مرحلہ ہے پہلا
تو صرف امتحان کی شمولیت کا مسئلہ ہے۔ اگر راہی اس منزل تک
بھی نہ پہنچ سکیں تو ع

خدا سے کیا ستم و جور ناخدا کہیے۔

یونین پبلک سروس کمیشن نے مختلف یونیورسٹیوں سے متعلق ۱۹۸۰ء
کے اعداد و شمار شائع کیے ہیں۔ علی گڑھ کے نزدیک ترین یونیورسٹیوں
کے اعداد و شمار ملاحظہ ہوں۔

یونیورسٹی	تعداد شرکاء	تعداد کامیاب
جواہر لال نہرو یونیورسٹی دہلی	۲۱۰	۴۷
دہلی یونیورسٹی	۱۰۱۶	۱۸۷
الہ آباد "	۴۶۴	۴۸
پنجاب "	۴۶۳	۴۷

ان میں سے دو مرکزی یونیورسٹیاں ہیں اور دو علاقائی۔ مرکزی یونیورسٹیوں کی حیثیت سے تو ہمیں دہلی یونیورسٹی کی ہمسری کرنی چاہیے تھی۔ لیکن ہم تو علاقائی یونیورسٹیوں کے مقابلے میں بھی کہیں نہیں آئے۔

علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کا خاص طور پر ذکر اس لیے کیا گیا کہ یہاں مسلمان طالب علموں کا سب سے بڑا اجتماع ہے اور یہاں کے سارے حالات ان کے حق میں ہیں۔ لیکن اگر ملک گیر حیثیت سے دیکھیں تو شاید صورتِ حال زیادہ مایوس کن نہ بھی ہو تو زیادہ بہتر یقیناً نہیں ہے۔ گذشتہ دو سال کے اعداد و شمار کچھ اس طرح ہیں۔

	۱۹۸۱ء	بہ اعتبار تناسب مسلمانوں کی مطلوبہ تعداد	۱۹۸۲ء	بہ اعتبار تناسب مسلمانوں کی مطلوبہ تعداد
تعداد درخواست دہندگان	۹۴۴۱۹	۱۱۳۴۲	۸۵۴۴۳	۱۱۰۲۰
تعداد شرکاء امتحان	۵۷۴۴۵	۷۴۶۲	۵۰۴۲۰	۶۵۵۲
تحریری امتحان میں کامیاب	۹۶۲۷	۱۲۴۸	۹۸۷۳	۱۲۸۷
انٹرویو کے بعد کامیاب	۱۶۵۲	۲۱۵	۱۶۶۴	۲۴۲
مسلمان منتخب		۱۲		۱۴

گویا ۱۹۸۲ء میں مسلمانوں کی مطلوبہ تعداد کو منتخب ہونے کے لیے ساڑھے چھ ہزار سے زائد امیدواروں کی امتحان میں شرکت کی ضرورت تھی۔ اگرچہ اس بارے میں اعداد و شمار حاصل نہیں ہیں، لیکن صورتِ حال کے پیش نظر یہ قیاس کرنا کچھ بعید از کار نہ ہوگا کہ امتحان میں شرکت کرنے والے مسلم طلباء کی کل تعداد بھی شاید دو سو نہ ہو۔

سبق حاصل کرنے کے لیے یہ امر بھی قابل توجہ ہے کہ ۱۹۸۲ء کے ۱۸۹۴ کامیاب امیدواروں میں پسماندہ اور درج فہرست ذاتوں کے ۴۵۹ امیدوار تھے۔ کیا یہ صرف اس لیے ہوا کہ ان لوگوں کو جو مراعات حاصل ہیں انہیں ان کا فائدہ پہونچا؟ اس کا جواب اثبات اور نفی دونوں میں ہے۔ پبلک سروس کمیشن کی رپورٹ کے مطابق ان امیدواروں کے نتائج سال بہ سال بہتر ہو رہے ہیں۔ ۱۹۷۹ء سے پہلے محفوظ جگہوں کو پُر کرنے کے لیے امیدوار نہیں مل پاتے تھے۔ لیکن ۱۹۷۹ء سے صورتِ حال بدل گئی۔ اب مجموعی طور پر پورا اترنے والے درج فہرست ذاتوں کے امیدواروں کی تعداد اتنی ہو جاتی ہے کہ محفوظ جگہوں کو بہ آسانی پُر کیا جا سکتا ہے۔ عمومی معیار اور ان امیدواروں کے معیار کا تفاوت ۱۹۷۷ء میں ۱۰ فی صدی تھا۔ ۱۹۸۲ء میں یہ گھٹ کر ۶ فی صدی رہ گیا ہے اور اب کوئی سال جاتا ہے کہ یہ ۶ فی صدی کی خلیج پٹ جائے گی اور پچھڑی ذاتوں کے امیدوار خود کو ملک کے عمومی معیار پر لے آئیں گے۔ اور تب کسی خصوصی رعایت کی ضرورت نہیں رہے گی۔ مسلمان تعلیم اور مقابلہ آرائی میں اپنی پسماندگی کے جو اسباب بیان کرتے ہیں ان میں سے کسی میں بھی ان ذاتوں کی حالت بہتر نہیں بلکہ شاید کمتر ہی ہو۔ لیکن وہ تعمیر اور ترقی، مسابقت، مقابلہ آرائی اور جہد للبقا کے جذبے سے سرشار ہیں اور ہم ......؟ کوئی بتلاؤ کہ ہم بتلائیں کیا؟ ہم بہت سی صدیاں منا رہے ہیں۔ کیا یہ نہیں ہو سکتا کہ ایک صدی تقریب مستقبل کی تعمیر کے لیے بھی منائی جائے؟ یعنی ہم ۱۹۸۳ء میں یہ عہد کریں کہ سرسید کے ۱۸۸۳ء کے خواب کی تعبیر پوری کی جائے گی!

کون ہوتا ہے حریف مے مرد افگن عشق؟

ڈاکٹر اصغر عباس

وہ خاک کہ ہے جس کا جنوں صیقلِ ادراک

عزیزو! میرے بیقرار دل کو آج قرار سا آگیا ہے۔ معلوم ہوتا ہے میرا خواب شرمندۂ تعبیر ہونے کو ہے۔ میں اب ہمیشہ کے لیے خاموش ہوا چاہتا ہوں۔ میری ہڈیوں کو اس غم نے پگھلا دیا تھا کہ میں دیکھتا تھا وقت کا قافلہ تیزی کے ساتھ آگے بڑھتا چلا جارہا ہے لیکن تم ہو کہ خوابِ گراں سے بیدار ہونے کا نام نہیں لیتے۔ میں نے برسوں لگاتار تمہیں خوابِ غفلت سے جگانے کی جدّوجہد کی۔ خدا کی کوئی صبح مجھ پر ایسی طلوع نہیں ہوئی جب اس مقصد کی طلب سے میرا دل خالی ہوا ہو اور کوئی شام مجھ پر ایسی نہیں گزری جب میں نے اس کی تمنّا میں اپنے بسترِ غم واندوہ پر بیقراری سے کروٹیں نہ بدلی ہوں۔ آج مسجد کی محرابیں اور اسٹریچی ہال کے بام و در دیکھتا ہوں تو کچھ ایسا محسوس ہوتا ہے کہ میرے دل کی بیقراری نے اس کالج کا پیکر اختیار کرلیا ہے۔

——— سرسیّد احمد خاں

علی گڑھ اسٹیشن سے شمال کی جانب دو کلومیٹر کا فاصلہ طے کریجیے تو بائیں ہاتھ کو ایک گیٹ نظر آتا ہے۔ یہ فیض گیٹ ہے اور یہیں سے یونیورسٹی کی عمارات کا سلسلہ شروع ہو جاتا ہے۔ گیٹ کے اندر قدم رکھیے تو وہ شاندار اور پُرشکوہ عمارت آپ کے پیشِ نظر ہوگی جسے علی گڑھ سے متعلق سرسیّد کے خوابوں کی پہلی تعبیر کہا جاسکتا ہے۔ یہ سرسیّد ہال ہے۔ اس کا صدر دروازہ جو جنوب کے رُخ پر وکٹوریہ گیٹ کہلاتا ہے اس کی تعمیر ۱۸۹۴ء میں مکمل ہوئی اس کے مینار پر جو کلاک لگا ہوا ہے وہ کالج کے پرنسپل بیک کے والد نے تحفتہً کالج کو دیا تھا۔ اس کلاک کا وزن تین سو چھتیس پونڈ ہے۔

وکٹوریہ گیٹ کے اندر قدم رکھیے تو اسٹریچی ہال کی شاندار عمارت نظر آتی ہے۔ ۱۱ر دسمبر [illegible] کو اس کا سنگ بنیاد رکھا گیا اور جب یہ مکمل ہوا

توشمالی ہندوستان کا سب سے بڑا ہال سمجھا جاتا تھا۔ یہ عمارت مع برآمدوں
اور طرفین کی گیلریوں کے ۱۰۷ فٹ لمبی ۸۱ فٹ چوڑی اور ۵۴ فٹ
بلند ہے اور تقریباً سات ہزار مربع فٹ میں بنی ہوئی ہے۔ اس کی تعمیر میں
۱۰ہزار روپے صرف ہوئے تھے اور ایک سو بیس بزرگوں نے اس
کے لیے چندہ دیا تھا جن کے نام ہال کی دیوار پر نصب کیے گئے ہیں۔
۱۲ نومبر ۱۸۹۴ء کو اس کے افتتاح کے موقع پر سرسید نے پیشین گوئی
کی تھی کہ "جس جگہ ہم لوگ اس وقت جمع ہیں ایک روز وہ اولوالعزم
نوجوانوں کی بیتاب تمناؤں کا مرکز بنے گا اور یہاں سے ملّی اعزاز و
سرفرازی کے قافلے روانہ ہوں گے۔"
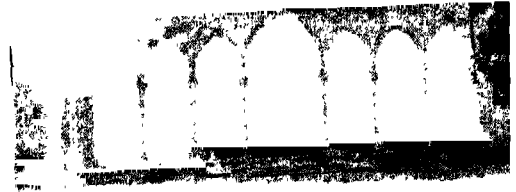
سرسید ہال کے مشرقی گوشے میں ایک بڑا سا ہال ہے۔ یہ سالار
[ج]نگ کے نام سے منسوب ہے کیونکہ اس کی تعمیر میں سر سالار جنگ کے تعاون
[ک]ا دخل ہے۔ یہ ڈائننگ ہال کے طور پر استعمال ہوتا ہے۔ ۱۸۷۵ء میں
[ریاس]ت حیدر آباد نے مدرستہ العلوم کو بائیس سو روپیہ سالانہ کی امداد عطا
[کی۔] یہ رقم بڑھتے بڑھتے چوبیس ہزار سالانہ تک پہنچی۔ اس سرپرستی کا
[اعتر]اف نظام میوزیم کی تعمیر سے کیا گیا جو سرسید کی وفات کے بعد ۱۹۰۴ء
[میں] پایۂ تکمیل کو پہنچی۔ آسمان منزل بھی اسی سال مکمل ہوئی یہ وزیر اعظم
[حیدر]آباد سر آسمان جاہ کی یادگار کے طور پر تعمیر ہوئی۔ کالج کو ان کا
[ز]بردست تعاون حاصل تھا۔ برکت علی خاں لکچر روم، تصدق رسول
[خ]اں روم، حمید اللہ خاں لکچر روم، بیگ منزل، آدم جی پیر بھائی منزل

سمیع منزل، مشتاق منزل اور لٹن لائبریری سرسید ہال کی دیگر یادگار
عمارتیں ہیں جن کی تفصیل یہاں قلم انداز کی جاتی ہے لیکن ایک عمارت
ایسی ہے جس کے بغیر یہاں کی عمارات کا ذکر بہر حال نامکمل ہے۔ یہ
عمارت ہے سرسید ہال کی شاندار اور پُرکشش مسجد۔

اس مسجد کی تعمیر ۱۸۷۹ء میں شروع ہوئی۔ اس وقت سرسید نے
کہا تھا "یا اللہ میں یہاں تیرے نام لیواؤں کے لیے ایک گھر بناؤں گا"۔
یہ گھر فروری ۱۹۱۵ء میں مکمل ہوا۔ اس کی خشت اوّل سیّد محمود
کے ہاتھوں رکھی گئی۔ یہ امر قابلِ ذکر ہے کہ مسجد مساحت میں زیادہ نہیں
لیکن حسنِ تناسب میں بے نظیر ہے۔ کہا جاتا ہے کہ جامع مسجد دہلی کے
علاوہ پورے ہندوستان میں شاید ہی کوئی مسجد ایسی ہو جس کے سرخ بنیادوں
اور تینوں اجلے گنبدوں میں انفرادی اور مجموعی طور پر ایسا تناسب واقع
ہوا ہو۔ غالباً یہی سبب ہے کہ ہماری نگاہیں اس پر اس حد تک مرکوز
ہو جاتی ہیں کہ جی چاہتا ہے اسے دیکھتے ہی چلے جائیں۔

مسجد کے احاطے میں جانب شمال محمود منزل اور سیّد محمود کا مقبرہ
ہے۔ اس کے بعد ہمارے رہنما کی تربت ہے۔ سرسیّد کا مقبرہ ان کے
رفیق سید زین العابدین کی نگرانی میں تیار ہوا تھا۔ کہا جاتا ہے کہ
سرسیّد اور زین العابدین جب علی گڑھ میں ہوتے تو صبح کی چائے
ساتھ پیتے تھے۔ جب اُن کا انتقال ہو گیا تب بھی زین العابدین
نے اپنی وضع قائم رکھی۔ صبح کو خادم چائے کی ٹرے لے کر سرسید کے مزار
پر آتا۔ یہاں زین العابدین پہلے فاتحہ پڑھتے پھر چائے پیتے تھے۔ ان
کی یہ وضع مرتے دم تک برقرار رہی۔ سر راس مسعود، ڈاکٹر ضیاء الدین احمد
محسن الملک اور سیّد زین العابدین یہیں مدفون ہیں۔

ابو الکلام قاسمی

سرسید کی پیش بینی

مدرسۃ العلوم، سائنٹیفک سوسائٹی، مسلم ایجوکیشنل کانفرنس اور تہذیب الاخلاق، یہ چاروں وہ عناصرِ اربعہ تھے جن کی تشکیل سے سرسید کے مشن کے خدوخال متعین ہوتے تھے۔ سائنٹیفک سوسائٹی کے جھنڈے تلے جدید علوم وافکار سے متعلق تحریروں کو اُردو میں منتقل کرنے کے عزائم، ایجوکیشنل کانفرنس کی نگرانی میں پورے ملک کے مسلمانوں میں تعلیمی سرگرمیوں کا آغاز اور کانفرنس کے سالانہ جلسوں میں اس مقصد میں پیش رفت کے جائزے کی تجویز، تہذیب الاخلاق کے ذریعہ مسلمانوں کی اخلاقی اور مدنی حالت کے سُدھار کی کوشش اور مدرسۃ العلوم کو اپنے خوابوں کی عملی تعبیر اور ساری عمر کی آرزوؤں کی تکمیل کے طور پر معرضِ وجود میں لانا۔ ثابت کرتا ہے کہ سرسید نے ساری زندگی مسلمانوں کی فلاح وبہبود کے بہت سے طریقے اپنائے مگر بالآخر تعلیم پر ساری توجہ مرکوز کرنے کو ہی انھوں نے پوری ملت کی پس ماندگی اور اجتماعی احساسِ کمتری کے ازالہ کی اساس سمجھا۔ بعد کے حالات اور گذشتہ ایک صدی میں ہندوستانی مسلمانوں کی تاریخ نے اس کا ثبوت فراہم کیا کہ سرسید نے تعلیمی پس ماندگی کو مسلمانوں کی قومی برائیوں کی اساس سمجھ کر کوئی غلطی نہیں کی تھی۔ چنانچہ سرسید کے متعین کردہ خطوط پر ہی ہندوستان میں مسلمانوں کی تعلیم، تہذیب اور روشن خیالی کے نقوش اُجاگر ہوئے۔

اب دیکھنا یہ چاہیئے کہ آیا سرسید کی خدمات ہمارے لئے صرف متبرک ہیں جن سے بعد کی نسلیں مستفیض ہورہی ہیں یا عقلی اور فکری طور پر بھی سرسید کی کوئی معنویت آج کی نسل کے لئے باقی ہے؟ — اس کا جواب معلوم کرنے کے لیے سرسید کے خیالات اور افکار کی طرف رجوع کیا جائے تو شاید شخصیت پرستی کے الزام سے محفوظ رہتے ہوئے ہم کسی نتیجہ تک پہنچ پائیں۔ سرسید نے ایک بار اپنی تقریر میں کہا تھا:۔

> ہمارے بزرگوں کو نہایت آسانی تھی کہ مسجدوں اور خانقاہوں کے حجروں میں بیٹھے بیٹھے قیاسی مسائل کو قیاسی دلائل سے اور عقل کو عقلی براہین سے توڑتے پھوڑتے رہیں اور اُن کو تسلیم کریں مگر اس زمانے میں نئی صورت پیدا ہوتی ہے جو اس زمانے کے فلسفے اور حکمت کی تحقیقات سے بالکل علیحدہ ہے۔ اب مسائل طبعی تجربہ سے ثابت کئے جاتے ہیں یہ مسائل ایسے نہیں جو قیاسی دلائل سے اٹھا دیئے جائیں۔" (لکچرز ص۲۰۸)

جو لوگ منطق، فلسفہ اور علمِ کلام کی روایتی موشگافیوں سے واقف ہیں وہ زیادہ آسانی سے سرسید کی اس پیش بینی کی قدر و قیمت کا اندازہ لگا سکتے ہیں۔ یہ بات سرسید نے تقریباً سو سال پہلے کہی تھی جب کہ پچھلے چند برسوں تک بھی مشرقی علوم کی درسگاہوں میں عقلی براہین اور قیاسی دلائل کا دور دورہ تھا۔ سو سال قبل وقت کی ضرورت کو محسوس کر لینا اور دورِ عصر کی ماہیت تک رسائی حاصل کرنے کی کوشش کرنا سرسید کا ہی حصّہ تھا۔

جس طرح سرسید کے ہم عصر غالب نے دشتِ امکاں کو ایک نقشِ پا بتلا کر تمنا کے دوسرے قدم کو کائنات کی لامحدود وسعتوں کے لئے ایک سوالیہ نشان کہا تھا۔ اسی طرح سرسید نہ صرف یہ کہ اپنے زمانے کی نبض پہچانتے تھے بلکہ ان مسائل کا بھی شعور رکھتے تھے جن کے حل کی خاطر مسلمانوں کے پاس وسائل نام کی کوئی چیز نہ تھی۔ سرسید بہت سی اصلاحی کوششوں کے تجربے کا تجزیہ کر کے علم اور تعلیم کو سارے مسائل کی کلید سمجھنے لگے تھے۔ اس لئے

عملی طور پر مدرسۃ العلوم کے ذریعہ اور فکری طور پر اپنی تحریروں اور تقریروں سے اُنھوں نے علم کے قدیم اور جدید تصورات کا موازنہ کرنا شروع کر دیا تھا وہ علم اور فلسفے کو ذہنی تعیش اور خیالات و افکار کو تجریدی سرگرمی گرداننے والوں کے سخت ناقد تھے۔ اُنھوں نے اپنی ایک اور تقریر میں کہا تھا کہ:

آج تک جو ہم نے جانا اور جو ہمارے بزرگوں نے جانا، علم کی حقیقت کو اسی قدر جانا کہ ایک شئے عقلی ہے جو خیال میں اور حافظے میں رہتی ہے اور نفس کو اس سے بہت مزا اور روح کو خوشی حاصل ہوتی ہے مگر اس زمانے میں اسی کو اصل علم کہتے ہیں جو دیکھنے اور برتنے اور تجربہ میں آوے اور انسان کے لئے اس کے تمام کاموں میں مفید ہو۔

اس قول سے صاف ظاہر ہے کہ "اعلیٰ ترین شادمانی" (HIGHEST PLEASURE) کے فلسفیوں کے بالکل برخلاف سرسید، علم کو کوئی خود مکتفی چیز نہیں سمجھتے تھے بلکہ ہمیشہ اُنکی نظر میں علم کا وہ افادی پہلو زیادہ نمایاں رہا جو مختلف شعبۂ ہائے زندگی میں تربیت، تہذیب اور اعتدال کا سبب بنا کرتا ہے۔ یہ بات پُرانے مفکرین کی سمجھ میں مشکل سے آتی تھی مگر اسے کیا کیجئے کہ بیسویں صدی کے اس موڑ پر جہاں ہم لوگ کھڑے ہیں۔ علم کی توسیع اور تخصص کے سارے راستے افادیت کی طرف ہی جاتے ہیں۔

سرسید کے بارے میں عموماً جو غلط فہمیاں پیدا ہوتی رہی ہیں ان کا سبب سرسید کی افتادِ طبع کو نہ سمجھنا رہا ہے۔ یہ بات ہمیں کبھی نہ بھولنی چاہیئے کہ سرسید عینیت پسند نہ تھے۔ چنانچہ بہت سے ایسے افکار و تصورات جو انیسویں صدی میں عینیت پسندوں کے درمیان بہت محبوب تھے۔ اُن پر سرسید نے بلاتکلف تنقید کی اور زندگی کی حقیقت کے اُن اسرار و رموز پر اپنا ارتکاز برقرار رکھا جو ان کے اصلاحی اور افادی چوکھٹے میں فِٹ بیٹھتے تھے۔ اگر کوئی سرسید کے اصلاحی اور افادی دائرۂ کار کی تحدید پر اعتراض کرے تو ہمیں چیں بجبیں نہ ہونا چاہئے اور یہ ماننے میں کوئی پس و پیش نہ کرنا چاہیئے کہ سرسید نہ تو پوری دنیا کے نجات دہندہ بن کر آئے تھے اور نہ وہ پورے ہندوستان کے لئے اصلاحی جد و جہد میں مصروف تھے۔ سرسید ایک دیانتدار اور سچے انسان تھے جنھوں نے ابتداء سے ہی اپنا نصب العین مسلمانوں کی فلاح و بہبود تک محدود رکھا اور جہاں تک ایسے مصلحوں اور رہنماؤں کا تعلق ہے جو اپنا دائرۂ کار لا محدود رکھتے ہیں اور جو بلا تخصیص مذہب و ملت بنی نوع انسان کے مسائل کا بوجھ ایک ساتھ اٹھانے کی کوشش کرتے ہیں۔ عموماً یا تو ان کے جواب کثرتِ تعبیر پریشان ہو جاتے ہیں۔ یا پھر اُن کا انجام ذاتی مفاد اور ترقی کی منزلوں کے حصول کی شکل میں سامنے آتا ہے۔ یہی وہ تلخ حقیقت ہے جس کا ادراک ہمیں سرسید کو ایک مخلص اور سچے اصلاح پسند کے نام سے موسوم کرنے پر مجبور کرتی ہے۔ سرسید کے بارے میں غور کرنے والوں کو اگر ان کا مشن یاد رہے اور وہ سرسید کی بکھری ہوئی کاوشوں کو صرف ہندوستان کے سیاسی حالات یا انگریزوں کی حاکمیت کے پس منظر میں دیکھنے کے بجائے خود سرسید کے مشن کے سیاق و سباق میں دیکھیں تو اپنی ساری محدودیت اور ملت پسندی کے باوجود سرسید کے سارے طور طریقے ایک منضبط اور منظم سلسلے کی کڑیاں دکھائی دیں گے۔ سرسید کی بہت سی باتیں اپنے سیاق و سباق سے الگ ہو کر عجیب معلوم ہوتی ہیں۔ مگر آپ ان باتوں کو الگ سے دیکھیں ہی کیوں؟

سرسید نے انفرادی تعلیم کے سلسلے میں ایک بار اُس طریقۂ تعلیم پر سخت تنقید کی جس کے زیر اثر حکمران یا جاگیردار یا دوسرے متمول لوگ علماء کو ملازمت میں رکھ کر اپنے بچوّں کو اعلیٰ سے اعلیٰ تعلیم بہ آسانی دلوا سکتے تھے۔ شہنشاہوں یا جاگیرداروں میں علوم و فنون کی روایت ایسی ہی انفرادی کوششوں کا نتیجہ رہی۔ سرسید نے اس طریقۂ تعلیم کو ایک بہت بڑی غلطی سے تعبیر کیا اور اسے خود اپنی اولاد کے ساتھ دشمنی کے مترادف قرار دیا۔ سرسید کہتے تھے کہ جہالت اور ناتربیتی وبا کی مانند ہوتی ہے۔ جب تک تمام شہر اس بدہوا سے پاک نہ ہو کوئی ایک گھر اپنے تئیں اس سے بچا نہیں سکتا۔" غدر کے بعد کے حالات میں ہندوستانی مسلمانوں کی اجتماعی سراسیمگی، احساسِ شکست اور مستقبل کی بے یقینی کا تصور کیجئے تو پتہ چلے گا کہ اس وقت اجتماعی طور پر مسلمانوں کے لئے تعلیم و تہذیب اور بلند حوصلگی کی کیا اہمیت تھی۔

سرسید نے انسانی تاریخ کا بھی بہت گہرا مطالعہ کیا تھا اور اس میں کوئی شک نہیں کہ تاریخ سے واقفیت ہی انسان کو صحیح معنوں میں عروج و زوال کے حقائق سے آشنا کرتی ہے اور مستقبل کے لئے راہیں متعین کرنے میں آسانیاں فراہم کرتی ہے۔ سرسید نے لکھا ہے کہ

جب میں اپنے ہم وطنوں کے حال پر نظر کرتا ہوں تو دیکھتا ہوں کہ وہ گذشتہ حالات سے اس قدر ناواقف ہیں کہ آئندہ راستے چلنے کو ان کے پاس

کچھ بھی روشنی نہیں ہے۔ وہ نہیں جانتے کہ کل کیا ہوگا اور آج کیا ہے اور
اس سبب سے وہ کچھ نتیجہ نہیں نکال سکتے کہ کل کیا ہوگا۔ وہ نہیں جانتے کہ دنیا
میں جو بہت چھوٹی چھوٹی قومیں تھیں انھوں نے کیوں کر ترقی پائی اور کس
طرح وہ ایک بڑے شاندار اور سایہ دار درخت کی مانند ہو گئیں وہ
نہیں جانتے کہ جو بڑی بڑی قومیں ایک بڑے میوہ دار درخت کی مانند پھول
پھول رہی تھیں وہ کیوں کر مرجھا گئیں۔

سرسیّد کا یہی تاریخی شعور ان میں بعض ایسی اصلاحی عاقبت
اندیشی پیدا کرتا ہے جس کی بدولت آج بھی اُن کے خیالات از کار رفتہ نہیں
معلوم ہوتے۔ ہندوستان کے مسلمان انیسویں صدی کے نصف آخر میں جن
حالات سے دوچار تھے صرف ان حالات میں ہی نہیں بلکہ ایک صدی گزرنے کے بعد
آج بھی سرسید کے بنائے ہوئے خطوط پر ملی معاملات و مسائل پر غور و
خوض کی راہیں ہموار ہو سکتی ہیں ایک اور سب سے اہم بات جو سرسیّد کو اُن کے
بعد کے اصلاح پسندوں میں ممتاز بلکہ منفرد باقی رکھتی۔ سرسید کا
اپنے مشن کو سیاست سے الگ رکھنا ہے ہر چند کہ سرسیّد سیاسی شعور بھی
رکھتے تھے۔ وہ یہ بھی جانتے تھے کہ سیاسی چالوں سے کیوں کر نبرد آزما ہوا
جا سکتا ہے، انھیں معلوم تھا کہ سیاست اُن کی راہ میں کس کس انداز
سے کانٹے بچھا سکتی ہے، مگر اس ساری واقفیت، شعور اور اسباب
بغاوتِ ہند جیسی سیاسی بصیرت کی عکاس، کتاب لکھنے کے باوجود
سرسید ایک سیاسی آدمی نہ تھے۔ اگر کسی کو میری یہ بات ناقابلِ قبول
لگے تو وہ صرف یہ سمجھے کہ آج کے معنوں میں سرسیّد کو کسی بھی طرح سیاسی
شخصیت کے نام سے موسوم نہیں کیا جا سکتا۔

اپنی تحریک کو سیاست سے محفوظ رکھنے کی کوشش سرسیّد کی دور
اندیشی کا ایک ایسا حصہ تھی جس نے بعد کے زمانوں میں ثابت کر دکھایا کہ
جب بھی سرسیّد تحریک کے کسی مظہر کو سیاست کا آلۂ کار بنانے کی
کوشش کی گئی یا سرسیّد کو سیاسی پس منظر میں دیکھا گیا تو اس کے نتائج
بہت اچھے نہیں نکلے۔

★ ★

(بقیہ، قوم کا مسیحا)

زود اثر مگر نقصان دہ ہوتی ہیں۔ یہ علاج کتنا گراں ہے اس کا اندازہ
سبھی کو ہوگا۔ ایک اور مصیبت یہ ہے کہ دوائیں مہنگی ہوتی ہیں۔ اس
لیے جعلی دوائیں خوب بنتی ہیں۔ یہ وبا آج بہت عام ہے۔ یہ جعلی دوائیں
کبھی کبھی بہت خطرناک اور جان لیوا ثابت ہو سکتی ہیں۔

ہومیوپیتھک طریقِ علاج میں بعض خوبیاں قابلِ توجہ ہیں۔
ارزاں ہونے میں کوئی اور علاج اس کا مقابلہ نہیں کر سکتا۔ جو لوگ
خدمت خلق کے طور پر مفت علاج کرنا چاہتے ہیں وہ عموماً اسی طرف
راغب ہوتے ہیں۔ ہر شہر میں دس پانچ ایسے خدا ترس مل جائیں گے
جو مفت ہومیوپیتھی علاج کرتے ہیں۔ اس کی دوائیں نقصان نہیں دیتیں
ان کا استعمال آسان ہے کہ گولی کو نگلنے کے لیے ایک گھونٹ پانی
تک درکار نہیں۔ اس میں ایسی دوائیں بھی موجود ہیں کہ ایک خوراک
پندرہ دن کے لیے کافی ہوتی ہے۔

اس کی خرابی اور اس کی دشواری صرف ایک ہے وہ یہ کہ اس
میں علامات سے علاج ہوتا ہے۔ مریض کے لیے تفصیلات بتانا مشکل
اور معالج کے لیے علامات کی شناخت دشوار۔ قومی پیمانے پر
کوشش کی جائے تو اس دشواری پر قابو پانا ممکن ہے۔ اس سے
متعلق کم قیمت کتابیں شایع ہوں جو ہر گھر میں موجود ہوں جس
طرح اخبارات میں آجکل ہومیوپیتھی پر مضامین آ رہے ہیں۔ اسی طرح ریڈیو
اور ٹیلی ویژن پر مرض کی علامات اور انکی دوائیں بتائی جائیں تو بیماریوں
پر بڑی حد تک قابو پایا جا سکتا ہے۔

تسلیم کرنا چاہیے کہ ملک کو صحت کا راستہ دکھانے والے اور
علاج کے اس ارزاں اور بے ضرر طریقے کی رغبت دلانے والے پہلے
شخص سرسیّد تھے۔ ان کی مسیحائی کا بہرحال قائل ہونا پڑتا ہے۔

★ ★

معذرت شمارہ ۱۹ میں غلطی سے پہلی اکتوبر کی جگہ پہلی ستمبر چھپ گیا اجیکٹو ٹائپ ٹیسٹ (معروضی امتحان) کا ترجمہ غلط
ہو گیا اور جامعہ ازہر کے املا میں غلطی ہو گئی۔ ادارہ معذرت خواہ ہے۔

***

سرسید کی آرزو تھی کہ قوم میں کوئی ایسا شاعر پیدا ہو جو اپنی شاعری سے سوتوں کو جھنجھوڑے اور بے عملوں میں جذبہ عمل پیدا کرے۔ اس کام کی ابتدا حالی نے مسدس مدوجزر اسلام لکھ کر کی جسے سرسید اپنے لیے سومایۂ آخرت خیال کرتے تھے۔ ایک جگہ لکھا ہے قیامت کے دن سوال ہوگا کہ تو نے دنیا میں کیا نیک کام کیا تو کہوں گا حالی سے مسدس لکھوائی۔ لیکن یہ اقبال کی قسمت میں لکھا تھا کہ وہ اپنی شاعری سے قوم کو جگانے کا یادگار کارنامہ انجام دیں۔

انہوں نے اپنے پیغام کو پُراثر بنانے کے لیے مختلف فنی تدابیر اختیار کیں۔ اِن میں سے ایک یہ ہے کہ وہ اپنی بات اکثر دوسروں کی زبان سے ادا کراتے ہیں۔ اس کے لیے حسبِ ضرورت کبھی خضر کا انتخاب کرتے ہیں کبھی جبریل کا تو کبھی لینن کا۔

علمائے دین، اربابِ سیاست اور اہلِ قلم کو مخاطب کرنے کے لیے سرسید سے زیادہ موزوں آواز اور کس کی ہو سکتی تھی۔ چنانچہ اقبال سرسید کی زبان سے رہنمایانِ دین کو ترکِ دنیا اور فرقہ بندی کے خلاف آواز اٹھانے کی تلقین کرتے ہیں، اہلِ سیاست سے دلیری دبے باکی کی توقع رکھتے ہیں اور شاعروں سے تقاضا کرتے ہیں کہ وہ اپنے کلام کے اعجاز سے سونے والوں کو بیدار کردیں۔ طارق اقبالی کی نظم "سید کی جدید لوحِ تربت" میں طلبا سے جو کچھ کہا گیا ہے، سرسید اگر آج زندہ ہوتے تو یقیناً یہی کہتے۔

سید کی لوحِ تربت

اے کہ تیرا مرغِ جاں تارِ نفس میں ہے اسیر
اے کہ تیری روح کا طائر قفس میں ہے اسیر
اس چمن کے نغمہ پیراؤں کی آزادی تو دیکھ
شہر جو اُجڑا ہوا تھا اُس کی آبادی تو دیکھ
فکر رہتی تھی مجھے جس کی وہ محفل ہے یہی
صبر و استقلال کی کھیتی کا حاصل ہے یہی
سنگِ تربت ہے مرا گرویدۂ تقریر دیکھ
چشمِ باطن سے ذرا اس لوح کی تحریر دیکھ

مدعا تیرا اگر دنیا میں ہے تعلیمِ دیں
ترکِ دُنیا قوم کو اپنی نہ سکھلانا کہیں
وا نہ کرنا فرقہ بندی کے لیے اپنی زباں
چھُپ کے ہے بیٹھا ہوا ہنگامۂ محشر یہاں
وصل کے اسباب پیدا ہوں تری تحریر سے
دیکھ! کوئی دل نہ دکھ جائے تری تقریر سے
محفلِ نو میں پُرانی داستانوں کو نہ چھیڑ
رنگ پر جو اب نہ آئیں ان افسانوں کو نہ چھیڑ

تو اگر کوئی مُدبر ہے تو سُن میری صدا
ہے دلیری دستِ اربابِ سیاست کا عصا
عرضِ مطلب سے جھجک جانا نہیں زیبا تجھے
نیک ہے نیت اگر تیری تو کیا پروا تجھے
بندۂ مومن کا دل بیم و ریا سے پاک ہے
قوتِ فرماں روا کے سامنے بے باک ہے

ہو اگر ہاتھوں میں تیرے خامۂ معجز رقم
شیشۂ دل ہو اگر تیرا مثالِ جامِ جم
پاک رکھ اپنی زباں تلمیذِ رحمانی ہے تو
ہو نہ جائے دیکھنا تیری صدا بے آبرو

سونے والوں کو جگا دے شعر کے اعجاز سے
خرمن باطل جلا دے شعلۂ آواز سے

(اقبال)

سیّد کی جدید لوحِ تربت

(طلبا سے خطاب)

اے گُلِ نورستۂ شاخِ نہالِ آرزو
اے کہ تیرے رنگ و بو سے اس چمن کی آبرو
سازِ پُر آواز یہ تیرے ہی زیر و بم سے ہے
علم کی اس بزم کی رونق ترے ہی دم سے ہے

سنگِ تربت ہے مرا کب سے سراپا دیدہ، دیکھ
دیکھتا ہے تیری جانب ہو کے پُر اُمید، دیکھ

تو کسی مقصد کی خاطر ہی تو آیا ہے یہاں
مدعا کوئی تو ہے جو تجھ کو لایا ہے یہاں
جانبِ منزل شروع تونے کیا ہے جب سفر
ہر قدم پر چاہیے مقصد پہ ہو تیری نظر

اپنے مقصد سے بھٹک جانا نہیں زیبا تجھے
تو ہے رہرو، راستے کی لبتیوں سے کیا تجھے

مہ جبینِ علم کی خواہش ہے گر دل میں مکیں
وصل اس کا پوری یکسوئی کے بن ممکن نہیں
ماسوا کے شور و شر سے ذہن کو آزاد کر
بزمِ دل کو بس اسی کی فکر سے آباد کر

پہلے ہاتھوں میں تو علم و فضل کا دُر دانہ لے
ہر متاعِ دہر پھر قدموں میں ہے، بے پانہ لے

ہے مسافر تو ضروری ہے سفر کا اہتمام
واقفانِ راہ کا لازم ہے تجھ پر احترام
راستہ جس نے دکھایا اس کا تو احساں سمجھ
پاسِ احساں کو عزیز از جاں نہیں، ایماں سمجھ

کیا سفر کا خوف ہے، زادِ سفر محمل میں رکھ
اپنے محسن اور غمخواروں کی عظمت دل میں رکھ

رہنما ے طالبانِ علم ہے کوئی جو تو
ذہن ٹھنڈا رکھ اگرچہ گرم ہو تیرا لہو
تو ہے قائد اس جماعت کا تری ملت ہے یہ
اس کی سبکی جو، قیادت کی تری ذلت ہے یہ

ان کی خوشنودی سے بڑھ کر ہو تجھے ان کا مفاد
ان کی بہبودی نظر میں ہو، نہ تعریف اور داد
زک اٹھانا ہی پڑے خواہ تجھ کو ان کے ہات سے
کھیلنا ہرگز نہ تقریروں میں تو جذبات سے

بات پر اڑنا قیادت میں سمجھداری نہیں
خودکشی ہے قوم کے حق میں یہ خودداری نہیں

جب کبھی کرنا پڑے تم کو بڑوں سے اختلاف
رائے کا اظہار لازم ہے یقیناً صاف صاف
حق کی تلخی گو جھلکتی ہو تمھاری بات سے
دامن شائستگی لیکن نہ چھوٹے ہات سے

بات سے مرعوب ہو ہرگز، نہ دب کے ساتھ ہو
گفتگو لیکن بزرگوں سے ادب کے ساتھ ہو

مدعا تیرا اگر ہے علم و دانش کا حصول
دیکھ دامن پر سیاست کی نہ آنے پائے دھول
زندگی کے خوانِ نعمت پر سیاست سم نہیں
میکدے میں علم کے لیکن زہر سے کم نہیں

ارض پر گندم انیس خاطرِ مجموع ہے
ہاں مگر خلدِ بریں میں یہ شجر ممنوع ہے

(طارق اقبالی)

ایک سے زیادہ شادیاں

فَاِنْ خِفْتُمْ اَنْ لَّا تَعْدِلُوْا فَوَاحِدَةً ٥

اگر تم کو خوف ہو کہ عدل نہ کر سکو گے تو صرف ایک ہی (بیوی) کرو۔

وَلَنْ تَسْتَطِیْعُوْا اَنْ تَعْدِلُوْا بَیْنَ النِّسَآءِ وَلَوْ حَرَصْتُمْ

تم ہرگز استطاعت نہیں رکھتے کہ عورتوں میں عدل کر سکو گو تمھارا کتنا ہی دل چاہے۔

عدل صرف روٹی کپڑے میں ہی نہیں ہوتا بلکہ انصاف کا تقاضا یہ بھی ہے کہ سب بیبیوں سے یکساں محبت کی جائے جو بالعموم انسانی اختیار سے باہر ہے۔ علاوہ ازیں یہی نہیں فرمایا کہ "اگر تم انصاف کر سکو" بلکہ کہا گیا کہ "اگر تم کو خوف ہو کہ عدل نہ کر سکو گے" لاکھ کوشش اور سعی کے باوجود نا انصافی کا اندیشہ تو باقی رہتا ہی ہے پھر یہ فرما کر کہ "تم ہرگز استطاعت نہیں رکھتے کہ عورتوں میں عدل کر سکو گو تمھارا کتنا ہی دل چاہے" ایک سے زیادہ شادیوں کا دروازہ ہی بند کر دیا۔ (سہیل)

طلاق

مَا خَلَقَ اللّٰہُ شَیْئًا عَلٰی وَجْہِ الْاَرْضِ اَبْغَضَ مِنَ الطَّلَاقِ

خدا تعالیٰ نے زمین پر کوئی چیز ایسی پیدا نہیں کی جو اس کے نزدیک طلاق سے زیادہ مبغوض ہو۔

اَبْغَضُ الْحَلَالِ اِلَی اللّٰہِ الطَّلَاقُ

خدا کے نزدیک مباح چیزوں میں سب سے زیادہ مبغوض اور مکروہ چیز طلاق ہے۔

خدا نے عورت کو مرد کا ساتھی، مددگار، رنج و راحت کا شریک بنا کر پیدا کیا اور اس کی سب سے اخیر غرض جس کے لیے وہ پیدا کی گئی ہے۔ یہ ہے کہ وہ مرد کے ساتھ شریک ہو کر خدا کے اس بڑے حکم کی تعمیل میں کہ بڑھو اور پھیلو اور زمین کو آباد کرو۔ میں مدد دے مگر جب وہ یہ فرائض ادا نہ کر سکے تو یقین کرنا چاہیے کہ خدا نے اس کا بھی کوئی علاج رکھا ہوگا۔ اور وہ طلاق ہے۔ گویا طلاق مرض لا علاج کا علاج ہے۔

سو سیپ

ڈاکٹر سید محمد ہاشم

سیّد کی لوحِ تربت

(ایک تجزیاتی مطالعہ)

قومی فکر و جد و جہد کے قافلہ سالاروں میں سرسیّد علیہ الرحمۃ اور اُن کے ساتھیوں کے بعد علاّمہ اقبال کا نام و مقام مسلّمہ اہمیّت کا حامل ہے اپنے ابتدائی دورِ فکر و فن میں ہی اُنھوں نے سرسیّد کے خوابوں کی تعبیر دیکھ لینے کی تمنا بھی کی اور بھرپور کوشش بھی۔ نظم "سیّد کی لوحِ تربت" جو ۱۹۰۵ء سے قبل کی تخلیق ہے، فکرِ سیّد سے اُنکی فکری ہم آہنگی کی غمّاز ہے۔ ۲۵ برس کی عمر میں اقبال کی یہ نظم اپنی رفعتِ تخیل بلندیٔ فکر اور بصیرت افروزی کے لحاظ سے اُردو شاعری کی روایت میں ایک نادر مثال ہے، جس کا پس منظر یہ ہے کہ اقبال اس عہد کے اپنے منبعِ فکر یعنی سرسیّد کے مرقد پر کھڑے السلامُ علیکم یا اہل القبور کا طویل جواب سُننے میں مصروف ہیں۔

اس نظم میں اُنھوں نے جو کچھ بیان کیا ہے وہ سرسیّد کی تمام تر فکری و عملی کاوشوں کے عین مطابق اور مبالغہ آرائی سے پاک معلوم ہوتا ہے۔ چار بند کی یہ نظم ہے جس کی فضا میں یہ احساس اُبھارا گیا ہے کہ لوحِ تربت کی تحریر اور مزار کے اندر سے سرسیّد کی آواز گونج کر ہر اس صاحبِ بصیرت تک پہنچ رہی ہے جو اس مرکزِ علم و ادب سے فیض اُٹھانے کا خواہاں ہے۔ یہ آوازِ حاضر کو مخاطب کرکے اس دانش گاہ کے قیام کے تصور کے طور پر غدر کے نتائج و اثرات یاد دلاتی ہے۔ نیز اس وقت کی تباہی، دہشت انگیزی اور عام مایوسی کو آئینہ کر دیتی ہے، لیکن یہ وقت باقی نہیں رہتا، عبوری دور آتا ہے چلا جاتا ہے۔ پھر سرسیّد تحریک اور اس کے جاں فروشوں کی قربانیوں کا رنگ نکھرتا ہے، حالات کروٹ بدلتے ہیں اور قوم کی اُمیدوں کا بے آب و گیاہ صحرا نشاۃ الثانیہ کی سرسبز و شاداب وادیوں میں بدل جاتا ہے۔ اسی لئے فخریہ لہجے میں اقبال کی زبان سے بے اختیار یہ الفاظ ادا ہوتے ہیں۔

شہر جو اجڑا ہوا تھا اُس کی آبادی تو دیکھ!

کالج کا قیام، اس کے ارتقاء و استحکام میں صبر و استقلال کا مظاہرہ اور قوم کی فلاح کے لئے تن من دھن کی بازی لگا دینے کے نتیجہ میں قوم کے حالات میں یکسر تبدیلی مایوسی ختم ہوکر امید اور اعتماد کی فضا پیدا ہو جانا اور بالآخر سرسیّد کا اپنی زبان سے یہ اقرار کر لینا کہ میں نے اپنے لگائے ہوئے باغ کو برگ و بار لاتے دیکھا۔ یہ گذشتہ صدی کے ربع آخر کا زرّیں باب ہے، جس کے ایک ایک صفحہ اور ہر صفحہ کے ایک ایک لفظ سے محنت و جد و جہد، محبّت و خلوص، اتحاد و یگانگت، بے خوفی و بے ریائی، بلند کرداری سچائی و راست بازی، مصلحت نا اندیشی، اولوالعزمی اور اپنے وجود کو منوانے کا جذبہ اور اس کا عملی پہلو آشکار ہے۔ اس لئے اگر ان تمام خصائص کو محیط سرسیّد کی یہ آواز آج بھی آتی ہو تو بعید از قیاس نہیں۔

فکر رہتی تھی مجھے جس کی وہ محفل ہے یہی ٭ صبر و استقلال کی کھیتی کا حاصل ہے یہی

سرسیّد نے قوم کی جس کسک کو محسوس کیا تھا اور قومی جذبہ کی جو تڑپ اُن کے اندر پیدا ہو گئی تھی اس کی فکر نے یہ عظیم الشان ادارہ قائم کرایا۔ اس شعر میں وہ یہی خواہش کرتے نظر آتے ہیں کہ ادارہ کی بنیاد میں جو خونِ جگر صرف کیا گیا ہے اور اس کے قیام میں جد و جہد کا رزار تھی نیز ادارے سے جو اقدار رہنما کی تھیں، آئندہ نسلیں اُن کے بقا و تحفظ کا عزم صمیم کریں۔ اس چمن میں ہمیشہ بہار رہے گی اور خزاں سے یہ محفوظ

امون ہو جائے گا۔ اگر ایک طرف اِس دانشگاہ عظیم کے معرکہ خیز کارناموں پر سر سید کی روح وجد کرتی ہو گی تو اسے دوسری طرف رو بہ زوال دیکھنے اور اس چمن پر خرابی کے معمولی سے آثار دیکھ کر روحِ سید مضطرب و بے چین ہو جاتی ہو گی۔

تاریخ شاہد ہے کہ ہماری اِس دانشگاہ نے کبھی بھی غیروں سے نہیں بلکہ صرف اپنوں سے نقصان اُٹھایا ہے۔ اِس لئے ہم میں سے ہر طبقہ اس کا ذمہ دار ہے اور حالات دُرست کرنے کے لئے دوسروں پر اُنگلی اٹھانے کے بجائے اپنے ہی حالات درست کرنے کی فکر اشد ضروری ہے، اس کے بغیر سید احمد خاں سے محبت کے ہمارے تمام دعوے باطل ہیں اور یہی اس شعر کا ماحصل ہے۔

سنگِ تربت ہے مرا گرویدۂ تقریر دیکھ + چشمِ باطن سے ذرا اس لوح کی تحریر دیکھ

اس کے بعد سر سیّد کی آواز قوم کے تین طبقوں سے مخاطب ہو کر انہیں ان کے فرائض و ذمہ داریاں یاد دلاتی ہے۔ وہ طبقے ہیں علمائے دین، اربابِ سیاست اور اہلِ قلم۔ دراصل یہی وہ تین گروہ ہیں جن کے ہاتھ میں قوم کی باگ ڈور ہوتی ہے۔

یہ اگر اپنے فرائض سے غفلت نہ برتیں تو قوم کبھی ادبار میں مبتلا نہ ہو۔

عالمِ دین مذہب کے وسیلے قوم سے مخاطب ہوتا ہے۔ قوم کا بڑا حصّہ اُس کی آواز پر لبیک کہنے کے لیے تیّار رہتا ہے۔ اس لیے اگر عالمِ دین نے گوشہ نشینی اور ترکِ دنیا کا سبق پڑھا دیا تو اس بات کا خطرہ ہے کہ وہ طبقہ زندگی کی دوڑ میں پیچھے رہ جائے گا۔ اِس سے زیادہ خطرناک بات یہ ہے کہ عالمِ دین، قوم کو فرقہ واریت کی تعلیم دے۔ یہ کچھ کم مہلک نہیں۔ ان کی خواہش ہے کہ وہ علیحدگی نہیں، اتحاد و اتفاق کا درس دے

وصل کے اسباب پیدا ہوں تری تحریر سے

دوسرا خطاب سیاسی رہنما سے ہے جس نے سیاست کے میدان میں قدم رکھا ہے۔ ضروری ہے کہ وہ مصلحت سے بے پرواہو، بے غرض اور اخلاقی جرأت رکھتا ہو۔ مؤمن کی پہچان یہ ہے کہ وہ ہمیشہ حق گوئی [illegible]

بندۂ مومن کا دل بیم و ریا سے پاک ہے
قوتِ فرماں روا کے سامنے بیباک ہے

تیسرا خطاب اہلِ قلم یعنی شعراء سے ہے۔

سونے والوں کو جگا دے شعر کے اعجاز سے
خرمنِ باطل جلا دے شعلۂ آواز سے

اصولی طور پر شاعر نہ تو معتقدات کی زمام اپنے ہاتھ میں رکھتا ہے اور نہ سیاسی میدان میں اس کے اقوال کا اعتبار ہے بلکہ وہ ادب کے راستے سے اپنے جذبات و احساسات قاری تک پہنچا دیتا ہے۔ لیکن مذہبی یا سیاسی ہونا اس کی شان کے منافی نہیں ہے اس لئے وہ ان دونوں یا ان میں سے کسی ایک کا سہارا لے کر بھی اپنی بات کا انکشاف کر سکتا ہے اور شاعر کا یہ عمل بعض حالات میں عام ہو جاتا ہے۔ اس کی مثالیں ہر جگہ موجود ہیں۔

شاعری اکتسابی چیز نہیں، قدرت کا خصوصی عطیہ ہے، مشق و مہارت سے اِس کو جلا ملتی ہے۔ لیکن اصلاً فیضانِ سماوی ہی اس کا محرک و منبع ہوتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ شاعر کو "تلمیذ رحمانی" کہا گیا ہے۔ اس لیے ممکن نہیں کہ اس ساز سے پھوٹنے اور نکلنے والا شعر غیر مؤثر ثابت ہو جائے لیکن شاعر کا فرض ہے کہ اس کے وقار اور مرتبے کی بقا و حفاظت میں کسی بھی کوشش سے دریغ نہ کرے۔ زوال آمادہ قوم کو عروج کی طرف مائل کرے، غفلت و کاہلی میں مست لوگوں کو اس نشے سے بے نیاز کرے، خوابِ غفلت میں پڑے ہوئے لوگوں اور نیند کے ماتوں کو جھنجھوڑ کر رکھ دے۔ نیز اپنے شعر کی سحر بیانی اور اعجاز اثری سے ایسی بنا ڈالے جس سے باطل قوتیں صفحۂ ہستی سے نیست و نابود ہو جائیں۔

یہ اقبال کی نظم ہے اور ظاہر ہے خیالات بھی انہی کے ہیں لیکن یہ اندازہ لگانا مشکل ہے کہ سر سید کی فکر میں کس قدر غرق ہو کر یہ نکتے پیش کئے ہیں۔ ہر عہد میں اور ہر یومِ سر سید کے موقع پر اگر یہ تہیہ کر لیا جائے کہ اسی طرح سر سید کے افکار کو زندہ کرنا اور قابلِ عمل بنانا ہے تو یہ کوئی بڑی بات نہیں کہ ہر دور میں ایک اقبال پیدا ہو جائے۔

★★

محمد قاسم صدیقی

تعلیم وتربیت

سرسید نے اپنی تعلیمی پالیسی کی وضاحت کرتے ہوئے کہا تھا

"اے دوستو! مجھے یہ بات خوش کرنے والی نہیں ہے کہ کسی مسلمان نے بی۔ اے یا ایم۔ اے کی ڈگری حاصل کرلی ہے۔ میری خوشی قوم کو قوم بنانے کی ہے"۔

(لکھنؤ کی تقریر)

"قوم کو قوم بنانے کی خوشی" کا واحد راستہ ایک اہم اور دوررس ذہنی انقلاب میں مضمر تھا۔ اس دوررس ذہنی انقلاب کے بغیر سماجی اور ذہنی تبدیلیاں ممکن نہ تھیں اور ان تبدیلیوں کے بغیر قوم کا تصور تشنہ تھا۔ اس دوررس ذہنی انقلاب کے لیے اعلیٰ تعلیم کی ضرورت تھی۔ ایسی تعلیم جو قوم کی روح کو سیراب کرسکے سرسیّد اس زمانہ کے حالات کو بدلنا چاہتے تھے۔ وہ قوم کو یورپ کے دوش بدوش کھڑا کرنا چاہتے تھے۔ جب تک مسلمان نئی روشنی سے بہرہ مند ہوکر مغرب کے کمالات حاصل نہ کریں گے اس وقت تک وہ ترقی کی منزلوں تک نہیں پہنچ سکتے۔ وہ نئی تعلیم کو سرکاری ملازمت کا وسیلہ نہیں سمجھتے تھے۔ اگر سمجھتے تو بی۔ اے/ایم اے کی ڈگری کو اہمیت دیتے۔ وہ تو قوم میں بیداری اور روشنی پھیلانے کے رسیا تھے۔ نئے عہد کے تقاضوں کو پورا کرنے کا واحد راستہ یہ تھا کہ تعلیم کا کام خود اپنے ہاتھ میں لیا جائے۔

"میں تم سے سچی بات کہتا ہوں کہ قومی تعلیم اور قومی عزت ہم کو اس وقت تک حاصل نہیں ہوسکتی جب تک ہم اپنی تعلیم کا کام خود اپنے ہاتھ میں نہ لیں گے"۔

(لدھیانہ کی تقریر)

جدید سائنس اور دوسرے جدید علوم وفنون کی تعلیم کے ساتھ ساتھ کردار سازی اور تربیت کو سرسیّد نے ہمیشہ فوقیت دی۔ تعلیم کا مقصد بچے کی شخصیت کا ہمہ گیر اور ہمہ جہتی نشوونما ہے مگر شخصیت کی یہ تعمیر اور کردار سازی کا کام سرکاری مدارس میں ممکن نہ تھا۔

"سرکاری مدارس اور سرکاری کالج کی تعلیم سے اپنی قومی عزت اور قومی ترقی کی ہرگز توقع نہ کرنی چاہیے"۔

(لاہور کی تقریر)

اگر صحیح معنیٰ میں ایک مکمل تعلیم یافتہ نسل پیدا کرنی ہے تو مسلمانوں کو خود آگے بڑھ کر آنا پڑے گا۔

"کوئی قوم جس کو اپنے بچوں اور قوم کی تعلیم کی خواہش ہو جب تک وہ تعلیم اپنے ہاتھ میں نہ لیوے اس کا پورا ہونا غیر ممکن ہے"۔ (گورداس پور کی تقریر)

سرسیّد کے ذہن میں قوم کی تعمیر کا منصوبہ بالکل واضح تھا۔ وہ سمجھتے تھے کہ یہ کام جب ہی ممکن ہے جب اعلیٰ مدارج تک جدید علوم

کی تعلیم دی جائے اور مسلمانوں کے بنیادی اعتقادات میں استحکام پیدا ہو۔ اور یہ دونوں چیزیں اس وقت حاصل ہو سکتی ہیں جب اقامتی ادارے قائم کیے جائیں۔ تاکہ وہاں شخصیت و کردار سازی کا کام تکمیل پا سکے۔ سرسید کے تعلیمی منصوبہ میں اور تعلیمی تصورات میں سب سے زیادہ اہمیت تربیت کو دی گئی ہے۔ تربیت کے بغیر تعلیم نہ صرف نامکمل ہے بلکہ ناقص ہے۔

تعلیم کا مقصد صرف علوم کی معلومات نہ تھا بلکہ سرسید نے اس کے عملی پہلو کو زیادہ اہمیت دی۔ تعلیم سے شخصیت میں جو نکھار آتا ہے جو چمک آتی ہے۔ سرسید اس چمک کے دلدادہ تھے اور یہ چمک صرف تربیت سے حاصل ہو سکتی تھی، صرف تعلیم سے نہیں۔

"موجودہ تعلیم کے ساتھ اگر تربیت شامل نہ ہو تو
موجودہ تعلیم سے ہم کو کسی باثمر درخت کے پیدا
ہونے کی توقع نہیں کرنی چاہیے بلکہ ایک پرخار اور
مردم خوار درخت کے پیدا ہونے کا یقین کرنا
چاہیے۔"

انھوں نے قوم سے مخاطب ہو کر صاف طور سے کہا کہ وہ اپنے بچوں کی تربیت کا تعلیم سے بھی زیادہ خیال رکھیں۔ تربیت سے ان کی مراد یہ تھی کہ طلبا میں سچائی۔ ایمانداری۔ سچے اخلاق۔ سچی محبت۔ سچی ہمدردی۔ سلف رسپکٹ قومی محبت قوم کا خیال اپنے کاموں میں دیانت داری، ایمانداری۔ فرائض منصبی کے ایمانداری سے ادا کرنے کی خصلت پیدا ہوتی ہو۔ یہ تربیت یکایک ممکن نہ تھی۔ لیکن اگر اقامتی زندگی کو مضبوط بنایا جائے تو قوم کو اس طرف موڑا جا سکتا ہے۔ اگر اس راہ پر نوجوان بچے ڈالے جاویں تو شاید ایک زمانے کے بعد ایسے لوگ قوم میں پیدا ہو جاویں" لیکن افسوس یہ تھا کہ اس زمانہ میں بھی اور آج بھی ہماری قوم کو تعلیم ترقی اور فلاح سے لاپرواہی ہے

علی گڑھ کے دارالعلوم میں وہ اسی قسم کی کردار سازی کا تصور کرتے تھے اور اس کے بنیادی اصولوں میں تربیت کو ترجیح دیتے رہے تھے۔ اس زمانہ میں سرسید کی مخالفت عروج پر تھی۔ علی گڑھ کی انگریزی تعلیم کے خلاف قوم صف آرا تھی۔ اس وقت ایک اعتراض یہ بھی تھا کہ انگریزی تعلیم سے طالب علموں کے عادات و اطوار خراب ہو جاتے ہیں۔ سرسید نے اس اعتراض کو سنا اور صاف طور سے اعلان کیا۔

"لوگ شکایت کرتے ہیں کہ بڑوں کا ادب۔ ماں
باپ کا ادب ان کی عزت ان کی فرماں برداری
(انگریزی تعلیم سے) ان میں سے جاتی رہتی ہے۔
میں اپنے کالج کے طالب علموں کو ایسا نہیں پاتا
وہ نہایت مہذب اور بزرگوں اور استادوں کا
ادب کرنے والے ہیں۔"

سرسید کے ذہن میں جو قوم کا تصور تھا اور وہ جس تعلیم و تربیت کا بار بار تذکرہ کرتے تھے اس میں ایسے تعلیم یافتہ افراد کا تصور ابھرتا ہے جن میں سپاہیانہ دلیری، مہذب بہادری، شائستہ جرأت ہو اور جو محنت و مشقت کے دلدادہ ہوں جو علم میں یکتا ہوں، ان کی خواہش تھی کہ قوم کے افراد جو تعلیم و تربیت سے مرقع ہوں، ان میں اخلاق۔ محبت؛ مروت۔ دوستی۔ دوستی کا برتاؤ دوستی کا پاس۔ دلی نیکی۔ فیاضی۔ متانت۔ چھوٹوں کے ساتھ الفت بڑوں کا ادب۔ غریبوں سے ہمدردی ان میں جمع ہوں۔

آج قوم جس حالت سے دوچار ہے سرسید کی باتیں اور اُن کی یاد اور بھی زیادہ آرہی ہے۔ ضرورت اس بات کی ہے کہ علی گڑھ آج پھر رہبری کرے اور اس کردار سازی کی طرف قدم اُٹھائے جس سے قوم میں ایسے افراد پیدا ہوں جو ان خوبیوں کے مالک ہوں جس کا خواب سرسید نے دیکھا تھا۔ ●

آل احمد ضیاء الدین انصاری

خطباتِ احمدیہ

سرسید کی یہ تصنیف جس کا پورا نام "الخطبات الاحمدیہ فی العرب
سیرۃ المحمدیہ" ہے سر ولیم میور (SIR WILLIAM MUIR) کی انگریزی
ب THE LIFE OF MOHAMMAD کا جواب ہے۔ ولیم میور
ذیں صدی کے مشہور دانشور اور مستشرق تھے۔ انھیں متعدد مغربی اور
رقی زبانوں پر عبور حاصل تھا اور اسلام سے گہری واقفیت تھی وہ ایک کثیر التصانیف
ان تھے لیکن ان کی کتاب 'دی لائف آف محمد' کو خصوصی اہمیت حاصل ہے
زمانے میں یہ کتاب بہت مقبول ہوئی۔ اس کا اندازہ اس حقیقت سے
یا جاسکتا ہے کہ مختصر سی مدت میں اس کے تین ایڈیشن شائع ہوئے۔ اس
صۂ دراز تک سیرت پر بہترین اور سائنٹیفک اصولوں پر تالیف کی ہوئی
ب تصور کیا جاتا رہا اس کی تالیف کا مقصد فاضل مولف نے ان
اظ میں بیان کیا ہے:-

"اس کتاب کا لکھنا اور مسلمانی مذہب کی سند کی کتابوں کی تحصیل
اوّل اس غرض سے اختیار کی گئی کہ پادری پی۔ فنڈر صاحب نے جو اس
بات میں مشہور ہیں کہ انھوں نے مسلمانوں سے مباحثہ میں عیسائی مذہب
کی بہت حمایت کی، اس بات پر اصرار کیا کہ اسلام کے پیغمبر کے حالات
میں ایک کتاب جو اس کے پیروں کے پڑھنے کے لیے مناسب ہو
ایسے قدیم ماخذوں سے ہندوستان زبان میں تالیف کی جاوے
جس کو خود مسلمان صحیح اور معتبر مانتے ہوں۔ چنانچہ اس منشا سے
مسلمانی مذہب کی سند کی کتابوں کو پڑھا اور اس کتاب
کو لکھا ہے۔"[1]

بظاہر یہ کتاب بڑے عالمانہ، اور منصفانہ انداز میں لکھی گئی ہے۔
اسی لیے بادی النظر میں بہت عمدہ اور معقول پسند معلوم ہوتی ہے۔ چنانچہ
جن حضرات نے اس کا سرسری مطالعہ کیا۔ وہ اس سے متاثر ہوئے بغیر نہ رہ
سکے۔ لیکن جن لوگوں نے اس کا سنجیدگی اور گہرائی سے مطالعہ کیا،
انھیں محسوس ہوا کہ مولف نے گستاخی کا رویہ اختیار کیا ہے اور سیرتِ پاک
کے متعدد پہلوؤں پر بے جا اعتراضات کیے ہیں۔ اس کے حالات کو مسخ
کر کے پیش کیا ہے اور اسی ضمن میں وہ اعتراضات عاید کرتا چلا گیا ہے۔
جو ہو سکتا ہے سرسری مطالعہ کرنے والوں کو درست معلوم ہوں۔ کتاب
جتنے عالمانہ انداز میں لکھی گئی تھی اس کا مقتضا تھا کہ اس کا جواب بھی ایسے
ہی سنجیدہ اور پُر وقار انداز میں دیا جائے اور عالمانہ انداز سے اسکی بددیانتی کا
پردہ چاک کیا جائے۔ ظاہر ہے یہ کام ہر کس و ناکس کے بس کا نہیں تھا۔
اس کا بیڑا سرسید نے اٹھایا اور کئی سال کی محنتِ شاقہ کے بعد "الخطبات
الاحمدیہ فی العرب و سیرۃ المحمدیہ" تالیف کی۔ اس کے دیباچے میں سرسید
فرماتے ہیں:

"میرے دل پر جو اس کتاب (LIFE OF MOHAMMAD) سے
اثر پیدا ہوا وہ یہ تھا کہ اسی زمانہ میں، میں نے ارادہ کیا کہ آنحضرتؐ کے متعلق
حالات میں ایک کتاب اس طرح پر لکھدی جاوے کہ جو جو باتیں صحیح اور اصلی
اور واقعی اور منقح ہوں اور معتبر روایتوں اور صحیح صحیح سندوں سے
بخوبی ثابت ہیں۔ ان کو بخوبی چھان بین کر کے ترتیب سے لکھا جاوے
اور جو حالات مشتبہ اور مشکوک ہیں اور اُن کا ثبوت معتبر یا کلی نہیں ہے،
ان کو جداگانہ اسی ترتیب سے جمع کیا جاوے اور جو محض جھوٹ اور

[1] بحوالہ خطبات احمدیہ ص ۱۸

ترا و بہتان یا خود غرض یا احمق واعظوں اور جہلاء کو دام تزویر میں
پھنسانے والے لوگوں یا احمق خدا پرست اور جھوٹی نیکی پھیلانے والوں
بنائی ہوئی باتیں ہیں اُنکو علیحدہ بہ ترتیب لکھا جاوے اور ان ہی کے
تھ اُن کے غلط اور اُن کے نامعتبر ہونے کا ثبوت اور اُن کے موضوع
ہونے کی وجوہات بھی بیان کی جاویں۔" [1]

سرسید لگن کے سچے اور دُھن کے پکے تھے۔ جس کام کا بیڑا اٹھاتے
اسے پایۂ تکمیل کو پہنچا کر ہی دم لیتے اور اُسے اس حُسن و خوبصورتی سے سرانجام
دیتے کہ یہ محسوس ہوتا گویا یہ کام صرف وہی کر سکتے تھے، دوسرا شخص
اس کام کو انجام نہیں دے سکتا تھا۔ یہی حال کچھ میور صاحب کی تالیف
کے ساتھ بھی پیش آیا۔ اوّل تو کسی میں جرأت ہی نہ تھی کہ اس عالمانہ کتاب
کا ایسا مدلّل جواب دیتا، اور اگر کوشش کرتا بھی تو اس کام کو اتنے حسن
وسلیقے سے انجام نہ دے پاتا، جیسا کہ سرسیّد نے دیا۔ میور نے حقائق کو
اس انداز سے پیش کیا جس سے نہ صرف عیسائی حضرات اسلام کی حقانیت
اور بانیٔ اسلام کی بلند کرداری سے مشکوک ہو رہے تھے، بلکہ خود جدید تعلیم
سے بہرہ ور مسلمان بھی مختلف وساوس و شبہات کا شکار تھے۔ سرسید اس
صورت حال سے بڑے فکرمند تھے اور چاہتے تھے کہ جلد از جلد اس کا
جواب لکھ دیا جائے تا کہ اصل حقائق سامنے آجائیں اور عوام گمراہی سے
محفوظ رہیں۔

سرسیّد نے جب خطبات احمدیہ لکھنے کا بیڑا اٹھایا تو انھیں محسوس
ہوا کہ اس کے لیے ہندوستان کے کتاب خانے ناکافی ہیں۔ ان میں وہ
تمام کتب دستیاب نہیں ہیں جن کی اس عظیم کام کے لیے ضرورت ہوگی چنانچہ
۱۸۶۹ء میں جب انھوں نے انگلستان کا سفر کیا تو دوسرے مقاصد کے
ساتھ ایک اہم مقصد یہ بھی تھا کہ لندن کے مشہور کتاب خانوں سے
استفادہ کر کے خطبات احمدیہ کے لیے مواد فراہم کیا جائے۔ لہٰذا وہاں
پہنچ کر انھوں نے اس کام کو اوّلیت دی اور برٹش میوزیم و انڈیا آفس
کے کتاب خانوں سے استفادہ کیا اور سیرتِ پاک پر عربی اور لاطینی
وغیرہ کی کتابیں فرانس، جرمنی اور مصر سے خرید کر منگائیں۔ اسی طرح انگریزی

[1] خطبات احمدیہ: ص ۱۹-۲۰

کی قدیم کتابیں جو وہاں دستیاب نہیں تھیں انھیں بھی بیش از بیش قیمت
پر حاصل کیا۔ اس طرح اس آہنی انسان نے تمام مشکلات کا ہمت و
جواں مردی سے مقابلہ کیا اور مقصد کی تکمیل میں شب و روز ایک کر دیا۔
اُن کی اِن مشکلات کا اندازہ اُن خطوط سے بخوبی ہوتا ہے جو انھوں نے
لندن سے اپنے دوستوں اور بالخصوص نواب محسن الملک کو تحریر کیے۔
اُن کے دل میں اس کام کی تکمیل کرنے کی کتنی تڑپ تھی اور وہ کتنی جلدی
اسے کر لینا چاہتے تھے، اس کا اندازہ اُن کے ۱۰ ستمبر ۱۸۶۹ء کے خط کے
اس اقتباس سے لگایا جا سکتا ہے۔ فرماتے ہیں:-

"میں روز و شب تحریر کتاب سیرِ مصطفوی صلعم میں مصروف
ہوں۔ سب کام چھوڑ دیا ہے۔ لکھتے لکھتے کمر درد کرنے لگتی
ہے۔ اِدھر فکر ترتیب مضامین کتاب، اُدھر فکر جواب
اعتراضات اِدھر فکر تنقیح و تصحیح روایات صحیح میں مبتلا ہوں
اور کسی شخص کے مددگار نہ ہونے سے یہ کام اور بھی سخت
ہو گیا ہے۔ اُدھر جب حساب دیکھتا ہوں تو جان نکل
جاتی ہے کہ ابھی لکھوانا اور چھپوانا تو شروع کر دیا، روپیہ کہاں
سے آئے گا۔ مسلمان البتہ آستین چڑھا کر اس باب میں لوٹنے
کو تیار ہوں گے کہ انگریزوں کے ساتھ کھانا مت کھاؤ
مگر جب کہو کہ مذہبی تائید میں کچھ روپیہ خرچ کرو تو جان
بچاویں گے۔" [2]

اس طرح سرسیّد نے ذہنی، جسمانی اور معاشی مشکلات کا سامنا کر کے
یہ معرکۃ الآرا کتاب لکھی جس کے ایک ایک لفظ سے اسلام میں اُن کے
غیر متزلزل یقین اور حضورِ اکرمؐ سے اُن کی عقیدت اور والہانہ محبت
ٹپکتی ہے۔ اِس کتاب کا اثر یہ ہوا کہ ولیم میور کی کتاب کی گرم بازاری ختم
ہو گئی اور رفتہ رفتہ لوگوں نے اسے بالکل ہی فراموش کر دیا۔

مکمل کتاب بارہ ابواب پر مشتمل ہے۔ باب کو سرسیّد نے خطبہ
کا نام دیا ہے۔ اس طرح یہ کتاب بارہ خطبات پر مشتمل ہوئی جیسا کہ
انھوں نے خود کہا ہے "میں نے ہر ایک حصّہ کو بہ لفظ خطبہ تعبیر کیا ہے۔"
ابتدا میں ۲۵ صفحات پر مشتمل دیباچہ ہے۔ جس میں پہلے انھوں نے

، حقیقت، احکام اسلام، اسلام پر اور آنحضرت کی سیرت مبارک
یوں کے اعتراضات کی نوعیت سے بحث کی ہے اور بعد میں
ل سبب تالیف بیان کیا ہے۔ اس کے بعد خطبات شروع
ہیں جن کی تفصیل اس طرح ہے:

طبہ: (ص ۲۷ تا ۱۹۳) اس میں عرب کے جغرافیہ، عرب کی تاریخ
ں دنیا میں تشریف آوری سے متعلق پیشین گوئیوں، حضرت ابراہیم
ہاجرہؑ اور حضرت سارہؓ کے حالات پر روشنی ڈالی گئی ہے۔

خطبہ: (۱۹۴ تا ۲۱۵): اس میں دور جاہلیت میں عربوں کی معاشی
) کا بیان ہے۔ اس ضمن میں خانہ کعبہ اور حجر اسود سے متعلق جو مشرکا
اس دور میں رائج تھیں اُن سے تفصیلی بحث کی گئی ہے اور بت پرستی
قت کو واضح کیا گیا ہے۔

طبہ: (ص ۲۱۶ تا ۲۴۱): اس میں طلوعِ اسلام سے قبل عرب میں
ہب رائج تھے، اُن پر روشنی ڈالی گئی ہے۔

خطبہ (ص ۲۴۲ تا ۳۲۳) اس میں اسلام کی عظمت اور اس کے عالمگیر
ہونے کو ثابت کیا گیا ہے اور کثرتِ ازدواج، طلاق اور غلامی پر
ی نقطۂ نظر سے بحث کی گئی ہے۔

ال خطبہ: (ص ۳۲۴ تا ۳۴۳): یہ خطبہ مسلمانوں کی مذہبی کتابوں سے
ں ہے اور کتب حدیث، کتب سیر، کتب تفسیر اور کتب فقہ کی صحت اور
ر کا تجزیہ کیا گیا ہے۔

خطبہ (ص ۳۴۴ تا ۴۱۸) اس میں مذہبی روایات کے معتبر یا غیر معتبر
دینے کی کسوٹی بتائی گئی ہے۔

ال خطبہ: (ص ۴۱۹ تا ۴۸۶): اس میں قرآن کریم کی جمع و ترتیب اور
ن نزول پر تفصیلی بحثیں ہیں۔

وال خطبہ: (ص ۴۸۷ تا ۵۳۹) یہ خطبہ تاریخ مکہ، بیت اللہ شریف، حضور
م سے قبل پیغمبروں اور بزرگوں کے حالات پر مشتمل ہے۔

خطبہ: (ص ۵۴۰ تا ۵۵۵): اس میں حضور اکرمؐ کے نسب نامے سے تفصیلی
ث ہے۔

دسواں خطبہ (۵۵۶ تا ۶۲۰) اس میں اُن بشارات کی تفصیل ہے جو آپ کی تشریف
آوری کے سلسلہ میں توریت و انجیل میں ملتی ہیں۔

گیارہواں خطبہ (ص ۶۲۱ تا ۶۶۵): یہ خطبہ حضورؐ کے شق صدر اور معراج سے متعلق ہے۔

بارہواں خطبہ (۶۶۶ تا ۷۰۰) اس میں حضور کی ولادت باسعادت سے لے کر بارہ
سال کی عمر تک کے حالات درج ہیں۔

سرسید کو اپنی اس تالیف پر بہت ناز تھا اور سمجھتے تھے کہ جو کچھ انھوں
نے لکھا ہے وہ بہت محقق اور مدلل ہے اور اس کی تردید ممکن نہیں چنانچہ
ایک خط میں وہ لکھتے ہیں:

"آنحضرت صلعم کی بارہ برس کی عمر تک حال لکھ چکا اور سر ولیم
میور صاحب اور اُن مصنفوں نے یہاں تک کے حال پر جو کچھ لکھا
ہے، سب کے ایک ایک حرف کا جواب لکھا ہے۔ نہایت محققانہ
جواب ہیں۔ اور یہ شرط ہے کہ کسی شخص کے آگے ڈال دو، وہ کیسا
ہی بے دین کیوں نہ ہو، اگر وہ کہے کہ ہاں نہایت سچ اور انصاف
کا جواب ہے تو تو میرا نام ورنہ میرا نام نہیں۔"

سرسید کا یہ دعویٰ بڑی حد تک درست ہے۔ کتاب واقعی
بڑے موثر اور مدلل انداز میں لکھی گئی ہے اور اسلوب نگارش بھی عالمانہ
ہے۔ اس میں نہ کہیں جارحانہ انداز ہے، نہ عذر خواہانہ۔ بلکہ ہر بات کو
اس کے صحیح تناظر میں نہایت متین انداز میں پیش کیا گیا ہے۔

پہلی بار یہ کتاب مطبع فیض عالم علی گڑھ سے شایع ہوئی۔ اس میں ۷۰۰
صفحات ہیں۔ تاریخ اشاعت درج نہیں ہے البتہ دیباچہ کے اختتام پر
"بمقام لندن محلہ میکلن اسکوئر مکان ۲۱۔ ۱۸۷۰ء مطابق ۱۲۸۷ھ"
درج ہے۔

دوسری بار یہ مطبع نول کشور لاہور سے شایع ہوئی۔ یہ نسبتاً چھوٹے
سائز میں ہے اس لئے صفحات کی تعداد ۵۰۲ ہو گئی۔

تیسری بار نفیس اکیڈیمی کراچی سے ۱۹۶۴ء میں شائع ہوئی۔ اس میں
۵۲۰ صفحات ہیں۔ اس کے علاوہ تصانیف احمدیہ (مطبوعہ انسٹی ٹیوٹ
پریس علی گڑھ ۱۸۸۷ء) کے حصہ اول جلد دوم میں بھی شامل ہے۔

پروین احسن

لے کے سیّد جو گنڈا اُٹھے تو لاکھوں لائے

سرسید نے کہا تھا "ایک دن آوے گا جب لوگ کہیں گے کہ سید بھی کوئی دیوانہ تھا پر بات پتے کی کہتا تھا" سرسیّد کا کارنامہ صرف یہی نہیں ہے کہ انھوں نے پتے کی بات کہی ان کا اصل کارنامہ یہ ہے کہ جو کہا اسے کر دکھایا۔ انھوں نے ثابت کر دیا کہ خواب ایک نہ ایک دن شرمندۂ تعبیر ہو کے رہتے ہیں شرط یہ ہے کہ لگن سچی، ارادہ فولادی اور کوشش ہار نہ ماننے والی ہو۔ جن کی طلب صادق اور ہمت جواں ہوتی ہے ان کے لیے بشارت ہے کہ بے شک فتح تمھاری ہی ہوگی۔ دنیا نے دیکھا کہ زبردست مخالفتوں کے باوجود فتح سرسیّد ہی کی ہوئی۔

آیئے اب دیکھیں کہ یہ "پتے کی بات" کیا تھی اور سرسیّد نے اسے حقیقت کا روپ دینے کے لیے کیا کیا؟ یہ پتے کی بات تھی ہندوستانی مسلمانوں کے لیے جدید تعلیم کا بندوبست۔ اس راستے کی دشواریاں بے حساب تھیں۔ جو مخالفتیں ہوئیں وہ اپنی جگہ لیکن سب سے بڑی دشواری تھی روپے کی فراہمی۔ اس کام کے لیے لاکھوں روپے کی ضرورت تھی۔ بظاہر اتنی بڑی رقم کے جمع ہو جانے کا امکان نہ تھا مگر انھوں نے ہمت نہ ہاری۔ ہر دروازہ کھٹکھٹایا اور ہر ذی حیثیت کے آگے جھولی پھیلائی۔ اہلِ ثروت ہی کا کیا ذکر ہے جس نے جو دیا اسے آنکھوں سے لگایا۔ اس وقت ہم یہ بتانا چاہتے ہیں کہ انھوں نے کس کس تدبیر سے چندہ جمع کیا۔

اصل میں تو لفظ چندہ اگاہنا ہے۔ اگاہنے کے معنی ہیں "وصول کرنا" لیکن کثرتِ استعمال سے چندہ اگانا ہوگیا۔ غور کیجیے تو اس محاورے میں بڑی بلاغت ہے۔ جیسے فصل اگانے کے لیے زمین کو پہلے جوت کر نرم کیا جاتا ہے، پھر بیج بویا جاتا ہے، کھاد پانی دیا جاتا ہے، دیکھ بھال کی جاتی ہے، نرائی ہوتی ہے تب جا کے فصل اگتی ہے۔ چندے کا بھی یہی حال ہے۔ زمین ہموار کرو، اہلِ ثروت کے ناز نخرے برداشت کرو، بیسیوں پھیرے لگاؤ، انھیں اپنا ہم خیال بناؤ تب کہیں جا کے تھوڑا سا چندہ وصول ہوتا ہے۔ سرسیّد کو بار بار ان منزلوں سے گزرنا پڑا۔

سرسید احمد خاں نے انگلستان کے نمونے پر کالج قایم کرنے کا فیصلہ کیا اور جی جان سے اس کام میں لگ گئے مگر آثار اچھے نظر نہ آتے تھے۔ سرسید کے ایک بزرگ نواب امّو خاں نے ان سے سوال کیا کہ تم نے جو تعلیم کا منصوبہ بنایا ہے وہ تو بہت بڑا ہے۔ آخر کتنے خرچ کا اندازہ ہے؟ انھوں نے جواب دیا "دس لاکھ" اس جواب پر وہ اچھل پڑے۔ بولے "کیا دیوانوں کی سی باتیں کرتے ہو، بھلا قوم تمھیں اتنی بڑی رقم دے گی اور وہ بھی انگریزی تعلیم کے لیے جس کے نام سے اسے نفرت ہے؟" کوئی اور ہوتا تو دل چھوڑ دیتا مگر سرسیّد کے پائے استقلال میں لغزش نہ آئی۔ آخر

ان کا خواب پورا ہوا۔

سرسید نے جس جس طرح چندہ وصول کیا اس کے دسیوں قصے قابلِ ذکر ہیں۔ ان کا طریقہ یہ تھا کہ پہلے خود اپنی جیب خالی کرتے، پھر دوستوں کی جیبیں ٹٹولتے۔ اس کے بعد دوسروں کے آگے ہاتھ پھیلاتے۔ ایک بار ان کے بیٹے سید محمود کی کسی بات پر قاضی رضا حسین سے پچاس روپے کی شرط ہوگئی۔ سید محمود ہار گئے۔ انھوں نے سو کا نوٹ لاکے قاضی صاحب کو دینا چاہا کہ شرط کی رقم لے لو۔ انھوں نے کہا شرط کا روپیہ لینا جائز نہیں۔ سید محمود کا کہنا تھا کہ جائز نہیں تو تم نے شرط لگائی کیوں تھی۔ اِدھر سے اصرار اُدھر سے انکار ہوتا رہا۔ آخر مقدمہ لے کر دونوں سید صاحب کی خدمت میں حاضر ہوئے۔ وہ کالج کے حساب کتاب میں مصروف تھے۔ سر اٹھایا، مقدمہ سنا، بیٹے سے سو کا نوٹ لے کر کالج کی صندوقچی میں رکھا اور پچاس روپے لوٹاتے ہوئے ارشاد ہوا "تم دونوں کی رائے ٹھیک ہے۔ شرط کا روپیہ دینا ناجائز، لینا ناجائز مگر کالج کو دینا مناسب بلکہ مستحسن۔"

مسٹر بیک کے والد علی گڑھ آئے اور چند روز مولوی زین العابدین کے مہمان رہے۔ چلتے وقت انھوں نے پانچ اشرفیاں دینی چاہیں۔ انھوں نے لینے سے انکار کیا۔ ان کا ارشاد تھا کہ تم میرے بیٹے کے دوست اور اس لیے بیٹے کے برابر ہو، میرا حکم تمھیں ماننا ہی پڑے گا۔ بات طے نہ ہوئی۔ یہ مقدمہ بھی سرسید کی عدالت میں پہنچا۔ انھوں نے اشرفیاں لیں اور کالج کے حساب میں جمع کر دیں کہ لو مقدمہ فیصل ہوگیا۔

ایک بار طوائفوں اور سازندوں نے کالج کو چندہ دینے کی پیشکش کی لیکن ساتھ ہی یہ بھی کہا کہ ہماری کمائی تو ناجائز ہے اس لیے تامل ہے۔ ان کا جواب تھا کہ کوئی بات نہیں اس ناپاک رقم سے ہم کالج کے بیت الخلا تعمیر کرا دیں گے۔

جب سرسید نے سنا کہ لوگ سنجیدہ کاموں سے زیادہ ناچ، گانے، نوٹنکی، تھیٹر میں دلچسپی لیتے ہیں تو انھوں نے بھی ایک ڈرامے کا پروگرام بنایا۔ اس کا ٹکٹ لگا اور سرسید نے اسٹیج پر آکے خود ایک غزل گائی۔

چندے کی ساری تدبیریں ختم ہوگئیں تو انھوں نے ایک لاٹری کا پروگرام بنایا۔ ایک رئیس موجود تھے۔ انھوں نے کہا لاٹری جوا ہے۔ اس لیے گناہ ہے۔ خدا کے گھر تم سے اس کی باز پرس ہوگی۔ انھوں نے برجستہ جواب دیا کہ باز پرس تم سے ہوگی۔ خدا کہے گا کہ اگر تم سید کی مدد کرتے اور چندہ دیتے تو وہ گناہ کا یہ کام کیوں کرتا۔

ان کا طریقہ تھا کہ چندہ کرنے نکلتے تو سفر خرچ خود برداشت کرتے۔ جہاں پہنچتے وہاں خود پکاتے کھاتے اور کسی کی دعوت قبول نہ کرتے۔ کوئی دعوت کا ارادہ کرتا تو اس سے دعوت کا خرچ نقد وصول کر کے رسید کاٹ دیتے کہ دعوت کی مد میں اتنی رقم وصول پائی۔ جب انھوں نے حیدرآباد جانے کا ارادہ کیا تو وہاں محسن الملک استقبال کی تیاریاں کرنے لگے۔ ان دنوں حیدرآباد میں ہر طرف ان کا ڈنکا بجتا تھا۔

محسن الملک نے دعوت کا اہتمام شروع کیا تو لوگوں نے ٹوکا کہ بھلا سید صاحب بھی کہیں دعوت قبول کرتے ہیں۔ سارا انتظام بیکار جائے گا۔ مگر وہ نہ مانے اور تیاری میں مشغول رہے۔ وہ سرسید کے مزاج سے خوب واقف تھے۔ انھوں نے پہنچتے ہی دھمکی دی کہ اس بار پانچ ہزار لیے بغیر نہیں ٹلوں گا۔ انھوں نے کہا "مجھے آپ کے مطالبے کا اندازہ تھا۔ اتنی رقم میں نے پہلے ہی الگ رکھ دی تھی۔" اس کے بعد محسن الملک نے ڈنر کی بات چھیڑی۔ انھوں نے عذر کیا۔ جب اصرار ہوا تو کہا کہ تم تو بڑے بڑے لوگوں کو بلاؤ گے اور بڑا خرچ کرو گے۔ آخر کتنے خرچ کا اندازہ ہے؟

انھوں نے خرچ کا اندازہ ڈیڑھ سو بتایا۔ سرسید نے وہی نسخہ استعمال کیا کہا، "ہائے، ہائے، اتنی بڑی رقم برباد کرو گے۔ لاؤ یہ دعوت کی مد میں کالج کو دے دو۔" انھوں نے کہا — "منظور۔ لیکن بات یہ ہے کہ آپ نے دعوت قبول نہ کی تو یہ ڈیڑھ سو ملیں گے اور قبول کر لی تو تین سو۔" سرسید دوگنی رقم کیوں نہ وصول کرتے۔

یہ واقعہ کافی مشہور ہے کہ کسی مخالف نے ٹوٹا ہوا جوتا پارسل بنا کے سید صاحب کو بھیجا۔ انھیں کافی ملال ہوا۔ ذرا دیر میں خیال آیا کہ ایک پھیری والا ٹوٹے جوتے خریدتا پھرتا ہے۔ اس خیال سے تسلی ہوئی۔ آخر انھوں نے جوتا ایک آنے میں بیچ دیا اور اسے کالج فنڈ میں جمع کر دیا۔

سرسید نے نواب مختار الملک کو کالج کی طرف متوجہ کرنا چاہا۔ کوئی تدبیر کارگر نہ ہوئی تو ایک انوکھی ترکیب اختیار کی۔ انھوں نے ایک تصویر تیار کرائی جس میں دکھایا گیا ہے کہ قوم کا جہاز طوفان میں پھنس گیا ہے اور ڈوبا ہی چاہتا ہے۔ ایک کشتی جس پر "ایک لاکھ روپیہ" درج ہے امداد کو آرہی ہے۔ خود سرسید تشویش کے عالم میں پیڑ سے کمر لگائے کھڑے ہیں اور کہہ رہے ہیں "اس جہاز کو بچانے کے لیے ایک لاکھ ناکافی ہیں۔" ذرا فاصلے پر نواب مختار الملک کھڑے ہیں۔ ایک فرشتہ جو آسمان سے اترا ہے نواب صاحب کی طرف انگلی سے اشارہ کر کے کہہ رہا ہے "اس نیک آدمی سے مدد مانگو۔" یہ تصویر جب نواب صاحب کی خدمت میں پیش کی گئی تو بہت متاثر ہوئے۔ انھوں نے خود مدد کی اور نواب حیدرآباد کو مدد پر آمادہ کیا۔ اکثر کہا کرتے تھے کہ "مجھے متاثر کرنے کی اس تصویر سے زیادہ کوئی اور صورت کارگر نہ ہو سکتی تھی۔"

کالج کے لیے غیروں کے آگے ہاتھ پھیلانے میں بھی انھیں عار نہ تھی۔ ایک اجنبی انگریز مسافر ڈاک بنگلے میں ٹھہرا تھا۔ سرسید نے اس سے بھی چندہ طلب کیا۔ اس نے منہ بنا کے جواب دیا کہ اپنی قوم کے لیے کالج بنا رہے ہو تو قوم ہی سے چندہ مانگو۔ اس پر سرسید نے کہا "بے شک ہم کو قوم کی پست ہمتی سے غیروں کے آگے ہاتھ پسارنا پڑتا ہے مگر یاد رکھنا چاہیے کہ اگر یہ انسٹی ٹیوشن بغیر انگریزوں کی اعانت کے قایم ہو گیا تو انگریزوں کے لیے کوئی ذلت کی بات اس سے زیادہ نہ ہوگی کہ وہ باوجودیکہ ہندوستان کی حکومت سے بے انتہا فائدے اٹھاتے ہیں مگر ہندوستانیوں کی بھلائی کے کاموں میں مطلق شریک نہیں ہوتے۔" حالی لکھتے ہیں کہ وہ شرمندہ ہوا۔ اور اسی وقت بیس کا ایک نوٹ سرسید کی نذر کیا۔

اکثر ایسا بھی ہوا کہ چندے کی فراہمی کے سلسلے میں سرسید کو شرمندگی اٹھانی پڑی لیکن انھوں نے ہمت نہ ہاری۔ چندے کے لیے انھوں نے اکثر دور دراز کے سفر کیے۔ ایک بار لاہور پہنچے۔ نمازِ جمعہ سے پہلے شاہی مسجد میں اعلان ہوا کہ علی گڑھ سے سرسید احمد خاں آئے ہیں اور بعد نماز وہ کالج کے سلسلے میں کچھ کہیں گے۔ نماز کے بعد لوگ یہ کہتے ہوئے چلے گئے کہ بے دین ہے، نیچری ہے، دشمن اسلام ہے۔ انگریزوں کا پٹھو ہے۔ اس کی بات کون سنے۔ آخر مسجد میں سرسید رہ گئے اور جلسے کے چند منتظمین۔ یہ افسردہ اور وہ نادم!

مولوی نذیر احمد کو سرسید کی اکثر باتوں سے اختلاف تھا مگر کالج کے معاملے میں وہ ہمیشہ مددگار رہے۔ انھوں نے سرسید کی سبکی کا حال سنا۔ فوراً اطلاع کرائی کہ اگلے جمعہ تک وہیں ٹھہرو اور گلی کوچوں میں اشتہار لگوا دو کہ دہلی سے ایک جغادری مولوی

سرسید سے مناظرہ کرنے آرہے ہیں ۔ اگلے جمعہ کو عجب حال ہوا ۔ مسجد میں تل دھرنے کو جگہ نہ رہی ۔ مولوی نذیر احمد لاہور پہنچ ہی چکے تھے ۔ بڑے وجیہہ انسان تھے اور کڑاک دار آواز پائی تھی ۔ نماز کے بعد تقریر کو کھڑے ہوئے ۔ دیر تک سرسید کے عیب گناتے اور انھیں بُرا بھلا کہتے رہے ۔ پھر ذرا دیر کو رکے اور سر جھکا کر بولے " اسے کیا کہوں کون سا عیب ہے جو خود میرے اندر موجود نہیں" پھر مجمع پر نظر ڈالی اور فرمایا " بھائیو، تم سب بھی اپنے اپنے گریبانوں میں منہ ڈال کر دیکھو ۔ ایسا تو نہیں کہ تم بھی گناہوں سے نہ بچے ہوں " پھر یاد دلایا کہ خدا اور اس کے رسول کا حکم ہے کہ دشمن بھی کچھ کہے تو سنو اور ٹھنڈے دل سے غور کرو اور یہ تو تمھارے دشمن نہیں ، دوست ہیں ، تمھارے بچوں کی فکر ان کے دامن گیر ہے ۔ ان کی تعلیم کے واسطے بھیک مانگنے نکلے ہیں ۔ ان کی بات تو سن لو "

سارا مجمع آبدیدہ تھا ۔ اس کے بعد سرسید نے اپنی تقریر میں کہا کہ " بھائیو ! اپنے مکان کی بات تو چھوڑو ۔ یہ بتاؤ جب تم مسجد تعمیر کرتے ہو تو کبھی یہ خیال کرتے ہو کہ کون مزدور نمازی ہے کون بے نمازی بلکہ کبھی یہ بھی سوچا کہ ان میں کون مسلمان اور کون غیر مسلم ہے ۔ میں بھی ایک مزدور ہوں اور تمھارے بچوں کے لیے کالج بنا رہا ہوں ۔ میرے کام کو دیکھو میرے اعمال پر نظر مت رکھو ۔ میں گنہگار ہوں لیکن یہ معاملہ میرے اور میرے خدا کے درمیان ہے ۔ میں تم سے شفاعت کا طلبگار نہ ہوں گا ۔ مجھ پر نہیں اپنے بچوں پر رحم کرو " آخر سرسید کو وہاں زبردست کامیابی حاصل ہوئی اور خوب چندہ برسا ۔ اسی لیے وہ ہمیشہ اہل پنجاب کو زندہ دلانِ پنجاب کہتے اور ان سے دلی محبت رکھتے تھے ۔

کہاں تک لکھا جائے اور کیا کیا لکھا جائے ۔ چندہ وصول کرنے کا کوئی جتن انھوں نے اٹھا نہ رکھا تھا ۔ انھوں نے چراغی مانگی ، نمائش میں کتابوں کی دکان لگائی ، تماشا دکھانے اسٹیج پر آئے ، لاٹری نکالی ۔ جو کچھ ان سے بن پڑا اس میں دریغ نہ کی ۔ ایک جگہ لکھا ہے کہ :

" ہمارا تو اب یہ حال ہوگیا ہے کہ ہمارے دوست بھی ہم سے ملتے ہوئے ڈرتے ہیں کہ کچھ سوال نہ کر بیٹھیں ۔ ہماری صورت ہی اب سوال ہوگئی ہے ۔ میں نے ایک دوست سے کہا تھا کہ بھائی میری قسمت میں بھیک مانگنا لکھا تھا سو اس کی بد ملاتا ہوں مگر شکر ہے کہ اپنے لیے نہیں قوم کے لیے "

قوم کے اس بھکاری نے چندہ جمع کرکے ایسا کارنامہ انجام دیا جو رہتی دنیا تک اس کے احسانوں کی یاد دلاتا رہے گا ۔ ★ ★

میں سرسید احمد کا بھاٹ نہیں ۔ وہ اگر پیر ہوں تو ان کا مرید نہیں ۔ استاد ہوں تو ان کا شاگرد نہیں ۔ مرثیہ خواں ہوں تو ان کا لبسوریا نہیں ۔ امیر ہوں اور مجھ کو معلوم ہے کہ نہیں ہیں لیکن اگر ہوں تو ان کا دست نگر نہ کبھی تھا ، نہ اب ہوں اور نہ انشاء اللہ مدت العمر ہوں گا ۔ مگر ہے کیا ، آدمی ہوں ۔ دوست دشمن میں تمیز کرنے کی ، قومی حالت اور قومی ضرورتوں کی شناخت کی عقل رکھتا ہوں ۔ میں نے خود سرسید کے رو در رو اس بات کے کہنے میں مطلق باک نہیں کیا اور کیوں کرتا کہ میں ان کے سب نہیں بعض معتقدات کو غلط سمجھتا ہوں لیکن جیسا کہ مجھ کو ان کی غلطیوں کا تیقن ہے ۔ اس بات کا بھی تیقن ہے کہ وہ شخص منافق نہیں ، بزدل نہیں ، مکار نہیں اور قومی خیر خواہی سے ایسا سرشار ہے کہ اس کا بس چلے تو ، اپنی تو پہلے ہی اتار رکھی ہے ، دوسروں کی پگڑی بھی اتار کے مسلمانوں کے حوالے کر دے ۔

(مولوی نذیر احمد کے ایک لکچر سے اقتباس)

شاہدہ خالد

قوم کا مسیحا

اُن کی زندگی کا کوئی لمحہ ملک و قوم کی فکر سے خالی نہ تھا۔ ہمہ وقت وہ قومی بھلائی کے کاموں میں مصروف رہتے تھے۔ ادب، مذہب اُن کے ذہن میں گردش نہ کرتے رہتے ہوں اور ان کا مضطرب ذہن ان مسائل کے حلوں کا متلاشی نہ ہو۔ پھر صحت کے مسائل سے وہ کیسے غافل رہ سکتے تھے۔ اس مسئلے پر اُنھوں نے پوری توجہ صرف کی اور اس کا وہ حل ڈھونڈھ نکالا جو آج تقریباً سوا سو سال بیت جانے کے بعد بھی بیماریوں کے اس ملک کا واحد حل نظر آتا ہے۔ اسی لئے ہم نے سرسید کو "قوم کا مسیحا" کہا ہے۔

سرسیّد کے زمانے میں ملک کی حالت آج سے زیادہ ابتر تھی بیماری، بے روزگاری اور غربت اب سے بڑھ کر تھی۔ اس پر ستم یہ کہ جہالت نے ہر مرض کو لاعلاج بنا دیا تھا۔ اعداد و شمار سے ثابت ہو جائے گا کہ بیماروں اور بیماریوں دونوں کی تعداد بہت زیادہ تھی۔ اور شفایاب ہونے والوں کا تناسب بہت ہی کم! دوائیاں آج شفا اور معالج آج ناپید ہیں تو ذرا سوچیے اس زمانے میں کیا حال رہا ہوگا۔

سرسیّد کا واسطہ اس ملک سے تھا جس میں بیماری کے ساتھ بے روزگاری اور غربت بھی تھی۔ اس لیے انھیں ایسے طریقِ علاج کی تلاش تھی جو سستا ہو بے حد سستا۔ جہاں ڈاکٹروں اور مستند معالجوں کی کمی ہو وہاں عطائیوں کی بن آتی ہے۔ یہ وہ لوگ ہوتے ہیں جنھیں کچھ نہیں آتا اور سب کچھ جاننے کے دعویدار ہوتے ہیں۔ نتیجہ یہ کہ ان کے علاج سے مرض کے گھٹنے کا امکان کم اور جان کے جانے کا اندیشہ زیادہ ہوتا ہے۔ اس وشال دیس میں ڈاکٹروں کی تعداد اتنی ہو جائے جتنی درکار ہے اس کا خفیف سا امکان آج بھی نہیں تو کل کیا رہا ہوگا۔ اس لیے طریقِ علاج کے لیے دوسری شرط یہ قرار پائی کہ کوئی کم علم آدمی بھی اسے برتے تو مریض کے حق میں ملک الموت نہ ثابت ہو۔ یعنی یہ علاج بے ضرر ہو۔

ان باتوں کو ذہن میں رکھ کے سرسیّد نے جس طریقِ علاج کا انتخاب کیا وہ تھا ہومیو پیتھی۔ یہ ارزاں بھی ہے اور بے ضرر بھی۔ وہ اس مسئلے پر اچھی طرح غور کر چکے تھے چنانچہ انھوں نے ۱۷ دسمبر ۶۷ء کو ہومیو پیتھک طریقِ علاج پر ایک نہایت مدلل لیکچر دیا۔

یہ بات شاید بار بار دہرانے کی ضرورت نہیں کہ سرسیّد دُھن کے پکے تھے۔ جو سودا اُن کے سر میں سما جاتا تھا اُسے عملی جامہ پہنائے بغیر انھیں چین نہ آتا تھا وہ ایسے عملی انسان تھے کہ اکثر کہتے بعد کو اور کرتے پہلے تھے۔ اِسی سال لیکچر دینے سے پہلے وہ بنارس میں ہومیو پیتھک طریق علاج کو فروغ دینے کے لیے ایک کمیٹی تشکیل دے چکے تھے۔ مہاراجہ بنارس اس کمیٹی کے صدر اور خود سرسید اس کے سکریٹری تھے۔

۲۵ ستمبر ۱۸۶۷ء کو انھوں نے بنارس میں ایک "ہومیو پیتھک ڈسپنسری اینڈ ہاسپٹل" قائم کر کے اپنے خواب کو حقیقت میں تبدیل کر دیا۔ یہ زمانہ وہ تھا کہ جب اس طریقِ علاج کا نام جاننے والے بھی چند ہی ہوں گے لیکن ۴ دسمبر ۱۸۶۷ء کے پائنیر اخبار سے پتہ چلتا ہے کہ پہلے ہی مہینے میں پانچ سو سولہ (۵۱۶) مریض علاج کے لیے اس شفاخانے میں آئے۔

سرسید نے ۷ اردسمبر ۱۸۹۶ء کو بنارس میں ہومیوپیتھی پر جو لکچر دیا اس سے پتہ چلتا ہے کہ انھوں نے انتہائی بے تعصبی اور نہایت محنت سے اس علم کا مطالعہ کیا تھا۔ اس مطالعے سے چند نتائج برآمد ہوئے وہ انھوں نے بڑی وضاحت اور بہت مدلل انداز سے اس لکچر میں پیش کردیے

انھوں نے سب سے پہلے تو یہ واضح کیا کہ علاج کے دو طریقے ہوسکتے ہیں علاج بالضد اور علاج بالمثل یعنی پہلی صورت تو یہ ہوسکتی ہے کہ جو مرض تشخیص کیا جائے اس کے برعکس دوا جسم میں پہنچائی جائے۔ لفظ ایلوپیتھی دو یونانی الفاظ سے مرکب ہے اور اس کے معنی ہی ضد کے ذریعے علاج ہیں دوسری صورت یہ ہے کہ جو مرض پایا جائے اس کے مشابہ دوا جسم میں پہنچائی جائے۔ ہومیو بھی ایک یونانی لفظ ہے جس کے معنی مثل یا مشابہ کے ہیں اور پیتھی کا مطلب ہے علاج۔ گویا ہومیوپیتھی کے معنی ہوئے علاج بالمثل۔

سرسید اعتراف کرتے ہیں کہ یہ بات بظاہر عجیب سی لگتی ہے کہ جس تکلیف کا علاج کرنا ہے۔ اسی کے مزید جراثیم جسم میں داخل کردیے جائیں۔ لیکن اس کی حمایت میں دلیل پیش کرتے ہیں کہ چیچک کا ٹیکہ چیچک کے جراثیم ہی سے تیار ہوتا ہے۔ ایک دلیل انھوں نے اور پیش کی ہے۔ انھوں نے بقراط کا یہ قول نقل کیا ہے کہ جس چیز سے بیماری پیدا ہوتی ہے اسی سے چلی بھی جاتی ہے۔ کالی داس کے ایک شعر میں کہا گیا ہے کہ سانپ کے زہر کا تریاق سانپ کا زہر ہی ہے۔ اس سے یہ بھی معلوم ہوجاتا ہے کہ ہومیوپیتھی بہت پرانا طریق علاج ہے۔ ہینی مین کا کمال تو صرف یہ ہے کہ اس نے اسے زندہ کیا، اس کے اصول مرتب کیے اور اسے عام کیا۔

کونین بخار کی دوا ہے۔ ہینی مین نے صحت کی حالت میں کونین کھائی تو اسے بخار آگیا۔ کئی بار اس نے یہ تجربہ خود پر پھر دوسروں پر کیا۔ جب وہ علاج بالمثل کے طریقے کا قائل ہوگیا تو اس کی اشاعت کی طرف متوجہ ہوگیا۔ لوگ اس کے مخالف ہوگئے اور اسے اپنا وطن چھوڑنا پڑا۔ بڑھاپے میں وہ لوٹا اور پھر اپنے کام میں مشغول ہوگیا۔ وہ پہلے ایلوپیتھی کا ڈاکٹر تھا لیکن ہومیوپیتھی کا قائل ہوگیا تو ساری زندگی اس طریق علاج کی خدمت میں صرف کردی۔

سرسید اس اعتراض کو فضول بتاتے ہیں کہ ہومیوپیتھی میں دوا کی خوراک بہت کم ہوتی ہے۔ اس بات کا لوگ آج تک مذاق اڑاتے ہیں مگر جب تجربے نے بتادیا کہ ذرا سی دوا کام کرسکتی ہے تو پھر بہت سی دوا پلانے کا کیا فائدہ ہے۔ سرسید اسے عیب نہیں خوبی بتاتے ہیں اور کہتے ہیں کہ اس دوا کے بے ضرر ہونے کا سبب یہی ہے کہ اس کی خوراک کم ہوتی ہے۔ سرسید نے ہومیوپیتھی دواؤں کے بے ضرر ہونے کو بہت سراہا ہے اور اعداد و شمار سے بتایا ہے کہ اس طریق علاج میں اموات کی تعداد بہت گھٹ جاتی ہے۔

یہ تھے وہ اسباب جن کی بنا پر سرسید نے ہومیوپیتھک طریق علاج کی وکالت کی اور اس کا ہسپتال قائم کیا۔

ہمارا خیال ہے سرسید نے اس سلسلے میں جو کچھ کیا وہ صرف اُن کے عہد کی ضرورت نہ تھی بلکہ ہمارا زمانہ بھی یقیناً اسی کا تقاضا کر رہا ہے۔ ایک معمولی انسان اور برگزیدہ ہستی میں یہی فرق ہوتا ہے کہ ایک کو تو اپنے پاس کی چیز بھی دکھائی نہیں دیتی اور دوسرے کو دور تک کا صاف نظر آتا ہے۔ ہمیں یقین ہے کہ ملک کو بیماریوں سے نجات دینی ہے تو ہومیوپیتھک طریق علاج کی مدد لینی پڑے گی اور ضرور لینی پڑے گی۔

ہمارے ملک میں تین اور طریق علاج رائج ہیں۔ ایلوپیتھی، آیورویدک اور طب یونانی۔ ہمارے ذہنوں سے ابھی غلامی کی بو نہیں گئی۔ اس کا ثبوت یہ ہے کہ ایلوپیتھی کو ہم انگریزی علاج کہتے اور اُس سے بُری طرح مرعوب ہوتے ہیں۔ یہ طریق علاج خامیوں سے پاک نہیں ہے۔ اس کے پاس جدید تحقیق کا ذخیرہ تو بہت بڑا ہے مگر تجربے کا سرمایہ صفر ہے۔ اسی لیے ایک دوا آج بے حد مفید اور کل حد سے زیادہ مضر بلکہ مہلک بتائی جاتی ہے۔ پنسلن کا حشر ہم دیکھ ہی چکے ہیں۔ اکثر یہ ہوتا ہے کہ ڈاکٹر نے عکس ریز (اکسرے) کا سہارا لے کر بدن کے اندر تک جھانک تو لیا مگر سمجھ کچھ نہ پایا۔ اکسرے کے پڑھنے والے ماہروں کی رایوں میں عموماً بہت فرق ہوتا ہے۔ اب یہ واضح ہوچکا ہے کہ انٹی بایوٹک جیسی تیز دوائیں

(باقی ص ۸۱ پر)

علی گڑھ مسلم یونیورسٹی علی گڑھ

اشتہار نمبر ۸۴-۸۳/۱۹

مندرجہ ذیل آسامیوں کے لئے مقررہ فارموں پر درخواستیں مطلوب ہیں۔

۱۔ سینئر ٹیکنیکل اسسٹنٹ (ریکارڈنگ)۔ ڈپارٹمنٹ آف جنرل سرجری (عارضی لیکن مستقل ہونے کی امید۔

شرح تنخواہ:۔ ۵۵۰ ۔ ۲۵ ۔ ۷۵۰ ۔ ای بی ۔ ۳۰ ۔ ۹۰۰ ۔ روپیہ اور دیگر الاؤنس۔

استعداد:۔ (۱) لازمی

اس مضمون میں لیباریٹری ٹیکنک کی ٹریننگ کے تجربے کے علاوہ سائنس میں گریجویشن

II پسندیدہ:۔ میڈیکل ریکارڈنگ کے لئے ڈبلو ایچ او کے کوڈنگ سسٹم میں مطلوبہ تجربہ یا لائبریری سائنس کوڈنگ میں ڈپلومہ۔ لائبریری کی کتابوں کا کیٹالاگنگ یا میکنیکل ڈیٹا پروسیسنگ مشین کو استعمال کرنے کا تجربہ۔

۲۔ سینئر ٹیکنیکل اسسٹنٹ (چھٹی کی وجہ سے خالی آسامی) ڈیپارٹمنٹ آف پیڈیا ٹرکس

شرح تنخواہ:۔ ۵۵۰ ۔ ۲۵ ۔ ۷۵۰ ۔ EB ۔ ۳۰ ۔ ۹۰۰ روپیہ اور دیگر الاؤنس

استعداد:۔ لازمی بی ایس سی اور بائیو کیمیکل لیبوریٹری میں ٹریننگ کا تین سال تجربہ

پسندیدہ:۔ میڈیکل لیباریٹری ٹیکنکس میں ڈپلومہ

۳۔ سینئر ٹیکنیکل اسسٹنٹ (بلڈ بینک) (چھٹی کی وجہ سے خالی آسامی) جواہر لال نہرو میڈیکل کالج

شرح تنخواہ:۔ ۵۵۰ ۔ ۲۵ ۔ ۷۵۰ ۔ ای بی ۔ ۳۰ ۔ ۹۰۰ روپیہ اور دیگر الاؤنس

استعداد:۔ بی۔ ایس سی اور لیباریٹری ٹکنکس میں ٹریننگ کا تجربہ۔

پسندیدہ:۔ ٹیکنیکل پیتھالوجی یا بلڈ ٹرانسفیوژن میں سرٹیفکٹ۔ بلڈ بینک میں کام کا عملی تجربہ۔

۴۔ انسٹرکٹر ان الیکٹرونکس انجینرنگ (ریڈیو) مستقل ویمنس پالی ٹیکنک

شرح تنخواہ:۔ ۴۴۰ ۔ ۱۵ ۔ ۵۱۵ ۔ ای بی ۔ ۱۵ ۔ ۵۶۰ ۔ ۲۰ ۔ ۷۰۰ ۔ ای بی ۔ ۲۵ ۔ ۷۵۰ روپیہ اور دیگر الاؤنس

استعداد:۔ الیکٹرونکس/ ٹیلیکمیونیکیشن/ ریڈیو/ الیکٹریکل انجینرنگ میں فرسٹ کلاس ڈپلومہ اور کسی مقتدر و مشہور ادارہ میں کام کا ۲ سالہ تجربہ۔

۵۔ اسسٹنٹ میٹرن (مستقل) جواہر لال نہرو میڈیکل کالج

شرح تنخواہ:- ۵۵۰- ۲۰- ۶۵۰- ۲۵- ۷۵۰ روپیہ اور دیگر الاؤنس
استعداد:- لازمی جنرل نرسنگ اور مڈوائفری اور کسی ریاستی میڈیکل فیکلٹی میں رجسٹریشن، تسلیم شدہ سسٹر، ٹیوٹر یا نرسنگ ایڈمنسٹریشن کا کورس، نرسنگ کا سات سالہ تجربہ
پسندیدگی:- دو سال اور اس سے زیادہ کا انتظامی تجربہ۔

- ٹیکنیکل اسسٹنٹ (ڈرافٹسمین) مستقل ڈیپارٹمنٹ آف ہسٹری

شرح تنخواہ:- ۴۲۵- ۱۵- ۵۰۰- ای بی- ۱۵- ۵۶۰- ۲۰- ۷۰۰ روپیہ اور دیگر الاؤنس
استعداد:- (لازمی) سول انجینئرنگ یا آرٹس میں ڈپلومہ
پسندیدگی:- نقشہ کشی / پیمائش کا تجربہ

اس اسامی کے لئے فرائض اور ذمہ داریاں

عہد قدیم سے متعلق مٹی کے ظروف کی تصویر کشی، پلان سیکشن اور پیمائش کی تیاریاں، تاریخی اشیاء کی نمائش میوزیم اور آثار قدیمہ کے سلسلہ میں لگنے والے کیمپ میں مدد دینا۔ سینٹر/اور ڈیپارٹمنٹ آف ہسٹری کی جانب سے آثار قدیمہ کی کھدائی اور پیمائش میں حصہ لینا اس کے علاوہ کھدائی وغیرہ سے متعلق جو بھی کام تفویض کیا جائے اس کو سرانجام دینا۔

- پرسنل اسسٹنٹ ٹو ڈین۔ فیکلٹی آف انجینئرنگ

شرح تنخواہ:- ۴۲۵- ۱۵- ۵۰۰- ای بی- ۱۵- ۵۶۰- ۲۰- ۷۰۰ روپیہ اور دیگر الاؤنس
استعداد:- لازمی:- آرٹس، سائنس یا کامرس میں گریجویشن۔ بحیثیت پی اے یا اسٹینوگرافر۔ کام کا پانچ سالہ تجربہ

- پروجیکشنسٹ (مستقل) ڈیپارٹمنٹ آف افتھلمالوجی

شرح تنخواہ:- ۴۲۵- ۱۵- ۵۶۰- ای بی- ۲۰- ۶۴۰ روپیہ اور دیگر الاؤنس
استعداد:- لازمی:- ۳۵ ایم ایم/۱۶ ایم ایم کے پروجیکٹر کو چلانے کا سرٹیفکیٹ / لائسنس اور تین سالہ تجربہ۔
- پسندیدگی:- جن امیدواروں کو پبلک ایڈریس سسٹم اور آڈیو وژول ایکوئپمنٹ کو چلانے کا تجربہ ہو انکو ترجیح دی جائیگی۔

- اسٹاف نرسیز (۲۰ اسامیاں) (مستقل) جواہر لال نہرو میڈیکل کالج

شرح تنخواہ:- ۴۲۵- ۱۵- ۵۶۰- ای بی- ۲۰- ۶۴۰- روپیہ اور دیگر الاؤنس
استعداد:- میٹریکولیشن یا اس کے مساوی کوئی دوسری استعداد۔ کسی تسلیم شدہ ادارہ سے جنرل نرسنگ اینڈ مڈوائفری میں ڈپلومہ اور کسی ایک ریاست میں رجسٹریشن۔ بحیثیت جنرل ڈیوٹی نرس کم از کم ایک سال کا تجربہ

- اسکلڈ اسسٹنٹ (مستقل) ویمنس پالیٹیکنک

شرح تنخواہ:- ۳۸۰- ۱۲- ۴۴۰- ای بی- ۵۶۰- ای بی- ۲۰- ۶۴۰ روپیہ اور دیگر الاؤنس

استعداد :۔ کاسٹیوم ڈیزائن اینڈ ڈریس میکنگ / ٹیلرنگ اینڈ کلاتھنگ میں تسلیم شدہ فرسٹ کلاس سرٹیفکٹ

یا

کم ازکم سات سالہ پیشہ ورانہ تجربہ کا حامل۔ تعلیم یافتہ اچھا کٹر (کپڑا قطع کرنے والا) ٹیلر

۱۱۔ میکینک (الیکٹریکل) (مستقل) جواہر لال نہرو میڈیکل کالج ہسپتال

۱۲۔ میکینک (میکینیکل) (مستقل) جواہر لال نہرو میڈیکل کالج ہسپتال

شرح تنخواہ :۔ ۳۸۰ - ۱۲ - ۵۰۰ - ای بی - ۱۵ - ۵۶۰ روپیہ اور دیگر الاؤنس

استعداد :۔ شمار نمبر ۱۱ کے تحت میکینکس (الیکٹریکل) کے لئے۔

(i) کسی آئی ٹی آئی سے الیکٹریشن کا سرٹیفکٹ

شمار نمبر ۱۲ کے تحت میکینکس (میکینکل) کے لیے

(ii) کسی آئی ٹی آئی سے میکینکس کا سرٹیفکٹ

(iii) کھراد مشین کے ذریعہ ہونے والے جملہ کاموں کی ماہرانہ واقفیت مثلاً فینسنگ، سرفیسنگ، کئی طرح کے اسکریو کٹنگ، ٹیپ اور کرو ڈٹرنینگ وغیرہ کے علاوہ ورکشاپ کی دوسری مشینوں (جیسے شیپر، ملنگ اینڈ ڈرلنگ) پر کام کی واقفیت گلوسینو میٹر، اسٹاپ کلاکس اور گھڑیوں جیسے لیبارٹری آلات کی مرمت کی اہلیت۔

۱۳۔ اسٹور کیپر۔ کم۔ نسخہ نویس (مستقل) اجمل خاں طبیہ کالج ہسپتال

شرح تنخواہ :۔ ۳۳۰ - ۶ - ۳۸۰ - ای بی - ۱۲ - ۵۰۰ - ای بی - ۱۵ - ۵۶۰ روپیہ اور دیگر الاؤنس

استعداد :۔ (۱) فارسی بحیثیت ایک مضمون لے کر گریجویشن

(۲) بحیثیت اسٹور کیپر کام کا تین سالہ تجربہ

(۳) انگریزی میں ڈرافٹ اور رپورٹ تحریر کا تجربہ

(۴) ٹائپنگ

۱۴۔ الیکٹریشن (مستقل) الیکٹریسٹی ڈیپارٹمنٹ

شرح تنخواہ :۔ (i) کسی آئی۔ ٹی آئی سے بحیثیت الیکٹریشن کا سرٹیفکٹ

(ii) بجلی کے موٹر اور بجلی کے دوسرے آلات کی دیکھ ریکھ اور مرمت کا تجربہ

۱۵۔ کارندہ (مستقل) پراپرٹی ڈیپارٹمنٹ

شرح تنخواہ :۔ ۲۶۰ - ۶ - ۲۹۰ - ای بی - ۶ - ۳۲۶ - ۸ - ۳۶۶ - ای بی - ۸ - ۳۹۰ - ۱۰ - ۴۰۰ روپیہ اور دیگر الاؤنس

استعداد :۔ کسی تسلیم شدہ بورڈ / یونیورسٹی سے ہائی اسکول یا کسی تسلیم شدہ یونیورسٹی کی ڈگری۔ اردو کی استعداد لازمی۔ کسی لائق و موزوں امیدوار کی صورت میں استعداد میں ڈھیل دی جاسکتی ہے۔

پسندیدہ :۔ سول فوجداری اور مالی معاملات میں عدالتی پیروکاری کا دس سالہ تجربہ۔ زمین کی پیمائش اور جائیداد وغیرہ کا حساب کتاب رکھنے کا تجربہ۔

غیر معمولی تجربہ اور قابلیت کے حامل امیدواروں کو ابتدا ہی سے اعلیٰ تنخواہ سے شروعات دی جاسکتی ہے۔ انٹرویو کے لیے طلبیدہ امیدواروں کو بطور ٹی اے ریلوے کے سیکنڈ کلاس کا ایک طرفہ کرایہ ادا کیا جائے گا۔

مطلوبہ درخواست فارم اور ہدایات اسسٹنٹ رجسٹرار (سلیکشن کمیٹی) رجسٹرار آفس مسلم یونیورسٹی کے کیش کاؤنٹر میں جمع شدہ) یا فائننس آفیسر مسلم یونیورسٹی کے نام واجب الادا تین روپیہ کا کراسڈ پوسٹل آرڈر دے کر ذاتی طور پر یا 23X10 cm کا لفافہ بھیج کر حاصل کئے جاسکتے ہیں۔ لفافہ پر خود کا پتہ تحریر ہونا ضروری ہے۔ درخواست موصول ہونے کی آخری تاریخ ۲ر نومبر ۱۹۸۳ء ہے۔ نامکمل اور تاخیر سے موصول ہونے والی درخواستیں قبول نہیں کی جائیں گی۔

ضمیر احمد خاں
رجسٹرار

علی گڑھ مسلم یونیورسٹی علی گڑھ

اشتہار نمبر ۸۴-۸۳/۲۰

مندرجہ ذیل اسامیوں کے لیے مقررہ فارموں پر درخواستیں مطلوب ہیں۔

۱۔ پروفیسر آف اوکیولر پیتھالوجی۔ ڈپارٹمنٹ آف آپتھلمالوجی۔

شرح تنخواہ:۔ ۱۵۰۰-۵۰-۱۹۰۰-۱۰۰-۲۰۰۰-۲/۱۲۵-۲۵۰۰ روپیہ اور دیگر الاؤنس

استعداد:۔ لازمی (۱) ایم بی بی ایس یا میڈیکل کونسل آف انڈیا سے منظور شدہ کوئی مساوی استعداد (۲) ایم ایس (آپتھلمالوجی) ایم ڈی (آپتھلمالوجی)۔ کسی میڈیکل کالج میں بحیثیت ریڈر آپتھلمالوجی تدریس اور تحقیق کا چار سالہ تجربہ۔

پسندیدہ:۔ ترجیحاً کسی آپتھلمک ڈپارٹمنٹ میں آپتھلمک پیتھالوجی کا تجربہ۔ اور اس تخصیصی مضمون میں ہندوستانی یا غیر ملکی جرائد میں شائع تخلیقی تحقیقی کام۔

۲۔ ریڈر ان انستھیسیالوجی۔ ڈپارٹمنٹ آف انستھیسیالوجی

شرح تنخواہ:۔ ۱۲۰۰-۵۰-۱۳۰۰-۶۰-۱۹۰۰ روپیہ اور دیگر الاؤنس۔

استعداد: (۱) لازمی۔ (۱) ایم بی بی ایس یا میڈیکل کونسل آف انڈیا سے منظور شدہ کوئی مساوی استعداد۔

(ii) ایم ڈی (انستھیسالوجی) ایم ایس (انستھیسالوجی)۔ کسی میڈیکل کالج میں بحیثیت لکچرر انستھیسالوجی تدریس و تحقیق کا پانچ سالہ تجربہ۔ II پسندیدہ:۔ تحقیق کا میلان اور مطبوعہ مضامین۔

۱- ریڈر ان پتھالوجی (ہیماٹولوجی اینڈ بلڈ بنک)۔ مستقل) ڈپارٹمنٹ آف پتھالوجی

شرح تنخواہ:۔ ۱۲۰۰ - ۵۰ - ۱۳۰۰ - ۶۰ - ۱۹۰۰ روپیہ اور دیگر الاؤنس۔

استعداد:۔ (i) لازمی - ایم بی بی ایس یا میڈیکل کونسل آف انڈیا سے منظور شدہ کوئی مساوی ڈگری (ii) ایم ڈی (پتھالوجی)/ایم ڈی (پتھالوجی اینڈ بکٹریالوجی)۔ ایم ڈی (پتھالوجی معہ بکٹریالوجی/پی ایچ ڈی (پتھالوجی)/ ڈی ایس سی (پتھالوجی) میڈیکل کونسل آف انڈیا سے تسلیم شدہ کوئی مساوی استعداد۔ بحیثیت لکچرر پتھالوجی (ہیماٹالوجی اینڈ بلڈ بنک) کسی میڈیکل کالج میں تدریس و تحقیق کا پانچ سالہ تجربہ - II پسندیدہ:۔ اس تخصیصی مضمون میں شائع شدہ ملکی اور غیر ملکی جرائد میں مطبوعہ مضامین۔

۴- لکچرر ان اناٹمی - (ہسٹالوجی) (پلان پوسٹ) ڈپارٹمنٹ آف اناٹمی۔

شرح تنخواہ:۔ ۷۰۰ - ۴۰ - ۱۱۰۰ - ۵۰ - ۱۶۰۰ روپیہ اور دیگر الاؤنس۔

استعداد:۔ (i) لازمی - (i) ایم بی بی ایس یا میڈیکل کونسل آف انڈیا سے تسلیم شدہ کوئی مساوی استعداد۔

(ii) ایم ایس (اناٹمی)- ایم ایس سی (اناٹمی) - پی ایچ ڈی (میڈیکل اناٹمی) ڈی ایس سی (میڈیکل اناٹمی)) اس مضمون میں مطلوبہ پوسٹ گریجویٹ استعداد۔ پسندیدہ:۔ ہسٹالوجی کے مضمون میں مطبوعہ کام اور تحقیقی تجربہ

۵- لکچرر ان فزیالوجی (مستقل) ڈپارٹمنٹ آف فزیالوجی۔

شرح تنخواہ:۔ ۷۰۰ - ۴۰ - ۱۱۰۰ - ۵۰ - ۱۶۰۰ روپیہ اور دیگر الاؤنس۔

استعداد: (i) لازمی۔ ایم بی بی ایس یا میڈیکل کونسل آف انڈیا سے تسلیم شدہ کوئی مساوی استعداد۔

(ii) ایم ڈی (فزیالوجی)۔ ایم ایس سی (فزیالوجی) پی ایچ ڈی (میڈیکل فزیالوجی) ڈی ایس سی (میڈیکل فزیالوجی) اس مضمون میں مطلوبہ پوسٹ گریجویٹ استعداد اور تدریسی و تحقیقی تجربہ۔

پسندیدہ:۔ اس تخصیصی مضمون میں شائع شدہ ملکی و غیر ملکی جرائد میں مطبوعہ مضامین۔

۶- لکچرر ان بائیوکیمسٹری (مستقل) ڈپارٹمنٹ آف بائیوکیمسٹری

شرح تنخواہ:۔ ۷۰۰ - ۴۰ - ۱۱۰۰ - ۵۰ - ۱۶۰۰ روپیہ اور دیگر الاؤنس

استعداد:۔ (i) لازمی (i) ایم بی بی ایس یا میڈیکل کونسل آف انڈیا سے تسلیم شدہ کوئی مساوی استعداد۔

(ii) ایم ڈی (بائیوکیمسٹری) ایم ایس سی (میڈیکل بائیوکیمسٹری) پی ایچ ڈی (میڈیکل بائیوکیمسٹری)۔ ڈی ایس سی (میڈیکل بائیوکیمسٹری)۔ اس مضمون میں مطلوبہ پوسٹ گریجویٹ استعداد اور تحقیقی و تدریسی تجربہ۔

نوٹ:۔ منتخب امیدواروں پر کلینکل بائیوکیمسٹری سیکشن منتظم کے علاوہ ایم بی بی ایس اور ایم ڈی کلاسیز کے لیے میڈیکل یا بائیوکیمسٹری کورسز چلانے کی ذمہ داری بھی ہوگی۔

لیکچرر اِن مائکرو بائیولاجی ۔ ڈپارٹمنٹ آف مائکرو بایولاجی ۔

شرح تنخواہ:۔ ۷۰۰ ۔ ۴۰ ۔ ۱۱۰۰ ۔ ۵۰ ۔ ۱۶۰۰ روپیہ اور دیگر الاؤنس۔

استعداد:۔ (۱) لازمی (۱) ایم بی بی ایس یا میڈیکل کونسل آف انڈیا سے تسلیم شدہ کوئی مساوی استعداد

(ii) ایم ڈی (بیکٹریالوجی)/ایم ڈی (مائکرو بایولاجی)۔ ایم ڈی (بیکٹریالوجی معہ پیتھالوجی) ایم ڈی (پیتھالوجی اینڈ بیکٹریالوجی) ایم ایس سی (میڈیکل بیکٹریالوجی)/ایم ایس سی (میڈیکل مائکرو بایولاجی)/پی ایچ ڈی (میڈیکل بیکٹریالوجی)/پی ایچ ڈی (میڈیکل مائکرو بیالوجی/ڈی ایس سی (میڈیکل بیکٹریالوجی)/ڈی ایس سی (میڈیکل مائکرو بائیولاجی)

اس مضمون میں مطلوبہ پوسٹ گریجویٹ استعداد اور تدریسی و تحقیقی تجربہ (ب) پسندیدہ:۔ مائکرو بائیولوجی میں تدریسی تجربہ

لیکچرر اِن کارڈیالوجی ۔ ڈپارٹمنٹ آف میڈیسن ۔

شرح تنخواہ:۔ ۷۰۰ ۔ ۴۰ ۔ ۱۱۰۰ ۔ ۵۰ ۔ ۱۶۰۰ ۔ روپیہ اور دیگر الاؤنس۔

استعداد:۔ (۱) لازمی I- ایم بی بی ایس یا میڈیکل کونسل آف انڈیا سے تسلیم شدہ کوئی مساوی استعداد۔

(ii) ڈی ایم (کارڈیالوجی) میڈیکل کونسل آف انڈیا سے تسلیم شدہ کوئی مساوی استعداد۔ اس مضمون میں مطلوبہ پوسٹ گریجویٹ استعداد اور تدریسی و تحقیقی تجربہ۔

پسندیدہ:۔ اس مخصوص مضمون میں مطبوعہ تحقیقی کام۔

غیر معمولی قابلیت اور تجربہ کے حامل افراد کو ابتداء سے ہی اعلیٰ تنخواہ سے شروعات دی جا سکتی ہے۔

انٹرویو کے لیے بلائے جانے والے امیدواروں کو بطور T.A. ریلوے سکنڈ کلاس کا یک طرفہ کرایہ ادا کیا جائے گا۔

درخواست کے مطلوبہ فارم اور ہدایات علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کے رجسٹرار آفس کے اسسٹنٹ رجسٹرار (سلیکشن کمیٹی) کے دفتر سے ۵ روپیہ نقد ادائیگی (مسلم یونیورسٹی کے فائننس آفس کے کیش سیکشن میں جمع شدہ) یا فائننس آفیسر مسلم یونیورسٹی کے نام واجب الادا اسی قیمت کے انڈین پوسٹل آرڈر بھیج کر ذاتی طور پر یا ۱۰/ + ۲۳ سم کا ایسا لفافہ جس پر خود کا پتہ تحریر ہو بھیج کر حاصل کی جا سکتی ہیں۔ درخواست موصول ہونے کی آخری تاریخ ۲۱ اکتوبر ۱۹۸۳ء ۴ بجے سہ پہر تک ہے۔

نامکمل اور تاخیر سے موصول ہونے والی درخواستوں پر غور نہیں کیا جائے گا۔

نوٹ:۔ موزوں امیدواروں کو مستقبل میں ہونے والے تقررات کے لیے بنائے گئے پینل میں رکھا جا سکتا ہے۔

ضمیر احمد خاں

رجسٹرار

مونوٹو سلف ۔ نور الحسن نقوی ۔۔۔ مطبوعہ [illegible]

کیا
آپ کی روزانہ کی خوراک سے
آپ کے بدن کو پوری قوّت اور
پورا فائدہ ملتا ہے؟

اپنی روزمرّہ خوراک سے صحیح تغذیہ حاصل کرنا
اِس بات پر منحصر ہے کہ آپ کا نظامِ ہضم کتنا
ٹھیک اور طاقتور ہے۔

سنکارا ہی ایک ایسا ٹانک ہے جس میں
طاقت دینے والے ضروری وٹامنوں اور معدنی
اجزاء کے ساتھ چھوٹی الائچی، لونگ، دھنیا،
دار چینی، تیزپات، تلسی وغیرہ جیسی چودہ ۱۴ جڑی
بوٹیاں شامل ہیں۔ اِس مرکّب سے آپ کے
نظامِ ہاضمہ کو طاقت ملتی ہے اور آپ کا بدن
اس کی مدد سے آپ کی روزمرّہ خوراک سے
صحیح تغذیہ اور بھرپور قوت حاصل کرتا ہے۔

سنکارا

ہر موسم اور ہر عمر میں
سب کے لیے بےمثال ٹانک

خاص خاص مطبوعات

اقبالیات

- کلیاتِ اقبال (اردو) — صدی ایڈیشن — -/۲۰
- اقبال معاصرین کی نظر میں — وقار عظیم — -/۵۰
- اقبال بحیثیت شاعر — رفیع الدین ہاشمی — -/۴۵
- اقبال کی اردو نثر — عبادت بریلوی — -/۲۰
- اقبال شاعر اور فلسفی — وقار عظیم — -/۲۰
- فکرِ اقبال — خلیفہ عبدالحکیم — -/۴۰
- اقبال فن اور فلسفہ — ڈاکٹر نورالحسن نقوی — ۷/۵۰
- تصوراتِ اقبال — مولانا صلاح الدین احمد — -/۱۵
- بانگِ درا عکسی — علامہ اقبال — -/۱۰
- بالِ جبریل عکسی — " — -/۸
- ضربِ کلیم عکسی — " — -/۸
- ارمغانِ حجاز اردو عکسی — " — ۴/۵۰

غالبیات

- غالب: تقلید اور اجتہاد — پروفیسر خورشید الاسلام — -/۳۰
- غالب: شخص اور شاعر — مجنوں گورکھپوری — -/۱۵
- دیوانِ غالب — نورالحسن نقوی — -/۱۳
- خطوطِ غالب کا فنی تجزیہ — حامد مسعود — -/۲۰
- اطرافِ غالب — ڈاکٹر سید عبداللہ — -/۲۰

فیض

- کلامِ فیض عکسی — فیض احمد فیض — -/۲۰
- نقشِ فریادی عکسی — " — -/۶
- دستِ صبا عکسی — " — -/۶
- زنداں نامہ عکسی — " — ۷/۵۰
- دستِ تہِ سنگ عکسی — " — -/۶

سرسید

- سرسید ایک تعارف — پروفیسر خلیق احمد نظامی — -/۲
- سرسید اور علی گڑھ تحریک — " — -/۴۴
- سرسید اور ہندوستانی مسلمان — ڈاکٹر نورالحسن نقوی — -/۲۰
- انتخاب مضامین سرسید — آل احمد سرور — -/۶
- مطالعہ سرسید احمد خاں — عبدالحق — -/۱۵

لسانیات و جمالیات

- اردو لسانیات — ڈاکٹر شوکت سبزواری — -/۱۲
- اردو زبان و ادب — ڈاکٹر مسعود حسین خاں — ۱۲/۵۰
- جمالیاتِ شرق و غرب — پروفیسر ثریا حسین — -/۱۵
- ادب میں جمالیاتی اقدار — ڈاکٹر ظہیر احمد صدیقی — -/۱۰

مثنوی

- اردو مثنوی کا ارتقا — عبدالقادر سروری — ۱۲/۵۰
- انتخاب مثنویاتِ اردو — مغیث الدین فریدی — -/۶
- مثنوی گلزارِ نسیم — ظہیر احمد صدیقی — -/۶
- مثنوی سحرالبیان — " — -/۶

افسانے و ناول

- چار ناولٹ — قرۃ العین حیدر — -/۳
- روشنی کی رفتار — قرۃ العین حیدر — -/۳۰
- آخری شب کے ہمسفر (ناول) — " — -/۵۰
- ایک دن بیت گیا (ناول) — صلاح الدین پرویز — -/۴۰
- سارے دن کا تھکا ہوا پُرش (ناول) — " — -/۳۱
- چوٹیں — عصمت چغتائی — -/۲۰
- ضدی — " — -/۱۲
- ہمارے پسندیدہ افسانے — مرتبہ: ڈاکٹر اطہر پرویز — -/۱۵
- بیدی اور بیدی کے افسانے — " — -/۱۵
- کرشن چندر اور کرشن چندر کے افسانے — " — -/۱۵
- اردو کے تیرہ افسانے — " — -/۱۲
- منٹو کے نمائندہ افسانے — " — -/۱۲
- پریم چند کے نمائندہ افسانے — مرتبہ: ڈاکٹر قمر رئیس — -/۱۲
- نمائندہ مختصر افسانے — مرتبہ محمد طاہر فاروقی — -/۶

ڈرامے

- اردو ڈراما کا ارتقا — عشرت رحمانی — -/۴۰
- اردو ڈراما: تاریخ و تنقید — " — -/۲۰
- یونانی ڈراما — عتیق احمد صدیقی — -/۲۰
- آغا حشر اور اردو ڈراما — انجمن آرا — -/۲۰
- انارکلی — مقدمہ: ڈاکٹر محمد حسن — -/۹

ادب و تنقید

- مضامینِ نو — خلیل الرحمٰن اعظمی — -/۲۵
- تنقیدیں — پروفیسر خورشید الاسلام — -/۳۰
- شناسا چہرے — ڈاکٹر محمد حسن — -/۱۵
- ادبی تحقیق مسائل و تجزیہ — رشید حسن خاں — -/۲۵
- تنقیدی تناظر — ڈاکٹر قمر رئیس — -/۲۰
- پریم چند شخصیت اور کارنامے — " — -/۳۵
- احساس و ادراک — ڈاکٹر ظہیر احمد صدیقی — -/۲۲
- انیس شناسی — ڈاکٹر فضل امام — -/۱۶
- چہرہ بہ چہرہ — ڈاکٹر ابنِ فرید — -/۲۵
- میں، ہم اور ادب — " — -/۲۰
- غزل کا نیا منظر نامہ — شمیم حنفی — -/۱۰
- غزل اور درسِ غزل — اختر انصاری — -/۸
- اردو قصیدہ نگاری — ڈاکٹر ام ہانی اشرف — -/۳۵
- کلاسیکیت اور رومانیت — " — -/۱۲
- نثر، نظم اور شعر — منظر عباس نقوی — ۷/۵۰
- شیخ الہند محمود الحسن حیات اور کارنامے — ڈاکٹر اقبال حسن خاں — -/۳۰
- ناول کا فن — ابوالکلام قاسمی — -/۱۵
- اردو ادب کی تاریخ — عظیم الحق جنیدی — -/۹
- موازنہ انیس و دبیر — مقدمہ: ڈاکٹر فضل امام — -/۱۲
- مقدمہ شعر و شاعری — مقدمہ: ڈاکٹر وحید قریشی — -/۱۲
- امراؤ جان ادا — مقدمہ: تمکین کاظمی — -/۱۲
- مجموعہ نظمِ حالی — مقدمہ: ڈاکٹر ظہیر احمد صدیقی — ۷/۵۰
- مولوی نذیر احمد کی کہانی — مرزا فرحت اللہ بیگ — ۳/۷۵
- آج کا اردو ادب — ڈاکٹر ابواللیث صدیقی — -/۱۶
- جدید شاعری — ڈاکٹر عبادت بریلوی — -/۲۵
- غزل: مطالعہ غزل — ڈاکٹر عبادت بریلوی
- داستان سے افسانے تک — وقار عظیم
- نیا افسانہ — "
- شہرت کی خاطر — نظیر صدیقی
- تنقید اور احتساب — ڈاکٹر وزیر آغا
- ستارہ یا بادبان — محمد حسن عسکری
- انسان اور آدمی — "
- اسلوب — سید عابد علی عابد
- قرۃ العین حیدر اور ناول — پروفیسر عبدالسلام
- مرزا رسوا اور تہذیبی ناول — "
- تنقیدی دبستان — سلیم اختر
- تحقیقی و تنقیدی مطالعہ باغ و بہار — "
- باغ و بہار تحقیق و تنقید کے آئینے میں — "
- منٹو کا فن
- آبِ حیات کا تنقیدی و تحقیقی مطالعہ — سید سجاد
- مقدمہ آبِ حیات — مولانا محمد حسین آزاد
- تنقید و تبصرہ امراؤ جان ادا — ڈاکٹر ابواللیث صدیقی
- جیل — منشی پریم چند
- حسرت موہانی — طلعت سلطانہ

سیاسیات و تاریخ

- دنیا کی حکومتیں (ورلڈ کانسٹی ٹیوشن) — محمد ہاشم قدوائی
- تاریخ افکار سیاسی (ہسٹری آف پولیٹیکل تھاٹ) — "
- جمہوریہ ہند (کانسٹی ٹیوشن آف انڈیا) — "
- مبادی سیاسیات (ایلیمنٹس آف پالیٹکس) — "
- مبادیات علمِ معیشت (ایلیمنٹس آف اکنامکس) — "
- تاریخ تہذیبِ عالم (ورلڈ ہسٹری) — اے۔ اے۔ ہاشمی

متفرق

- ایڈوانسڈ اکاؤنٹس — ڈاکٹر محمد عارف خاں
- جدید تعلیمی مسائل — ڈاکٹر ضیاء الدین علوی
- اصولِ تعلیم — "
- عام معلومات
- ایجادات کی کہانی — "
- رہبرِ صحت — مسرت زمانی
- تعلیمی نفسیات کے نئے زاویے — "
- علمِ خانہ داری — "
- بچوں کی تربیت — "
- گلدستۂ مضامین و انشاپردازی — ڈاکٹر محمد عارف خاں
- اردو صرف — ڈاکٹر انصار اللہ
- اردو نحو — "
- فیروز اللغات جیبی (عکسی)
- فیروز اللغات اردو جدید (ریگزین)
- اردو سیکھئے (ہندی کے ذریعہ اردو سیکھئے)
- انگلش ٹرانسلیشن کمپوزیشن اینڈ گرامر — ایم اے بتھید

ایجوکیشنل بک ہاؤس۔ مسلم یونیورسٹی مارکیٹ علی گڑھ

پندرہ روزہ
تہذیب الاخلاق
علی گڑھ
جلد ۲ * یکم نومبر ۱۹۸۳ء * شمارہ ۲۱

مندرجات :

آفتابِ تازہ پیدا بطنِ گیتی سے ہُوا

آسماں ڈوبے ہوئے تاروں کا ماتم کب تلک

تہذیب الاخلاق ملنے کے پتے

ایجوکیشنل بک ہاؤس، شمشاد مارکیٹ، علی گڑھ
مکتبہ جامعہ، اُردو بازار دہلی، پرنسز مارکیٹ بمبئی۔
شمشاد مارکیٹ، علی گڑھ
محب بک ڈپو، پوسٹ بکس ۶۱۲۰۱۶ بمبئی ۳
بک امپوریم، سبزی باغ پٹنہ، ۴
مسکین بک ڈپو، موتی ڈونگری روڈ، جے پور۔ ۴
شمع بک اسٹال، اسٹیشن روڈ، مظفر پور
محمد الیاس نیوز ایجنسی، ۹۱ کولوٹولہ اسٹریٹ کلکتہ ۔ ۷۳
اسماعیلیہ بک ڈپو، نیو مارکیٹ، تاتار پور چوک، بھاگلپور۔
سکندر نیوز ایجنسی، پہلاپُل، لال چوک، سری نگر۔
ایم۔آئی۔مرزا۔ مدار نیوز پیپر ایجنٹ، بیجاپور
زینت اُردو نیوز ایجنسی، پرانا محلّہ ڈنڈیلی
جمال بک ڈپو باری روڈ، گیا۔
بنگلور بک ہاؤس، کلاسی پلیم، مین روڈ، بنگلور
نصرت بک ایجنسی، انجمن بلڈنگ، ہبلی۔
حفیظ بک ڈپو، جمال منزل، وارث پورہ، کامٹی
حنیف بک ڈپو، مومن پورہ ناگ پور
سینٹرل نیوز ایجنسی لمٹیڈ ۹۰/۲۳، کناٹ سرکس، نئی دہلی
شاکر بک ڈپو، بین مارکیٹ امروہہ
انوار بک ڈپو، شمشاد مارکیٹ، علی گڑھ

★

قیمت فی پرچہ .... ایک روپیہ
سالانہ .... بیس روپے

بیرونِ ہند سے

فی شمارہ .... ایک ڈالر
سالانہ .... پندرہ ڈالر

★

رابطہ :

نور الحسن نقوی

شعبۂ اُردو، علی گڑھ مسلم یونیورسٹی، علی گڑھ

★

ترسیلِ زر کا پتہ :

منظر عبّاس نقوی

شعبۂ اُردو، علی گڑھ مسلم یونیورسٹی، علی گڑھ

★

اداریہ

تہذیب الاخلاق کے پچھلے چند شماروں میں ہندوستانی مسلمانوں کی تعلیمی اور اقتصادی حالت کے سلسلے میں متعدد مضامین شائع ہوئے ہیں ان کے مطالعے سے اندازہ ہوتا ہے کہ زندگی کی دوڑ میں ہم ابھی تک اپنے دوسرے ہم وطنوں سے بہت پیچھے ہیں۔ ایک مقالہ نگار نے تو یہاں تک کہا ہے کہ ہمارے اور ہم سے آگے نکل جانے والوں کے درمیان آج بھی اتنا ہی فاصلہ ہے جتنا سر سید کے زمانے میں تھا بلکہ مالی حالت تو اس زمانے سے بدتر ہے۔

۱۸۵۷ء میں ہندوستان کے مسلمانوں کو ایک قیامت کا سامنا تھا۔ اس کی تباہی سے سنبھلنے میں کم و بیش آدھی صدی صرف ہو گئی تھی اور اس وقت جبکہ قوم کو سرسید جیسا غم خوار اور دور اندیش راہنما میسر تھا جسے نہ دن کو چین تھا نہ رات کو آرام اور جس کی ساری زندگی اس کوشش میں بسر ہو گئی کہ مسلمانوں کا کھویا ہوا وقار کسی طرح بحال ہو جائے۔ یہ وقار بحال ہوا بھی مگر صرف نصف صدی کے لیے کہ ۱۹۴۷ء میں ایک اور قیامت ہندوستانی مسلمانوں کی منتظر تھی۔ یہ پہلے سے کہیں زیادہ ہولناک تھی۔

آزادی کے بعد ملک کی آبادی میں مسلمانوں کا تناسب گر کے پہلے سے بہت کم رہ گیا تھا، آسودہ حال اور تعلیم یافتہ گھرانوں نے ملک کو خیرباد کہہ دیا تھا، اکثریت ان سے بدگمان تھی اور سب سے بڑا ستم یہ کہ مسلسل فسادات سے ان کے قدم ڈگمگا رہے تھے۔ کسی کو خبر نہ تھی کہ جان، مال اور عزت کے تحفظ کے لیے کب رخت سفر باندھنا پڑے۔ کسی سے گلہ شکوہ کرنے کی مجال بھی نہ تھی کہ زبان کھولے بغیر طرح طرح کے طعن سننے پڑتے تھے۔ ایک ہی بات تھی جو ہر ایک کو بار بار سننے کو ملتی تھی کہ تمہارا یہاں کیا کام تمہاری جگہ تو کہیں اور ہی ہے۔ ایسے میں سرسید تو کیا ان سے دس گنا کم قد کا بھی رہبر نصیب نہ تھا۔ محسوس ہوتا تھا کہ یہ قوم اب کبھی نہ سنبھل سکے گی، کبھی نہ پنپ پائے گی۔ مسلمانوں کے بہت سے تعلیمی ادارے بند ہو گئے تھے اور جو گنتی کے چھوٹے چھوٹے کارخانے تھے ان میں سے اکثر جل کے راکھ ہو چکے تھے۔ یہ قوم اگر خود اعتمادی سے ہاتھ دھو بیٹھتی اور حوصلہ کھو بیٹھتی تو اس میں حیرت کی کیا بات ہے۔ اس کی جگہ کوئی اور قوم ہوتی تو عجب نہیں اپنا دین بھی گنوا دیتی۔

ہم تجارت میں، دولت میں، صنعت و حرفت میں، تعلیم میں اپنے ہم وطنوں سے پیچھے ہیں، بے شک ہیں لیکن شکر ہے کہ ہم ایک دریائے خون سے سلامت گزر گئے ہم میں خود اعتمادی پیدا ہوئی ہے۔ اور ماننا پڑے گا کہ ہم آگے بڑھے ہیں اور برابر بڑھ رہے ہیں۔ رفتار بے شک آج دھیمی ہے مگر کل یقیناً تیز ہوگی۔ ہم اپنے مستقبل سے مایوس نہیں ہیں۔ اپنے ہم وطنوں کو یہ یقین دلانے میں ہمیں کامیابی ہوئی ہے کہ اس وطن میں ہمارا برابر کا حصہ ہے۔ ہمیں مٹایا نہیں جا سکتا، نکالا نہیں جا سکتا۔ ہمارے گھروں اور کارخانوں کو آگ لگے گی تو یہ ملک پچھڑے گا۔ ہم خوشحال ہوں گے تو ملک کی خوشحالی میں اضافہ ہوگا کہ ہم ملک کی دوسری بڑی اکثریت ہیں۔

ماضی کے قصے بہت دنوں سن سنا لیے، اپنی بے کسی اور پسماندگی کا ماتم بہت ہو لیا۔ اب کچھ کر گزرنے کا وقت ہے اور قوم کو ایسے دردمندوں کی ضرورت ہے جو صحیح معنی میں رہبری کر سکیں۔ ایسے خود غرض اور مفاد پرست تو بہت ہیں جو کھوکھلی اور دھواں دھار قسم کی تقریروں سے سننے والوں کا لہو گرما سکتے ہیں اور اس جوشیلی قوم کے جذبات سے کھیل سکتے ہیں لیکن ہم میں ایسا بھی کوئی ہے جو ہماری منزل کا پتہ دے! ہیں اور ضرور ہیں جو صلہ وستائش سے بے نیاز، حوصلہ شکنی اور نکتہ چینی سے بے پروا ملک کے مختلف گوشوں میں چپ چاپ اپنا فرض ادا کر رہے۔ ہمارا فرض ہے کہ ان کی ہمت بندھائیں اور ان کا ہاتھ بٹائیں۔ یہ بھی ضروری ہے کہ ان بکھری ہوئی کوششوں میں ربط پیدا کیا جائے۔ اور انہیں مرکزیت دی جائے۔ علی گڑھ مسلم یونیورسٹی اور ہمدرد فاؤنڈیشن کے بزنس اینڈ امپلائمنٹ بیورو کے اشتراک عمل سے دہلی اور علی گڑھ میں جو دو سیمینار ہوئے ان کا مقصد اسی ضرورت کو پورا کرنا تھا۔ ان سیمناروں میں جو تجویزیں منظور ہوئیں، خدا کرے وہ جلد عملی شکل اختیار کریں۔

اس سلسلے کا سب سے پہلا کام سروے ہونا ہے اور اس کے لیے کارکنوں کی ضرورت ہوتی ہے لیکن اس کام میں تاخیر مضر ہے اس لیے ہم سبھی کو اپنا فرض سمجھ کے یہ خدمت انجام دینی چاہیے۔ اگر آپ صنعت و تجارت سے دلچسپی رکھتے ہیں تو اپنے علاقے کے صنعتی و تجارتی اداروں سے متعلق اور اگر تعلیم سے متعلق ہیں تو تعلیمی اداروں کے بارے میں اعداد وشمار فراہم کیجیے، ان اداروں کے مسائل پر غور کیجیے اور انہیں اشاعت کی غرض سے تہذیب الاخلاق کو مرحمت فرمائیے۔ جہاں جہاں ممکن ہے ادارہ اپنے طور پر معلومات فراہم کر رہا ہے جیسے تہذیب الاخلاق کے صفحات پر پیش کیا جاتا رہیگا۔ رسالہ کم سے کم یہ خدمت تو انجام دے ہی سکتا ہے کہ تعلیمی، صنعتی، تجارتی اداروں کے مسائل کو اپنے صفحات پر جگہ دے اور ماہرین ان کے جو حل تجویز کریں انہیں بھی شائع کرتا رہے تاکہ دشواریوں پر قابو پانے میں کسی حد تک تو مدد ملے۔

اور اب ان مسائل کے ساتھ ساتھ ذرا سا اس رسالے کے مسائل پر بھی غور فرما لیجیے۔ پچھلے دو شماروں سے اس کی تعداد اشاعت میں کافی اضافہ ہوا ہے اور اب اسے فوٹو آفسیٹ سے چھاپا جا رہا ہے۔ طباعت کا خرچ بڑھ جانے کے باوجود قیمت میں اضافہ نہیں کیا گیا، ادارے کو کافی خسارہ برداشت کرنا پڑ رہا ہے۔ رسالے کی قیمت لاگت سے نصف بلکہ اس سے بھی کم ہے۔ اس خسارے کو پورا کرنے کی صرف دو تدبیریں ہیں۔ عطیات و اشتہارات۔ کوشش کی جائے گی کہ انہی تدبیروں سے خسارہ پورا کیا جائے اور قیمت میں اضافہ نہ کرنا پڑے۔

لیکن ایک مسئلہ اور ہے۔ بہت سے حضرات اور بہت سے اداروں کو مہینوں سے پابندی کے ساتھ یہ رسالہ اس توقع پر بھیجا جا رہا تھا کہ وہ رسالے کے اغراض و مقاصد سے متفق ہوں اور اس کی اہمیت کا احساس ہو تو شاید اس کی سرپرستی بھی فرمائیں اور قیمت ادا کر دیں۔ بہتوں نے یہ کیا بھی لیکن جن کی توجہ سے رسالہ محروم رہا ان کی تعداد بھی کم نہیں۔ جو اصحاب کسی رسالے کی قیمت ادا نہیں کرتے ان سے یہ توقع بھی کم ہی ہے کہ وہ اس کی ورق گردانی بھی کر لیتے ہوں گے۔ اس کا ایک اور پہلو بھی ہے۔ بہت سے لوگوں نے رسالہ کہیں دیکھ کر پسند کیا تو کسی بک اسٹال سے حاصل کرنے کی کوشش کی یا ہم سے فرمائش کی لیکن ہم تعمیل سے قاصر رہے کیونکہ پچھلے دونوں شمارے ختم ہو گئے اور اب اسٹاک میں بالکل موجود نہیں ہیں۔ گویا جن اصحاب نے رسالہ حاصل کر کے پڑھنا چاہا وہ محروم رہ گئے۔

اسی طرح جن اصحاب کی مدت خریداری ختم ہو چکی اور یاد دہانی کے باوجود انھوں نے توجہ نہیں فرمائی انہیں بھی رسالہ بھیجنا بند کیا جا رہا ہے۔

تہذیب الاخلاق کا زرسالانہ بیس روپے ہے لیکن فتری کارروائی سے نجات پانے، بار بار خط لکھنے اور یاد دہانی ے بھیجنے نیز اسے مستحکم کرنے کے خیال سے مستقل رکنیت کا ایک منصوبہ تیار کیا گیا ہے یعنی تہذیب الاخلاق کے اغراض و مقاصد سے دلچسپی رکھنے والے حضرات اس کا لائف ممبر بنا قبول فرمائیں اور اپنے بجٹ اور حوصلے کے مطابق زیادہ سے زیادہ جو رقم چاہیں ادارے کو مرحمت فرمائیں لیکن لائف ممبر بننے کے لیے کم سے کم دو سو روپے ادا کرنے ہوں گے و سو سو روپے کی دو قسطوں میں بھی ادا کیے جا سکتے ہیں۔ سلم یونیورسٹی سے متعلق اصحاب یہ رقم بالاقساط اپنی نخواہوں سے وضع کرا سکتے ہیں۔

جن اداروں کو تہذیب الاخلاق اب تک بلا قیمت بھیجا جاتا رہا ہے ان کے ذمہ داران بھی زرسالانہ ادا کرنے کی طرف توجہ ہوں لیکن جن اداروں کی مالی حالت اس کی متحمل نہیں ہو سکتی وہ از راہ کرم مطلع فرمائیں تاکہ رسالہ جاری رکھنے کی ئی تدبیر کی جا سکے۔

نور الحسن نقوی

کمالِ انسانیت

عافیت و آبرو، ثروت و اقتدار کے بجائے تواضع اور تحمل پر موقوف ہیں۔ چونکہ انسانی معاشرے میں ہمہ وقت کے اختلاط کے باعث شعوری یا غیر شعوری طور پر قلبی و ذہنی اذیت ناگزیر ہے، لیکن جذبۂ انتقام سے اس میں تخفیف کے بجائے اضافہ ہی ہوتا ہے اور انسان کی منفرد تعمیری صلاحیتیں بتدریج اضمحلال کا شکار ہو کر فنا ہو جاتی ہیں۔ چنانچہ اس مزمن مرض میں مبتلا ہو کر انسانی صفات کا بیش قیمت سرمایہ ضائع ہو جاتا ہے اور عالمی سطح پر اُبھرنے والی عدیم المثال صلاحیتیں سوزشِ انتقام سے خاکستر ہو جاتی ہیں۔

کمالِ انسانیت یہ ہے کہ آدمی اس بہیمی صفت کے خاردار جنگل سے دامن بچا کر نکل جائے اور دائمی اذیت کوشی کے بجائے عارضی کلفت پر قناعت کرے۔

یہ قاعدہ کلیہ ہے کہ درخت بار آور ہو کر جھک جاتا ہے۔ چنانچہ درخت کثرتِ ثمر سے سجدہ ریز ہو جاتا ہے اور اگر کوئی ڈھیلا مارے تو پھل دیتا ہے۔ اور ایمان کی بات یہ ہے کہ شجرِ بے ثمر پر ڈھیلا ہی کون مارتا ہے۔

اگر آدمی واقعی اپنی منفرد اور لازوال صلاحیتوں کو بروئے کار لانا چاہتا ہے تو فرضی حریف سے سلام میں سبقت کرے، غیبت میں اس کے واقعی فضائل بیان کرے اور وقتاً فوقتاً ہدایا پیش کرے۔ تو یہ حقیقت مشاہد ہو کر رہے گی کہ وہ جسے اپنا دشمن خیال کرتا تھا وہ درحقیقت اس کا سچا بہی خواہ اور جانثار دوست ہے۔

(ڈاکٹر نادر علی خاں)

سید حامد

خطا کس کی ہے؟

۱۵؍ اگست کے گارجین نے ایران اور عراق کی لڑائی کا اعتراف اداریہ سے کیا ہے۔

" یہ لڑائی شروع ہوئی اور ختم ہونے میں نہیں آرہی، صرف اِس وجہ سے کہ دو ضدی آدمی آیت اللہ خمینی اور صدّام ایک دوسرے کو ایک آنکھ نہیں بھاتے۔ لیکن لڑائی سے اتنا زبردست نقصان ہرگز نہ ہوتا، اگر دوسرے ممالک نے ہتھیار نہ بھیجے ہوتے۔ لہذا اِس بڑے نقصان کی ذمّہ داری خلیج تک محدود نہیں ہے۔ امریکہ اور روس نے اپنی حکمتِ خارجہ کا ایک اہم اوزار اسلحہ کی فروخت کو بنا رکھّا ہے..... "سپری"

The Stockholm International Peace Research Institute کے جمع کیے ہوئے اعداد و شمار بتاتے ہیں کہ ان دونوں ممالک کے ہتھیاروں کی فروخت کا زیادہ حصّہ تیسری دنیا کی قسمت میں لکھا ہے۔ روس دنیا بھر میں بکنے والے کل اسلحہ کا ۶۰ فی صد اور امریکہ ۵۶ فی صد ترقی یافتہ ممالک کو بیچتا ہے۔ امریکہ کے اسلحہ کے گاہکوں کی تعداد روس کے گاہکوں سے تین گنی زیادہ ہے اور سوویت روس اسلحہ بھیجنے والے ممالک میں اوّل ہے۔ اس سے یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ روس کے گاہک، جن میں عراق بھی شامل ہے، بہت بڑی مقدار میں اسلحہ خرید لیتے ہیں۔ اسلحہ برآمد کرنے والوں میں تیسرا نمبر فرانس کا اور چوتھا نمبر برطانیہ کا ہے ۱۹۷۸ سے ۱۹۸۲ء تک سب سے زیادہ اسلحہ خریدنے والے ممالک میں سے ۷، مشرقِ وسطیٰ میں تھے۔ عرب ممالک میں واقعات کی ترتیب کچھ اس طرح ہے۔ پہلے اسلحہ خرید لو، پھر اُن کے استعمال کی صورت نکالو فرانس عراق کو میزائل بھیجنے والا ہے۔ ان کے ہدف خلیج میں پٹرول کے ٹینکر ہوں گے۔

یہ کہنا تو مبالغہ ہوگا کہ تیسری دنیا میں جہاں کہیں لوگوں پر بپتا پڑتی ہے، وہ مغربی ممالک کے اسلحہ کی فروخت کی وجہ سے لیکن لڑائی کا پیمانہ اور اس کی مدّت اور اس کے لائے ہوئے عذاب کا سرا براہِ راست ان ترقی یافتہ ہتھیاروں سے جوڑا جا سکتا ہے۔ جو انھیں فراہم کیے گئے ہیں۔ ترقی یافتہ ممالک اسلحہ کی فروخت سے خود اپنے اسلحہ اندوزی کے پروگرام کو کمک پہونچا رہے ہیں ایٹمی لڑائی دائرہ امکان تک محدود ہے لیکن روایتی انداز کی لڑائیاں دنیا میں جا بجا ہو رہی ہیں..... بے شمار انسان لڑائی کا

اره بن رہے ہیں اور دنیا مطمئن نظر آرہی ہے۔"
مندرجہ بالا اقتباس میں مسلمانوں کے لیے عبرت کا سرمایہ
۔ ہمارا دعویٰ ہے کہ اسلام کامل ترین دستورِ حیات ہے۔
اخوت اور مساوات، رافت اور رحمت، اتحاد اور خیر کا پیام
کر آیا۔ اپنے گریباں میں منھ ڈالیے اور بتائیے کہ ان میں سے
ئی وصف بھی اب ہمارے اندر نظر آتا ہے۔ ہم آپس میں لڑے
تے ہیں۔ ہم نے خود کو خبائث میں گلے گلے مبتلا کر رکھا ہے۔ تعیش
ارا شیوہ ہے جہالت اور بد اخلاقی ہمارا وطیرہ۔ عراق
ور ایران آپس میں دست وگریباں ہیں، اس پر مُصر ہیں کہ
ک دوسرے کو تباہ کر دیں۔ ہندوستان اور پاکستان کے
عض شہروں میں سنی اور شیعہ ایک دوسرے کا گلا کاٹنے کو سرمایۂ
فخرت سمجھ رہے ہیں۔ دنیا کے باشندے کیا نتیجہ نکالیں گے
ور اہلِ ہند مسلمانوں کے متعلق کیا رائے قائم کریں گے۔ کاش
ملمان یہ سمجھیں کہ اس وقت بظاہر ان میں کوئی خوبی
یسی نہیں ہے جس کی بنیاد پر یہ نتیجہ نکالا جاسکے کہ وہ دنیا
ں باقی رہیں گے یا عزت کے ساتھ دیکھے جائیں گے۔

گارجین نے تسلیم کیا ہے کہ آگ پر تیل ترقی یافتہ ممالک
ڑک رہے ہیں۔ اس سے مسلمانوں کی ذمہ داری کم نہیں
رتی۔ اغیار تو تیل چھڑکیں گے ہی۔ ہم انھیں ایسا کرنے کا
۔قع کیوں دے رہے ہیں۔ کیا یہ ملت عقل وشعور، غیرت
ر حمیت، اتفاق اور اتحاد، اخلاق اور کردار کے لحاظ سے بالکل
الیہ ہو گئی ہے۔

یہ کہنے سے کام نہیں چلے گا کہ دنیا میں دوسرے مذاہب
مانے والے بھی تو برائیوں میں مبتلا ہیں، ان کے یہاں
بھی جہالت اور نا اتفاقی ہے۔ لیکن اس شدت سے کہاں
ہے اور ان کے یہاں تاویل کی گنجائشیں کتنی ہیں۔ اسلام کا
مذہب اس قدر واضح ہے کہ اعمال میں انحراف کی ساری راہیں
اس کے ماننے والوں کے لیے بند ہو گئی ہیں اور کڑے احتساب کی ساری
راہیں کھل گئی ہیں۔ مسلمان اور سب کچھ بھول کر صرف جہالت اور نفاق
کی گرد اپنے دامن سے جھاڑ دیں تو وہی نہیں، ساری دنیا بدل جائے
کیونکہ سر دست انھوں نے اپنی غفلت اور بداعمالی کی نقاب اسلام
کے روئے زیبا پر ڈال رکھی ہے۔ جو کوئی انھیں دیکھتا ہے، اسلام
کے متعلق حقارت انگیز رائے قائم کرتا ہے۔ ★★

تشریف آوری اور اشتیاق

گذشتہ مہینے میں برادر محترم جناب سید محمد حامد صاحب (علیگ) وائس چانسلر علی گڑھ مسلم یونیورسٹی پاکستان کے مختصر دورے پر اپنے اعزاء احباب سے ملنے تشریف لائے تھے۔ برادر موصوف نے راولپنڈی اور لاہور میں مختصر قیام فرمایا۔ پنڈی کے علیگ برادران لاہور والوں سے زیادہ خوش نصیب تھے کہ وہ یہاں کے مقابلے میں وہاں زیادہ دیر مقیم رہے اور پنڈی کی اولڈ بوائز ایسوسی ایشن کے صدر جنرل شاہد حامد صاحب نے موصوف کے اعزاز میں مشاعرہ اور ڈنر کا اہتمام کیا۔ سید حامد صاحب محترم نے اس محفل میں مختصر تقریر کرتے ہوئے بھارت کی تعلیمی سرگرمیوں کے علاوہ خصوصیت سے مسلم یونیورسٹی کے جدید ترقیاتی منصوبوں کا ذکر فرمایا۔ پنڈی سے ہی بھائی چودھری محمود علی خاں (علیگ) نے اس محفل کے انعقاد کی اطلاع فرمائی۔ لاہور میں دو تین گھنٹے کے دوران قیام صرف چند اراکین نے نیا گڑھ پبلک اسکول گلبرگ میں سید صاحب کا خیر مقدم کیا۔ باقی دوسرے اراکین مشتاق و محروم رہ گئے! یار زندہ صحبت باقی۔

(ماہنامہ تہذیب الاخلاق - لاہور)

شرکائے شبستاں

خوشہ چیں اخبار کی ورق گردانی کر رہا تھا۔ نظر ۸ اگست ۱۹۸۳ء کے "گارجین"[1] کی اس سرخی پر رُک گئی "بستر کے رفیق"۔ "رفیق" سے پہلے جو حرفِ اضافت استعمال ہوا ہے وہ صیغۂ جمع کی طرف اشارہ کرتا ہے۔ الٰہی خیر، خوشہ چیں نے اپنے دل میں کہا۔ کیا یہ کسی طوائف کی خود نوشت سوانح عمری ہے۔ طوائف کے متعلق انگریز کہتے ہیں کہ جو پیشہ وہ کرتی ہے وہ انسان کا سب سے دیرینہ پیشہ ہے۔ طوائف خود جمع کا صیغہ ہے۔ جمع بھی طائفہ کی، خود طائفہ بھی اسم اجتماعی ہے۔ خوشہ چیں کے فرشتوں کو بھی خبر نہیں کہ شاہدِ بازاری کو طوائف کیوں کہنے لگے۔ شاید اسے یہ نام خریداروں اور پرستاروں کی کثرت سے ملا ہے۔ سُرخی دیکھ کر دلچسپی تو محسوس کی۔ حیرت زیادہ نہیں ہوئی کیونکہ بک اسٹالوں پر نظر ڈالیے تو اس قسم کے اعترافات پر مشتمل بہت سی مصوّر کتابیں دکھائی دیتی ہیں۔ قارئین ان کتابوں کو بڑی دلچسپی کے ساتھ پڑھتے ہیں کہ انھیں اس طرح تھوڑی بہت دادِ ناکردہ گناہوں کی حسرت کی مل جاتی ہے۔ کبھی کوئی طوائف اور کبھی کوئی اعلیٰ سوسائٹی میں اٹھنے بیٹھنے والی عورت اپنی خود سپردگی کی داستانیں دہراتی ہے اور کبھی کوئی حیا باختہ مرد اپنی فتوحات کی کہانی سناتا ہے۔

لیکن خوشہ چیں کا اطمینان ایک سطر سے آگے نہ بڑھا۔ پتہ چلا کہ ایک خاتون "سُو ہبرڈ"[2] بہ کمال سنجیدگی اس مسئلہ پر غور کر رہی ہیں کہ وہ عورتیں جن کے شوہر انھیں چھوڑ کر چلے گئے ہیں، اپنے جسم کی آگ کو کس طرح ٹھنڈا کریں۔ علیحدگی کے بعد عورت کی حیثیت صفر ہو جاتی ہے۔ بچے پریشان رہتے ہیں کہ باپ اچانک کہاں چلا گیا۔ وہ سوچتی ہے گھر چلانے کے لیے خرچ کہاں سے آئے گا۔ لیکن بالآخر وہ ان عبوری آزمائشوں سے عہدہ برآ ہو جاتی ہے۔ اب اسے مرد کی ضرورت پھر محسوس ہوتی ہے۔ شوہر چھوڑ کر چلا گیا ہے، بستر چھوٹ جاتا ہے۔ وہ نئی رفاقتیں ڈھونڈ نکالتا ہے۔ وہ جانتا ہے کہ بچوں کو اس کی حرکتوں کا پتہ بھی نہیں چلے گا اور ان کے نشوونما پر اس کی ان دراز دستیوں کا کوئی اثر نہ پڑے گا۔ بچے اس سے ملنے آئیں گے تو اپنے باپ کے کردار اور شہرت پر آوارگی کے داغ دکھائی نہیں دیں گے۔

لیکن ماں (جس کے پاس بالعموم ٹوٹے ہوئے گھر کے بچوں کی تحویل ہوتی ہے)۔ وہ اپنا غم کس طرح غلط کرے، اپنی تنہائی کس طرح کاٹے۔ ایسی مائیں کس روش پر چلیں، یہ جاننے کے لیے ہمارے پاس نہ روایات ہیں نہ سوابق۔

مضمون نگار صاحبہ آگے چل کر آنکھ جھپکائے بنا فرماتی ہیں

---

[1] انگلستان کا اخبار۔ Guardian.

[2] Sue Hubbard

کہ "میری طرح کی بہت سی عورتیں، جن کی عمر تیس اور چالیس کے درمیان ہے، صاف گوئی سے کام لینے لگی ہیں۔ وہ اپنے بچوں کو بتادیتی ہیں کہ انھیں بھی رفاقت، سہارے، اعتماد اور مضمراً جنسی تشفی کی ضرورت ہے۔ وہ اپنے عاشق کو اپنے شبستاں میں جگہ دے دیتی ہیں اور اس کی اجازت بھی کہ کبھی کبھی وہ ان کے ساتھ آکر گھر میں رہ جائے۔ لیکن یہ منزل تو بعد میں آتی ہے اس سے پہلے عارضی تعلقات کے مراحل کیسے طے ہوں کیونکہ اس طرح کے عارضی تعلقات میں سے ہی نسبتاً دیرپا غیر منکوحہ رفاقت کی راہ کھلتی ہے۔ میری دوستوں میں سے کئی ایک نے مجھے بتایا کہ وہ اپنے بچوں کو بے تکلفی اور بے حجابی کے ساتھ سب کچھ (بشمول جنسی ضرورت کے) بتادیتی ہیں۔ انھوں نے فخر کے ساتھ مجھ سے کہا کہ صبح کو جب ان کے بچے کسی غیر مرد کو ان کے بستر میں پاتے ہیں تو انھیں یہ بات ناگوار نہیں ہوتی انوکھی نہیں لگتی۔ لیکن اس بات کا اثر بچوں پر کیا پڑے گا۔ جب وہ پندرہ سولہ سال کے ہوں گے اور اپنے عاشقوں یا معشوقاؤں کو گھر لانے لگیں گے تو ماں انھیں کیسے سمجھا سکے گی کہ اس کے لیے ایک قاعدہ ہے اور بچوں کے لیے دوسرا۔ وہ مختلف مردوں کے ساتھ تجربہ کرسکتی ہے لیکن اس کی بیٹی صرف اسی لڑکے کو اپنے ساتھ لاسکتی ہے جس کے ساتھ اس کا ارادہ استقامت کے ساتھ جنسی اختلاط اور بالآخر شادی کا ہے"۔

محترمہ آگے چل کر کہتی ہیں کہ "غریب ماں کے لیے پھر چارۂ کار ہے کیا۔ کیا وہ اپنے بچوں کی خاطر وکٹورین عصر کی برف کی بنی ہوئی عورت بن جائے جو صنفی اور جذباتی ضروریات سے بالاتر ہے، سراپا ایثار اور جنسی تشفی سے بے نیاز، کیا وہ ہمیشہ چھپ چھپ کر لذت اندوز ہوتی رہے اور تازہ وارد شریکِ شبستاں کو جو خراٹے لے رہا ہے، بچوں کے جاگنے سے پہلے منہ اندھیرے اٹھا کر روانہ کردیا کرے۔

ایسی صورت میں اس بات کا کوئی امکان نظر نہیں آتا کہ وہ کوئی دیرپا تعلق قائم کرسکے۔ فاضل مضمون نگار نے بہت جبرت کے ساتھ لکھا ہے کہ بے چاری عورت بچوں کی خاطر یا تو مرد کی رفاقت سے بالکل کنارہ کش ہوجاتی ہے یا کسی ایسے تعلق کو جو دراصل اس کے لیے اطمینان بخش نہیں ہے دیرپا بنادیتی ہے"۔

خوشہ چیں نے یہ مضمون پڑھ کر اپنا سر پکڑ لیا کہ دنیا کہاں سے کہاں پہنچ گئی اور وہ اپنے دقیانوسی خول سے باہر نہ نکل سکا۔ کرشمہ ساز عقل نے حرام کاری کو جائز بنادیا۔ نکاح کی فرسودہ رسم کو متروک کردیا۔ گویا جس عورت کو شوہر نے چھوڑدیا اسے اختیار ہے کہ گھر کو ایک فرش اوپر لے جائے، بالاخانہ بنالے۔ اس کے سامنے مسئلہ یہ نہیں ہے کہ شادی کرے یا نہ کرے مسئلہ یہ ہے کہ روز ایک نئے مرد کو اپنے شبستاں میں جگہ دے یا کسی ایک مرد کو ایک معقول مدت کے لیے اپنا شریکِ حیات بنالے۔ سارا مضمون ناجائز تعلقات کے محور پر گردش کر رہا ہے۔ اور اس انداز سے کہ ان سے زیادہ معمولی اور جائز کوئی طرزِ عمل ہے ہی نہیں۔

اس اعتماد اور دلیری کو داد دیجیے کہ انفعال کا دور دور گزر نہیں۔ آخر انفعال کس بات کا۔ نکاح کی ضرورت کیا۔ انسان کے لیے ویسے ہی کیا کم پابندیاں ہیں کہ نکاح کی بیڑیاں بھی پاؤں میں ڈال لے۔ آزادی کے اس دور میں پابندی کی بات وہی کرے گا جسے غلامی عزیز ہوگی۔ ان

دقیانوسوں کو نہ ملک کی آزادی ایک آنکھ بھائی نہ ذہنوں کی آزادی۔ انسان کو تغیر پسند مزاج ملا ہے۔ ایک عورت ایک مرد پر قناعت کیونکر کرے اور کیا بچوں کا یہ حق نہیں ہے کہ جب صبح کو اٹھیں تو اپنی ماں کے بستر میں روز کسی نئے آدمی کو دیکھیں۔

اختلاط طلب عورت دوسری شادی کرنے سے گریز شاید اس لیے کر رہی ہے کہ اس کا مذہب طلاق کی اجازت نہیں دیتا۔ اور اس غریب کے ساتھ تو یہ ہوا ہے کہ وہ ہوا میں معلق رہی ہے۔ شوہر چلا گیا۔ دونوں علیحدہ ہیں۔ شوہر کی واپسی کا نہ امکان ہے نہ امید۔ ذرا دیر کو مان لیجیے کہ عیسائی مذہب نے طلاق کی اجازت دے بھی دی۔ اب سوال پیدا ہوگا کہ دوسری شادی کیوں کر ہو۔ کہ یہاں تو رسم یہ ہے کہ پہلے کورٹ شپ ہو، اس کے بعد شادی۔ اور کورٹ شپ کے بعد بھی شادی لازمی نہیں۔ ورنہ کورٹ شپ کی ضرورت کیا تھی۔ کورٹ شپ کا بنیادی اصول ہے تجرباتی تعلقات جن کا خاتمہ علیحدگی یا نکاح پر ہو۔ کورٹ شپ میں ردّ و قبول کا اختیار فریقین کو آخر وقت تک رہتا ہے۔ شادی سے پہلے کورٹ شپ، اور علیحدگی ہوگئی تو شادی کے بعد پھر کورٹ شپ، اور کورٹ شپ کو استوار کرنے کے لیے کورٹ شپ سے پہلے بے شمار چھوٹی چھوٹی یک روزہ کورٹ شپیں یا بدلتے ہوئے عاشقوں کے ساتھ شبستاں کی شرکت۔ بچے بھی ایک باپ سے گھبرا جاتے ہوں گے۔ انھیں بھی حق ہے کہ باپ کو صیغۂ جمع میں اپنی ماں کے گرد و پیش دیکھیں۔

"سو" صاحبہ کسی جنجال میں پھنس گئیں۔ اس مسئلہ کا آسان حل یہ ہے کہ شادی کی فرسودہ رسم کو جو عورتوں کی غلامی کی یاد دلاتی ہے یک قلم ترک کر دیا جائے۔ کوئی انسان ہے جو روز ایک ہی طرح کا کھانا خوشی سے کھاتا ہو۔ پھر جنسی تعلقات میں اس بے کیف — یکسانیت پر اتنا اصرار کیوں ہے۔

میاں خوشہ چیں سے جو اس بحث کو بہت دلچسپی کے ساتھ سن رہے تھے، رہا نہیں گیا۔ بول اٹھے کہ "تعدّدِ ازدواج میں کیا برائی تھی۔ طبائع میں اختلاف ہونے کے باوجود علیحدگی کی نوبت نہیں آتی تھی۔ عورت رسوائی اور بے حیثیتی سے بچ جاتی تھی۔ مرد بھی اسے گوارا کر لیتا تھا۔ گھر کا بھرم رہ جاتا تھا: بچے بھی باپ کے سایۂ عاطفت سے محروم نہ ہوتے تھے۔ اور انھیں یہ دن نہ دیکھنا پڑتا تھا کہ رات میں ہر روز ایک نیا شخص چور کی طرح ان کی ماں کے کمرے میں داخل ہو رہا ہے اور دن نکلنے سے پہلے گھر چھوڑ دیتا ہے"۔ اس ڈھب کی گفتگو کا انجام ظاہر ہے۔ سب لوگ میاں خوشہ چیں پر پل پڑے۔ وہ گت بنائی کہ انھوں نے ان محفلوں کی طرف پھر رخ نہیں کیا۔ جان انھیں بھی عزیز ہے۔ گرچہ گزر خوشہ چینی پر ہوتی ہے۔ انھیں فخر ہے کہ وہ کسی جمشید کے ساغر نہیں ہیں اور انھیں زعم ہے کہ جہاں بینی ان کی فطرت ہے۔ اسی جہاں بینی کی لاج رکھنے کے لیے انھوں نے جہاں گردی اختیار کی ہے۔ سارے عالم میں خوشہ چینی کرتے ہوئے گھومتے ہیں۔ واضح ہو کہ خوشہ چیں کوئی ٹکڑ ما گدا نہیں۔ وہ اپنی قوتِ بازو کی کمائی کھاتا ہے۔ جو غلّہ کسان اٹھا نہیں پاتا اسے خوشہ چیں اٹھا لیتا ہے۔ خوشہ چینی میں آرام سے گزر جاتی ہے۔ عافیت وہیں بگڑ جاتی ہے جب خوشہ چیں خوشہ چینی چھوڑ کر نکتہ چینی شروع کر دیتا ہے۔ ظالم، جاہل کہیں کا! ●●

ڈاکٹر محمد شریف خاں
ڈیپارٹمنٹ شعبۂ تعلیم، مسلم یونیورسٹی، علیگڑھ

اسلام میں تعلیم کی اہمیت

قرآن حکیم کی روشنی میں

ہندوستان کے عام مسلمانوں کی حالت دیکھ کر یہ احساس ہوتا ہے کہ ان کے یہاں علم کی کوئی اہمیت نہیں ہے۔ یہ لوگ نہ خود تعلیم کا شوق رکھتے ہیں اور نہ اپنے بچوں کو تعلیم دلاتے ہیں لیکن اسلام کی حقیقی شکل اس کے بالکل برعکس ہے۔ اسلام ایک مکمل ضابطۂ حیات ہونے کے علاوہ دین فطرت بھی ہے اسلام کا پیش کردہ ضابطہ حرکی اور فعال ہے چنانچہ وہ اپنے متبعین کو مضمحل، غیر فعال اور آدم بیزار دیکھنا پسند نہیں کرتا وہ دین اور دنیا میں تقسیم نہیں کرتا اور تعلیم کا مفہوم چند کتابیں پڑھ لینے سے نہیں لیتا۔ اسلام میں زندگی کے ہر اہم شعبے سے متعلق جامع و مانع راہ نما اصول ملتے ہیں چنانچہ اسلام نے حصولِ تعلیم پر بھی بہت زور دیا ہے اور اس سلسلے میں جو ہدایات مذہب اسلام میں ملتی ہیں وہ شاید ہی دنیا کے کسی دوسرے مذہب میں ملتی ہوں۔ اسلام میں تعلیم و تربیت کا وسیع ترین مفہوم ملتا ہے۔ دنیا ے تعلیم کے اکابرین اس بات پر متفق ہیں کہ تعلیم کو مدرسے کی چہار دیواری سے باہر نکلنا چاہیے اسی بات پر اسلام نے ڈیڑھ ہزار سال پہلے بہ انداز دگر زور دیا ہے۔

ہندوستان کے مسلمانوں کی بدنصیبی ہے کہ اس کی اکثریت نے مذہب کی تعلیمات و احکامات سے صرف نظر کر لیا ہے حالانکہ تعلیم بھی مذہب کے اوامر میں شامل ہے۔ مسلمانوں کی حالت دیکھ کر یہ غلط فہمی پیدا ہوتی ہے کہ مذہب اسلام اپنے متبعین کو تعلیم کی طرف کوئی زور نہیں دیتا ہندوستان کی آبادی میں بے پڑھے لکھے لوگوں کی تعداد میں اضافہ کرنے میں مسلمانوں کا بڑا دخل ہے۔ اول تو مسلمانوں کے اپنے اسکول ہی کتنے ہیں اور جو ہیں بھی وہ چاہے خالص دینی تعلیم کے ہوں یا موجودہ نظامِ تعلیم کے مگر سب کی حالت بہت ہی خراب ہے اگر آپ ان کی عمارتیں دیکھیں تو خستہ حالت جن میں والدین بچوں کو بھیجنے میں ڈریں اور بچوں کو اُن کے اندر داخل ہوتے خوف لگے۔ اسکولوں کے اندر اور اُن کے آس پاس گندگی اور غلاظت کے انبار لگے ہوئے دکھائی دیں۔ ان اسکولوں کا فرنیچر دیکھیں تو یا تو پھٹی ہوئی دریا یا پھر ٹوٹی پھوٹی کرسیاں اور میزیں ان میں نظر آئیں۔ ان کے تختۂ سیاہ یا تو ٹوٹے پھوٹے ہوں یا ان کی سیاہی غائب ہو چکی ہو یا وہ اتنے چھوٹے ہوں کہ ان

پڑھنے سے کچھ حاصل نہ ہو۔ ان اسکولوں کے طالب علموں کو دیکھیں تو گندے کپڑے، یونیفارم غائب، کتابیں اور کاپیاں ندارد اور عجب بے ہنگم کیفیت میں نظر آئیں۔

مسلمان اساتذہ کا حال بھی کچھ زیادہ مختلف نہیں ہے وہ حکومت کا رونا تو ضرور روتے نظر آئیں گے کہ مسلمانوں کی تعلیم و ملازمت کی طرف حکومت منصف مزاجی سے کام نہیں لے رہی ہے مگر خود ان کو مسلمان بچوں کو تعلیم دینے کی طرف خاص توجہ نہیں۔ یا تو وہ درجہ میں پڑھانے جائیں گے ہی نہیں اور اگر گئے بھی تو بیکار باتوں میں وقت ضائع کر کے چلے آئیں گے۔ کسی اسکول میں جو مسلمان اساتذہ ایسا سلوک مسلمان طلباء کے ساتھ نہیں کرتے ان کو انگلیوں پر گنا جا سکتا ہے۔

اس مضمون کا مقصد خدانخواستہ کسی کی دل آزاری کرنا نہیں ہے بلکہ غیر مسلموں کی غلط فہمی دور کرنی ہے اور عام مسلمانوں میں ایک بیداری پیدا کرنا ہے تاکہ عوام تعلیم کی اہمیت سے کما حقہٗ آگاہ ہو جائیں۔ اور اس کے نکتے کو ذہن نشین رکھیں کہ اسلام میں تعلیم کی اہمیت پر کس قدر زور دیا گیا ہے نیز حصول تعلیم سے روگردانی درحقیقت اسلامی احکامات سے روگردانی کے مترادف ہے۔

اسلام کی کسی بات کا بھی فیصلہ کرنا ہو تو سب سے پہلے ہم کو قرآن میں دیکھنا ضروری ہے کہ قرآن کا اس مسئلہ میں کیا فیصلہ ہے کیونکہ قرآن کا فیصلہ اسلام کے ماننے والوں کے لیے سب سے بڑا فیصلہ ہے قرآن کے بعد ہمارے رسول مقبول نے جو تعلیمات دی ہیں وہ ہمارے لیے فیصلہ کرتی ہیں کہ اس مسئلہ میں اسلام کا کیا فیصلہ ہے۔

اگر ہم قرآن مجید کا مطالعہ کریں تو ہم کو معلوم ہوگا کہ قرآن مجید کا نزول ہی علم و تعلیم کی آیات سے ہوا۔ مندرجہ ذیل آیتیں جو قرآن مجید سے لی گئی ہیں وہ یہ واضح کریں گی کہ اسلام میں علم کی کیا اہمیت ہے۔

اِقْرَأْ بِاسْمِ رَبِّكَ الَّذِي خَلَقَ ۝ خَلَقَ الْإِنْسَانَ مِنْ عَلَقٍ ۝ اِقْرَأْ وَرَبُّكَ الْأَكْرَمُ ۝ الَّذِي عَلَّمَ بِالْقَلَمِ ۝ عَلَّمَ الْإِنْسَانَ مَا لَمْ يَعْلَمْ ۝

(سورۃ العلق)

"اے پیغمبر آپ قرآن اپنے رب کا نام لے کر پڑھا کیجئے جس نے مخلوقات کو پیدا کیا جس نے انسان کو خون کے لوتھڑے سے پیدا کیا آپ قرآن پڑھا کیجئے اور آپ کا رب بڑا کریم ہے جس نے قلم سے تعلیم دی انسان کو ان چیزوں کی تعلیم دی جن کو وہ نہ جانتا تھا۔"

ان آیات میں انسانوں کو خدا کا نام لیتے قرآن پڑھنے اور قلم سے تعلیم دینے کی ہدایت دی ہے اور اس کو یہ یاد کرایا ہے کہ انسان کو جو بھی تعلیم حاصل ہے وہ سب خدا کی دی ہوئی ہے۔

يَرْفَعِ اللَّهُ الَّذِينَ آمَنُوا مِنْكُمْ وَالَّذِينَ أُوتُوا الْعِلْمَ دَرَجَاتٍ۔ (المجادلہ ۱۱)

"اللہ اس حکم کی اطاعت سے تم میں ایمان والوں اور جن کو علم عطا ہوا ہے انکے درجے بلند کرے گا۔"

اس آیت میں انسانوں کو یہ ہدایت کی گئی ہے کہ جو علم حاصل کریں گے ان کے درجے بلند کیے جائیں گے۔ اس آیت سے صاف طور پر واضح ہو جاتا ہے کہ جن کو علم عطا ہوا ہے اور جو اس کی اطاعت کریں انکے درجے بلند کرے گا۔

قُلْ هَلْ يَسْتَوِي الَّذِينَ يَعْلَمُونَ وَالَّذِينَ لَا يَعْلَمُونَ ۝

(الزمر: ۹)

"کہدو کیا علم والے اور بے علم والے برابر ہو سکتے ہیں"

اس آیت میں خدائے تعالیٰ نے واضح ہدایت دی ہے کہ علم والے اور بے علم والے برابر نہیں ہو سکتے اس کا صاف مطلب ہے کہ قرآن علم حاصل کرنے کو بڑا درجہ دیتا ہے اور اگر انسان برابری کے درجہ پر رہنا چاہتا ہے تو اس کو علم حاصل کرنا ضروری ہے۔

شَهِدَ اللَّهُ أَنَّهُ لَا إِلَٰهَ إِلَّا هُوَ وَالْمَلَائِكَةُ وَأُولُو الْعِلْمِ (آل عمران)

"اللہ اور فرشتے اور علم والے شاہد ہیں کہ اللہ کے سوائے

معبود نہیں" اس آیت میں اللہ تعالیٰ نے اپنی معبودیت کی شہادت
ے فرشتے اور علم والوں کو گواہ بنایا ہے۔ اس سورۃ سے علم حاصل
نے والوں کی برتری کا حال معلوم ہوتا ہے۔

هُوَ الَّذِي بَعَثَ فِي الْأُمِّيِّينَ رَسُولًا مِّنْهُمْ يَتْلُوا
عَلَيْهِمْ آيَاتِهِ وَيُزَكِّيهِمْ وَيُعَلِّمُهُمُ الْكِتَابَ وَالْحِكْمَةَ
(سورۃ الجمعۃ)

"وہی ہے جس نے عرب کے ناخواندہ لوگوں میں ان ہی کی قوم
سے یعنی عرب میں ایک پیغمبر بھیجا جو ان کو اللہ کی آیتیں پڑھ پڑھ
سناتے ہیں اور ان کو عقائد باطلہ و اخلاق ذمیمہ سے پاک کرتے ہیں
ان کو کتاب اور دانش مندی کی باتیں سکھلاتے ہیں۔"

اس آیت میں علم کی اہمیت اس طرح واضح ہوتی ہے کہ اللہ کے رسول
ذمہ لوگوں کو آیتیں پڑھ کر سنانے اور کتاب اللہ اور دانش مندی
باتیں سکھلانے کی ذمہ داری دی گئی ہے۔

. وَلَقَدْ آتَيْنَا دَاوُودَ وَسُلَيْمَانَ عِلْمًا ۖ وَقَالَا الْحَمْدُ
لِلَّهِ الَّذِي فَضَّلَنَا عَلَىٰ كَثِيرٍ مِّنْ عِبَادِهِ الْمُؤْمِنِينَ ۝
(سورۃ النمل)

"ہم نے داؤد و سلیمان کو علم عطا کیا اور انھوں نے کہا کہ شکر
اس خدا کا جس نے ہم کو اپنے بہت سے مومن بندوں پر
فضیلت عطا کی ہے۔"

اس آیت سے معلوم ہوتا ہے پیغمبروں نے جب ان کو علم دیا
تو انھوں نے بھی خدا کا شکر اس پر ادا کیا کیونکہ علم دوسرے
مومن بندوں پر فضیلت عطا کرتا ہے اس سے بھی علم کی اہمیت
اندازہ ہوتا ہے جو اسلام نے اس کو دی ہے۔

إِنَّمَا يَخْشَى اللَّهَ مِنْ عِبَادِهِ الْعُلَمَاءُ ۝
(فاطر: ۲۸)

حقیقت یہ ہے کہ اللہ کے بندوں میں سے صرف علم رکھنے والے
ہی اس سے ڈرتے ہیں۔"

ایک عالم دین اپنی تفسیر قرآن میں لکھتے ہیں کہ جو شخص اللہ کی صفات
سے جتنا زیادہ ناواقف ہوگا وہ اس سے اتنا ہی بے خوف ہوگا اور اس
کے برعکس جس شخص کو اللہ کی قدرت، اس کے علم، اس کی حکمت، اس
کی قہاری و جباری اور اس کی دوسری صفات کی جتنی معرفت حاصل
ہوگی اتنا ہی وہ اس کی نافرمانی سے خوف کھائے گا۔ پس در حقیقت
اس آیت میں علم سے مراد فلسفہ و سائنس اور تاریخ و ریاضی وغیرہ درسی
علوم نہیں ہے بلکہ صفاتِ الٰہی کا علم ہے قطع نظر اس سے کہ آدمی خواندہ
ہو یا ناخواندہ جو شخص خدا سے بے خوف ہے وہ علامہ دہر بھی ہے تو اس
علم کے لحاظ سے جاہل محض ہے اور جو شخص خدا کی صفات کو جانتا ہے اور اس
کی خشیت اپنے دل میں رکھتا ہے وہ اَن پڑھ بھی ہو تو ذی علم ہے۔"

اس سلسلے میں یہ کہنا بھی نامناسب نہ ہوگا کہ جو شخص خوف خدا نہیں
رکھتا وہ حقیقت میں علم بھی نہیں رکھتا چاہے اس نے ظاہری تعلیم کسی معیار
کی حاصل کرلی ہو۔

۸۔ وَمِنَ النَّاسِ مَن يُجَادِلُ فِي اللَّهِ بِغَيْرِ عِلْمٍ وَلَا
هُدًى وَلَا كِتَابٍ مُّنِيرٍ ۝ (سورۃ لقمان)

"انسانوں میں کچھ لوگ ہیں جو اللہ کے بارے میں جھگڑتے
ہیں بغیر اس کے اُن کے پاس کوئی علم ہو یا ہدایت یا کوئی روشنی
دکھانے والی کتاب۔"

اس کا مطلب یہ ہوا کہ ان لوگوں کے پاس نہ تو کوئی ایسا ذریعۂ
علم ہے جس سے اُنھوں نے براہِ راست خود حقیقت کا مشاہدہ یا تجربہ کر لیا
ہو نہ کسی ایسے رہنما کی رہنمائی انھیں حاصل ہے جس نے حقیقت کا مشاہدہ
کر کے انھیں بتایا ہو اور نہ کوئی کتابِ الٰہی اُن کے پاس ہے جس پر یہ
اپنے عقیدے کی بنیاد رکھتے ہوں۔

۹۔ وَقَالُوا مَا هِيَ إِلَّا حَيَاتُنَا الدُّنْيَا نَمُوتُ وَنَحْيَا وَقَالُوا
يُهْلِكُنَا إِلَّا الدَّهْرُ ۚ وَمَا لَهُم بِذَٰلِكَ مِنْ عِلْمٍ
(سورۃ الجاثیہ)

"یہ لوگ کہتے ہیں کہ زندگی بس یہی ہماری دنیا کی زندگی ہے یہیں

ہمارا مرنا اور جینا ہے اور گردشِ ایام کے سوا کوئی چیز نہیں ہے جو ہمیں ہلاک کرتی ہو" درحقیقت اس معاملہ میں ان کے پاس کوئی علم نہیں ہے۔

اس آیت سے معلوم ہوتا ہے کہ اگر انسان کو علم حاصل نہ ہو تو وہ کیسی کیسی گمراہی میں پڑ سکتا ہے اور وہ علم نہ ہونے کی صورت میں کیسا بھٹک جاتا ہے۔

١٠- اِیْتُوْنِیْ بِکِتَابٍ مِّنْ قَبْلِ هٰذَآ اَوْ اَثٰرَةٍ مِّنْ عِلْمٍ اِنْ كُنْتُمْ صٰدِقِيْنَ٥ (سورۃ الاحقاف)

"اس سے پہلے آئی ہوئی کتاب یا علم کا کوئی بقیہ (ان عقائد کے ثبوت میں) تمھارے پاس ہو تو وہی لے آؤ اگر تم سچے ہو۔"

اس آیت میں پہلے آئی ہوئی کتاب سے مراد کوئی ایسی کتاب ہے جو قرآن سے پہلے اللہ تعالیٰ کی طرف سے بھیجی گئی ہو اور علم کے بقیہ سے مراد قدیم زمانے کے انبیاء اور صلحاء کی تعلیمات کا کوئی ایسا حصہ ہے جو بعد کی نسلوں کو کسی قابلِ اعتماد ذریعہ سے پہنچا ہو اور اگر کتاب سے مراد کتابِ الٰہی اور بقیہ علم سے مراد انبیاء و صلحاء کا چھوڑا ہوا علم نہ بھی لیا جائے تو دنیا کی علمی کتاب اور دینی یا دنیوی علوم کے کسی ماہر کی تحقیقات میں بھی آج تک اس امر کی نشان دہی نہیں کی گئی کہ زمین یا آسمان کی فلاں چیز کو خدا کے سوا فلاں بزرگ یا دیوتا نے پیدا کیا ہے۔

١١- فَلَمَّا جَآءَتْهُمْ رُسُلُهُمْ بِالْبَيِّنٰتِ فَرِحُوْا بِمَا عِنْدَهُمْ مِّنَ الْعِلْمِ - (سورۃ المومن)

"جب رسول ان کے پاس بینات لے کر آئے تو وہ اسی علم میں مگن رہے جو ان کے پاس تھا۔"

ایک عالمِ دین اپنی تفسیر میں لکھتے ہیں کہ اپنے فلسفے اور سائنس، اپنے قانون، اپنے دنیوی علوم اور اپنے پیشواؤں کے گھڑے ہوئے مذہبی افسانوں اور دینیات کو ہی انھوں نے اصل علم سمجھا اور انبیاء علیہم السلام کے لائے ہوئے علم کو ہیچ سمجھ کر اس کی طرف کوئی التفات نہیں کیا۔"

اس آیت سے معلوم ہوتا ہے کہ حقیقی علم صرف وہ علم ہے جو خدائے تعالیٰ کی طرف سے عطا ہوا اور دنیوی علوم اس کے مقابلہ میں کوئی حیثیت نہیں رکھتے۔

١٢- اَلرَّحْمٰنُ ٥ عَلَّمَ الْقُرْاٰنَ ٥ خَلَقَ الْاِنْسَانَ ٥ عَلَّمَهُ الْبَيَانَ ٥ (سورۃ الرحمٰن)

رحمٰن نے اس قرآن کی تعلیم دی اس نے انسان کو پیدا کیا اور اسے بولنا سکھایا۔ ایک عالم دین اپنی تفسیر قرآن میں لکھتے ہیں کہ اس کا مطلب یہ ہے کہ قرآن کی تعلیم کسی انسان کی طبع زاد نہیں ہے بلکہ اس کا معلّم خود رحمان ہے اس مقام پر یہ بات بیان کرنے کی حاجت نہیں تھی کہ اللہ نے قرآن کی یہ تعلیم کس کو دی کیونکہ لوگ اس کو محمدؐ کی زبان سے سن رہے تھے اس لئے مقتضائے حال سے کلام کا یہ مدعا آپ ظاہر ہو رہا تھا کہ یہ تعلیم محمدؐ کو دی گئی ہے آغاز اس فقرے سے کرنے کا پہلا مقصد تو یہی بتانا ہے کہ حضورؐ اس کے مصنّف نہیں ہیں بلکہ اس تعلیم کا دینے والا اللہ تعالیٰ ہے مزید برآں دوسرا مقصد اور بھی ہے جس کی طرف لفظ رحمٰن اشارہ کر رہا ہے فرمایا یہ گیا کہ اس کی قرآن کی تعلیم رحمٰن نے دی ہے تو اس سے خود بخود یہ مضمون نکل آیا کہ بندوں کی ہدایت کے لیے قرآنِ مجید کا نزول کیا جانا سراسر اللہ کی رحمت ہے وہ چونکہ اپنی مخلوق پر بے انتہا مہربان ہے اس لیے اس نے یہ گوارا نہ کیا کہ تمہیں تاریکی میں بھٹکتا چھوڑ دے اور اس کی رحمت اس بات کی مقتضی ہوئی کہ یہ قرآن بھیج کر تمہیں وہ علم عطا فرمائے جس پر دنیا میں تمھاری راست روی اور آخرت میں تمھاری فلاح کا انحصار ہے۔

اللہ تعالیٰ انسان کا خالق ہے اور خالق ہی کی یہ ذمہ داری ہے کہ اپنی مخلوق کی رہنمائی کرے اور اسے وہ راستہ بتائے جس سے وہ اپنا مقصدِ وجود پورا کر سکے اس لیے اللہ تعالیٰ کی طرف قرآن کی اس تعلیم کا نازل ہونا محض اس کی رحمانیت ہی کا تقاضا نہیں ہے بلکہ اس کے خالق ہونے کا بھی لازمی اور فطری تقاضا ہے۔

* *

ایک یادگار شخصیت

سید امین اشرف
شعبۂ انگریزی، مسلم یونیورسٹی، علیگڑھ

مختار حامد علی

خانوادۂ سرسید کے چشم و چراغ مختار حامد علی دہلی کے رہنے والے تھے۔ الہ آباد یونیورسٹی سے فرسٹ ڈویژن ایم۔ اے کرنے کے بعد علی گڑھ یونیورسٹی میں شعبۂ انگریزی سے منسلک ہو گئے اور ساری عمر یہیں درس و تدریس کا فریضہ انجام دیتے رہے۔ انتقال سے چند ہی سال قبل ان کا تقرر بحیثیت ریڈر ہوا تھا۔

مختار صاحب چھریرے بدن اور موزوں قد و قامت کے آدمی تھے۔ گنجے تو نہیں تھے مگر سر پر کم ہی بال تھے۔ گردن ہلکی سی ترچھی تھی کلاس میں ہوتے تو زاویۂ قائمہ بنی رہتی اور گفتگو کرتے تو زاویۂ منفرجہ۔ بڑی بڑی نیم وا آنکھوں میں ہلکے ہلکے گلابی ڈورے پڑے رہتے۔ سگریٹ نہیں پیتے تھے مگر کم چونا لگا ہوا چھوٹا سا پان دونوں وقت کھانا کھانے کے بعد شوق سے کھاتے اور شام کو چائے کے بعد بھی۔ پان کھانے کے بعد خلافِ معمول ہشاش بشاش نظر آتے۔ پان مرغوب خاطر تھا مگر صبح صبح کھانے سے اس لیے احتراز کرتے کہ انھیں ڈپارٹمنٹ جانا رہتا۔ گھر سے باہر نکلتے تو علی گڑھ پاجامہ سفید کرتا اور سفید سوتی شیروانی گرمیوں میں اُن کا لباس ہوتا۔ گھر میں ہوتے تو شکن در شکن پڑا ہوا پاجامہ، جسم پر باریک تن زیب کا کرتا یا بغیر کالر کی قمیص۔ سردیوں میں بھی ان کا لباس یہی ہوتا، بس اس فرق کے ساتھ کہ اونی شیروانی زیب تن کر لیتے، کبھی عنابی رنگ کی اور کبھی بادامی۔ گلے میں مفلر ضرور ہوتا۔ سردی زیادہ پڑتی۔ تو شیروانی کے اوپر کوئی اوورکوٹ یا الاسٹر ڈال لیتے۔ گھر میں ہوتے تو اپنے کمرے میں دو لائی اوڑھے لیٹے پڑھتے رہتے۔ کمرے کے باہر دھوپ چمکتی تو ایک معمولی سا سوئٹر پہن کر بڑی سی بنچ پر دراز ہو جاتے۔ کوئی نہ کوئی کتاب ہاتھ میں ہوتی۔ لیٹے ہوئے سر پر گول اونی ٹوپی اس طرح پہنے رہتے کہ وہ سرک کر ناک تک آجاتی آنکھیں تو دکھائی دیتیں مگر پیشانی چھپ جاتی۔ مختار حامد علی گورے چٹے آدمی تھے مگر خوبصورت نہیں تھے۔ گول اونی ٹوپی پہن کر کھڑے ہوتے تو ہیرالال دین دیال لگتے اور لیٹے تو اجین چریا کوٹی۔ وہ جس لباس میں کسی قدر دیدہ زیب نظر آتے وہ تھا ان کا معمول کا لباس، سفید شیروانی اور علی گڑھ کٹ پاجامہ۔

مختار حامد علی کی زندگی، گوشہ نشینی کی زندگی تھی، لیکن یہ گوشہ نشینی فقر یا قناعت کی وجہ سے نہیں تھی بلکہ خرابیٔ صحت کی وجہ سے گو یہ بھی حقیقت ہے کہ طبعاً وہ نہایت شرمیلے اور کم آمیز قسم کے انسان تھے۔ ان کے گنتی کے چند دوست تھے بس انھیں کے سامنے کسی قدر کھل کر بات کرتے مگر وہاں بھی شخصیت پر تہہ بہ تہہ دبیز پردے پڑے رہتے کھلکھلا کر یا ٹھٹھا مار کر ہنستے نہ اپنے قریب ترین دوست سے بھی بے جھجک گفتگو کرتے۔ گپ بازی جو اہلِ علی گڑھ کے مزاج کی نمایاں خصوصیت ہے، مختار حامد علی کا مزاج اس سے میل نہیں کھاتا تھا۔ دوستوں سے اُن کی شوخ گفتگو بھی سنجیدگی اور احتیاط پسندی کی نفیس نازک ردا اُوڑھے رہتی۔

مختار حامد علی ہر وقت تکان سے چور، خستہ، نڈھال اور

مضمحل نظر آتے بدن میں ہلکی سی کپکپی یا رعشہ رہتا۔ اس کا سبب
تھا خرابیِ صحت و کثرتِ مطالعہ اور اس کے سوا کچھ اور بھی!

علی گڑھ حصولِ تعلیم کی غرض سے آنا میری خواہش کے خلاف
تھا اور مختار صاحب سے ملاقات میرے بزرگ دوستوں کی مرضی کے
خلاف۔ اِس اجمال کی تفصیل یہ ہے کہ میرے کلب اور اسکول کے ہم سبق
لکھنؤ اور الٰہ آباد میں تعلیم حاصل کر رہے تھے اور میں اُن سے اکثر یہ سُنا
کرتا تھا کہ علی گڑھ کا تعلیمی معیار پست ہے۔ عام طور سے علی گڑھ کے
طلبا انگریزی میں کورے ہوتے ہیں اور محض شیخی باز طالب علم بہت
ترقی کرتا ہے تو پڑھتے پڑھتے شاعر بن جاتا ہے۔ وغیرہ وغیرہ۔ چنانچہ
جو لوگ مجھے قریب سے جانتے ہیں وہ اچھی طرح واقف ہیں کہ ؎
میں خود آیا نہیں لایا گیا ہوں۔ ۱۹۵۰ء میں جب میں علی گڑھ آ رہا تھا
تو پرنسپل نیاز احمد صدیقی (رشید احمد صدیقی کے چھوٹے بھائی)
نے مجھ سے نصیحتاً کہا کہ بیٹے دو باتوں پر دھیان دینا، ایک میرس روڈ نہ جانا،
دوسرے کمیونسٹوں سے دور رہنا۔ خلافِ نصیحت، میرس روڈ سے
اتنا گہرا علاقہ تھا کہ ؎ عمر گذری ہے اسی دشت کی سیّاحی میں
اور انھیں جغرافیائی حدود میں مختار حامد علی بھی رہتے تھے جو نہایت
کڑھے ہوئے کمیونسٹ تھے اور ملحد بھی۔ اُن سے میری ملاقات ایک
خوشگوار حادثہ تھی جو رفتہ رفتہ استمراری بندوبست میں تبدیل ہو گئی۔

مختار حامد علی بلا مبالغہ اوّل درجہ کے اُستاد تھے۔ ترسیل و
ابلاغ کا مسئلہ شاعری میں جتنا اہم ہے، اسی قدر کلاس میں بھی۔ اصل
چیز ہے عالم فاضل استاد کا اپنے تاثرات اور مفہوم کو اپنے شاگردوں
تک منتقل کرنا۔ یہ صحیح ہے کہ اچھا ٹیچر ہونا بلند پایہ اسکالر ہونے
کی دلیل نہیں ہے مگر یہ بھی صحیح ہے کہ بلند پایہ اسکالر ہونے کا مطلب
یہ نہیں ہے کہ اس میں پڑھانے کی صلاحیت نہ ہو۔ میں نے مختار حامد علی
کو اوّل درجے کا استاد پایا۔ مختار حامد علی کا انگریزی ادب کا مطالعہ
نہایت گہرا اور وسیع تھا۔ انگریزی ادب اُن کا اوڑھنا بچھونا تھا۔
وہ دن رات مطالعے میں غرق رہتے۔ کلاس میں جولانیِ طبع سے نکلن
روانی اور برّاقی سے اس طرح لکچر دیتے کہ ذہن میں اترتا چلا جاتا۔ علمِ
ادب پر گہری نظر رکھنے کے ساتھ ساتھ وہ فنِ تدریس میں بھی
مہارت رکھتے تھے۔

مختار صاحب کلاس میں میز کے بائیں طرف ہاتھ میں کتاب
لے کر کھڑے ہو جاتے۔ کتاب تو ہاتھ میں بس یوں ہی ہوتی کیونکہ
اصل نظم کی نظم اُن کو زبانی از بر ہوتی۔ کتاب داہنے ہاتھ میں بائیں
آنکھ کے نیچے ہوتی اور دونوں آنکھیں کلاس کے سامنے۔ لکچر دیتے تو
منہ سے پھول جھڑتے۔ چونکہ کمزور تھے پوری کوشش سے بولتے
اور بولتے بولتے منہ سے جھاگ نکلنے لگتے۔ بی۔ اے۔ میں ٹامس
ہارڈی پڑھاتے اور ایم اے میں ورڈز ورتھ، کالرج، کیٹس، والٹر
اسکاٹ اور جین آسٹن۔ واقعہ یہ ہے کہ دورانِ لکچر لبا اوقات
پورے کلاس پر وجد اور سرمستی کا سماں چھا جاتا۔

مختار صاحب بغل میں رجسٹر دبائے، آنکھیں جھکائے اس طرح
آتے جیسے اُن کی نرم روی ہمیں یہ سکھا رہی ہو کہ بشر کو چاہیے
دنیا میں سر جھکا کے چلے۔ مگر لکچر کے نقطۂ آغاز سے درمیان تک آتے
آتے طوفان بن کر حیرت انگیز روانی کے ساتھ کلاس پر چھا جاتے
لکچر کا اختتام نہایت ڈرامائی مگر منطقی انداز سے ہوتا۔ حاضری
صرف پہلے دن لیتے، دوسرے دن ایک ہی جملے کا اعادہ کرتے:

جو کل حاضر تھے انھیں آج بھی حاضر تصوّر کیا جائے گا۔

مختار حامد علی جس طرح کتاب کی عبارت پڑھتے وہ اس
قدر منفرد لب و لہجہ ہوتا جو دوسرے استادوں کی خطابت سے
بآسانی ممیز کیا جا سکتا تھا۔ مثلاً جب کوئی نظم پڑھتے تو ایک ہی
سانس میں کبھی کبھی کئی مصرعے پڑھ جاتے اور کبھی صرف ایک یا دو
لفظ پڑھ کر رُک جاتے۔ آواز میں اتار چڑھاؤ ہوتا۔ یکسانیت نہیں
کبھی گرج ہوتی، کبھی دھیما پن۔

وہ ایک نظم سمجھانے میں کئی گھنٹے لیتے۔ نتیجہ یہ ہوا کہ مجھے
ان کی پڑھائی ہوئی کئی نظمیں زبانی یاد ہو گئیں اور آج بھی زبانی

یاد ہیں۔ مہینے کے کسی ایک گھنٹے میں وہ دس پندرہ منٹ اس امر کے لیے وقف کر دیتے کہ طالب علم کو کوئی دشواری ہے تو وہ سوال کر سکتا ہے۔ بعض طلبا خود نمائی کی خاطر اور بعض واقعی حل مشکلات کے لیے سوال کرتے اور مختار صاحب اس کا تسلی بخش جواب دیتے جواب دینے میں وہ اس امر کا لحاظ رکھتے کہ طلبا کے سوالات چونکہ مشکلات کے ازالے کے لیے ہیں، اس لیے ان کا جواب زیادہ پیچیدہ اور فلسفیانہ نہ ہو۔

مختار صاحب اس امر کو ملحوظ خاطر رکھتے کہ طلبا اور طالبات کو ان کے لیکچر سے اُکتاہٹ نہ ہو۔ اس لیے بیچ بیچ میں کہیں کوئی شوخ پھلجھڑی ضرور چھوڑ دیتے۔ حیرت ہے کہ خود مختار صاحب کے ہونٹوں پر تبسم خفی بھی نہ ہوتا۔ غالباً چہرے کی اس بے رنگی اور متانت سے انھیں طلبا کو یہ باور کرانا مقصود تھا کہ لیکچر شوخی اور ٹھٹھول کے لیے نہیں بلکہ یہ مخصوص شوخ فقرہ لیکچر کی نوعیت کے فطری پن کا تقاضا تھا۔

وہ خصوصیت کے ساتھ شعبۂ انگریزی کی صالح اور تعمیری روایات کے امین اور پاسدار تھے۔ کلاس سے باہر عام طور پر طلبا اُن سے ملنے میں ہچکچاہٹ محسوس کرتے کیونکہ باوجود مرنجان مرنج ہونے کے غیر معمولی سنجیدگی کی وجہ سے اُن کے چہرے پر ایک وقار آمیز رُعب ہوتا۔ البتہ جب شعبہ کے کسی طالب علم پر ہال کی رقم واجب ہوتی تو ان کے پاس جانے میں تردد یا تکلف محسوس نہ کرتا، شرط یہ ہے کہ مختار صاحب اس کو جانتے ہوں وہ سال بہ سال دو ایک طالب علموں کے لیے سیکورٹی لکھ دیتے اور یہ اطمینان دلا دیتے کہ میں رقم واپس لینے کے لیے نہیں لکھ رہا ہوں۔ اور اگر کوئی کمیونسٹ پارٹی کے لیے چندہ مانگنے آتا تو توقع سے زیادہ خوشی اور معمول و مقدار سے زیادہ فیاض نظر آنے لگتے۔ اپنی طالب علمی کے زمانے میں خلیل الرحمٰن اعظمی کیمونسٹ پارٹی کے سرگرم اور فعال رکن ہونے کی وجہ سے جب گرفتار کر لیے گئے تھے تو ان کو مختار حامد علی نے ہی ضمانت پر رہا کرایا تھا۔

مختار حامد علی ایک شریف اور وضعدار انسان تھے اپنے بچوں سے شدید محبت کرتے اور اُن سے غپ شپ کے لیے ذرا سا وقت ہر روز ضرور نکالتے۔ بیوی کی جھلاہٹ کو جھیلنے کا فن انھیں خوب آتا تھا۔ طیبہ بیگم کو جس قدر غصہ آتا اسی قدر مختار صاحب اور شوخ ہو جاتے اور اپنی بیوی کے غصے کو دبانے میں مزاح اور ذہانت سے کام لیتے۔ مختار صاحب اپنے ذاتی خطوط لکھتے تو تالیفِ قلب کے لیے بیگم سے کہتے کہ ڈی آئی جی، کمشنر اور گورنر کو چوری کے سلسلے میں لکھ رہا ہوں (ان کی بیٹی کا جہیز چوری چلا گیا تھا) خیر سے پورا سال گذر گیا اور نتیجہ صفر۔ بیگم بولیں کہ ایک دعا کی کتاب ہاتھ آئی ہے۔ اس میں لکھا ہے کہ فلاں دعا پڑھ کر کچھ مشتبہ افراد کا نام لیا جائے اور کنوئیں کی جگت پر لوٹا اوندھا کر رکھ دیا جائے تو اصل چور کے نام پر لوٹا ناچنے لگے گا۔ مختار صاحب نے یوں سمجھایا کہ بیگم بتائیے علی گڑھ شہر اور مواضعات میں کتنے تھانے ہوں گے اور پھر پورے ہندوستان میں کتنے تھانے اور کتنی پولیس۔ اگر چور کا پتہ لگانا اتنا ہی آسان ہوتا تو اس قدر تھانے اور پولیس کی کیا ضرورت تھی۔ ہر محلہ میں ایک کنواں ہوتا اور ہر کنوئیں پر ایک لوٹا اوندھا کر رکھ دیا جاتا اور دُعا پڑھتے ہی لوٹا ناچنے لگتا اور چور کا پتہ چل جاتا۔

بیگم صاحبہ کے پڑوس کی ایک خاتون نے اپنی بیٹی کے لیے سفارش کی۔ پی۔ یو۔ سی کی طالبہ تھی۔ مختار صاحب پہلے ہی اس کا کریا کرم کر چکے تھے اور پچاس میں کل پانچ نمبر تھے طیبہ بیگم نے کہا کہ مختار اسے خوب اچھے نمبر دے دو۔ مختار صاحب اس معاملے میں کٹر وہابی تھے اور نمبر گھٹانا بڑھانا شرک جانتے تھے۔ بیگم صاحبہ نے کھانے کی میز پر پوچھا کہ کتنے نمبر دیے۔ کہا کہ پچاس میں پچپن جس میں پانچ نمبر صفائی کے ہیں۔ بیگم صاحبہ عین دوپہر میں خاتون مذکور کے گھر پر پہونچ کر دروازہ کھٹکھٹانے لگیں اور خوشی کے

عالم میں بار بار کہتیں پچاس میں پچپن ۔ پچاس میں پچپن ۔ واپسی پر مختار صاحب نے کہا کہ پرلے درجے کے دنیادار اور خود غرض لوگ ہیں۔ جب سفارش کی تھی تو بڑی عاجزی اور نیازمندی نظر آتی تھی مگر جب نمبروں کے بارے میں اطلاع دی تو سب کے چہرے فق تھے اور کسی نے کسی خوشی کا اظہار نہیں کیا۔ مختار صاحب نمبر کاٹ لو اور صرف دس بیس نمبر دے کر ٹال دو۔ مختار صاحب نے کہا، اچھا بیگم صاحبہ۔ مگر چونکہ آپ کو ناخوش کیا ہے۔ اس لیے میں اس سے بھی کم نمبر دوں گا۔

مختار صاحب مزاحیہ فقرہ چپکانے میں رعایت نہیں کرتے تھے طلبا، طالبات، برابر والے، بڑے اور چھوٹے سب مزاح کی کاری ضرب سے محظوظ ہوتے اور یہ وار سب پر یکساں چلتا۔ ایک نو وارد طالب علم جو مختار صاحب کو پہچانتا نہیں تھا۔ اُن کے گھر تک گیا اور اُن سے پوچھا کہ "کیا یہ ہکلی بیگم کی کوٹھی ہے؟" انھوں نے کہا "جی ہاں" اُس نے پوچھا آپ (یعنی آپ کی تعریف) مختار صاحب نے جواب دیا "ہکلا"

مختار حامد علی ہمارے ان بزرگوں میں تھے جن کو علی گڑھ سے غیر معمولی لگاؤ تھا اور خصوصیت کے ساتھ اپنے شعبے کی ترقی اور نیک نامی سے۔ وہ اپنے زمانے کی ایک لائق احترام اور پسندیدہ شخصیت تھے۔ ایک اچھے اُستاد کی بڑائی کی یہ بھی پہچان ہے کہ اس کے شاگرد کس قدر محبت سے اسے یاد کرتے ہیں اور

جناب مختار حامد علی

اس کا نام کس درجہ عزت و احترام سے لیتے ہیں۔ میں نے ان کے زیادہ تر شاگردوں کو جو آج برصغیر ہند و پاک میں اعلیٰ عہدوں پر فائز ہیں یا یونیورسٹیوں میں درس و تدریس سے متعلق ہیں، ان کا نام آتے ہی عقیدت سے سر جھکاتے اور ان کی عظمت کا اعتراف کرتے دیکھا ہے۔ یہ ایک المیہ ہے کہ ہماری یونیورسٹی میں ایسے لوگ اب گنتی کے رہ گئے ہیں۔ مختار حامد علی اس یونیورسٹی کے اُن فرزندوں میں سے تھے جنھوں نے اس یونیورسٹی میں ٹیچر کے مقام کو بلند کیا ہے۔ مختار حامد علی کی نکھری ہوئی دلنواز شخصیت آج بھی جب میری آنکھوں کے سامنے ہوتی ہے تو بے ساختہ زبان سے نکل جاتا ہے ؎

ایسا کہاں سے لاؤں کہ تجھ سا کہیں جسے ★ ★

عربوں میں صحت کی بابت ایک کہاوت ہے۔ صحت '۱' کا عدد ہے۔ محبت صفر ہے، شان و شوکت صفر ہے کامیابی صفر ہے۔ ان کو ترتیب وار لکھ دیجیے تو آپ مال دار ہیں۔ لیکن تندرستی کے "ایک" کے بغیر سب کچھ صفر رہ جاتا ہے۔

"جیک دینٹن اسکاٹ"

شاید...

میں تو ہدفِ تیر ہائے ملامت ہو گیا ہوں اور روز بروز ہوتا جاؤں گا۔ شاید بعد میرے کوئی زمانہ آئے جب لوگ میری دلسوزی کی قدر کریں۔

(سرسید)

زادِ سفر:

علی گڑھ کی روایات

پہلی اکتوبر کے شمارے میں ڈاکٹر اطہر پرویز کا ایک دلچسپ مضمون "یاد ش بخیر" شائع ہوا تھا۔ ڈاکٹر صاحب نے اپنے زمانۂ طالب علمی کی وہ باتیں دہرائی تھیں جن سے علی گڑھ، علی گڑھ تھا۔ حکایت لذیذ، اندازِ بیان لذیذ تر! مضمون پسند کیا گیا اور فرمائشیں ہوئیں کہ پرانی یادوں اور پرانی باتوں کا یہ سلسلہ جاری رہے۔ کسی طرف سے یہ آواز بھی آئی کہ حال سے منہ موڑ کر ماضی کی خوابناک دنیا میں کھوئے رہنا ہمارا مزاج بن گیا ہے۔ کم سے کم تہذیب الاخلاق تو اسے فروغ نہ دے۔ دراصل زندہ قوم کی شناخت یہ ہے کہ یونانی دیوتا جانس کی طرح اس کی سامنے کی دو آنکھیں تو مستقبل پر مرکوز ہوتی ہیں اور پیچھے کی دو آنکھیں اپنے ماضی سے سبق لیتی رہتی ہیں۔ ماضی کو فراموش نہ کرنے کا فائدہ یہ ہے کہ اس کی قابل قدر باتوں اور قابل فخر روایتوں کو زندہ کرنے اور زندہ رکھنے کی خواہش پیدا ہو۔ گویا زندگی کے سفر میں یادوں کا یہ سرمایہ زادِ راہ کا کام دیتا ہے۔ غرض طے پایا کہ یہ سلسلہ جاری رہے۔ اب اس کے لیے کسی مستقل عنوان کی جستجو ہوئی۔ جناب مختار مسعود کے ایک مضمون سے جو آئندہ کسی شمارے میں شامل ہوگا فال نکلی زادِ سفر۔ اس عنوان کے تحت ہر شمارے میں تو نہیں لیکن اکثر اس طرح کے مضامین شائع ہوتے رہیں گے۔ اس سلسلے کا آغاز پروفیسر رشید احمد صدیقی کے ایک مضمون سے کیا جا رہا ہے۔ روایتوں کا ان سے بڑا محافظ اور علمبردار کون ہوگا۔ یہ مضمون ان کی تحریروں سے تراش کے تیار کیا گیا ہے۔

ہائی اسکول کو الوداع کہنے کے بعد عدالتِ دیوانی میں عارضی کلرکی ملی۔ اس زمانے میں گورنمنٹ کے دفتر میں کلرک ہونا بھی بڑی بات تھی۔ کلرکی کرتا رہا اور کبھی کبھار ڈبل روٹی بھی کھا لیتا لیکن خوشی سے پھول نہ سکا۔ (اکبر الٰہ آبادی کا مشہور مصرع ہے: کھا ڈبل روٹی کلرکی کر خوشی سے پھول جا) کس طرح سالہا سال کلرکی کی اور علی گڑھ کا طالب علم بھی رہا۔ کلرکی کے چکر میں کہاں کہاں گیا، کیا کیا دیکھا، کیا کیا گزری اور اس کا اثر مجھ پر اور میری تحریر پر کیا پڑا، بڑی طویل داستان ہے اور خاصی دلچسپ بھی [illegible]

کون ؟ اس لیے کہ پھر اس کا سمیٹنا میرے لیے بہت مشکل ہوگا ۔ پھر ایک ایسا موقع آیا جب میں نے کلرکی کے نقد کو طالب علمی کے ادھار پر ترجیح دی اور میرا عشق بے خطر آتشِ نمرود میں کود پڑا ۔ گو مجھے اس کا اعتراف ہے کہ میری عقل بھی کچھ اس طرح کی تھی کہ محوِ تماشائے لبِ بام ہونے میں بھی اس کو کافی خطرہ نظر آتا تھا ۔ بہرحال پھر میں نے تمام عمر نہ کبھی عشق کو منہ لگایا نہ آتشِ نمرود کے منہ لگا ۔

یہ بتانے کی ضرورت نہیں کہ میں بڑے تردد اور ناکسی کے عالم میں بریلی لائن سے دس بجے رات کو علی گڑھ پہنچا تھا ۔ یہ بھی بتاتا چلوں کہ یہ گاڑی آج بھی اسی حلیہ و رفتار سے انہی اوقات میں بریلی اور علی گڑھ کے درمیان سرگرم "سیر" رہتی ہے جیسی کبھی رہی ہوگی ۔ وہی ڈبے ، ویسے ہی ڈبے ، وہی سیٹی ، وہی گھڑگھڑاہٹ جو آج سے چالیس بیالیس سال قبل تھی ۔ جب میں پہلے پہل علی گڑھ آیا تھا ۔ جیسے پوری گاڑی کسی آسیب کی زد میں ہو اور تا حشر اسی طرح آتی جاتی رہے گی ۔ روحانیت کے کسی ماہر سے تحقیق کرائی جائے تو کچھ عجب نہیں اسی زمانے کے ڈرائیور گارڈ اور کوئلہ جھونکنے والوں کی ارواح اسی ٹرین میں اسیرِ سفر مل جائیں ۔

ہاں تو میں دس بجے رات کو علی گڑھ پہنچا تھا ۔ کالج کے ہم سفر طلبا نے حال پوچھے بغیر صرف میری ہیئت و حالت دیکھ کر میری دلداری نہ کی ہوتی اور اپنے ساتھ لاکر اپنا ناشتہ کھلا کر اپنے کمرے پر ، اپنی چارپائی اور بستر پر جگہ دے کر ، خود کہیں اور جاکر ساتھیوں کے جمگھٹے میں تمام رات ہو حق میں بسر نہ کردی ہوتی تو میں شہر جاکر معلوم نہیں کہاں قیام کرتا اور میرا کیا انجام ہوتا ! ایک درماندہ اجنبی طالب علم کے ساتھ علی گڑھ کے ہم سفر طالب علموں کی یہ بے ساختہ دوستی اور دردمندی آج بیالیس سال بعد بھی میرے دل کو اس طرح شاداب و شادماں کرتی ہے جیسے کل کا واقعہ ہو !

اس زمانے میں کالج کی شوکت و شہرت پورے عروج پر تھی ۔ کھیل میں ، لکھنے پڑھنے میں ، یونین کی سرگرمیوں میں اور شریفانہ رکھ رکھاؤ میں ، چھوٹے بڑوں کے آپس کے سلوک میں ۔ غرض اس وقت کے معیار سے زندگی کا ہر پہلو بابرکت اور بارونق نظر آتا تھا اور ایک طرح کی آسودگی ، احترام اور آرزومندی کی فضا چپے چپے پر چھائی ہوئی تھی ۔

جس کسی نے کچی بارک (سید محمود کورٹ) دیکھا نہ ہو وہ اندازہ نہیں کرسکتا کہ کچی بارک کیا چیز تھی ! کوئی عمارت تھی ، عبادت تھی یا علامت ! واقعہ یہ ہے کہ وہ تینوں تھی پھر بھی کچھ اور ۔ ایسی زار و زبوں عمارت اس وقت کالج کے رقبے میں کہیں اور نظر نہ آتی تھی ۔ معلوم نہیں کب کی بنی ہوئی کھپریل کی چھت ، مٹی کے درو دیوار ، نہایت درجہ نیچا ، بودا ، بوسیدہ برآمدہ جس کی کڑیاں جگہ جگہ سے گل بھی گئی تھیں اور کھسک بھی رہی تھیں جن میں لکڑی کے آڑے ترچھے طرح طرح کے پیوند لگائے گئے تھے ۔ جون کی گرمی اور آندھی میں ایسا معلوم ہوتا تھا جیسے پوری بارک مٹیالی گرم دردری دھول اور دھند میں جھول رہی ہو — کانپتی ، کراہتی ، کھانستی !

مگر اب سوچتا ہوں تو محسوس ہوتا ہے کہ مجھے زندگی میں جو کچھ ملا تو یہیں سے ۔ جس نے مجھے زندگی اور ادب کے ڈھرے پر ڈال دیا وہ یہی کچی بارک تھی ۔ یہاں ہر حیثیت اور ہر درجے کے گھرانوں کے لڑکے آباد تھے ۔ لیکن طرح طرح کی تکلیفیں اٹھانے کے باوجود ایک متنفس نے بھی کبھی اس کی شکایت نہ کی کہ کچی بارک میں رہنا صحت ، عافیت ، حیثیت ، شان یا شرافت کے خلاف تھا ۔ یہی نہیں بلکہ کتنے اس کی آرزو کرتے کہ کچی بارک میں جگہ مل جائے !

اس زمانے کی کچی بارک کی صبح و شام اور زمین و آسمان کا خیال کرتا ہوں تو تصور میں ریگستان کا وہ منظر آجاتا ہے جہاں خضر راہ میں اقبال نے کہا ہے :

ریگ کے تودے پہ وہ آہو کا بے پروا خرام
یا — وہ خضر بے برگ و ساماں ، وہ سفر بے سنگ میل

پھر کچھ ایسا محسوس ہونے لگتا ہے جیسے ایک طور پر ملّتِ مصطفوی کا اس جہان میں یہی نقشا اور یہی نوید ہے! وہی بدوؤں کا سا حال جو ریگستان کی ہر طرح کی سختی جھیلیں گے لیکن منزل پر اتریں گے تو ہر چھوٹی بڑی نعمت کا حق ادا کیے بغیر نہ رہیں گے۔

ایک سال بارش کی ایسی شدّت ہوئی کہ کئی دن تک بند نہ ہوئی۔ خیال کیا جا سکتا ہے کہ کچی بارک کا کیا حال ہوا ہوگا۔ ہم سب کمروں سے نکل کر برآمدے میں کھڑے ہوگئے۔ سید محمود کورٹ شرقی سے نعرہ بلند ہوا۔ اس کا جواب فوراً مغرب سے دیا گیا۔ طے کیا گیا کہ محصور ہو کر برسات کا مقابلہ ناکام رہا۔ اب میدان میں دادِ شجاعت دینی چاہیے۔ سب موسلا دھار بارش میں جا کھڑے ہوئے۔ کچی بارک کے وسیع صحن میں ڈنڈ اور دھوم مچی۔ تھوڑی دیر میں کیا دیکھتے ہیں کہ کالج کے پرنسپل ٹول صاحب گھوڑے پر سوار بھیگتے چلے آرہے ہیں۔ موصوف ایسے ہی کبھی سال چھ مہینے میں کسی بورڈنگ ہاؤس کے آس پاس سے گزر جایا کرتے تھے۔ ان کا اس طرح گزرنا بھی ایک حادثہ قرار دیا جاتا تھا۔ پوچھا کیا ہو رہا ہے۔ ہم میں سے ایک بڑا ہی بے فکر اور بے جھجک تھا آگے بڑھ کر بولا جناب والا طوفان آزمائی ہے۔ ٹول صاحب مسکرائے اور مبارک ہو کہہ کر واپس چلے گئے۔

اس زمانے کے علی گڑھ کی ایک بات اور سنتے چلیے۔ وہ جنھوں نے ہم سے پہلے یہاں قدم رکھا اور جنھیں سینیر کہا جاتا ہے وہ ہم نو واردوں یا جونیروں کو باتوں باتوں میں کس طرح یہاں کے ادب آداب سکھاتے تھے، یہ بھی سننے سنانے کی بات ہے۔ پکّی بارک کے ایک سینیر طالب علم میرے وطن سے آئے جہاں ان کے والد گورنمنٹ کے ایک ذمے دار عہدے پر مامور تھے۔ گھر والوں نے میرے لیے یونیفارم کا کپڑا بھیجا تھا۔ بورڈنگ ہاؤس پہنچ کر انھوں نے پہلا کام یہ کیا کہ میرے کمرے پر تشریف لائے۔ گھر والوں کی خیریت تفصیل سے سنائی اور بتایا کہ یونیفارم کا کپڑا لائے تھے۔ میں نے بے اختیار پوچھا کہاں ہے۔ مسکرائے اور بڑے اطمنان اور شفقت سے فرمایا کمرے پر ہے۔ معاً مجھے اس کا احساس ہوا کہ میری یہ حرکت جونیر کی سی حرکت تھی۔ بولے چار بجے کمرے پر آؤ میرے ساتھ چائے پیو۔ کپڑا بھی مل جائے گا۔ یہ توقف مجھے بڑا شاق ہوا۔ اس زمانے میں کم سے کم میرا یہ حال تھا کہ یہ معلوم ہو جائے کوئی ساتھی یا شخص گھر والوں سے مل کر آیا ہے یا وہاں سے میرے لیے کچھ لایا ہے تو طبیعت بے قابو ہو جاتی اور جب تک وہ آدمی یا چیز مل نہ جائے چین نہ آتا تھا۔

بارے وہ وقت آیا اور میں ان کے کمرے پر پہنچا۔ دروازے پر آکر پذیرائی کی۔ دوسروں سے تعارف کرایا، کھیلنے اور پڑھنے کے بارے میں پوچھتے رہے۔ بالآخر مجھ سے رہا نہ گیا۔ میں نے کہا کپڑا مرحمت ہو۔ میں جانا چاہتا ہوں۔ بولے ضرور ضرور۔ نوکر کو آواز دی۔ آیا تو بکس کی کنجی اس کے حوالے کی اور کپڑا نکلوایا۔ میں نے چاہا لے کر کمرے سے بھاگ کھڑا ہوں۔ بولے ذرا ٹھہرو۔ نوکر چائے کے برتن ہٹا دے۔ وہ کپڑا (صرف دو گز سرج!) لے کر تمھارے ساتھ جائے گا۔ میں چاروں خانے چت تھا لیکن شاید چت ہونے میں ایک آدھ خانہ باقی تھا۔ اس لیے کہ اپنے کمرے پر پہنچا تو ایک اور سینیر رونق افروز تھے۔ میں نے نوکر سے جھپٹ کر کپڑا لیا اور بکس کھول کر رکھنے لگا۔ نوکر واپس جانے لگا تو سینیر صاحب نے مجھے مخاطب فرما کر بہ آواز بلند فرمایا مولانا نوکر کو دو آنے دے دیتا ہوں۔ روپے بعد میں تڑاتے رہیے گا۔ اب میں بے شمار خانوں چت تھا!

اِس زمانے میں اس واقعے کو سن کر کون نہ ہنسے گا مگر کروں کیا کہ اس طرح کی باتوں سے میں نے بہت کچھ سیکھا۔ جیسے یہی کہ تمام عمر کیسا ہی کوئی موقع و محل کیوں نہ ہو خوش اعتماد سا رہا۔ اپنے سے بھی دوسروں سے بھی!

رشید احمد صدیقی

علی گڑھ مسلم یونیورسٹی میں
ایک اہم
تقریری مقابلہ

⋆ ⋆ ⋆

علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کے لٹریری کلب نے سماجی فلاح وبہبود کی وزارت کے اشتراک سے ۷ راکتوبر ۸۳ء کو گاندھی جینتی تقریبات کے سلسلے میں ایک مذاکرے کا اہتمام کیا جس کا موضوع تھا:۔ "طلباء پر شراب نوشی کے مضر اثرات"۔ مذاکرے کی صدارت ڈاکٹر وارث کرمانی نے فرمائی۔ محترمہ مس جل کاٹرل (لندن) نے بطور مہمان خصوصی شرکت کی۔ آپ یونیورسٹی آف واروک کے لا اسکول سے متعلق ہیں اور آج کل ہندوستان کے دورے پر ہیں۔

تلاوتِ کلام پاک کے بعد جناب سبطین اخگر نے شرکا کا خیرمقدم کیا اور موضوع کی اہمیت پر روشنی ڈالی۔ انھوں نے طلبا میں بڑھتی ہوئی شراب نوشی اور نشیلی دواؤں کے استعمال پر تشویش کا اظہار کرتے ہوئے کہا کہ صحت کو برباد کرنے، ذہنی صلاحیت کو فنا کرنے اور اخلاق کو تباہ کرنے والی اس عادت کو فوراً نہ روکا گیا تو ملک و قوم کو ناقابل تلافی نقصان پہنچے گا اور تعلیمی اداروں میں اس کے رواج سے تعلیم کا معیار پست ہوگا۔ سبطین اخگر صاحب لٹریری کلب کے سکریٹری اور یونیورسٹی میں علمی و ادبی سرگرمیوں کے روح رواں ہیں۔ اور اس کلب نے یونیورسٹی میں تحریری و تقریری صلاحیتوں کو فروغ دینے کی اہم خدمت انجام دی ہے۔

بائیں سے دائیں: جناب سبطین اخگر، (سکریٹری)۔
مس جل کاٹرل (لندن) مہمان خصوصی اور ڈاکٹر وارث کرمانی (صدر جلسہ)

اس سیمینار میں انتیس ۲۹ طلبا وطالبات نے حصہ لیا۔ اور اردو، ہندی، انگریزی تینوں زبانوں میں تقریریں کیں۔ فرخ سعید صاحب، صلاح الدین صاحب اور آلوک شرما صاحب نے پہلا، دوسرا اور تیسرا مقام حاصل کرکے بالترتیب تین سو، دوسو اور سو روپے کے نقد انعامات حاصل کیے۔ مس آبھا شرما، عبدالراشد صاحب اور اعجاز تقی واسطی صاحب پچاس پچاس روپے کے خصوصی انعامات کے مستحق قرار پائے۔

تینوں ججوں کی نمائندگی کرتے ہوئے ڈاکٹر ایم۔ اے علوی نے موضوع بحث کے متعدد گوشوں کو اپنے مخصوص انداز میں اجاگر کیا۔ مہمان خصوصی مس جل کاٹرل نے یورپ میں شراب نوشی کے رجحان اور اس کے اثرات پر روشنی ڈالی اور اس سیمینار میں حصہ لینے والے مقررین کی حوصلہ افزائی کی۔ آخر میں پروفیسر حبیب الرحمٰن کو آرڈینیٹر جنرل ایجوکیشن نے سیمینار کی کامیابی پر مسرت کا اظہار فرمایا اور شرکا کا شکریہ ادا کیا۔ ★★

★ آپ کے رسالے کی نئی سج دھج پسند آئی۔ تہذیب الاخلاق کو پٹنہ کے بک اسٹالوں پر بھجوانے کی زحمت کریں تاکہ اس کی علمی، تہذیبی اور ثقافتی افادیت عام ہو سکے۔ اس کے پہلے ان سے خط لکھ کر معاملات طے کیجیے۔ میں نے اس خط کی نقل بک اسٹالوں کو بھی بھیجی ہے۔ (ڈاکٹر) عابد رضا بیدار

ڈائرکٹر خدابخش اورینٹل پبلک لائبریری، پٹنہ

★ میری اس تجویز پر غور فرمائیں کہ تہذیب الاخلاق میں املا جدید مسلّمہ قاعدے کے مطابق ہو اور اس میں یکسانیت ہو۔ مناسب ہو تو کاتبوں کو تحریری ہدایت کر دیں کہ املا اس طرح لکھیں، لیے، کیے، دیے (دیے اور دئے دونوں غلط) کیجیے، لیجیے، فرمایئے، آیئے؛ آئے، لائے، گئے، نئے؛ اونا، اعلا، گزرا، گذشتہ؛ علاحدہ، پانو (جمع پانوں) گانو، گانوں (مگر گانا سے گاؤں) جائے، گائے (بغیر ہمزہ کے مگر گانا سے گائیے) اسی طرح صلائے عام (بلا ہمزہ)؛ قائم، شائع (قایم، شایع غلط)؛ آزمایش، نمایش، فرمایش۔

ریحان احمد عباسی

بٹلہ ہاؤس، دہلی

(توجہ اور مشورے کا شکریہ عباسی صاحب۔ کاتبوں کو ہدایت کر دی گئی)

★ علی گڑھ میں تعلیم پانے والی ایک دوست پچھلی تعطیلات میں اپنے وطن رامپور آئیں۔ ان سے سنا کہ علی گڑھ میں سرسید کا تہذیب الاخلاق پھر سے زندہ ہوا ہے۔ نہ پڑھنے کو جی چاہا نہ حاصل کرنے کو۔ سوچا ہو نہ ہو اس میں ہوگا کیا وہی باتیں جو بڑی آماں کی زبان سے صبح و شام سننی پڑتی ہیں۔ بی بی زور زور سے مت بولو، کھی کھی نہ کرو، دوپٹہ سر پہ لیے رہا کرو۔ اب دیکھا تو اب تک نہ دیکھنے کا ملال ہوا۔ ہنسی ہنسی میں یوں کام کی باتیں کہ دل میں گھر کر لیں جیسے شکر میں لپٹی کڑوی دوا کہ منہ بنائے بنا نگل جاؤ۔ تھوڑا اور خوشگوار بنائیے قصے کہانیاں نہیں نہ سہی وہ تاریخی واقعات لیجیے جو ناول سے زیادہ مزیدار اور پند و نصیحت سے زیادہ سبق آموز ہوتے ہیں۔

شہناز ظہیر (ایم۔ اے۔ علیگ) رامپور

★ ایسا دیدہ زیب، کارآمد اور دلچسپ رسالہ نکالنے پر مبارکباد! امتحان کا مسئلہ بڑا گمبھیر اور اصلاح طلب ہے۔ مذاکرے میں شرکت کے لیے چند سطریں الگ سے بھیج رہی ہوں۔ مفید مطلب ہوں تو مذاکرے میں شامل کر لیں۔ عرض ہے کہ ممکن ہو تو چار صفحوں سے زیادہ کوئی مضمون نہ ہو۔ مذہبی مسائل پر زیادہ زور نہ ہو کہ اس کے لیے کئی رسالے موجود ہیں۔

انجم بانو

لکچرر گورنمنٹ گرلز کالج، کوٹہ (راجستھان)

★ رسالہ خوب ہے اور اب اس کا انتظار رہنے لگا ہے۔ کیا یہ ممکن نہیں کہ دیگر رسائل کی طرح تہذیب الاخلاق بھی بہ آسانی بک اسٹالوں پر مل جایا کرے؟

محمد احسن

پورنیہ (بہار)

★ مضامین عمدہ، کتابت خوب، طباعت خوب تر۔ اغلاط نہ ہونے کے برابر لیکن کیا یہ ممکن نہیں کہ ایک نقطے کی غلطی بھی نہ ہو۔ آخر انگریزی کتابیں غلطیوں سے یکسر پاک کیوں ہوتی ہیں؟

خورشید صدیقی
لکچرر جموّں یونیورسٹی۔ جموّں

(یہ احساس کمتری نہیں اظہار حقیقت ہے کہ انگریزی کا مقابلہ ہم نہ کر پائیں۔ انگریزی میں چھپنے والی کتابیں لاکھوں کی تعداد میں چھپتی ہیں۔ اس لیے وہ پروف ریڈنگ کے ماہرین کی خدمات حاصل کر پاتے ہیں۔ پروف ریڈنگ بھی ایک ہنر ہے۔ اس کے ماہر کی نظر لفظوں پر ٹوٹ ٹوٹ کر پڑتی ہے۔ انگریزی روزنامے کے ایک پروف ریڈر نے ہمیں بتایا کہ گھر سے آیا ہوا خط پڑھنا میرے لیے دشوار ہو جاتا ہے۔ نظر ایک ایک لفظ اور ایک ایک حرف میں الجھتی ہے اور مطلب ذہن نشین نہیں ہوتا۔ دماغ بار بار نظر کو ہدایت کرتا ہے کہ یہ پروف نہیں بیوی کا خط ہے مگر پروف ریڈنگ کی خوگر نظر بیچاری کرے کیا۔ بہرحال کوشش جاری رہے گی کہ تہذیب الاخلاق میں غلطیاں نہ ہوں)۔

★ تہذیب الاخلاق کا ۱۹واں شمارہ نظر سے گزرا۔ پڑھ کر بہت مسرت ہوئی۔ جناب سید حامد صاحب کا نوٹ اور ایک گمنام انگریزی نظم کا ترجمہ "خیال کی طاقت" بہت ہی پسند آیا جو درحقیقت نوجوانوں کے لیے ایک مشعل راہ ہے۔ میری تمام نیک خواہشات تہذیب الاخلاق کے ساتھ ہیں۔ تہذیب الاخلاق کے لیے ایک حقیر مشورہ ہے کہ علی گڑھ مسلم یونیورسٹی نے دوسری یونیورسٹیوں کے مسلم طلبا کے لیے جو مقابلے کے اونچے امتحانات میں حصہ لینا چاہتے ہوں کیا موثر انتظام کیا ہے۔ اس سے متعلق تہذیب الاخلاق کا ایک کالم مخصوص کر دیا جائے۔ (عرفان خواجہ، بہارستان، پٹنہ)

(یونیورسٹی میں مقابلوں کے امتحان کا ایک مرکز ہے۔ اس سے تفصیل معلوم کی جارہی ہے جسے جلد شائع کیا جائے گا۔ اس مفید مشورے کا شکریہ) ★★★★★

محسن الملک

عزت

انسان کے اچھے خیال۔ اچھی باتیں۔ اچھے کام عزت کو ایسا کھینچ لیتے ہیں جیسا کہ مقناطیس لوہے کو یا کہربا گھاس کو۔ وہ کسی سے اپنی بزرگی کا طالب نہیں ہوتا۔ مگر لوگ خود بخود اُس کی عزت کرتے ہیں۔ وہ کسی سے اپنی تعریف نہیں چاہتا مگر سب اس کی صفت خود کرتے ہیں۔ کیوں کہ انسان کی اچھی حالتوں کا یہ قدرتی خاصہ اور ذاتی تاثیر ہے جسے کوئی تبدیل نہیں کر سکتا۔ ہر جو شخص اچھے خیال رکھتا ہے، اچھی صفات کا جامع ہوتا ہے۔ وہ خود اپنے آپ کو اچھا جانتا ہے۔ اپنی آپ عزت کرتا ہے۔ وہ مغرور تو نہیں ہوتا۔ مگر اپنے آپ کو سچی عظمت میں جانتا ہے۔ وہ کمینہ آدمی کی طرح جھوٹی شیخی تو نہیں رکھتا۔ مگر ممدوح خودداری کا خیال رکھتا ہے۔ اس کا دل اُس سچی عزت اور ممدوح خودداری کے سبب سے ایک پر رعب شہنشاہ کی مانند ہوتا ہے جسے اپنی شہنشاہی پر ناز ہو۔ اسی واسطے وہ مخالفوں کے ذلیل کیے سے اپنے آپ کو ذلیل نہیں جانتا۔ وہ دشمنوں کے حقیر کہہ دینے سے اپنی حقارت نہیں سمجھتا۔ اس ایک سچے آبدار موتی کے موافق جوہری کا طالب ہوتا ہے۔ مگر جھوٹے موتی کی جھوٹی چمک دکھلانے سے اپنی بے آبروئی نہیں سمجھتا۔ وہ لعلِ بدخشاں کی طرح سلطانی تاج کی خواہش تو رکھتا ہے مگر کسی نادان مفلس کے پھینک دینے سے اپنی بے وقعتی نہیں جانتا۔ درحقیقت سچی عزت ایک قدرتی چشمہ کے موافق ہوتی ہے جسے کوئی خس و خاشاک روک نہیں سکتا۔ اور ایک روشن آفتاب کی مانند ہوتی ہے جس کی نورانی شعاعوں کو کوئی شپرہ چشم بند نہیں کر سکتا۔ ★★

کیا
آپ کی روزانہ کی خوراک سے
آپ کے بدن کو پوری قوّت اور
پورا فائدہ مِلتا ہے؟

Tahzibul Akhlaq Fortnightly 1st. NOV. 83. Regd. No. L/ALG.247

20/1/84

جلد ۲ — ۱۶ نومبر ۱۹۸۳ء — شمارہ ۲۲۵

مندرجات

رابطہ:
نور الحسن نقوی
شعبۂ اردو، علی گڑھ مسلم یونیورسٹی، علی گڑھ

ترسیل زر کا پتہ:
منظر عباس نقوی
شعبۂ اردو، علی گڑھ مسلم یونیورسٹی، علی گڑھ

قیمت فی پرچہ ایک روپیہ / سالانہ بیس روپے
بیرون ہند سے:
فی شمارہ ایک ڈالر / سالانہ پندرہ ڈالر

اے جوئے آب بڑھ کے ہو دریائے تند و تیز
ساحل تجھے عطا ہو تو ساحل نہ کر قبول!
—— علامہ اقبال

ہر شخص میں قدرت نے کوئی نہ کوئی صلاحیت رکھی ہے۔ اس صلاحیت کو درجۂ کمال تک پہنچانے ہی میں ساری نیکی اور بڑائی ہے۔ درجۂ کمال تک نہ کبھی کوئی پہنچا ہے نہ پہنچ سکتا ہے لیکن وہاں تک پہنچنے کی کوشش ہی میں انسان، انسان بنتا ہے؛ یہ سمجھو کہ ذت ہوجاتا ہے۔ حساب کے دن جب اعمال کی جانچ پڑتال ہوگی تو خدا یہ پوچھے گا کہ میں نے جو استعداد تجھ میں ودیعت کی تھی اسے کمال تک پہنچانے اور اس سے کام لینے میں تو نے کیا کیا اور خلق اللہ کو اس سے کیا فیض پہنچایا۔
—— بابائے اُردو مولوی عبد الحق

تم جس دیس میں اس درسگاہ سے نکل کر جا رہے ہو وہ بڑا بد نصیب ملک ہے، جاہلوں کا ملک ہے، بے انصافیوں کا ملک ہے، بے رحمیوں کا ملک ہے، ظالمانہ رسموں کا ملک ہے، غافل پجاریوں کا ملک ہے، بھائی بھائی میں نفرت کا ملک ہے، بیماریوں کا ملک ہے، سستی کا ملک ہے، افلاس اور ناداری کا ملک ہے، بھوک اور مصیبت کا ملک ہے۔ غرض بڑا کم بخت ملک ہے، لیکن کیا کیجیے، تمہارا اور ہمارا ملک ہے۔ اسی میں جینا اور اسی میں مرنا ہے۔ اس لیے یہ ملک تمہاری ہمتوں کے امتحان، تمہاری قوتوں کے استعمال اور تمہاری محبت کی آزمائش کی جگہ ہے۔ اس دیس کو تمہاری گردنوں سے اُبلتے خون کے دھارے کی ضرورت نہیں ہے بلکہ تمہارے ماتھے کے پسینے کا بارہ ماسی بہنے والا دریا درکار ہے۔
—— ڈاکٹر ذاکر حسین

اپنی کوششوں ہی کی بدولت ہم نے بدلے ہوئے حالات میں سخت سے سخت مشکلات پر قابو پایا ہے اور بڑے بڑے معرکے سر کیے ہیں اور کبھی شکست بھی کھائی ہے تو عزت قائم رکھی ہے۔ لیکن علی گڑھ اسی وقت کامیاب ہوا ہے جب اس کے دیوانوں اور فرزانوں نے اپنی صفوں کو سیدھا اور استوار رکھا ہے اور کامل اتحاد کا ثبوت دیا ہے۔ علی گڑھ کے لیے یہ گھڑی محشر کی ہے اور ہم سب عرصۂ محشر میں ہیں۔ آیئے مل کر بیٹھیں، مل کر سوچیں، مل کر فیصلہ کریں اور مل کر اس فیصلے پر قائم رہیں اور نتیجے کو خدا پر چھوڑ دیں۔
—— پروفیسر رشید احمد صدیقی

سید حامد

زندہ دلانِ پنجاب

آج ہم ایک نیا سلسلہ شروع کر رہے ہیں۔ اس حسرت کے ساتھ کہ اس کا آغاز پہلے ہی کیوں نہ ہوا۔ ہمارا روئے سخن ان سفروں کی طرف ہے جو علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کے وائس چانسلر کو وقتاً فوقتاً کرنا پڑتے ہیں۔ نیت خدانخواستہ سفرنامہ لکھنے کی نہیں۔ ارادہ صرف یہ ہے کہ ان اطلاعات میں جو معنی خیز یا دلچسپ ہوں، تہذیب الاخلاق کے قارئین کو شریک کر لیا جائے۔

۲۷ جون کو پنجاب کی قومی یک جہتی کانفرنس (PUNJAB STATE NATIONAL INTEGRATION COUNCIL) کی تیسری میٹنگ چندی گڑھ میں ہوئی۔ وائس چانسلر کو پہلی میٹنگ میں شرکت کا موقع بھی ملا تھا۔ پہلی میٹنگ بھی تقریباً اسی زمانہ میں ہوئی تھی۔ نادِ راہ میں سحری اس بار بھی شامل تھی۔ اس دفعہ موسم خوشگوار ہے۔ مانسون کے چھوٹے موٹے ہراول دستے موسم گرما کے قلعہ میں دراڑیں ڈال چکے ہیں۔ گزشتہ سال میٹنگ سے اٹھ کر جمعہ کی نماز کے لیے گیا تھا تو یہ خطرہ لاحق تھا خالی پیٹ ہے۔ کہیں لُو نہ لگ جائے۔ ضعفِ ایمان کا کیا علاج! چندی گڑھ کی جامع مسجد نئی وضع کی ہے اور بے حد خوبصورت۔ لیکن جگہ کے استعمال کرنے میں آرکیٹیکٹ نے کفایت نہیں برتی۔ اتنی ہی خوبصورت ایک مسجد میسور میں دیکھنے میں آئی تھی۔ جس میں ارتفاع کا حسن بھی شامل ہو گیا ہے۔

گزشتہ سال اس میٹنگ میں دارا سنگھ اور پرتھی پال سے ملاقات ہوئی تھی۔ آخر الذکر اب دنیا میں نہیں رہے، قاتل کی گولی کا نشانہ بن گئے۔ پرتھی پال سنگھ ہندوستان کے ہاکی کپتان رہے ہیں اور ان کا شمار دنیا کے پنالٹی کارنر ماہرین میں ہوتا ہے۔ دارا سنگھ مشہور بلند قامت روئیں تن پہلوان ہے جو پردہ سیمیں کی کشش کے آگے سپر انداز ہو گیا۔ ان دونوں کی شرکت سے اندازہ ہوتا ہے کہ پنجاب میں کھیل عوامی زندگی کا جُزو ہیں اور انھیں ہنسی کھیل نہیں سمجھا جاتا۔ مہارت کے سامان فراہم کیے جاتے ہیں اور امتیاز کا اعتراف ہوتا ہے۔ آج کی میٹنگ میں بھی ایک صاحب نے ان پنجابیوں کا ذکر کرتے ہوئے، جنھیں بین الاقوامی شہرت ملی ہے گرونند سنگھ کھورانا کے ساتھ آشونی کمار کا نام لیا جو غالباً اولمپک ایسوسی ایشن کے نائب صدر چنے گئے ہیں۔ ایک شہرہ آفاق سائنس داں کے ساتھ کھیلوں کے ایک ممتاز منتظم کا نام لینا اسنگت اور ناموزوں لگتا ہے لیکن اس قسم کی لغزش یا غلو کی ایک بڑی برکت یہ ہے کہ اس کی بدولت ہمیں دلوں کے اندر جھانکنے کا موقع مل جاتا ہے اور ایک پوری جماعت کی ترجیحات، رجحانات اور طرزِ فکر کے عوامل اور انداز سمجھ میں آجاتے ہیں۔ پنجاب نے تندرستی اور اس کے لوازمین کھیل کود کسرت اور غذا کو ہمیشہ

اہمیت دی ہے۔

صحت کے ساتھ ایک جلوس چلتا ہے جس میں سے آپ جینے کے ذوق، بھرپور زندگی بسر کرنے کی امنگ، ولولہ، اقدامیت اور آگے بڑھنے اور بڑھ چڑھ کر حصّہ لینے کے جذبے، جفاکشی اور خطرجوئی اور مہم طلبی کو پہچان سکتے ہیں۔

یہ لوگ اپنی راہ میں کسی کو حائل نہیں ہونے دیتے۔ خواہ وہ سستی ہو، یا تذبذب، یا خطرہ، یا وسائل کی کمی، یا رکاوٹوں کی زیادتی یا اصول اور اقدار کا احترام۔ جو بھی سامنے آیا ہٹا دیا جائے گا یا کچلا جائے گا۔ ان کی قوّتِ بازو موانعات کو قبول ہی نہیں کرتی۔ یہ لوگ ڈنکے کی چوٹ کماتے ہیں اور دھڑلے سے صرف کرتے ہیں۔ یہ جہاں پہونچ جائیں، اصلی مالک راہِ ہزیمت اختیار کرے۔ اسی طرح ہر کام جو ہاتھ و بل مانگتا ہو، اسے دوسروں سے بہتر کریں گے۔ فٹ بال کے کھیل سے انھیں کوئی سروکار نہ تھا۔ دیکھتے ہی دیکھتے اس میں بھی آگے بڑھ گئے۔ چاول سے انھیں کوئی نسبت نہ تھی۔ اس کی پیداوار میں ہاتھ ڈالا تو بنگال کے کان کاٹنے لگے۔ غرض یہ کہ کہیں بند نہیں ملک خدا تنگ نیست پائے مرا لنگ نیست کی ان سے زیادہ موزوں مثال تصوّر میں نہیں آتی۔ یہ لوگ لڑتے جھگڑتے ہیں تو بھی کام کی لگن اور ترقی کی رفتار دھیمی نہیں پڑتی۔ اِس وقت اکالیوں کے ایجی ٹیشن نے ریاست کو دو نیم کر دیا ہے۔ تشدد کا بازار گرم ہے۔ انتہا پسندوں اور نشانہ بازوں اور قاتلوں کی بن آئی ہے۔ اس کا ذکر کرتے ہوئے مجلس میں ایک صاحب زورِ بیان کی رَو میں کہہ گئے کہ پنجاب کی اقتصادیات تباہ ہو گئی ہے۔ وزیرِ اعلیٰ سردار دربارا سنگھ نے جو بہت ٹھنڈے مزاج کے ہیں اور ہر طرح کی بات کو طمانینت کے ساتھ سنتے ہیں فوراً احتجاج کیا کہ یہ کیا کہہ رہے ہو۔ اعداد و شمار بتاتے ہیں کہ باوجود انتہا پسندوں کی تشدد آزمائی کے، ریاست میں اقتصادی ترقی کی رفتار مدّھم نہیں ہوئی۔

ایک پمفلٹ میں جسے افتخار نامہ کہیے اور جو کانفرنس میں بانٹا گیا تھا یہ بات بتائی گئی ہے کہ پنجاب دوسری ریاستوں سے کتنا آگے نکل چکا ہے۔ اس میں دیے ہوئے مندرجہ ذیل اعداد و شمار پر غور کیجیے۔

	پنجاب	ہندوستان
فی کس آمدنی (روپیوں میں)	۲۶۴۲	۱۵۳۷
زمین اور فصلوں کا تناسب	۱۶۱	۱۲۳
سینچے ہوئے رقبہ کا مزروعہ رقبہ کے ساتھ تناسب	۸۱	۲۷
ایک ہیکٹر (ڈھائی ایکڑ) میں گیہوں کی زیادہ سے زیادہ پیداوار (کلوگرام میں)۔	۲۸۸۴	۱۴۳۷
ایک ہیکٹر میں چاول کی زیادہ سے زیادہ پیداوار (کلوگرام میں)	۲۷۳۶	۱۰۸۲
مرکزی بھنڈار کو گیہوں کی زیادہ سے زیادہ فراہمی	۷۳	

فی صد		
مرکزی بھنڈار کو چاول کی (زیادہ سے زیادہ) فی صد فراہمی	۴۸	
ٹریکٹروں کی سب سے زیادہ تعداد	۱،۱۰،۰۰۰	
فی کس دودھ کی زیادہ سے زیادہ یومیہ فراہمی (کلوگرام میں)	۵۴۱	۱۰۶
سال میں فی کس زیادہ سے زیادہ بجلی کا استعمال	۲۱۴	۱۳۰
زراعتی مزدوروں کی زیادہ سے زیادہ یومیہ اجرت	۱۴ روپیہ	
سو مربع کلومیٹر میں پکّی سڑکوں کا تناسب	۵۶ کیلومیٹر	۱۶

اِس دوڑ میں ہریانہ پنجاب کو پکڑنے کی کوشش کر رہا ہے اور گاؤں گاؤں میں بجلی لگنے کا جہاں تک تعلق ہے، ہریانہ پنجاب سے جیت بھی گیا۔ شمال مغرب کی ان دو ریاستوں نے غذائی خود کفالت کے میدان میں ہندوستان کی لاج رکھ لی۔

ان ریاستوں کے برعکس حال یو۔پی اور بہار کا ہے جہاں زندگی کی رفتار یوں ہی بہت دھیمی ہے اور اختلافات اور ذات پات نے اسے اور بھی دھیما کر دیا ہے۔

آج کے جلسہ میں بہت سی تجاویز آئیں۔ کھیل ان میں سرفہرست نظر آئے۔ جسم کی ساخت ہی کچھ ایسی ہے۔ دماغ سے کچھ عرصے کام نہ لیجیے، زنگ نہ لگے گا۔ جسم کو تھوڑی مدّت کے لیے ڈھیلا چھوڑ دیجیے کام سے جاتے گا۔ منگول جنھوں نے چشم زدن میں ساری دنیا کو زیر و زبر کر دیا، جن کی جفاکشی اور سخت کوشی اور سخت جانی ضرب المثل بن گئی ہے جب وہ ہندوستان آئے تو وہ خود سلطان غیاث الدین بلبن کو خراج دیے بنا نہ رہ سکے جس نے اپنی فوج کو کبھی نچلے بیٹھنے نہ دیا اور جو اس پر برابر لشکرکشی، ورزش اور مہم جوئی سے سان رکھتا رہتا تھا۔ کسی جماعت کی ترقی کا راز مقصد کی لگن اور مسلک پر اعتماد کے علاوہ، صحت اور تعلیم بھی ہے۔ افرادی صلاحیت ان ہی دونوں کے زیر سایہ پروان چڑھتی ہے۔ صحت کے گُر کو اہلِ پنجاب نے پا لیا ہے۔ گرہ میں سختی سے باندھ لیا ہے۔ صحت اور مہم جوئی نے انھیں ملک کے دفاع میں دخیل بلکہ شریکِ غالب بنا دیا ہے اور کھیلوں کے میدانوں میں بھی اُن ہی کا سکّہ چلتا ہے۔ پنجاب نے کسان ایسے پیدا کیے جو بنجر زمین کو گلزار بنا دیں دھرتی سے سونا اگلوا دیں اور صنعت کار ایسے جنھوں نے گھر گھر کو کارخانوں میں تبدیل کر دیا ہے۔ شہد کے چھتّے کا سا عالم ہے یہ لوگ خوب کماتے ہیں، خوب کھاتے ہیں اور (وائے قسمت) خوب پیتے ہیں۔ محنت بھی کرتے ہیں اور عیش بھی اور ایک کو دوسرے کی راہ میں نہیں آنے دیتے۔

کھیلوں کا ذکر آیا تو لگے ہاتھوں ایک شکوہ بھی کر دیا جائے ہاکی کو جو ہندوستان کی کُلاہ میں پر کی حیثیت رکھتی تھی، اہلِ پنجاب کے تصرف سے نقصان پہونچا۔ انھوں نے ہماری ہاکی کو طاقت دی دم دیا لیکن وہ ذہن نہیں دیا جو ان دونوں کو سلیقہ سے فنکارانہ اور فتحمندانہ کام میں لا سکتا۔ اسے کلائی اور کمر کا وہ

جادو نہ دے سکے جس میں اس کھیل کا جاہ اور کمال چھپا ہوا ہے۔ اور اپنے نقطۂ عروج پر شکور مرحوم کی نقاشی سے پہونچا تھا۔ بہرکیف مرحوم ہاکی کا ماتم کب تک کیا جائے۔ اب تو کرکیٹ کا جشن منانا چاہیے۔ ہم نے ایک روزہ کرکیٹ کے عالمی کپ میں آسٹریلیا، انگلستان اور ویسٹ انڈیز جیسے سورماؤں کو شکست دے کر ٹرافی جیتی ہے۔ بہتوں کے گھمنڈ ٹوٹ گئے اور ہمارا سر فخر سے بلند ہو گیا۔

کھیل کے تذکرہ سے اتنے صفحات سیاہ کر دئے، ہمیں [illegible] کے خاموش احتجاج کا احساس ہے۔ لہٰذا ہم کھیل کے میدان سے کانفرنس روم میں واپس ہوتے ہیں دبی زبان سے یہ کہتے ہوئے کوئی قوم جسم پروازی اور جفاکشی اور مہم جوئی اور گوئے و چوگاں کے بغیر نہ صحت مند رہ سکتی ہے نہ تیز رو زمانہ کی ہم قدم۔

کانفرنس کی تجاویز ہمہ گیر تھیں۔ ان میں سے بعض آرام کرسی والی بھی تھیں لیکن اہلِ پنجاب ارضی سوجھ بوجھ رکھتے ہیں، بلند پروازی اور نازک خیالی، یاوہ گوئی اور ژولیدہ فکری کو زیادہ دیر تک برداشت نہیں کر پاتے، سرِ محفل ٹوک دیتے ہیں۔ چنانچہ بات جہاں نہج سے ہٹی اور دور رس اور دور از کار باتیں ہونے لگیں وہیں کوئی سردار اُٹھا اور کہا جس مقصد سے جمع ہوئے ہو اس کی باتیں کرو۔ تعلیم اور پرچار ہوتا رہے گا۔ یہ طے کرو کہ جو آگ اس وقت لگی ہوئی ہے اسے کیسے بجھائیں پچھلی مجلس کی روداد پر بحث ہونے لگی تو معترض نے کہا۔ روداد کو چھوڑیے۔ کام کی باتیں کیجیے۔ چنانچہ ایسا ہی کیا گیا۔ ایک صاحب نے تو یہ بھی جسارت کی کہ جب وزیر اعلیٰ اپنا خطبۂ صدارت پڑھنے چلے تو کہا کہ تقسیم تو ہو گیا ہے پڑھ کے کیا کیجیے گا۔ آخر میں جب وزیر اعلیٰ گفتگو کو پایان پر پہنچا رہے تھے تو بیچ بیچ میں لوگ بے محابا اعتراض کرتے ہوئے در آتے تھے اور یہ کسی مخالفت کی بنا پر نہ تھا۔ مساواتی جسارت کے بعض دلکش مظاہر دیکھنے میں آئے۔

ایک صاحب نے کہا کہ پنجاب میں ۸۰ فی صد کاشتکار سکھ ہیں اور ۸۰ فی صد تاجر اور دوکاندار ہندو ہیں۔ ان کی تجویز تھی کہ ان دونوں کو روپے کی امدادی وادوستد کے ایک زرّیں سلسلہ میں اس طرح باندھ دیا جائے کہ باہمی اختلافات دب کر رہ جائیں اس پہلو پر زور دیا گیا کہ اکالیوں اور ہندوؤں کا حالیہ اختلاف مذہبی اختلاف نہیں ہے۔ اس کی جڑیں اقتصادی ہیں اور برگ و بار سیاسی۔ غور کیجیے ہندو مسلم فسادات میں بھی سیاست اور اقتصادیات گھس آتی ہیں۔

ایک سن رسیدہ خاتون ہمارے برابر بیٹھی تھیں وہ آریہ سماجی ہیں اور اس تحریک کے بانی لالہ لاجپت رائے کے بہت قریب رہ چکی ہیں ان کی نے پالک بیٹی کے نام سے جانی جاتی تھیں۔ ان کی روایت ہے کہ لالہ لاجپت رائے نے انھیں ۱۹۲۵ء میں بتایا تھا کہ "کمبخت" (کمبخت تو ہم نے لکھ دیا ہے۔ انھوں نے کوئی زیادہ سخت لفظ کہا تھا جو راویہ کی زبان پر نہ آیا تو ہمارے قلم سے کیسے نکل سکتا) انگریز اور (یہاں انھوں نے ایک اور نام لیا تھا۔ جس کو حذف کرنا موصوفہ نے قرینِ مصلحت سمجھا) ہمارے ملک کو کوڑھی بنا کر چھوڑیں گے۔ اس کے ٹکڑے ہو کر رہیں گے۔ مجھے حیرت ہوئی کہ تقسیم سے ۲۲ سال پہلے لالہ لاجپت رائے کو اپنی سیاسی بصیرت کے تحت ایک نئے ملک کے وجود میں آنے کا یقین ہو گیا تھا۔ محترمہ نے مجھ سے سرگوشی میں یہ بھی کہا کہ پنجاب میں جو ہنگامہ اس وقت ہو رہا ہے اس کے پیچھے پاکستان کا ہاتھ ہے۔ سوءِ ظن کی اس کارفرمائی پر میں مسکرا کر رہ گیا۔

* *

مختار مسعودؔ

فضل الرحمٰن

آزادی سے پہلے مسلم ہند کے نشیب میں ایک دریا بہتا تھا جسے مسلم یونیورسٹی کہتے تھے۔ جونہی مانسون ختم ہوتی داخلے کا موسم شروع ہوجاتا اور اس دریا میں طغیانی آجاتی۔ ہر طرف سے برساتی ندی نالے آکر اس میں گرنے لگتے۔ کچھ گہرے اکثر پایاب۔ کچھ سرکش اکثر نرم رو۔ آس پاس کی بات تو سمجھ میں آتی ہے مگر بعض دور دراز بلکہ سمندر پار سے بھی بہہ کر آجاتے۔ چند ایسی مٹی سے اٹی راہوں سے ہوکر آتے کہ پانی زرا گدلا ہوتا اور چند اتنے شفاف کہ نظر پانی میں ڈوب جائے۔ دریا انہی پانیوں سے مل کر بنتا اور اسی ذخیرے سے اٹھ کر لہریں ہنستے کھیلتے ایک دوسرے کو کہنی مار کر اس کی سطح پر جگہ لینے کی کوشش کرتی رہتیں۔

ہر سال گرمیوں میں ڈاکیہ کے پھیرے بڑھ جاتے۔ وہ روز بہت سے خط ڈال جاتا اور یہ سارے خط والدین کی طرف سے اولاد کی اعلیٰ تعلیم کے سلسلے میں مشورہ طلبی اور رہنمائی کی درخواست یا مسلم یونیورسٹی کے داخلے کی باضابطہ درخواست کی صورت ہوا کرتے۔ والدین فکرمند ہوتے تو خط رجسٹری کرادیتے۔ امیر ہوتے تو تار پر تار دیتے۔ لڑکا پڑھائی میں اچھا ہوتا تو اس کا ذکر مقابلے کا امتحان پر ختم ہوتا اور کمزور ہوتا تو بار بار ناکام ہوجانے کی ذمہ داری ممتحن کے فرقہ پرست کاندھوں پر ڈال دی جاتی۔ اس موسمی خط و کتابت کے نتیجے میں ہر سال داخلے کے دنوں میں چند لڑکوں کو اسٹیشن سے ہوسٹل پہنچانے اور دو چار کو چند دن گھر پر ٹھہرانے کا کام ایک معمول بن چکا تھا۔ ان دنوں چار پانچ سو میل کا سفر ایک معرکہ ہوا کرتا تھا جسے ریل گاڑی پر سوار ہوکر کئی دنوں میں بڑے جتن سے سر کرتے۔ اس معرکے میں گھمسان کا رن اس جنکشن میں پڑتا تھا جہاں ریل گاڑی بدلنی ہوتی تھی۔ پہلی بار تنہا سفر کرنے والے نوجوان کی خاطر جو اپنے قصباتی گھر بس سر شام مرغیوں کی طرح گن کر ڈربے میں بند کردیا جاتا تھا فکرمند والدین جنکشن پر رہنے والے کسی فرد کو ڈھونڈ نکالتے اور بالواسطہ تعلقات کو کھینچ تان کر قریبی بنالیتے اور ان کا واسطہ دے کر خواہاں ہوتے کہ برخوردار کو صحیح گاڑی میں سوار کرادیں۔ برخوردار ہمیشہ بخیریت علی گڑھ پہنچ جاتا جہاں اس پارسل کو ہم وصول کرلیتے۔ اس سالانہ ڈرامے کی ہمیں پوری مشق تھی۔ استقبال کرنے والا بروقت اسٹیشن پہنچتا، گاڑی ہمیشہ وقت پر آیا کرتی تیسرے درجے سے ایک نوجوان مسافر طے شدہ نشانی کے طور پر دائیں ہاتھ میں سرخ رومال یا بائیں ہاتھ میں نلشتے دان لیے اترتا۔ اس کے سامان میں ایک بڑا ٹرنک اور ایک پھولا ہوا بستر ہوتا جس میں ٹرنک سے بچ رہنے والے جوتے کپڑے بھی لپٹے ہوتے مسافر کو اس کے سامان سمیت یکے پر سوار کراکے گھر لے آتے۔ وہ تھکن اور شرم کے دور ہونے کے بعد پہلا تبصرہ یکے پر کیا کرتا۔ کیا بے تکی اور خطرناک سواری ہے۔ نہ چڑھنے کے لیے پائدان نہ بیٹھنے کے لیے کرسی آدمی کو سامان کی طرح لاد دیتے ہیں اور سامان کو آدمی پر لاد دیتے ہیں۔ سواری چلتی ہے تو وہ جھٹکے کھانے پڑتے ہیں کہ عمر بھر یاد رہیں۔

ایک برس ایسا آیا کہ ہمارے یہاں تین لڑکوں کی سواری اتری

امرتسر سے شیخ سرشار، سری نگر سے پنڈت رینہ اور کسی نامعلوم مقام سے فضل الرحمٰن، آخر الذکر نے داخلے کی خط و کتابت خود کی تھی استقبال کی فرمایش کے بجائے لکھا تھا کہ اسٹیشن پر کسی کو بھیجنے کی ضرورت نہیں، میں خود گھر پہنچ جاؤں گا۔ جب وہ آئے تو یکے کے بجائے تانگے پر سوار تھے۔ دوسرا تانگہ سامان سے لدا ہوا پیچھے آیا۔ سامان میں دو بڑے منقش چوبی افریقائی صندوق بھی شامل تھے۔ سالِ اوّل میں داخلہ لینے آئے تھے مگر جس عمر میں لڑکے فرسٹ ایر فول کہلاتے ہیں اس سے کم از کم دس برس بڑے تھے۔

فضل الرحمٰن کے رنگ ڈھنگ اتنے نرالے تھے کہ ابھی انھوں نے دم بھی نہ لیا تھا کہ ان سے کئی کہانیاں منسوب ہو گئیں۔ ساری کہانیوں میں اس بات پر اتفاق ہے کہ پہلی جنگ عظیم کو ختم ہوئے کوئی دس برس گزرے ہوں گے کہ ایک پندرہ سولہا سالہ لڑکا گجرات شہر کے شاہ دولھا دروازے سے نکلا اور براعظم ہند اور بحر ہند کو عبور کرنے کے بعد افریقی جزیرے زنجبار میں سلطان کے محل کے دروازے پر جا نکلا۔ کشتیاں جلا کر آیا تھا اس لیے محنت مشقت کے لیے تیار اور ہر تکلیف اٹھانے پر آمادہ۔ وہ خوش شکل اور ہنس مکھ تھا، مہم جو اور چاک چوبند تھا۔ محل کی حفاظتی پولیس میں بھرتی ہو گیا اور جلد ہی ترقی کر کے سارجنٹ بن گیا۔ پہلے وردی ملی پھر پیٹی اور پستول۔ کچھ عرصے بعد موٹر سائیکل بھی مل گئی۔ قربِ سلطانی کی وجہ سے تعلقات بڑھے، عزت بڑھی، تنخواہ اور انعام میں اضافہ ہوا۔ کلف دار وردی میں ٹھاٹھ سے اکڑے رہنے کے باوجود خوش مزاجی اور بے تکلف انداز دونوں میں اضافہ ہوتا چلا گیا۔ گرم مصالحے کے اس جزیرے میں فضل الرحمٰن کو زندگی کا بڑا چٹپٹا تجربہ ہوا۔ دیکھتے ہی دیکھتے ایک دھائی گزر گئی۔

آرام دہ مگر یکسانیت کی زندگی سے فضل الرحمٰن اکتا گئے۔ اب ان کے دل میں یہ خواہش پیدا ہوئی کہ زندگی از سر نو بسر کرنی چاہیے۔ کوئی نیا تجربہ کرنا چاہیے۔ کوئی نیا خطرہ مول لینا چاہیے۔ سلطان آف زنجبار کے محل کی طرح وہاں کا قانون بھی نرالا تھا پچیس برس کی عمر کے باوجود وہ تاحیات پنشن کے حقدار تھے۔ پنشن لے کر وہ جہاز میں داخل ہو گئے اور دو چار دن بعد یہ جہاز پورٹ سعید پہنچا۔ یہ اس اثنا میں اہرام مصر دیکھ آئے۔ دنیا مردہ اور فرسودہ لگی لیکن جب جہاز پہلی یورپی بندرگاہ پر لنگر انداز ہوا تو آنکھیں کھلی کی کھلی رہ گئیں دنیا دوبارہ زندہ ہو گئی اور دلچسپ لگی۔ سیاحت نے علم کی طرف مائل کیا اور انھوں نے مسلم یونیورسٹی میں داخلہ لے لیا۔

داخلے کے دنوں کی گہما گہمی اس سال بہت زوروں پر تھی۔ فضل الرحمٰن کی وجہ سے ہمارے گھر میں رونق لگی ہوئی تھی۔ سرِ شام بہت سے لوگ جمع ہو جاتے۔ چھڑکاؤ کیے ہوئے کچے صحن میں کرسیوں اور چارپائیوں پر اتنی دیر تک محفل جمتی کہ رات کی رانی کی خوشبو فضل الرحمٰن کی خوش کلامیوں میں گھل جاتی۔ فضل الرحمٰن افریقہ کی ملازمت اور یورپ کی سیاحت سے واپس آئے تھے ان کی راہ آورد میں ہر ایک کی دلچسپی کا سامان تھا۔ عمر ایسی کہ طلباء سے دس برس بڑے اور اساتذہ سے دس برس چھوٹے تھے۔ بیان ایسا میٹھا کہ چھوٹے اس کی چاشنی میں چپک کر رہ جائیں اور بڑے اس کی گرمی میں ہاتھ تاپنے لگیں۔ میں سفر کی داستان سننے والوں میں سب سے کم عمر تھا۔ اس کا سب سے زیادہ اثر شاید مجھ پر ہوا۔

میں نے فضل الرحمٰن سے فرمایش کر کے کئی بار پیرس کی اس نمایش اور کانفرنس کا ... سُنا جس میں شرکت کی شرط یہ تھی کہ عمر کم سے کم تیس برس اور قد زیادہ سے زیادہ چار فٹ چار انچ ہو۔ یہ بونوں کا عالمی میلہ تھا۔ فضل الرحمٰن جب اس میلے کا حال مزے لے لے کر سناتے تو سننے والے پہلے تو خاموشی سے سنتے رہتے اور بعد میں جرح شروع کر دیتے۔ اس کانفرنس کا مقصد کیا تھا۔ جواب ملتا سوشیالوجی اور لغیات کے ماہرین کے لیے ایک موقع فراہم کرنا سوال ہوتا کہ ایسی علمی کانفرنس میں میلے ٹھیلے والی بات کہاں سے آگئی۔ جواب ملتا کانفرنس عالموں کے لیے تھی اور نمایش لوگوں کے لیے۔ میلے کا مقصد یہ تھا کہ بونوں میں

زندگی کو معمول کے مطابق بسر کرنے کے عزم کو مضبوط کیا جائے۔ پھر کوئی پوچھ لیتا کہ اس کے اخراجات کہاں سے آئے تھے جواب ملتا کچھ آمدنی ہم آپ جیسے تماش بین لوگوں پر ٹکٹ لگانے سے ہوگئی اور باقی خرچہ ایک بے اولاد دولت مند کی وصیت کے مطابق اس کی جائداد سے پورا ہوا۔ اس بات پر سب ہنس دیتے اور کوئی بے یقین بول اٹھتا فضل الرحمٰن کیوں گپ مار رہے ہو۔ سعدی نے سچ کہا تھا۔ جہاں دیدہ بسیار گوید دروغ۔ فضل بھی ہنسی میں شریک ہو جاتے، کہتے، میں تو آپ کا امتحان لے رہا تھا۔ یہ براعظم توہمات کے خطِ استوا پر واقع ہے۔ یہاں ہر بعید از قیاس بات کو بلاچون و چرا مان لیتے ہیں۔ یہ نہ ہوتا تو پیری فقیری اور اشتہاری ڈاکٹری اور نیم حکیمی کا یہ عالم کیسے ہوتا۔ میں خوش ہوں کہ آپ کیوں اور کیسے کا استعمال جانتے ہیں۔ یہی بات علی گڑھ کو دوسروں سے ممتاز رکھنے کے لیے کافی ہے۔ علی گڑھ والے اس تعریف کو خراج سمجھ کر وصول کرتے۔ اس کا البتہ ملال رہتا کہ وہ بونوں کی کانفرنس کا دلچسپ واقعہ محض گپ بازی نکلا۔ فضل الرحمٰن ذرا سی دیر کے لیے اندر جاتے، ایک افریقائی چوبی ٹرنک کھولتے اور چند تصویریں نکال کر سب کے سامنے پھیلا دیتے۔ یہ تصویریں بونوں کی عالمی کانفرنس کی تھیں۔ ان میں ایک بڑا گروپ فوٹو ایسا تھا کہ اسے دیکھ کر حیرت اور بے یقینی بڑھ جاتی۔ ہر رنگ و نسل کے بونے اور ہر صورت و ساخت کے بونے۔ یہاں تک کہ لمبے اور ٹھگنے بونے اس میں قطار اندر قطار کھڑے تھے۔

ایک شام گھر سے ملحق کھیت سے گیدڑ کی آواز آئی۔ کسی نے صفائی پیش کرتے ہوئے کہا کہ سرسید بہت دور اندیش تھے۔ مسلم یونیورسٹی کے لیے غیر آباد علاقہ اس لیے منتخب کیا تھا کہ جب یونیورسٹی پاؤں پھیلائے تو چادر کم نہ پڑ جائے۔ فضل الرحمٰن بولے افریقہ میں تو کوئی شیر کی آواز پہ کان نہیں دھرتا اور آپ ہیں کہ گیدڑ کی آواز سن کر فرفر تاریخ کا سبق سنانے لگتے ہیں۔ آپ کے یہاں جنگلی جانوروں اور انسانوں میں کوئی مفاہمت نہیں ہے۔ افریقہ میں دونوں ایک دوسرے کا حق تسلیم کرتے ہیں اور مزے میں رہتے ہیں۔ وہاں اکثر ایسا ہوتا کہ درندے گھومتے پھرتے میرے گھر میں گھس آتے۔ برآمدے میں وہ پڑ رہتے اور کمرے میں میں سو رہتا۔ صبح اٹھ کر وہ جنگل چلے جاتے اور میں دفتر۔ کبھی کبھی جنگلی بلّے کی خر خر سے رات کھوٹی ہو جاتی جیسے کل رات شیخ سرشار کے خراٹوں نے سونے نہیں دیا۔ یہ اگر تکیہ اونچا کرلیں تو ان کے خراٹوں کو باہر نکلنے میں دشواری ہوگی اور ہمسایہ میں پروفیسر عنایت علی خاں کے گھر کے لوگ آرام سے سو سکیں گے۔ سرشار بحث میں الجھ گئے۔ وہ مُصر کہ میں خراٹے نہیں لیتا اور واقعہ بھی یہ تھا مگر فضل الرحمٰن کا اصرار کہ سونے والا اپنے خراٹوں کا گواہ کیسے بن سکتا ہے۔ شیخ سرشار کو فکر لاحق ہو گئی۔

فضل الرحمٰن نے بات بدلی کہنے لگے تم نے گینڈے کے خراٹے نہیں سنے۔ یوں لگتا ہے جیسے لوہار کی دکان پر بیٹھے ہوں۔ سب چوکنے ہو گئے کہ اب فضل الرحمٰن کوئی دور کی کوڑی لائیں گے۔ گینڈا کوئی ایسا موضوع نہ تھا کہ بال کی کھال کھینچنے میں دیر لگتی۔ سننے والوں اور سنانے والوں میں اس بات پر تکرار ہو گئی کہ گینڈے کی کھال کیسی ہوتی ہے۔ فضل الرحمٰن کہنے لگے گینڈے کی کھال نہیں ہوتی وہ تو خول میں رہتا ہے۔ اچھا اگر آپ خول والی بات نہیں مانتے تو کم از کم یہ مان لیں کہ اس کی کھال لکڑی کی موٹی چھال کی طرح ہوتی ہے۔ سامعین کہنے لگے ہم ہاتھی کی کھال سے ذرا زیادہ موٹی اور کھردری کھال ماننے کو تیار ہیں مگر اتنے بدھو نہیں ہیں کہ تم گینڈے پر کبھی خول چڑھاؤ کبھی چھال اگا دو اور ہم محض اس لیے مان جائیں کہ تم افریقہ سے آئے ہو۔ فضل الرحمٰن کہنے لگے کہ جس جانور کی جلد سے چمڑا بنے وہ کھال اور جس سے لکڑی کی طرح دستکار چیزیں بنائیں وہ چھال۔ گینڈے کی چھال سے ہاتھ میں لینے کی چھڑی بناتے ہیں۔ وہی لکڑی کا رنگ اور وہی عام چھڑی کی موٹائی مگر پلاسٹک کی سی لچک ہوتی ہے سامعین نے شور مچایا پھر ہانک رہے ہو، پھر کھینچ رہے ہو۔ سعدی نے سچ کہا تھا۔ جہاندیدہ بسیار گوید دروغ۔ فضل الرحمٰن ہنسی میں شریک ہو گئے۔ پھر افریقائی جاگنی کا ایک ٹرنک کھلا۔ اس میں سے گینڈے کی کھال کی ایک چھڑی نکلی۔ یہ گویا جادو کی چھڑی تھی۔ عامل نے جس کسی کو

س چھڑی سے چھو دیا وہ مقبول بن گیا۔ اس واقعہ کے بعد کئی دن تک
سی نے فضل الرحمٰن کو نہیں ٹوکا۔

میں پہلے دن سے فضل الرحمٰن کا طرفدار تھا۔ جب دوسرے بحث
ں مار کھاتے اور معلومات میں بہت پیچھے رہ جاتے تو میرا سر اونچا ہوتا
ضل الرحمٰن سر پر ہاتھ پھیرتے اور کہتے مسعود میاں پڑھنے کے لیے تمہیں
ب کہیں گے مگر سیر و سیاحت کے لیے کہنے والا شاید تمہیں میرے سوا
ئی نہیں ملے گا۔ سیر و سیاحت کے بغیر زندگی بسر کرنا نباتات کی مجبوری
ہے مگر اشرف المخلوقات کا شیوہ نہیں۔ سفر اور علم دو حقیقتیں ہیں —
زم و ملزوم۔

ایک دن ہم لوگ تانگے میں بیٹھ کر رسل گنج گئے۔ فضل الرحمٰن نے
م جلیبیاں خریدیں اور حلوائی کی دوکان پر بیٹھ کر کھانی شروع کر دیں
ہلی جلیبی منہ میں ڈالی ہوگی کہ تانگے میں سے کسی نے کھنکھارنا شروع
ا۔ وہ اس اشارے کو گول کر گئے۔ سب نے شور مچایا کہ یوں بر سرِ عام کھانا
ی گڑھ کی روایات کے خلاف ہے۔ یہ غیر مہذب اور جانگلو ہونے کی نشانی
ہے۔ بہتیرا سمجھایا مگر وہ باز نہ آئے۔ کہنے لگے اس وقت بھوک لگی ہے
س لیے کھا رہا ہوں۔ کھانے کا تعلق بھوک سے ہے۔ بھوک کے
پنے اصول ہوتے ہیں جو روایات بھوک کا خیال نہ رکھیں گی وہ مٹ
ئیں گی۔ انصاف سے کام لو کچھ تقاضے اور آداب اس مٹھائی
کے بھی ہیں۔ اسے گرم گرم کھانا چاہیے۔ بازار سے یونیورسٹی تک
پہنچتے پہنچتے اس گرم جلیبی پر ایک سرد گھنٹہ گزر چکا ہوگا۔ اس کی
رت کم ہو جائے گی۔ آپ نہ بھوک کا لحاظ کرتے ہیں نہ لذت کا خیال
کھتے ہیں۔ پاس ہے تو صرف فرسودہ روایات کا۔ یاد رکھیے جیت ہمیشہ
رم جلیبی کی ہوگی یعنی وہ بات جو عملی ہو اور وہ عمل جو فطری ہو۔ اس کے
امنے نہ روایت ٹھہر سکے گی نہ ریاست۔

برا نہ مانیں اور غلط نہ سمجھیں تو یہ کہنے کی جرات کروں گا
مجھے اچکنوں میں ملبوس علی گڑھ کے طلبا مستقبل کے معمار لگنے کے بجائے
ریخ کے گزرے ہوئے دور کا چلتا پھرتا حوالہ نظر آتے ہیں۔ چوغے،
بے، فرغل اور انگرکھے سے اچکن تک ذرا سا سفر آپ نے سو برس میں
طے کیا ہے۔ اچکن میں آپ نہ امن کے دنوں میں ورزش کے دوران
سر کے بل کھڑے ہو سکتے ہیں نہ جنگ کے میدان میں سر دھڑ کی بازی لگا
سکتے ہیں یہ نہ کارخانے کے مزدور کا لباس ہے نہ کھیت میں کام کرنے
والے کسان کے لیے کارآمد۔ آپ اس لباس میں دوڑ کر بس بھی نہیں
پکڑ سکتے زمانے کو کیسے پکڑیں گے۔ یہ لباس دیدہ زیب اور پُروقار ہے۔
آپ اس میں بہت اچھے لگتے ہیں مگر یہ پریکٹیکل نہیں۔ وہی گرم جلیبی
والی بات ہے۔ اچکن بھی ایک دن ہار جائے گی۔ وقت کیوں ضائع کرتے
ہو۔ اچکن کے بٹن کھولو۔ تمہاری شرح صدر کے لیے یہ بہت ضروری ہے
خفا ہو کر کسی نے کہا، اچکن کی مٹی پلید کر چکے اب کچھ ترکی ٹوپی
کے بارے میں بھی ارشاد ہو۔ فضل الرحمٰن کہنے لگے۔ یہ ترکی ٹوپی جس کا
استعمال ترکی میں قانوناً ممنوع ہے آپ لوگ ہر وقت سر پر دھرے رہتے
ہیں ذرا تیز چلنا چاہیں تو اس کی وجہ سے چل نہ سکیں۔ ذرا ہوا چلے تو پھندنا
بکھر جائے۔ بادِ مخالف چلے تو ٹوپی اڑ جائے۔ آپ یونیورسٹی کے سوئمنگ
باتھ میں ترکی ٹوپی کے ساتھ کیوں نہیں نہاتے۔ دنیا تو ایک سمندر ہے
اس میں ٹوپی پھندنے کے ساتھ نہانے پر کیوں مصر ہیں۔ یہ ترکی ٹوپی
تو اچکن سے بہت پہلے اتر جائے گی۔ اصل شے ٹوپی نہیں اس سے
ڈھکا ہوا سر ہے جس میں فرد اور قوم کی ترقی کے لیے علم اور سیاحت
کا سودا ہونا چاہیے۔

مسلم یونیورسٹی کی دو روایات بڑی ہنگامہ پرور اور جو ان کا نشانہ
بنے، اس کے لیے بڑی کٹھن ہوتی تھیں۔ ایک نئے طلبا کی انٹروڈکشن
نائٹ اور دوسری الکشن ہارنے والے کا جنازہ۔ پہلی تقریب میں خامیوں
پر اور دوسری میں ناکامیوں پر ہنسنا سکھایا جاتا۔ شبِ تعارف نئے
اور ناواقف لڑکوں کی شامت آجاتی، جو بوکھلا جاتا وہ مارا جاتا۔ اس
ہنگامے کا مقصد یہ ہوتا کہ خود رو پودوں کی تراش خراش کر کے انھیں باغ
کی زینت بنالیں۔ فضل الرحمٰن کو سمجھایا گیا کہ تمھاری عمر کا مذاق اڑایا جائے گا۔
سینگ کٹا کر بچھڑوں میں شامل ہونے کا طعنہ دیا جائے گا۔ پھر عمر اور علاقے
کی نسبت سے تمہیں پنجابی ڈنگر کا خطاب ملے گا، تمھاری شان میں فی البدیہ

مزاحیہ سجع کہا جائے گا، ممکن ہے رباعی یا قطعہ بھی ہو جائے۔ نہ پھبتی کا بُرا ماننا نہ ریختی کا۔ تم سے فرمائشیں بھی کی جائیں گی۔ اگر بے سُرے ہو تو بار بار گانا سُنانا ہوگا۔ سر کے پیچھے سے ہاتھ گھما کر ناک پکڑنی ہوگی اور اپنے خلاف تقریر کرنی ہوگی۔ بس مُسکراتے رہنا اور بحث میں نہ اُلجھنا۔

فضل الرحمٰن کی شبِ تعارف آئی۔ دیکھنے ہم بھی گئے تھے یہ تماشا نہ ہوا۔ آدھی رات لڑکوں نے ڈھول اور دروازہ پیٹا۔ اندر سے مندی آنکھوں اور شب خوابی کے لباس میں ہڑبڑا کر اٹھنے والے لڑکے کی جگہ فضل الرحمٰن برآمد ہوئے۔ استری کیے ہوئے کپڑے، تازہ شیو کیا ہوا دمکتا کشمیری چہرہ ہاتھ میں ایک کتاب، السّلام علیکم آپ لوگوں نے آنے میں بڑی دیر کی میں تو کب سے آپ کی راہ دیکھ رہا تھا۔ آپ سے کہیں زیادہ جلدی مجھے ہے چاہتا ہوں کہ یہ رسم تعارف ختم ہو اور میں فوراً اپنی تعلیم کی طرف توجہ کروں۔ آپ دیکھ رہے ہیں کہ میں نے تعلیم مکمل کرنے میں کتنی دیر لگا دی ہے۔ اب ذرا سا وقت بھی ضائع ہو تو گراں گزرتا ہے۔ لیجیے اسی اسٹول پر کھڑا ہو جاتا ہوں، یہ مسخروں کی ٹوپی اور گھنٹی مجھے دے دیجیے۔ میں خوشی خوشی ٹوپی پہن لیتا ہوں اور اپنے سر پر اپنے ہاتھ سے گھنٹی بجاتا ہوں۔ پچھلے سال کرسمس میں طرح طرح کی رنگ برنگ ٹوپیاں دیکھی تھیں۔ ہر شخص کی مسخرہ ٹوپی دوسرے سے مختلف تھی۔ یہ آپ اتنے بہت سے لڑکوں کے لیے صرف ایک ٹوپی لیے پھر رہے ہیں۔ خوش مذاقی اور جدت میں کسی سے پیچھے رہ جانے کا کیا جواز ہے۔ اور یہ بات بھی بے جواز نظر آتی ہے کہ آپ ترکی ٹوپی کی درگت بنا کر اسے مسخروں کی ٹوپی بنا دیں۔ جب تک یہ آپ کا سمبل ہے اس کی حفاظت اور عزت آپ پر لازم ہے۔ ہنسی مذاق کے لیے فیلٹ ہیٹ سے کام لیں۔ اس طرح انگریز کا رُعب کم ہوگا اور آزادی کی تاریخ نزدیک آجائے گی۔ اچھا آپ شیرینی کے لیے چندہ مانگتے ہیں۔ دوسروں سے آٹھ آنے اور مجھے عمر میں بڑا ہونے کا جرمانہ ایک روپیہ۔ جناب میں نے طے کیا تھا کہ آپ میری جو قیمت لگائیں گے میں اس ارزاں قیمت پر فروخت ہونے سے انکار کرتے ہوئے اس سے دوگنی رقم پیش کروں گا۔ یہ لیجیے دو روپے۔ نام رکھنا چاہتے ہیں تو بڑے شوق سے رکھیں، صرف یہ یاد رہے کہ زندہ قومیں اپنی سرحدوں کے ساتھ ساتھ اپنے مذاق کی حفاظت بھی کرتی ہیں۔ میں نے آپکے اتنے نعرے اور شعر سنے ہیں اگر جان کی امان پاؤں تو ایک مشورہ پیش کروں۔ یہ آپ کی رسمِ تعارف مجھے سفر کی مانند لگ رہی ہے آپ ایک کمرے سے دوسرے کمرے اور ایک ہوسٹل سے دوسرے ہوسٹل تک سفر کر رہے ہیں۔ آپکی مسافت بہت کم ہے۔ سفر کے فاصلے کا دارو مدار مسافر کے حوصلے پر ہوتا ہے۔ ہمت کیجیے اور کمروں کے بجائے ملکوں کے سفر پر روانہ ہو جائیے۔ بات یہاں تک پہنچی تھی کہ ایک لڑکے نے نعرہ لگایا، افلاطون کا بٹیا۔ ہجوم نے جواب دیا ہائے ہائے۔ دوسرا لڑکا بولا، کشمیری سیب، باقی بولے دو روپے سیر اس کے بعد، ہجوم شور مچاتا گھنٹی بجاتا آگے بڑھ گیا۔ ★ ★

مختصر جواب

قدیم اسپارٹا کے باشندوں میں شانِ بے نیازی توانائی کے ہمدوش تھی۔ وہ جنگجو تھے اور کم گو۔ روایت ہے کہ مقدونیہ کے بادشاہ فیلقوس (سکندر اعظم کے باپ) نے اسپارٹا کے محصور بادشاہ کو پیغام بھیجا "اگر ہم نے تمہارے شہر کو تسخیر کر لیا تو ہم اسے نذرِ آتش کر دینگے" یک لفظی جواب: "اگر" ۔

نارمن لیوس

اینٹونیو جے سنٹو (انگولہ۔ افریقہ)

میرے ماتھے کا پسینہ

ایک افریقی نظم

سامنے ان پھیلے ہوئے دور دراز کھیتوں میں بارش نہیں ہوتی
یہ میرے ماتھے کا اٹوٹ پسینہ ہے جو میری فصلوں کو سیراب کرتا ہے

ان بڑے کھیتوں میں قہوہ کے پودے تیار ہو رہے ہیں
چیری کے پھلوں میں سرخی آرہی ہے
یہ میرا خون ہے جو ان پھلوں کی رگوں میں دوڑ رہا ہے

کافی کے بیج پک جائیں گے
پھر انھیں بھونا جائے گا
ان کی رنگت کالی پڑ جائے گی
کیونکہ اس رنگت کو بدلنے میں میری کالی رنگت کو بہت دخل ہے

جاؤ ان چڑیوں سے پوچھو جو صبح سے شام تک گاتی پھرتی ہیں
جنگلوں میں
باغوں میں
پانی کی روپہلی سطح پر
پہاڑوں کی سرسبز وادیوں میں
ان سے پوچھو
صبح کو سب سے پہلے کون اٹھتا ہے ؟
سب سے پہلے کام پر کون جاتا ہے ؟
کون ہے جو لے کر جاتا ہے اس لمبی سڑک پر
وہ جہاز کا پلنگ
یا غلّے کا بوجھ
جو فصلوں کو کاٹتا ہے لیکن اس کے بدلے میں پاتا ہے جھڑکیاں
سڑے ہوئے مکئی کے دانے ۔ سڑی ہوئی مچھلی
پھٹے پرانے کپڑے ۔ اور پچاس تانبے کے سکّے
اور اپنی زخمی پیٹھ پر کوڑوں کی مار
کون ؛ کون ؛
کون ہے وہ جو باجرہ اگاتا ہے
سنتروں کے باغ لگاتا ہے
کون؟ کون ؟

مالک کو کون دولت دیتا ہے کہ وہ خریدے
کاریں ۔ مشینیں ۔ عورتیں
اور موٹروں کو چلانے کے لیے حبشیوں کے سر

ان سفید آقاؤں کو کون خوشحال کر رہا ہے
ان کی توندوں کو کون بھر رہا ہے
دولت سے
کون ؟ کون ؛

اور وہ چڑیاں جو صبح سے شام تک گاتی پھر رہی ہیں
پانی کی روپہلی سطح پر
پہاڑوں کی سرسبز وادیوں میں
وہ جواب دیں گی ۔

اب مجھے چڑھنے دو تاڑ کے درختوں پر
مجھے اس کی تاڑی پینے دو
اور اس کے پینے کے بعد میں بھول جاؤں گا
کہ میں کون ہوں ۔ ••

(ترجمہ: عشرت غنی)

جیمس اوونز

ترجمہ: نجمہ شہریار
شعبۂ انگریزی مسلم یونیورسٹی، علی گڑھ

میرا سب سے بڑا اولمپک انعام

۱۹۳۶ء کی گرمیاں تھیں۔ اولمپک کھیل برلن میں شروع ہو چکے تھے۔ قومیت کا احساس شدید تر تھا کیونکہ ہٹلر بالکل بچکانے انداز میں مصر تھا کہ اس کے ملک کے کھلاڑی بہترین حکمراں نسل کے رکن ہیں۔

میں اس سلسلے میں قطعاً متردد اور پریشان نہیں تھا۔ میں نے اپنے آپ کو بہت منضبط کیا تھا، تربیت دی تھی، پسینہ بہایا تھا اور کھیل مستقل میرے ذہن میں رہے تھے میرے وجود کا حصہ بن گئے تھے۔ جب میں سفر پر روانہ ہوا تو میرے دل میں یہی تھا کہ میں یقیناً ایک دو سونے کے تمغے لے کر واپس ہوں گا۔ میری خصوصی نظر لمبی جست پر تھی۔ سال بھر پہلے میں نے ۲۶ فیٹ ¼ ۸ انچ کا عالمی ریکارڈ قائم کیا تھا۔ ہر شخص کی نظر مجھ پر تھی اور یہ امید کی جا رہی تھی کہ میں اولمپک میں یقیناً کوئی کارنامہ انجام دوں گا۔

جب لمبی جست کے آزمائشی مقابلے کا وقت آیا تو میں انگشت بدنداں رہ گیا، چونک گیا۔۔۔ وہ گڑھے سے ۲۶ فیٹ کے فاصلے پر بڑی کامیاب کوشش کر رہا تھا۔ اس کا نام لُز لانگ تھا مجھے بتایا گیا کہ اب تک ہٹلر نے اُسے پوشیدہ رکھا تھا اس خیال سے کہ وہ اس مقابلے میں جیت سکے۔

میں نے سوچا کہ اگر لُز لانگ جیت جاتا ہے تو اس سے نازیوں کے "آریہ برتری" والے نظریے کو شہ ملے گی، آخر کو میں نیگرو ہوں چنانچہ میں نے طے کیا کہ ثابت کر کے رہوں گا کہ کون برتر ہے اور کون کمتر۔

غصے میں بھرا ہوا کھلاڑی یقیناً غلطیاں کرے گا یہ طے شدہ بات ہے۔ میں کیونکر اس سے مبرا ہو سکتا تھا۔ پہلے دن جو تین مطلوبہ آزمائشی جستیں مجھے لینا تھیں ان میں جست گاہ سے کئی انچ پرے سے میں اچھلا اور معاملہ صفر رہا۔ دوسری چھلانگ پر اس سے بھی بدتر۔ میں نے بڑی تلخی سے سوچا کہ تین ہزار میل کی دوری سے کیا میں اسی لیے آیا ہوں آزمائشی جستوں ہی میں ناکام ہونے اور اپنا مذاق اڑوانے؟

گڑھے سے چند گز کی دوری پر چلتے ہوئے میں نے بڑی بدمزگی اور غصے کے ساتھ زمین پر ٹھوکر ماری۔ اچانک مجھے اپنے کاندھے پر کسی کا ہاتھ رکھا ہوا محسوس ہوا۔ پلٹ کر دیکھا تو جرمن لُز لانگ کی نیلی دوستانہ آنکھیں میری آنکھوں میں جھانک رہی تھیں۔ اس نے پہلی ہی کوشش میں آزمائشی جستوں میں کامیابی حاصل کر لی تھی۔ اس نے گرمجوشی سے مجھ سے ہاتھ ملایا۔

"جیمس! میں لُز لانگ ہوں" وہ جرمن لہجے میں انگریزی بول رہا تھا۔

"بڑی خوشی ہوئی آپ سے مل کر" میں نے اپنی گھبراہٹ چھپانے کی ناکام کوشش کی۔ "مزاج شریف"؟

"شکر خدا کا..... میں بہ خیر ہوں..... سوال یہ ہے کہ آپ کیسے ہیں!"

"کیا مطلب آپ کا؟"

"کوئی چیز آپکو کھائے جا رہی ہے..... ارے بھئی آپ تو آنکھیں بند کر کے مقابلہ جیت سکتے ہیں.....؟"

"یقین کریں لمبی جست سے میں پوری طور سے واقف ہوں" کسی سے اس وقت یوں کہتے مجھے بڑا اچھا اور طمانیت بخش لگا۔

چند لمحوں تک ہم بات کرتے رہے..... میں نے اُسے یہ نہیں بتایا کہ ہمیں کیا چیز کھائے جا رہی ہے لیکن یہ لگ رہا تھا جیسے اُسے میرے غصّے کی وجہ معلوم ہے اور وہ مستقل مجھے تسلّی دینے میں مصروف تھا حالانکہ "نازی جوان تحریک" کے ذریعے اس کی تربیت ہوئی تھی۔ جس کے تحت ہر نوجوان کو اس کی نسل کی برتری کا یقین دلایا جاتا ہے لیکن لُز کو "آریہ برتری" والے اس نظریے پر مزید اعتبار نہ رہا تھا.....

لُز لانگ مجھ سے ایک انچ لمبا رہا ہوگا... دُبلا پتلا، صاف شفاف نیلی آنکھیں، خوبصورت بال، خوبصورت چہرہ۔ جب اُس نے دیکھا کہ میں پُرسکون ہو گیا ہوں تو اُس نے جست گاہ کے تختے کی طرف اشارہ کیا۔

"دیکھو تم جست گاہ سے دو تین انچ پیچھے ایک لکیر کیوں نہیں کھینچ لیتے.... پھر وہاں سے جست لو۔ یوں اُصول کی خلاف ورزی بھی نہ ہوگی اور تم استعداد بھی حاصل کر لوگے۔ کیا فرق پڑتا ہے اگر تم آزمائشی جستوں میں اوّل نہیں ہوا اصل کھیل تو کل کا ہے"۔

اس کی بات کی صداقت میرے دل کو چھو گئی اور میرا سارا ذہنی تناؤ آن کی آن میں دور ہو گیا۔ میں نے اُس کے بتائے ہوئے طریقے پر عمل کر کے آزمائشی مقابلے میں کامیابی حاصل کی۔

میں اُس رات لُز کے کمرے میں شکریہ ادا کرنے کی غرض سے گیا۔ مجھے پوری طرح احساس تھا کہ اگر اس کی بروقت مدد نہ ملتی تو میں فائنل کھیل میں شریک نہیں ہو سکتا تھا۔ ہم نے تقریباً دو گھنٹے باتیں کیں۔ ورزشوں اور کھیلوں کے بارے میں خود اپنے بارے میں دُنیا کے موجودہ حالات کے بارے میں اور نہ جانے کیا کیا۔

جب ہم رُخصت ہونے لگے تو ہمیں محسوس ہوا کہ ایک سچّی اور مخلص دوستی کی بنیاد پڑ چکی ہے۔ لُز دوسرے دن مجھ کو ہرانے کی کوشش کر سکتا تھا لیکن وہ یہ چاہتا تھا کہ میں بہترین کارنامہ انجام دوں۔ ایسا کرنے میں اس نے اپنا پچھلا ریکارڈ توڑ دیا فقط مجھ کو آسمان پر پہنچانے کے چکر میں۔ مجھے فتحیاب ہوتے دیکھنے کی خاطر اور ایسا کر کے اُس نے مجھے اعلیٰ ترین کارنامہ انجام دینے کے لیے آگے بڑھایا۔ مجھے یاد ہے جس لمحہ میں اپنی آخری جست مکمل کر چکا تھا (جس نے کہ ۲۶ فیٹ $\frac{5}{16}$ ۱۰ انچ کا اولمپک ریکارڈ قائم کیا) وہ میرے قریب تھا اور مجھے مبارکباد دے رہا تھا۔ اُس نے مجھ سے گرمجوشی سے ہاتھ ملایا۔ اُس کی مسکراہٹ ٹوٹے ہوئے دل کی مصنوعی مسکراہٹ نہیں تھی!

آپ میرے سارے سونے کے تمغے اور کپ پگھلا دیں تب بھی وہ ۲۴ قیراط والے کھرے سونے جیسی اس دوستی کے پاسنگ برابر بھی نہ ہوں گے — وہ دوستی جس کا اس لمحہ مجھ کو احساس ہوا۔

تب ان لمحوں میں، میں نے محسوس کیا کہ لُز لنگ لُب لباب تھا: یخ دی کو برتین کے اُن محسوسات کا جن کے تحت اس نے کہا تھا —

"اولمپک کھیلوں میں جیت کی اہمیت نہیں بلکہ حصّہ لینے کی اہمیت ہے.... زندگی میں بنیادی چیز فتح نہیں بلکہ اچھی طرح، حُسن و خوبی سے، لڑنا اور جنگ کرنا ہے"!

★★

اطہر پرویز

ہماری روایات

ہمارے سینئرز نے ہمیں "ٹریڈیشن" کے مفہوم سے آشنا کیا تھا۔ علی گڑھ والے ٹریڈیشن پر جان دیتے ہیں اسے چاہیں تو ہماری قدامت پسندی کہہ لیجیے۔ جیسے ہی کوئی نوجوان اس سرزمین پر قدم رکھتا ہے یہ لفظ اس کے کان میں پڑتا ہے۔ پہلے وہ اس لفظ سے گھبراتا ہے کیونکہ یہ لفظ اس کی نیندیں اڑانے کے لیے کافی ہے لیکن بہت جلد اس سے مانوس ہو جاتا ہے اور اتنا مانوس کہ جب وہ پہلی چھٹیوں میں گھر جاتا ہے تو علی گڑھ کی ٹریڈیشن کا اپنے عزیزوں اور دوستوں سے اتنا ذکر کرتا ہے کہ وہ اس سے پہلے مرعوب ہوتے ہیں پھر خوش ہوتے ہیں کہ علی گڑھ کے نوجوان محفوظ ہاتھوں میں ہیں۔

لیکن آئیے ذرا اس لفظ "ٹریڈیشن" کو خوردبین سے دیکھیں اُردو میں اسے روایت اور ہندی میں 'پرمپرا' کہتے ہیں۔ مجھے پرمپرا بہت پسند ہے۔ صوتی اعتبار سے یہ لفظ ہمیں اپنے مفہوم تک لے جانے کی کوشش کرتا ہے۔ "پرمپرا" — گویا تہہ بہ تہہ کا احساس دلاتا ہے۔ بعض لوگ اسے رسم کے مترادف سمجھتے ہیں۔ اس کی وجہ سے بہت سی غلطیاں سرزد ہوتی ہیں۔ رسم بری بھی ہو سکتی ہے اور اچھی بھی۔ لیکن روایت ہمیشہ اچھی ہوتی ہے۔ یہ اور بات ہے کہ ہم اس اچھی روایت کو کسی وجہ سے ترک کر دیں۔ کبھی کبھی بعض اچھی روایتیں اس لیے بھی ترک کر دی جاتی ہیں کہ زمانہ آگے بڑھ جاتا ہے اور وہ روایت اس کا ساتھ نہیں دے پاتی۔

اچھی رسمیں جب بہت دنوں تک کسی معاشرے میں چلتی رہتی ہیں، سماج یا معاشرے کو قدم قدم پر ان سے دوچار ہونا پڑتا ہے لیکن چونکہ معاشرہ اُن کو ہضم نہیں کر پاتا اس لیے وہ روایت نہیں بنتیں ایسی رسموں کو معاشرے کے دانشور بُرا بھلا کہتے رہتے ہیں اور دل سے قبول نہیں کر پاتے پھر بھی وہ صدیوں تک چلتی رہتی ہیں کیونکہ کچھ لوگوں کے معاشی مفاد وابستہ ہوتے ہیں۔ مثلاً ہمارے یہاں ستی کی رسم تھی، چھوت چھات کی رسم ہے، لڑکیوں کی شادی میں جہیز دینے کی رسم ہے یہ رسمیں صدیوں سے چلی آ رہی ہیں لیکن سماج کے دانشوروں نے ان کو پسندیدگی کی نظر سے نہیں دیکھا۔ چھوت چھات کی رسم آج بھی عام ہے لیکن اس سے انسان کا سر شرم سے جھک جاتا ہے روایات پر ہم ناز کرتے ہیں اپنا سر اٹھا کر چلتے ہیں اور اُن پر عمل کرنے کی تلقین کرتے ہیں۔

بات علی گڑھ کے ٹریڈیشن سے چلی تھی۔ یہاں بھی ہم روایت کی پاسبانی اور اس کی پاسداری کرتے ہیں۔

یونیورسٹی اسٹوڈنٹس یونین کے الکشن علی گڑھ میں بڑی اہمیت رکھتے ہیں۔ نئے آنے والے طالب علم اس کا انتظار کرتے ہیں۔ جب الکشن ہوتا ہے جلسے جلوس ہوتے ہیں۔ پوسٹر اور ہینڈ بل نکلتے ہیں۔ ایک دوسرے کے خلاف بیانات دیے جاتے ہیں کیچڑ اُچھالی جاتی ہے لیکن نتیجہ آنے کے بعد ایک جلوس نکلتا ہے۔ یہ الکشن کے خاتمے کا اعلان ہے کسی زمانے میں اس جلوس کا نام جنازہ تھا۔ خدا جانے علی گڑھ والوں نے یہ جنازہ نکالنا کہاں سے سیکھا تھا۔ دراصل علی گڑھ کے الکشن کی ایک خصوصیت یہ بھی کہ یہ الکشن اُمیدواروں کے خلاف نہیں ہوتا تھا۔ یہ ہوتا تھا کارکنوں اور سینئروں کا الکشن۔ کیونکہ اُمیدوار کی حیثیت ٹوکن کی سی تھی جس

کو سینئر کھڑا کر دیتے تھے اور یہ سینئر الکشن لڑتے تھے۔ اُمیدوار کہیں جا کر اپنے بارے میں کچھ نہیں کہتا تھا اس کے بارے "سینئر کنویسنگ" کرتے تھے اور یہ شکست اُمیدوار کی نہیں، سینئر ورکرز کی ہوتی تھی۔ جو الکشن لڑاتے تھے۔

اور پھر نتیجے کے اعلان کی رات کو باقاعدہ جنازہ نکلتا تھا لیکن یہ جنازہ کسی ایک فردِ واحد کا نہیں ہوتا تھا۔ یہ کسی جماعت کا بھی نہیں ہوتا تھا۔ یہ ہوتا تھا ان تمام غلاظتوں کا جو الکشن کے زمانے میں ایک دوسرے پر پھینکی جاتی تھیں۔ یہ جنازہ تھا ان تمام گندے الزامات کا جو ایک دوسرے پر لگائے جاتے تھے۔ یہ جنازہ بڑی دھوم دھام سے نکلتا تھا۔ مرثیے اور نوحے پڑھے جاتے تھے اور اس طرح وہ غلیظ فضا دُھل جاتی تھی اور جب اگلی صبح طلوع ہوتی تو دلوں کے غبار مٹ جاتے تھے۔ کدورتیں ختم ہو جاتی تھیں اور ایسا لگتا تھا کہ کچھ ہوا ہی نہیں۔ یونین کا نائب صدر، سکریٹری اور دوسرے عہدے دار کسی جماعت کے نہ ہوتے تھے بلکہ وہ پوری یونیورسٹی کے طلبا کے نمائندے سمجھے جاتے تھے۔

لیکن کچھ برسوں کے بعد یہ نقشہ بدل گیا۔ یہ برائیوں کا جنازہ، ہارنے والے امیدوار کا جنازہ بن گیا اور پھر جھگڑوں کا سلسلہ شروع ہو گیا۔ ایک بار ہارنے والا اُمیدوار غیر مسلم تھا تو اُس نے فرقہ وارانہ شکل اختیار کر لی اور بالآخر ایک دن یونیورسٹی کے ارباب حل و عقد نے جنازے پر پابندی لگا دی۔

اس طرح ایک اچھی روایت دیکھتے دیکھتے کیا سے کیا ہو گئی۔

اس جنازے کے سلسلے میں بڑے خوبصورت مرثیے اور نوحے سننے کو ملے۔ مجازؔ مرحوم کا لکھا ہوا مرثیہ برسوں یونیورسٹی کے گلی کوچوں میں سنائی دیا ؎ عاشق کا جنازہ ہے ذرا دھوم سے نکلے

یہ سچ ہے کہ روایتیں بنتے بنتے بنتی ہیں لیکن تخریبی قوتیں انھیں ذرا سی دیر میں ختم کر دیتی ہیں۔ اس لیے روایتوں پر عمل کرتے ہوئے ان کی حفاظت کرنا بھی ضروری ہے۔ اگر چور سے گھر کی حفاظت کرنی ہے تو پھر چوکیدار ہونا ضروری ہے جو رات میں "جاگتے رہو جاگتے رہو" کے نعرے لگاتا ہے کہ ہم اطمینان کی نیند سو سکیں۔

اگر علی گڑھ ایک تہذیبی ورثہ ہے تو اس کی حفاظت ہم کو بہر حال کرنی ہے اور اس دولت کو کم کرنا نہیں بلکہ اس میں اضافہ کرنا ہے اور یہ دولت روپے پیسے سے نہیں بڑھتی بلکہ اس کے لیے خون پسینہ ایک کرنا پڑتا ہے۔ آیئے ہم عہد کریں کہ اس کے لیے تن من سے اپنا کام کریں گے۔

★★

شاعرانہ چشمک

★ شاعروں کی آپس کی نوک جھونک مشہور ہے۔ شاید کسی زبان کی شاعری ایسے معرکوں سے خالی نہیں۔ ہماری شاعری کی تاریخ میں ایسے قصے کچھ زیادہ ہی ہیں۔ میر کی سودا سے چشمکیں رہتی تھیں، انشا مصحفی سے دست و گریباں تھے، غالب کی ذوق سے چوٹیں رہتی تھیں۔ اب سے کوئی چوتھائی صدی پہلے میرٹھ کے دو استاد - مولانا ندرت میرٹھی اور ہوشیار میرٹھی۔ اپنے شاگردوں سمیت ایک دوسرے کے مقابل صف آرا تھے۔ ہوشیار میرٹھی نے کسی مشاعرے میں شعر پڑھا۔ مولانا ندرت کے ایک شاگرد نے داد دی۔ واہ استاد کیا سمجھا ہوا شعر کہا ہے۔ ہوشیار قلعی گر تھے فقرہ چپک گیا۔ ان کے شاگرد موقعے کی تاک میں رہے۔ کسی مشاعرے میں مولانا ندرت نے مطلع پڑھا

دل گیا، جان گئی، یار کے پیکان کے ساتھ
گھر سے گھر والے بھی رخصت ہوئے مہمان کیساتھ

ہوشیار کے شاگرد نے داد دی واہ استاد کیا بات کہی ہے ؎

گھر سے گھر والی بھی رخصت ہوئی مہمان کے ساتھ

وار بھرپور تھا۔ مولانا غزل پھینک مشاعرہ گاہ سے رخصت ہو گئے ★

اخلاق احمد
شعبۂ اسلامیات، مسلم یونیورسٹی، علی گڑھ

مسلمانوں کا کارنامہ

یورپ کی زراعت میں

اسلام سے پہلے ماحول کے لحاظ سے عربوں کے لیے تجارت کا پیشہ موزوں تھا لیکن فاتح کی حیثیت سے فن سپہ گری کی اہمیت سے کیسے انکار کیا جا سکتا تھا ریگستانی سرزمین نے جہاں ان کو پانی ترسا رکھا تھا وہاں ان کو ہریالی اور سبزے سے بھی محروم رکھا تھا۔ ریگستان اور پہاڑوں کی دشوار زندگی نے ان کو سخت کام کرنے کا عادی بنا رکھا تھا۔ بحیثیت حکمراں کے بھی کام کرنے میں ان کو عار نہیں تھا جس ملک کی زمین قابل کاشت تھی ان لوگوں نے زراعت کا پیشہ اختیار کرنے میں شرم محسوس نہیں کی۔ اس کے علاوہ پورا معاشرہ صرف کسی ایک کام تک محدود نہیں رہ سکتا تھا۔ وہ تازگی ہریالی اور شادابی کی محرومی کا بھرپور مداوا کرنے کی کوشش میں لگ گئے۔ مختلف قسم کی فصلیں پھول، پھل، درخت، سبزی اور جڑی بوٹیوں سے یورپ کا دامن بھر دیا۔ اگرچہ یورپ کا جنوبی حصہ بحر روم کی ہوا کی وجہ سے مختلف قسم کی فصلوں اور پھلوں سے مالا مال تھا لیکن مسلمانوں نے اس حصہ کی زرخیز مٹی اور آب و ہوا سے مزید فائدہ اٹھانے کی کوششیں کیں اور کامیاب رہے۔ بڑھتی ہوئی فتوحات کے تحت مختلف حصوں کے ذرائع ان کو دستیاب تھے۔ نئے قسم کے بیج اور پودوں سے انھوں نے یورپ کی نباتات میں بے مثال اضافے کیے۔ یورپ کے اندر نقدی فصل کا کوئی تصور نہیں تھا اور نقدی فصل کا تعلق تجارت سے تھا۔ تھوڑے سے یورپی زائرین کے علاوہ باہر کی دنیا کا کسی کو کوئی خاص علم نہیں تھا۔ اس لیے تاجر اور تجارت کا مقصد محدود ہو کر رہ گیا تھا۔ نئے زراعتی رجحان کے تحت مقامی اور عام لوگوں کی محنت کا فائدہ اٹھایا گیا۔ معاشرتی حالات بہتر ہوئے ساتھ ہی ساتھ یورپ کی اقتصادی حالت پر مسلمانوں کا قبضہ ہو گیا۔ مسلمانوں نے یورپ کے اندر اپنی جدوجہد اور شوق کا ثبوت دیا۔ رومی حکومت کے دور میں یورپ، شمالی افریقہ اور مغربی ایشیا کے خاص حصے قبضے میں تھے لیکن نباتی نقل اس وقت انجام نہ پا سکی کیونکہ یورپ کے اندر زراعت پیشہ لوگ ضرور تھے لیکن نباتات داں طبقہ نہیں پایا جاتا تھا۔ یہاں کے لوگوں کے زراعت پیشہ ہوتے ہوئے بھی گیہوں اور شراب شمالی افریقہ سے منگائی جاتی تھی۔

اسپین کے اندر میدانی حصے اور پہاڑی سلسلے پائے جاتے تھے۔ لیکن شمالی پہاڑیوں کا ایک طویل سلسلہ تھا۔ اس پہاڑی اور بنجر علاقے میں مسلمان آباد نہیں ہونا چاہتے تھے۔ اس حصے میں مسلمانوں سے شکست کھائے ہوئے عیسائیوں نے پناہ لی تھی اور پھر مسلمانوں کے زوال کے وقت طاقت بن کر جنوب کی طرف بڑھنا شروع کیا۔ اس ملک کے زیادہ تر لوگ زراعت پیشہ تھے۔ آبپاشی کا کام دریاؤں یا چند نہروں سے لیا جاتا تھا اس کے علاوہ کنویں اور رہٹ سے کبھی کام نہیں لیا جاتا تھا۔ پانی کا مسئلہ اہم تھا۔ مشرق میں سینچائی کے لیے بہت طریقے ترقی کر گئے تھے۔ مسلمانوں نے اپنے مقبوضہ علاقے

میں نہروں اور رہٹ کا استعمال کیا۔ مروجہ قانون کے تحت صحیح طریقے سے ترتیب کے ساتھ لوگوں کو پانی پہنچایا جاتا تھا۔ اس علاقے میں گیہوں، زیتون، جو، چنا، رائی، مکئی جوار وغیرہ کی پیداوار ہوتی تھی بحرروم کی آب و ہوا کے اثر سے پھل، لیمو، انجیر، بادام، انار، کیلا، بلوط وغیرہ پیدا ہوتے تھے۔ مسلمانوں نے اخروٹ، آڑو، شفتالو، نیشکر، خوشبودار جڑیں مختلف قسم کے پھل اور پھول، لونگ اور صندل، عود، زعفران، دارچینی، کالی مرچ وغیرہ کا اضافہ کیا۔

عبدالرحمٰن اوّل نے اسپین کے اندر اقتدار حاصل کرنے کے بعد اموی حکومت کی بنیاد مستحکم کی۔ اس کی پرورش شاہی محل کے اندر خلیفہ ہشام کی نگرانی میں ہوئی تھی تعلیم و تربیت بخوبی انجام پائی۔ بلند معیار اور اچھا ذوق رکھتا تھا۔ قرطبہ کے پاس مغرب کی جانب ایک سیرگاہ بنوائی جس کا نام رُصافہ رکھا۔ یہی نام اس کے دادا ہشام نے بھی اپنی سیرگاہ کے لیے پسند کیا تھا۔ رصافہ ایک خوبصورت شاداب باغ تھا۔ مقامی درختوں اور پودوں کے علاوہ دور دراز ممالک خاص طور سے دمشق، بغداد اور شام سے مختلف قسم کے درخت منگوائے تھے۔ اسی کام کے لیے قاصد دور دراز کا سفر کرتے تھے۔ اس کے علاوہ لذیذ پھلوں کے بیج اور گٹھلیاں منگوا کر لگوائے گئے تھے پھر تھوڑے ہی عرصے میں پھل دار درخت تیار ہوگئے تھے اور پھر پورے اسپین کے مختلف حصوں میں پائے جانے لگے۔ حکومت کے کاموں سے فارغ ہونے کے بعد عبدالرحمٰن اپنا زیادہ تر وقت باغ میں گذارتا تھا۔ اس باغ کے اندر ایک خوبصورت محل بھی تھا۔ رصافہ کا انار (رمان سفری) کے نام سے مشہور تھا کیونکہ اس کا رنگ، مٹھاس، اس کی لذت، ذائقہ نرالا تھا۔ اس باغ میں کھجور کی گٹھلیاں نصب کی گئیں لیکن صرف ایک درخت تیار ہو سکا اس درخت سے عبدالرحمٰن کے وطن کی یادیں وابستہ تھیں۔ اس کے دیکھنے کے بعد اس کے احساسات کے تاروں کی جھنکار اٹھتی تھی۔ ایک روز اس نے کھجور کے تنہا درخت کے متعلق چند اشعار موزوں کیے۔

تبدلت لنا وسط الرصافة نخلة

نبات بارض الغرب عن بلد النخل

ترجمہ: رُصافہ کے وسط میں کھجور کا ایک تنہا درخت نظر آیا، جو نخلستان کی آبادی سے جدا ہو کر مغرب کی زمین میں آگیا ہے۔

فقلت شبیہی بالتغرب والنویٰ

وطول اکتنابی عن بنی وعن اهلی

ترجمہ: میں نے اس سے کہا تو غریب الوطنی اور جدائی اور بال بچوں سے طولِ فراق میں میرے مشابہ ہے۔

نشأت بارض انت فیہا غریبة

فمثلک فی الاقصاء والمنتہای مثلی

ترجمہ: تو نے ایسی زمین میں نشو و نما حاصل کی جہاں تو بالکل ہی پردیسی ہے۔ تیری مثال اپنے وطن سے دور دراز مقام پر جدا کر دیے جانے میں میرے مانند ہے۔

اسپین نے بہت کچھ مشرق وسطیٰ اور عربوں سے حاصل کیا اور ان کے ذریعہ یورپ کے بیشتر حصوں میں تہذیب و تمدن کے علاوہ ہر قسم کی زراعت اور پھل پیدا کرنے کے طریقے، بے شمار نئے پودے پھل اور سبزیاں یورپ میں عام ہوئیں جس کی آج کوئی اہمیت نہیں ہے۔ اسپین کے اندر جو عرب تھے حقیقت میں ان کا شمار دنیا کے مشہور باغبانوں اور کاشتکاروں میں ہوتا تھا۔

سسلی کا زیادہ تر حصہ کوہستانی ہے۔ سب سے اونچا پہاڑ اٹنا ہے جو یہاں کا مشہور آتش فشاں پہاڑ ہے۔ آتش فشانی کے باوجود اس پر سرسبز درخت پائے جاتے ہیں، بندق، آرزق وغیرہ کے درخت پائے جاتے ہیں۔ سسلی میں بھی مسلمانوں نے زمین کی قدرتی بناوٹ اور آب و ہوا کے فائدے اٹھا کر زراعت کو ترقی دی کیونکہ سسلی میں دریاؤں، چشموں، جھیلوں اور نہروں کا جال بچھا ہوا تھا۔ نباتی نشو و نما کے لیے آب و ہوا عمدہ تھی۔ وادیاں چراگاہوں کے کام آتی تھیں، جہاں مختلف قسم کے جانور پائے جاتے ہیں۔ کوہ اٹنا کی آتش فشانی

اور گرم ہواؤں سے فصلوں کو نقصان پہنچتا تھا۔ ضرر رساں پہلو سے فصلوں کو بچانے اور زراعت کو ترقی دینے کی کوشش کی گئی۔ بنجر زمینوں کو قابلِ کاشت بنایا گیا۔ چھوٹی چھوٹی پہاڑیوں اور ٹیلوں کو ہموار کرنے کے بعد کھیتی کے لیے زمین تیار کی گئی۔

مٹیالی سطح پر سیب، لوط، فندق، آلو بخارا اور دوسرے میووں کے درخت لگائے گئے اور پہاڑی حصہ جس کو بالکل ہاتھ نہیں لگایا جاسکتا تھا وہاں اخروٹ، صنوبر، چلغوزے اور دوسرے قسم کے درخت لگائے گئے اور پورا حصہ سرسبزی اور شادابی سے ڈھک گیا۔ باربرداری اور کاشت کے سلسلے میں یہاں کے جانور، گھوڑے خچر، گدھے، گائے بیل، کام میں لائے گئے، غلوں میں گیہوں خاص قسم کی پیداوار تھی۔ اس کے علاوہ چنا مٹر وغیرہ کی پیداوار ہوتی تھی۔ ترکاری میں کدو، بیگن، ککڑی وغیرہ تھیں۔ یہاں پھلوں کی افراط تھی۔ انگور، نارنگی، لیمو، سیب، ناشپاتی، انجیر، چلغوزے، زیتون بادام، اخروٹ، خباری، شفتالو، ناریل وغیرہ کثرت سے پیدا ہوتے تھے۔ گلاب، بنفشہ، مہندی، سرو وغیرہ کے درخت باغوں میں پائے جاتے تھے۔ سسلی کی زمین اور یہاں کی آب و ہوا زعفران کے لیے موزوں نہیں تھی پھر بھی مسلمانوں نے یہاں زعفران پیدا کرنا شروع کر دیا۔ جو چیزیں یہاں نہیں پائی جاتی تھیں دوسری جگہوں سے لاکر پیدا کی جاتی تھیں۔ ان میں خاص طور سے کتان اور نیشکر قابلِ ذکر ہیں۔ عربوں نے روئی کا پودا صرف صیقلہ میں ہی نہیں بلکہ اسپین کے اندر بھی پہنچایا۔ اس طرح سے نیشکر کی کھیتی اور پھر اس سے شکر بنانے کا طریقہ مسلمانوں نے اہلِ چین سے سیکھا پھر اُن کے ذریعہ یورپ والوں نے سیکھ لیا اور چیزوں کے علاوہ خربوزہ، جڑی بوٹیاں گرم مصالحے اور خوشبودار چیزیں انھوں نے عراق، شام اور ہندوستان سے لاکر اس جزیرے میں پیدا کرنا شروع کر دیا۔ مسلمانوں کے عہد میں سسلی کے اندر رس دار پھل، نیشکر، کھجور اور شہتوت کی پیداوار دسویں صدی تک ہوتی رہی جب تک وہاں مسلمانوں کی تہذیب کا اثر رہا۔ یہ بات اہم ہے کہ مختلف اشیاء کے ایشیا سے دوسرے ممالک میں جانے کا پتہ چلتا ہے مگر ایسی کسی چیز کی نشاندہی نہیں ہوئی کہ یورپ سے ایشیا لائی گئی ہو۔

جنوبی یورپ کے اندر مشرقی ممالک سے۔ طرح طرح کے پیڑ پودے وغیرہ اور سینچائی کے اصول مسلمانوں کے ذریعہ پہنچے۔ سسلی کے اندر نارمن عہد میں مسلمانوں کی مدد سے زرعی ترقی کافی ہوئی۔ یورپ کے اندر مسلم فاتح ہی نہیں داخل ہوئے تھے بلکہ مسلمانوں کا پورا معاشرہ وہاں پہنچا تو مختلف لوگ مختلف مشاغل میں مصروف ہوئے۔ وہاں زراعت کی طرف بھی رجحان بڑھا۔ آب رسانی کے مختلف ذرائع مسلمانوں کی دین تھی۔ جانور جو کھیتی کے کام میں استعمال ہوتے تھے مسلمانوں نے ان سے پانی بھی نکلوانا شروع کیا، زمین دوز نالے، چشمے، جھرنوں کے ذریعہ ان شہروں میں پانی لے جایا جاتا تھا جہاں پانی کی قلت ہوتی تھی جس کی وجہ سے شہری ترقی ممکن ہوئی۔ یورپ کے جن حصوں میں کھیتی ہوتی تھی وہاں کھیتی کرنے اور سینچائی کا کوئی نہ کوئی طریقہ بھی موجود تھا مسلمانوں نے ان میں فنی طریقوں کا اضافہ کیا۔ ہوسکتا ہے کچھ طریقے دوسرے ممالک سے لائے گئے ہوں اور کچھ انھوں نے حالات کے تحت سوچ سمجھ کر ایجاد کیے ہوں لیکن ان کے کارناموں سے روگردانی کرنا انصاف کی بات نہ ہوگی۔

★★

فن کار

جو آدمی ہاتھ سے کام کرتا ہے وہ مزدور ہے جو
آدمی ہاتھ اور دماغ سے کام کرتا ہے وہ کاریگر ہے
جو آدمی ہاتھ اور دماغ اور دل سے کام کرتا ہے
وہ فن کار ہے۔

لوئی نیزیر

یاسین حسین
شعبۂ علم طبقات الارض، مسلم یونیورسٹی، علی گڑھ

ایک عطیۂ قدرت کی ناقدری

آبی آلودگی

وقت بدلا اس کے ساتھ انسان اور اس کی ضروریات بدلیں
رقی کے مدارج طے کرنے کے ساتھ ساتھ قدرت کے نظام میں اس
دخل اندازی بھی بڑھتی گئی۔

اس دخل اندازی کے کچھ اچھے نتیجے بھی نکلے اور کچھ بُرے بھی۔
لاً یہ کہ ایک شاعر کی نظر میں محبت کی نشانی ہے۔ تاج محل اس
خوبصورتی کو خطرہ لاحق ہوگیا۔ وادی کشمیر کی حسین ڈل جھیل کے
تم ہونے کے اندیشے پیدا ہوگئے۔ ماحولیاتی تحفظ وقت کے لیے چیلنج
ن چکے ہیں۔ ڈٹرجنیٹس کا روز افزوں استعمال صنعتی فضلہ، شور،
ٹرولی و ڈیزل گاڑیوں کا دھواں، تابکار عناصر آلودگی کا باعث ہیں۔

ہوا کے بعد زندگی کے لیے سب سے اہم پانی ہے لیکن آلودگی کے
نسدادی نظام کی غیر موجودگی میں یہ بھی زیادہ عرصے تک محفوظ نہیں
ہ سکتا۔ تاریخ میں آبی آلودگی کا پہلا ثبوت ۱۸۵۴ء میں لندن میں
تا ہے جب کہ براڈ اسٹریٹ پمپ (BROAD STREET PUMP)
آلودگی کی وجہ سے چالیس دن کے اندر اندر چھ سو سولہ افراد
یضے کا شکار ہو کر موت کی آغوش میں پہونچ گئے تھے۔

عالمی صحت تنظیم (W.H.O.) کی ایک رپورٹ کے مطابق
یا میں ہر روز ۲۵۰۰۰ افراد پانی کی قلت یا آلودہ پانی کے استعمال
وجہ سے موت کا شکار ہو جاتے ہیں سالانہ ایک کروڑ لوگ جن میں
زیادہ تر نوزائیدہ بچے ہوتے ہیں پانی کی ناکافی سپلائی کی وجہ سے
لقمۂ اجل بن جاتے ہیں ترقی پذیر ممالک میں ہر پانچ میں سے چار بچے
پانی سے پیدا شدہ بیماریوں کی وجہ سے چل بستے ہیں۔ رپورٹ میں اس
بات پر بھی روشنی ڈالی گئی ہے کہ دنیا میں سالانہ پچاس کروڑ افراد
پانی سے متعلق بیماریوں سے متاثر ہوتے ہیں۔

آبی آلودگی کے اسباب:

نامیاتی یا غیر نامیاتی مادّے کی وجہ سے قدرتی پانی کے اوصاف
میں کوئی تبدیلی یا پانی کے درجۂ حرارت میں کمی بیشی، آبی آلودگی
کہلاتی ہے۔ آلودگی کے سرچشمے قدرتی بھی ہو سکتے ہیں اور انسانی
بھی۔ قدرتی آلودگی میں یہ ہوتا ہے کہ جس وقت صاف پانی دلدلی
علاقوں یا تیل اور کوئلے کے ذخائر سے گزرتا ہے تو اس میں مُضر
اجزا شامل ہو جاتے ہیں۔ بڑھتی ہوئی آبادی کے ساتھ ضروریاتِ
انسانی کا دائرہ بھی وسیع ہوتا جا رہا ہے۔ کھیتی کے لیے مصنوعی کھاد اور
کیڑے مار دواؤں کا استعمال، گندے نالوں کی غلاظت و کوڑا کرکٹ صنعتی
فضلہ، سمندروں میں نیوکلیائی ٹیسٹ (NUCLEAR TESTS)
تجربہ گاہوں میں تابکار ہمجا (RADIO ISOTOPES) کا استعمال
حرارتی بجلی گھروں سے اور صنعتی مراکز سے گرم پانی کی نکاسی آبی

لودگی کے لیے خاص وجہ بنتے جا رہے ہیں۔

ہندوستان گھنی آبادی والا نسبتاً غریب ملک ہے پچھلی تین
ھائیوں میں تیزی سے بڑھتی ہوئی آبادی اور صنعتوں کی وجہ سے
بی آلودگی نے بہت سے مسائل پیدا کر دیے ہیں۔ گنگا جو کہ ایک
قدس دریا سمجھا جاتا ہے اور کروڑوں لوگوں کو پینے کا پانی فراہم
رتا ہے سب سے زیادہ آلودہ ہو چکا ہے اس کے پانی کا معیار کانپور
یں چمڑے اور دیگر صنعتوں کی وجہ سے گر رہا ہے۔ چند سال پہلے
روُنی ریفائینری سے تیل کے رسنے کی وجہ سے آبی آلودگی کے علاوہ
ریا میں پانچ گھنٹے تک آگ لگی رہی علاوہ ازیں اشنان گھاٹوں پر
اکیزگی کے متلاشی اپنی غلاظت اس پوتر دریا کی بھینٹ کر جاتے
ہیں۔ آبی آلودگی سے نمٹنے کے لیے مرکزی بورڈ کے اعداد و شمار کے
مطابق دریائے جمنا میں روزانہ تین لاکھ مکعب میٹر انسانی فضلہ اور
بیس ہزار مکعب میٹر زہریلی صنعتی فضلہ بہتا ہے۔ دہلی میں ۳۲۲۹
صنعتی اکائیوں میں سے ۲۵۹ کارخانے رقیق فضلہ پیدا کر رہے ہیں
جس کے انسداد کا کوئی انتظام نہیں ہے اس جگہ سے جہاں نجف گڑھ
نالہ (جو کہ ۲۱۶ کارخانوں کا فضلہ لے جاتا ہے) جمنا سے ملتا ہے اوکھلا
تک پانی اتنا آلودہ ہو جاتا ہے کہ یہ کھیتی کے قابل بھی نہیں رہتا آگرہ
میں بھی چمڑے کی صنعت کی وجہ سے یہ مزید آلودہ ہو جاتا ہے لکھنؤ
میں دریائے گومتی شہری غلاظت اور ایک پیپر مل کی وجہ سے
آلودہ ہو رہا ہے۔ بہار کے دریائے دامودر کے پانی کا معیار بوکارو
اسٹیل پلانٹ اور جھریا کول واشیریز کی وجہ سے گرا ہے۔ دریائے
سون میں کلورین کے زیادہ ارتکاز کی وجہ مرزا پور کی فیکٹریاں ہیں۔

آبی آلودگی سے خطرات:

ہمارے سفید انقلاب اور سبز انقلاب کا سب سے نمایاں دشمن آبی
آلودگی ہے جس کی اہمیت کی اندازہ اس سے لگایا جا سکتا ہے کہ
انسانی جسم میں پانی کی مقدار ۷۰ فیصد ہے جس میں سے پانچ فیصد
پانی روزانہ بدل جانا چاہیے اور اگر یہ پانی آلودہ ہو تو؟

یہ اندازہ لگایا گیا ہے کہ ہندوستان کی تقریباً ۷۵ سے ۸۰ فیصد
آبادی کو پینے کا صاف پانی میسر نہیں ہے۔ نتیجہ یہ کہ ہر سال پانچ کروڑ
سے زیادہ افراد مختلف امراض کا شکار ہو جاتے ہیں اور بیس لاکھ سے
زیادہ پانی سے پیدا شدہ امراض کی بدولت موت کی بھینٹ چڑھ جاتے
ہیں۔ مئی ۱۹۸۱ء میں مغربی دہلی کے ننگلوئی گاؤں میں ایک ماہ کے
اندر اندر دو ہسپتالوں میں اسہال کے تیرہ سو مریضوں اور ہیضہ کے
سات سو مریضوں کا علاج کیا گیا۔

اس ماہ سورت کے دیہات سے بچوں میں دانتوں اور
ہڈیوں کی بیماریوں اور بالغوں کے جوڑوں میں درد، جسموں میں
بھدہ پن اور مچھلیوں کا تیزی سے خاتمہ کی شکایات موصول ہوئی ہیں
تحقیقات کرنے پر پایا گیا کہ ایک ریفریجریٹر گیس پلانٹ کے فضلے کی وجہ
سے دریائے مندھولا میں فلورائڈ کی بہتات ہو گئی تھی جس میں سے
سے آبی آلودگی کی وجہ سے دماغی امراض میں اضافہ ہوا۔

انٹوزول امراض (ENTOZOAL DISEASES) جیسے نیماٹوڈ
(NEMATOD) فلیوکس (FLUKES) بلہرزیا (BILHARZIA)
گنی ورم (GUNIEA WOUM) اور ہک ورم (HOOK WORM)
آبی آلودگی کی ہی دین ہیں ٹیپ ورم (TAPEWORM) اور راؤنڈ
ورم (ROUND WORM) کے انڈے بھی پانی کے ذریعہ ہی انسان
تک پہنچتے ہیں پانی میں غیر نامیاتی مادے کی موجودگی اسہال اور دائمی
قبض کے لیے ذمہ دار ہے جبکہ پیٹ کی اکثر بیماریاں نامیاتی مادہ کی وجہ سے
ہوتی ہیں آبی آلودگی کی وجہ سے میعادی بخار، یرقان، ہیضہ اور دماغی
امراض پیدا ہوتے ہیں اس کی وجہ سے نوزائیدہ بچوں کے قد پر
بھی اثر پڑ سکتا ہے۔

ہندوستان اور چند دیگر ساحلی ممالک میں انسانی فضلہ میں
امراض کے جراثیم ہوتے ہیں جس کی وجہ سے کالا بخار، موتی جھرا اور
ورم جگر جیسے امراض جنم لیتے ہیں کچھ مچھلیاں نہایت زہریلے پولی کلورینیٹڈ

بائی فی نائیل (P.C.B.) کو برداشت کر لیتی ہیں اور یہ اُن کے جسموں میں جمع ہوتا رہتا ہے۔ یہ مچھلیاں کھانے سے جلدی امراض بانجھ پن جگر کی بیماریاں، قے، وزن میں کمی یرقان، آنتوں پر ورم اور پیٹ کا درد جیسے موذی امراض لاحق ہو سکتے ہیں امریکا کے ماحولیاتی تحفظ ایجنسی (U.S.E.P.A.) کے مطابق پانی کو صاف کرنے کے لیے کلورینیشن بھی مہلک ہے کیونکہ اس کی وجہ سے کلوروفارم کا ارتکاز بڑھتا ہے جس کی وجہ سے کینسر کے خطرات پیدا ہو سکتے ہیں۔

ڈی۔ ڈی۔ ٹی (D.D.T.) پیرا تھون (PARATHION) میلا تھیون (MELATHION) اینڈرن (ENDRIN) ڈائی ایلڈرن (DIELDRIN) ٹوکسافین (TOXAPHENE) آنڈین (UNDANE) اور ہیپٹا کلر (HEPTACHLOR) جیسے کیڑے مار دواؤں کی وجہ سے آبی زندگی پر بُرا اثر پڑتا ہے ان کی وجہ سے شمسی شعاعیں نیچے تک نہیں پہونچ پاتیں۔ شعاعی ترکیب عمل میں رخنہ پڑتا ہے فری آکسیجن کم ہو جاتی ہے نتیجہ یہ کہ آبی پودے گل سڑ کر سطح آب پر آجاتے ہیں آلودہ پانی کچھ ان جراثیم کے لیے سازگار ہوتا ہے جو مچھلیوں میں مختلف بیماریاں پھیلا دیتے ہیں۔

انسدادی تدابیر:

آبی آلودگی خواہ وہ شہری غلاظت سے ہو، صنعتی فضلہ سے ہو یا کھیتی میں استعمال کی جانے والی کیمیائی کھادوں اور کیڑے مار دوائیوں سے ہو بہرحال زمین کے قدرتی آبی نظام کے لیے اور نوع انسانی کے لیے ایک زبردست خطرہ ہے اس لیے آبی آلودگی کا پتہ لگانا اور اس کا تدارک کرنا ہندوستان کے لیے ہی نہیں بلکہ صنعتی طور پر تمام ترقی پذیر ممالک کے لیے ایک اہم ضرورت ہے۔

یقیناً اس نیک کام میں قدرت کی مدد بھی ہمارے ساتھ ہے شعاعی ترکیب عمل سے لہروں اور پانی کے چٹانوں کی وجہ سے فری آکسیجن پیدا ہوتی ہے جو آبی آلودگی کے تدارک میں معاون ہے۔ سورج کی روشنی بہت سے مہلک جراثیم اور جانداروں کو ختم کر دیتی ہے کچھ جاندار وقت کے ساتھ ساتھ ختم ہوتے رہتے ہیں۔ پُرسکون دریاؤں میں تلچھٹ کے عمل سے آلودگی کا مادہ نیچے بیٹھتا رہتا ہے۔ زمین دوز پانی کے لیے قدرتی فلٹریشن بہترین ہے لیکن اس مرحلے پر صرف قدرتی وسائل پر تکیہ کرنا دانشمندی نہیں ہے ضرورت ہے کہ اسکولوں اور کالجوں کی سطح پر ماحولیاتی تعلیم کا بندوبست کیا جائے، ایسے قوانین بنائے جائیں جو آلودگی کے روکنے میں معاون ثابت ہوں اور ان خطرات کے بارے میں عوام کو معلومات فراہم کی جائیں اس بات کو یقینی بنایا جائے کہ آلودگی کے لیے ذمہ دار اجزا کی نکاسی دریا میں نہ ہو پائے بلکہ نکاسی سے پہلے آلودہ پانی کی تخلیص ہو جائے اس امر کو ملحوظ رکھا جائے کہ زیادہ سے زیادہ استعمال قدرتی کھادوں کا ہو اور حتی الامکان آلودہ پانی کی نامیاتی مادہ سے تخلیص کے لیے GRANULAR ACTIVATED CARBON FILTERS کے استعمال کا مشورہ دیا ہے جو کہ ہر تیسرے ہفتے یا بائیس گیلن پانی چھاننے کے بعد تبدیل کئے جا سکتے ہیں۔

★★

کرنل محمد خان

..... جو دیدۂ عبرت نگاہ ہو

ان دنوں قاہرہ میں میلاد النبی کا تہوار بڑی شان سے منایا جاتا تھا۔ خود شاہ فاروق تقریبات میں حصّہ لیتے۔ اس سال کے یوم میلاد میں ہمارے کیمپ کے مسلمان جوانوں نے بھی شرکت کرنا چاہی۔ چونکہ ہمارے سپاہیوں کا مصریوں کے ساتھ اختلاط کا معاملہ تھا، کرنل صاحب نے مجھے خود ساتھ جانے کو کہا کہ کوئی ناخوشگوار واقعہ نہ ہونے پائے۔ چنانچہ میں، صوبیدار صاحب اور کوئی پچاس جوان صاف ستھری وردیاں پہنے فوجی لاریوں میں بیٹھ کر جلسہ گاہ میں پہنچے۔ شاہ فاروق کے آنے میں کچھ وقت تھا کہ صوبیدار صاحب نے میرے کان میں کہا۔

"اگر اجازت دیں تو شاہ فاروق کے آنے پر ہم نعرۂ تکبیر بلند کریں؟"

میں نے پوچھا "کیوں"؟

بولے۔ "خلیفۂ اسلام ہے اور ہمارا دل چاہتا ہے کہ اپنے مسلمان بادشاہ کے لیے نعرہ لگائیں۔"

میں نے منع کر دیا کہ ہم وردی میں آئے ہوئے ہیں ہمیں اس تقریب میں متانت سے حصّہ لینا چاہیے۔ یہ موقع نعرہ بازی کا نہیں۔ وطن میں جا کر یا یونٹ میں ہی کوئی جلسہ کر کے، نعرے لگا کر دل ہلکا کر لیں گے۔

صوبیدار صاحب خاموش ہو گئے لیکن سخت ناخوش۔ میرے ساتھ ہی بیٹھے تھے اور میں دیکھ رہا تھا کہ وہ میرے غیر اسلامی رویے پر سخت برہم ہیں۔ اتنے میں آواز آئی کہ جلالۃ الملک کی سواری آ رہی ہے۔ یہ سنا تو صوبیدار صاحب کا چہرہ جگمگا اُٹھا۔ ان کی نظریں اس سمت میں گڑ گئیں جدھر سے شاہ فاروق کو جلسہ گاہ میں داخل ہونا تھا۔ ان کا تنفّس تیز ہو گیا۔ میں نے ان کی حالت غیر ہوتے دیکھی تو ان کے بازو پر ہاتھ رکھا لیکن ہاتھ کے بجائے ان پر شہتیر بھی گرتا تو ان کی توجہ کا کچھ نہ بگاڑ سکتا۔ وہ اب ایک دوسری دنیا میں پہنچ چکے تھے۔ جونہی شاہ فاروق نے دروازے کے اندر قدم رکھا۔ صوبیدار صاحب بجلی کی سرعت سے اُٹھ کھڑے ہوئے اور فضا میں ایک آواز بلند ہوئی۔

"نعرہ۔ اے۔ تکبیر"

نعرہ اور لمبی 'اے' کے بعد تکبیر کا لفظ اس طرح ادا ہوا جیسے فلیتہ جلنے کی شوں شوں کی آواز کے بعد یک لخت گولا پھٹتا ہے اور جوں ہی صوبیدار صاحب لفظ تکبیر تک پہنچے، ہمارے پچاس جوانوں نے یک زبان ہو کر نعرہ لگایا۔ اللّٰہ اکبر

اس پر شاہ فاروق کسی قدر حیرت سے مسکرائے اور حاضرین نے شاہی مسکراہٹ سے اشارہ پا کر تالیاں بجا دیں۔

واقعہ یہ تھا کہ ہمارے نعرے کو کسی نے سمجھا نہ تھا۔ چاروں الفاظ بے شک عربی کے تھے لیکن ان کا پنجابی تلفظ اور وہ بھی ایک نعرے کی شکل میں مصریوں کے فہم سے بعید تھا۔ وہ یہ سمجھے کہ ہندوستانیوں نے کوئی تماشا کیا ہے۔ چنانچہ میں نے صوبیدار صاحب کو ایک قہر آلود نگاہ سے دیکھا۔ لیکن صوبیدار صاحب تو اپنے خلیفہ کے حضور میں تھے۔ ایک خستہ حال نیم لفٹین کیا اور اس کی نگاہِ غضب کیا؟ شاہ فاروق ہماری طرف بڑھ رہے تھے۔ جب ہمارے قریب سے گزرے تو جیسے

صوبیدار صاحب کا اندر سے بٹن دب گیا ہو۔ پھر دیوانہ وار اُٹھے اور وایاں بازو بلند کر کے نعرۂ تکبیر کی صدا لگائی اور ایک مرتبہ اور اللہ اکبر کی آواز گونجی۔ اب کے شاہ فاروق نے قہقہہ لگایا اور تمام حاضرین خصوصاً پاشاؤں نے شاہی قہقہے کی تائید میں اپنے جی حضوری گلے پھاڑ کر رکھ دیے اور شامیانہ سر پر اُٹھا لیا۔ ہر چند کہ اللہ اکبر کا نعرہ ہمارا دین وایمان تھا تاہم اس مجلس میں اس نعرہ بازی سے ہم تماشا بن گئے۔ شاہ فاروق کرسیٔ صدارت پر بیٹھ گئے۔ جلسے کی کارروائی شروع ہوئی تو جلسے کے منتظم بکری پاشا میرے پاس آئے اور ٹوٹی پھوٹی انگریزی میں مجھے مبارکباد دے کر کہنے لگے۔

"تمہارے نوجوانوں کے تماشے سے جلالتہ الملک بہت خوش ہوئے ہیں۔ اگر یہ لوگ حضور کی رخصت کے وقت بھی ایسا کریں تو حضور اور خوش ہوں گے۔" لگے ہاتھوں مجھے یہ مژدہ بھی سنایا کہ تمہاری چائے کا انتظام کر دیا گیا ہے۔ اب اگر میں بکری پاشا کو دل کی بات بتاتا تو کہتا کہ تم اور تمہارا بادشاہ بہشت کی دوسری طرف جا سکتے ہو لیکن یہ کہنے کی بات نہ تھی۔ بکری پاشا کی سنا کیا اور خون جگر پیتا رہا۔ صوبیدار صاحب بھی بکری پاشا کی بات سن رہے تھے۔ ظاہر ہے کہ خلیفۂ وقت کی خوشنودی کا امکان ہو تو وہ دن بھر نعرے لگاتے رہیں گے۔ بہرحال جیسا کہ فوج کا دستور ہے، میں نے صوبیدار صاحب سے کہا۔ آپ نے عدول حکمی کی ہے۔ آپ اپنے آپ کو زیر حراست سمجھیں صوبیدار صاحب کے چہرے کا رنگ ذرا پھیکا ہونے لگا اور آپ نے میری طرف دیکھا بلکہ پہلی دفعہ محسوس کیا کہ یہ شخص بھی ساتھ آیا ہے اور اپنے دل میں وہی باتیں سوچنے لگے جو گرفتاری کے وقت لوگوں کے دماغ میں آتی ہیں؛ چنانچہ ایک لمحے کے لیے ان کے ذہن میں خلیفۃ اللہ اور بکری پاشا کے درمیان سے ہمیں بھی باریابی ہوئی لیکن اتنے میں فاروق تقریر کے لیے اُٹھ کھڑے ہوئے۔ لگے صوبیدار صاحب نے ہمیں دماغ سے نکال باہر کیا۔ ان کی آنکھوں میں پھر وہی روشنی عود کر آئی۔ ان کے نزدیک ہر مصری باتیں کرتے وقت قرآن پڑھتا معلوم ہوتا تھا اور اب تو امیر المومنین خود سخن سنج تھے۔ صوبیدار صاحب کی آنکھوں کی روشنی ایک آتشیں شعلے میں تبدیل ہو گئی۔

فاروق ابھی دو لفظ بھی نہ کہنے پائے تھے کہ صوبیدار صاحب نے اپنی جگہ پر ہی یعنی میری بغل سے "اللہ اکبر" کا نعرہ بلند کیا۔ فاروق اس دخل در معقولات سے پہلے تو ذرا ٹھٹھک سے گئے لیکن معاً ان کے ہونٹوں پر تبسم نمودار ہوا اور تمام پاشے کھلکھلا اُٹھے۔ تالیاں بجنا شروع ہوئیں۔ صوبیدار صاحب نے یہ دیکھا تو سمجھے کہ مصر فتح کر لیا ہے۔ لگے ہاتھوں ایک مزید نعرہ لگایا مگر وفور جوش سے گلے پر معمول سے زیادہ زور دے دیا۔ آواز ہچکولے کھانے لگی۔ فاروق اور ان کے حواری ہنس ہنس کر دوہرے ہو رہے تھے۔ بکری پاشا بھاگے بھاگے آئے اور میرا شکریہ ادا کیا کہ تمہارے سپاہیوں نے جلالتہ الملک کو آمادۂ خندان کر دیا۔ میں شرم سے غرق نیل ہو رہا تھا۔ نہ صرف ہماری فوج بلکہ قوم کی سبکی ہو رہی تھی اور یہاں دونوں کی آبرو کا محافظ میں تھا کہ سب سے سینیئر تھا لیکن اپنی سینیارٹی کا استعمال کس شکل میں کرتا۔ بکری پاشا کی داڑھی نوچ لیتا؟ فاروق کو شٹ اپ کہتا؟ صوبیدار صاحب کے منہ میں فونٹین پین ڈال دیتا؟ یا کیپٹن کو وہیں فال ان کر کے رائٹ لیفٹ کرتا جلسہ گاہ سے باہر نکل آتا؟ ان میں سے کوئی حرکت بھی کرتا تو صوبیدار صاحب سے بھی زیادہ ممتاز الّو بنتا؛ چنانچہ انتہائی بے بسی میں سر جھکا کر بیٹھا گیا اور سنتا رہا۔ خدا ہی جانتا ہے کہ ہمارے سر پر کیا کیا آرے چلے اور کیا کیا نعرے لگے۔

آخر مجلس برخاست ہوئی۔ واپس کیمپ میں پہنچے۔ صوبیدار صاحب کو اب دربار خلیفہ سے نکل کر یونٹ لائن میں آگئے تھے، برخاستگی بلکہ قید کی تیاری کرنے لگے۔ صوبیدار صاحب کا جرم سنگین تھا لیکن اس سادہ اور جوشیلے مسلمان کا جیل خانے سے ایک بہتر اور باعزت مصرف بھی تھا یعنی محاذ جنگ۔ دوسرے روز دفتر میں بلایا تو صوبیدار صاحب سمجھے کہ اب کورٹ مارشل ہوتا ہے لیکن جب محاذ جنگ پر جانے کا حکم سنا تو ان کی آنکھوں میں روشنی کی وہی پرانی کرن پھوٹی، سیلوٹ کیا، دفتر سے باہر نکلے اور معاً "اللہ اکبر" کی صدا بلند ہوئی۔

★

فرخ جلالی

عہدِ سرسید میں
قانونِ ٹرسٹیان کی حمایت اور مخالفت

سرسید کی تعلیمی تحریک اصلاح اور ترقی کا ایک جامع منصوبہ تھا اس کی حمایت اور مخالفت مختلف سمتوں سے کی گئی۔ مسلم عوام اور ہندوستانیوں کا وہ طبقہ جو اس تعلیمی تحریک کی مدد اور اعانت کر سکتا تھا وہ غیر منظم تہی مایہ اور بے اثر تھا۔ سرسید کی اس تعلیمی تحریک کے حامی منتشر اور بے آواز تھے۔ سرسید نے محمڈن اینگلو اورینٹل کالج کا خاکہ ۱۸۷۰ء میں لندن میں بنا لیا تھا۔ ۱۸۷۲ء سے ۱۸۷۴ء تک اس کی تعلیمی منصوبہ بندی کی تشکیل کا زمانہ ہے۔ ۱۸۷۵ء میں ایم اے او کالج کا قیام عمل میں آیا۔ ۱۸۸۲ء کے تعلیمی کمیشن کے سامنے سرسید نے نہایت جرأت سے ایک فکر انگیز بیان دیا جس میں انھوں نے صاف کہا ضلع کے حکام مسلمانوں میں خصوصًا اور ہندوستانیوں میں عمومًا اعلیٰ مغربی تعلیم کی اشاعت کے مخالف ہیں اس کا اندازہ اور تجربہ سرسید کو مختلف طریقوں سے ہوا۔ سرسید نے دیکھا کہ زمینداروں کا ایک بڑا طبقہ اس تعلیمی تحریک سے بے تعلق ہے۔ اودھ کے زمیندار اس عظیم تعلیمی تحریک سے بے تعلق رہے۔ ۱۸۸۸ء تک سرسید کو پنجاب اور لاہور کی یونیورسٹیوں میں مشرقی زبانوں کی تدریس کو اوّلیت دینے کی کوششوں کا تجربہ ہو چکا تھا۔ بقول شبلی جس کی انھوں نے بھرپور مخالفت کی تھی۔ مختلف اسباب کی بنا پر ۱۸۸۵ء میں انھوں نے محمڈن اینگلو اورینٹل کالج کا مشرقی شعبہ ختم کر دیا۔

فارسی عربی کی تعلیم جاری رہی۔ سرسید کو احساس ہو گیا تھا کہ نئی سلطنت کے حکام مغربی تعلیم کے مباحث اور مقامات سے مسلمانوں اور ہندوستانی عوام کو بے خبر رکھنا چاہتے تھے۔ وہ انگریزی کی بس اسی قدر تعلیم چاہتے تھے کہ پُرانے منشیوں کے بجائے نئے کلرک مل جائیں اور اس کی باقاعدہ کوشش کی گئی کہ مسلم آبادیوں کے بڑے مراکز کو تعلیمی تحریک سے الگ رکھا جا سکے اور انگریز حکام اس میں کامیاب بھی ہوئے۔

محمڈن اینگلو اورنٹیل کالج میں ان کو ایک نہایت تلخ اور انوکھا تجربہ ہوا۔ کچھ ضلع کی سطح کے مقامی مسلم حکام اور علی گڑھ اور اس کے نواح کے وہ مسلم رئیس جو سرسید کے ساتھ تھے سخت مخالفت پر آمادہ ہو گئے۔ ۱۸۸۵ء تک سرسید کو اندازہ ہو گیا کہ ان کے بعد محمڈن اینگلو اورنٹیل کالج کو انگریز حکام محض ایک مشرقی مدرسہ بنا دیں گے۔ لہٰذا انھوں نے ایک جامع منصوبہ بنا کر محمڈن اینگلو ورنٹیل کالج کو ایک قانون کے ماتحت کر دیا تاکہ آئندہ اس تعلیمی تحریک کے بنیادی مقاصد سے انحراف نہ کیا جا سکے۔ سرسید کی زندگی میں انگریز پرنسپلوں کی کوشش یہ ہوتی تھی کہ مسلم طلبا ایم۔اے نہ کر پائیں اور اگر کریں تو فارسی اور عربی میں ایم۔اے کریں۔ سرسید کے قریبی ساتھی زین العابدین کے لڑکے زین الدین مشکل سے

انگریزی میں ایم۔اے۔کر پائے تھے۔

۱۸۸۹ء میں جب سرسید نے قانونِ ٹرسٹیان پیش کیا تو ان کے بعض قدیمی ساتھی اور علی گڑھ اور نواح کے اکثر زمیندار انگریزی حکام کے دانستہ یا نادانستہ دام میں آگئے اور انھوں نے محمڈن اینگلو اورنٹیل کالج کے اس استحکام کی مخالفت شروع کردی۔ اس قانون ٹرسٹیان کی مخالفت کا بظاہر ایک سبب سیّد محمود کو تاحیات نائب سکریٹری مقرر کرنا اور سرسید کے انتقال کے بعد سیّد محمود کا آنریری سکریٹری مقرر کرنا تھا۔ سرسیّد نے ایک جگہ لکھا ہے:

"لندن ہی میں میں نے اس مدرسہ کے قائم کرنے کی اور تعلیم کی تمام تجویزوں کو پورا کیا۔ یہاں تک جس نقشہ پر آپ اس کالج کی عمارتوں کو بنتا ہوا دیکھتے ہیں یہ بھی لندن میں قرار پا چکا تھا۔ میں بدنصیبی سے انگریزی سے ناواقف تھا۔ میں سیّد محمود کا نہایت شکرگزار ہوں کہ تمام واقفیت اور اطلاعیں جو مجھ کو حاصل ہوئیں اس میں سیّد محمود نے میری بڑی مدد کی۔ مجکو اس بات کے اقرار کرنے سے نہایت خوشی ہے کہ اگر انکی مدد نہ ہوتی تو جس مقصد سے میں لندن گیا تھا میرا جانا فضول تھا۔"

لیکچر دربیانِ تاریخانہ حالات کالج، از سرسیّد مطبع مفید عام آگرہ ۱۸۸۹ء ص ۲

سرسیّد نے پھر لکھا:

"ایک اور امر ہے جس کو میں بہت بڑا عظیم الشان سمجھتا ہوں گو اور لوگ اس کو حقیر سمجھیں کہ یہ کالج جس مقصد اور جس پالیسی سے میں نے قائم کیا ہے اور جس نتیجہ قومی ترقی پر میں نے اوسپر محنت کی ہے۔ میرے بعد بھی اسی طرح اور اسی نتیجہ پر یہ کالج چلے۔ سیّد محمود ابتدا سے آج تک ان تمام صلاحوں میں شریک غالب رہے ہیں اور مجکو اس بات کا یقین کامل ہے کہ سوائے سیّد محمود کے اور کوئی شخص اس کالج کو اس طریقہ پر نہیں چلا سکتا۔"

لیکچر دربیانِ تاریخانہ حالات کالج، از سرسیّد، صفحہ ۴۴

سرسید کی ان رایوں سے معلوم ہو گیا کہ سرسید نے نیک نیتی سے سیّد محمود کو اپنا جانشین مقرر کیا تھا اور یہ بھی ممکن ہے کہ مخالف حضرات میں سے بعض نے نیک نیتی یا بھولے پن سے مخالفت کی مگر یہ قانونِ ٹرسٹیان جو تین سو آٹھ دفعات پر مشتمل تھا محض سیّد محمود کی تقرری سے متعلق نہ تھا۔ سیّد محمود اس زمانہ میں یوپی میں جسٹس تھے اور یہ ہندوستانیوں کے لیے ایک بڑا عہدہ تھا۔

سرسیّد اس مخالفت سے اس قدر دل برداشتہ ہوگئے کہ انھوں نے تحریر کیا:

"چونکہ مخالفین نے، جو تعداد میں معدودے چند ہیں اور صرف پارٹی فیلنگ سے اور صرف نفسانیت سے، مخالف پارٹی قائم کرنے کے ارادے سے آپس میں صلاح و مشورہ کر کے اور ایک پارٹی قائم کر کے رائیں بھیجیں تھیں اور ایک نے دوسرے کی رائے کی نقل کی تھی اور یہ خطوط بھی اوسیطرح ایک دوسرے کی نقل یا خلاصہ ہیں اور بجز مخالف پارٹی بنانے کے قومی ہمدردی یا کالج کے فایدہ کا کچھ خیال نہ تھا۔"

قانونِ ٹرسٹیان کا بنیادی مقصد دفعہ ۳ کے تحت یہ رکھا گیا تھا

اس کالج کا مقدم مقصد مسلمانوں کو تعلیم دینا ہوگا جہاں تک اس مقصد کے خلاف نہ ہو ہندوؤں اور اور لوگوں کو بھی تعلیم دے گا۔

★ ★

رائے مشورے

★ یکم اکتوبر کا تہذیب الاخلاق کا شمارہ وصول ہوا۔ فوٹو آفسیٹ پر طباعت کے باعث ظاہری شکل و صورت واقعی بہتر ہو گئی ہے۔ قاضی معز الدین صاحب کی ادارت سے سبکدوشی کا سن کر افسوس ہوا لیکن امید ہے وہ قلمی تعاون سے تہذیب الاخلاق کو ضرور سنوارتے رہیں گے۔ رسالے کو بہتر بنانے کے لیے دو عنوانات ذہن میں آ رہے ہیں۔ یونیورسٹی کے شب و روز اور سرسید کے خطوط۔ پہلے عنوان سے علی گڑھ سے باہر کے لوگوں بالخصوص اولڈ بوائز کو خاص دلچسپی ہے اور دوسرے سے تاریخی حالات اور سرسید کے خیالات کا علم ہوگا۔

اشتیاق محمد خاں ــ بمبئی

★ یہ مختار مسعود کون صاحب ہیں۔ ان کا مضمون ایل۔ کے۔ جیدر پر نظر سے گذرا۔ بہت ہی جچا تلا اور دلکش۔ مکمل مصفیٰ ہے۔ انھوں نے یقیناً مشرقی تربیت پائی ہے اور مغربی ذوق ادب۔ دونوں کی چاشنی اور تہذیب اس مختصر سے مضمون میں ملی۔ ملاقات ہو تو داد دیجیے گا۔ زیادہ سے زیادہ لکھنے پر اصرار کیجیے گا۔

(ڈاکٹر) ظ۔ انصاری، ڈپارٹمنٹ آف فارن لنگویجز۔ بمبئی

★ تہذیب الاخلاق کا نیا شمارہ نئی سج دھج کے ساتھ کچھ دن روپوش رہنے اور انتظار کرانے کے بعد موصول ہوا۔ اس میں تبدیلیاں لاکر ایک نیا نکھار دینے کے لیے مبارکباد قبول فرمائیے۔ اگر اس کو مداخلتِ بے جا نہ تصور کریں تو عرض کرنے کی اجازت چاہوں گا کہ انگریزوں کے جو قول اس میں تین جگہ درج کیے گئے ہیں ان کی جگہ ہندوستان ہی کے مفکروں کے قول نقل کیے جائیں تو بہتر ہوگا۔ اس کے لیے بہتر ہوگا کہ علامہ شبلی، مولانا ابو الکلام آزاد وغیرہ ہی کے خیالات و نظریات شامل کیے جائیں۔

محمد امین مسعود، تلک نگر، لکھنؤ

(مسعود صاحب! روپوش رہنے کی بات سمجھ میں نہیں آئی۔ اس کی اشاعت میں نہ تاخیر ہوئی، نہ ناغہ۔ غالباً کوئی شمارہ ڈاک میں ضائع ہوا۔ دوبارہ طلب کر لیجیے۔ مشرق و مغرب کے معاملے میں ہمارا مسلک وہ ہے جس کی اقبال نے تلقین کی تھی کہ:

مغرب سے ہو بیزار نہ مشرق سے حذر کر
فطرت کا اشارہ ہے کہ ہر شب کو سحر کر۔

پھر بھی دیکھیے آپ کے مشورے پر کسی حد تک عمل ہوا ہے۔ ادارہ)

★ سرسید نمبر موصول ہوا۔ آپ نے اہم ترین قلم کاروں کا تعاون حاصل کیا ہے۔ یہ کم اہم بات نہیں ہے۔ پروین احسن کے مضمون "لے کے سید جو گزٹ اٹھے..." کے کچھ حصے طلبا (بھوپال یونیورسٹی، خط و کتابت کورس) کو سنائے۔ ٹوٹے ہوئے جوتے کا ذکر آیا تو اکثر طلبا کی آنکھیں نم ہو گئیں۔

اخلاق اثر ــ بھوپال

★ سرسید نمبر ملا۔ یہ ایک معیاری نمبر ہے۔ صفحہ ۱۲ پر دو اقتباسات پیش کیے گئے ہیں جو ان کے مذہبی مضامین سے لیے گئے ہیں۔ سرسید نے ہندوستانی مسلمانوں کی تعلیمی اور معاشرتی اصلاح کے لیے جو کام کیا اسے ملت اسلامیہ کے ہر طبقے اور ہر فرقے نے دل کھول کر سراہا اور ان کی مدد بھی کی۔ لیکن مذہبی اصلاح کے عنوان سے انھوں نے جو کام کیا اس میں ان سے بڑی لغزشیں ہوئیں اور اسی بنا پر اس دور کے علمائے کرام نے اس دائرے میں ان کی سخت مخالفت کی۔ یہاں تک کہ ان کے قریب ترین ساتھیوں نے ان کی تعلیمی تحریک میں اس شرط پر حصہ لیا کہ ایم۔ اے۔ او۔ کالج کے طلبا کو ان کے مذہبی لٹریچر کی ہوا بھی نہیں لگنے دی جائے گی۔ سرسید مرحوم نے اس شرط کو بخوشی منظور کر لیا تھا۔

سرسید کے اصلاحی مقاصد کے حصول واشاعت کے لیے تہذیب الاخلاق
دوبارہ جاری کیا گیا ہے۔ یہ بڑی خوشی کی بات ہے لیکن میری رائے میں
ذیب الاخلاق کے اوراق کو مرحوم کے تعلیم و معاشرت سے متعلق
بالات تک ہی محدود رکھا جائے تو بہتر ہوگا۔ مرحوم کے مذہبی
یالات کی اشاعت کی جائے گی تو اختلافات کا دروازہ کھل
ئے گا اور اس صورت میں آپ کی صحافتی دیانت داری کا یہ
اضا ہوگا کہ آپ تہذیب الاخلاق کے اوراق میں ان خیالات کی
ی اشاعت کریں مثلاً تعدد ازدواج سے متعلق سرسید مرحوم
نے قرآنی آیات کی روشنی میں جن خیالات کا اظہار کیا ہے وہ صحیح
ہیں ہیں۔ قرآن اور شارع علیہ السلام نے تعدد ازدواج کا دروازہ
کز بند نہیں کیا۔ خود حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم اور صحابۂ کرام کا اس
سلسلے میں جو طرز عمل تھا وہ کس سے پوشیدہ ہے۔ ہاں، یہ صحیح ہے
ایک سے زیادہ شادیاں کرنے والوں کو اللہ تعالیٰ نے انصاف
نے اور توازن رکھنے کا سختی سے حکم دیا ہے اور اس پر اخلاص نیت
ے ساتھ عمل کیا جانا بھی ضروری ہے کہ جس کا عملی نمونہ ہمیں آقائے
جہاں اور آپ کے صحابہ کی زندگیوں میں نظر آتا ہے لیکن یہ انصاف
ز عمل میں ہوگا محبت میں نہیں۔ محبت ایک غیر اختیاری جذبہ ہے اور
سلام، کہ جو دین فطرت ہے، غیر اختیاری جذبات پر قدغن نہیں لگاتا
د ہمارے آقا کو تمام امہات المومنین سے یکساں محبت نہیں تھی۔

اللہ تعالیٰ نے بیویوں کی طرح اولاد کے ساتھ مساوی طرز عمل
ختیار کرنے کا بھی سختی سے حکم دیا ہے لیکن ظاہر ہے کہ وہ حکم محبت کے
ے نہیں ہے۔ چنانچہ والدین کو اپنی کسی اولاد سے دوسروں کی بہ نسبت
م طور پر زیادہ محبت ہوتی ہے تو کیا وہ محبت معصیت سمجھی جائے گی۔

محمد اللہ خاں — سہاور، ضلع ایٹہ۔

• آپ نے تو رسالے کو بالکل بدل ڈالا۔ مبارک ہو۔ ایک تجویز یہ
ے کہ یونیورسٹی کے حالات و مسائل پر بھی اس میں اظہار خیال
اکرے۔ (ڈاکٹر) شاہد قمر (ممبر یونیورسٹی کورٹ) علی گڑھ

تہذیب الاخلاق ملنے کے پتے:

- ★ ایجوکیشنل بک ہاؤس، شمشاد مارکیٹ، علی گڑھ
- ★ مکتبہ جامعہ، اردو بازار دہلی، پرنسز مارکیٹ بمبئی، شمشاد مارکیٹ علی گڑھ
- ★ محب بک ڈپو ۱۱۹ رحمت اللہ روڈ بالمقابل ہمدرد، بھنڈی بازار، بمبئی ۳
- ★ بک امپوریم، سبزی باغ، پٹنہ ۴
- ★ مسکین بک ڈپو، موتی ڈونگری روڈ، جے پور ۴
- ★ شمع بک اسٹال، اسٹیشن روڈ، مظفر پور
- ★ محمد الیاس نیوز ایجنسی ۹۱ کولوٹولہ اسٹریٹ کلکتہ ۷۳
- ★ اسماعیلیہ بک ڈپو، نیو مارکیٹ، تاتارپور چوک، بھاگل پور
- ★ سکندر نیوز ایجنسی، پہلا پل، لال چوک، سری نگر
- ★ ایم۔ آئی۔ مرزا۔ مدار نیوز پیپر ایجنٹ، بیجاپور
- ★ زینت اردو نیوز ایجنسی، پرانا محلہ، ڈنڈیلی
- ★ جمال بک ڈپو، باری روڈ، گیا
- ★ بنگلور بک ہاؤس، کلاسی پلیم، مین روڈ، بنگلور
- ★ نصرت بک ایجنسی، انجمن بلڈنگ، ہبلی
- ★ حفیظ بک ڈپو، جمال منزل، وارث پورہ، کامٹی
- ★ حنیف بک ڈپو، مومن پورہ، ناگ پور
- ★ سینٹرل نیوز ایجنسی لمیٹڈ۔ ۲۳/۹، کناٹ سرکس، نئی دہلی
- ★ مکتبہ معارف الاسلام، نظام پورہ، بھونڈی
- ★ انوار بک ڈپو، شمشاد مارکیٹ، علی گڑھ
- ★ نکہت بک ڈپو اے۔ بی۔ مارکیٹ، آسنسول
- ★ اردو مرکز، محلہ حاجی سبحان، مونگھیر
- ★ محمد حسین، اسٹیشن روڈ، دھنباد
- ★ بہار بک ڈپو، پکی سرائے، مظفر پور
- ★ نسیم بک ڈپو، ٹاور چوک، دربھنگہ
- ★ محمد اعظم خاں، تھریا محابت خاں، بریلی
- ★ گل مہر بک ہاؤس، نزد پٹنہ لاجنگ، سبزی باغ، پٹنہ

علی گڑھ مسلم یونیورسٹی علی گڑھ

اشتہار نمبر ۸۴-۸۳/۲۲

مندرجہ ذیل اسامیوں کے لیے مقررہ فارموں پر درخواستیں مطلوب ہیں۔

۱۔ کیوریٹر:۔ مولانا آزاد لائبریری۔ مسلم یونیورسٹی علی گڑھ۔

شرح تنخواہ:۔ ۱۱۰۰۔۵۰۔۱۶۰۰ روپیہ اور دیگر الاؤنس۔

استعداد:۔ (۱) عربی یا فارسی میں ایم اے اور بی لب سائنس یا لائبریری سائنس میں ایک سالہ پوسٹ گریجویٹ ڈپلومہ (تمام امتحانات میں مسلسل فرسٹ یا سکنڈ کلاس)۔

۲۔ کسی اعلیٰ تعلیمی ادارہ میں کام کا دس سالہ تجربہ جس میں کسی یونیورسٹی لائبریری یا قومی اہمیت کی حامل السنہ مشرقیہ کی کسی لائبریری کے مخطوطات کے ڈویژن میں بحیثیت اسسٹنٹ لائبریرین کام کرنے کا پانچ سالہ تجربہ بھی شامل ہو۔

پسندیدہ: (۱) حکومت ہند کے نیشنل آرکائیوز کا پوسٹ گریجویٹ تجربہ۔

(۲) لائبریری سائنس یا علوم مشرقیہ پر مطبوعہ مضامین۔

۲۔ فورمین (الیکٹریکل) یونیورسٹی پالیٹکنک

شرح تنخواہ:۔ ۵۵۰۔۲۵۔۶۵۰۔ ای بی۔۳۰۔۹۰۰ روپیہ اور دیگر الاؤنس

استعداد:۔ الیکٹریکل انجینیرنگ میں ڈپلومہ اور پانچ سالہ تجربہ

یا

دس سالہ تجربہ کے ساتھ ٹریڈ سرٹیفیکٹ۔

پسندیدہ:۔ الیکٹریکل مشینوں، پیمائش کے آلات اور الیکٹرانکس کے دوسرے آلات کی دیکھ ریکھ اور مرمت کا تجربہ۔

۳۔ اوورسیر (الیکٹریکل) الیکٹریسٹی ڈپارٹمنٹ

شرح تنخواہ:۔ ۴۲۵۔۱۵۔۵۰۰۔ ای بی۔۱۵۔۵۶۰۔۲۰۔۷۰۰ روپیہ اور دیگر الاؤنس

استعداد :- (۱) الیکٹریکل انجینئرنگ میں ڈپلومہ۔
(ii) بجلی کی تنصیبات کی تعمیر اور/یا مرمت کا دو سالہ تجربہ۔

آپٹو میٹرسٹ (دو۔ مستقل) جواہر لال نہرو میڈیکل کالج ہسپتال۔
شرح تنخواہ:- ۴۲۵۔ ۱۵۔ ۵۰۰۔ ای بی۔ ۱۵۔ ۵۶۰۔ ۲۰۔ ۷۰۰ روپیہ اور دیگر الاؤنس۔
استعداد :- ہائی اسکول اور آپٹومیٹری یا آرتھوپٹکس میں ڈپلومہ اور اس تخصص میں ایک سال کا تجربہ۔

کیجوئلٹی تھیٹر ٹیکنیشین (مستقل)، جواہر لال نہرو میڈیکل کالج ہسپتال۔
شرح تنخواہ:- ۴۲۵۔ ۱۵۔ ۵۰۰۔ ای بی۔ ۱۵۔ ۵۶۰۔ ۲۰۔ ۷۰۰ روپیہ اور دیگر الاؤنس۔
استعداد:- میٹرکولیشن یا اس کے مساوی کوئی استعداد۔ نرسنگ میں ڈپلومہ اور کسی آپریشن تھیٹر میں کام کا دو سالہ تجربہ

یا

آپریشن تھیٹر میں بحیثیت اسسٹنٹ یا ٹیکنیشین کام کا ۴ سالہ عملی تجربہ
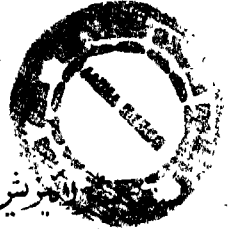
[illegible]ائزیشن ٹیکنیشین (مستقل) جواہر لال نہرو میڈیکل کالج ہسپتال۔
شرح تنخواہ:- ۴۲۵۔ ۱۵۔ ۵۰۰۔ ای بی۔ ۱۵۔ ۵۶۰۔ ۲۰۔ ۷۰۰ روپیہ اور دیگر الاؤنس۔
استعداد :- میٹرکولیشن یا اس کے مساوی کوئی استعداد۔ کسی تسلیم شدہ ہسپتال میں اسٹریلائزیشن کے کام کا تین سالہ عملی تجربہ۔

جونیر انسٹرومنٹ میکینک (مستقل) ڈپارٹمنٹ آف میکینکل انجینئرنگ۔
شرح تنخواہ:- ۴۲۵۔ ۱۵۔ ۵۰۰۔ ای بی۔ ۲۰۔ ۶۴۰ روپیہ اور دیگر الاؤنس۔
استعداد :- بینچ ورک کے تمام کاموں سے پوری طرح آگاہی جیسے فیلنگ، سرفیسنگ، ٹرننگ ملٹیپل اسکریو کٹنگ (جس میں مختلف انداز کے اسکریو تھریڈ شامل ہیں)، ٹیپ اور کروڈ ٹرننگ وغیرہ۔ اس کے علاوہ ورکشاپ کی دوسری مشینوں جیسے شیپر، ملنگ اور ڈرلنگ وغیرہ پر کام کرنے کی مناسب اہلیت اور لیباریٹری کے آلات کی مرمت کی اہلیت۔

۱۔ گلاس بلوور (مستقل) ڈپارٹمنٹ آف فزکس۔

شرح تنخواہ:- ۴۲۵ – ۱۵ – ۵۶۰ – ای بی – ۲۰ – ۶۴۰ روپیہ اور دیگر الاؤنس۔

استعداد:- کسی تسلیم شدہ ادارہ سے گلاس بلوونگ کے کورس کی ٹریننگ اور گلاس بلوونگ کی ٹیکنکس میں پانچ سالہ تجربہ ضروری ہے۔

۹۔ سینئر لیبوریٹری اسسٹنٹ، ڈپارٹمنٹ آف پتھالوجی (عارضی مگر مستقل ہونے کی امید)۔

شرح تنخواہ:- ۳۸۰ – ۱۲ – ۵۰۰ – ای بی – ۱۵ – ۵۶۰ روپیہ اور دیگر الاؤنس۔

استعداد (لازمی) سائنس کے مضامین میں میٹرکولیشن۔

پسندیدہ:- میڈیکل لیبارٹری ٹیکنالوجی (کلینکل پتھالوجی) میں ڈپلومہ اور کیمیکل اور ہیماٹولوجی پتھالوجی لیبارٹری میں کام کا تجربہ۔

۱۰۔ جونیئر لیبارٹری اسسٹنٹ (مستقل)۔ ڈپارٹمنٹ آف مائکروبائیلوجی۔

شرح تنخواہ:- ۲۶۰ – ۸ – ۳۰۰ – ای بی – ۸ – ۳۴۰ – ۱۰ – ۳۸۰ – ای بی – ۱۰ – ۴۳۰ روپیہ اور دیگر الاؤنس۔

استعداد:- سائنس کے مضامین سے کر میٹرکولیشن یا اس کے مساوی کوئی اور استعداد۔ اس کے ساتھ ہی مائکروبائیولوجی لیبارٹری میں کام کا مناسب تجربہ۔

۱۱۔ جونیئر لیبارٹری اسسٹنٹ (میکینکل) ڈپارٹمنٹ آف فزکس۔ (مستقل)

شرح تنخواہ:- ۲۶۰ – ۸ – ۳۰۰ – ای بی – ۸ – ۳۴۰ – ۱۰ – ۳۸۰ – ای بی – ۱۰ – ۴۳۰ روپیہ اور دیگر الاؤنس۔

استعداد:- (لازمی) سائنس کے مضامین کے ساتھ میٹرک۔

(پسندیدہ) کسی مشین شاپ پر کام کا تجربہ یا
آئی ٹی آئی سے فٹر کا سرٹیفکٹ۔

۱۲۔ فٹر (مستقل) جواہرلال نہرو میڈیکل کالج ہسپتال۔

شرح تنخواہ:- ۲۶۰ – ۶ – ۲۹۰ – ای بی – ۶ – ۳۲۶ – ۸ – ۳۴۱ – ای بی – ۸ – ۳۹۰ – ۱۰ – ۴۰۰ روپیہ اور دیگر الاؤنس۔

استعداد:- (۱) (لازمی) تعلیم یافتہ۔ بحیثیت فٹر کام کا معتد بہ تجربہ۔ اگر کسی ادارہ میں ہو تو بہتر ہے۔

(۲) (پسندیدہ) آئی ٹی آئی سے فٹر کا سرٹیفکیٹ۔

۱۳۔ مستری۔ بلڈنگ ڈپارٹمنٹ (مستقل)

شرح تنخواہ:- ۲۶۰-۶-۳۲۶- ای بی ۸-۳۵۰ روپیہ اور دیگر الاؤنس۔

استعداد:- ہائی اسکول یا اس کے مساوی، عمارتی تعمیرات کے کام میں پانچ سالہ عملی تجربہ۔ عمارات کی تعمیرات کے سلسلہ میں جو نقشہ جات اسے مہیا کیے جائیں ان سے بخوبی واقف ہو اور ان کی بنیاد پر راست طریقہ پر آزادانہ کام کرنے کی اہلیت۔

عمر:- ۲۵ سال سے کم نہ ہو۔

غیر معمولی قابلیت اور تجربہ کے حامل افراد کو ابتداء ہی سے اعلیٰ تنخواہ سے شروعات کی جاسکتی ہے۔ انٹرویو کے لیے طلب کیے جانے والے امیدواروں کو بطور ٹی اے ریلوے کے سکنڈ کلاس کا یک طرفہ کرایہ ادا کیا جائے گا۔

درخواست کے مطلوبہ فارم اور ہدایات اسسٹنٹ رجسٹرار (سلیکشن کمیٹیز) رجسٹرار آفس، علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کے دفتر سے تین روپیہ یکشت ادائیگی کے بعد (جو یونیورسٹی کے فائننس آفس کے کیش سکشن میں جمع شدہ ہو) یا اسی قیمت کے انڈین پوسٹل آرڈر (جو فائننس آفیسر کے نام واجب الادا ہو) کی ادائیگی کے بعد ذاتی طور پر یا بذریعہ ڈاک حاصل کیا جاسکتا ہے۔

بذریعہ ڈاک حاصل کرنے کے لیے ۱۰ × ۳ کا لفافہ بھیجنا ضروری ہے، جس پر خود کا پتہ لکھا ہوا بھی ہو۔

درخواست موصول ہونے کی آخری تاریخ یکم دسمبر ۱۹۸۳ء (شام ۴ بجے تک ہے)

نامکمل اور تاخیر سے موصول ہونے والی درخواستوں پر غور نہ کیا جائے گا

ضمیر احمد خاں

رجسٹرار

پرنٹر پبلشر: نورالحسن نقوی ۔ مطبع: شیروانی آفسیٹ پریس دہلی ۔ مقام اشاعت: شعبۂ اردو علی گڑھ مسلم یونیورسٹی، علی گڑھ

کیا
آپ کی روزانہ کی خوراک سے
آپ کے بدن کو پوری قوت اور
پورا فائدہ ملتا ہے؟

hzibul Akhlaq Fortnightly 15th Nov. 1983 Regd. No. L/ALG. 247

تہذیب الاخلاق

پندرہ روزہ علی گڑھ

مدیر

سید حامد

وائس چانسلر علی گڑھ مسلم یونیورسٹی
علی گڑھ

مدیر مسئول

نورالحسن نقوی

استاد شعبۂ اردو علی گڑھ مسلم یونیورسٹی
علی گڑھ

مدیر:
سید حامد
وائس چانسلر علی گڑھ مسلم یونیورسٹی
علی گڑھ

مدیر مسئول:
نورالحسن نقوی
استاذ شعبۂ اردو علی گڑھ مسلم یونیورسٹی
علی گڑھ

یکم دسمبر ۱۹۸۳ء
جلد نمبر ۲ شمارہ نمبر ۲۳

مندرجات

انداز بیاں گرچہ بہت شوخ نہیں ہے شاید کہ ترے دل میں اتر جائے مری بات
یا وسعتِ افلاک میں تکبیرِ مسلسل یا خاک کے آغوش میں تسبیح و مناجات
وہ مذہب مردانِ خود آگاہ و خدامست یہ مذہب ملّا و جمادات و نباتات

(علامہ اقبال)

دو جنگیں

صلیبی جہاد نے ازمنۂ وسطیٰ کے یورپ کو مشرق وسطیٰ کے دوش بدوش کھڑا کر دیا تھا۔ یورپ اس عہد کے مسیحی دماغ کی نمائندگی کرتا تھا، مشرق وسطیٰ مسلمانوں کے دماغ کی اور دونوں کی متقابل حالت سے ان کی متضاد نوعیتیں آشکارا ہو گئی تھیں۔ یورپ مذہب کے مجنونانہ جوش کا علم بردار تھا۔ مسلمان علم و دانش کے علم بردار تھے۔ یورپ دعاؤں کے ہتھیار سے لڑنا چاہتا تھا۔ مسلمان لوہے اور آگ کے ہتھیاروں سے لڑتے تھے۔ یورپ کا اعتماد صرف خدا کی مدد پر تھا، مسلمانوں کا خدا کی مدد پر بھی تھا لیکن خدا کے پیدا کیے ہوئے سروسامان پر بھی تھا۔ ایک صرف روحانی قوتوں کا معتقد تھا دوسرا روحانی اور مادّی دونوں کا۔ پہلے نے معجزوں کے ظہور کا انتظار کیا دوسرے نے نتائجِ عمل کے ظہور کا۔ معجزے ظاہر نہیں ہوئے لیکن نتائجِ عمل نے ظاہر ہو کر فتح و شکست کا فیصلہ کر دیا۔

ژواویں ویل نے لکھا ہے کہ "جب مسلمانوں نے منجنیق سے آگ کے گولے برسانے شروع کیے تو ہمارے سردار لارڈ والٹر نے مشورہ دیا کہ جونہی مسلمان آگ کے بان چلائیں، ہمیں چاہیے کہ گھٹنوں کے بل جھک جائیں اور اپنے نجات دہندہ خداوند سے دعا مانگیں کہ اس مصیبت میں ہماری مدد کرے۔ چنانچہ ہم سب نے ایسا ہی کیا۔ جیسے ہی مسلمانوں کا پہلا بان چلا ہم گھٹنوں کے بل جھک گئے اور دعا میں مشغول ہو گئے۔ جب بان چھوٹنے کی آواز ہمارا ولی صفت بادشاہ سنتا تو بستر سے اٹھ کھڑا ہوتا اور روتے ہوتے ہاتھ اٹھا اٹھا کر ہمارے نجات دہندہ سے التجائیں کرتا 'مہربان مولا میرے آدمیوں کی حفاظت کر'۔"

لیکن بالآخر کوئی دعا بھی سودمند نہ ہوئی اور آگ کے بانوں نے تمام برجیوں کو جلا کر خاکستر کر دیا مگر اگلی جنگ تک صورتِ حال بالکل بدل چکی تھی۔ اٹھارویں صدی کے اواخر میں جب نپولین نے مصر پر حملہ کیا تو مراد بک نے علمائے ازہر سے مشورہ کیا۔ انھوں نے بالاتفاق یہ رائے دی کہ جامع ازہر میں صحیح بخاری کا ختم شروع کر دینا چاہیے۔ چنانچہ ایسا ہی کیا گیا مگر یہ ختم ابھی مکمل نہیں ہوا تھا کہ مصری حکومت کا خاتمہ ہو گیا۔ انیسویں صدی کے اوائل میں جب روسیوں نے بخارا کا محاصرہ کیا تو امیر بخارا نے حکم دیا کہ تمام مدرسوں اور مسجدوں میں ختم خواجگان پڑھا جائے۔ اُدھر روسیوں کی قلعہ شکن توپیں شہر کا حصار منہدم کر رہی تھیں اِدھر لوگ ختم خواجگان کے حلقوں میں بیٹھے یا مقلّب یا مُحوّل الاحوال کے نعرے بلند کر رہے تھے بالآخر وہی نتیجہ نکلا جو ایک ایسے مقابلے کا نکلنا تھا جس میں ایک طرف گولہ بارود ہو دوسری طرف ختم خواجگان:

دعائیں فائدہ ضرور پہنچاتی ہیں مگر انہی کو پہنچاتی ہیں جو عزم و ہمت رکھتے ہیں۔
بے ہمتوں کے لیے تو وہ ترکِ عمل اور تعطّلِ قویٰ کا حیلہ بن جاتی ہیں۔

—— مولانا ابوالکلام آزاد

اداریہ

یونانی مفکر افلاطون کا خیال تھا کہ جو طالب علم بے حد ذہین اور بہت
اصلاحیت ہوں انھیں عام طالب علموں سے الگ رکھ کر امور سلطنت
،تعلیم دی جانی چاہیے کیوں کہ ملک کی اہم ترین خدمت انھی کو انجام دینی
ہے۔ یہ خیال افلاطون کے زمانے سے لے کر آج تک کسی نہ کسی شکل میں
دجود ہے۔ آج اس بات کو ذرا سا بدل کر یوں کہا جاتا ہے کہ تعلیم کے
تدائی مراحل کے دوران طالب علم کے ذہنی رجحان کا پتہ لگا لینا
زوری ہے تاکہ مزید تعلیم انھی خطوط پر ہو۔ ظاہر ہے یہ کام آسان نہیں۔
رہمارے ملک میں اس کے لیے ضروری سہولتیں اور ساز و سامان موجود
ہیں لیکن انگریزی رسالے سوسائٹی نے ملک کے ایک ایسے اسکول کی
ان دہی کی ہے جس میں داخلے سے پہلے یہ اطمینان کر لیا جاتا ہے کہ
میدوار میں لیڈرشپ کی صلاحیت موجود ہے۔ پھر اسکول کی تعلیم
مل ہونے تک اصل توجہ اسی صلاحیت کو فروغ دینے پر صرف کی جاتی
ہے۔ یہاں بچوں کو اسکول سے باہر کرنے کے جو کام سونپے جاتے ہیں
ہسے اسکول کے مقاصد کا کسی حد تک اندازہ لگایا جا سکتا ہے۔ مثلاً
ہ جماعت کے طالب علم کو حکم دیا جاتا ہے۔ گھر جاؤ۔ وہاں کسی کو تمھارے
ؤقت گھر آنے کا سبب معلوم نہ ہونا چاہیے۔ بالٹی اور جھاڑو لو اور
ھلے روڈ پہنچ جاؤ۔ وہاں سڑک کے کنارے ایک بیت الخلا ہے
ں کی مکمل صفائی کرو۔ گھر لوٹ کر نہاؤ اور کسی کو کچھ بتائے بغیر
کول واپس آجاؤ۔ دوسرے طالب علم کو ہدایت کی جاتی ہے کہ وہ
انے پہنچ کر کسی سے معلومات حاصل کیے بغیر پولیس افسروں کی
رو رخصت کے اوقات نوٹ بک میں درج کرے اور ان کے
ولات کے متعلق مفصل رپورٹ تیار کرے۔ طلبا کی ایک جماعت
سی شراب خانے کا گھراؤ کرنے بھیجا جاتا ہے اور اس ہدایت کے
ساتھ کہ وہاں سنگین صورت حال پیدا ہو تو اس سے نمٹنے کے لیے
بھی تیار رہے۔ لڑکیوں کے ایک قافلے کو ایک اجنبی شہر (ستارا)
روانہ کیا جاتا ہے، اب یہ خود ان کی ذمہ داری ہے کہ وہاں ٹھہرنے کا
بندوبست کریں، راستوں کا پتہ اپنے آپ لگائیں اور وہاں کی صنعتی
ترقی کے بارے میں ایک مکمل رپورٹ پیش کریں۔

اس طریق تعلیم میں عملی کام کو کتابی علم سے زیادہ اہمیت دی گئی ہے
لیکن اس عملی کام کی نوعیت کچھ جاسوسی کام سے ملتی جلتی ہے۔ بہر حال
اس کا اعتراف تو کرنا پڑے گا کہ اس زمانے میں جب اسکول کا بچہ
کتابوں کے انبار میں دبا ہوا ہے مضامین کی کثرت اور کورس کی
زیادتی اس کی کمر توڑے ڈال رہی ہے، یہ جدت خوش آیند معلوم
ہوتی ہے۔ موجودہ تعلیم کا یہ نقص بہت کھل کر سامنے آچکا ہے
کہ بچے پر اس کی سکت سے زیادہ بوجھ لاد دیا گیا ہے۔ اسکول کے بعد
ہوم ورک اسے نہ کھیل کود کی مہلت دیتا ہے نہ تفریحی مشاغل کی اور نہ
اس کی کہ جو دنیا اس کے ارد گرد آباد ہے اسے نظر بھر کے دیکھ سکے۔
اسے موقع ہی نہیں ملتا کہ وہ تجربے سے کچھ سیکھ سکے۔ وہ سارا علم
صرف کتابوں کے ذریعے حاصل کرتا ہے۔ اس لیے عجب نہیں کہ جب
وہ عملی دنیا میں قدم رکھے تو اسے اجنبیت کا احساس ہو۔ اور
اس دنیا سے وہ خود کو ہم آہنگ نہ کر سکے۔

خلاصہ یہ کہ مذکرہ بالا اسکول کی یہ بات قابل ستائش ہے کہ
اس میں عملی تعلیم پر زور دیا جاتا ہے۔ ممکن ہے آپ اس اسکول کا
نام جاننا چاہیں۔ تو سنیے شہر پونا کے اس اسکول کا نام ہے "جن
پر بودھنی" اور اس کے منتظمین کبھی نہ کبھی اور کسی نہ کسی طرح آر۔ ایس ایس
سے ضرور متعلق رہے ہیں۔ اس تعلق کی چھاپ اسکول کے چپے چپے پر نظر

آتی ہے۔ پہلی نظر میں اسکول کی پانچ منزلہ عمارت پر مندر ہونے کا گمان ہوتا ہے۔ سفید ٹوپی اور کرتا پاجامہ یا شلوار قمیص طالب علموں کا لباس ہے۔ دروازے میں قدم رکھیے تو دنیا کے اس عجیب و غریب نقشے پر نظر پڑتی ہے جس میں برما، بنگلہ دیش، لنکا، پاکستان، ایران افغانستان اور خدا جانے کن کن ملکوں کو ہندوستان کا حصہ دکھایا گیا ہے۔ یہ توسیع پسندانہ عزائم ہی تو ہیں جو جدید ترین اسلحے سے لیس بہترین افواج رکھنے والے اسرائیل کو ساری دنیا میں ذلیل و خوار کیے ہوئے ہیں۔

بہرحال یہ ساری باتیں تو، سوائے اس کے کہ ان میں بھی عبرت کا سامان ہے، اس موقعے پر غیر متعلق ہیں۔ عرض یہ کرنا تھا کہ جن اسکولوں کا نظام ہمارے ہاتھوں میں ہے ان میں طلبا کو کرم کتابی نہ بننے دیں، عملی کاموں کے لیے بھی مواقع فراہم کریں۔ یہی وہ منزل ہے جب ان میں قومی کاموں کے لیے لگن پیدا کی جا سکتی ہے۔ اپنے اپنے علاقوں کی صحت و صفائی کے معاملات پر غور کرنے بلکہ اس کے لیے عملی کام کرنے کی تربیت دی جا سکتی ہے۔ اس سے بھی زیادہ اہم یہ کہ تحریر و تقریر کی مشق اگر اس عمر میں نہ کرائی جائے۔ تو اعلیٰ تعلیم کے دوران اس طرف رغبت دلانا بہت مشکل کام ہے۔ اکثریتی طبقے کے بچوں کی تعلیم میں کوئی کسر رہ جائے تو ممکن ہے ان کا کسی طرح نباہ ہو جائے کیوں کہ ان کے ہاتھوں میں بہت کارخانے اور کمپنیاں ہیں لیکن ہمارے بچے صرف اسی صورت میں باعزت زندگی بسر کر سکیں گے کہ وہ دوسروں سے زیادہ محنتی اور زیادہ باصلاحیت ہوں۔ اس کے بعد اپنے تعلیمی اداروں کے منتظمین سے ہم جو کچھ کہنا چاہتے تھے وہ کہنا لفظوں کا زیاں معلوم ہوتا ہے۔ آگے بڑھنے کی بات تو وہ سوچے کم سے کم جس کا وجود تو خطرے میں نہ ہو۔ ہم نے اردگرد کے اضلاع کے اسکولوں سے متعلق معلومات حاصل کیں تو ان اسکولوں کی زندگی ہی خطرے میں نظر آئی اور ہر طرف سے ایک بات سننے کو ملی کہ ادارے کی مجلس منتظمہ کئی کئی حصوں میں تقسیم ہے اور تعلیم کے میدان میں اپنی کارگزاری کا مظاہرہ کرنے کے بجائے ایوان عدالت میں دادِ شجاعت دے رہی ہے اور قوم کا سرمایہ پانی کی طرح بہایا جا رہا ہے۔ بعض گروہوں نے کمیٹیوں سے اپنے حریفوں کو نکال باہر کیا ہے اور اس کی صورت یہ ہے کہ اسکول کی منتظمہ کمیٹی کو سوسائٹی ایکٹ کے تحت رجسٹر کرایا جاتا ہے۔ اب قاعدہ یہ ہے کہ دو سال بعد تجدید کرانی ضروری ہے۔ تجدید نہ کرائی جائے تو از سرِ نو رجسٹریشن کرانا پڑتا ہے۔ جو لوگ برسرِ اقتدار ہوتے ہیں وہ مدت گزر جانے دیتے ہیں پھر اپنے حریفوں کے نام نکال کر (خواہ ان کی سابقہ خدمات کتنی ہی قابل قدر کیوں نہ ہوں) دوبارہ رجسٹریشن کرا لیتے ہیں۔ اس طرح ایک تو ادارہ ان افراد کے تعاون سے محروم ہو جاتا ہے دوسرے لامتناہی مقدمہ بازی کا دروازہ کھل جاتا ہے۔ برسرِ اقتدار گروہ ادارے کا سرمایہ برباد کرتا ہے اور دوسرا محاذ آرائی کے لیے چندہ کرتا ہے۔ قوم کا سرمایہ بہرحال برباد ہوتا ہے۔ جن جن شہروں میں یہ شرمناک تماشے ہو رہے ہیں کیا وہاں کی رائے عامہ میں اتنی طاقت نہیں کہ ان خود غرضوں اور مفاد پرستوں کو مجبور کر دے کہ وہ عدالت سے مقدمات واپس لیں اور مفاہمت کے لیے سر جوڑ کر بیٹھیں؟

نور الحسن نقوی

وَاعْتَصِمُوا بِحَبْلِ اللّٰهِ جَمِيعًا وَّلَا تَفَرَّقُوا (قرآن حکیم)

اللہ کی رسی کو مضبوطی سے تھامو اور تفرقہ نہ ڈالو۔

سید حامد

ستاروں کی زندگی اور موت

ڈاکٹر سبرامنیئن چندر شیکھر کے متعلق یہ تعارفی سطور بڑی حد تک ان دو مضامین پر مبنی ہیں جو نومبر میں انگریزی رسائل "سنڈے" اور "انڈیا ٹوڈے" میں شایع ہوئے۔ ادارہ امید کرتا ہو کہ ہمارے شعبۂ طبیعیات کے کوئی پروفیسر ہمارے قارئین کو آئندہ شمارے میں اس بڑے سائنس داں کے نظریے کی تفصیلات سے عام فہم انداز میں روشناس کرا دیں گے۔

إِنَّ فِي خَلْقِ السَّمَاوَاتِ وَالْأَرْضِ وَاخْتِلَافِ اللَّيْلِ وَالنَّهَارِ وَالْفُلْكِ الَّتِي تَجْرِي فِي الْبَحْرِ بِمَا يَنْفَعُ النَّاسَ وَمَا أَنْزَلَ اللَّهُ مِنَ السَّمَاءِ مِنْ مَاءٍ فَأَحْيَا بِهِ الْأَرْضَ بَعْدَ مَوْتِهَا وَبَثَّ فِيهَا مِنْ كُلِّ دَابَّةٍ وَتَصْرِيفِ الرِّيَاحِ وَالسَّحَابِ الْمُسَخَّرِ بَيْنَ السَّمَاءِ وَالْأَرْضِ لَآيَاتٍ لِقَوْمٍ يَعْقِلُونَ ۔

(ترجمہ: بیشک آسمان اور زمین کے پیدا کرنے میں اور رات اور دن کے بدلتے رہنے میں اور کشتیوں میں جو سمندر میں لوگوں کے کام کی چیزیں لے کر چلتی ہیں، اور پانی میں جسے اللہ نے آسمان سے اُتارا اور اس پانی سے اس زمین کو جو مر چکی تھی، زندہ کیا اور اس میں سب طرح کے جانور پھیلائے ہوا اور بادل میں جو آسمان اور زمین کے درمیان اس کے حکم کے تابع ہیں۔ بے شک ان سب چیزوں میں ان لوگوں کے لیے جو غور کرتے ہیں، نشانیاں ہیں۔)

مشاہدہ، تفکر اور مطالعہ قدرت اور تدبر، زندگی اور موت کا تسلسل، قرآن کریم میں یہ ذکر بار بار آتا ہے اور قدرت سے رابطہ قائم رکھنے اور قدرت کے مظاہر پر غور کرنے اور ان سے نتائج نکالنے کی تلقین جا بجا کی گئی ہے۔ اگر اُن آیات کا شمار کیا جائے جو اس موضوع پر ہیں تو یہ بات کھل جائے گی کہ ان کی تعداد ان آیات سے کہیں زیادہ ہے جو قرآن میں کسی دوسرے موضوع پر آئی ہیں مقصد ظاہر ہے، انسان کائنات کا جزو ہے، وہ اگر خود کو قدرت سے الگ رکھنے کی کوشش کرے گا تو مرجھا جائے گا کیوں کہ اس کی جڑیں زمین کے اندر نہیں رہیں گی۔ اس کے علاوہ کائنات کی وسعت کا احساس اسے گھمنڈ سے بچاتا ہے اور بار بار یاد دلاتا ہے کہ زمان کے طول اور مکان کی عرض کے سامنے اس کا وجود بے حقیقت ہے۔ کائنات کا پراسرار اور حیرت انگیز نظام اسے کائنات کے پیدا کرنے اور قائم رکھنے والے کی طرف لے جائے گا۔ وہ خود سے بار بار سوال کرے گا کہ یہ سارا نظام آپ ہی آپ وجود میں کیوں کر آسکتا ہے۔ اور یہ باطل اور فضول اور بے کار کیسے ہو سکتا ہے؟

ایک چھوٹے سے پتہ پر ہی نظر ڈالیے اس کی نشو و نما کا بھید کیا ہے وہ پیڑ سے کیا لیتا ہے اور اس کے عوض پیڑ کو کیا دیتا ہے۔ اس کی ننھی سی

جان کو زندہ اور سرسبز رکھنے کے لیے کیا کیا عوامل کام کرتے ہیں۔

برگِ درختاں سبز در نظر ہوشیار
ہر ورقی دفتریست معرفتِ کردگار

(ذی شعور انسان کی نظر میں ہرے بھرے پیڑوں کا ایک ایک پتّہ پروردگار کو سمجھنے کے لیے ایک ضخیم کتاب کی حیثیت رکھتا ہے)

وہ لوگ تو کم نصیب ہیں جو قدرت کے اوراق کا مطالعہ سرے سے کرتے ہی نہیں۔ وہ ان مناظر سے سرسری گزر جاتے ہیں اور جو لوگ ان کا مطالعہ کرتے ہیں وہ ذوق اور شعور کے بقدر بہرہ یاب ہوتے ہیں۔ ان اوراق کی مثال کسی بڑے شاعر کے آثار کی سی ہے۔ قارئین اپنے علم اور ذوق کے مطابق اشعار سے حظ اندوز ہوتے ہیں۔ یہ کہنے کی چنداں ضرورت نہیں کہ جن قوموں نے فطرت سے اپنا ناتہ توڑ لیا، جنھوں نے اپنے ذہن اور اپنی فکر کو انسان کے بنائے ہوئے زنداں میں اسیر کر لیا، جنھوں نے مشاہدہ اور غور وفکر کو ترک کر دیا، وہ قومیں جہالت، پستی، تباہی اور فنا کی طرف گامزن ہو گئیں۔

قدرت کے اوراق میں ایک بہت ہی دلکش اور معنیٰ خیز ورق آسمان ہے۔ جو انسان آسمان پر نظر رکھتے ہیں وہ اپنے مسائل اور مصائب کو بآسانی برداشت کر لیتے ہیں، کم از کم وہ اپنے مسائل کو بڑھانے چڑھانے نہیں، نہ ان کے ہجوم سے گھبراتے ہیں۔ آسمان کے سامنے انسان اور اس کے مسائل سمٹ کر حقیر اور غیر اہم رہ جاتے ہیں۔ رات میں آسمان پر نظر ڈالیے اس کی دلائی میں بے شمار ستارے ٹکے ہوئے نظر آتے ہیں۔

۶۲ سال ہوئے ہمارا ایک عالم طبیعیات سی وی رمن پانی کے جہاز میں یورپ جا رہا تھا۔ اس نے آسمان پر نظر ڈالی اور سوچنے لگا کہ آسمان نیلا کیوں ہے۔ قدرت کے اس دلنواز مظہر پر وہ غور کرتا رہا اور بالآخر ۹ سال بعد اسے اپنے سوال کا جواب مل گیا اور جواب کے ساتھ طبیعیات میں نوبل انعام جو دنیا کا اہم ترین اعزاز سمجھا جاتا ہے۔ شعاعوں کے اثرات کے متعلق سی وی رمن کے اس انکشاف کو سائنس کی کتابوں میں ان کے نام کے ساتھ منسوب کر دیا گیا ہے۔ اور وہ "رمن ایفیکٹ" کہلاتا ہے۔

عجیب اتفاق ہے کہ جس سال سی وی رمن کو یہ اعزاز ملا اُسی سال ان کا بھتیجہ سبرامنین چندرشیکھر، ان ہی کی طرح پانی کے جہاز میں کیمبرج یونیورسٹی میں داخلہ کے لیے انگلستان جا رہا تھا۔ اس وقت اس کی عمر ۱۹ سال کی تھی۔ جہاز کے ڈیک سے آسمان کے ورق کا مطالعہ کرتے ہوئے اس کی نگاہیں ستاروں پر جم گئیں۔ وہ سوچنے لگا کہ یہ وجود میں کیونکر آئے، ان کے ارتقا کے منازل کیا ہیں اور بالآخر ان کا کیا انجام ہونے والا ہے۔ تین سال کی تحقیق اور غور وخوض کے بعد اس نے ستاروں کی پیدائش اور موت کے متعلق ایک جامع نظریہ تیار کر لیا۔ سبرامنین چندرشیکھر نے ۱۱ جنوری ۱۹۳۵ء کو ۲۴ سال کی عمر میں رائل ایسٹروفزیکل سوسائٹی کی میٹنگ میں اپنا نظریہ پیش کیا۔

اس نظریہ کا لبِّ لباب یہ ہے کہ مرنے والے ستاروں میں سے جن ستاروں کا ماس (MASS) سورج کے ماس ۱.۴ گنے سے کم ہوتا ہے، وہ ستارے اپنا جوہری ایندھن ختم کرنے کے بعد ٹھنڈے ہو کر ایک گنجان مادّے میں گر جاتے ہیں جسے وہائٹ ڈوارف یا "سفید بَونا" کہا جاتا ہے۔ لیکن وہ ستارے جن کا وزن کری ٹیکل ماس (سورج کے ماس کے ۱.۴) سے زیادہ ہوتا ہے وہ "وہائٹ ڈوارف" کی منزل کے بعد بھی سکڑتے چلے جاتے ہیں اور زیادہ گھنے اور زیادہ گھنے ہوتے چلے جاتے ہیں۔ ان کو بلیک ہول کہا جاتا ہے۔ سائنس کی کتابوں میں کری ٹکل ماس کو "چندرشیکھر کی حد" کا نام دیا گیا ہے۔

چندرشیکھر ستاروں کی ساخت کا مطالعہ صرف چند سال کرنے کے بعد اس حیرت انگیز انکشاف تک پہنچ گیا۔ مدراس میں اسے ایڈنگٹن کی کتاب جو اس وقت کا سب سے بڑا اختر شناس تھا، انعام میں ملی تھی۔ یہیں سے ستاروں میں اس کی دلچسپی کا آغاز ہوا اور بالآخر اس نے ان کی داستانِ حیات کی ساری منازل چھان ڈالیں اور وہ اس جگہ پہونچ گیا، جہاں تک اس سے پہلے کسی ہیئت داں کی نگاہ نہیں گئی تھی۔ چندرشیکھر نے کیمبرج پہونچ کر اپنے ہیرو ایڈنگٹن سے رجوع کیا اور ۲۴ سالہ شاگرد اور ۵۲ سالہ استاد کی یہ دلچسپ جوڑی فلکیات کی سیر کے لیے باہم نکلا

رتی۔ لیکن آج اس اہم میٹنگ میں ایڈنگٹن نے چندر شیکھر کی بات کاٹ
ری اور اس کے نظریہ کا مذاق اُڑایا۔ اس ہونہار سائنس داں کی امنگوں
پر اوس پڑ گئی۔

لیکن سبرامنیم چندر شیکھر ہمت ہارنے والا نہیں تھا۔ وہ سادہ مزاج
اور وسیع الذہن انسان پھر اپنے کام میں لگ گیا اور پھر کیمبرج یونیورسٹی
چھوڑ کر شکاگو چلا گیا۔ وہاں پہنچ کر چندر شیکھر نے اپنے نظریہ کو ایک کتاب
میں قلم بند کر دیا اور کتاب طاق پر رکھ دی اور دوسری تحقیقات میں مصروف
ہو گیا۔ چندر شیکھر کا دن ۶ بجے شروع ہوتا ہے اور آدھی رات کو ختم ہوتا
ہے۔ اس معمول میں کبھی تبدیلی نہیں آئی۔

پچاس سال پہلے چندر شیکھر کے نظریہ کو دنیا نے حقارت کی نظر
سے دیکھا۔ آج اسی نظریہ پر اسے نوبل انعام ملا ہے، ایسٹرو فزکس
(Astro - Physics) پر سب سے پہلا نوبل انعام! چندر شیکھر
کی دریافت کی اہمیت دن بدن بڑھتی جا رہی ہے اس کی equations
کو ہم خلا کی تحقیق (اسپیس ریسرچ) اور دور یابی (Remote Sensing)
اور جدید علم ہیئت میں استعمال کرتے ہیں۔ دراصل اب کوئی بھی میدان
ایسا نہیں ہے جس میں اس کے گوناگوں انکشافات کو استعمال نہ کیا جاتا
ہو۔

اور یہ سائنس داں جس نے انسان کے علم اور اس کے ذہنی افق
میں گرانقدر اضافہ کیا ہے انتہائی سادگی اور انکسار کے ساتھ زندگی
بسر کرتا ہے، شہرت سے بے نیاز ہو کر اسے اپنے کام سے کام ہے۔ وہ
اس ہندوستانی روایت کا مرقع ہے کہ سادگی کے ساتھ رہو اور
بلندی کی طرف نظر رکھو۔ "میرا مقصد ایک مسئلہ کو حل کرنا نہیں
ہے بلکہ ایک پورے رقبہ کا احاطہ کرنا ہے۔"

چندر شیکھر نے امریکن قومیت اختیار کر لی ہے، ہر چند کہ ہم نے ایک
وقت میں اسے نادانی اور جانبداری کی بنا پر ڈیمانسٹریٹر کے چھوٹے سے
منصب کے لیے رد کر دیا تھا۔ آج ہمارا سر فخر سے اونچا ہے کہ ہمارے وطن
کی خاک سے فی زمانہ ایک ایسا انسان پیدا ہوا جس نے انسانی علم کو آگے
بڑھایا۔ چند سال پہلے ہرگووند کھورانا نے بھی ہمیں اسی طرح فخر کا موقع
دیا تھا۔ لیکن چندر شیکھر کی سادگی، قناعت، استقامت، سلامت روی
اور نہ بجھنے والی علم کی پیاس، اسے اور بھی ممتاز کرتی ہے۔ اور اسے
ابنائے وطن سے بے مہری کی شکایت بھی نہیں۔ وہ نہ صرف بڑا سائنسداں
ہے بلکہ بڑا آدمی بھی ہے جس کی لگن کے ناخن نے ستاروں کی دنیا کے بہت
سے رازہائے سربستہ کھول ڈالے ہیں۔ اس میں شبہ نہیں کہ ہمارے ملک
نے سائنس کے فروغ میں حصہ لیا ہے اور اس کے بعض فرزندوں نے
عالمگیر امتیاز حاصل کیا ہے۔ اس دن کا ہمیں ہنوز انتظار ہے جب علی گڑھ
مسلم یونیورسٹی سائنس کی دنیا میں سرسید کے خوابوں کو شرمندۂ تعبیر
کرے گی۔

★★

بقیہ: قصہ کمپیوٹر کا

[First Generation] کے کمپیوٹر کہلاتے ہیں۔ بعد میں والوز
کی جگہ ٹرانزسٹرس نے لے لی اور اس طرح دوسری نسل کے کمپیوٹر رونما
ہوئے۔ ان کا حجم، قیمت اور بجلی کا خرچ تینوں بہت کم ہو گئے۔ ۱۹۶۵ء میں
تیسری نسل کے کمپیوٹر بازار میں آ گئے۔ ان مشینوں میں ٹرانزسٹر کے
بجائے آئی۔ سی (I-C) کا استعمال کیا گیا۔ ۱۹۷۰ء تک تقریباً اسی ہزار
کمپیوٹر بن چکے تھے اور اب یہ تعداد لاکھوں میں ہے۔ زندگی کا کوئی
شعبہ باقی نہیں جہاں کمپیوٹر کا استعمال نہ شروع ہو گیا ہو۔ سائنس،
ٹیکنالوجی، بزنس، ریلوے بکنگ، ہوائی جہاز کی بکنگ، بینک، کھیل،
تفریحات وغیرہ۔ غرض ہر میدان میں کمپیوٹر کا راج ہے۔ اب کمپیوٹر کی چوتھی
پیڑھی وجود پا چکی ہے۔ اس میں مائکرو پروسیسر (Micro Processor)
استعمال کیے گئے ہیں اور اس کے حساب کتاب اور کام کرنے کی رفتار بے حساب
سمجھیے۔ اس ضمن میں یہ بھی جان لیجیے کہ کمپیوٹر کی پانچویں نسل کی باتیں بھی
ہونے لگی ہیں اور امید ہے کہ ان مشینوں کے آ جانے کے بعد دنیا کا ہر کام
کمپیوٹر کا رہین منت ہوا کرے گا۔ کمپیوٹر شروع میں تحقیق کی گتھیاں سلجھانے
کے کام آتا تھا۔ مگر اب کمپیوٹر سائنس دانوں کی تجربہ گاہوں کا قیدی نہیں
بلکہ بازاروں سے گزرتا ہوا ہمارے گھروں کی طرف گامزن ہے۔ ☆☆

اکٹر محمد شریف خاں
شعبۂ تعلیم
لم یونیورسٹی علی گڑھ

اسلام میں تعلیم کی اہمیت

قرآنِ حکیم کی روشنی میں

یہ دیکھا ہو کر اسلام میں علم کا کیا مقام ہے تو قرآنِ کریم کے بعد
ں نظر سے احادیث کا مطالعہ بھی ضروری ہے۔ احادیث کو یکجا اکٹھا کرنا قرآن
ں آیات کے یکجا اکٹھا کرنے سے زیادہ مشکل ہے۔ اس لیے چند احادیث
سلام میں علم کے مقام کو واضح کرنے کے لیے مندرجہ ذیل ہیں۔

۱۔ وَعَنْ اِبْنِ مَسْعُوْدٍ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ۔ لَاحَسَدَ اِلَّا فِیْ اِثْنَیْنِ۔ رَجُلٍ اٰتَاہُ اللّٰہُ مَالاً فَسَلَّطَہٗ عَلٰی ھَلَکَتِہٖ فِی الْحَقِّ، وَرَجُلٍ اٰتَاہُ اللّٰہُ الْحِکْمَۃَ فَھُوَ یَقْضِیْ بِھَا وَیُعَلِّمُھَا۔

(بخاری ومسلم)

"حضرت ابن مسعودؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلّم نے فرمایا حسد (رشک) صرف آدمیوں کے سلسلے میں جائز ہے۔ ایک وہ شخص جسے اللہ نے مال دیا پھر اسے حق کی راہ میں لٹانے کی توفیق بخشی دوسرا وہ شخص جسے اللہ نے حکمت عطا کی تو وہ اس کے مطابق فیصلے کرتا ہے اور لوگوں کو اس کی تعلیم دیتا ہے۔"

اس حدیث سے پتہ چلتا ہے کہ علم کی یہ حیثیت ہے کہ اس کے رکھنے والے اور صحیح استعمال کرنے والے پیے دوسرے لوگوں کو تلقین کی گئی ہے کہ وہ بھی ایسا کرنے کی کوشش کریں۔ یہ بات صاف ظاہر ہے کہ جب اسلام میں علم حاصل کرنے اور صحیح استعمال کا یہ مقام ہے تو اگر آج مسلمان اس میں کوتاہی کرتے ہیں تو وہ اسلام کی غلط نمائندگی کرتے ہیں اور لوگوں کے ذہن میں غلط فہمی پیدا کرتے ہیں۔

۲۔ وَعَنْ اَنَسٍ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ۔ مَنْ خَرَجَ فِیْ طَلَبِ الْعِلْمِ فَھُوَ فِیْ سَبِیْلِ اللّٰہِ حَتّٰی یَرْجِعَ۔ (ترمذی)

"حضرت انسؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا جو شخص علم کی تلاش میں نکلے وہ اس وقت خدا کی راہ میں ہے جب تک واپس نہ آجائے۔" اسلام میں مسلمانوں کو خدا کی راہ پر چلنے کے لیے بہت زور دیا گیا ہے اور زندگی کے کسی شعبہ میں اس بات کی نہیں ہے کہ وہ خدا کے بتائے ہوئے راستے پر چلے اور اس کے لیے اجازت نہیں ہے کہ وہ خدا کے بتائے ہوئے راستے سے جدا ہو سکے۔ اس لیے ہر مسلمان کا فرض ہے کہ وہ خدا کے بتائے ہوئے راستے پر چلے۔ اور اس کے لیے علم کی تلاش بھی ایک اہم راستہ ہے۔ عام لوگوں کے ذہن میں یہ بات بستی ہے کہ علم کی تلاش بھی خدا کی راہ ہے اور وہ اس وقت تک رہتی ہے جب تک علم حاصل کرنے والے اپنی جگہ واپس نہ آجائے۔

۳۔ وَعَنْ اِبْنِ عَبَّاسٍ رَضِیَ اللّٰہُ عَنْھُمَا قَالَ۔ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ: مَنْ جَاءَہٗ اَجَلُہٗ وَھُوَ یَطْلُبُ الْعِلْمَ لَقِیَ اللّٰہَ وَلَمْ یَکُنْ بَیْنَہٗ وَبَیْنَ النَّبِیِّیْنَ اِلَّا دَرَجَۃُ النُّبُوَّۃِ (الطبرانی فی الاوسط)

"حضرت عبداللہ بن عباسؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔ اگر کسی شخص کو اس حالت میں موت آجائے کہ وہ علم حاصل کر رہا ہو تو وہ اللہ سے اس حال میں ملے گا کہ اس کے اور انبیا کے درمیان صرف نبوّت کے درجے کا فرق رہے گا۔"

اس حدیث میں جو علم کا مقام بتایا گیا ہے وہ شاید دنیا کے کسی مذہب میں نہیں ہے۔ انبیا خدا کے قریب ترین بندے ہیں اور خدائے تعالیٰ کے حکم کو ماننے والوں میں ان کا درجہ اول ترین ہے۔ علم

حاصل کرنے والے کو انبیاء کے اتنے قریب درجہ دینے کا مطلب ہے کہ خدا اور اس کے رسول کے یہاں علم کا درجہ بہت بڑا ہے اور یہ مسلمانوں کی بدقسمتی ہے کہ وہ دین اور دنیا کی اتنی بڑی نعمت سے محروم ہیں۔

۴۔ وَعَنْ كَعْبِ ابْنِ مَالِكٍ قَالَ. قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ. مَنْ طَلَبَ الْعِلْمَ لِيُجَارِيَ بِهِ الْعُلَمَاءَ اَوْ لِيُمَارِيَ بِهِ السُّفَهَاءَ اَوْ يَصْرِفَ بِهِ وُجُوْهَ النَّاسِ اِلَيْهِ اَدْخَلَهُ اللّٰهُ النَّارَ۔

ترمذی۔ ابن ماجہ۔ عن ابن عمر

"کعب بن مالک رض سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: جس نے علم اس غرض سے حاصل کیا کہ وہ اس سے علماء پر فخر کرے یا جاہلوں سے جھگڑے یا لوگوں کو اپنی طرف متوجہ کرے خدا اس کو دوزخ کی آگ میں داخل کرے گا۔"

اسلام کی یہ بھی خصوصیت ہے کہ وہ نہ صرف علم کی تلاش پر زور دیتا ہے علم کے حصول پر زور دیتا ہے بلکہ علم کے صحیح استعمال پر بھی زور دیتا ہے اور علم جیسی اہم چیز کے غلط استعمال کے لیے دوزخ کی سزا مقرر کرتا ہے جو ایک مسلمان کے لیے سب سے زیادہ ناپسندیدہ شے ہے۔

۵۔ وَعَنْ اَبِي الدَّرْدَاءِ قَالَ، سَمِعْتُ رَسُوْلَ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ يَقُوْلُ: مَنْ سَلَكَ طَرِيْقًا يَلْتَمِسُ فِيْهِ عِلْمًا سَهَّلَ اللّٰهُ لَهُ طَرِيْقًا اِلَى الْجَنَّةِ وَ اِنَّ الْمَلٰئِكَةَ لَتَضَعُ اَجْنِحَتَهَا لِطَالِبِ الْعِلْمِ رِضًا بِمَا يَصْنَعُ وَاِنَّ الْعَالِمَ لَيَسْتَغْفِرُ لَهُ مَنْ فِي السَّمٰوٰتِ وَمَنْ فِي الْاَرْضِ حَتَّى الْحِيْتَانُ فِي الْمَاءِ وَفَضْلُ الْعَالِمِ عَلَى الْعَابِدِ كَفَضْلِ الْقَمَرِ عَلٰى سَائِرِ الْكَوَاكِبِ، وَاِنَّ الْعُلَمَاءَ وَرَثَةُ الْاَنْبِيَاءِ، اِنَّ الْاَنْبِيَاءَ لَمْ يُوَرِّثُوْا دِيْنَارًا وَلَا دِرْهَمًا، اِنَّمَا وَرَّثُوا الْعِلْمَ فَمَنْ اَخَذَهُ اَخَذَ بِحَظٍّ وَافِرٍ (ابوداؤد، ترمذی۔ ابن ماجہ)

"ابوالدرداء رض سے روایت ہے وہ کہتے ہیں کہ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو فرماتے سُنا: جو شخص علم کی تلاش میں کوئی راستہ اختیار کرے گا اللہ اُس کے لیے جنّت کا راستہ آسان کر دے گا اور فرشتے طالب علم کی خوشی کے لیے اپنے بازو بچھاتے ہیں اور عالم کے لیے آسمانوں اور زمین کے رہنے والے یہاں تک کہ پانی کی مچھلیاں بھی مغفرت کی دعا کرتی ہیں اور عالم کی فضیلت عابد پر ایسی ہے جیسے چودھویں رات کے چاند کی فضیلت باقی سب تاروں پر ہے اور علماء نبیوں کے وارث ہیں۔ انبیاء کا ورثہ نہ دینار ہے نہ درہم۔ بلکہ ان کا ورثہ علم ہے تو جس کسی نے اسے حاصل کیا اُس نے وافر حاصل کیا۔

اسلام میں علم کے مقام کی اہمیت اس حدیث سے واقف ہوتی ہے کہ رسول خدا نے بتایا کہ علم کی تلاش کرنے والے کے لیے جنت حاصل کرنے کا راستہ آسان کر دیا جاتا ہے۔ طالب علموں کو علم حاصل کرنے کی کوشش کے بدلے میں فرشتوں کی طرف سے خوش آمدید ہوتی ہے اور جو لوگ علم حاصل کر لیتے ہیں اُن کے لیے آسمان اور زمین میں رہنے والے یہاں تک کہ پانی کی مچھلیاں بھی مغفرت کی دعا کرتی ہیں۔ عبادت کرنے والوں کے خدائے تعالیٰ کی طرف سے بہت سے انعامات ہیں مگر علم حاصل کرنے والوں کو ان عبادت کرنے والوں سے بھی زیادہ فضیلت والا بتایا گیا ہے۔ اسلام میں انبیاء کا درجہ تمام انسانوں سے بڑا ہے اور عام لوگوں کو اس کا وارث بنا کر علم کو درجۂ اولیٰ عطا کیا گیا ہے۔

۶۔ وَعَنْ اَبِي هُرَيْرَةَ قَالَ: قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ. مَنْ تَعَلَّمَ عِلْمًا مِمَّا يُبْتَغٰى بِهِ وَجْهُ اللّٰهِ لَا يَتَعَلَّمُهُ اِلَّا لِيُصِيْبَ بِهِ عَرَضًا مِنَ الدُّنْيَا لَمْ يَجِدْ عَرْفَ الْجَنَّةِ يَوْمَ الْقِيَامَةِ يَعْنِيْ رِيْحَهَا۔

(احمد، ابوداؤد۔ ابن ماجہ)

"حضرت ابوہریرہ رض کہتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا جس نے اس علم کو جس سے خدا کی خوشنودی طلب کی جاتی ہے محض اس غرض سے سیکھا کہ وہ اس سے دنیا کی متاع حاصل کرے اسے

امت کے دن جنت کی خوشبو میسر نہ ہوگی۔"

اس حدیث سے صاف واضح ہے کہ علم حاصل کرنے سے انسان
ا کو خوش کرتا ہے اور جس سے خدا خوش ہو جائے اس کی قسمت
کون رشک نہ کرے گا۔ اسلام میں کیونکہ تمام علم خدا کی خوشنودی
اصل کرنے کے لیے کیے جاتے ہیں اس لیے علم جیسی چیز بھی اگر دنیا
غرض کے لیے حاصل کی جائے تو ایسے شخص کے لیے جنت کی خوشبو
اس سے محرومیت کی اطلاع دی گئی ہے۔

۔ وَعَنِ الْاَعْمَشِ رض قَالَ: قَالَ رَسُوْلُ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ
سَلَّمَ: اٰفَۃُ الْعِلْمِ النِّسْیَانُ وَ اِضَاعَتُہٗ اَنْ تُحَدِّثَ
ہٖ غَیْرَ اَھْلِہٖ (دارمی)

"اعمش رض کہتے ہیں کہ رسول خدا نے فرمایا کہ علم کی آفت بھولنا
ہے اور اس کو ضائع کرنا یہ ہے کہ تم ایسے شخص کے سامنے بیان کرنے
جو اس کا اہل نہیں۔"

اس حدیث واضح ہوتا ہے کہ علم حاصل کرنا ہر شخص کے بس کی
ت نہیں ہے اور ہر شخص اس کے حاصل کرنے کا اہل بھی نہیں ہے۔
ں حدیث میں علم کا مطلب لکھنے اور پڑھنے سے نہیں ہے بلکہ اس کو
ہت وسیع معنوں میں لکھا گیا ہے۔

۔ وَعَنِ ابْنِ عَبَّاسٍ رض قَالَ: ضَمَّنِیَ النَّبِیُّ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ
سَلَّمَ اِلٰی صَدْرِہٖ فَقَالَ اللّٰھُمَّ عَلِّمْہُ الْحِکْمَۃَ وَ
ی رِوَایَۃٍ عَلِّمْہُ الْکِتَابَ (بخاری)

حضرت ابن عباس رض کہتے ہیں کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے مجھے
پنے سینے سے لگایا اور فرمایا: خدایا اس کو حکمت عطا فرما۔ ایک روایت
ں یہ الفاظ ہیں اس کو کتاب (قرآن) کا علم دے۔"

اس حدیث سے واضح ہوتا ہے کہ رسولِ خدا نے بھی علم کو بڑی
ہمیت دی ہے اور جب انھوں نے حضرت ابن عباس کو دعا دی تو یہ کہا
اس کو حکمت عطا فرما اور جس علم کے لیے رسولِ خدا نے دعا کی وہ
لم قرآن کا علم ہے۔

۹۔ وَعَنْ اَبِیْ ھُرَیْرَۃَ رض اَنَّ النَّبِیَّ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ
قَالَ: اَفْضَلُ الصَّدَقَۃِ اَنْ یَّتَعَلَّمَ الْمَرْءُ الْمُسْلِمُ
عِلْمًا ثُمَّ یُعَلِّمَہٗ اَخَاہُ الْمُسْلِمَ۔ (ابن ماجہ)

"حضرت ابو ہریرہ رض سے روایت ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے
فرمایا افضل صدقہ یہ ہے کہ ایک مسلم شخص علم سیکھ کر اپنے دوسرے
مسلم بھائی کو اس کی تعلیم دے۔"

ہر مسلمان اس بات سے واقف ہے کہ اسلام میں صدقے
کی بڑی اہمیت ہے اور اس کام کو افضل صدقہ بتایا گیا ہے کہ
ایک مسلمان خود علم سیکھ کر دوسرے مسلمان بھائی کو وہ علم عطا کرے۔

۱۰۔ وَعَنْ اَنَسِ ابْنِ مَالِکٍ رض قَالَ: قَالَ رَسُوْلُ اللّٰہِ صَلَّی
اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ ھَلْ تَدْرُوْنَ مَنْ اَجْوَدُ جُوْدًا؟
قَالُوْا اَللّٰہُ وَرَسُوْلُہٗ اَعْلَمُ۔ قَالَ اَللّٰہُ اَجْوَدُ جُوْدًا؟ ثُمَّ
اَنَا اَجْوَدُ بَنِیْ اٰدَمَ وَ اَجْوَدُھُمْ مِنْ بَعْدِیْ رَجُلٌ عَلِمَ
عِلْمًا فَنَشَرَہٗ یَاْتِیْ یَوْمَ الْقِیَامَۃِ اَمِیْرًا وَحْدَہٗ اَوْ قَالَ
اُمَّۃً وَّاحِدَۃً (بیہقی)

"حضرت انس بن مالک رض کہتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے
فرمایا کیا تم جانتے ہو کہ سخاوت میں کون سب سے بڑھ کر ہے؟ لوگوں نے عرض
کیا اللہ اور اس کے رسول خوب جانتے ہیں۔ آپ نے فرمایا جود و سخاوت
میں سب سے بڑھ کر خدا ہے پھر بنی آدم میں سب سے زیادہ سخی میں ہوں اور
میرے بعد جود و سخاوت میں سب سے بڑھ کر وہ ہے جس نے علم حاصل کیا
اور اس کو پھیلایا۔ یہ شخص قیامت کے روز ایک امیر کی طرح سے
آئے گا یا آپ نے فرمایا کہ یہ ایک جماعت کی حیثیت سے آئے گا۔"

اس حدیث سے ایک بات تو یہ معلوم ہوتی ہے کہ علم پھیلانے کا کام
ایک سخاوت کا کام ہے اور علم پھیلانے والے کو خدا کے رسول نے
اپنے بعد کا درجہ دیا ہے اور عالم کی اس سے بڑی کیا عزت ہو سکتی ہے
کہ رسول خدا نے اس کو اپنے بعد کا درجہ دیا ہے۔ اس کے بعد بھی اگر
مسلمان علم کی طرف توجہ نہ دیں تو اس میں اسلام کا کوئی قصور

نہیں ہے۔

۱۱۔ وَعَنْ اَبِیْ هُرَيْرَةَ رض قَالَ. سَمِعْتُ رَسُوْلَ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ يَقُوْلُ. اَلدُّنْيَا مَلْعُوْنَةٌ مَلْعُوْنٌ مَا فِيْهَا اِلَّا ذِكْرَ اللّٰهِ وَمَا وَالَاهُ وَعَالِمًا وَ مُتَعَلِّمًا

(ترمذی، ابن ماجہ، بیہقی)

حضرت ابوہریرہؓ سے روایت ہے وہ فرماتے ہیں کہ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو فرماتے سنا۔

"دنیا اور دنیا کی ہر چیز ملعون ہے۔ سوائے اللہ کے ذکر اور اس چیز کے جس کا اس سے تعلق ہو اور سوائے عالم اور طالب علم کے۔"

اس حدیث سے علم کی حیثیت کا صحیح پتہ چلتا ہے جب کہ دنیا اور اس کی ہر چیز کو رسولِ خدا نے قرار دیا ہے۔ صرف اللہ کے ذکر اور اس چیز کے جس کا اس سے تعلق ہو اور سوائے عالم اور طالب علم کے سب کو معلون قرار دیا ہے اس کا مطلب ہے کہ رسولِ خدا علم حاصل کرنے والوں کو خدا کے ذکر یا کم از کم اس کے بعد سب سے بڑا درجہ دیتے ہیں۔

۱۲۔ وَعَنْ اَبِیْ هُرَيْرَةَ رض قَالَ: قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ. مَنْ سُئِلَ عَنْ عِلْمٍ فَكَتَمَهُ اُلْجِمَ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ بِلِجَامٍ مِّنْ نَارٍ۔

(ابوداؤد و ترمذی)

حضرت ابوہریرہؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا؛

جس شخص سے علم کی کوئی بات پوچھی جائے اور وہ اس کو چھپالے تو قیامت کے دن اس کے (منہ میں) آگ کی لگام دی جائیگی"

اس حدیث سے واضح ہوتا ہے کہ علم حاصل کرنا ہی کافی نہیں ہے بلکہ اسلام میں اس کو دوسرے تک پہنچانے کی ذمہ داری ہے اور اگر کوئی شخص علم کو دوسرے سے چھپانے کی کوشش کرے گا تو اس کی سخت سزا ہوگی۔

۱۳۔ عَنْ زِيَادِ بْنِ لَبِيْدٍ رض قَالَ: ذَكَرَ النَّبِيُّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ شَيْئًا فَقَالَ ذَالِكَ عِنْدَ اَوَانِ ذَهَابِ الْعِلْمِ قُلْتُ يَا رَسُوْلَ اللّٰهِ وَكَيْفَ يَذْهَبُ الْعِلْمُ وَنَحْنُ نَقْرَءُ الْقُرْاٰنَ وَنُقْرِئُهُ اَبْنَاءَنَا وَيُقْرِئُهُ اَبْنَاءُنَا اَبْنَاءَهُمْ فَقَالَ ثَكِلَتْكَ اُمُّكَ يَا زِيَادُ اِنْ كُنْتُ لَاَرَاكَ مِنْ اَفْقَهِ رَجُلٍ بِالْمَدِيْنَةِ اَوَلَيْسَ هٰذِهِ الْيَهُوْدُ وَالنَّصَارٰى يَقْرَءُوْنَ التَّوْرَاةَ وَالْاِنْجِيْلَ لَا يَعْمَلُوْنَ بِشَيْءٍ مِّمَّا فِيْهِمَا۔

(ابن ماجہ)

"حضرت زیاد بن لبیدؓ فرماتے ہیں کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے کسی (خوفناک) چیز کا ذکر کیا اور پھر فرمایا کہ یہ فتنہ و فساد علم کے چلے جانے کے وقت ہوگا۔ میں نے عرض کیا: اے اللہ کے رسول علم کیسے چلا جائے گا جب کہ ہم قرآن پڑھتے ہیں اور اسے اپنی اولاد کو پڑھاتے ہیں اور ہماری اولاد اپنی اولاد کو پڑھائے گی؟ آپ نے فرمایا تمہاری ماں تمہیں کھوئے زیاد! میں تو تمہیں مدینہ کا انتہائی فہیم اور سمجھدار آدمی سمجھتا تھا۔ کیا یہ یہودی اور عیسائی توریت اور انجیل نہیں پڑھتے (مگر اس کے باوجود) جو کچھ ان میں ہے اس پر کچھ بھی عمل نہیں کرتے

اس حدیث میں رسولِ خدا نے اس پر زور دیا ہے کہ علم کے ساتھ عمل بھی ضرورت ہوتی ہے۔ ورنہ اس کا کوئی معنی خیز نتیجہ نہیں ہوگا

قرآن اور احادیث کی روشنی میں علم کی اہمیت اسلام میں دیکھنے کے بعد یہ کہنا بالکل صحیح ہے کہ اسلام نے تعلیم کو بہت اہم مقام دیا ہے اور ایک اچھے مسلمان بننے کے لیے تعلیم کا حاصل کرنا ضروری ہے اور جو مسلمان اپنے بچوں اور بچیوں کی تعلیم و تربیت کی طرف خصوصی توجہ نہیں دیتے وہ اسلام کے احکام کی صریح خلاف ورزی کرتے ہیں۔

قصہ کمپیوٹر کا

ڈاکٹر عالم حسین نقوی
شعبۂ طبعیات انجینیرنگ کالج مسلم یونیورسٹی علی گڑھ

آج کمپیوٹر کا زمانہ ہے۔ کمپیوٹر ایک حیرت انگیز الیکٹرونک مشین ہے۔ جو حساب کتاب آپ کئی ماہ میں کریں گے یہ مشین، جس کو ہم کمپیوٹر کہتے ہیں، پلک جھپکتے کر دیتی ہے۔ جدید الیکٹرونکس ترقی کی اس راہ پر چل نکلی ہے کہ جس کی حد آسمان ہے۔ ایسا لگتا ہے کہ کچھ سال بعد گھروں میں ٹی وی، ریڈیو اور ٹیلی فون کی طرح کمپیوٹر بھی ہوا کرے گا اور زندگی کا اہم ترین جزو بن جائے گا یا ممکن ہے کہ زندگی اور تمدن پر چھا جائے۔ بہت سے ذہن تو آج بھی شک کرنے لگے ہیں کہ یہ عجوبہ الیکٹرونک مشین خود ان سے بہتر تو نہیں! ہم نے جس کمپیوٹر کو بنایا، آج وہ ہم کو ہی نیچا دکھانے کے چکّر میں ہے! اس ضمن میں ایک دلچسپ گفتگو پیش خدمت ہے۔ میرے ایک دوست نے کمپیوٹر کے بارے میں پڑھا تو بہت متاثر ہوئے اور کہنے لگے کہ بھائی صاحب یہ مشین کمپیوٹر تو انسان کو مات دے گئی۔ اس کی ذہانت انسانی ذہانت سے کوسوں آگے نکل گئی ہے۔ یہ سن کر میں نے جواب دیا کہ آپ جس کمپیوٹر کو بے حد ذہین سمجھ رہے ہیں وہ ایسا ذہین بھی نہیں ہے۔ بھڑک کر میرے دوست نے کہا 'یہ کیسے ہو سکتا ہے'؟ میں نے ان کو بتایا کہ کمپیوٹر تو بیچارہ صرف جوڑنا جانتا ہے، گھٹانا، تقسیم کرنا، ضرب کرنا وغیرہ سب جوڑ کر ہی آتا ہے۔ اس کے علاوہ یہ نہ ۱ جانتا ہے اور نہ ۵۔ نہ دو سمجھتا ہے اور نہ چار۔ اس کے ذہن کے خانوں میں صرف دو کیفیتیں ہوتی ہیں جن کو ہم صفر (٥) اور ایک (۱) کا نام دیتے ہیں۔ اگر کمپیوٹر سے کوئی کام کروانا ہے تو صفر (٥) اور ایک (۱) کی زبان میں اس کو مطلب بیان کیجیے۔ تب وہ آپ کے کام کو پلک جھپکتے کر سکتا ہے۔ میرے دوست جو کہ کمپیوٹر کی عظمت سے مرعوب تھے، ان کو میری بات پر یقین نہ آیا۔ بعد میں انھوں نے مجھے بتایا کہ جب انھوں نے یہ ذکر اپنے حلقۂ احباب میں کیا تو سننے والوں کو بھی یقین نہیں آیا۔ اس گفتگو سے ایک صورت حال عیاں ہوتی ہے۔ وہ یہ کہ زیادہ تر لوگ ابھی کمپیوٹر سے واقفیت نام کی رکھتے ہیں۔ یہ مشین کیا ہے اسے کیسے استعمال کیا جاتا ہے، اس سے بالکل بھی شناسائی نہیں رکھتے۔ اپنے اس نقطۂ نظر کو اُجاگر کرنے کے لیے ایک اور گفتگو کا ذکر کرتا ہوں۔

کچھ دن پہلے کی بات ہے کہ ایک شام ٹی وی (TV) پر کمپیوٹر کے بارے میں ایک پروگرام آ رہا تھا۔ کمپیوٹر کے ایک ماہر کا ایک دوسرے صاحب انٹرویو لے رہے تھے۔ انھوں نے خام اجزاء کے بارے میں سوال پوچھا۔ ماہر نے بتایا کہ زیادہ تر اجزاء (Hardware) درآمد (components) کرنے پڑتے ہیں لیکن اس سے زر مبادلہ کا نقصان نہیں ہوتا کیوں کہ ہندوستان سے Software کی خاصی برآمد (Export) ہے۔ انٹرویو لینے والے صاحب نے اطمینان کی سانس لی اور کہا اچھا تو آپ

SOFTWARE کا ایکسپورٹ کرکے زرِمبادلہ کما لیتے ہیں۔ ان کے
اس طرح سے کہنے سے صاف ظاہر تھا کہ وہ یہ سمجھے کہ Software
بھی کچھ کل پرزے ہیں۔ یہاں پر یہ بات واضح ہوتی ہے کہ تعلیم یافتہ
لوگ بھی ابھی کمپیوٹر سے وابستہ ایک 'نئی تعلیم' سے تعارف نہیں رکھتے۔
آس پاس نظر دوڑایے تو آپ محسوس کریں گے کہ اب کمپیوٹر کا استعمال
ناگزیر ہوتا جا رہا ہے۔ آج کمپیوٹر اپنے کاندھوں پر سائنس اور ٹیکنالوجی
کو بٹھائے ترقی کی فلک نما چوٹی کی طرف دشوار گزار راہوں پر بہ آسانی
دوڑتا ہوا جا رہا ہے۔ اگر ہم کمپیوٹر سے وابستہ وقت حاضر کی نئی تعلیم کو
حاصل نہیں کریں گے تو یقیناً ہمارا علم نامکمل رہ جائے گا۔ وہ وقت دور
نہیں کہ جب دنیا کا ہر کام کمپیوٹر کے ذریعہ ہوا کرے گا اور ممکن ہے کہ
گفت وشنید کا ذریعہ بھی کمپیوٹر بن جائے۔ ظاہر ہے نئی تعلیم سے ناواقف
لوگ کتنے گونگے اور بہرے تصور کیے جائیں گے!

آج کمپیوٹر اپنے شباب کے دور میں داخل ہو رہا ہے، اس کو اچھی
طرح سمجھنے کے لیے بہتر ہوگا کہ پہلے ہم اس کی پیدائش اور طفلی کی اہم کی
ورق گردانی کریں۔

بات بہت پرانی ہے۔ ہزاروں سال پہلے شروعات ہوئی تھی،
جبکہ انسان نے اپنی بیویوں، بچوں اور دیگر اشیاء کو گننے کے لیے اپنی
انگلیوں کو ناکافی پایا۔ گنتی گننے کی قدیم ترین شے کون سی ہے؟ جواب
پانے کے لیے آپ کو اپنے بچپن میں جانا پڑے گا۔ تاروں میں پروئے
ہوئے رنگ برنگے موتیوں کا کھلونا ABACUS یاد آیا؟ یہ اندازاً ۱۵۰۰
سال قبل مسیح وجود میں آیا تھا۔ گذرتے وقت کے ساتھ ضرورتیں بڑھتی
گئیں اور حساب کتاب کرنے کے طریقے ایجاد ہوتے رہے۔ مثلاً سلائڈ
رول (Slide Rule) جسے ۱۶۲۲ء میں انگلستان کے ولیم آٹریڈ نے
بنایا تھا۔ کمپیوٹر کا نظریہ ۱۸۱۲ء میں انگلستان کے ہی ایک عظیم انسان
چارلس بیبیج [Charles Babbage] نے پیش کیا تھا۔ انھوں نے
نہ صرف اس طرح کی مشین کی ضرورت کو محسوس کیا بلکہ یہ بھی سوچا کہ
یہ مشین کس طرح بنائی جائے اور کس طرح یہ کام کرے گی۔

چارلس بیبیج نے ایک بہت اہم اور عجوبہ مکینکل مشین Analytical
Engine کا خاکہ بنایا تھا۔ پچاس ہزار پہیوں، گیرز [GEARS]
اور دیگر اشیاء پر مشتمل اس حد پیچیدہ نظام کی یہ مشین تیار نہ کی جا سکی۔
حکومت نے چارلس بیبیج کو ایک قدرے کم پیچیدہ مشین Difference
Engine بنانے کو کہا اور اس کام کے لیے مالی امداد بھی دی۔ لیکن اس
سے پہلے کہ بیبیج کو اپنے خواب کی تعبیر ملتی یہ امداد واپس لے لی گئی۔ بیبیج
کا تجویز شدہ انجن دو حصوں پر مشتمل تھا ایک اسٹور [STORE] اور
دوسرا [MILL]۔ اسٹور کی خاص چیز اس کی مکینکل یاد داشت تھی جس
میں معادلات [Equations] کو حل کرنے کے لیے جن توابت۔
[CONSTANTS] یا اعداد و شمار کی ضرورت ہوتی وہ اس میں داخل کر دیے
جاتے۔ کام کرتے وقت اعداد و شمار اسٹور سے لیے جاتے، حساب
کتاب کیا جاتا، اور ما حصل نتائج کو یاد داشت میں محفوظ کر دیا جاتا۔
تاکہ وہ وقت ضرورت پھر کام آ دیں۔ بیبیج نے اس مشین میں اطلاعات
اور اعداد و شمار داخل کرنے کے لیے سوراخ شدہ کارڈوں [PUNCHED CARDS]
کا استعمال تجویز کیا تھا۔ یہ بڑی انوکھی ترکیب ہے اور ۱۸۰۴ء میں جے۔ ایم۔
جیکوارڈ [J.M. Jacquard] نے اس کی ایجاد کی تھی۔ آج بھی یہ کارڈ
کمپیوٹر میں اسی کام کے لیے استعمال کیے جاتے ہیں۔

آیئے اب دورِ حاضر کے الیکٹرونک کمپیوٹر کی طرف۔ ان کا وجود صرف
۳۸ سال پرانا ہے۔ اس مختصر سی مدت میں یہ جادوئی مشین دنیا پر چھا
گئی ہے۔ پہلا الیکٹرونک کمپیوٹر ENIAC نام کا امریکہ میں ۱۹۴۵ء
میں تیار کیا گیا تھا۔ اس کا حجم اور قیمت دونوں بہت زیادہ تھے۔ اس
میں ۱۸ ہزار ریڈیو والوز استعمال ہوئے تھے۔ اس مشین کو چلانے میں
بجلی کے خرچ کا اندازہ اس بات سے لگایئے کہ جب ENIAC کام کرتا تو
مغربی فلاڈیلفیا کی روشنیاں ماند پڑ جاتی تھیں۔ بہتر مشین بنانے کی کوشش
کے نتیجے میں ۱۹۴۹ء تک ساٹھ کمپیوٹر تیار ہوئے لیکن ان میں سے کوئی
بھی دو ماڈل ایک جیسے نہ تھے۔ ۱۹۵۰ء میں امریکہ میں پہلی بار UNIVAC
نام کے ایک جیسے ۴۵ کمپیوٹر تیار کیے گئے۔ یہ سب کمپیوٹر پہلی نسل

حکیم صبانت اللہ

طبِّ یونانی بالمقابل ہومیوپیتھی

"قوم کا مسیحا" کے عنوان سے محترمہ شاہدہ خانم نے سرسیّد علیہ الرحمۃ کے ہومیوپیتھی طریقہ علاج میں شغف و غیر معمولی دلچسپی سے متعلق جہاں کچھ انکشافات کیے ہیں وہاں خود انھوں نے اس کی نمائندہ و علمبردار بن کر اس طریقہ علاج کی دوسری طبوں پر برتری کے لیے اتنا زورِ قلم صرف کیا ہے کہ وہ کسی حد تک موضوع سے تجاوز کر گیا ہے اور بعض اعتبارات سے محلِ نظر بھی ہے۔ اس موازنہ میں اگر بات صرف ایلوپیتھی تک محدود رہتی تو میرے لیے جنبشِ قلم مناسب نہ ہوتی۔ لیکن چونکہ اس میں یونانی طب کا بھی ذکر کیا ہے۔ اس لیے خادمِ فن کی حیثیت سے میں کچھ کہنے پر مجبور ہوں

ہومیوپیتھی طریقہ علاج اپنی جگہ مسلمہ اور صحیح علامات فہمی و تشخیصِ مرض کی اس کی اپنی اصطلاحات کے ساتھ بعض کہنہ اور مزمن امراض کے ازالے کے حیرتناک واقعات بھی سامنے آتے ہیں لیکن یہ بات شاید بعض حضرات کے لیے ایک انکشاف ہو کہ ہومیوپیتھی نے علاج بالمثل اور کم سے کم مقدارِ خوراک کا جو نظریہ اپنایا ہے وہ طب یونانی کے نظریات کے ایک حصّہ کا چربہ اور عکس ہے۔ طب یونانی نظری اعتبار سے بعض مستثنیات کے ساتھ اگرچہ علاج بالضد کی قائل ہے مگر اس کے باوجود حفظِ صحت اور ازالۂ مرض میں طبیعت مدبرہ بدن کی کارفرمائیوں کو بھی اہمیت دیتی ہے۔ طبیعتِ مدبرہ اگر قوی ہے تو حملۂ مرض مشکل اور دفاع آسان۔ طبیعت اگر کمزور ہو کر مغلوب ہوئی تو علاج بالدوا بھی آسان نہیں رہتا۔ یونانی نظریہ کے مطابق طبیعت کی یہ مصلحانہ کارفرمائیاں کس طرح جاری و ساری رہتی ہیں اس کو بطورِ مثال اس طرح سمجھا جا سکتا ہے کہ بعض اوقات بحالتِ صحت بغیر کسی ظاہری سبب کے اچانک نکسیر پھوٹ پڑتی، کبھی قے آجاتی اور کبھی دست بھی آجاتے ہیں۔ یہ اگر مسلسل اور زیادہ نہ ہوں اور جسم کی اپنی توانائی میں کوئی اضمحلال بھی نہ ہو تو سمجھ لیا جائے کہ دماغ، معدہ و آنتوں میں کچھ زائد خون اور کچھ خراب و ردی مواد و فضلات کا اجتماع ہو رہا تھا جن کو طبیعت مدبرہ بدن نے سہل تر راستوں سے خارج کر دیا اگر یہ فاضل اجتماعات کسی حیثیت سے بھی جسم میں باقی رہ جاتے تو حملۂ مرض یقینی ہوتا۔ طب یونانی کی اصطلاح میں اسے طبیعت کے دفعِ موذی و اطلاقِ طبیعت سے موسوم کیا جاتا ہے جس میں علاج بالدوا کے بجائے محض تقویتِ طبیعت ملحوظ رکھی جاتی ہے۔

اس نظریہ کے مطابق زمانۂ وبا میں جب ہوا اور فضا تک میں فساد لاحق ہو جاتا ہے اور لوگوں کی کثیر تعداد اس وبائی مرض میں مبتلا ہو جاتی ہے لیکن پھر بھی بہت لوگوں پر قطعاً اس کا کوئی اثر نہیں ہوتا۔ یہ بھی اس کی دلیل ہے کہ بیمار ہونے والے اشخاص کی طبیعت کمزور اور جسم میں قبولیت مرض کی استعداد موجود تھی۔ لیکن جو افراد تندرست رہے ان کی طبیعت قوی تھی جس کی دفاعی کارفرمائیوں کی وجہ سے جسم میں اس وبائی مرض کا تعدیہ نہ ہو سکا۔

اب ہومیوپیتھی نے طب یونانی کے نظریہ طبیعت کو اس طرح اپنایا کہ ہر مرض کی کچھ علامتوں کا تعین کیا اور تعین علامات کے ساتھ ازالۂ مرض کے لیے اعانتِ طبیعت سے کام لیا۔ مثلاً جمال گوٹہ، سنا، سقمونیا، جلاپہ وغیرہ وغیرہ یہ سب دست آور اشیاء ہیں اور ان کے دستوں کی

علیحدہ علیحدہ علامات بھی مخصوص ہوتی ہیں۔ ان مخصوص و متعینہ علامات
کے مطابق ایسی دستآور دوا کی کچھ مقدار جس میں کیمیاوی طریقہ سے جوہر
شفا بھی ہوتا ہے جسم میں پہنچائی گئی اس جوہر شفا نے جب اپنا عمل کیا تو
ازالۂ مرض میں طبیعت مدبرہ کو ایک طرح کی کمک حاصل ہوگئی جب کہ
پہلے ہی سے طبیعت کا اپنا دفاعی عمل جاری تھا چنانچہ مرض خارجی امداد
اور کمک سے طبیعت ازالہ مرض کر سکی۔

اب رہی ہومیوپیتھی کی کم سے کم مقدار خوراک تو یہ بھی یونانی طب
ہی سے مستعار ہے۔ یعنی طب یونانی میں بھی دوائے مطلق کی کیفیت کے
ماورا اس کی جوہریت سے بھی کام لیا جاتا ہے۔ مثلاً بعض مجربات وغیرہ
کو مسلسل اس درجہ باریک پیسا جاتا ہے کہ ان کے اجزائے متصلہ تقسیم
در تقسیم ہوتے ہوئے جزءِ لایتجزیٰ تک پہنچ سکیں۔ یہ جزء لایتجزیٰ
'ایٹم' کی تعریف میں آتا ہے۔ یہ 'ایٹم' اور جوہر طب یونانی کی اصطلاحات
میں "سحق بلیغ" تصعید، تقطیر یا دوسرے کیمیاوی طریقوں کے ناموں
سے حاصل کیا جاتا ہے۔ کرّات و مرّات یعنی بار بار و پیہم اس کی خاص
اصطلاح ہے۔ جس حد تک اس کی تکرار کی جائے گی۔ جوہریت میں اضافہ
ہوتا جائے گا اور مقدار خوراک کم سے کم ہوتی جائے گی۔ اس نظریہ کے مطابق
ہومیوپیتھی دوا کو چھ سے لے کر لاکھوں تک چھوٹی سے چھوٹی تقسیم در تقسیم
کو پوٹینسی یا بالفاظ دیگر جوہریت کے نام سے تعبیر کیا جاتا ہے۔ اس اقلِ
مقدار کو محترمہ نے ہومیوپیتھی کی انفرادیت سے تعبیر کیا ہے جو فلسفۂ طبِ
یونانی کے جزء لایتجزیٰ کی جوہریت کا دوسرا نام ہے۔

جہاں تک ہومیوپیتھی دواؤں کے عدم ضرر و نقصان کا تعلق ہے تو یہ
ادّعا بھی ذرا زیادہ ہی ہے۔ اگر ایسا ہوتا تو اس میں اینٹی ڈوٹ (Anti Dote)
کا تصور ہی نہ ہوتا۔ اس کے علاوہ خود اس طریقہ علاج کے حاملین بھی اس
میں ضرر و نقصان کے قائل ہیں۔

★★

تہذیب الاخلاق ملنے کے پتے:

- ★ ایجوکیشنل بک ہاؤس، شمشاد مارکیٹ، علی گڑھ
- ★ مکتبہ جامعہ، اُردو بازار دہلی، پرنسز مارکیٹ بمبئی، شمشاد مارکیٹ علی گڑھ
- ★ محب بک ڈپو ۱۱۹ رحمت اللہ روڈ بالمقابل ہمدرد، بھنڈی بازار، بمبئی
- ★ بک امپوریم، سبزی باغ، پٹنہ ۴
- ★ مسکین بک ڈپو، موتی ڈونگری روڈ، جے پور ۴
- ★ شمع بک اسٹال، اسٹیشن روڈ، مظفر پور
- ★ محمد الیاس نیوز ایجنسی ۹۱ کولوٹولہ اسٹریٹ کلکتہ ۳،
- ★ اسماعیلیہ بک ڈپو، نیو مارکیٹ، تاتار پور چوک، بھاگل پور
- ★ سکندر نیوز ایجنسی، پہلا پل، لال چوک، سری نگر
- ★ ایم۔ آئی۔ مرزا۔ مدار نیوز پیپر ایجنٹ، بیجا پور
- ★ زینت اُردو نیوز ایجنسی، پرانا محلہ، ڈنڈیلی
- ★ جمال بک ڈپو، باری روڈ، گیا
- ★ بنگلور بک ہاؤس، کلاسی پلیم، مین روڈ، بنگلور
- ★ نصرت بک ایجنسی، انجمن بلڈنگ، ہبلی
- ★ حفیظ بک ڈپو، جمال منزل، وارث پورہ، کامٹی
- ★ حنیف بک ڈپو، مومن پورہ، ناگ پور
- ★ سینٹرل نیوز ایجنسی لمیٹڈ ۲۳/۹۰، کناٹ سرکس، نئی دہلی
- ★ مکتبہ معارف الاسلام، نظام پورہ، بھونڈی
- ★ انوار بک ڈپو، شمشاد مارکیٹ، علی گڑھ
- ★ نکہت بک ڈپو اے۔ بی۔ مارکیٹ، آسنسول
- ★ اُردو مرکز، محلہ حاجی سبحان، مونگھیر
- ★ محمد حسین، اسٹیشن روڈ، دھنباد
- ★ بہار بک ڈپو، پکی سرائے، مظفر پور
- ★ نسیم بک ڈپو، ٹاور چوک، دربھنگہ
- ★ محمد اعظم خاں، ٹھریا نجابت خاں، بریلی
- ★ گل مہر بک ہاؤس، نزد پٹنہ لاجنگ، سبزی باغ، پٹنہ

شہسوار

حضرت عبد اللہ کا نام تاریخِ اسلام کے اوراق پر ہمیشہ جگمگاتا
ہے گا۔ انھوں نے اپنی لیاقت اور شجاعت سے ایسے کارنامے انجام
یے جو قابلِ تقلید ہیں۔ حضرت عبد اللہ کے والد حضرت زبیرؓ رسولِ
رمؐ کی پھوپھی کے بیٹے تھے اور بڑے بڑے معرکوں میں شمشیر کے جوہر
ھاکر کفّار کے حوصلے پست کر چکے تھے۔ جنگِ احد میں جب مسلمانوں کو
شکست ہوگئی تھی تو نبی اکرمؐ کے گرد مضبوط حصار بنانے والے مسلمان
ان نثاروں میں ایک یہ بھی تھے۔

حضرت عبد اللہؓ کی والدہ حضرت اسماءؓ کا رتبہ بھی مسلمان
اتین میں بہت بلند ہے۔ آپ حضرت ابو بکر صدیقؓ کی بیٹی تھیں اور
شرف بہ اسلام ہونے والوں میں ان کا نمبر سترھواں تھا۔ دلیری اور
خوفی کا یہ عالم تھا کہ جب رسولِ اکرمؐ نے مکّے سے مدینے کو ہجرت
رمائی اور اپنے رفیق حضرت صدیق اکبرؓ کے ساتھ غارِ ثور میں پناہ لی
زرات کے وقت اپنا سر ہتھیلی پر رکھ کر یہی انھیں کھانا پہنچایا کرتی تھیں
صدیق اکبرؓ نے اپنا سب ہی کچھ اسلام پر قربان کر دیا تھا ہجرت
کا وقت آیا تو بیوی بچوں کے لیے گھر میں کچھ بھی نہ چھوڑا کہ کہیں سفر میں
آقا کو تکلیف نہ ہو۔ ان کے والد پریشان ہوئے کہ گھر میں کچھ بھی نہیں
تو حضرت اسماءؓ نے ایک تھیلی میں کنکر پتھر بھر کے طاق میں رکھ دیے
اور دادا کو یہ کہہ کر مطمئن کر دیا کہ دیکھیے وہ کتنا بہت سا زر و مال چھوڑ
گئے ہیں۔

شادی کے بعد حضرت اسماء کو تنگ دستی کا سامنا کرنا پڑا تو
انھوں نے محنت مشقت کی اور کبھی حرفِ شکایت زبان پر نہ لائیں۔
شوہر میدانِ جنگ میں دادِ شجاعت دیتے، یہ زخمیوں کو پانی پلاتیں
اور ان کی مرہم پٹی کرتیں۔ حضرت عبد اللہ ایسے خدا پرست، شجاع اور
جفاکش ماں باپ کے سایے میں جوان ہوئے تھے۔ یہی خوبیاں ان
میں بھی موجود تھیں۔ اس لیے مسلمانوں میں مقبول ہوئے اور
خلافت پائی۔

عبد الملک بن مروان کے ظالم صوبیدار حجّاج نے جب مکّے پر
چڑھائی کی تو یہی اس کے نگہبان تھے۔ حجّاج کا لشکر زبردست تھا اور
مکّے کے بہت سے سردار در پردہ اس سے مل گئے تھے۔ حضرت عبد اللہ
کو اس کا علم تھا۔ انھوں نے اپنی ماں سے مشورہ کیا۔ اس دین دار اور
دلیر خاتون نے مشورہ دیا۔ "تو حق پر ہے، جنگ کر۔ شکست و فتح
تو خدا کے اختیار میں ہے۔" آخر ایک رات حجاج سے ساز باز رکھنے والے
سرداروں نے چپکے سے دروازہ کھول دیا۔ لڑائی میں حضرت عبد اللہؓ
شکست کھا کر گرفتار ہوئے۔ حجاج نے ان کا سر کٹوا دیا۔ پھر اس
نے حضرت اسماءؓ سے جا کر کہا کہ تمھارا بیٹا بے دینی پھیلا رہا تھا۔ اس
لیے میں نے اسے قتل کرا دیا۔ سو سال سے زیادہ عمر کی اس بہادر
عورت نے، جس کی بینائی بھی جاتی رہی تھی، بے خوفی سے جواب دیا۔
"تو جھوٹا اور بے ایمان ہے۔ عبد اللہ خدا کا اطاعت گزار اور میرا
فرماں بردار تھا۔" حجاج اس ترش جواب سے چڑ گیا۔ اس نے حضرت
عبد اللہؓ کی بے سر لاش ایک اونچے مقام پر لٹکوا دی اور حکم دیا کہ جب
تک اس کی ماں آکر روئے گڑگڑائے نہیں، یہ یوں ہی لٹکی رہے۔ لیکن
اس صابر اور جری عورت نے جب تیسری صبح بھی یہ سنا کہ اس کے
بہادر بیٹے کی لاش ابھی تک لٹک رہی ہے تو اس کی زبان سے صرف
یہ نکلا۔

"کیا ابھی اس شہسوار کے زمین پر قدم رکھنے کا
وقت نہیں آیا۔"

یہ سن کر پتھر دل بھی لرز اٹھے اور آخر حجاج نے ان کی لاش اتروا
کر دفن کرا دی۔

★ ★

GEEP
TRADE MARK
EXTRA POWER
A SHERVANI ENTERPRISE

ایک یادگار شخصیت

وقار الملک

سید محمد ہاشم
شعبۂ اردو، مسلم یونیورسٹی علی گڑھ

سرسید قوم کے پجاری تھے اور اسلام اور انگریزوں کے دوست
ار الملک قوم کے خادم تھے اور اسلام کے پجاری۔ دونوں پکے سچے
لمان تھے لیکن یہ فرق ہمیشہ باقی رہا۔ دونوں گہرے اور مضبوط دوست
، یہ دوستی معمولی سے نشیب و فراز کے ساتھ آخر تک قائم رہی اور
سید سے دوستی کو نباہ لے جانا آج بھی حیرت انگیز سمجھا جاتا ہے۔
سید تفکر کے پیکر لیکن شعلہ خو انسان تھے۔ موخرالذکر کی فکری عمارت
لامی ارکان کی بجا آوری، اقدار و روایات کی پاسداری اور حلم و
انت کی وضع داری پر رکھی گئی تھی۔ تمکنت اور دبدبہ سید کا زیادہ
ا اور وقار تو مولوی مشتاق حسین ہی کا حصہ تھا۔ کالج کے لیے
بلہ پائی کے دونوں شکار تھے۔ ہمہ گیری میں سرسید کا پلہ بھاری تھا
نوں شعلہ بیان خطیب و مقرر تھے، جرأت، بے خوفی اور بے غرضی
نوں کی قدم بوس تھی، ہمت، حوصلہ اور لگن میں ایک کو دوسرے
ترجیح دینا مشکل ہے۔ ذمہ داریوں کے احساس اور فرض سے وفاداری
نوں قابل تقلید۔ کالج دونوں نے مل کر قائم کیا۔ آگے بڑھایا اور چلایا
ر وقار الملک تو کالج سے یونیورسٹی بننے تک کے تمام حالات دیکھ
تھے۔ غرض دونوں اپنے عہد کے ایسے منتخب ترین افراد تھے جن سے
ین بنتی ہیں۔ ان میں ایک سرسید ہے تو دوسرا سرسید ثانی اور اس
دلیل کے طور پر خود سرسید کے خطوط لکچرز اور ایک خاص مضمون
ش کیے جاسکتے ہیں۔ وقار الملک نے اپنے اخلاق و اطوار اور اپنی
نت و کوشش سے اس ادارۂ عظیم میں جن اعلیٰ اور لازوال اقدار و
روایات کی بنیاد ڈالی، وہ ملک و قوم کے لیے عموماً اور فرزندانِ علی گڑھ کے
خصوصاً ہمیشہ باعثِ فخر رہیں گے۔

وقار الملک کی شخصیت خصائص گوناگوں کا مجموعہ اور گلہائے رنگا رنگ
حسین گلدستہ تھی جو اس عجیب و غریب شخصیت کی تشکیل میں اُن کے
بھولے پن کے ساتھ ساتھ اُن کے وطن اور اُن کے گھریلو ماحول نے بھی
خاص کردار ادا کیا ہے۔ امروہہ علم و ادب کا گہوارہ، اقدار و
روایات کا مخزن اور بڑا مذہبی مرکز ہے۔ جہاں تربیت کے دوران اُنکی
شخصیت کو نکھرنے، عظیم بننے اور آب و رنگ حاصل کرنے کی تحریک و فضا
ملی۔ شمالی ہند کے اُردو کے اولین مثنوی نگار اسمٰعیل امروہوی، میر تقی میر
کے استاد میر سعادت علی اور مصحفی جیسے اساتذۂ فن کا امروہہ سے وطنی
تعلق اس کی قدیم اور اہم ادبی فضا کی ضمانت ہے، اس لیے وقار الملک
بھی اس سے بے نیاز نہیں رہ سکتے تھے۔

وہ ابھی چھ ماہ کے ہی تھے کہ باپ کا سایہ سر سے اُٹھ گیا تھا۔ ایک
طرف تو اپنے والدین کے اکلوتے اور پھر یتیم، امکان غالب تھا کہ وہ فنا سب
لاڈ، پیار اور ناز و نعم کا شکار ہو جاتے لیکن والدہ نے اپنی پوری توجہ ان
کی تربیت کی طرف مرکوز کر دی۔ اگرچہ وہ معمولی پڑھی لکھی بھی نہ تھیں (اب
دیکھیں ابتدا سے ہی باپ کے سایہ سے محروم، اور ماں اَن پڑھ، اس
پر مشتاق حسین کا وقار الملک بن جانا!) لیکن بہترین تربیت کے گُر سے
واقف تھیں۔ اور وقار الملک کی یہ اعلیٰ تربیت اور پوری شخصیت والدہ کی
ہی کرشمہ سازی کا نتیجہ ہے۔ مثال کے طور پر مشتاق حسین نے بچپن میں ضدی مزاج
پایا تھا لیکن وہ اسے نرمی سے سمجھا کر ختم کرا دیتی تھیں، وہ اُن کے لیے بتاشے
منگوا کر رکھ لیتی تھیں، کم بتاشے دیکھ کر وہ اکثر یہی ضد کرتے کہ میں تو بیس
لوں گا۔ مگر تھے اتنے سیدھے کہ والدہ انہی بتاشوں کو دو تین بار گن کر بیس
کی گنتی پوری کر دیتیں۔ چنانچہ صاحبزادے نے بیس کی آواز سنی اور راضی ہو گئے۔
وہ سبق یاد کرنے یا اچھی باتوں پر کبھی کبھی انعام دیتیں تو اُسے جمع کر لیتے
اور اس کا مصرف یہ تھا کہ یا تو قلم اور روشنائی خرید لیتے یا والدہ کی اجازت
سے وہ پیسے کسی محتاج کو دے دیتے، پھر تو آخر تک اُن کا یہی حال رہا۔ آخری
زمانے میں تانگے میں بیٹھتے وقت ہاتھ میں پیسوں کی تھیلی ہوتی تھی جو راستے

کے ضرورت مندوں کے لیے وقف ہوتی تھی اور گھر واپسی تک بالکل خالی — ہو جاتی تھی۔

مشتاق حسین نے ابتدائی تعلیم انہاک سے حاصل کی تھی، نماز، روزہ اور مذہبی پابندی و پختگی اسی پہلی تعلیم کا نتیجہ تھا اور اسی فضل نے ان کے عادات اطوار میں پختگی، طرزِ عمل میں اعتدال اور امتیاز مدارج پیدا کر دیا تھا لیکن حیرت تو اس پر ہوتی ہے کہ مشتاق حسین جیسے لڑکے نے اس زمانے (۱۸۵۹ء) میں سول انجینئرنگ ٹامسن کالج رڑکی میں داخلہ لے کر انجینئرنگ کی تعلیم حاصل کی، غالباً معاشی حالات کے سبب وہ اسے مکمل نہ کر سکے اس لیے کہ ڈیڑھ سال کے بعد ہی ۱۸۶۰ء میں وہ مرادآباد میں ملازمت کرتے نظر آتے ہیں۔ تحصیلداری کا امتحان پاس کر کے وہ علی گڑھ میں سررشتہ دار ہو گئے۔ یہ نماز باجماعت کے پابند تھے اور مسٹر کالون جو اس زمانے میں کلکٹر علی گڑھ ہو کر آئے تھے، نماز کے سخت مخالف تھے، بالآخر انھیں چھ ماہ کی رخصت لینی پڑی اور سرسید کی سفارش سے حیدرآباد میں ملازم ہو گئے اور اپنی محنت، دیانت اور لگن کے طفیل بتدریج اتنی ترقی کر لی کہ معتمد مدار المہام یعنی سکریٹری وزیراعظم ہو گئے۔ پندرہ برس کے بعد اُنھوں نے تمام ملازمتوں سے استعفیٰ دے کر خود کو قومی خدمات کے لیے وقف کر دیا۔ محسن الملک کے بعد کالج کے سکریٹری ہوئے اور ۱۹۱۲ء میں ضعف و علالت کے سبب اس سے استعفا دے کر اپنے وطن چلے گئے اور ۱۹۱۷ء میں وہیں وفات پائی۔

اُن کی وفات پر مولانا سید سلیمان ندوی نے کچھ غلط نہ لکھا تھا:

> "نواب محسن الملک کی وفات پر ہم نے تدبر و سیاست کا ماتم کیا، مولانا نذیر احمد کے مرنے پر سحر نگاری اور بزم آرائی کا مرثیہ پڑھا، مولانا شبلی کی موت پر ہم نے علی گڑھ کے نقدان کا نوحہ کیا، مولانا حالی کو رخصت کرتے ہوئے ہم نے سخن وری اور نکتہ سنجی پر آنسو بہائے لیکن نواب وقار الملک کی رحلت پر ہم قوم کا ماتم کرتے ہیں اور اولوالعزمانہ اخلاق کی گمشدگی پر فریاد ....."

اس آخری جملے کی تفصیل یہ ہے کہ وقار الملک کی شخصیت جن اجزا کا مجموعہ تھی ان میں محنت، لگن اور دیانت داری، حق گوئی و بے باکی اور آزادیِ رائے، فیاضی اور قوم کا درد، عمدہ اخلاق، اعلیٰ درجے کی مذہبیت اور نیکی و اخلاص وغیرہ شامل تھے۔ ان کے یہ اوصاف جس زمانے میں انتہائی عروج پر تھے اسی وقت علی گڑھ کو ان کی سرپرستی میسر آگئی اور اُنھوں نے محنت و کاوش سے یہاں جن اعلیٰ اور لازوال اقدار و روایات کی بنیاد ڈالی، وہ فرزندانِ علی گڑھ کے لیے باعثِ فخر رہی ہیں اور ہمیشہ رہیں گی۔ اُنھوں نے مختلف عہدوں پر کام کیا، ہر شخص خواہ اُن کا ماتحت یا افسر اُن کی محنت و لگن، ذمہ داری اور فرض شناسی کا معترف ہی نہیں مدّاح بھی رہا، مسٹر کالون جن سے نماز پڑھنے سے روکنے کے سلسلے میں سخت اختلاف ہو گیا تھا، یہاں تک کہ ملازمت سے سبکدوش ہو گئے تھے اُنھوں نے وقار الملک کی رپورٹ میں پُرزور الفاظ میں اُن کی محنت و دیانت کی تحسین و تعریف کی تھی۔ حیدرآباد کی معتمدی کے زمانے میں انھیں اپنے عہدے کے کاموں کے علاوہ دوسرے کاموں پر بھی آٹھ دس گھنٹے زیادہ دینے پڑتے تھے، نواب فریدون الملک نے لکھا تھا کہ قدرت نے ان کو کام کرنے کی انتھک قوت دی تھی، وہ روزانہ مسلسل پندرہ سولہ گھنٹے کام کی کچھ پروا نہیں کرتے تھے۔ یہ حقیقت ہے کہ اُنھوں نے بہت سے عہدے لینے سے اسی بنا پر انکار کر دیا تھا کہ وہ کام کرنے کے لائق نہیں رہے ہیں۔ اگر اُن میں سے بیشتر اعزازی تھے۔ تاہم اُنھوں نے اعزازات کو محض برائے اعزاز قبول نہیں کیا۔ قوتِ عمل زبردست تھی، کام کرنے کا جذبہ ہمیشہ اور عزم و حوصلہ ہمیشہ بلند رہا، جس بات کی ٹھان لیے تکمیل کے بغیر چین نہ بیٹھتے۔ اُن کے ایک دوست نے لکھا تھا کہ نواب صاحب زمانۂ ملازمت میں اپنے فرائضِ منصبی ادا کرنے میں نہایت جفاکش اور دیانتدار تھے اور یہی اُن کی ترقی اور شہرت کا راز تھا۔ اُن کے حُسنِ کارگذاری نے تمام حکام اور رعایا کو اپنا گرویدہ بنا رکھا تھا۔

کالج کے پرنسپل مسٹر ڈنلاپ کی رائے تھی کہ وہ نہایت جفاکش، اعلیٰ اصول کے بےحد پابند تھے ایماندار، پبلک کے ہمدرد اور ریاست کے ایک قابل قدر ملازم تھے۔ سرآسمان جاہ نے ایک بار انھیں لکھا تھا کہ جس قد

پ محنت کرتے ہیں، میں گواہ ہوں کہ کوئی اس قدر نہیں کرسکتا۔

جب سر سید علی گڑھ میں صدر الصدور رہتے تو وقار الملک نے
ی ماتحتی میں بھی کام کیا تھا۔ اگرچہ یہ زمانہ ابتدائی ملازمت کا تھا مگر
س وقت ہی اُنھوں نے اپنی لگن اور جانفشانی کا سکہ جما دیا تھا چنانچہ
رسید نے اپنے بنارس کے تبادلہ کے وقت اُن کی سروس بک میں لکھا
اکہ:

"منشی مشتاق حسین سررشتہ دار عدالت ہذا نہایت لائق
نہایت محنتی، نہایت کارگزار نہایت فہیم اور زود نویس
وخوش خط افسر ہے۔ اس افسر کی دیانتداری پر مجھ کو
ایسا یقین ہے جیسا اپنی موت پر۔ جس عہدے پر
یہ شخص ملازم ہے اس سے بہت زیادہ بڑے عہدے کی
نہایت عمدہ لیاقت اس میں موجود ہے۔"

محنت کے علاوہ دیانتداری کے اس جوہر کو پہچان کر وقار الملک
ے مستقبل کی اہم ترین حقیقت وخصوصیت کو سرسید نے قبل از وقت آشکار کر دیا تھا
ر کیوں نہ پہچانتے، آخر اپنے عہد کے نابغہ تھے۔ وقار الملک میں دیانتداری بلا کی تھی کوئی
معاملہ ہو، دیانت سے پہلو تہی روا نہ تھی، زاید کاغذ خرچ نہ کرتے۔
فایت سے کام چلا لیتے، اس پر بھی کاغذ کا کچھ حصہ لکھنے سے بچ رہتا اس کو
اٹ لیتے اور اشیاء کی وصولیابی کی رسید کے کام میں لاتے جس کا احساس
رے حیدرآباد کو تھا۔ اس کے علاوہ دفتری کاغذ پر اپنی ذاتی تحریر نہیں لکھتے
تھے اور اگر کسی دوسرے سے یہ غلطی ہو جاتی تو وہ اپنی ملکیت سے کاغذ داخل
رتے کلرکوں سے اپنا ذاتی کام نہ لیتے، احسان کم سے کم لیتے، اگر ان سے
ام لینا ناگزیر ہی ہو جاتا تو پسینہ خشک ہونے سے پہلے اس کام کی مزدوری
یش کر دیتے تھے۔ یہی وجہ ہے کہ اس کا اثر ان کے ماتحتوں اور افسروں
دونوں پر ہوا

اخلاقی جرأت، حق گوئی، بے خوفی اور آزادئ رائے اگر کسی کو
سیکھنا ہے تو وقار الملک سے سیکھے۔ اپنے چھوٹوں یا ماتحتوں کے سامنے
سچ اور صاف بات کہہ دینا کوئی خاص بات نہیں۔ ساتھیوں اور ہمسروں
سے بھی ان کے خلاف صحیح بات کہنے کے لیے ذرا سوچنا اور تامل کرنا پڑتا ہے
اور جہاں تک افسر بلکہ افسر اعلیٰ کا تعلق ہے۔ اس کی غلطیوں پر توجہ دلانے
نکتہ چینی کرنے اور اس بارے میں صفائی سے اپنی رائے پیش کرنے
کے لیے زبردست اخلاقی جرأت درکار ہے۔ اگر شخصیت میں ذرا بھی کمزوری
ہے تو یہ جرأت نہیں ہو سکتی۔ حیدرآباد کی من مانی کروانے والی اور باہمی
داخلی تنازعات کی حامل حکومت میں وزیر اعظم جیسی شخصیت کی رائے کی
تائید نہ کرنا اور اس کے خلاف اپنی رائے کا اظہار کر دینا عجیب وغریب معلوم
ہوتا ہے۔ لیکن وقار الملک کو نہ اُن کے عہدے کا لحاظ تھا نہ اپنی نوکری کی
پروا، وہ بے باکی سے ئے دیتے، رمز و کنایہ کے بجائے صاف اور واضح
طور پر اس کا اظہار کرتے تھے لیکن اس میں خلوص و دیانت اپنے عروج پر
ہوتے تھے یہی وجہ ہے کہ وہاں کے امرا نے موصوف کے اختلاف رائے کو
نہ صرف یہ کہ برداشت کیا بلکہ وہ لوگ اُنکی رائے کا احترام بھی کرتے تھے چنانچہ
سر سالار جنگ نے ایک موقع پر وقار الملک سے کہا کہ فلاں معاملہ میں میری یہ رائے
ہے آپ اسے اپنی رائے کے طور پر بشیر الدولہ کے سامنے پیش کر دیں۔ سر سالار
جنگ وقار الملک کے محسن تھے اور انھیں کی وجہ سے یہ حیدرآباد پہنچے تھے
لیکن اس کی پروا کیے بغیر وقار الملک نے کہہ دیا تھا "میری یہ رائے نہیں"
ظاہر ہے سالار جنگ کو طبعًا یہ بات ناگوار گذری ہوگی۔ وقار الملک گھر آئے
ملازمت سے استعفا دیا اور وطن جانے کی تیاری شروع کر دی۔ سالار جنگ
نے انھیں بلا کر اپنی غلطی کا اعتراف کیا اور آئندہ ایسے امور سے احتراز کرنے
کا یقین دلایا۔

یہیں اخلاقی جرأت کی ایک دوسری مثال بھی پیش کرنی ضروری ہے
سالار جنگ کی وفات کے بعد سر آسمان جاہ مدار المہام ہوئے، سالار جنگ
سے اُن کے تعلقات اچھے نہیں رہتے تھے، وقار الملک کو ان کی معتمدی کا
بھی موقع ملا۔ تاہم وقار الملک سر آسمان جاہ سے وقتًا فوقتًا یہ صاف طور پر
کہہ دیا کرتے تھے کہ میں آپکی اور حکومت کی خدمت میں کوتاہی نہ کروں گا
لیکن مجھے ریاست میں ملازمت نواب سالار جنگ کی وجہ سے ملی ہے اور میری
عقیدت کا یہ پہلا مرجع انہی کا خاندان ہے۔ اسی طرح سر آسمان جاہ کی لغزشوں

اور کمزوریوں پر توجہ دلاتے ہوئے انہیں لکھا کہ

"سرکار عالی کے دیانت بالمقابلہ مقصود ہے یا دیانت اصلی۔
اگر اصلی مقصود ہے تو یہ باتیں اس کے خلاف ہیں اور اگر
میں رہا تو اس میں سے کچھ بھی نہیں ہونے دوں گا، اگر مجھ کو
رکھنا ہے تو یہ سمجھ کر رکھنا چاہیے۔"

ایک اور موقع پر انھیں یہ الفاظ لکھ بھیجے تھے کہ یہ غلط طرزِ حکومت اور انصاف کے خلاف ہے۔"

جن معتمدوں میں اخلاقی جرأت اور افسروں میں عالی ظرفی کا فقدان ہوتا ہے۔ وہ معتمد اپنے افسر کے اور وہ افسر اپنے شعبہ کے زوال کا سبب آسانی سے بن جاتے ہیں۔ زندگی کے اس منجدھار میں وقار الملک کی شخصیت مشعلِ راہ ہے اور روایات علی گڑھ کا بنیادی پتھر، انکی لگن، دیانت داری اور بے باکی نے کالج کو بھی بہت سے فتنوں سے بچایا ہے۔ یہاں بھی انکی آزادئ رائے کا یہی حال رہا۔ سرسید سے کسی بات پر اتفاق نہ ہوتا تو صاف کہدیتے اور بعض باتوں پر سخت چینی کرتے۔ سرسید اپنے مخصوص مزاج کے سبب ان سے سخت ناراض بھی ہو جاتے لیکن انکی رائے میں تبدیلی نہیں ہو سکتی تھی۔ حیدرآباد کا ایک واقعہ مشہور ہے کہ امرائے خواص کی ایک مجلس میں سرسید کی کسی بات سے اختلاف کیا۔ سرسید نے اپنی بات پر اصرار کیا۔ سرسید ناراض ہوئے تو وقار الملک نے سر سے ٹوپی اتاری اور اپنا گھٹا ہوا سر ان کے سامنے کر دیا اور کہا کہ جوتے ماریے لیکن بات آپ ہی کی غلط تھی۔ غرض مذہبی معاملہ ہو یا کالج کا کوئی مسئلہ، سرسید ہوں یا مدار المہام، ان کی بے باک اظہار رائے میں کوئی مخل نہ ہو سکتا تھا۔ قانونِ ٹرسٹیاں کے تحت کالج کی سکریٹری شپ کے تنازعے میں سرسید اپنا جانشین سید محمود کو بنانا چاہتے تھے اس کی نواب وقار الملک نے بھی مخالفت کی تھی۔

اپنے زمانے میں کالج کی ترقی کی غرض سے سرسید نے انگریزوں کی حد درجہ دلجوئی کی۔ نواب محسن الملک کے زمانے میں عملی طور پر انگریزی اسٹاف غالب آگیا اور انتظامی امور میں ٹرسٹی یا سکریٹری خاصے بے دخل سے ہو گئے۔ جب وقار الملک سکریٹری ہوئے تو انھوں نے ٹرسٹیوں کی حیثیت بحال کرانے کے لیے زبردست مجاہدہ کیا اس سے پرنسپل اور پورے انگریزی اسٹاف کی حمایت و تائید کی لیکن وقار الملک نے بڑی اولوالعزمی اور استقامت سے اس کا مقابلہ کیا اور طے کیا جب تک انگریزی اسٹاف خود کو ملازم کی حیثیت میں اور ٹرسٹیوں کی مختاری و بالادستی تسلیم نہ کرے گا، وہ چین سے نہ بیٹھیں گے اور بالآخر انھیں کامیابی ملی ظاہر ہے اس نازک دور میں یہ اقدام حیرت انگیز بھی تھا اور جرأت مندانہ لیکن سالارِ جنگ، آسمان جاہ، کالج کے پرنسپل اور سرسید وغیرہ سبھی اس معاملے میں رطب اللسان تھے کہ آزادئ رائے اور بیباک اظہار و اختلاف کے موقع پر بھی متانت اور وقار کا دامن کبھی ہاتھ سے نہیں چھوڑا۔ اس کے متعدد اسباب تھے۔ وہ مسئلہ پر بہت غور کرتے، کئی کئی دن اسی الجھن میں گذار دیتے اور اگر کوئی بات اتفاق رائے سے منظور ہو جاتی تو اس فیصلے کا احترام کرتے تھے۔ دوسرے یہ کہ اختلاف رائے کے موقع پر وہ اپنے فرض سے غافل نہ ہو جاتے تھے۔ سرسید سے کسی بھی بات پر اختلاف یا معرکہ ہو جاتا تو کالج کی خدمت میں کوتاہی اور کمی تو کجا، اس وقت انکی ذمہ داری میں اضافہ ہو جاتا اور کالج کی امداد کی ترغیب میں بیش از بیش مضامین قوم کے نام لکھتے تھے۔ تیسرے یہ کہ اختلاف کے باوجود نہ بے نیام ہو جاتے نہ کسی سے بے ادبی سے پیش آتے بلکہ ادب و اکرام کے جو اوصاف انکی ذات میں جمع تھے، اختلاف کے وقت بھی ان کا اسی طرح اظہار ہوتا ہے۔ سرسید نے ایک مرتبہ ان کے استقلال رائے سے اختلاف کرتے ہوئے برہم ہو کر لکھا تھا کہ "مجھ کو یقین تھا کہ آپ خدا کے الہام پر بھی اپنی رائے سے منحرف ہونے والے نہیں ہیں"۔ ٹرسٹی شپ بل کے سلسلے میں سید محمود کی جانشینی کی مخالفت کے وقار الملک کے خط پر سرسید کا ردعمل یہ تھا کہ مولوی سمیع اللہ کا اس سے زیادہ کچھ مطلب نہیں کہ سید محمود نہ ہوں، جو آپ کہتے ہیں، اس کا مطلب بھی یہی ہے۔ وقار الملک زود رنج نہیں تھے انھیں سرسید کا یہ انداز کتنا ہی ناپسند ہوا ہو لیکن اپنی رائے سے متعلق انھوں نے سرسید کو جو خط لکھا تھا اس کے ایک ایک لفظ سے ان کے بنیادی اوصاف عیاں ہیں۔ اس میں ان کا لہجہ، سرسید

کاادب و احترام، احسان شناسی کا جذبہ، اعلیٰ روایات کی پاسداری اور
اپنے اظہار رائے میں آزادی کی مجبوری سب کچھ چند جملوں میں سمٹ آیا
ہے، خط کا ضروری اقتباس درج ذیل ہے ۔

"قومی اندیشہ ہے کہ بعض مطالبات ضرور آپ کے ملال
خاطر کا باعث ہوں گے ۔ لیکن جن مجبوریوں سے میں ان
کے لکھنے پر مجبور ہوا - ان کا بیان میں نے ساتھ ہی کر دیا ہے۔
اگر کوئی معذرت آپ کے اس ملال کو کم کر سکتی ہو تو
جس قسم کی معذرت ہو میں اس کے پیش کرنے
کو اپنا فخر سمجھونگا - آج چھٹا دن ہے جو میں اس رائے
کا مسودہ لکھ چکا ہوں - اس تمام عرصے میں برابر سوچا
کہ آیا اس مضمون کو میں رہنے دوں یا خارج کردوں لیکن
فقط اس خیال نے کہ جو کچھ میں کہہ رہا ہوں وہ ایک قومی
کام ہے لہٰذا جو کچھ میری رائے میں آیا میں نے اس کا کرنا
اپنے اوپر فرض سمجھا اور اب میں اپنے کو نہایت خوش
قسمت سمجھونگا اگر یہ معلوم ہو کہ میری اس نالایق حرکت
نے آپکی مربیانہ شفقت کو میرے اوپر سے کم نہیں کیا۔ مولوی
مہدی علی تو کہتے ہیں کہ اس کے بعد عمدہ تعلقات قایم
رہنا ممکن نہیں لیکن خدا کے نزدیک کوئی بات بھی ناممکن
نہیں، اور اسی پر بھروسہ ہے۔"

مذکورہ بالا امور کے علاوہ یہ طویل اقتباس علی گڑھ کی ان روایات کا
بھی بہترین مظہر ہے جو کالج کی بنیادوں میں مسالے کا کام کر رہی تھیں۔
وقار الملک کی تواضع و خاکساری میں ان کی عمر اور عہدوں کے ساتھ کمی
آنے کے بجائے اضافہ ہوتا رہا ہے، ان کے ہم عصر نواب حبیب الرحمٰن خاں
شروانی نے اُن کی خوش اخلاقی، خوش گفتاری اور شائستگی کی زبردست
تعریف کی ہے۔ صاحب زادہ آفتاب احمد خاں نے انھیں ایک عہد آفریں
شخصیت تسلیم کیا ہے اور علی گڑھ کے اخلاق کی تعمیر میں اُن کا اہم ترین حصہ
قرار دیا ہے ایک جگہ لکھتے ہیں کہ:

نواب صاحب کی پبلک اور قومی خدمات سے قطع نظر کر
کے ان کا ذاتی کیرکٹر اور اُن کی اخلاقی خوبیاں خاص طور پر
قابلِ ذکر اور یاد رکھنے کے لایق ہیں ..... ان کی تحریر و
تقریر میں سخت کلامی کبھی پاس نہیں آئی اور روزانہ برتاؤ
میں جس ادب اور دلداری کو وہ ہر وقت اور ہر شخص
کے ساتھ ملحوظ رکھتے تھے، وہ خاص طور پر قابلِ ذکر ہے ۔
بڑوں اور چھوٹوں سب کے ساتھ تعظیم و تکریم سے ملتے
اور میں کہہ سکتا ہوں کہ اُن کے ذاتی اخلاق کا اثر مجموعی
طور پر ہم سب پر پڑا ہے ۔

وقار الملک کی قابلِ تقلید فیاضی نے اُنھیں
فارغ البال زندگی نہیں گزارنے دی۔ اگرچہ تنخواہ معقول تھی لیکن
التزامی طور پر آمدنی کا آدھے سے زیادہ حصہ کم استطاعت عزیزوں
حاجتمندوں اور دوسرے غریبوں کی امداد کی مد میں خرچ ہوتا اُس
کے ساتھ ہی جس ضروری فنڈ یا امداد میں ضرورت ہوتی بلا تامل خرچ کرتے
تھے اور کئی کئی سال تک طلبہ کی خفیہ مدد کرتے وہ جن محتاجوں اور غریبوں
کی خفیہ مدد کرتے اُن کے انتقال کے بعد ان میں سے بہت سے بے یار و مددگار
ہوگئے۔ سرسید نے اپنے ایک مضمون "فیاضی انتصار جنگ مولوی مشتاق
حسین" میں اُن کی فیاضی اور ہر ہر موقع پر کالج کی خدمت اور امداد
کی بہت واضح الفاظ میں تعریف کی تھی - وہ جب وقار الملک سے فنڈ
یا وظیفہ لینا چاہتے تو اجازت کی ضرورت ہی محسوس نہ کرتے تھے اور
جس قدر چندے یا امداد کی ضرورت ہوتی یا جتنے لڑکوں کو وظیفہ دینے
چاہتے، منظوری کے یقین پر لیکن منظوری حاصل کئے بغیر وقار الملک
کی طرف سے اس کا اعلان کر دیتے۔ نمونہ کے طور پر اس طرح کا ایک
اطلاعی خط درج ذیل ہے :

میں مدرستہ العلوم کا بجٹ بنا رہا ہوں، اس میں اب کی سال بھی آپ
کی طرف سے اسکالرشپ دینی ہوگی، جس تعداد سے کہ ضرورت ہوگی اور
اطلاعاً لکھا گیا ہے، کچھ اجازت لینے کی ضرورت نہ تھی۔

یہی وہ باہمی خلوص تھا جو سرسیّد ہال کی عمارت میں آج بھی آشکارا ہے۔ یہی نہیں بلکہ یادگار سرسید، نظام میوزیم، محمود منزل، آسمان منزل، سالار منزل، اسٹریچی ہال، لارنس گیٹ، جاہ اخوان الصفا، خام بورڈنگ ہاؤس، پختہ بورڈنگ ہاؤس، اور رتیل اسکول کلاسینر یوا احاطۂ کالج (یہ سب کالج کی عمارتیں اور آثاروں کے نام ہیں) غرض ن کے زمانے کا کوئی کام ایسا نہیں جس میں وقار الملک نے مجموعی طور پر زاروں روپیہ چندہ نہ دیا ہو۔ وہ اپنی تنگ دستی اور رفاقہ مستی پر دوسروں کی اعانت و امداد کو ترجیح دیتے تھے اور یہی وہ جذبہ تھا جس نے ب دقات سرسید کو سخت مخالف ہوتے ہوئے بھی اُن کا حامی بنا دیا تھا۔

بعض فیاض اور سخی لوگ نفسیاتی طور پر روپیہ جمع رکھنے اور زیادہ زیادہ حاصل کرنے میں بھی کوشاں رہتے ہیں۔ وقار الملک کا روپیہ سے استغنا کا یہ عالم تھا کہ بشیر الدولہ سر آسمان جاہ (جن کا سالار جنگ اختلاف رہتا تھا) سے خاص تعلق کے سبب ایک موقع پر سالار جنگ وقار الملک کو ملازمت سے برطرف کر دیا۔ جب بشیر الدولہ کو حقیقت حال لم ہوا تو اُنھوں نے موصوف کی خفیہ امداد کی ہر ممکن کوشش کرلی لیکن ہوں نے قبول نہیں کیا یہاں تک کہ موقع غنیمت جان کر بشیر الدولہ نے رالملک کی دُختر کی شادی میں نیوتے کے طور پر چار ہزار روپے کی بھیجی اسے بھی واپس کر دیا گیا۔

اس کے کچھ ہی دن بعد سالار جنگ نے وقار الملک کو خود ایک یں لکھا میں چار سو روپیہ ماہ بماہ آپ کو بھیجتا رہوں گا، آپ خاطر جمع یں اور اس امداد کو بہ "صیغۂ راز" رکھیں۔ وقار الملک نے اس پیشکش اب میں دو باتیں لکھ بھیجیں، اوّل یہ کہ روپے کی مقدار کم کر دی جائے لئے کہ میں کفایت سے گزارہ کر سکتا ہوں دوسرے اسے قرض سمجھا ے۔ زمانہ میری مساعدت کرے گا تو یہ قرض ادا کر دوں گا۔

ایسے حالات میں بھی ہر کس و ناکس کی مدد کے لیے تیار رہتے اعزہ ا اور تمام حاجتمند اس فیض سے بہرہ ور ہوتے۔ ظاہر ہے کہ ان کے روپیہ جمع ہونے کا سوال ہی نہ تھا۔ جب حیدر آباد سے وطن کے لیے روانہ ہوئے تو اُن کے پاس سفرخرچ تک نہیں تھا، بمشکل اس کا انتظام کیا۔ جب وہاں سے آئے تو پتلون میں پیوند لگا ہوا تھا جس پر سرسیّد نے ایک آہ سرد کھینچی تھی۔ نواب محسن الملک نے تو حیدر آباد میں اتنی عالی شان کوٹھی بنوائی تھی کہ اس کا فرنیچر بھی اس زمانے کے ستّر ہزار روپے میں انگلستان سے آیا تھا، لیکن وقار الملک نے امروہہ حیدر آباد اور علی گڑھ کہیں کوئی کوٹھی تو کجا، مکان تک نہیں بنوایا۔ آبائی مکان کی معمولی مرمت کرالی تھی۔

سرسید نے محسن الملک اور وقار الملک کے اس وصف کا موازنہ کرتے ہوئے پُرزور الفاظ میں وقار الملک کی تحسین کی ہے۔

موصوف کی ہمدردی، دلسوزی اور منکسر المزاجی بھی قابلِ ذکر اور لائق تقلید ہے مخلوق خدا کی ذرا سی تکلیف پر اُن کا دل کانپ جاتا تھا حیدر آباد میں اُنھوں نے رعایا کی راحت و آرام کے لیے اور اُن کو مظالم سے چھٹکارا دلانے کے لیے ہر وقت اور ہر ممکن کوشش کی۔ ورنگل کی صوبیداری کے زمانے میں ایک موقع پر دورہ کرتے ہوئے ایک گاؤں سے گزرے جہاں ہیضہ پھیلا ہوا تھا۔ اُنھوں نے گاؤں کے قریب پہنچتے ہی سواری روک لی اور تمام ساتھیوں کو اجازت دے دی کہ جس کا جی چاہے آگے چلا جائے۔ خود ڈاکٹر کو لے کر صبح سات بجے گاؤں میں داخل ہوئے۔ تمام مریضوں کی دیکھ بھال کی۔ ان کی تیمارداری اور علاج کا انتظام کیا۔ ساڑھے تین بجے فارغ ہو کر جائے قیام پر پہنچے۔ ہمدردی کا یہ عالم تھا کہ ایک سفر میں ان کا ایک اہلکار گم ہو گیا، اس کی تلاش میں سپاہیوں کو بھیجا اور ساتھ میں جبھی دیا کہ اگر وہ کسی جنگل میں ہو اور پانی کی ضرورت محسوس کر رہا ہو تو اس کو پانی پہنچایا جا سکے۔ یہی نہیں بلکہ شام تک اُس کے انتظار میں کھانا نہیں کھایا۔

طبیعت کے انکسار اور عالی ظرفی کی ایک مثال یہ ہے کہ کسی مسجد کے ایک نابینا کا کھانا اُن کے یہاں مقرر تھا۔ ایک روز شدید بارش ہو جانے کی وجہ سے رات کو ملازم نابینا کا کھانا نہیں پہنچا سکا۔ وقار الملک کو بہت دیر میں معلوم ہوا تو خود کھانا لے کر پیدل گئے وہ شخص بھوکا بیٹھا

بہت ناخوش تھا، خفا ہو کر بولا کہ آدھی رات کو روٹی لے کر آیا
جا ہم نہیں کھاتے۔ موصوف نے بڑی منت سماجت سے اُسے راضی
رکھانا کھلا کر واپس آئے تاہم اس پر قطعاً ظاہر نہیں کیا کہ کھانا
لے کر آئے تھے۔

اپنے ماتحتوں اور ملازموں کا خاص خیال رکھتے تھے۔ کوئی وفات
تو اس کی اور اس کے اہل خاندان کی ساری تفصیلات معلوم کر
۔ اس پر قرض ہوتا تو اتارنے کا بندوبست کرتے، اس کے لڑکوں
یے وسائل معاش کا خیال رکھتے۔ غیر شادی شدہ لڑکیوں کی شادی
ظام کراتے اور بیواؤں کے لیے وظیفے مقرر کراتے تھے۔

ان کا مذہب بہت پختہ تھا اور اس معاملے میں کسی سمجھوتے کی
ایش نہیں تھی۔ اسکول کے زمانے سے لے کر آخر عمر تک نماز جماعت
ا کرتے رہے، دفتری اوقات میں بھی تھوڑی دیر کے لیے اٹھ کر
دا کر لیا کرتے تھے۔ علی گڑھ کی سررشتہ داری کے زمانے میں ان کے
سٹر کالون کو ان کا نماز کے لیے اُٹھنا ناگوار ہوا، اس نے ممانعت
نھوں نے تعمیل حکم سے انکار کر دیا، اُس نے اصرار کیا تو اُنھوں نے
ے درخواست دے دی کہ نماز مذہباً مجھ پر فرض ہے، میں اسے چھوڑ
ں سکتا البتہ اس وجہ سے اگر کام میں کوئی خلل پیدا ہو تو آپ مجھ سے
ب طلب کر سکتے ہیں۔ لہٰذا نماز کی وجہ سے جو تھوڑی سی غیر حاضری ہوتی
اس کی مجھ کو اجازت دی جائے یا غیر حاضری کی تنخواہ کاٹ لی جائے یا
جینے کی رخصت منظور کی جائے جو میرا حق ہے اور اگر ان میں کوئی بھی
رت منظور نہ ہو تو اس درخواست کو میرا استعفا سمجھ لیا جائے۔

ادائیگی نماز میں اس قدر مضبوطی کا ثبوت دیا کہ پندرہ سالہ ملازمت
بھی پروا نہ کی، وہ کوئی مصالحت کی صورت نکال سکتے تھے لیکن اسے
ہوں نے روا نہ رکھا، یہ غیر معمولی بات ہے اور اس درخواست میں
ں خوشامد یا کمزوری کا پہلو نظر نہیں آتا۔ البتہ متین انداز میں تمام
ن صورتیں پیش کر دی ہیں۔ لیکن سرسید نے شعلہ خو اور سیماب وش
یت نے وقار الملک کے اس مزاج سے اختلاف کیا اور جب وقار الملک
نے یہ پوری تفصیل سرسید کو لکھی تو انھوں نے جواب میں لکھا کہ

...... نماز جو خدا کا فرض ہے اس کو ہم اپنی شامت اعمال سے جس
خرابی سے ہو، ادا کریں یا قضا کریں لیکن کوئی شخص اگر یہ کہے کہ تم نماز نہ پڑھو
اس کا صبر ایک لمحہ بھی نہیں ہو سکتا۔ یہ بات سنی بھی نہیں جا سکتی میری
سمجھ میں نماز نہ پڑھنا صرف گناہ ہے جس کے بخشے جانے کی توقع ہے۔
اور کسی شخص کے منع کرنے سے نہ پڑھنا اور سستی میں ڈالنا میری سمجھ میں
کفر ہے جو کبھی بخشا نہ جائے گا۔ تم کو پہلے ہی اپنی طرف سے ایسا طریقہ
اختیار کرنا چاہیے تھا جو اس قسم کی بحث نہ آتی اور جب ایسا طریقہ اختیار
نہیں کیا تو پھر لجلجانا اور گڑگڑانا اور حضور رخصت ہی دیں، تنخواہ
کاٹ لیں کہنا واہیات تھا۔ تڑاق پڑاق استعفا دینا تھا اور صاف کہنا تھا
اور صاف کہہ دینا تھا کہ میں اپنے عظیم الشان قادر مطلق کے حکم کی
اطاعت کروں گا، نہ کہ آپ کی، کیا ہوتا، نوکری نہ میسر ہوتی، فاقہ مر جاتے
نہایت اچھا ہوتا۔ والسلام۔

یہ اقتباس سرسید کی مذہبیت سے زیادہ اُن کی جوشیلی طبیعت
کا مظہر ہے۔ مذکورہ بالا حقائق کے پیش نظر اسے وقار الملک کی کسی مذہبی
کمزوری کا آئینہ دار نہیں تسلیم کیا جا سکتا۔ ان کی مذہبی حدود بہت وسیع
ہیں جن کا اندازہ چند سطروں سے نہیں لگایا جا سکتا۔ ان کی ایمانداری اور
دیانتداری ایک زبردست اخلاقی قوت کا ثبوت تھی۔ عملی اعتبار سے
زیادہ اور نظریاتی اعتبار سے بھی کئی معاملوں میں سرسید اور وقار الملک
کے طرز زندگی میں فرق تھا، لیکن وہ کونسا ساتھی تھا جو مذہبی باریکیوں
میں اپنے کاروانِ سالار سرسید سے اختلاف نہ رکھتا تھا۔ یہ وقت کی اور
سرسید کی مجبوری تھی۔ اسی لیے سرسید کے معتقد ہونے میں مذہبی
اختلاف رائے قطعاً مانع نہیں رہا۔ وہ مقصد جس کی باگ ڈور سرسید کے
ہاتھ میں تھی، اس پر تمام اہل بصیرت اور رفقائے سید متفق تھے جیسا کہ ذکر
ہوا۔ کبھی کبھی طریق کار میں اختلاف ہو جاتا تھا اور یہ ضروری بھی ہے۔

وقار الملک ایک انقلابی شخصیت کے مالک تھے، انقلاب کے لیے نعرے
بازی ضروری نہیں۔ جینیس کی طرح انقلاب آفریں شخصیت بھی کسی گروہ یا

پارٹی کا سہارا نہیں ڈھونڈتی، اس کے ذاتی افعال و کردار کے جلوہ میں ایسی
زبردست قوتیں پوشیدہ ہوتی ہیں جن کی تقلید صالح انقلاب کا پیش خیمہ
ثابت ہوتی ہیں حیدرآباد کے زمانۂ قیام میں انھوں نے سیکڑوں لوگوں کو
اپنی زندگی کی نہج تبدیل کرنے پر مجبور کردیا خود ریاست کے ارباب اقتدار
نے موصوف کی متعدد صفات اختیار کرلیں اور ہزاروں لوگوں نے آئینِ
جواں مرداں حق گوئی و بے باکی کا درس انہی سے لیا نیز علی گڑھ کے اخلاق و
اقدار میں بہترین عناصر مثلاً خاکساری، تواضع، حلم، فیاضی، مہمان نوازی
سادگی اختلاف رائے کے مہذب آداب اختیار کرنا، حفظ مراتب ہمدردی
دلسوزی، حسن اخلاق، مذہبیت و دینداری اور کسی سے مرعوب نہ ہونے
کا جذبہ وقارالملک کے اوصاف حمیدہ کی عملی شکل کے نتیجہ میں وجود پذیر
ہوئے ہیں۔

وقارالملک نے ایک عرصہ تک کالج کے سکریٹری اور بورڈنگ کے نگراں
کی حیثیت سے بھی کالج کی خدمت کی۔ یہاں طلبا کو قریب سے دیکھنے اور
سمجھنے کا موقع ملا۔ وہ طلبہ کی بیحد عزت کرتے اور اُن سے بیحد محبت کرتے
اُن کے مستقبل کی امیدوں میں پھولے نہیں سماتے تھے۔ اُن کی فلاح و
بہبود کے لیے ہمیشہ مستعد رہتے، ہر ممکن امداد کرتے اور اسی لیے انھوں نے
وظائف کا انتظام بھی اپنے ہاتھ میں لے لیا تھا۔ طلبا کو وظائف دینے
کی پوری کوشش کرتے اور اس راز کو پوشیدہ رکھتے کہ کس طالب علم
کو وظیفہ ملتا ہے۔ پیسے کا زاید خرچ کرنے سے بہتر یہ سمجھتے تھے کہ وہ پیسہ
بطور وظیفہ لڑکوں کے کام آئے۔ اسی لیے جب انھیں نواب کا خطاب
ملا تو مبارکباد کے سلسلے میں آنے والے تاروں کا جواب تار سے نہیں دیا
اور اس پیسے کو وظیفہ کے فنڈ میں جمع کردیا۔ وہ لڑکوں کی واقعی عزت
کرتے اور آپ جناب سے پیش آتے۔ ان کی سکریٹری شپ کے زمانے
میں یہ اجازت عام تھی کہ کوئی بھی لڑکا کسی بھی وقت اُن سے ملاقات
کرسکتا ہے۔

بورڈنگ کی نگرانی کے زمانے میں وہ طلبہ کے اخلاق کا بہت خیال
رکھتے تھے اور اس کے لیے وہ تمام وسائل اختیار کرتے تھے۔ بُرے کھیلوں مثلاً
— تاش شطرنج وغیرہ پر پابندی لگادی تھی اور عدول حکمی پر کبھی کبھی سزا بھی
تھے۔ یہ دور بڑا دلچسپ تھا، اور لڑکے کب کسی کی مانتے ہیں۔ وقارالملک
جن چیزوں کے سختی سے مخالف تھے اُن میں ایک تاش کھیلنا اور دور
ترکِ نماز تھا۔ اُن کے دور میں کوئی طالب علم نماز نہیں چھوڑ سکتا تھا جا
وہ سجدہ میں سبحان ربی الاعلیٰ وقارالملک کا منہ کالا ہی کہتا رہے۔ جو
طالب علم نماز میں حاضر نہیں ہوتا تھا اُسے ڈائننگ ہال میں فرش پر بیٹھ
کر کھانا نہیں مل سکتا تھا بلکہ فرش کے باہر جوتوں کے قریب کھانا کھلا
جاتا تھا، نرم مزاج، رقیق القلب اور تواضع کے پیکر ہونے کے باوجود
ڈسپلن کی سختی اپنے شباب پر تھی اور اُن کے مقررہ اصولوں میں کبھی نر
نہیں آتا تھا۔ نہایت منصف مزاج تھے۔ دوست ہو یا دشمن، اپنا ہو
بیگانہ، چھوٹا ہو یا بڑا، انصاف سب کے ساتھ یکساں تھا ایک مرتبہ غلط
سے کسی ملازم پر جرمانہ کردیا۔ جب اس غلطی کا احساس ہوا تو اپنے او
بھی جرمانہ کیا اور سزا بھی اور ملازم سے معافی بھی مانگی۔

تاش میں جس قدر وقت ضایع ہوتا ہے، رات رات بھر اسی کی نذ
ہوجاتی ہے اس کا علم و احساس وقارالملک کو بھی اچھی طرح تھا اور اس
معاملے میں بیچارے لڑکے بھی اُن سے سراسیمہ رہتے تھے لیکن سخت
ممانعت کے باوجود اس کھیل کو ترک کرنے کے لیے تیار نہ تھے، کمرے بند
کئے اور موقع پاکر کھیلنا شروع کردیا۔ اپنی نگرانی کے زمانے میں وقارالملک
رات رات بھر جاگتے اور لڑکوں کی حفاظت، اصلاح اور بہتری کے
لیے رات کو ہاسٹل کا گشت کرتے تھے۔ انتقامی جذبہ قطعاً نہیں تھا بلکہ
حلم و بردباری وضعداری اور خوش اخلاقی ہمیشہ ان کے ساتھ رہتی تھی
اسی گشت کا واقعہ ہے کہ ایک مرتبہ ایک کمرے میں کچھ لڑکے تاش کھیل
رہے تھے کھیل کے دوران ایک لڑکے نے یوں ہی کہدیا "کہیں سرگھٹا
ملّا نہ آجائے"۔ اچانک دروازہ کھلا اور نواب وقارالملک اپنے خاص وقار
اور متانت سے "السلام علیکم! بندہ حاضر ہے۔" کہتے ہوئے اندر داخل ہوئے
سب لڑکے دہشت سے سکتے میں رہ گئے اور نواب صاحب ان لڑکوں
کے ہاتھوں سے تاش لے کر چلے گئے۔.....

★ ★

نفیس بانو
شعبۂ اردو، مسلم یونیورسٹی علی گڑھ

سرسید کا تصوّرِ تربیت

ہندوستان کی مایۂ ناز ہستیوں میں سرسیّد کی ذات اور شخصیت روشنی کا وہ مینار ہے جس نے ملک و قوم کی ذہنیت کے ہر گوشے کو منوّر و تابناک کر دیا۔ سرسیّد نے اپنی اصلاحی تحریکات میں تعلیم و تربیت پر بہت زور دیا ہے اور اس سے متعلق "تہذیب الاخلاق" میں متعدد مضامین تحریر کیے ہیں۔ یہ حقیقت ہے کہ بچّوں کے لیے محض تعلیم ہی ضروری نہیں بلکہ صحیح تربیت اور ماحول بھی ازحد ضروری ہے۔ بچپن کی تربیت کا اثر زندگی بھر نہیں جاتا۔ بچّے کا حافظہ کافی تیز ہوتا ہے نقل کرنا اور بالخصوص بری عادتوں کو جلد اختیار کرنا بچّوں کی فطرت ہے بچّہ جس ماحول میں پرورش پاتا ہے اس کے اثر قبول کرتا ہے اور آخر عمر تک وہ اثر زائل نہیں ہو پاتا۔ اکثر دیکھا گیا ہے کہ بچپن میں جن بچوں کو بھوت پریت اور چڑیل سے ڈرایا جاتا ہے تا عمر ان کے لاشعور میں بھوتوں اور چڑیلوں کا خوف بیٹھ جاتا ہے اور بڑھاپے تک پیچھا نہیں چھوڑتا۔ جوشؔ نے یادوں کی برات میں جعفر علی خاں اثرؔ کے بارے میں لکھا ہے کہ وہ عالم ضعیفی میں بھی چڑیل، بھوت پریت سے خوف زدہ رہتے تھے ایک دن ان کی غیر موجودگی میں جوشؔ ان کے یہاں گئے اور اُن کے بستر پر چادر اوڑھ کر دم سادھ کر لیٹ گئے۔ اثرؔ جب اپنے کمرے میں داخل ہوئے تو ڈر کے مارے اُن کا بُرا حال تھا انھوں نے دعائیں پڑھنا شروع کیں جب پتہ چلا کہ یہ جوشؔ ہیں تو بولے تُو کسی دن میری جان لے گا۔

اس واقعہ سے بخوبی اندازہ ہوتا ہے کہ بچپن کی باتوں کا ذہن پر کس قدر گہرا اثر ہوتا ہے۔ اس لیے منع کیا جاتا ہے کہ بچّوں کو کبھی ڈرانا نہیں چاہیے اس سے اُن میں بہادری و شجاعت کے بجائے بزدلی پیدا ہوتی ہے۔ جن بچّوں کی تربیت پر توجہ نہیں کی جاتی وہ پڑھ لکھ کر بھی جاہل رہتے ہیں۔ سرسیّد بغیر تربیت کے تعلیم کو ناقص کہتے ہیں۔ سرسیّد مکمل تربیت کے لیے نئے علوم سے واقفیت کو بھی ضروری سمجھتے ہیں۔ سرسیّد اپنے مضمون "تربیتِ اطفال" میں اپنے خاص مقصد کی طرف اشارہ کرتے ہیں کہ ہندوستانی جو جدید تہذیب جدید علوم اور جدید ادب سے متنفر ہیں اُن کے ذہن کو روشن کیا جائے اُن کے دل و دماغ کو اعلیٰ خیالات سے روشناس کرایا جائے۔ تاکہ ان کے شعور میں بالیدگی پیدا ہو۔ انھیں شکایت ہے کہ مسلمانوں میں تربیت اطفال پر توجہ نہیں دی جاتی سرسیّد ایسی تربیت اور تعلیم کے خلاف ہیں جن سے لڑکوں کے خیالات محدود ہو جاتے ہیں اور ان کے اندر خود سوچنے سمجھنے کی صلاحیت مفقود ہو جاتی ہے۔ اس طرح اُن کی ذہنی نشو و نما میں بالیدگی پیدا نہیں ہو پاتی۔

اپنے ایک مضمون "نظامیہ سلسلۂ تعلیم" میں جو تہذیب الاخلاق جلد اوّل بابت ۱۵ ذی الحجہ ۱۲۸۷ھ میں شایع ہوا تھا انھوں نے قدیم اور مروّجہ طرزِ تعلیم و نصاب کا جائزہ لیا اور اس نتیجہ پر پہنچے کہ اس تعلیمی سلسلے میں تبدیلی ضروری ہے۔ گرداس پور میں تقریر کرتے ہوئے انھوں نے کہا تھا:

"پچھلا طریقۂ تعلیم واقعی بہت اچھا تھا لیکن وہ تیلیاں جس ڈور سے بندھی تھیں ٹوٹ گیا اور اب دوسرا ڈورا اُن کے باندھنے کو ہونا چاہیے"۔

ان کا کہنا تھا کہ مُرجھائے درخت کی جڑ میں پانی دینے اور پتوں پر پانی چھڑکنے سے کوئی فائدہ نہیں۔ اس کا یہ مطلب نہیں کہ سرسیّد قدیم مشرقی علوم اور اپنے اسلاف کے سرمایہ سے بیزار تھے۔ ۲۹ جنوری ۱۸۸۴ء کو امرتسر میں تقریر کرتے ہوئے انھوں نے کہا تھا کہ عربی زبان کی تحصیل کے لیے مسلمانوں کو کوشش کرنا چاہیے کیونکہ یہ ہمارے باپ

دادا کی مقدس زبان اور ہمارے قدیم ملک کی زبان ہے۔ یہ بھی واضح ہے کہ وہ اپنی قومی تاریخ پر فخر کرتے تھے۔

سرسید اگر اپنے مشرقی علمی سرمایے سے بیزار ہوتے تو "آثار الصنادید" میں آثار قدیمہ کے نقوش کو محفوظ نہ کرتے اور اونچے اونچے میناروں کے کتبوں کا چربہ اتارنے میں اپنی جان جوکھم میں نہ ڈالتے۔ سرسید اگر اپنی قومی تاریخ سے کشیدہ خاطر ہوتے تو "آئین اکبری" کی تقریظ مرزا غالب کو یہ کہہ کر واپس نہ کرتے کہ ایسی تقریظ مجھے نہیں چاہیے کیونکہ تقریظ میں غالب نے اکبر اور ابوالفضل کے کارناموں کے مقابلے میں انگریزوں کی اختراعات و ایجادات کو سراہا تھا۔

"تزکِ جہانگیری" "تاریخ فیروز شاہی" کی اشاعت بھی ان کے اسی رویے کو ظاہر کرتی ہے۔

لیکن اب وقت کے تیور کچھ اور کہہ رہے تھے اور ضرورت اس بات کی تھی کہ پرانے نظامِ تعلیم و تربیت کو بدلا جائے جبھی قومی ترقی ہو سکتی ہے۔ سرسید کے متعلق اُن کے مخالفین کا خیال تھا کہ وہ انگریزوں کے لیے کلرک پیدا کرنا چاہتے تھے اور نئے حاکموں سے حد درجہ مرعوب تھے حالانکہ سرسید کا نظریہ یہ نہ تھا بلکہ انھوں نے حکمراں قوم کی تہذیب و تمدن، اُن کی تعلیم و تربیت کے قوانین و ضوابط کی بعض ایسی اہم خوبیاں دیکھیں تھیں جو قوم کی ترقی کی ضامن تھیں وہ ملک و قوم کے سچے بہی خواہ تھے لہٰذا قوم کے مفاد کی خاطر انھوں نے ہر ممکن کوشش کی کہ قوم کے بچوں کی تربیت ایسے ڈھنگ سے کی جائے جو آگے چل کر انھیں ترقی کی راہوں پر گامزن کر سکے۔ انھوں نے لندن سے محسن الملک کو ایک خط میں لکھا تھا کہ: "اگر تم یہاں آتے تو دیکھتے کہ تربیت کس طرح ہوتی ہے اور اولاد کا کیا طریقہ ہے اور علم کیوں کر آتا ہے۔ ان شاء اللہ میں یہاں سے واپس آکے سب کچھ کہوں گا اور کروں گا مگر مجھ کافر مردود، گردن مروڑی مرغی کھانے والے کفر کی کتابیں چھاپنے والے کا کون سنے گا۔"

سرسید نے طلباء کی اقامتی زندگی کے لیے بورڈنگ کا انتظام اس لیے کیا تھا کہ انھیں اچھا ماحول اور عمدہ سوسائٹی ملے اور ایک ساتھ مل کر رہنے سہنے، کھانے پینے، پڑھنے لکھنے اور مجلسوں میں شریک ہونے کا موقع حاصل ہو جس سے اُن میں اتحاد و اتفاق، زندگی کو برتنے کا سلیقہ وقت کی پابندی کا احساس پیدا ہو بڑوں کا ادب اور چھوٹوں سے شفقت کا برتاؤ سیکھیں۔ کالج کی اقامتی زندگی کے بارے میں انھوں نے کہا تھا کہ مدرستہ العلوم کو کیمبرج اور آکسفورڈ یونیورسٹی کے طرز پر بنایا جائے گا انھوں نے کہا تھا کہ بورڈنگ ہاؤس ایک کل ہے قوم کو قوم بنانے کی۔ سرسید نے اپنے خیالات کی وضاحت مختلف اندازے کی ہے اور مختلف مثالوں سے قوم کو سمجھانے کی کوشش کی انھوں نے ایک جگہ کہا ہے کہ: "تعلیم و تربیت کی مثال کمہار کے آوے کی سی ہے جب تک تمام کچے برتن بہ ترتیب ایک جگہ نہیں چنے جاتے اور ایک قاعدہ داں کمہار کے ہاتھ سے نہیں پکائے جاتے کبھی نہیں پکتے پھر اگر تم چاہو کہ ایک ہانڈی کو آوے میں رکھ کر پکا لو تو وہ ہرگز درستی سے نہیں پک سکتی۔"

غرض سرسید کا مقصد انگریزوں کے لیے کلرک پیدا کرنا نہیں تھا بلکہ قوم کو اعلیٰ تعلیم کی طرف متوجہ کرنا اور ان کی ذہنی سطح کو بلند کرنا تھا کیونکہ وہ دیکھ رہے تھے کہ روایت پرست قوم جدید تعلیم و تربیت سے بیزار ہے انھیں احساس تھا کہ محض ماضی کے وظیفے پڑھنے سے ان کا مستقبل تابناک نہیں ہو سکتا اس کیلیے ضروری ہے کہ وقت کے تقاضے کو محسوس کیا جائے۔

آج کی برق کی رفتار زندگی بچوں کی صحیح تربیت کی راہ میں حائل ہے۔ والدین اپنے بچوں کو نہ اتنا وقت دے پاتے ہیں اور نہ ان کی صحیح تربیت ہو پاتی ہے۔ والدین کا اہم فریضہ ہے کہ بچوں کی اچھی تربیت کی طرف توجہ دیں کیونکہ اچھے تربیت یافتہ بچے بڑے ہو کر قومی عمارت کے ستون بنیں گے اور ترقی کی راہوں پر گامزن ہو کر اپنا اور اپنے ملک کا اپنی درسگاہ اور اپنے اُستادوں کا نام روشن کریں گے۔

★★

تقریبات

مسلم یونیورسٹی فائن آرٹ کلب نے ۲۹ اکتوبر ۱۹۸۳ء بروز سنیچر ایک اوپن ڈسٹرکٹ اسپاٹ پینٹنگ [Open Aist Spot Painting] مقابلے کا اہتمام کیا۔ اس مقابلہ میں مسلم یونیورسٹی کے علاوہ آگرہ یونیورسٹی کے کالجوں کے طالب علموں نے حصّہ لیا۔ یہ مقابلہ صبح نو بجے سے شروع ہوکر ایک بجے دوپہر تک چلا۔ جس میں موضوع کی مناسبت سے بڑی خوبصورت اور دلچسپ پینٹنگ ناظرین کو دیکھنے کو ملیں۔ سید عظمت شاہ صاحب اور خلیق اشفاق صاحب نے ججوں کی حیثیت سے شرکت کی۔ اس مقابلے میں پہلا، دوسرا، تیسرا انعام بالترتیب جناب ریحان ظہیر نقوی، آل احمد زیدی اور عرفان علوی نے حاصل کیے۔

شام تین بجے انعامات کی تقسیم کی گئی۔ اس جلسہ کی صدارت جناب جی۔ ڈی۔ بھٹاچاریہ نے کی اور مہمان خصوصی اردو کے مشہور شاعر صلاح الدین پرویز نے انعامات تقسیم کیے۔ انھوں نے اپنی طرف سے تین سو، دو سو اور سو روپے کے خصوصی انعامات بھی دیے اور آئندہ تعاون کا اعلان کیا۔ ان انعامات کے علاوہ ۶ جون ۸۳ء کی تصویری نمائش میں ایوارڈ حاصل کرنے والوں کو بھی ایوارڈ دیے گئے۔ یہ تینوں ایوارڈ وارشنیہ کالج کی مس وینا راٹھی، آنند شرما اور مسلم یونیورسٹی کے سبطین اخگر کو دیے گئے۔ اس نمائش کا افتتاح یونیورسٹی کے وائس چانسلر جناب سید حامد نے کیا۔ یہ نمائش کینڈی ہاؤس میوزیم میں کی گئی۔ فائن آرٹ کی اس تقریب میں مہمان خصوصی نے اپنی اردو نظمیں بھی سنائیں جس کو سامعین نے توجہ سے سنا۔

جلسہ کے اختتام پر کلب کے سکریٹری جناب اظہار الحق نظمی نے مہمانوں کا شکریہ ادا کیا اور چائے کی دعوت دیتے ہوئے تقریب کے اختتام کا اعلان کیا۔

جناب
صلاح الدین پرویز
(صدر)
اور
جناب
اظہار الحق نظمی
سکریٹری
فائن آرٹ کلب

مضمون نگاری کا مقابلہ

یونیورسٹی لٹریری کلب کی جانب سے بسلسلہ یوم سر سید، ۲۳ اکتوبر ۸۳ء و شام چار بجے ایک مضمون نگاری کا مقابلہ لیا گیا۔ اس مقابلے میں ۸۰ طلبہ نے حصّہ لیا جو اب تک ہونے والے اس قسم کے مقابلوں کی سب سے بڑی تعداد تھی۔ یہ مقابلہ جنرل ایجوکیشن کینڈی ہاؤس میں ہوا، جو کہ بیک وقت تین جگہوں پر شروع

ہوا۔ ایک جگہ یونیورسٹی اسکول کے طلبہ، دوسری جگہ یونیورسٹی کے طالب علم اور تیسری جگہ طالبات کے لیے مخصوص تھی۔ یہ مقابلہ شام چار بجے شروع ہوا اور ایک گھنٹے کا وقت مقرر کیا گیا۔ اردو، ہندی اور انگریزی میں الگ الگ 2200/- روپے انعامات کا اعلان کیا گیا۔ ان تینوں زبانوں میں اول آنے والوں کو تین سو روپے، دوسرا انعام دو سو روپے اور تیسرا انعام سو روپے کے انعامات دیے جائیں گے۔ ان کے علاوہ تینوں زبانوں میں خصوصی انعام سو روپے، 75/- روپے اور 50/- روپے کے انعام بھی دیے جائیں گے۔

الہ آباد میں "یومِ سرسید" تقریبات

الہ آباد: اس سال یومِ سرسید اے ایم یو اولڈ بوائز برانچ ایسوسی ایشن نے یوم عاشورہ کی وجہ سے ۱۷ اکتوبر کو نہیں منایا تھا۔ بلکہ یہ جلسہ اب ۱۲ نومبر ۸۳ء کو منعقد ہوا۔ جس میں مہمان خصوصی کی حیثیت سے ڈاکٹر سید ظہور قاسم صاحب نے شرکت کی جو کہ خود بھی علی گڑھ کے اولڈ بوائے ہیں۔ اس جلسہ میں تقریباً ۷۵ اولڈ بوائز نے شرکت کی۔

سب سے پہلے ایگزیکیٹو کمیٹی کا الیکشن ہوا۔ جس میں سردار نظام شروانی صاحب کی جگہ سید محمد زاہد حسن صاحب کو نیا سکریٹری چنا گیا اور جوائنٹ سکریٹری بیگم نزہت لقمان، خزانچی خورشید الزماں خاں شروانی اور مجلسِ منتظمہ کے آٹھ ممبران کا انتخاب ہوا۔

جلسہ کی صدارت جناب فاروق نعمانی صاحب نے کی جو شرکا میں سب سے بزرگ اولڈ بوائے تھے۔ جلسہ کا اختتام یونیورسٹی ترانے پر ہوا۔ اس کے بعد حاضرین عشائیہ میں شریک ہوئے۔ ★★

قحط سے امان

(مزاحیہ)

عالمی خوراک کانگریس میں دور کی کوڑی لانے والے بہت سے افراد شامل تھے۔ ایک ہندچینی سے آئے تھے۔ ان کی تجویز یہ تھی کہ اگر صبح کا اخبار پڑھنے کے بعد ناشتے کے طور پر کھانے کے کام آ سکے تو اس دنیا میں کبھی قحط نہیں پڑ سکتا۔ دلیل یہ تھی کہ کاغذ نباتات سے حاصل ہوتا ہے۔ اس لیے تحقیق کے بل بوتے پر اسے کھانے کے لائق بنایا جا سکتا ہے۔ رہی سیاہی تو اس کی جگہ رنگ دار مشروبات استعمال کیے جا سکتے ہیں۔ اس تجویز پر جو فرمایشی قہقہہ لگا وہ موصوف کا کچھ بھی نہ بگاڑ سکا۔ ان کی سادگی اور سنجیدگی دونوں میں کوئی فرق نہ آیا۔

اگلے روز اخبارات نے اس تقریر پر بڑی حاشیہ آرائی کی بلکہ موضوع کی مناسبت سے اس خبر کو نمک مرچ لگا کر پیش کیا۔ مسافر نے اس تجویز پر غور کیا تو نئے امکانات روشن ہوتے چلے گئے۔ لوگوں کے ہاں اخبارات ان کی اشتہا کے مطابق آیا کریں گے۔ خوش خوراک صبح و شام بہت سے روزانہ اخبار منگایا کریں گے۔ رمضان میں اخبارات کے سحری اور افطاری ایڈیشن نکلا کریں گے۔ جمعرات کو ردّیاں بانٹنے کے بجائے ہینڈبل تقسیم ہوں گے۔ شیر خوار بچے ڈبے کے دودھ کے بجائے ڈبے کا لیبل گھول کر پیا کریں گے۔ ناپسند خبروں کو کھانے والا تھوک دے گا۔ ناگوار بیانات کو کچا چبا جائے گا۔ چینی کھانوں کے ریستوران چینی چھاپے خانوں میں بدل جائیں گے۔ وہ بھی کیا عافیت اور کفایت کے دن ہوں گے جب لوگ دعوتوں کے لیے ردّی جمع کیا کریں گے۔

(مختار مسعود: سفر نصیب)

جملہ خط وکتابت کا پتہ:
نورالحسن نقوی
شعبۂ اردو، مسلم یونیورسٹی علی گڑھ

روپیہ بھیجنے کا پتہ:
منظر عباس نقوی
شعبۂ اردو، مسلم یونیورسٹی علی گڑھ

قیمت فی شمارہ ..... ایک روپیہ
سالانہ ..... ۲۰ روپے
تاحیات ..... دو سو روپے

رائیں مشورے

آپ کی ادارت میں تہذیب الاخلاق کے شائع ہونے والے دو پرچے نظر سے گزرے۔ ماشاء اللہ آپ نے اس کی ترتیب بہترین انداز پر کی ہے' اس پر آپ کو مبارکباد پیش کرتا ہوں۔

اصلاح طلب اور فوری اصلاح طلب چیز صرف ایک ہے جس کی بابت عرصہ ہوا ہفتہ وار اخبار صدق جدید کے ذریعہ توجہ دلائی تھی کہ ٹائیٹل پر رسالہ کے نام کے ساتھ "محمڈن" (Mohammedan) کا لفظ بدستور قائم رکھا گیا ہے' اسے ہٹا کر اس کی جگہ مسلم (Muslim) کا لفظ لایا جائے۔

محترمی سید حامد صاحب سے سلام کے بعد ان کی توجہ اس جانب اور میری اس حقیر عرض کے ساتھ مبذول کرائیے گا۔ محترم سید حامد صاحب دار المصنفین کے اس جلسہ میں شریک تھے جس میں مولانا ابوالحسن علی ندوی اور دوسرے ممتاز شرکاء نے اس حقیقت کا اظہار کیا تھا کہ لفظ "محمڈن" دشمنِ اسلام عیسائی مشنریوں و مستشرقین نے قصداً چلایا تھا۔ اس کی تبدیلی ضروری ہے۔ محمڈن ایجوکیشنل کانفرنس ایم اے او کالج سب اس نام کو تبدیل کر چکے ہیں۔ صرف آپ کے یہاں یہ پرانی روایت اب تک قائم چلی آرہی ہے۔ آپ نے رسالہ کے سرورق میں خوشگوار تبدیلی کی ہے۔ صرف یہی ایک لفظ کھٹک رہا ہے۔ امید ہے کہ اس جانب جلد توجہ فرمائیں گے۔ انشاء اللہ اس کا اچھا اثر آپ کی اشاعت پر پڑے گا

حکیم عبدالقوی   صدق جدید۔ لکھنؤ

پہلے شمارہ میں "مسلم یونیورسٹی علی گڑھ میں طبیہ کالج کی بنا" گاہے گاہے بازخواں' کے بطور حکیم ہمدانی صاحب کا مضمون نہ صرف طبیہ کالج علی گڑھ بلکہ طب یونانی اور طبی اداروں کے مقاصد کے سلسلہ میں بے حد معلوماتی مضمون ہے۔ طب یونانی آج جن خطرات سے دوچار ہے اگر طبیہ کالج علی گڑھ اور دیگر طبیہ کالجوں کے قیام کے ان مقاصد اولین کو نظروں سے اوجھل نہ کیا جاتا جس کی نشاندہی صاحب مضمون نے کی ہے تو آج یہ عظیم فن "صورت بیں حالت مپرس" کا مصداق نہ بنا ہوتا۔ کوئی علم و ہنر کسی قوم و ملت کی میراث نہیں ہوتا — پھر بھی مسلم یونیورسٹی علی گڑھ میں طبیہ کالج کا قیام "محمڈن ایجوکیشنل کانفرنس" کے ایک دیرینہ منصوبہ کی تکمیل ہے جو اس نے اپنے لکھنؤ کے ایک اجلاس ۲۸ دسمبر ۱۹۰۶ء میں یعنی اب سے تقریباً اسّی سال قبل تکمیل الطب کالج لکھنؤ کے قیام کی تائید میں ایک ریزولیوشن کی شکل میں پیش کیا تھا کہ "۱۱ سے تکمیل الطب کالج کے اغراض و مقاصد سے پورا اتفاق ہے اور تکمیل الطب کالج یونانی کی ترقی کا اچھا ذریعہ ہے اور ایجوکیشنل کانفرنس بحیثیت ایک عام قومی جلسہ ہونے کے طب یونانی کو منجملہ ان علوم و فنون کے تصور کرتی ہے جن کی تعلیم مسلمانوں کے واسطے مناسب ہے اور بلحاظ فلاح دنیوی و تمدن ان کے حق میں مفید و سودمند قرار دی گئی ہے" [تذکرہ خاندانِ عزیزی۔ مرتبہ حکیم سید ظل الرحمن صاحب صفحہ ۱۲۶]

سرسید نمبر "زاد راہ و راہنما" میں محترم وائس چانسلر صاحب نے جس دل گیر و دل گداز انداز میں مسلم یونیورسٹی کی موجودہ فضا و حالات پر بالواسطہ روشنی ڈالی ہے وہ صرف اس عظیم ادارہ سے وابستگان ہی کے لیے نہیں بلکہ تمام بہی خواہان یونیورسٹی کے لیے ایک لمحہ فکریہ فراہم کرتی ہے۔ اگر اس ابتدائیہ کو اسی جذبہ و زاویہ نگاہ سے پڑھا جائے تو یونیورسٹی کی موجودہ مکدّر فضا کے یہ سیاہ بادل نہ صرف چھٹ سکتے ہیں بلکہ ہر آنے والے دور اور مسلم یونیورسٹی کے لیے ایک ایسا ضابطۂ حیات بن سکتا ہے جس سے سرسید علیہ الرحمۃ کے خوابوں کی تعبیر اس کی اصل شکل میں سامنے آسکے گی۔

میں وائس چانسلر صاحب کے آج سے تقریباً انتالیس قبل غالباً ۱۹۴۷ء کے اس دور کا عینی شاہد ہوں جب موصوف عالمِ جوانی میں اپنی صلاحیتوں کے طفیل انگریزی دور کے ضلع بجنور میں ایس ڈی ایم تھے اور ہاکی کے مایہ ناز مرد میدان تھے۔ میں بھی کبھی کبھی پکڑا پکڑایا کسی نہ کسی حیثیت سے نہٹور' بجنور میں ان کے مقابل ہاکی کے میدان میں اترتا تھا۔ مجھے ان کا وہ

ـی کردار آج تک یاد ہے جب وہ ہاکی کے میدان میں گھٹنوں سے کافی
ـے موزے پہن کر آتے تھے اور ستر پوشی کے ساتھ نماز کو نماز کے
ـیں ادا کرتے تھے۔ اس مدتِ مدید میں اگرچہ پھر مجھے انھیں دیکھنے کا
ـع نہیں ملا ہے، پھر بھی میں سمجھتا ہوں کہ جن کا کردار اُس انگریزی دور
ـ ایسے اسلامی رنگ کا مظہر ہو، ان سے آج بھی کردار فروشی کی امید کم ہے
ـان سب سے ہو سکتی ہیں مگر بخلوص نیت و تلافیٔ مافات چارہ سازی
ـلساری ہی ان کا حل ہوتا ہے۔ اندھیروں میں "کتاب الابدال" کی
ـ گردانی کرتے رہنے سے کچھ حاصل نہ ہوگا۔

محترم طیب جی نے اپنے علی گڑھ کے دورِ حیات کی جو عکاسی کی ہے
ـیسے رہنما اصولوں پر مبنی و مشتمل ہے جو جماعتی و اجتماعی زندگی کے طور
ـی کی صحیح رہنمائی کرتی اور نامساعد حالات میں تعمیری زندگی کے ڈھنگ
ـاتی ہے۔ موصوف اپنے علی گڑھ کے دور میں متنازعہ شخصیت نہیں رہے
ـ اس لیے ان کے یہ مشاہدات و تجربات اصلاحِ حالات میں اب بھی بے حد
ـن و مفید ہو سکتے ہیں۔ کاش آج کے تلخ حالات میں ان کی شخصیت کو
ـان لیا جائے۔

حکیم صیانت اللہ امروہہ۔

....."تہذیب الاخلاق" ملا۔ ہر چند پسند آیا اور کیوں نہ آئے اپنی چیز کسے
ـی نہیں لگتی۔ یہ اس جگہ سے نکل رہا ہے جہاں زندگی کے بہترین چار سال گزار
ـہوں۔ میں نے علی گڑھ کو ٹوٹ کر چاہا، چار سال وہاں رہا اور آنے کے بعد
ـ نہ جا سکا۔ یہ بات بہت اچھی لگی " اب کچھ کر گزرنے کا وقت ہے اور قوم
ـیسے دردمندوں کی ضرورت ہے جو صحیح معنیٰ میں رہبری کر سکیں۔" آج کا
ـسلم لیڈر میرا خیال ہے اپنا کیریر بنانے کی فکر میں ہے اور قوم کو واقعی
ـے لیڈروں کا انتظار ہے جو آگے آئیں اور ان کی رہبری کریں۔ آپ تہذیب
ـلاق" میں اگر ایسے مضامین شایع کریں جو عمل کی دعوت دیتے ہوں تو
ـا پر احسان ہوگا۔

نسیم محمد جان ضلع اسکول۔ چھپرا۔ بہار

..... کل ہی پہلی دفعہ آپ لوگوں کی محنت کا ثمرہ "تہذیب الاخلاق"
ـی اسٹال پر نظر نواز ہوا۔ پھر کیا ساری رات کچھ یوں گزری کہ پتہ تک نہ
ـا۔ شریف صاحب کی محنت تو بار بار پڑھنے کی خواہش ہو رہی ہے۔ خدا اس
رسالہ کو عزتِ دوام بخشے۔ آمین

محمد حامد علی خاں۔ بہار شریف

.....تہذیب الاخلاق شمارہ نمبر ۲۱ پڑھنے کا شرف حاصل ہوا۔ یہ دیکھ کر خوشی ہوئی کہ سر سیّد کی روایت کو پھر زندہ کیا جا رہا ہے۔ خدا کرے یہ روایت قایم رہے۔ خاص طور سے سیّد حامد صاحب کا ادارؔیہ "خطا کس کی ہے" اور "اسلام میں تعلیم کی اہمیت" قابلِ قدر پڑھنے کی چیز ہے۔ ضرورت اس بات کی ہے کہ چند صفحات بڑھا کر طلبا و طالبات کے لیے دیں تاکہ ان صفحات میں انھیں وہ چیز حاصل ہو جو آج پچاس ساٹھ روپیہ کی کتاب خریدنے سے مجبور ہیں اور جو صرف لائبریری کی زینت بن رہی ہے اور طلبا انھیں پڑھنے کے لیے نمبر لگاتے رہتے ہیں۔

میری مراد ایک دو مقالے سے ہے جو ادبی ہوں اور عام فہم زبان میں ہوں۔ تاکہ طلبا اس سے فائدہ حاصل کر سکیں اور ان کا رجحان اس طرف ہو تاکہ تہذیب الاخلاق ہر خاص و عام کے ہاتھوں تک جا سکے۔

ایس قدیر آزاد۔ پٹنہ

★

...... یہ دیکھ کر خوشی ہوئی کہ "تہذیب الاخلاق" اب پٹنہ کے بک اسٹالوں پر آنے لگا ہے۔ شاید ڈاکٹر عابد رضا بیدار، ڈائرکٹر خدا بخش لائبریری کی کاوشوں اور مشوروں کا ہی نتیجہ ہے۔ پہلے یہ صرف مذکورہ لائبریری میں ہی دیکھنے کو ملتا تھا۔

"تہذیب الاخلاق" کو آپ خوب سے خوب تر بنانے کی کوشش کیجیے۔ راہ میں رکاوٹیں تو بے شک حائل ہوں گی لیکن عزم، حوصلہ اور جد و جہد سے ان رکاوٹوں کو دور کیا جا سکتا ہے۔ اس کی زندہ مثال علی گڑھ مسلم یونیورسٹی ہی ہے۔

یکم نومبر کے شمارہ کے مضامین پسند آئے لیکن خوشہ چیں کے "شرکائے شبستاں" کی اشاعت کا مقصد سمجھ میں نہیں آیا۔ طلبہ کی معلومات میں اضافہ کرنے والے مضامین شایع کیے جائیں تو بہتر ہے۔

ریحان غنی۔ شاہ گنج۔ پٹنہ

علی گڑھ مسلم یونیورسٹی۔ علی گڑھ

اشتہار نمبر ۲۳/۸۳-۸۴

مندرجہ ذیل اسامیوں کے لیے مقررہ فارموں پر درخواستیں مطلوب ہیں۔

۔ پوسٹ گریجویٹ ٹیچر (سنی ٹیچر) مستقل۔ طاہر سیف الدین ہائی اسکول۔

شرح تنخواہ:۔ ۵۵۰ - ۲۵ - ۷۵۰ - ای بی - ۳۰ - ۹۰۰ روپیہ اور دیگر الاؤنس۔

استعداد:۔

i۔ لازمی: سنیّ دینیات میں ماسٹرس ڈگری یا السنہ مشرقیہ کے کسی ادارہ یا کسی مشہور مدرسہ سے حاصل کردہ مساوی استعداد کے علاوہ انگریزی اور عربی کی مناسب استعداد اور کسی ہائی اسکول یا ہائر سکنڈری میں تدریس کا تجربہ

ii۔ ان امیدواروں کو جو انگریزی اور عربی کی مناسب اہلیت کے علاوہ تعلیمات میں ڈگری/ڈپلوما بھی رکھتے ہوں، ترجیح دی جائے گی۔

ٹرینڈ گریجویٹ ٹیچرس (فزیکل ٹریننگ انسٹرکٹر ۔ ۲۔ اسامیاں) ۔[ایک مستقل۔ ایک عارضی)۔ طاہر سیف الدین ہائی اسکول

شرح تنخواہ:۔ ۴۴۰ - ۲۰ - ۵۰۰ - ای بی - ۲۵ - ۷۰۰ - ای بی - ۲۵ - ۷۵۰ روپیہ اور دیگر الاؤنس

استعداد:۔

۱۔ لازمی۔ کسی تسلیم شدہ یونیورسٹی سے فزیکل ایجوکیشن میں تین سالہ بیچلرس ڈگری

یا

۲۔ کسی تسلیم شدہ یونیورسٹی سے بی۔پی۔ ایڈ کی ڈگری۔ یا

۳۔ کم از کم ایک سالہ تعلیمی میقات کی تربیت کے بعد کسی تسلیم شدہ یونیورسٹی/انسٹی ٹیوشن سے ڈی۔پی۔ایڈ۔ بشرطیکہ اس ڈپلومہ میں داخلہ کی بنیادی شرط یونیورسٹی ڈگری ہو۔

iii پسندیدہ:۔ بچوں کو ہاکی، کرکٹ، فٹ بال اور والی بال میں کوچنگ دینے کی اہلیت کے علاوہ نصاب سے متعلق دوسری سرگرمیوں کو منظم کرنے کی قابلیت کے حامل امیدواروں کو ترجیح دی جائے گی۔

۳۔ ٹرینڈ گریجویٹ ٹیچر (ٹیلرنگ) سٹی ہائی اسکول۔

شرح تنخواہ:۔ ۴۴۰۔ ۲۰۔ ۵۰۰۔ ۲۵۔ ۷۰۰۔ ۲۵۔ ۵۰ ، ۷ روپیہ اور دیگر الاؤنس

استعداد:۔

(الف) درج ذیل کسی ادارہ سے ٹیلرنگ، سوزن کاری، کشیدہ کاری میں ڈپلومہ۔

۱۔ لیڈی ارونگ کالج ۔ نئی دہلی۔

۲۔ گورنمنٹ انڈسٹریل ٹریننگ انسٹی ٹیوٹ، کستوربا گاندھی مارگ ۔ نئی دہلی۔

۳۔ پنجاب گورنمنٹ ٹیکنکل ٹریننگ سینٹر۔ شملہ

(ب) مہاراشٹر کے ڈپارٹمنٹ آف ٹیکنکل ایجوکیشن سے خواتین اور بچوں کے ملبوسات کی تیاری کے ٹیلرنگ کورس میں ڈپلومہ

یا

(ج) نئی دہلی کے سماجی بہبود اور آبادکاری کے ڈائریکٹوریٹ سے کرافٹ میکنگ (ٹیلرنگ) میں ڈپلومہ

یا

(د) سینٹرل ٹریننگ انسٹی ٹیوٹ فار وینس انسٹرکٹرس، نئی دہلی سے خواتین انسٹرکٹر کے لیے کٹنگ اور ٹیلرنگ نوماہ/ایک سال کا ٹریننگ کورس سرٹیفکیٹ۔

یا

(ک) بورڈ آف ٹیکنکل ایجوکیشن مہاراشٹر سے سوزن کاری (نیڈل ورک) میں ٹیچرس ٹریننگ کورس اور ایمبرائڈی (کشیدہ کاری) اور فینسی میں سرٹیفکیٹ۔

یا

(ل) حکومت مدراس سے گروپ سرٹیفکیٹ اور نیڈل ورک اور ڈریس میکنگ اور ایگزامینیشن ان ٹیلرنگ اور ٹیکنکل ٹیچرس سرٹیفکیٹ

۲۔ بی۔ایس سی۔ (ہوم سائنس)، بی ایڈ۔

یا

۳۔ لیڈی ارون کالج سے ہوم سائنس میں تین سالہ ڈپلومہ کے حامل امیدوار۔ بشرطیکہ وہ ٹیچرس کسی تسلیم شدہ بورڈ/یونیورسٹی سے ہائی اسکول ہو

یا

۴۔ انسٹی ٹیوٹ آف ہوم اکانومکس۔ نئی دہلی سے ہوم سائنس میں ڈپلومہ کے حامل امیدوار

۴۔ کرافٹ ٹیچر (مستقل) احدی اسکول برائے نابینا۔

شرح تنخواہ:۔ ۴۴۰۔ ۲۰۔ ۵۰۰۔ EB۔ ۲۵، ۷۰۰۔ ۲۵، ۷۵۰، روپیہ اور دیگر الاؤنس

استعداد:۔
پارچہ بافی میں تسلیم شدہ ڈگری/ڈپلومہ کے علاوہ کسی ہائر سیکنڈری اسکول یا تسلیم شدہ ٹیکنکل ادارہ میں مناسب تدریسی تجربہ، پارچہ بافی کے جملہ کاموں سے مکمل آگاہی سے حامل ایسے امیدوار کے لیے جو بصارت سے عاری بچوں کو ان فنون کی تعلیم دینے کی اہلیت رکھتا ہو، مطلوبہ استعداد میں کمی کی جا سکتی ہے۔

۵۔ پرائمری ٹیچر (سندھی)۔ (مستقل)۔ عبداللہ نرسری اسکول۔
شرح تنخواہ:۔ ۳۳۰۔ ۱۰۔ ۳۵۰۔ EB ۱۰۔ ۳۸۰۔ ۱۲۔ ۵۰۰۔ EB ۱۵۔ ۵۶۰۔ روپیہ اور دیگر الاؤنس۔

استعداد:۔
۱۔ لازمی۔ ہائر سیکنڈری ٹرینڈ ایسی خواتین سندھی ٹیچر جو تدریس میں معاونت کرنے والے دلکش اور دیدہ زیب تعلیمی چارٹ تیار کرنے کی اہلیت رکھتی ہو۔

پسندیدہ:۔
سندھی میں معقول لیاقت۔

تجربہ:۔
انگلش میڈیم اسکول میں تدریس کا تین سالہ تجربہ۔

۶۔ پرائمری ٹیچر (میتھمیٹکس)۔ (مستقل)۔ عبداللہ نرسری اسکول۔
شرح تنخواہ:۔ ۳۳۰۔ ۱۰۔ ۳۵۰۔ EB ۱۰۔ ۳۸۰۔ ۱۲۔ ۵۰۰۔ EB۔ ۱۵۔ ۵۶۰ روپیہ اور دیگر الاؤنس

استعداد:۔
۱۔ لازمی:۔ ہائر سکنڈری ٹرینڈ اور بولی جانے والی انگریزی (SPOKEN ENGLISH) میں مہارت و روانی۔
(الف): گیمس، فزیکل ٹریننگ اور ڈرامائی تشکیل کو منظم کرنے کی اہلیت۔
(ب) کسی انگلش میڈیم اسکول میں بحیثیت ریاضی ٹیچر تدریس کا کم از کم پانچ سالہ تجربہ
نوٹ:۔ مرد اور خواتین دونوں امیدوار درخواست دے سکتے ہیں۔

غیر معمولی تعلیمی اور تجربہ کے حامل امیدواروں کو ابتداء ہی سے اعلیٰ تنخواہ سے شروعات دی جا سکتی ہے۔

انٹرویو کے لیے طلب کیے جانے امیدواروں کو بحیثیت ٹی۔ اے ریلوے کی سکنڈکلاس کا یک طرفہ کرایہ ادا کیا جائے گا۔

درخواستوں کے مطلوبہ فارم اور ہدایات اسسٹنٹ رجسٹرار و سلیکشن کمیٹی ، رجسٹرار آفس علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کے دفتر سے پانچ روپیہ یکشت نقد ادائیگی و مسلم یونیورسٹی کے فائننس آفس میں جمع شدہ ، یا فائننس آفیسر مسلم یونیورسٹی کے نام واجب الادا اسی قیمت کا انڈین پوسٹل آرڈر بھیج کر ذاتی طور پر یا بذریعہ ڈاک حاصل کیے جا سکتے ہیں۔
فارم بذریعہ ڈاک منگوانے کے لیے ۲۳ × ۱۰ سم کا ایسا لفافہ بھیجنا ضروری ہے جس پر خود کا پتہ تحریر ہو۔

درخواست موصول ہونے کی آخری تاریخ ۱۲ دسمبر ۱۹۸۳ء ۴ بجے سہ پہر تک ہے۔

نامکمل اور تاخیر سے موصول ہونے والی درخواستوں پر غور نہیں کیا جائے گا۔

دستخط

ضمیر احمد خاں

رجسٹرار

علی گڑھ مسلم یونیورسٹی، علی گڑھ

اشتہار نمبر ۸۴-۸۳/ ۲۴

مندرجہ ذیل اسامیوں کے لیے مطلوبہ فارموں پر درخواستیں مطلوب ہیں۔

پروفیسر۔

شرح تنخواہ:- ۱۵۰۰- ۶۰- ۱۸۰۰- ۱۰۰- ۲۰۰۰- ۱۲۵/۲ ۲۵۰۰ روپیہ اور دیگر الاؤنس

پروفیسر آف سوشیالوجی۔ ڈپارٹمنٹ آف سوشیالوجی۔

استعداد:-

(الف) متعلقہ مضمون میں کسی ہندوستانی یونیورسٹی سے فرسٹ کلاس یا ہائر سیکنڈ کلاس میں ماسٹرس ڈگری یا اس کے مساوی کوئی غیر ملکی استعداد۔

(ب) ڈاکٹریٹ معیار کی ریسرچ ڈگری یا اعلیٰ پایہ کا مطبوعہ کام۔

(ج) پوسٹ گریجویٹ کلاسیز کی تدریس کا کم ازکم دس سالہ تجربہ۔ اور تحقیق کی رہنمائی کا قدرے تجربہ

ریڈرس:-

شرح تنخواہ:- ۱۲۰۰- ۵۰- ۱۳۰۰- ۶۰- ۱۹۰۰ روپیہ اور دیگر الاؤنس۔

ریڈر ان سوشیالوجی۔ ڈپارٹمنٹ آف سوشیالوجی۔

ریڈر ان ہندی۔ ڈپارٹمنٹ آف ہندی۔

استعداد:-

(الف) متعلقہ مضمون میں کسی ہندوستانی یونیورسٹی سے فرسٹ کلاس یا ہائی سیکنڈ کلاس میں ماسٹر ڈگری یا

اس کے مساوی کوئی غیر ملکی استعداد۔

(ب) ڈاکٹریٹ معیار کی ریسرچ ڈگری یا اعلیٰ پایہ کا مطبوعہ کام۔

(ج) پوسٹ گریجویٹ کلاسیز کی تدریس کا کم ازکم پانچ سالہ تجربہ اور تحقیق کی رہنمائی کا قدرے تجربہ

لکچررس:

شرح تنخواہ: ۷۰۰-۴۰-۱۱۰۰-۵۰-۱۶۰۰ روپیہ اور دیگر الاؤنس

۴۔ لکچرر ان باٹنی۔	ویمنس کالج
۵۔ لکچرر ان زولوجی	ویمنس کالج
۶ لکچرر ان فزکس	ویمنس کالج
۷ لکچرر ان بائیوکیمسٹری	ویمنس کالج
۸۔ لکچرر ان میتھمیٹکس۔	ویمنس کالج
۹۔ لکچرر ان اکانومکس۔	ویمنس کالج
۱۰۔ لکچرر ان پالیٹکل سائنس۔	ویمنس کالج
۱۱ لکچرر ان لنگوئسٹک	ویمنس کالج
۱۲ لکچرر ان سنسکرت	ویمنس کالج
۱۳۔ لکچرر ان ھندی۔	ویمنس کالج
۱۴ لکچرر ان اردو۔	ویمنس کالج
۱۵۔ لکچرر ان عربی	ویمنس کالج
۱۶ لکچرر ان سوشیالوجی	ڈپارٹمنٹ آف سوشیالوجی۔

استعداد:

(۱) لازمی (الف) ڈاکٹریٹ ڈگری یا اعلیٰ پایہ کا تحقیقی کام

(ب) مسلسل اچھے تعلیمی ریکارڈ کے ساتھ متعلقہ مضمون میں فرسٹ کلاس یا ہائی سکنڈ کلاس میں ماسٹرس ڈگری (سیون پوائنٹ اسکیل میں B) یا کوئی مساوی غیر ملکی استعداد

اگر سلیکشن کمیٹی اس نتیجہ پر پہونچے کہ کسی امیدوار کا تحقیقی کام جیسا کہ اس کی تھیسس یا مطبوعہ کام سے ظاہر ہے بہت اعلیٰ پایہ ہے تو اس صورت میں سلیکشن کمیٹی (ب) کے تحت دی ہوئی استعداد میں کمی کر سکتی ہے۔ مزید آنکہ اگر ڈاکٹریٹ ڈگری

یا اس کے متبادل تحقیقی کام کا حامل امیدوار میسر نہ آئے یا موزوں نہ سمجھا جائے تو اس صورت میں مسلسل اچھے تعلیمی ریکارڈ کے حامل امیدوار (ایم فل یا اس کے مساوی یا معیاری تحقیقی کام کو اہمیت دی جائے گی) کا تقرر کیا جا سکتا ہے۔ بشرطیکہ اس نے دو سال تک تحقیقی کام کیا ہو یا کسی ریسرچ لیبارٹری/آرگنائزیشن میں کام کرنے کا تجربہ ہو۔ بشرطیکہ وہ اپنی تقرری سے پانچ سال کے اندر ڈاکٹریٹ ڈگری حاصل کرے۔ جس میں ناکامی کی صورت میں اس کو اس وقت تک سالانہ انکریمنٹ نہیں دیے جائیں گے۔ تاآنکہ وہ ان شرائط کو پورا نہ کرے۔

(ii) پسندیدہ :- شمار نمبر چار کے تحت باٹنی میں لیکچرر کے لیے

- ——— تدریس اور تحقیق کی رہنمائی کا تجربہ

شمارہ نمبر ۷ کے تحت بائیوکیمسٹری میں لیکچرر کے لیے

- ——— مطبوعہ کام اور جدید بائیوکیمیکل رجحانات کی آگاہی

شمار نمبر ۱۵ کے تحت عربی لیکچرر کے لیے

- ——— (الف) تدریسی تجربہ یا تحقیقی کام۔
- ——— (ب) اعلیٰ پایہ کا مطبوعہ کام۔

شمار نمبر ۱۶ کے تحت سوشیالوجی میں لیکچرر کے لیے

- ——— (i) ڈگری / پوسٹ گریجویٹ کلاسز کو تدریس کا تجربہ
- ——— (ii) معیاری جنرلس میں مطبوعہ کام۔

ڈائریکٹر آف فزیکل ایجوکیشن - ڈیپارٹمنٹ آف ایجوکیشن۔

شرح تنخواہ :- ۷۰۰ - ۴۰ - ۱۱۰۰ - ۵۰ - ۱۶۰۰ روپیہ اور دیگر الاؤنس

استعداد :-

(i) فزیکل ایجوکیشن میں ماسٹرس ڈگری (ہائی سکنڈ کلاس)۔ کسی تسلیم شدہ ادارہ سے اسپورٹس کوچنگ میں ڈپلومہ

یا

فزیکل ایجوکیشن میں ماسٹرس ڈگری (ہائی سکنڈ کلاس)۔ اس کے علاوہ اپنی یونیورسٹی، انٹر یونیورسٹی/صوبائی سطح پر کسی قومی مقابلہ میں نمائندگی کی ہے۔

(ii) گیمس اور اسپورٹس منعقد کرانے کا تجربہ (اس ادارہ میں کم از کم سال میں آدھے درجن ٹیموں کی نگرانی کرنا۔

اور یونیورسٹی/انٹر کالج مقابلوں میں ان کی دیکھ ریکھ اور عوامی پیمانہ پر گیمس اور اسپورٹس کی حوصلہ افزائی کرنے کی اہلیت۔

غیر معمولی تعلیمی اور تجربہ کے حامل امیدواروں کو ابتداء ہی سے اعلیٰ تنخواہ سے شروعات دی جاسکتی ہے۔

انٹرویو کے لیے طلب کیے جانے والے امیدواروں کو بحیثیت ٹی اے ریلوے کی سکنڈ کلاس کا یکطرفہ کرایہ ادا کیا جائے گا۔

درخواستوں کے مطلوبہ فارم اور ہدایات اسسٹنٹ رجسٹرار (سلیکشن کمیٹی)، رجسٹرار آفس علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کے دفتر سے پانچ روپیہ یکمشت نقد ادائیگی (مسلم یونیورسٹی کے فائننس آفس میں جمع شدہ) یا فائننس آفیسر مسلم یونیورسٹی کے نام واجب الادا اسی قیمت کا انڈین پوسٹل آرڈر بھیج کر ذاتی طور پر یا بذریعہ ڈاک حاصل کیے جاسکتے ہیں۔ بذریعہ ڈاک منگوانے کے لیے ۹ × ۱۰ سم کا ایسا لفافہ بھیجنا ضروری ہے جس پر خود کا پتہ تحریر ہو۔

درخواست موصول ہونے کی آخری تاریخ ۲۶ ردسمبر ۱۹۸۳ء کو ۴ بجے سہپہر تک ہے۔

نامکمل اور تاخیر سے موصول ہونے والی درخواستوں پر غور نہیں کیا جائے گا۔

نوٹ:۔ موزوں امیدواروں کو مستقبل میں خالی جگہوں پر تقرر کے لیے بنائے گئے پینل میں رکھا جاسکتا ہے۔

ضمیر احمد خاں

رجسٹرار

پرنٹر پبلشر: نورالحسن نقوی : مطبع: شیروانی آفسیٹ پریس دہلی : مقام اشاعت: شعبۂ اردو علی گڑھ مسلم یونیورسٹی علی گڑھ